

الحمد لله

نزهة احمد

حالم (نمرہ احمد)

”باب اول“

”گدلے پانیوں کا سنگم!“

اس نے خواب میں دیکھا کہ
 وہ گدلی سی جگہ ہے....
 دو دریاؤں کا سنگم....
 بارش تڑا تڑا برس رہی ہے....
 کچھڑ میں کھلے آسمان تلے دو لوگ کھڑے ہیں....
 ایک سنہرے بالوں والی لڑکی ہے....
 بارش نے اس کو بھگو دیا ہے....
 اس کے بال گیلے ہو کر گالوں سے چپک گئے ہیں
 اور وہ گردن اٹھائے اوپر دیکھ رہی ہے....
 آسمانوں کو.... آسمانوں کے پار جہانوں کو....
 سامنے ایک آدمی کھڑا ہے....
 کچھڑ سے اس کے پیرلت پت ہیں...
 وہ دراز قد اور کسرتی بازوؤں والا ہے....
 اس کے گیلے بال ماتھے پہ بکھرے ہیں....
 وہ اپنے گریبان پہ ہاتھ ڈالتا ہے....
 اور نائی نوج کے اتارتا ہے....
 پھر وہ آستینیں موڑتا ہے... پیچھے... اور پیچھے....

لڑکی ابھی تک اوپر دیکھ رہی ہے....
 آدمی جھکتا ہے.... کچھڑے مٹھی بھرتا ہے....
 سیدھا کھڑا ہوتا ہے....
 مٹھی لڑکی کی طرف بڑھاتا ہے...

”میرے ساتھ رہو.... ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

وہ بارش اور طوفان میں بلند آواز سے کہتا ہے....
 وہ چونک کے اسے دیکھتی ہے.... پھر اوپر نگاہ اٹھاتی ہے....
 دور آسمان پہ ایک پرندہ اڑتا ہوا آرہا ہے....
 اپنے پر پھیلانے اس آدمی کے سر کے اوپر فضا میں آرکتا ہے....
 چکر کاٹتا ہے.... کاٹتا ہے.... کاٹتا ہے....

لڑکی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتی ہے.... الفاظ اس کے لبوں سے نہیں نکل پاتے.... مگر وہ ہونٹ ہلا کر کہتی.... بے آواز.... وہ دیکھو....
 آدمی مٹھی بڑھائے ہنوز کھڑا رہتا ہے۔ اس کی مٹھی میں کچھڑے.... اور کچھڑے میں دکتی ایک سونے کی چابی ہے....
 میرے ساتھ رہو.... میرے ساتھ رہو.... وہ ہنوز کہہ رہا ہے۔

پرندہ ان کے سر پہ چکر کاٹ رہا ہے.... سنہرے اور سرخ رنگ کا پرندہ.... عقاب جیسا.... نیلے ہیروں جیسی آنکھوں والا پرندہ....
 ایک جھٹکے سے عالم کی آنکھ کھلی.....

☆☆=====☆☆

کولا پور، جزیروں کے ملک ملائیشیا کا سب سے مشہور شہر ہے۔ مختلف تہذیبوں اور ادیان کا مرکز.... یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سمندر اور اونچے پہاڑ.... سبزہ اور کھلے باغات.... وہ جنت کے تصور جیسا خوبصورت شہر تھا اور اس صبح وہ معمول کے مطابق آوازوں، شور اور بے فکر تہذیبوں سے گونج رہا تھا.... لوگ مصروفیت سے اپنے روزمرہ کے کام بچنا رہے تھے.... سڑکوں پہ... دفاتروں میں.... گھروں میں....

کے ایل (کولا پور کو عرف عام میں کے ایل کہا جاتا تھا) کے مصروف کاروباری مراکز کے علاقے میں ایک اونچی عمارت بے نیازی سے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بارہویں فلور پہ آؤ تو آفس کیبن بنے تھے اور ورکرز مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ٹائپنگ کی آوازیں، فون کی گھنٹیاں.... یوں دکھائی دیتا تھا کہ اس آفس میں بردن کی طرح کام جاری و ساری تھے....

ایسے میں ایک نوجوان ہاتھ میں فائل پکڑے تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ چینی نقوش کی صورت کا حامل وہ درمیانے قد کا تھا اور چہرے پہ دبا دبا

جوش تھا۔ ایک آفس کے دروازے کے سامنے وہ رکا، خوشی کو قابو کرتے ہوئے مسکراہٹ دبائی، اور دھڑلے سے دروازہ کھولا۔

اندر آفس ٹیبل کے پیچھے ایک تھکا ماندہ سا دھڑلے عمر شخص بیٹھا تھا۔ نائی دھیلی کیے، بگڑے تاثرات لئے، اس نے آنکھیں اٹھا کے اکتاہٹ سے اندر داخل ہوتے نوجوان کو دیکھا۔

”مولیا میں اس وقت کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ میں ساری رات سو نہیں پایا۔ ابھی مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔“

”انور صاحب...! اچھی خبر ہے۔“ مولیا دھڑلے چہرے کے ساتھ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھا تو انور صاحب نے ہاتھ جھلایا۔

”تمہیں لگتا ہے اس وقت مجھے کوئی خبر خوش کر سکتی ہے؟ میری لا پرواہی سے باس کا لیپ ٹاپ چوری ہو گیا ہے اور تمہیں اپنے کاموں کی پڑی ہے؟...“ وہ ناراض چینی آنکھیں مولیا پہ جما کے زور سے بولے۔ ”ابھی تک تو باس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان کا لیپ ٹاپ جس میں ہمارے بزنس کے خفیہ دستاویزات ہیں، اور جو انہوں نے مجھے وائرس سے پاک کرنے کے لیے دیا تھا، میں گم کر چکا ہوں۔ جاؤ خدا کے لئے....“

”سرتحل سے میری بات سنیں۔ مولیا نے لیپ ٹاپ کو ٹریس کر لیا ہے۔“ وہ چمک کر بولا۔ (ملایشیا کے لوگ عموماً ”میں نے یہ کر لیا ہے“ کی جگہ اپنا نام لے کر کہتے ہیں کہ ”مولیا نے یہ کر لیا ہے۔“)

انور صاحب کا جھکا ترا چہرہ تیزی سے سیدھا ہوا۔ آنکھیں پھیلیں۔ بہت سے رنگ چند لمحوں میں بدلے۔

”کیا مطلب؟ کیسے؟“ وہ تیزی سے آگے ہوئے۔

”حالم!“ مولیا نے جوش اور فخر سے وہ فائل سامنے رکھی۔ انور صاحب نے چونک کے اسے دیکھا، پھر سیاہ فائل کو۔

”تم نے حال کو ہائر کیا؟“ ان کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ دلچسپ سرگوشی میں۔ آنکھوں میں چمک ابھری۔

”جی۔ مولیا نے رات کو ہی اسے کال کر دی تھی۔ اور صبح تک اس نے سارا کھوج لگا لیا ہے۔“

”اتنی جلدی؟“ ان کو خوشگوار سی بے یقینی ہوئی۔

”وہ حال ہے سر۔ حال یعنی خواب دیکھنے والا مگر خواب وہ ہمارے پورے کرتا ہے۔ ہم جیسے لوگ پولیس کے پاس جا نہیں سکتے کیونکہ

پولیس لیپ ٹاپ کو evidence میں شامل کر کے اسے دیکھے گی ضرور اور ہمارے کارپوریٹ سیکرٹس کمپر وائز ہو جائیں گے اور باس کو بھی

علم ہو جائے گا۔ اس لئے ہمارے پاس حال جیسے پرائیوٹ Scam Investigator سے اچھا کوئی آپشن نہیں تھا۔“

”تم نے بہت اچھا کیا۔ حیرت ہے مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ کتنے کام کروا چکے ہیں ہم پچھلے چند ماہ میں اس سے۔“ وہ تکان

سے پہلی دفعہ مسکرائے۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا۔ ”کیسا ہے وہ اب؟ ویسا ہی خریلا، مغرور اور موڈی؟“

”ہے تو وہ ویسا ہی۔ کتنی منتیں کرنی پڑتی ہیں اس کی پھر کام کرنے کی حامی بھرتا ہے وہ۔ لیکن ایک دفعہ ذمہ داری اٹھالے تو کام کر کے دم لیتا

ہے۔ ایسے ہی تو وہ کے ایل کی بلیک مارکیٹ کا سب سے ذہین اور شاطر انویسٹی گٹر نہیں ہے سر۔ اس کی ذہانت....“

”اچھا اچھا۔ اب کام کی طرف آؤ۔“ انہوں نے بے زاری سے ٹوکا تو مولیا کی زبان کو قفل لگا، پھر نجل سا مسکرا کے بولا۔

”اچھا یہ دیکھیں۔ اس نے لیپ ناپ کو ٹریس کر لیا ہے۔ اس وقت ہمارا لیپ ناپ اس ایڈریس پہ موجود ہے۔“ مولیا نے فائل کھول کے اس پہ ایک جگہ دستک دی۔

انور صاحب آگے کو جھکے، عینک ناک پہ جمائی اور غور سے پڑھا۔ ”یہ تو کسی کے گھر کا پتہ لگ رہا ہے۔ مگر یہ کون.... ایک منٹ۔“ انہوں نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں۔ رنگ فق ہوا تھا۔

”یہ تو تنگو کامل محمد کا گھر ہے۔“ انہوں نے چونک کے سر اٹھایا تو منہ آدھا کھل چکا تھا اور پیشانی پہ پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ ”تنگو کامل نے ہمارا لیپ ناپ چرایا؟ اوہ خدا..... مجھے اٹھالے۔ مجھے اٹھالے....“

”صبر کریں، سر۔“

”صبر؟ میں باس کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“ وہ چیخے تھے۔ ”میری کار سے ان کا لیپ ناپ چوری ہوتا ہے اور چوری کرنے والا کون ہے؟ ہمارا سب سے بڑا حریف۔ یا اللہ! وہ اب تک کیا کچھ کر چکا ہو گا ہمارے ڈاکومنٹس کے ساتھ۔“ انہوں نے پیشانی پہ ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مولیا نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کے ان کے سامنے کیا۔ انور صاحب نے جھٹ گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ پی گئے۔ پھر گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے لگے۔

”ابھی تک تو میں نے سر کو یہ کہہ رکھا ہے کہ لیپ ناپ ٹھیک کروا رہا ہوں۔ چند گھنٹے سے زیادہ میں ان کو نال نہیں سکتا۔ اب بتاؤ۔“ وہ خود پہ قابو پاتے ہوئے فکر مندی سے پوچھنے لگے۔ ”وہ کتنی جلدی تنگو کامل کے گھر سے لیپ ناپ نکال کر لا سکتا ہے؟“

”کون؟“

”میرا دادا جو قبر میں بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہے، یو ایڈیٹ۔“ انہوں نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ پانی کا گلاس تو کانپا ہی، مولیا خود بھی اچھل ہی پڑا۔

”مم.... میں.... وہ.... عالم کا پوچھ رہے ہیں آپ؟ مگر سر، وہ انویسٹی گیٹر ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا اور....“ مگر انور صاحب کے تاثرات اور لال انکارہ آنکھیں دیکھ کر وہ گڑ بڑا کے اٹھا۔ ”میں.... میں کچھ کرتا ہوں۔ اس کی منت کرتا ہوں۔“

انور صاحب نے خاموشی سے انگلی سے اسے قریب بلایا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ان کی طرف جھکا۔

”اگر....“ وہ اتنا زور سے گرجے کہ مولیا بے اختیار پیچھے ہٹا۔ ”مجھے آج رات تک لیپ ناپ نہ ملا تو تمہاری نوکری گئی۔ جتنا پیسا خرچ کرنا پڑے، کرو.... میں ساری رقم ادا کروں گا لیکن مجھے وہ واپس چاہیے....“

”راجر باس۔“ اس نے اثبات میں زور زور سے گردن ہلاتی، جلدی جلدی فائل سمیٹی اور باہر کو بھاگا۔

اپنے آفس میں آکر اس نے دروازہ بند کیا، اور کرسی پہ آکے نڈھال سا گرا۔ مگر وقت مزید ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک نظر اپنی بیوی

بچوں کی تصاویر کو دیکھا جو میز پر رکھے فریبرز میں لگی تھیں اور پھر فون پر نمبر ملانے لگا۔ کالنگ حالم۔ جلد ہی اس نے فون اٹھالیا۔
 ”میں سوچ ہی رہا تھا کہ ابھی تک میری صبح خوشگوار کیوں گزر رہی ہے۔ کوئی نحوست کیوں نہیں گھل رہی اس میں؟ فون کرنے کا شکریہ
 مولیا۔ اب بتاؤ، کیا کام ہے؟“ خوشگوار سی مردانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو مولیا کی صبح میں سارے زمانے کی نحوست گھل گئی۔ چہرے کے
 زاویے بگڑے مگر وہ ضبط کر کے مسکرایا۔

”تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے فون کیا تھا۔“

”ہو ہی نہیں سکتا۔ کام بتاؤ۔“ وہ اب کے رکھائی سے بولا تھا۔ ”مگر یاد رکھنا، اگلے چار دن میں مصروف ہوں۔ جمعرات کے بعد کرسکوں
 گا۔ اب بتاؤ، پھر سے کیا کھودیا ہے تم نے؟“

”وہی لیپ ٹاپ....“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”وہ کیسے نکلواؤں؟“

”کیا مطلب؟ ابھی تک نکلوا یا نہیں ہے وہ؟ کمال آدمی ہو یا تم۔ دو گھنٹے پہلے رپورٹ دی تھی تمہیں۔ اپنے چار پانچ سیکورٹی کے بندے
 لے کر جاتے ان کے گھر میں گھستے اور نکال کر یہ جاوہ جا۔“

”حالم.... حالم.... خدا کے لئے سمجھو۔“ مولیا اپنے بال نوچنا چاہتا تھا۔ ”ہم کارپوریٹ سیکٹر کے لوگ ہیں۔ غنڈے بد معاش نہیں ہیں۔
 جتنے اچھے ہمارے سیکورٹی آفیسرز ہیں اس سے کہیں اچھے لوگ تنگو کمال کے پاس ہوں گے۔ وہ تنگو کمال ہے۔ ایک امیر اور طاقتور آدمی
 نہ ہوتا تب بھی ہم یہ نہیں کر سکتے کیوں کہ لیپ ٹاپ انور صاحب کی لاپرواہی سے کھویا ہے۔ ہم باس کو بتائے بغیر اس کو واپس حاصل کرنا
 چاہتے ہیں۔ کل صبح سے پہلے۔“

”دیکھو اگر تو تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ میں تنگو کمال کے گھر جا کر تمہارا لیپ ٹاپ چراؤں گا تو میں یہ نہیں کرنے لگا، سوری۔ حالم چور نہیں
 ہے۔ صرف انویسٹی گیٹر ہے۔“ وہ بے رخی سے بولا تھا۔

”پھر میں کیا کروں؟ میری نوکری چلی جائے گی یار۔“ مولیا نے بے چارگی سے فوٹو فریبرز کو دیکھا۔ آفس بلاسٹڈز سے چھن کر آتی دھوپ
 میں وہ مزید چپکنے لگی تھیں۔ تیز دھوپ۔ بے سائبان۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

”اچھا پھر کسی چور کو ہار کر وہ رات کو چرالائے گا۔“ حالم نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”میں کاروباری آدمی ہوں۔ کہاں جانتا ہوں گا ان چور ڈاکوؤں کو؟ تم کچھ کرو پلینز۔ میں منہ مانگی رقم ادا کروں گا۔“ دوسری طرف خاموشی
 چھا گئی۔

”پہلے سے دگنی رقم دو گے؟“ مولیا جھٹکے سے سیدھا ہوا۔ چہرہ کھل اٹھا۔

”ہاں بالکل۔“

”مگر میں تین گنا لوں گا۔“

مولیا نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا پھر ضبط کرتے ہوئے دوبارہ کان سے لگایا۔ ”جو مانگو گے دوں گا۔“

”پھر ایک کام کرو۔“ حالم کا لہجہ اب کے نرم پڑا جیسے اسے مولیا پہ ترس آ گیا ہو۔ ”مجھے دو ڈھائی گھنٹے دو۔ میں تنگو کامل کے تمام ملازموں کی پروفائلز تمہیں دے دیتا ہوں۔ ان کی صلاحیتیں اور ان کی کمزوریاں۔ تم جس ملازم کو بہتر سمجھو اس کے پاس جا کر اس کو ڈرا دھمکا کے یا پیسے کالا لچ دے کر اس کو خرید لو۔ گھر کا بھیدی آسانی سے لیپ ٹاپ نکال کر لادے گا۔“ مولیا کا منہ کھل گیا۔

”یہ سب میں کروں گا؟ مطلب... کیا تم خود ان ملازموں سے بات نہیں کر سکتے؟“

”یونو واٹ مولیا.... تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری مدد کی جائے۔ اب فون نہ کرنا۔“ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ مولیا کا سر گھومنے لگا۔ اس نے دیوانہ وار دوبارہ نمبر ملایا۔

”پلیز.... پلیز حالم... فون اٹھا لو....“ وہ با آواز بلند دعا کر رہا تھا۔

(اگر باس کو معلوم ہو گیا.... گھن کے ساتھ وہ بھی پس جائے گا۔ بلکہ وہ تو سڑک پہ آ جائے گا۔) مگر حالم فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

میز پہ رکھے فونو فریزر اب دھوپ کی حدت سے چمکنے لگے تھے۔ جیسے اس کے بیوی بچے سایے سے نکل کر ننگے سر سورج تلے آ کھڑے ہوئے ہوں۔ اس کا تو گھر بھی کمپنی کا دیا ہوا تھا۔ اس نے غصے اور بے بسی سے پیغام نامپ کیا۔

”حالم... فون اٹھاؤ ورنہ میں خود کشی کر لوں گا۔“

”آفس کے دروازے کالا ک کھول کے خود کشی کرنا۔ ورنہ لاش سے بدبو آنے میں چند دن لگ جاتے ہیں۔“

”میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ میں اس کے ملازموں سے خود بات کر لوں گا۔ صرف مجھے ان کی پروفائلنگ کر دو۔“ اس نے جلدی جلدی پیغام لکھا۔

”پہلے مجھ سے معذرت کرو۔“ فوراً جواب آیا۔

”کیسے؟“

”ایک کاغذ پہ لکھو۔ حالم کے ایل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے اور میں آئندہ اس سے اختلاف نہیں کروں گا۔ تمہارے یہ لکھنے تک میں پروفائلز تیار کر لوں گا۔“ مولیا نے فوراً سے نوٹ پیڈ پہ قلم اٹھایا۔

”میں نے یہ لکھ بھی لیا۔“

”اس کو پانچ سو پچپن دفعہ لکھو۔“ وہ غرا کے بولا اور فون کٹ گیا۔ مولیا نے گہری سانس لی، آستین سے پیشانی پونچھی اور جلدی جلدی قلم کاغذ پہ گھسیٹنے لگا۔

”پتہ نہیں اس شخص کی کون سی انا کو تسکین ملتی ہے ایسے کاموں سے۔“ وہ غصے سے بڑبڑا بھی رہا تھا۔

کمرے میں دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر اس نے اسے ہی کو تیز نہیں کیا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا۔ بس سر جھکائے، لکھتا گیا۔ لکھتا گیا

- جانے کتنی دفعہ لکھا گیا تھا کہ اس نے سر میز پر رکھ دیا اور خالی نظروں سے قلم اور پینسل سے بھرے مگ کو دیکھنے لگا۔ اس کا سر در کر رہا تھا جیسے دماغ پھٹنے کو ہو۔ انور صاحب کے ساتھ اس کی نوکری اور گھر دونوں جائیں گے.....

فون کی گھنٹی چنگھاڑی تو مولیا اچھل پڑا۔ تیزی سے فون اٹھایا۔ حالم کی ای میل آئی تھی۔ اس کے جسم کا برعوض آنکھ بن گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ چند پر بعد کاغذ اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ کھلاپ ناپ تر چھا کر کے یوں رکھا ہوا تھا کہ سورج کی کرنوں کا راستہ رک گیا تھا اور نو فریز چھایا تھے۔ ان کو جیسے سا بان مل گیا تھا۔

”تنگو کامل کا ڈرائیور!“ اس نے ایک کاغذ اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور آنکھیں چھوٹی کر کے تفصیل پڑھی۔ ”اؤہوں۔ جو اتنے سال سے تنگو کامل کی ملازمت کر رہا ہو، بھلے وہ جوئے کا عادی بھی ہو وہ نہیں بک سکتا۔“ اس نے کاغذ واپس ڈالا اور دوسرا پرنٹ آؤٹ اٹھایا۔

”بٹلر۔“ بند مٹھی ہونٹوں پر رکھ کے چند لمحے تفصیلات پڑھیں۔ بٹلر کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا گیا تھا جیسے۔ ”یہ تو بالکل بھی نہیں۔ اس کا کرمٹل بیک گراؤنڈ اس کی کمزوری نہیں اس کی طاقت ہے۔ کیا سوچ کے حالم نے اس سے کئے آدمی کی پروفاکل بنا کے دی ہے؟ یہ تو مجھے پھونک مار کے اڑا دے گا۔“

جھرجھری لے کر کاغذ رکھ دیا۔ اب پرنٹل اسٹنٹ کی باری تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی مولیا کورونا آ گیا۔

”یہ تو مجھ سے عمر میں بھی بڑا ہے اور قابلیت میں کہیں آگے ہے۔ امریکا کا پڑھا ہوا محنتی اور قابل نوجوان۔ اس کے سامنے میں بات بھی نہیں کر پاؤں گا۔“ اس کاغذ کو تو اس نے چھوا بھی نہیں۔ پھر اگلے کو دیکھا تو نگاہ ٹھہر گئی۔ دھیرے سے کاغذ اٹھا کے آنکھوں کے سامنے لایا۔ وہ ان تمام پروفاکٹلز میں پہلی نسوانی پروفاکل تھی۔

”تالیہ مراد۔“ وہ نام پڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ صفحے کے کونے میں اس کی تصویر بنی تھی۔ (تصویر آج کی لی ہوئی تھی جیسے کسی گھر کی چھت سے گلی میں چلتی لڑکی کی تصویر اتاری گئی ہو۔ وہ لمبا سا مقامی طرز کا فراک پہنے ہوئی تھی، کہنی پر نوکری لٹکی تھی جس میں پھول تھے اور وہ سر جھکائے کندھے کے پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ ماتھے پر سفید خوبصورت سا ہیٹ پہن رکھا تھا جس سے سیاہ بال نکل کر کندھے پر گر رہے تھے۔ جھکے سر اور ہیٹ کے باعث چہرہ واضح نہ تھا مگر رنگت گوری، نکھری ہوئی لگتی تھی۔) مولیا کی نظریں ٹاپ شدہ الفاظ پر جا رکیں جو حالم نے اس کی پروفاکٹنگ کرتے ہوئے لکھی تھیں۔

”تالیہ مراد۔ اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔ تین ماہ سے تنگو کامل کی ملازمت ہے.... زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، مگر انگریزی اور ملے زبان ٹھیک سے بول لیتی ہے۔ بہت باتونی لڑکی ہے۔ قدرے بے وقوف اور جلد باز۔ آدھا دن تنگو کامل کی ملازمت کرتی ہے اور شام میں ایک ریسٹورانٹ میں ویٹرس کے طور پر کام کرتی ہے۔ کشمیر میں اس کا لمبا چوڑا خاندان ہے جس کی کفالت یہی کرتی ہے۔ جو کماتی ہے وہیں بھیج دیتی ہے۔ خود عام کپڑوں اور جوتوں میں خوش باش گھوم رہی ہوتی ہے۔ تالیہ کو سوپ بنانے، احمقوں کی طرح بہت بولنے اور ہر چھپکلی، کا کروچ کو دیکھ کر چیخیں مار مار کے رونے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے جن کے پاس اچھی شکل اور دراز قد کے علاوہ

کوئی خصوصیت اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ نہ ذہانت، نہ تعلیم۔ اس کے باوجود تنگو کامل ہو یا سوپ پارلر والے، سب تالیہ سے محبت کرتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ ایک کم ذہن، کم علم اور سادہ سی لڑکی پہ سب اتنا اعتماد کیوں کرتے ہیں؟ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایماندار، سچ بولنے اور خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہے۔ انہی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی میں کبھی ترقی نہیں کر سکی اور نہ کبھی کر سکے گی۔“ وہ ایک بے رحمانہ تجزیہ تھا۔

مولیا کی پیشانی پہ افسوس کی لکیریں ابھریں۔ ”حالم کتنا بے مروت اور سفاک ہے۔ یا شاید مادہ پرست۔“ ابھی وہ کوئی اور تبصرہ کرتا لیکن صفحے کا آخری پیرا گراف پڑھ کے ٹھنک گیا۔

”تالیہ یہاں الیگل ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں آنے والے غیر قانونی پاکستانیوں میں سے ہے۔ اور یہی اس کی وہ کمزوری ہے جس کی بنا پہ اس کو ڈرایا دھمکایا جاسکتا ہے۔“

”اوہ تب ہی تنگو کامل نے اسے ملازمت دی۔ الیگل لڑکی یعنی کم تنخواہ اور مراعات۔ کنجوس تو وہ ہمیشہ سے تھا.... غیر قانونی تارک وطن....“ مولیا نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رگلت میں پھر سے سرخیاں گھل گئی تھیں اور فوٹو فریمز چھاؤں میں محفوظ دکھائی دیتے تھے۔

”مجھے اس لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔“ کار کی چابی اٹھاتے ہوئے اس نے تمام کاغذ سمیٹ کر فائل میں رکھے، ایک نظر لڑکی کے پتے پہ ڈالی اور فائل لئے اٹھا۔

”مجھے ان چند گھنٹوں میں اس لڑکی کے ذریعے باس کا ایپناپ واپس حاصل کرنا ہے۔“ وہ ایک عزم سے بابر کو بھاگا تھا۔

☆☆=====☆☆

سوپ پارلر میں دوپہر اپنی ساری حدت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ بیچنی کی خوشبو اور اشتہا انگیز دھوئیں سارے میں پھیلے تھے۔ کچن میں ایک ساتھ بہت سی چیزیں پک رہی تھیں۔

اندر جھانک تو دو ویٹر لڑے پہ برتن لگا رہے تھے۔ ایک ویٹر اس ایک پلیٹر پہ جھکی کھڑی اس میں رکھے ملغوبے کو سجا رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی ایپرن اور ٹوپی پہنے کھڑا سوپ کے دیگچے میں چیچ ہلارہا تھا۔ صرف وہ فارغ بیٹھی نظر آتی تھی....

خالی کاؤنٹر پہ چوکڑی کے انداز میں بیٹھی اس نے ایپرن پہن رکھا تھا اور بال ٹوپی میں مقید تھے۔ یہ واضح نہ تھا کہ وہ کتنے لمبے تھے مگر چہرہ بیضوی اور سرخ سفید سا تھا۔ سیبوں جیسے گال جن پہ مسکرانے سے ڈمپل پڑتا تھا۔ اور بڑی بڑی سبز آنکھیں۔ وہ ایشیائی نقوش والی پیاری سی لڑکی تھی اور اس وقت آنکھیں گھما کے سب کو دیکھتی مسکراتے ہوئے گنگنائے جا رہی تھی۔

دفعتاً دوسری ویٹر نے سر اٹھا کے اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔

”کتنا کام پڑا ہے اگر تم تھوڑا سا کر لو گی تو وزن نہیں کم ہو جائے گا تمہارا۔“

تالیہ گانا روک کے ہلکا سا ہنسی پھر آنکھیں سیدھی ویٹرس پہ جمائے بولی۔ ”میرے گانے سے سوپ میں ذائقہ آتا ہے۔ آپ لوگوں نے وہ مووی دیکھی ہے کنگ فو پانڈا؟ نہیں دیکھی؟ میں نے بھی نہیں دیکھی۔ لیکن سنا ہے اس میں ایک موٹا سا پانڈا تھا جو....“

”تم نے اپنی تنخواہ کا کیا کیا تالیہ؟“ بوڑھے شیف نے ایک دم اس کی طرف گھوم کے سختی سے سوال پوچھا تو تالیہ کی زبان رکی، لیکن مسکراہٹ برقرار رہی۔

”جب معلوم ہے کہ تنخواہ پاکستان بھیجتی ہوں تو پوچھتے کیوں ہو، پیارے اور موٹے سے بوڑھے؟“ وہ کہہ کے خود ہی ہنس دی تو باقی سب بھی ہنس پڑے۔ سوائے شیف کے جو خفگی سے اسے گھور رہے تھے۔

”لٹا دینا بردفعہ کی طرح اپنے خاندان پہ سب کچھ؟ اپنے لئے کیوں کچھ نہیں رکھتی؟“ وہ زچ ہوئے۔

”ارے ارے... میرے کون سے اتنے خرچے ہوتے ہیں۔ اور پھر اتنے سارے پیسوں کا میں نے کیا کرنا ہے۔ اونہوں۔ کھاؤ نہیں ایک۔“ اس نے بات کرتے کرتے کھلیراٹھایا اور ویٹر کے ہاتھ پہ مارا جو نوکری سے گاجر بے پرواہی سے اٹھا رہا تھا۔ ہاتھ پہ لگی تو اس نے بدمزگی سے تالیہ کو دیکھا جس نے نفی میں دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ”اونہوں۔ یہ مالک کی امانت ہے۔ ہم اسے نہیں کھا سکتے۔“

”بس بس تالیہ تم اپنی سچائی اور ایمانداری کو لے کر ہمیشہ ویٹرس کی ویٹرس ہی رہنا۔“ وہ برہمی سے ٹرے اٹھاتا باہر نکل گیا۔ تالیہ پھر سے ہنس دی اور کندھے اچکا دیے۔ پھر گردن موڑی تو ہیڈ شیف اسی طرح اسے ناراضی سے گھور رہے تھے۔ تالیہ نے مسکراہٹ دبالی۔

”تمہارے خاندان نے کیا تمہیں پیسہ کمانے والی مشین سمجھ رکھا ہے؟ تمہارا باپ اور بھائی خود کیوں کام نہیں کرتے؟ چلو ماں باپ تو ٹھیک ہے، بھائی بھابھی اور ان کے بچوں کا خرچہ بھی تم کیوں اٹھاؤ؟ کیا ان کو احساس نہیں ہوتا کہ تم ایک انسان ہو اور دو دو نوکریاں کر کے گزارا کرتی ہو؟“ غصے اور بے بسی کی حدت سے ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ تالیہ اداس ہوئی۔ ”ابو بیمار رہتے ہیں، بھائی کی نوکری سے گزارا نہیں ہوتا۔ بھابھی کے بچے ہیں وہ کام نہیں کر سکتیں.... اور وہ سب کوشش تو کرتے ہیں نا۔ پھر ان کا کیا قصور؟ اگر میں ذرا پڑھ لکھ جاتی تو کوئی نوکری کر لیتی اچھی سی۔ لیکن خیر....“ وہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”میرے کون سے خرچے ہیں یہاں۔ نہ پڑھائی وغیرہ کرنی ہوتی ہے، نہ بیمار پڑتی ہوں۔ اوپر سے ہوں بھی الیگل۔“

کھٹاک سے ڈوئی بوڑھے شیف نے اس کے کندھے پہ دے ماری۔ وہ بلبلا اٹھی۔ ”کیا ہے؟“ نزوٹھے پن سے چیختی بھی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے اس بات کا اعلان نہ کیا کرو۔ پولیس نے پکڑ لیا نا تو بری پھنسو گی۔“

”ہاں تو آپ کے سامنے ہی کہہ رہی ہوں کون سا کسی اور کو بتا رہی ہوں۔“ وہ کندھا سہلاتے ہوئے خفگی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ”اب الیگل ہوں تو اس میں میرا کیا قصور؟ ٹریول ایجنسی نے دھوکہ دیا تھا۔ مجھے تو یہاں آ کر علم ہوا۔ میرے تو پیپرز بھی انہوں نے رکھ لئے۔ خیر وہ تو انہوں نے دوسرے نام سے بنوائے تھے۔ غلطی میری اتنی ہے کہ میں نے اسی وقت عقل سے کیوں نہیں کام لیا۔ مگر مجھے نوکری چاہیے تھی

کندھا سہلاتا اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اداسی سے پلکیں جھک گئیں۔ ”اب اگر تنخواہ بھیج دیتی ہوں پاکستان تو کیا برا کرتی ہوں۔ ایک بھائی ہی تو ہے کمانے والا۔ اب فوج کی نوکری میں کہاں گزارا ہوتا ہے پانچ لوگوں کا؟“ اس نے سر جھٹک کر پانی کی بوتل نکالی اور بیٹھے بیٹھے منہ سے لگائی۔

معمرشیف نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ ”نرسنگ چھوڑ دی اس نے؟“ تالیہ نے پانی کا گھونٹ بوتل اوپر لے جا کر بھرا، پھر بوتل لبوں سے ہٹائی اور ڈھکن بند کرتے ہوئے ان کو دیکھ کر بولی۔ ”کہاں؟ فوج میں میل نرس ہے نا وہ۔ آپ کو تو میرے گھر والے اتنے برے لگتے ہیں کہ ان کی اچھی باتیں بھی بھلا دیتے ہیں آپ!“ آخر میں نروٹھے پن سے بولی۔ شیف چند لمحے تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

”تمہارے کوئی خواب نہیں ہیں تالیہ؟“ اس سوال پہ تالیہ جو گوتم بدھا کے انداز میں چوکڑی مارے کاؤنٹر پہ بیٹھی تھی، تھوڑی تلے انگلی رکھے اوپر دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”میرے خواب؟“

”ہاں تالیہ... تمہارا سب سے بڑا خواب کیا ہے؟“ ایک ویٹر واپس آ گیا تھا اور گفتگو میں پر جوش سا داخل ہوا تھا۔ ویٹرز، شیف، سب رک کر اسے دیکھنے لگے جو انگلی سے گال پہ دستک دیتی اوپر دیکھتی سوچ رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں چمکیں، اس نے ان سب کو دیکھا، اور چٹکی بجائی۔ ”ہے نا۔“

”کیا؟“ سب کام روکے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ تالیہ نے دانت سے نچلا لب دبائے بڑی بڑی سبز آنکھیں مسکرا کے چھپکیں۔ ”میرا سب سے بڑا خواب یہ ہے کہ میں ایک سوپ کارٹ دھکیلتے ہوئے شہر کی مصروف ترین سڑک پہ سوپ بیچ سکوں۔ میرا اپنا ذاتی سوپ کارٹ ہو اور لوگ میری بہترین ریسیپی والے سوپ کے دیوانے ہوں!“

کچن میں لمحے بھر کوسنا نا چھا گیا۔ شیف کا چہرہ سب سے زیادہ اتر اٹھا۔ ویٹرز تو جل بھن گئی۔

”ایک سوپ کی ریڑھی؟ بس تالیہ؟ بس؟“ ایک نے پیر پٹھا۔

تالیہ ڈر کے ذرا خفیف ہوئی۔ ”کچھ غلط کہا میں نے؟“

”لو کی تم نو جوان ہو، شکل کی بھی اچھی ہو، خود مختار ہو، اور تمہارے خواب اتنے محدود ہیں؟ سوپ کی ریڑھی... اف تالیہ... اف۔“ ویٹرز نے ٹرے اٹھائی اور پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

”ارے ارے... تمہیں معلوم بھی ہے ایک کارٹ کتنا ہنگامتا ہے بات تو سنو۔“ وہ پیچھے سے پکارنے لگی۔

”تالیہ کیا تم دوسروں کی طرح اونچے اونچے خواب نہیں دیکھتی؟“ شیف نے دیگچہ ڈھکا اور اس کے سامنے آ کر حوصلہ افزاء انداز میں پوچھنے لگے۔ ”کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تمہارا اونچا ساحل ہو، جس میں تم ملکہ کی طرح رہو، تمہارے پاس دولت کا ڈھیر ہو، شہزادوں سا شو بہر ہو، تمہیں کوئی کام نہ کرنا پڑے، نوکر چاکر ہوں، تم جس شے کو ہاتھ لگاؤ وہ سونا بن جائے۔ تالیہ مراد کیا تم ایسے خواب نہیں دیکھتی؟“

تالیہ نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دائیں بائیں نفی میں گردن ہلائی۔ ”نہیں تو۔“

بوڑھے شیف کی ساری خوش اخلاقی ہوا ہو گئی۔ ماتھے کو چھوا، اسے غصے سے کوسا اور کام کی طرف پلٹ گئے۔ تالیہ کندھے اچکا کر پھر سے ہنس دی۔

”میں تو ایک عام سی لڑکی ہوں۔ نہ میری تعلیم ہے، نہ کوئی اعلیٰ خاندان۔ مجھے خوابوں میں دلچسپی ہے نہ مردوں میں۔ بس تنگو کامل کے گھر سے ریسٹورانٹ اور ریسٹورانٹ سے ان کا گھر... میری زندگی جب ان ہی دونوں چکروں میں کٹ جاتی ہے تو کیا کرنا ہے میں نے لمبے لمبے خواب دیکھ کر۔ اپنے لئے کماتی ہوں، کھاتی ہوں اور گھر والوں کو کھلاتی ہوں۔ میں تو بہت خوش ہوں ایسے۔ میری زندگی میں کوئی مسئلہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔“ وہ بے فکری سے ہنس مکھ سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

شیف مزید اسے کچھ سخت سست سناتے کہ ایک ویٹر تیزی سے اندر آیا۔

”تالیہ... تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“

”مجھ سے؟“ تالیہ نے انگلی سینے پر رکھ کے آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔

”ہاں۔ سوٹ وغیرہ پہن رکھا ہے۔ پوچھ رہا تھا تم تنگو کامل کی ملازمہ ہونا؟“

”اوہ۔“ تالیہ کی سبز آنکھیں چمکیں۔ ”میں سمجھ گئی۔“ وہ جلدی سے نیچے اتری، جوتے پیروں میں گھسیڑے (ویٹرس نے ناک سکوڑ کے اس کی اس حرکت اور خالی سلیب کو دیکھا۔ صفائی، تمیز، آداب، سب خاک میں مل جاتے تھے اس کی وجہ سے۔) اور باہر کو لپکی۔ کیپ سر سے اتار دی تھی، سیاہ بال جو کندھوں تک آتے تھے اس وقت پونی میں بند تھے۔ وہ ہاتھوں سے سامنے کے بال درست کرتی آگے چلتی آئی۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

کونے کی میز پر مولیا بے چین سا بیٹھا تھا۔ چینی نقوش کا حامل وہ درمیانے قد کا نوجوان تھا، اور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پریشان لگتا تھا۔ دفعتاً نظر اٹھائی تو دیکھا، سامنے سے ایک ویٹر چلتی آرہی ہے۔ حالم کی دی گئی تصویر میں اس کی شکل واضح نہ تھی مگر وہ پہچان گیا۔ البتہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ چہرے کو بھی سنجیدہ بنالیا۔ وہ سامنے آئی تو اس نے کرننگی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”بیٹھو! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

وہ اس کے سامنے بیٹھی۔ کہنیاں میز پر رکھیں، ہتھیلیوں پر چہرہ گرایا اور دلچسپی سے اس کو دیکھا۔ ”بولیے۔“

مولیا قدرے رعب سے کھٹکھٹا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”تم تنگو کامل کی ملازمہ ہونا؟“

”یعنی کہ میرا اندازہ درست تھا۔“ وہ ہلکا سا ہنس دی۔ ”آپ تنگو احمد کامل (تنگو کامل کے بیٹے کا نام) کی سالگرہ کی تقریب میں تھے

شاید اور میرا سوپ پیا تھا نا آپ نے۔ اور اب آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ میں آپ کے لئے کام کروں مگر میں....“

”تم ملائیشیا میں الیگل ہوئے نا؟“ وہ سختی سے بولا تو وہ ٹھہر گئی۔ مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ سبز آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”آپ کو کیسے....“

”دیکھو میں لمبی بات نہیں کرنے آیا لیکن اگر ابھی میں جا کر پولیس کو اطلاع کر دوں کہ تم یہاں الیگل ہو تو یہ سوپ پارلر کا مالک تو چھوڑو سنگو کامل بھی مشکل میں پھنس جائے گا۔“

تالیہ کے ہونٹ کھل گئے۔ ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔ پھر آنکھوں میں افسوس ابھرا۔

”آپ ایسا کیوں کریں گے؟ میرے ساتھ ٹریول ایجنسی نے دھوکا کیا تھا۔ اور پھر میں نے اپلائی کر رکھا ہے قانونی.....“

”تم جانتی ہو میں تمہیں ابھی کے ابھی جیل میں ڈلواسکتا ہوں۔“ وہ آگے کو جھکا اور اس کو گھورتے ہوئے غرایا۔ وہ ہلکا سا چونکی۔

”آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟“

مولیا نے گہری سانس لی اور فائل کھولی۔ پہلے صفحے پہ تالیہ کی پروفائل (رپورٹ) رکھی تھی۔ تالیہ نے سر جھکا کے دیکھا تو آنکھیں پھیل گئیں۔ بے یقینی سے پلکیں اٹھائیں۔ ”میرے بارے میں آپ کو اتنا کچھ.....؟“ اب کے وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی۔ چونکی سی۔ قدرے پیچھے بھی ہوئی۔ ”کون ہیں آپ؟“

مولیا نے اگلا صفحہ پلٹا اور ایک تصویر نکال کے اس کے سامنے رکھی۔ ”یہ تمہارے گھر والوں کی تصویر ہے نا، کشمیر میں رہتے ہیں وہ۔ جانتی ہو میں ان کے بارے میں کیسے جانتا ہوں؟ کیونکہ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“ اس کی طرف جھکے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا چبا چبا کے کہہ رہا تھا۔ تالیہ کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ وہ مزید پیچھے ہوئی پھر گردن گھما کے دیکھا۔ ارد گرد لوگ کھانے پینے اور باتوں میں مصروف تھے۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ خوفزدہ لڑکی نے پھر سے مولیا کو دیکھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”تمہارے اوپر قرضہ بھی ہے۔ بھائی کی شادی کے لئے لیا تھا نا؟ وہ کیسے اتارو گی؟ کبھی سوچا؟“

”آپ کو مجھ سے کیا چاہیے۔“ وہ شدید غیر آرام دہ نظر آ رہی تھی۔

”دیکھو تالیہ.....“ مولیا نے آواز دھیمی کی۔ لہجہ نرم کیا۔ لمحے بھر کے لئے بھی وہ لڑکی کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ ”اگر تم چاہو تو میں تمہارا قرضہ بھی اتار سکتا ہوں، مزید رقم بھی دے سکتا ہوں اور تمہاری فیملی کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ بات نہیں مانو گی تو تمہارے ماں باپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور تم الیگل ہونے اور جیل چلے جانے کے باعث ان کی مدد بھی نہیں کر پاؤ گی۔ اب بتاؤ میری مدد کرو گی؟“

”کیسی مدد؟“ وہ ابھی۔ رنگت قدرے بحال ہوئی۔

”تمہارے مالک تنگو کامل نے میرا پناپ چرایا ہے اور مجھے وہ واپس چاہیے۔ یہ اس کی تصویر ہے۔“ اس نے کھلی فائل سے ایک اور کاغذ نکال کر سامنے رکھا تو نیچے رکھے ایک کاغذ کا کونا باہر کو سرک آیا۔ تالیہ نے گردن میڑھی کر کے پڑھا۔ نچلے کاغذ کو جس پہ ایک ہی فقرہ کسی نے بار بار پین سے لکھا ہوا تھا۔

”حالم کے ایل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے اور میں آئندہ.....“ مولیا نے ایک دم ہڑبڑا کے کاغذ اندر ڈالا۔ تالیہ نے چونک کے اسے

دیکھا۔ ”آپ نے کسی حالم نامی اسکام انوسٹی گیٹر کو ہار کیا ہے میری چھان بین کے لئے؟“ آواز میں ہلکا سا غصہ در آیا۔

”میری بات دھیان سے سنو۔“ اس نے دوسرا کاغذ سامنے کر کے فائل بند کر دی۔ (سوال نظر انداز کر گیا۔) ”یہ اس لیپ ٹاپ کی تصویر ہے اور یہ تنگو کال کے گھر میں موجود ہے۔ میرا لیپ ٹاپ چرایا ہے انہوں نے۔ تم مجھے یہ واپس لا کر دو گی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم جانتی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ چاہتے ہیں میں چوری کروں؟“ وہ الجھن سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔ جو انہوں نے چوری کیا مجھ سے اس کو واپس چوری کرو۔ میں تمہیں ایک خطیر رقم دوں گا اور نیشنلیٹی لینے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔“

”میں اپنے مالک کے گھر چوری کروں؟ اپنے مالک کے گھر؟“ اس نے انگلی سینے پہ رکھ کے افسوس سے پوچھا۔ مولیا نے بے صبری سے جھٹ سر ہلایا۔ ”ہاں....“

تالیہ نے تاسف بھری سانس کھینچی اور سر جھٹکا۔ ”پھر آپ ایسا کریں پولیس کو بتا دیں جو بھی بتانا ہے کیونکہ تالیہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہیے ہیں۔ میں اپنے مالک کو دھوکا نہیں دوں گی۔“ وہ سادگی سے کہہ کر کھڑی ہو گئی۔ مولیا بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

”سب یہی کہتے ہیں کہ ہمیں پیسے نہیں چاہئیں اس سے پہلے کہ انہیں چند صفر بڑھا کے رقم دی جائے۔ یہ میرا نمبر رکھ لو۔ تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ذہن بدلے تو مجھے کال کرنا۔ لیکن اگر پولیس یا تنگو کال کے پاس جانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا....“ اس نے اپنا موبائل لہر کے دکھایا۔ ”میں نے تمہاری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے جس میں تم نے الیگل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر مجھے میرا لیپ ٹاپ نہ ملا تو میں اس گفتگو کو کیسے استعمال کر سکتا ہوں تمہاری سوچ ہے۔ ایک گھنٹہ۔“ ایک کاغذ کی چٹ اس کی طرف بڑھائی۔ جب وہ نہیں ملی تو مولیا نے اسے زبردستی اس کے ایپرن کی جیب میں ڈال دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد وہ کچن سے تیز تیز اپنی چیزیں سمیٹتی دکھائی دے رہی تھی۔ ارد گرد کھڑے شیف اور ویٹرز بار بار پوچھ رہے تھے۔ ”تالیہ کیا ہوا ہے.... کیوں جا رہی ہو؟“ مگر وہ بار بار آنسو رگڑتی سرنفی میں ہلائے جا رہی تھی۔ ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

کار میں بیٹھتے ہوئے مولیا نے دروازہ زور سے بند کیا اور چند لمحے کھڑکی سے باہر سڑک پہ بہتارش دیکھتا رہا۔ بے فکر سیاح گھوم رہے تھے۔ کھانوں کی خوشبو۔ بازار کا رش۔ وہ مضطرب ساسارے کو بے دھیانی سے دیکھتا رہا پھر فون نکال کے کال ملائی۔

”بولو!“ حالم کی کھروری خشک آواز سنائی دی۔

”میں نے ان تمام ملازموں میں سے تالیہ کو چنا۔ تالیہ مراد کو۔“

”گڈ۔ میں ذرا مصروف ہوں تو....“

”وہ اچھی لڑکی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ اسے اتنا برا ساں کیا۔ وہ سچی اور ایماندار ہے۔ وہ کبھی چوری نہیں کرے گی۔ اس نے انکار کر دیا

ہے عالم!“ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”رقم بڑھا دو۔“ وہاں بے نیازی تھی۔

”تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟ وہ ایک ایماندار اور سچی لڑکی ہے۔ سادہ اور معصوم!“

”یہ سب اندر سے ایک سی ہوتی ہیں۔ یہاں کوئی سچا یا ایماندار نہیں ہے مولیا۔ پیسے بڑھا دو وہ فوراً مان جائے گی۔“ عالم کو جیسے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ مولیا کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری۔

”یہ تمہارا تجربہ بول رہا ہے کیا؟ کسی لڑکی نے دھوکہ دیا ہے تمہیں یوں لگتا ہے۔“

جواب میں چند لمحے خاموشی چھا گئی۔ گہری خاموشی۔ پھر عالم کا زوردار قہقہہ گونجا۔ مولیا نے گڑبڑا کے فون کان سے ذرا دور کیا۔

”ارے مولیا.... تمہارا مینٹل کیلر میرے پاؤں سے بھی نیچے ہے۔ میرے بارے میں اندازے نہ لگاؤ اپنا لپ ناپ ڈھونڈو۔“ پھر سے ہنسنے کی آواز آئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ مولیا بد مزگی سے کچھ بڑبڑایا تھا۔

☆☆=====☆☆

تنگو کامل کا گھر تین منزلہ تھا۔ خوبصورت اور پر تعیش۔ تالیہ نے دروازہ کھولا تو سنہری وال پیپر سے سجی لابی دکھائی دی جس سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ ایک طرف لالچ میں کھلتا دروازہ تھا۔ سامنے ایک باور دی ملازم کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے حیرت سے قریب آیا۔

”تالیہ.... تمہارے ڈیوٹی آورز تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئے پھر....؟“

”سرگھر پہ ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ ابھی۔“ وہ بے چینی سے بولتی آگے آئی تھی۔ ملے طرز کی سیدھی لمبی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے وہ ریسٹوران سے مختلف لباس میں تھی۔ بال ہیز بینڈ لگا کے کھول رکھے تھے جو سیاہ تھے اور کندھوں تک آتے تھے۔ سبز آنکھوں میں پریشانی تھی۔

”تالیہ سراسٹڈی میں ہیں۔ تمہیں اگر تنخواہ وغیرہ چاہیے تو میم سے بات کرو مگر وہ بھی کل صبح....“

”پلیز مجھے ابھی سر سے ملنا ہے۔ صرف پانچ منٹ کے لئے۔“ وہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھی اور سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ملازم آوازیں دیتا رہ گیا اور وہ یہ جاوہ جاؤ پر بھاگ گئی۔

اوپر بھی اسی طرح کی لابی بنی تھی۔ سامنے کھلا سالانچ تھا۔ ایک طرف اسٹڈی کا بند دروازہ۔ تالیہ نے جلدی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور دھکیلا۔

اسٹڈی روم میں میز کے پیچھے کرسی پہ ایک ادھیڑ عمر چینی نقوش والے صاحب بیٹھے سامنے کھڑے نوجوان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ آہٹ پہ دونوں نے مڑ کے دیکھا۔ تالیہ نے خفت اور پریشانی سے سر دروازے سے نکال کے ان کو دیکھا۔

”سر میں آ جاؤں؟“

وہ نوجوان جو تنگو کامل کا پرسنل سیکرٹری تھا، منہ بنا کے منع کرنے والا تھا مگر تنگو کامل نے تکلفاً مسکرا کے اسے اشارہ کیا۔ ”آ جاؤ تالیہ“ سیکرٹری چپ ہو گیا۔ تالیہ جھجھکتی نظریں جھکائے اندر داخل ہوئی۔ ان کے عین سامنے آکر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ ”سر مجھے بات کرنی تھی۔“ وہ مسلسل انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

”ہاں بولو، مگر ذرا جلدی۔“ انہوں نے کہنے کے ساتھ گھڑی دیکھی۔

”سر... میرے ریسٹورانٹ... ایک آدمی آیا آج۔ اس نے مجھے کہا کہ میں آپ کے گھر چوری کروں۔“ وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بتاتی گئی۔ تنگو کامل چونک کے آگے ہوئے۔ سیکرٹری کا بھی منہ کھل گیا۔ جب تک اس نے بات مکمل کی، وہ دونوں ہر شے بھول چکے تھے۔

”اس نے بتایا وہ کون تھا؟“

”کس کے لئے کام کرتا تھا؟“

”نام کیا تھا؟“ تاہو تو سوالات کی تیز بو چھاڑ سے لڑکی قدرے برا ساں نظر آنے لگی۔ پھر بظاہر ہمت کر کے گردن کڑائی۔ ”نام نہیں بتایا اس نے سر، لیکن اتنا ضرور کہا کہ اس کا ایپ ٹاپ آپ کی اسٹڈی میں ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ کسی کا ایپ ٹاپ چوری نہیں کر سکتے۔ ہے نا؟“ تاہو سیدی نظروں سے اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ سیکرٹری نے فوراً مالک کو دیکھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ ہم کیوں چرائیں گے؟ بلکہ ہو سکتا ہے وہ تمہارے ہاتھوں میرا کمپیوٹر چوری کروانا چاہتا ہو۔“ تنگو کامل تالیہ کو دیکھ کر پورے وثوق سے بولے تو اس نے تسلی بھری سانس خارج کی۔

”نہیں سر، اس نے مجھے ایپ ٹاپ کی تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ وہ آپ کے جیسا نہیں تھا۔ سفید سا تھا۔ اس نے بولا یہیں ہے وہ....“ تالیہ نے ایک طائرانہ نگاہ اطراف پھرائی۔

”تم نے بہت اچھا کیا تالیہ جو مجھے آگاہ کر دیا۔“ وہ توصیفی انداز میں اسے دیکھ کے بولے تھے۔ وہ مسکرا دی۔ سیکرٹری تیزی سے بک شیلف کی طرف گیا اور باری باری دراز کھولنے لگا۔ کتابیں ادھر ادھر پلٹائیں۔

”ہو سکتا ہے کسی نے ہمارے اوپر ایپ ٹاپ پلانٹ کیا ہو، ہمیں اسے فوراً ڈھونڈنا ہو گا۔“ تنگو کامل سوچتے ہوئے بولے تھے۔ سیکرٹری نے سر ہلادیا۔ وہ تیز تیز چیزیں الٹا پلٹا رہا تھا۔ دفعتاً انہیں تالیہ کا خیال آیا۔

”تم پیسے لے سکتی تھیں، مگر تم نے مجھے کیوں بتایا؟“ اس نے پلکیں اٹھائیں۔

”سر اگر انسان میں وقاداری، سچائی اور ایمان ہی نہ ہو تو وہ کیسا انسان ہوا؟ باقی ساری خوبیاں اور ڈگریاں سب کے پاس ہوتی ہیں۔ مگر سچائی سیکھی نہیں جاتی۔ یہ تو انسان کی گھٹی میں ہوتی ہے۔“

دراز کھولتے، بند کرتے سیکرٹری نے پلٹ کے درزیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور اونچا سا بولا۔ ”سر یہ اس کا فرض تھا کہ آپ کو رپورٹ کرتی۔ اگر محترمہ چوری کرتیں تو ظاہر ہے ہمیں پتہ چل جاتا، اور اس آدمی کی بھی کارنی نہیں تھی کہ پیسے دے گایا نہیں۔“ آواز میں جلن تھی۔

تالیہ کا چہرہ بچھ گیا، البتہ تنگو کامل نے ایک ناپسندیدہ نظر سیکرٹری پہ ڈالی۔

”اگر جھوٹ بولنا ڈس کریڈٹ ہے تو سچ بولنے کا کریڈٹ دینے کی بھی عادت ڈالنی چاہیے، منگ۔“

”نسر!“ وہ ایک دم بولی تو وہ جوا سے جھڑک رہے تھے، تالیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا؟“ ترمی سے پوچھا۔

”مجھے یاد آیا، اس کے پاس ایک کانغذ پہ کسی scam انو-سٹی گیٹر کا نام لکھا تھا۔“ تالیہ نے آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ ”حالم.... یہی نام تھا

اس کا۔“ اس نے اب کے جوش سے تنگو کامل کو دیکھا۔ ”اس نے میری معلومات اسی انو-سٹی گیٹر سے لی تھیں۔“

”حالم؟ ہوں۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ سیکرٹری منگ ہاتھ جھاڑتے ہوئے واپس آیا۔ ”نہیں ملا سر۔ کچھ بھی نہیں ہے

یہاں۔“

”تو اس حالم نے کیوں کہا اس آدمی کو کہ اس کا لیپ ناپ یہیں ہے؟ اسی نے بتایا ہو گا یقیناً۔“ وہ متفکر نظر آ رہے تھے۔

”میں نے حالم کا نام پہلی دفعہ سنا ہے، لیکن میں اس کی تحقیق ضرور کروں گا۔“ منگ پورے عزم سے کہہ رہا تھا۔ ایک دم تنگو کامل نیچے کو

جھکے اور کچھ کھولنے لگے۔ آواز سے یوں لگتا تھا کہ جیسے اسٹڈی ٹیبل کے نچلے خانے میں رکھا کوئی سیف کھول رہے ہوں۔ پھر انہوں نے

سیف سے چیزیں نکال نکال کر اوپر رکھنی شروع کیں۔ گن.... کانغذات.... جیولری کے بند ڈبے۔

سیکرٹری نے تالیہ کو فوراً رعب سے کہا۔ ”تم ابھی جاؤ۔“ وہ سر جھکائے مڑنے لگی تو تنگو کامل نے چند مزید چیزیں میز پہ رکھتے ہوئے نفی میں

سر ہلایا۔

”تم رکو تالیہ۔“ وہ اپنا سیف خالی کر رہے تھے۔ وہ دونوں سیف تو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ان چیزوں کو دیکھ سکتے تھے جو وہ میز پہ ڈھیر کر

رہے تھے۔ زیورات کے ڈبے۔ فالٹز۔ چند چیک بکس۔ اور ایک شیشے کا ڈبہ جو گھڑی کے ہاکس کے جیسا تھا اور اس میں ایک سنہری سکہ

چمک رہا تھا۔ پھر انہوں نے وہ چیزیں واپس ڈالنی شروع کیں۔ سیف بند کرنے کی آواز آئی۔ وہ سیدھے ہونے لگے، پھر جیسے کوئی خیال آیا

اور اسٹڈی ٹیبل کا اوپری دراز کھولا۔

اندر سامنے ایک سفید لیپ ناپ رکھا تھا۔

تالیہ کا منہ کھل گیا۔ ”یہ یہاں.... واقعی....؟“

”یہ ہم نے نہیں چوری کیا۔ یقین رکھو۔“ انہوں نے گہری سانس لے کر اسے تسلی کروائی۔ اور لیپ ناپ سیکرٹری کی طرف بڑھایا۔

”یہ کسی نے ہمیں پھنسانے کے لئے یہاں رکھا ہے۔ دیکھو اوپر ان کی کمپنی کا لوگو بھی بنا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ کس کا ہے۔“ تنگو کامل اور

سیکرٹری نے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔

”نسر۔ ہمیں پولیس کو کال کرنی چاہیے۔ میں مسز کامل سے کہتی ہوں۔“ وہ جذباتی سی ہو کر دروازے کی طرف لپکی۔

”رکو رکو۔ کیا کر رہی ہو۔ تالیہ۔ اوہو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو وہ الجھن سے واپس مڑی۔ ”پولیس کونہ بلائیں؟“

”نہیں، پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس میں ہے کیا۔“

”لیکن سر جب یہ ہماری چیز ہی نہیں ہے تو ہم کیوں دیکھیں اسے؟“

”بھی اصل مالک کا معلوم کرنے کے لئے دیکھنا تو ہوگا نا۔“ انہوں نے جلدی سے اسے تسلی کروائی پھر سیکرٹری کو اشارہ کیا تو وہ لیپ ٹاپ لے کر دوسری کرسی کھینچے بیٹھ گیا۔ تالیہ گولگوں کیفیت میں کھڑی رہی۔

”تم نیچے جاؤ اور میرے لئے اچھا سا سوپ بنا کر لاؤ، پھر میں بتاتا ہوں کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔“ تالیہ نے کچھ چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا اور باہر نکل گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سوپ کی ٹرے لئے اسٹڈی میں داخل ہوئی تو وہ دونوں تیار سے بیٹھے تھے۔ لیپ ٹاپ شاٹنگ بیگ میں ڈال رکھا تھا۔ تالیہ نے ادب سے سوپ ان کے سامنے سجایا۔

”تم نے کہا اس نے تمہیں اپنا نمبر دیا تھا، ہے نا؟“

”جی سر۔ میرے ایپرن میں رکھا ہے۔“

”تم اس کو کال کر کے سوپ پارلر بلاؤ اور یہ اس کو دے دو۔ ہم نے چیک کر لیا ہے، یہ اسی کا ہوگا۔ کسی سازش کے تحت کسی نے اسے ہم پر پلانٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پولیس ہماری بات مانے گی نہیں۔ اس لئے چپ چاپ اسے واپس کر دو۔“

تالیہ نے غیر آرام دہ سی ہو کر ان دونوں کو دیکھا۔ ”مگر سر.... یہ یہاں آیا کیسے ہے؟ اور میں کس طرح؟.... وہ تو سمجھے گا میں نے چوری کی ہے۔“

”تو سمجھنے دو نا۔ اور وہ جو پیسے دے وہ رکھ لینا۔ تمہارے کام آئیں گے۔“

”میں پیسے نہیں رکھوں گی۔“ وہ بدک گئی۔

”رکھ لینا تالیہ، ورنہ وہ سمجھے گا کہ تمہیں ہم نے بھیجا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس میں انوالوڈ ہیں۔ ٹھیک ہے؟“ سیکرٹری اب خوشامدی انداز میں سمجھا رہا تھا۔ تالیہ کی آنکھوں کے کنارے بھینگنے لگے۔

”میں اس کو چور لگوں گی سر۔ تالیہ چور نہیں ہے۔“

”ہم جانتے ہیں یہ بات تالیہ۔ اور ہم تمہیں اس کام کی اجازت دے رہے ہیں اس لئے دل سے کسی بھی گلٹ کو نکال کر یہ اسے واپس کر دو۔ یہ تمہارے مالک کا حکم ہے۔ ٹھیک ہے؟“

تالیہ نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور سر اثبات میں ہلایا۔

”اور یہ تمہارا انعام ہے۔“ انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھائی۔ جسے سیکرٹری منگ نے ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ تالیہ نے جیسے بے دلی سے وہ نوٹ اٹھائے تھے۔

جب وہ لیپ ٹاپ لے کر باہر نکلی تو پیچھے سے تنگو کامل نے سیکرٹری کو تنبیہ کی سے مخاطب کر کے کہا۔ ”اس بے وقوف پہ نظر رکھنا۔ کہیں اس کو

”جگ نہ بتادے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن اگر آپ مجھے کچھ وقت دیتے تو میں اس لیپ ٹاپ کو keylog بھی کروا دیتا۔ یہ ہمارے حریف کا لیپ ٹاپ ہے۔ وہ جو بھی کام اس پہ کرتا ہم اس کو دیکھ سکتے اور.....“

”فائلز کا پی کر لیں ہم نے، یہی بہت ہے۔ اور ہاں پتہ لگاؤ یہ یہاں آیا کیسے؟“ ان دونوں کی آوازیں مدھم سرگوشیوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

”مگر سر انعام کے طور پہ تالیہ کو اتنی خطیر رقم دینا غلط نہیں ہوگا؟“ وہ ذرا جذباتی ہو کے بولا۔

”زیادہ بک بک نہ کرو۔ جو چیز اس کے توسط سے ملی ہے ہمیں اس کی قیمت لاکھوں کروڑوں میں ہے۔“ وہ اسے ڈپٹ رہے تھے۔

اور تالیہ سر جھکائے، لیپ ٹاپ سینے سے لگائے سیڑھیاں اتر رہی تھی ایسے کہ اسے بار بار گالوں پہ آئی نمی کورگڑنا پڑ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

سوپ پارلر پہ معمول کارش تھا۔ مغرب اتر چکی تھی بابر برآمدے میں لگی کرسیوں پہ بھی مہمان بیٹھے کھاپی رہے تھے۔ سارے بازار میں رونق میلہ سا لگا تھا۔ ایسے میں سڑک کنارے ایک میز پہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور گود میں شاپنگ بیگ میں رکھا لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ دفعتاً دوڑتے قدموں کی آواز آئی، پھر سامنے والی کرسی کھینچ کے کوئی بیٹھا۔ تالیہ نے گلابی متورم آنکھیں اٹھائیں۔ وہ خوشی سے متمتاتے چہرے والا مولیا تھا۔

”مجھے پتہ تھا.... مجھے پتہ تھا تم اچھی لڑکی ہو، میرا کام کر دو گی۔ لیپ ٹاپ لائی ہو؟“ اس کی آنکھوں میں ڈر، خوف اور فتح کے ملے جلے تاثرات تھے۔ تالیہ نے اثبات میں سر اوپر نیچے ہلایا۔

”اوکے.... مگر ہاں.... پہلے تمہارے پیسے۔“ اس نے جلدی سے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا۔ ”گن لو۔“

تالیہ نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، پھر لفافہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور لیپ ٹاپ میز پہ۔ مولیا نے بے قراری سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور کھول کے دیکھا۔ سکون سا اس کے چہرے پہ پھیلنے لگا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ تھینک یو تالیہ۔“

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ دور کھڑی کار میں سے ان پہ نظر رکھتے سیکرٹری منگ نے بھی تشفی بھرا ایک مسیج اپنے باس کو لکھا۔

”بے فکر رہیں۔ تالیہ نے اسے کچھ نہیں بتایا۔“

”سوری تالیہ.... میں نے تمہیں اتنا پریشان کیا۔“ پریشانی کی دھند چھٹی تو مولیا نے افسوس سے کہنا چاہا۔ مگر تالیہ مراد نے ہاتھ جھلا کے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود بیگ میں رقم ذاتی چہرے پہ ناگواری، بے بسی اور غصہ لئے سوپ پارلر کی طرف بڑھ گئی۔

”خیر....“ مولیا نے لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے پیچھے سے بلند سا کہا۔ ”میرے دوست نے ٹھیک کہا تھا، رقم بڑھا دو تو تم سب ایک سی ہوتی

ہو۔ یہاں کوئی سچا اور ایماندار نہیں ہے۔“

وہ آگے بڑھتے بڑھتے رکی اور پلٹ کے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا، لیکن لب سختی سے بند رکھے اور پھر مڑ گئی۔

رات پھیل رہی تھی۔ مولیا کا دن بالآخر کامیابی لے آیا تھا۔ سیکرٹری منگ نے کار آگے بڑھا دی اور مولیا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ ان دونوں کو اور ان کے باسز کو مطلوبہ چیز مل گئی تھی اور وہ سب مطمئن تھے۔

ایسے میں تالیہ مراد سوپ پارلر میں آئی، اپنا استعفیٰ لکھ کر کاؤنٹر پہ جمع کرایا اور اسی خاموشی سے وہاں سے نکل گئی اس سے پہلے کہ کوئی اس کو روک کے وجہ پوچھ لے۔

بیگ میں دو مختلف نوٹوں کی گدیاں اٹھائے وہ بس اسٹاپ تک آ گئی۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد بس اس کو کے ایل کے مختلف مقامات سڑکوں اور گلیوں سے گزرتی ایک شاہانہ طرز کے علاقے میں لے آئی۔ وہ اسٹاپ سے اتری اور بیگ سنبھالتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ایک کالونی میں آگے بڑھتی گئی۔

چند منٹ کی واک کے بعد وہ بالآخر ایک گیٹ کے سامنے رکی۔ گیٹ کھلا تھا۔ تالیہ نے اندر قدم رکھا۔ سامنے رات کی تاریکی میں یسٹ پوسٹس سے جگمگا تالاں دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت نفیس تراشیدہ سالان اور اس کے اختتام پہ اونچا سا کھڑا بنگلہ۔ وہ بیگ کندھے پہ ڈالے آگے چلتی آئی، چلتی آئی.... یہاں تک کہ برآمدے کی سیڑھیاں عبور کر کے اونچے داخلی دروازے تک جا کر کی۔ پھر بیل بجائی اور بند مٹھی سے دھپ دھپ دستک دی۔

بھاری قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ تالیہ نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے بھاری بھر کم جتنے والی سیاہ رنگت کی عورت کھڑی تھی۔ عمر کافی زیادہ تھی۔ پچاس پچپن کے نگ بھگ۔ بال موٹی موٹی گھنگریالی لٹوں کی صورت کندھوں تک آتے تھے اور اس نے کھلے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چوکھٹ پہ بازو جمائے اس نے خشکیوں نگاہوں سے سامنے کھڑی ویٹرس کے یونیفارم والی لڑکی کو دیکھا اور استفہامیہ ابرواٹھائی۔ ”ہوں؟“

تالیہ نے نظریں جھکا دیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”آج تالیہ نے اپنا سب کچھ کھودیا۔ اپنا وقار، اپنا ایمان، اپنی سچائی، اپنی عزت.... میں نے ہر شے کوچھ ڈالا۔ میں نے.... تالیہ مراد نے اپنے ضمیر کا سودا کر لیا۔“

سیاہ موٹی عورت نے سر سے پیر تک اسے دیکھا اور بنا کوئی اثر لئے سنجیدگی سے بولی۔ ”کتنے میں؟“

تالیہ کی پلکیں بنوز جھکی تھیں۔ اس سوال پہ چند لمحے وہ نہیں بلی، پھر ایک دم پلکیں اٹھائیں تو ان میں آنسو غائب تھے اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”سات لاکھ میں۔“ وہ چہکی اور دونوں ایک دم ہنس پڑیں۔

”اب سامنے کھڑی رہو گی یا مجھے میرے گھر میں داخل بھی ہونے دو گی؟“ وہ ایک دم مصنوعی خفگی سے بولی تو فرہہ عورت مسکرا کے

سامنے سے ہنسی اور ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔

”ویلم ہوم، تالیہ۔ یا شاید مجھے کہنا چاہیے.... ویلم ہوم، عالم!“ تالیہ نے مسکرا کے بیگ اس کے بازوؤں میں تقریباً پھینکا اور مانوسیت بھری شان سے اندر داخل ہو گئی۔

اندر خوبصورت سلاؤنچ تھا جس کے آگے اوپن کچن تھا۔ وہ پھولوں، پینٹنگز اور اونچے وال مورلز سے سجا ایک اعلیٰ درجے کا گھر لگتا تھا۔
”کیسا ہا Scam (فراڈ؟) بے بی گرل؟“ سیاہ فام عورت بیگ اٹھائے اس کے پیچھے آئی تو وہ لاؤنچ کے وسط میں کھڑی ایڑیوں پہ چاروں طرف گھومتی، مسکرا مسکرا کے اپنا گھر دیکھ رہی تھی۔ اس سوال پہ مڑ کے اسے دیکھا اور کھلکھلا کے ہنس دی۔

”پرفیکٹ۔ تین تین دفعہ ہیمنٹ وصول کی ہے۔ ایک دفعہ اس بے وقوف مولیا سے عالم بن کے۔ ایک دفعہ تالیہ بن کے۔ اور ایک دفعہ اپنے کھڑوس باس سے ایمانداری کے انعام کے طور پہ۔ لیکن میں بتا رہی ہوں، آج کے بعد میں نے اس مولیا کے ساتھ کام نہیں کرنا۔“ وہ حتیٰ لچھے میں کہتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ آنکھوں میں جیسے کچھ یاد آنے پہ غصہ در آیا۔
عورت نے کمر پہ ہاتھ رکھ لئے اور آنکھوں میں حیرت لئے اسے دیکھا۔

”مولیا تو اتنا اچھا کلائنٹ ہے۔ اس کو تین دفعہ لوٹ چکے ہیں ہم۔ بے چارہ سب کی طرح تمہیں یعنی عالم کو Scam انویسٹی گیٹر سمجھتا ہے۔ حالانکہ ہم کے ایل کے سب سے بڑے Scam Artists (چور فراڈ) ہیں۔“

”اور اسی لئے ہم ایسا کلائنٹ انورڈ نہیں کر سکتے جو میرا نام کاغذ پہ لکھ لکھ کے ہرجگہ گھومتا رہے۔ اف۔“ اس نے جھرجھری لے کر فریج کھولا اور ایک سیب نکالا، پھر اس میں دانت گاڑتے ہوئے واپس مڑی۔ اب وہ سوپ پارلر والی سادہ لڑکی سے بہت مختلف نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں ایک شاہانہ سی چمک تھی، کندھے اعتماد سے سیدھے تھے اور پیشانی پہ خفا سے بل پڑے تھے۔

”مذاق میں اس گدھے کو کہہ دیا میں نے کہ کاغذ پہ لکھے، عالم کے ایل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے۔ وہ تو سچ سچ لکھ کر کاغذ ساتھ میں لئے گھوم رہا تھا۔ اس کو آج ہی کلائنٹ لسٹ سے خارج کرو۔“

”اوہ اچھا!“ فریبی عورت نے گہری سانس لی۔ وہ ابھی تک کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ ”مجھے لگا اسے ہماری اصلیت معلوم ہو گئی ہے۔“
”کیسے ہو سکتی ہے یار؟“ وہ ہتھیلیوں کے بل کاؤنٹر ٹاپ پہ چڑھی اور پیرلنکا کے بیٹھ گئی، پھر سیب میں دانت گاڑتے ہوئے بے نیازی سے مسکرا کے بولی۔ ”ہم ڈارک انٹرنیٹ سے آپریٹ کرتے ہیں۔ ہماری لوکیشن کوئی نہیں جانتا۔ اور پھر سب سمجھتے ہیں کہ عالم ایک آدی ہے کیونکہ میں encrypted فون سے کال کرتی ہوں ہمیشہ مردانہ آواز میں۔ سب یہی جانتے ہیں کہ میں ایک اسکیم انویسٹی گیٹر ہوں اور ہمارا ہر کلائنٹ آگے یہی بتاتا ہے کہ میں ساتھ میں مغرور اور بدتمیز بھی ہوں۔“ وہ سیب کھاتے ہوئے ہنس دی۔ ”مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمیں کوئی انویسٹی گیٹر ہوں نہ ہی کوئی مرد۔ میں اور تم.... ہم تو چور ہیں، چور۔ پہلے مسئلہ پیدا کرتے ہیں پھر اسے حل کر کے پیسے لیتے ہیں۔ جیسے پہلے مولیا کے باس کا لپ ٹاپ چرائے تنگو کال کے گھر رکھا، پھر تینوں جگہوں سے پیسے کمائے، ہاں لیکن اس طرح مولیا کسی مخالف کی

نوکرانی کے سامنے حالم کے نام کا کاغذ رکھ دے، ہرگز نہیں۔ اس لئے آج سے مولیا کلائنٹ لسٹ سے آؤٹ ہو گیا۔“

فریہ عورت نے افسوس سے گہری سانس کھینچی۔ ”ویسے تو میرا ذاتی خیال ہے کہ مولیا جیسے ناکارہ آدمی کو ہر اس درخت سے معافی مانگنی چاہیے جو اس کے لئے دن رات آکسیجن پیدا کرتا ہے، لیکن اس کو کلائنٹ لسٹ سے خارج کر کے مجھے افسوس ہوگا۔ ایک کلائنٹ کم ہو گیا۔“

”اؤنہوں۔ ڈونٹ وری!“ تالیہ نے ہاتھ جھلا کے بے فکری سے کہا۔ ”میں نے تنگو کا مل کے سامنے حالم کا نام لے لیا ہے۔ مستقبل میں ہم ان کے لئے ایسا مسئلہ کری ایٹ کریں گے جس کو حل کرنے کے لئے وہ لازماً حالم کے پاس آئیں گے۔ پتہ ہے بہترین اسکام (فراڈ) کیا ہوتا ہے؟ جس میں ان مالدار لوگوں کو لگے کہ سب کچھ انہوں نے خود اپنی مرضی سے کیا ہے، سارا آئیڈیا انہی کا تو تھا۔ جیسے آج تالیہ بیچاری کی تو مرضی ہی نہیں تھی، مگر دونوں اطراف نے اسے مجبور کر دیا اتنے سارے پیسے کمانے پہ۔“ وہ یاد کر کے پھر سے ہنسی اور سب کو دوسری سمت سے دانت سے کاٹنے لگی۔ کاؤنٹر پہ وہ آلتی پالتی کیے بیٹھی بے فکر اور خوش باش نظر آتی تھی۔

”سوپ پارلر چھوڑ آئی ہونا؟“ موٹی عورت نے بیگ اٹھا کے میز پہ رکھا اور پھر سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں..... وہاں کچھ چرایا جو نہیں تھا۔ اب تو اداکاری کر کر کے تنگ آ گئی تھی۔ آج تو اپنے فرضی بھائی کو فوجی بنا دیا میں نے حالانکہ جو کہانی میں نے تالیہ کی لکھی تھی اس میں وہ نرس تھا۔ لیکن پتہ ہے کیا.....“ وہ چھت کو دیکھتے ہوئے اداسی سے مسکرائی۔

”اس کردار کا نام ان تین ماہ کے لئے میں نے تالیہ مراد ہی رکھ لیا تھا۔ اپنا اصل نام۔ اچھا لگتا تھا اپنے نام کے ساتھ ایماندار، سچی کے القابات سننا۔ مگر ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں ایک کر مثل، جھوٹی، چور اور دھوکے باز ہوں۔“ اس نے نگاہیں نیچے کیوں اور اپنی دوست کی موٹی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے خفگی سے ہنسیوں بھنجیں۔

”تم نا خوش ہو اس حال میں کیا تالیہ؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ بے فکری سے ہنس دی اور شانے اچکائے۔ ”ابھی تو ہم نے بہت سی چوریاں اور scams ایک ساتھ کرنے ہیں۔ ابھی تو ہمیں بہت بہت امیر ہونا ہے۔ میں نے کسی جزیرے پہ ایک محل خریدنا ہے..... جہاں میں ساری عمر عیش سے رہوں۔ ہماری ہر ”جواب“ ہمیں منزل سے قریب کرتی ہے۔ ہمارے خوابوں کی منزل سے۔ اور آج کی رات سیلبریشن کی رات ہے۔ تم کھانا بناؤ، میں فریش ہو کے آتی ہوں۔“ سب کا درمیانی حصہ بچا کے اس نے نوکری میں اچھالا اور کاؤنٹر سے نیچے زمین پہ اتری۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا۔

”سی نوڈ کیوں نہیں بنا لیتیں تم آج؟ آخر اتنے دن تم نے میرے گھر کا خیال رکھا ہے، آج کیلیریز کی پرواہ کیے بغیر میں خوب کھانا چاہتی ہوں۔“ وہ واقعاً خوش لگتی تھی۔

”اوہ تالیہ!“ موٹی عورت نے افسوس سے اسے دیکھا اور دھپ سے صوفے پہ گر گئی۔ ”کیا تم نے کبھی ان جانوروں، ان مچھلیوں اور ان جھینگوں کی تکلیف کا احساس کیا ہے جن کو تم جیسے انسان ان کے خاندانوں سے چھین کر انہیں ذبح کر کے اپنے فریج میں چھپا لیتے ہو؟ کیا تم نے کبھی ان کے لاشوں کی کرب بھری پکار سنی ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کو جلد از جلد فنا کیا جائے؟“

”نہیں لیکن تم شاید پچھلے اتنے دن میرے گھر میں یہی کرتی رہی ہو؟“

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی، چہرے پہ غصہ در آیا۔ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی اور فریزر کا دروازہ کھولا۔ صاف ستھرا تقریباً خالی فریزر....

”اف!“ وہ غصے اور درد سے چلاتی واپس مڑی۔ ”تم میرا سارا راشن کھا گئیں؟“

موٹی عورت چہرے پہ سادگی سجائے ناگوں کی قینچی بنائے صوفے پہ بیٹھی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”گوکہ تمہاری یہ ناشکری میری طبیعت پہ گراں گزر رہی ہے، لیکن میں تمہیں اس کے لئے معاف کر دوں گی۔ میں اس مرغی کی طرح ہوں جو ہمیشہ تمہارا خیال رکھے گی اور تمہیں تمام جانوروں کی بددعاؤں سے بچانے کے لئے اپنے پروں میں چھپا کر رکھے گی۔“

تالیہ نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ ”اتنی کالی برائے مرغی پہلی دفعہ دیکھی ہے میں نے۔ ہونہ!“ اور پیر پختی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”ناشکری لڑکی۔“ وہ اس کے پیچھے تاسف بھری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☆☆=====☆☆

رات چند ساعتیں مزید آگے سرکی۔ تاریکی بڑھی۔ داغدار چاند کے آگے سے سارے بادل چھٹ گئے اور وہ عالم کے گھر کی کھڑکیوں سے صاف نظر آنے لگا۔ اپنے سارے عیوب کا لک اور چمک کے ساتھ..... عیاں اور واضح.....

لونگ روم میں اب اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ اوپن کچن جو سلور اور سیاہ رنگ میں آراستہ کیا گیا تھا اس وقت کسی ریسٹوران کی طرح سجا نظر آتا تھا۔ مدھم زرد بتیاں جلی تھیں۔ میز پہ موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ فر بہ عورت اپنے کھلے جھولے نما لباس کو سنبھالتی، کچن کے وسط میں رکھی مستطیل میز پہ برتن لگا رہی تھی.... جس پہ مختلف رنگوں اور شکلوں کے پکوان چن دیے گئے تھے۔ اس کا نام لیانہ تھا مگر تالیہ اس کو ”داتن“ Datin کہتی تھی۔ (مالے اپنی دادی کو عظیم داتن کہہ کے مخاطب کرتے ہیں۔)

دفعہ سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی تو اس نے چیخ کا نئے سجاتے گردن اٹھا کے دیکھا۔

تالیہ سیڑھیاں اترتی چلی آرہی تھی۔ کندھوں تک آتے سیاہ سیدھے بال گیلے تھے اور چہرہ دھلا دھلایا، نکھر ہوا تھا۔ آنکھوں کے سبز لینز اتار کے پھینک دیے تھے تبھی وہ سیاہ نظر آرہی تھیں۔ وہ شب خوابی کے لباس کے طور پہ پہنے جانے والی رف ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی مگر یلنگ پہ ہاتھ رکھ کے گردن اٹھائے، کندھے سیدھے رکھے، نیچے اترنے کا انداز شاہانہ تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پہ تالیہ مراد رکی۔ آنکھیں بند کیں اور چھوٹی سی ناک سے سانس اندر کھینچی۔ پھر آنکھیں کھول کے مسکرا دی۔

”میرا فیورٹ سی فوڈ اور سوٹی!! ہے نا؟“

”ہاں۔ یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ داتن نے کسی شیف کی طرح سینے پہ ہاتھ رکھے، گردن جھکا کے کہا۔ تالیہ رکی۔

آنکھوں میں ستائش ابھری۔ ”واقعی؟“

”ظاہر ہے، نہیں۔ تمہارے پسندیدہ ریسٹوران سے آرڈر کیا ہے۔“ داتن نے بھنویں اچکا کے شان بے نیازی سے کہا اور کرسی پہ بیٹھ گئی۔
تالیہ ہنس دی۔ ”تم بھی نا۔“ سر جھٹکتے ہوئے اس نے دوسری کرسی کھینچی۔ اب وہ دونوں مدھم روشنیوں میں... ہوم بیٹوں سے سچی میز پہ
آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

”اب تنگو کامل کے Scam سے Exit ہونے کا وقت آگیا ہے تالیہ۔ آخری اسٹیپ کب کرنا ہے؟“ داتن نے کھانا نکالتے ہوئے فکر
مندی سے پوچھا۔

”براہِ اچھے اسکام کا سب سے اچھا اصول یاد ہے، داتن؟ برا اسٹیپ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ سامنے والے کو اپنا آئیڈیا معلوم ہو۔“ وہ چاول
پلیٹ میں نکالتے ہوئے سمجھداری سے کہہ رہی تھی۔ گیلے بال چہرے کے دونوں اطراف سیدھے گر رہے تھے اور پانی کے چند قطرے گالوں
پہ پڑے تھے۔ نظریں کھانے پہ جھکی تھیں۔

”اسٹیپ ون۔ مجھے ایپ ٹاپ کو تلاش کروانے کے بہانے تنگو کامل سے اپنی موجودگی میں لا کر کھلوانا تھا تا کہ میں اس کا کامینیشن دیکھ
سکوں۔ یونو، وہ UL کلاس 360 کا سیف ہے، اور اس کو کھولنے میں بہت وقت لگنا تھا لیکن خوش قسمتی سے اس نے میرے سامنے لا کر کھولا
اور میں نے اس کا کامینیشن معلوم کر لیا۔“

”اس نے تمہیں کوڈ دیکھنے دیا؟“ سوال پہ تالیہ نے چمکتی نگاہیں اٹھائیں۔ اور مسکرائی۔ ”نہیں میں اس کے سامنے کھڑی تھی، وہاں سے لا کر
نہیں نظر آتا تھا لیکن اس کے پیچھے بک ریک کے گلاس ڈور میں عکس دکھائی دے رہا تھا۔“ وہ کہہ کے خود ہی ہنس دی۔ پھر یاد آیا۔ ”مسز کامل
کی تمام جیولری کی میں نے تصاویر تمہیں دی تھیں، تم نے ان کی نقل تیار کر لی؟“

”کیسے نہ کرتی؟ ایک تصویر ایک ہزار الفاظ پہ بھاری ہوتی ہے، اور وہ زیورات تصاویر میں ہی مجھ سے درخواست کر رہے تھے کہ میں ان کو
اپنی ملکیت میں لے لوں۔“ داتن چاولوں کا چمچ بھر بھر کے کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اچھا میں بتانا بھول گئی۔ اس میں جو تیارا (تاج) تھا نا اس کو ہم نے نہیں چرانا۔ وہ مسز کامل کی والدہ کی نشانی ہے، اور اس کے کھوجانے پہ
ان کا دل دکھے گا۔“

”مگر تالیہ وہ اچھا خاصا مہنگا ہو گا یا۔“

Honour among thieves, Datin !”

اس نے اسٹیکس کی مدد سے مچھلی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے یاد دہانی کروائی۔ داتن نے افسوس سے کندھے اچکا دیے۔

”اگلا اسٹیپ۔“ وہ واپس پلان تک آئی۔ ”اتوار کی رات تنگو کامل کے گھر کوئی خاص مہمان آرہے ہیں۔ میں تقریب سے پہلے
سیکیورٹی کیمرز ڈس اہل کر دوں گی اور موقعے کا فائدہ اٹھا کے تمام نقلی جیولری کو ان کے سیف میں ڈال دوں گی اور اصل نکال لوں گی۔ پھر
اسی وقت میں کسی مہمان کے ساتھ بدتمیزی کروں گی یا کوئی احمقانہ حرکت جس کے اوپر مجھے نوکری سے جواب دے دیا جائے گا۔ یوں ایسا

لگے گا کہ انہوں نے اپنی مرضی سے مجھے نکالا ہے۔ اور چند ماہ تو لگیں گے ان کو اندازہ کرنے میں کہ جو جیولری وہ پہن رہی ہیں وہ نقلی ہے تب تک میرا نام و نشان بھی وہ لوگ بھلا چکے ہوں گے۔“

”میری forgeries اتنی جلدی نہیں پکڑی جاتیں تالیہ۔ یاد ہے وہ انڈینیشن ایکسپورٹ جس کی گھڑی چرائی تھی ہم نے؟ اس نے پورے سال بعد جا کر تھانے میں درخواست دی تھی وہ بھی سنا کے خلاف کہ اس نے مجھے گھڑی ہی نقلی بنا کے دی ہے۔“

اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔ دفعتاً داتن کی مسکراہٹ مدھم ہوئی اور اس نے محویت سے اسے دیکھا جو ہنستے ہوئے کھانے پہ پھر سے چہرہ جھکا گئی تھی۔

”تم خود سے محبت کرتی ہوتا لیہ؟“

تالیہ نے روشن آنکھیں اٹھائیں اور مسکرا کے داتن کو دیکھا۔ ”سب سے زیادہ۔“

”مگر تم اپنی عزت نہیں کرتی۔“

تالیہ کی مسکان مدھم ہوئی۔ آنکھوں میں سایہ ساہرا لیا۔

”میں ایک Scam آرٹسٹ ہوں داتن۔ اسکام آرٹسٹ۔ یہ ساری دولت میں نے لوگوں کو دھوکہ دے کر..... ان کو لوٹ کر کمائی ہے۔“

میں اپنے آپ کو جانتی ہوں۔“

”تم کبھی کسی کو برٹ نہیں کرتیں۔ تم لوگوں کا دل نہیں دکھاتیں۔ کسی کو جسمانی ایذا نہیں پہنچاتی۔ ہم صرف میوزیمز اور امیر و کبیر دولت مندوں

کو لوٹتے ہیں.... اور پھر ہم وہ ساری دولت غریبوں کو دے دیتے ہیں۔“

”ہیں؟ کون سے غریب؟“ تالیہ حیران ہوئی۔

”لو۔ ہم دونوں سے زیادہ غریب کون ہو گا سارے شہر میں۔ ہم خود پہ خرچ کریں تو مطلب یہی ہوا نا کہ غریبوں پہ خرچ کی دولت۔“

تالیہ زور سے ہنس دی۔ ”تم داتن کبھی نہیں بد لوگی۔ مگر میں تمہاری طرح اپنے کام کو جھٹیلانی نہیں کرتی، لیکن مجھے یہ کام بہت پسند ہے۔“

اور میں اس زندگی سے بہت خوش ہوں۔“ کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا تو داتن نے مسکرا کے اپنا گلاس اس سے ٹکرایا۔

”گڈ گرل!“ پھر اس کا شفاف چہرہ دیکھتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

”سات سال گزر گئے تالیہ.... سات سال پہلے ہم پہلی دفعہ ملے تھے یاد ہے؟“ اس پہ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”ہاں۔ اس سے پہلے میں کتنی مختلف زندگی گزار رہی تھی۔ لاہور میں اپنے پیرٹس.... اپنے فوٹر پیرٹس کے ساتھ۔“ وہ موم بتیوں کو دیکھ

کے آہستہ سے بولی۔ میز پہ چنے کھانوں سے اڑتی بھاپ اور موم بتیوں کے شعلوں میں بہت سی یادیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔

”تمہیں اپنے اصلی ماں باپ یاد نہیں؟“

”نہیں۔ میری پہلی میموری گیارہ سال کی عمر کی ہے... آج سے سترہ سال پہلے.... جب میں گیارہ سال کی تھی.... میں کسی راہداری میں

چل رہی تھی....“ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ”چرچ کے ڈیسک... میں ان کے درمیان میں سے گزر رہی تھی.... میرا منہ میلا تھا.... لباس پھٹا پرانا تھا.... سینٹ پال چرچ.... ملا کہ.... (یہ شہر کوالا لپور سے ذرا فاصلے پہ واقع ہے۔)“ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ”وہیں پہ میں پہلی دفعہ اسٹیٹ اتھارٹیز کو ملی تھی۔ انہوں نے مجھے یتیم خانے میں ڈال دیا اور وہاں سے ایک کشمیری جوڑا مجھے ایڈاپٹ کر کے لے گیا۔ سب کہتے ہیں کہ میرے بارے میں کبھی کچھ یہ نہیں چل سکا تھا۔ کون ہوں کہاں سے آئی ہوں کوئی ریکارڈ نہیں، کوئی نام نہیں۔“

”تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟“

”یتیم خانے کی منتظم کہتی ہیں کہ میں نے ان کو اپنا نام تالیہ بتایا تھا۔ تالیہ بنت مراد۔ میرا لباس دیہاتی تھا اور گندا میلا۔ بس یہ ایک نشان تھا میری گردن پہ۔“ اس نے انگلیوں سے گدی (گردن کے پچھلے حصے) سے نیچے چھوا۔ ”گول سا نشان جیسے کسی نے آگ سے داغا ہو۔ جیسے کوئی ٹیڈ ہو۔ کوئی مہر ہو۔ شاید کوئی حادثہ ہوا تھا میرے ساتھ جو میں ہر شے بھول چکی تھی۔“ وہ عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔

”تمہیں کوئی لینے بھی نہیں آیا؟“

”انہوں نے“ اس نے چاول کھاتے ہوئے گردن دائیں بائیں ہلاتی۔ ”اس علاقے میں دور دور تک کسی کا بچہ نہیں کھویا تھا۔ کسی نے مجھے Claim ہی نہیں کیا۔“

”لیکن تمہارے فوٹر پرنٹس تو بہت برے لگے۔“ داتن ناپسندیدگی سے بولی تھی۔ تالیہ کے لبوں پہ اداس مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ہاں انہوں نے مجھے ایڈاپٹ تو کر لیا کیونکہ یہاں جاب تھی ان کی اور ان کو ایک نوکرائی چاہیے تھی، لیکن یہاں پھر بھی وہ بہتر تھے۔ پاکستان جا کر انہوں نے مجھے واقعاً ملازمہ بنالیا۔ اگر بچپن سے مجھے پیسوں اور کھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی چوریاں اور بڑے بڑے جھوٹ نہ بولنے پڑتے تو میں شاید ایسی کبھی نہ ہوتی۔“

”چلو، کم از کم یہاں آ کر ان کی نوکری سے تو جان چھوٹی تمہاری۔“

”وہ بھی اس لیے کہ میں ان کی بیٹیوں کے رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے میرج بیورو سے جو پہلا رشتہ ملا مجھے پنا دیا۔ مگر میں بھی خوش تھی داتن کیونکہ رشتہ ملایشیا کا تھا۔ یونو.... جان چھٹ جاتی اس فیملی سے۔ خوش شکل لڑکا تھا.... اتنا امیر... اسکا نپ پہ نکاح ہوا.... میں کتنی بے وقوف تھی نا۔“ وہ پھر سے ہنسی.... ”مجھے لگتا تھا یہاں آ کر میں خوش ہو جاؤں گی کیونکہ یہ میرا ملک ہے۔ ٹھیک ہے مجھے اپنا آپ لاہوری لگتا رہا ہے ہمیشہ مگر میری اصل قوم تو مالے تھی نا۔ اور انہی خوابوں کے ساتھ میں یہاں آئی تھی۔ لیکن ایئر پورٹ پہ....“

اس کی آنکھوں میں تکلیف سی لہرائی۔ کاشاپلیٹ میں گرا دیا۔ داتن خاموشی اور اداسی سے بہت دفعہ کی سنی ہوئی کہانی سننے لگی۔

”ایئر پورٹ پہ اترتے ہوئے پہلی دفعہ میں نے پہلا وٹرن دیکھا تھا۔ جاگتی آنکھوں سے پہلا خواب۔ جیسے ایک دم آنکھوں کے سامنے منظر بدل جائے اور ایک منظر سا چلنے لگے۔ مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھولتا.... میں نے دیکھا کہ میں ایک بھاری تھیلا کندھے پہ اٹھائے کانٹوں پہ چلتی جا رہی ہوں جس میں سے سونے کی اشرفیاں جھلک رہی ہیں۔ بس لمحے بھر کا منظر تھا اور غائب۔ وہ مجھے ریسو کرنے آئے والا تھا۔

میرا کاغذی شوہر اور میں ایئر پورٹ کے وسط میں ہکا بکا کھڑی تھی۔ اور تم داتن... تم تب ایئر پورٹ پہ ملازمت تھیں۔ ایسی ہی موٹی اور کالی سی تھیں۔ مگر دکھی سی۔ میں گرنے لگی۔ تم نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے ہاتھ روم تک لے گئیں۔ پانی پلایا۔ یاد ہے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے تمہیں وہیں روک لیا۔ اور اپنا بیگ دیکھا۔ وہ بری میں آیا تھا اور اسکاپ سے میاں صاحب کا حکم جاری ہوا تھا کہ یہی بیگ ضرور ساتھ لاؤں۔ بس ایک بیگ.... میں نے وہیں اسے کھولا تھا.... تمہارے سامنے.... اور یاد ہے اس میں کیا تھا؟“ وہ زخمی سا مسکرائی۔

”نوٹوں کے بنڈل!“

”میں کتنی بے وقوف تھی۔ منی لانڈرنگ کی کوریئر گرل کے طور پہ استعمال ہو رہی تھی اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ کب میرا بیگ لاہور ایئر پورٹ پہ تبدیل ہوا، کوئی ہوش ہی نہیں تھا مجھے۔ اگر تم اس وقت میری مدد نہ کرتیں اور اس بیگ کے ساتھ ایئر پورٹ سے نکلنے میں میری مدد نہ کرتیں تو میں پتہ نہیں کہاں ہوتی۔“

”میرا کیا کام تالیہ۔ میں تو خود اولاد کے ہاتھوں اولڈ ہوم کی طرف دھکیلی جانے والی عورت تھی۔ بڑی دکھی رہتی تھی میں ان دنوں۔ ہائے۔“ اسے اپنے دکھ یاد آ گئے۔ ”لیکن یہ تمہاری آنکھیں تھیں جن پہ میں نے بھروسہ کیا۔ ان کی چمک مجھے سچی لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ تم بے قصور ہو۔ ویسے کتنی زیادہ رقم تھی نا اس بیگ میں یاد ہے تالیہ کاش رکھ لیتے۔“

”کیسے رکھ لیتے، موٹی خاتون؟“ وہ غصہ ہوئی۔ ”اسی رقم کو خر بہ بنا کر تو ہم نے میرے اس شوہر کو ڈھونڈا اور اس سے طلاق کے پیپرز لئے تھے۔ مگر خیر....“ اس نے آخری نوالہ لیتے ہوئے گہری سانس لی۔ ”اس فراڈ آدمی نے مجھے ایک سبق تو سکھا دیا تھا کہ پیسے کمانے کے لئے کسی کو دھوکہ کیسے دیا جاتا ہے۔ اور دیکھو آج چھوٹی بڑی چوریاں کر کے ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ انٹرنیٹ اسکام سے شروع کیا گیا سفر آج ہمیں کتنا بڑا اسکام آرٹسٹ بنا چکا ہے۔“ (اسکام آرٹسٹ بنیادی طور پہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کے لالچ کو ان کے خلاف استعمال کر کے ان سے مال لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ اور عموماً ایسے کاموں کے کرنے کا لالچ دیتے ہیں جو قانونی نہیں ہوتے یعنی دھوکہ کھانے کے بعد لوٹا گیا شخص پولیس کے پاس نہیں جاسکتا۔ جیسے کسی بندے کو قتل کرنے کے لیے پیسے ایڈوائس میں بنو رنا اور پھر غائب ہو جانا۔)

”تمہیں ملائیشیا آنے سے پہلے کبھی اس طرح وژن یا سچے خواب نہیں نظر آئے تھے تالیہ؟“

”نہیں۔ پہلی دفعہ ایئر پورٹ پہ ہی نظر آیا تھا اور پھر کبھی وہ سلسلہ تھا ہی نہیں۔“

”اگر تمہارے خواب اور وژن ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہم اتنا کچھ نہیں کما سکتے تھے تالیہ۔ تم ایک Clairvoyant (جن کو مستقبل نظر آتا ہے) ہو۔ ایک Seer۔ تمہیں وقت سے پہلے بارش نظر آ جاتی ہے، کسی کی موت دکھائی دینے لگتی ہے.... کوئی حادثہ.... کوئی آفت.... مگر ان سارے چھوٹے چھوٹے وژن اور خواب ایک طرف.... اگر تم ان سات سالوں میں وہ دس بڑے خواب نہ دیکھتی تو ہم اتنے امیر نہ ہوتے۔“

”کیا رہ!“ تالیہ نے نینکیں سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے تھج کی۔ ”تنگو کامل کو اپنا لپ ٹاپ اور زیورات لا کر سے نکالتے دیکھا تھا میں

نے خواب میں.... تین ماہ پہلے.... جس کے بعد ہم نے اس پہ کام کرنا شروع کیا تھا، اور میں نے اس کے گھرملازمت حاصل کی.... اس کو ملا کے گیارہ خواب ہوئے جو میں نے دو متمدنوں کی تجویزوں اور میوزیمز کی قیمتی پینٹنگز اور آرٹ ورک کے بارے میں دیکھے تھے۔ جیسے قسمت مجھے خود بتا دیتی ہے کہ تالیہ، فلاں کے لاکر میں یہ سب رکھا ہے، اسے چرا لو۔ اور دس دفعہ ان کی مدد سے ہم نے کتنی دولت کمائی۔ اب دیکھو، گیارہویں دفعہ کامیاب ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن داتن....“ اس نے گہری آہ بھر کے چھت پہ لگی بتیوں کو دیکھ کے کہا۔ ”میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔“

”کیا؟“

”میں اگلی دفعہ کوئی بڑی heist.... کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی لمبا ہاتھ۔ ایک آخری جاب، جس سے کروڑوں کمالیں ہم اور پھر میں اس کام کو چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ پچھلے تین ماہ میں نے ایک سچی مگر بے وقوف لڑکی کا کردار کیا.... اپنے اصل نام کے ساتھ.... مگر ان سب لوگوں سے اتنے اچھے الفاظ سن کر میرا دل چاہنے لگا ہے کہ میں یہ کام چھوڑ دوں۔ ایک آخری فراڈ.... ایک آخری چوری کے بعد....“ وہ چھت پہ ٹپکتے لیمپ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں امید تھی، خوشی تھی۔ سادگی تھی۔

”تالیہ!“ داتن سنجیدگی سے آگے کوچھلی۔ ”پلان کیا گیا گناہ کبھی آخری گناہ نہیں بن سکتا۔ جس جرم سے پہلے تم سوچ لو کہ اسے آخری دفعہ کرنے جا رہی ہو وہ جرائم کی زنجیر کی محض اگلی کڑی ہوتا ہے۔ اگلی چوری، اگلا گناہ۔ اس کے بعد مزید ایک اور ہوگا۔ پھر مزید ایک اور۔ جو لوگ چھوڑتے ہیں نا گناہ وہ پچھلے گناہ کو آخری گردان کے چھوڑتے ہیں۔ لیکن میرے اور تمہارے جیسے لوگ.... تالیہ ہم چور ہیں اور ساری عمر یہی رہیں گے۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ انسان نہیں بدلا کرتے۔“

تالیہ نے نگاہیں داتن کی طرف موڑیں تو ان کی جوت بجھ گئی تھی۔ ”ہم جب چاہیں یہ کام چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اچھے ہو سکتے ہیں۔“

”ہم پہلے ہی بہت اچھے ہیں تالیہ۔ مگر ہم اس کام کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ہماری زندگیوں میں جھوٹ اور دھوکے بازی اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم چاہیں بھی تو نہیں بدل سکتے۔ ہم نے ہمیشہ اسی طرح رہنا ہے۔“

”اوکے! پھر میں اسی طرح خوش ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ پھر نیپکین سے ہونٹ تھپتھپائے۔ ”اب میں سونے جا رہی ہوں۔ صبح کام پہ بھی جانا ہے۔ ویسے نوکرانی بنا بہت ہی روکھا پھیکا کام ہے۔“ وہ قدرے زروٹھے پن سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن نے مسکرا کے اسے شب بخیر کہا۔ تالیہ جانے ہی لگی تھی کہ ٹھہری۔ آنکھوں میں شرارت سی چمکی۔ لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔

”میں نے کل رات ایک خواب دیکھا!“

داتن نے اطمینان سے اسے دیکھا۔ ”کالونی میں کون مرنے والا ہے؟ کس کا کتا بھاگنے والا ہے؟ کون اپنی بیوی کو دھوکہ دینے والا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ نچلا لب دبا کے ذرا سی ہنسی۔ ”میں نے خود کو دیکھا۔ میں دو دریاؤں کے درمیان کیچڑ میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے ایک

آدمی کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اسے میری ضرورت ہے اور مجھے اس کی.... اور یہ کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔“ داتن جو دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی آخر میں مایوس سی نظر آئی۔ ”اس میں اتنا خاص تو کچھ نہیں تھا۔“

”کیونکہ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ آدمی کون تھا۔“

”کون تھا؟“ وہ چونکی۔ تالیہ نے اب انگلی دانتوں میں دبالی تھی اور کچھ یاد کر کے وہ پھر سے ہنسی تھی۔

”وہ مجھے کہہ رہا تھا.... کہ میں اس کے ساتھ رہوں.... اُف... اُف... اُف۔“ اس کے چہرے پر رنگ آ کے بکھرے تھے۔ داتن نے اچنبھے سے بھنویں بھنچیں۔

”مگر وہ تھا کون؟“

”اُوں ہوں۔ اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تم مجھ پہ ہنسو گی۔ ایسا آدمی میرے خواب میں.... اُف۔“

”اُوں ہو کچھ تو بتاؤ۔ تم جانتی ہو اسے؟“ پھر وہ چونکی۔ ”شاید تم اسے پسند بھی کرتی ہو!“

”جانتی ہوں؟ پسند کرتی ہوں؟“ وہ جیسے محظوظ ہوئی۔ ”پیاری داتن.... اس کو سارا ملایشیا جانتا ہے.... اور پسند؟ اُوں ہوں۔ اس سے سارا ملایشیا عشق کرتا ہے، عشق! گڈنائٹ۔“ اور وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ داتن اسے پکارتی رہ گئی مگر اب وہ ہاتھ ہلاتی سرنگی میں ہلاتی زینے چڑھتی جا رہی تھی۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ وہ اپنے موٹے موٹے ہاتھوں پہ چہرہ گرائے مشکوک نظروں سے اسے جاتے دیکھے گئی۔

☆☆=====☆☆

دو دریاؤں کے سنگم پہ وہ دونوں اسی طرح کھڑے تھے۔ بارش تڑا تڑبیرس رہی تھی۔ وہ دونوں بھگے ہوئے تھے۔ پاؤں کچھڑ میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ اوپر دیکھ رہی تھی جہاں سرخ پروں اور سنہری ناگلوں والا پرندہ اس آدمی کے سر کے عین اوپر فضا میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلے بیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

”میرے ساتھ رہو۔“ آواز پہ تالیہ نے نظریں پھیریں۔ وہ بھگی کھڑی تھی۔ سنہری بال موٹی گیلی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔

”میرے ساتھ رہو۔“ وہ اب نائی نوج کے اتار رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی شرٹ کا کف کھولا۔ اور آستین پیچھے موڑی۔ نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ اسی طرح اس نے دوسری آستین تہہ کی۔ پھر زمین پہ جھکا اور مٹی میں کچھڑ اٹھایا اور سیدھا ہوا۔ مٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ تالیہ نے دیکھا.... اس کی ہتھیلی میں کچھڑ کے اوپر ایک سنہری چابی دمک رہی تھی۔

”میرے ساتھ رہو۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔

بیڈروم میں اندھیرا تھا۔ تالیہ نے چند لمحے پلکیں جھپکا کے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر دیں اور دوبارہ سے سو گئی۔
 چند گھنٹے بیتے اور صبح پوری طرح پھیل گئی۔ لاونچ خاموش پڑا تھا۔ اوپن کچن کی میز پر ناشتہ شیشے کے برتنوں میں ڈھکا ہوا لگا پڑا تھا۔
 وہ زینے اترتی نیچے آئی تو ملازمہ کے یونیفارم میں ملبوس تھی۔ آنکھیں سبز تھیں۔ اور چہرے پہ ہلاکی مسکینیت طاری تھی۔ لاونچ میں رک کے اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ ”واتن؟“

”نیچے ہوں۔“ آواز پہ وہ گہری سانس لیتی ایک دروازے کی طرف آئی۔ دیوار میں نصب چوکھٹے پہ اپنا انگوٹھا رکھا۔ خود کار آلے نے اس کی تشخیص کی اور دروازہ کھل گیا۔ آگے سیڑھیاں تھیں جو مزید نیچے جاتی تھیں۔ وہ زینے اترنے لگی۔
 نیچے کھلا سا کمرہ تھا۔ دیواروں پہ مختلف پینٹنگز اور آرٹ ورک سجایا گیا تھا۔ چند ڈبے بند رکھے تھے۔ وسط میں بڑی میز تھی جس پہ چند مشینیں پڑی تھیں اور واتن حفاظتی گلاسز لگائے، گلوڑ پہنے، ایک گن نما آلے سے ایک نیکلیس پہ کام کر رہی تھی۔
 تالیہ اس کے قریب آرکی اور تنقیدی نظروں سے سارے زیورات کو دیکھا۔ پھر ایک انگوٹھی کو اٹھا کے اوپر روشنی میں کر کے دیکھنے لگی۔
 ”پرفیکٹ۔“ اس نے انگوٹھی واپس ڈال دی۔

”بس یہی زیورات ہیں مسز کال کے پاس؟“ واتن نے ایک نظر ان تھوڑے سے زیورات کو دیکھ کے کہا۔
 ”ہاں.... لا کر میں کل چودہ Pieces ہیں۔ تاج کی نقل نہیں تیار کرنی۔ میں باقی تیرہ پیس اٹھاؤں گی۔“ وہ کہہ کے جانے لگی۔
 واتن جو یورپ چھٹی تھی، چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”چودہ کیسے؟ تم نے صرف تیرہ کی تصاویر بھیجی تھیں۔ تاج نکال دو تو پیچھے بارہ بچ گئے۔“

تالیہ ٹھہری۔ واپس گھومی۔ زیورات سامنے پڑے جگمگا رہے تھے۔ پھر سے ان کو گنا۔ ذرا سی الجھی۔ ”نیکلیس، کڑے، بندے، انگوٹھیاں۔ یہ ہوئے بارہ پیس۔ مگر مسز کال کے تمام زیورات جو لا کر میں تھے میں نے ان کی گنتی کی تھی تو وہ چودہ پیس تھے۔“
 ”تم نے پہلی دفعہ لا کر اندر سے کب دیکھا تھا؟“

”ایک ماہ پہلے جب میں نے مسز کال کی انگوٹھی چھپا دی تھی اور ان کو میرے سامنے لا کر کھولنا پڑا تھا، تب میں نے سارا لا کر دیکھا تھا۔ کوڈ اس لئے نہیں دیکھ سکتی تھی کہ مجھے انہوں نے لا کر کھولنے کے بعد بلایا تھا۔“ وہ الجھ کے انگلیوں پہ گننے لگی۔ ”کل بھی جب تنگو کال نے میز پہ زیورات کے ڈبے رکھے تو میں نے گئے تھے دوپانچ.... تیرہ.... وہ بڑبڑاتے ہوئے گننے لگی۔ مگر گنتی پوری نہیں پڑ رہی تھی۔
 ”ہو سکتا ہے تم بھول رہی ہو۔ ٹوٹل تیرہ ہی ہوں۔“

”تالیہ کچھ نہیں بھولتی۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ایک دراز کھولا۔ چند کاغذ الٹائے پلٹائے۔ ایک فولڈر نکالا۔
 ”جب مسز کال نے میرے سامنے لا کر سے زیور نکالا تھا تو میں نے اپنے بلاؤز بٹن کے کیمرے سے اس کی ہائی کوالٹی تصاویر لی تھیں۔“ وہ فولڈر کھولتے ہوئے صفحے تیز تیز پلٹا رہی تھی۔

”اور تم نے مجھے تیرہ تصاویر دی تھیں تالیہ۔ وہ میرے گھر پڑی ہیں۔“

”میرے پاس اور بچل ہوں گی۔ ایک منٹ۔“ اس نے وہ فولڈر رکھا اور ایک دوسرا نکالا۔ پہلا صفحہ کھولا تو لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”یہ لو.... یہ رہی تمام تصاویر۔ ان کو نیلی کرو۔ ہم نے کون سا زیور مس کر دیا ہے۔“

داتن گھوم کے اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ عینک اتار دی اور اب وہ دونوں باری باری تمام پرنٹ آؤٹس متعلقہ زیورات کے ساتھ رکھ رہی تھیں.... پانچ.... آٹھ.... بارہ.... تیرہ....

”اوہ!“ آخری پرنٹ آؤٹ سے متعلق کوئی زیور انہوں نے نہیں بنایا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تالیہ کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

وہ گھڑی کے باکس کے جیسے شیشے کے ڈبے میں رکھا ایک سنہری سکہ تھا۔ پرنٹ آؤٹ پہ اس باکس کی آگے پیچھے سے چار تصاویر لی گئی تھیں۔

”یہ تو کوئی لہٹیک ہے۔“ داتن قدرے جوش سے جھکی مگر تالیہ نے بے دلی سے کاغذ پرے کر دیا۔

”اوپر دیکھو کیا لکھا ہے۔“ مظفر شاہ۔ ”یہ ملاکہ سلطنت کے سلطان مظفر شاہ کے زمانے کا سکہ ہے۔ تنگو کامل کو آرٹ اور ہسٹری میں خاصی دلچسپی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کو سنبھال رکھا ہے۔“

”مگر ہم اسے کیوں نہیں چرار ہے۔“

”کیونکہ مظفر شاہ کے سکے آج کل کو لالا پور کے بر مال سے ملتے ہیں اور سارے نقلی ہوتے ہیں۔ ابھی ان کے کوئے کھرچو تو سفید رنگ نکلنے لگے گا۔ اور یہ بھاری ہوتے ہیں۔ جبکہ اصلی سکے اتنی aging اور oxidation کے باعث ہلکے ہونے چاہئیں۔ بالفرض یہ اصلی بھی ہو تو اتنی ویلٹیو نہیں ہے ان کی۔ رہنے دو بیچاروں کے پاس ان کا سکہ۔“

داتن نے ایک دوسری عینک اٹھائی اور اسے ناک پہ جما کے غور سے کاغذ پہ چھپی تصویر کو دیکھنے لگی۔

”یہ واقعی اصلی سکہ نہیں ہے۔“ وہ ناپسندیدگی سے بولی تھی۔ آج کل کے Forgers کو خدا کا کوئی خوف نہیں۔ ٹھیک ہے میرے جیسے اعلیٰ درجے کے نقالے نہیں تراش سکتے وہ میں جانتی ہوں لیکن نقلی سکہ تیار کرتے وقت انسان کو چاہیے کہ ایک دفعہ اصلی سکہ بھی دیکھ لے کیونکہ مظفر شاہ کے اصل سکوں پہ ایک طرف ”مظفر شاہ ال سلطان“ اور دوسری طرف ”نصیر من الدین والدین“ (دنیا اور دین میں مددگار) لکھا ہوتا ہے۔ اس پہ تو دونوں طرف مظفر شاہ ال سلطان لکھا ہے۔“

داتن کے آخری فقرے پہ وہ منجمد ہو گئی۔ پھر اتنی تیزی سے گردن موڑی گویا برف چٹختی ہو۔

”دونوں طرف مظفر شاہ لکھا ہے؟“ اس نے کاغذ داتن کے ہاتھ سے چھینا۔ اور اس پہ بے قرار نگاہیں دوڑائیں۔

”میں نے ایسا سکہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ ہماری ایک واردات والی جگہ پہ یہ تھا مگر میں نے اسے تب بھی چھوڑ دیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ نیشنل ہسٹری میوزیم میں۔ ہے نا؟ میں نے بھی دیکھا تھا۔“ تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”نہیں... میں نجیب بن سلامت کی بات کر رہی ہوں۔ پچھلے سال جب میں نے اس کی پرائیوٹ آرٹ کلکیشن کے بارے میں وژن دیکھا تھا اور ہم نے ان کے ذاتی سیف میں نایاب لہٹنیک برتن چرائے تھے۔ تب ایسا سکھ وہاں بھی تھا۔“

”یقیناً ہو گا مگر تین سال پہلے جب تمہارے ہی ایک خواب پہ ہم نے نیشنل ہسٹری میوزیم والی واردات کی تھی، تب یہ وہاں ڈسپلے تھا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔“

تالیہ نے کرسی کھینچی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ ایک جیسے بہت سے سکے مارکیٹ میں ہوتے ہیں۔“

”نہیں۔ کچھ غلط ہے اس سب میں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے سامنے یہ سکے تیسری دفعہ آرہا ہے مگر ہم نے اسے نہیں چرایا۔“

”ہم واردات کی جگہ سے چند چیزیں ہی چراتے ہیں، ہر چیز تو نہیں اٹھا سکتے تالیہ۔“

”بات یہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے سال ایسا ہی سکے نجیب بن سلامت کے پاس تھا۔ اس کا باکس بھی یہی تھا۔ داتن... داتن... داتن... نجیب بن سلامت ہماری وجہ سے دیوالیہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی بہت سی آرٹ کلکیشن کو آکشن پہ ڈال دیا تھا۔ اس کا ریکارڈ پبلک ہو گا ذرا معلوم کرو یہ سکے اس آکشن میں تھا یا نہیں؟“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ تنگو کامل اور نجیب بن سلامت دوست ہیں اور میں نے مسز کامل سے سنا تھا کہ جب نجیب پہ برا وقت آیا تھا تو تنگو کامل نے اس کی مدد کی تھی۔ اس کی آکشن سے کوڑیوں کے بھاؤ ملنے والی چیزیں مہنگی خرید کے۔ کچھ پینٹنگز اور...“ اس نے کاغذ اٹھا کے دیکھا۔ ”شاید یہی سکے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ ایک جیسے بہت سے سکے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی سکے ہے جو بار بار تمہارے خواب میں آتا ہے؟“

”ہاں۔ میرے گیارہ خواب... بلکہ بارہ... ان میں سے تین میں یہ سکے تھا۔ شاید مزید میں بھی ہو مگر اس کے ساتھ رکھے جو اہرات زیورات، پینٹنگز اور نادرا اشیاء نے میری آنکھوں کو ہمیشہ اتنا خیرہ کر دیا کہ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔“ وہ حیران پریشان نظر آرہی تھی۔

”میں اس سکے کا ریکارڈ ڈٹریس کرنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن اگر تم یہ کہہ رہی ہو کہ یہ ایک سکے پچھلے کئی سال سے ایک شخص سے دوسرے

کی تحویل میں جا رہا ہے اور قسمت تمہیں بار بار خواب میں اشارہ دے رہی ہے کہ اسے حاصل کرو تو یہ بہت عجیب بات ہے۔“

مگر وہ سن ہی خلاء میں دیکھ رہی تھی۔ ”میں ہمیشہ اپنے خوابوں کی تعبیر غلط کرتی ہوں۔ کسی کو پانی میں ڈوبتے دیکھوں تو سمجھتی ہوں وہ مرنے والا ہے مگر چند دن بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کوئی اعلیٰ تعلیمی کامیابی ملی ہے کیونکہ پانی ”علم“ کا سہل ہے۔ کسی کا زیور چوری ہوتے دیکھوں تو سمجھتی ہوں کہ اس کے ہاں ڈاکہ پڑنے والا ہے مگر اس کو طلاق ہو جاتی ہے۔ اور وہ گروہری اسٹور والی روز میری... میں نے دیکھا اس کے

بازو میں سونے کا نیا کڑا ہے تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ امیر ہونے والی ہے مگر اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ غریب وہ ابھی بھی ویسی ہے۔ میں ہمیشہ اپنے وزن یا خواب کی غلط تعبیر کرتی ہوں مگر ان بارہ خوابوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میں نے درست سمجھے ہیں کیونکہ انہی کی وجہ سے ہم امیر ہوئے لیکن شاید وہ بھی میں نے غلط سمجھے تھے۔“ اس کی رنگت تاریک پڑ رہی تھی۔ داتن کو افسوس ہوا۔

”تم کام پہ جاؤ میں اس سکے کو لیں کرتی ہوں۔“ اس نے اس کا سر تھپک کے تسلی دی تو وہ بے دلی سے اٹھی اور سر ہلا دیا۔ پھر ٹھہری۔

”میں اتنے سال سمجھتی رہی ہوں کہ میری تقدیر مجھ سے یہی سب کچھ چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔ یہ ان دیکھے کو دیکھنے کا تحفہ مجھے اسی لئے ملا ہے لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ شاید میں نے اس تحفے کو غلط استعمال کیا۔“ اس کی آنکھ کا کنارہ بھیگ گیا۔

”تالیہ۔“ داتن نے آگے بڑھ کے اسے شانوں سے تھاما۔ ”ہم اس سکے کو ڈھونڈ لیں گے اور اس کو حاصل بھی کر لیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ اب کام پہ جاؤ اور مجھے میرا کام کرنے دو۔“ تالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ لیں۔ اسے کام سے دیر ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

تنگو کامل کی رہائش گاہ پہ صبح صبح سے روزمرہ کے کام شروع ہو چکے تھے۔ کچن میں تالیہ اور ایک دوسری ملازمہ کھڑی کام میں مصروف تھیں۔ بٹلر ٹرائی کو اپنی نگرانی میں سیٹ کروا رہا تھا اور ساتھ میں فون پہ بات بھی کر رہا تھا۔ ایسے میں تالیہ بے دھیانی سے جگ میں جوس انڈیل رہی تھی۔ چہرے پہ ابھی تک وہی الجھن چھائی تھی اور ہاتھ سست پڑ رہے تھے۔ مارے باندھے اس نے جگ کوڑے میں رکھا اور آگے بڑھ گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پہ تنگو کامل سربراہی کرسی پہ بیٹھے خوش مزاجی سے دائیں ہاتھ جلوہ گرا اپنی بیوی سے مخموتگو تھے۔ بچے بھی ناشتہ کر رہے تھے۔ ایسے میں وہ جوس لے کر آئی تو دونوں میاں بیوی نے خوشگوار مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

”کیسی ہوتا تالیہ؟ اور تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں سب۔ تھینک یوسر۔“ اس نے ادب سے سر جھکایا۔

”میں بیگم سے کہہ رہا تھا کہ اس ماہ سے تالیہ کی تنخواہ بڑھادی جائے۔“

”شکریہ سر!“ وہ مصنوعی مسکراہٹ اور تشکر کے ساتھ بولی۔ اور ان کے گلاس میں جوس ڈالنے لگی۔

”تالیہ مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ گی۔“ مسز کامل نے کہا تو اس نے سر کو ادب سے خم دیا۔ اور کچن میں آگئی تاکہ جلدی جلدی کام نبھالے۔

”آخر جمعے کو آکون رہا ہے جس کے استقبال کے لیے اتنی تیاری ہو رہی ہے؟“ وہاں کھڑی دونوں ملازمائیں نور اور تنیم آپس میں بات کر رہی تھیں۔ پھر اس سے بھی پوچھا۔ ”تمہیں کچھ معلوم ہے تالیہ؟“

”نہیں۔“ وہ سادگی سے کہہ کے برتن دھونے لگی۔ (میرے جیسی رچ کرل اس وقت ان کے جھوٹے برتن دھور ہی ہے، مجھے فی الحال یہی معلوم ہے۔) جلتے دل کے ساتھ اس نے سوچا تھا۔

کے ایل کا وہ بازار شام کے وقت متوسط طبقے کے لوگوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ مختلف وضع قطع کے لوگ۔ اکثریت چینی نقوش والے افراد کی تھی اور خواتین کی ایک بڑی تعداد کس کے چہرے کے گرد لپٹنے والا حجاب لئے ہوئی تھی جس کو مقامی زبان میں tudung.... کہا جاتا تھا۔ بازار میں سرخ ناکلز سے بنی روش تھی اور روش کے دونوں اطراف دکانیں اور ان کے آگے اسٹالز لگے تھے۔ برآمدوں میں کہیں چھتری تلے کرسیاں بھی بچھی تھیں اور لوگ کھاپی رہے تھے۔

ایسے میں تالیہ سامان کے شاہراہ ٹھائے مسز کامل کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔

”جو مہمان آرہے ہیں ان کے لیے چاول لے رہی ہوں۔ ان کو اچھا چاول بہت پسند ہے۔“

مسز کامل ساتھ میں تبصرہ بھی کیے جا رہی تھیں۔ وہ جیسے ان مہمانوں کے آنے پہ بہت خوش تھیں مگر ان کا نام کسی وجہ سے نہیں لے پا رہی تھیں لیکن شاید ان کا دل کسی سے شیئر کرنے کو بہت چاہ رہا تھا۔ تالیہ خاموش رہی۔ پھر یونہی پوچھا۔

”بچے بھی آرہے ہیں ساتھ؟“

”نہیں۔ بس دونوں میاں بیوی آئیں گے۔ ویسے ان کے دو بچے ہیں۔“ پھر رک کے تصحیح کی۔ ”تین تھے۔ لیکن ان کی بیٹی آریا نہ بچپن میں کھو گئی تھی۔ چئیر لفٹ سے گر گئی تھی۔ لاش نہیں ملی مگر سب کو یہی لگا کہ وہ مر گئی ہے اس لیے قبر وغیرہ بنا دی تھی۔“ پھر وہ چپ ہو گئیں جیسے بہت زیادہ بول گئی ہوں اور ایک دکان کی طرف چلی گئیں۔ وہ گہری سانس لے کر پیچھے آئی۔

مسز کامل نے اعلیٰ درجے کے چاول نکلوائے اور ان کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگیں۔ تالیہ یونہی ان کے ہاتھوں کو دیکھ گئی۔ یک دم جیسے ساری آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ مسز کامل کے ہاتھوں میں بھرے چاول دیکھتے ہی دیکھتے جلنے لگے۔ بس لمحے بھر میں وہ سب راکھ ہو گئے۔ اور ان کے دونوں ہاتھ کا لک سے رنگے خالی رہ گئی۔

وہ چونکی۔ سماعت کھل گئی۔ آوازیں آنے لگیں۔ اس نے مسز کامل کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی راکھ نہیں تھی۔ وہ چاول اٹھا اٹھا کے چیک کر رہی تھیں۔ تالیہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”میم۔“ اس نے بولے سے ان کو پکارا۔ ”کل آپ کی کسی دوست کا فون آیا تھا میں بتانا بھول گئی۔“

”کس کا؟ کیا کہہ رہی تھی؟“ وہ چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”نام نہیں بتایا مگر یہ کہا تھا کہ وہ ذرا مصروف ہیں، مگر میں آپ کو بتا دوں کہ آپ صدقہ دے دیں اور آگ وغیرہ سے احتیاط کریں کیونکہ

انہوں نے آپ کے بارے میں برا خواب دیکھا ہے۔“

”کیا؟ کیا دیکھا ہے اس نے؟“ وہ بے چین سی ہو کے پوری اس کی طرف گھوم گئیں۔ دونوں اب کاؤنٹر سے ہٹ کے کھڑی تھیں اور

سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔

”یہ کہ آپ نے ہاتھوں میں چاول اٹھا رکھے ہیں اور وہ راکھ میں بدل جاتے ہیں۔ شاید آپ کو چولہے اور ہیٹر وغیرہ سے احتیاط کرنی چاہیے۔“

”اوہ تم نے اچھا کیا مجھے بتا دیا لیکن کون سی دوست تھی میری؟“

”نام نہیں بتایا لیکن کہتے ہیں برے خواب کا بار بار ذکر نہیں کرنا چاہیے اس لیے بہتر ہے کہ آپ بس صدقہ اور دعا وغیرہ کر دیں۔“ اس نے خوبصورتی سے بات کا رخ پھیرا تو وہ سر ہلا کے رہ گئیں۔ البتہ چہرے پہ بے پناہ پریشانی اُٹھ آئی تھی۔

(مجھے لگتا ہے آپ کے ہاتھ جلنے والے ہیں۔ یا آپ کے گھر کو آگ لگنے والی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ یہ وژن میں نے دیکھا ہے نہ ہی یہ کہ میرے خواب ہمیشہ سچ ہو جاتے ہیں۔ اوہ میرے اللہ.... یہ تحفہ نہیں ہے.... یہ تو ایک curse ہے۔) ان کے ساتھ سر جھکائے بازار میں چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار ان کے ہاتھوں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ گوری کلائی میں انہوں نے خوبصورت ساسونے کا بریسلٹ پہن رکھا تھا جس پہ ننھے ستارے جھول رہے تھے۔ تالیہ نے یونہی اپنی خالی کلائی کو دیکھا اور پھر ایک دم وہ ٹھٹھک کے رکی۔ ذہن کے پردے پہ ایک منظر لہرایا تھا۔

لاکر میں رکھی ڈبی اس میں سجاوہ بریسلٹ۔ وہ وہیں سن سی کھڑی رہ گئی۔ ایک دم ساری گھٹیاں سلجھ گئی تھیں۔ پزل کے بہت سے ٹکڑے اپنے اپنے خانوں میں آکر رہے تھے۔

☆☆=====☆☆

لابریری کے اندر مقدس بارعب سی خاموشی چھائی تھی۔ اونچے ریکس، کتابوں کی طویل الماریاں.... جگہ جگہ بچھی میزوں پہ مطالعے میں منہمک سے دکھائی دیتے لوگ.... کمپیوٹرز کے آگے بیٹھے کام کرتے اشخاص.... غرض معمول کا خاموش سامان حول تھا۔

ایسے میں دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ اس نے صبح کے ملازماؤں والے لباس کے برعکس سرخ خوبصورت اور قیمتی فرائیڈ پہن رکھا تھا۔ کہنی پہ ڈیزائنریگ تھا اور سر پہ سفید کورا ہیٹ جس سے نکلتے سیاہ بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ دروازے پہ وہ رکی ہیٹ کو ڈائمنڈ رنگ اپنی انگلی سے ترچھا کر کے سیاہ آنکھیں اس پاس دوڑائیں۔ ایک لائبریرین جو قریب سے کتابوں کی ٹرائی دھکیلتا گزر رہا تھا، اسے دیکھ کے رکا اور جھٹ سلام جھاڑا۔

”السلام علیکم۔ مس ساشا۔“

تالیہ نے شان بے نیازی سے سر خم دیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا تو وہ بولا۔

”مسز لیا نہ اس طرف ہیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی اور اسی طرح انھی گردن کے ساتھ آگے چلتی گئی۔

کونے میں ایک آڈیو روم تھا۔ شیشے کی دیواروں نے اسے مکمل بند کر رکھا تھا، گویا شیشے کا کوئی ڈبہ ہو۔ اندر تنگ سی جگہ پہ وہ پھنس کر بیٹھی

سیاہ موٹی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ عینک لگائے بال جوڑے میں باندھے وہ کتابوں میں الجھی ہوئی تھی۔ آہٹ پہ اس نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا، تالیہ دروازہ کھلتی اندر داخل ہو رہی تھی۔

”اتنے سالوں سے یہاں کام کر رہی ہو داتن، اور ایک ڈھنگ کا آفس بھی نہیں دیتے یہ تمہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کے کہتی سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ پرس میز پر رکھا، اور ہیٹ کو مزید ترچھا کیا تو چہرہ اور سیاہ مسکراتی آنکھیں مزید واضح ہوئیں۔

”کیا نہ بنت دانش صابری کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ چاہے تو یہ پوری لائبریری خرید لے...“ خشنگیں لگا ہوں سے اسے گھور کے وہ بولی تو تالیہ نے ابرو اونچا اٹھایا۔ ”پوری؟“

”چلو... آدھی سہی!“ داتن نے ڈھٹائی سے تصحیح کی، پھر ناک سے مکھی اڑائی۔ ”اور تمہاری یہ تنقیدی نظریں جو میرے اس کوزی آفس کو پچھلے بیس سیکنڈ سے ملامت کر کے میرے اوپر ترس کھا رہی ہیں، میں ان کو کھلے دل سے معاف کر دوں گی کیونکہ تم بھول رہی ہو کہ یہی وہ ڈبہ ہے جس میں بیٹھ کے ہم نے وہ تمام کام پلان کیے تھے جن کے باعث تم آج اس اونچے محل میں رہ رہی ہو۔“

”لگتا ہے بڑے زور کی لگی ہے۔ پیچ پیچ۔“ تالیہ نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ داتن نے چبھتی نظریں اس پہ جمائے ناک زور سے سکڑی۔

”میں Sun Tzu کی ماننے والی ہوں اور وہ کہتا تھا کہ جب امیر ہو تب غریب نظر آؤ اور جب غریب ہو تب امیر۔“

”اس نے یہ فقرہ طاقور اور کمزور کے بارے میں کہا تھا۔“

”مگر اس کا مطلب یہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔“

”اچھا چائے نہیں پلاؤ گی؟“ وہ بوری ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ داتن نے افسوس سے اسے دیکھ کے گہری سانس بھری۔

”تمہیں معلوم ہے ایک چائے کے اندر موجود caffeine انسان کو کتنے خطرناک اثرات سے دوچار کر سکتی ہے؟ بے شک

Emperor shennong نے دعویٰ کیا تھا کہ چائے بہت سی بیماریوں کی دوا ہے لیکن وہ چونکہ ایک بادشاہ تھا اس لئے اس پہ کبھی بھی

اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ چائے کی زیادتی سرورڈ Panic انکس، بے خوابی، ہارٹ برن، متلی، ڈائریا اور کنفیوژن کا باعث بن سکتی ہے۔“

”اوہ اسی لئے جب تم میرے گھر آتی ہو داتن تو میری پتی سب سے پہلے ختم ہوتی ہے۔“

”میں ایک موذی چیز سے تمہیں چھٹکارا دینے کی اپنی طرف سے کوشش ہی کر سکتی ہوں تالیہ لیکن اگر تم اس زہریلے مادے کی محبت میں

اس کی ایڈکشن میں اتنی مبتلا ہو ہی چکی ہو تو میں اس سے زیادہ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔“

”اُف تم اتنی لمبی بات کیوں کرتی ہو داتن؟“

مگر موٹی عورت نے میز پر رکھے ٹریولر مگ کا ڈھکن کھولا، اور پیچھے سے تھرماس اٹھا کر اس میں گرم چائے انڈیلی۔ تالیہ نے

شکر یہ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ داتن نے تھرماس واپس رکھی، کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی، اونگ سے گھونٹ بھر کے تسلی سے اسے

دیکھا۔ ”ہاں تو تم کیسے آئیں؟“

تالیہ نے گہری سانس لی، ایک چبھتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور گویا ہوئی۔

”تمہیں معلوم ہے میں کیوں آئی ہوں۔“

”او کے!“ داتن نے مگ پرے رکھا اور اپنا ٹیبلٹ نکال کے اسکرین اس کو دکھائی، یوں کہ ٹیبلٹ داتن کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

”یہ ہے وہ سکہ۔“ وہاں ایک اعلیٰ کوالٹی کی تصویر نظر آرہی تھی۔ تالیہ آگے ہوئی۔

”ما معلوم ذرائع سے یہ سکہ چند برس پہلے منظر عام پہ آیا تھا۔ تقریباً سترہ سال پہلے۔ یہ سلطان مظفر شاہ کے زمانے کے سکوں سے مختلف ہے لیکن برمیوزیم اور بریو پارٹی نے اس سے متعلق بہت سی کہانیاں سنائی ہیں، اور ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ سب جھوٹی ہیں۔ یہ سکہ زیادہ دیر کسی کے پاس ٹھہرنا نہیں ہے، یا بیچ دیا جاتا ہے یا تحفے میں دے دیا جاتا ہے یا نیلام ہو جاتا ہے۔ میں اس کا پورا ٹریل تو نہیں ڈھونڈ سکی لیکن پچھلے سات سالوں میں ہماری....“ وہ رکی اور مناسب لفظ ڈھونڈا۔ ”گیارہ بڑی ”جائز“ (وارداتوں) میں سے پانچ میں یہ سکہ موجود تھا۔“

”اور باقی میں؟“ اس نے بے قراری سے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تا کہ ٹیب لے لے مگر داتن نے اسے پیچھے کر لیا اور خفگی سے ہنسیوں سکڑیں۔ ”اگر تم چند لمحے کا سکوت اختیار کرو اور مجھے خود کو متاثر کرنے کا موقع دو تو میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ بے شک باقی سات وارداتوں میں یہ سکہ موجود نہیں تھا مگر ان ساتوں جگہوں پہ جو چیزیں موجود تھیں میں نے ان کی لسٹ بنائی تو.....“

”تو کوئی اور چیز تھی جو ان ساتوں جگہوں پہ موجود تھی؟“ وہ تیزی سے بولی تو داتن نے لب بھنج لئے۔ منہ کا ذائقہ تک خراب ہو گیا تھا۔ مگر ضبط کر کے کہنے لگی۔

”ہاں۔ میں نے سارا دن لگا کر کرائم سین فوٹوز اور اپنے ریسرچ ورک کو جو ہم نے واردات سے پہلے کیا تھا، اکٹھا کیا اور تمام فہرستوں کو کراس چیک کیا تو وہ ایک آئٹم تھا جو ان سب میں مشترک تھا۔ بوجھ کون سا؟“

”ملا کہ سلطنت کی ایک ملکہ کا سونے کا بریسلٹ۔ ہے نا۔“

داتن کے کندھے ڈھیلے ہوئے، منہ کھل گیا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”چونکہ میں چائے بہت پیتی ہوں اس لئے میری یادداشت بہت اچھی ہے، اور آج مسز کامل کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے ان کا بریسلٹ دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ ملا کہ سلطنت کی ایک ملکہ کا بریسلٹ بھی میں نے انہی سات جائز میں سے دو تین میں دیکھا تھا مگر نظر انداز کر دیا کیونکہ مجھے وہ نقلی لگا تھا اور ہم ہمیشہ اصلی اور تاریخی آرٹ پہ ہاتھ صاف کرتے ہیں داتن! اور وہ مجھے تاریخی نہیں لگا تھا۔“

”اگر سب کچھ معلوم ہو گیا تھا تو میرے پاس کیوں آئی ہو؟“ داتن نے برا سامنہ بناتے ہوئے ٹیب زور سے بند کر کے میز پہ رکھا۔

”کیونکہ اگر تم نے سارا دن اس کام پہ لگایا ہے تو شاید تمہیں کچھ ایسا معلوم ہوا ہو جو مجھے نہ ہو سکا ہو۔“ اس پہ داتن کھلے دل سے مسکرائی۔

”ویسے میں غور نہیں کرنا چاہتی لیکن تم متاثر ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ تالیہ بی بی کیونکہ نہ وہ سکہ کوئی سکہ ہے نہ وہ بریسلٹ کوئی

بریسلیٹ ہے۔ یہ دیکھو۔“ داتن نے ٹیب اسکرین اس کے سامنے کی تو وہ چونک کے آگے کوہو کے دیکھنے لگی۔ وہاں ایک طرف سکے کی تصویر بنی تھی اور دوسری طرف ایک زنجیر والا بریسلیٹ بنا تھا جس کے اوپر سونے کی مستطیل ڈلی سی تھی جس کے آخر میں تین دانت بنے تھے۔

”بظاہر یہ ایک سکہ ہے اور وہ ایک بریسلیٹ لیکن اگر ان دونوں کو جوڑ دو تو...“ داتن نے مسکراتے ہوئے منن دبایا تو ایک اور امیج جزیٹ ہوا جس میں ان دونوں اشیاء کے کنارے ملے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ”یہ دیکھو کیا بنتا ہے۔“

”چابی۔“ وہ مسحوری بولی۔ ”یہ ایک چابی کے دو ٹکڑے ہیں جس کے ساتھ زنجیر لگی ہے۔“

”ہاں۔ یہ ایک ٹوٹی ہوئی چابی ہے جس کو ہمیں ڈھونڈنا ہے اور تمہاری نقدیر بار بار تمہیں اس کی طرف لے جاتی تھی لیکن تم کبھی سمجھ ہی نہ سکی۔“ تالیہ کی آنکھوں میں چمک سی در آئی تھی۔

”سکہ نکالنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کل تنگو کامل کے گھر کچھ خاص مہمان آرہے ہیں، ڈنر کی افراتفری میں، میں زیورات ادل بدل کر کے سکھ نکال لوں گی۔ سکے کی کاپی ہم اس لئے تیار نہیں کریں گے کیونکہ بعد میں اگر ہمیں اس کو fence کرنا پڑے تو تنگو کامل یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ اس کے پاس بھی ویسا ہی سکا ہے ورنہ ہمیں اس کی اچھی قیمت نہیں ملے گی۔ تم بریسلیٹ کو ڈھونڈو کہ یہ کس کے پاس ہے۔“ وہ دبے دبے جوش سے بولی تو داتن نے ٹیک لگائے لگائے پر سوچ ہنکارا بھرا۔ پھر گک کا ڈھکن ہٹایا تو چائے کی خوشبو بھاپ کے ساتھ اوپر اٹھنے لگی۔ اس نے مگ لبوں سے لگایا، گھونٹ بھرا، اونگ نیچے کیا۔ اس دوران جیسے الفاظ جوڑے۔

”جتنا ان دو چیزوں کی ملکیت کی چین کو میں نے دیکھا ہے تالیہ... ان دونوں کو کبھی کسی نے نہیں چرایا۔ ان کو یا مالک بیچ دیتا ہے یا کسی میوزیم کو عطیہ کر دیتا ہے۔ جہاں کسی آکشن پر ان کو فروخت کر دیا جاتا ہے یا مالک خود ہی کسی دوست کو تحفہ دے دیتا ہے مگر۔“ پھر وہ چپ ہوئی۔ تالیہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس کے سامنے چائے کے بے رنگ دھوکے کے مرغولے تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔

”مگر ایک عجیب بات مجھے محسوس ہوئی ہے۔“ داتن نے کہنا شروع کیا۔

”میرا خیال تھا میرے ساتھ رہ رہ کر تم نے عجائبات پہ حیران ہونا چھوڑ دیا ہے۔“

”ہاں، میرا ذہن برا اس چیز کو مان سکتا ہے جس کو لوگ جھوٹ قرار دیتے ہیں کیونکہ ہماری حکومتیں اور ہمارے دانشور ہمیں ادنیٰ سمجھ کر ہم سے حقائق چھپاتے آئے ہیں۔ لیکن... یہ بات پھر بھی عجیب تھی کیونکہ میں نے نوٹس کیا کہ بروہ پرائیوٹ اونر جس کے پاس یہ سکھ یا یہ بریسلیٹ رہا ہے اس کو کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ کوئی بڑی موذی بیماری۔“

”ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو داتن۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ بس اس بریسلیٹ کو ڈھونڈو تا کہ ہم جلد از جلد اسے حاصل کر سکیں۔“ پھر خلا میں دیکھتے ہوئے وہ گہری سانس بھر کے بولی۔ ”مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں نے اتنے سال ضائع کر دیے۔ میں کل سے یہی سوچ رہی ہوں۔ میری قسمت مجھے اس چابی تک لے جانا چاہتی تھی اور میں دوسری چیزوں میں پڑی رہی۔ اس چابی کی قیمت ان سب سے زیادہ ہوگی۔ یقیناً۔“

مجھے لگتا ہے داتن....“ اس نے پُر امید نظریں اس پہ جمائیں۔ ”یہ وہی بڑی ‘جواب‘ ہے جس کا میں انتظار کر رہی تھی۔ میری آخری چوری۔ آخری Heist۔ وہ کیا کہتے ہیں ‘Score of the scores’۔ اور اس سے میں اتنا کمالوں گی کہ پھر دوبارہ کوئی غلط کام نہیں کرنا پڑے گا۔“

”تالیہ... کوئی چوری ہماری آخری چوری نہیں ہو سکتی۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ نہ کبھی بدلیں گے۔“ اس نے سمجھانا چاہا مگر وہ بضد تھی۔ ”مجھے لگتا ہے میں بدل جاؤں گی۔ اس لئے اس چابی کو ڈھونڈ داتن۔ ایک آخری اونچا ہاتھ مار کے ہم کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“

”پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ ہم اس کی کھوج نہ لگائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی بری شے... کوئی بلا ہماری گھات لگائے نہ بیٹھی ہو۔“ وہ غیر آرام دہ نظر آرہی تھی۔

”تم وہم کر رہی ہو یا ر۔ حوصلہ رکھو۔“ وہ ناک سے مکھی اڑاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیگ بھی اٹھالیا۔ داتن نے سمجھ کے سر ہلا دیا۔ ”اوکے“ میں اسے ڈھونڈوں گی۔ مگر جو اس روز تم نے خواب دیکھا، تم نے بتایا تھا کہ اس میں بھی تم نے ایک آدمی کو کچھڑ میں لتھڑی چابی تمہاری طرف بڑھاتے دیکھا تھا۔“ یاد کرتے ہوئے وہ خود چونکی۔ ”کیا وہ یہی چابی تھی؟“ چائے کے مگ کا ڈھکن ہٹا تھا اور اس سے بھاپ بنوڑاڑ رہی تھی۔ تالیہ ٹھہر گئی۔ خود بھی جیسے وہ چونکی تھی۔

”ہاں۔ وہ یہی تھی۔“ اس نے ٹیبلٹ اٹھا کے پھر سے اس چابی کو غور سے دیکھا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ ایک ننھی کلائی پہ بندھا ہوا۔ سیلیٹ۔ پزل کا ایک اور ٹکڑا عین اپنی جگہ پہ آگرا تھا۔

”ویسے وہ آدمی کون تھا تالیہ؟“ داتن نے تجسس سے پوچھا مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔ ”میں نے یہ بری سیلیٹ دیکھ رکھا ہے پہلے۔ مجھے پتہ ہے یہ کس کا تھا۔“ پھر اس کے چہرے پہ سختی آگئی۔ جیسے بے چینی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت ہو۔ ”مسز مار یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ اس نے ٹیبلٹ پٹھا اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ داتن حیرت سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ ”اے کیا ہوا؟“

☆☆=====☆☆

اگلی صبح جب کوالا پور کی بلند بالا عمارتیں دھوپ میں سینٹا نے کھڑی تھیں اور نمی سے بوجھل فضا نے ماحول میں جس سا پیدا کر رکھا تھا، شہر کے ایک مفلوک الحال علاقے میں فلیٹ بلڈنگز کی بالکونیوں میں رسیوں پہ کپڑے سوکھتے دکھائی دے رہے تھے۔ اتوار کے باعث شاید ساری عمارت کی عورتوں نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ ایسے میں تالیہ بنت مراد ایک فلیٹ بلڈنگ کی گندی میلی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ مالے طرز کا حجاب پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ اور لمبی قمیص جیسا لباس اور اس کے اوپر کس کے لیا گیا اسکارف جس پہ مزید ایک دوپٹہ پھیلا رکھا تھا۔ آنکھوں پہ نظر کا چشمہ لگا تھا اور وہ پہلے سے مختلف نظر آرہی تھی۔ تیسری منزل کے ایک دروازے کے سامنے وہ رکی اور نیل

بجائی۔

”آ رہی ہوں۔“ عورت کی آواز سنائی دی جیسے وہ تکلیف میں آہستہ آہستہ چلتی دروازے تک آ رہی ہو۔ پھر دروازہ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر عورت نظر آئی جس کا چہرہ کریلے کے خول کی مانند جھریوں زدہ تھا اور سفید سرمئی بال چوٹی میں گندھے تھے۔ نظر کے موٹے چشمے سے اس نے سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے کو دیکھا تو چہرہ کھل اٹھا۔

”تا... تالیہ... آؤ آؤ۔ بڑے عرصے بعد آئیں تم... آ جاؤ...“ انہوں نے خوشی سے اسے راستہ دیا۔ وہ سلام کر کے سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ وہ تنگ و تاریک سافلیٹ تھا۔ سامنے ایک لاؤنج نما چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں صوفے رکھے تھے۔ خاتون گھٹنوں کے درد کے باعث میز پر سیدھی چلتی آگے آئیں صوفوں سے کپڑے ہٹائے اور بیٹھنے کو جگہ بنائی۔

”آؤ بیٹھو۔ آج مشین لگا رہی تھی تو سارا گھر کپڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ حالانکہ ایک میرے کتنے کپڑے ہوتے ہیں۔ تم بیٹھو میں شربت لاتی ہوں۔“

”او کے مسز ماریہ۔“ وہ مسکرا کے بیٹھ گئی۔ وہ گئیں تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور اس پہ خفگی نظر آنے لگی۔ جسے اس نے پھر سے مصنوعی مسکراہٹ کے پردے میں چھپالیا۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے شربت کی ٹرے رکھ دی تھیں۔ ”اتنا اچھا لگتا ہے تمہیں یوں دیکھ کے۔ ابھی تک سکول میں پڑھا رہی ہو؟“

”جی۔“ وہ مسکرا کے بولی۔ ”دینیات اور میتھس پڑھاتی ہوں۔“ وہ نظریں جھکا کے شرافت سے بولی تھی۔

”شو بڑے بچے سب ٹھیک ہیں۔“

”جی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے تو میں وقت نکال کے آ گئی۔“ اس کام آرٹس کی مسکراہٹ ویسی ہی سادہ تھی۔

”کبھی ان کو ساتھ بھی لے آؤ مجھ سے ملوانے۔ صرف تصویریں دکھائی ہیں تم نے اب تک۔“ انہوں نے شکوہ کیا۔

”بس جب آپ سے ملتی ہوں تو اپنا آپ بھی بچہ لگنے لگتا ہے۔ آپ یتیم خانے کی منتظم تھیں اور تین سال میرا وہاں خیال رکھا تھا آپ نے۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کے پرانی باتیں یاد کرنے کا دل کرتا ہے مسز ماریہ۔“ بات موڑ دی۔

”خوش رہو جیتی رہو۔“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”جو بچے چھوڑ جاتے ہیں یتیم خانہ وہ کبھی واپس نہیں آتے۔ مگر جس طرح تم واپس آ جاتی ہو پیسے بھیجتی رہتی ہو۔ دل بہت خوش ہوتا ہے۔“

شربت سے بھرا گلاس دونوں کے درمیان ان چھوڑا رکھا تھا۔ تالیہ نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس نظریں ان کے بیمار زرد چہرے پہ جمائے رکھیں۔ ”مسز ماریہ... آپ کو کبھی علم نہیں ہو سکا کہ مجھے وہاں کون چھوڑ گیا تھا۔“

”یہ معمہ میں بھی کبھی حل نہیں کر سکی۔ رات کو چرچ بند ہوتا تھا۔ صبح جو پہلا بندہ ادھر گیا اس کو تم وہیں ملی تھی۔“

”مجھے وہ سب یاد ہے۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ آپ عبادت کے لئے جلدی آ گئی تھیں اور مجھے روک کے کچھ پوچھا تھا آپ نے۔“

”ہاں“ میں پھر تمہیں یتیم خانے لے آئی۔ وہیں پولیس بھی بلائی۔ مگر کوئی بھی تمہارے ماں باپ کو نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔ تمہارے کپڑے عجیب سے تھے۔ پھٹے پرانے میلے کپڑے۔ تمہیں میں نے نئے کپڑے دیے تمہیں تیار کیا۔ اور....“ وہ یاد کر کے ذرا جوش سے بولے جا رہی تھیں کہ تالیہ ایک دم بولی۔ ”مجھے میرے ماں باپ مل گئے ہیں مسز ماریہ۔“ مسز ماریہ رکیں۔ منہ کھل گیا۔ بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا جس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے اور وہ خوشی سے بتا رہی تھی۔

”ایک ویب سائٹ گمشدہ بچوں کو ان کے ماں باپ سے ملاتی ہے۔ میں نے اپنے بچپن کی تصویر ڈالی تو ایک جوڑے نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ مالے ہیں مگر امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں نے ان کو اپنی ڈی این اے رپورٹ بھیجی تو وہ میچ کر گئی۔ اب میں امریکہ جا رہی ہوں۔“ ”واؤ تالیہ.... واؤ۔“ وہ خوشگوار گرم جوش سے اس کا ہاتھ دبائے کہنے لگیں۔ ”میں بہت خوش ہوں تمہارے لئے۔ یہ تو انہونی ہو گئی۔ مگر اس وقت وہ کیوں نہیں آئے تھے تمہیں کلیم کرنے؟“

”ان کی مجبور یوں کی لمبی داستان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا لیکن....“ وہ ٹھہری۔ آواز از دانہ سرگوشی میں بدلی اور آگے کوچھکی۔ ”انہوں نے بیس ہزار ڈالر کا انعام دینے کا وعدہ کیا ہے میرے کیریئر کو۔ میری لاہور والی فیملی اتنی اچھی نہیں تھی، میں نہیں چاہتی یہ انعام ان کو ملے۔ میں چاہتی ہوں یہ یتیم خانے کے لوگوں کو ملے یعنی آپ کو ملے۔“ اس کام آرٹسٹ نے پہلا پتہ پھینکا۔

”بیس ہزار ڈالر؟“ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

”جی مسز ماریہ وہ بہت امیر لوگ ہیں۔ میرے بعد ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ خوشی میں کر رہے ہیں یہ سب۔ مگر.... ایک مسئلہ ہے۔“ ”کیا؟“ ان کی سانس اٹک گئی۔

”وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ ثابت کر کے دوں کہ آپ واقعی مجھے چرچ میں ملی تھیں۔ ظاہر ہے اتنی بڑی رقم دینے سے پہلے ان کو گارنٹی چاہیے کہ آپ واقعی میری کیریئر تھیں یا نہیں۔“

”میں.... میں کیسے ثابت کروں؟“ وہ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں اور مارے جذبات کے اس کے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔

”آپ کوئی نشانی بتا سکتی ہیں۔ کوئی ایسی بات جو صرف آپ کو ہی معلوم ہو سکتی ہو۔ اصل میں....“ اس نے لہجے کو سرسری بنایا۔ نگاہیں ایک لمحے کو بھی خاتون کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔ ”کل.... میں مال میں ایک بریسلٹ دیکھ رہی تھی.... تو مجھے یاد آیا.... چرچ کا

منظر.... میری یادداشت اچھی ہے کافی.... چرچ سے لے کر اب تک سب یاد ہے مجھے.... پہلے یہ بات مجھے اہم نہیں لگی تھی مگر کل.... اپنے ماں باپ کے ملنے کے بعد.... مجھے یاد آیا کہ میری کلائی میں ایک بریسلٹ تھا جس پہ سونے کی ایک چابی بنی تھی۔ صرف پہلے منظر میں مجھے وہ یاد ہے۔ پھر وہ پتہ نہیں کہاں گیا۔ اگر آپ اس کے بارے میں کچھ بتا دیں تو....“ وہ بنا پلک جھپکے مسز ماریہ کو دیکھ رہی تھی جن کا چہرہ ایک دم

پھیکا پڑا تھا۔

”وہ؟“ وہ چپ ہو گئیں۔

”چلیں اگر آپ کو نہیں یاد تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنے والدین کو یتیم خانے والے قاسم صاحب کا نام دے دیتی ہوں تاکہ....“ وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”نہیں نہیں.... قاسم نے کیا کیا تمہارے لئے؟ مجھے یاد ہے میں بتاتی ہوں۔“ انہوں نے ہڑبڑا کے اسے روکا۔ ”تمہارے ہاتھ میں ایک بریسلیٹ تھا۔ اصل میں وہ چابی تھی جس کی سنہری چین کو تم نے کلائی پہ پہن رکھا تھا۔ میں نے وہ تمہارے ہاتھ سے اتاری تو وہ ایک دم ٹوٹ گئی۔ مجھے نہیں پتہ تالیہ یہ کیسے ہوا مگر اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سکا انک ہو گیا اور بریسلیٹ پہ ڈلی سی رہ گئی۔ مجھے تمہاری نگہداشت کرنی تھی تمہارے لئے یتیم خانے میں جگہ بنانی تھی فنڈز نہیں تھے میں کیا کرتی تالیہ۔“

”اٹس اوکے۔“ تالیہ نے نرمی سے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔ ”آپ نے وہ چر الیا کیونکہ آپ کو پیسے چاہیے تھے میں اس بات کو سمجھ سکتی ہوں۔“ پھر اس نے سیل فون کی اسکرین سامنے کی۔ ”کیا وہ ایسا تھا؟“

انہوں نے غور سے اسکرین کو دیکھا۔ ”ہاں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ایسا ہی ڈیزائن تھا۔ اتنے سال ہو گئے اب یادداشت جواب دینے لگی ہے۔ آئی ایم سوری مگر میری مجبوری تھی۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میرا ایک رشتہ دار سنار تھا میں نے وہ اس کو بیچ دیا۔ وہ عجیب سی چیز تھی۔ مجھے اس سے خوف آتا تھا۔ مگر اس کے جانے کے بعد تم چپ ہو گئیں بالکل۔“

تالیہ نے بے اختیار صوفے کی گدی مٹھی میں بھنچ لی۔ اس کا سانس اٹک گیا تھا۔ ”اس کے بعد چپ ہوئی؟ مگر آپ لوگ تو کہتے تھے کہ میں ہمیشہ سے چپ تھی مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔“

”نہیں۔ پہلے چند منٹ جب تک تمہارے ہاتھ میں بریسلیٹ تھا تم نے کچھ باتیں کی تھیں۔ وہ تمہارے ہاتھ میں چمکتی تھا۔ جیسے اس سے روشنی نکلتی ہو۔ میں نے اسے تمہاری کلائی سے اتار تو وہ بجھ گیا اور چابی دو ٹکڑے ہو گئی۔ مجھے اس سے خوف آیا تھا تالیہ۔“

”میں نے.... کیا باتیں کی تھیں۔“ اس نے رندھے گلے سے پوچھا تھا۔

”صحیح الفاظ یاد نہیں۔ اتنے سال بیت گئے اب تو تالیہ مگر اتنا یاد ہے کہ تم نے کہا تھا گاؤں والے مصیبت میں ہیں۔ تم ان کے لئے مدد لینے آئی ہو ورنہ سب مرجائیں گے۔ تم نے کہا تمہیں ان سب کو پہچانا ہے۔ میں نے پوچھا یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے تو تم نے کہا یہ میرے بابا نے مجھے دی ہے۔ میں نے تمہارا نام پوچھا تو تم نے کہا تالیہ بنت مراد۔ لیکن جب میں نے وہ بریسلیٹ اتارا تو تم خاموش ہو گئیں جیسے تمہیں سب بھول گیا ہو۔“

تالیہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے مگر اب کی بار وہ اصلی آنسو تھے۔ ”اور کچھ۔“

”اور مجھے یاد نہیں۔ کیا یہ کافی ہو گا تمہارے ماں باپ کو یقین دلانے کے لئے؟“

”ہوں؟“ وہ چونکی۔ پھر اپنی کوراسٹوری یاد آئی تو زبردستی مسکرائی۔ ”میں ان کو بتا دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”انعام کی رقم کب تک ملے گی؟“ وہ بے قراری سے اس کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ وہ بدقت مسکرا کے ان کو تسلی دلانے لگی۔

☆☆=====☆☆

رات اس پوش علاقے پہ اپنے پر پھیلائے اتری تو حالم کے اس اونچے عالیشان گھر کی بیرونی بتیاں جگمگاتی دکھائی دیئے لگیں۔
لاؤنج میں البتہ اندھیرا تھا، صرف بڑی سی ٹی وی اسکرین چمک رہی تھی جس کے سامنے وہ دونوں صوفے پہ بیٹھی تھیں۔

داتن نے سیاہ کھلاباس پہن رکھا تھا اور ناگلوں کی قیمتی بنارکھی تھی۔ گود میں باپ کارن کا پیالہ تھا جس سے وہ بھنے ہوئے تازہ خستہ پاپ کارن نکال نکال کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ نظریں اسکرین پہ جمی تھیں جہاں ایک مالے گیم شو چل رہا تھا۔ ایک فیملی گھر جیتنے ہی والی تھی اور داتن کی سانس رک رک کے آرہی تھی۔

ساتھ پیر اوپر کر کے بیٹھی تالیہ دور خلا میں گھور رہی تھی۔ گم صم۔ کسی اور دھیان میں۔ سیاہ بال ہنیر بینڈ لگا کر پیچھے کر رکھے تھے اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ انگلی بے مقصد سی صوفے کے ہاتھ پہ بنے ڈیزائن پہ پھیر رہی تھی۔
”آخری راؤنڈ... اُف اللہ۔“ داتن ذرا آگے ہوئی۔

”وہ چابی میری تھی داتن۔ وہ میرے باپ نے بنائی تھی۔“

داتن چونکی اور گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ اسی طرح صوفے کے ڈیزائن پہ انگلی پھیرتی بے خودی بولے جا رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی تھی۔

”میں آج مسز ماریہ سے ملنے گئی تھی۔“ الفاظ اس کے لبوں سے بہتے جا رہے تھے گویا مکئی کے دانے ہوں جو حدت ملنے پہ چٹچڑھ رہے ہوں۔ وہ کہے جا رہی تھی اور داتن بھٹے کی خستہ خوشبو سے دہک سی گئی تھی۔ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے، آنکھوں میں غصہ ابھر آیا۔
”اس نے تمہارا بریسلٹ بیچ دیا؟ اُف اُف۔ خبردار جو آئندہ تم نے مسز ماریہ کی کوئی مالی مدد کی۔“
”کیوں؟“

”کیونکہ وہ ایک بددیانت چور ہے!“

”اور میں کیا ہوں؟“ اس نے سادگی سے داتن کو دیکھا تو وہ ناک سکڑ کے رہ گئی۔

”اس عورت نے تین سال میرا خیال رکھا جب مجھے کوئی اور لینے نہیں آیا۔ مجھے ان پہ تھوڑا غصہ آیا تھا مگر مجھے ان سے گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”خیر... اب کیا کرنا ہے؟“

”تم بریسلٹ تلاش کرو، میں سکے کو تنگو کامل کے لاکر سے چوری کرتی ہوں۔ کل جب مہمانوں کا رش ہو گا تو میں موقع دیکھ کے اسٹڈی میں چلی جاؤں گی۔“

”کیا تم وہ چابی صرف پیسوں کے لئے چرانا چاہتی ہو تالیہ؟“

تالیہ نے گہری سانس لی، داتن کو دیکھا اور مٹھی بھر کے پیالے سے پاپ کارن اٹھائے۔ ”جب تک مجھے یہ یاد نہیں آیا تھا کہ وہ میری چابی ہے، میں اسے دولت کے لئے ہی چرانا چاہتی تھی، مگر اب...“ اس نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے پاپ کارن پھانکے۔ اور بند ہونٹ ہلاتے ہوئے انہیں چبانے لگی۔ لمبے بھر کولانچ میں سنانا چھا گیا۔ داتن اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جوٹی وی اسکرین کی نیلی روشنی میں دمک رہا تھا۔

”مگر اب شاید مجھے میرے تمام سوالوں کے جواب بھی مل جائیں، میں کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں۔ سب معلوم ہو جائے۔“

”اور تمہارے ماں باپ۔ تم ان سے نہیں ملنا چاہتی؟ اور وہ گاؤں والے جن کا تم نے ذکر کیا تھا؟“

”سچ کہوں تو نہیں، داتن۔ میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ مجھے ان سے نہیں ملنا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ وہ دیکھیں میں کیا بن گئی ہوں۔“ تلخی سے مسکرا کے وہ اسکرین کو دیکھنے لگی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ مسز ماریہ کی آواز ہرجگہ گونج رہی تھی۔

(تم نے کہا تھا، گاؤں والے مصیبت میں ہیں۔ تم ان کے لئے مدد لینے آئی ہو ورنہ سب مرجائیں گے۔ تم نے کہا تمہیں ان سب کو بچانا ہے۔)

مگر اس نے سر جھٹکا۔ (مجھے کسی کو نہیں بچانا۔ مجھے کسی کی مدد نہیں کرنی۔ اب تک تو سب مر چکے گئے ہوں گے۔ مجھے صرف چابی کو اچھے داموں بیچنا ہے۔ تاریخی نوادرات منگے داموں بک جاتے ہیں۔ میرے خواب... ایک جزیرے پہ ایک اونچا محل... بس مجھے یہی سوچنا ہے۔)

”ویسے کل کون آرہا ہے تنگو کامل کے گھر؟“ داتن کی بات نے اس کو گہری سوچ سے نکالا۔ ”پتہ نہیں۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”جب بڑے لوگ بڑے لوگوں کے گھروں میں آتے ہیں تو وہ ہم چھوٹے لوگوں کو تفصیلات نہیں بتاتے۔ سکیورٹی پر نوکول۔“

مگر داتن جواب سے بنا اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ فیملی آخری راؤنڈ میں تھی گھر جیتنے کے بہت قریب۔

☆☆=====☆☆

صبح سے تنگو کامل کے گھر صفائی اور تیاریوں کا ایسا سماء بندھا تھا کہ چند ایک بار تو تالیہ نے بٹلر کو روک کے پوچھنا چاہا کہ آخر آکون رہا ہے؟ مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ کون سا وہ بتا دے گا۔ ہونہ۔

مسز شیللا کامل مضطرب اور پر جوش ی کچن میں ایک ایک چیز اپنی نگرانی میں تیار کروا رہی تھیں۔ باریک ہیل پہنے وہ بالوں کو پارلر سے سیٹ کروائے بے حد خوش اور زور وں نظر آرہی تھیں۔ مگر جب انہوں نے تالیہ اور تسنیم کو کھانا لانے کی ترتیب کی ہدایت دینا شروع کی تو تالیہ کے ابرو حیرت سے اکٹھے ہوئے۔

”بچپس منٹ؟ صرف بچپس منٹ کے لئے وہ لوگ آرہے ہیں کیا؟ مسز کامل نے اسے یوں دیکھا گویا اس کی عقل پہ افسوس کیا ہو۔“ ہاں تالیہ۔ بچپس منٹ بھی بہت ہیں۔“ اور ناک سے مکھی اڑاتی آگے بڑھ گئیں۔ تسنیم نے کندھے اچکا دیے۔ کسی ملازم کو اندازہ نہ تھا کہ مہمان

کون تھے۔ بس بنکر نے کام کے دوران اتنا بتایا کہ سر کے کلاس فیلو اور ان کی بیگم ہیں۔ تسنیم نے بنکر کے آگے بڑھتے ہی اس کے کان میں سر گوشہ کی۔

”کامل صاحب کے کلاس فیلو ہیں تو اچھے خاصے بوڑھے ہوں گے۔ آخر ایک بوڑھے اور بڑھیا کے آنے پہ اتنا ہنگامہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

تالیہ بے اختیار ہنس دی۔ پھر اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے ایپرٹن پہ سامنے ہاتھ رکھ کے نقلی زیورات کی موجودگی کی تصدیق کی جو پولی کی صورت بیلٹ کے ساتھ اس کی کمر سے بندھے تھے۔ لا کر کھول کے زیورات اول بدل کرنے کے لیے پچیس منٹ بھی کافی تھے۔ شام ڈھل گئی اور گھر پہ اندھیرا چھانے لگا۔ مالے گھر بھی کراچی کے بنگلوں جیسے تھے۔ ویسے ہی لان پورچ، ڈرائیوے اور سامنے گیٹ۔ اونچی چار دیواری۔ کچن کی کھڑکی سے لان نظر آتا تھا۔ وہاں تنگو کامل اپنے بیوی بچوں سمیت کب سے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

تالیہ منہمک سی کھڑی سلاڈ پلیٹ میں سجا رہی تھی جب باہر پر رونق سا شور مچا۔ تسنیم اور نور (ساتھی ملازمائیں) لپک کے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گاڑیوں کے اندر آنے اور دروازوں کے کھنسنے بند ہونے کی آوازوں کے ساتھ دعا سلام بھی گونجا تھا۔ تالیہ مزے سے سلاڈ کے قتلے ڈش میں سجا گئی۔

”او خدا یا۔ اُف اُف۔ کیا تم نے انہیں دیکھا؟“ کھڑکی سے باہر جھانکتی تسنیم نے مہمانوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا تو مارے جوش کے اس نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ نور باقاعدہ اوپر نیچے اچھلی پھر دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔

”اُف.... یہ تو.... مجھے یقین نہیں آرہا۔“

”انہوں نے گرے سوٹ پہن رکھا ہے۔“

”وہ ان کی وائف کو دیکھو۔ اس نے صبح یہی ڈریس مارنگ شو کے انٹرویو میں پہنا ہوا تھا۔ اُف اُف۔“ ان دونوں کے چہرے سرخ پڑنے کے متمم رہے تھے اور وہ کبھی منہ پہ ہاتھ رکھتیں، کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ مارے جوش کے پکڑتیں۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور افسوس سے سر جھٹکا۔

(خیر.... یہ بے چاریاں ملازمائیں ہیں! امیر اور مشہور لوگ دیکھنے کا موقع کہاں ملتا ہے ان کو۔ ان کا ایسا جذباتی ہونا بنتا ہے۔) اس نے سلاڈ کی ڈش رکھی اور تسلی سے ہاتھ رومال سے پونچھتی آگے آئی۔ ان دونوں کے قریب رکی اور باہر جھانکا۔

گارڈز اور چند افراد کے ہمراہ وہ دونوں میاں بیوی کار سے اتر چکے تھے اور میزبانوں سے مل رہے تھے۔ گرے سوٹ والا آدمی دراز قد اور بلا پٹا تھا۔ فٹ اور اسارٹ۔ مسٹر کامل سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی پشت تالیہ کی طرف تھی۔ پھر وہ پلٹا تو تنگو کامل کے بیٹے علی کے قریب ٹھہرا۔ علی نے اس کا ہاتھ تھاما اور چوم کے آنکھوں سے لگایا۔ یہ مالے لوگوں کا بڑوں سے ملنے کا طریقہ تھا۔ اور تب تالیہ نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا۔

”ہا!“ اس نے بے اختیار ہونٹوں پہ ہاتھ رکھا تھا۔ آنکھیں شاک سے پھیل گئیں، سانس اٹک اٹک گئی اور رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ”اوہ گاڈ.... اوگاڈ۔“ اس نے بے یقینی سے نور اور تسنیم کو دیکھا جو اتنی ہی بے یقینی سے اور خوشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

وہ شخص اب مسکرا کے بچے کا سر تھپک رہا تھا، پھر چہرہ کامل صاحب کی طرف موڑ کے کچھ کہنے لگا۔ اور ادھر تالیہ مراد کھڑکی میں ہکا بکاسی کھڑی تھی۔ نور نے اس کا کندھا ہلایا۔ ”تمہارا فون بج رہا ہے تالیہ۔“

وہ چونکی، پھر اپرن کی جیب سے فون نکال کر بغیر دیکھے کان سے لگایا۔ نظریں وہیں باہر جمی تھیں۔ دوسرا ہاتھ ابھی تک ہونٹوں پہ تھا۔ اُف۔ ”بریسلیٹ کا پیہ چل گیا تالیہ۔ اور تم یقین نہیں کرو گی کہ وہ کس کے پاس ہے۔“ وہ جوش سے بتا رہی تھی۔ ”میری اس شخص سے بات ہوئی ہے جس نے آخری دفعہ اسے بچا ہے۔ اس سے ایک آدمی نے خریدا تھا وہ بریسلیٹ اپنی بہن کی سالگرہ کے لئے اور جانتی ہو اس کی بہن کس کی بیوی ہے؟“

”شاید میں جانتی ہوں۔“ وہ نظریں باہر نکائے بے خودی کہہ رہی تھی۔

وہ پورچ میں کھڑا، علی بن کامل کی طرف اشارہ کر کے اس کے باپ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ یا شاید بچے کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ دراز قد تھا، کسرتی جسم والا بے حد فٹ اور تیز چلنے والا آدمی.....

”نہیں تم نہیں جانتیں۔ اس کی بہن کا شو ہر اس ملک کا سب سے پاپولر ایڈر ہے.....“

اس کی رنگت صاف تھی، بے حد صاف، نقوش چینی تھے، مگر بہت پرکشش۔ وجیہ چہرہ اور چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھیں۔ وہ اب تنگو کامل کی بات پہ مسکرا رہا تھا۔

”بارسین نیشٹل کا ہونے والا نیا صدر.....“

اس کے بال سیاہ تھے اور نفاست سے برش کر کے پیچھے کر رکھے تھے۔ کانوں کے اوپر سے وہ سفید تھے جو اس کے چہرے کی نرمی اور وقار میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ اڑتالیس برس کا تھا مگر اپنی فٹنس اور جوان نظر آتے چہرے کے باعث عمر سے دس پندرہ برس کم دکھائی دیتا تھا۔

”..... ہمارے ملک کا اگلا وزیراعظم..... وان فاتح رامنزل.... اس کے گھر ہے تمہارا بریسلیٹ، تالیہ۔“

بے یقینی سی تالیہ ہنوز باہر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ دونوں ملازمین باہر بھاگ چکی تھیں۔

”اور اگر میں تمہیں یہ کہوں داتن کہ وان فاتح بن رامنزل اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے تو کیا تم یقین کرو گی؟“ وہ بے خودی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف داتن نے گہری سانس بھری تھی۔

”تالیہ..... میں جانتی ہوں اس کا نام سن کر تم صدے اور Fan Moment کی ملی جلی کیفیت میں ہو، اس لئے کوئی بات نہیں، ٹھنڈا پانی

پیو اور پھر لا کر کی طرف جاؤ۔ بریسلیٹ کا ابھی نہ سوچو۔“ اس کے الفاظ نے کوئی بلبلہ سا پھاڑ دیا تھا۔ تالیہ کے ماتھے پہ ہل پڑے۔

”چپ کرو، موٹی کالی مرغی!“ وہ جل کر بولی اور فون بند کر کے جیب میں رکھا پھر کھڑکی سے باہر جھانکا تو پورچ اب خالی تھا۔ یقیناً

مہمانوں کو لے کر میزبان اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے۔ اس نے بے قراری سے کچن کے دروازے کو دیکھا۔ سب ملازم مہمانوں کے آگے پیچھے بھاگ چکے تھے۔ وہ جائے یا نہیں؟

انہوں نے اس نے گہرے گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کرتے ہوئے Fan Moment سے نکلنے کی کوشش کی۔ کندھے اچکائے اور سینے پہ بازو لپیٹ کر وہیں کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ میں کوئی باقی لوگوں کی طرح فاتح رامنزل کی اتنی بڑی فین تھوڑی ہوں جو اپنے ذاتی وقار اور خود اعتمادی کو پس پشت ڈال کر چھوٹے لوگوں کی طرح سلیمیر ٹی کے آگے پیچھے بھاگتی پھروں۔ ہونہہ۔“ وہ اسی طرح اکڑ کے کھڑی رہی۔ چند سانس لیں۔ پھر ایک دم بازو نیچے گرائے اور باہر کو بھاگی۔

(مٹی ڈالو وقار اور اعتماد پہ۔ وہ فاتح رامنزل ہے۔ اُف۔ دی فاتح رامنزل۔) تیز تیز دوڑتی وہ ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی تھی۔ چہرہ خوشی سے گلابی سا متمنا لگا تھا۔ ملازمائیں وہاں پہلے سے کھڑی پر جوشی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے پاس آرکی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر یہاں سے صرف کامل صاحب اور مسز کامل بیٹھے نظر آتے تھے۔ مہمان نہیں۔ تبھی بٹلر باہر نکلا اور سخت لہجے میں تالیہ کو مخاطب کیا۔ ”جوس تم سر و کرو گی۔ جلدی۔“

اس کی رنگت مزید گلابی پڑ گئی۔ جھٹ سر ہلایا اور کچن کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی ٹرے لگائی اور ڈرائنگ روم تک آئی۔ دروازے پہ لگے بیضوی آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ سائیڈ کی مانگ نکال کر بالوں کو کس کر جوڑے میں باندھے وہ سرمئی سفید یونیفارم میں ملبوس تھی۔ چہرہ دھلا دھلایا اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اُف خیر ہے۔ اس نے سر جھٹکا اور اندر داخل ہوئی۔

ڈرائنگ روم میں تیز اے سی چل رہے تھے مگر اس کے ہاتھوں پہ پسینہ آ رہا تھا۔ ٹھنڈے ماحول کو زرد لیمپس کی روشنیوں نے مزید مسحور کن اور پرفسوں بنا رکھا تھا۔ میزبان جوڑے کے علاوہ مہمان جوڑا اور تین افراد بیٹھے تھے۔ فاتح رامنزل سامنے والے صوفے پہ موجود تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلائے وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ ذرا موڑے کامل صاحب کی بات سن رہا تھا۔ برابر میں اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ اس کے بال بھورے سرخ ذاتی تھے اور ہاف باندھ رکھے تھے۔ وہ بالکل سپاٹ چہرہ لیے ہوئے تھی۔ آنکھیں بے جان تھیں۔ وہ دونوں ٹرے اٹھائے آتی ملازمہ کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ تالیہ باری باری سب کے پاس رک کر جوس پیش کرنے لگی۔ ”سوری میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں۔“ جذباتی سی مسز کامل نے اپنے شوہر کی بات ٹوکتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ ”مگر وان فاتح رامنزل اور مسز رامنزل... آپ دونوں کا ایک دفعہ پھر شکریہ کہ آپ نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔“

”مائی پلیز۔“ وہ بھاری مسکراتی آواز میں بولا تھا۔ تالیہ کی اس طرف پشت تھی.... یہ آواز.... یہ شخص.... یہی تھا اس کے خواب میں.... میرے ساتھ رہو.... میرے ساتھ رہو۔) اس نے سر جھٹکا۔ اور جھک کے اگلے صاحب کے سامنے ٹرے کی۔

”کیا یہ درست ہے سر کہ آپ استعفیٰ دے رہے ہیں اور واپس امریکہ شفٹ ہو رہے ہیں؟ ہم نیوز میں سنتے رہتے ہیں۔“ کامل صاحب کے سوال پہ تمام نظریں فاتح رامنزل کی جانب اٹھی تھیں۔ وہ جواباً کھٹکھارا۔

”دیکھو تنگو کامل.... بات یہ ہے کہ فاتح بن رامزل جیسا انسان جو دو دفعہ امریکہ میں اسٹیٹ انارنی کا الیکشن لڑ کے منتخب ہوا تھا اور جس کے زمانے میں اسٹیٹ انارنی آفس میں پراسیکیوشن کا ریکارڈ مثالی رہا تھا.... اور جو پندرہ سال پہلے امریکہ چھوڑ کے.... امریکی شہریت چھوڑ کے صرف مالے قوم کے لئے واپس آیا تھا اس آدمی کو اتنی لمبی اسٹرگل کے بعد اگر باریسن پارٹی کا صدر منتخب ہونے کے لئے اور فنڈز حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کے محل میں ہر روز ماتھا میکنا پڑے جیسے وہ عظیم بدھا ہوا اور میں ایک بچاری تو نہیں فاتح یہ نہیں کرے گا۔ مجھ سے یہ منافقت نہیں ہوتی کیونکہ ہمارے بادشاہ اور ہمارے وزیر اعظم دونوں کو اس وقت جیل میں ہونا چاہیے۔ ہاں میں جیل میں ان دونوں کو برہنہ وزٹ کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ اس بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔ (مگر فاتح رامزل نے سوال کا جواب نہیں دیا۔) وہ سوچتے ہوئے پاٹ چہرہ بنائے اب بڑے صوفے تک آرکی تھی۔ فاتح رامزل کے ایک طرف سے جھک کے ٹرے پیش کی۔ کپکپاتی پلکیں اٹھا کے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ تنگو کامل کو دیکھ رہا تھا مسکرا کے۔ ایک شان بے نیازی سے۔ تالیہ کھڑی رہی تو مسز فاتح نے ایک نظر اسے دیکھ کے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔ (وہ یہ جوس نہیں پیتے۔) تالیہ آگے بڑھ گئی۔ دل بجھ سا گیا تھا۔

باہر جا کر وہ وہیں دروازے کی اوٹ میں ٹھہر گئی۔ مسز کامل کہہ رہی تھیں۔

”لیکن آپ ایک ممبر پارلیمنٹ ہیں سر، کیا آپ واقعی استعفیٰ دے رہے ہیں؟“

”تنگو شیلہ....“ وہ ہر ایک کو اس کے فرسٹ نیم سے پکار رہا تھا۔ ”میں سیاست میں طاقت یا دولت حاصل کرنے نہیں آیا تھا۔ فاتح بن رامزل ایک Dreamer ہے۔ ایک وژنری۔ جو ایک بہتر ملائیشیا کا خواب دیکھتا ہے۔ مگر مالے قوم کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری رولنگ پارٹی اتنی بھاری اکثریت سے منتخب ہوتی آرہی ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کی کوئی اپوزیشن ہی نہیں رہ گئی۔ کوئی بھی جمہوری گورنمنٹ تب تک صحیح کام نہیں کر سکتی جب تک اس کے خلاف اپوزیشن نہ ہو۔ زندگی کے ہر مقام پہ یہ مخالفت ہوتی ہے جو ہم سے ہماری اصلاح کرواتی ہے اور ہم بہتر کام کرتے ہیں۔ اگر باریسن پارٹی ایک اچھی اپوزیشن نہیں بننا چاہتی اگر پارلیمنٹ خود کو مضبوط نہیں کرتی تو اخلاقی طور پہ پارٹی صدر بننے یا ممبر پارلیمنٹ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔“

باہر کھڑی تالیہ مسکرا دی۔ (اس نے پھر سے استعفیٰ کا جواب نہیں دیا۔ آہ۔ سیاستدان۔)

دفعۃً اس نے گھڑی دیکھی۔ دس منٹ گزر چکے تھے۔ پندرہ رہتے تھے۔ ایک بے قرار نظر ڈرائنگ روم پہ ڈال کے وہ چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔

اسٹڈی کی جی جی اس نے نہیں جلائی۔ مینسل نارچ جلا کر آگے آئی۔ لا کر کے سامنے بچوں کے بل بیٹھی اور لا کر پہ لگا گول چکر آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔ چند ایک کلک ہوئے پھر دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ اس نے پوٹلی نکالی اور لا کر کھول کے زیورات کے ڈبے باہر نکالنے لگی۔ ایک دم وہ ٹھنک گئی۔ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔

سکے والا باکس غائب تھا۔ اوہ نو۔ تالیہ نے پریشانی سے سارا لا کر کھنگال دیا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے بے بسی بھرے غصے سے زیورات

کو ادل بدل کیا، لا کر بند کیا، اصل زیورات یونیفارم میں چھپائے اور باہر نکل آئی۔

اب کے اس نے نور اور تسنیم کو کھانا سرو کرنے دیا اور خود کان لگا کر دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی۔ بٹلر نے گھورا بھی مگر اس نے چہرے پہ مسکینیت طاری کر کے پلکیں دوبار جھپکائیں تو وہ ہنکارا بھر کے آگے بڑھ گیا۔

اندر گفتگو کا رخ ملائیشین پارلیمنٹ میں زیر بحث توہین رسالت بل کی طرف مڑ گیا تھا۔ فاتح رامزل کے ساتھ آئے افراد اس بارے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے تین سال کی قید یا بھاری جرمانے والی سزا کسی بھی دین کی توہین کرنے پر درست ہے۔“

”نہیں میرا خیال ہے اس میں ترمیم ہونی چاہیے اور اس کو سزائے موت میں تبدیل ہو جانا چاہیے تاکہ مثالیں سیٹ کی جاسکیں۔“ مسٹر کامل اور دوسرے افراد باری باری اپنی رائے دے رہے تھے۔ تالیہ نے کان مزید زور سے دروازے کے ساتھ لگایا۔ اسے کافی دیر سے فاتح رامزل کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے سر؟“ تالیہ نے پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ وہ نگاہیں کامل صاحب پہ جمائے مسکرایا تھا۔ پھر گہری سانس لی۔

”میرا ایک دوست تھا سکول میں۔ بدھٹ تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ مگر میرے والد کو وہ بہت برا لگتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے بگاڑ دے گا۔ وہ اس کی عزت نہیں کرتے تھے باوجود اس کے کہ وہ اس سے کبھی نہیں ملے تھے۔ میں ہر روز ان سے بحث کرتا تھا کہ میں اس کی دوستی سے نہیں بگڑوں گا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ اپنی ٹھنڈی بھاری اور پرسکون آواز میں اور سب سن رہے تھے۔ ”پھر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میرے والد جب اسے جانتے ہی نہیں ہیں تو وہ اس کی عزت کیسے کریں گے؟ تب میں نے ان کو اپنے دوست کی خوبیوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ تنگو کامل میں نے ان کو بتایا کہ انسان ایک مکمل پیکیج ہوتا ہے اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں خامیاں بھی اور اگر ہم کسی کو اس کے Weakest Link سے جج کرتے ہیں تو ہم بہت برے جج بن جاتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ انسان ہیں جن کے اندر صرف خوبیاں اور اچھائیں تھیں۔ ان کے گستاخ کو بروہ سزا ملنی چاہیے جو شریعہ نے مقرر کر رکھی ہے علماء کو اس بارے میں کھل کے بولنا چاہیے اور مالے پارلیمنٹ کو پراپر قانون سازی کرنی چاہیے اور جو بھی سزا قرآن و سنت کے مطابق ہے وہ دی جائے، مثالیں سیٹ کی جائیں لیکن....“ وہ رکا۔ تالیہ نے گردن مزید اوپر کی۔ وہ انہی پرسکون آنکھوں سے ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن کوئی بھی Evil صرف سزا دینے سے ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا ہمارے نبی ﷺ کی دل سے ریسیکٹ تب کرے گی جب ہم ان کو بتائیں گے کہ وہ کون تھے۔ سزا دینا، چیخنا چلانا آسان ہے، یہ جلدی ہو جاتا ہے۔ زیادہ مشکل کام ہے نبی ﷺ کے لئے اپنی زندگیوں سے مسلسل وقت نکالنا اور اپنی توانائی کو دنیا تک ان کی اصل شخصیت سامنے لانے کے لئے خرچ کرنا۔ اس میں محنت لگتی ہے اور مسلمان بچے اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ کیونکہ ہمارے بچوں کو خود معلوم نہیں کہ نبی ﷺ کون تھے تو وہ دوسروں کو کیا بتائیں گے؟ توہین اس لیے ہوتی ہے کیونکہ ہم اپنی جاب ٹھیک سے نہیں کر رہے۔ ہمیں دنیا کو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بتانا تھا ان کے قصے سنانے تھے۔ بنیادی طور پہ

دو قسم کے لوگ توہین کرتے ہیں۔ ایک وہ جو لاعلم ہیں اور ایک وہ جو شرانگیز ہیں اور جان کے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن جس دن ہم اپنی جاب کرنا شروع کریں گے، اندھیرے میں دیے جلانے لگیں گے، تو لاعلم لوگ ہمارے رسول اللہ ﷺ سے واقف ہوں گے اور وہ خود ہر شرانگیز کے خلاف ہماری ڈھال بن جائیں گے۔ سزائیں لازمی دیں، مگر میری قوم کو خود بھی اس فتنے کو کم کرنے کے لیے توانائی خرچ کرنی پڑے گی۔ میں جس ملائیشیا کا خواب دیکھتا ہوں، نا وہاں ہمیں مالے قوم کو میڈیا کے ذہنی شکنجے سے نکال کر اپنی سوچ کو آزاد کرنا سکھانا ہوگا۔“

”آپ خوابوں پہ یقین رکھتے ہیں وان فاتح؟“ مسز شیلہ قدرے زور سے مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ”مطلب برے خوابوں پہ۔ جیسے میری دوست نے میرے بارے میں خواب دیکھا۔“ تالیہ نے بے اختیار دل کو تھام لیا۔

تنگو کامل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی بیوی کو ٹوکا۔ (یہ مناسب موقع نہیں ہے۔) مگر وہ فاتح رامنزل کے آنے کی خوشی اور اپنی پریشانی میں گھری کہتی گئیں۔

”اس نے دیکھا کمیرے ہاتھوں میں چاول ہیں جو ایک دم راکھ بن جاتے ہیں۔ آپ دوسری قسم کے خواب دیکھتے ہیں مگر ایسے خوابوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“ تالیہ کے گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ کان مزید دروازے سے لگائے۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ پھر فاتح نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے۔ ”خوابوں میں ہر چیز علامتی ہوتی ہے۔ اس کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ کیا آپ کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع ہے تنگو شیلہ؟“

میزبان میاں بیوی سن رہ گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا پھر فاتح کو۔ ”جی مگر ہمیں خود چند دن پہلے معلوم ہوا ہے تو آپ کو کیسے....“

”چاول Fertility کی علامت ہوتے ہیں۔ ایسا خواب اس لئے آ سکتا ہے تاکہ آپ احتیاط کریں یا پھر کسی متوقع حادثے کے لئے تیار رہیں۔“ اس کی بات میں ایسی ٹھنڈک تھی کہ مسز کامل کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ دروازے سے لگی تالیہ بھی شل کھڑی رہ گئی۔

فاتح کی بیوی نے بے اختیار تادیبی نظروں سے اسے گھورا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اسے ایسی بات اتنے عام انداز میں نہیں کہنی چاہیے مگر وہ کسی بھی جذباتی پن سے عاری ٹھنڈا پرسکون سا بیٹھا تھا۔ عصرہ رامنزل پہلی دفعہ بولی۔

”کاش ہمیں بھی آریانا کو کھونے سے پہلے کوئی خواب آ جاتا تو ہم اس روز چیئر لفٹ پہ نہ جاتے۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

(آریانا؟ اچھا۔ ان کی بیٹی جو کئی سال پہلے کھو گئی تھی۔) تالیہ کو ان کے انٹرویو میں کئی دفعہ کی دہرائی گئی بات یاد آئی تو اس نے اندر جھانکا۔

فاتح رامنزل کا چہرہ سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس پہ کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ وہی ٹھنڈا مسکراتا، وجیہہ چہرہ... مگر وہ اعتراف سرفہلا کے بولا تھا۔

”ہاں.... وہ بڑا ٹھن وقت تھا۔ خیر۔“ اس نے کندھے اچکا کے گہری سانس لی۔

بلرنے اس کے سر کی پشت پہ چپت لگائی تو وہ چونکی۔ ”تمہارا کچن میں کام پڑا ہے۔ اندر جاؤ۔“ اس نے حکم صادر کیا تو وہ منہ بنا کے آگے بڑھ گئی۔ کام کیا خاک کرنے تھے، وہ کچن کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ چند منٹ گزرے اور آوازیں آنے لگیں۔ وہ وہیں جمی رہی۔ وہ لوگ اب راہداری میں آچکے تھے اور باہر جا رہے تھے، مگر کسی وجہ سے ٹھہر گئے تھے۔ تالیہ نے سر نکال کے دیکھا تو برف کا بت بن گئی۔

علی بن کامل اپنے مہمان کو تحفہ پیش کر رہا تھا۔ اور وہ تحفہ... تالیہ کی سانس اکٹنے لگی.... وہ وہی شیشے کا باکس تھا جس میں سنہری سکہ رکھا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے بچے سے باکس لیا۔ علی کامل اب اس سے منسلک کہانی سن رہا تھا مگر فاتح راز مل نے باکس کھولا اور سکہ نکال کے اوپر اٹھا کے دیکھا۔ دونوں اطراف پلٹائیں۔

”ویسے یہ اور بیجبل نہیں ہے۔ اور بیجبل میں ایک طرف نصیر من الدین والدین لکھا ہوتا ہے۔ مگر آئی لائیک اٹ۔“ سچائی سے تبصرہ کیا تو میزبان ایک دم شرمندہ ہو گئے مگر وہ آدمی اتنا بے پرواہ اتنا بے نیاز تھا کہ اسے ان کے تاثرات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ (اور اس کی بات کو کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ نہ مان سکتا تھا۔ وہ مالے قوم کو بہت محبوب تھا۔) ایک ہی فقرے میں اس نے ایمانداری سے پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا۔ پھر ذرا ٹھہرا۔ ”معصرہ یہ تمہارے بریلیٹ کی طرح نہیں لگتا جو تمہیں الیش نے دیا تھا؟ ہے نا۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے باکس پیچھے کھڑے اپنے باڈی مین کی طرف بڑھا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ سب اس کے آگے پیچھے چلتے باہر نکل گئے۔ وہ تیز تیز چلتا تھا اور ہر شخص اس کے قدم سے قدم ملانے کا خواہشمند تھا۔

باڈی مین نے سکے کی ڈبیہ جیب میں ڈالتے ہوئے باہر نکلنے سے قبل ایک دفعہ مڑ کے یونہی پیچھے دیکھا تھا۔ نگاہ چوکھٹ پہ ہکا بکا کھڑی لڑکی پہ پڑی تو وہ لمحے بھر کو ٹھہرا.... اس کی سبز آنکھوں کو دیکھا جو اس کے ڈبیہ جیب میں ڈالتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں.... بس لمحے بھر کا اثر تھا.... پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

اور وہ نڈھال سی چوکھٹ سے لگی کھڑی رہ گئی۔

☆☆=====☆☆

”سمبلز۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگ ایک طرف پھینکا اور جوتے اتار کے دوسری طرف اچھالے۔ داتن جو لیپ ٹاپ اور کاغذ پھیلائے صوفے پہ بیٹھی تھی اسے آتے دیکھ کے تیزی سے اٹھی۔ ایک فکر مند نظر اس کے بے رنگ پریشان چہرے پہ ڈالی۔

”تم نے راستے سے فون کر کے اتنی تیزی سے سب بتایا کہ مجھے وہ سمجھنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ تم پریشان نہ ہوتا لیہ۔ اب دونوں چیزیں ایک ہی شخص کے پاس ہیں۔ اور....“

”سمبلز۔ اس نے کہا خواب میں ہمیشہ سمبلز آتے ہیں۔ علامتیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے صوفے پہ گر گئی۔ چند لمبے لمبے سانس لئے پھر نظریں اٹھا کے ابھی کھڑی داتن کو دیکھا۔

”میں نے دیکھا ہم دو دریاؤں کے سنگم پہ کھڑے ہیں جہاں کیچڑ ہے۔ کیچڑ یعنی ”لپور“ اور دریاؤں کا سنگم یعنی ”کوالا“۔ ہم ”کوالا لپور“ میں ملتے ہیں۔ کوالا لپور.... کے ایل.... ہمارا شہر....“ وہ تیز تیز بولتی جا رہی تھی۔ ”آج ہم ملے مگر ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید اس خواب کے پورا ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا تھا داتن کہ اس کے سر پہ ایک پرندہ چکر کاٹ رہا ہے۔ سنہری ناگوں والا سرخ پرندہ جس کی آنکھیں ایسی نیلی تھیں گویا Blue sapphires ہوں....“

”Eyes as blue as sapphires“۔ داتن نے چونک کے زیر لب دہرایا۔

”ایک ہی پرندہ ہے جو ایسا ہوتا ہے داتن۔ جو صرف خوابوں اور کتابوں میں ہوتا ہے۔ ہا۔ Pheonix“ وہ جوش سے بولی تھی۔ رنگت ابھی تک اڑی ہوئی تھی مگر چہرے پہ سکون واپس آ رہا تھا۔

”فاتح رامزل کے سر پہ ہا۔۔۔۔۔ ہا جو علامت ہے خوش بختی، دوبارہ جنم لینے۔۔۔۔۔ دوسری زندگی اور۔۔۔۔۔“

”اور حکومت کی۔ داتن۔ طاقت اور حکومت کی۔ فاتح رامزل ہمارا اگلا پردھانہ منتری (وزیر اعظم) بننے جا رہا ہے اور وہ یہ بات نہیں جانتا۔“

”اوہ خدایا۔۔۔۔۔ فاتح رامزل۔۔۔۔۔ نیکسٹ مالے پردھانہ منتری۔۔۔۔۔ واؤ تالیہ۔۔۔۔۔ واؤ“ داتن نے خوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔ لیکن پھر وہ ٹھٹھک کے رکی۔ ”مگر اس کا مطلب ہے کہ ہمیں۔۔۔۔۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اگلی چوری اپنے مستقبل کے وزیر اعظم کے گھر کرنی ہے۔“ ایک عزم سے کہتی وہ اٹھی اور داتن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”مجھے اپنی چابی فاتح رامزل سے واپس لینی ہے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟“

☆☆=====☆☆ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حالم (نمرہ احمد)

باب دوم:

”گھائل غزال“

اس نے خواب میں دیکھا کہ.....
 سنہرے بالوں والی لڑکی دو دریاؤں کے سنگم پہ کھڑی ہے.....
 بارش اسی طرح برس رہی ہے.....
 سرخ پروں والا پرندہ سامنے کھڑے شخص کے سر پہ چکر کاٹ رہا ہے.....
 وہ شخص جو بارش میں بھیگتا جا رہا ہے اور نائی نوج کے پھینک چکا ہے.....
 اور اب وہ ہاتھ میں کچھڑے لتھڑی چابی لیے اسے دیکھ رہا ہے.....
 پھر وہ ہاتھ پیچھے کر لیتا ہے..... اور چابی اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے.....
 وہ گردن اٹھا کے دیکھتی ہے تو نیلی آنکھوں والا سرخ سنہرا پرندہ فاتح کے سر سے گزر کے بائیں طرف آ رہا ہے.....
 وہ چونک کے بائیں جانب دیکھتی ہے تو وہاں ایک نوجوان کھڑا ہے.....
 اس کا کوٹ اور شرٹ بھی بارش میں بھیگ بھیگ گئی ہے..... وہ تالیہ کو دیکھ رہا ہے اور تالیہ اوپر پرندے کو.....
 پرندہ فضا میں چند لمحے نوجوان کے سر کے اوپر ٹھہرتا ہے پھر تالیہ کی طرف آتا ہے..... تالیہ کے سر کے اوپر..... وہ گردن پوری اٹھا کے آسمان کو دیکھتی ہے.....
 ہما اس کے سر سے کئی فٹ اوپر اپنے پر پھیلائے گزر جاتا ہے..... اس کے سر کے اوپر سے..... عین اوپر سے.....
 ”نمیرے ساتھ رہو۔ تمہیں میری ضرورت ہے اور مجھے تمہاری۔“ وہ آواز پہنچتی ہے۔ سامنے کھڑا بارش میں بھیگا فاتح اسے پکار رہا ہے۔ وہ بدک کے پیچھے ہٹتی ہے..... مڑتی ہے اور دوڑنے لگتی ہے..... مگر ایک پھندا اس کے منحنے میں جا پڑتا ہے..... رسی کا پھندا..... تالیہ رپٹ کے گرتی ہے..... اس کے لباس اور چہرے پہ کچھڑ لگ جاتا ہے..... ہتھیلیوں کے بل اٹھتے ہوئے وہ مڑتی ہے تو ایک دوسرا پھندا اس کی گردن میں آ پڑتا ہے..... وہ بدقت کھڑی ہوتی ہے.....

اپنی جگہ کھڑے فاتح کی گردن میں بھی ایسا ہی پھندا ہے..... وہ ہر اس نظر سے بائیں جانب دیکھتی ہے تو نو جوان گھٹنوں کے بل گر پڑا ہے اور اس کی گردن بھی رسی سے کسی ہوئی ہے.....

”تالیہ۔“ داتن نے اس کا کندھا ہلایا تو اس نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔

وہ روشنیوں میں نہائے لاؤنچ کے صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ خواب فضا میں تحلیل ہو چکا تھا اور وہ حال میں واپس آ چکی تھی۔ تالیہ نے گہری سانس لے کر چہرے سے سیاہ بال ہٹائے اور جوڑے میں لپیٹے۔

”میں چائے بنانے کیا گئی تم تو غافل سو ہی گئیں۔“ داتن گرما گرم چائے کا کپ لیے سامنے آ بیٹھی اور قدرے تفکر سے اسے دیکھا۔
 ”حالم اتنی آسانی سے غافل نہیں ہوتا، بد صورت مرغی!“ وہ آواز کو بھاری بنا کے غرائی تو داتن کی ساری فکر مندی ہوا ہوئی۔ اس کی جگہ ترحم اور افسوس نے لے لی۔

”ایک تحقیق کے مطابق کسی سلیم بنی کو حقیقت میں دیکھ لینے کے چوبیس گھنٹے بعد تک دماغ ماؤف رہتا ہے اور انسان بغیر دماغ کے گھومتا پھرتا ہے۔ اس لئے خیر ہے بچے میں تمہارا رد سمجھ سکتی ہوں۔“ اس نے بھاری ہاتھ سے تالیہ کے کندھے کو تھپکا تو تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”زیادہ اول فول نہ بولو۔ میں فین مومنٹ سے نکل آئی ہوں اور میں کوئی سو نہیں رہی تھی۔ میں اس کا خواب دیکھ رہی تھی.... اُف وہ مجھے بار بار خوابوں میں کیوں نظر آنے لگا ہے.....“ چہرے پہ سادہ تاثرات سجاتے ہوئے اس نے کشن اٹھا کے گود میں رکھا اور ہتھیلیوں پہ تھوڑی گرا کے دور چھت کو دیکھنے لگی۔ ”ہماری ملاقات تو کوالا پور میں ہو گئی نا.... گدلے پانیوں کے سنگم پہ.... پھر وہی خواب، وہی وژن دوبارہ کیوں نظر آرہا ہے مجھے داتن؟“

”اب کی دفعہ کیا دیکھا؟“ وہ اطمینان سے گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پوچھنے لگی۔
 ”آج تو وہ ہمارے سر پہ بھی تھا.... پھر کسی نے میری گردن میں پھندا ڈال دیا۔ مجھے لگتا ہے میں پہلے وزیراعظم بنوں گی پھر پھانسی چڑھوں گی۔“

”اول ہوں۔“ داتن نے غصیلی شکل بنا کے اسے دیکھا۔ ”کیا فضول بولے جاتی ہو۔ عقل سے کام لو۔“
 ”عقل، دماغ، دل سب ساتھ چھوڑ گئے میرا داتن پدوکا۔“ اس نے پھر سے چھت کو دیکھتے ہوئے آدھ بھر کے کہا۔ ”میں نے فاتح رامنزل کو اصل میں دیکھ لیا.... میں نے اسے جس پیش کیا.... اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا.... وہ مسکرایا اور نرمی سے بولا،
 ”شکر یہ تالیہ۔ تم بہت اچھی ہو۔“

داتن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ”اس نے واقعی تمہیں یہ کہا۔“
 ”ہاں۔ وہ تو پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے متاثر لگتا تھا۔“ وہ ڈھٹائی سے کندھے اکڑا کے بولی۔ داتن نے ستائش سے ابرو اچکائے۔

”خیر اب بتاؤ اس کے گھر چوری کیسے کرنی ہے۔ کیا پلان ہے؟“

”حالم کے پاس ہمیشہ پلانز ہوتے ہیں۔ پلان نہیں پلانز۔“ وہ زور دے کر بولی۔ ”پلان اے بی اور سی۔ اگر اے فیل ہو جائے تو سی پہ جائیں گے وہ کام نہ کرے تو ڈی سوچ لوں گی۔“

”اور بے چارہ بی کیوں نہیں؟“

”تالیہ کے پلانز ہیں تالیہ کی مرضی۔“ وہ کندھے اچکا کے بے نیازی سے بولی اور پھر سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا کے خلا میں دیکھنے لگی۔ ”وہ بچاس کا ہونے والا ہے مگر کتنا بگ لگتا ہے۔ جب وہ مسکراتا ہے تو اس کا ڈمپل پڑتا ہے۔ تم نے کبھی نوٹ کیا؟“

”تم اٹھائیس سال کی ہو وہ اڑتالیس کا۔ تمہیں اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔“ داتن اسی سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر کسی کو اس کے بارے میں سوچنا چاہیے تو وہ میں ہوں۔“

تالیہ کو جیسے کرنٹ لگا۔ بلبلا کے اس نے گردن موڑی اور موٹی کالی عورت کو سر سے پیر تک دیکھا۔

”تم؟ تم؟ داتن؟“ وہ حیرت اور صدمے سے غرا بھی نہ سکی۔

”ہاں.... آخر وہ میری عمر کے قریب قریب ہے۔“ داتن اب کے سادگی سے مسکرائی۔ تالیہ نے غصے سے ہونٹ بھیجنے لیے۔

”اور وہ تمہیں کیوں پسند کرے گا؟“

”کیونکہ عشق اندھا ہوتا ہے۔“

”اندھا ضرور ہوتا ہے مگر کلر بلائنڈ نہیں۔“ وہ جل کے بولی تو داتن نے ساتھ رکھا کشن اٹھایا اور کھینچ کے اسے دے مارا۔ اس نے دونوں بازو آگے کر لئے تو وہ ان سے ٹکرا کے نیچے گر گیا۔

”خیر!!“ داتن نے خفگی سے چائے کا گھونٹ بھرا اور شانے اچکائے۔ ”ماڈرن سائنس نے گورا ہونے کے انجیکشن بنا لئے ہیں۔“

”پتلے ہونے کے پھر بھی نہیں بنائے۔“ وہ اب کے مسکراہٹ دبا کے بولی۔ داتن نے ہاتھ جھلا کے جیسے اس کی بات ہو امیں اڑائی۔

”زیادہ خواب مت دیکھو اس کے۔ وہ تمہارے باپ کی عمر کا ہے۔ ارے ہاں۔“ وہ ٹھہری۔ آنکھیں چمکیں۔ ”اس کی بیٹی آریانہ بھی تو کھوئی تھی نا۔ یا مر گئی تھی۔ مگر لاش نہیں ملی تھی۔ ہم نے سکہ چرانے اس کے گھر داخل ہی ہونا ہے نا، کیوں نا تم آریانہ بن کے چلی جاؤ۔“

تالیہ نے افسوس سے اسے دیکھتے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ ”آریانہ چھ سال پہلے کھوئی تھی جب وہ سات سال کی تھی۔ اب اگر وہ زندہ بھی ہو تو تیرہ سال کی بچی ہوگی۔ اور میں اٹھائیس کی ہوں۔“

”تم آریانہ کی کوئی دوست یا نیچر بن کے بھی جاسکتی ہونا۔“

”اپنی دہلی پتلی عقل پہ اتنا زور نہ دو اور پلاننگ کا کام مجھ پہ چھوڑ دو۔ اور اگر اپنی چابی چرانے کے لئے مجھے فاتح رامزل سے ملنا ہی پڑا تو میں اس کی بیٹی بن کے نہیں جانے والی۔“ پھر اس نے مسکرا کے چھت کو دیکھا اور جیسے خواب بنے۔ ”میں تو ایسی سچو نیٹشن بناؤں گی جس

میں اس کو مجھ سے پہلی نظر کی محبت ہو جائے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم اس سے ملی تھیں اور اس نے تمہاری تعریف بھی کی تھی۔“

”جیسے تمہیں تو معلوم ہی نہیں کہ میں جھوٹ بول رہی تھی۔“ وہ اسی ڈھٹائی سے ترنت بولی پھر صوفے سے اتری اور پیروں میں سلیپرز گھسیڑے۔

”میں کے ایل کی سب سے ماہر اسکام آرٹسٹ اس لئے ہوں مسز لیا نہ دانش صابری کیونکہ جب میں اپنا کردار لکھتی ہوں تو دنیا مجھے اتنا اور ویسا ہی دیکھتی ہے جتنا اور جیسا میں ان کو دکھانا چاہتی ہوں۔ میں نے اب تک بہت سے رول کیے ہیں، مگر یہ رول سب سے دلچسپ ہو گا۔ فاتح اور میرے راستے کہیں نہ کہیں جا کر ملتے ہی ہیں۔ ہماری قسمت ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہے۔ اور میرے خواب کے مطابق.... ہم تینوں کے سروں پہ ہمارا پرندہ تھا اور پھر ہم تینوں کی گردن میں پھندے تھے۔ اچھایا برا اس اسکام کا انجام بہت دلچسپ ہو گا، موٹی مرغی۔“ وہ عزم سے کہتی مسکرا کے آگے بڑھنے لگی تو داتن نے کپ نیچے کیا اور چونک کے اسے پکارا۔

”تینوں؟ تیسرا کون؟“

اس سوال پہ وہ بھی غٹکی جیسے حیرت سے سوچا ہو۔

”ارے ہاں... اس دفعہ جب وہ منظر ذرا آگے چلا تو اس میں ایک تیسرا شخص بھی تھا۔“

”کون؟ کون؟“ موٹی جوش سے آگے ہوئی۔ تالیہ نے انگلی تھوڑی پر رکھ کے آنکھیں اوپر کیے ذرا سا سوچا۔

”میں نے اسے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ تالیہ کو کبھی کچھ نہیں بھولتا۔ مگر...“ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ”وہ نوجوان کون تھا؟ اونہوں۔ یا انہیں آ رہا۔“ یاد کرنے میں ناکام ہوئی تو سر جھٹک کے میڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”گڈ ٹائٹ، داتن پدوکا... صبح ملتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ میری نیند کے دوران میں تم میرے فریج کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے میرے رازوں کی کرتی ہو۔“

”ہونہہ۔ فکر ہی نہ کرو۔“ وہ چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اونچا سا بولی تھی۔ تالیہ میڑھیاں چڑھتی گئی تو اس نے جلدی سے کپ رکھا اور موبائل نکال کے اسکرین روشن کی۔ پھر گردن اٹھا کے احتیاط سے دیکھا۔ تالیہ اب باہر نہیں آنے والی تھی۔ داتن مسکرائی اور جلدی سے گولگ ٹیب میں ٹائپ کرنے لگی۔

”پتلا ہونے کے لئے سرجری“ اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ گوبن دبا دیا۔

☆☆=====☆☆

چند گھنٹے پیچھے واپس چلتے ہیں.....

تنگو کامل کے ڈرائنگ روم سے مہمان نکل کے راہداری میں آئے کھڑے تھے جہاں کم عمر علی بن کامل نے فاتح رامنزل کوشیشے کی ڈیا میں

سجاسکے پیش کیا تھا۔

”ویسے یہ اور بچنل نہیں ہے۔ اور بچنل میں ایک طرف نصیر من الدین لکھا ہوتا ہے۔ مگر آئی لائیک اٹ۔“ سچائی سے تبصرہ کیا تو میزبان ایک دم شرمندہ ہو گئے مگر وہ آدمی اتنا بے پرواہ اتنا بے نیاز تھا کہ اسے ان کے تاثرات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ (اور اس کی بات کو کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ نہ مان سکتا تھا۔ وہ ملے قوم کو بہت محبوب تھا۔) ایک ہی فقرے میں اس نے ایمانداری سے پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا۔ پھر ذرا ٹھہرا۔ ”عصرہ یہ تمہارے بریلیٹ کی طرح نہیں لگتا جو تمہیں ایش نے دیا تھا؟ ہے نا۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے باکس پیچھے کھڑے اپنے باڈی مین کی طرف بڑھا دیا۔

وہ آگے بڑھ گیا اور باڈی مین سکے جیب میں ڈالتا، آگے بڑھنے کو تھا کہ ٹھہرا۔ یونہی گردن موڑی۔ نظر دور پیچھے کچن کی چوکھٹ پہ کھڑی ملازمہ پہ پڑی۔ یہاں واضح روشنی تھی۔ تیز سفید لائٹس۔ اندر تو زرد فنیسی لائٹس تھیں اس لئے آتے جاتے ملازموں کی شکلوں پہ وہ غور نہیں کر سکا تھا مگر یہاں وہ سفید روشنیوں میں نہائی کھڑی شل سی، سوگوار سی اس سکے کو دیکھ رہی تھی جسے باڈی مین جیب میں ڈال رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کی آنکھوں کو دیکھا اور پھر مڑ گیا۔

باہر آیا تو گاڑیوں کے دروازے بند ہو رہے تھے۔ دعا سلامت، الوداعی کلمات۔ وہ اپنے نئے کوٹ اور نائی کو لاشعوری طور پہ درست کرتا اس سیاہ کار تک آیا جس کی پچھلی نشست پہ فاتح رازمل اور اس کی بیوی بیٹھ چکے تھے۔ ڈرائیور نے اسٹیرنگ سنبھالا اور باڈی مین فرنٹ سیٹ پہ مستعد سا بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی۔ اس نے بیک ویو مرر پہ نگاہ دوڑائی۔ پیچھے بیٹھا فاتح رازمل جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پہ لٹکا رہا تھا۔ پھر اس نے اسی جیب سے سیل فون نکالا اور اسکرین روشن کر کے دیکھنے لگا۔ باڈی مین نے ہاتھ بڑھا کے شیشہ ذرا سارتر چھایا کیا تا کہ دونوں میاں بیوی دکھائی دیں۔ ڈرائیور نے ایک نظر اس پہ ڈالی مگر ٹوکا نہیں اور ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اب شیشے میں وہ دونوں نظر آرہے تھے۔ عصرہ گردن موڑے کھڑکی کے باہر بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ گھٹنے پہ اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے اور ایک کلانی میں طلائی بریلیٹ دکھائی دے رہا تھا۔

”تمہیں ان کے لپٹیک تحفے کے بارے میں ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا فاتح علی کو برا لگا ہوگا۔“

”صلی کون؟“ وہ اسکرین انگلی سے نیچے کرتے مصروف سا بولا تھا۔

عصرہ نے چہرہ موڑ کے مذمتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”شیلہ کا بیٹا۔“

”اچھا۔ اس کا نام علی ہے۔“ اس نے سر کو خم دیا اور سیل فون پہ ای میل نیچے کرتا گیا۔ باڈی مین بار بار آئینے پہ نظر ڈالتا پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگتا۔ وہ ملک کا سب سے محبوب کپل تھا۔ ان کو بار بار دیکھ کے بھی دل نہیں بھرتا تھا۔

”تم نے استغنیٰ والی بات کا جواب نہیں دیا۔ ہم یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ تم ریزائن دو گے اور ہم امریکہ واپس چلے جائیں گے۔“

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ اسکرین کو انگلی سے دباتا نا پ کر رہا تھا۔ عصرہ چند لمحے کے لئے خاموش ہوئی۔ سرخ بھورے بالوں والی

وہ خوبصورت عورت تھی۔ دہلی پتلی اسارٹ سی۔ ماتھے پہ کٹے بال گرتے تھے اور باقی بالوں کو آدھا باندھ رکھا تھا۔ گردن میں موتیوں کا نیکلکس تھا اور بھوری آنکھوں میں تلخی سی تھی۔

”تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے بہت سی لائبریمیں چھوڑ چکی ہیں۔ اپنے کریز ما، اور فین فالوونگ سے باہر نکل کے دیکھو تو تمہارا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ باریسن نیشنل کالجیر مین منتخب ہونے کے لئے ہمیں فنڈز چاہئیں، جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ پہلے پارٹی انکیشن پھر جنرل انکیشن.... ہم کچھ بھی انورڈ نہیں کر سکتے۔ میرا برنس پہلے ہی اشعر (بھائی) کے قرضوں تلے دبا ہے۔ میں مزید قرضے نہیں لے سکتی۔ تم نے آج تک سیاست سے کچھ نہیں بنایا، اور میں اس کی قدر کرتی ہوں مگر اب میں مزید تمہیں ایک کھوکھلے خواب کے پیچھے پیسہ اور محنت لٹاتے نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ اب کے نرمی سے کہہ رہی تھی۔ وہ جواب دیے بنا موبائل کی طرف متوجہ رہا۔

”ہمارے ساتھ کوئی لابی، کوئی سیاسی اتحاد نہیں ہے۔ اگر کوئی پارٹی کا صدر بننے کے لئے انکیشن میں کھڑا ہو سکتا ہے تو وہ تم نہیں ہو فاتح۔ تمہارے ٹوئیٹر فالورز کے علاوہ ہمارے ساتھ کوئی نہیں کھڑا۔ وہ اشعر ہے۔ ایش۔ ایش نو جوان ہے.... ”ملے زیا“ (ملائیشیا) کا جسٹن ٹروڈو۔ اس کے پاس پیسہ ہے، اس کے ساتھ سیاسی حلیف کھڑے ہیں۔ وہ ممبر پارلیمنٹ ہے اور محنت کر کے اس مقام پہ آیا ہے۔ میں اس لئے نہیں کہہ رہی کہ وہ میرا بھائی ہے بلکہ وہ نو جوان نسل کا نیا لیڈر ہے، اس کی کیمپین میں زیادہ چارم ہے، تم ایک زمانے میں بہت پاپولر تھے اور خدا کا شکر ہے کہ اب بھی ہو مگر تمہارے غیر سیاسی فیصلوں نے تمہارا چارم کم کر دیا ہے۔ تمہارے ووٹ کم ہو گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم عزت سے اس مونوپلی سے نکل آئیں اور اپنا بڑھاپا امریکہ میں آرام سے گزاریں۔ تمہیں میں نے کہا تھا کہ اگلے ماہ جب ایش باقاعدہ پارٹی چیئر مین کے انتخاب کا اعلان کرے گا تو تم اس کو endorse کرو گے اور اس کے حق میں دستبردار ہو جاؤ گے۔ تمہارا ووٹ بینک ایش کے حق میں چلا جائے گا اور یوں یہ ایک بہترین پیسی اینڈنگ ہوگی۔ ایش ملے زیا کا اگلا وزیراعظم ہے، تم اس نوشتہ دیوار کو جتنی جلدی ہو سکے پڑھ لو فاتح۔ اور اس طرح خاموش نہ رہو جیسے میں یہ اپنی گیلری کے لیے کر رہی ہوں۔ میں یہ ہم دونوں اور ہمارے بچوں کے لئے کر رہی ہوں۔“

فاتح نے سیل فون اسکرین بھائی اور عینک اتار کے فولڈ کی، پھر دونوں چیزوں کو کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا، چہرے پہ مسکراہٹ سجائے کھڑکی سے باہر آنکھیں جمائے کہنے لگا۔

”ملے زیا (ملائیشیا) کے دوسرے بچوں کی طرح مجھے بھی بچپن میں سب سے زیادہ ملے ادب کی جو کہانیاں پسند تھیں وہ ”ننھے غزال“ کی تھیں۔ ننھا چالاک ہرن۔ ماؤس ڈبیر (یہ ایک دم کٹا چوہے کی شکل والا ہرن ہوتا ہے جو قبر بآکتے جتنا ہوتا ہے۔) وہ چھوٹا سا تھا مگر جانوروں میں اس جیسا con artist دوسرا کوئی نہ ہوگا۔ بہت عیار تھا وہ۔ ننھا کن چیل۔ (ہرن) کن چیل اسٹوریز کی ابتدائی داستانوں میں وہ ایک دھوکے باز، چور اور چرب زبان ہرن تھا۔ بعد میں وہ اچھا ہوتا گیا تھا مگر شروع کی داستانوں میں مجھے وہ کہانی بہت پسند ہے جب اس کو دریا پار کرنا تھا اور سامنے ایک مگرچھ بیٹھا تھا۔ تو ننھے ہرن نے مگرچھ سے کہا کہ بادشاہ نے مگرچھوں کی دعوت کی ہے اور اس کو یہ ذمہ

داری سوچی ہے کہ وہ گرچھوں کی تعداد گن کے بتائے تاکہ اسی حساب سے کھانا پکویا جائے اس لیے سب گرچھ لائن میں کھڑے ہو جائیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر روشن عمارتوں کو بھاگتے دیکھ کر محظوظ سا ہنسا رہا تھا۔ سب سانس روکے اس کو سن رہے تھے۔ ایڈم کے کان پوری طرح کھڑے تھے۔ ”پھر کیا تھا... گرچھوں نے پل کی صورت قطار بنالی۔ وہ ایک دو تین کر کے گنتا ہوا ایک گرچھ سے دوسرے پہ چھلانگ لگاتا اور یوں دریا پار کر گیا۔ گرچھ آج بھی بادشاہ کی دعوت کا انتظار کر رہے ہیں۔ سارے دم کٹے ہرنوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو لوگوں کو manipulate کرنے کی اتنی عادت پڑ جاتی ہے کہ یہ مینیپولیشن ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ ہاتھ پیر کٹ جانے سے مفلوج نہیں ہوتے، دوسروں کی زندگیوں کا اسٹیئرنگ و ہیل چھن جانے پہ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ ایسے غزالوں کو اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب دعوت کا انتظار کرتے گرچھ دریا سے نکل آئیں اور اس کو تلاش کر لیں کیونکہ گرچھ خشکی پہ بھی اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے جتنا دریا میں۔“

کہہ کے اس نے جیب سے موبائل دوبارہ نکالا اور اسکرین روشن کر کے عینک ناک پہ جمائی۔ عصرہ گہری سانس لے کر چہرہ موڑ گئی اور باڈی مین نے نگاہیں جھکا لیں۔ (کیا فاتح صاحب نے اپنے سالے کو ”سنگ کچیل“ the mouse deer بولا ہے؟ عیار اور چال باز؟ وہ بھی اپنے ملازموں کے سامنے؟ یا اللہ... یہ امیر لوگ ملازموں کی موجودگی میں ایسے کیسے باتیں کر لیتے ہیں؟ ہمارے محلے میں تو یوں نہیں ہوتا۔) وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

کار سنگٹل پہر کی تو ایڈم نے دیکھا ایک طرف سے چند بچے بینرز اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ شاید کوئی واک وغیرہ تھی جس کا اختتام ہو چکا تھا۔ وہ معمول کے انداز میں قریب سے گزر رہے تھے مگر جیسے ہی ایک نے شیشے کے پار بیٹھے شخص کے جھکے چہرے کو دیکھا جس کو موبائل کی روشنی نے منور کر رکھا تھا... اس کی آنکھیں حیرت سے چمکیں۔ وہ فوراً پلٹا اور اپنے گروہ کو خوشی اور جوش سے چیخ کے پکارا۔ (فاتح رامنزل کی کار! جلدی آؤ!)

سنگٹل ابھی سرخ تھا۔ بچے اکٹھے ہونے لگے۔ ہنسی مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے ہوئے۔ ایک نے ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب آ کر اپنا موبائل دکھا کے کچھ کہا تو باڈی مین نے گردن موڑی۔

”سر، بچے شاید تصویر بنوانا یا ہاتھ ملانا چاہتے ہیں۔“

”ڈونٹ بی اوور انفیشیٹ ایڈم۔ یہ بچے ہیں، ووٹرز نہیں۔“ عصرہ تلخی سے بولی۔ باڈی مین نے خفت سے سر ہلایا اور بچوں کو دور ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ننھے چہروں کی جوت بجھ گئی اور وہ پیچھے ہٹے۔ سنگٹل براہو گیا اور کار آگے چل پڑی۔

اسی پل فاتح نے موبائل سے نظریں اٹھائیں اور فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے باڈی مین کو دیکھا۔ ”اور تم کون ہو؟“ وہ بچوں کو نظر انداز کر گیا تھا۔ اس نے جلدی سے گردن موڑی اور تابعداری سے کہنے لگا۔ ”سر، میں ایڈم بن محمد ہوں۔ آپ کا باڈی مین اور...“

”معبدا اللہ گیارہ دن کی چھٹی پہ گیا ہے تو اس نے اپنے محلے کے لڑکے کو کام کے لئے بھیج دیا۔ مجھے اس کی شکل پہ ترس آ گیا اس لئے اسے رکھ لیا۔ ایڈم نام ہے اس کا۔“ عصرہ بے زاری سے بتانے لگی۔ ”آتے وقت یہ دوسری کار میں تھا۔ میں نے کہا اب آیا ہی ہے تو کام تو پورا

کرے۔“ (ملائیشیاء میں آدم نام کو ایڈم رکھا اور بلایا جاتا ہے اور یہ مسلمانوں میں عام ہے۔)

سنگل کھل گیا اور ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ فاتح نے پھر سے موبائل دیکھتے ہوئے بھاری رعب دار آواز میں پوچھا۔ ”کیا کرتے ہو ایڈم؟“ ایڈم کا چہرہ اتنی توجہ پہنچنے لگا۔

”سر میں فوج میں تھا، مگر صحت کے واجبی سے مسئلے پہ وہاں سے فارغ ہو گیا۔ پھر دو تین جگہ اپائی کیا مگر نوکری نہیں ملی۔ والد صاحب ایک دکان پہ سیلز مین ہیں ان کے ساتھ بھی کام کیا۔ ایک سیکورٹی فرم سے پرائیوٹ باڈی گارڈ کی تربیت بھی لی۔ اب عبداللہ کی جگہ گیارہ دن کے لئے آیا ہوں۔“

”اور تم کیبا باڈی گارڈ والا لباس پہن کر آگئے ہو۔“ معصرہ نے پیچھے سے برہمی سے ٹوکا۔ ”تم فاتح صاحب کے باڈی گارڈ نہیں باڈی مین ہو، اور ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آئندہ نہ دیکھوں میں یہ سوٹ اور ٹائی۔ اور یہ پستول... اس کالائسنس ہے؟“ ذلیش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

”جی میم۔ مجھے لگا مجھے باڈی گارڈ بننا ہے۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

”غیر ٹھیک ہے، گن ساتھ لے کر گھوم سکتے ہو، مگر حلیہ درست کر کے آنا کل۔“ وہ نخوت سے کہتی بات ختم کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وان فاتح نے موبائل واپس جیب میں ڈالا اور عینک اتارتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”ووٹ کس کو ڈالا تھا تم نے ایڈم؟“

ایڈم نے گردن موڑ کے اس کو دیکھا اور لمحے بھر کو چپ رہ گیا۔ پھیننے نقوش اور صاف رنگت کا وہ ایک عام سا ملے نوجوان تھا اور سوٹ ٹائی اس پہ بہت نئے اور اوپرے لگ رہے تھے جیسے مانگ کے پہنے ہوں۔

”کسی کو نہیں، سر۔ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔“

فاتح نے بے اختیار دونوں ابرو اٹھائے اور تعجب سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں معلوم ہے ایڈم کسی ملک کے لئے سب سے خطرناک آدمی کون ہوتا ہے؟“

”کرپٹ حکمران؟“ اس نے گڑبڑا کے کہا۔

”ہاں مگر اس سے بھی زیادہ سیاسی جاہل خطرناک ہوتا ہے۔“ وہ اس پہ نظریں جمائے بھاری آواز میں افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ سیاسی جاہل جو سینٹان کے کہتا ہے کہ اسے سیاست سے دلچسپی نہیں، بلکہ اسے تو سیاست سے نفرت ہے۔ ایسا آدمی نہ کچھ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ کرتا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سیاست Policies بنانے کا نام ہے اور آٹے دال، چاول، دواؤں اور موبائل کریڈٹ کی قیمت سے لے کر ہر چیز کا تعین سیاست دان کرتے ہیں، اور اگر سیاسی جاہل اپنی رائے نہیں رکھے گا، سیاست میں ووٹ اور سپورٹ کے ذریعے حصہ نہیں لے گا، تو وہ کرپٹ حکمرانوں کو مضبوط کرے گا اور سڑکوں پہ بے حال پھرتے لوگوں، چور ڈاکوؤں، غریبوں، سب کا ذمہ دار وہ ہوگا۔ مجھے

زیادہ خوشی ہوتی ایڈم اگر تم کہتے کہ تم نے میرے مخالف کو ووٹ ڈالا تھا کیونکہ تب مجھے لگتا کہ میں ایک سیاسی خواندہ سے بات کر رہا ہوں جس کی کوئی سوچ ہے، بھلے مجھ سے مختلف ہو، مگر کوئی نظریہ، کوئی رائے، کچھ تو ہے اس کے پاس۔ یہ انسان کی آزاد رائے ہوتی ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے مختلف کرتی ہے، ورنہ ہم میں اور بھیڑ بکریوں میں کیا فرق ہے؟“ آخر میں کندھے اچکا کے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگ گیا۔

ایڈم پہ تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے چہرہ بالکل جھکا دیا۔

دونوں میاں بیوی کو گھرا تار کے وہ کار سے نکلا اور چھٹی لے کر باہر آ گیا۔ آدھے گھنٹے کی بس کی خواری کے بعد وہ اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ ایک منزلہ چھوٹا سا گھر جس کی چھت مخروطی تھی اور دیواریں لکڑی کی تھیں۔ کھڑکیاں اس پہر بھی روشن تھیں۔ ضرور اس کی ماں جاگ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے دروازہ کھول کے اندر آیا، اور کوٹ اتار کے اسٹینڈ پہ ناٹکا پھر پلٹا تو دیکھا، کچن کے دروازے پہ ویسے ہی چینی نقوش والی عورت کھڑی تھی۔

”ایڈم! تم آگئے۔ کھانا لاؤ؟“ لکڑی کی راہداری میں سدا بہار پھولوں کی مہک پھیلی تھی۔ گھر میں جا بجا چھوٹے برتنوں، ٹین ڈبوں اور بوتلوں میں پودے اور بلیں لگی تھیں۔

”بھوک نہیں ہے، ماں۔“ وہ بد دلی سے سر جھکائے کہتا آگے آیا۔ ”باپا سے کہنا کہ یہ سوٹ دکان پہ واپس کر دیں۔ کل سے مجھے دوسری قسم کے سوٹ پہننے ہوں گے۔ ٹوپس نا پ۔“

”مگر گارڈز تو ایسے ہی سوٹ بوٹڈ رہتے ہیں نا۔“ ادھیڑ عمر عورت حیران سی ہوئی مگر وہ چہرہ لٹکائے کچن میں داخل ہوا اور کرسی کھینچ کے خاموشی سے بیٹھ گیا۔

”عبداللہ نے کہا تھا مجھے باڈی مین بننا ہے میں سمجھا وہ باڈی گارڈ ہی ہوتا ہے۔“

”ایں؟ باڈی مین کیا ہوتا ہے؟“ ماں نے اچنبھے سے کہتے سامنے والی کرسی کھینچی۔ چھوٹا سا کچن نفاست سے صاف کیا گیا تھا اور کھڑکی پہ جالی دار پردے لہرا رہے تھے۔ وہاں بھی چھوٹے چھوٹے سے سرسبز پتوں والے گملے رکھے تھے۔ ایڈم نے بجھا ہوا چہرہ اٹھایا اور ماں کا چہرہ دیکھا۔ ”باڈی مین پرسنل ایڈ کو کہتے ہیں، ماں۔“

”جیسے سیکرٹری؟ اسٹنٹ؟“

”نہیں، ماں۔ سیاستدانوں کے سیکرٹری بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ پولیٹیکل سیکرٹری انک، پرسنل سیکرٹری انک۔ باڈی گارڈز بھی ماہر تربیت یافتہ کمانڈوز ہوتے ہیں۔ میں صرف باڈی مین ہوں۔ پرسنل ایڈ۔ جب انہیں پیاس لگے تو پانی پکڑانا ہے، جب وہ کھانا کھانے لگیں تو نیکیں سامنے کرنا ہے، جب وہ دستخط کرنے لگیں تو قلم کھول کے ان کے ہاتھ میں تھمانا ہے۔ بروقت مستعد اور تیار ان کے قریب رہنا ہے کہ کہیں ان کو کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے۔“

”یعنی کہ نوکر؟“ وہ دھک سے رہ گئی۔

”نوکر بھی فلیچو ہوتے ہیں، انجنسی سے کانٹریکٹ کر کے آتے ہیں، ماں۔ نوکر بہتر ہوتے ہیں۔ باڈی مین تو ایک نوباڑی ہوتا ہے بس۔“

”چند دن کی ہی تو بات ہے۔ پھر ختم ہو جائے گی یہ نوکری۔“

”اس کے بعد میں کیا کروں گا؟ دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ اور میرے پاس نوکری تک نہیں ہے۔“

”تم فاتح رامنزل سے کہو کہ وہ تمہاری کہیں سفارش کرادے۔“

”اوہ میری بھولی ماں....“ ایڈم نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔ ”وہ فاتح رامنزل ہے۔ وہ کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔ اس پہ ایک دنیا مرنی ہے۔ لوگ اس پہ پیسہ لٹاتے ہیں۔ اس کے اعزاز میں بڑی بڑی تقریبات کرتے ہیں اس کی پارٹی کو فنڈز دیتے ہیں مگر وہ نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور اگر کوئی کروڑوں بھی خرچ کر دے تو وہ تھینکس کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کا احسان ”رجسٹر“ نہیں کرتا۔ کہتا ہے میں کسی کو بدلہ نہیں دے سکتا، ہم سب بہتر ملے زیا (ملائیشیا) کے لئے کام کر رہے ہیں، گڈ۔ بس۔ آپ فاتح رامنزل کے لئے جان بھی دے دیں تو وہ تھینکس کہہ کے چلا جائے گا۔ اس کے اتنے چاہنے والے ہیں اس پہ لوگ اتنا کچھ لٹانے کو تیار ہوتے ہیں کہ اس کو ان چیزوں میں دلچسپی ہی نہیں۔ وہ ایک الگ طرح کا بندہ ہے۔ میں تو اس سے کیا سفارش کرواؤں گا، وہ تو میری طرف بلا ضرورت دیکھے گا بھی نہیں۔ وہ بہت بہت اونچا آدمی ہے، ماں۔“

”ایڈم!“ اس کی ماں نے جھک کے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا اور اس کی نبجھی آنکھوں میں دیکھ کے نرمی سے گویا ہوئی۔ ”اگر وہ اتنا ہی خود غرض آدمی ہوتا تو سارا ملک اس سے محبت کیوں کرتا؟“

ایڈم نے پلکیں اٹھائیں۔ ان میں نا سنجھی کی سی کیفیت تھی۔

”لوگ فاتح سے محبت اس لئے کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کو بے نیاز لگتا ہے۔ وہ امریکہ میں ایک ایماندار اور محنتی پراسیکیوٹر ہاتھا پھرا پنا کیریئر چھوڑ کے وہ قوم کے لئے واپس آیا اور اس نے انکیشن لڑا۔ اپنے حلقے میں اس نے اسکولز بنائے، کالجز بنائے۔ اس نے لوگوں کے لئے کام کیا اور وہ دن بدن مشہور ہوتا گیا۔ ایسے میں اس کے گرد سارے مفاد پرستوں کا ٹولہ جمع ہو گیا جن کو امید ہے کہ اگر وہ اس پہ پیسہ خرچ کریں گے تو رامنزل حکومت میں آکر ان کو اونچے عہدوں سے نوازے گا مگر تم یہ دیکھو کہ وہ ان غریب بچوں کے لئے، جو اس کو کچھ نہیں دے سکتے، اسکولز تو بناتا جاتا ہے مگر امیر دوستوں کو تھینکس کہہ کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ بروہ شخص جو فاتح رامنزل کے قریب اس سے چپکا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے وہاں موجود ہے۔ جیسے شہد کے اوپر کھیاں چٹ جاتی ہیں۔ سب کو اپنا حصہ چاہیے۔ اسی لئے وہ ایسے لوگوں سے سر درویر رکھتا ہے تا کہ ہر ایک کو یہ واضح ہو جائے کہ وہ کسی کے لئے کچھ نہیں کرے گا۔“

ایڈم نے سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔

”تم پہلے سے ہی جانتے ہو کہ وہ تمہارے لئے کچھ نہیں کرے گا تو ایڈم، تم اس سے امید نہ لگاؤ۔ کوئی درخواست کرو نہ کسی مفاد کے لئے

اس کو اپنے کام سے متاثر کرنے کی کوشش کرو۔ غریب کو بھی مفاد چاہیے، امیر کو بھی مفاد چاہیے۔ تم ان دونوں کی طرح نہ بنو۔“

”پھر میں کیا بنوں؟“

”باڈی مین!“ وہ سادگی سے مسکرائی۔ ”تم اس کے باڈی مین بنے رہو یہ گیارہ دن۔ بغیر کسی لالچ، کسی غرض اور کسی لمبی اسکیم کے۔ تم اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ سوچو کہ تم نے پوری سچائی، ایمانداری اور وفا داری سے اپنے مالک کی خدمت کرنی ہے۔ اسے غریب دوست بھی مل جائیں گے، امیر دوست بھی، مگر سچائی، ایمانداری اور وفا آج کل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ تم بس یہ گیارہ دن اس کے ہو کر رہو۔ اس کے لئے جان ماری پڑے، جان مارو۔ جان لگانی پڑے تو لگا دو۔ اس کی حفاظت کرو اس کے کام آؤ۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کے اس کی خدمت کرو اور کسی بدلے کی امید نہ رکھو۔ جو تمہارے نصیب میں ہے وہ تمہیں مل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایڈم نے سر ہلایا اور پھیکا سا مسکرایا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”میں پوری سچائی، ایمانداری اور وفا داری سے اس کی خدمت کروں گا اور بے شک وہ مجھے اس کا بدلہ نہیں دے گا۔ لیکن اب مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوگی۔“

”ایڈم!“ اس کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ماں مسکرائی اور اس کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھایا۔ ”صدقت، امانت اور وفا کا بدلہ ہمیشہ ملتا ہے۔ تم دیکھنا، کسی کی بے غرض خدمت سے اللہ تمہیں وہ بخت لگائے گا کہ ساری دنیا دیکھے گی۔“

ایڈم ہلکا سا ہنس پڑا۔ ”میری بھولی ماں، گیارہ دن کی ہی تو بات ہے، ان گیارہ دنوں کی خدمت اسے یاد بھی نہیں رہنی۔“ اور پھر گھڑی دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اب سونے جانا تھا۔ ماں بھی ساتھ ہی اٹھ گئی۔

اس وقت ایڈم بن محمد کو نہیں معلوم تھا کہ ان گیارہ دنوں کے اختتام پہ کون سی بلا اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر وہ جانتا ہوتا تو فاتح رامنزل کی ملازمت تو درکنار وہ اس شہر، اس ملک کو ہی چھوڑ کے کہیں دور بھاگ جاتا.....

☆☆=====☆☆

اگلی صبح منہ اندھیرے جو بارش شروع ہوئی تو سورج نکلنے تک کے ایل بھگتا ہی رہا۔ کے ایل میں ہر دوسرے تیسرے روز بارش ہوا کرتی تھی۔ اگر چار پانچ دن خشک گزر جائیں تو مسجدوں میں بارش کے لئے دعا کروائی جاتی تھی۔ ملائیشیا ایک مسلمان ملک تھا۔ یہاں 60% ملے قوم بستی تھی جن کی رنگت گندی اور نقوش بھینے سے تھے۔ یہ مسلمان تھے۔ 30% چائینیز تھے ادھر جو خوب گورے اور اصلی چینی نقوش کے حامل تھے۔ یہ بڈھسٹ ہوتے تھے عموماً۔ باقی دس فیصد تامل انڈین تھے۔ یوں مختلف ادیان، اور ثقافتوں سے مزین یہ رنگارنگ اور جادوئی سا ملک تھا۔

مسلم اکثریت کے باعث یہاں اسلام کا رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ مسلم عورتیں قابل اعتراض لباس میں نہیں پھرتی تھیں۔ اگر مغربی لباس زیب تن کرتیں تو بھی پورا کرتیں ورنہ عموماً ملے طرز کا لباس پسنتیں جو کھلی سی اسکرٹ اور گھٹنوں تک آتی قمیض پہ مشتمل ہوتا تھا۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد دنگ جاب اوڑھتی تھی اور وہاں مڈل کلاس میں سر ڈھکنا پسند کیا جاتا تھا۔

یہ خاموش طبع اپنے کام سے کام رکھنے والا ملک ہے۔ یہاں آج سے چھ سو سال پہلے اسلام آیا تھا۔ تلوار یا جنگوں کے زور پر نہیں۔ مسلم تاجر آئے اور یہاں بس گئے۔ اسلام کا پیغام لائے اور ان کو چلتا پھرتا قرآن بنے دیکھ کے مالے قوم اپنے آپ اسلام لے آئی۔ راجہ مسلمان ہو گیا اور یوں ملاکہ سلطنت کے بادشاہ کو سلطان کہا جانے لگا۔ دیکھتے دیکھتے امن امان سے لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ جب 1957 میں ملائیشیا نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کی تب بھی کوئی جنگ و جدل نہیں ہوا۔ بات چیت سے معاہدے ہوئے اور ملائیشیا انگ ہو گیا۔

ملائیشیا میں بھی پارلیمنٹ اور وزیراعظم ویسے ہی کام کرتے ہیں جیسے پاکستان میں، مگر ان کا ایک بادشاہ بھی ہوتا ہے جو کے ایل کے ایک محل میں رہتا ہے۔ ہر پانچ سال بعد نیا بادشاہ آتا ہے اور اس کی یہاں وہی حیثیت ہے جو پاکستان میں صدر کی۔ کوئی خاص کام کاج نہیں کرتا، بس ایک اعزازی کرسی ہے جس سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔

ملائیشیا بر ریاست کا اپنا (منتری بیسار) ہوتا ہے جیسے پاکستان میں صوبے ہیں اور ان کے وزرائے اعلیٰ۔ ملائیشیا میں سارے وزیروں، وزرائے اعلیٰ اور بادشاہ سے بھی زیادہ طاقتور ایک شخص ہوتا ہے.... وہ آدمی جس کو پارلیمنٹ منتخب کر کے وزیراعظم یا پردان منتری بناتی ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جس سیاسی جماعت کو زیادہ ووٹ ملتے ہیں ان کے چیئرمین کو وزیراعظم بنایا جاتا ہے اس لئے اگر کسی کو ملائیشیا کا وزیراعظم بننا ہے تو پہلے اس کو اپنی سیاسی جماعت کے ہر پانچ سال میں ایک دفعہ ہونے والے انٹرا پارٹی الیکشن میں چیئرمین کی کرسی کے لئے انتخاب لڑنا پڑے گا۔ اگر وہ چیئرمین منتخب ہو جائے اور پارٹی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر لے تو پارٹی چیئرمین ہی وزیراعظم بنے گا۔ وہاں پارٹی چیئرمین ہر پانچ سال بعد منتخب ہوتے ہیں، اولاد کو وراثت میں پارٹی نہیں دی جاتی۔

نوں کی دہائی تک ملائیشیا کچھ بڑے کا ڈھیر ہوتا تھا۔ بھوکا، کمزور اور لٹا پٹا ملک جس کو کرپشن کا کینسر کھائے جا رہا تھا۔ پھر ان کو ڈاکٹر مہاتیر بن محمد جیسا ایڈر ملا جس نے یہ ثابت کیا کہ اگر کسی پارٹی کا صرف چیئرمین بھی ایماندار اور بہادر ہو، اور نیچے بھلے پوری پارٹی بے ایمان ہو تو بھی وہ ایک شخص سارا ملک بدل سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے ملائیشیا کے ادارے مضبوط کیے عدل و انصاف کا نظام لایا اور ملک کو کرپشن سے پاک کیا۔ نتیجتاً ملک خوشحال ہونے لگا۔ سیاح آنے لگے۔ ملائیشیا کی خوبصورتی کے چرچے ہونے لگے اور ملک دولت اور ترقی سے مالا مال ہوتا گیا۔ لوگ حکومت سے اتنے خوش تھے کہ بار بار اسی پارٹی کو منتخب کرتے گئے۔ باریسن نیشنل خود کو کوئی پارٹی نہیں تھی بلکہ بہت سی پارٹیوں کا اتحاد تھی۔ جہاں اس پارٹی نے ملک کو اچھے سے چلایا وہیں بے پناہ سیٹیں ملنے کے باعث اس کی اپوزیشن ختم ہو گئی۔ ضرورت سے زیادہ طاقت ہمیشہ انسان کو خراب کر دیتی ہے۔ یوں گزشتہ انتخابات میں پہلی دفعہ باریسن نیشنل (قومی فرنٹ) الیکشن ہار کے اپوزیشن میں آ گئی اور جس وقت کی کہانی ہم بیان کر رہے ہیں اس وقت یہ مقبول جماعت اپوزیشن میں بیٹھی ہے۔ لیکن لوگ موجودہ حکومت سے بھی ناخوش نظر آتے ہیں، کیونکہ عوامی رائے سے زیادہ جلدی بدلنے والی شے کوئی نہیں ہوتی، اس لئے نوشتہ دیوار یہ کہتا ہے کہ باریسن نیشنل اپنی خامیوں پہ قابو پا کر اگلے سال کا انتخاب جیت کر اقتدار میں آئے گی اور لازماً اس کا چیئرمین ہی اگلا وزیراعظم بنے گا۔

ملائیشیا کامیڈیا پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں پاکستان کامیڈیا پہلے آزاد اور پھر آوارہ ہوتا گیا، ملائیشیا کامیڈیا سرکاری دباؤ تلے ہی رہا۔ وہاں کے تمام چینل ”پی ٹی وی“ ہیں جن کا کام حکومت کے عیوب کو چھپانا اور اپوزیشن کو بالکل ہی چھپا دینا ہوتا ہے۔ اپوزیشن لیڈرز کے انٹرویوز، جلسوں اور ریلی وغیرہ کو میڈیا کو ترجیح نہیں دیتا۔ یوں کسی بھی حکومت کی جب تک غلطیوں کی نشاندہی نہ کی جائے، وہ بگڑتی چلی جاتی ہے اور اس وقت ملائیشیا میں بھی یہی حال تھا۔

اب ہم واپس کے ایل کی اونچی عمارتوں تک آتے ہیں جو بارش میں کھڑی بھیگ رہی تھیں۔ سرسبز پہاڑیاں، نیلا سمندر اور اونچی سرمئی عمارتیں... یہ ہر روز کا کے ایل تھا۔ جیسے کسی بھیجی جنت کا ٹکڑا ہو۔

دیس پارک سٹی کے ایل کا وہ علاقہ تھا جو امیر اور اثر و رسوخ رکھنے والے خاندان کا مسکن تھا۔ اس کے گرد چار دویواری بنی تھی جو اس کو باقی کے ایل سے منقطع کر کے خاص الخاص بناتی تھی۔ وہاں ایک کالونی میں بڑے سے لان اور پول سے گھر ایک تین منزلہ محل نما گھر تھا جس کے ڈائنگ ہال میں ناشتے کی میز سجی تھی اور اشتہا انگیز خوشبوئیں سارے کو مہکا رہی تھیں۔

میز پہ چھوٹے چھوٹے برتنوں میں رنگ برنگی اشیاء چینی گئی تھیں۔ کری میز، ناسی لیما، داکنگ رینگ، تربوز کا جوس، اور تہہ تاریک (چائے) مگر سربراہی کرسی پہ بیٹھے فاتح رامنل نے ان پر تکلف اشیاء کو ہاتھ لگانے کی بجائے صرف سوپ کے پیالے پہ اکتفا کیا تھا، جسے پیتے ہوئے وہ ناک پہ عینک جمائے اخبار کھولے مطالعے میں منہمک تھا۔ سوپ میں ابلی مرغی کا ٹکڑا منہ میں آجاتا تو وہ نظریں الفاظ پہ رکھے، بند ہونٹوں سے خاموشی سے چباتا اور اگلا جچ بھر لیتا۔ دائیں ہاتھ کرسی پہ عصرہ بیٹھی تھی۔ بھورے سرخ بال ماتھے پہ کٹے ہوئے گر رہے تھے اور باقی پیچھے جوڑے میں بندھے تھے۔ کاجل لگی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کے وہ گاہے بگاہے فاتح کا چہرہ دیکھتی، پھر کرسی پف کترنے لگتی۔ پیچھے ایڈم مستعد سا کھڑا تھا۔ ڈریس شرٹ اور پینٹ پہنے، وہ کل کی نسبت زیادہ پر اعتماد اور آرام دہ لگ رہا تھا۔ اخبار اسی نے لا کر دیا تھا اور اب وہ منتظر تھا کہ ادھر فاتح نہانے کے لئے جائے، ادھر وہ اس کا فون چارج پہ لگائے۔ بس یہی کام تھے ایک باڈی مین کے۔

”السلام علیکم!“ ایک خوشگوار مسکراتی ہوئی آواز آئی تو دونوں میاں بیوی نے نظریں اٹھائیں۔ داخلی دروازے سے ایک سمارٹ سا آدمی چلا آ رہا تھا۔ پینتیس چالیس کے درمیان ہوگا، کافی خوش شکل تھا اور عصرہ میں ملتا تھا۔ آنکھیں تو ہو بہو عصرہ والی تھیں۔ گرے سوٹ، نائی، کف، لکس پہنے اور گیلے بال سامنے سے پائلس کی صورت کھڑے کیے، وہ خوشگوار اور تر و تازہ سا لگ رہا تھا۔

”کا کا (آپی)... آ بنگ (بھائی)!“ اس نے مسکرا کے کہتے باری باری دونوں کو سلام کیا اور فاتح کے دوسری طرف کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ فاتح ذرا سا مسکرایا، سر کو خم دیا اور واپس اخبار پڑھنے لگا۔ عصرہ البتہ پورے دل سے مسکرائی اور فخریہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ نو وارد کے ملازم نے میز پہ ٹوکری لا کر رکھی جس میں سرخ گلابی سے انوٹیشن کارڈز جھلک رہے تھے۔

”کیسے ہوا ایش؟“

”ہمیشہ کی طرح اچھا۔ اور سوری میں آنے سے پہلے بتا ہی نہیں سکا۔“ وہ مسکرا کے کہنے لگا تو فاتح صفحہ پلٹاتے ہوئے سادگی سے بولا۔

”فکر نہ کرو تمہاری بہن کو وحی آ جاتی ہے اس لئے وہ تمہاری پسند کا ناشتہ بنا لیتی ہے۔ ریلیکس۔ ناشتہ کرو۔“

عصرہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ چہرہ خفت سے گلابی ہوا۔ نگاہیں چراغیں مگر اشعر ہنس پڑا اور پلیٹ قریب کھسکائی۔

”وہ کیا ہے آبنگ (بھائی) کہ خون کے رشتوں کی کشش کے آگے دنیا کے سارے رابطے بچھتے ہیں۔“ فاتح نے اگلا صفحہ پلٹا یا اور

گہری سانس لے کر اخبار پر نظریں جمائے بولا۔ ”بہت لوگ دیکھے ہیں ایش مگر تمہاری طرح کا ڈھیٹ جھوٹا ابھی تک نہیں دیکھا۔“

”میری خوش قسمتی ہے بھائی!“ وہ پھر سے ہنس دیا اور پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے ایک نظر اطراف میں ڈالی۔ پیچھے کھڑے ایڈم

نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظریں بہت تیز تھیں۔ عقاب جیسی نہیں۔ کسی لومڑی کی مانند۔

”عبداللہ کہاں گیا؟“ فوراً سے تبدیلی محسوس کر کے پوچھا۔

”چھٹی پہ گیا ہے۔ تم سناؤ کیسے آئے۔“ عصرہ اشیائے طعام اس کے سامنے رکھتے ہوئے موضوع بد لئے لگی۔

”میں یہ آپ کے لیے نیلامی کے کارڈز لایا تھا۔ آپ کے آرٹ میز کی نیلامی کی تقریب کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ آپ

کارڈز دیکھ لیں۔ ابھی میں نے کسی کو بھیجے نہیں ہیں۔ لیٹ ناٹ آئے تو میں صبح سب سے پہلے ادھر ہی چلا آیا۔ اور ایک تو صبح صبح اس دی

مالے نامنٹر ملے میل کے رپورٹر نے فون پہ فون کرنے شروع کر دیے تھے۔ پتہ نہیں ان کو کون بتاتا ہے کہ فاتح بھائی چیرمین کا الیکشن نہیں لڑ

رہے۔ میری رائے پوچھ رہا تھا۔ ابھی تو میں نے پالیسی اسٹیٹمنٹ دی ہے، لیکن سچ پوچھیں تو میں آپ لوگوں کے اس فیصلے سے خوش نہیں

ہوں۔“ اس کے لہجے میں افسوس تھا۔ فاتح نے اخبار سے نظر تک ہٹانے کا تکلف نہیں کیا۔ سوپ پیتے ہوئے وہ کالم پڑھتا رہا۔

”میں آج جو کچھ بھی ہوں.... سیاست میں میرا جو مقام بھی ہے وہ آپ دونوں بالخصوص فاتح بھائی کی وجہ سے ہے۔ اگر بھائی مجھے انگلی

پکڑ کے چلانا نہ سکھاتا، مجھے بروقت اپنے ساتھ نہ رکھتا تو میں ایک عام سا وکیل ہوتا۔ مگر ایک ممبر پارلیمنٹ نہ ہوتا۔ اور اب جب وہ وقت آیا

ہے کہ آپ دونوں مجھے چیرمین بنارہے ہیں، مجھے اس عہدے تک لے جا رہے ہیں جس کے میں قابل نہیں ہوں، تو آپ سیاست سے کنارہ

کش ہو کے باہر جانا چاہتے ہیں۔“ وہ احساس بھری خفگی سے کہہ رہا تھا اور کہتے ہوئے اپنی سیاہ چمکتی آنکھوں سے باری باری دونوں کے

تاثرات دیکھتا تھا۔ ”میں اپنے حق میں آپ کی دستبرداری کے فیصلے کی جتنی قدر کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے اپنا آپ اکیلا محسوس ہونے لگا ہے

بھائی۔ اگر آپ لوگ چلے گئے تو مجھے کون گائیڈ کرے گا؟ کا کا.... اتنی ضد مت کریں۔“ اس نے گویا بہن کی منت کی۔

”میں پولیٹیکل وائف پوز کر کے تھک چکی ہوں ایش۔ ہمارے پاس اس مہنگے شوق کو جاری رکھنے کے لئے کوئی فنڈز نہیں

ہیں۔ آریانہ کے بعد تو میرا کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ میں بس واپس جانا چاہتی ہوں اور ظاہر ہے فاتح کو اپنی فیملی بہت عزیز ہے، بیوی بچوں

سے الگ تو وہ نہیں رہ سکتا۔“

اشعر نے خستہ کری ایف کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور اسے چباتے ہوئے پرسوج نظروں سے فاتح کو دیکھا۔ ”آبنگ (بھائی).... آدمی کو آپ

جیسا جمہوری بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرے حق میں دستبرداری کی میں بہت قدر کرتا ہوں، مگر یوں ملک چھوڑ کے....“

”تمہیں کس نے کہا کہ میں دستبردار ہو رہا ہوں؟“ اس نے عینک اتارتے ہوئے اور اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے ٹھنڈی نظروں سے ایش کو دیکھ کے کہا تو لمحے بھر کو نو جوان سیاستدان کی رنگت اڑ گئی مگر وہ سنبھل کے مسکرا دیا۔ ”آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا میں اس میں آپ کے ساتھ ہوں گا“ آنگ۔ جیسے آپ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ آپ میرے آئیڈیل ہیں، کبھی مت بھولیے گا۔“

”تھینک یو۔“ وہ اخبار تہہ کر کے کرسی دھکیلتا اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈم نے جلدی سے اس کا سیل اٹھایا اور فاتح کے پیچھے لپکا۔ ذہن میں مسلسل ماں کی باتیں گونجنے لگی تھیں۔ اسے ان باتوں کے تہہ در تہہ معانی اب سمجھ آنے لگے تھے.... ڈائننگ روم خالی ہوا تو اشعر آگے کو جھکا اور فکر مندی سے بہن کو دیکھا۔ ”آپ نے کہا تھا بھائی مان گیا ہے۔“

”ایش!“ عصرہ نے اس کا ہاتھ دبایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے وزیر اعظم تم بنو گے تو تم ہی بنو گے۔ میں فاتح کو مزید سیاست میں خود کو تباہ کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ اسی سیاسی Campaign کے دوران آریانہ کو کھویا تھا ہم نے۔ فاتح کے پاس صرف خواب ہیں، پیسے نہیں۔ میں اسے مزید اپنا اور میرا پیسا اس سیاست میں نہیں جھونکنے دوں گی۔“

”مگر میں براہیل کر رہا ہوں۔ بھائی مجھ سے خفا ہے۔“

”وہ تم سے خفا نہیں ہے۔“ عصرہ نے ٹوکری سے ایک کارڈ نکالتے ہوئے ہاتھ جھلا کے اس کے داہمے کور دیکھا۔ ”وہ خود سے خفا ہے۔ وہ ناکام ہو چکا ہے اور اس ناکامی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا۔“

”ویسے تمہیں ان کو ملک چھوڑنے کا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ملائیشیا ان کے خون کا حصہ ہے۔“ وہ جانچتی پرکھتی نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے بظاہر سادگی سے بولا تھا۔

”میں اس سے کم پہ راضی نہیں ہو سکتی۔ سوری۔“ پھر کارڈ کھولا تو اس کی بھوری آنکھوں میں ستائش ابھری۔ ”بہت خوبصورت کارڈز ہیں۔ تھینک یو ایش۔ تم نے میرے کہے بغیر سارا انتظام اپنے سر لے لیا۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو کا۔ تمہیں بابر سمنل ہونے کے لئے یہ رقم چاہیے تھی۔ اتنے سالوں سے اتنی بڑی آرٹ گیلری کی مالک رہی ہو اب اس سارے آرٹ کو فروخت کرنے لگی ہو تو ادا کرنے والوں تو نہیں بیچنے دوں گا نا اس سب کو۔ ایک دنیا شریک ہوگی اس میں۔“

”زبردست۔ نیلامی کی رقم کا ایک چوتھائی چیرینی میں جائے گا اور اسی چیز کو بنیاد بنا کے ہم اس کی تشہیر کریں گے۔“ وہ جوش سے بتا رہی تھی۔ پھر جیسے یاد آیا۔ ”جمعرات کی۔ بہہ پہر وہ کویتی امیر میری گیلری آئیں گے۔“

”کون سے کویتی؟“

”تم اور فاتح ایک جیسے ہو۔ بار بار بھول جاتے ہو۔ میں نے بتایا تھا نا کہ ایک کویتی امیر ہمیں نیلامی کے لیے ایک مار پینٹنگ کا عطیہ دے رہے ہیں۔ سپانکم کی پینٹنگ ”گھائل غزال“ (زخمی برن)۔ وہ ایک مشہور آرٹ کلکٹر ہیں اور جس وقت وہ گیلری آئیں تمہیں وہاں

ہونا ہے لازمی۔ سیاندانوں کی بیویوں کو لوگ عطیے صرف سیاندان سے تعلقات بنانے کے لیے دیتے ہیں۔ ان کا کوئی کام وغیرہ ہو تو تم کر دینا۔ فاتح سے تو مجھے امید نہیں ہے۔“ وہ بے رخی سے کہہ کے کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔

”شیور مگر پینٹنگ کو کسی ایکسپرٹ سے چیک ضرور کروانا۔ نقلی نہ نکلے۔“

”ظاہر ہے، کرواؤں گی۔ ایسے ہی تو نیلامی پہ نہیں رکھ دوں گی نا۔ میری کریڈیٹیلٹی کا سوال ہے۔“ وہ اب کارڈز واپس ڈال رہی تھی۔ اشعر نے ایک نظر کھڑکیوں کو دیکھا جن پہ ٹپ ٹپ قطرے برس رہے تھے اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلتا ہوں کا کا۔ آج بہت کام ہیں۔“

عصرہ نے چہرہ اٹھا کے محبت بھری نظروں سے اشعر کو دیکھا۔ ”تم شادی کر لو اشعر۔“

”شادی!“ اس نے ہنسیوں اکٹھی کیں جیسے اچانک اس ذکر پہ حیرت ہوئی ہو۔

”ہاں ایش.... کسی اعلیٰ خاندان کی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لو۔ ملے زیا کے لوگوں کو کیا اچھا لگتا ہے؟ ان کے لیڈر کی ایک مثالی خوبصورت بیوی اور دو بچے ہوں۔ پرفیکٹ فیملی۔ تمہاری رہنمائی بھی اوپر جائیں گی اور شہرت بھی بڑھے گی۔“

”ہوں۔“ وہ چھوڑی کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”مگر کا کا اتنی پرفیکٹ لڑکی کہاں ملے گی؟“

”جیسے تمہارے حلقہ احباب اور عادتوں کو میں تو جانتی ہی نہیں۔ جاؤ، ڈھونڈو کوئی۔“ عصرہ نے ہاتھ جھلا کے اسے ہلکا سا جھڑ دیا اور کارڈز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایش ہنس دیا۔ پھر اپنی کالی آنکھوں سے اطراف کا عین جائزہ لیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆=====☆☆

کے ایل کے ایک دوسرے رہائشی علاقے میں آؤ تو یہاں تنگو کامل کے گھر بھی صبح ہو چکی تھی۔ بارش یہاں بھی تڑا ترنبر سے جا رہی تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں سے بھیکتالان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مسز شیلا صوفی نے پہنچی، دنگرنگی سے سامنے بیٹھی تالیہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”وہ ایسے تمہاری شادی کیسے کر سکتے ہیں؟“

تالیہ نے گلابی متورم آنکھیں اٹھائیں۔ وہ یونیفارم میں ملبوس تھی، سیاہ بال کس کے باندھ رکھے تھے اور چہرے پہ ادا سی تھی۔ ”سرنے جو پیسے مجھے دیے تھے اور جو اس آدمی نے دیے تھے وہ میں نے اپنے والد کو بھجوائے۔ مجھے لگا تھا وہ خوش ہوں گے مگر ان کو لگتا ہے کہ میں غلط کاموں میں پڑ گئی ہوں، اس لئے انہوں نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے اور مجھے واپس بلا لیا ہے۔“ آنکھیں بھینکے لگیں ”مگر میں غلط کاموں میں تو نہیں پڑی تھی نا میم۔ تالیہ نے تو وہی کیا جو مسٹر کامل نے کہا تھا۔ تالیہ نے تو چوری نہیں کی تھی نا میم۔“ آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکا اور گلابی گال پہ لڑھک گیا۔

”میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں تالیہ۔“ شیلا نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ ”میری ماں نے بھی میری بہن کے ساتھ یہ کیا تھا۔ آہ ہم ایشیائی عورتیں۔ میں تو اس وجہ سے ماں کو کبھی معاف نہیں کر سکی۔“

تالیہ چونکی۔ ”مگر آپ کو تو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی نا۔ آپ نے بتایا تھا کہ انہوں نے آپ کو ایک تاج دیا تھا جو آپ نے اپنے بیٹے

کی بیوی کے لیے سنبھال رکھا ہے۔“

”کون سی محبت؟ ہونہ۔ سوتیلی ماں تھی وہ ہماری۔ اس کا دیا زور بھی پہننے کو دل نہیں چاہتا میرا۔ قیمتی نہ ہوتا تو سنبھال نہ رکھتی۔“ انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا تو تالیہ کا منہ کھل گیا۔ ایک بے بس سی نظر اوپر ڈالی جہاں اسٹڈی کے لاکر میں وہ اس تاج کو ان پر رحم کھا کے چھوڑ آئی تھی۔ (اُف اُف... کاش خواہ مخواہ انسانیت کے چکر میں نہ پڑی ہوتی۔ ہائے۔ وہ کتنا پیارا اور قیمتی تھا۔ کاش موٹی کی بات سن لی ہوتی۔)

”میں چلتی ہوں میم۔ اور اگر آپ لوگ کبھی لاہور آئیں تو میرے پاس ضرور آئیے گا۔ ہم لاہور کے لوگ بہت پیارے ہوتے ہیں۔ کھلے دل کے مہمان نواز اور کھاتے پیتے سے۔“ وہ بادل نحواستہ کہتی چھتری اٹھائے اٹھی تو وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

”انشاء اللہ کیوں نہیں۔“ وہ مسکرا کے بولیں پھر پرس کھولا۔ ”اپنی باقی تنخواہ لیتی جاؤ۔“

”نہیں میم... سر نے اتنا کچھ دے دیا ہے میں اب مزید کچھ نہیں لوں گی۔“ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ اور سختی سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ انہوں نے زبردستی تھمانے چاہے تو تالیہ نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ ”نہیں میم! یہ میں نہیں لوں گی۔“

”اچھا میں کچھ اور کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟“ وہ خلوص سے پوچھ رہی تھیں۔ تالیہ نے بدقت اپنے خفا جذبات کو چہرے پر آنے سے روکا۔ (ماں کے زیور کے قصے کیوں سنائے تھے آخر پھر؟ اُف تالیہ تم نے وہ کیوں چھوڑ دیا؟) ”بس دعا میں یاد رکھیے گا۔“

”کیوں نہیں تالیہ۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم اتنی اچھی صاف اور سچے دل کی مالک جو ہو۔“

باہر ایک دم زور سے بجلی کڑکی۔ بارش کی بو چھاڑ تیز ہوئی۔ تالیہ کی آنکھوں میں سایہ ساہرایا۔ سیاہ تاریک مایوس ساسایہ۔ دل ایسے ڈوبا...

جیسے نیلے سمندر میں ٹونا ہوا جہاز ڈوب جاتا ہے...

(اللہ تعالیٰ اس بات سے اتفاق نہیں کرے گا مسز شیل... مگر خیر...) اس نے سر جھٹک دیا۔ ہمیشہ کی طرح گلٹ کو بھی جھٹک دیا۔ مسز شیل اب پرس واپس رکھ کے اسے وقتِ رخصت کی دعائیں دے رہی تھیں۔ بارش ویسی ہی برس رہی تھی۔ وہ گھر آئی تو دروازہ کھلا تھا۔ داتن پھیل کے لاؤنج کے مرکزی صوفے پہ براجمان تھی۔ ٹی وی چلا ہوا تھا اور وہ آلو کے گرم ماگرم چپس کھا رہی تھی۔ تالیہ نے سامنے آتے ہوئے آنکھیں چھوئی کر کے اسے دیکھا۔

”اتنے سارے چپس....“ ایک مشکوک نظر اوپن کچن کاؤنٹر پہ ڈالی۔ ”اور اتنے سارے جھوٹے برتن ظاہر کر رہے ہیں کہ تم کب سے بیٹھی بس کھا ہی رہی ہو۔ یقیناً رات دیر تک جاگتی رہی تھیں....“ وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے سامنے پھیلے بکھراوے کو دیکھنے لگی۔ کاغذات۔ لیپ ٹاپ۔ کتابیں۔ ”یہ کام تو تم نے صبح اٹھ کے میرے جانے کے بعد شروع کیا ہوگا“ پھر رات بھر جاگ کے کمپیوٹر پہ کیا کرتی رہی تھیں؟ مجھے سوچنے دو۔ ہوں۔“ تالیہ نے انگلی سے گال پہ دستک دی اور اوپر چھت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”جب داتن ساری رات کمپیوٹر پہ بیٹھے اور اتنا کھائے اور صبح اس کے چہرے پہ یہ بچھتاوے بھری خاموشی ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔ کہ تم رات بھر گوگل پہ دبے ہونے کے طریقے دیکھتی رہی تھیں۔“

داتن جو ناک پہ عینک جمائے اسکرین کو دیکھ رہی تھی اس بات پہ نظریں اٹھا کے اسے کھورا۔ ”اور تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟“
 ”تمہاری آنکھوں کے گرد لکڑیوں میں لکھا ہے بوڑھی عورت۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے صبح میرے لیپ ناپ کی ہسٹری چیک کی ہوگی۔“

”ظاہر ہے میں نے ہسٹری چیک کی تھی۔“ وہ کھلکھلا کے ہنس دی اور اس کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔ پیروں کی قینچی بنا کے میز پہ رکھ لئے۔ ”اتنا ہلکان نہ ہوا کرو داتن۔ تم اب پتلی نہیں ہو سکتیں۔“

”پتلا ہونے کے لئے عمر کی شرط نہیں ہے۔ انسان کسی بھی عمر میں دبلا ہو سکتا ہے۔“

”انسان ہو سکتا ہے نا۔ برائے مرغیاں نہیں۔“ وہ کہہ کے زور سے ہنسی۔ ”ویسے دیکھا ہے تم نے کبھی کسی مرغی کو ڈانگنگ کرتے؟ سوپ اور ابلی سبزیاں کھاتے؟ نہیں نا۔“

داتن نے خفگی سے ناک سکوڑی اور اسے درزیدہ نظروں سے دیکھا۔ ”بہت خوش نظر آرہی ہو۔ خیر ہے؟“

”ہاں نا۔ تنگو کامل کے گھر سے استعفیٰ دے آئی ہوں۔ بقایا تنخواہ بھی ان کو صدقہ کر آئی ہوں۔ جلد ان کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ پیچ پیچ۔“ افسوس سے سر ہلایا۔ اپنی انسانیت کا نتیجہ گول کر گئی۔ ”خیر... اب ہم فاتح رامنزل پہ کام کرنا شروع کریں گے۔ میں فریش ہو کے آتی ہوں اور پلان بتاتی ہوں۔“

کہہ کے اس نے پیر نیچے اتارے اور جھک کے جوتے کھولنے لگی۔ چونکہ تالیہ کے بال جوڑے میں بندھے تھے گردن کی پشت پہ گول سا جلنے کا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ داتن اس کو دیکھے گئی، پھر موبائل نکالا اور ہاتھ اونچا کر کے اس نشان کی تصویر لی۔

”کیا کر رہی ہو؟ میری جیسی پتلی تم اگلی دس زندگیوں میں بھی نہیں ہو سکتی۔“ تالیہ جوتے اٹھاتے سیدھی ہوئی، اسے چڑانے کو بولی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ داتن نے کچھ نہیں کہا۔ بس اسکرین کو زوم کر کے اس نشان کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں اچنبھا سا تھا۔ اس نے تصویر موبائل سے لیپ ناپ میں ڈالی اس کا پرنٹ آؤٹ نکالا اور پھر اس کاغذ کو تہہ کر کے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ وہ فریش ہو کر آئی تو داتن اس تصویر لینے کا برنشان مٹا چکی تھی۔ تالیہ نے گیلے سیاہ بال تولیے میں لپیٹ رکھے تھے اور پیروں میں سیلپرز پہن رکھے تھے۔ وہ سامنے والے صوفے پہ آلتی پالتی کر کے بیٹھی اور بولی۔

”تو ہم کیا جانتے ہیں فاتح رامنزل کے بارے میں؟“

☆☆=====☆☆

(فاتح رامنزل جس کے نام کے ساتھ دان لگتا ہے... اور تم جانتی ہو تالیہ کہ وہ ان ملائیشیا میں ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ لگتا ہے جو اوپر سے شاہی خاندان میں سے تھے مگر پھر کسی ایک نے کسی عام آدمی سے شادی کر لی تو ان کی نسل میں ملاوٹ ہو گئی۔)
 کے ایل کی سڑک پہ وہ سیاہ لمبی کار دوڑ رہی تھی اور بچھیلی سیٹ پہ بیٹھا فاتح کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں پر سوچ انداز میں چھوٹی کر

رکھی تھیں اور مسلسل تھوڑی کو انگوٹھے سے رگڑ رہا تھا۔ فرنٹ سیٹ پہ تابعداری سے بیٹھا ایڈم گاہے بگاہے آئینے میں اپنے مالک کو دیکھ لیتا تھا۔ عارضی مالک کو۔ اس نے سوچ کی تصحیح کی۔

(فاتح کم عمری میں اپنے والدین کے ساتھ امریکہ چلا گیا تھا۔ اس کو وہاں کی شہریت بھی مل گئی مگر وہ کبھی ملک سے کٹا نہیں۔ چھٹیوں میں‘ تہواروں پہ وہ کے ایل آجاتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ وہ وہاں کالج میں کافی مقبول تھا۔)

”یوں کرو کارموڑلو۔“ کھڑکی سے نظر ہٹائے بغیر فاتح نے ڈرائیور کو مخاطب کیا تو وہ چونکا۔

”سر ہم پارلیمنٹ نہیں جارہے؟“ اس کے وقت کا ایک ایک منٹ ڈائری میں لکھا ہوتا تھا۔ ایسے میں یہ تبدیلی؟

”شمس کے گھر کی طرف لے چلو۔“

”مگر سر‘ کیا آج آپ سیشن اٹینڈ نہیں کریں گے؟“ ڈرائیور نے فکر مندی سے پوچھا۔

”راستے سے پھول بھی لیتے چلو۔ شمس بیمار ہے کچھ عرصے سے۔“

”اوکے سر۔ میں پولیٹیکل سیکرٹری کو انفارم کر دوں کہ آپ سیشن اٹینڈ نہیں کریں گے؟“ ایڈم نے جلدی سے فون نکالا۔ سیکرٹری دوسری کار میں آرہا تھا۔

”گلاب مت لینا۔ شمس کو اس سے الرجی ہے۔ کچھ اور لینا۔“ وہ کھڑکی سے باہر دور نظر آتی اونچی عمارتوں پہ نظریں جمائے بولا تھا۔ ایڈم گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اتنا تو وہ پچھلے تیس گھنٹوں میں سمجھ چکا تھا کہ اس کا عارضی مالک بات کا سیدھا جواب نہیں دیتا۔

(فاتح نے دو دفعہ اسٹیٹ انارنی کالیکشن لڑا اور دونوں دفعہ ریاست کے لوگوں نے اسے منتخب کر کے آفس میں پہنچایا۔ وہ امریکہ میں کافی مقبول تھا۔ اس کا ریکارڈ شاندار تھا۔ ایماندار آدمی‘ سچا اور کھرا مگر وہ سب چھوڑ کے ملائیشیا واپس آیا‘ اور یہاں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔)

کاراب بھی سڑک پہ دوڑ رہی تھی اور وہ ہنوز باہر دیکھتے ہوئے کچھ سوچے جارہا تھا۔ ڈرائیور اور باڈی مین اپنے اپنے فونز پہ لگے تھے۔ سیکرٹری کو اطلاع‘ شمس صاحب کے آفس میں اطلاع.... پرنٹو کول.... سکیورٹی انتظامات.... افراتفری سی مچ گئی تھی۔

(وہ دو دفعہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوا ہے اور ان دس سالوں میں اس نے اپنے حلقے کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اس نے علاقے کو صاف کیا‘ وہاں بہترین اسکول بنوائے‘ بہترین ہسپتالوں کا نظام لایا‘ میکیو رٹی بہتر کی۔ لوگ اس سے خوش ہیں۔ اگر کوئی نہیں خوش تو اس کی اپنی پارٹی ہے۔)

کاراب ایک پھولوں کی دکان کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک باہر دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھا۔ جیب میں رکھا موبائل وقفے وقفے سے تھر تھراتا تھا مگر وہ ادھر متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

(اس کی صاف گوئی نے جہاں بہت سے دوستوں کو ناراض کیا وہاں حد سے زیادہ بے نیازی امیر lobbyists کو اس سے دور کر کے

اشعر کے قریب لے گئی۔ اشعر اس کی بیوی کا بھائی ہے۔ میٹھی چھری جیسا۔ ہر وقت ہنستا مسکراتا ہوا ایک نمبر کا دوغلا اور ambitious انسان۔ اشعر نے اپنے آبگ کے نام پہ لوگوں سے قرضے لئے 'فیورز مانگے۔ یہ نہیں کہ فاتح ان کو ادا کرے گا بلکہ یہ کہ اس طرح میں آپ کو فاتح سے قریب کر دوں گا۔ اشعر امیر ہوتا گیا اور فاتح کی جمع پونجی کم ہوتی گئی۔ سیاست بہت مہنگا شوق ہے اور اس کی بیوی کا کام بھی اس سے متاثر ہوا ہے۔ اوپر اوپر سے لگژری لائف اسٹائل کا طمع تو ہے مگر اندر سے ان کے پاس کچھ نہیں بچا مگر ان فاتح کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے۔)

کار پھر سے چل پڑی تھی۔ پھول ایڈم نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیے تھے اور ان کی خوشبو نے ساری کار کو مہکا دیا تھا۔ ایسی دلفریب خوشبو کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ ایڈم کا موڈ بھی ایک دم کافی خوش ہو گیا۔

(وہ ایک خواب میں جی رہا ہے تالیہ۔ ایک آئیڈیلزم میں۔ لوگ کہتے ہیں اسے سیاست نہیں آتی۔ اسے عیاریاں نہیں آتیں۔ وہ عوام کے ووٹ کے بھروسے پہ وزیر اعظم بننے کے لئے پر یقین اور پر امید ہے مگر اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ ملے زیا میں جمہور کی حمایت کافی نہیں۔ امیر دوست زیادہ ضروری ہیں۔)

گاڑیوں کا قافلہ ایک بنگلے کے باہر پہنچا تو خود کار گیٹ کھل کے دیوار میں گھستا گیا۔ کار طویل ڈرائیو سے پہ آگے بڑھتی آئی۔ (فاتح ایک سادہ آدمی ہے۔ مغرور بھی ہے مگر ہر ایک پہ اعتبار کر لیتا ہے۔ سب کو اپنے جیسا سچا سمجھتا ہے۔ اس کے دوست اشعر کے ساتھ ملتے جارہے ہیں۔ دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فاتح رامنزل اپنے خواب سے دستبردار ہوتا ہے یا نہیں۔)

ایڈم جھٹ کار سے نکلا اور فاتح کا دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر وہ فاتح نے دروازہ خود ہی کھولا اور کوٹ کا مٹن بند کرتے باہر نکلا۔

☆☆=====☆☆

باہر نکل کے فاتح رامنزل نے گردن اٹھا کے اس اونچے گھر کو دیکھا۔ بارش اب ہتھم چکی تھی۔ سیاہ بادل غائب ہو رہے تھے۔ "تم لوگ یہیں رکو۔" اس نے بے نیازی سے تمام ملازموں کو ہاتھ سے اشارہ کیا جو ساتھ آرہے تھے۔ سب رک گئے اور سمجھ کے چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ فاتح گھر کے برآمدے کی طرف بڑھا جہاں خنس کے ملازم اس کو اندر لے جانے کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ پھر وہ ٹھہرا اور گردن موڑ کے سوالیہ نظروں سے ایڈم کو دیکھا جو ساتھ چلا آرہا تھا۔

"مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ یہیں رکو۔"

"سوری سر" مگر آپ کو صبح سے فلو کی شکایت ہے، آپ کو بار بار بارنٹھو کی ضرورت ہوگی جو میں ساتھ لایا ہوں اور آپ کو کسی دوسرے کے ملازم کے نشوز پہ نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے آپ کے ساتھ آنا ہوگا۔"

فاتح نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک ابرو اٹھائی۔ "تم مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

”نہیں سر۔ میں نے آج صبح سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ سچائی اور ایمانداری سے کام کروں گا“ کیونکہ میں آپ کے ملازموں میں وہ واحد شخص ہوں جس کو آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ سادگی سے مسکرایا۔

”واقعی؟“ (تمام ملازمین، سیکرٹری، سب ایڈم کو گھور رہے تھے مگر وہ نڈر سا بولے جا رہا تھا۔)

”سر میری نوکری ویسے بھی چند دن میں ختم ہو جائے گی اور آپ کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتے، سو مجھے آپ سے کچھ نہیں ملنے والا۔ کل رات تک میرے دل میں لالچ تھا اس لئے میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں نے کسی کو ووٹ نہیں دیا۔ میں نے آپ کی مخالف امیدوار کو ووٹ دیا تھا سر، حکمران پارٹی کو۔ اپنی موجودہ وزیراعظم کو۔ مگر اب مجھے خوف نہیں ہے سر۔ سچ بولنے والے انسانوں کی ناراضی سے ڈرتے نہیں ہیں۔ اس لئے سوری مگر میں آپ کو اکیلے اندر نہیں جانے دے سکتا جب کہ آپ کو فلو ہے۔“

فاتح ہلکا سا مسکرایا اور آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔ ”تم واقعی مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ اور آگے بڑھ گیا۔ ایڈم مستعدی سے پیچھے لپکا۔ سیکرٹری نے تادیبی انداز میں پکارا، ڈرائیور نے گھورا مگر چونکہ فاتح نے منع نہیں کیا اس لئے وہ رکا نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ ایک خوبصورتی سے سجائے گئے شاہانہ طرز کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ اونچی کھڑکیاں، سنہری پردے اور سفید مٹلیں صوفے۔ جیسے کراچی کا کوئی بنگلہ ہو۔ شمس صاحب چینی نقوش کے حامل ادھیڑ عمر انسان تھے۔ ان کے سامنے فاتح رامزل براجمان تھا۔ ہاتھ صوفے کی پشت پہ پھیلائے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ ایڈم پیچھے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں نشو کا پیکٹ تھا۔

”تمہیں کچھ پریشان کر رہا ہے فاتح؟“ شمس صاحب تفکر سے اس کا چہرہ دیکھ کے بولے تھے۔

”میں ایک دورا ہے پہ کھڑا ہوں۔ کراس روڈز پہ۔ سامنے تین سڑکیں ہیں۔ فیصلہ نہیں کر پار ہا کہ کون سی لوں۔“ بات کے اختتام پہ وہ جھکا اور میز پر رکھے نشو باکس سے تین نشو کھینچے۔ (ایڈم کا منہ کھل گیا۔) ”تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں تاکہ اپنا ذہن کلیئر کر سکوں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے بربرے وقت میں مجھے یاد رکھا ہے اور مجھ پہ بھروسہ کیا ہے۔“

”میں کسی برے وقت میں نہیں ہوں شمس۔“ تہہ شدہ نشو سے ناک رگڑتے اس نے کندھے ذرا سے اچکائے تھے۔ ایڈم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ نشو کا پیکٹ پکڑا ہاتھ پہلو میں ڈھیلا سا گر گیا۔

”اگر مجھ پہ بھروسہ کیا ہی ہے تو میری رائے کو ختم سے سنو۔ تم اچھے وقت میں بھی نہیں ہو فاتح۔ لوگ تم سے ہاتھ کھینچ رہے ہیں۔“

”ایش چاہتا ہے میں چیئر مین شپ کے الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں۔ عصرہ چاہتی ہے کہ ہم امریکہ چلے جائیں۔“

”یہ سراسر ظلم ہے۔“ شمس صاحب کے چہرے پہ غصہ نظر آنے لگا۔ ”چیئر مین بننے کا اگر یہ درست وقت نہیں ہے تو وہ الگ بات ہے لیکن ملک چھوڑنا... اپنی سیاست چھوڑ کے کسی lounge lizard کی طرح ریٹائرمنٹ گزارنا.... یہ تمہاری شان کے خلاف ہے۔“

فاتح نے اسی سادگی سے دوسرا نشو تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”سیاست درمیانی راستے کا نام ہے۔ منہ امت کا۔ بات چیت سے مسائل حل کرنے کا۔“ وہ سمجھداری سے کہہ رہے تھے۔ وہ نشو مٹھی

میں دبائے آنکھیں چھوٹی کر کے ان کو غور سے دیکھتا رہا۔

”تم کچھ اپنی منواؤ۔ کچھ اس کی مانو۔ چیئر مین شپ چھوڑ دو مگر کسی ایک ریاست کی حکومت مانگ لو۔ ایش وزیر اعظم بن کے ایک ریاست تمہارے حوالے کر دے، تم اس شرط پہ ایش سے ذیل کر لو۔“

”واقعی؟“ فاتح نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

”یہ بہترین آپشن ہے۔ پانچ سال تم اس ریاست کے حاکم بن کے خود کو مزید مضبوط کرو۔ پانچ سال بعد تم چیئر مین شپ کا انکیشن لڑو اور وزیر اعظم بننے کی کوشش کرو۔“

”صحیح۔ میں اس بارے میں سوچوں گا۔“ اس نے سر کو آہستہ سے ہلایا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی، پھر ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شمس صاحب بھی ساتھ ہی اٹھے۔

”اب اجازت۔ عصرہ کی نیلامی پہ ملاقات ہوگی ان شاء اللہ۔“

”اچھا کوئی ایونٹ ہو رہا ہے مسز عصرہ کا۔ اللہ برکت دے۔“

”ہاں ایش اریج کروار رہا ہے۔“ وہ مصافحہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ ڈرائیونگ روم سے نکل کر وہ لابی تک آئے تو درمیانی میز پہ پھولوں کی نوکری رکھی تھی۔ ایڈم نے گزرتے ہوئے یونہی نظر گھمائی تو چونکا۔

نوکری میں ایک سرخ اور گلابی کارڈ کا کونا جھلک رہا تھا۔ ذہن میں جھماکہ ہوا۔ ”لیٹ ٹائم کارڈز آئے تھے، صبح صبح سب سے پہلے ادھر ہی آیا۔“

کسی خواب کی سی کیفیت میں ایڈم سیدھا ہوا، پھر آگے دیکھا۔ فاتح موبائل پہ مٹن دباتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایڈم شل سا پیچھے آیا۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا مگر اسے خود پہ قابو پا کر کار میں بیٹھنا تھا۔

گیٹ پہ کھڑے ہو کر شمس صاحب نے فاتح کی کار کو الوداعی ہاتھ ہلایا اور جب تمام گاڑیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو انہوں نے موبائل نکالا اور اسپید ڈائل پہ ایک نمبر ملا کے فون کان سے لگایا، پھر ایک ہاتھ کمر پہ جمائے، گھنٹی سننے لگے۔

”ایش!“ رابطہ ملنے پہ انہوں گہری سانس لی۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سب سے پہلے میرے پاس آیا ہے۔ ہاں بے فکر رہو، میں نے وہی کہا ہے جو تم نے بولا تھا۔ ایک ریاست کی حاکمیت اور بس۔“ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو وہ سوچتے ہوئے بولے۔ ”کچھ کہہ نہیں سکتا مگر وہ دستبرداری کے لئے نیم رضامند لگتا ہے۔ نہیں نہیں اس کو مجھ پہ شک نہیں ہو گا، وہ مجھ پہ اعتبار کرتا ہے۔....“ وہ اب بولتے ہوئے اندر کی طرف مڑ گئے تھے۔ آواز بلکی ہوتی جا رہی تھی۔

چند کلومیٹر دور.... اپنے آفس فلور کے کارنز آفس میں اشعر پاوری سیٹ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ٹیک لگائے وہ فون کان پہ جمائے مسکرا کے سن رہا تھا۔ ”گڈ۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کبھی بھی امریکہ نہیں جائے گا۔ ہم نے اس کو موت دکھا کے بخار پہ راضی کرنا ہے۔ وہ مجھ سے جلد ہی ایک

ریاست کی بات کرے گا اور میں اس کا مان رکھ لوں گا۔ وہ سمجھے گا سارا آئیڈیا اسی کا ہے۔“

کال بند کر کے اس نے اپنے چیف آف اسٹاف کو بلایا۔ جیسے ہی وہ اندر آیا اس نے دیکھا کہ اشعر بنجیدہ سپاٹ سا بیٹھا ہے۔ چہرے پر بے رحمی بھری سختی اور ماتھے پہ بل ہیں۔

”عرب امیر زادے کا بندوبست کر لیا ہے؟“ اس نے سرد آواز میں پوچھا۔

”لیس سر۔ سارے کاغذات یکے ہیں۔ مسز عصرہ کو شک بھی نہیں ہو گا کہ جس عرب امیر سے وہ ملنے جا رہی ہیں وہ ایک اداکار ہے۔“

”اور پینٹنگ؟“

”اسی شیخ کے ملازم سے ان کے گھر سے اٹھوائی ہے لیکن اصل شیخ صاحب اس کو مس نہیں کریں گے کیونکہ چند سال قبل جب زخمی برن کی پینٹنگ چوری ہوئی تھی تو چور ہمیشہ کی طرح ایک نقلی پینٹنگ چھوڑ گئے تھے۔ بہت مہارت سے بنائی گئی ہے وہ۔ شیخ صاحب نے غصے سے اس کو اسٹور میں پھینکوا دیا تھا۔“

”اور ایکسپرٹ؟“

”دو ایکسپرٹس کا بندوبست کر لیا ہے جو پینٹنگ کی تصدیق کریں گے اور مسز عصرہ کو بتائیں گے کہ وہ اصلی ہے۔ مسز عصرہ کے اپنے ایکسپرٹ کو عین موقع پر ملک سے بھیجنے کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ مسز عصرہ وہ گیلری اوز ہیں! ایکسپرٹ نہیں۔ وہ دھوکہ کھا جائیں گی۔“

”گڈ!“ اشعر پہلی دفعہ مسکرایا۔ ”نیلامی پہ جب پینٹنگ منگے داموں بک جائے گی تو عین وقت پہ باہر سے آیا ایک مشہور ایکسپرٹ اس کا معائنہ کرے گا اور میڈیا کے سامنے یہ آشکار کرے گا کہ مسز عصرہ فاتح جعلی پینٹنگ چیرائی کے نام پہ بیچ رہی تھیں۔ فاتح بھائی کو ذمہ داری قبول کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ بیچ بیچ۔“

”بہت بدنامی ہو گی سر۔“ مینیجر کے الفاظ میں افسوس تھا۔ پھر وہ ہچکچایا۔ ”مگر سر... آپ مسز عصرہ کے بھائی ہیں۔“

”غلط!“ اس نے سپاٹ لہجے میں بات کاٹی۔ ”میں صرف مالے زیا کی وزارتِ اعظمیٰ کا امیدوار ہوں! یہ تخت کا معاملہ ہے رٹی۔ اور تخت کے لیے بیٹے اپنے باپ کو اور باپ بیٹوں کو مار دیا کرتے ہیں۔ ہم ملے زیا کا تخت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے جو دس پندرہ سال پہلے ملے زیا آیا تھا۔ اس ملک میں ساری عمر ہم نے گزاری ہے۔ اس کو ایشین ٹائیگر بنتے ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے وارث ہم ہی ہیں۔“ اور سختی سے ہاتھ جھلایا، گویا جانے کا اشارہ کیا۔

”جی سر!“ مینیجر نے جلدی سے بات ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆=====☆☆

کوالا لپور پہ چھائے سرمئی بادلوں کو سورج نے دونوں ہاتھوں سے دائیں بائیں دھکیل کر اپنے جھانکنے کا راستہ بنالیا تھا۔ بارش ختم ہو گئی تھی اور سنہری دن نکل آیا تھا۔ ایسے میں شہر کا ایک مشہور و معروف کنونشن سینٹر جس کو پترا ورلڈ ٹریڈ سینٹر کہا جاتا تھا اپنی پوری آب و تاب

سے کھڑا تھا۔ ٹکون عمارت جو سامنے سے شیشوں سے ڈھکی تھی اور اس کے اندر بڑے بڑے ہال بنے تھے جہاں کنونشن اور سیمینارز منعقد ہوتے تھے۔ ایک طرف شاپنگ مال تھا اور اوپر آفس بلڈنگز۔ باریسن نیشنل کا ہیڈ آفس اسی ٹکون عمارت کے اندر واقع تھا اور اس وقت فاتح رامزل آفس فلور کی لابی میں تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ چار پانچ افراد بھی اس کی معیت میں قدم اٹھا رہے تھے۔ ایڈم بالکل خاموش تھا۔ ذہن کے پردے پہ بار بار نوکری سے جھلکتا کارڈ آتا تھا۔

فاتح رامزل اس سے چند قدم آگے تھا۔ سیکرٹری اور باڈی گارڈز کی موجودگی کے باعث وہ اس کے قریب نہیں جا پارہا تھا۔ اور پھر راستے میں اسے دیکھ کے رک رک جاتے لوگ... جن کو وہ مسکرا کے ہاتھ ماتھے پہ لے جا کر سلام کہتا آگے بڑھتا جا رہا تھا....

”سر مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ ایڈم نے پیچھے سے اسے پکارا مگر فاتح نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا البتہ پولیٹیکل سیکرٹری ایڑیوں پہ کھوما اور غصے سے اسے گھورا۔ ”ایڈم تم مجھ سے ملو کچھ دیر تک۔ مجھے لگتا ہے عبداللہ نے تمہیں مینرز سکھائے بغیر بھیج دیا ہے۔“ ایڈم خاموش ہو گیا۔ فاتح آفس میں چلا گیا تو وہ باہر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی پولیٹیکل سیکرٹری کسی کام سے باہر گیا وہ تیزی سے دستک سے کر آفس میں داخل ہوا۔

اندر بلاسٹڈز کھلے تھے۔ روشنی میں کمرہ نہایا ہوا لگتا تھا۔ فاتح نے کوٹ اتار کے اسٹینڈ پہ لٹکا دیا تھا اور خود پاؤں چیر پہ بیٹھا، عینک لگائے چند کاغذات دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پہ بھی متوجہ نہ ہوا۔

”سر!“ ایڈم سنجیدگی سے کہتا سامنے آیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ محتاط سا نکلیوں سے دروازے کو بھی دیکھ لیتا کہ کہیں سیکرٹری واپس نہ آجائے۔ ”کیا میں آپ سے ایک بات کہہ سکتا ہوں؟“

”میں نہیں جانتا لوگ سوال پوچھنے کی اجازت کیوں طلب کرتے ہیں جب کہ انہیں جواب میں صرف ہاں ہی سننا ہوتا ہے اور اجازت کی انہیں پرواہ نہیں ہوتی۔“ وہ اپنی ڈائری کے صفحے پلٹاتے ہوئے مصروف انداز میں بولا تھا۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ وہ ملک کے مصروف ترین لوگوں میں سے تھا۔ ایڈم کا حلق سوکھنے لگا۔

”سر آپ شمس صاحب کے پاس گئے اور ان سے اشعر صاحب کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔“ وہ جلدی جلدی کہنے لگا۔ فاتح اب سیل فون اٹھا کے کوئی چیز ڈائری کے صفحے سے ٹیلی کر رہا تھا۔ ”انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ آپ کے دوست ہیں اور یہ کہ انہیں مسز عصرہ کے ایونٹ کے بارے میں معلوم نہیں ہے، مگر اشعر صاحب نے صبح کہا تھا کہ وہ کارڈز سب سے پہلے آپ کی طرف لائے ہیں، مگر ایک کارڈ شمس صاحب کے گھر بھی پڑا تھا۔ شمس صاحب کا گھر اشعر صاحب کے گھر کے قریب ہے۔ اگر وہ پہلے ان کو کارڈ دے کر آئے ہیں تو یقیناً دونوں کی دوستی گہری اور فار میلیٹیز سے پاک ہے۔“ مگر ایڈم کو لگا وہ سن نہیں رہا۔ اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔

”مجھے لگتا ہے سر، آپ غلط آدمی پہ بھروسہ کر کے اس سے مشورہ لے کر آئے ہیں۔ وہ آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔“

فاتح کے چلتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے نظریں اٹھا کے ایڈم کو دیکھا اور پھر آنکھوں کو پرسوج انداز میں چھونا کیا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

ایڈم کی چلتی زبان کو بریک لگا۔ ”ایڈم بن محمد۔“

”ایڈم! رائٹ۔“ اس نے سر ہلایا اور پھر ایڈم پہ ٹھنڈی نظریں جمائے پیچھے کو ٹیک لگائی اور عینک اتاری۔ ”ایڈم! کسی گاؤں میں ایک آدمی کا قتل ہو گیا تو لوگوں نے شہر سے ایک ماہر سراغ رساں کو بلایا۔ اس نے موقع واردات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مرنے والے کا کسی شادی شدہ عورت سے افیئر تھا۔ عورت کون تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ سراغ رساں سیدھا چرچ گیا اور پادری کے ساتھ اعترافی کمرے میں بیٹھ گیا۔ یونو، ہمارے مسیحی بھائی جب گناہ کرتے ہیں تو پردے کے پیچھے وہ پادری کے سامنے اعتراف کر لیتے ہیں۔ سو اس نے پردے کے پیچھے پادری سے کہا کہ فادر... میں بہت گناہگار ہوں، میرا ایک شادی شدہ عورت سے تعلق ہے۔“

ایڈم سانس روکے سن رہا تھا اور وہ اس پہ نظریں جمائے مدھم مسکراہٹ سے کہے جا رہا تھا۔

”پادری نے فوراً پوچھا، کیا مسز جولیا سے؟ اس نے کہا نہیں۔ پادری بولا، کیا مسز مارٹھا سے؟ اس نے کہا نہیں تو پادری نے کہا۔ پھر یقیناً مسز براہوں گی۔ سراغ رساں وہاں سے نکل آیا۔ باہر کسی نے اس سے پوچھا کہ تم قتل کی تفتیش کی جگہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تو اس نے کہا، جب میں چرچ میں گیا تھا تو خالی ہاتھ تھا، اب جب کہ میں نکلا ہوں تو میرے پاس تین مشتبہ عورتوں کے نام ہیں!“ آخر میں وہ ہلکا سا مسکرایا۔

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ چند لمحے لگے اسے بات سمجھنے میں۔ ”آپ جانتے تھے کہ وہ اشعر صاحب کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اس لئے آپ ان سے ملنے گئے تاکہ... تاکہ یہ جان سکیں کہ اشعر صاحب اصل میں کیا چاہتے ہیں۔ ان کی اینڈ گیم کیا ہے۔“ فاتح نے جواب نہیں دیا مگر اسی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ ”تمہاری تسلی ہو گئی؟“

”میں... میں سمجھا کہ آپ... آپ...“ وہ کہہ نہیں سکا کہ آپ بے وقوف ہیں۔ رعب سارعب تھا جو اس کے وجود پہ طاری ہو رہا تھا۔ نا نگیں ایک دفعہ پھر سے لرزنے لگی تھیں۔

”ایڈم!“ وہ آگے کو جھکا اور ہاتھ باہم پھنسائے گردن اٹھائے اسے مسکرا کے دیکھا۔

”اگر تمہیں کبھی کسی انسان کی قابلیت کو ماننا ہو تو یہاں نہ اس جنگ کو نہ بنانا جو اس نے جیتی یا ہاری ہے بلکہ ہمارے کردار کا تعین تو وہ جنگیں کرتی ہیں جن کو لڑنے کی ہم ہمت کرتے ہیں۔ اگر تم جانتا چاہتے ہو کہ کوئی انسان کس مقام پہ کھڑا ہے تو دیکھو کہ اس کے خواب کیا ہیں۔ وہ کون سے مقاصد اور منزلیں پالینا چاہتا ہے۔ انسان وہ ہوتا ہے جو اس کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے، بھلے وہ اس کو نہ بھی حاصل کر سکے۔ اور اگر ایک آدمی کا خواب اس ملک کے سب سے بڑے عہدے پہ پہنچنا ہے اور اپنے ملک کو ایشیاء کا لیڈر بنانا ہے، اور وہ شخص اس خواب کے لئے آخری حد تک کوشش بھی کر رہا ہے تو وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر بے وقوف نہیں۔“

ایڈم نے شل سے انداز میں سر ہلادیا۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

”سب کہتے ہیں کہ آپ ہر ایک پہ اعتبار کر لیتے ہیں۔“

”غلط نہیں کہتے۔“

”آپ نے مجھ سے نشو کیوں نہیں لیا سر؟ جبکہ آپ جانتے تھے کہ میں اسی کام کے لئے کھڑا تھا۔“

”ایڈم، تمہیں واقعی لگتا ہے کہ فاتح بن رازمل کسی پہ Depend کر سکتا ہے!‘ میرت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پھر سے عینک لگائی اور ڈائری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایڈم خاموشی سے باہر نکل گیا۔

وہ آج پہلی دفعہ فاتح رازمل سے ملا تھا اور اس کا دل ایک عجیب خوشگوار حیرت سے بھر گیا تھا۔ مگر پھر.... دل پہ ایک بوجھ سا آگرا۔ گیارہ دن میں یہ دیوئی ختم ہو جائے گی اور وہ کبھی اس سے یوں نہیں مل سکے گا۔ صرف گیارہ دن تھے اس کے پاس ملک کے سب سے بڑے Visionary (حالم) سے کچھ سیکھنے کے لئے۔

خاطر ہے! ابھی وہ یہ تھوڑا ہی جانتا تھا کہ یہ گیارہ دن کبھی نہ ختم ہونے والے دن بنے جا رہے تھے۔

☆☆=====☆☆

اگلی دوپہر شہر پہ پھیلی تو سارا کے ایل سونے کے پانی میں نہا گیا اور گزشتہ روز کی بارش کی نمی کچھ دیر کے لیے کم ہو گئی۔ ایسے میں اس کالونی کے دونوں اطراف میں اونچے اونچے محل نما گھروں کی دو قطاریں بنی تھیں۔ تمام گھروں کے لان کشادہ تھے اور چار دیواری تین چار فٹ کی چھوٹی سی تھی۔ ان میں ایک فاتح رازمل کی رہائش گاہ بھی تھی جو چمکتے سورج تلے دبک رہی تھی۔

فاصلے پہ ایک درخت کی اوٹ میں ایک کارر کی کھڑی تھی اور اس میں وہ دونوں بیٹھی نظر آرہی تھیں۔ تالیہ نے سیاہ لباس اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی اور نظریں جھکائے گلوں ہاتھوں پہ چڑھا رہی تھی۔ داتن نے اسکا رخ چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور بھداسا کالا چشمہ لگائے ہوئے تھی۔ چہرہ موڑ کے تالیہ کی کارروائی دیکھتی رہی، پھر رہ نہ سکی۔ ”دن دیباڑے چوری زیادہ خطرناک نہیں ہوگی تالیہ؟“

تالیہ نے سیاہ آنکھیں اٹھا کے اسے گھورا۔ ”تم واقعی بوڑھی ہو رہی ہو اس لئے بھول جاتی ہو کہ دنیا بھر میں 70% سے زائد چوریاں دن کے وقت ہوتی ہیں۔ ہم چور سیکورٹی الارم یا کتوں سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا گھر والوں سے ڈرتے ہیں۔ اور دوپہر میں سب عموماً کام پہ ہوتے ہیں.... خیر.... سب تیاری مکمل ہے نا۔“ اس نے دوسرا گلو پہنتے ہوئے کسی لیڈر کی طرح پوچھا۔ داتن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں۔ کل میں نے ان کا گھر case کر لیا تھا۔ دوپہر کے وقت یہاں صرف تین گارڈز ہوتے ہیں اور ایک ملازمہ۔ کچھ عرصہ پہلے مسز عصرہ نے بہت سے ملازم فارغ کیے تھے۔ باقی گارڈز فاتح صاحب یا عصرہ صاحبہ کے ساتھ جاتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ان کا ہوم الارم سسٹم کون سا ہے۔“

”کاش تم ہیکر ہوتیں اور ہم اتنے تر دو کرنے کی بجائے سیکورٹی سسٹم کو صرف ہیک کر لیا کرتے۔“

اب کے داتن نے اسے گھورا تھا۔ ”اول تو یہ کہ ہیکر بننا آسان نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ ایک بچہ بھی کسی کا ہوم الارم بند کر سکتا ہے۔ چند فٹ کے فاصلے سے بھی میں اس عام سے جیمز کا ایک بٹن دباؤں گی اور ان کا الارم جام ہو جائے گا۔“

”اور سیکورٹی کیسے ہے؟“

”وہ وائی فائی پہ ہیں۔ میں دوسرے جیمز سے وائی فائی بھی جام کر دوں گی۔ پھر میں دروازے پہ جا کے فاتح رامزل کی ناراض ووٹرن کے دھرتا دوں گی، چاروں ملازم اکٹھے ہو جائیں گے اور مجھے بھگانے کی کوشش کریں گے۔ تم کونے سے دیوار پھلانگ کے اندر چلی جانا۔“ پھر وہ ان گھروں کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کے بولی۔ ”کیا تمہیں ان امیر لوگوں پہ ترس نہیں آتا تالیہ جو یہ تک نہیں جانتے کہ ان کی سیکورٹی کمپنیز ابھی تک ۹۰ کی دہائی والی الارم ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہیں۔ یہ ان بے چاروں کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہاں برائیک گھر میں چوری کرنی چاہیے تا کہ ان کے الارم کی اصلیت کھول کے ان کے سامنے رکھی جائے۔ یہ ان پہ کتنا بڑا احسان ہو گا۔“ مگر تالیہ نہیں ہنسی۔ اس کا ذہن بٹا ہوا تھا۔ ٹوپی سے بال اچھی طرح ڈھکے اور گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ایک ایک لمحہ پلان کے مطابق استعمال کرنا تھا۔ ”میں تیار ہوں۔ سگنل جام کرو۔“

”کیا نہ صابری کا اس کالونی پہ پہلا احسان، مگر یقیناً یہ آخری نہیں ہوگا۔“ کیا نہ عرف داتن نے بہت فیاضی سے ٹن دبا دیا۔ تالیہ کی نظریں گھر کے گیٹ پہ جمی تھیں جہاں سیکورٹی گارڈ سیاہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس کھڑا فون پہ بات کر رہا تھا۔

”الارم، وائی فائی، سب ہو گئے جام۔ اب تم جا سکتی ہو۔ اور میں بھی۔“ داتن دروازہ کھولنے لگی مگر تالیہ نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔ ”ایک منٹ۔“ اس کی چوکنی نظریں گارڈز پہ جمی تھیں۔

وہ کال کے دوران ایک دم فون کان سے ہٹا کر دیکھنے لگا، پھر جلدی سے اسے کان سے لگایا اور شاید الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کیا۔ پھر اسکرین پہ انگلی پھیرتا اندر کو بھاگا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ غلط ہے، داتن۔“ وہ سانس روکے، بنا پلکیں جھپکے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر غائب ہوا، گھر کا الارم بجنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ گارڈ دوسرے دو گارڈز کے ہمراہ باہر آتا دکھائی دیا۔ سب ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ پستول نکال لیے تھے۔

”نکلو یہاں سے۔ جلدی۔“ اس کا فقرہ مکمل ہی نہیں ہوا تھا کہ داتن نے گاڑی چلائی اور موڑ کاٹ لیا۔ وہ کالونی کے سرے پہ تھیں اس لئے گارڈز کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔

”الارم کیسے بجا۔“ داتن ہکا بکا تھی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا۔

”ان کے الارم سسٹم میں جامر سے بچاؤ کے لئے کوئی جامنگ Algorithm کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی سگنل جام کرنے کی کوشش کرے تو گارڈز کو نیکیسٹ میسج پہ الرٹ آجائے گا اور پھر وہ خود اپنے ہاتھ سے الارم آن کر کے چور کی تلاش میں دوڑتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان امیر لوگوں کو تمہارے احسان کی ضرورت نہیں ہے کیا نہ صابری۔“

”ہا۔“ داتن نے منہ پھلایا۔ وہ شدید خفا نظر آرہی تھی۔ ”ہم نے ان کو انڈراٹیمسٹ کیا۔ اب ہم کیا کریں۔“

”ڈونٹ وری تالیہ کے پاس پلان سی ہے۔“ وہ گلوڑ اتارتے ہوئے آرام سے بولی تھی۔ ڈرائیو کرتی داتن نے گھور کے اسے دیکھا۔ ”مگر ہم ان کا الارم نہیں بند کر سکتے۔ یعنی ہم ان کے گھر تک نہیں جاسکتے جب تک وہ خود ہمیں انوائیٹ نہ کریں۔“

”بالکل۔ اور اب وہ ہمیں خود انوائیٹ کریں گے۔“ اس نے ٹوپی اتاری اور بیگ میں پھینکی۔ سیاہ بال کس کے جوڑے میں بندھے نظر آ رہے تھے اور دھلا دھلا یا نکھرا ہوا چہرہ گہری سوچ میں ڈوبا لگتا تھا۔

”مگر کیسے؟“

”جانتی ہو ایک بہترین Con Game کیسے کھیلی جاتی ہے؟ Con کا لفظ کانفیڈنس سے ہوتا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوتا ہے کہ ہمارے شکار کو کس چیز پر اعتماد ہے۔ اندھا اعتماد۔ مگر کچھ Congames میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا شکار کس چیز سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ اور تمہیں پتہ ہے لاہور اور ملائیشیاء کے لوگ سب سے زیادہ کس سے ڈرتے ہیں؟“

”نپولیس سے؟“

”نہیں، داتن۔ ڈینگلی سے۔“

”رائٹ!“ داتن نے گہری سانس لے کر سر ہلایا تھا۔ "The dengue scam"

☆☆=====☆☆

اگلی صبح جب اس کا لوہی پہ اتری تو ایک لڑکی بائیسائیکل چلاتی سڑک پہ آتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھوں میں باریک دستاں چڑھا رکھے تھے، چہرے پہ سبز رنگ کا ڈسٹ ماسک تھا، اور سر پہ پی کیپ۔ سائیکل کی ٹوکری میں اخباروں کے رول پڑے تھے جن کو وہ ایک ایک کر کے برگر میں اچھاتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ موٹر کاٹ کے غائب ہوئی سڑک پہ پھر سے خاموشی چھا گئی۔

فاتح رامزل کے دروازے سے گارڈ نے اخبار کا رول کھولا تو وہ فلمی میگزین تھا۔ وہ صفحے پلٹاتے ہوئے اندر کی طرف چلا آیا اور رسالہ ملازمہ کی طرف بڑھا دیا جو اس نے لیتے ساتھ ہی ریک میں رکھ دیا کیونکہ ایسے بے کار رسالے گھر میں کوئی نہیں پڑھتا تھا مگر اخبار والے پھینک جایا کرتے تھے۔

ناشتے کے لئے ملازمہ جب تازہ بریڈ لینے باہر نکلی تو وہ نامحسوس انداز میں اپنی کلائی کھجاری تھی۔ وہ صبح اس بیکری پہ تازہ بریڈ لینے آتی تھی۔ مگر آج وہ شدید کوفت میں نظر آ رہی تھی۔ ٹرائی میں روزمرہ کا سامان بھرتے ہوئے وہ کبھی ماتھے پہ خارش کرتی، کبھی گردن کی پشت کو رومال سے رگڑتی۔ سرخ ننھے ننھے دانے سے اس کی جلد پہ پھوٹ رہے تھے۔

”یہ بریڈ پکڑانا۔“ اس نے طبیعت پہ چھائی اکتاہٹ سے سامنے کھڑی موٹی سیاہ عورت کو مخاطب کیا جو آواز پہ پلٹی، اور پھر بریڈ کا پیکٹ اٹھا کے اس کی طرف آئی، مگر اس کی جلد دیکھ کے منہ کھلا رہ گیا۔ پیکٹ ٹرائی میں قریباً پھینکا اور خود بدک کے دو قدم پیچھے ہٹی۔

”مجھ سے دور رہو۔ تمہیں تو ڈینگلی ہو رہا ہے۔“

”ڈینگ؟“ ملازمہ شل رہ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ عورت اب آگے بڑھ گئی تھی، کسی اور نے نہیں سنا تھا۔ وہ سر جھٹکتی ٹرائی دھکیلتی گئی۔ البتہ چہرے پہ پریشانی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

”ان نفلّی Symptoms کو اترنے میں کتنی دیر لگے گی تالیہ؟“ فاتح رامزل کے گھر سے دوگلیاں چھوڑ کے ایک پارک آتا تھا۔ اس کے سرے پہ ایک بچہ تالیہ بیٹھی پیکٹ سے چپس نکال نکال کے کھا رہی تھی، جب ہانپتی کا ہنپتی داتن اس کے ساتھ آ کر بیٹھی۔ ان دونوں نے اوپر دنگ پہن رکھا تھا جس میں سے صرف چہرہ دکھتا تھا اور نیچے ڈھیلا ڈھالا سال لباس تھا۔

”ایک دن، مگر بے فکر ہو۔ آدھی بیماری اللہ دیتا ہے تو باقی آدھی گوگل لگا دیتا ہے۔ جب یہ ڈینگ کو نیٹ پہ سرچ کرے گی تو دو چار مزید علامات بھی ظاہر ہونے لگیں گی جو ہمارے الرجک اسپرے کا حصہ ہی نہیں تھیں۔“

ملازمہ جس وقت ڈاننگ ٹیبل پہ ناشتہ سرو کر رہی تھی اس کا جسم بخار سے ٹوٹ رہا تھا، سر دکھ رہا تھا، اور جلد پہ سرخ دھبے ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ موبائل پہ ڈینگ کو سرچ کر چکی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ مرنے والی ہے۔ خاموشی سے اس نے ناشتہ عصرہ کے سامنے لا رکھا جو گہرے نیلے اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس، گیلری جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ گردن سے چمکی موتیوں کی لڑی اور کلائی میں طلائی بریسلیٹ پہنے، وہ سیل فون دیکھ رہی تھی جب کسی احساس کے تحت چونکی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“

”میم مجھے شاید ڈینگ ہو گیا ہے۔“

”واٹ؟“ عصرہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ”کیسے؟ کب؟ گاؤ تم لوگ اپنے گھروں میں پانی کیوں جمع رکھتے ہو؟“

”میم، میرا قصور نہیں ہے۔ حسن کو بھی ایسے ہی دانے نکل رہے ہیں۔“ وہ منمنائی۔

”گاؤ۔“ عصرہ نے کینٹی کو چھوا۔ ”چیک اپ کرواؤ اپنا۔ اور حسن سے بھی کہو۔ سمج، تم بچوں کا خیال رکھنا۔ اور گھر کی صفائی اپنی نگرانی میں

کرواؤ۔ اور آج خیال آیا تمہیں یہ بتانے کا؟ ریش تو ہفتے بھر کے بعد جا کے ہوتی ہے۔“ اس کا ناشتہ حرام ہو چکا تھا۔

”جی میم، بخار تو تھا کچھ دن سے۔“ اسے سوچ کے ہی تھکاوٹ ہونے لگی۔

پارک میں وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھی تھیں۔ تالیہ مسلسل چپس کھا رہی تھی۔ داتن بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔

”کتنا انتظار کرنا ہے مزید؟“

”چند منٹ مزید۔“ وہ مسکرا کے بولی تھی۔ ”مسز فاتح اب تک پیسٹ کنٹرول فون کر چکی ہوں گی۔“

چند منٹ گزرے اور پیسٹ کنٹرول کی ایک بڑی سی وین قریب سے گزری۔ تالیہ نے گردن موڑ کے دیکھا۔ سیاہ حجاب کے ہالے میں

اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ وین کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے چینی نوجوان نے اسے دیکھ کے صرف سر کو خم دیا اور وین روک

لی۔ ”چلو۔“ وہ تیزی سے اٹھی۔ آگے پیچھے دونوں وین کی طرف بڑھی تھیں۔

وین کی پچھلی طرف سوار ہو کر انہوں نے اپنے مدنگ اتار دیے۔ نیچے دونوں نے پیسٹ کنٹرول کا زرد یونیفارم پہن رکھا تھا۔ تالیہ نے اپنے بیگ سے ٹوپیاں اور ماسک نکال کے داتن کی طرف بڑھائیں۔ پچھلی طرف ایک ہی در کر بیٹھا تھا جو ان سے واقف لگتا تھا اس لیے جلدی جلدی ان کو سلینڈر اور دوسری چیزیں تھمانے لگا۔

”کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے، کیجھ۔“ داتن نے رعب دار آواز میں اسے گھورا تھا۔

”یہ تیسرا اسکام ہیں جو ساشا میں اور آپ کر رہے ہیں۔ پہلے کبھی گڑبڑ ہوئی تھی کیا؟ ہم پیسٹ کنٹرول میں نوکری ہی اس لیے کرتے ہیں تاکہ ڈینگی اسکام کر سکیں۔ اگر ہماری جگہ آپ جعلی در کر لے کر جاتیں تو بعد میں بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اب ہمارا سارا کام لیگل ہے۔“ وہ برامان کے بولا تھا۔

”اور سنو....“ داتن کہنے لگی تو تالیہ نے دبی آواز میں اسے ٹوکا۔

”زیادہ باتیں نہیں کرو اس سے، موٹی!“

”شرم کرو۔ میں تمہاری ماں کی عمر کی ہوں۔“

”غلط۔ تم میری دادی کی عمر کی ہو۔“

چند منٹ بعد فاتح رامزل کے لان میں در کرز اسپرے کرتے نظر آئے تھے۔ عصرہ بادل نحواستہ رک گئی تھی مگر کار میں بیٹھی تھی۔ ملازم گمرانی پہ کھڑے تھے۔ در کرز کا ہیڈ آصف اونچی اونچی ہدایات دے رہا تھا۔ سارے میں گھنی دھند پھیلی تھی۔ داتن لاؤنج میں اسپرے کروا رہی تھی۔ ایسے میں سب کو مصروف پا کر تالیہ دھند میں فاگ گلاسز کی مدد سے دیکھتی آگے چلتی آئی۔ وائی فائی جام کر دیا تھا اور ہوم الارم گارڈز نے خود ہی آف کر دیا تھا۔

”کہا تھا نا، وہ ہمیں خود دعوت دیں گے اب۔“ تالیہ کان میں لگے نغھے سے آ لے میں بولی۔ ایسا ہی ایک آلہ داتن کے کان میں بھی لگا تھا۔ اس نے لاؤنج کے پر لے کونے سے اسے اشارہ کیا۔ کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ تالیہ تیزی سے بیڈروم میں گھس آئی۔

اندر آ کے اس نے گلاسز اتارے اور گردن گھما کے اطراف کا جائزہ لیا۔ سادہ کمرہ۔ سادہ پردے۔ خالی دیواریں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھی ایک ننھی بچی کی تصویر اور ساتھ میں مسکراتا فاتح۔ تالیہ آگے آئی اور ڈریسنگ روم کی الماریاں کھولیں۔ مردانہ کپڑے منگے تھے۔ یہ فاتح رامزل کا کمرہ تھا۔

”یر۔ سلیٹ تو مسز فاتح کلائی میں پہنے رکھتی ہیں مگر ایک اینٹیک تحفہ انہوں نے یقیناً الماری یا لاکر میں رکھا ہوگا۔“

”مگر تالیہ تم تو کہہ رہی تھی کہ فاتح نے تنگو کامل کے بیٹے کے منہ پہ کہہ دیا تھا کہ وہ سکے اصلی نہیں ہے۔“

”ہاں، اصلی نہ سہی قدیم تو ہے نا۔ کوئی اینٹیک ایسے پھینک تو نہیں دیتا اور مسز عصرہ جیسی آرٹ کلکٹر تو بالکل بھی نہیں۔“

اب وہ جلدی جلدی دراز کھول رہی تھی۔ مختلف خانے چیک کیے۔ پھر آخری الماری کھولی تو دیکھا، سامنے کونے میں ننھا سا سیف نصب

تھا۔ سیف کی میت دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

”آج ہمارا چھادن ہے، بدھیا۔“ کان میں لگے آلے میں وہ بولی۔ ”کیونکہ اتنے بڑے لیڈر نے اپنی قیمتی چیزوں کو چھپانے کے لئے صرف ایک فارسیف کا سہارا لیا ہے۔“

”کیا؟ فارسیف؟“ دروازے کے باہر کھڑی داتن نے حیرت سے سرگوشی کی۔ پھر اندر آتے ملازم کو دیکھا تو اس پہ برس پڑی۔

”تم بغیر ماسک کے اندر کیا آرہے ہو؟ کینسر کروانا ہے؟ پھیپھڑے خراب کروانے ہیں؟ جانتے ہو یہ کیمیکل کتنے نقصان دہ ہیں۔ ماسک پہن کر آؤ۔“ ملازم ہڑبڑا کے باہر بھاگا۔

”میرے کان میں مت چیخو۔“ اندر سیف کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتی تالیہ نے برا منہ بنایا پھر اپنا ننھا بیگ زمین پہ رکھا۔

(تجوریاں مختلف طرح کی ہوتی ہیں۔ فارسیف وہ تجوری ہوتی ہے جو اگر گھر کو آگ لگ جائے اور تجوری دو تین گھنٹے جلتی بھی رہے تو اندر کی چیزیں محفوظ رہتی ہیں۔ ایسی تجوریوں میں لوگ قیمتی کاغذات رکھتے ہیں، اور ان کو کھولنا آسان ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی تجوریاں جو زیورات یا رقم کے لئے ہوتی ہیں ان کو برگلری سیف (چوروں کی تجوری) کہا جاتا ہے۔ جلتی یہ بھی نہیں ہیں، مگر چوروں کے لئے ان کو کھولنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔)

”تم مقناطیس لائی ہو؟“ داتن نے دبی سرگوشی میں کہا۔

”تالیہ سارا زادہ راہ ساتھ اٹھاتی ہے میڈم۔“ اس نے مسکرا کے بیگ سے ایک سلور رنگ کا گول ہاکی پٹ ریئر اتھ میگنٹ نکالا (وہ ایسا تھا جیسے دو شامی کبابوں کو اوپر تلے ملا کے رکھا گیا ہو) اور اس کو ایک جراب میں ڈالا۔ (اگر ڈائریکٹ مقناطیس لوہے پہ رکھ دیتی اور اس کی انگلی درمیان میں آجاتی تو وہ وہیں چپکی پڑی ہوتی۔) پھر جراب میں لپٹے مقناطیس کو تجوری کے دروازے کے اوپری بائیں کونے پہ رکھا۔

”یہ سب سے پہلا سیف ہے جس کو کھولنا سیکھا تھا میں نے داتن۔“ وہ مسکرا کے بتانے لگی۔ ”اس کے اندر جو کنڈا دروازے کے لاک کو جوڑے ہوئے ہے... وہ مقناطیس کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ یوں... اور....“ اس نے مقناطیس آہستہ سے دائیں طرف پھیرا تو دروازے کے دوسری طرف کنڈا ہلنے لگا۔ چند سیکنڈ مزید لگے اور کلک کی آواز آئی۔ تالیہ نے تجوری پہ نصب پاسور ڈیپڈ کو زبان نکال کے دکھائی (ہاہا.... جب مقناطیس ہے میرے پاس تو تمہارے پاسور ڈکودبانے کی ضرورت کیا ہے۔) اور مزے سے دروازہ کھولا۔ وہ کھل گیا۔

”فاتح رامنزل کے فرشتوں کو بھی نہیں علم ہوگا کہ کسی نے تجوری کھولی تھی۔“ مسکرا کے اب وہ کاغذات باہر نکالنے لگی۔ پھر اندر ہاتھ مارا۔

مسکراہٹ غائب ہوئی۔ وہاں کچھ رقم، پاسپورٹ، کاغذات وغیرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ تالیہ کا چہرہ اتر گیا۔

تجوری بند کر کے اٹھی اور کھلی الماری کو دیکھا۔ پھر بھنویں سکوڑیں۔ صرف مردانہ کپڑے، ٹائی، کوٹ؟ یہ صرف فاتح کا کمرہ ہے کیا؟ وہ چونکی۔ پھر جلدی سے سب کچھ ٹھیک کر کے باہر آئی۔

لاؤنج میں درکرز اسی طرح کام کر رہے تھے۔ گہری دھند برسو پھیلی تھی۔ داتن کو اشارہ کرتی وہ دوسرے ماسٹر بیڈروم میں چپکے سے داخل

ہوئی (دولازم سامنے ہی تھے مگر ہند کے باعث اس کو نہیں دیکھ سکتے تھے)۔

واہ.... کیا عالیشان کمرہ تھا عصرہ کا۔ اونچے نمٹلیں پردے... قیمتی پینٹنگز اور آرٹ ورک.... ڈریسنگ ٹیبل پہ سچی پرفیوم کی بوتلیں.... ستائشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتی وہ سنگھار میز تک آئی اور دروازہ کھولے۔ پھر وارڈرو ب کھولا۔ کوئی سیف نہیں تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل چیک کی مگر بے سود۔ ٹھہر دوہاں ایک ریوٹ پڑا تھا۔ یہ بلاسٹڈز کے ریوٹ جیسا تھا۔ اے سی کا تو نہیں تھا۔ تالیہ نے ریوٹ ایک پینٹنگ کی طرف بلند کیا اور مٹن دبایا۔ پینٹنگ آہستہ سے دائیں طرف ہٹی اور دیوار میں خانہ نظر آنے لگا۔ اندر یقیناً سیف تھا۔ وہ مسکرائی اور آگے بڑھی، مگر جیسے ہی وہ قریب آئی، مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ دل دھک سے رہ گیا۔

”جلدی کرو تالیہ۔“ داتن اس کے کان میں شور ڈالے ہوئی تھی۔

”داتن!“ اس کو اپنی آواز گہری کھائی سے آتی سنائی دی۔ ”سیف مل گیا ہے مگر... مگر یہ TL30 سیف ہے۔ گروپ ۲ کمینیشن لاک...“ اس نے دروازے پہ لگے پیسے کو چھوا۔ ”اگر اس میں ڈرل سے سوراخ کروں تو دروازے کے اندر شیشے کی تہہ ٹوٹ کر اس کو مزید مشکل طریقے سے لاک کر دے گی۔ مکے ماروں تو اسپرنگ ری لاک ہو جائے گا۔ آری سے کاٹوں تو ایک گھنٹے بعد دروازہ کٹے گا۔“

”فلموں میں تو لوگ ایک منٹ میں کھول لیتے ہیں تالیہ۔“

”شاید دو چار ایسے ایکسپٹ ہوں دنیا میں لیکن اگر میں لاک کو گھما کر اندر pins کی آواز سنتے ہوئے اس کا پاسورڈ کمینیشن معلوم کرنے کی کوشش کروں تو اس میں پچھتر منٹ لگیں گے۔ سوا گھنٹہ۔“

”اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“

”تو پھر....“ تالیہ نے رک کر حسرت بھری نگاہ سے سیف کو دیکھا اور چند قدم پیچھے ہٹی۔ ”پھر بھاگو، داتن۔ میں تم سے گاڑی میں ملتی ہوں۔“

داتن تیزی سے باہر نکلی۔ چہرہ جھکائے ہند میں چلتی وہ گھر سے باہر نکل آئی اور سڑک پار کی۔ پارک تک آئی۔ ان کی کار وہیں کھڑی تھی۔ داتن نے بیٹھے ہی اپنا ماسک اتار اور ادھر ادھر دیکھا۔ تالیہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی۔

”تالیہ۔ کدھر ہو۔“ اسے فکر ہوئی۔ تالیہ کی پھنسی پھنسی سی آواز سنائی دی۔

”داتن.... وہ ملازم آگیا تو میں الماری میں چھپ گئی۔ وہ مجھے الماری میں لاک کر گیا ہے۔“ داتن کے پیروں تلے سے زمین نکلنے لگی۔

”تالیہ.... تالیہ.... یہ کیسے ہوا۔“

”داتن.... مجھے نکالو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اوہ میں کیا کروں۔“

”تم پریشان نہ ہو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ داتن کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

”داتن.... مجھے نکالو.... مجھے سانس نہیں آرہا۔ او خدا یا پلیز مجھے بچالیں.... میرا دم خراب ہو رہا ہے۔“

”تالیہ... میری بچی تم...“ داتن کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ جلدی سے ماسک پہنے لگی پھر رکی۔ ”تمہیں کب سے دمہ ہوا۔“

”دومنٹ پہلے سے!“ وہ اس کے کان کے اتنا قریب جیچنی کہ داتن اچھل پڑی۔

تالیہ ہنستی ہوئی دروازہ کھول کے اندر بیٹھ رہی تھی۔ داتن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اعصاب شل تھے۔ چند لمحے گزرے اور اس کی رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ”تم!“ غصے کے مارے وہ بول نہیں پارہی تھی۔

”ہا ہا ہا...“ اور وہ ہنستی جاری تھی۔ ”میں الماری میں پھنس سکتی ہوں کیا؟ ہا ہا... تم تو رونے والی ہو گئی تھیں۔ اُف تم کتنی کیوٹ ہو داتن پدوکا۔“ اس نے موٹی عورت کے سیاہ پھولے گال کی چٹکی کاٹی۔

داتن نے غصے سے آنکھیں رگڑیں اور بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”تم... تم چھوٹی برنی... تم نے مجھے کتنا ڈرا دیا اندازہ ہے تمہیں؟ کسی دن سچ میں پھنسو گی اور میں نہیں آؤں گی“ کن چیل (کہانیوں والا چھوٹا برن)۔“

”اچھا نا... ڈانٹو تو نہیں۔“ وہ ٹوپی اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ داتن نے ہونہہ کہہ کے کار اشارٹ کی۔ ”اب کیا ہوگا؟ پلان اے کے بعد پلان سی بھی بے کار ہو گیا۔“

”بے فکر ہو۔ پلان ڈی ہے نا۔“ پھر اس نے جیب سے ایک سرخ اور گلابی کارڈ لہرا کے دکھایا۔ ”مجھے دیر اس لئے ہوئی کیونکہ میں مسز عصرہ کی نیلامی میں اپنا زبردستی والا انوٹیشن کارڈ اٹھانے رک گئی تھی۔ یہی ہے ہمارا پلان ڈی۔“

”اور پلان بی کا کیا؟“ داتن کو سخت چڑ ہوئی۔

”تالیہ کے پلانز ہیں تالیہ کی مرضی۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”اور اگر... ملازمہ نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ اس کو ڈینگی نہیں ہوا تو عصرہ کو شک نہیں ہوگا؟“ داتن ابھی تک غصے سے اس کی غلطی نکالنا چاہ رہی تھی۔

”ابھی دنیا میں ملازموں کی وہ قسم پیدا نہیں ہوئی داتن جو مالک کو کہے کہ وہ بیمار نہیں ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ سب سچ سچ بتا کے چھٹی اور مالی امداد لینے کا اتنا اچھا موقع گنوا دے گی؟“ داتن کا غصہ ہوا ہونے لگا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لے کر تالیہ کو دیکھا۔

”اس وقت مجھے بہت بری لگ رہی ہو تم لیکن ایک بات ہے... تم کبھی بھی مایوس نہیں ہوتی ہار نہیں مانتی۔ ایک پلان ٹھپ ہوئے تو دوسرا لے آتی ہو۔ اتنی ہمت کہاں سے لاتی ہو تم تالیہ؟“

”پتلے اور جوان لوگوں میں بڑی ہمت ہوتی ہے بڑھیا۔ مگر تم کیا جانو۔“ وہ افسوس سے بولی تھی اور داتن نے چند منٹ کے لیے اس سے بات نہ کرنے کی قسم اٹھالی تھی۔

☆☆=====☆☆

کے ایل پہ اس دوپہر پھر سے سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے ایک دم سے برسنا شروع ہوئے اور ساری

سڑکیں جل تھل ہوتی گئیں۔ بازاروں میں پھرتے لوگوں نے چھتیاں تان لیں، اور سائبان کی طرف دوڑے۔ ایسے میں آفس کا دروازہ کھول کے ایڈم داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی کا گلاس بند ڈھکن اور اسٹرا سے لیس رکھا تھا۔

آفس میں مدھم بتیاں جل رہی تھیں۔ بلاسٹڈ سختی سے بند تھے۔ فاتح کنٹرول چیئر پہ بیٹھا تھا۔ قدرے تکان زدہ، پیچھے کو ٹیک لگائے، ٹائی ڈھیلی کر کے سفید شرٹ کی آستین پیچھے کو موڑے۔ وہ سنجیدہ لگتا تھا۔ سامنے ایک سفید بالوں والے صاحب بیٹھے تھے۔ یہاں سے ایڈم کو ان کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ کھنکھارتا ہوا میز تک آیا۔ مہمان کا چہرہ واضح ہوا۔ وہ فاتح کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ عبداللطیف۔ ٹی وی پر اس نے ان کو دیکھ رکھا تھا۔ نامور سیاستدان اور کاروباری شخصیت۔ ایک چور نظر ان پہ ڈالے سنجیدگی سے ایڈم نے میز پہ ٹرے رکھی۔ (مہمان کی چائے آئی رکھی تھی۔ یہ فاتح کی کافی تھی جو وہ مال میں ایک خاص شاپ سے لایا تھا۔ وہ اس کے علاوہ کہیں کی کافی نہیں پیتا تھا۔)

”اس کو فکس کرو۔“ وہ کافی رکھ کے مڑنے ہی والا تھا کہ فاتح نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ایڈم نے چونک کے اس طرف دیکھا۔ ایک آفس کینیٹ کا دروازہ گر پڑا تھا۔ دروازے کا جوڑ قبضہ وغیرہ سب اکھڑ گئے تھے۔

”رائٹ سر!“ وہ آگے بڑھا، پھر کا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر فاتح کی طرف گھوما۔ ”میخ اور ہتھوڑا ہو گا ادھر سر؟“ وہ جو ابھن اور اکتاہٹ سے گفتگو شروع کرنے جا رہا تھا، اس سوال پہ ایک نظر اٹھا کے ایڈم کو دیکھا اور پھر واپس مہمان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک سخت نظر ایڈم پہ گھروں پانی ڈال گئی۔ وہ تیزی سے باہر لپکا۔ فاتح کے سیکرٹری سے ہتھوڑا مانگا۔ وہاں نہیں تھا۔ کسی نے بتایا کچن میں دیکھے۔ وہ ادھر بھاگا۔ بہر حال تھوڑی تگ و دو بعد وہ میخیں اور بیچ کس لئے آفس میں دوبارہ داخل ہوا اور باس سے نظر ملائے بغیر ٹوٹی کینیٹ تک آیا اور پنچوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا۔

”ایش نے تمہیں پھنسا دیا ہے فاتح۔ اب تم کیا کرو گے؟“ کنکھیوں سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ عبداللطیف صاحب فکر مندی سے کہہ رہے تھے۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے ایک ہاتھ گال تلے رکھے، کھڑکی کو دیکھتا رہا۔

”ہار مان جاؤ گے؟ صرف پیسوں کے پیچھے؟ ہم پولیٹیکل فنڈ ریزنگ کر سکتے ہیں۔ عوام تمہارے ساتھ ہوں گے۔ باریسن نیشنل کے ڈھائی لاکھ ممبرز کو ہم اپروچ کر سکتے ہیں۔ تم پارٹی چیئر مین منتخب ہو سکتے ہو۔“

”ایک آدمی تھا عرب میں۔“ وہ گہری سانس لے کر عبداللطیف کی طرف چہرہ گھما کے کہنے لگا۔ آواز آہستہ اور تکان زدہ تھی۔ (ایڈم دھیرے دھیرے بیچ کسنے لگا۔ سر جھکائے، سنجیدہ صورت بنائے مگر کان گفتگو پہ لگائے ہوئے۔) ”مالدار عزت دار باوقار۔ اس کا نام عمرو تھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ کعبہ آنے والے حاجیوں کے لئے شور بے میں روٹی توڑ توڑ کے رکھ چھوڑتا جس کو سب کھاتے اور اسے دعائیں دیتے تھے۔ اس سے لوگوں نے اس کا نام ہاشم رکھ دیا۔ روٹی توڑنے والا۔ جو لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور اخلاق کے اچھے ہوتے ہیں انہیں ایک دنیا اچھے ناموں سے یاد رکھتی ہے.....“

ایڈم بیچ قبضے پہ جمائے آہستہ سے اسے اوزار سے کس رہا تھا۔ دھیان وہیں تھا۔

”ہاشم ایک دفعہ ملک شام گیا تو راستے میں مدینہ میں اس نے ایک خاتون سے شادی کر لی۔ کچھ دن وہاں ٹھہرا اور پھر شام چلا گیا۔ اس سفر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ پیچھے سے بیوی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا مگر ہاشم کے خاندان والے اس شادی سے واقف نہیں تھے تو بچہ ماں کے پاس پلتا رہا۔ اس کے بال بالکل سفید سے تھے بلوند سنہرے جیسے۔ اس لئے اس کا نام شبیبہ (سفید بالوں والا) رکھا گیا۔ شبیبہ دس بارہ سال کا ہوا تو ہاشم کے بھائی مطلب کو اس کا علم ہوا۔ مطلب کے لئے یہ ایک جذباتی دھچکا تھا۔ وہ فوراً مدینہ گیا اور بھیجے کو اس کی ماں سے اصرار کے ساتھ اپنے ساتھ لے آیا۔

”عرب میں لوگ سفر سے واپسی پہ نوجوان غلام خرید کے ساتھ لایا کرتے تھے۔ مطلب جس وقت شبیبہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ وہ نیا غلام خرید کر لایا ہے تو وہ اس لڑکے کو ”عبدالمطلب“ پکارنے لگے۔ یعنی مطلب کا غلام۔ مطلب نے کلیئر کر دیا کہ یہ میرا بھیجتا ہے مگر شبیبہ کا نام اس دن سے عبدالمطلب پڑ گیا اور آج تک ہم ان کو اسی نام سے جانتے ہیں۔ مگر میں تمہیں یہ قصہ کیوں سنارہا ہوں؟ ٹھہرو....“ عبد الطیف صاحب نے پہلو بدلا تو فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں ٹھہرنے کو کہا اور اسی سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ایڈم کے کان بھی وہیں لگے تھے۔

”عبدالمطلب مکہ کے اعلیٰ اور معزز خاندان میں سے تھے۔ اگر تم ان لوگوں کی تاریخ پر دھتو تو دیکھو گے کہ یہ بہت اونچے اخلاق کے عظیم لوگ تھے۔ باوقار، بہادر اور جری۔ یہ ہماری طرح چھوٹے چھوٹے مفادات کے پیچھے بڑے بڑے سمجھوتے نہیں کرتے تھے۔ یہ دولت اور قیمتی چیزوں کے انبار اپنے گرد لگا کے خود کو ان کا غلام نہیں بناتے تھے۔ عبد الطیف یہ آزاد لوگ تھے۔ یہ اپنے جذبات اپنی آستین پہ پیہن کے رکھتے تھے۔ عبدالمطلب کی مکہ میں بہت عزت اور ناموری تھی۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ خوبصورت، نڈر اور دل کے سچے۔ ان کو ایک رات خواب میں کسی کی آواز آئی کہ زم زم کا کنواں کھودو۔ وہ اٹھے تو دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلے تھے۔“ وہ سانس لینے کو ٹھہرا۔ ایڈم کے ہاتھ رک چکے تھے۔ وہ بالکل دم سادھے سن رہا تھا۔ گردن کے پیچھے کے بال کھڑے ہو چکے تھے۔

”زم زم کا کنواں کئی صدیاں پہلے بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت دفن کر دیا تھا اور ساتھ انہوں نے کعبہ کے سونے کے دو برن، قدیم تلواریں، زریں وغیرہ بھی اس میں دفن کی تھیں۔ یہ سب نیشنل ٹریژر تھا۔ مگر عبدالمطلب کو سمجھ نہیں آ سکا کہ وہ اس کو کیسے کھودیں۔ اگلی رات انہوں نے پھر خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے زم زم کا کنواں کھودو۔ تم اسے کھود کے نہیں پچھتاؤ گے۔ یہ تمہارے آباؤ اجداد کی طرف سے تمہارا تحفہ ہے۔ یہ نہ کبھی سو کھے گانہ اس کا پانی کم ہوگا۔ یہ حاجیوں کی پیاس بجھانے کو کافی ہوگا۔ عبدالمطلب نے پوچھا کہ یہ کہاں ہے تو جواب ملا، ٹیلے کے پاس جہاں کو اچونچ سے زمین پہ دستک دے رہا ہے۔ اگلی صبح وہ اپنے اکلوتے بیٹے حارث کے ساتھ کعبہ کی طرف گئے۔ قرینی ٹیلے پہ ایک کواڑٹا ہوا آیا اور زمین پہ چونچ رگڑنے لگا۔ دونوں باپ بیٹے نے کدالیں تھامیں اور اس جگہ کو کھودنے لگے۔ یوں صدیوں سے دفن کنواں دریافت ہو گیا۔ خزانہ بھی مل گیا، مگر دوسرے لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے

مگر عبدالمطلب کا کہنا تھا کہ یہ ہمارا ہے! سے ہم نے ڈھونڈا ہے۔ وہ لوگ لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ عبدالمطلب وہاں اکیلے تھے اور ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس وقت ان کو اپنا آپ بہت کمزور لگا اور گو کہ بعد میں ان کو سارا خزانہ اور کنوئیں میں سے حصہ مل ہی گیا لیکن اس موقع پہ انہوں نے دعا مانگی تھی کہ اگر اللہ مجھے دس بیٹے دے تو میں ایک کو کعبہ کے پاس قربان کر دوں گا۔ ان کے مرتبے کا سردار ایک بہادر آدمی ایک جرات مند لیڈر وہ صرف ایک چیز کے بل بوتے پہ ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اپنے خاندان کی طاقت۔ اور کچھ نہیں۔ ہم تب تک کسی جنگ میں نہیں جاسکتے عبدالطیف جب تک ہمارا خاندان ہمارے ساتھ نہ کھڑا ہو۔ اگر ہم ان کو کنوئیں نہ کر سکیں کہ ہم جیت سکتے ہیں... اگر وہ ساتھ چھوڑ دیں تو چیزیں زیادہ مشکل ہو جاتی ہیں۔“ اس کی آواز میں تکلیف سمٹ آئی تھی۔ ایڈم بالکل شل سا بیٹھا تھا۔ اس نے ہاس کو اتنے دکھ سے بات کرتے پہلی دفعہ سنا تھا۔ ”میں اس انتخاب میں تب تک نہیں جاسکتا جب تک عصرہ اور بچے میرے ساتھ نہ ہوں۔ میں پیسے کی کمی سے نہیں ڈرتا۔ لیکن اتنے سال میں نے ملے زیا کے لئے جدوجہد کی، دکھا ٹھائے، قربانیاں دیں“ (اس نے ایک نظر اس نوٹو فریم پہ ڈالی جو میز پہ رکھا تھا۔ ننھی سی مسکراتی بچی۔ فاتح کی آنکھوں میں تکلیف ابھری۔) ”ہر بات کے اختتام پہ میں یہی سوچتا تھا کہ کبھی تو اللہ مجھے بر چیز کے لئے Compensate کرے گا۔ لیکن اب ایش چاہتا ہے کہ میں اپنے خواب سے دستبردار ہو جاؤں۔ تو کیا وہ اتنے سال بے مصرف گئے؟ ان ساری قربانیوں کو میں ضائع کر دوں؟ خواب تو بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے ساتھ بڑا کرتے ہیں، لیکن میرے خواب شاید بوڑھے ہو گئے ہیں۔“

ایڈم نے آخری پیچ کسا اور سامان اٹھا کے اٹھ گیا۔ دروازے کھولتے ہوئے اس نے سنا کہ عبدالطیف کہہ رہے تھے۔ ”عصرہ کو کنوئیں کیا جاسکتا ہے۔ میں اگر....“ اس نے باہر آ کر دروازہ بند کیا تو آوازوں کا رستہ رک گیا۔ وہ وہیں سیکرٹری کے کیمین کے آگے منتظر افراد کے پیچھے صوفے پہ بیٹھا اور موبائل نکال کے اپنی ماں کو کال ملائی۔ جیسے ہی اس نے فون اٹھایا ایڈم گہری سانس لے کر نظریں جھکائے کہنے لگا۔ ”تم صحیح کہتی تھی ماں۔ مجھے فاتح رازمل کی دل سے خدمت کرنی ہے۔ وفاداری، سچائی اور امانت کا آج کل کوئی مول نہیں ہوتا۔ اور پتہ ہے کیا.... اب میں بھی زندگی میں کچھ بنا چاہتا ہوں۔ بڑا آدمی۔ اونچے خواب، اونچے مقصد رکھنے والا.... مجھے اپنے آپ کو کسی بامقصد کام کے لئے استعمال کرنا ہے اور....“ وہ جو آنکھوں میں نئے نئے خواب سجائے کہہ رہا تھا ایک دم اس کے جوتے پہ کسی نے بوٹ رکھا تو وہ بلبللا کے کھڑا ہوا اور موبائل نیچے کیا۔ سامنے سیکرٹری کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

”کیا ہوا سر؟“ وہ بوکھلایا۔

”تمہیں اب تک برداشت کر رہا ہوں میں لیکن یہ جوتم اور اسمارٹ بن کے فاتح صاحب کے آگے پیچھے پھرنے کی کوشش کر رہے ہو... عبد اللہ کی نوکری ہتھینا چاہتے ہو تم کیا؟ ہاں؟“

”نن نہیں سر... آپ کو غلط فہمی....“ وہ ہکلا یا مگر سیکرٹری نے غصیلی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بوٹ سے اس کا انگوٹھا مزید زور سے دبایا۔ ”اس آفس میں بہت سے آئے اور بہت سے گئے۔ جو آتا ہے ”طاقت“ کا خواب لے کر آتا ہے اور میں اسے مکھی کی طرح نکال پھینکتا

ہوں۔ اس لئے لمبے لمبے خواب مت دیکھو۔ اپنے گئے چنے دن پورے کرو اور سر سے زیادہ فرینک نہ۔ ورنہ ابھی عبداللہ کو کال کر کے بتا دوں گا کہ تم اس کی نوکری ہتھیانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ تمہاری جان لے لے گا۔ سمجھ میں آیا؟“

”جی سر!“ ایڈم نے نگاہیں جھکا دیں۔

”اب مجھ سے معافی مانگو!“ نوجوان سیکرٹری اسے اسی طرح گھورتے ہوئے چبا چبا کے بولا تو ایڈم نے گلابی پڑتی آنکھیں اٹھائیں۔ ”سوری سر! اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”ہوں!“ وہ ہنکارا بھر کے مڑا اور بوٹ اس کے پیر سے ہٹا دیا۔ ایڈم نے فون اوپر کر کے دیکھا۔ کال ابھی تک ملی ہوئی تھی اور ماں یقیناً خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا تو وہ خود سے ہی کہنے لگی۔

”لوگوں کی تنقید نہ ہو تو کوئی آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ تم دیکھنا اللہ تمہیں دو برا بخت لگائے گا ایڈم۔ تم ایک دن دنیا پہ حکومت کرو گے۔ یہ تمہاری ماں کی دعا ہے۔“ اس نے جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا وہ صرف اس کا دل رکھنے کے لئے کہہ رہی ہے ورنہ آج کل کے دور میں سونے کے برن اور زم زم کے کنویں کسے ملتے تھے؟

☆☆=====☆☆

اس نے دیکھا.....

کہ وہ کیچڑ آلود زمین تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے.... چار پانچ درختوں میں گھرے ہوئے.... بارش تڑا تڑا برس رہی تھی.... وہ درخت سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا تھا اور اسے پتلیاں سکڑ کے چبھتی نظروں سے دیکھ رہا تھا.... وہ سامنے کیچڑ پہ بیٹھی تھی.... اس کے منہ پہ مٹی لگی تھی.... الجھے سنہرے بال گرد آلود تھے.... چہرے پہ زخم کے نشان تھے.... کپڑے پھٹے پرانے تھے.... وہ بھی فاتح کو ان ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی.... اور بازوؤں میں کچھ پکڑے بیٹھی تھی....

ایک ننھا برن تھا وہ..... وہ اس کو اپنے بازوؤں میں زبردستی جکڑے ہوئے تھی۔ برن کسمار ہاتھا، پھڑ پھڑا ہاتھا، مگر تالیہ نے اپنا کیچڑ آلود پاؤں اس جانور کی گردن پہ رکھا ہوا تھا۔

”آپ نے مجھ سے پوچھا تھا.... یاد ہے....“ وہ نظریں اس پہ جمائے کیچڑ پہ رکھا چاقو اٹھاتے ہوئے غرائی تھی۔ ”کہنا تمہارے ٹیلنٹ کیا ہیں؟ تمہاری زندگی میں کامیابیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا آتا ہے؟“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کے ادا کر رہی تھی۔ چاقو اب برن کی گردن سے لگایا تھا، نظریں فاتح کے چہرے پہ مرکوز تھیں۔

”مجھے.... یہ آتا ہے۔“ اور ساتھ ہی چاقو تیزی سے برن کی گردن میں گھونپ دیا۔ معصوم جانور چلایا.... بڑپا.... خون کے تازہ چھینٹے فاتح کے چہرے اور شرٹ پہ آگرے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر جھٹکا۔ بولا کچھ نہیں.....

برن تڑپ رہا تھا.... خون بہہ رہا تھا.... اس کے کپڑے.... زمین.... سرخ خون سے رنگین ہوتی جا رہی تھی....

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔

بیڈروم تاریک تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ اسے سی چل رہا تھا اور آرام دہ ٹھنڈے ماحول میں سکون ہی سکون تھا۔ مگر اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ بال تک گیلے ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے بستر سے اتری اور لیمپ جلایا۔ زرد روشنی تاریکی میں گھل کے کمرے کو نیم روشن کر گئی۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ دیکھے۔ اپنے کپڑے جھاڑے۔ کوئی خون، کوئی جانور.... کچھ بھی تو نہ تھا۔ تالیہ نے سر ہاتھوں میں گرا لیا اور بیڈکنارے بیٹھتی چلی گئی۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا۔ ایسے بھیا تک، خوفزدہ کرنے والے خواب وہ پہلے نہیں دیکھا کرتی تھی۔ اسے ان سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ پھر اب کیا ہو رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

آرٹ گیلری اس شام اپنی مرمریں راہدار یوں کے ساتھ چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ دور دور تک دیواروں پہ آویزاں پینٹنگز... شیشے کے چوکنوں میں نمائش کے لئے لگائے گئے نوار دات.... بڑے ہال نما کمرے کی چھت دو منزلیں اوپر تھی۔ کسی شاپنگ مال کی طرح فرش پہ کھڑے ہو کر گردن اٹھاؤ تو اوپری دونوں منزلوں کی چوکور بالکونیاں اور ان میں ٹہلتے لوگ صاف دکھائی دیتے تھے۔ سیاح اور آرٹ کے قدردان رک رک کر نمائشی شہ پارے دیکھ رہے تھے۔

ایسے میں اوپری منزل پہ کارز آفیس کے اندر خوشگوار ماحول میں میننگ جاری تھی۔ کنٹرول چیمبر پہ عصرہ محمود بیٹھی تھی۔ ماتھے پہ کٹے بال سامنے کیے، اور باقی کو فرانسیزی جوڑے میں گوندھے اس نے اسکرٹ کے اوپر گرے منی کوٹ پہن رکھا تھا۔ بڑی بھوری آنکھوں میں مسکراہٹ لئے، وہ ہاتھ باہم ملائے، آگے کو ہو کر بیٹھی کہہ رہی تھی۔

”میں آپ کی اس عنایت کی جتنی قدر کروں کم ہے۔ ہم اس پینٹنگ کو نیلامی میں رکھیں گے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کا چوتھا حصہ خیراتی اداروں کو بھیجا جائے گا۔ اللہ آپ سے قبول کرے۔“

سامنے جتنی صورت سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا آدمی بیٹھا تھا جس کی فرنیچ داڑھی تھی اور اس کے آگے پیچھے تین چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک اشعر بھی تھا۔ وہ بس مسکرا کے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ عصرہ کی سیکرٹری عصرہ کے پیچھے مستعد سی کھڑی تھی اور میز پہ ایک بڑا سالکڑی کا ڈبہ رکھا تھا جس کے اندر فریم میں یقیناً ایک پینٹنگ تھی۔

”نوازش، میم!“ وہ سر کو خم دے کر مسکرا کے بولا تھا۔ ”یہ پینٹنگ ہمارے خاندان میں پچھلے ستر سال سے موجود ہے۔ تمام لیگل ڈاؤمنٹس میں نے آپ کو دے دیے ہیں۔ Spoilum (چینی پینٹر) عموماً چینی اور مغربی تاجروں کے پورٹریٹ بناتا تھا مگر اس کا یہ کام ”زخمی برن“ اس کے دوسرے تمام کام سے مختلف ہے۔“ پیچھے کھڑے گارڈ نے جھک کر ڈبے کا ڈھکن ہٹایا تو عصرہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمام بیٹھے ہوئے افراد بھی اٹھ گئے۔

پینٹنگ ایک درخت کی تھی جس کے تنے کے ساتھ ایک برن گرا پڑا تھا۔ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں آسمان پہ

جی تھیں۔ ان آنکھوں کی یاسیت... ان کا کرب... عصرہ نے ستائش سے گہری سانس لی اور ہولے سے پینٹنگ کے شیشے کو چھوا۔ ”سپائلم کی سب سے مزید اربا بات یہ تھی کہ وہ ریورس گلاس پینٹنگ کرنا جانتا تھا۔ اس زمانے میں... اٹھارویں صدی میں صرف مغربی پینٹرز اس میں مہارت رکھتے تھے۔ شیشے پہ الٹی تصویر بنانا اور پھر اس کو سیدھا کرنا... سبحان اللہ۔“ وہ تحسین سے کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کے مہمانوں کو دیکھا۔

”میں فاتح کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ وہ یقیناً ٹریفک میں پھنس گیا ہوگا ورنہ وہ پہنچ جاتا۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔“ پھر وہ ذرا ٹھہری۔ ”اگر آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو.....۔“

”میری شدید خواہش تھی مگر کچھ کام ایسے آن پڑے ہیں کہ مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ مگر آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ تحفہ کسی مطلب کے لئے ہے۔“ وہ خفیف سا ہو کے بولا تو وہ مسکرا دی۔

”بالکل بھی نہیں۔“ (اشعر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔)

چند منٹ بعد جب تمام مہمان جا چکے تو عصرہ واپس کرسی پہ بیٹھی اور بے نیازی سے سیکرٹری کو اشارہ کیا۔ ”ایکسپریس کو بلاؤ۔ وہ آئیں تو میں اس کام سے فارغ ہو جاؤں۔ جینوئن ہے تو ہم اس کو رکھیں ورنہ پھینک دیں۔“

”احسان صاحب اور رزاق صاحب باہر انتظار کر رہے ہیں۔“

”اور عبدالحلیم صاحب؟ ان کو نہیں بلا یا؟“

”نہیں عبدالحلیم صاحب اور ملک سے باہر ہیں۔ صرف یہی دستیاب تھے۔“

”ٹھیک ہے ان کو بلاؤ۔“ اس نے نخوت سے ہاتھ کا اشارہ کیا اور فون کو دیکھنے لگی۔ سیکرٹری جھٹ سے باہر نکل گئی۔

”فاتح کبھی میرا مان نہیں رکھ سکتا۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے اشعر سے بولی تو وہ نرمی سے اسے تسلی دینے لگا۔

”کا کا..... اچھا ہوا کہ آنگ نہیں آیا ورنہ شاید ان کی شان میں صاف گوئی سے کچھ ایسا کہہ دیتا کہ الٹا ہمیں ان کو دو چار ہینکس دے کر بات ختم کرنی پڑتی۔“ اس کے انداز پہ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

☆☆=====☆☆

چند میل دور... حالم کے بنگلے پہ وہ صبح تازہ پھولوں کی خوشبو میں رچی بسی جلوہ گر ہوئی تھی۔ اور لاؤنج میں داتن نے مہکتے گلاب لا کر رکھے تھے جنہوں نے سارے گھر کو مہکا دیا تھا۔ اور خود وہ اپن کچن میں کھڑی کھانا بنا رہی تھی۔

تالیہ لاؤنج کے بڑے صوفے پہ بیٹھی بال باندھے پیر اوپر کیے ریوٹ سے چینل بدلے جا رہی تھی۔

”تم ڈسٹرب ہو۔“

”ہوں۔“ اس نے اداسی سے ہنکارا بھرا۔ یاسیت بھری نظریں اسکرین پہ جمی تھیں۔ چہرہ زرد لگتا تھا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا.... وہ

میرے سامنے بیٹھا ہے اور میں نے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہرن کو ذبح کر ڈالا۔“

داتن کے ہاتھ سے ڈوئی چھوٹ گئی۔ ہڑبڑاکے وہ پلٹی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ہرن کو؟ ذبح؟“ پھر اس نے جھرجھری لی۔ ”شروع شروع میں جب میں مرغیاں پالتی تھی تو تم ایک آدھ کو ذبح کر لیتی تھیں مگر ہرن!“

”مجھے یہ سب چیزیں آتی ہیں داتن۔ خنجر کا استعمال، گن کا استعمال۔ ہاتھوں کا استعمال۔۔۔ مگر میں اس طرح کسی معصوم جانور کو نہیں مار

سکتی۔“ اس نے سر جھٹکا۔ پھر چونکی۔ ”اور وہ مجھے تا شہ کہہ رہا تھا۔“

”ساشا؟“ داتن کو لگا اسے سننے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ”وہ ساشا کے نام سے ایک آئی ڈی ہے نا تمہارے پاس۔“

”نہیں داتن۔ اس نے مجھے تا شہ کہا۔ بلکہ میں نے خود اسے بتایا کہ اس نے مجھے یہ کہہ کر کچھ پوچھا تھا۔۔۔ خیر۔۔۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”میں

نے اسے ہرن ذبح کر کے بتایا کہ یہ میرا ٹیلنٹ ہے۔ مگر یہ کیا بات ہوئی؟ خواب تو علامتی ہوتے ہیں نا تو پھر یہ سب کیا تھا؟“ وہ الجھی ہوئی تھی۔

”تمہارا ٹیلنٹ کیا ہے؟“ اس سوال پہ اس کا چہرہ زخمی سا ہو گیا۔

”لوگوں کو دھوکہ دے کر پیسے بنو رنا اور چوریاں کرنا۔“ وہ تلخ ہوئی۔

”مگر اس کے علاوہ تم ایک اچھی آرٹسٹ بھی ہو، آرٹ کی پہچان ہے تمہیں اگر تم کسی یونیورسٹی میں یا کسی آرٹ میوزیم میں بطور ایکسپرٹ

کام کر دو تو بہت پیسے بنا سکتی ہو۔ یونو، اصلی اور نقلی آرٹ کی تصدیق بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔“

”جانے دو۔ اس کا میرے خواب سے کیا تعلق؟ خیر۔ آج ہم پلان ڈی کی طرف آئیں گے۔“ اس نے ریوٹ سے ٹی وی بند کیا اور

تمام الجھنوں کو گویا جھٹک کے مکمل طور پہ داتن کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مسز یاسمین اور مسز فوزیہ کس وقت گیلری جائیں گی؟“

”میں نے تمہارے نمبر سے ان دونوں کو مسیج کر کے آج شام کا کہا تھا۔ مگر تالیہ۔۔۔“ داتن پین ڈھک کے سامنے آئی اور فکر مندی سے

اسے دیکھا۔ ”تم ان کے ساتھ گیلری جاؤ گی تو وہ وہاں کسی کو بھی بتا دیں گی کہ تم تالیہ مراد ہو۔“

”ہاں تو وہ کس تالیہ مراد کو جانتی ہیں؟ امیر کبیر سوشلائٹ اور آرٹ کی قدردان تالیہ کو جانتی ہیں نا وہ۔ ان کو یہ تو نہیں معلوم کہ میرا اصل

ذریعہ آمدنی کیا ہے۔ اور میں نے جن علاقوں میں ویٹرس یا نوکرائی بن کے کام کیا ہے وہ یہاں سے کافی دور ہیں اور وہ اپرڈل کلاس ہے۔

تالیہ مراد ہائی ایلٹیٹ میں موو کرنے والی لڑی ہے جس کے بال سنہری ہیں اور جو صرف ڈیزائینرز ڈائمنڈز پہنتی ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ مسز عصرہ سے بریسلٹ چرانے کے لیے تم نے اگر grifter ہی بنا ہے تو کوئی اور روپ دھار لو۔“

(Theif) وہ چور ہوتا ہے جو خاموشی سے مال چرا کے لئے جاتا ہے اور گرفتہ وہ ٹھگ ہوتا ہے جو کوئی کردار اپنا کے، بھیس بدل کے کسی کے

پاس جاتا ہے اور اپنی چرب زبانی سے ان سے مطلوبہ مال لوٹتا ہے جیسے بزنس انویسٹمنٹ کا جھانسنہ دینا وغیرہ)

”میں کبھی گرننگ نہیں کرتی داتن۔ وہ تم کرتی ہو۔ میرا چہرہ کے ایل کے اس علاقے میں ایک امیر سوشلائٹ کے طور پر مشہور ہے جو اپنے باپ کی دولت خرچ کر رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کل کو جب میں یہ کام چھوڑوں تو کوئی مجھے پہچان لے۔ ابھی تک تالیہ نے کسی کے ساتھ grifting نہیں کی۔“ وہ بے فکر تھی۔ جیسے برستی بارش میں کوئی کھلے آسمان تلے خوش باش مراقبے میں بیٹھا ہو۔

”مگر تم نے نوکرانی کا رول ادا کرنے کے لئے یہ نام استعمال کیا تھا تالیہ۔“

”مجھے اچھا لگ رہا تھا اپنے نام کے ساتھ وہ اچھے القابات سننا، مگر اس میں میرا حلیہ بالکل مختلف تھا۔ اور اب بھی میں ساشا یا کچھ اور بن کے نہیں جاؤں گی۔ میں تالیہ مرادی بن کے جاؤں گی۔“ وہ مطمئن بیٹھی تھی۔ مگر داتن نے اسی بے چینی سے اسے دیکھا۔

”تم نے مسز عصرہ کو جوں سر دیکھا تھا اگر اس نے پہچان لیا؟“

”اوہ داتن.... ہم روز ریسٹورانٹ میں درجنوں ویٹرز کو دیکھتے ہیں۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے ایک ہی یونیفارم میں ملبوس ایک عمر کی تین چار لڑکیوں کو دیکھ کر کوئی بعد میں نہیں پہچان سکتا۔ عصرہ دن میں دس جگہوں پہ جاتی ہیں اور انہوں نے مجھے دیکھا ضرور تھا، نظر نہیں ملائی تھی۔ کسی کو بھی میں یاد نہیں ہوں گی لائٹس بھی ڈم تھیں۔ رہے ان کے ملازم تو وہ کوئی اتنے ذہین فطین عقابی نظروں کے مالک نہیں تھے کہ مجھے پہچان لیں۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بات کرتی تھی۔ جیسے ہواؤں میں ان دیکھے تال چھیڑ رہی ہو۔ جیسے کوئی جادوگر سارے جادو بکھیر کے ہر چیز طے کیے بیٹھا ہو۔

”تو اب تم باقاعدہ عصرہ سے ملنے جا رہی ہو! مگر تم کیا کہو گی؟“

تالیہ کے چہرے پہ آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ پیر نیچے اتارتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں نے کچھ نہیں کہنا۔ جو کہنا ہے میرے ڈائمنڈز نے کہنا ہے۔ تم کھانا بناؤ، میں بال ڈائی کر کے واپس تالیہ مرادی بن جاؤں۔“ اور پیروں میں چپل گھسیڑتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے دیکھی میں تلنے کی خوشبو آنے لگی تو داتن ہڑبڑا کے اس طرف لپکی۔

☆☆=====☆☆

ایکسپریٹس پینٹنگ کی تصدیق کر کے جا چکے تھے اور اب عصرہ اور اشعر آفس کے باہر بالکونی میں کھڑے تھے۔ یہ گول بالکونی تھی۔ درمیان میں خلا تھا جہاں سے نیچے کامر میں ہال اور اس میں ٹہلتے لوگ صاف دکھائی دیتے تھے۔ رنگ برنگی لڑکیاں لڑکے۔ بے فکر لوگ۔ ”شکریہ ایش... تم نے آج میرے لیے اتنا وقت نکالا۔“ وہ اس کی ممنون ہوئی تو ایش نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلایا۔ ”میں تمہارا بھائی ہوں، کا کا۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔“

”شادی کر لو ایش!“ وہ اس کے انداز پہ محبت سے بولی تو وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

”جتنا تم مجبور کر رہی ہو، میں واقعی اس بارے میں سوچنے لگا ہوں۔“ وہ دونوں بالکونی کی ریلنگ کے ساتھ آگے سامنے کھڑے تھے۔

”تمہاری بات نے میرا مان بڑھا دیا ہے۔“ عصرہ کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ ”کوئی ڈھونڈ رکھی ہے تو مجھے ملو ادا اس سے۔ میں امریکہ

جانے سے قبل تمہاری یہ خوشی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”نہیں کا کا۔“ اس نے تاسف سے سر جھٹکا اور نیچے ہال میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ ”میرے حلقہ احباب میں نامکمل لڑکیاں ہیں۔ جو حسین ہے، اس میں وقار نہیں ہے۔ جس میں وقار ہے، اس کا خاندان اعلیٰ نہیں ہے۔ جس میں یہ سب کچھ ہے، وہ ذہین نہیں ہے۔ اگر اشعر محمود کسی لڑکی کو ملک کی فرسٹ لیڈی بنائے گا تو اس کو پرفیکٹ ہونا چاہیے۔“

”اچھا۔ مثلاً اس کو کس طرح پرفیکٹ ہونا چاہیے؟“ عصرہ محبت اور دلچسپی سے اس کو دیکھ کے چھیڑنے لگی۔

”اس کو....“ وہ عام سے انداز میں بات کا آغاز کرنے لگا، مگر پھر ٹھہر گیا۔ نظر نیچے ہال کے دروازے سے اندر آتی تین لڑکیوں پہ پڑی۔ ان میں سے دو امراء کے کسی خاندان کی تک سک سے تیار معمولی شکل کی لگتی تھیں اور تیسری.... وہ لمحے بھر کو بالکل مبہوت ہو گیا۔ ”اس کو....“ اس نے نظریں اس پہ لگائے الفاظ جوڑنے چاہے۔ ”اس کو منفرد ہونا چاہیے۔“

وہ پیر تک آتی سفید اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی۔ جل پری کا سالباں۔ بالکل سفید۔ کندھوں پہ چھوٹا سا سرخ منی کوٹ پہن رکھا تھا۔

”اور وہ بے حد حسین ہو....“

اس کے سیدھے سنہری بال تھوڑی سے نیچے تک آتے تھے۔ گوری سرخ رنگت، سیاہ آنکھیں، وہ ساتھ والی خاتون کی بات پہ مسکرا رہی تھی اور گال میں ڈپل پڑ رہا تھا۔

”اور کافی دولت مند بھی ہو۔“

لڑکی نے کانوں میں موٹے موٹے نازک سے سرخ یا قوت جزے ایئرنگز پہن رکھے تھے اور یہاں سے بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی انگلی میں موٹے سے Solitaire ہیرے والی انگلی تھی۔ کہنی پہ سفید ہینڈ بیگ لگا تھا۔

”اور اس کے ہر انداز سے اس کے اعلیٰ خاندان کا پتہ چلتا ہو۔ ریگل۔ ریگل سی لڑکی ہو وہ....“ اس کے ساتھ والی خاتون خوش گپیاں کرتیں آگے بڑھ گئیں مگر وہ پہلی پینٹنگ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور ارد گرد سے بے نیاز پوری توجہ سے اس آرٹ کو دیکھنے لگی۔

”اور ذہین بھی ہو!“ وہ پہلی پینٹنگ کے سامنے سے جلد ہی ہٹ گئی البتہ اگلی کے سامنے ٹھہر گئی۔ لبوں پہ مسکراہٹ آئی۔ اشعر نے دیکھا، وہ عام کو نظر انداز کر کے خاص اور قدیم کے سامنے کی تھی۔ ”کسی خوبصورت اور ذہین ہرنی کی طرح!“

”تم اس کو جانتے ہو؟“ عصرہ نے اس کے قریب ہو کے سرگوشی کی تو اس نے چونک کے عصرہ کو دیکھا پھر ذرا جھل ہوا۔ ”اوہو کا کا۔“ میں تو یونہی ایک بات کر رہا تھا۔“

”اگر تمہیں وہ پسند آگئی ہے تو مجھے بتاؤ۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی تھی۔ اشعر ہلکے سے ہنس دیا۔ پھر دوبارہ نیچے دیکھا۔ وہ ابھی تک اس پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی۔

”ویسے کون ہے یہ کا کا؟“ عصرہ نے شانے اچکا دیے۔

”میں تو نہیں جانتی۔ تم خود پوچھ لو۔“

اشعر نے دور کھڑی سیکرٹری کو چٹکی سے ادھر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً دوڑی چلی آئی۔

”یہ لڑکی کون ہے سفید لباس اور سرخ منی کوٹ والی۔ معلوم کر کے دو۔“ سنجیدہ صورت بنا کر اس نے سپاٹ انداز میں حکم دیا تو وہ فوراً ”یس سر“ کہتی سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔

گیلری کے باہر ایک کافی شاپ کے برآمدے میں چھتری تلے بیٹھی داتن گرما گرم کافی پی رہی تھی۔ بارش ابھی تھمی تھی اور موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی وہ کان میں لگے ننھے ٹکڑے کو دبا کے کہہ رہی تھی۔ ”اور تمہیں کیوں لگتا ہے کہ تم عصرہ سے ملاقات کر لو گی۔“

اندر پینٹنگ کے سامنے کھڑی تالیہ نے ہونٹوں کی کم سے کم جنبش کے ساتھ جواب دیا۔ ”کیونکہ میرے ڈائمنڈز اسے متوجہ کر لیں گے۔ وہ ابھی بھی اوپر کھڑی مجھے ہی دیکھ رہی ہے۔ ساتھ اس کا بھائی بھی ہے۔“

”بس خدا کرے اس نے اس سنگا پوری تاجر کی بیوی کو کبھی یہ یا قوتی سیٹ پہنے نہ دیکھا ہو جس سے ہم نے یہ چرایا تھا۔“

”خدا کی قسم داتن، اگر تم نے مجھے اس پچویشن میں ہنسانے کی کوشش کی تو میں تمہارا کھانا پینا بند کر دوں گی۔“ وہ بدقت مسکراہٹ دبا کے بولی تھی۔ ”اور تیرنشا نے پہ لگا ہے۔ عصرہ کی سیکرٹری مسز یاسمین کے ساتھ کھد بد کرتی نظر آ رہی ہے۔ یقیناً میرا ہی پوچھ رہی ہو گی۔ اور مسز یاسمین معصوم سی ہے، جو امپریشن میں نے بنا رکھا ہے اس کو بڑھا چڑھا کے بتائے گی۔“ وہ ننکھیوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نظریں پینٹنگ پہ جمی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس نے دیکھا کہ یاسمین خاموش ہوئی ہے، اور سیکرٹری سر ہلا کے مڑنے کو ہے، وہ ایک دم گھومی اور چند قدم چل کے ان کے قریب آئی۔“

”سنو تم... تم یہاں کام کرتی ہو؟“ سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تو سیکرٹری نے پہلے یاسمین کو دیکھا، جو اپنی جگہ تجل ہوئی تھی اور پھر تالیہ کو۔

”جی۔“

”مجھے یہ پینٹنگ خریدنی ہے۔ ابھی۔ اسی وقت۔“ اس کے انداز میں ایک شاہانہ پن تھا۔

”یہ تو... کافی... آ...“ وہ ہکلائی۔ ”قیمتی ہے، اور اس طرح ان کو بیچا نہیں جاتا، لیکن...“

”قیمت کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں بر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ تالیہ نے اسی شاہانہ انداز میں ہاتھ جھلا کے جیسے اس کے خدشے کو رد کیا تھا۔ ”متعلقہ آفیسر کو میرے پاس بھیجو۔ مجھے یہ ابھی چاہیے۔“ اور بے نیازی سے واپس پلٹ کر اسی پینٹنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ سیکرٹری کچھ مرعوب، کچھ کنفیوژ سی واپس اوپر بھاگی۔

”اس کا نام تالیہ مراد ہے۔ باپ مرتے وقت لمبی چوڑی جائیداد چھوڑ گیا تھا، اس نے چند نامور کمپنیز میں انویسٹمنٹ کر رکھی ہے اور ان شیئرز کی خرید و فروخت کے منافع سے کافی آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔“ سیکرٹری اب ان دونوں کے ساتھ کھڑی دھیمی آواز میں بتا رہی تھی

اشعر کی نظریں نیچے ہال پہ جمی تھیں جہاں وہ اس جانب کمر کیے پینٹنگ کے مطالعے میں محو تھی۔ عصرہ سینے پہ بازو لپیٹے بنا کسی تاثر کے سنتی رہی۔ ”یہ ایک سوشلائٹ ہے (ایسی عورتیں جو بے پناہ دولت ہونے کے باعث سارا وقت پارٹیز اور فنکشنز اٹینڈ کرنے میں گزارتی ہیں۔) مختلف چیمبرینی ایونٹس میں بھاری ڈونیشن بھی دیتی رہی ہے۔ آرٹ کلکٹر ہے۔ اور میم....“ وہ کھٹکھاری۔ ”وہ اس پینٹنگ کو خریدنا چاہتی ہے۔“

”اس پینٹنگ کو؟“ عصرہ نے بازو گرائے اور تعجب سے ابرو اٹھایا۔ ”لینگ مے کی اس پینٹنگ کو وہ خریدنا چاہتی ہے؟ اس کو اس کی قیمت معلوم بھی ہے۔“

”بچ دو،“ اشعر نے اطمینان سے عصرہ کی آنکھوں میں دیکھا اور دھیمسا بولا۔ ”اس کو جو چاہیے اس کو فروخت کر دو، کا کا۔“ عصرہ نے ایک نظر اشعر کو دیکھا، اور دوسری نظر نیچے کھڑی لڑکی پہ ڈالی جواب گردن ترچھی کر کے پینٹنگ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ پھر گہری سانس لی اور تحکم سے بولی۔ ”اسے اوپر بلاؤ۔“

سیکرٹری نے جب تالیہ کے قریب آ کر یہ پیغام دیا تو وہ چونکی، پھر گھوم کے اوپر دیکھا۔ دونوں بہن بھائی وہاں کھڑے تھے مگر بظاہر آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ تالیہ اسی سنجیدگی سے سیکرٹری کے پیچھے چل دی۔ کان میں داتن کی محفوظ آواز گونجی۔

”تیرنٹا نے پہ لنگ چکا ہے۔ عصرہ سے ہاتھ ملانا اور اس کے ہاتھ سے بریسلٹ اتار لینا۔ ہائے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ہم غریب تھے اور کے ایل کے بازاروں میں عورتوں سے ٹکرا کے معذرت کرتے اور ان کے زیور اتار لیتے تھے۔ یہ بھی ویسے ایک آرٹ ہے تالیہ۔ اتنی احتیاط اور نزاکت سے کسی کے ہاتھ سے زیور اتارنا کہ اسے محسوس ہی نہ ہو۔ چوروں کی کوئی ایوارڈز کی تقاریب کیوں نہیں ہوتیں؟ میں آدھ درجن تو جیت ہی جاتی۔“

”تمہارے جیتنے سے پہلے آدھے چور ایوارڈز چرا کے ہی لے جاتے۔“ کہہ کے بدقت اس نے ہنسی دبائی اور سنجیدہ چہرہ بنائے سیکرٹری کے پیچھے چلتی گئی۔

”یہ مس تالیہ مراد ہیں، میم۔“ سیکرٹری نے اس کے قریب آنے پہ تعارف کروایا تو وہ دونوں بہن بھائی اس کی طرف گھومے۔ سامنے کھڑی سفید لمبی اسکرٹ اور سرخ منی کوٹ والی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں میں خوشگوار حیرت در آئی تھی۔ ”مسز عصرہ فاتح۔ آف کورس۔ یہ تو آپ کی گیلری ہے۔ مجھے خیال کیوں نہیں آیا کہ آپ سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔“ وہ متاثر اور خوش سی آگے بڑھی اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ عصرہ مسکرائی (اس نے تنگو کامل کی نوکرانی کو نہیں پہچانا تھا) اور اس کا ہاتھ تھاما۔

”میں نے فاتح رامزل کو ووٹ دیا تھا۔ باریسن نیشنل کو۔“ وہ گرمجوشی مگر وقار سے عصرہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامے بولی اور انگلیاں طلائی بریسلٹ کی طرف بڑھائیں۔ جیسے ہی اس کے پوروں نے بریسلٹ کی زنجیر کو چھوا، اسے کرنٹ سا لگا۔ زنجیر دہکنے لگی تھی۔ گرم جیسے سونا ابل رہا ہو۔ ایک دم اس نے ہاتھ پیچھے ہٹایا۔ عصرہ چونکی، مگر وہ فوراً سے سنبھل گئی اور جبراً مسکرائی۔ ”فین مومنٹ۔ یونو۔“ زنگت ذرا

پھکی پڑی۔ ایک چور نظر اس کی کلائی پہ ڈالی۔ بریسلٹ چمک رہا تھا۔ تیز روشن سا۔ مگر عصرہ اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔ نہ اسے گرمائش محسوس ہوئی تھی۔ اس کی نظر تالیہ کے کانوں سے لٹکتے سرخ یا قوتقس پہ جم گئی تھیں۔ آنکھیں چمکیں۔

”مصباح کہہ رہی تھی آپ اس پینٹنگ میں انٹر سٹڈ ہیں۔“ اشعر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ”جی بالکل۔“ وہ انگلی سے سنہری بال پیچھے ہٹاتے ہوئے مسکرائی۔ ”مجھے قدیم چینی پینٹرز کا کام بہت فیسی نیٹ کرتا ہے۔ میرے بیڈروم میں صرف چینی آرٹ ورک ہے۔ پرنسلین اور چینی پینٹنگز۔“

”مگر یہ پینٹنگ برائے فروخت نہیں ہے۔“ عصرہ اسی اطمینان سے مسکرا کے بولی۔ تو اشعر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ نظروں میں تنبیہ کی مگر وہ تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

”میں اس کو نیلامی میں رکھ رہی ہوں۔ آپ نیلامی میں آئیں اور دوسرے لوگوں کی طرح بولی لگائیں۔ اگر آپ کی قیمت اچھی ہوئی تو آپ اس کو جیت لیں گی۔“ اشعر نے ضبط سے گہری سانس لی۔ اور داتن اس کے کان میں بولی۔

”چالاک بزنس وومن ہے یہ خاتون۔ معلوم ہو گیا کہ تمہیں پینٹنگ پسند آگئی ہے تو اب قیمت بڑھوا رہی ہے۔ نیلامی والے دن یہ اپنا بندہ بٹھا دے گی جو بولی لگا تا لگا تا قیمت کو لاکھوں میں لے جائے گا اور تم دس گنا قیمت پہ خریدنے پہ مجبور ہوگی۔ خیر بریسلٹ چرا لیا ہے تو نکل آؤ، کیونکہ باہر فاتح رامنزل کی گاڑیوں کا قافلہ آ رہا ہے۔“

”شیور۔ میں آکشن میں خرید لوں گی اور مجھے معلوم ہے کہ میں اسے خرید لوں گی۔“ وہ جبراً مسکرا کے بولی تو عصرہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”آپ سے مل کر اچھا لگا تالیہ۔ مصباح پلیز ان کو انوٹیشن کارڈ لا کر دو اور گیٹ لسٹ میں ان کا نام ڈالو۔“ پھر اشعر کو دیکھا اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”تالیہ یہ میرا بھائی ہے اشعر محمود۔ آپ یقیناً ان کو جانتی ہوں گی۔“ ٹو پیس، ٹائی، ہیئر موز سے ماتھے کے اوپر کھڑے بال اور وجیہہ چہرے کی مسکراہٹ۔ تالیہ نے پہلی دفعہ نگاہیں پھیر کے اشعر کو دیکھا۔ جبراً مسکرائی اور سر کو خم دیا۔

”ان کو کون نہیں جانتا۔“ اشعر جو پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا اس بات پہ ہلکا سا ہنس دیا۔

”میں اس کو تعریف سمجھوں گا۔“ پھر اسی محظوظ انداز میں اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ”تو آپ کیا کرتی ہیں تالیہ؟“

”میں مختلف کلبرز کی ممبر ہوں چند کارپوریٹ شیئرز کی مالک ہوں، پارٹیز، چیرٹیز۔ مصروف زندگی گزر رہی ہے۔“ وہ آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی کہ گیلری کا مرکزی دروازہ کھلا تھا اور اندر چند افراد داخل ہوئے تھے۔ سوٹ میں ملبوس باڈی گارڈز۔ اور ان کے درمیان مسکرا کے قدم اٹھاتا فاتح رامنزل۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

”ماشاء اللہ۔ امپریسیو۔“ اشعر نے ستائشی انداز میں ابرو اٹھائے۔

”اور آپ کو آرٹ کلیکشن کا شوق بھی ہے۔“ عصرہ نے ایک نظر نیچے ڈالی اور اسی بے نیازی سے واپس تالیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”بہت زیادہ۔“

”سٹنس گڈ۔ پھر تو آپ کو آرٹ کی قدر ہوگی بہت۔ ان فیکٹ....“ اس کی آواز میں دبا دبا سا جوش بھرا۔ ”ہمارے پاس سپانلم کی ایک پینٹنگ بطور عطیہ آئی ہے اور میں اسے بھی نیلا می میں رکھ رہی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔ ”کون سی پینٹنگ؟“

”گھائل غزال۔“ تالیہ کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوئی۔ آنکھوں میں بے یقینی در آئی۔ ”گھائل غزال؟“

”ہوں۔ تم دیکھنا چاہو گی؟“ کہنے کے ساتھ اس نے سیکرٹری کو ایک اشارہ کیا، پھر اشعر کو دیکھا۔ ”تم اپنے بہنوئی کو انینڈ کرو اور ان کو بتاؤ کہ عرب مہمان جا چکے ہیں۔“ دانت پہ دانت جما کے بولی اور سینے پہ بازو لپیٹے مڑ گئی۔ تالیہ فوراً اس کے پیچھے لپکی۔ اشعر بد مزہ ہوا مگر گہری سانس لے کر مڑ گیا۔

”ایک منٹ.... کیا اس نے کہا گھائل برن؟“ کافی شاپ میں بیٹھی داتن کان میں لگا آلہ دباتے ہوئے چونک کے بولی۔ ”مگر گھائل برن تو ہم نے اس عرب شہزادے کے جزیرے والے گھر سے چرایا تھا اور اس کی جگہ تمہاری بنائی گئی نقلی پینٹنگ رکھ دی تھی۔“

”ہوں۔“ وہ دبی آواز میں غیر آرام دہ سا بولی اور عصرہ کے پیچھے چلتی گئی۔ ذہن میں جکھڑ چل رہے تھے۔

”تالیہ اصلی گھائل غزال تو ہمارے پاس ہے، پھر مسز عصرہ کو عرب مہمان نے نقلی پینٹنگ کیوں عطیہ دی؟“ داتن حق دق تھی۔ ”ڈیڑھ سال سے اس عرب شہزادے نے پینٹنگ کی چوری کی رپورٹ نہیں کی تھی کیونکہ وہ اس کے باپ کی تھی اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اصلی پینٹنگ چوری ہو چکی ہے، باپ کی وجہ سے چپ رہا۔ تو اب کیوں؟“

تالیہ خاموشی سے عصرہ کے ہمراہ آفس میں داخل ہوئی۔ سیکورٹی کے دو افسران وہاں کھڑے تھے اور پینٹنگ کو پیک کر رہے تھے۔ عصرہ نے ان کو اشار کیا تو وہ اسے دوبارہ سے واپس نکال کے سامنے رکھنے لگے۔

”واؤ۔“ تالیہ مصنوعی ستائش سے کہتی قریب آئی اور جھک کے غور سے اسے دیکھا۔ ”یہ آپ کو عطیہ کی گئی ہے۔“

”ہاں۔ آپ کو سپانلم کا کام پسند ہے؟“

”رپورس گلاس پینٹنگ میری پسندیدہ ہے مسز عصرہ۔“ وہ اسی طرح جھکی کھڑی آنکھیں چھوئی کر کے باریک بینی سے پینٹنگ کا جائزہ لے رہی تھی۔ کان میں داتن بولی۔ ”یہ تمہاری والی ہے؟“

”ہوں!“ تالیہ نے مثبت سا ہنکارا بھرا پھر سیدھی ہوئی۔ ”آپ نے اس کو کسی ایکسپرٹ سے authenticate کروایا؟“

”ہاں.... ابھی کچھ دیر پہلے کروایا ہے۔ یہ اصلی ہے۔“ عصرہ مسکرا کے زور دے کر بولی۔ تو تالیہ بھی مسکرا دی اور پھر سے اس پینٹنگ کو

دیکھا۔

”تالیہ.... کوئی مسز عصرہ کو اس کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خیر.... یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“ داتن نے اپنی فکر کو خود ہی رد کر دیا۔ ”تم

بریسلیٹ لے کر نکل آؤ بس۔“

”او کے۔ میں چلتی ہوں اب۔“ وہ مسکرا کے مصافحہ کرنے آگے بڑھی تو دیکھا اس کے ہاتھ کے قریب آتے ہی بریسلٹ کا سونا چمکنے لگا ہے۔ تالیہ کا دل بیٹھنے لگا۔ بس واجبی سا اس سے ہاتھ ملا کر واپس کھینچ لیا۔ چمک ماند پڑ گئی جیسے بریسلٹ ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔

”اچھا لگا آپ سے مل کر تالیہ۔ آکشن میں ملاقات ہوگی۔“ معصرہ خوش نظر آتی تھی۔ وقار سے ایک ہاتھ بڑھا کے تالیہ کے کندھے کو دبایا تو وہ پھیکا سا مسکرا دی۔ تبھی دروازہ کھلا تو تالیہ کا دل دھڑکا۔ البتہ وہ مڑی نہیں۔

”میں لیٹ ہو گیا؟ چلے گئے وہ صاحب؟“ وہ بے نیازی اور خوشگوار موڈ میں کہتا اندر داخل ہوا۔ گارڈز باہر ہی رک گئے تھے اور اس کے ساتھ صرف اشعر اندر آیا تھا۔ آتے ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ ”تو یہ ہے ان کا عطیہ۔“ میز کے کنارے وہ رکا اور ایک بے نیاز سی نظر اس پینٹنگ پہ ڈالی۔ ”کیا قصور تھا اس بے چارے جانور کا جو اس کو زخمی حالت میں پینٹ کرنا ضروری تھا؟“ وہ افسوس سے چیخ کر کے بولا تھا۔ معصرہ نے اسے گھورا مگر جب بولی تو آواز کافی شائستہ تھی۔

”یہ ہماری نیلامی کی سب سے قیمتی پینٹنگ ہوگی۔“

”ایک تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لوگ ایک کینوس کے ٹکڑے پہ اتنا پیسہ کیوں لٹاتے ہیں؟ جبکہ کروڑوں انسان بھوک کا شکار ہیں پڑھ نہیں سکتے اچھے کپڑے نہیں پہن سکتے اور.....“ وہ بے رحمی سے پینٹنگ کو دیکھ کے تبصرہ کر رہا تھا۔ وہ ہنوز رخ موڑے کھڑی تھی۔

”اسی لئے بھائی، کا کا کی آکشن کا ایک بڑا حصہ چیمبرینی میں جائے گا۔“ اشعر نے نرمی سے اسے ٹوکا۔ فاتح نے ہنوز گردن جھکائے پینٹنگ کو دیکھتے شانے جھٹکے۔ ”واقعی؟ دیس گڈ معصرہ۔“

”فاتح ان سے ملو۔ یہ تالیہ مراد ہیں۔“ معصرہ نے تالیہ کو یوں گولگو سا کھڑا دیکھا تو کھٹکھار کے فاتح کو متوجہ کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی اور پھر دائیں طرف دیکھا۔ وہاں سنہرے بالوں والی دراز قد لڑکی کھڑی تھی۔ کندھوں پہ سرخ منی کوٹ پہنے سفید پاؤں تک آتے لباس والی تالیہ نے نظریں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہ ملی۔ اشعر فوراً سے بولا۔ ”تالیہ ایک معروف سوشلائٹ ہیں۔ ایک وسیع وراثت کی مالک۔ مختلف چیمبرٹیز اور آرٹ آکشن میں حصہ لیتی ہیں۔ ہماری چیمبرینی کی مستقبل کی ایک بڑی ڈور بننے والی ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ تالیہ کو دیکھ کے سادگی سے مسکرایا۔ ”سو آپ کیا کرتی ہیں ناشہ؟“

”تالیہ۔“ معصرہ نے ہلکے سے تھج کی مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔ تالیہ نے بدقت لب کھولے۔

”میں ایک کمپنی میں شیئر ہولڈر ہوں مسلینگ پارٹنر اور مختلف چیمبرٹیز میں ڈونٹ کرتی رہتی ہوں۔“

”مگر یہ تو آپ کے ماں باپ کا پیسہ ہے نا۔ وراثتی دولت۔ اس کو خرچ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ خود کیا کرتی ہیں۔ آپ کے کیا

ٹیلنٹس ہیں؟ کیا کامیا بیاں ہیں؟“ وہ اسی سنجیدگی سے بولا تھا۔ تالیہ کے سارے الفاظ ختم ہو گئے۔ گلا سوکھنے لگا۔

”میں.... سوشلائٹزنگ اور....“

”مطلب تم کچھ نہیں کرتیں ناشہ؟ کچھ بھی نہیں؟“ وہ متعجب ہوا تھا۔ اتنا تیز بولتا تھا کہ سامنے والے کو جواب کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

”کوئی زندگی میں بڑے گولز، بڑے خواب، کچھ نہیں ہیں تمہارے؟ Too Bad۔ انسان کو ایسے اپنی زندگی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔“ معصرہ نے بے اختیار ماتھا چھوا مگر وہ اب اشعر کی طرف متوجہ تھا۔ ”تم ایک کام کرو، میرے ساتھ آؤ، میں....“

”میں چلتی ہوں۔“ وہ کہہ کر جلدی سے مڑ گئی اور باہر نکل آئی۔

گیلری میں آ کر چند گہرے سانس لئے۔ رنگت بے رنگ پڑ رہی تھی۔ دل عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ بار بار کنپٹی کو چھوتی۔ کبھی گردن پہ ہاتھ رکھتی۔ فاتح کے ملازم گیلری میں گروہ کی صورت کھڑے تھے۔

وہ گیلری میں چلتی گئی۔ آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ کنکھیوں سے اس نے دیکھا کہ ملازموں کے گروہ میں سے ایک شخص نے مڑ کے اسے دیکھا اور پھر اس کے پیچھے آیا۔ وہ پرواہ کیے بنا چلتی رہی۔

”بات سنیں۔“ ابھی ہوئی آواز میں وہ اس کے پیچھے آ کر بولا تو وہ بادل نخواستہ رکی اور پلٹی۔ وہ کوٹ اور شرٹ میں ملبوس عام شکل و صورت کا ملے نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کے وہ چونکی۔ (یہ وہی ہے خواب والا۔ میں فاتح اور یہ۔ ہم تینوں کے سر پہ ہما تھا۔) مگر ظاہر نہیں کیا اور رکھائی سے بولی۔ ”آپ کون؟“

”میں.... فاتح صاحب کا باڈی مین ہوں۔ اس دن ہم تنگو کامل کے گھر آئے تھے۔ اصل میں وہ میری جاب کا پہلا دن تھا، پہلا دن کوئی نہیں بھولتا۔ میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ ہے نا۔“ وہ الجھن اور ذرا جوش سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ تنگو کامل کی ملازمہ ہیں نا؟“

تالیہ مراد اپنی جگہ بالکل سن کھڑی رہ گئی۔

”آپ کے بال فرق تھے، اور حلیہ بھی، مگر آپ وہی ہیں، ہے نا؟ اس دن آپ نوکرانی کیوں بنی ہوئی تھیں؟“ اس کے انداز میں سادگی اور تعجب تھا۔

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔

☆☆=====☆☆

کوالا لپور سے چند گھنٹے کی مسافت پہ.... ملاکہ شہر میں ایک قدیم قلعہ واقع تھا۔ اس کی دیواریں گدلی اور خستہ حال تھیں۔ ایک اندرونی دیوار کے کونے میں چند الفاظ کھدے نظر آتے تھے۔ جیسے صدیوں پہلے کسی نے ہاتھ سے دیوار کے گارے میں نوکیلی شے سے لکھے ہوں جو گارے کو کھنے پہ وہاں امر ہو گئے تھے....

وہ قدیم جاوی رسم الخط میں لکھی ایک طویل نظم تھی جس کے پہلے دو مصرعے بدقت پڑھے جا رہے تھے....

”تاشہ کی یاد میں۔“

وہ جو شاہزادیوں جیسی تھی....

اور اس نے ایک غلام سے شادی کی تھی....

اور اس کو آزاد کر دیا....“

اگلے الفاظ دیوار کی کالک اور میل میں چھپے گئے تھے.....

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆=====☆☆

حالم (نمرہ احمد)

باب 3:

”شکار باز“

اس نے دیکھا.....

گھٹا جنگل ہے..... اونچے درخت... جھاڑیاں.... کہیں بلندی کہیں نشیب ...
اور وہ دونوں بھاگتے چلے جا رہے تھے....

تیز سانس لینے کی آوازیں.... ہانپتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے پیچھے دیکھنا اور اندھا دھند دوڑنا....

وہ خود کو واضح دیکھ سکتی تھی.... اچھے مکھرے آدھے بندھے سنہرے بال.... چہرے پر مٹی اور زخموں کے نشان.... ڈھیلا ڈھالا سالباں پہنے وہ بھاگتی جا رہی تھی.... کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں تعاقب کر رہی تھیں....

کوئی اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا.... وہ بھی بار بار گردن گھما کے تعاقب کرنے والوں کو دیکھتا تھا....

پھر ایک دم وہ رک گئی.... جھک کے گہرے گہرے سانس لینے لگی.... وہ جو چند قدم آگے نکل گیا تھا واپس مڑا۔

”چے تالیہ.... رکھیں گی تو ان کا شکار بن جائیں گی.... دوڑیے....“ وہ اس کے کندھے کے پیچھے گھبراہٹ سے کچھ دیکھتا تھا....

”نہیں....“ اس نے پھولتی سانسوں کے درمیان دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ”ان کے پاس شکاری کتے ہیں۔ تالیہ نہیں بھاگے گی۔“ وہ

کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھی.... چند قدم اٹھائے.... آوازیں قریب آرہی تھیں....

”چے تالیہ.... آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”تالیہ اور ایڈم میں یہی فرق ہے... تم ایڈم شکار بن کے سوچتے ہو.... میں شکار باز بن کے سوچتی ہوں....“ وہ ادھر ادھر جھاڑیوں میں

ہاتھ مار رہی تھی۔ ”اگر میں شکاری ہوتی تو تالیہ اور ایڈم کو کیسے ڈھونڈتی؟“

”کیسے؟“

دو چیزیں.... دو چیزیں ہوتی ہیں شکاری کتوں کے پاس جن سے وہ شکار کو پکڑتے ہیں....“ اس نے جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرتے

انگلیوں کی وی بنا کے پیچھے دکھائی۔ ”ان کی رفتار اور سونگھنے کی حس....“ وہ دھونکنی کی طرح چلتے تنفس کے درمیان رک رک کے کہہ رہی تھی

۔ ”رفتار اتنی تیز ہوگی جتنا تیز مالک چل سکتا ہے“ اس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی ہوتی ہے.... شکاری کتوں کو زنجیر کے بغیر کوئی نہیں جنگل

میں لاتا.... اور اس کا مالک اتنا تیز نہیں ہے.... کتوں کو ہم تک پہنچنے میں وقت لگے گا.... ہمیں کتے سے زیادہ نہیں اس کے مالک سے زیادہ تیز بھاگنا ہے۔“

بھونکنے کی آوازیں ہر پہل قریب ہو رہی ہیں.....

”اور دوسری چیز....“

”اس کی حس مشامہ....“ اس نے دے کے مریض کی طرح سینے پہ ہاتھ رکھ کر سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سو نگھنے کی خوشبو....“ پھر چند پتے توڑ کھینچے۔ ”کالی مرچ کا پودا... اور وہ دیکھو...“ بازو لمبا کر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ شہتوت کا درخت.... منگلد.... انڈین شہتوت.... ان کی خوشبو کتوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے.... وہ اس بو کا تعاقب نہیں کرتے.... ان کو خود پہل لو ایڈم... ہم شکاریوں سے اور کسی طرح سے نہیں بھاگ سکتے....“

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا ہے تالیہ؟“ وہ دم بخود کھڑا تھا۔ تالیہ نے زرد چہرہ اٹھا کے نقاہت سے اسے دیکھا۔

”کسی نے نہیں.... میں خود شکار باز ہوں، بے وقوف!....“ وہ کہہ کے درخت کی طرف بڑھی تھی.... کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں بلند ہو چکی تھیں۔ وہ قریب تھے.... بہت قریب.....

☆☆=====☆☆

”آپ تنگو کامل کی ملازمہ ہیں نا؟“

تالیہ مراد اپنی جگہ بالکل سن کھڑی رہ گئی۔

”آپ کے بال فرق تھے اور حلیہ بھی، مگر آپ وہی ہیں، ہے نا؟ اس دن آپ نوکرانی کیوں بنی ہوئی تھیں؟“ اس کے انداز میں سادگی اور تعجب تھا۔

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگ۔ لمحے بھر کو وہ اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ شل۔ ساکت۔ پھر داتن کی آواز کان کے آلے سے چنگھاڑی۔

”یا اللہ.... یہ کون ہے؟ اس نے کیسے پہچانا؟ تالیہ بھاگو یہاں سے.... میں کارگیلری کے دروازے تک لاتی ہوں۔“

مگر وہ لمحہ گزر گیا، اور برنی جیسی آنکھوں والی لڑکی نے لب بھینچ لیے۔ بھنویں اکٹھی کیں، اور چار پانچ قدم قریب آئی، یہاں تک کہ وہ ایڈم کے عین مقابل آکھڑی ہوئی۔

”سوری، مجھے سنائی نہیں دیا۔ کیا کہا آپ نے؟“ ہر عادی جھوٹے کی طرح اس نے جواب سوچنے کے لئے وقت حاصل کیا۔

”میں.... سوری میں کہہ رہا تھا کہ اس دن فاتح صاحب کے ساتھ آپ کی طرف آیا تھا۔ آپ تنگو کامل کی ملازمہ ہیں نا۔“ وہ بلا کسی ڈر

جھجھک کے سادگی سے پوچھے گیا۔ عام سا چینی نقوش کا نو جوان اور اس کی سادگی.... تالیہ کے ماتھے پہل پڑے۔

”کون ہو تم؟ وان فاتح کے ملازم؟“

”جی میں....“

”ادھر آؤ.... تم!“ اس نے ایک دم چہرہ غصے سے لال بھسوکا کر کے چٹکی بجا کے باڈی گارڈز کو اشارہ کیا جو عصرہ کے آفس کے سامنے کھڑے تھے۔ پولیٹیکل سیکرٹری نے اس طرف دیکھا تو چونک گیا۔ ایڈم کے سامنے کھڑی طرح دار امیری لڑکی غصے سے اسے بلارہی تھی۔ وہ پریشانی سے اس طرف دوڑا۔

”کیا سز فاح اس طرح گیلری آئے مہمانوں کو بے عزت کرتی ہیں؟“

”سوری میم.... کیا ہوا؟“

”میں ابھی ابھی مسز عصرہ کی چیر بیٹی کے لئے ایک بڑی ڈومیشن کی کمٹنٹ کر کے آئی ہوں اور بابر کھڑا یہ باڈی مین مجھے روک کر کہتا ہے کہ تمہاری شکل ایک بد صورت غریب ملازمہ جیسی ہے۔ یا اللہ.... یا اللہ....“ اس نے ہونٹ گول کر کے سانس بابر نکال اپنے ہاتھ سے چہرے پہ پٹکھا جھلا جیسے ایک دم اس کا شوگر لوہور ہا ہو.....

ایڈم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ششدر سے ہو کر اس نے سیکرٹری کو دیکھا۔ ”نہیں“ میں نے یہ نہیں کہا“ میں تو کہہ رہا تھا کہ تنگو کامل....“ ”یہ کیا چیز پال رکھی ہے مسز عصرہ نے؟ ہاں؟“ وہ نزاکت بھرے غصے سے چلائی۔ ”کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تھی جو اس طرح میری توہین کی جارہی ہے؟.... یہ رکھو کارڈ اور مسز عصرہ کو کہہ دینا کہ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ یا اللہ.... یا اللہ!“ اس نے کچھ سے کارڈ نکال کے سیکرٹری کے منہ پہ پھینکا اور مڑ گئی۔ باریک ہیل سے چلتی وہ راہداری میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ سیکرٹری گھبرا کے اس کے پیچھے دوڑا۔

”میم.... برکیس پلینز.... آپ مت جائیں.... میں معذرت کرتا ہوں بلکہ ایڈم آپ سے خود معذرت کرے گا.... میم سنیں تو۔“ مگر وہ ہاتھ جھلا کے اس کو دفعتاً ہونے کا اشارہ کر کے تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگی۔ ابھی تک خود کو ہاتھ سے پٹکھا جھل رہی تھی جیسے نازک اندام طبیعت پہ یہ سب بہت گراں گزرا ہو۔ سیکرٹری نے بے چارگی سے اسے جاتے دیکھا پھر پلٹا اور کسی بھوکے شیر کی طرح ایڈم کی طرف آیا۔ وہ اپنی جگہ حیران پریشان کھڑا تھا۔

”تم.... تمہیں سمجھایا تھا میں نے کہ اپنی حد میں رہو۔“

”نہیں سر“ میں نے ان کی شکل کا تو نہیں کہا۔ یا اللہ.... میں تو کہہ رہا تھا کہ اس دن وہ ان کی ملازمہ تھی اور اب....“ ”بکواس بند کرو!“ سیکرٹری نے زور سے اس کو کندھے سے پکڑ کے پیچھے دھکا دیا تو ایڈم کا چہرہ سرخ ہوا، مگر اس نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”سر آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“

”تمہیں تو اب میں بتاؤں گا کہ زیادتی کے معنی کیا ہوتے ہیں۔“ وہ آندھی طوفان کی طرح اندر لپکا۔

آفس میں وہ تینوں اسی طرح کھڑے تھے۔ عصرہ برہمی سے کچھ کہہ رہی تھی اس کے یوں مدخل ہونے پہ اس طرف متوجہ ہوئی۔

”میم... وہ جو مس یہاں سے ابھی ابھی گئی ہیں، وہ کارڈ واپس کر گئی ہیں۔ بہت غصے میں تھیں۔“

”کیا؟“ جہاں عصرہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا، وہیں ایش تیزی سے سیدھا ہوا۔ ”کیوں؟ کیا ہوا؟“ فاتح مرکزی کرسی پہ بیٹھا تھا، بنا کسی تاثر کے سیکرٹری کو دیکھے گیا۔

”ایڈم نے ان سے بدتمیزی کی۔ ان کو روک کے ان پہ جملے کسے۔ وہ اس توہین پہ برا منا کے چلی گئیں۔“

”ایڈم کون ہے؟“ اشعر نے ناگواری سے ٹوکا۔

”عبداللہ کی جگہ جو نیا لڑکا آیا ہے۔ جب سے آیا ہے باس کے برٹنہ جلنے والے سے فرینک ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو مستقل نوکری چاہیے اس لئے شاید کینیڈا بنانا چاہ رہا ہے، تھینا ان خاتون کو بھی یہی کہا ہوگا پھر ان کے انکار پہ ان سے بدتمیزی کر بیٹھا۔“

”اُف۔ بلاؤ اس ایڈم کو۔“ عصرہ غصے سے چنگھاڑی۔ ”میں اس کے ساتھ اتنی مہربان رہی اور یہ میرے کلائنٹس کو بھگا رہا ہے؟“

”تم حوصلہ رکھو کا۔ میں دیکھتا ہوں۔ ارے تم بیٹھو، میں ہوں نا۔“ اشعر نے چہرے کو جلد ہموار کر لیا اور اسے تسلی دیتا ہوا برٹنہ لگا۔ سیکرٹری اس کے پیچھے لپکا۔ عصرہ نے بے بسی سے فاتح کو دیکھا تو اس نے ہلکے سے شانے اچکا دیے جیسے کہہ رہا ہو، میں معاملے سے واقف ہی نہیں تو کیا کروں؟

باہر تمام گارڈز موجود تھے۔ ایڈم پریشان سا ان سے انگ کھڑا نظر آتا تھا۔ اشعر پاٹ چہرے کے ساتھ چلتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”تم نے مسز عصرہ کی مہمان سے بدتمیزی کی؟“

”نہیں سر، میں نے بدتمیزی نہیں کی۔ صرف یہ کہا تھا کہ میں نے ان کو تنگو کا مل کے گھر....“

”ارے واہ تم میں تو بہت ہمت ہے، کیا اسی لہجے میں تم نے ہماری مہمان سے گفتگو کی تھی؟“ وہ اتنی تیزی سے پھنکارا کہ ایڈم کا سانس رک گیا۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکا۔ سامنے کھڑا قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک طاقتور آدمی اس کو سلگتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کو پہلی دفعہ خوف محسوس ہوا۔

”کتنے دن رہ گئے ہیں تمہارے کام کو ختم ہونے میں؟“

”چھ دن، سر!“ سیکرٹری گردن آگے کر کے تیزی سے بولا۔

”کیا میں نے تم سے پوچھا ہے؟“ اشعر نے ایک تیز نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ گڑبڑا کے پیچھے ہو گیا۔ پھر وہ واپس ایڈم کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم ان خاتون سے اپنے رویے کی معافی مانگو گے، سناتم نے۔ رٹی!“ اس نے تحکم سے اپنے چیف آف اسٹاف کو آواز دی۔ ادھیڑ عمر عینک والا رٹی پیچھے ہی کھڑا تھا فوراً آگے آیا۔ ”باس!“

”ان خاتون کا پتہ معلوم کرو پھر دعوت نامے اور اس بے وقوف کو لے کر ان کے گھر جاؤ۔ اور اگر یہ لڑکا معافی مانگنے سے انکار کرے تو

اس کو گھر بھیج دو بغیر تنخواہ کے اور عبداللہ کو واپس بلا لو۔“ مرمریں رابرداری کی ساری یاسیت ایڈم محمد کی آنکھوں میں اتر آئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اشعر آگے بڑھ چکا تھا اور رٹی اس کے ساتھ تھا۔ پیچھے اب اسے پولیٹیکل سیکرٹری کی کھری کھری سننی تھیں۔

”اس لڑکی کے بارے میں تمام معلومات لے کر آنا۔ بینک بیلنس کتنا ہے، شیئرز کن کمینیز میں ہیں، اور سب سے بڑھ کے، کوئی شوہر، سنگیتر، دوست وغیرہ ہے یا سنگل ہے۔“ اشعر رابرداری میں سبک قدموں سے چلتا دبی آواز میں رٹی کو ہدایات دے رہا تھا۔

”میں بخوبی سمجھ گیا باس!“ وہ تیز تیز اس کے قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

داتن کار کار دروازہ کھولے گیلری کے باہر کھڑی تھی جب تالیہ باہر نکلی۔ ہوا سے اس کے سنہرے بال اڑنے لگے تو اس نے سفید ہیٹ سر پر رکھ لیا۔ ماتھے پہ بل ویسے ہی تھے اور آنکھوں کی خفگی بڑھ چکی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پہ آ بیٹھی تو داتن اسٹیرنگ و ہیل تھامے دوسرے ہاتھ سے موبائل پہ مٹن دوبارہی تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ اس نے کوفت سے اسے مخاطب کیا۔

”معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم کس تھانے کی حدود میں موجود ہیں تاکہ جب یہ ہمیں گرفتار کروا کے وہاں بھیجیں تو مجھے پہلے سے پتہ ہو کہ یہاں میرا کون کون جانے والا ہے۔“

”کار چلاؤ داتن۔ ہم نہیں پکڑے جا رہے۔“ تلخی سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا تو داتن نے سر ہلا کے کار آگے بڑھا دی۔

”تھانہ یہاں سے دس منٹ کے فاصلے پہ ہے، جب تک وہ پولیس کو بلائیں گے ہم مین روڈ کر اس کر کے آگے نکل چکے ہوں گے۔“

”داتن ریلیکس۔ ہم محفوظ ہیں۔“

”اور جب وہ ہمیں تھانے لے جائیں گے مین روڈ سے گرفتار کر کے تو تمہیں سب سے پہلے میرا پہلا اصول یاد آئے گا کہ جب ہماری اداکاری کھل جائے تو تالیہ.....“ (چیخ کر بولی) ”وہاں سے فوراً بھاگتے ہیں!!“

”تالیہ کے پاس ہمیشہ اگلا پلان ہوتا ہے اور میرے کان میں مت چیخو، موٹی!“ وہ دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ کے جواباً چلائی۔ داتن نے لب بھینچ کے اسے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہ ڈسٹرب نظر آتی تھی۔ داتن دھیمی پڑی۔ ”یہ کون تھا اور اس نے تمہیں کیسے پہچانا؟“

”مجھے کیا معلوم۔ کوالا لپورا تاتا بڑا شہر ہے، یہاں ہزاروں بہروپے روز بھیس بدل کے لوگوں سے ملتے ہیں، کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ میرا تو حلیہ بھی فرق تھا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا، پھر چونک کے چہرہ اٹھایا۔ ”ضرور یہ کوئی خطرناک آدمی ہے جو وان فاتح کے ساتھ جڑا ہے۔ کسی ایجنسی کا بندہ یا انٹر پول کا انڈر کوریجنٹ.....“

”یہ وان فاتح کے باڈی مین کی جگہ گیارہ دن کے لیے آیا ہے۔ ڈسنگی اسکام کے وقت معلومات اکٹھے کرتے مجھے پتہ چلا تھا مگر مجھے اتنا اہم نہیں لگا تو میں نے اس کی زیادہ جانچ پڑتال نہیں کی۔“ داتن افسوس سے کہہ رہی تھی۔

”متبادل ملازم! اوہ۔“ تالیہ چونکی۔ ”سارے بہروپے اور کرایے کے قاتل متبادل ملازم بن کے ہی آتے ہیں۔ اس کی پوری چھان بین کرو۔“ پھر آنکھیں بند کر کے کنپٹیوں کو سہلایا۔ ”مجھے کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔ یا اللہ یہ مجھے کیسے پہچان گیا۔ مجھے اس کی اگلی پچھلی سات پشتوں کا حساب چاہیے۔“ داتن نے برا منہ بنا کے بیک ویو میں اسے دیکھا۔

”پچھلی سات نسلوں کا مل جائے گا۔ اگلی کے لئے خواب میں مستقبل نظر آنا ضروری ہے اور معذرت کے ساتھ یہ کام مجھے نہیں آتے۔“

مگر وہ اب کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پریشانی سے بڑبڑا رہی تھی۔ ”کوئی اتنی طرح دار امیر لڑکی کو یوں سراہ مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کرتا اس نے کیسے کر لی؟ کیا چیز تھا وہ؟“

”ویسے تمہارے چوری شدہ زیورات بھی کسی کام نہ آئے۔ اس نے پھر بھی تمہیں ملازمہ بنا ڈالا۔“

”تم تو چپ ہی کر جاؤ۔“ وہ اسے دیکھ کر جل کے بولی۔ داتن آگے سے چمک کے کچھ کہہ رہی تھی مگر یکدم تالیہ کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا.... اسے زور کا چکر آیا تھا....

جنگل.... وہ دونوں بھاگ رہے تھے.... تعاقب کرتے کتے.... شہتوت کا درخت....

”تالیہ.... تالیہ....“ داتن نے کار آہستہ کی اور زور سے اسے پکارا تو وہ چونکی۔ وہ گردن موڑ کے فکر مندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں سر میں درد ہے۔“ وہ رخ موڑ گئی مگر دل ابھی تک دھڑک رہا تھا.... کتوں کی آوازیں.... کالی مرچ کی خوشبو....

”میں اور ایڈم جنگل میں کیوں بھاگ رہے تھے؟ وہ مجھے چے تالیہ (مس تالیہ) بلارہا تھا! یا اللہ اس سب کا کیا مطلب ہے؟“ کہنی دروازے کے ہتھ پر رکھے اس نے پیشانی ہتھیلی پر گرا کے آنکھیں بند کر لیں۔

ایسا دھچکا پہلی بار لگا تھا۔ آخر کون تھا یہ ایڈم؟

☆☆=====☆☆

پولینیکل سیکرٹری کی اچھی خاصی جھاڑن کے اب ایڈم گیلری کے باہر فاتح کی کار کے ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ڈرائیور اور دوسرے گارڈز بھی مستعد سے کھڑے تھے۔ (تمسخرانہ نگاہوں سے بار بار ایڈم کو دیکھتے بھی تھے۔) اسی اثناء میں فاتح باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ سیکرٹری سے کچھ کہتے ہوئے پارکنگ تک آیا تھا۔ عادتاً مسکرا رہا تھا۔ بال ہوا کے باعث اڑ کے ماتھے پہ بکھرنے لگے تو اس نے ہاتھ سے ان کو دائیں جانب پیچھے کیا اور کار کی طرف بڑھا۔ ایڈم کو کھڑے دیکھ کر حسب معمول اشارہ کیا کہ وہ آگے بیٹھے۔ سیکرٹری نے فوراً مدخلت کی۔

”سر اس کو میں گھر بھیج رہا ہوں۔ اس نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے۔“

وہ جواندر بیٹھنے کے لیے جھکنے لگا تھا، چونک کے واپس سیدھا ہوا اور پہلے سیکرٹری پھر ایڈم کو دیکھا۔ ”کیوں؟ کیا کیا ہے اس نے؟“

ایڈم کی نظریں جھک گئیں۔ رنگت گلابی پڑی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا۔

”سر وہ جو خاتون مسز عصرہ کی مہمان تھیں، وہ heiress سوشلائٹ اس نے ان کو روک کے بد صورت کہا ہے۔ وہ کافی خفا ہو کے گئی ہیں۔“

دروازے پہ ہاتھ رکھے فاتح نے آنکھیں پر سوچ انداز میں چھوٹی کر کے ایڈم کو دیکھا۔ ”کیا وہ واقعی بد صورت تھی؟ مجھے نہیں لگی۔ مگر خیر....“ اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ ”اس شہر میں اس جیسی بورنگ پر بیٹی ویمن بھری پڑی ہیں۔ بیٹھو۔“ ابرو سے اشارہ کیا تو ایڈم کی آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی۔ ”میں بیٹھوں سر؟“

ادھر سیکرٹری کی رنگت خفت سے اڑی گئی۔ جلدی سے بولا۔ ”مسز عصرہ کافی خفا ہیں سر۔ مجھے اس لڑکے کو ابھی گھر بھیجنا ہے تاکہ یہ اپنے رویے کو.....“

”مجھے فلو ہے“ عثمان اور ایڈم کے پاس نشو ہیں۔ بیٹھو۔ میرے پاس تم لوگوں کی آفس پالیٹیکس میں ضائع کرنے کے لیے مزید وقت نہیں۔“ ٹھنڈی سی پیش سے کہا اور اندر بیٹھ گیا۔ ایڈم جو شل سا کھڑا تھا، جھٹ سر ہلا کے بولا ”جی سر۔“ اور فوراً دروازہ بند کیا پھر سیکرٹری سے نظر ملائے بغیر جلدی سے فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھا۔ دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔

کارزن سے آگے بڑھ گئی اور سیکرٹری تند و تیز نظروں سے اسے گھورتا رہ گیا۔ یہ لڑکا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

☆☆=====☆☆

حالم کے بنگلے کی بلائی منزل پہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس کی سڑک کو چہرہ کرتی دیوار شیشے کی تھی۔ اس سے اندر چھن کے آتی کرنوں نے سارا کمرہ روشن کر رکھا تھا۔ وہاں قطار سے چند ایکسر سائز مشینیں رکھی تھیں۔ ورزش کرتے ہوئے سامنے پھیلے بنگلوں کی قطار اور ان کے پار دور اوپر نیلا آسمان نظر آتا تھا۔

مگر وہ آسمان کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس ٹریڈ میل کے بینڈ ریل پہ دونوں ہاتھ جمائے، بیلٹ پہ کھڑے کھڑے بھاگ رہی تھی۔ ورزش کے رف کپڑوں میں ملبوس، سنہری بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھے (جس سے گردن تلے گول جلنے کا سائنٹان صاف نظر آ رہا تھا) وہ پسینہ پسینہ کھڑی تھی۔ آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں لیکن شاید دماغ کے اندر تک ابھی نہیں۔ ان میں بے بسی بھرا غصہ بلکورے لے رہا تھا۔

دفعاً اسے شیشے کی دیوار پہ عکس دکھائی دیا۔ داتن عقب میں کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔ تالیہ نہر کی، نہ پلٹی، اسی طرح ٹریڈ میل پہ بھاگتے ہوئے بولی۔ ”معلوم کیا تم نے؟ کون ہے وہ ایڈم؟ کرایے کا قاتل؟ کوئی جاسوس؟ بہرہ پیا؟“

”تالیہ....“ بھاری بھر کم داتن بچکچاتے ہوئے قریب آئی۔ تالیہ نے مٹن دبایا اور ٹریڈ میل کی رفتار بڑھائی۔ قدموں تلے بچھارنگ بیلٹ مزید روانی سے بھاگنے لگا۔ ”وہ لڑکا ایڈم....“

”میں کبھی گرننگ نہیں کرتی۔“ وہ پھولے تنفس کے دوران خود سے بولے جا رہی تھی۔ (گرفتار وہ ٹھگ ہوتا ہے جو بھیس بدل بدل کے لوگوں سے مختلف اسکیموں کے نام پہ پیسے بٹورتا ہے) ”میں cat burglar ہوں۔ رات کو دبے پاؤں پھلانگ کے آنے والا چور۔ ایسے کردار کرتی ہوں جو بس منظر میں رہتے ہیں۔ ویٹر نوکرانی بچوں کی آیا.... مجھے کبھی کسی نے نہیں پہچانا۔ اس نے پہچانا تو کیسے؟“ وہ غصے میں تھی۔

”سنو....“

”وہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔“ وہ کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے دانت پہ دانت جمائے کہہ رہی تھی۔ ”بہت ذہین، بہت گہری نظر کا مالک تھا۔ اور اس کا وہ اعتماد جس سے اس نے مجھے پکارا۔ عام آدمی ایسا نہیں کرتا۔“

داتن آگے آئی اور ٹریڈ میل کا بٹن دبایا۔ مشین بند ہو گئی۔ بیلٹ رک گئی۔ وہ ذرا سا لڑکھرائی، پھر غصے سے داتن کو دیکھا۔ ”کیا؟“ داتن نے پہلے جوس کی بوتل اس کے سامنے رکھی پھر بولی۔ ”تخل سے سنو۔ وہ ایک معمولی گھرانے کا معمولی لڑکا ہے۔ بے روزگار ہے۔ فوج میں نوکری ملی تھی مگر جلد ہی دے کی شکایت کی وجہ سے واپس بھیج دیا گیا۔ تب سے اب تک ڈھنگ کی نوکری نہیں کر سکا۔ باپ ایک کپڑوں کے اسٹور پریلز مین ہے۔ مگنی ہو چکی ہے اور جلد شادی ہونے والی ہے۔“

”ہاج باج بالکل۔“ پرفیکٹ کور اسٹوری۔“ اس نے بوتل منہ سے لگائی، چند گھونٹ غٹا غٹ بھرے پھر بوتل نیچے کی اور سرخ تہمتاے چہرے کے ساتھ داتن کو دیکھا۔ ”مگر اصل میں کون ہے وہ؟ یہ بتاؤ؟“

”وہ یہی ہے تالیہ۔ ایک سادہ سچا ایماندار لڑکا۔“

”جیسے تنگو کامل کی ملازمہ تالیہ تھی؟ ہونہ۔“ اس نے سر جھٹکا اور ٹریڈ میل سے اتر آئی۔ ”کوئی سچا ایماندار نہیں ہوتا یہاں داتن۔ سب کی سیاہ داستانیں ہوتی ہیں۔ یہ جو تم بتا رہی ہو یہ تو اس ایڈم نے اپنی فائل میں لکھا ہو گا۔ مگر وہ اصل میں کون ہے؟“

”وہ یہی ہے تالیہ۔ اس کے محلے میں میرا ایک کانٹیکٹ رہتا ہے۔ وہ چھبیس برس سے اس کو جانتا ہے۔ سارا محلہ اس کے خاندان کو جانتا ہے۔ وہ نیک شریف لوگ ہیں۔ وہ کوئی جاسوس، کوئی کرایے کا قاتل نہیں ہے۔ وہ سادہ اور سچا مشہور ہے۔“

تالیہ ٹھہر گئی۔ چہرے پہ شل ہو جانے کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ بے یقین تھی۔ ”سچے لوگ نہیں ہوتے دنیا میں۔ جو ہوتے ہیں وہ زیادہ دیر تک ٹھہرتے نہیں۔“

”دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک سانچے سے کوئی دو لوگ نہیں بنائے اللہ نے۔“

وہ تالیہ سے گردن تھپتھپانے لگی۔ الجھی ہوئے نظر آ رہی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ باہر شام کی کرنیں اب ڈوبنے لگی تھیں۔

”اگر وہ اتنا ہی ذہین تھا تو ابھی تک زندگی میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکا؟“

”کیونکہ ہر شخص کو اپنی ذہانت کا علم نہیں ہوتا تالیہ۔ ذہانت انگ چیز ہوتی ہے، ذہانت کا اعتماد انگ۔“ داتن سبھاؤ سے اس کو سمجھا رہی

تھی۔

”یاشاید وہ شکار کی طرح سوچتا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ داتن ٹھیک سے سن نہ پائی اور پوچھنے لگی۔ ”تم نے بریسلٹ کیوں نہیں چرایا؟“
تالیہ پلٹ گئی اور دیوار گیر روشن کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگی۔ دور اور چار جانی پڑتا نظر آ رہا تھا.... اپنی آغوش میں بہت سے انسانوں کے
راز دبا کے بھی وہ شام کے اس پہر پر سکون لگتا تھا....

”جس کی مجھے تلاش ہے داتن“ شاید اس کو بھی میری تلاش ہے۔ مگر وہ چوری نہیں کیا جاسکتا۔ اس سکے یا اس بریسلٹ کو کبھی کسی نے
چوری نہیں کیا۔ ہمیشہ بیچا یا تحفے میں دیا۔ میں نے اسے چھوٹا چاہا تو وہ دہکنے لگا۔ میں اس کو ایسے نہیں چرا سکتی۔“
داتن کی نظریں بے اختیار اس کی گردن کے نشان پہ ٹھہر گئیں۔ (کیا مجھے تالیہ کو بتادینا چاہیے؟ انہوں نے) اس نے سر جھٹکا۔
”مگر فکر نہ کرو.... میرے پاس پلان ہے۔ میں اپنی چابی واپس لے کر ہی رہوں گی۔“ وہ عزم سے سلگتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تالیہ.... شاید ہمیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ شاید یہ واقعی کوئی ملعون شے ہو اور....“

وہ تیزی سے گھومی اور غصے سے داتن کو دیکھا۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے داتن؟ میرے پاس کیا ہے زندگی میں؟“ وہ ایک دم ایسے پھٹ پڑی
تھی کہ لیانہ صابری ہکا بکا رہ گئی۔ ”تمہیں لگتا ہے میں جو ہنستی ہوں مذاق کرتی ہوں؟ یہ سب سچ ہے؟ یہ جو میں کہتی ہوں کہ مجھے کبھی فلاں
سلبرٹی پہ کرش ہے تو کبھی وان فاتح پسند ہے؟ یہ سب میرے دل کی باتیں ہیں؟ نہیں داتن۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں جھوٹ بولتی ہوں۔ خود
کو خوش رکھنے کے لئے بہانہ کرتی ہوں۔ ورنہ میری زندگی خالی ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کے دکھائے جن میں ہوا کے
سوا کچھ نہ تھا۔

”میرے پاس کوئی رشتہ نہیں ہیں۔ کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اور وان فاتح کہتا ہے کہ تمہاری کامیابیاں کیا ہیں؟ تمہارا ٹیلنٹ کیا ہے؟
کہاں تھے اس وقت یہ تمام ممبر پارلیمنٹ جب میرے شوہر نے میرے ذریعے منی لانڈرنگ کروانی چاہی تھی۔ کہاں تھے یہ قانون کے
ادارے جب میں اور تم ملائیشیا کی سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے تھے اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم نے اذیت کاٹی ہے، بھوک
اور مفلسی کاٹی ہے۔ اور اب میری زندگی میں ایک ہی خواب بچا ہے....“ اس کی آواز دھیمی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”.... ایک چھوٹا
ساجزیرہ ہوا اور وہ میرا ہو۔ اس کے اوپر ایک پہاڑ کی چوٹی پہ ایک قلعہ ہو، اور میں وہاں حکومت کروں۔ جزیرے کے لوگ مجھے چور نہ سمجھیں،
وہ میری عزت کریں۔ ہاں وہاں میں سچی ایماندار بن کے رہ سکتی ہوں۔ مگر اس شہر میں شاید کبھی نہیں۔ مجھے اپنی زندگی کی ساری خوشیاں،
ساری دولت ان امیر لوگوں سے حاصل کرنی ہے داتن۔ میں غریبوں کا مال کبھی نہیں چراتی، صرف ان امیر لوگوں سے لیتی ہوں جو پیسے کو
مس نہیں کرتے۔ میں لوگوں کے دل نہیں دکھاتی، اور وہ کہتا ہے، تمہاری کامیابیاں کیا ہیں؟“ آنسو پٹپٹ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے
تھے اور بوتے بوتے اس کی ہچکی بندھ گئی تو وہ وہیں کھڑکی کے ساتھ فرش پہ پیٹھ تکی چلی گئی۔ ایسے ہی اکڑوں حالت میں، اور تھوڑی گھنٹوں پہ رکھ
دی۔ آنسو ہنوز گر رہے تھے۔

”تم اتنی دکھی ہوتا لیہ؟“ داتن دھیرے سے اس کے سامنے ہوم جم مشین کی سیٹ پہ بیٹھی اور ملال سے اس کا چہرہ نکلا۔

”میں اندر سے خالی ہوں کیا نہ۔ میری زندگی کا کوئی مقصد کوئی عزم کچھ نہیں ہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں کچھ نہیں کرتی۔ میری کوئی کامیابیاں نہیں ہیں۔“ اس نے ہتھیلیوں سے آنسو رگڑے اور رندھی آواز میں بولی۔ پھر گردن موڑی تو دیکھا کالونی کی سڑک پہ ایک عورت وا کر کوڈھکیلتی دکھائی دے رہی تھی۔ وا کر میں کوئی بچہ تھا جس کے اوپر وہ چھاتا تانے ہوئے تھی۔

”مجھے نہیں جانا میرے ماں باپ کون تھے۔ مجھے صرف یہ بات دکھ دیتی ہے کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑا؟ کیا کوئی ایسے اپنے بچے کو چھوڑ کے بھول جاتا ہے۔“ اس کی آزرده آنکھیں سڑک پہ چلتی عورت پہ جمی تھیں۔ ”یہ لوگ خوش قسمت ہیں۔ ان کے پاس کوئی گھر ہے جہاں پہ کوئی ان کا انتظار کرتا ہے۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ داتن اگر میں اس اونچے محل میں مر بھی جاؤں تو کتنے دن ہمسایوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔“

داتن کی آنکھیں نم ہوئیں۔ ”اور میں تالیہ؟“

تالیہ نے گردن موڑ کے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”ایک تم ہی ہو مگر لوگ کہتے ہیں خون کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں۔ دوستی کا رشتہ کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے خوف آتا ہے کہ تم بھی مجھے چھوڑ کے چلی جاؤ گی۔ اگر میرے ماں باپ مجھے چھوڑ سکتے ہیں تو مجھے کوئی بھی چھوڑ سکتا ہے۔ اس لئے میں ڈھیر ساری دولت حاصل کرنا چاہتی ہوں داتن۔ وہ کم از کم میرے ساتھ تو رہے گی۔ سونا اور ہیرے دھو کہ نہیں دیتے۔ بس ایک آخری واردات۔“ اس نے سختی سے سیاہ آنکھیں رگڑیں جو اندر سے گلابی پڑ گئی تھیں۔ داتن نے ٹوٹے دل کے ساتھ گہری سانس لی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے ابھی۔

”میرے تمہارے جیسے لوگ کبھی نہیں نیک ہو سکتے تالیہ۔ ہم کبھی سچے اور ایماندار نہیں ہو سکتے۔“ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ پٹی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ تالیہ نے چہرہ گھٹنوں میں دے دیا۔ آنسو پھر سے بنے لگے تھے۔ داتن بارہ بیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے سیاہ چہرے پہ پھسل رہے تھے۔

شام دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔

☆☆=====☆☆

کیپونگ کا علاقہ رات کو اتنا روشن نہیں تھا جتنے امراء کے علاقے ہوتے تھے۔ یہاں لوگ وقت پہ سو جاتے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف قطار میں چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ گھر بنے تھے جن کی محرومی چھتیں تھیں۔ ایڈم جس وقت چھوٹا لکڑی کا گیٹ کھول کے کوٹ کندھے پہ لا دے اندر داخل ہوا، گھر کا برآمدہ روشن تھا۔ مگر اس کے چہرے کی جوت بجھی ہوئی تھی۔ وہ وہیں برآمدے کے اسٹیپ پہ بیٹھ گیا۔ قریب میں مرغیوں کا ڈربہ تھا جس کے اندر پروں تلے چوزے دبائے بیٹھی مرغی نے ہلکی سی کٹاک کی بھیسے چونکی ہو۔

جالی دار دروازے کے کھلنے کی آواز آئی تو ایڈم نے گردن موڑی۔ اس کی ماں وہاں کھڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسکارف سر پہ لیجے، لمبی قمیص اور کرنگ (اسکرٹ کی طرح) پہنے وہ جیسے اس کو دیکھ کے فکر مند ہو گئی تھی۔

”تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر آ جاؤ۔“

”میں اتنا بے وقوف کیوں ہوں، ای بو (ماں)۔“ وہ تھوڑی گھٹنوں پہ گرائے سامنے دیکھتے ہوئے اداسی سے بولا تھا۔ ماں نے گہری سانس لی اور چند قدم چل کے قریب آئی۔ ایڈم نے چہرہ موڑ کے اس کے جنوؤں کو دیکھا جو اس کے ساتھ آر کے تھے۔ ان سے نکلنے پیروں پہ ادھیڑ عمر کی کتنی لکیریں پڑی تھیں۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ ڈھارس بندھانے والے انداز میں پوچھتی اس کے ساتھ نیچے بیٹھی۔

”میں نے آج کتنی بڑی بے وقوفی کی، تم سوچ بھی نہیں سکتی، ایبو۔“

”سوچ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ۔“ وہ گردن موڑ کے سکون سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”مجھے شرم آئے گی۔“ وہ خفت زدہ لگتا تھا۔

”سچ بولنے والوں کو اگر سچ پہ شرم آنے لگے تو جھوٹ بولنے والے جھوٹ کہتے وقت گردن کڑا لئے کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے میرا بیٹا جھوٹ نہیں بولے گا۔“

ایڈم نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”تم میرا یقین کرو گی۔“

”کیا پہلے کبھی نہیں کیا؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں... میں نے اس کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی یا شاید غلط سمجھی تھی۔“ وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

”کون؟“

”وہ لڑکی... وہ گیلری میں آئی تھی...“ وہ ڈھکن کھول کے اندلی جانے والی بوتل کی طرح روانی سے بتاتا گیا۔ ”پہلی نظر میں مجھے لگا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، پھر یاد آیا،‘ جاب کے پہلے دن جس گھر میں ہم گئے تھے وہ ادھر کام کر رہی تھی۔ تب اس نے ملازمہ والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آج وہ بالکل فرق لگ رہی تھی۔ یہ اتنے سارے زیور پہنے بال چکیلے کیے۔ مگر مجھے وہ وہی لگی تھی۔ میں نے صرف اسے روک کے پوچھا کہ اس دن وہ ملازمہ کیوں بنی ہوئی تھی، اور اس نے سب کو اکٹھا کر دیا کہ یہ مجھے بد صورت کہہ رہا ہے۔ کسی نے میرا یقین نہیں کیا۔ باس نے کہا ہے کہ اب مجھے اس سے معافی مانگنی ہو گی...“

”ہو سکتا ہے یہ غلط فہمی ہو۔“

”ہاں واقعی، یہ میری غلط فہمی ہو گی اتنی بھی اس کی اس ملازمہ سے شکل نہیں ملتی تھی، ہو سکتا ہے وہ واقعی کوئی اور ہو اور...“

”تمہاری نہیں اس کی غلط فہمی ہو کہ تم اس سے کچھ اور پوچھ رہے ہو۔“ ماں زور دے کر بولی تو وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ایڈم کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی؟“

”ہو سکتی ہے، لیکن ہوتی نہیں ہے۔ ایڈم اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ وہی لڑکی تھی تو وہ وہی ہوگی۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ جانتی ہوں کہ تم ذرا سادہ ہو، مگر چالاک نہیں ہو، سچے اور ذہین ہو۔ لیکن ایک چیز... تمہاری نظریں، وہ ہمیشہ سے بہت گہری تھیں۔ گھر میں کوئی چیز کھوتی تو میں تم سے کہتی، ”تم منٹ میں ڈھونڈ لیتے۔ بازار سے سودا لانا ہوتا تو تمہیں بھیجتی۔ تم ایک نظر میں ساری دکان دیکھ لیتے کہ کچھ اور بھی تو کم نہیں ہے گھر میں!“

”واقعی؟ میری نظر اچھی ہے نا۔“ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔

”ہاں ایڈم... تمہاری نظر جھوٹ نہیں بولتی، کیونکہ تمہارا دل جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر تم کبھی جھوٹ بول بھی لیتے تھے تو چند گھنٹوں میں ہی سارا سچ میرے سامنے کھول دیتے تھے۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں ایڈم۔ ایک وہ جو سچے ہوتے ہیں، اور ایک وہ جو جھوٹے ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی سچے تھے اور وہ ہم سے یہ چاہتے تھے کہ ہم بھی سچے بنیں۔ کیونکہ بنے، جب انسان دوسروں سے سچ بولتا ہے تو اس کے اعضاء اس سے سچ بولنے لگتے ہیں۔ اس کا دل اس کو غلط کا احساس دلاتا ہے اور نظریں اس کو کسی جھوٹ کا شکار نہیں بننے دیتیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ لڑکی کون ہے اور اس کا کیا معاملہ ہے، لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہاری نظر تمہیں دھوکہ نہیں دے گی۔“

وہ اس کی باتوں پہ بالکل گم صم سا ہو گیا۔ ذہن کے جالے صاف ہوئے تو دل الجھنوں میں گھر گیا۔ وہ جو خود کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں ایک لڑکی کو ملازمہ سے ملایا، اب پھر سے چونک گیا تھا۔

”تم نے اسے اس لئے روکا کیونکہ تمہارے دل نے کچھ غلط ہوتے دیکھا۔ ایک انسان دوسرے روپ میں دیکھا تو دل کو لگا یہ غلط ہے اور تم نے سادگی سے اپنی الجھن بیان کر دی۔ یہی ہوا ہوگا، ہاں؟ تم اس سے معافی مانگ لینا اور بات ختم کر دینا، کیونکہ تمہیں کیا معلوم کس کی کیا مجبوریاں ہیں۔ تم بس اپنے کام پہ دھیان دو۔ خوب محنت کرو۔ پتہ ہے....“ وہ ایک دم مسکرائی اور یاد دکر کے بولی۔ ”جب تم چھ سال کے تھے تو تمہارے باپا کے بڑے تایا ہمارے گھر آئے تھے۔ وہ بڑے نیک اور اچھے انسان تھے۔ میں نے کہا ایڈم کے لئے دعا کریں تو انہوں نے دعا مانگی کہ....“

”کھانا... کھانا دو ماں۔“ وہ خجالت سے اس کی بات ٹوکتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایڈم!“ ماں نے سر اٹھا کے افسوس بھری گہری سانس لی۔ ”تمہیں تایا جان کی دعا پہ شرمندگی کیوں ہوتی ہے؟ اللہ سے جتنا زیادہ مانگو گے، وہ اتنا زیادہ ہی دے گا۔“

”ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب کھانا دونا۔“ وہ اسے اٹھاتے ہوئے پھر سے بات گول کر گیا۔ مبادا ماں وہ دعا دہرا ہی نہ دے۔ (اگر جو کسی نے سن لیا تو؟ اُف۔ اور اگر جو باس کے پولیٹیکل سیکرٹری نے سن لیا تو وہ کتنا ہنسے گا ایڈم پہ۔) اس نے جھرجھری لی۔ ڈر بے میں بیٹھی

مرغی نے پھر سے کٹاک تو دیوار سے جھانکتی ملی پیچھے ہو گئی۔ رات پھر سے پرسکون ہوتی گئی۔
ماں اب کچھ خفاسی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کے اندر کی طرف جارہی تھی۔ دعا پہ کیسی ندامت، ہاں؟

☆☆=====☆☆

رات کو الالہ پور پہ اتری تو دیسا پارک کے اس اونچے محل کے لان میں لگے پھول مہک مہک اٹھے۔ خوشبو اتنی تیز تھی کہ اندر تک آنے لگی۔
وان فاتح گھر کے اندر داخل ہوا تو ہر سوسنا چھایا تھا۔ ملازموں کی چہل پہل تھم چکی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کوٹ اتارتے ہوئے
دوسرے کی انگلیوں سے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے اور کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ پھر کھلا دروازہ دیکھ کے وہ ٹھٹھا بھنویں سکڑیں۔
دروازہ پورا دھکیلا تو لبوں سے گہری سانس نکلی۔ عصرہ اس کے کمرے میں سامنے کرسی پہ بیٹھی، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اس کی طرف دیکھ رہی
تھی۔

”تم سوئی نہیں ابھی تک؟ یا آج تمہیں دیر تک کوئی کام نہیں کرنا؟“ اس نے کوٹ دوسری کرسی پہ ڈالا۔ پھر بیڈ کے کنارے آ بیٹھا اور
شرٹ کے کف کھولنے لگا۔

”تم نے آج اس لڑکی کے ساتھ بہت برا کیا، فاتح۔ وہ ہماری کلائنٹ تھی۔ ڈونر تھی۔“ وہ خفگی سے ایک دم بولی، تو وہ جو کف کا بن کھول
رہا تھا، رک کے حیرت سے اسے دیکھا۔ آنکھوں میں الجھن بھر گئی۔
”کون سی لڑکی؟“

”جس کو تم نے میرے آفس میں یہ کہہ کر بے عزت کیا کہ وہ کچھ نہیں کرتی۔ اور اس کے آرٹ کے شوق کی تو ہین انگ کی۔“
فاتح چند لمحے اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا، پھر یاد آیا۔ سہرے بالوں اور بڑی آنکھوں والی لڑکی.... ”اچھا وہ.... اس کو میں نے برا بھلا کہا
تھایا ایڈم نے؟“ وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس کی غلطی کیا تھی۔ پھر یاد کیا۔ ”ویسے میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا اس کو۔“ اب وہ کندھے اچکا کے
جھک کے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔ ”میں اگر یہ دیکھوں کہ میرے سامنے ایک ایسا انسان کھڑا ہے جس کی زندگی میں کوئی بڑا مقصد نہیں ہے
وہ اپنی زندگی ضائع کر رہا ہے اور میں ظاہر کروں کہ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں، یہ تو غلط بات ہے۔“
”مگر وہ دنیا کو ایسے نہیں دیکھتی ہوگی جیسے تم دیکھتے ہو۔“

”نہ دیکھے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے دوبارہ اچکا تے جھکے جھکے دوسرا تسمہ کھولا۔
”فاتح تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کیریئر میں تمہیں سپورٹ کرتی رہوں لیکن تمہیں میرے فائدے نقصان سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس
نے دکھا اور غصے کے طے جلے تاثرات آنکھوں میں بھرے اسے دیکھا۔ وہ بوٹ اتارتے ہوئے اسے سادگی سے بولا۔
”دیکھو عصرہ.... میرے الفاظ کو Twist کر کے اگر تم آرگومنٹ جیتنا چاہتی ہو تو جیت لو۔ میں برا نہیں مناؤں گا۔ لیکن ہم دونوں کو
معلوم ہے کہ یہ کوئی ایسا ایشو نہیں ہے جس پہ تم اتنی توانائی ضائع کرو۔“

”میری مہمان اور ڈور کو خفا کرنا کوئی ایشو نہیں ہے؟ واہ۔ کیا میں تمہارے مہمانوں کے ساتھ ایسے کرتی ہوں؟ کیا میں اچھی بیوی کی طرح پوز کر کے ان کی خاطر مدارت نہیں کرتی؟ ہاں؟“

”اب تمہارا آرگو منٹ کمزور پڑ رہا ہے۔“ فاتح نے جرابیں اتارتے ہوئے افسوس سے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اگر تم اس بات پہ برامنائی کہ میں کسی لڑکی سے اچھے سے بات کر رہا ہوں تو میں اسے ایک جائز دلیل سمجھتا، لیکن برے سے بات کرنے پہ اتنا جھگڑا؟ سچ۔“ آخر میں گویا ملال کر کے وہ اٹھا اور نائی ڈھیلی کرتے ہوئے ڈرینگ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ بے اختیار اٹھی اور غصے بھری بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔

”تم کبھی نہیں سمجھتے کہ جو کنکرتم دریا میں پھینک دیتے ہو ان کے دائرے کتنی دور تک پھیل کے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ چاہے وہ میں ہوں.... میرا کاروبار ہو.... تمہارا کیریئر ہو.... یا.....“ اس کی آنکھیں گیلی ہوئیں۔ ”یا.... آریانہ ہو۔“

وہ جو الماری کھولے کھڑا بیٹنگرز الٹ پلٹ کر رہا تھا اس بات پہ ایک دم ٹھہر گیا۔ پھر آہستہ سے واپس پلٹا تو اس کے چہرے میں کچھ بدلا ہوا سا نظر آتا تھا۔ جیسے کوئی زخمی پن سا ہوا آنکھوں میں.... کسی بجھی را کھ کی پر چھائیں ہو....

”تم آریانہ کو درمیان میں لائے بغیر بھی بحث جیت سکتی ہو عصرہ۔“ جیسے کوئی اداس ماتم سا ہوا آواز میں....

”میں تم سے جیتنا نہیں چاہتی۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں دان فاتح کہ تم اپنی arrogance کے خول سے باہر نکل کے دیکھو کہ تمہاری وجہ سے ہم سب کیا کچھ نہیں سہہ چکے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ منٹھیاں بھیجنے کر درد سے چلا رہی تھی۔ ”تم نے اپنے جنون کے ہاتھوں، ہم سب کو تباہ کر دیا ہے۔ آریانہ کو کھونا تمہاری غلطی تھی۔ میری بیٹی تمہاری وجہ سے مجھ سے دور ہوئی ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ اپنے بچے کو کھونا ایک ماں کے ساتھ کیا کر دیتا ہے۔“

وہ خاموش کھڑا رہا۔ بیٹنگر پہ لگی شرٹ بازوؤں میں تہہ کیے زخمی آنکھوں سے اسے دیکھ گیا۔

”مگر تم نہیں سمجھتے۔ تم نہیں بدلتے۔ میں ایک بھڑکتے جہنم میں رہ رہی ہوں، مجھے باہر نکلنا ہے اس سے۔ وہ نیلامی میں اپنے بچوں کو تمہارے جنون کی آگ سے نکالنے کے لئے کر رہی ہوں اور تم اس کو نقصان پہنچانے سے بھی باز نہیں آتے۔ میں تمہاری بیوی ہونے کی قیمت آخر کب تک ادا کرتی رہوں گی؟“

”مجھے بھی آریانہ کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے۔“ وہ زخمی سا بولا تھا۔

”تمہیں دکھ ہے اس کا؟ تمہیں تو شاید وہ یاد بھی نہیں آتی، وان فاتح۔“ وہ تنفر اور اذیت سے اسے دیکھ کے مڑی اور تیز تیز چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ فاتح نے آنکھیں بند کیں اور گہری سانس اندر کو کھینچی۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بیٹنگر پرے رکھ دیا۔ جیب سے والٹ نکالا اور آگے آیا۔ والٹ لیے وہ اسی کرسی پہ بیٹھا جہاں عصرہ پہلے بیٹھی تھی۔ جگہ ابھی تک گرم تھی۔ شاید وہ بہت دیر سے اس کے انتظار کی آگ میں جل رہی تھی۔

اس نے والٹ کی ایک تہہ پلٹائی تو سامنے فوٹو کے خانے میں ان دونوں کی تصویر لگی تھی۔ فاتح اور آریانہ۔ وہ دونوں اس میں ہنس رہے تھے۔ ننھی سی بچی جس نے ہینر بینڈ لگا رکھا تھا اور جس کی آنکھیں ہیروں جیسی چمکتی ہوئی تھیں۔

”نصیرہ یہ نہیں سمجھتی کہ اپنی بیٹی کو کھودینا ایک باپ کے ساتھ کیا کر دیتا ہے۔“ وہ تصویر پہ انگوٹھا پھیر کے ہلکا سا بڑبڑایا تھا۔ اذیت سی اذیت تھی جو دل میں اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔

بابر مہکتے گلابوں کی اداس خوشبو اب بھی سارے گھر سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

حالم کے گھر میں اس رات کسی نے کوئی جی نہیں جلائی۔ ایک سوگ سا تھا جس نے سارے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ داتن اندھیر زینوں پہ بیٹھی سامنے خلاء میں گھور رہی تھی جب پیچھے آہٹ ہوئی۔ دروازہ چرچرایا۔ پھر ننگے قدم اٹھانے کی ہلکی سی چاپ سنائی دی.... یا شاید آواز اس نے تصور کی تھی کیونکہ cat burglar بنا چاپ کے چلنے میں ماہر تھی۔

وہ اس کے پیچھے آرکی۔ داتن نہیں مڑی۔ یاسیت سے سامنے دیکھتی رہی۔

”کیا نہ!“ تالیہ نے دھیرے سے پکارا۔ آواز سنبھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

”تم ہر چیز سیکھنا چاہتی تھیں۔“ وہ اسی طرح سامنے دیکھتے ہوئے ٹوٹے دل سے بولی۔ ”کیا تمہیں یاد ہے تالیہ؟“

تالیہ کچھ نہیں بولی۔ اس سے پیچھے ایک زینہ اوپر بیٹھ گئی اور اسے بولنے دیا۔

”جب ہم نے تمہارے شوہر کے پیسے واپس کر کے اس سے تمہارے لیے طلاق لی تھی تو تم نے مجھے کہا تھا کہ اس شخص نے تمہیں دھوکہ دینا سکھا دیا ہے اور اب تم اسی طرح پیسے بنانے کے نئے طریقے سیکھنا چاہتی ہو۔ اسکام اور چوری کے طریقے۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے اسکام سے شروع کیا تھا۔ تم نے انٹرنیٹ پہ ایڈ ڈالا کہ اپنے سابقہ بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ یا میاں بیوی کا اکاؤنٹ ہیک کروانے کے لئے ہم سے رابطہ کریں۔“

تالیہ جو گھٹنوں پہ سر دیے بیٹھی تھی اس بات پہ بے اختیار ہنس دی۔ داتن نہیں ہنسی۔ بولتی گئی۔

”عشق اور جملن سے تڑپتے لوگ ہم سے رابطہ کرتے، ہم پیسے ایڈوانس مانگتے اور جب وہ پیسے دے دیتے تو ہم ان کی ای میلز کا جواب نہ دیتے۔ اب وہ پولیس کے پاس بھی نہیں جاسکتے تھے کہ کیا کہتے؟ کسی کا اکاؤنٹ ہیک کروانے جیسے غلط کام میں ملوث رہے ہیں؟ خود پکڑے جاتے سورو دھوکے چپ ہو جاتے۔ تم کہتی تھیں کہ اگر لوگ پیسے کی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ اس پیسے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ مگر جلد تم بور ہو گئیں۔“

اندھیر سیڑھیوں پہ وہ دونوں ہیولوں کی صورت بیٹھی نظر آتی تھیں۔ داتن کی آواز جیسے کسی پس منظر میں بیٹھے پیانو ساز کی مدھر لے جیسی سنائی دے رہی تھی۔

”ہم نے کرایے کا گھر لے لیا تھا، سر چھپانے کا ٹھکانہ تھا، دو وقت کا کھانا مل جاتا تھا مگر تم ناخوش تھیں۔ تم کہتی تھیں، داتن... دھوکہ دہی ایک آرٹ ہے اور آرٹ میں دھوکے کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ جس طریقے سے ہم لوٹ رہے ہیں اس میں لٹ جانے کے بعد لوگوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ یہ احساس میری ذہانت کی توہین ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے con games (فریب) کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ پھر ہم نے چھوٹی چھوٹی چوریاں شروع کیں۔ مالز میں، بازاروں میں عورتوں سے ٹکرا کے ان کے زیورات اٹار لیتے۔ تمہاری انگلیاں اس کام میں ماہر تھیں، مگر تم تب بھی خوش نہیں تھیں۔ تم کہتی تھیں کہ میں جزیرے پہ وہ اونچا قلعہ تو بنا لوں گی کسی نہ کسی طرح، مگر ابانت کے ساتھ نہیں۔ تمہیں مزید صفائی سے کام کرنا تھا۔ تب تم نے فیصلہ کیا کہ تم آرٹ thief بنو گی۔ کیٹ برگر۔ (جو بلی کی طرح کہیں بھی گھس کے بنا آہٹ کے کچھ چراتا ہے۔) تمہیں پینٹنگ کا شوق تھا مگر تم اسے کرنا نہیں جانتی تھیں۔ پھر تم آرٹ اسکول گئیں۔ تم نے پینٹ کرنا سیکھا۔ تم نے مختلف فن سیکھے۔ تم نے گن چلانا سیکھا۔ لڑنا سیکھا۔ تم نے خود کو کسی ہتھیار کی طرح تراشا۔“

تالیہ تھوڑی گھٹنوں پر رکھے محوی سے گئی جیسے شہر یار کو شہر زاد کسی خوبصورت رات میں الف لیلوی داستان سنا رہی ہو۔ جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو۔

”جب تم نے پہلی نقال تیار کی جس کو تم نے اصلی پینٹنگ کی جگہ رکھ کے اصل کو چراتا تھا تو میں وہ دیکھ کے مہبوت رہ گئی۔ وہ اتنی مکمل تھی کہ حد نہیں۔ میں نے تب تم سے پوچھا، تالیہ تم اتنا اچھا پینٹ کرنے لگ گئی ہو، تو تم اسی شعبے کو کیوں نہیں اپنا لیتی۔ تم نے کہا، داتن، اگر میں بہت اچھی پینٹنگ بھی بناؤں تو وہ دو تین ہزار سے زیادہ کی نہیں بکے گی۔ لیکن اگر میں کسی قدیم پینٹنگ کی نقل تیار کروں، اور بھرپور پلاننگ کے ساتھ اس کو اصل کی جگہ رکھ کے اصلی چرالوں تو اس اصلی پینٹنگ کو میں بلیک مارکیٹ میں پچاس ساٹھ لاکھ کا بیچ سکتی ہوں۔ کوالا پور بھرا پڑا ہے بے کار پینٹرز سے اور کوالا پور بھرا پڑا ہے چوروں سے، مگر آرٹ thief وہ ہوتا ہے جو یا تو کسی ماہر نقال کو اپنے ساتھ رکھے یا خود نقال پینٹ کرنا جانتا ہو۔ forger کے بغیر آرٹ حریف نہیں بن سکتی میں۔ اور کسی فورجر پہ اعتبار نہیں کر سکتی۔ مجھے خود فورجر ہی سیکھنی ہو گی۔ پھر تم نے پینٹنگز کے علاوہ دوسری چیزوں کی نقال بھی تیار کرنا شروع کیں۔ انعامی اسکیم، بلیک ٹکٹ، پرائز بونڈ، اور ہم امیر ہوتے گئے۔ تم نے ہر چیز سیکھی سوائے ایک چیز کے۔“ کہتے کہتے اس نے مڑ کے تالیہ کو دیکھا جواب اس کے ایک دم بات کو اندھے موڑ پہ لانے پہ چونک کے گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اور وہ ہے چوری کا فن۔ ہاتھ کی صفائی۔ یہ تمہیں ہمیشہ سے آتا تھا۔ مجھے نہیں آتا تھا۔ میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ ساری عمر ایک جیولری اسٹور اور ایک لائبریری میں کام کیا تھا۔ جب تمہیں جیولری چرانے کی ہوتی تو اس کی نقل تم نہیں تیار کر سکتی تھیں۔ وہ میں تیار کرتی۔ پھر ہم نے عالم کے نام سے کام شروع کر دیا، لوگوں کے لئے مسئلے کھڑے کرتے اور ان کو خود حل بھی کر دیتے۔ کبھی کسی کی پینٹنگ چرا کے خود ڈھونڈ لاتے۔ اصل رکھ کے نقل اس کو واپس کر دیتے۔ کبھی کسی سے انعامی اسکیم کے لیے پیسے بنورتے۔ تم نے بس چوری کا فن نہیں سیکھا اور میں

نے تو کچھ نہیں سیکھا سوائے ہاتھ کی صفائی اور چوری کے فن کے۔ یہ مجھے نہیں آتا تھا۔ تم نے مجھے سکھایا۔ تم گناہ رہنا چاہتی تھیں۔ اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی تھیں۔ کیونکہ تمہیں امید تھی ایک دن تم اچھی بن جاؤ گی۔ میں نے یہ ذمہ اپنے سر لے لیا۔ سوائے چند لوگوں کے تمہیں شہر میں کوئی بطور ایک چور کے نہیں جانتا۔ مگر میں نے اسٹریٹ کانٹیکٹس بنائے۔ میں نے بلیک مارکیٹ میں تعلقات استوار کیے۔ اور یوں ہم دونوں آرٹ اور جیولری چرانے کے ساتھ بطور حاملہ ان کے مالکان سے کنسلٹی فیس بھی لیتے تھے، ہم ماہر scammers بن گئے اور ہم نے مڑ کے نہیں دیکھا۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو، داتن؟“ اس بات پہ داتن نے سوگوار چہرہ موڑا اور ملال سے اسے دیکھا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ تم یہ راستہ چھوڑ سکتی ہو مگر ایسا ممکن نہیں ہے تالیہ۔ میں نے جانتی ہو، ہمیشہ اپنا چہرہ کیوں مخفی نہیں رکھا؟ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک دفعہ ہم اس دریا میں اتر جائیں تو واپسی کی کوئی کشتی نہیں بچے گی۔ تم کبھی پینٹر بن کے خوش نہیں رہ سکتی نہ میں لاہیرین بن کے۔ جب مجھے میرے بچوں نے چھوڑا... یا... جب میں نے ان کو چھوڑا کیونکہ جیولری اسٹور کو جوان کار میٹرل گئے تھے اور میں ایک بوجھ تھی تو میں نے لاہیرین کے ساتھ ایئر پورٹ پہ نوکری کر لی اور اولڈ ہوم آ گئی۔ لیکن جب بعد میں میرے پاس تمہاری وجہ سے دولت آنے لگی تو میں ہر ویک اینڈ پہ اپنے بچوں کے پاس جانے لگی۔ اب بھی جاتی ہوں۔ ان کے لئے قیمتی تحفے لے کر اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک لاہیرین ہوں مجھ سے میرا ذریعہ معاش نہیں پوچھتے۔ وہ اب میری قدر کرتے ہیں، بھلے جہاں سے بھی پیسہ آئے وہ خوش ہیں۔ میں بھی خوش ہوں کیونکہ میں ان پہ انحصار نہیں کرتی ان کے سامنے ایک مضبوط عورت ہوں میں، لیکن اگر میں یہ کام چھوڑ دوں تو میری قدر و قیمت وہاں ختم ہو جائے گی اس لئے میں کبھی بھی ”نیک“ نہیں ہونا چاہتی کیونکہ تالیہ... خون کے رشتے ہر ایک کے لئے کامل نہیں ہوتے۔ ہم جیسے لوگوں کی کہانیوں میں دوستی کا رشتہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔“

”آئی ایم سوری داتن۔“ اس نے پیچھے سے داتن کی گردن میں بازو لپیٹے اور اپنی تھوڑی اس کے کندھے پہ رکھ دی۔ ”میں اتنی ڈسٹرب تھی کہ میں بھولتی جا رہی تھی کہ میں کون ہوں اور کیا کرنے کی اہل ہوں۔ میں اپنی گیم سے باہر ہو رہی تھی مگر اب نہیں۔“ اس نے داتن کا سیاہ گال چوما اور پھر سیدھے ہو کر ایک عزم سے کھڑی ہوئی۔ دیوار پہ ہاتھ مارا اور لمحے بھر میں سارا گھر روشن ہو گیا۔ تیز روشنی سے داتن کی آنکھیں چندھیا گئیں اس نے فوراً ان پہ ہاتھ رکھا۔ پھر ذرا اٹھہر کے تالیہ کو دیکھا جو سینے پہ بازو لپیٹے اب سنبھلی ہوئی سی سامنے کھڑی تھی۔

”اب؟“ داتن نے ہمیشہ کی طرح اس سے پوچھا جو کہتی تھی کہ اس کے پاس ہمیشہ اگلا پلان ہوتا ہے۔

”اب ہم نے انتظار کرنا ہے۔ یا تو ایڈم کی بات پہ یقین کر کے عصرہ محمود تنگو کامل سے رابطہ کرے گی اور وہ سب میری تصدیق کر کے مجھے گرفتار کرنے یہاں آئیں گے۔ یا پھر عصرہ محمود اپنے اسٹاف کے ہاتھوں مجھے دعوت نامہ بھجوائیں گی۔ پہلی صورت میں ہمارا سامان بندھا ہوا پڑا ہوا اور ہم گنجل دیکھتے ہی شہر سے فرار ہو جائیں۔ اور دوسری صورت میں ہم کھیل جاری رکھیں۔“ داتن نے گہری سانس لی اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھی۔

”مگر کھیل ہے کیا تالیہ؟ تم نے بریسلٹ اتار کے واپس آ جانا تھا، نیلامی وغیرہ پہ تھوڑی جانا تھا۔“

”میں کھیل بدل رہی ہوں۔ پلان بی۔“ اس نے مسکرا کے موبائل ٹراؤزر کی جیب سے نکالا اور نمبر ملانے لگی۔ داتن نے اچنبھے سے اس کے سیاہ فون کو دیکھا جو حامل کا تھا۔

”یہ تم کس کو.....“

”السلام علیکم زین العابدین مولیا۔“ وہ بٹا شت سے بولی اور داتن کو دیکھ کے آنکھ دہائی۔ ”کیسے ہو مولیا؟ ابھی تک درختوں پہ بوجھ بنے ہوئے ہو؟ اوہ اچھوٹی۔ اس بات پہ غور نہ کرنا، میرے حس مزاج کا لیول تمہارے ذہن سے کافی بلند ہے۔ خیر.... میں نے اس لئے فون کیا کہ.....“ وہ اعتماد سے بولتی ہوئی مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور داتن نے تکان بھری سانس اندر کھینچی۔

بالآخر وہ کھیل میں واپس آ چکی تھی۔ اس کی یہی بات تو سب سے اچھی تھی۔ گو کہ سب کی طرح گرتی تھی مگر گرنے کے بعد ہنس کے کپڑے جھارتی اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

پلان بی.... داتن گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔ (مجھے یقین ہے کہ یہ پلان اس کے پاس پہلے نہیں تھا اور اس نے ابھی ابھی سوچا ہے مگر کبھی نہیں مانے گی۔ ہونہر۔) وہ بھی واپس گیم میں آرہی تھی۔

☆☆=====☆☆

جزیروں سے بنے ملک پہ اگلی صبح بھیگی بھیگی سی اتری۔ سیاہ بادل سورج کو جھانکنے تک نہیں دے رہے تھے۔ بس گرجتے اور چمکتے جا رہے تھے۔

ایسے میں قطار سے کھڑے اونچے محل اپنے سامنے سڑک پہ بھاگتے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو ٹراؤزر کے اوپر آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس، دوڑتا جا رہا تھا۔ کپٹی سے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بال گیلے ہو کے ماتھے پہ چپکے تھے۔ وہ دور سے جاگنگ کرتا آرہا تھا۔ اپنے گیٹ کے قریب آ کر رفتار سست ہوئی، ایک ہاتھ گیلے بالوں میں چلا کے ان کو پیچھے کیا اور ہینڈ زفری کانوں سے کھینچ نکالے۔

گارڈز نے اسے دیکھتے ہی راستہ کھول دیا۔

”فاتح صاحب!“ کسی نے تولیہ اچھالا جو اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے تھا اور اس سے چہرہ پونچھتا پورچ میں آگے چلتا گیا۔ لمبی جاگنگ سے چہرہ گلابی شفاف سا ہو رہا تھا اور تنفس تیز تھا۔

لاؤنج میں آ کر وہ میز تک رکا، جھک کے اخبار اٹھائی، الٹ پلٹ کر کے دیکھی، پھر سیدھا ہوا ہی تھا کہ سامنے ایڈم نظر آیا۔ وہ اس کی عینک بڑھائے ہوئے تھا۔

”جھینکس!“ فاتح نے اخباریں رول کیں، عینک تھامی اور آگے بڑھ گیا۔

”سر!“ اس نے جلدی سے پکارا، مگر وہ رکا نہیں۔ میزھیوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

”سرا شعر صاحب نے کہا ہے کہ آج میں ان خاتون سے معافی مانگنے جاؤں!“ بہت کر کے بلند آواز میں بولا۔

”کون سی خاتون ایڈم؟“ وہ زینے چڑھتے ہوئے اخباروں کو الٹا پلٹا کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

”وہ گیلری والی۔“ وہ رکاوٹ جلدی سے اضافہ کیا۔ ”سرا کیا مجھے ان سے معافی مانگنی چاہیے؟“

فاتح نے مطلوبہ میگزین نکال کے اوپر رکھا اور گردن موڑ کے ایک سادہ نظر اس پہ ڈالی۔ ”ایڈم ہر لفظ کے نتائج ہوتے ہیں۔ خاموشی کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنے کہے گئے الفاظ کے نتائج مرد بن کے بھگتا کرو۔“ اور اوپر چڑھتا گیا۔ ایڈم کا چہرہ مزید بھج گیا۔ (مگر میں نے ایسا کیا کہا تھا؟)

نیرس پہ اس کی کرسی پچھی رکھی تھی۔ ساتھ میز پہ جوس کا گلاس اور پھل۔ سب ترتیب سے تھا۔ مگر وہ ذرا چونکا۔ وہاں عصرہ بھی بیٹھی تھی۔ اسے آتے دیکھ کے عصرہ نے نظریں اٹھائیں تو ان میں اداسی تھی۔

”تم ادھر؟“ وہ نارمل انداز میں کہتا اپنی کرسی پہ آ کے ڈھیر ہوا اور جو گرز لمبے کر کے میز پہ قینچی کی صورت رکھ لیے۔

”آئی ایم سوری۔ میں کل رات کچھ زیادہ بول گئی۔“

”ہاں تم کل رات کچھ زیادہ ہی بول گئیں۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہتے ہوئے سر کو خم دیا اور اخبار سینے پہ رکھ کے بازوؤں کا تکیہ بنا کے سران پہ نکالیا۔ اب اس کی آنکھیں توجہ سے عصرہ پہ جمی تھیں۔ بھورے بالوں کی پونی بنائے اسکرٹ بلاؤز کے اوپر سفید رنگ کا دوپٹہ کندھوں کے گرد لپیٹے ایک ہتھیلی پہ چہرہ نکائے وہ اداس نظر آتی تھی۔

”میں اندر سے دکھی ہوں فاتح۔ میرے زخم نہیں بھرتے۔ اور میں تمہارا بھی دل دکھا دیتی ہوں۔“

”اور تم سمجھتی ہو کہ میرے زخم بھر چکے ہیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”کیا نہیں بھرے؟“

”میں اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار نہیں کرتا عصرہ!“ وہ نیم دراز بازوؤں کے تکیے پہ سر رکھے اسے سامنے بیٹھے دیکھ کے رسان سے

بولتا گیا۔ ”ان کو سی کے آگے بڑھ جاتا ہوں مگر جس کھڑکی سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں، تم نے وہ کھڑکی بند کر رکھی ہے۔“

”فاتح.... تم....“

”عصرہ، یہ دنیا ماضی میں جینے والوں کے لئے نہیں ہے۔ وہ میری بھی بیٹی تھی، مجھے بھی دکھ ہے اس کا مگر اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی۔

میں پچھتاؤوں پہ یقین نہیں رکھتا۔ میں ماضی میں نہیں رہتا۔ میں آگے کا سوچتا ہوں۔ جبکہ تم....“ اس نے گہری سانس خارج کی۔ ”تم ہمیشہ

ماضی میں جیتی ہو۔ اب نکل آؤ ماضی سے عصرہ۔ یہ دنیا بہادر اور daring لوگوں کے لئے ہے، جو آگے بڑھیں اور اس کو اپنی مثبت سوچ سے

فتح کر لیں۔ یہ دنیا امید رکھنے اور خواب دیکھنے والوں کی ہے۔ بہت سی عورتیں گرتی ہیں عصرہ اور بہت سی گر کے اٹھتی ہیں، مگر جیتی صرف وہ

ہیں جو ہنس کے اٹھنے والی ہوں۔ مگر میں تم سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم تھوڑی سی کوشش کرو تو ایک دن تم بھی حال میں جینے

والی بن جاؤ گی۔“ وہ بات کے اختتام پہ مسکرایا تھا۔ سیاہ بادلوں کے جھروکے سے چند آوارہ کرنیں ٹیرس پہ پڑ رہی تھیں، اور اس کے چہرے کو روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہاں امید، نرمی، سکون سب کچھ تھا۔ عصرہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اور پھر اسکے ہاتھ پہ دونوں ہاتھ رکھے۔

”مجھے مستقبل ڈراتا ہے فاتح۔“ وہ بولی تو آواز کانپ رہی تھی۔ ”تمہیں کھونے کا ڈر۔ اپنے بچوں کے رل جانے کا خوف۔ میرے دل کو سمجھو فاتح۔ ملائیشیا کا ہمارے بغیر کچھ نہیں بگڑے گا مگر ہم ٹوٹ جائیں گے۔ میں تمہارے لئے ڈرتی ہوں۔ تم یہ ایکشن نہیں جیت پاؤ گے اور جب ہارو گے تو تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ جانتی ہوں کہ تم مضبوط ہو، بہادر ہو، اپنے دکھ بتاتے نہیں ہو مگر میں تمہیں ضائع ہوتے نہیں دیکھ پاؤں گی۔“

”یہی فرق ہے ہم میں عصرہ۔“ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے گال پہ رکھ کے اس کا چہرہ تھپکا۔ ”تم یہ سوچتی ہو کہ کہیں میں ہار نہ جاؤں۔ اور میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے جیتنا کیسے ہے۔“ پھر اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے اخبار کھول کے چہرے کے سامنے کیا اور عینک آنکھوں پہ جمائی۔ عصرہ نے گہری سانس لی اور سر جھٹکا۔ وہ اس شخص کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

”جس پی لو۔ گرم ہو جائے گا۔“ اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا اور اٹھ گئی۔ فاتح نے اخبار پہ نظریں جمائے ”تھینکس“ کہا۔ عصرہ نے چند قدم اٹھائے پھر ٹھہری۔

”بس ایک بات مجھے پرسکون کرتی ہے کہ آریانا زندہ ہے۔ وہ مری نہیں ہے۔ کسی کو مل گئی ہوگی وہ۔ کسی اچھے گھرانے میں تربیت پا رہی ہوگی۔ میں مرجاتی فاتح اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی کہ وہ کبھی نہ کبھی ہمیں واپس مل سکے گی۔ تمہارے خواب بہتر ملائیشیا کے ہیں، میرے آریانا کے ہیں۔ اور اس خواب نے میری ہر کھڑکی کے آگے پردے ڈال دیے ہیں۔ تم اس کو ”آریانا تھی“ کہہ کے بلاتے ہو، اور میں اس کو ”آریانا نہ ہے“ کہہ کے سوچتی ہوں۔ یہی فرق ہے ہم میں، وان فاتح!“ کھڑے کھڑے اس کو دیکھے بنا وہ کہتی گئی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

وہ اخبار پڑھتا رہا۔ بادلوں نے پھر سے سورج کو چھپا لیا تو اس کا روشن چہرہ چھایا میں چلا گیا۔ ٹھنڈی سرمئی چھایا۔

☆☆=====☆☆

حالم کا اونچا بنگلہ بھی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بالائی منزل کے ہال کی شیشے کی دیوار سے وہ نیچے دیکھ رہی تھی جہاں ایک کار کھڑی تھی اور ایک آدمی نکل کے گھنٹی بج رہا تھا۔

”کیا خیال ہے؟“ داتن اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی۔ ”ہم آج رات کا کھانا کون سے تھانے میں کھائیں گے؟“

”وہ اس باڈی مین کو ساتھ لائے ہیں۔“ وہ سنجیدہ سی نیچے نظریں جمائے بولنے لگی۔ ”ڈرائیور نہ گھڑی کو دیکھ رہا ہے، نہ آگے پیچھے۔ نہ اسے جلدی ہے نہ وہ کسی کو چھپا کے ساتھ لایا ہے۔ بار بار گیٹ کی دھات میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ یعنی اسے بہت ہدایت کے ساتھ خود کو بہترین پوز کرنے کا کہا گیا ہے۔ اپنے کوٹ کی جیب کو بھی تھپتھپاتا ہے، یعنی اندر کچھ ہے۔ یقیناً دعوت نامہ۔“ پھر اطمینان سے داتن کی

طرف کھوی۔ ”ہم نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ ہمارا شکار hook بھی ہو چکا ہے۔“

چند منٹ بعد تالیہ کی ایک جزوقتی ملازمت ان دو افراد کو اندر لارہی تھی۔ رٹلی طائرانہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا قدم اٹھا رہا تھا گویا آنکھوں سے ہر شے کی مالیت کا اندازہ کرنا چاہ رہا ہو جبکہ ایڈم بجا بجا مگر سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ دونوں ڈرائیونگ روم کے صوفے پہ بیٹھ گئے تو بٹر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد دروازے پہ آہٹ محسوس ہوئی۔ دونوں بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ لمبی اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس، پیشانی پہ بل لئے، سینے پہ بازو لپیٹے وہ ان کے سامنے آٹھبرہی۔ ناقدانہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

”جی؟“ ماتھے پہ مصروفیت اور اکتاہٹ سے بھری شکن تھی۔ ایڈم نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ اتنی خوبصورت، طرح دار اور با اثر لڑکی جس کے کانوں کے چمکتے ہیرے نگاہیں خیرہ کر رہے تھے.... یہ وہ تھی یا نہیں؟ اس کا دل شک میں پڑنے لگا۔ پیچھے دیوار پہ اس کی فوٹو فریم میں تصویر بھی لگی تھی۔

”میڈم۔ کل آپ گیلری سے خفا ہو کر آئی تھیں، ہمیں باس نے بھیجا ہے تاکہ آپ کی غلط فہمی دور کی جاسکے۔“

”یہ!“ تالیہ نے چونک کے ایڈم کی طرف انگلی اٹھائی، اور جیسے ذہن پہ زور دیا۔ ”یہ مسز عصرہ کا وہی ملازم ہے نا جس نے کل مجھ پہ نعرے کسے تھے۔ یا اللہ.... اور آپ اس کو میرے گھر لے آئے۔“ خوبصورت آنکھیں برہمی سے سرخ پڑنے لگیں تو رٹلی جلدی سے بولا۔

”یہ معذرت کرنے آیا ہے، مادام۔ اس سے غلطی سے ہوا جو بھی ہوا۔“ ساتھ ہی ایڈم کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (معافی مانگو) ایڈم نے پہلے اسے دیکھا، پھر تالیہ کو۔ ایک قدم آگے آیا۔ اس کے عین سامنے۔

”انسان کے ہر لفظ کے نتائج ہوتے ہیں چہ تالیہ۔ خاموشی کے بھی۔ مجھے قطعاً یہ حق حاصل نہ تھا کہ میں سر راہ کسی خاتون کو روک کر ان کو کسی سے تشبیہ دوں۔ آپ وہ تھیں یا نہیں، مجھے بغیر کسی تعارف کے یوں بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔“ اپنی پوری دیانتداری اور دل کی سچائی سے وہ بولا اور جیسے اس کا دل شانت ہو گیا۔

وہ اسی طرح اس کو دیکھتی رہی۔ تند و تیز نگاہوں سے۔ جیسے اس کے الفاظ کو تول رہی ہو۔ پھر رٹلی کو دیکھا اور گہری سانس لی۔

”ہوں.... ٹھیک ہے۔ میں نے معذرت قبول کی۔ اور کچھ۔“

”میم! اگر آپ نے دعوت نامہ قبول نہیں کیا اور نیلامی پہ نہیں آئیں تو اس بچے کی نوکری چلی جائے گی۔ اس کو اس نوکری کی اشد ضرورت ہے اور مسز عصرہ اس کو معاف نہیں کریں گی۔“ دعوت نامہ کوٹ سے نکال کے رٹلی نے سامنے رکھا اور لجا جت سے بولا تو ایڈم کی آنکھوں میں جہاں حیرت ابھری وہاں اہانت کا احساس بھی ہلکے سے لینے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، تالیہ نے تحکم سے کہا۔

”باس کو کال ملاؤ۔“ رٹلی نے فوراً فون لگایا اور بولا۔ ”سر.... چہ تالیہ بات کرنا چاہتی ہیں۔“ اور فون تالیہ کو پیش کیا۔

”تالیہ مراد بات کر رہی ہوں۔ اوہ آپ؟ میں مسز عصرہ کی توقع کر رہی تھی۔“ وہ فون کان سے لگائے حیران ہوئی۔

”ایک ہی بات ہے۔ چے تالیہ۔“ وہ شائستگی سے جواباً کہہ رہا تھا۔ ”آپ عصرہ اور میری کلائنٹ نہیں، مہمان تھیں اور ہماری مہمان کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر ہماری مہمان نوازی ٹھکرا دے، یہ ہمارے خاندان کے لئے تکلیف کی بات ہے۔“

”میں خود بھی معذرت خواہ ہوں اشعر صاحب۔“ اس کو نرم پڑتا دیکھ کے رٹی کی سانس بحال ہوئی۔ ”یہ تو بچہ ہے، بھول چوک میں کچھ بول گیا تو مجھے ہی بڑے پن کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مگر آپ کے اس قدم نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔“

”گڈ۔ میں عصرہ کو آگاہ کر دوں گا کہ ان کی مہمان نے مہمان نوازی قبول کر لی۔“

”میں شکر گزار ہوں، سر!“ اور فون واپس کر دیا۔ پھر فرصت سے ان دونوں کو دیکھا۔ بالخصوص ایڈم کو۔

”بے فکر ہو۔ تمہاری نوکری نہیں جائے گی۔“ ادائے بے نیازی سے ہاتھ جھلا کے گویا تخیل کا اشارہ کیا تو ایڈم کے ابرو بھنج گئے۔

”تھینک یو، مگر مجھے یہ نوکری مستقل کرنی ہی نہیں ہے۔ میں صرف گیارہ دن کے لیے متبادل کے طور پر آیا ہوں، چے تالیہ۔“ رٹی نے گڑبڑا کے اسے گھورا، مگر وہ اسی طرح تالیہ کی آنکھوں میں دیکھتا رہا (یہ وہی ہے۔ یہ آنکھیں.... ان کے تاثرات.... وہی ہیں۔)

اور وہ.... وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھہری گئی۔ دم بخود۔ ساکن.....

نگاہوں کے سامنے منظر بدلا.... ایک جھلی پہ گویا فلم سی چلنے لگی.....

رات کا سیاہ آسمان تھا.... چاند چمک رہا تھا.... پہاڑی کا راستہ دشوار گزار اور پتھر یلا تھا.... اونچا نیچا.... اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے.... تالیہ آگے تھی.... ایڈم پیچھے تھا.... لباس اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا.... بس تاریکی میں گویا دو ہیولے تھے جو اوپر چڑھتے جاتے۔

”چے تالیہ....“ وہ پیچھے سے ہانپتا ہوا بولا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”کیا ایڈم!“

”آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟“

”میں ہم دونوں کو بہت امیر کرنے جا رہی ہوں ایڈم!“ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

”کیسے؟“ وہ پلٹی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تاشہ کے خزانے سے جسے ہم دونوں کھود کے نکالیں گے۔“

”کیا؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”کیا تم اب بھی نہیں سمجھتے ایڈم کہ تاشہ نے اس دیوار پہ وہ نظم کیوں لکھی تھی؟“ وہ مسکرائی۔

”کیوں؟“

”تاکہ ایڈم اور تالیہ اس دیوار تک جائیں اور وہاں مدفن خزانے کے راز کو کھود نکالیں۔ ہم دنیا کے سب سے طاقتور لوگ بن جائیں گے“

”ایڈم۔“

”اور وان فاتح؟“ وہ پوچھ رہا تھا مگر تصویر دھندلی پڑتی گئی.....

”ہمیں اجازت!“ رلی کی آواز نے اسے حال میں واپس کھینچا تو وہ چونکی۔ بس لمحے بھر کا اثر تھا اور وہ سنبھل گئی۔ پھر دوبارہ ایڈم کو دیکھا۔ اب کی دفعہ نگاہ مختلف تھی۔ حیران۔ متحیر۔ وہ البتہ مرعوب ہو کر نظر جھکا چکا تھا، مبادا مزید کوئی مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔

”ہوں!“ اس نے ہاتھ سے درخواست ہونے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں پلٹ گئے۔

ان کے باہر نکلتے ہی داتن کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا، وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی ہے۔ داتن نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ ”کیا وہ پولیس کو لینے گئے ہیں؟“

تالیہ نے ماتھے سے ہاتھ ہٹائے اور سر اٹھا کے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”داتن.... ایک خزانہ ہے کہیں۔“

”میری پیاری بچی... میں جانتی ہوں تم مجھے کسی خزانے سے کم نہیں سمجھتیں، مگر....“

”تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔“ وہ جھنجھلا کے کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی شاہزادیوں والی شان اب نثار دیتی تھی۔

”میری بات سنو۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”جاتے وقت ایڈم نے لابی میں لگی تمہاری تصاویر میں سے ایک کو چپکے سے موبائل پہ

اتارا ہے تالیہ۔“

”ظاہر ہے اس نے یہ کرنا تھا۔ اس کا حل ہے میرے پاس۔ تم فی الحال میرے ساتھ پلان بی کی تیاری کرواؤ۔“ وہ اس موٹی مرغی کو کندھوں سے پکڑ کے ڈھکیل کے باہر لے جانے لگی۔

رلی کا رچلا رہا تھا اور ایڈم موبائل اسکرین کو اس کی نظروں سے بچا کے وہ تصویر غور سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں الجھن بھری گہری سوچ پنہاں تھی۔ (یہ وہی تھی۔ یا شاید نہیں تھی؟)

☆☆=====☆☆

کوالا پور کی وہ تگن شیشوں سے ڈھکی عمارت بادلوں کو سر اٹھا کے دیکھ رہی تھی جو دھیرے دھیرے اس پہ قطرے پڑ رہے تھے۔ بوندا باندی کافی دیر سے جاری تھی۔ عمارت کے اندر پارٹی کے آفس فلور پہ معمول کی چہل پہل جاری تھی۔ راہداریوں میں پارٹی ورکر آ جا رہے تھے۔ کام چل رہا تھا۔ ایسے میں ایڈم فاتح کے آفس کے باہر بے کار سا بیٹھا تھا۔ سر جھکا اور چہرہ بجھا ہوا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہوا۔

فاتح کوٹ پہنچے ہوئے باہر نکل رہا تھا، ساتھ میں چلتے شخص سے بات بھی کر رہا تھا۔ گرے سوٹ، سفید شرٹ، نائی اور ہلکے گیلے بال جو وہ دائیں جانب کو سنوار کے پیچھے کرتا تھا... اور اس پہ مسکراتا چہرہ.... کسی بات پہ ہلکا سا ہنس کے وہ ساتھ موجود شخص کو جواب دے رہا تھا.... وہ ایڈم کی طرف متوجہ نہیں تھا اور ایڈم صرف اس کی طرف متوجہ تھا۔ گزشتہ روز اس امیر زادی کے ہاں ماتھا ٹیکنے کی ساری کلفت دور ہونے لگی۔ وہ شخص آگے بڑھ گیا اور فاتح کوٹ کا کار سامنے سے برابر کرتا مڑا تو ایڈم پہ نظر پڑی۔ ”ہاں ایڈم.... کیا حال ہے تمہارا؟“ آنکھوں میں

مسکراہٹ لئے نرمی سے پوچھا اور بٹن کو ہول میں ڈال کے بند کیا۔

”فٹ سر!“ وہ تازہ دم سا ہو کے مسکرایا۔

”گڈ۔ مجھے پارلیمنٹ جانا ہے اور مجھے کافی چاہیے۔ میرے کار میں پہنچنے تک لے آؤ ورنہ میں تمہارے بغیر جا رہا ہوں۔“ نرم لہجے سے بات شروع کر کے آخر میں تنبیہ کی اور مڑ گیا۔ ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ بے ساختہ اس نے دوسری جانب دوڑ لگائی تھی۔

بارش ٹپ ٹپ برس رہی تھی جب فاتح سڑک پہ کھڑی کار میں بیٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈرائیور نے اوپر چھتری تان رکھی تھی۔ فاتح نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ اسی پل بھاگتا اور بھگتا ایڈم کھڑکی تک آیا اور ایک کافی گلاس جس میں اسٹرا لگا تھا فاتح کی طرف بڑھایا۔

اس نے گلاس پکڑا اور اپنی چمکدار آنکھیں اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔

”وان فاتح پارلیمنٹ سیشن میں ہمیشہ دو کپ کافی پیتا ہے۔“

”اسی لئے میں دو کپ لایا ہوں سر۔“ اس نے دوسرا ہاتھ اٹھا کے ایک اور گلاس دکھایا تو فاتح کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلی۔ شیشہ اوپر کر دیا

اور کپ لبوں سے لگائے اپنی کوئی فائل کھول کے دیکھنے لگا۔ ایڈم دوسرا گلاس پکڑے فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھا۔

بارش تیز ہو رہی تھی۔ کار سڑک پہ رواں دواں تھی اور وہ عینک ناک پہ جمائے اپنی فائل پڑھ رہا تھا۔

”میں کچھ...“ ایڈم نے پوچھتے پوچھتے شیشے میں دیکھا مگر اسے محو دیکھ کے چپ ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایک ناگوار نظر ایڈم پہ ڈالی۔

”نپو چھو ایڈم!“ فاتح نے آخری صفحہ پلٹا یا اور فائل بند کر دی۔ پھر عینک اتار کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”کیا پھر عبدالمطلب کو اللہ نے دس بیٹے دیے؟“ وہ اس دن کے ادھورے قصے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

وہ عینک کے ہینڈل کا کوندانتوں میں دبائے اس کی بات سن کے مسکرایا۔ نظریں کھڑکی کے باہر جمی تھیں۔

”ایڈم انسان شدید تکلیف کی حالت میں اللہ سے جب کسی سودے کا وعدہ کر لیتا ہے تو آرمایا بھی جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی قسمت

بدل جاتی ہے۔ وہ چیز اس کو پہلے بھی ملنی تھی مگر وعدے کے باعث وہ اس کی قوت ارادی کی آزمائش بن جاتی ہے۔“

”عبدالمطلب کی قوت ارادی کیسی تھی؟“

”میرے اور تمہارے سے بہتر تھی۔ اس وقت ان کا ایک ہی بیٹا تھا پھر اللہ نے ان کو کئی بیٹے دیے۔ دس یا شاید اس سے بھی

زیادہ۔ جب وہ جوان ہوئے اور اپنا بہترین ورژن بن گئے تو عبدالمطلب نے وعدہ نبھانے کا سوچا۔ وہ ہماری طرح اللہ کے لیے کم ترین

نہیں دیتے تھے۔ بہترین دیتے تھے۔ سو انہوں نے قرعہ ڈالا اور وہ عبد اللہ کے نام نکلا۔“

ایڈم نے چونک کے گردن موڑی۔ ”ہمارے رسول اللہ ﷺ کے والد کا؟“

”ہاں۔“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گردن اثبات میں ہلائی۔ نظریں دور بھیگتے شہر پہ جمی تھیں۔ ”مگر عبد اللہ کے ماموں وغیرہ

آڑے آگئے اور کہا کہ اس کو قربان نہیں ہونے دیں گے مگر عبدالمطلب وعدے کے سچے تھے۔ ایک آدمی جو اتنے برس ایک وعدے کے

ساتھ جیا ہو وہ خائن نہیں ہوتا۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ انگلی سے تھوڑی کوزرا کھرچا۔ نظریں باہر ثبت تھیں۔
 ”تو کیا انہوں نے عبد اللہ کو قربان کر دیا؟“

”نہیں۔ وہ ایک کاہنہ عورت کے پاس معاملہ لے گئے تو اس نے کہا کہ ایک پرچی پہ عبد اللہ کا نام لکھو اور دوسری پہ دس اونٹ، پھر قرعہ نکالو۔ ایسا ہی کیا تو پھر سے عبد اللہ کا نام نکلا۔ وہ بولی، اونٹ بڑھاتے جاؤ، یہاں تک کہ اللہ راضی ہو جائے۔ سو وہ لوگ اونٹوں کی تعداد بڑھاتے گئے۔ ہر دفعہ عبد اللہ کا نام نکلتا یہاں تک کہ سو اونٹ کی پرچی ڈالی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ سو عبد المطلب نے گمان کیا کہ اللہ راضی ہے، اور سو اونٹ قربان کیے۔ عبد اللہ کو بچالیا گیا اور تب سے آج تک مسلمانوں میں ایک انسان کی دیت سو اونٹ مقرر ہے۔ تب ہی ہمارے رسول اللہ ﷺ خود کو دو ذبیحوں کی اولاد کہتے تھے۔“

”اسمعیل علیہ السلام اور عبد اللہ جن کو ذبح ہونے سے بچالیا گیا۔ صحیح!“ وہ سر ہلا کے سمجھتے ہوئے بولا تھا۔ پھر ٹھہرا۔ وند اسکرین کے پار دیکھا جہاں بارش کے قطرے مسلسل گر رہے تھے اور اوپر زروانی سے چل رہے تھے۔

”مگر وعدہ تو پورا نہیں کیا عبد المطلب نے۔ آخر میں کفارہ ہی دیا۔ پھر اتنے برس کے وعدے کا کیا فائدہ ہوا۔“

”اللہ تعالیٰ سے انسان فائدے نقصان کے لئے کمٹمنٹ نہیں کرتا۔ اپنے اور اللہ کے اعتبار کے تعلق کو مضبوط کرنے کے لئے کرتا ہے۔ ہم اللہ سے وعدے کر کے چند دن میں ہی انہیں توڑ دیتے ہیں مگر تمہیں ایڈم، عبد المطلب کو یا درکھنا چاہیے جنہوں نے کئی برس اپنے وعدے کو پال پوس کے جوان کیا۔ اگر تم اللہ سے کوئی وعدہ کر لیتے ہو اور مقررہ گھڑی کے قریب آنے پہ تمہارا دل کمزور پڑنے لگ جائے، تب بھی اس وعدے کو نبھانے کی کوشش کیا کرو۔ اللہ کو تم سے کوئی چیز چھین لینا مقصود نہیں ہے، وہ صرف تمہیں کھودینے کے خوف اور پالینے کے لالچ سے آزاد کر کے ایک مضبوط انسان بنانا چاہتا ہے۔ ہم اپنے وعدوں کو جتنا زیادہ نبھائیں گے اتنے ہی مضبوط بنیں گے۔ اور آخر میں اللہ خود ہی کوئی راہ نکال کے ہمیں ہماری محبوب شے لوٹا دے گا۔ عبد المطلب کو مضبوط بننے کے لئے دس بیٹے چاہیے تھے۔ لیکن کیا تمہیں نہیں لگتا ایڈم کہ ان کو دس بیٹوں سے زیادہ ان کے وعدوں نے مضبوط کیا تھا؟“ کہہ کے اس نے گلاس لیوں سے لگایا، کافی کا آخری گھونٹ اندر انڈیلا اور گلاس سائیڈ بن میں ڈال دیا۔ ایڈم نے جواب دینے کی بجائے دوسرا گلاس اس کی طرف بڑھایا، جسے اس نے تھاما، ہونٹوں تک لے کر گیا، پھر ذرا اوپر کیا۔ خوشبو اندر اتاری اور چونک کے فرنٹ سیٹ کی طرف دیکھا۔

”یہ میری کافی نہیں ہے۔ شاید یہ تم اپنے لئے لائے تھے۔“ اور بغیر پیے گلاس آگے بنے اسٹینڈ میں اٹکا دیا۔ ایڈم نے سخت شرمندگی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اب اس گلاس کو اٹھاتا۔

فاتح اسی طرح کھڑکی سے باہر دور تک پھیلی عمارتوں کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیکے چلی جا رہی تھیں۔

☆☆=====☆☆

پارلیمنٹ ہاؤس وسیع و عریض اور روشنیوں سے منور تھا۔ دور دور تک ممبران کے ڈیسک اور کرسیاں بچھی تھیں جن پہ ان کی فائلز، مائیک

وغیرہ سچے تھے۔ مرکزی چبوترے پہ اونچی کرسی پہ اسمبلی کا سپیکر بیٹھا تھا اور عینک ناک پہ جمائے، نیچے کھڑے تقریر کرتے ممبر کو دیکھ رہا تھا۔

ہال کے اوپر... کافی اوپر بالکونی بنی تھی۔ وہاں سینما گھروں کی طرف کرسیاں اوپر تک لگی تھیں جہاں لوگ بیٹھ کے پارلیمنٹ کی کارروائی دیکھتے تھے۔ عموماً لوگ کرسیوں پہ بیٹھے ہوتے تھے، مگر وہ گیلری میں ریلنگ کے ساتھ کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ سنہرے بال فرنج چوٹی میں گوندھے، وہ سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز کے اوپر سیاہ منی کوٹ پہنے ہوئے تھی اور سر پہ ترچھا کر کے سفید ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ سفید گلابی چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

نیچے ممبران معمول کے انداز میں بیٹھے تھے۔ کچھ آپس میں بات کر رہے تھے، کچھ اپنے لیپ ٹاپس پہ ٹائپ کر رہے تھے اور زیادہ تر تقریر کرتے فاتح کو سن رہے تھے۔ تالیہ یہاں سے اس کی پشت دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ پہ کھڑا، اسپیکر کی طرف رخ کیے بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

”مجھے آج افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ملے پارلیمنٹ نے میرا ایجوکیشن بل نامنظور کر دیا ہے۔ تو ان اسپیکر (جناب اسپیکر) ہم اس بل کے ذریعے تعلیمی شعبے میں وہ اصلاحات متعارف کروانا چاہتے تھے جو...“

تالیہ بوری ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ قانون سازی کی خشک باتوں سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ دوسرے مقصد کے لئے آئی تھی۔ گردن آگے پیچھے گھمائی تو ٹھہری۔ فاصلے پہ ایڈم کھڑا تھا۔ توجہ سے تقریر کرتے وان فاتح کا ایک ایک لفظ سنتا ہوا۔ وہ بور نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نامحسوس طریقے سے اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ جانے کس احساس کے تحت ایڈم نے یونہی گردن موڑی تو اسے دیکھ کے چونکا۔

”آپ یہاں؟“ تالیہ چونکی۔ پھر اسے دیکھ کے مشکوک نظر آنے لگی۔

”تم میرا پیچھا تو نہیں کر رہے؟ اور بعد میں اس پہ معافی مانگ لو گے؟“

”نہیں نہیں...“ وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگا۔ ”میں تو وان فاتح کے ساتھ آیا ہوں۔“

”ہوں!“ وہ کروفر سے ہنکارا بھر کے گردن واپس موڑ گئی اور سنجیدگی سے نیچے دیکھنے لگی۔ البتہ ایڈم کا دھیان بٹ چکا تھا۔

”آپ یہاں کیسے؟“

”اشعر صاحب کہاں ہیں؟“ وہ نیچے دیکھتے ہوئے خشکی سے بولی۔

”وہ نیچے بیٹھے ہیں۔ وان فاتح کے پیچھے۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

”ابھی لنچ بریک ہوگی تو میں آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ اسی راستے سے باہر نکلیں گے۔“ وہ اشارہ کر کے سمجھانے لگا، پھر ایک

غیر آرام دہ نظر اس پہ ڈالی۔ ”آپ نیلامی پہ آئیں گی نا۔“ اسے دیکھ کے اندیشہ سا ہوا کہ پھر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔

”ظاہر ہے بچے۔ میں نے کل کہا تھا تا میں نے تمہیں معاف کیا۔“

”مگر میں نے آپ کو بد صورت نہیں کہا تھا۔ پلیز مجھے وضاحت کرنے دیں۔ میں نے آپ کی شکل کی ایک لڑکی دیکھی تھی کسی کے گھر میں سمجھا وہ آپ ہیں۔“

تالیہ پوری اس کی طرف گھومی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”تو کیا وہ میں ہوں؟“

ایڈم اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ بس ایک نظر انہیں دیکھا اور شک و شبہ رفع ہونے لگا۔ یہ وہ نہیں تھی۔ اس نوکرانی کی تو شکل بھی اب اسے بھوتی جا رہی تھی۔

”نہیں۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ سوری۔“ سچائی سے اس نے نظریں جھکا کے اعتراف کیا۔

”دلچسپ بات یہ ہے جناب اسپیکر کہ اس وقت اسمبلی میں آدھے سے زیادہ لوگ میری بات کو غیر اہم جان کے صرف لچ بڑیک کا انتظار کر رہے ہیں۔ باقی آدھے سو رہے ہیں۔“ اس نے ایک دم تقریر کا کاغذ ڈیسک پہ پٹخا اور اونچی آواز میں بولا تو وہ دونوں چونک کے متوجہ ہوئے۔ ہال میں چلتی سرگوشیوں میں کمی آئی۔ سنانا چھانے لگا۔

وان فاتح اپنی جگہ پہ کھڑا اسپیکر کو دیکھ کے دبے دبے غصے سے بول رہا تھا۔ گرے سوٹ اور دائیں طرف کو پیچھے کر کے جمائے بالوں کے برعکس اس کی آواز آج قابو میں نہیں لگ رہی تھی۔

”کیونکہ ان کو تعلیم کی باتیں بورنگ لگتی ہیں۔ کیونکہ ان باتوں کا زلٹ اگلے الیکشن تک نہیں ملتا۔ مگر اونچی عمارتوں اور لمبی سڑکوں کا مل جاتا ہے۔ شہر میں نئے پھول لگانے اور نئے پارک بنانے کا بھی مل جاتا ہے۔ سیاستدان ہمیشہ اگلے الیکشن کا سوچتا ہے، مگر لیڈر اگلی نسل کا سوچا کرتا ہے، سر! وان فاتح یہ بل اس لئے پاس کروانا چاہتا تھا کیونکہ وان فاتح اس وقت کا بھی سوچ رہا تھا جب وہ خود مرچکا ہوگا مگر ملایشیا کے بچے آج سے زیادہ مشکل حالات میں ہوں گے۔“ اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے جھک کے ڈیسک دو دفعہ بجایا تو سارے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ اشعر خاموشی سے پیچھے بیٹھاس رہا تھا۔

”ٹھیک ہے میں وزیراعظم صاحبہ کی پارٹی میں سے نہیں ہوں!“ اس نے ہاتھ اٹھا کے کافی فاصلے پہ اگلی قطار میں بیٹھی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے گردن اونچی کی۔ سفید اسکارف اوڑھے وزیراعظم فرنٹ پہ بیٹھی تھی اور یہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ ”مگر میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بچے میرے اور ان کے ہم سب کے نہیں تھے؟ کیا ہم مل کے سیاسی اختلافات کو بھلا کے اپنے بچوں کے لئے ایک پلیٹ فارم پہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ صرف اس لئے کہ وان فاتح نے تعلیم کے نام پہ ووٹ لیا ہے، میڈم وزیراعظم نے میرے وعدے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اس بل کو نا منظور کروایا۔ مگر مجھے آپ کو وعدوں کے متعلق ایک بات بتانے دیجئے۔“ وہ برہمی سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔ نظریں وزیراعظم کی کرسی پہ تھیں جس نے مڑ کے اسے دیکھا تک نہیں۔ بنا اثر لیے سامنے دیکھتی رہی۔

”چونکہ وزیراعظم صاحبہ کو وعدے پورے کرنے کی عادت نہیں ہے اور وہ ہمیشہ لینے پہ یقین رکھتی ہیں، دینے پہ نہیں اس لئے وہ اس بات

سے ناواقف ہیں کہ کچھ لوگ اپنے وعدوں کی پاسداری کے لئے اپنی قیمتی متاع کو بھی ذبح کر دیتے ہیں اور آپ کے لئے بری خبر یہ ہے کہ وان فاتح ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ مجھے کہا جاتا ہے کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں، میری پارٹی تک میرے ساتھ نہیں کھڑی۔ جیسے وان فاتح کو اس بات کی بہت فکر ہے کہ وہ اکیلا رہ گیا تو کیا ہوگا۔ اگر میرے اوپر ایسا وقت آیا کہ ملے قوم میں سے صرف ایک شخص بھی میرے ساتھ کھڑا ہو، میں تب بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا، میں اس ایک شخص کا بھی لیڈر ہوں گا۔ اور یاد رکھیے گامیڈم، میں پھر سے اس بل کا ڈرافٹ تیار کروں گا اور اب کی بار... میں... اس بل کو... آپ کے... حلق سے... نیچے اتاروں گا! اور آپ مجھے بے بسی سے ایسا کرتے دیکھیں گی۔“ کہہ کے اس نے زور سے ڈیسک پہ ہاتھ مارا۔ چہرہ جذبات کی حدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ پھر نائی کو ڈھیلے کرتے وہ واپس کرسی پہ بیٹھا تو اوپر گیلری سے جہاں تالیاں گونجنے لگیں، وہیں ہال میں بیٹھے اس پارٹی کے چند ارکان ڈیسک بجانے لگے۔ (اسمبلی میں بیٹھ کے ڈیسک بجانے کا مطلب تعریف اور کھڑے ہو کے بجانے کا مطلب احتجاج ہوتا ہے۔) حکومتی ارکان البتہ خاموش بیٹھے رہے۔

اور وہ دونوں بھی اوپر بالکل خاموش سے کھڑے تھے۔ ایڈم گم صم ساتھ اور وہ یک ٹک اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جواب ٹیک لگا کے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ قریب بیٹھے افراد نے آگے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ کسی نے پانی کی بوتل آگے بڑھائی جو اس نے تھام کے لبوں سے لگالی۔

چند منٹ بعد وہ نیچے راہداری میں ایڈم کے ساتھ کھڑی تھی۔ گارڈز بھی ساتھ ہی کھڑے تھے۔ دفعتاً لفٹ کے دروازے کھلے اور.... چند افراد باہر نکلے۔ آگے وہ دونوں تھے۔ اشعر اور... تالیہ کے دل کی دھڑکن مس ہوئی... وان فاتح۔

وہ اب قطعاً غصے میں نہیں لگ رہا تھا، مسکرا کے اشعر کی بات سن رہا تھا جو خوشگوار انداز میں اس کے قریب جھکے کچھ کہہ رہا تھا کہ اس کی نظر تالیہ پہ پڑی۔ آنکھوں میں حیرت اتری۔ اس نے ہلکے سے فاتح کی کہنی کو چھو کے کچھ کہا تو فاتح نے نظر اٹھا کے اس طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں چند قدم آگے آئے۔ تالیہ کو لمحے بھر کے لیے اپنا سارا اعتماد ہوا ہوتا محسوس ہوا۔ بے اختیار نظریں فاتح پہ جمی تھیں۔

”تالیہ! آپ یہاں؟“ اشعر نے کہتے ہوئے ایڈم کو دیکھا تو ذرا سا چونکا۔ ”کیا وہ بات ختم نہیں ہوئی۔“

”مجھے شرمندہ مت کریں اشعر صاحب۔“ پھر فاتح کو دیکھ کر ادب سے سر کو خم دیا۔ ”وان فاتح!“ اس نے جواباً دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسے جانا تھا۔ اس کے غلت بھرے انداز نے تالیہ کو بے چین کیا۔ جلدی سے بولی۔

”میں اشعر صاحب سے بات کرنے آئی تھی مگر آپ کی تقریر.... بہت اچھی تھی۔ میں ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتی ہوں۔ لیکن....“ وہ ٹھہری تو فاتح جو غالباً آگے بڑھنا چاہتا تھا، رک کے اسے دیکھنے لگا۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ ”لیکن؟“

”میں نہیں مان سکتی کہ کبھی آپ پہ ایسا وقت آ سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ ملے قوم میں سے سوائے ایک کے کوئی نہ کھڑا ہو، لیکن اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میں اپنی پوری سچائی سے کہتی ہوں کہ میں وہ ایک شخص ضرور ہوں گی۔“

”میں بھی!“ ایڈم نے زیر لب کہا تھا۔

”تھینک یوتا شا!“ وہ تکلفاً مسکرایا جیسے اسے اس بات سے فرق نہ پڑا ہو۔ وہ ان باتوں کا عادی تھا۔

”تالیہ... ان کا نام تالیہ ہے۔“ اشعر نے کھٹکھار کے صہج کی۔ پھر ایک گہری نظر تالیہ پہ ڈالی۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز فاتح کو دیکھے جا رہی تھی۔ اشعر کی پیشانی پہ ہلکی سی شکن ابھری۔

”صحیح... صحیح... تالیہ...“ اس نے پیشانی چھوئی۔ ”میری بیوی شکر ہے یہاں نہیں ہے، ورنہ اس کو خفا ہونے کے لئے ایک اور وجہ مل جاتی۔“ وہ جھرجھری لے کر ہلکا سا ہنسا۔ پھر گھڑی دیکھی اور اشعر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں کار میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”مجھے... ایک بات کرنی تھی۔“ وہ جلدی سے بولی مگر وہ نہیں رکا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے گارڈز اور ایڈم اس کے ساتھ ہو لیے۔ تالیہ کی رنگت بجھی۔ تو اشعر مسکرا کے آگے ہوا اور حوصلہ افزا انداز میں کہا۔ ”آہنگ کو دل رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ وہ ہماری دنیا کے انسان نہیں ہیں۔ مگر آپ کیسے۔ میں سن رہا ہوں۔“ مگر تالیہ کا چہرہ بجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

”میں گھائل غزال میں اتر شڈ ہوں۔“

”اور؟“

”میں صرف یہ چاہتی تھی کہ مسز عصرہ سے ذاتی طور پہ مل لوں۔ گیلری سے ہٹ کے مگر...“ ایک ادا اس نظر اس طرف ڈالی جہاں وہ اپنے گارڈز کے ساتھ جاتا دکھائی دیتا تھا۔ ”شاید مسز فاتح یوں برائیک سے نہیں مل لیتیں۔“ وہ جیسے ہرٹ ہوئی تھی۔

”وہ برائیک سے واقعی نہیں مل لیتیں لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ آپ کو برائیک کی کیٹیگری میں رکھتی ہیں۔“ وہ چونک کے اشعر کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں امید جاگی۔ ”کیا یہ ممکن ہے؟“

”جی یہ ممکن ہے۔ آج رات آپ میرے اور عصرہ کے ساتھ ان کے گھر ڈنر کیجئے گا۔ وہیں آپ پینٹنگ کی بات کر لیجئے گا۔ آپ یقیناً یہ چاہتی ہیں کہ کا کا اس کو نیلامی پہ نہ رکھیں۔“ امرواٹھا کے سوال کیا گویا اس کا چہرہ پڑھ رہا ہو۔ دونوں ابھی تک راہداری میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

”جی۔ نیلامی پہ مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ میں زیادہ قیمت دے کر بھی اس کو اپنے لیے پہلے سے بک کرنا چاہتی ہوں۔ مسز عصرہ واقعی میری بات رک کے سنیں گی نا؟“ وہ اس سے بولی جیسے ابھی بھی خوفزدہ ہو کہ اشعر اپنا ذہن بدل نہ لے۔

”کا کا آہنگ جیسی نہیں ہیں چے تالیہ۔ وہ آپ سے مل کے بہت خوش ہوں گی۔ ہاں لیکن میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ وہ پینٹنگ نیلامی سے نکالنے پہ راضی ہو جائیں گی۔“ اس بات پہ وہ مسکرائی۔

”اور اگر میں کوئی ایسی سفارش لے آؤں جس کو وہ رو نہ کر سکیں تو؟“

اشعر ہلکا سا چونک کے اسے دیکھنے لگا، پھر مسکرایا۔ ”آپ سفارش لائیں، ہم دیکھ لیں گے۔ مجھے اجازت!“ تالیہ نے مسکرا کے سر ہلایا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ آگے بڑھا تو اس کے منتظر گارڈز بھی ساتھ چلتے گئے۔

”تو اس نے تمہیں گھر بلایا ڈنر پہ؟“ کار میں بیٹھتے ہی داتن نے چھوٹے ہی پوچھا۔ تالیہ اطمینان سے بیٹھی اور دروازہ بند کر کے سیٹ بیلٹ پہنے لگی۔

”کیسے نہ بلاتا۔ مجھے پتہ تھا وہ فلاح نے مجھے گھاس نہیں ڈالنی اور اشعر ٹھہرا خوش اخلاق۔ مجھے ”برٹ“ دیکھ کے مداوا کرتے ہوئے ڈنر پہ بلا لے گا۔ سب پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔“ ہیٹ اتار کے اس نے پچھلی سیٹ پہ ڈالا۔

”کل دعوت نامہ بھی اشعر نے بھیجا تھا۔ اب یہ دعوت بھی اشعر نے کر ڈالی۔ یہ تم میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔“ داتن کا راسٹارٹ کرتے ہوئے تھوڑی کھٹکی تھی۔

”کیونکہ میں اس کی بہن کے بار و بار کے لئے منافع بخش ثابت ہو سکتی ہوں۔“

”اشعر جیسے سیاست دانوں کو گلے سرس بیوی کی تلاش ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مزید پاپولر ہو جائیں۔“

”اے لڑکیوں کی کیا کمی ہے داتن؟ وہ صرف اپنی بہن کے لیے کر رہا ہے یہ۔“ وہ شانے اچکا کے بے نیازی سے بولی تو داتن خاموش ہو گئی۔

”فلاح مجھے تاشہ کہتا ہے.... یہ تاشہ کون ہے؟“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے سوچ میں ڈوبی بولی تھی۔

”تمہارے پاس ایک شناختی کارڈ ساشا کے نام کا ہے نا۔“

”اوہ ہوتی دفعہ بتاؤں موٹی مرغی اس نے ساشا نہیں کہا، تاشہ کہا ہے۔ میں نے اس دن ایک وژن دیکھا تھا کہ ایڈم اور میں کسی تاشہ کے خزانے کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی خزانہ ہے داتن.... اور کوئی تاشہ کی نظم جس سے مجھے وہ خزانہ ڈھونڈنا ہے۔“

”تو پھر انتظار کرو۔ تمہارے خواب تمہیں راستہ دکھا ہی دیں گے۔ فی الحال ڈنر کا سوچو۔“

”رائٹ!“ وہ سر جھٹک کے سیدھی ہوئی اور گہری سانس اندر اتاری۔ ”ہمارے پاس آج رات تک کا وقت ہے۔ ڈنر پہ مجھے عصرہ کے سامنے نقلی پینٹنگ کی اصلیت کھولنی ہے اور اس شخص کا پردہ بھی چاک کرنا ہے جو عصرہ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ کون ہے اس کو ہم نے شام سے پہلے ڈھونڈنا ہے۔ یہاں سے رائٹ لے لو۔ ہمیں ابھی گیلری کی طرف جانا ہے۔ وقت نہیں ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی اور ساتھ میں چھوٹا آئینہ نکال کے چہرے کے سامنے کیے لپ اسٹک گہری کرنے لگی۔

☆☆=====☆☆

واپس پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر آؤ تو پارکنگ میں کار کھڑی تھی اور دروازہ کھلا تھا۔ اندر بیٹھا فلاح موبائل پہ میلو چیک کر رہا تھا، اور غالباً اشعر کا انتظار بھی۔ اشعر پارکنگ کے سرے پہ کھڑا ملی کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔

”تمام معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ واقعی اتنی ہی امیر ہے جتنی نظر آتی ہے۔“ وہ دبے دبے جوش سے بتا رہا تھا۔ ”چند معروف کمپنیز میں اس کے شیئرز ہیں۔ باپ عرصہ ہوا مرکب گیا تھا تب سے ساری دولت کی بلا شرک غیرے مالک رہی ہے۔ کئی سال امریکہ میں رہی“

وہیں پلی بڑھی، تین سال ہوئے کے ایل آئی ہے۔ پارٹیز اور آرٹ کی خدمت بس یہی کام کرتی ہے۔ ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ ایک چالان تک نہیں ہوا آج تک۔“ پھر وہ ٹھہرا۔ اشعر جو سکر کے سن رہا تھا اس کے وقتے پہ قدرے بد مزہ ہوا۔

”تمہاری ٹون سے لگتا ہے تم ”مگر“ کہنے والے ہو۔“

”نہیں سوری سر، مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس کا بھی بیک گراؤنڈ ڈیٹا اکٹھا کروں اس کے دامن کا کوئی نہ کوئی دھبہ ضرور مل جاتا ہے۔ ایک پارکنگ ٹکٹ ہی سہی۔ ڈرنک ڈرائیونگ کا ایک ایکسیڈنٹ ہی سہی مگر یہ لڑکی بالکل صاف ہے۔ کچھ زیادہ ہی صاف ہے۔“

”بہت سے لوگ صاف ہوتے ہیں رٹلی۔ بے کار کی باتیں نہ سوچا کرو۔“ وہ اکتا کے بولا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ اندر بیٹھے ہی وہ قدرے درشتی سے فاتح سے مخاطب ہوا تھا۔

”وہ کا کا کے لیے بہت منافع بخش ڈونر ثابت ہو سکتی ہے۔ بھائی آپ کو اس کو تھوڑا سا وقت دینا چاہیے تھا۔“

وہ جو عینک ناک پہ جمائے موبائل دیکھ رہا تھا اسی طرح سر جھکائے بولا۔ ”کا کا کا بہانہ نہ کرو! ایش۔ تمہیں وہ لڑکی پسند آگئی ہے۔ اس لیے تم اس پہ جتنا چاہے وقت ضائع کرو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

اشعر نے فوراً سامنے بیٹھے ڈرائیور اور ایڈم کو دیکھا اور پھر یرہم سی خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

☆☆=====☆☆

کوالا پور کی وہ چوڑی سڑک درختوں سے گھری تھی۔ دونوں اطراف میں دو تین منزلہ اونچی لکڑی کی عمارتیں بنی تھیں۔ کسی زمانے میں یہ گھر تھے مگر اب ان کو تراش خراش کے بعد آرٹ گیلریز، ریسٹورانٹس اور ڈیزائنر شاپس میں ڈھال دیا گیا تھا۔ سرسبز درختوں کے پس منظر میں بھوری لکڑی کی اونچی شاپس بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ عصرہ کی آرٹ گیلری بھی ان کے وسط میں کھڑی تھی۔

گیلری کے بالکل سامنے سڑک پہ ایک پولیس کار آرکی، دروازے کھلے اور اندر سے وہ دونوں باہر نکلیں۔ تالیہ نے فرانسیزیسی جوڑا بنا کے سن گلاسز پہن رکھی تھیں۔ ہونٹوں پہ بھوری لپ اسٹک لگائے سیاہ کوٹ پہنے وہ سخت گیر سی آفیسر معلوم ہوتی تھی۔ جبکہ داتن پولیس کے یونیفارم میں ملبوس تھی۔

تالیہ اعتماد سے آگے چلتی، ماتھے پہ مل ڈالے گیلری کے مقابل شاپ میں داخل ہوئی جو ایک کپڑوں کا بوتیک تھا۔

”سا شاکمال... اے ایس پی رائل ملیشیا پولیس۔“ وہ جج کارڈ لہراتی ریسپشن پہ آئی اور ایک کہنی کاؤنٹر پہ رکھی۔ ”اور یہ انسپکٹر صوفیہ ہیں۔“

”سنجیدہ خشک انداز میں داتن کا تعارف کروایا۔“

کاؤنٹر والا لڑکا سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ”جی آفیسر... کیا ہوا؟“

”دی رو میں ایک قتل ہو گیا ہے۔ ہائی پروفائل۔ مجھے تمہارا سی سی ٹی وی ریکارڈ دیکھنا ہے۔“ کروفر سے کہہ کر اس نے ہاتھ جھلایا اور جھک کے کاؤنٹر کی مانیٹر اسکرین اپنی جانب موڑی۔

”کیا ہورہا ہے؟“ مینیجر سامنے سے چلتا آیا تو دونوں پولیس آفیسرز نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ مینیجر ناخوش لگتا تھا۔ کبھی ان کو دیکھتا کبھی گاہکوں کو جوڑمڑ کے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ تالیہ اسے نظر انداز کر کے واپس لڑکے کی طرف مڑی۔

”صوفیہ تمام عملے سے پوچھ گچھ کریں گی، تم مجھے کل کی فوٹو نکال کے دو۔“ تحکم سے وہ بولی مگر اس سے پہلے کہ لڑکا کمپیوٹر پہ جھکتا، مینیجر سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اس کے چہرے پہ ناگواری تھی۔

”وارنٹ ہے آپ کے پاس؟“

”آپ کے خیال میں میں وارنٹ کے لیے کورٹ کے چکر لگاتی رہوں اور قاتلوں کو بھاگ جانے دوں؟“

”کون سا قاتل ہوا ہے یہاں؟ کمال ہے ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی۔“

”پھر دعا کرو کہ تمہارے عملے کا تعلق نہ نکل آئے جرم سے، ورنہ سارے زمانے کو خیر ہو جائے گی۔ فوٹو نکالو یار، کیا کر رہے ہو۔“ لڑکے کو جھڑکا تو وہ فوراً کی بورڈ پہ بٹن دبائے لگا۔ مینیجر نے جھپٹی ہوئی آنکھوں سے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔

”کون سے تھانے سے ہیں آپ؟“

”تن ایچ ایس لی پولیس اسٹیشن۔“ پیچھے کھڑی داتن روکھے انداز میں بولی تھی۔

”اچھا۔ میرا کزن بھی وہاں کام کرتا ہے۔ کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا اس نے سا شاکمال صاحبہ۔“

”کیا نام ہے آپ کے کزن کا؟“ وہ پرسکون رہی۔ بے نیاز اور اکتائی ہوئی۔

”نصر اللہ پترا۔ سب انسپٹر ہے۔“

تالیہ نے بے زاری سے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے کہ داتن تالیہ کے برابر آئی۔ ”نصر اللہ پترا تو دو سال پہلے کارا ایکسڈنٹ میں فوت نہیں ہو چکا؟ اس کی روح نے آکر اگر تمہیں میڈم کے بارے میں خبر نہیں دی تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ سیاہ موٹی عورت اسے گھور کر چبا چبا کے کہتی دو تین قدم مزید قریب آئی تو مینیجر کے تاثرات بدلے۔ وہ پیچھے ہٹا۔

”اگر تم جیسے mysognist مرد عورتوں کووردی میں برداشت نہیں کر سکتے اور چاہتے ہو کہ ہمارے تھانے فون کرو تو ملاؤ فون۔ اچھا ہے آج سارا دن پولیس کی گاڑیاں تمہارے اسٹور کے باہر کھڑی رہیں تاکہ گاہک ادھر آنے کی زحمت نہ کریں۔“ موٹی ایک ایک حرف پیش سے ادا کرتی گھورتے ہوئے آگے آرہی تھی اور مینیجر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی کلفت اور شک سب زائل ہو چکا تھا۔

”اب ہم تھانے سے کسی مرد آفیسر کو بلا کے لائیں گے یا تم لوگوں نے تعاون کرنا ہے؟“ تالیہ برہمی سے بولی۔

”لگاؤ... ان کو کیا دیکھنا ہے... شاباش دکھاؤ۔“ وہ لڑکے کی طرف گھوما تو وہ یس باس کہتا جلدی جلدی مطلوبہ فوٹیج لگانے لگا۔ تالیہ نے

بدقت مسکراہٹ دبائے فلیش ڈرائیو اس کی طرف بڑھائی۔

باہر پولیس کار میں بیٹھتے ساتھ ہی وہ داتن کی طرف گھومی تھی۔ ”تمہیں کیسے پتہ کہ اس کا کزن مر چکا ہے۔“

داتن نے جواب میں شاہانہ بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ ”میں کردار میں خود کو اچھے سے ڈھاتی ہوں تالیہ۔ جس تھانے کی آفیسر کا رول کر رہی ہوں اس کے بیس سال کا ریکارڈ میرے زرخیز ذہن میں محفوظ ہوتا ہے۔ ایک ایک شخص کا نام، ایک ایک کیس کا نمبر۔“

”واؤ داتن!“ وہ بے حد متاثر ہو کے بولی۔ ”میں کتنی امپریسڈ ہوں تم سوچ نہیں سکتیں۔ اتنی ذہین اور باکمال گرافٹر کا ساتھ میرے لئے کتنے فخر کی بات ہے۔ کاش میں بھی تم جتنی ذہین ہوتی۔“ آخر میں افسوس سے بولی تو داتن کے سیاہ گالوں میں سرخی گھلی۔ وہ شرمانے کے ساتھ حیران بھی ہوئی۔

”سچ؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ چیخ کے بولی۔ ”کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم جب بھی پولیس والی کا رول کرتی ہو تو کان میں لگے اس آلے سے.... (اس کے کان سے ٹکڑا کھینچ نکالا) بروقت اپنی پولیس والی دوست سے آن لائن رابطے میں رہتی ہو تا کہ ادھر کوئی کسی کا نام لے، ادھر تمہاری دوست تمہیں کان میں خبر کر دے۔ ہونہ۔“ آگے اس کی مٹھی میں پٹخا۔ لیکن داتن ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئی۔

”یہ بھی آرٹ کی ہی ایک قسم ہے۔“

”اور اسے شارٹ کٹ کہتے ہیں۔“

داتن نے افسوس سے اسے دیکھا اور کارڈ اشارٹ کی۔ ”دل دکھانے والوں کا قیامت کے دن انگ سے حساب ہوگا تالیہ۔“

”اس سے پہلے دنیا کی آدھی آبادی کا کھانا کھا جانے والوں کا ہوگا۔“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور فلیش اس میں لگائی۔ اسکرین ذرا سیدھی کی اور گردن جھکا کے غور سے دیکھا۔ ”مسز عصرہ نے کہا تھا کہ میرے آنے سے پہلے عرب شیخ نے آکر پینٹنگ ان کو دی۔ یہ دیکھو یہ میں جا رہی ہوں شاپ میں۔“ وہ ویڈیو کو پیچھے کر رہی تھی جو اسٹور کے بیرونی کیمرے سے لی گئی تھی اور اس میں گیلری میں جاتے لوگ صاف دکھائی دے رہے تھے کیونکہ اسٹور اور گیلری آمنے سامنے تھے۔

”اوہ۔ یہ ہے وہ عرب شیخ جس نے مسز عصرہ کو پینٹنگ دی۔ اس کے گارڈز پینٹنگ کا باکس اٹھا کے اندر لے جا رہے ہیں۔ اسے پہچانتی ہو۔“ اس نے اسکرین کا رخ داتن کی طرف موڑا۔ اس نے ذرا سیور کرتے ہوئے ایک نظر ڈالی۔

”نہیں۔ کون ہے یہ؟“

”یہ نوفل ہے۔ شیخ جاسم کا ملازم جس سے ہم نے پینٹنگ چرائی تھی مگر یہاں تو یہ بڑے اچھے کپڑے جوتے پہن کے آیا ہے۔ ڈیزائنر گلاسز۔ واہ۔ شیخ بننے کی داکاری کر رہا ہے۔“

”تمہیں اس کی ابھی تک شکل یاد ہے؟“ جواب میں تالیہ نے ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ ”بد قسمتی سے میرا زرخیز دماغ بیس سال پہلے تھانے کا ریکارڈ تو اپنے اندر محفوظ نہیں رکھتا، مگر ڈیڑھ سال پہلے چوری کی گئی پینٹنگ سے متعلقہ گھر کی تمام معلومات یاد ہیں مجھے۔ یہ نوفل ہی ہے اس کی پوری چھان بین کی تھی ہم نے۔“

”یعنی اس نے شیخ بن کے پینٹنگ مفت میں دی ہے۔ عطیے کے طور پر۔ اگر پیسے کمانا مقصد نہیں ہے تو پھر کیا؟“

”دشمنی۔ کیونکہ جب نیلامی پر عصرہ یہ پینٹنگ بیچیں گی اور وہاں خریدار نے ماہرین کو بلا کے اسے چیک کروایا اور میڈیا کے سامنے یہ بات کھلی کہ پینٹنگ نقلی ہے تو عصرہ مشکل میں پڑ جائیں گی۔ پچھلے دس سال سے بیچی ایک ایک پینٹنگ کا آؤٹ ہو گا۔ مقدمے.... اسکیٹڈل....“

”تو ہم ان کی مدد کیوں کر رہے ہیں؟ یہ ان کا معاملہ ہے۔ ہمارا اس سے کیا لینا دینا۔“

”میں وان فاتح کو اس طرح برٹ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ بس میں نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے اسکرین آہستہ سے فولڈ کی۔ ”یہ جو کوئی بھی ہے اس کا مقصد وان فاتح سے دشمنی نکالنا ہے، ناکہ عصرہ سے۔“

واتن نے ڈرائیو کرتے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ ”وہ سیاستدان ہے اور وہ بھی شادی شدہ، دو بچوں کا باپ۔ تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے، تالیہ۔ سیاستدان بہت رلاتے ہیں اچھے دل کی لڑکیوں کو۔“

”تین۔ اس کے تین بچے تھے۔“ وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کرچیاں سی چھنے لگی تھیں۔ (کیا واقعی مجھے اس سے محبت ہونے لگی ہے؟)

”غیر آج رات تم کیا کرو گی؟“

”میں!“ اس نے آنکھیں رگڑیں اور وینڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے مسکرائی جہاں بارش کے بعد اب سورج جھانکنے لگا تھا۔ ”میں آج ڈرنیبل پر وان فاتح کو بتاؤں گی کہ میرا ٹیلنٹ کیا ہے۔“ ایک عزم ان چمک دار آنکھوں میں جھلکانے لگا تھا۔ آنسو خاموش ہو گئے تھے۔

☆☆=====☆☆

شہر کے دوسرے حصے میں وان فاتح کی کار ایک عمارت کے سامنے رکی تو اشعر جو اس گفتگو کے بعد سے اب تک خاموش ہی تھا، نکلنے سے پہلے اچھٹے انداز میں اسے دیکھ کے بولا۔ ”آپ اندر نہیں چلیں گے؟“

”ارادہ بدل دیا ہے۔ آفس جاؤں گا۔“ وہ سر جھکائے ابھی تک موبائل دیکھ رہا تھا۔

”شاید آپ اس گید رنگ کو اس لیے avoid کر رہے ہیں کیونکہ یہاں سب آپ سے استغفے کی بابت سوال کریں گے۔ میرا خیال ہے آجنگ اب وہ وقت آ ہی گیا ہے جب آپ اپنے استغفے کا اعلان بہادری کے ساتھ کر ہی ڈالیں۔“ اس کے لہجے میں برہمی اور خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ فاتح نے نظر تک نہیں اٹھائی اور وہ کار سے نکل گیا۔

”عثمان۔“ اس نے بالآخر سر اٹھا کے ڈرائیو کرتے پولیٹیکل سیکرٹری کو دیکھا۔ ”دی سن کی ہڈی کے ساتھ شام کے انٹرویو کا وقت رکھو۔ وہ کافی دن سے کہہ رہی تھی۔“

”اوکے سر، مگر.... دی سن تو ہمارا مخالف اخبار ہے۔“ وہ تذبذب سے بولا۔ (ملائشیا میں آدھے اخبارات حکومت اور آدھے اپوزیشن کی

سیاسی جماعتوں کے ہوتے تھے۔ ایک کالج جانبدار ہوتا تھا تو ایک کالج جھوٹ۔)

”مجھے سیاست نہ سکھاؤ۔ جو کہا ہے وہ کرو۔“ وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا تو عثمان خاموش ہو گیا۔ ایڈم ہلکا سا کھٹکھٹا ہوا۔

”سر میں آج کادن آف لے سکتا ہوں دو تین گھنٹے کا؟ میرا ایک دوست....“

”شیور۔ کار سے نکل جاؤ۔“ موبائل پہ لگے فاتح نے ہاتھ جھلا کے کہا گویا مزید اپنے مطالعے میں خلل برداشت نہ کر پار ہا ہو۔ ایڈم

اگلے ہی پل باہر تھا۔

اندر اشعر عمارت کی لفٹ کی طرف بڑھتا فون کان سے لگائے مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو برا تو نہیں لگا؟ کا کا؟ ایک ڈنر کا بوجھ

ڈال دیا میں نے آپ پہ؟“

”برا کیوں لگے گا؟ ایش؟ میں ہر رات کسی ڈنر کی میزبان یا مہمان بننے کی عادی ہوں۔ اور اگر وہ دو پیئنگنز بھی خرید لے اور اپنے جیسے

دو تین آرٹ کلکٹرز کو لے آئے تو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔“ وہ حساب کتاب کر کے کہہ رہی تھی۔ ”اور میں جانتی ہوں کہ تم اس میں دلچسپی

لے رہے ہو اس لیے مجھے بھی اب اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے۔“

”اچھا اتنا شور کیوں ہے آپ کے پیچھے؟“ وہ مسکراہٹ دبا کے بولا تھا۔

”پیرینی ایونٹ پہ آئی ہوئی ہوں ایک یتیم خانے میں۔ شام کو وقت سے پہنچ جانا۔ اچھا۔ فاتح سے تو مجھے کوئی امید نہیں ہے مگر اسے بھی

آنے پہ مجبور کرنا۔“ عصرہ نے فون رکھا اور مسکرا کے پیچھے کھڑے لوگوں کی طرف متوجہ ہوئی جو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ طے طرز کی لمبی

قمیض اور اسکرٹ کے اوپر دوپٹہ سر پہ لیے ہوئے تھی۔ ایک اونچی عمارت کے دالان میں وہ کھڑی تھی۔ سامنے سیڑھیاں تھیں جہاں سے ان

کو اوپر جانا تھا۔

”اس طرف۔“ ساتھ چلتے افراد آگے بڑھے تو وہ مسکرا کے ان کی بات سننے لگے پیرزینے چڑھنے لگی۔ دائیں بائیں منتظمین تھے۔ چند

مرد اور خواتین جو اسے وقفے وقفے سے ایونٹ کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔ فونو گرافرز بھی ساتھ ہی اوپر چڑھ رہے تھے۔

وہ اوپری زینے پہ آئی ہی تھی کہ جانے کس طرف سے ایک بچہ بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ اس کی رنگت سیاہ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ عصرہ

نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ مسکرا کے منتظم کی بات سن رہی تھی کہ اس بچے نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑا۔ وہ چونکی، مگر پھر مسکرا کے ذرا سا جھکی تاکہ

آہستہ سے اپنا ہاتھ نکال لے۔

”دھیان رکھنا۔ خبردار رہنا۔“ وہ اس کے قریب ہو کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غرایا تھا۔ عصرہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ دیگر افراد

فوراً اس طرف بڑھے تاکہ اس کو عصرہ سے علیحدہ کر سکیں مگر وہ اس کا ہاتھ جکڑے اس کی آنکھوں میں بنا پلک جھپکے آنکھیں ڈالنے غراہٹ کے

ساتھ کہتا گیا۔

”ایک چور ہے۔ اور وہ پمپورو (شکار بازوں) میں سے ہے۔“

اس کو اپنی زندگی میں مت داخل ہونے دینا۔

وہ آئے گی اور تمہارے شوہر کو تمہاری دنیا سے دور لے جائے گی۔

وہ.....“ مگر ایک شخص نے اسے زور سے کھینچ لیا تو اس کا ہاتھ عصرہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اسے جھڑکتے ہوئے اپنی گرفت میں لیے دور لے جا رہا تھا اور عصرہ ایک ٹک ادھر دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ شل ہو گئی تھی مگر پھر جبراً مسکرائی اور زینے چڑھنے لگی۔ رنگت ابھی تک قدرے اڑی ہوئی تھی۔ منتظم گھبرا کے معذرت کرنے لگا۔

”یہ احمد ہے۔ کچھ عرصے سے ذہنی توازن بگڑتا جا رہا ہے اس کا۔ کہتا ہے اس کو مستقبل کے خواب آتے ہیں۔ بس میں معافی چاہتا ہوں۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔“ اس نے گردن موڑ کے اس طرف دیکھا جہاں وہ بچے کو لے کر گئے تھے۔ ”یہ پمپور وکیا ہوتے ہیں۔“

”پمپور و legend ہے ایک۔ قدیم داستانوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ ایک جادوگروں یا عاملوں کا گروہ سا تھا شاید جو اپنے آپ کو پمپور و (شکاری) کہتے تھے۔ مگر آپ ان باتوں میں نہ پڑیں۔ احمد کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔“ وہ اسے تسلی دینے لگا تو وہ گہری سانس لے کر زینے چڑھنے لگی۔ اسے ان حقیقت سے ماور باتوں پہ ویسے بھی یقین نہیں تھا۔

☆☆=====☆☆

کوالا پمپور کا وہ ایک مصروف بازار تھا۔ درمیان میں اینٹوں کی روش بنی تھی اور دونوں اطراف میں دکانوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے برآمدوں میں چھتری والے اسٹال لگے تھے جہاں لوگ رک رک کے خریداری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں ایک ریسٹورانٹ کے اندر درمیانی میز پہ ایڈم بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے ایک کریوکٹ والا نوجوان تھا جس سے وہ ممنونیت سے کہہ رہا تھا۔

”شکریہ تم نے میرے لئے وقت نکالا۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں تو فوج سے چھٹی پہ آیا ہوا تھا۔ پچھلے ہی ہفتے رینک بڑھا ہے۔ تم سناؤ تم کیا کرتے ہو۔“ اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ وہ شاہانہ انداز میں بائیں بازو کرسی کے پیچھے کیے بیٹھا تھا۔

”میں....“ وہ رکا۔ ”میں ایک آدمی کا باڈی مین ہوں۔ چند دن کے لئے۔“

”واٹ؟ باڈی مین؟ چیچ چیچ۔“ اسے افسوس ہوا۔ ”اگر تمہیں دم نہ ہوتا تو تم فوج میں ترقی کرتے بہت۔ میرے برابر پہنچ چکے ہوتے۔“

پھر نوجوان چپ ہو گیا تو وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”نصر میں تم سے کبھی جیلس نہیں ہوں گا، بے فکر رہو۔ اگر اللہ نے میرے دوست کو وہ کامیابیاں دے دی ہیں جو میں حاصل کرنا چاہتا تھا تو مجھے حسد نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ سب کا برابر کا ہوتا ہے۔ میرا بھی ہے۔ میں محنت کروں گا تو مجھے بھی کامیابیاں ملیں گی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ نصر نے کان کھجاتے ہوئے سر کو خم دیا۔ پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کری پف آگئے تو وہ ان سے

انصاف کرنے لگے۔

”ایک بات بتاؤ.... مجھے ایک الجھن ہے۔“ بالآخر ایڈم مدد سے پہ آیا۔ نوجوان اپنی کھاتے ہوئے غور سے اس کو دیکھنے لگا۔
 ”اگر کسی لڑکی کہتے کہتے آدمی بول گیا۔“ کسی آدمی کو تم دو مختلف جگہوں پہ دو مختلف حلیوں میں دیکھو تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟“
 ”یہ تو ان دو جگہوں پہ منحصر ہے ایڈم۔“

”کیا؟“ وہ سمجھ نہیں پایا۔

”اگر کوئی شخص دو مختلف حلیے بنا کے دو مختلف جگہوں پہ موجود ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ ان دو جگہوں میں کیا مشترک ہے۔ وہ کس کے آگے پیچھے کھوم رہا ہے؟“

ایڈم شل رہ گیا۔ بالکل شل۔ وہ تو حلیوں میں ہی الجھ رہا تھا۔ یہ خیال ہی نہیں آیا۔

”ایک.... ایک بہت ہائی پروفائل شخص کے گرد....“ ایڈم کی حیرت میں ڈوبی زبان لڑکھرائی۔ ”دو دفعہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ نوکر کے روپ میں ایک دفعہ امیر انسان کے روپ میں۔“

”تو صاف ظاہر ہے، وہ اس ہائی پروفائل شخص کو نارگٹ کر رہا ہے۔“

”تمہارے خیال میں وہ ایسا کیوں کرے گا؟“ وہ الجھنوں میں گھر گیا تھا۔

”کیونکہ یہ بہروپ سے (con artist) جاسوس یا کرایے کے قاتل ہوتے ہیں جو حلیے بدلتے ہیں اور کسی خاص جگہ یا شخص کو نارگٹ کرتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی کو قتل کرنا یا کوئی اہم چیز چرائنا ہوتا ہے۔“

”مگر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ وہی ملازم ہے تو وہ بولا کہ نہیں، اور اس نے مجھے اتنا برا بھلا بھی کہا۔“ اس کو اپنا غم یاد آیا۔

”تو تمہارے خیال میں اس نے مان جانا تھا؟ بلکہ اسے تو ہنگامہ کر کے تمہیں نوکری سے نکلوانا چاہیے تھا تا کہ تم اس کے لیے رکاوٹ نہ بنو۔“

”یعنی وہ.... وہ وہی ہے۔“ پہلی دفعہ اسے ہزار فیصد یقین آیا تو وہ دنگ رہ گیا۔

”اگر ہنگامہ کھڑا کیا ہے تو وہ بالکل وہی ہے، کیونکہ چور ہی سب سے زیادہ شور مچاتا ہے۔“ وہ سینڈوچ کے بائٹ لیتے عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مطلب میں ٹھیک تھا۔ یا اللہ۔ وہ کون ہے؟ چور جاسوس یا قاتل؟“ پھر چونک کے دوست کو دیکھا۔ ”اب میں کیا کروں؟“

”یہ اس گھر کا معاملہ ہے جہاں تم نوکری کرتے ہو؟“ ایڈم نے جھٹ سر ہلایا۔

”اور کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا؟“ ایڈم نے نفی میں گردن دائیں بائیں ہلائی۔

”جہاں تم نے اس کو ملازم بنے دیکھا تھا وہاں جاؤ اور ادھر کے مالکوں سے اس کے بارے میں معلومات لو۔ پھر اپنے مالک کے پاس

ثبوت سمیت جاؤ۔ ایک منٹ کہاں جا رہے ہو، کھانا تو کھالو۔“ وہ اسے یوں اٹھتے دیکھ کے حیران ہوا مگر ایڈم نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کا کندھا تھپکا..... ”تھینک یو“ بولا..... جیب سے چند نوٹ نکال کے گلاس تلے رکھے اور باہر کو بھاگا۔ اس کی ساری دنیا میں بھونچال آگیا تھا۔ (کرایے کی قات؟) جاسوس یا چور کی بجائے یہی خیال پریشان کرنے کے لئے کافی تھا۔

☆☆=====☆☆

ابھی دوپہر پوری طرح نہیں ڈھلی تھی مگر اس سڑک پہ بنی مہنگی اور برانڈڈ شاپس کی ساری بتیاں جل اٹھی تھیں۔ ایسے میں وہ اٹھی گردن کے ساتھ کہنی پہ پرس ٹانگے ایک بڑے اسٹور کے سامنے آرکی۔ سبز فراک اور چھوٹا سفید منی کوٹ پہنے، وہ آنکھوں پہ بڑے بڑے سیاہ گلاسز لگائے ہوئے تھی۔ گردن مغرور امیرزادیوں کی طرح کڑا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں ملک ٹیک تھا اور دوسرے میں موبائل جس پہ وہ پیغام دیکھ رہی تھی۔

”جو تم نے کہا تھا میں نے کر دیا،‘حالم‘! مولیا کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

”گڈ۔ اب کوشش کرنا کہ مجھے تم بالکل یاد نہ آؤ۔“ جواب دے کر فون رکھا تو دوسرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے کان سے لگایا۔ ”داتن، مولیا

نے کام کر دیا ہے۔“

”گڈ۔ تم کہاں ہو؟“

”میں مسز عصرہ کے لئے کوئی قیمتی تحفہ لینے آئی ہوں، جو میری شان کے عین مطابق ہو۔“

”جیسے میں اس بات پہ یقین کر لوں گی؟“ اس نے منہ بنا کے کہا تو تالیہ نے شانے اچکائے اور فون پرس میں ڈال دیا۔ پھر اعتماد سے

اندر چلی آئی۔

جیولری ریک پہ آکر اس نے سن گلاسز اوپر کر کے بالوں پہ لگائے اور گردن جھکا کے قیمتی زیورات دیکھنے لگی۔ آنکھیں سوچنے والے انداز میں چھوٹی کر لیں۔ ساتھ ہی ملک ٹیک کے گھونٹ بھی بھرتی رہی۔ پھر دودھ و قیمتی مساک جیولرز کے دو ڈائمنڈ لاکٹ اٹھائے۔ بالکل ایک جیسے۔ ایک کو خالی ہاتھ میں پکڑا، دوسرے کو ملک ٹیک گلاس والے ہاتھ میں اور کاؤنٹر کی طرف چلی آئی۔

کاؤنٹر پہ ایک چینی نوجوان کھڑا بنگ کر رہا تھا۔ رش کافی تھا۔ تالیہ کے آگے قطار لگی تھی۔ وہ منتظر سی کھڑی رہی۔ رش بہت تھا۔ قطار سست تھی۔ جیسے ہی سامنے والی عورتیں نہیں، وہ آگے آئی اور لاکٹ سامنے دھرا۔ ملک ٹیک گلاس والا ہاتھ نیچے کر لیا۔ نوجوان نے ہل بنا کے دیا تو اس نے پرس سے نوٹوں کی گڈی نکال کے رکھی۔ لڑکے نے پیسے رکھ لیے اور لاکٹ کا سیکورٹی ٹیگ اتارا۔ (اگر یہ ٹیگ لگا رہے تو دوکان سے باہر لے جانے کی صورت الارم بج جاتا ہے۔) ابھی وہ لاکٹ ساتھ والے ملازم کو دینے ہی لگا تھا کہ اسے باکس میں ڈالے کہ وہ بولی۔

”ایک منٹ۔ میں اس کو ورائی کر لوں۔“ لڑکے نے سمجھنے والے انداز میں لاکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنا سیل اور پرس کاؤنٹر

پہ دھرا۔ بقایا رقم بھی نہیں اٹھائی۔ گویا لا پرواہ امیر لڑکی نے سب ان کے سامنے رکھ دیا۔ پھر ملک ٹیک سے گھونٹ بھرا اور آئینے تک آئی جو قریب میں لگا تھا۔ اب اس نے دھیرے سے ٹیک اتر لاکٹ ملک ٹیک گلاس میں گرادیا اور خود ٹیک والا دوسرا لاکٹ گردن میں پہن کے دیکھنے لگی۔ ہاتھوں کی یہ خفیف سی حرکت سی سی ٹی وی میں نظر نہیں آتی۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھ کے اس نے منہ بنایا۔ ماتھے پہ سلوٹیں پڑیں۔ واپس آئی۔ دو تین گاہکوں کے بھگت جانے کا انتظار کیا اور پھر اداسی سے لاکٹ کاؤنٹر پہ رکھا۔

”یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ کیا میں اسے واپس کر سکتی ہوں۔“ بل اٹھا کے واپس بڑھایا۔ سیلز مین کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ مگر اس نے سر ہلاتے ہوئے بل تھام لیا۔ ”آپ کچھ اور دیکھ لیں۔“

”نہیں اب میرا موڈ آف ہو گیا ہے۔“ وہ اداس نظر آتی تھی۔ لڑکے نے لاکٹ واپس لے لیا اور بل سے میچ کرنے لگا۔ پھر اس کی انگلیاں ٹیک پہ ٹھہریں۔ تالیہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور اونچا سا بولی۔ ”اُف باہر کتنی haze پھیلی ہے۔ اس نے تو کے ایل اور تائی یو این میں کوئی فرق ہی نہیں چھوڑا۔“ (ہیز وہ دھند ہوتی ہے جو انڈونیشیا کے جنگلات جلانے سے ملائیشیا تک پھیل جاتی ہے۔)

وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ ”آپ تائی یو این جا چکی ہیں؟“ (تائی یو این چائینہ کا انتہائی فضائی آلودگی کا شکار ایک شہر ہے۔)

”جا چکی کیا مطلب؟ میں بڑی ہی وہیں ہوئی ہوں۔“ وہ مسکرا کے چینی زبان میں بولی تو وہ خوشگوار حیرت سے مسکرایا۔ ”میرے والد کا آدھا خاندان وہیں سے ہے۔ ہم بھی وہیں رہتے تھے۔ یہ آپ کے پیسے۔“ اس نے لاکٹ واپس کر دیا اور پیسے اس کے حوالے کر دیے۔

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ تالیہ نے شکر یہ ادا کر کے ملک ٹیک کا گلاس اٹھایا۔ سن گلاسز آنکھوں پہ گرائے اور اسی اعتماد سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ آرام سے کارتک آئی، اندر بیٹھی، گلاس کا آخری گھونٹ بھرا اور نشو سے نیچے بیٹھ لاکٹ نکال کر صاف کیا اور مسکرائی۔ ”ہے کوئی عالم جیسا ہاں؟“

☆☆=====☆☆

تنگو کا مل محمد کے گھر پہ شام اترنے لگی تھی جب ایڈم نے بیرونی گیٹ کی گھنٹی بجائی۔ دل دھڑک رہا تھا بار بار لبوں پہ زبان پھیرتا تھا مگر جنون اس سے بڑا تھا۔ کھوج لگانی ہی تھی۔

دروازہ کھلا تو ایک ملازم دکھائی دیا۔ ”مجھے مسز شیلہ سے ملنا ہے۔ میں وان فاتح کا باڈی مین ہوں۔“

ملازم نے فوراً راستہ چھوڑ دیا اور اسے پورچ تک لے آیا، پھر وہیں رکنے کو کہا۔ ایڈم بے چینی سے آگے پیچھے ٹہلنے لگا۔ دروازہ کھانے کی آہٹ ہوئی تو فوراً سیدھا ہوا۔ مسز شیلہ باہر نکلیں تو اس نے فوراً جھک کے سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کے جواب دیا۔

”کیا آپ کو وان فاتح نے بھیجا ہے؟“

”نہیں میڈم۔ میں ذاتی کام کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔“ وہ ذرا جھجکا مگر انہوں نے مسکرا کے ”بتاؤ“ کہا تو اس کی ہمت بڑھی۔

”اس روز جب ہم آپ کے گھر آئے تھے تو آپ کی نوکرائی تھی ایک... تا... تالیہ مراد نام کی۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔“
 ”ہماری تو اس نام کی کوئی ملازمہ نہیں ہے۔“ وہ سکون سے بولیں تو ایڈم کا دل دھک سے رہ گیا۔ منہ کھل گیا۔

”نہیں ہے؟ آر یوشیور؟“ اس نے جھٹ موبائل نکالا اور ایک تصویر سامنے کی۔ ”یہ... یہ آپ کی نوکرائی نہیں ہے؟“

مسز شیلا نے ایک اچھتی نگاہ سنہرے بالوں والی لڑکی پہ ڈالی۔ ”میں تو اس لڑکی کو پہلی دفعہ دیکھ رہی ہوں۔ میں تو اسے نہیں جانتی۔“ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”کچھ اور یا نہیں؟“ انداز پر خلوص ہی تھا مگر اس میں عجلت تھی۔ ایڈم کا چہرہ بجھ گیا۔ اپنا آپ انتہائی بے وقوف نظر آنے لگا۔ آہستگی سے اس نے فون جیب میں ڈالا اور نفی میں سر ہلایا۔

”آپ نے اتنا وقت دیا اس کا شکریہ۔ سوری کہ میں نے یہ وقت ضائع ہی کیا۔“ معذرت کر کے وہ لٹکے چہرے کے ساتھ مڑ گیا۔
 مسز شیلا اسے جاتے دیکھتی رہیں پھر واپس اندر آ گئیں۔ لاؤنج میں سامنے تنگو کامل کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کے تفکر سے ابرو اکٹھے کیے۔ ”تالیہ کا پوچھ رہا تھا؟“

”ہاں۔ میں نے وہی کیا جو آپ نے کہا تھا۔ مگر کامل...“ وہ الجھیں۔ ”ہم تالیہ کے اپنے ہاں کام کرنے کا بریکارڈ کیوں مٹا رہے ہیں۔“

”کیونکہ وہ لڑکازین العابدین مولیا میرے پاس آیا تھا۔ میرے حریف کی کمپنی سے ہے وہ۔ وہی جس کو تالیہ نے لیپ ٹاپ دیا تھا۔“ وہ تلخی سے کہتے ہوئے صوفے پہ جا بیٹھے۔ ”وہ مجھے دھمکارہا تھا کہ وہ جانتا ہے میں نے ان کے پراڈکٹ کا فارمولہ چر لیا ہے وہ بھی غیر قانونی ملازمہ کے ہاتھوں۔ جانتی ہو غیر قانونی ملازمہ رکھنا کتنا جرم ہے؟ بہت کرلیں ہم نے بچتیں۔ وہ کیس کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔ فراڈ اور چوری میں پکڑا جاسکتا ہوں میں۔ اس لئے ہم گھر سے تالیہ کا سارا ریکارڈ غائب کر دیں گے۔ یہ وان فاتح کا باڈی گارڈ کم اور پولیس کا بندہ زیادہ لگ رہا تھا۔ شاید یہ لوگ میری تفتیش کر رہے ہیں۔“ وہ تائی ڈھیلی کر رہے تھے گویا سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہو۔

مگر مسز شیلا کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ ”تالیہ تصویر میں بڑی فرق لگ رہی تھی۔ بنی سنوری۔ مختلف سی۔“

”اتنے پیسے لے کر گئی ہے خود کو سنوارنا آہی گیا ہوگا۔ بہر حال آئندہ میں تالیہ کا نام نہ سنوں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں کڑوے پن سے بولے تو مسز شیلا نے شانے اچکا دیے۔ (بس سارے مسئلے میرے ملازموں سے ہی ہوتے ہیں ان کو۔ ہونہہ۔) اور سر جھٹک کے آگے بڑھ گئیں۔

☆☆=====☆☆

حالم کے گھر پہ بھی دوپہر ڈھل چکی تھی اور شام کی آمد آمد لگتی تھی۔ داتن تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی جہاں میز پہ چند مشینیں اور آلات رکھے تھے۔ تالیہ زمین پہ بیٹھی تھی اور گود میں ایک ڈبہ اٹھا رکھا تھا جس میں لاکٹ ڈال رہی تھی۔ ڈبہ اسی ڈیزائنر جیولر کا تھا۔ آگے پیچھے چار ایسے ہی ڈبے رکھے تھے گویا ان کو مشکل وقت کے لئے جمع کر رکھا ہو۔

”کیسے چرایا؟“ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے اس کے سر پہ آکھڑی ہوئی۔
 ”ملک ٹیک اسکام۔“ ہنس کر بولی اور ڈھکن احتیاط سے بند کیا۔
 ”خریدنا تو تمہاری شان کے خلاف ہے۔“

”اب میں اپنی حرام کی کمائی ایک سیاستدان کی بیوی پہ کیوں خرچ کروں بھلا ہاں!“ وہ بے نیازی سے بولی اور ڈبہ لئے اٹھی۔ داتن نے ایک نظر اطراف میں ڈالی۔ کمرے کے چاروں کونوں میں لکڑی کے بند ڈبے رکھے تھے۔ نوار دات اور پیٹنٹلز جو اتنے سال میں انہوں نے اکٹھے کیے تھے۔ یہ تالیہ کا حصہ تھا۔ داتن اپنا کہاں رکھتی تھی اس نے کبھی نہیں بتایا۔ ایک سیف بھی بنا تھا جس کے لاک جدید طرز کے تھے اور اس میں تمام ہیرے جواہرات مقفل رکھے تھے۔ مگر جزیرے پہ محل خریدنے کے لئے یہ سب کم تھا۔

”میں اب ڈنر کے لیے تیار ہونے جا رہی ہوں۔“ وہ ڈبہ اٹھا کے اٹھ گئی تو داتن نے اس کے جانے کا انتظار کیا۔ پھر تیزی سے میز تک آئی۔ آنکھوں پہ چشمہ چڑھایا اور پرس سے ایک پرنٹ آؤٹ نکال کے سامنے کیا۔ تالیہ کی گردن کے پیچھے والا گول نشان۔ احتیاط سے سیڑھیوں کو دیکھا۔ تالیہ اب نہیں آئے گی۔ اس نے گہری سانس لی اور بیگ سے ایک چھوٹی مگر دبیز کتاب نکالی۔ اس کی جلد چمڑے کی تھی اور اس کے بھورے سرورق پہ زرد رنگ سے وہی نشان بنا تھا۔ نیچے قدیم جاوی رسم الخط میں لکھا تھا۔

”ہم شکار باز۔“ اس نے کتاب کے بوسیدہ صفحے کھولے۔ پہلے پہ لاہیری کی مہر تھی۔ داتن نے اگلا صفحہ پلٹا اور پڑھنا شروع کیا۔

☆☆=====☆☆

شیشوں سے ڈھکی تکون عمارت کے اندر شام کے اس پہر بھی مصروف ماحول بنا ہوا تھا۔ پارٹی کارکن کام کر رہے تھے، ٹائپنگ کی آوازیں، فون کی گھنٹیاں.... ایسا ہی رش وان فاتح کے آفس میں بھی لگا تھا۔ وہ کنٹرول چیمبر پہ پیچھے ہو کر بیٹھا تھا اور مسکرا کے سامنے بیٹھی خاتون کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا جو ہاتھ میں ننھار یکارڈر مائیک پکڑے اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔ فوٹو گرافر تصاویر اتار رہا تھا۔ انٹرویو اپنے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

”وان فاتح کیا یہ درست ہے کہ آپ استعفیٰ دے کر امریکہ منتقل ہو رہے ہیں؟“ وہ خشک ساٹ انداز میں نظریں اس پہ جمائے پوچھ رہی تھی۔ وہ اسی سکون سے پیچھے کو ٹیک لگائے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ گیا۔ گرے شرٹ پہنے، کف موڑے، بال دائیں طرف کو پیچھے کیے اس کی چھوٹی چمکتی آنکھوں میں زمانے بھر کی سادگی تھی۔

”بندئی میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا جس کو وجہ بنا کے لوگ اس خبر کو چلائیں۔“

”مگر آپ اس کی تردید بھی نہیں کر رہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“

”میں تو تعلیمی مل کا سوچ رہا ہوں۔“

”آپ کے خیال میں اشعر محمود چیئر مین بننے کے اہل ہیں؟“

”اشعر بہت قابل اور بہت میلنڈ نو جوان ہے، میرا خیال ہے وہ زندگی میں بہت ترقی کرے گا، اور میں اس کو زندگی کے ہر نیک مقصد کے لئے گڈ لک کہتا ہوں۔ اشعر میری فیملی ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے۔“ مگر اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کے ساتھ کچھ اور بھی تھا جو رپورٹر کو مزید سوالات پہ اکسار ہاتھا۔

”کیا آپ اپنی جگہ اشعر محمود کو چیئر مین کے طور پہ قبول کر لیں گے؟“

فاتح نے گردن موڑ کے سیکرٹری کو دیکھا اور مسکرا کے پوچھا۔ ”تم نے مہمانوں کو کافی پیش نہیں کی؟“ رپورٹر گہری سانس لے کر تھم گئی اور کیمرے گرانے کا اشارہ کر دیا۔ اپنا ریکارڈر بھی بند کر دیا۔ سیکرٹری سر ہلا کے فوراً باہر نکل گیا۔ کچھ لمحوں بعد ڈرے کے ساتھ آمد ہوئی جس پہ چند لمحوں رکھے تھے۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، وان فاتح۔“ وہ شکوہ کرتے ہوئے ایک مگ اٹھا کے بولی اور گھونٹ بھرا۔

”جو بات ہوئی ہی نہیں ہے، میں اس کے بارے میں رائے کیسے دے سکتا ہوں، بُدی۔“ وہ اسی طرح ٹیک لگا کے مسکرا رہا تھا۔ سیکرٹری نے اس کا مگ اس کے سامنے رکھا مگر اس نے اسے نہیں چھوا۔ وہ رپورٹر پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

”لیکن اب آپ کو اس بات کی وضاحت.....“ کہتے کہتے لڑکی نے مگ سے گھونٹ بھرنے کے لئے اسے چہرے کے قریب کیا تو چونکی۔ بالکل سُن۔ شل۔ مگ کو اوپر لاکے دیکھا۔ سرخ رنگ کا مگ جس پہ چند سمبلو بنے تھے۔ اس نے فوراً دوسرے مگ کو دیکھے جو سادہ سفید رنگ کے تھے۔ اب کے اس نے عجیب سی نظریں وان فاتح کی جانب اٹھائیں۔

”یہ مگ.....“

”اشعر نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ چند برس پہلے۔ میں آفس پہ اتنا خرچہ کرتا نہیں ہوں، اس لئے نئے مگ ٹوٹ جائیں تو یہ لوگ پرانے نکال لیتے ہیں۔“ مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے اپنا مگ اٹھایا اور پینے لگا۔ مگر لڑکی ایک ٹک اس مگ کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اور اشعر صاحب کو یہ مگ کسی نے سو وینئر کے طور پہ دیا ہوگا؟“

”ہاں۔ شاید اس کے دوستوں نے۔ مگر خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ انسان کے ہر طرح کے دوست ہوتے ہیں۔“

مگر رپورٹر نے مگ اسی طرح بھرا ہوا واپس رکھ دیا۔ اس کا دماغ چونکا ہوا لگتا تھا۔ گردن موڑ کے اس نے فوٹو گرافر کو خفیف سا اشارہ کیا۔

(اس مگ کی تصویر لو۔) اور واپس وان فاتح کی طرف متوجہ ہوئی جواب کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ”ہم اس کو ریپ اپ کر سکتے

ہیں اب؟ مجھے ایک ڈنر پہ پہنچنا ہے۔“

”سر، بس دو سوالات مزید۔“ وہ بٹاشٹ سے کہتی سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنے لگی۔ اس کو خبر مل گئی تھی۔

وان فاتح کے گھر کالان لائٹس سے جگمگا رہا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا اور ملازموں کی چہل پہل میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ عصرہ لابی میں کھڑی تالیہ سے مل رہی تھی۔ یتیم خانے والے واقعے کا اس کے چہرے پہ شائبہ تک نہ تھا۔ بھورے بال نفیس جوڑے میں باندھے، گہری نیلی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے، گردن سے موتیوں کی لڑی چپکائے، وہ خوبصورت اور باوقار لگ رہی تھی۔

”مسز عصرہ... امید ہے آپ کے مصروف شیڈیول میں خل نہیں ہوئی ہوں گی۔“ تالیہ نے اپنا سفید ہیٹ اتار کے اسٹینڈ پہ لگی کھوٹی پہ اٹکایا۔ سنہری بالوں کی فرانیسیسی چوٹی بنا کے اسے بائیں کندھے پہ ڈالے، وہ پیروں تک آتا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کندھوں پہ نارنجی رنگ کا منی کوٹ تھا۔ ایسے لباس وہاں عموماً چینی عورتیں پہنتی تھیں۔

”مجھے مہمان اچھے لگتے ہیں تالیہ بے فکر رہو۔“ عصرہ کہنے کے ساتھ اسے آگے لے آئی۔ بٹلر نے ادب سے دروازے کھولے اور وہ دونوں ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں۔ تالیہ نے میز پہ لاکٹ باکس کا بیگ رکھا تو عصرہ نے بیٹھتے ہوئے افسوس سے اسے دیکھا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی تالیہ۔“

”مجھے آپ کے شایان شان لگا تو میں نے لے لیا۔“ وہ مسکرا کے بولی تو عصرہ آگے کو بڑھی، باکس بیگ سے نکالا اور واپس ٹیک لگا کر اس کا ڈھکن ہٹایا۔ لاکٹ دیکھ کے اس ابرو پسندیدگی سے اٹھے۔

”بے عیب!“ اور مسکرا کے باکس بند کر کے ایک طرف دھرا۔ جیسے وہ قیمتی تحفوں کی عادی ہو۔

ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم کھٹکھار کے اندر داخل ہوا اور عصرہ کی طرف فون بڑھایا۔ ”آپ کے بینک سے ہے۔“

”اس وقت؟“ اس نے حیران ہو کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری جانب داتن مہذب انداز میں پوچھ رہی تھی۔ ”مسز عصرہ آپ کے اکاؤنٹ سے ایک بھاری رقم آج نکالی گئی ہے، آپ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر کنفرم کر سکتی ہیں؟“

”ایک منٹ۔ تالیہ، مجھے ایکسکیوز کرنا ذرا۔“ معذرت کرتی وہ فون کان پہ لگائے باہر نکل آئی۔

چند منٹ بعد عصرہ فون پہ خفگی سے بولتی واپس ڈرائنگ روم کی طرف جاتی دکھائی دی۔ ”آپ نے میرا اتنا وقت ضائع کر دیا اور اب کہہ رہی ہیں کہ عصرہ محمد کا معاملہ تھا؟ میں عصرہ محمود ہوں، فارگاڈ سیک۔“ اور اندر داخل ہوئی۔ ”سوری تالیہ، میں....“ چوکھٹ پہ وہ ٹھٹھک کے رکی۔

چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ در آئی۔

اس کے دونوں بچے تالیہ کے برابر صوفے پہ بیٹھے تھے۔ ایک گیارہ سال کا لڑکا اور ایک آٹھ سال کی بے حد لمبے بالوں والی بچی۔

”ارے تم لوگ ادھر کب آئے؟“

”میں نے بلوایا تھا، مجھے ان سے ملنا تھا۔ اچھی سمجنی دیتے ہیں یہ۔“ مسکرا کے وہ کہہ رہی تھی۔ عصرہ فون پہ بینک آفیسر کو جھڑکتے ہوئے سلسلہ کلام منقطع کرنے لگی اور اسی اثناء میں تالیہ آہستہ سے اپنا ہاتھ بچی کے پیچھے لے گئی۔ بچی تالیہ اور اپنے بھائی سکندر کے درمیان بیٹھی تھی۔ تالیہ نے بچی کے پرلی طرف کمر پہ زور سے چٹکی کاٹی اور پھرتی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سٹکھیوں سے سی سی ٹی وی کیمرے کا رخ بھی دیکھ چکی تھی۔

وہ گھوم رہا تھا۔ اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

جولیانہ چیخنی اور فوراً بائیں طرف بیٹھے بھائی کی ران پہ تھپڑ دے مارا۔ اس نے جواباً طیش اور شاک سے جولیانہ کا کان مروڑا۔
”ماما اس نے مجھے مارا ہے۔“

”ماما اس نے مجھے پہلے مارا تھا۔“ وہ ایک دم رونے لگی تو عصرہ خفگی سے کھڑی ہوئی۔

”بیٹا آپ گیسٹ کے سامنے کیا کر رہے ہو؟ چلو اٹھو، میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے جاؤں۔“

”اٹس اوکے مسز عصرہ۔ بچے ہیں یہ اور ان کو یہ بچپن دوبارہ نہیں ملے گا۔“ اور پھر مسکرا کے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کے بند مٹھی میں کچھ نکالا اور گھوم کے جولیانہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اوہو بے بی رو کیوں رہی ہو۔ چلو میں تمہیں ایک میجک دکھاتی ہوں۔“ آواز کو پرسرار بنایا تو سکندر گردن نکال کے چونک کے دیکھنے لگا مگر جولیانہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔ اسے کچھ نہیں سنا تھا۔

”یہ دیکھو۔ یہ چاکلیٹ میری مٹھی میں ہے نا۔“ اس نے چاکلیٹ دکھا کے مٹھی بند کی اور پھر کھولی۔ مٹھی خالی تھی۔ جولیانہ ہتھیلی سے آنسو رگڑتی رک گئی۔ سکندر کا منہ کھل گیا۔

”چاکلیٹ کہاں گئی؟“ ننھی پیاری بچی حیرت سے تالیہ کو دیکھ کے بولی۔

”سکندر کی جیب میں۔“ سکندر چونکا، جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس میں ایک چاکلیٹ تھی۔

”واؤ!“ وہ حیرت زدہ سا مسکرایا۔ تالیہ نے آنکھیں گھما کے عصرہ کو دیکھا تو وہ اسی طرح کھڑی محظوظ نظر آرہی تھی۔ ”یہ تم نے کیسے کیا؟“
”میجک۔“ اس نے ہلکے سے آنکھ دبائی۔

”میرے ساتھ بھی کریں نا۔“ جولیانہ نے بے چینی سے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں۔ پھر حسرت سے سکندر کو دیکھا جو اپنی جادوئی

چاکلیٹ کو تحیر اور خوشی سے کھول رہا تھا۔ تالیہ اس کی فرمائش پہ ذرا کنفیوژن نظر آئی، پھر پرس کھنگالا اور کچھ مٹھی میں نکالا۔

”جولی... ان کو تنگ نہ کرو۔“ عصرہ سامنے بیٹھتے ہوئے بولی مگر تالیہ نے روک دیا۔

”نہیں... ایک اور میجک ٹک تو میں دکھا ہی سکتی ہوں۔ مجھے کوئی باریک چیز دیں۔“ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا، پھر عصرہ کے

ہاتھ کو دیکھ کے ٹھہری۔ ”جولیانہ، ماما سے ان کا بریسیلیٹ لے کر آؤ۔“ (دل زور سے دھڑکا بھی تھا۔)

جولیانہ جھٹ آگے آئی اور ہاتھ بڑھایا تو عصرہ نے مسکرا کے بنا کسی تامل کے بریسیلیٹ اتار کے اس کو تھما دیا۔ وہ اسے واپس تالیہ کے

پاس لے کر آئی اور تالیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے پکڑا۔ وہ گرم نہیں ہوا۔ وہ جلا نہیں۔ وہ ٹھنڈا، شانت رہا۔ وہ عصرہ کی رضامندی سے

اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔

اس کے جادو کو انسانی ذہانت نے مات دے دی تھی۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے رومال پہ بریسلٹ رکھا، پھر رومال کو تہہ بہ تہہ بند کرتی گئی۔ عصرہ بھی آگے کو ہو کے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جولیانہ اور سکندر اس کے گرد دم سادھے کھڑے تھے۔ آنکھیں رومال کی کھلتی تہوں پہ تھیں۔ یہ کھلی آخری تہہ اور... اندر ایک ننھا پھول رکھا تھا۔ بریسلٹ غائب تھا۔ بچوں کے منہ کھل گئے۔ عصرہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

”جولیانہ... یہ پھول آپ اپنی پاکٹ میں ڈال لو۔“ جولیانہ نے خوشی خوشی اسے اٹھایا اور پاکٹ میں ڈال دیا۔

”اور ماما کا بریسلٹ؟“ سکندر بے چین ہوا۔

”وہ تو تالیہ نے چرا لیا۔“ وہ مسکرا کے بولی تو عصرہ مسکرا دی۔ بچے حیران ہوئے تو وہ ہنس دی۔

”ذرا وہ پھول نکالو جولیانہ۔“

جولیانہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس میں کوئی پھول نہ تھا۔ بلکہ اس میں چمکتا دمکتا بریسلٹ تھا۔

”واؤ۔“ سکندر نے تالی بجا ئی اور جولیانہ مسکرانے لگی۔ اس نے بریسلٹ خود پہن لیا اور عصرہ نے منع نہیں کیا۔ اسے اپنے بچوں سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔

”او کے بہت ہو گیا بچوں۔ اب آپ جاؤ۔ اور مجھے اپنی گیسٹ کے ساتھ باتیں کرنے دو۔“ عصرہ خود بھی کافی محظوظ ہوئی تھی، لیکن اب بہت ہو چکا تھا۔ بچے تالیہ کو خوش اخلاقی سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

”ٹرس کاراز پو چھنا بد اخلاقی نہ ہوتا تو میں ضرور پوچھتی۔“

”مجھے آپ خوش اخلاق ہی پسند ہیں۔“ اس نے مسکرا کے کہتے ہوئے پرس کو بند کیا (اور آستین کے اندر چھپایا اصلی بریسلٹ پرس میں گرا دیا۔) اس کی توقع کے عین مطابق بچی نے بریسلٹ ماں کو فوراً واپس نہیں کیا تھا اس لئے وہ کم از کم ابھی فرق نہیں پہچان سکے گی۔ گو کہ داتن کے نقال پہچانا مشکل تھا مگر عصرہ ایک آرٹ کلکٹر تھی۔ پھر بھی فی الحال کوئی خطرہ نہ تھا۔

☆☆=====☆☆

کھانے کی لمبی میز ڈائننگ ہال میں سچی دکھائی دیتی تھی اور اس پہ تالیہ سربراہی کرسی کی سیدھ میں بیٹھی نیپکین گود میں پھیلا رہی تھی۔ ملازم اشیاء علا لاکے رکھ رہے تھے۔ عصرہ گاڑیوں کی آواز سن کے باہر چلی گئی تھی۔

”اچھا لگا آپ کو دیکھ کے چپے تالیہ۔“ اشعر کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔ وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ تالیہ کی بے چین نظروں نے اس کے تعاقب میں دیکھا۔ وان فاتح نہیں تھا۔ پھر وہ جبراً مسکرا کے اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اتنی پر تکلف دعوت کا شکریہ اشعر صاحب۔ امید کرتی ہوں آپ آگے بھی میرا ساتھ دیں گے۔“

”اور میں یہ جاننے میں انٹرسٹڈ ہوں کہ آپ کس کی سفارش لائی ہیں۔“ وہ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا اور نیپکین اٹھالیا۔ گرے سلک ڈریس شرٹ پہنے بغیر کوٹ یا نائی کے وہ بالوں کو سامنے سے اٹھائے، کافی تیار لگ رہا تھا۔ گاہے بگاہے ایک گہری نظر اس پہ ڈالتا گویا اسے پڑھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بس ہلکا سا مسکرا دی اور سر جھکا کے نیپکین درست کرنے لگی۔

فاتح بھی ساتھ ہی گھر میں داخل ہوا تھا مگر عصرہ نے اس کو باہر روک لیا تھا۔

”میں اس کو لاکھوں کی مالیت کی دوپینٹنگز بیچنا چاہتی ہوں، فاتح پلیز، یہ بات یاد رکھنا۔“ وہ منت اور تنبیہ دونوں کر رہی تھی۔

”اچھا وہی لڑکی۔ ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ، میں کیا کروں۔“ وہ صلح جو انداز میں بولا۔

”بس اس کو خفا نہ کرنا۔ پلیز۔“

”اوکے۔ بے فکر رہو۔“ اس نے نرمی سے عصرہ کا سر تھپکا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ ”آئی لویو۔“ ذہن میں ایک لمحے کے لیے بچے

کی نیلی آنکھیں تازہ ہوئی تھیں مگر جب فاتح نے مسکرا کے جواب میں ”لو یو“ کہا اور آگے بڑھ گیا تو اس نے ساری سوچیں جھٹک دیں۔

کمرے میں آ کے اس نے کوٹ اور ٹائی اتار کے پرے رکھی، پھر ہاتھ روم میں آیا۔ واش بیسن پہ جھک کے پانی کے چھینٹے منہ پہ مارے اور گیلہا چہرہ اٹھا کے آئینے میں خود کو دیکھا۔

”یعنی اب مجھے اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے ایک obnoxious اور شو آف قسم کی بورنگ لڑکی کو کمپنی دینی پڑے گی۔ چلو۔ عصرہ کے لئے یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ تو ایہ کھینچتے ہوئے وہ گہری سانس لے کر بڑبڑایا تھا۔

”تو آپ ساری عمر باہر ہی ہیں؟ یہاں اور وہاں میں کیا فرق....“ اشعر گردن موڑ کے تالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہی رہا تھا کہ وان فاتح ڈائینگ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جو اس کی بات سن رہی تھی، بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

”ہاں تاشہ کیا حال ہے... بیٹھو بیٹھو....“ ہاتھ کے اشارہ سے اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ کرتا وہ سربراہی کرسی تک آیا اور اسے کھینچ کے بیٹھا۔ کوٹ اتار چکا تھا۔ سفید شرٹ کے کف موڑ رکھے تھے۔ بال جو صبح گیلے کر کے جمائے تھے اب سوکھ کے ماتھے پہ بکھرے تھے اور وہ اس عام سے حلیے میں بھی سحر انگیز لگ رہا تھا۔

ایڈم کسی کو نے سے نمودار ہوا پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ تالیہ کو وہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اور تالیہ بس فاتح پہ نظریں جمائے واپس بیٹھ رہی تھی۔ اشعر بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ عصرہ میز بانی کے فرائض سرانجام دیتی ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی۔

”تو کب آئی تم؟ میں زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گیا؟“ دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے فاتح نے نیپکین گلاس سے نکال کے جھٹک کے گود میں بچھایا اور ڈش سے چاول پلیٹ میں نکالنے لگا۔ جانتا تھا سب کھانا شروع کرنے کے لیے اس کے منتظر تھے۔

”آپ مجھے بار بار تاشہ بلاتے ہیں، میرا نام تالیہ ہے۔“

”اچھا مجھے لگا میں تالیہ ہی کہہ رہا ہوں۔ خیر۔ کھانا شروع کرو۔ اشعر... لو۔“ وہ سب کو عام سے انداز میں ہدایات دیتا خود شروع کر چکا

تھا۔ تالیہ بھی آہستہ سے کھانا نکالنے لگی۔ ہاتھوں میں ذرا سی لرزش تھی۔ حلق بار بار سوکھ رہا تھا۔ یہ شخص.... اُف یہ شخص....

”تو کیا بنا عصرہ تمہاری نیلا می کا؟ کل تک میں سن رہا تھا کہ تمہاری دوست ناراض ہو گئی ہیں۔ وہ معاملہ حل ہوا؟“ وہ بیک وقت عصرہ اور

تالیہ دونوں کو دیکھ کے بولا تھا۔ ساتھ ہی چاولوں کا چھج منہ میں رکھا۔

”ہاں، وہ غلط فہمی تھی، ایڈم نے کلیئر کر دی تھی۔“ عصرہ خوشگوار انداز میں بولی تھی۔ فاتح کا اچھا موڈ دیکھ کے وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

”اسے بھول جائیے۔“ اس نے مسکرا کے ایک نظر کوٹنے میں کھڑے ایڈم کو دیکھا جس نے نظریں مزید جھکا لیں۔ ”ہم تو اب نیلامی کا سوچ رہے ہیں۔ مسز عصرہ....“ وہ اپنائیت بھرے انداز میں کہتی عصرہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”میں مدد سے پہ آتی ہوں۔ مجھے برصورت گھائل غزال خریدنا ہے۔“ پھر ایک نظر اشعر کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔ ”میں سفارش ہی کر سکتا ہوں، آگے کا کاکی مرضی۔“

”تالیہ.... مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ اس پینٹنگ کو خرید وگی مگر میں اس کو نیلامی واؤچر میں ڈال چکی ہوں۔ لوگ دور دور سے آئیں گے۔ اگر اب میں اس کو نکال دوں تو میری کریڈیٹ بیلٹی پہ برا اثر پڑے گا۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں۔“ پھر وہ رکی۔ ذرا افسردہ نظر آتی تھی۔

”کیا میں کچھ اور کر سکتی ہوں تالیہ؟“ عصرہ نے دلجوئی والے انداز میں لقمہ لیتے ہوئے پوچھا تو وہ جھینپ کے مسکرا دی۔

”میں ایک دفعہ اس پینٹنگ کو چھوٹا چاہتی ہوں۔“

”اتنی سی بات؟ میں ابھی لاتی ہوں۔ وہ میرے پاس ہی ہے۔“ عصرہ نے پلیٹ پر رکھے کائی، نشو سے لب تھپتھائے اور کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ اس پینٹنگ میں اتنا خاص کیا ہے۔“ فاتح پلیٹ پہ جھکے کندھے اچکا کے بولا تھا۔ وہ ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔

”اس میں ایک بے بس خوبصورت ہرن اکیلا زخمی حالت میں پڑا ہے، اور وہ زندہ ہے.... وہ مرا نہیں ہے.... تنہائی، بے بسی، محرومی.... ان احساسات کا سمجھ رہے وہ پینٹنگ۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

”اچھا مجھے پتہ ہے کیا لگتا ہے؟“ اس نے لقمہ لیا، پھر خاموشی سے چبانے لگا۔ حلق سے تلے اتار لینے کے بعد آنکھیں اٹھا کے تالیہ کو دیکھا اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آرٹ اچھا شوق ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں، مگر جن آرٹسٹ کی زندگی میں ان کو کوئی پوچھتا نہیں تھا، ان کے مرنے کے بعد ان کی بنائی اچھی اور بے کار دونوں طرح کی اشیاء کو اتنے کریزی ہو کر خریدنا.... یہ مجھے نمود و نمائش لگتا ہے۔ جیسے لوگ دیکھا دیکھی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی فاتح صاحب۔ قدیم ادوارست ادوار تھے۔ لوگ جلدی مشہور نہیں ہو پاتے تھے۔ لیکن ہزاروں مصورتب بھی موجود تھے مشہور صرف بہترین ہوئے ہیں۔“

وہ دونوں میز کے دونوں سروں پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے یوں کہ طویل میز درمیان میں حائل تھی۔ وسط میں اونچا سا کینڈل برا رکھا تھا جس پہ اوپر نیچے تین موم بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ فاتح کا چہرہ ان کے شعلوں کے پار دیکھ رہی تھی۔

اشعر فاتح کے بائیں جانب بیٹھائیں میچ میں گیند کا تعاقب کرنے والی نظروں سے خاموشی سے دائیں بائیں... دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

”مشہور؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا اور باربی کیو کا ٹکڑا چھری کانٹے سے توڑتے ہوئے بولا۔ ”صدیوں پہلے ایک اطالوی مصور نے ایک پینٹنگ بنائی تھی جس نام مونا لیزا تھا۔ چار سو سال تک وہ غیر مقبول رہی۔ مصور اسے سراہتے تھے مگر عوام اس کو جانتے تک نہ تھے۔ وہ پیرس کے Louvre میوزیم میں لگی ایک عام پینٹنگ تھی، مگر پھر اس کو کس نے مشہور کیا؟“

”چوروں نے۔“ وہ سکون سے بولی۔ ”انہوں نے مونا لیزا چوری کر لی۔“

”رائٹ۔ مونا لیزا جب غائب ہوئی تو وہ ایک خبر بن گئی۔ ایک خواب بن گئی۔ اخباروں کی زینت، گفتگوؤں کا محور۔ سب اس میں دلچسپی لینے لگے۔ میں مانتا ہوں وہ ایک بہترین پینٹنگ ہوگی گو کہ مجھے اس کی کبھی سمجھ نہیں آئی، لیکن ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اور چوروں نے اسے مشہور کیا تھا۔ مگر وہ اسے بچ نہیں سکے اور دو سال بعد وہ برآمد کر لی گئی۔“

”انہوں نے اسے بیچنے کے لئے نہیں چرایا تھا وان فاتح۔ انہوں نے اس کو پھر سے تخلیق کرنے کے لئے چرایا تھا۔“ وہ اب کہنیاں میز پر لکائے دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر رکھ کے ان پر تھوڑی جمائے کہہ رہی تھی۔ کھانا اسے بھول چکا تھا۔ وہ چاولوں کا چھچھو بھرتا ذرا چونکا۔

”انہوں نے مونا لیزا کی جیسے نقالیں تیار کیں اور بے وقوف امریکی بزنس مینوں کو بیچ دیں۔ کئی بلین ڈالر کے عوض۔“

”اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ انسان اتنی قیمتی چیزیں خریدتا ہی کیوں ہے جو کبھی بھی کوئی بھی چرا کے لے جائے۔“ وہ شانے جھٹک کے بولا۔

”لگتا ہے آپ کو چور بہت برے لگتے ہیں۔“ آواز میں اداسی سی تھی۔

”چوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے، تا شہ۔“

”مگر آپ ہماری وزیراعظم صاحبہ کو بروقت چور کہتے رہتے ہیں، مگر وہ اپنے کاروبار کو تقویت دینے کے لئے ایسے لوگوں سے پیسے چراتی ہیں جو پیسے کو مس نہیں کرتے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے ہیروں کی دوکان سے کوئی ایک ہیرا چرا لے۔ اتنے بڑے جوہری کو ایک ہیرے کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے وان فاتح؟“ وہ اس کی آنکھوں سے نظر ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔ فاتح نے چیچ پلٹ میں گرا دیا اور سنجیدگی سے تالیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”جوہری کو فرق پڑے یا نہ پڑے، مگر وہ تمام نوکری پیشہ لوگ جو اس ہیروں کی دکان کی حفاظت پہ مامور ہیں میکیو رٹی گارڈ، کیشیئر، سیلز مین... کیا ان کی نوکریاں نہیں چلی جائیں گی؟“

تالیہ کے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ وہ پلک تک نہ جھپک پائی۔

”ٹھیک ہے۔ وزیراعظم چور ہے۔ بہت بری ہے وہ۔“ حلق میں شاید وہ آنسو تھے۔ ”لیکن اگر وہ کہے کہ وہ اچھی ہونا چاہتی ہے....“

چوری چھوڑ کے نیک ہونا چاہتی ہے... تو کیا اسے معاف نہیں کیا جاسکتا؟“

”میں کون ہوں معاف کرنے والا؟ اس نے میرا نہیں عوام کا پیسہ چرایا ہے۔ اگر وہ سارا پیسہ واپس کر دے اور...“

”ہاں... اگر... اگر وہ سارا پیسہ واپس کر دے تو کیا وہ تب بھی بری ہوگی؟“

”ناشہ!“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”وہ صرف چور نہیں ہے وہ جھوٹی اور خائن بھی ہے اور جھوٹے لوگوں کے لئے جھوٹ چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ناممکن نہیں مگر بہت مشکل۔ اور جانتی ہو ان کی سب سے بڑی سزا کیا ہوتی ہے؟ جب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا بچ بولنا چاہیں تو ساری دنیا ماننے سے انکار کر دے۔ میرے معاف کرنے کے باوجود اس کو اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔“

تالیہ کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ ”آپ کو چور اتنے برے کیوں لگتے ہیں؟“

”کیونکہ وہ صرف آپ سے آپ کے پیسے نہیں چراتے۔ وہ ان پیسوں سے جڑے آپ کے خواب چرا لیتے ہیں۔“

”اور خواب چرانے والوں کی کیا سزا ہونی چاہیے؟“ وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

”ان کا...“ (فاتح نے آنکھوں سے اشعر کو دیکھا) ”دایاں ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔“

الفاظ کی ٹھنڈک پہ اشعر نے ذرا چونک کے اسے دیکھا مگر اب وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں کھڑکا ہوا تو تالیہ جبراً چہرے پہ مسکراہٹ لے آئی۔ عصرہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ ساتھ بٹلر تھا جس نے لکڑی کا ڈبہ اٹھا رکھا تھا۔ ملازم نے فوراً تالیہ کے سامنے جگہ خالی کی اور بٹلر نے ڈبہ ادھر رکھا۔

”مجھے امید ہے تم بور نہیں ہوئی ہوگی تالیہ۔“ وہ اپنی کرسی پہ واپس بیٹھتے ہوئے بولی تو تالیہ نے ”ہرگز نہیں۔ فاتح صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔“ کہتے ہوئے پینٹنگ کا ڈھکن ہٹایا۔ اندر شیشے پہ پینٹ کردہ زخمی برن اسی طرح تڑپتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ وہی تھا جو اس نے پینٹ کیا تھا۔ وہ ایک ایک رنگ کو پہچانتی تھی۔

”بے عیب!“ پینٹنگ کی سطح پہ ہاتھ پھیر کے وہ ستائش سے بولی تھی۔ عصرہ مسکرا کے کھانا کھانے لگی۔ تالیہ نے ایک نظر چھری کو دیکھا جو ساتھ رکھی تھی اور پھر پینٹنگ کو۔ وہ ابھی چھری سے پینٹنگ کے فریم کو کاٹ کے اندر چھپا ہوا میٹرل ان کو دکھا سکتی تھی جو ظاہر کر دیتا کہ وہ نقلی تھی۔ مگر اس سے پہلے اسے ایک اور کام کرنا تھا۔ فاتح کی ساری باتوں کو بھلا کے اس نے مسکراتا چہرہ اٹھایا۔ ”اگر میں کوئی بڑی سفارش لاؤں تب بھی آپ اس کو مجھے نہیں دیں گی؟“

”مثلاً کس کی سفارش؟“ اشعر دیر بعد بولا تو تالیہ نے مسکرا کے فون اٹھایا اور کال ملا کے اسے چہرے کے سامنے کر لیا۔ اسپیکر آن تھا اور وہ تینوں رنگ ٹون سن سکتے تھے۔ وہ فیس ٹائم پہ کال ملا رہی تھی۔ فاتح اب سکون سے کھانا ختم کر رہا تھا۔

چند لمحے بعد اسکرین پہ ایک گندی رنگت کے آدمی کا چہرہ نمودار ہوا۔ ”مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا تالیہ۔ تم ضروری بات کرنا چاہتی تھیں؟“ سلام کے بعد وہ بولا تھا۔ تالیہ نے مسکرا کے اسکرین عصرہ کے سامنے کی۔ ”یہ شیخ جاسم ہیں میرے اچھے جاننے والے۔ وہ گھائل غزال انہی

کی ملکیت تھی۔ انہوں نے ہی دی ہوگی نا آپ کو؟“ ساوگی سے پوچھا۔ عصرہ کھاتے کھاتے رکی۔ بھنویں سکڑیں۔ چہرہ سامنے کیا۔ پھر آنکھوں میں تعجب اور بے یقینی در آئی۔

”السلام علیکم۔ آئی ایم سوری مگر.... میں ان سے تو نہیں ملی۔ وہ تو کوئی اور تھے۔“ وہ ایک دم الٹ نظر آتی تھی۔ فاتح چونکا مگر اشعر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پرسکون۔

”جی مسز عصرہ آپ مجھ سے نہیں ملیں۔ آپ میرے کزن جاسم الثانی سے ملی تھیں اور وہ پینٹنگ اس نے آپ کو ہمارے پورے خاندان کی طرف سے عطیے میں دی تھی۔“ تالیہ جو مسکرا کے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی ان الفاظ پہ اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ فوراً سے اسکرین اپنی طرف موڑی۔

”اوہ.... وہ آپ کے کزن تھے؟“ دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ (یہ سب ملے ہوئے تھے؟)

”جی بالکل۔ اب آپ کو مجھ سے کیا فیور چاہیے تالیہ۔“

وہ اس لمحے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا وہ شیخ کو اس کے ملازم کے اسکام سے آگاہ کرنے جا رہی ہے مگر یہاں تو.....

”چونکہ آپ کے ہاتھ سے مسز عصرہ نے پینٹنگ وصول نہیں کی اس لئے میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں فی الوقت۔“ الوداعی کلمات کہہ کر اس نے فون بند کیا، ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ بدقت مسکرا کے عصرہ کو دیکھا۔ ”میں آپ کی خواہش کا احترام کرتی ہوں۔ میں کوئی سفارش کیے بغیر نیلا می میں دوسرے لوگوں کی طرح ہی حصہ لوں گی اور چاہے جتنی قیمت ادا کرنی پڑے میں کروں گی۔“

”تالیہ....“ عصرہ کچھ غیر آرام دہ لگ رہی تھی۔ جیسے سوچ میں الجھی ہو۔ ”تمہیں کوئی شک ہے پینٹنگ کے بارے میں کیا؟ مطلب تم آرٹ کی پہچان رکھتی ہو اگر کچھ ٹھٹک رہا ہے تو پینٹنگ تمہارے سامنے رکھی ہے۔ بتاؤ۔“

”جی تالیہ.... بتائیے۔“ اشعر بھی اتنی توجہ سے بولا تھا۔ اس نے باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھا اور پھر.... فاتح کو۔ وہ پھلوں کے رس کے گھونٹ بھرنا خاموش آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ تالیہ پینٹنگ پہ جھکی اس کو بابر نکالا اور ذرا اوپر اٹھایا۔ عصرہ ہاتھ روک چکی تھی۔ سانس بھی تھم چکا تھا۔

وہ چند لمحے پینٹنگ اور اپنے ساتھ رکھی چھری کو دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پینٹنگ واپس رکھی اور گہری سانس لے کر ان تینوں کو دیکھا۔

”یہ اصلی ہے۔ سو فیصد اصلی۔“

عصرہ کی سانس بحال ہوئی اور اشعر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ (اس کو آرٹ کی پہچان نہیں ہے، شاید صرف فیشن کی ہے۔ مگر اچھا ہے۔)

فاتح نیپکین سے ہونٹ تھپتھپاتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”مجھے اجازت!“ پھر رک کے تالیہ کو دیکھا۔ ”اچھا لگا تم سے مل کر۔ نیلا می میں ملاقات ہوگی اب۔“ رسماً کہہ کر وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے زیادہ پر فارمنس وہ نہیں دکھا سکتا تھا اور عصرہ مطمئن تھی۔

”مگر آپ مجھے ایک اور فیور تو دیں گی نامسز عصرہ۔“ وہ سوچ سوچ کے بولی تھی۔

☆☆=====☆☆

تالیہ مراد کے جانے کے بعد اشعر عصرہ سے مل کر دروازے تک آیا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ شیخ جاسم کا میسج آیا تھا۔ اس نے مسکرا کے جواب لکھا۔ ”میں جانتا تھا ہماری ڈونر آپ کی ہی سفارش لائے گی۔ مدد کا شکریہ۔ میری حکومت میں آپ کو اس مدد کا اچھا بدلہ ملے گا۔“ وہ اچھے موڈ میں لگ رہا تھا۔ پیغام بھیجا ہی تھا کہ ایک کال آنے لگی۔ موبائل کان سے لگا کے ہیلو کہا مگر دوسری جانب سے کہے گئے الفاظ سن کے رنگت بدلتی گئی۔

”کون سالگ؟“ چہرہ سفید پڑا پھر سرخ۔ ”وہاٹ؟“ وہ دھاڑا۔ پھر فون بند کیا اور تیزی سے واپس آیا۔ عصرہ کمرے میں جا چکی تھی اور ایڈم گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایڈم کو بازو سے تھام کے روکا۔

”آجنگ کہاں ہے؟“ اشعر کے تیور دیکھ کے وہ ٹھٹھک گیا۔ ”وہ اسٹڈی میں....“ اشعر نے اسے چھوڑا اور آگے دوڑا۔ دیوانہ وار زینے بھلانگے اور دھاڑ سے اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔

وہ سامنے اپنی کرسی پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ایک نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”اخبار میں موجود تمہارے ذرائع نے خبر دے دی تمہیں؟“ ٹھنڈے انداز میں سوال کیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے سر پہ آپہنچا۔

”آپ نے.... آپ نے ان کو میرا لگ دکھایا؟“ میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے وہ جھکا اور غصے سے غرایا۔ فاتح نے عینک اتار کے پرے رکھی اور ٹیک لگا کے اسے فرصت سے دیکھا۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا، کوئی الزام نہیں لگایا۔ تم اس اینٹی چائینز تنظیم کے ساتھ منسلک تھے، ایش!“

”وہ برسوں پرانی بات ہے۔“ اس نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ ”وہ بچپن کا ایک کریز تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ مگر آپ نے اسے کھول دیا۔ واؤ۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ کل پورا ملک مجھے racist کہہ رہا ہوگا۔ سارے چینی اکٹھے ہو جائیں گے کہ میں چینی قوم سے نفرت کرتا ہوں۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔“ وہ سیدھا ہوا اور پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔

فاتح کال تلے تین انگلیاں رکھے اسے دیکھ گیا۔ ”ایک لڑکا تھا.... بہت ذہین، بہت....“ اشعر تورا کے گھوما اور غصے سے اس کو دیکھا۔

”مجھے اس وقت آپ کی کوئی کہانی نہیں سننی۔“

”.... بہت عقلمند، بہت پھریتلا سا۔ اپنے ماں باپ کے بعد وہ سب سے زیادہ اپنی بہن سے قریب تھا۔ اکثر چھٹیاں گزارنے امریکہ آتا تھا۔“

اشعر ہنسنے لگا۔ ”انکھیں ابھی تک غصے سے لبریز تھیں مگر اب وہ سن رہا تھا۔

فاتح کے پیچھے کھڑکی کے شیشے پہ پٹ پٹ بارش برسنے لگی تھی۔

”جب میں رات دیر تک کام کرتا رہتا... تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھ سے پوچھتا تھا، ”آبنگ آپ اتنی محنت کس چیز کے لئے کر رہے ہیں؟ میں اس کو بتاتا کہ میں اسٹیٹ انارنی (شہر کے پراسیکیوٹر) کا الیکشن لڑ رہا ہوں۔ وہ پوچھتا، ”آبنگ لوگ الیکشن کیوں لڑتے ہیں؟ تو میں کہتا، مختلف وجوہات ہوتی ہیں مگر ایک وجہ سب میں مشترک ہوتی ہے۔“ اس کی نظریں اشعر پہ جمی تھیں، جو اسے لب بھنچے دیکھ رہا تھا۔

”اور وہ ہے... طاقت حاصل کرنے کا جنون۔ خود مختاری اور طاقت... یہ سب کو اچھی لگتی ہے۔ تب وہ نو جوان لڑکا مجھ سے کہتا تھا، ”آپ میں اور آپ کے مقابل میں پھر کس شے کا فرق ہے اگر آپ دونوں کو طاقت ہی چاہیے ہے۔“

قطرے زور زور سے کھڑکی پہ برس رہے تھے گویا شیشے کو چکنا چور کر ڈالنا چاہتے ہوں۔ اشعر کا تنفس آہستہ ہو چکا تھا۔ رنگت بحال ہو رہی تھی۔ وہ بس خاموش نظروں میں چیہن لئے فاتح کو دیکھے جا رہا تھا۔

”تب میں نے اس کو بتایا کہ جو میرا مخالف ہے وہ ایک دفعہ اسٹیٹ انارنی رہ چکا ہے اور اس نے بڑے بڑے مجرموں کے کیس رشوت لے کر بند کیے ہیں۔ اس کو طاقت اپنی دولت بڑھانے کے لئے چاہیے۔ مجھے طاقت زمین پہ اللہ کا انصاف قائم کرنے کے لئے چاہیے۔ پھر اس نے پوچھا۔ انسان کو معلوم کیسے ہوتا ہے کہ اس کو طاقت کیوں چاہیے؟ میں نے کہا، ”اس کے طریقے سے۔ تب جانتے ہو اشعر اس لڑکے نے مجھے کیا کہا تھا؟“ اس کی آواز میں دکھ در آیا اور اشعر... اس کی فاتح پہ جمی آنکھوں میں گلابی نمی اترنے لگی۔ پلکیں بھینگنے لگیں۔

”اس لڑکے نے کہا۔ ”آبنگ اگر میں کبھی طاقت کی ہوس میں مبتلا ہو جاؤں تو مجھے روک لیا۔“

باہر بجلی زور کی کڑکی۔ پل بھر میں سارا شہر روشن ہو گیا، اشعر کی آنکھ کے کنارے پہ ایک آنسو اٹکا ہوا تھا۔ اگلے ہی پل پھر سے اندھیرا چھا گیا۔ آنسو اس نے اندر اتار لیا۔

”آپ کو لگتا ہے مجھ میں اور آپ میں فرق ہیں؟“ وہ سابقہ غراہٹ سے بولا تھا۔ ”آپ وائٹ مائٹ ہیں اور میں سیاہ بھیر؟ مگر نہیں۔ ہم دونوں ایک جیسے ہیں کیونکہ ہم دونوں کو ایک ہی چیز چاہیے۔ آپ نے وزیر اعظم بن کے وہی کرنا ہے جو موجودہ وزیر اعظم کر رہی ہے۔ کرسی لینے کے بعد سب ایک سے ہو جاتے ہیں ”آبنگ۔“ پھر اس نے افسوس سے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ”مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ یوں مجھے تباہ کرنے کی کوشش کریں گے!“

”اوہ لیکن میں تمہیں تباہ نہیں کر رہا۔“ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”میں یہ بات لائیوٹی وی پہ بھی کہہ سکتا تھا مگر میں نے اس اخبار کا انتخاب کیا جہاں تمہیں وقت سے پہلے خبر مل جائے گی مگر اس رپورٹر کو چنا جو خبر لگائے گی ضرور۔ میں نے ایش تمہیں ایک موقع دیا ہے۔“

وہ ٹیک لگائے، نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ”کل جب تم ایک اسکینڈل کی زد میں ہو گے اور تمہیں racist کا خطاب مل جائے گا اور تم چائنیز اکثریت ووٹر کھودو گے تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کو فکس کیسے کرو گے۔ ایک بزنس مین کی طرح یا ایک لیڈر کی طرح؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے حق میں دستبردار ہو جاؤں تو پہلے مجھ پہ ثابت کرو کہ تم... مجھ سے... بہتر ہو۔ تب میں اس بارے میں سوچ سکتا ہوں

ورنہ....“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے کھڑے اشعر کے برابر آ کر اس کا چہرہ افسوس سے دیکھا۔ ”ورنہ پھر ہم دونوں کرسی کے لئے لڑیں گے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لڑنا تمہارا حق ہے، مگر میں یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے لڑو گے۔ میں نے اس لڑائی میں آریا نہ کوکھویا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کچھ کھونے کی اہلیت رکھتے ہو یا نہیں۔“

مگر وہ جواباً نفرت سے پھنکارا تھا۔ ”مجھے معلوم تھا، ہم ایک دن اس مقام پہ ضرور آئیں گے۔ آپ کو معلوم نہیں تھا۔ میں تیار ہوں، آپ نہیں۔“ ہاتھ اٹھا کے اشارے سے سلام کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسٹنڈی سے باہر نکل گیا۔ فاتح ہلکا سا مسکرایا اور واپس کرسی پہ بیٹھا۔ (تیار تو دور کی بات ایش... میرے پاس کوئی کارڈ بچا ہی نہیں ہے کھیلنے کے لئے۔ میں نے ساری عمر تم پہ اعتبار کیا اور تم نے ہر طرف سے مجھے مفلوج کر دیا۔) کھڑکی کے باہر بارش کو دیکھتا وہ زخمی سا مسکرا رہا تھا۔ خود پہ۔ زندگی پہ۔ برشے پہ۔

☆☆=====☆☆

وہ لاونج میں داخل ہوئی اور پرس اٹھا کے زور سے فرش پہ پھینکا، پھر غصے و بے بسی کے عالم میں صوفے سے کشن اٹھا کے دیوار پہ مارا۔ آوازیں سن کے داتن نیچے تہہ خانے سے اوپر آئی تو دیکھا وہ سردونوں ہاتھوں میں گرائے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ ”بریسلیٹ نہیں ملا؟“ تالیہ نے چہرہ اٹھایا تو آنکھیں گلابی پر رہی تھیں۔

”مل گیا ہے۔“

”یعنی کرائے بے بی اس کام کام کر گیا۔ گڈ۔ پھر منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟“ وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”پینٹنگ کی اصلیت نہیں کھول سکی۔ وہ شیخ ملا ہوا تھا۔ اس نے نوفل کی اسٹوری کو پکا کر دیا۔“

داتن کا منہ کھل گیا۔ ”اوہ۔ مگر تم یہ تو بتا سکتی تھیں کہ پینٹنگ نقلی ہے۔“

”کیسے بتاتی؟“ وہ زبردست ہوئی۔ ”میں سچ بولتی کب ہوں جو اتنا بڑا سچ بولتی؟ بڑی ہمت چاہیے ہوتی ہے سچ کے لئے داتن۔ اور میرے

پاس وہ نہیں تھی۔“ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ داتن نے افسوس سے گہری سانس لی۔ ”میری بچی۔ خود کو معاف کرنا سیکھو۔“

وہ جواباً تلخی سے کچھ کہنے لگی تھی کہ دروازے پہ گھنٹی بجی۔ داتن اٹھنے لگی مگر وہ آنکھیں رگڑتی کھڑی ہو گئی۔ ”تم بیٹھو۔ ملازمہ تھوڑی ہو تم جو

بٹلر نہیں ہو کا تو تم یہ کام کرو گی۔ میں خود دیکھتی ہوں۔ اور شاید تھوڑی دیر واک پہ چلی جاؤں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔“ خود کو سنبھالتی

وہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

پورچ اندھیر پڑا تھا۔ صرف ایک بتی روشن تھی۔ وہ قدم قدم اٹھاتی گیٹ تک آئی مگر پھر.... ٹھہر گئی۔ رفتار سست پڑ گئی۔

گیٹ اور چار دیواری چھوٹی اور برائے نام تھی۔ سامنے کھڑے شخص کے سینے تک اونچی تھی۔ اور وہ شخص... تالیہ کی سانس منجمد ہو گئی۔

وہ درمیانی عمر کا مرد تھا۔ سانولا، چمکتی آنکھوں والا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

”میں نے سنا جب کہ اشعر محمود کسی تالیہ مراد کی تفتیش کروا رہا ہے تو میں کھٹک گیا تھا۔ سوچا ہونہ ہو یہ وہی تالیہ ہے۔ میری سابقہ بیوی۔“

وہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”سمجھ!“ لب پھڑ پھڑائے۔

”اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ تم میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یعنی شادی وغیرہ کرنا چاہتا ہے۔ تو میں نے تمہارا پتہ اچکا اور یہاں آ گیا۔ اور اب سوچ رہا ہوں کہ پہلے کیوں نہیں آیا۔“ ستائش سے اس نے گردن اٹھا کے اونچے بنگلے کو دیکھا جو بت بنی تالیہ کی پشت پہ کھڑا تھا۔

”بڑا مال بنالیا ہے تم نے۔ تھینا امیر دوست بنائے ہوں گے ان کو محبت کے جال میں پھنسا دیا ہوگا اور پھر لوٹ کے چھوڑ دیا ہوگا۔ تم جیسی خوبصورت مگر اکیلی لڑکیاں اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ لیکن کیا ہے تالیہ کہ....“ وہ گیٹ کے جنگلے پہ ہاتھ رکھے آگے بڑھا۔ وہ اس سے دو میٹر کے فاصلے پہ تھی، پھر بھی ایک لخت پیچھے ہٹی۔ آنکھوں میں خوف تھا۔

”اس دفعہ بندہ غلط چنا ہے تم نے۔ سیاستدان؟ چیچ چیچ۔ جانتی ہو سیاستدانوں کو فرشتہ صفت بیویاں چاہیے ہوتی ہیں۔ کیا اسے معلوم ہے تم پہلے بھی ایک شادی کر چکی ہو اور منی لانڈرنگ میں انوالوڈ رہی ہو۔ تھینا نہیں۔ یونو واٹ.... میرے پاس نکاح کی ویڈیو تک پڑی ہے مگر طلاق کہیں رجسٹر نہیں ہوئی تھی۔ اگر چاہوں تو میں تمہیں ابھی بھی اپنی بیوی کلیم کر سکتا ہوں، اور ایک دفعہ یہ ذکر کھلا تو وہ سیاستدان تمہیں باہر اٹھا کے پھینک دے گا۔ لیکن....“ وہ رکا۔ دو انگلیوں سے تھوڑی کھجاتے ہوئے مسکرایا۔ وہ برف کا مجسمہ بنے سن رہی تھی۔ ”لیکن اگر.... تم میرا کوئی ماہانہ وظیفہ مقرر کر دو یہی کوئی دو تین لاکھ ہر ماہ کے.... تو میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ ابھی تم ذرا شکد ہو گئی ہو، خیر سے سنبھل لو، پھر آؤں گا میں۔ اتنے برسوں بعد دیکھا ہے تمہیں۔ بیٹھ کے گئے دنوں کی باتیں بھی کریں گے۔ اچھا، چلتا ہوں۔“ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور مڑ گیا۔

اب وہ ٹہلتا ٹہلتا سڑک پہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا اور تالیہ.... وہ شل کھڑی تھی۔

جیسے کاٹو تو لبو نہیں۔

مارو تو جان نہیں۔

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

☆☆=====☆☆

حالم (نمرہ احمد)

قسط نمبر: 4

”میراثِ پدرِ من“

باب:

اس نے دیکھا....

ایک نیم اندھیر کمرہ ہے جس کی چوکھٹ پہ وہ ننھی لڑکی کھڑی ہے.... کھلے لمبے بال اور پیروں تک آتا لباس....
اند ایک آدمی پشت کیے بیٹھا ہے.... اس کے آگے آگے جل رہی ہے اور وہ جھک کے سلاخ پہ کسی شے کو دھکا رہا ہے....
چھوٹی لڑکی قدم قدم چلتی اس کے کندھے کے پیچھے آرکتی ہے....
”باپا!“ اس کے پکارنے پہ وہ چونک کے گردن موڑتا ہے.... جیسے برے خواب سے جاگا ہو.... پھر جبراً مسکراتا ہے۔
”تم سوئیں نہیں، تالیہ؟“

”یہ لوگ کون تھے جو ابھی یہاں سے گئے ہیں؟“ اس کی کم عمر باریک آواز گونجتی ہے تو وہ زیادہ چونکتا ہے، پھر اس کا ہاتھ تھام کے اسے ساتھ بٹھاتا ہے۔

”میرے دوست تھے... فوج کے ساتھی!“ اور سلاخ کو انگاروں پہ پلٹتا ہے۔ اس کے سرے پہ سونے کے سکے جیسا کچھ ہے۔
بچی، تھیلیوں پہ چہرہ گرا کے سوچ میں ڈوبی کہتی ہے.... ”مگر وہ سپاہی تو نہیں لگتے تھے۔ میں نے خود سنا تھا، وہ بار بار پمبورو کہہ رہے تھے۔“

”یا اللہ تالیہ....“ مراد کے ہاتھ میں پکڑی سلاخ لرزتی ہے.... گھبرا کے ادھر ادھر دیکھتا ہے....

”یہ پمبورو (شکار باز) کون ہوتے ہیں، باپا؟“

”دشش....“ اس نے بوکھلا کے اسے چپ کرایا۔ ”تم یہ لفظ اب نہیں بولو گی۔ اگر شہر میں کسی نے سن لیا تو ہم سب مار دیے جائیں گے۔“

”مگر باپا.... وہ کسی خزانے کی بات کر رہے تھے؟“ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ ”مجھے بتاؤ باپا.... کیا کوئی خزانہ ہے باپا؟“

آدمی گہری سانس لیتا ہے اور سلاخ آگ سے اوپر اٹھا کے دکھاتا ہے.... اس کے سرے پہ گول سکڑا اور ڈلی جڑی ہے۔ سنہری چابی۔

”جب یہ چابی تیار ہو جائے گی تو ہم اس کی مدد سے خزانہ ڈھونڈ لیں گے۔ اور پھر ہمارے شہر کے لوگوں کو عافیت مل جائے گی۔“

بچی کی آنکھیں دہکتی چابی پہ جم سی جاتی ہیں۔ لب کھل جاتے ہیں۔ تھیرے ستائش سے....
”یہ چابی کس کی ہے؟“

”انسانوں کے سب سے بڑے خزانے کی.... میں اس کو اپنے لوگوں کی مدد کے لیے تیار کر رہا ہوں.... چاند کی اکیسویں پہ یہ تیار ہو جائے گی.... پھر یہ ہمیں خود خزانے تک لے جائے گی۔“
”وہ کیسے؟“ وہ دلچسپی سے پوچھتی ہے۔

”جو اس چابی کو پہلی دفعہ پہنتا ہے وہ اس کو راستہ خود دکھاتی ہے اس کو اس جگہ خود لے جاتی ہے جہاں خزانے کا قفل ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔ سب امیر ہو جائیں گے۔“ وہ دھیرے دھیرے سمجھا رہا ہے۔

”اے سب سے پہلے کون پہنے گا؟“ اس کی نظر دہکتی چابی پہ ٹکی ہے جس کو وہ دوبارہ آگ میں ڈال رہا ہے.....
”میں.... صرف میں.... تم اس کے قریب بھی نہیں آؤ گی.... اب جا کر سو جاؤ....“ وہ آخر میں درشتی سے کہتا ہے مگر اس کی نظریں ابھی تک چابی پہ ٹکی ہیں جس پہ چند ہند سے بار بار ابھر کے مٹ رہے ہیں.... جیسے وہ بہت سے الفاظ اپنے اندر چھپی جا رہی ہو.....
وہ عجیب سے ہند سے تھے.....

☆☆=====☆☆

تالیہ واپس لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ وہ نہ تھا جس کے ساتھ وہ گھنٹی بجنے پہ اٹھ کے باہر گئی تھی۔ وہ برف کی مانند سفید پڑ رہی تھی۔
۔ ٹھنڈی۔ بے جان۔

داتن اسی اثناء میں دوریان (پھل) اٹھالائی تھی اور سینئر میز پہ رکھ کے اب انہیں کاٹ رہی تھی۔ دروازہ کھلا تو منہ میں پھل بھرے اس نے کچھ کہتے ہوئے سر اٹھایا تو تالیہ کو دیکھ کے ٹھنکی۔ وہ سفید بے جان کپڑے کی گڑیا کی طرح گویا پانی پہ قدم رکھتی آرہی تھی۔ گم صم۔ شل۔
”کون تھا؟“ داتن نے پلیٹ پرے ہٹائی۔ ماتھا ٹھنکا۔
”سمج۔“

”کون؟ وہ بجلی کے محکمے میں جو ہمیں.....“ وہ یاد دکر نے ہی لگی تھی کہ تالیہ بات کاٹ کے بولی۔
”میرا شوہر.... میرا ایکس!“ داتن کا منہ کھل گیا۔ آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر شاک ابھرا۔
”وہ.... وہ سمج؟“

تالیہ بے دم سی صوفے پہ گر گئی۔ آنکھیں کہیں دور خلاء میں ٹکی تھیں۔
”کیا کہا اس نے؟“ داتن پریشانی سے اٹھ کے اس کے پاس آئی۔ ”اس نے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش تو نہیں کی تمہیں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بلایا؟“

”وہ مجھے ڈرانے آیا تھا.... شاید وہ اشعر کو جانتا ہے۔ دھمکارا تھا کہ اشعر کو بتا دے گا کہ میں فراڈ ہوں۔“
 ”اس کو کیسے معلوم کہ ہم اسکا مرز ہیں؟“ داتن چونکی۔

”مگر یہ تو معلوم ہے کہ میں کسی فوت شدہ امیر خاندانی آدمی کی heiress کی نہیں ہوں۔ اگر اس نے بتا دیا کہ میں لاہور سے شادی ہو کر آئی تھی تو سوال انھیں گے کہ میں نے یہ دولت کیسے بنائی۔ وہ میرا کور blow کر دے گا۔ سب ختم ہو جائے گا۔“ اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ وہ شدید ذہنی دباؤ اور خوف کے زیر اثر تھی۔

”مگر اس کو اشعر وغیرہ کا کیسے علم ہوا؟“

”مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ اس کو میرے گھر کا معلوم ہو گیا ہے اور اب وہ پیسے مانگ رہا ہے۔ اوہ داتن.... وہ سب کچھ ختم کر دے گا!“ اس نے سردنوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

”تم تو بہت بہادر ہوتا لیہ۔ ایسے گھبراؤ تو نہیں۔ تم تو بڑے بڑوں کو انگلیوں پہ گھما دیتی ہو میری بچی۔“

تالیہ نے بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”سمجھو وہ پہلا آدمی تھا جس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ میں کبھی بھی اس کے خوف سے باہر نہیں نکل پائی۔“ داتن نے دلا سادینے والے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ وہ بے بسی سے روتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔ ”میں تو سب کچھ چھوڑنے والی تھی.... بس آخری واردات.... بس آخری چوری کرنی تھی.... اور اب سمجھو سب خراب کر دے گا.... یا اللہ.... اگر اس نے وان فاتح کو بتا دیا کہ میں فراڈ ہوں تو وہ مجھے بھی ایسے دیکھیں گے جیسے وزیراعظم کو دیکھتے ہیں۔ میں ان کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔“ اس کا سر پھٹنے کو تھا۔

”کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم تالیہ ہو۔ تمہارے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ میری بات سنو۔“ داتن نے اسے شانوں سے تھام کے جھنجھوڑا۔ ”تم وہی کرو گی جو میں کہوں گی۔ تم زخمی برن کی پینٹنگ کے معاملے اور اس سکے کو ڈھونڈنے پہ فوکس کرو۔ سمجھو مجھ پہ چھوڑ دو۔ میں اس کام نہ بند کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لوں گی۔“ تالیہ نے گہری سانس لی اور تھیلیوں کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اب وہ ابتدائی شاک سے نکل آئی تھی اور اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ اب کے وہ بولی تو آواز گیلی مگر سنبھلی ہوئی تھی۔

”کچھ کرو داتن۔ ایک دفعہ وہ چابی مل جائے تو میں وان فاتح کی زندگی سے دور چلی جاؤں گی۔ بس تب تک سمجھو کام نہ بند رکھنے کی کوشش کرو۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ اور ہاں.... بریسلٹ مل گیا نا؟“ داتن کو خیال آیا تو پوچھا۔ تالیہ پھیکا سا مسکرائی۔

”ہاں۔ جیسے ہم ویٹرز بن کے پارٹیز میں عورتوں کے بچوں کو راکران کا زیور چھپاتے تھے بالکل اسی طرح۔ کرائے بے بی اسکام۔

مجھے بس اب وہ سکے ڈھونڈنا ہے۔“

”اور مجھے سمجھ کا حل۔“ داتن ابھی اور اپنی چیزیں اٹھا کے پرس میں ڈالنے لگی۔ کشن کے پیچھے سے ایک پرانی چھوٹی کتاب اٹھائی۔ (ہم

شکار باز)۔ تالیہ اب بے چینی اور پریشانی سے بڑبڑا رہی تھی۔

”کہاں ہو سکتا ہے وہ سکہ؟ نہ اس کو نیلامی پر رکھ رہی ہیں عصرہ نہ وہ فاتح کے سیف میں تھا۔ یقیناً عصرہ کے لاکر میں ہو گیا گھر میں کسی دوسری جگہ۔“ داتن نے کتاب بیگ میں ڈال کر دوسری چیزوں تلے چھپا دی اور اسے پکارا۔

”سمجھ پہ مجھے ابھی سے کام شروع کرنا ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔“

تالیہ پھیکا سا مسکرائی اور اس کی پھلوں والی پلیٹ کو دیکھا۔ ”تم دوریان کھا بھی نہیں سکیں میری وجہ سے۔“

”تالیہ!“ داتن نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ”میری پیاری بچی... میری برنی... میری بلی... تمہارے لئے میں ہر شے قربان کر سکتی ہوں... مگر...“ چہرے پہ غصہ طاری کیا۔ ”...تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں دوریان قربان کروں گی۔ ہونہہ۔“ موٹی عورت نے یہ کہہ کے دوریان کی پلیٹ اٹھائی ایک قاش منہ میں رکھی اور دھپ دھپ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ تالیہ کے ابرو اکتاہٹ سے اکٹھے ہوئے۔

”میری پلیٹ واپس نہ لائیں تم تو دیکھنا۔“ پیچھے سے پکارا مگر داتن ناک سے مکھی اڑاتی باہر نکل چکی تھی۔

داتن کے جاتے ہی گھر ایک دم خاموش اور سنسان ہو گیا تھا۔ اونچا محل اور اندر مقید وہ تنہا شہزادی.....

خیال سا آیا تو چونکی اور پرس کھولا۔ اندر بریسلٹ رکھا تھا۔ اس نے احتیاط سے اسے نکالا۔ دل دھڑکا۔ مگر وہ ٹھنڈا رہا۔ تالیہ نے اسے ہاتھ میں نہیں پہنا بلکہ گردن تک لے گئی۔ زنجیر لمبی تھی عصرہ اس کے کندھے کو پہلی کڑی میں ٹائٹ کر کے ڈالتی تھی تو وہ کلائی پہ فٹ بیٹھتا تھا۔ تالیہ نے اسے گردن سے لگایا اور آخری کڑی میں کندھا ڈالا.... وہ اس کی گردن پہ فٹ آ گیا.... کسی پھندے کی طرح.....

ایک دم ارد گرد روشنی ہوتی گئی.... تیز روشنی.....

تب اس نے وہ منظر دیکھا.... چابی کو دھکا تا اس کا باپ اور اس سے سوال پوچھتی ننھی تالیہ.... شکار باز.... فوجی دوست.... گاؤں کے لوگ.... خزانہ.... ساری باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

اس نے زنجیر نوچ کے گردن سے اتاری۔ روشنی غائب ہو گئی۔

حواسوں میں واپس آنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ سنہری زنجیر صوفے سے نیچے جا گری تھی.... اس نے جھک کے اسے اٹھایا۔ وہ بے نور رہی۔ مگر تالیہ کی آنکھوں میں تحیر، خوف اور جستجو مل جل کے ابھرنے لگی تھی۔

”شکار باز....؟ مگر کس چیز کے شکاری؟“ وہ آنکھیں چھوٹی کر کے لاکٹ کو دیکھتی بڑبڑاتی تھی۔

”تو یہ تھے میرے باپا.... پہلی دفعہ دیکھا ان کو....“ وہ خواب کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”باپا فوج میں تھے.... اور ان کے دوست بھی.... شکار باز۔ کوئی ایسی تنظیم جس پہ پابندی ہوگی.... اور یہ لوگ خزانہ تلاش کر رہے تھے... اپنے گاؤں کے غریبوں کی مدد کرنے کے لئے....“ وہ دور خلا میں دیکھتی کڑیاں ملارہی تھی۔

”اور وہ چابی.... وہ شاید انہوں نے مجھے پہنا دی ہو۔ میں اسے پہن کے دور کسی چرچ میں نکل گئی ہوں گی اور کھو گئی ہوں گی۔ چابی

اترتے ہی میری یادداشت چلی گئی ہوگی اور میں کسی کو بتا نہیں سکی ہوں گی کہ میں کہاں سے آئی ہوں۔ مگر پھر مجھے میرے باپا نے ڈھونڈا کیوں نہیں؟“ اس کا ذہن الجھ الجھ رہا تھا۔ ”شاید پیچھے سے لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو کہ وہ شکار باز ہیں اور وہ کسی مشکل میں پھنس گئے ہوں۔ شاید وہ جان سے چلے گئے ہوں۔“ دل کا نپا۔ ”شاید میرے پیچھے کوئی اس لئے نہ آیا ہو کیونکہ کوئی زندہ ہی نہ رہا ہو۔ پورا گاؤں تباہ ہو گیا ہو۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہی کہانی ہے میری۔ اور میری ساری یادداشتیں اسی سونے کی ڈلی میں محفوظ ہیں۔“

اب وہ احتیاط سے لاکٹ کوئٹو میں لپیٹ رہی تھی۔ عصرہ کے بریسلیٹ کو اس نے لاکٹ بنالیا تھا۔ اپنی داستان اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی۔

مگر کیا اس کی داستان اتنی سادہ تھی؟ ایسا کیا تھا جو اس کے باپا میں بہت عجیب سا تھا..... جو اس کمرے اور اس ننھی بچی میں بھی تھا..... کچھ بہت انوکھا اور منفرد..... جس کو سمجھنے کے لئے اس کی عقل چھوٹی پڑ رہی تھی..... کچھ غلط تھا.....

☆☆=====☆☆

داتن کا اپارٹمنٹ چھوٹا مگر آرام دہ لگتا تھا۔ دروازے کے باہر سرسبز گیلے رکھے تھے۔ وہ لفٹ سے اتری اور بھاری بھر کم جتنے کے ساتھ چلتی اپنے دروازے تک آئی ہی تھی کہ.....

”ماں!“ پیچھے سے اس کے بیٹے کی آواز سنائی دی۔ چابی لاک میں گھسائی داتن رکی اور حیرت سے مڑ کے دیکھا۔ ٹوپیں پہنے ایک نوجوان چلا آ رہا تھا۔ سیاہ رنگت اور نقوش داتن جیسے ہی تھے اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ داتن کے سارے وجود میں خوشی پھیل گئی۔

”عدنان، تم آج کیسے؟ آج تو ویک اینڈ نہیں ہے۔“ وہ دونوں جب اندر آ گئے تو داتن اپنا سامان میز پر رکھتے ہوئے خوشگوار حیرت سے پوچھنے لگی۔ عدنان اب صوفے کے کنارے پہ آگے کو ہوئے ٹک گیا تھا اور ایک گھٹنا بے چینی سے ہلا بھی رہا تھا۔ سوال پہ ننھی داڑھی کھجاتے ہوئے کندھے اچکائے۔ ”آپ آرام سے آکر بیٹھیں تو میں بتاتا ہوں۔“

”میں قبوہ لے آؤں۔“ وہ رساں سے کہتی کچن کی طرف آئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور ٹرے سامنے رکھا۔ اس میں قبوہ کے ساتھ بسکٹ سے بھر ایک جاب بھی تھا۔

”میں نے یہ گندم والے بسکٹ بنائے تھے۔ تم دونوں کو پسند ہیں۔ واپسی پہ لیتے جانا۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسے قبوہ پیش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”آپ کی جاب کیسی جارہی ہے؟“

داتن نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”جاب؟“

”لاہری کے علاوہ کسی امیر عورت کے ہاں ہاؤس کیپنگ کرتی ہیں نا آپ۔“

”ہاں.... ساٹا میڈم کے ہاں۔“ داتن نے گہری سانس لی۔ ”اچھی جارہی ہے، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”کیا وہ آپ کو قرضہ دے سکتی ہیں؟ اصل میں....“ اس نے کپ اٹھا کے گھونٹ بھرا۔ بسکٹ کو چھوا بھی نہیں۔ ”مجھے نیا کاروبار شروع کرنا ہے، بھاری رقم چاہیے۔ میں سود سمیت واپس کر دوں گا۔ واپسی کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔“

داتن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ پیالی میں چائے اندھیلے ہاتھ رک گئے۔ نظریں کپ پہ جھکی رہیں۔

”کتنی رقم چاہیے؟“ آہستہ سے تھرماس واپس رکھی اور نظریں جھکائے چائے میں چینی ڈالنے لگی۔ عدنان نے جھٹ رقم بتائی۔

”یہ تو کافی زیادہ ہے مگر میں میڈم سے مانگ لوں گی۔ کب تک چاہیے؟“ پلکیں نیچی کیے وہ چیخ ہلا رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے بسکٹوں کا جاراٹھا کے قدموں کے پاس رکھ دیا۔

”اگر دو تین دن میں مل جائے تو میں کچھ سامان خرید لوں گا۔ کام جلد شروع ہو سکے گا۔“

”میں تمہارے اکاؤنٹ میں بھیج دوں گی۔ تمہیں مجھے ریما سنڈ بھی نہیں کروانا پڑے گا۔“

”او کے تھینک یو ماں۔“ اس کا چہرہ فرط مسرت سے چمکنے لگا تھا۔ پھر کرائی کی گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔ چلتا ہوں۔“ پھر رک کے داتن کے پیروں کے ساتھ رکھے بسکٹوں کے جار کو دیکھا۔ ”کیا یہ میرے بچوں کے لئے بنائے ہیں آپ نے؟“

جیسے یاد نہ آ رہا ہو کہ ابھی ماں نے بسکٹوں سے متعلق کیا کہا تھا۔

لیا نہ صابری نے پیر سے جار کو صوفے کے نیچے ذرا سادھکیلا۔ ”نہیں۔ یہ شوگر فری ہیں۔ ساشا کے لئے بنائے تھے۔ وہ ہر وقت ڈائٹ اور ایکسرسائز کے چکر میں زیادہ کھاتی پیتی نہیں ہے نا۔ تم جاؤ“ میں پیسے بھیج دوں گی۔“ نظریں اٹھا کے ویرانی سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا اور سلام جھاڑتا ہر نکل گیا۔

چھوٹا سافلیٹ بالکل خاموش رہ گیا۔ سوگوار۔ تنہا۔ ویران۔

داتن کی چائے اسی طرح رکھی تھی اور وہ بے دلی سے اس کے شفاف مائع کو دیکھے جا رہی تھی۔ ذہن کا پردہ بھی چائے کی طرح ہو رہا تھا۔

سیاہ تاریک مگر شفاف..... اور اس پہ ابھرتے مناظر.....

سات سال قبل کی وہ گرم صبح جب سارا کوالا پور پسینے سے کھل رہا تھا۔ ایسے میں ایئر پورٹ کی عمارت کے اندر معمول کارش اور شور تھا۔ آوازیں، اعلانات، الوداعی ملاقاتیں اور آنے والوں کو خوش آمدید کہنا۔ مگر لیا نہ صابری کو اس وقت کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

سیاہ فام بھاری بھر کم عورت جس کے گھنگریالے بال جوڑے میں بندھے تھے سر جھکائے ہاتھ رومز کے آگے بنے فرش پہ وائپر سے موپ لگا رہی تھی۔

(سمجھا کریں ماں، ہم مزید ساتھ نہیں رہ سکتے، میری بیوی کو ڈاکٹرز نے ریٹ کا کہا ہے، آپ کے ساتھ رہے گی تو روز جھگڑا ہوگا، اور اس کی صحت پہ برا اثر پڑے گا۔ وہ یعقوب بھی تو ہے آپ کا بیٹا، آپ اس کے ساتھ بھی رہ سکتی ہیں۔)

سر جھکائے وائپر لگاتی لیا نہ کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور فرش پہ جا گرا۔ اگلے ہی لمحے پوچے کے دھاگوں نے اسے واپس کر کے فرش کو

صاف کر دیا۔ پہلے عدنان اور اب یعقوب کی آواز سنائی دینے لگی۔

(میرے ساتھ؟ نہیں ماں۔ یہ ممکن نہیں۔ عدنان اور اس کی بیوی تو باپا کے بنائے گھر میں رہ رہے ہیں وہ وہاں سے آپ کو کیسے نکال سکتے ہیں۔ میرا فلیٹ تو پہلے ہی بہت چھوٹا ہے اور تنخواہ کم ہے۔ مگر میرے دوست کی والدہ اولڈ ہوم میں رہتی ہیں، تمام سہولیات میسر ہیں، خوراک، رہائش، آرام۔ اور پھر اپنی عمر کے لوگوں کا ساتھ بھی ہوگا۔ ان کے اتنے دوست بن چکے ہیں وہاں اور....)

آنسو ٹپ ٹپ فرش پہ گر رہے تھے۔ پھر اس نے آنکھیں زور سے رگڑیں اور بے رحمانہ انداز میں پوچھا دائیں سے بائیں لگایا۔ بکٹ اٹھائے وہ ٹوائٹلس کی طرف آئی اور آخری ٹوائٹ کا دروازہ سختی سے دھڑ دھڑایا۔ ”کون ہے اندر؟ نکل بھی آئیے۔ میں نے صفائی کرنی ہے۔“

(جیولری اسٹور کے مالک نے تمہیں نوکری سے نکال دیا ہے لیانہ۔ اس کو جوان اور خوبصورت لڑکی مل گئی ہے۔ تمہاری دوست کی حیثیت سے سمجھا رہی ہوں اب کسی اسٹور میں تمہیں ملازمت نہیں ملے گی۔ کیونکہ.....) اب کانوں میں ایک دوست کی آواز گونجنے لگی تھی۔

باتھ روم سے جوڑ کی باہر نکلی وہ تالیہ نہیں تھی جس کے ساتھ اب داتن کام کرتی تھی۔ وہ ایک ڈری، سہمی، قدرے الجھی ہوئی لڑکی تھی جس کی آنکھیں رونے کے باعث سرخ نظر آرہی تھیں۔ کڑھائی والی شلوار قمیض، کندھوں پہ دوپٹہ اور ہاتھوں پہ مٹی سی مہندی۔ اس کے پاس ایک ایسا بیگ تھا جس سے وہ خود بھی ناواقف تھی۔ لیانہ کو وہ بیگ اور اس کے حالات دیکھ کے سارا معاملہ بھانپنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

ایئر پورٹ پہ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ یا لڑکیاں مجبور ہو تیں یا ناواقف۔ مگر یہ لڑکی بہر حال یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر یہ سب کر سکتا ہے۔

لیانہ نے اسے چھپ چھپاتے ایئر پورٹ سے نکلوا دیا اور اپنی دوست کے گھر لے آئی جہاں وہ خود بطور پے انگ گیسٹ کے رہ رہی تھی۔

تالیہ سمجھدار تھی ذہین بھی۔ بات جلدی سمجھ جاتی اور تیزی سے وہ کام کر ڈالتی۔ دوست کے سامنے لیانہ کی رشتے دار کی اداکاری بھی اچھی کر لی لیکن وہ اب بھی پریشان اور سوگوار تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اسکائپ پہ اپنے شوہر سمیع سے رابطہ کیا تو اس کا انداز اور باتیں.... ہر شے اس کا رہا ہوا شک دفع کرنے کے لیے کافی تھی۔

اب لیانہ کو لگا کہ تالیہ بالآخر مان گئی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے صرف استعمال کیا اور آگے بھی کرنا تھا کیونکہ وہ جوان گھریلو لڑکیوں کے بیگز ایئر پورٹ پہ کم ہی کھولے جاتے ہیں۔ لیکن مان جانے کے بعد وہ بالکل چپ ہو گئی۔ سمیع کو معلوم نہ تھا وہ کدھر ہے۔ وہ لیانہ کی دوست کے اس کمرے میں بالکل مقید ہو کے رہ گئی۔ خاموش۔ صدمے میں۔

پھر چند دن بعد اس نے خود کو سنبھالنا شروع کیا۔ اس سے لیانہ کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن وہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ بے حد ذہین اور قابل لیکن بے بس اور دکھی۔ خود کو ٹکڑا ٹکڑا کر کے اس نے جوڑا اور سمیع سے رابطہ کیا۔ شرط یہی طے پائی کہ وہ اسے طلاق دے گا تو وہ بیگ واپس کرے گی۔ سمیع کاغذات کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور چونکہ اس کے اسکائپ کے نکاح کا بھی کوئی ثبوت نہ تھا، (وہ ملائیشیا اپنے طے پس منظر کے باعث آئی تھی۔ سپاؤز ویزا نہیں۔) اور تالیہ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس کو فون پہ طلاق

دے ڈالے۔ وہ ایک نئے ملک میں تہاڑ کی تھی جس کو پیچھے بھی سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ سمج سے کوئی بعید نہیں معاملہ کتنا لکائے اور کاغذات کے لیے اس کو سمج سے ملنا پڑتا اور لیا نہ کو ہمیشہ لگا کہ وہ سمج کا نام سن کے بھی خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

اس نے تالیہ کو کسی ایسی چیز سے ڈرتے نہیں دیکھا جو عموماً اس کی عمر کی لڑکیوں کو خوفزدہ کیے رکھتی ہیں۔ طوفان، سانپ، بچھو۔ کبھی واک کرتے ہوئے کوئی موذی کیڑا نظر آ جاتا تو وہ اس کو جوتے تلے مسل کے آگے بڑھ جاتی۔ لیا نہ کو اچھا نہ لگتا۔ ملے لوگ سانپوں کو بھی نہیں مارتے کہ ان کا دل دکھتا ہے۔ مگر وہ لڑکی مار ڈالتی تھی۔ ایک سمج کے خوف سے وہ کبھی نہیں نکلی۔ طلاق دے دی، بیگ واپس ہو گیا، تعلق ختم مگر اس کے ذکر پہ وہ چونک چونک جاتی تھی۔ وہ واحد آدمی تھا جس نے تالیہ کو اس کا کام کیا تھا ایسے کہ اس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔

لیا نہ نے اسے ایک ریسٹوران میں نوکری دلا دی۔ ویٹرس کی نوکری۔ لیا نہ خود لاہری میں کام کرتی تھی۔ دونوں اس کی دوست کے کمرے میں ہی رہتی تھیں۔ بالآخر وہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی تھی۔ ویٹرس بن کے محنت مشقت کر کے پیسے جوڑنا.... لیا نہ کو یہ تالیہ کے مسائل کا بہترین حل لگتا تھا۔ مگر پھر ایک دن.....

ریسٹوران میں اس روز معمول کی گہما گہمی تھی۔ تالیہ ٹرے پہ چسپ، برگراور کوک کے گلاس رکھے سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ یونیفارم پہنے، پونی کے اوپر پی کیپ جمائے، وہ سادہ اور سپاٹ سی ویٹرس لگ رہی تھی۔ ایک میز پہ تین مرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تالیہ ان کے پاس رکی اور باری باری ٹرے سے اشیاء نکال کے سرو کرنے لگی۔ ایک رک کے یونہی اسے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی وہ مڑی اور آگے بڑھی، اسے لگا کسی نے اسے چھوا ہے۔

وہ بدک کے پیچھے ہٹی اور غصے سے اس کو دیکھا۔ وہ آدمی مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تفریح چاہیے تو گلی کے پار جاؤ.... وہاں چند رنگٹ کے عوض تفریح مل جاتی ہے۔ یہاں آ کر میز سے کھانا کھایا کرو۔“ غصے سے غرا کے آگے بڑھ گئی مگر ان پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ تینوں مسکراتے رہے۔ چند قدم دور گئی تھی کہ ایک کی آواز سنائی دی۔ اس نے کوئی نازیبا بات کہی تھی۔ تالیہ کی رنگٹ سرخ ہوئی۔ اس کا ہاتھ قریبی میز کی طرف ریٹکا جہاں ایک چھری رکھی تھی۔ اس نے سرعت سے چھری اٹھائی اور گھا کر ایک دم ان کی طرف دے ماری۔ چھری گول چکر کی صورت گھومتی.... فضا میں اڑتی ہوئی.... سیدھی ان کی میز کے ساتھ دیوار کے وسط میں پیوست ہو گئی.... جیسے کسی ماہر نشانہ باز نے نشانہ باندھا ہو....

دو گھنٹے بعد وہ لیا نہ کے ساتھ اس کی لاہری کے باہر ایک کیفے میں بیٹھی تھی اور فنگر چسپ کھاتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

”اور پھر بہت شور مچا دیا۔ آخر میں میری یہ نوکری بھی چلی گئی۔ بہت سی گالیوں اور لعن طعن کے ساتھ ریسٹوران کی مالکن نے مجھے کسی شکاری کی اولاد کا طعنہ بھی دے دیا۔“ وہ کہہ کے ہنس دی جیسے خود بھی انجوائے کر رہی ہو یا شاید وہ زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

”مگر تم نے اتنا اچھا نشانہ باندھنا کس سے سیکھا۔“ لیا نہ حیران تھی۔

”پتہ نہیں۔ میں بچپن سے اچھے نشانے لگالیتی ہوں۔ شاید مجھے یہ کام آتے ہیں۔“ اس نے بے پرواہی سے شانے اچکا دیے اور

کھاتی رہی۔

”مگر ایسی کیا بات ہوئی جو تم اتنی خوش ہو؟“ لیا نہ نے آنکھوں کی پتلیاں سکڑ کے غور سے اسے دیکھا تو تالیہ نے چمکتی ہوئی آنکھیں اٹھائی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ احتیاط سے آگے ہوئی اور پر جوش سرگوشی میں بولی۔

”کیونکہ جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی میں نے جاتے جاتے اس کا بوہ بھی نکال لیا۔ اور اس میں اتنے ڈھیر سارے پیسے ہیں۔“ ہاتھ میز پر رکھا تو اس میں ایک نوٹوں سے بھرا بوہ بھی تھا۔

”تم کسی شکاری کے ساتھ ساتھ کسی چور کی اولاد بھی لگتی ہو تالیہ۔“ وہ خفگی سے بولی تھی۔

”بر وقت شکار بننے سے شکاری بننا بہتر ہے موئی عورت۔“

”مجھے موئی عورت مت کہا کرو۔“

”تو کیا داتن پدوکا کہوں؟“ وہ ہنسی۔ (داتن پدوکا بوڑھی دادی قسم کی خواتین کے لئے دیا جانے والا سرکاری اعزاز ہوتا ہے۔)

”تو کیا میں کسی داتن پدوکا سے کم ہوں؟“ وہ گردن کڑا کے بولی تو تالیہ کے لب حیرت سے کھل گئے۔ ”تمہارا خواب یہی ہے کیا؟ کہ ایک دن سرکار تمہیں داتن پدوکا کا ٹائٹل دے؟“

”اگر ہے بھی تو کیا۔ اتنے سال جیولری اسٹور اور اس لائبریری کی خدمت کی ہے میں نے۔ حق بنتا ہے میرا۔“ وہ نتھنے پھلائے برامان کے بولی تو تالیہ نے بے اختیار مسکراہٹ دہالی۔

”اوکے۔ جب میں بہت امیر ہو جاؤں گی میرا جزیرے پہ وہ اونچا محل بن جائے گا تو میں تمہیں یہ اعزاز دلا دوں گی۔“

”یہ اعزاز امیر لوگ نہیں دلا سکتے تالیہ مراد۔ یہ صرف پردھان منتری (وزیر اعظم) دلا سکتا ہے۔“

”تو پھر میں....“ وہ انھی اور میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے جھک کے شرارت سے بولی۔ ”.... پردھان منتری سے شادی کر لوں گی اور اس سے پہلی درخواست یہ کروں گی کہ وہ تمہیں جج جج کی داتن پدوکا بنا دے۔ خوش؟“

اس وقت کا وزیر اعظم ایسا بوڑھا اور ٹھگنا تھا کہ داتن یہ سب سوچ کے ہی کھلکھلا کے ہنس دی تھی.....

چائے ختم ہو گئی تھی۔ داتن کے ذہن کا پردہ خالی ہو گیا تھا۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا تو دیکھا.... وہ اپنے فلیٹ میں تنہا بیٹھی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے موبائل اٹھایا اور اپنے اکاؤنٹ کا بیلنس چیک کیا۔ اس میں بے پناہ رقم تھی۔ اس نے عدنان کو میسج لکھا۔ ”ساشا بی ادھار دینے پہ راضی ہیں میری تنخواہ سے کاٹ لیں گی، تم واپسی کی فکر نہ کرو، بس کاروبار پہ دھیان دو، صبح پیسے بھجوا دوں گی۔“

پیغام بھیج کر دل خالی سا ہو گیا۔ پھر انھی اور جاڑا اٹھالیا۔ اسے ان بسکٹس کو تالیہ کے لیے رکھنا تھا۔ یہ محبت سے بنائے گئے تھے۔ داتن کی کہانی میں ان کا تالیہ کے سوا کوئی حقدار نہ تھا۔

پھر اسے سمجھ کو کھوجنے کا کام شروع کرنا تھا۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کے اونچے محل پہ چاند پوری آب و تاب سے چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم بچن سے اپنی چیزیں لے کر نکلا تو اشعر کو دھڑا دھڑ زینے اترتے دیکھا۔ وہ اس چہرے کے ساتھ نہیں پلٹا تھا جس کے ساتھ اندر گیا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں، ماتھے پہ ہل تھے اور ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ تیز چلتی انگلیاں۔ زینے پھلانگتا وہ سیدھا باہر نکل گیا۔

”اشعر آیا تھا واپس؟“ عصرہ نے اپنے بیڈروم کے دروازے سے گردن باہر نکالے حیرت سے اسے پکارا۔

”جی میم... شاید باس سے کوئی بات کرنی تھی۔ اب وہ چلے گئے ہیں۔“ اس نے رسان سے مطلع کیا تو اس نے سر ہلا دیا۔ پھر ایڈم کے چہرے کا ہيجان دیکھ کر رکی۔

”کچھ کہنا ہے تم نے ایڈم؟“ غور سے ملازم کو دیکھا جو متذبذب نگہ رہا تھا۔ سوال پہ نظریں جھکا کے جھینپ گیا۔

”نہیں وہ... میم... مجھے کچھ چاہیے تھا۔“ کہہ کے خود بھی پریشان ہو گیا۔ عصرہ نے ہاتھ دروازے سے ہٹائے اور بازوؤں کو سینے پہ

لیٹ لیا۔ ”کس سلسلے میں۔“

”وہ... میری منگیتر... میری شادی ہو رہی ہے کچھ ماہ بعد... مگر اس سے پہلے...“

”پیسے چاہیے ہیں؟“ اس نے بات کاٹ کے سادگی سے پوچھا تو ایڈم نے چونک کے نظریں اٹھائیں۔ ”نہیں میم۔ برگز نہیں۔“ اس کا

جیسے دل دکھ گیا تھا۔ لب بھنج لئے۔ ”مجھے صرف ایک مشورہ چاہیے تھا۔“

”اچھا بتاؤ... کیا پوچھنا ہے؟“ وہ نرمی سے بولی تو لڑکے نے آنکھیں اٹھائیں۔ ماتھے پہ ابھی تک اداسی سے در آنے والی لکیریں

تھیں۔ عصرہ کو اس پہ ترس آیا۔ تینیس چوبیس برس کا نو جوان جو اگر کسی بڑے گھر میں پیدا ہوتا تو آج یوں کسی کی ملازمت نہ کر رہا ہوتا۔ خیر۔

”میری منگیتر کی سالگرہ ہے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا تحفہ دوں۔“

”اتنی سی بات؟“ وہ مسکرا دی۔ ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ ”کوئی اس کا پسندیدہ پرفیوم یا کسی اچھے برانڈ کا جوڑا یا کوئی

اچھی کتاب۔ اگر ہو سکے تو جیولری دے دو۔“ پھر رکی۔ ”وہ سکہ جو میں نے تمہیں دیا تھا، جو تنگو کامل کے بیٹے نے فاتح کو گفٹ کیا تھا، وہ

سنجھال رکھا تھا؟“

”جی میم۔“ ایڈم نے جھٹ سر ہلایا۔

اس روز تنگو کامل کے گھر سے واپسی پہ جب ایڈم نے کوٹ کی جیب سے سکہ نکال کر عصرہ کو امانت واپس کرنی چاہی تو وہ جو کار سے

نکل کے اندر جا رہی تھی، کچھ سوچ کے مزی اور اسے دیکھا۔ ”یہ تم رکھو لو۔“

”میں؟ مگر یہ تو لینیٹک ہے اور...“

”کمینیک نہیں ہے یہ مگر ہے سونے کا۔ زیور وغیرہ بنوالینا۔ میں تمہیں تمہارے کپڑوں پہ کچھ زیادہ ہی ٹوک گئی آج۔“ وہ سادہ مگر بلا جھجک انداز میں کہہ رہی تھی۔ یہ اس کے مداوے کا ایک طریقہ تھا۔

”مگر اس نے فاتح صاحب کو دیا تھا اور....“

”اور جب جب میں اسے دیکھوں گی مجھے یاد آتا رہے گا کہ فاتح نے ایک ننھے بچے کا کیسے دل دکھایا ہے۔“ اس کا اشارہ فاتح کا سیکے کو نقلی کہنے پر علی کامل کا چہرہ بچھ جانے کی طرف تھا۔ ”رکھ لو۔“ وہ شان بے نیازی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”جی میم.... وہ سکہ ماں نے سنبھال رکھا ہے۔“

”اس کی انگٹھی وغیرہ بنوالو اور اس کو دے دو۔ خوش ہو جائے گی۔“

ایڈم نے سمجھداری سے سر ہلایا اور تشکر سے مسکرایا۔ ”شکر یہ میم!“، مصصرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور پیچھے ہٹ کے دروازہ بند کر دیا۔

”تم نے وہ لاکٹ دیکھا جو مہمان خاتون تالیہ نے بیگم صاحبہ کو تحفے میں دیا ہے؟“ وہ اپنا بیگ اٹھانے کچن میں آیا ہی تھا کہ دونوں ملازمائیں فرج کھولے کھڑی کھسر پھسر کرتی دکھائی دیں۔

”ہاں.... اُف.... کیا خوبصورت لاکٹ تھا۔ مہنگا بھی بہت ہوگا۔ تم نے اس کے اندر لگے ہیرے دیکھے؟ پورے پانچ تھے۔“

”یا اللہ!“ وہ حیران ہوا۔ ”تم لوگ مالکوں کی چیزوں پہ اتنی گہری نظر رکھتی ہو کیا؟“

ملازمہ پلٹی اور تندہی سے اسے گھورا۔ ”ملازم کا کام نظر رکھنا ہی ہوتا ہے۔ چاہے آگے مالک ہوں یا دوسرے ملازم!“ پھنکار کے اطلاع

دی اور واپس مڑ گئی۔ مگر ایڈم محمد ایک دم بالکل سن رہ گیا۔ ملازم کا کام نظر رکھنا ہی ہوتا ہے۔ چاہے آگے مالک ہوں یا دوسرے ملازم؟؟؟

ذہن میں بجلی کا کوند سا پلکا اور اس کے چوہہ طبق روشن کر گیا تھا.....

بیگ اٹھا کے وہ بے اختیار باہر کو بھاگا.....

تنگو کامل کے گھر کے گیٹ کے باہر گیلی سڑک دیران پڑی تھی۔ رات کی تاریکی کو اسٹریٹ پولز نے روشن کر رکھا تھا۔ بارش کچھ دیر ہوئی رک چکی تھی۔ ایسے میں سامنے آگے درختوں کی اوٹ میں ایڈم کھڑا تھا۔ کوٹ ندر د تھا، سادہ شرٹ پینٹ میں ملبوس وہ آنکھیں چھوٹی کر کے گیٹ پہ جمائے ہوئے تھا۔

بالآخر گیٹ کھلا اور ایک ملازمہ باہر نکلتی دکھائی دی۔ یہ ملازموں کی چھٹی کا وقت تھا۔ یقیناً اسے بس اسٹاپ کی طرف جانا تھا۔ ایڈم محتاط

قدموں سے درمیان میں فاصلہ رکھے اس کا پیچھا کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ مین روڈ پہ آگئی۔ گاڑیاں زن سے سامنے سے گزرتی جا رہی تھیں۔ ملازمہ بس کے انتظار میں ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ تب

وہ تیز تیز چلتا اس کے قریب آیا۔ ”بات سنیں۔“ مصروف الجھے ہوئے انداز میں اسے پکارا۔ تو وہ چونک کے پلٹی۔

سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑا تھا، پھر بھی وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ شاید پہچانی نہیں تھی کیونکہ ایڈم کو نہیں یاد اگر اس ملازمہ سے اس کا پہلے آشنا سامنا ہوا ہو۔

”سنگو کامل بن محمد کے گھر کام کرتی ہیں آپ؟“ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا مگر سچائی کو کھوجنے کے لئے آج اسے جھوٹ بولنا تھا۔

”ہاں.... کیوں؟“ وہ چونکی ہوئی۔

”مجھے تالیہ نے....“ تھوک نگلی۔ زبان لڑکھرائی۔ ”بھیجا ہے۔ تالیہ نے کچھ تحائف بھیجے تھے آپ کے لئے اور اپنی ساری ساتھی ملازموں کے لئے۔“ بولتے بولتے اسے سانس چڑھنے لگا۔ جھوٹ بولنا کتنا دشوار تھا۔

ملازمہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ خوشگوار سی حیرت۔ ”اس نے تحائف پاکستان سے بھجوائے ہیں؟ وہ تو پاکستان چلی گئی تھی نا۔“ اور ایڈم اس لمحے بالکل پتھر کا بت بن گیا۔ یعنی تالیہ واقعی ان کی ملازمہ تھی؟

وہ سرخ روئی کا لمحہ تھا۔ اس کا جج جیت گیا تھا۔ اس کے اعضاء نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ایڈم سچا تھا۔ تالیہ جھوٹی تھی۔

”جی۔“ بدقت وہ بول پایا۔ ”مگر.... میں ذرا کنفیوژڈ ہوں۔ میں نے آپ کو تنگو کامل کے گھر سے نکلتے دیکھا لیکن کیا آپ واقعی تالیہ کے ساتھ تنگو کامل کے گھر کام کرتی تھیں؟ یہ نہ ہو میں تحائف کسی اور کو دے بیٹھوں۔“

”ہاں ہاں۔ میں نور ہوں۔ تالیہ مجھے جانتی ہے۔“

مگر اس نے پیشانی پہ آیا پسینہ پونچھا جیسے کافی الجھ گیا ہو۔ ”اور کتنا عرصے آپ دونوں نے ساتھ کام کیا؟ سوری مگر مجھے کنفرم کرنا ہے کہ

“...“

”دو ماہ.... وہ دو ماہ پہلے آئی تھی اس نے ریستوران میں تنگو کامل کے بیٹے کی جان بچائی تھی، یوناس کو الارجی ہے مونگ پھلی سے اور اس نے غلطی سے سلا میں سے مونگ پھلی کھالی تو تالیہ جو وہاں ویٹرس تھی اس نے کوئی گھاس پھوس بچے کے منہ میں ڈالا جس سے اس کی حالت سنبھل گئی۔ ویسے کیا بھیجا ہے تالیہ نے۔“

”کچھ کپڑے اور پرفیومز ہیں۔ باقی ملازموں میں بھی آپ کو ہی بانٹنے ہوں گے۔ مگر اتنا سامان جو میں آپ کے حوالے کروں اور کل کو آپ کہیں کہ آپ تالیہ کو جانتی تک نہیں۔“ ذرا سی ہمت کر کے بولا تو لڑکی کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ ”کتنی دفعہ بتاؤں کہ اس کو جانتی ہوں۔ آپ تالیہ سے بات کروادیں میری۔“

”تا کہ وہ مجھے ڈانٹے کہ میں نے اس کی دوست پہ شک کیوں کیا؟ مگر ایک منٹ۔“ اس نے سیل فون نکال کے ایک تصویر سامنے کی۔

”کیا یہ تالیہ ہے؟“

وہ کسی چینی اداکارہ کی تصویر تھی۔ نور نے الجھ کے سرنفی میں ہلایا۔ ایڈم نے اسکرین آگے کی۔ ایک لمبے اداکارہ۔ نور نے اچنبھے سے پھر

ماں کی۔ تیسری تصویر وہ سامنے لایا تو وہ سنہری بالوں والی تالیہ تھی۔ نور نے گہری سانس لی۔ ”امتحان لے رہے تھے آپ میرا؟ یہی ہے تالیہ۔ مگر....“ اس نے انگلیوں سے اسکرین پہ چٹکی لی اور تصویر زوم کی۔ ”اچھی لگ رہی ہے یہاں۔ بال رنگ کر لئے اس نے۔“

”ہاں پہلے اس کے بال سیاہ تھے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”لگتا ہے اچھی جگہ شادی ہوگئی اس کی۔ میک اپ وغیرہ کرنا آگیا۔“

”شادی؟“ وہ چونکا۔ نور نے آنکھیں اٹھا کے اسے کھورا۔

”کیا ابھی تک نہیں ہوئی؟ شادی کے سلسلے میں تو اس کے کھٹو باپ نے اسے واپس بلایا تھا۔ سارا خاندان غریب تھا ایک یہی کماتی تھی اور سب اس کے پیسے پہ عیش کرتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کسی نیکے سے شادی کر دیں گے اس کی مگر اس کے کپڑے اور جیولری تو دیکھو۔ لگتا ہے وہ امیر ہے۔“ پھر سر جھٹکا۔ ”خیر۔ سامان کدھر ہے۔“

”سامان۔“ ایڈم گڑبڑایا اور جلدی سے فون اس کے ہاتھ سے لیا۔ ”وہ میں کل لا دوں گا۔ آپ کی بس آگئی۔“ نور نے مڑ کے دیکھا بس خراماں خراماں چلتی قریب آرہی تھی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور واپس پلٹی۔ ”اچھا کل صبح میں....“ مگر بات ادھوری رہ گئی۔ پیچھے کوئی نہ تھا۔ ایڈم جا چکا تھا۔

”چلو۔ کل آئے گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی اور بس کی طرف بڑھ گئی۔

وہاں سے جلدی سے کھسک کے ایڈم ایک دوسری بس پکڑ کے گھر آگیا تھا۔ وہ حیران تھا، شاید کڈ تھا، خوش تھا۔

وہ سچا تھا۔ وہ لڑکی وہ نہیں تھی جو وہ خود کو کہہ رہی تھی۔ وہ شاید بہروپیہ تھی۔ فاتح کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ہاں یہ بات ہو سکتی تھی۔ یا اللہ... تو انکو (آقا).... مجھے اس جھوٹ کے لئے معاف کرنا.... میرے پاس سچ ثابت کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا.... وہ خطرناک لڑکی ہے اور مزہ تنگو کامل اس کو اس دن صاف بچا گئی تھیں.... سب جھوٹ بول رہے تھے تو انکو.... انہیں مات دینے کے لئے مجھے انگلیاں میڑھی کرنی پڑیں۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا، توبہ کرتا اپنے گھر کا چھوٹے دروازے کھول رہا تھا۔ ڈربے میں بیٹھی مرغی نے زور کی کٹاک کی۔ اس کے پروں تلے چھپے ننھے چوزے چوں چوں کرنے لگے۔ ایڈم نے ہش کیا تو مرغی کے پر جو کھل گئے تھے، دھیرے دھیرے ہٹم کے سمٹتے گئے اور وہ پرسکون ہو گئی۔

ایڈم دبے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ آہستہ سے چابی گھمائی۔ لبوں پہ پر جوش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں فتح کی چمک۔ جسم میں توانائی سی بھری تھی۔ دھیرے سے اندر آیا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ مگر پھر ٹھنکا۔

آج ماں کیوں نہیں اس کی راہ تکتی نظر آئی؟ نگاہیں سامنے کو اٹھیں۔ ایبو (ماں کو ملے میں ایبو کہتے تھے) اور باپا کے کمرے کی جی جی رہی تھی۔ وہ بنا چا پ کے دھیرے دھیرے چلتا آگے آیا مگر پھر قدم خود بخود ذخیر ہو گئے۔

”اب کیا ہوگا؟ بھائی صاحب واقعی سنجیدہ ہیں؟“ ایبو پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

”سنجیدہ ہیں تو اتنی سفاکی سے شرط رکھی ہے نا کہ جب تک ہم ایک بنا بنایا اپارٹمنٹ یا گھر فاطمہ کے نام نہیں لگائیں گے، وہ ایڈم اور فاطمہ کی شادی نہیں کریں گے۔“
 باہر کھڑے ایڈم کی سانس تھم گئی۔

”مگر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جانتے تو ہیں کہ ایڈم مخنتی ہے اور جلد اس کو نوکری مل جائے گی اور.....“

”ان کی طرف سے دیکھو تو بات غلط بھی نہیں ہے۔ جب انہوں نے ایڈم سے فاطمہ کا رشتہ طے کیا تھا تو ایڈم فوج میں تھا، اس کا مستقبل ان کو روشن نظر آیا تھا لیکن اب ایڈم کے پاس جاب نہیں ہے اور وہ بغیر کسی سکیورٹی کے فاطمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔“
 ”لیکن تمہارا اسٹور بھی ہے اور ایڈم مخنتی ہے ایک دن وہ بہت اوپر جائے گا محمد۔ لوگ اس بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ فوج کی نوکری دنیا کا آخری کنارہ تو نہیں ہوتی کہ اس کے بعد خلاء آجائے؟“ ایبو دکھی دل سے کہہ رہی تھی اور ایڈم شلنگی سے پلٹ گیا۔

اپنے کمرے کا دروازہ اس نے بنا آواز کے بند کیا اور بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ بالکل چپ۔ ساکت۔ جیسے دل ہی تھم گیا ہو۔
 کتنی ہی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور الماری کھولی۔ چند کپڑے آگے پیچھے کیے اور پھر..... وہ یونینفارم نکالا..... اس پہ آج بھی نیم پلیٹ یونہی لگی تھی۔ ایڈم Adam۔ اس نے نیم پلیٹ پہ انگلیاں پھیریں۔

بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ایڈم کو دمے کی وجہ سے فوج سے نہیں نکالا گیا تھا۔ نیم پلیٹ کو خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم جیسے اس کی چمکتی دھات میں مناظر دیکھنے لگا تھا.....

چیخ و پکار..... ننھی لڑکی کے چیخنے کی آواز نے پورے سفاری پارک کو سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ مجمع ٹیلے پہ کھڑا ہکا بکا سانشیب میں اُگے شوگر سیبوں کے اونچے درخت کو دیکھ رہا تھا جس کے اوپر.... بالکل اوپر ایک دس بارہ سال کی بچی چڑھی تھی اور خوف سے چیخیں مار رہی تھی۔
 سفاری پارک کا عملہ ڈنڈے لئے آگے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کوئی کال مل رہا تھا، کوئی مدد کے لئے دوسروں کو پکارنے بھاگ رہا تھا۔
 کیپٹن ایڈم اور میجر بدرالدین درختوں کے درمیان بنی روش پہ چلتے آرہے تھے۔ کریوٹ بال اور سن گلاسز لگائے میجر بدر صاف رنگت کا حامل ملے نو جوان تھا۔ ایڈم کی رنگت اس سے ذرا دہشتی تھی۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس وہ چھٹی کا دن انجوائے کرنے یہاں آئے تھے اور ابھی بدر کوئی بات کہہ ہی رہا تھا کہ دور سے لڑکی کی چیخوں کی آواز آئی۔

ایڈم چونک کے گھوما۔ یہ سفاری پارک تھا اور جانوروں سے بروقت خطرہ بہر حال موجود رہتا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا تھا؟ بنا سوچے سمجھے اس نے اس طرف دوڑ لگا دی۔

”کدھر جا رہے ہو؟ ہمیں فلم کے لئے جانا ہے... ایڈم... ایڈم!“ بدر اکتا کے اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ تیز تیز بھاگتا اونچے نیچے راستے پھلانگتا ٹیلے کی چوٹی تک آیا تو مجمع سامنے تھا اور بچی چند گز کے فاصلے پہ درخت پہ چڑھی چلا رہی تھی۔ ٹیلے اور درختوں کے درمیان گہری

”نادیہ!“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

”نادیہ میں فوجی ہوں۔ تمہیں فوجی اچھے لگتے ہیں نا۔“

بچی نے جواب نہیں دیا۔ آنسو بہاتی اس کو دیکھتی رہی۔

”نادیہ.... اس کو مت دیکھو مجھے دیکھو۔ مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔“ وہ اونچی آواز میں اس کو پکار رہا تھا۔ بچی نے ڈرگین سے نظریں ہٹا

دیں اور اس پہ جما دیں۔ اب وہ بات سننا چاہتی تھی۔

”ہمارے جنرل صاحب کہتے ہیں نادیہ کہ....“ وہ بچی سے نظریں ہٹائے بغیر آواز بلند بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ”اگر کبھی زندگی

میں کسی بری عادت، کسی نہ مل سکنے والی محبت یا کسی جنون اور شوق کا شکار ہو جاؤ تو یاد رکھنا.... جتنا زبردستی چیخ چیخ کے اس کو خود سے نوچ پھینکنے

کی کوشش کرو گے.... وہ اتنا اور تمہارے اوپر سوار ہو گا.... وہ اتنا تمہیں ڈرائے گا.... تم سن رہی ہو نادیہ.... کسی خوفناک درندے کی طرح وہ

چیز ہمیں ڈراتی رہے گی....“

درخت کی شاخیں جکڑے بچی نے بھیگی آنکھیں اسی پہ جمائے ہوئے تھیں۔

”وہ کہتے ہیں.... ان چیزوں کا مقابلہ بھی ایسے ہی کیا جاتا ہے جیسے کسی بڑے خوفناک درندے کا کیا جاتا ہے۔ پتہ ہے کیسے؟ پرسکون ہو

کر۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ مزاحمت چھوڑ دو۔ ڈرنا چھوڑ دو۔ اپنی خواہش، جنون، پاگل پن سے جب ہم ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ فیر گزر جاتا

ہے.... تم پرسکون ہو کے اس کے گزر جانے کا انتظار کرو.... ریلیکس کرو.... یہ تمہیں نہیں کچھ کہہ سکتا جب تک تم پرسکون ہو.... بہادری اس کو

کمزور کرے گی۔ تمہارا خوف اس کو مضبوط کرے گا۔ سنا تم نے نادیہ؟“

بچی نے گہرے سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک شاخوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

”اے تمہاری شاعری نہیں سمجھ آئے گی ایڈم۔“ بدر نے اکتاہٹ سے اسے ٹوکا تھا۔

”شدید حالات میں کوششیں بھی شدید کرنی پڑتی ہیں۔“

وائٹڈالائف کے ورکرز تیزی سے دوڑتے آرہے تھے۔ کسی نے ڈرگین کے سامنے کٹا ہوا برن پھینکا۔ باقی ڈنڈے لئے فاصلے پہ احتیاط

سے کھڑے ہو گئے۔ ڈرگین نے خوشبو سے ایک دم گردن موڑی اور تیزی سے اس طرف رینگا۔ درخت سے دور۔

ایڈم تیزی سے درخت کی طرف لپکا۔ بدر نے اسے پکارا مگر وہ جواباً چلایا۔ ”تم ڈنڈے کے ساتھ ڈرگین کو پکڑنے کی کوشش

کرو.... ورکرز کی مدد کرو۔“

اور خود آگے بھاگ گیا۔ ورکرز نے بدر کو ڈنڈا پکڑ لیا تو وہ برا منہ بناتا ڈرگین کی طرف بڑھا۔ ایڈم درخت کے نیچے آکر رکا۔ ڈرگین چند

قدم کے فاصلے پہ تھا۔ اس کی طرف پیٹھ کیے ہوئے وہ برن کے کٹے جسم میں منہ ڈالے دیوانہ وار ماس کھا رہا تھا۔ ایڈم نے سراونچا کر کے اوپر

چڑھی خوفزدہ بچی کو دیکھا۔

”اور اب تم وہی کرو جو جنون، محبت اور درندوں کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔ پرسکون ہو جاؤ۔ گہرے سانس لو... خود کو ہلکا چھوڑ دو۔ آگے کیا ہوگا کے خوف سے نکل آؤ۔ مجھ پہ بھروسہ کرتے ہوئے... چھلانگ لگا دو... خود کو ہوا کے حوالے کر دو۔ میں تمہیں پکڑ لوں گا۔ شاہاش نادیہ۔“ وہ بازو پھیلائے کہہ رہا تھا... آواز اب کے کافی مدہم تھی۔ مجھے کی سانسیں تھم گئی تھیں۔ ورکرز ڈنڈے پکڑے ابھی بھی دور کھڑے تھے۔ عجیب خوف تھا جو سب پہ طاری تھا۔ بچی نے شاخ پکڑے ڈریگن کو دیکھا تو ایڈم نے پکارا۔

”یہ نہیں سوچتے کہ بری چیزیں ہمارے ساتھ کتنا برا کر سکتی ہیں۔ یہ سوچتے ہیں کہ ہم دنیا میں کتنا اچھا کر سکتے ہیں۔“ بچی نے ڈریگن سے نظریں ہٹا کے اس پہ جمائیں۔ چند لمحوں میں آنکھوں میں دیکھتی رہی... پھر کو دنگی....

اس کے پیرز مین چھونے سے قبل ایڈم نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ بچی کو اٹھائے دیوانہ وار اوپر کی طرف بھاگا تھا۔ مجمع خوشی سے شور مچانے لگا اور بدرسمیت ورکرز ڈنڈے لئے ڈریگن کی طرف بھاگے۔ اس کو اب لگام ڈالی جاسکتی تھی۔

”کیا اب یہ اس کو مار دیں گے؟“ اس کی گردن کے گرد بازو پھیلائے اس سے لگی بچی نے سراپیمگی سے پوچھا۔ وہ اسے اٹھائے نیلے تک آپہنچا تھا۔

”نہیں۔ چاہے درندہ کیسا بھی ہو، ہمیں اس کی جان لے لینا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن۔“ اس نے ایک محفوظ جگہ پہنچ کے بچی کو زمین پہ اتارا اور اس کے ہاتھ تھامے اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا، پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں جانتا ہوں تم میٹھے سیب چرانے آئی تھیں۔ تم نادیہ، آئندہ چوری نہیں کرو گی۔ چوری کا پھل کبھی میٹھا نہیں نکلتا۔ ایک ذرا سی خواہش کے پیچھے زندگیاں چٹکی میں تباہ ہو جاتی ہیں۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اور بچی نے نظریں جھکالی تھیں۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ایڈم کے ہاتھوں میں تھے....

اپنے تاریک کمرے میں بیٹھا ایڈم ابھی تک نیم پلیٹ کو تک رہا تھا... چمکتے دھات میں سے ایک اور منظر ابھرا بھر سار ہا تھا جیسے کنویں کے پانی میں بچکو لے کھاتا چاند کا عکس ہو....

وہ ایک ملٹری اعزازات اور کتابوں سے سجا آفس تھا۔ وردی والا بارعب شخص مرکزی کرسی پہ بیٹھا تھا اور ابڑ بھنج کے ناگواری سے سامنے یونیفارم میں الرٹ کھڑے ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کے ہاتھ سیدھے تھے سر پہ کیپ تھی، البتہ آنکھوں پہ خت دکھا اور بے بسی بھرے غصہ پنہاں تھا۔

”اگر میجر بدر کو کوئی اعلیٰ اعزاز مل رہا ہے تو تمہیں اس میں کیا مسئلہ ہے، کیپٹن ایڈم؟“

”سر میں یہ نہیں کہتا کہ میجر بدر کو اعزاز نہ ملے۔ اس نے ڈریگن کو اس جگہ سے ہٹایا تھا، میں مانتا ہوں، مگر سر... اس بچی کو بچانے میں میرا بھی رول تھا۔ مجھے کوئی اعزاز، کوئی انعام، کچھ بھی کیوں نہیں مل رہا؟“

”تم نے انعام کے لئے بچی کو بچایا تھا؟“

”نہیں سر۔ لیکن مجھے گھر میں اور فوج میں یہی سکھایا گیا ہے کہ جب کچھ غلط ہوتے دیکھوں تو ہاتھ یا زبان سے اسے روکوں۔ میں نے تب بھی یہی کیا۔ اب بھی اپنے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کے یہی کر رہا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔

”ایوارڈ ایک ہی شخص کو مل سکتا ہے چونکہ بدر کا کردار زیادہ نمایاں تھا اس لئے وہ اس کا حقدار ہے۔“

”مگر سیاحوں کی فوجیں..... موبائل ویڈیوز جو یوٹیوب پر موجود ہیں.... ان کا کیا سر؟“

”میں مزید اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا ایڈم۔“ وہ اب کرخنگی سے بولا تو ایڈم نے نظریں جھکا لیں۔ چند گہرے سانس لئے اور آنکھیں اٹھائیں تو ان میں زمانے بھر کے شکوے تھے۔

”میرے ساتھ یہ سب صرف اس لئے ہو رہا ہے کیونکہ میں اورنگ اصلی ہوں۔ ہے نا سر!“

(اورنگ اصلی original people پُختی ذات ہے جو بظاہر ملے جیسے ہی لگتے ہیں مگر رنگت ذرا دیتی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو ملایشیا میں وہی مقام عموماً دیا جاتا ہے جو امریکہ میں سفید فام کے مقابلے میں سیاہ فام کو یا انڈیا میں براہمن کے مقابلے میں شہر کو ملتا ہے۔)

”بہت ہو گیا۔ میں آئندہ یہ racist گفتگو نہ سنوں اس چھاؤنی میں۔“ کمانڈر نے میز پر غصے سے ہاتھ مارا تو ایڈم خاموش ہو گیا۔

بیڈروم ابھی تک تاریک تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں یونیفارم اٹھا رکھا تھا جس پہ لگی نیم پلیٹ چاندنی سے مزید روشن ہو گئی تھی۔ ایڈم کی اداس آنکھیں اس پہ کندہ اپنے نام پہ جمی تھیں جس پہ وہ دن آج بھی تحریر تھا جب....

وہ لا کر روم میں اپنے کھلے لاکر کے سامنے کھڑا تھا اور اندر سے کپڑے الٹ پلٹ کر رہا تھا جب پیچھے کوئی آ کے کھڑا ہوا۔ ایڈم نے ایک اچھٹی نظر اپنے عقب میں ڈالی مگر پھر ٹھہر گیا۔ وہ میجر بدر تھا اور ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سب کہہ رہے ہیں کہ تم نے جنرل نصیر کو ای میل کی ہے کہ تمہیں ایوارڈ اورنگ اصلی ہونے کی وجہ سے نہیں دیا جا رہا۔“

”میں نے وہ کہا ہے جو سچ ہے۔“ وہ بے رخی سے کہہ کر واپس اپنے کپڑے کھنگالنے لگا۔

”جنرل نصیر آج چھاؤنی آرہے ہیں اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ اس نسلی امتیاز کی کہانی کو سن کر تمہیں ایوارڈ دلوادیں گے تو تم غلط ہو۔“ ایڈم کھوا اور سنجیدگی سے اس کو دیکھا۔

”میں یہ ایوارڈ لینے کے لئے نہیں کر رہا۔ اگر صرف مجھے ایوارڈ دیا جاتا اور آپ کو چھوڑ دیا جاتا تو میں آپ کے لئے بھی ایسے ہی لڑتا۔“ پھر رکا اور گہری سانس لی۔ ”میں شاید اس نسلی امتیاز پہ خاموش ہو جاتا لیکن اس روز میں نے نمبر پارلیمنٹ وان فاتح رامنزل کا انٹرویو دیکھا تو جانتے ہیں اس نے کیا کہا؟ وہ کہہ رہا تھا ذاتی زندگی ہو یا کیریئر صرف سچ بولنا اور سچ کے لئے کھڑے ہونا آپ کو ترقی دلاتا ہے۔ صرف سچ آپ کو بلندی پہ لے کر جائے گا کیونکہ وہ آپ کو ہلکا کر دیتا ہے اور آپ ہر بوجھ سے آزاد فضا میں پرواز کر سکتے ہیں۔“

وہ ایڈم کے قریب ہوا اور آواز دھیمی کی۔ ”اگر تم کمانڈر کے خلاف جاؤ گے تو یہ مت بھولنا کہ کمانڈر میڈیکل بورڈ بٹھا کر تمہارے دے کی تفتیش کروا سکتا ہے۔“

ایڈم لمحے بھر کو بالکل ہکا بکار رہ گیا۔ ”مگر مجھے دسمہ نہیں ہے، وہ تو صبح کے جنگل میں ٹریننگ کے باعث معمولی الرجی ہو گئی تھی لیکن میں....“ وہ پریشان حیران سا بولا تھا۔ ”میں یہ جڑی بوٹیوں سے علاج کی کتاب پڑھا ہوں اس میں ہر بیماری کا علاج ہے، میرا دسمہ چند ماہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے لا کر سے کتاب نکال کے دکھائی۔ ”اور دسمے کی وجہ سے کسی کو فوج سے نہیں نکالا جاسکتا۔“

”میں تم سے ہمدردی کر رہا تھا ایڈم۔ عقل سے کام لو۔ صحت کے مسئلے کی وجہ سے فوج سے نکالے گئے تو کوئی تمہیں باڈی گارڈ بھی نہیں رکھے گا۔ مگنیر شادی سے انکار کر دے گی۔ مگر تم شاید سمجھتے ہو کہ یہ کتابیں اور یہ دان فاتح والی امیڈیا لوجی تمہیں ترقی دلائے گی؟ بیوقوف لڑکے، کبھی سوچا کہ آج صوفیہ رٹمن وزیر اعظم کیوں ہے اور ان فاتح خود کیوں وہ ترقی حاصل نہیں کر سکا؟“

اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا اور ایک ترس کھاتی نظر اس پہ ڈال کے آگے بڑھ گیا۔ ایڈم بالکل چپ رہ گیا تھا۔ گم صم.....

لا کر روم کا منظر وقت کی سیاہ اسکرین پہ غائب ہو گیا اور اس میں سے ایک روشن دن طلوع ہوا.... چھاؤنی کی انگریز کے زمانے کی بنائی عمارت کے برآمدے میں گردن سیدھی کیے کھڑا ایڈم۔ بالکل چاق و چوبند اور مستعد۔ اور سامنے کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا سفید بالوں والا جنرل سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔

”اور تمہارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ سوچ سمجھ کے کہنا جو بھی کہنا۔“

”میں سوچ چکا ہوں سر۔ ایڈم جھوٹ نہیں بولے گا۔“ وہ سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ایڈم کے ساتھ یہ زیادتی اس لئے ہو رہی ہے کیونکہ ایڈم ایک اورنگ اصلی ہے اور ہماری فوج آج بھی ملے کو اورنگ اصلی پہ ترجیح دیتی ہے۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ نظروں سے کہہ رہا تھا۔ ”اور ایڈم جج اس لئے بول رہا ہے کیونکہ ہمارے رسول اللہ ﷺ اس دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں اور انہوں نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ چاہے زمانہ کوئی بھی ہو.... انسان کو بلندی صرف جج عطا کرتا ہے۔ سیاسی لیڈر غلط ہو سکتے ہیں، کمانڈر غلط ہو سکتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جج فرماتے تھے اور انہوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ کسی گورے کو کالے پہ فوقیت نہیں ہے، پھر ایڈم کے ساتھ کسی صاف رنگت والے کے لئے کیوں زیادتی کی جائے سر؟“

جنرل نصیر آنکھیں چھوٹی کر کے خاموشی سے اسے سن رہا تھا جو بے خوفی سے بولے جا رہا تھا....

اور جو آخری منظر ایڈم بن محمد کو یاد تھا وہ چھاؤنی میں فوجیوں کے زیر استعمال کمروں کا تھا۔ وہ ایک کمرے کے اندر دروازہ بند کیے دیوار کے ساتھ نیچے زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا.... اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پہ میڈیکل بورڈ نے اس کو فوج کے لئے آن فٹ قرار دے دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اسے بھینچے سر جھکائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ مگر کوئی سن نہ لے، اس خوف سے سسکیاں دبائے ہوئے تھا۔ سرخ گلابی چہرے پہ آنسو ٹپکتے اس کی وردی کے سینے کو بھگوتے جا رہے تھے۔ اور وہ روئے جا رہا تھا....

”جج تو کامیابی دیتا ہے۔ جج تو انسان کو عظمت دیتا ہے.... پھر میرے خواب کیوں چھن گئے مجھ سے اللہ تعالیٰ؟ ایڈم تو صرف اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا فوج کی وردی پہن کر اپنے ملک کو دشمنوں سے نجات دلانا چاہتا تھا، مگر ایڈم کی رنگت ذرا گہری ہے اس لئے ایڈم

سے یہ موقع چھین لیا گیا، اللہ تعالیٰ ایڈم اس لئے ظلم کے خلاف کھڑا ہوا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ ظلم کو خاموشی سے برداشت کر لینے والا بھی ظالم جیسا ہوتا ہے۔ پھر ایڈم کے خواب کیوں ٹوٹ گئے، تو انکو؟“

وہ گھٹنوں پہ سر رکھے گھٹی آواز میں روئے جارہا تھا.... بچکیوں سے.... سسکیوں سے.... مگر وقت کا پہرہ پیچھے نہیں مڑ سکتا تھا....

اور اب اپنے تاریک بیدروم میں بیٹھے ایڈم کو تالیہ مراد کی ”دریافت“، یکسر بھول چکی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ جس منگیتر کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی کافی عرصے سے بن چکی تھی، وہ فوج سے نکالے جانے کے بعد پچھلے ایک برس سے اس کے ساتھ اس لئے کئی کئی رہنے لگی تھی کیونکہ وہ اب ”بے کار“ تھا۔ ملے قوم کے لئے، اپنے خاندان کے لئے، وہ سب کے لئے بے کار تھا۔

وہ اسی طرح اداسی سے بیٹھا رہا اور رات بھٹکتی رہی.... ملی اس کی کھڑکی کے سامنے منڈیر پہ بیٹھی اسے دیکھتی رہی اور چاند خاموشی سے چمکتا رہا....

☆☆=====☆☆

رات کے اس پہر بھی کوالا پور جاگ رہا تھا۔ تالیہ مراد اپنے گھر کا گیٹ بند کر کے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے ٹراؤزر کے اوپر ہڈ والی لمبی شرٹ پہن لی تھی اور پیروں میں جو گرز تھے۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ گیلی سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ تیز تیز۔ نظریں دور سامنے جمی تھیں اور ذہن پیچھے تھا....

سات سال پہلے.... لاہوری کے لان میں ایک بیچ رکھا تھا.... ہرے گھاس پہ رکھا سرمی بیچ جس پہ بھاری سی داتن ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ چہرے پہ حیرت اور تحیر لئے وہ منہ کھولے تالیہ کو سن رہی تھی جو اس کے چاروں طرف چکر کی صورت نہلتی ہاتھ ہلاہلا کے مزے سے اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔

سیاہ لمبے بالوں والی تالیہ کوالا پور میں گزارے چند ماہ میں ہی خوش خوراک کے باعث قدرے بھری بھری ہو گئی تھی۔ رف سی اسکرٹ اور اوپر لمبی قمیض پہنے اس کا چہرہ گلابی اور بچوں کی طرح پھولا ہوا لگتا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی اور لبوں پہ شرارتی مسکراہٹ۔

”پرسوں میں سوچ رہی تھی کہ سمیج کے ساتھ میں کتنا برا کرنا چاہتی ہوں؟ یونو.... بدلہ وغیرہ... تو میرا دل چاہا میں اس کا ای میل ہیک کر لوں اور اس کے سارے راز پڑھ کے دنیا کے سامنے کھول دوں مگر پھر....“ اس نے شرارت سے چٹکی بجائی۔ ”مجھے یہ خیال آیا کہ میری طرح کتنے لوگ اپنے ایکس کا ای میل ہیک کرنا چاہتے ہوں گے؟ بس پھر کیا تھا.... میں نے ایک فیک فیس بک آئی ڈی سے اشتہار لکھا اور ایسے بیجز پہ لگا دیا کہ اتنے پیسے دو اور اپنے ایکس کا اکاؤنٹ ہیک کروالو۔ داتن، دودن میں پانچ لوگ آگئے جو اپنے ایکس کی ای میل پڑھنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تمہیں کبھی بھی پیسے نہیں دیں گے، کیونکہ تم ہیک کر رہی نہیں سکتیں۔“

وہ گھوم کے اس کے سامنے آئی اور مسکرا کے بولی۔ ”آرجنینا، یوراگوئے اور امریکہ سے چار لوگوں نے پیسے ایڈوانس بھیج دیے ہیں“

صرف پچاس ڈالر تو ایڈوانس مانگے تھے میں نے۔ پانچواں غفلت تھا پہلے ایڈوانس کے جھانسنے میں نہیں آیا۔“
 ”اور باقی کے پچاس ڈالر؟“

”یہی تو اسکام ہے اصل۔ ایڈوانس اچھا معاوضہ لے لو اور پھر اس کی ای میلڈ کا جواب ہی نہ دو۔ پچاس ڈالر سے وہ غریب نہیں ہو جائے گا، مگر ہم ضرور ایک کرایے کا مکان انورڈ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ وہ کسی بھی طرح ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔ پیسے کلکٹ کرنے والی سروس پناہ بھی غلط دیا ہے میں نے۔“ وہ اس کے ساتھ آئیٹھی اور جوش سے بتانے لگی۔

داتن نے گہری سانس لی۔ ”تالیہ... میں تمہارے ساتھ ہوں، مگر یہ یاد رکھنا کہ ایک دفعہ ہم اس راستے پہ چل پڑے تو کبھی واپس نہیں آ سکیں گے۔ ابھی بھی وقت ہے سوچ لو۔“

”بس کچھ عرصے کے لئے میں یہ چھوٹے چھوٹے اسکام کرنا چاہتی ہوں، پھر چھوڑ دوں گی۔ ایک گھر، گاڑی بنالوں، اچھا کاروبار سیٹ ہو جائے، پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہم کوئی ان سیاستدانوں کی طرح غریب عوام سے لوٹ مار تھوڑی کر رہے ہیں؟“ اس نے ہاتھ سے سڑک کی طرف اشارہ کیا جہاں مرکزی شاہراہ پہ بس بورڈ لگا تھا جس پہ وان فاتح کی تصویر آویزاں تھی۔ سوٹ میں ملبوس وہ ہاتھ بلند کیے ہوئے تھا۔ مسکراتا ہوا روشن چہرہ جس کے ساتھ چند حمایتی نعرے درج تھے۔

”میں صرف ان لوگوں سے چند ڈالر لوٹ رہی ہوں جو کسی دوسرے کے ساتھ برا کرنا چاہتے ہیں، یعنی ای میل ہیک کروانا۔ وہ میرے خلاف پولیس میں نہیں جاسکتے کیونکہ جرم کے ارادے میں خود پکڑے جائیں گے۔ اور اگر وہ اپنے پیسے کی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ اس پیسے کی ملکیت کے اہل ہی نہیں ہیں۔“ وہ جذباتی انداز میں دلائل دے رہی تھی۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں تالیہ... لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہم اس کام کو کبھی چھوڑ نہیں پائیں گے۔“

”وقت آنے پہ دیکھیں گے داتن۔ میں پارلر جا رہی ہوں۔ میری شفٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہاری بریک بھی ختم ہونے والی ہے۔ آج ہم کھانا باہر کھائیں گے۔“ وہ مسکرا کے اٹھی، بیگ کندھے پہ لیا تو داتن پیچھے سے بولی۔

”تمہارے ماں باپ... تمہارا خاندان... وہ تو ملے تھے نا... ملائیشیاء کے رہائشی... کیا تم ان کو ڈھونڈنا نہیں چاہتی؟“

تالیہ رک گئی۔ لمحے بھر کے لئے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر آہستہ سے مڑی تو داتن نے دیکھا، نہ وہ پریشان ہوئی تھی نہ جذباتی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

”انہوں نے مجھے بچپن میں ہی چھوڑ دیا۔ کوئی مجھے لینے نہیں آیا۔ میں چڑیا کا چھوٹا سا بچہ تھی جس کو انہوں نے گھونسلے سے گرایا تو دوبارہ اٹھانے کا خیال تک نہ آیا۔ میں یتیم خانے میں رہی، میں ایک فوٹر فیملی کے پاس ملازموں کی طرح بڑی ہوئی جہاں مجھے روٹی اور پاکٹ منی کے لئے چوری کرنی پڑتی تھی، سزا سے بچنے کے لئے بروقت جھوٹی کہانی گھڑنی پڑتی تھی۔ میں نے خود ہی اڑنا سیکھ لیا، اب میں اس گھونسلے کو تلاش کر کے کیا کروں گی داتن جو میرے خوابوں سے بہت چھوٹا، بہت پیچھے رہ گیا ہے؟“ آخر میں مسکرائی تو آنکھوں میں نمی تھی۔ پھر وہ پلٹ

گئی اور سر جھکائے آگے بڑھتی گئی۔

سڑک پہ آگے اس نے ایک نظر بھی اس بل بورڈ کو نہیں دیکھا، بلکہ بس یونہی قدم اٹھاتی رہی۔ کنارے پہ اسٹالز لگے تھے۔ کتابوں، اخباروں اور پھولوں کے۔ ایک اسٹال کے سامنے وہ رکی۔ وہاں سفید پھولوں کے گول تاج بنے پڑے تھے جو قدیم زمانوں میں شاہزادیاں اپنے سروں پہ پہنا کرتی تھیں۔ تالیہ کے لبوں پہ مانوس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے ایک تاج اٹھایا اور آگے آئی۔ اسٹال کے وسط میں بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ تالیہ نے تاج سر پہ رکھ کے آئینے میں دیکھا۔ وہ کسی شاہزادی کی طرح لگنے لگی تھی۔ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

نظر موڑی تو سامنے اخبار سجے دکھائی دیے۔ اس نے عادتاً نوکری کے اشتہار کے لئے اخبار اٹھایا اور تہہ کھولی۔ سامنے ہی وان فاتح کی تصویر تھی اور اس کے ساتھ انگریزی میں چھپا اس کا انٹرویو۔

سر پہ تاج پہنے کھڑی لڑکی رک کے ان الفاظ کو پڑھنے لگی۔

”دو برس قبل پہلی دفعہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے والے وان فاتح بن رامنزل سے جب ہم نے پوچھا کہ وہ ملائیشیاء میں کس قسم کی بہتری دیکھنا چاہے ہیں تو ان کا جواب روایتی سیاستدانوں سے ہٹ کے تھا۔

”میں جس ملائیشیاء کا خواب دیکھتا ہوں....“ اکتالیس سالہ ممبر پارلیمنٹ اور سابق امریکی اسٹیٹ اتارنی مسکرا کے ہمیں بتانے لگے۔ ”وہاں لوگ حلال گوشت خریدنے سے زیادہ حلال کمائی کا دھیان رکھنے والے بنیں گے۔ کیونکہ بظاہر ہم نے بہت ترقی کی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور نوکریاں.... خوبصورت سڑکیں، اونچی عمارتیں اور بے پناہ ٹوارزم تو ہم نے اپنی قوم کو دے دیا ہے مگر ہم اپنی وہ اقدار بھولتے جا رہے ہیں جن کے بغیر کوئی مسلمان مکمل نہیں ہوتا۔ دو چیزیں....“ انہوں نے ہمیں انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی گویا یہ ان کے نزدیک فتح کی واحد وجوہات تھیں.....

”دو چیزیں ہوتی ہیں جو کسی بھی انسان کو دنیا اور آخرت میں کامیاب کرتی ہیں۔ سچائی اور ایمانداری۔ اور ملائیشیاء کے لوگوں کو اور سیاستدانوں کو یہ بات وقت پہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اپنے معاملات میں سچے نہیں ہوں گے، پیسے کمانے کے لئے ایمانداری ذرائع استعمال نہیں کریں گے تو وہ فراموش کر دیں اس بات کو کہ ان کے رزق میں اور زندگیوں میں اللہ کوئی برکت دے گا۔ ان کی لالچ بڑھتی جائے گی اور وہ کبھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ وہ جتنے غفلت مند اور شاطر ہو جائیں اپنے جھوٹ کھانے کا خوف ان کو کبھی بہادر نہیں بنے دے گا۔ اب آپ صوفیہ رٹن کی مثال لے لیں، محترمہ نے دو دفعہ....“

تالیہ نے اخبار نیچے کر دیا۔ سر اٹھا کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ تاج ویسے ہی کھلا کھلا سا لنگ رہا تھا مگر آنکھوں میں اداس سا ہیجان تھا۔

”آپ کو کیا چاہیے؟“ دکاندار اس کو چناؤ کا کہہ رہا تھا۔ ”اخبار یا تاج.... یا دونوں؟“

”دونوں ایک ساتھ ایک دل میں نہیں رہ سکتے۔“ وہ بڑبڑائی۔ پہلے اپنے عکس کو دیکھا، پھر اخبار کو۔ چند ٹاپے کے لئے اس نے سوچا۔ پھر اخبار دھیرے سے واپس اسٹال پہ ڈال دیا۔ ”مجھے یہ تاج چاہیے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔“ بوئے سے چند نوٹ نکالے اور سنجیدگی سے دکاندار کی طرف بڑھائے۔ اس نے چناؤ کر لیا تھا....

مگر آج رات شہر کی بارش کی گیلی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے وہ عجیب اداسی کا شکار ہو رہی تھی۔

اس سارے راستے میں... تخت و تاج کی تگ و دو میں... وہ گھونسلہ تو بھول ہی گیا تھا جس سے وہ گری تھی۔ بچپن میں ان سے شکوہ ہوتا تھا... نوعمری میں نفرت ہوتی گئی جو پھر بے زاری میں بدل کے آخر میں اپنی برحیثیت کھو بیٹھی۔ جیسے برف کو پکڑے پکڑے انگلیاں سُن ہو جاتی ہیں۔ ان کی طرف سے تالیہ کا دل بھی سُن ہو گیا تھا۔ بے حس۔

مگر آج اس نے اپنے باپا کو دیکھا تھا... وہ چابی تیار کر رہے تھے اور دل نے کہا تھا کہ اس رشتے میں تخت و تاج سے زیادہ کشش تھی۔ وہ مشکل میں تھے۔ کسی ایسی مشکل میں جس کے باعث وہ اسے بچانے نہیں آ سکے تھے۔ وہ بھی تو ان کو بچانے نہیں گئی۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ کوئی ایسے بھی بھولا کرتا ہے کیا؟

سڑک کے وسط میں پھولوں کی چوڑی سی باز بنی تھی جو دونوں اطراف کی سڑکوں کو کاٹ رہی تھی۔ وہ اس کے سرے پہ سخت جگہ پہ بیٹھ گئی اور چہرہ ہتھیلیوں میں گرا دیا۔

”میرا بھی کوئی گھر تھا۔“ بے خودی کے عالم میں خالی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ ”میرا کوئی خاندان تھا... یا شاید اب بھی ہو...“ وہ چونکی۔ ”سترہ برس ہی تو گزرے تھے۔ خاندان والے زندہ ہوں گے اگر اس مشکل سے نکل آئے ہوں تب۔“ دل کو دھڑکا لگا تھا۔ ”مگر گاؤں... وہ گاؤں والے۔ جانے کتنے برس انہوں نے میرا انتظار کیا ہو، اور شاید اب تک کر رہے ہوں۔“ ایک دم وہ بے چینی سے اٹھی اور ادھر ادھر دیکھا۔

وہ شاہراہ کے وسط میں پھولوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ارد گرد چاروں طرف سڑکیں جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایڑیوں پہ پوری گول گھومی۔ کون سا راستہ اس کا تھا، کچھ معلوم نہ تھا۔

”مجھے اپنے خوابوں کو سمجھنا ہے... مجھے اس سکے کو ڈھونڈنا ہے... مجھے چابی کو مکمل کرنا ہے...“ ٹریفک کے رش اور شور میں وہ زور سے خود سے بولی تھی۔

”مجھے اس چابی کے ذریعے تاشہ کا خزانہ ڈھونڈنا ہے اور پھر اس خزانے سے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان والوں کی مدد کرنی ہے۔ وان فاتح کہتا ہے کہ میری کامیابیاں کیا ہیں؟ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں چور اور جھوٹی سہمی میں بہت بری سہمی، مگر اچھے لوگوں کے ساتھ برے ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے اپنے گاؤں کو ڈھونڈنا ہے۔ مجھے اپنے خوابوں کا تعاقب کرنا ہے۔“

بالآخر اسے منزل نظر آنے لگی تھی... ایک مقصد... ایک مارگٹ....

ایک عزم کے ساتھ اس نے ہڈ چہرے پہ گرائی بھیبوں میں ہاتھ ڈالے اور اٹھ کے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ اب اس کا ذہن پرسکون اور رخ گھر کی جانب تھا.....

آج اس نے پھولوں کو دیکھا تک نہیں تھا۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ بھی بارش تھم چکی تھی۔ سارا گھر پانی سے نہایا ہوا تھا۔ ایسے میں وہ ابھی تک اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ پیچھے کوٹیک لگائے وہ بظاہر پرسکون لگ رہا تھا۔ مگر جیسے کھڑکی کے شیشے پہ گد لے پانی کی لڑیوں کے نشان جم گئے تھے اس کی سوچیں بھی ایسی ہی دھندلی ہو رہی تھیں۔

(میرا کلا کارڈ کیا ہوگا؟ مگر میرے پاس کوئی کارڈ بچا ہے؟) اس نے سر جھٹکا۔

خیر کارڈ بہت سے ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے سامنے کبھی نہیں جھکا۔ کوئی وان فاتح کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ نہ پہلے کر سکا ہے۔ اشعر کے ساتھ بھلے ساری دنیا آکھڑی ہو، مجھے گرا نہیں سکتا وہ۔ ہارتے وہ ہیں جو ہار مان لیتے ہیں۔

اشعر سمجھتا ہے، جدوجہد کے لئے.... سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے.... بے پناہ پیسہ اور تعلقات ضروری ہیں.... سالوں کی محنت، لوگوں کو خوش کرنا اور اشتہار بازی کی مہم.... یہ سب انسان کو مقصد تک لے جاتی ہیں۔ ایش نہیں جانتا کہ عظیم مقاصد کے لئے عظیم قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ میں نے اس سفر میں آریانہ کو کھویا ہے۔ اشعر نے کیا کھویا ہے؟

اس نے میز کے کنارے رکھا فوٹو فریم اٹھایا۔ اس میں ننھی آریانہ ہیلیمٹ پہنے گھوڑے پہ بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہنستے ہوئے تھوڑی اٹھی ہوئی تھی اور سامنے سے دو دانتوں کا خلاء دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اس دن کی تصویر تھی جب آریانہ کھوئی تھی۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آریانہ کے ساتھ اس روز کیا ہوتی تھی.... عصرہ بھی نہیں.....

سوائے وان فاتح کے.... کوئی نہیں جانتا تھا....

دل کے اس کونے میں جہاں پہلی اولاد کے نام کا خانہ ساری عمر کے لئے وقف ہو جاتا ہے، بہت ڈھیر سارا درد اٹھا تھا۔ اس خانے کو کوئی پر نہیں کر سکتا۔ اولاد چلی جائے تو بھی وہ خانہ ویران، سوگوار رہتا ہے۔ کسی بھی قسم کی خانہ بیری کا انتظار کیے بغیر۔ صبر بھی آ جاتا ہے، ڈپریشن کا فیر بھی نکل جاتا ہے.... آدمی مضبوط ہو کر آگے بھی بڑھ جاتا ہے.... مگر رات کو سونے سے پہلے.... نیند کی وادی میں ڈوبنے سے پہلے.... پلک جھپکنے سے پہلے.... وہ خانہ برات پکارتا ہے.... وہ غم کبھی نہیں جاتا.... شکل بدل جاتی ہے، کیفیت ڈھل جاتی ہے.... مگر واللہ وہ غم ساتھ نہیں چھوڑتا.....

”اگر میں اب ہار مان گیا تو سمجھو آریانہ کی قربانی رائیگاں گئی!“ پھر اس نے گہری سانس لی.... فریم واپس رکھا اور موبائل اٹھایا۔

چند لمحے بعد وہ فون کان سے لگائے جب یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو چہرے کی مسکراہٹ سچی اور اطمینان اصلی تھا۔

”عبداللطیف.... میں نے....“ (ذرا سے شانے اچکائے) اشعر کے تالاب میں کنکر پھینکے ہیں اور وہ کنکر کافی بڑے ہیں۔ نہیں، پریشانی کس بات کی؟“

وہ ہلکا سا ہنسا۔ ”تمہیں معلوم ہے سیاست تھرل کے ساتھ اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ تم اگلے کچھ دن کے واقعات بہت انجوائے کرو گے۔“ پھر دوسری طرف کچھ سن کے رکھا اور سوچتے ہوئے چہرے کی لو کو انگلی سے رگڑا۔

”میں صرف اشعر کو مصروف کر رہا ہوں۔ فاتح دنیا کو مثبت سوچ سے دیکھتا ہے.... مجھے تو اپنا اور ملا میثیاء کا مستقبل بہت روشن نظر آ رہا ہے.... وہ جتنی چالیں چل لیں، میرے ہاتھ کوئی نیا کارڈنگ ہی جائے گا۔ فی الحال میں صرف ایک جگہ مار کھا سکتا ہوں، اور وہ ہے فنڈز کی کمی۔ مجھے پیسے چاہیے ہیں۔ نہیں، میں امیر دوستوں کے عطیات قبول نہیں کر سکتا۔ نہ قرض لینا چاہتا ہوں۔ نہیں مجھے اپنی بیوی کے پیسے بھی نہیں چاہیے ہیں۔ میں ملاکہ والا گھر بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہاں اس بارے میں کوشش کرو۔“ وہ عبداللطیف کا جواب سن کے ہنسا۔ ”نادر اور قیمتی ہے تو کیا ہوا؟ میرے باپ کا گھر ہے، مجھے وہ بیچنا ہی پڑے گا.... سوائے اس صورت میں کہ کوئی خزانہ ہاتھ لگ جائے میرے جو پارٹی چیئر مین انکیشن کا مسئلہ حل کر دے۔ ورنہ کل سے ہم اس گھر کو بیچنے کی تیاری کریں گے۔“ مطمئن اور روشن آنکھوں کے ساتھ وہ ٹیک لگائے، خوشگوار انداز اور بے فکری سے مستقبل کا لائحہ عمل طے کر رہا تھا....

☆☆=====☆☆

اپنے اندھیر کمرے میں بیٹھا ایڈم ابھی تک یونیفارم کو اس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”ایڈم فاطمہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ اس نے تکلیف سے خود سے کہا تھا۔ ”وہ واحد لڑکی ہے جس سے میری برسوں سے جذباتی وابستگی ہے۔ مگر ایڈم اس کو نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے بند مٹھی سے آنکھیں رگڑیں۔ ”ایڈم محنت کرے گا.... لیکن....“ ایک دفعہ پھر مایوسی اس کے ارد گرد ڈیرا ڈالنے لگی۔ ”ایک گھر اور کاروبار سیٹ کرنے کے لئے مجھے نوکری نہیں بلکہ.... کوئی.... کوئی خزانہ چاہیے.... اور خزانے ہم جیسوں کے ہاتھ نہیں لگا کرتے۔“

☆☆=====☆☆

سڑک کنارے وہ ہڈسر پہ گرائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز چلتی گھر واپس جا رہی تھی.... لیوں پہ بالآخر پر جوش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں پرانی چمک۔ ”میرے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔ جزیروں کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پہ محل.... ڈھیروں دولت.... اور.... اپنے خاندان اور گاؤں والوں کی مدد کرنا.... اور اس کے لئے مجھے کہیں دفن وہ خزانہ ڈھونڈنا ہے جو اس سنہری چابی سے کھلے گا.... خزانہ صرف میرا ہے کیونکہ صرف میں جانتی ہوں کہ کوئی خزانہ Exist کرتا ہے.... تا شہ کا خزانہ صرف میرا ہے!“

وہ مسکرا کے سوچتی ہوئی قدم اٹھا رہی تھی.....

کوالا پور پہ اتری روشنیوں سے منور رات اسی طرح بھلکتی جا رہی تھی.....

اگلی صبح کی روشنی جب پھیلی تو سورج نے وان فاتح کی رہائشگاہ کے لان میں ایڈم کو سوچ میں ڈوبا بیٹھے دیکھا۔ وہ گاہے بگاہے کلائی پہ بندھی گھڑی بھی دیکھتا کیونکہ فاتح کے جاگنگ سے واپس آنے پہ اس کو الارٹ ہو جاتا تھا۔ کچن میں ملازموں کی ٹھک ٹھوک شروع ہو چکی تھی۔ اندر۔ یقیناً بچے اور عصرہ ناشتہ کر رہے تھے۔

تبھی گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ مگر نور دفاتح نہیں تھا۔

پرس کہنی پہ ڈالے وہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ سنہرے بال اونچی پونی میں باندھے، سن گلاسز سر پہ لگائے، وہ سفید پینٹ کے اوپر گھٹنوں تک آتی فراک نمائشٹ میں ملبوس تھی جو ملے لڑکیاں شوق سے پہنتی تھیں۔ مسکراتی ہوئی چیونگم جباتی اب وہ گارڈ سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ ایڈم کے ابرو بھنج گئے۔ (یہ یہاں اتنی صبح کیسے؟)

مگر گارڈ اس کی آمد سے باخبر دکھائی دیتا تھا اس لئے اس کو اندر لے آیا۔ وہ مسکرا کے آگے بڑھی۔ پورچ کے وسط تک پہنچی کہ دروازہ کھلا اور اندر سے عصرہ آتی دکھائی دی۔ دونوں بچے اس کے ساتھ تھے۔ اسکول کے لئے تیار۔ عصرہ خود بھی کوٹ اسکرٹ پہنے گردن میں موتیوں کی لڑی اور بالوں کا جوڑا باندھے تیار لگ رہی تھی۔ تالیہ کو دیکھ کے ایک دم رکی۔ آنکھوں میں جیسے ”اوہ“ والے تاثرات ابھرے۔

”تالیہ... تم آگئیں۔“ انداز کو معذرت خواہانہ بناتے ہوئے وہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔

تالیہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ ”السلام علیکم مسز عصرہ... آپ کہیں جا رہی ہیں؟ مجھے لگا آپ نے رات ڈنر پہ میرے فیور مانگنے کو سنجیدگی سے لیا تھا۔“ وہ اداس ہو گئی تھی۔ چہرہ بجھ گیا۔

”سنجیدگی سے لیا تھا تو ہاں بھری تھی کہ تم میرا پورٹریٹ بناؤ گی جس کو ہم نیلامی پہ رکھیں گے۔“ وہ نرمی سے کہتی اس کے مقابل آرکی۔ ”مگر میرے بچوں کی بنگامی چیرٹس نیچر مینٹنگ کی کال آگئی ہے۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے مجھے جانا ہوگا۔“

تالیہ کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ مایوس نظر آنے لگی تھی۔ ”میں اسے کوئی کیمپین پر اس سمجھوں پھر ‘مسز عصرہ؟‘“ (انکیشن سے پہلے مہم کے دوران کیے گئے وعدوں کو کیمپین پر اس کہا جاتا ہے جو اکثر یہ کہہ کے پورے نہیں کیے جاتے کہ وہ محض کیمپین پر اس تھے اور صرف کیمپین کے لئے کیے گئے تھے۔)

”ہرگز نہیں تالیہ۔“ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے عصرہ نے اسے تسلی دی۔ ”میں ابھی واپس آ جاؤں گی۔ تم تب تک خود کو گھر میں کمفرٹبل کر لو اور اپنا پینٹنگ کا سامان سیٹ کر لو۔“

”اوکے!“ تالیہ جیسے اداسی سے مسکرائی۔ عصرہ کار کی طرف آئی تو اس نے پکارا۔

”کیا میں آپ کا پورٹریٹ بنانے کے لئے اپنی مرضی کی جگہ ڈھونڈ سکتی ہوں گھر میں؟“ ڈرائیور دروازہ کھولے کھڑا تھا عصرہ نے بیٹھتے بیٹھتے مسکرا کے ”شیور“ کہا اور سن گلاسز آنکھوں پہ لگائے۔ بچوں نے کار میں بیٹھتے وقت تالیہ کو مانوسیت بھری مسکراہٹوں سے ہاتھ ہلایا تو

اس نے بھی مسکرا کے جواباً بازو لہرا دیا۔ کارزن سے باہر نکل گئی اور تالیہ ان کو جاتے دیکھتی رہی۔

ادھر کارگیٹ سے نکلی، ادھر وہ ایڑھیوں پہ گھومی اور تختہ سے لان میں کھڑے ایڈم کو انگلی سے اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا۔

”تم... ادھر آؤ!“ وہ پورچ میں کھڑی تھی۔ ایڈم لان میں تھا۔ پھر رات میں وہ اس کی حقیقت سے بھی واقف ہو چکا تھا کہ وہ جھوٹی لڑکی تھی۔ پھر بھی اتنے فاصلے اور دل کے میل کے باوجود کوئی رعب سا تھا اس میں جو وہ تابعداری سے چلا آیا۔

”جی، چے تالیہ۔“

”میری کار کی بیک سیٹ پہ جو باکسز رکھے ہیں، وہ لے کر میرے ساتھ آؤ اور کار کو اندر پارک کر دو۔“ کار کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

”مگر میں وان فاتح کے انتظار میں بیٹھا تھا، ان کو فوراً کچھ چاہیے ہوتا ہے اور....“

”باکسز کے اوپر ایک پاؤچ میں برشز ہوں گے، وہ لانا مت بھولنا۔“ بے نیازی سے کہہ کر وہ گھوم گئی۔

ایڈم کو برا نہیں لگا۔ حالانکہ لگنا چاہیے تھا۔ کوئی بھی امیر زادی اور اوپر سے یہ طرحدار لڑکی جو روپ بدل کے آئی کھڑی تھی، اسے یوں حکم دے گی تو وہ لازمی برا منائے گا مگر اس نے نہیں منایا۔ کچھ تھا جو اس امیر زادی میں جو اس کے اوپر چڑھے طمع کے باوجود فطری اور عام لوگوں جیسا تھا۔ ایڈم نے چابی تھام لی اور گیٹ کی طرف چلا گیا۔

(مگر آج میں فاتح صاحب سے ضرور بات کروں گا۔ جو بھی ہے اس لڑکی کا پول کھلنا چاہیے۔)

ایڈم سامان اٹھائے اندر آیا تو وہ ڈرائینگ روم میں بڑے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، وہ جوس پیتے ہوئے، گردن پھیر پھیر کے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی جس سے اس کی اونچی پونی جھول رہی تھی۔ ایڈم نے چیزیں سامنے دھریں۔ تالیہ آگے کوچکی اور ایک نیلا شاپنگ بیگ اٹھایا جس میں سے کچھ کپڑے جھلک رہے تھے۔

”یہ تم لے جاؤ۔“ وہ چونکا۔ پھر حیرت سے بیگ کو دیکھا۔

”میں اس کا کیا کروں گا؟ چے تالیہ؟“

تالیہ نے جوس کا گھونٹ بھر کے گلاس نیچے کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکرائی۔ ”نور کو دے دینا۔ کہنا تالیہ نے بھیجا ہے پاکستان سے۔ اب جو وعدہ اس سے کرائے ہو، اس کو سچا تو ثابت کرنا ہو گا۔“

اور ایڈم بن محمد برف کابت بن گیا۔ ہکا بکا۔ شل۔ گویا سانس تک رک گیا ہو۔ (اس کو اتنی جلدی کیسے پتہ چل گیا؟)

”اوہ پور تھنک.... چچ چچ....“ تالیہ افسوس سے سر ہلارہی تھی۔ ”تمہیں لگا تھا تم جیسن بورن بن کے وہاں جاؤ گے اور مجھے معلوم نہیں ہو گا؟ میری دو آنکھیں میری گردن کے پیچھے بھی لگی ہیں ایڈم۔ میرے بارے میں سوال مجھ سے پوچھو تو زیادہ بہتر ہو گا۔“ جوس کا گلاس رکھ کے وہ انھی اور مسکرا کے شل ہوئے ایڈم کو دیکھا۔ ”اور سنو.... کوئی بھی بے وقوفی کرنے سے پہلے میری طرف کی کہانی ضرور سن لینا۔ یہ نہ ہو کہ بعد

میں تمہیں وان فاتح کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میری بات کے مقابلے میں تمہاری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی، یہ یاد رکھنا۔ باتھ روم کس طرف ہے؟“

شل سے کھڑے ایڈم نے میکا کی انداز میں کونے میں بنے گیٹ روم کی طرف اشارہ کیا تو تالیہ سیدھی اس طرف چلی گئی۔
 ”عصرہ کی میٹنگ والی ٹرک کام کر گئی۔“ کچھ دیر بعد وہ سنک کے سامنے کھڑی اپنے بکس کو دیکھتی فون پہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے کہا تھا نا، دو چار ماہیں اسکول فون کر کے کہیں گی کہ عصرہ کا بیٹا کلاس میں سیاسی پمفلٹ تقسیم کر رہا ہے تو صبح صبح عصرہ کو بلوایا جائے گا۔“
 ”پکا کام کیا ہے۔ گھنٹے سے پہلے عصرہ بیگم فارغ نہیں ہوں گی۔ تم تب تک سکے کو ڈھونڈ لو اور سنو۔“ داتن ساتھ میں کچھ کھا بھی رہی تھی۔
 ”ایک دم یاد آنے پہ بولی۔“ ایڈم کا کچھ کیا؟ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرے آدمی نے کہا ہے کہ وہ رات میں....“
 ”ہاں اس کو میں نے الجھا دیا ہے۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے امید ہے مجھ سے بات کرے گا۔“
 ”تمہیں کیسے پتہ؟“

”کیونکہ کچھ لوگ لیڈ کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ کچھ لیڈ ہونے کے لئے۔ ایڈم دوسری طرح کے لوگوں میں سے ہے۔ تم بتاؤ، وائی فائی کو جام کر دیا؟“ وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔ میں گھر سے ذرا فاصلے پہ ہی ہوں۔ وائی فائی جام ہو چکا ہے۔ اب گھر کے کیمرے کام نہیں کریں گے۔“
 ”کیمرے صرف اینٹرنیٹ اور ڈرائنگ روم میں ہیں۔ پرائیویسی کے باعث ہر جگہ کیمرے نہیں لگے۔ اچھا اب میں اوپر جا رہی ہوں۔“ سرگوشی میں کہہ کے اس نے فون رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ سر جھکا کے موبائل کے بٹن بھی دبایا ہی تھی۔ مصروف اور موڈی انداز۔ اسی طرح اوپر چلی گئی اور ملازم خاموش رہے۔

فاتح کا ایک انٹرویو چند ماہ پہلے اس کی اسٹڈی میں لیا گیا تھا۔ اس کی تصویر میں فاتح کے عقب میں شیلف میں سکوں کی کلکیشن نظر آرہی تھی۔ کسی زمانے میں شاید وہ اکٹھا کرتا ہوگا۔ اسے وہی دیکھنی تھی۔ اگر گھر میں کہیں وہ سکہ رکھ سکتے تھے تو یا کلکیشن میں سجا کے یا عصرہ کے لاکر میں چھپا کے رکھ سکتے تھے۔ یہی دو جگہیں تھیں۔

وہ اوپر آئی اور ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھتی آئی۔ ایک دروازہ کھولا تو وہ گلابی رنگ سے سجا چھوٹا کمرہ تھا۔ (جولیانہ کا کمرہ ہے یہ۔).... اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دوسرا کھولا تو پوٹرز اور گیمز کلکیشن سے معلوم ہو گیا کہ وہ سکندر کا تھا۔ تالیہ نے اس کو بھی احتیاط سے بند کر دیا۔ پھر وہ ٹھہری۔

راہداری کے سرے پہ ایک اور دروازہ بھی تھا۔ تجسس اور اسرار میں لپٹا۔ تالیہ کا دل یونہی دھڑکا۔ وہ آگے آئی اور ڈور ٹاب گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا تھا جس سے روشنی چھن کے کمرے میں گر رہی تھی۔ وہ اونچی چھت کا کھلا سا کمرہ تھا۔ نہ بے بی پنک میں رنگا نہ کھلونوں سے سجا... اس میں اونچے بکریک رکھے تھے جن میں کتابیں بھی تھیں۔ کتابیں.... بہت سی کتابیں....
تالیہ نے اندر قدم رکھا اور بتی جلائی۔

کمرہ بالکل صاف تھا۔ مگر لگتا تھا عرصے سے بیڈ پہ کوئی بیٹھا نہیں ہے۔ کونے میں نفاست سے سچی اسٹڈی ٹیبل۔ اس پہ لکھنے پڑھنے کا سامان۔ وہ آگے آئی۔ بکریک کے سامنے رکی۔ گردن اٹھا کے کتابوں کی جلدیں دیکھیں۔ فیری میلو۔ فینیکسی ناؤز۔ ننھے غزال کی کہانیاں۔ دیو مالائی جادوئی داستانیں۔ ایک ہزار ایک راتیں۔ (الف لیل و لیل)۔
کسی سحر میں وہ کتابوں کی جلدوں کو پڑھتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ الماری کا پٹ کھولا تو اندر کپڑے منگے تھے۔ عام نہیں۔ صرف خاص۔ پیروں تک آتی کاہلار میکسز جو کسی سات آٹھ سال کی بچی کو پوری آسکتی تھیں۔ تاج۔ موتیوں کی مالائیں۔ قدیم طرز کی شہزادیوں والے لباس اور زیورات۔

’تو آریا نہ کو شہزادیاں پسند تھیں۔ اور شاید فیری میلو میں رہنا بھی۔‘ وہ اداسی سے مسکرائی۔ اگر اب وہ کہیں زندہ ہے تو تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ بچ۔ اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ وقت کم تھا۔ وہ احتیاط سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی تو یوں لگا، کسی گزرے زمانے کا دروازہ بند کیا ہے.... جیسے کوئی عہد تمام ہوا.... جیسے ماضی دفن ہو گیا....

اسٹڈی خاموش پڑی تھی۔ گردن دائیں بائیں گھماتی پونی جھلاتی وہ سب قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ سامنے دیوار میں بنا اونچا شو کیس تھا۔ وسطی خانے میں اسٹینڈ کے اوپر سکے سجے تھے۔ مختلف ادوار اور حکومتوں کے سکے۔ وہ شوکیس کے شیشے کے بالکل قریب آرکی۔ ایک ایک سکے کو دیکھا۔ ان کے نشان علامتیں پڑھیں۔ وہ سکے نثار دیتا....
اور تبھی... شوکیس کے شیشے میں عکس سا ابھرتا دکھائی دیا۔

’تم!‘ وان فاتح کی برہم سی آواز سنائی دی۔ مگر وہ تالیہ تھی۔ نہ ڈری نہ گھبرائی۔ آرام سے پٹی اور مسکراتی نظریں ان پہ جمائیں۔
’گڈ مارنگ فاتح صاحب!‘

وہ جاگنگ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا تولیہ تھا جس سے بھیگی گردن پونچھتے ہوئے پتلیاں سکیرے ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا۔
’تم رات یہیں رک گئی تھیں کیا؟‘

’نہیں سر.... مسز عصرہ کا پورٹریٹ بنانا ہے میں نے نیلامی کے لئے۔‘ وہ رسان سے مسکرا کے بتانے لگی۔ ’اسی لئے انہوں نے مجھے صبح بلوایا تھا۔‘

’مگر عصرہ کو تو اسکول جانا تھا۔‘ وہ قدم قدم قریب آ رہا تھا۔ آنکھیں مشکوک انداز میں قدرے اتکا ہٹ سے چھوٹی کر رکھی تھیں۔

”جی“ اور انہوں نے واپس آنے تک مجھے پور ٹریٹ کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لئے کہا ہے۔ میں وہی جگہ تلاش کر رہی تھی کہ آپ کی اتنی خوبصورت اسٹڈی اور یہ کلکیشن دیکھنے....“

”سے خود کور وک نہ سکی اور اندر چلی آئی۔ تم سب بردفعہ یہیں سے کیوں بات شروع کرتی ہو؟“ فاتح نے افسوس بھری گہری سانس لے کر اس کوٹو کا تو تالیہ ٹھٹھک کے رک گئی۔

”جی؟“

”مجھے وقت نہیں ملتا اور نہ ضرور نوٹس کرتا“ کہ تم نے میری بیوی کو آخر کس طرح اتنا چارم کر لیا ہے کہ اس نے تمہیں گھر میں داخل ہونے دے دیا ہے.... لیکن میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم سب لڑکیاں ہمیشہ گھر میں گھومنے پھرنے سے ہی کیوں آغاز کرتی ہو؟“ ٹھنڈے انداز میں کہتے ہوئے وہ اسٹڈی ٹیبل کے دراز تک آیا اور اسے کھولا۔ پھر سر جھکائے چند فائلز نکالیں۔ تالیہ کو بات سمجھ آئی تو اس کی رنگت سرخ ہوئی۔

”آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”بالکل۔“ وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ”پھر بالکل یہی فقرہ بولا جاتا ہے۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد عموماً تم میں سے کوئی رونا شروع کر دیتی ہے۔ میرے ساتھ فلاں مسئلہ ہے، فلاں مجھے براں کر رہا ہے، میرا فلاں کام اٹکا ہوا ہے۔“ فائل پہ جھکے باز دیکھنے لگا کہ اس نے میز سے قلم اٹھایا اور صفحے پہ کچھ انڈر لائن کیا۔ ساتھ ہی بے رحمی سے بولے جارہا تھا۔

”پھر اس کے بعد لڑکی اپنا نمبر چھوڑ جاتی ہے.... یا کارڈ.... اور ہاں، مجھے بھول گیا، ساتھ میں اپنی کوئی چیز بھی.... کوئی کلپ، کوئی ایئر رنگ... کوئی نشو.... کبھی میری اسٹڈی میں.... کبھی نیچے میرے کمرے میں نظر بچا کے داخل ہو کے.... اس لئے....“ نظر اٹھا کے سادگی سے اسے دیکھا۔ ”اگر تم نے کچھ چھوڑا ہے تو ابھی لے جاؤ کیونکہ میں ایسی چیزوں کو کچھرے میں پھینک دیتا ہوں، اور میری بیوی ان کی اتنی عادی ہے کہ وہ ایسی بے وقوف لڑکیوں پہ ہنس دیا کرتی ہے۔“ قلم رکھا اور چھوٹے ٹولے سے چہرہ اور گردن دوبارہ سے پونچھے۔

”ہوں!“ تالیہ نے گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ ضبط سے ہنکارا بھرا۔ ”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی فیئر آپ کے گھر داخل ہو کر یہ سب کرتی ہیں۔“

”اور بالکل تمہاری طرح وہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ دوسری لڑکیاں یہ کام پہلے بھی کرتی آئی ہیں۔“

بولتے ہوئے وہ میز کے کنارے پہ بیٹھا اور سیل فون نکال کے فائل سے کچھ اس پہ فیڈ کرنے لگا۔

”اور اکثر یہ لڑکیاں کسی بہانے سے مسز عصرہ سے شناسائی بنا کے آپ کے ارد گرد یہ ساری حرکتیں کرتی ہیں، ہوں؟“ وہ لب بھنجے بدقت مسکرا کے بولی۔

”کئی سالوں سے۔ بالکل اسی طرح۔“ اس کی نظریں اسکرین پہ جھکی تھیں اور انگوٹھا ٹچ بٹنوں پہ حرکت کر رہا تھا۔

تالیہ کی گردن میں گھٹی سی ڈوب کے معدوم ہوئی۔ آنکھیں سرخ گلابی پڑنے لگی تھیں مگر وہ سیدھی کھڑی رہی، گردن کڑائے رکھی۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں یا نہیں کیونکہ وہ یقیناً یہ سب کرتی ہوں گی۔ میں صرف اتنا پوچھوں گی واں فاتح....“ چبا

چبا کے وہ زہر خند سا بولی۔ ”کہ وہ یہ سب آپ کے اس پاس اتنا کفر ٹیل ہو کر کیسے کر لیتی ہیں؟“

فاتح نے چونک کے آنکھیں اٹھائیں۔ اسے شاید اس جواب کی توقع نہیں تھی مگر وہ لڑکی اب بازو سینے پہ لپیٹے، ڈھٹائی سے بلند آواز میں بولے جا رہی تھی۔

”آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اپنی بیوی سے وفادار ہیں اور یقیناً ہوں گے۔ آپ کے بارے میں ایسی باتیں ہم نے کبھی نہیں سنیں۔ بہت سچے اور ایماندار ہیں آپ لیکن ایک بات آپ کو ماننی پڑے گی کہ آپ ان فیز کو آرام سے یہ سب کرنے دیتے ہیں۔ بے شک آپ کی طرف سے حوصلہ افزائی نہ پا کر وہ پلٹنے پہ مجبور ہو جاتی ہوں گی مگر آپ.... ان کو.... یہ سب.... کرنے دیتے ہیں کیونکہ اس سے آپ کی سیلبرٹی والی جس کو تسکین ملتی ہے۔ ہے نا؟“ تلخی سے مسکرائی تو فاتح کے ماتھے پہ برہمی سے بل پڑے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا تالیہ نے تیزی سے بات جاری رکھی۔

”آپ نے ابھی تک صرف خوبصورت چہرے اور خالی دماغ والی لڑکیاں دیکھی ہیں جو آپ کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں اور آپ کے غرور میں اضافہ کرتی ہیں۔ اس لئے اگر میں آپ کی جگہ ہوتی تو تالیہ مراد سے بات کرنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب چن لیتی کیونکہ یہ نہ ہو کہ کسی دن گدلے پانی میں کھڑے ہو کر آپ کو اعتراف کرنا پڑے کہ آپ کو.... میری.... ضرورت ہے!“

تیز تیز بولتے ہوئے اس کو سانس چڑھنے لگا تھا مگر وہ کمال ضبط سے آواز کو ہموار رکھے ہوئے تھی۔ جھپتی نظریں فاتح پہ جمی تھیں جو اس کی بات پہ آنکھیں سکوڑ کے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا۔ فائل رکھی اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مجھے صبح صبح.... اپنے گھر میں.... اجنبی لڑکیوں کا.... یوں گھومنا پھرنا.... پسند نہیں ہے.... میری بیوی کی خوشامد تم ڈرائیونگ روم کی حد تک بھی کر سکتی ہو۔“

”تو اپنے ملازموں سے کہیے کہ مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیں کیونکہ میں یہاں پینٹنگ بنانے آئی ہوں، جگہ بنانے نہیں، اور اپنی مرضی کا اسپاٹ ڈھونڈنے بغیر نیچے نہیں جاؤں گی۔“

وہ اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے پلک تک نہ جھپک رہی تھی۔ فاتح نے چہرہ اس کی طرف جھکایا اور سر گوشی کی۔

”پتہ ہے میں تمہیں اتنے دن سے برداشت کیوں کر رہا ہوں؟“ اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ ”کیونکہ آریانا.... تمہیں پسند کرتی تھی،

تاشہ آگاپووا!“ وہ واپس پیچھے ہوا۔ پھر اس کو دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

تالیہ چند لمحے شل کھڑی رہی۔ ”تاشہ آگاپووا؟“ بجلی کے کوندے کی طرح وہ نام ذہن میں لپکا اور اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

فاتح جاچکا تھا اور شاک سے نکلنے ساتھ ہی تالیہ کو اسٹڈی کی خاموشی میں اپنے کہے الفاظ کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ اس نے ایک دم دل پہ ہاتھ رکھا۔ جیسے خوفزدہ اور بے یقین ہو۔

”میں نے یہ سب کہہ دیا ان سے؟ وہ وان فاتح تھے... وہ ملائیشیاء کے محبوب وان فاتح تھے۔ لوگ ان کے قدموں میں رل جانے کو تیار رہتے ہیں اور میں.... میں ذرا سی توہین برداشت نہ کر سکی۔“ رنگت سرخ ہو رہی تھی اور آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔

”نہیں تو کرتی ہوں میں ان کو۔ سب کرتے ہیں۔ ہاں نہیں ہوں میں ان لڑکیوں کی طرح مگر میں بھی تو چوری کی نیت سے آئی تھی۔ پھر ان کو ناراض کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ساری عمر کے لئے ان کو خود سے ناراض کر لیا۔ اب تو وہ مجھے شدید ناپسند کرنے لگیں گے۔“ اپنے سر پہ اس نے بے بسی سے چپٹ لگائی۔ ”وہ وان فاتح تھے تالیہ.... ان کو روز ایسی ہی لڑکیاں ملتی ہیں.... اتنا زیادہ اکڑنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں۔ خاموشی سے برداشت کر لیتیں؟“ آف تم نے کس کو ناراض کر دیا۔“

”مگر وہ مجھے ہتک سے دیکھ رہے تھے۔“ اندر کی لڑکی نے انگڑائی لی۔ ”اور میں ایسی ہتک کسی کی طرف سے برداشت نہیں کر سکتی۔“ کیا جج تھا کیا جھوٹ۔ اب فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے آنکھیں رگڑیں اور باہر نکل آئی۔ عصرہ آنے والی ہوگی۔ مگر دل ابھی تک کرلار ہا تھا اور احساس توہین سے کان بہنوز سرخ پڑے تھے۔

☆☆=====☆☆

وہ ایک قلعہ نما بلند وبالا گھر تھا جس کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار پھیلے تھے۔ لان کے کونے میں ایک اونچا ٹیلہ تھا جس پہ لکڑی کی گول کینوپی بنی تھی۔ لکڑی کے ستونوں کی مدد سے کھڑی اونچی چھتری جس کے نیچے کرسیاں بچھی تھیں۔ وہاں بیٹھے افراد نشیب میں جاتے سبزہ زار اور دور واقع قلعے کا دفریب نظارہ کر سکتے تھے۔ گھاس پہ چرتے ہرن.... ایک طرف ٹہلتا کتا.... بھاگتے پھرتے خرگوش.... غرض وہاں قدرتی حسن کو بکھیرنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔

یہ اشعر محمود کے والد محمود بن عزیز کی کا گھر تھا جو اشعر کوتر کے میں ملا تھا۔

اشعر اس وقت کینوپی کی کرسی پہ بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک سرمئی سوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر گورا چٹنا چینی شخص بیٹھا تھا۔ اشعر خاموشی سے مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا جو فون پہ ہدایات دے رہا تھا۔

”ہڈی کی اسٹوری کل تو کیا کسی بھی دن پرنٹ نہیں ہوگی۔ جیسا میں نے رات میں کہا تھا ویسے ہی کرو۔ ایک مگ کے پیچھے ہم اپنے اخبار کو قانونی کیسز کی طرف نہیں دھکیل سکتے۔ ہم نے ایک نسل پرست ایشو کو اٹھایا تو حکومت بھی ہمیں بیک نہیں کرے گی۔“ پھر موبائل بند کر کے میز پہ ڈالا اور مسکرا کے سامنے بیٹھے اشعر کو دیکھا۔ ”میں مزید تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں ایش؟“

”آپ نے رات کو ہی یقین دہانی کروا کے میرے لئے سب کچھ کر دیا تھا۔ اب میرے کچھ کرنے کا وقت ہے۔“ کہہ کے اس نے ناگ سے ناگ بنائی اور ایک فائل میز پر رکھی۔

”یہ نوآرزم ملائیشیاء کے اشتہاروں کی تفصیلات ہیں جو کل سے آپ کے اخبار کی زینت بنیں گے۔“ بادل زور سے گرے اور پل بھر میں ٹپ ٹپ قطرے برسنے لگے۔

”یہ حکومتی اشتہار ہیں۔“

”اور میں اپوزیشن میں ہوں، جانتا ہوں لیکن میرے دوست برجگہ ہوتے ہیں۔“ چینی صاحب مسکرائے اور فائل کے صفحات دلچسپی سے پلٹنے لگے۔ اشعر نے گردن موڑ کے دیکھا۔ بارش تڑا تڑا برس رہی تھی اور کینو پی کی چھاتا کے کناروں سے پانی نیچے ٹپک رہا تھا۔ برن قلائچیں بھرتے آشیانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ کتا قلعے کی طرف دوڑا۔ پل بھر میں سارا منظر جل تھل ہو گیا تھا۔

”میرا خوبصورت ملائیشیاء۔“ وہ ستائش سے مسکرایا۔ (اور یہ ملک میں کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔)

”روزانہ کی بنیادوں پہ آدھے صفحے کے اشتہارات۔ وہ بھی فرنٹ پیج پہ۔ زبردست اشعر!“ اخبار مالک نے خوشگوار حیرت سے ابرو اٹھائے۔

”اور یہ سرکاری اشتہارات ہیں۔ پیسہ سرکاری خزانے سے جائے گا۔ کسی کو میرے اور آپ کے تعلق پہ شک نہیں ہوگا۔“ وہ بیچ کی پشت پہ بازو پھیلانے اطمینان سے بتا رہا تھا۔ ”لیکن آپ کو ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔“

چینی صاحب نے چونک کے عینک کے پیچھے سے آنکھیں اٹھائیں۔ ”اور وہ ہے؟“

”جس صحافی نے خبر لگانی چاہی تھی۔ اس کو نوکری سے نکال دیں۔“

”وہ کیوں؟“ اخبار مالک ٹھٹھک گئے۔

”کیونکہ کل کو وہ اگر کسی دوسرے اخبار کا رخ کرے تو ہم یہ کہہ سکیں کہ اس نے یہ سب صرف اور صرف اپنے چینی مالک کے خود کو نوکری سے نکالنے کی وجہ سے کیا ہے۔ تعصب، یونو۔“ مسکرا کے ہلکے سے شانے اچکائے تو چینی صاحب کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے اور ہونٹ مسکرا اٹھے۔ ”میں سمجھ گیا۔“

اشعر نے دوبارہ سے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا۔ پتھر یلا قلعہ بارش میں بھگتا جا رہا تھا۔ سارے جانور، چرند پرند چھپ گئے تھے۔ تنہا بھگتا قلعہ.....

☆☆=====☆☆

بارش نے موسم ٹھنڈا کر دیا تھا مگر وان فاتح کے لاؤنج میں پھر بھی ہلکا اے سی چل رہا تھا جیسے بروقت برجگہ ملائیشیاء میں چلتے رہتے ہیں۔ کھڑکی کے ساتھ اونچی شاہانہ کرسی پہ عصرہ بیٹھی تھی۔ روایتی لمبی سفید قمیض پہنے، نیچے نیلا اسکرٹ جسے باجو کرونگ کہتے تھے۔ (باجو قمیض اور کرونگ اسکرٹ)۔ کندھے پہ سلک کاسٹول تھا۔ بال جوڑے میں تھے۔ وہ مسکرا کے تالیہ کو دیکھ رہی تھی جو اپنا ایزل اور کینوس سامنے سیٹ کیے کھڑی تھی۔ اونچی پونی باندھے، وہ برش کا پچھلا کنارہ لبوں میں دبائے، تنقیدی پرسوج نظروں سے عصرہ کو دیکھ رہی تھی۔

”ایک منٹ۔“ پھر برش رکھ کے آگے آئی اور کسی ماہر اسٹائلسٹ کی طرح عصرہ کا دوپٹہ کندھے پہ درست کرنے لگی۔ اپنی شرٹ سے بروج اتار کے سٹول بروج کے ذریعے عصرہ کے کندھے کے ساتھ تھمتھی کیا۔

”آپ کسی دوسرے کا زیور پہننا برا خیال تو نہیں کرتیں؟“ سوال پہ عصرہ مسکرا دی۔

”یہ بروج بہت خوبصورت ہے۔“

(ہوں.... یعنی۔ برا خیال کرتی ہے مگر ابھی تکلف میں برداشت کر لے گی۔ گڈ۔)

”آپ کا پورٹریٹ بہت خوبصورت ہو گا مسز عصرہ۔ مجھے نیلامی کے ڈیڑھ درجن کارڈز بھی دیجئے گا کیونکہ میں چند ملکی اور غیر ملکی آرٹ کلیکٹرز کو مدعو کرنا چاہوں گی جو ویسے تو شاید وان فاتح کا نام سن کر بھی نہ آئیں، مگر میرے کہنے پہ آجائیں گے۔“

ننگھیوں سے فاتح کو دیکھ کے اونچا سا بولی جو تیار ہو کے اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ سیاہ سوٹ، نائی میں ملبوس، بالوں کو دائیں طرف پیچھے کر کے جمائے، پارٹی آفس جانے کے لیے مکمل تیار تھا۔ اپنے نام پہ ایک اچھلتی نگاہ اس طرف ڈالی جہاں اونچی سنہری پونی والی لڑکی قدرے خفگی سے عصرہ کا سٹول جوڑتے کہہ رہی تھی۔

(جیسے اس کو پرواہ تھی؟) سر جھٹک کے وہ آگے بڑھ گیا۔

”مسز عصرہ.... اگر آپ برا نہ منائیں تو....“ وہ پیچھے ہوئی اور پھر سے تنقیدی نظروں سے عصرہ کا جائزہ لیا۔ ”موتیوں کی بجائے ڈائمنڈز پہنیں۔ موتی آپ کو سیاسی بیوی کا لک دیتے ہیں جو کہ آپ ہیں، مگر میں مسز فاتح کا پورٹریٹ نہیں بنانا چاہتی۔ میں عصرہ محمود کو پینٹ کرنا چاہتی ہوں جو ایک وکیل، ایک ماں، ایک بیوی کے علاوہ بھی اپنی پہچان رکھتی ہیں۔ آپ وہ جیولری پہنیں جو بطور ایک عورت آپ نے سب سے زیادہ دل سے خریدی ہو۔ جو عصرہ نے عصرہ کو تحفے میں دی ہو۔“

اس کی بات پہ عصرہ چونکی۔ بات دل کو لگی تھی۔ وہ مسکرا کے ”میں سمجھ گئی“ کہتی اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فاتح لاؤنج سے ملحقہ ڈائیننگ ہال کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کا ناشتہ تیار تھا۔ عصرہ کے اٹھتے ہی تالیہ ”میں ذرا ہاتھ دھولوں“ کہہ کے لاؤنج کے کونے میں بنے گیسٹ ہاتھ روم کی طرف چلی آئی۔

دروازہ بند کرتے ہی اس کے ہاتھوں میں تیزی آ گئی۔ فون نکالا، اور ہینڈز فری تھمتھی کر کے کانوں میں گھسائے۔ پھر بے چینی سے اسکرین کو دیکھنے لگی، جہاں عصرہ کے بروج میں نصب نینو کیمرہ وہ سب دکھا رہا تھا جو عصرہ دیکھ رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے کا انداز.... پھر کیمرہ آگے بڑھتا گیا.... لا کر کے پاس ٹھہر جانا.... عصرہ کا ہاتھ سامنے آیا.... لا کر کے پیسے کو مخصوص نمبروں پہ گھمایا (تالیہ نے ان کو زبانی یاد کیا۔ ویڈیو کلیم تھی) لا کر کا دروازہ کھل گیا۔ اب سارا لا کر سامنے تھا۔ عصرہ نے ایک ایک ڈبہ ہٹایا۔ چند زیورات چیک کیے۔ اور ایک نیکلیس نکالا۔ لا کر اتنے اچھے طریقے سے آرگنائزڈ تھا کہ تالیہ اسکرین پہ دیکھ سکتی تھی.... سکے وہاں نہیں تھا.... تالیہ کے وجود میں مایوسی پھیلنے لگی۔ وہ ہینڈز فری اتار دیتی کہ آواز سنائی دی....

”عصرہ!“ کیمرہ گھوما (عصرہ گھومی) تو فاتح سامنے آیا۔ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کے آیا تھا غالباً۔ چہرے سے ناخوش لگتا تھا۔ پیچھے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا تا کہ آواز باہر نہ جائے۔

”تم ناشتہ نہیں کر رہے؟“

”یہ لڑکی کب تک ہمارے گھر میں منڈلاتی رہے گی؟ اس کو فارغ کرو۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں آئی۔“ اندھیرا تھر روم میں کھڑی تالیہ موبائل کی روشن اسکرین پر فاتح کا خفا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔

”کیا میں تمہارے سیاسی دوستوں کے ساتھ ایسے ہی کرتی ہوں؟“

”وہ تمہاری نئی کاروباری دوست ہے، یہاں تک ٹھیک ہے لیکن مجھے اس کا اپنے گھریلو منڈلا نا پسند نہیں آیا۔ کیا یہ وہی ہے جو یہ خود کو کہتی ہے؟“ (تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔)

”اشعر نے معلوم کروایا ہے۔ اس کی اچھی ریپوٹیشن ہے۔ کیا تم نے اس کویتی شیخ سے نہیں سنا؟ وہ تک اس سے واقف تھے۔ اور اشعر اس کو پسند کرنے لگا ہے میں یہ سب اس کے لئے کر رہی ہوں۔“ تالیہ مراد نے دونوں آنکھیں کھول کے اسکرین کو دیکھا۔ (کیا؟ تو سمجھ جو کہہ رہا تھا وہ درست تھا؟)

”تو پھر یہ سب ایش کے گھر کرو۔ مجھے اس کا اپنے گھر میں گھومنا پھرنا پسند نہیں آرہا۔ کچھ عجیب dishonest سا ہے اس لڑکی کے بارے میں جو مجھے کھٹک رہا ہے۔“ وہ اکتایا ہوا لنگ رہا تھا۔ عصرہ کے سانس لینے کی آواز آئی۔

”چند دن کی بات ہے پھر ہم نے کون سا ملایشیاء میں رہنا ہے جو....“

”ہم ملایشیاء سے کہیں نہیں جا رہے عصرہ۔“ وہ سختی اور درشتی سے بولا۔ نظریں عصرہ پر تھیں۔ کیمرے پر۔ تالیہ کو اس کی نظریں خود پہ محسوس ہوئیں۔ ”اشعر کی باتوں سے نکل آؤ۔ میں نے اپنی بیٹی کھوئی ہے اس جدوجہد میں۔ اگر اب میں نے یہ سب چھوڑ دیا تو اس کا مطلب ہے آریانہ کو ہم نے بے مقصد ضائع کیا۔“

”ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے فاتح۔“ عصرہ کی خشک آواز سنائی دی اور پھر کیمرہ آگے بڑھ گیا۔ عصرہ باہر آ رہی تھی۔ تالیہ نے جلدی سے ہینڈ زفری کانوں سے نکالی۔

تھوڑی دیر بعد فاتح ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہا تھا۔ دروازے کھلے تھے اور سامنے لاؤنج میں ایزل پہ برش چلاتی تالیہ دکھائی دے رہی تھی۔

”کا کا۔“ مرکزی دروازہ کھلا اور مانوس سی آواز آئی۔ جہاں بت بنی عصرہ مسکرائی، وہیں تالیہ مراد کے اندر تلخی سی پھیل گئی، مگر بنا اثر لیے پینٹ کرتی رہی۔

اشعر اندر داخل ہوا۔ مسکراتا ہوا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے۔ کوٹ غالباً کار میں چھوڑ آیا تھا۔ دور بیٹھے فاتح نے بس ایک نظر

اٹھا کے اس کے سلام کا جواب دیا اور سوپ پینے لگا۔ عصرہ البتہ مسکرا کے متوجہ ہوئی تھی۔

”آؤ ایش! میں تمہیں ہی مس کر رہی تھی۔“ وہ آگے آیا اور تالیہ کو دیکھ کے خوشگوار حیرت سے رکا۔ ”چے تالیہ۔ السلام علیکم۔“

برش کرتی تالیہ نے نظریں کیونوس پہ جمائے وعلیکم السلام کہتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ اشعر نے اس کا انداز غور سے دیکھا مگر اثر نہیں لیا۔ وہ عصرہ کے سامنے کرسی پہ آ بیٹھا اور متفکر انداز سے بات شروع کی۔

”میں نے سوشل میڈیا پہ ویڈیو دیکھی۔ آپ کے ساتھ یتیم خانے میں کل کسی نے بدتمیزی کی؟“

عصرہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک ذہنی معذور بچہ تھا۔ جیسے کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو سچے خواب آتے ہیں، وہ بھی یہی دعویٰ کر رہا تھا۔“

برش کرتی لڑکی کی برنی جیسی آنکھیں چونک کے تیزی سے اس طرف انھیں۔ ساری دنیا ہٹم سی گئی۔

”مگر اس نے کیا کہا تمہیں، کا کا؟“ اشعر ہنوز فکر مند تھا۔

”پتہ نہیں۔ کچھ اول فول بول رہا تھا۔ کوئی شکار بازوں میں سے آ کر میرا شو بر مجھ سے چرا لے جائے گا تو میں اسے گھر میں نہ داخل

ہونے دوں۔“

سوپ پیتا فاتح ایک دم ہنس دیا تو عصرہ بھی جھینپ کے مسکرا دی۔ اشعر کے ابرو تھیر سے بھنچ گئے اور تالیہ مراد... اس کا سانس تک رک چکا

تھا۔ وہ بالکل شل کھڑی تھی۔

”آؤ بنگ! آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ ایسے لوگوں کی باتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ شکایتی انداز میں سر اٹھا کے دور بیٹھے فاتح

سے بولا تو وہ دوبارہ سے ہنس دیا۔

”تم ایسی باتوں پہ کب سے یقین کرنے لگے ایش۔ نان سینس۔“ مسکرا کے سر جھٹکتے چچچ میں سوپ بھرا۔ (گزشتہ رات کی لڑائی کا شائبہ

تک نہ تھا۔)

”کیا آپ اس بات پہ یقین نہیں رکھتے وان فاتح کہ لوگوں کو سچے خواب آ سکتے ہیں؟“ وہ ایک دم بولی تو فاتح نے نظر اٹھا کے اسے

دیکھا۔ عصرہ اور اشعر بھی اسے دیکھنے لگے۔

”دنیا بہت عجیب ہے اور یہاں سب ممکن ہے، تا شہ... لیکن یہ تو کوئی فراڈ لگ رہا ہے۔ یونو... اکثر لوگ اس طرح دوسروں کا ہاتھ روک

کے ان کے بارے میں پیش گوئی کر کے پیسے بنو رہے ہیں۔“ سنجیدگی سے اسے دیکھ کے جواب دیا اور سوپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ ان باتوں کو مانتی ہیں؟“ اشعر کے استفسار پہ وہ چونکی، پھر شانے اچکا کے برش اٹھالیا۔

”نہیں۔ کسی کو سچے خواب نہیں آیا کرتے۔ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ بس۔“ تلخی سے کہہ کر وہ پینٹ کرنے لگی تھی۔ عصرہ اسی طرح واپس

مسکراتا مجسمہ بن گئی اور اشعر گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔

”تمہارے تاثرات سے لگ رہا ہے تم نے خبر کو رکوا دیا ہے۔“ اشعر اس کے پاس میز پر آ کے بیٹھا تو وہ سوپ میں چبچہلاتے ہوئے بے نیازی سے پوچھنے لگا۔

”آپ نے مجھے انڈر اسٹیمٹ کیا تھا“ آبنگ۔“

”کیا دیا تم نے اخبار کے مالک کو؟ ہوں؟ اپنے بزنس کے شیئرز کم قیمت پر فروخت کیے یا اخبار کے شیئرز کی قیمت بڑھوانے کے لئے اسٹاک مارکیٹ میں کوئی چال چلی یا... آف کورس...“ فاتح نے سمجھ کے سر ہلایا۔ ”اشتہار... اشتہار دیے تم نے!“

سیاستدانوں کو جب بھی کسی چینل یا اخبار میں کوئی خبر لگوانی یا رکوانی ہوتی ہے، وہ اس کو اشتہارات دے دیتے ہیں جو قومی منصوبوں کے ہوتے ہیں۔ ان کا پیسہ قومی خزانے سے اخبار مالک کو جاتا ہے، سیاستدان کو صرف دستخط کرنے ہوتے ہیں اور جہاں اخبار عام طور پر ایک ڈالر کا اشتہار لے گا، وہاں سیاستدان پچاس ڈالر کے اشتہار پر دستخط کر دے گا۔ اخبار مالک کو ایک کی جگہ پہ پچاس ڈالر ملیں تو وہ وہی کرے گا جو سیاستدان کہے گا۔

”مان لیجیے کہ آپ مجھے نہیں روک سکتے۔“ وہ فاتح کے قریب چہرہ کر کے سرگوشی میں بولا۔ مسکراتی شاطر آنکھیں فاتح پہ جمی تھیں۔ ”آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اور ملائیشیا کو جوان خون کی ضرورت ہے۔“

وان فاتح نے سوپ کا پیالہ پرے کیا اور نیپکین سے ہونٹ تھپتھپائے۔

”جب میں لاء اسکول میں تھا تو ہمارا کمر مثل لاء کا ایک پروفیسر تھا۔ بوڑھا، ٹھگنا، سفید بالوں والا۔ ساری عمر اس نے قانون پڑھنے پڑھانے میں گزاری۔“ پھلوں والی پلیٹ اپنے قریب کرتے ہوئے فاتح مسکرا کے بتانے لگا۔ ”وہ کہتا تھا جب لوگ جرم کرتے ہیں تو ان کو ان کا جرم نہیں پکڑا جاتا۔ ان کو ان کا خوف پکڑا جاتا ہے۔ وہ خوف جس کے ہاتھوں وہ اس جرم کو ڈھانکنے اور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کوشش... وہ کور آپ... اس کے خلاف سب سے بڑی گواہی بن جاتا ہے۔“

اشعر کے تاثرات بدلے۔ آنکھوں سے برہمی جھلکی۔ ”کسی تنظیم سے نوجوانی کے دنوں میں وابستگی کوئی جرم نہیں ہے۔“

”تو پھر تم اس کو اس طرح کور کر کے جرم کیوں بنا رہے ہو، ایش؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکرایا تھا۔

اشعر ہل بھر کو سن رہ گیا۔

”اگر تم اس خبر کو چلنے دیتے اور اس کو لا پرواہی سے ہنس کے اڑا دیتے اور قوم سے اس پہ معذرت کر لیتے تو تم لیڈر بن سکتے تھے لیکن تم نے خود ہی ایک معمولی چیز کو جرم بنا دیا۔ تم نے اخبار کے چینی مالک کو اپنی کمزوری تھادی اور اب وہ جانتا ہوگا کہ تم سے مزید کام کیسے نکلوانے ہیں۔ تم نے یہ گیند بزنس مین کی طرح کھیلی۔ اوہ ایش!“ افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے پھل کی قاش منہ میں رکھی۔

اشعر کی رنگت متغیر ہوئی۔ آنکھوں سے چھلکتا غصہ بڑھتا گیا۔ ”آپ میرے ساتھ یہ کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیا؟“ وہ لالعلقی اور بے نیازی سے کندھے جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا اور سیل فون اٹھالیا۔ منہ میں پھل چباتے ہوئے کوٹ کا بٹن بند کیا اور

لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ اشعر دبے دبے غصے کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔

فاتح لائونج سے باہر کھلتے دروازے پر کا.... اور ایک لمحے کے لئے.... ایک خود مہربانے اختیار لمحے کے لئے.... اس نے گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا.... وہ اونچی سنہری پونی والی لڑکی گردن ترچھی کیے.... نظریں کیوں پہ جمائے.... اس پہ برش پھیر رہی تھی۔
فاتح آگے بڑھ گیا۔

اسی پل تالیہ نے برش روکا.... اور گردن ذرا موڑی تو.... باہر نکلتے آدمی کی پشت دکھائی دی۔ تالیہ نے واپس عصرہ کی طرف دیکھا تو اس کے پیچھے کھڑکی کے باہر کا منظر دکھائی دیا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا اور چھتری اٹھائے ایڈم ساتھ تھا۔
بارش ابھی تک بر سے جا رہی تھی۔ ٹپ.... ٹپ.... وقت کی سوئیوں کی طرح.....

☆☆=====☆☆

یشیوں سے ڈھکی ٹکون عمارت بھی بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اس کے اندر بنے مال میں گاہکوں کا رش اور رونق معمول کی لگی تھی۔ مال سے چند منزلیں اوپر آفس فلورز بنے تھے جن میں سے ایک پہ باریسن نیشنل کے ورکرز اور سیاستدان اپنے معمول کے کام نبھاتے دکھائی دیتے تھے۔

فاتح اپنے آفس میں میٹنگ میں تھا اور ایڈم بے کار سا باہر بیٹھا تھا۔ صبح صبح تالیہ کی باتوں نے مزید الجھا دیا تھا۔ مگر اس وقت زیادہ بڑی کشمکش ماں کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔ ماں نے عجیب مطالبہ سامنے رکھا تھا جس کو فاتح کے سامنے رکھتے ہوئے اس کو شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

”ایڈم!“ فاتح کا پولیٹیکل سیکرٹری عثمان چوکھٹ پہ نمودار ہوا تو وہ فوراً سیدھا کھڑا ہوا۔

”جی سر!“ باب کے آخری تین دن رہ گئے تھے اور وہ عثمان سے کسی قسم کی آفس پالیسیس میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔

”میں گھر جا رہا ہوں والدہ کی طبیعت خراب ہے۔“ اس نے بازو پہ رین کوٹ فولڈ کر کے ڈالا ہوا تھا اور خلاف معمول نرمی سے بتا رہا تھا۔

”مس فرح آئیں تو تم ان کو یہ لسٹ دے دینا وہ اگلی میٹنگ سنبھال لیں گی۔ مجھے گھنٹہ لگ جائے گا اچھا۔“

”شیور سر“ آپ جائیں۔ ہم دیکھ لیں گے۔“ اس نے لسٹ تھامی تو عثمان تھینکس کہتا عجلت میں مڑا۔ پیچھے سے ملازم کافی کے کپ

ٹرے میں سجائے لار ہا تھا۔ ایک ہاتھ سے موبائل پہ ٹائپ بھی کر رہا تھا۔ ایڈم بوکھلا کے ”دھیان سے“ چیخا مگر ٹکر ہو گئی۔ کافی الٹ گئی۔

موبائل بھی دور جا گرا۔ گرم گرم مائع عثمان کے اوپر جا گرا۔ سب اس کی طرف دوڑے مگر اس نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

”بچت ہو گئی۔“ اس نے میز سے چند نشوونو کھینچے اور رین کوٹ پہ گری کافی صاف کی۔ اس کے کپڑے بچ گئے تھے۔ ایک کٹیلی نظر ملازم

لڑکے پہ ڈالی جو ڈر گیا تھا مگر کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ ایڈم نے سکون کا سانس لیا۔ قہیناً وہ والدہ کی وجہ سے الجھا ہوا تھا اس لیے موڈ خراب

نہیں کیا۔

فرح کے آتے ہی ایڈم نے لسٹ اس کے حوالے کر دی۔ وان فاتح نے اگلے دو گھنٹے کس کس سے ملنا ہے اور کس کی کیا خاطر کرنی ہے سب اس پہ درج تھا۔ سیاستدان کا ایک ایک منٹ ہفتہ پہلے سے پولیٹیکل سیکرٹری کی ڈائری میں جمع تفریق کے ساتھ درج ہوتا تھا۔ اگر کوئی مہمان فاتح کے پاس مقررہ وقت سے پانچ منٹ بھی اوپر بیٹھ جائے تو سیکرٹری اندر آ کے وقت کا احساس دلاتا اور فاتح کو نشست برخواست کرنی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایڈم سوچا کرتا کہ کون کس کے تابع ہے؟ سیاستدان سیکرٹری کے یا سیکرٹری سیاستدان کے؟

”مس فرح! فرح کے بیٹھے ہی اپنی ازلی مداخلت کی عادت سے وہ باز نہ رہ سکا۔ ”سب کو چائے پیش کرنی ہے مگر یہ گیارہ بجے والے مہمانوں کی اتنی خاطر داری کیوں کرنی ہے؟“

فرح عثمان جیسی نہ تھی۔ اسکا فہم پہنے مستعد اور خوش اخلاق سی ملے لڑکی تھی۔ فوراً مسکرا کے سمجھداری سے بولی۔ ”کیونکہ ان لوگوں سے وان فاتح کو کام ہے اور جن سے ہم نے مطالبے منوانے ہوتے ہیں ان کی خاطر داری کی جاتی ہے تاکہ وہ خود کو اہم سمجھیں۔“

”مگر وان فاتح کو تو کسی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو ہر ایک سے بے نیاز ہوتے ہیں۔“

”کس دنیا میں رہتے ہو ایڈم؟ انہیں واقعی کسی کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ روز اتنے لوگوں سے ملاقات نہ کرتے۔ وہ ظاہر نہیں کرتے مگر ہر سیاستدان کو لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو اپنی ذات کے لیے ضرورت نہ ہو تو بھی اپنی کاز کے لیے ہے۔“

اور ایڈم چونک سا گیا۔ وان فاتح اتنے بڑے بڑے کام کروا سکتے ہیں لوگوں سے اور میں اتنا چھوٹا سا کام نہیں کہہ سکتا؟

”میں چند منٹ کے لیے اشعر صاحب کے پاس جا رہا ہوں بس فرح! مجھے ان سے کام ہے۔“ وہی درست بندہ تھا۔ وہ فرح کو بتا کر باہر نکل آیا۔ بھاگ بھاگ لفٹ پکڑی۔ نیچے آیا اور برستی بارش میں ٹیکسی پہ سوار ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اشعر کے کاروباری مرکز میں موجود تھا۔ وہ ایک اونچی عمارت تھی جس کا اٹھارواں اور انیسواں فلور اشعر کے کاروباری ہیڈ کوارٹر کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ چند روز قبل وہ فاتح کے ساتھ یہاں آیا تھا اس لئے داخلے میں کوئی مسئلہ نہ ہوا۔

اشعر کے آفس روم کے باہر لابی بنی تھی جہاں لوگ صوفوں پہ بیٹھے تھے۔ سیکرٹری اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ بھی کونے میں بیٹھ گیا۔ اشعر کسی میٹنگ میں تھا۔ ایڈم کو انتظار کرنا تھا۔

سامنے میز پہ اخبار میں فاتح کا انٹرویو چھاپا پڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ مسکرایا اور اخبار اٹھالیا، مگر پھر... آنکھ کے کنارے نے کوئی شے پکڑی...

جیسے ذہن میں کوندا سالپکا... ایڈم نے نظریں موڑیں... سیکرٹری کے قریب کوٹ اسٹینڈ پہ رین کوٹ لٹکا تھا۔

سفید رین کوٹ جس کے اوپر دھبے لگے تھے... ایڈم سن رہ گیا۔ عثمان؟ ادھر؟ کیوں؟ اس کی تو ماں...؟

مگر آج اس کا سیاستدانوں کے ساتھ نواں دن تھا اور دماغ اب تیزی سے کام کرتا تھا۔ عثمان مجھے دیکھ نہ لے۔ اوہ نو۔ جلدی سے اخبار اٹھالیا اور چہرے کے سامنے پھیلائے ستون کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عثمان کو چھپ کے اشعر سے ملنے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

اندر آفس میں مرکزی کرسی پہ اشعر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سنجیدہ نظریں سامنے بیٹھے عثمان پہ جمی تھیں جو تابعداری سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اور تو کوئی بات نظر نہیں آئی لیکن صبح وان فاتح اپنے کسی دوست سے ملا کہ والے گھر کی بات کر رہے تھے۔ شاید وہ اس کو پہنچنا چاہتے ہیں۔“

اشعر جواب تک اکتایا بیٹھا نظر آتا تھا اس بات پہ ٹھہر گیا۔ بالکل شل۔ پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

”ملا کہ والا گھر... سن باؤ کا گھر؟“ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”سن باؤ؟“ عثمان الجھا۔ ”سن باؤ یعنی تین خزانے؟“

”وہ سن باؤ والا گھر... آبنگ اس کوچ کے چیئر مین کا انکیشن لڑنا چاہتا ہے؟“ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”کیا بہت قیمتی گھر ہے وہ؟ سر؟“

”قیمتی؟“ اشعر کو ٹھنڈے سپینے آنے لگے تھے۔ ”وہ آبنگ کے والد کا ان کے لئے آخری تحفہ تھا۔ وہ گھر قدیم ہے۔ تاریخی ورثہ۔ صدیوں پہلے کسی چینی سفارتکار کی ملکیت تھا۔ اس کا نام پہ پہ نہیں کیا تھا مگر اس کو ”سن باؤ“ (تین خزانے۔ تین تھینے) کہتے تھے۔ آبنگ کے والد نے سستے داموں یہ ساری زمین لی تھی۔ کچھ عرصے بعد کا کا کو معلوم ہوا کہ یہ سن باؤ کا ویر باؤس ہے جو وہ چھ سو سال پہلے استعمال کرتا تھا۔ کا کا نے اس کو احتیاط سے مرمت کروائی اور خوبصورت بنا دیا۔ تاریخی ورثے کی تصدیق بھی کروائی گئی۔ وہ گھر اگر نیلامی پہ چڑھا دیا جائے تو تاریخی نوادرات کے دیوانے امیر لوگ اس کو کروڑوں بلکہ اربوں میں خریدیں گے۔ آبنگ کو پھر پیسے کی کبھی کمی نہیں ہوگی۔“ اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے نائی ڈھیلی کی۔ رنگت اڑ چکی تھی۔ وہ گھر فاتح کو عزیز تھا۔ اتنا عزیز کہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس کو بھی بیچ سکتا ہے۔

”میرے لئے کیا حکم ہے سر؟“

اشعر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر خود کو سنبھال کے بولا۔ ”تم وان فاتح کے ساتھ رہو۔ کسی سایے کی طرح۔ اس کی ہر حرکت کی خبر مجھے کرو۔ تمہیں ماہانہ تانہ پیسہ میں اسی لئے دیتا ہوں کیونکہ تمہارا اصل باس میں ہوں۔ اب جاؤ۔“ تحکم سے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ موڈ خراب ہو گیا تھا۔ عثمان دروازے تک پہنچا کہ وہ بولا۔

”رکو۔“ آواز بدلی ہوئی تھی۔ عثمان چونک کے پلٹا تو دیکھا اشعر کی آنکھوں میں چمک تھی جیسے کچھ نیا سوچ رہا ہو۔ ”ایک کام تم آج بھی کر سکتے ہو۔“

ایڈم بابرستون کی اوٹ میں کھڑا تھا جب اشعر کے آفس کا دروازہ کھلا۔ بابر نکل کے تیزی سے اپنا رین کوٹ اٹھانے والا عثمان ہی تھا۔ ایڈم نے اخبار مزید سامنے پھیلا لیا۔ عثمان متوجہ نہ تھا۔ وہ جلدی میں لگ رہا تھا۔ سیدھا آگے بڑھتا گیا۔

ایڈم کا ذہن شل تھا۔ وہ وان فاتح کو کیسے بتائے گا کہ نہ تالیہ مراد وہ ہے جو وہ خود کو کہتی ہے نہ عثمان اس کے ساتھ مخلص ہے۔ بیک وقت دو لوگوں پہ الزام سے تو لگے گا ایڈم خود عثمان کی جگہ لینا چاہتا ہے... مگر ماں کا کام؟ ایک نئی الجھن نے الجھنوں کے جوم سے سر نکالا تو وہ گہری

سانس لے کر رہ گیا۔ پہلے اسے ماں کا کام کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد اشعر لفٹ میں سوار ہوا نیچے آ رہا تھا۔ مصروف بے نیاز سا... لفٹ کے دروازے لابی پہ جا کر کھلے تو وہ باہر نکلا پھر یکا یک رک گیا۔ سامنے سے بارش میں بھیکتا ایڈم آتا دکھائی دے رہا تھا۔ انداز سے لگتا تھا وہ ابھی ابھی عمارت میں داخل ہوا ہے۔

”سر...“ ہانپتا کانپتا اس کے پاس پہنچا تو اشعر نے ابرو بھنج کے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”کیا ایک چھتری تک نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”جلدی میں تھا سر۔ عثمان صاحب کو اپنی والدہ کے پاس جانا پڑا پیچھے وان فاتح کو اینڈ کرنے کے لئے کوئی نہیں ہے مجھے جلدی واپس جانا ہے، مگر آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔“

گو کہ اشعر کو پر واہ نہ تھی کہ عثمان کو کوئی دیکھ سکتا ہے کیونکہ عثمان اپنی حفاظت کرنا جانتا تھا، مگر ایڈم کے انداز سے لگتا تھا وہ اپنی ہی دھن میں ہے۔ ناواقف۔ بے وقوف۔ اشعر نے گھڑی دیکھی اور پھر جبر اُرتے ہوئے بولا۔ ”جلدی بولو۔“

”سر... میری والدہ کو نوکری چاہیے۔ کسی اچھے گھرانے میں ملازمہ رکھوادیں ان کو۔ انہوں نے اصرار کیا ہے۔“ عزت نفس پہ چیر رکھ کے اس نے کہہ دیا۔ ”وہ صفائی، ستھرائی، گارڈنگ، سب کام جانتی ہیں۔ اور...“

”کھانا پکانا جانتی ہیں؟ خاص چینی طرز کا کھانا؟“ اشعر تیزی سے بولا تو ایڈم ہکا۔ پھر جھٹ سر ہلایا۔

”بر قسم کا کھانا بنا لیتی ہیں وہ۔ ملے۔ انڈین۔ چینی۔“

”میں نے ابھی ابھی شام کو گھر میں پارٹی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ صرف چند چینی دوست مدعو ہوں گے۔ اگر تمہاری ماں بہترین چینی کھانا بنا سکتی ہے تو اس کو میرے گھر لے جاؤ اور کچن اس کے حوالے کر دو۔ اگر مجھے کوئی شکایت ندلی تو میں اس کو کہیں شیف رکھوا دوں گا۔“ پھر ہاتھ جھلا کے بیٹے کا اشارہ کیا تو ایڈم ہکا بکا سا ہٹ گیا۔

”شکریہ... شکریہ سر۔“ پیچھے سے بوکھلا کے پکارا مگر اشعر اپنے گارڈز سمیت آگے بڑھ گیا تھا۔ ایڈم لابی میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔

(تھوڑی دیر پہلے مجھے اشعر پہ غصہ تھا کہ وہ فاتح کے ملازم سے خفیہ تعلق کیوں رکھے ہوئے ہے۔) لابی میں آتے جاتے سوئڈ بوٹڈ امیر لوگوں کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ (مگر میں نے اپنا کام کہتے دیر نہیں لگائی۔ کیا میں بھی سیاست سیکھنے لگا ہوں؟) پھر سر جھٹکا۔

نوکری کے لیے سفارش کروانا بری بات نہیں۔ کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ چوری نہیں کی۔ محنت مزدوری کر کے پیسے کمانا چاہتے ہیں ہم۔ اگر یہی سیاست ہے تو بری چیز نہیں ہے یہ۔

☆☆=====☆☆

حالم کا خوبصورت اور اونچا گھر اس دوپہر خاموش پڑا تھا۔ بارش رک چکی تھی اور لان کا گھاس پانی سے بوجھل تھا۔ تالیہ نے کار پورچ میں روکی اور خاموشی سے باہر نکلی۔ وہ بھگی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید وہ عصرہ کے گھر سے واپسی پہ وہیں کار روک کے باہر نکل کے بارش میں

کھڑی رہی تھی۔ سنہرے بالوں سے موٹے موٹے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے.... وہ ان میں انگلیاں چلاتی دروازے کی طرف آئی

”میں نے آج دو چیزیں دریافت کیں۔ سنوگی تو داد دوگی۔“ دروازہ کھولا تو سامنے لاؤنج کے صوفے پہ پھیل کے بیٹھی بھاری بھر کم داتن دکھائی دی۔ سینے پہ پیالہ رکھے اس میں سے اخروٹ نکال نکال کے کھاتی بھی جارہی تھی۔ ”پوچھو کون سی دو چیزیں؟“

تالیہ اندر آئی۔ دروازہ بند کیا۔ جوتے اتارے۔ ریک سے نرم چپل نکال کے پہنے۔ چہرہ جھکا ہوا اور خاموش تھا۔ داتن نے بے چینی سے چند لمحے انتظار کیا۔

”چونکہ مشرقی لڑکی کی خاموشی ہاں تصور کی جاتی ہے اس لئے میں سمجھ گئی ہوں کہ تم میری دریافت جاننے کے لئے بے چین ہو، سو تمہارے پوچھے بغیر ہی بتائے دیتی ہوں۔“

تالیہ نے پرس اسٹینڈ پہ لٹکایا اور کچن تک آئی۔ ایک الماری کا پٹ کھولا۔ اندر سے سفید تولیہ نکالا۔

”جانتی ہو سیمع کو کیسے معلوم ہوا کہ اشعر محمود نے تمہاری تحقیقات کروائی ہیں؟ میں نے صرف سیمع کے شناختی کارڈ نمبر سے اس کا ایڈرس معلوم کروایا تو پتہ چلا وہ اشعر کے آفس میں کام کرتا ہے۔ یعنی ڈائریکٹ رملی (اشعر کا مینیجر) کے نیچے۔“

تالیہ نے کمر موڑی اور سر جھکا دیا، پھر گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹ کے سیدھی کھڑی ہوئی۔

”سیمع کا تعلق منی لانڈرنگ گروہ سے تھا، اور وہ کئی سالوں سے اشعر کے پاس ہی کام کر رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اشعر بھی اسی کام میں ملوث ہو۔ منی لانڈرنگ کر کے ہی بنائی ہوگی اشعر اور اس کے باپ نے اتنی بڑی جائیداد۔ اب دوسری دریافت کا پوچھو۔“

تالیہ سر نہ ہواڑے بالوں کو تولیے سے رگڑ رہی تھی۔ خاموش بالکل خاموش۔

”ہاں ہاں میں جانتی ہوں تم مزید جاننے کے لیے بے چین ہو۔ تجس تمہارے اندر اہل اہل رہا ہے۔ اس لئے تمہیں انتظار کیوں کرواؤں، اتنی ظالم تو نہیں ہوں میں۔ بتا ہی دیتی ہوں۔“ وہ مٹھی بھر اخروٹ پھاںکتے ہوئے جلدی جلدی جوش سے بتانے لگی اور تالیہ خاموشی سے بال خشک کرتی رہی۔

”اس کویتی شیخ کا ملازم نونل شیخ بن کے جب عصرہ سے ملا تو عصرہ یا فاتح تو نہیں جانتے تھے کہ اصلی شیخ کی شکل کیا ہے لیکن اشعر تو ساتھ تھا۔ اس نے عصرہ کو نہیں بتایا کہ یہ اصلی شیخ نہیں ہے۔ نہ جب تم نے ڈاننگ ہال میں شیخ کو کال ملائی، تب اشعر نے شیخ سے واقفیت ظاہر کی۔ لیکن یہ دیکھو....“ صوفے سے ایک کاغذ اٹھا کے لہرایا۔ ”اشعر اور وہ شیخ جاسم ایک ہی گالف کلب کے ممبر رہے ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ کبھی ملے نہ ہوں۔ لوگ گالف کھیلنے بھی تو اونچی دوستیوں کے لئے ہیں۔ میرا خیال ہے ان دونوں کی پرانی دوستی ہے یعنی یہ اشعر ہی ہے جس کے کہنے پہ شیخ نے نقلی پینٹنگ اور اپنا ملازم دونوں اس کے حوالے کر دیے۔ یعنی یہ اشعر ہے جو عصرہ اور فاتح کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔“

تالیہ نے تولیہ زور سے کھینچ کے پرے اچھالا اور مڑ کے اسے دیکھا تو آنکھوں میں غصہ تھا۔

”کون فاتح؟ کون اشعر؟ لیاناہ اور تالیہ کی بات کرو۔“

داتن حیران رہ گئی۔ ”تالیہ.....“

”ہمارے براسکام کے لئے لوگوں کو تم ہار کرتی ہو، میں پس منظر میں رہتی ہوں، اپنا چہرہ نہیں دکھاتی... رات کو چھپ کے چوری کرتی ہوں اور دن میں کسی نوکرانی، کسی ویٹرس جیسا معمولی سا کردار کرتی ہوں جو کسی کو یاد بھی نہیں رہتا۔ لیکن مجھے ہر بات یاد رہتی ہے۔“ اتنی درشتی سے بولی کہ داتن دھک سے رہ گئی۔

”چار ماہ پہلے ہم نے ڈریر اسکام کھلیا تھا... وہ اداکار چالاک لڑکا احمد جس نے یتیم خانے کے دورے پہ آنے والی امیر انڈیشین خاتون کے سامنے پیش گوئی کی اور پھر ہم نے اس کو ڈرا کے اس سے مزید پیش گوئیوں کے لئے پیسے بنورے تھے۔ کچھ یاد آیا؟“

داتن کے کھلے لب بند ہو گئے۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ”تمہیں پتہ چل گیا؟“

”نہیں چلنا تھا کیا؟“ وہ دبا دبا سا چلائی۔ ”تم میری طرف ہو یا میرے مخالف ہو داتن؟ کیوں تم نے عصرہ کو اسی دن ڈرانا چاہا جب وہ مجھے گھربلا رہی تھیں۔ میں اس کا شوہر چھین لوں گی؟ واٹ نان سینس؟“

چند لمحے لاونج میں موت کا سناٹا چھایا رہا۔ پھر داتن نے گہری سانس لے کر آنکھیں اٹھائیں۔ ”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس کا شوہر چھین لو گی۔ اتنا کہا تھا کہ تم اس کو عصرہ کی دنیا سے دور لے جاؤ گی اور یہ سب تمہارے خواب کہتے ہیں تالیہ۔ وہ دو دریاؤں والا خواب... اس کا یہی مطلب ہے۔“ مگر تالیہ نفی میں سر ہلاتی غصے سے ٹہلنے لگی تھی۔

”تم نے میری گردن کے نشان کی تصویر لی... تم اس کتاب کو چھپ چھپ کے پڑھتی رہیں... مجھے سب پتہ چل رہا تھا مگر میں چپ رہی... میری دو آنکھیں میری گردن کے پیچھے بھی ہوتی ہیں داتن مگر میں بروقت زبان نہیں چلاتی کیونکہ مجھے لگاتم میری حفاظت کر رہی ہوگی۔“

”میں تمہاری حفاظت ہی کر رہی ہوں۔“

تالیہ نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

”ہو سکتا ہے تم مجھ پہ بالکل یقین نہ کرو تالیہ۔ یہ تمہارا حق ہے لیکن میں جانتی ہوں۔ وہ چابی تمہیں تباہ کر سکتی ہے۔ وہ ملعون ہے اور تم خفا ہوتی ہو تو ہو، لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اس بری سیلٹ یا سکے کو چرواؤ کیونکہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔“ داتن کی آنکھیں بھینگنے لگیں۔

”وہ خزانے کی چابی ہے داتن۔ وہ میرے باپ کے خزانے کی چابی ہے۔ وہ میری وراثت ہے۔ میرے باپ کا ترکہ ہے۔“ وہ سینے پہ انگلی رکھے درد سے اونچا سا بولی... اب آواز میں غصہ کم اور دکھ زیادہ تھا... مگر داتن نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی خزانہ نہیں ہے تالیہ۔ اس الوژن سے نکل آؤ۔ اس چابی سے تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔“ آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکا اور سیاہ

گال پہ لڑھک گیا۔

”نہیں۔ میں جانتی ہوں۔ خزانہ ہے۔ تاشہ کا خزانہ۔ میرے باپ کا خزانہ۔ وہ جو بھی تھی اس نے میرے لئے خزانہ چھوڑا ہے۔ ایڈم اور

میں اس کے قریب پہنچنے والے تھے۔ میرے خواب غلط نہیں ہوتے۔ تم میرے راستے میں رکاوٹ کیوں بن رہی ہو؟“ وہ غصے اور دکھ سے بولی تو داتن اٹھ کھڑی ہوئی۔ میز پر رکھا جارٹھالیا جس میں سے خستہ بسکٹ جھلک رہے تھے۔

”تم نے خواب میں کوئی خزانہ نہیں دیکھا۔ کیا تم نے دیکھا؟ نہیں نا۔ لیکن تم نے دو دریا دیکھے۔ تم نے ہمارے کو دیکھا۔ اس کا مطلب حکومت یا طاقت نہیں ہے۔ یہ شکار بازوں کے نشان ہیں۔ تم شکار بازوں میں سے ہو اور وہ اچھے لوگ نہیں تھے تالیہ۔ یہ اچھی چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن اگر تم اتنی ہی کنوئیں ہو کہ خزانہ وجود رکھتا ہے تو تم اس کو ڈھونڈو۔ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی، لیکن کنوئیں میں چھلانگ لگانے میں اپنی دوست کی مدد بھی نہیں کروں گی۔“ تالیہ اسے انہی خفا نظروں سے دیکھتی رہی اور وہ کہتی گئی۔ ”البتہ تمہارے راستے کی دوسری رکاوٹوں کو میں تم سے دور کرتی رہوں گی جیسے سمجھ۔ اور یہ بسکٹ کھالینا اور جار کا ڈھلکن بند کر کے رکھنا۔ نمی گھس جائے تو ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔“ تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ بس صوفے پر بیٹھی اور کشن گود میں رکھ لیا۔ پھر چہرہ موڑے خفگی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”جانتی ہو دوستی کا سب سے تکلیف دہ لمحہ کون سا ہوتا ہے؟ جب دوست کچھ غلط کر رہا ہو۔ اگر نہ روکا تو دوست تباہ ہوگا۔ روکا تو دوستی مجھے نہیں معلوم اس لمحے میں کس کو چننا چاہیے۔ دوست کو۔ یا دوستی کو۔“ اتنا کہہ کے اس نے جار میز پر رکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو تالیہ نے خفا نظریں موڑ کے کھڑکی کو دیکھا۔ داتن باہر لان عبور کرتی نظر آرہی تھی۔ وہ چند لمحے بیٹھی رہی۔ ایک دو دفعہ جار کو تندہی سے دیکھا بھی۔

”پہلے اپنے بیٹے کو دینے لگی ہوگی، پھر آخری وقت ارادہ بدل کے مجھے یاد کیا ہوگا۔ ہونہ۔“ اور منہ موڑ لیا۔ کچھ دیر مزید گزری۔ پھر وہ تیزی سے آگے جھکی، جار اٹھالیا، کھول کے گود میں رکھا اور بسکٹ نکال کے چکھا۔

”یہ بسکٹ موٹی نے یتیم خانے والی حرکت سے پہلے بنائے ہوں گے۔ یہ حلال ہیں۔ میں کھا سکتی ہوں۔“ اور اسی طرح خفگی سے ایک ایک بسکٹ کترنے لگی۔ چہرہ ہنوز سرخ دہک رہا تھا اور گیلے سنہرے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اسے داتن پہ بہت سارا غصہ تھا۔

اور حالم کے گھر سے میلوں دور... اپنے آفس میں کھڑا مسکرا کے ملاقاتیوں سے مصافحہ کرتا داتن فاتح ان کو الوداع کہہ رہا تھا۔ وہ افراد باہر نکلے تو وہ تکان سے اپنی کرسی پر گرا، نائی کی ٹاٹ قدرے ڈھیلی کی اور موبائل اٹھالیا۔ ساتھ ہی عینک ناک پہ جمائی، اور اسکرین روشن کی۔ میسجوں پیغامات۔ ای میلز۔ وہ میکا کی انداز میں ایک ایک کھولتا گیا۔ دفعتاً ایک ای میل پہ ٹھہرا۔ ہڈی۔

”نسر... میری اشعر کے متعلق اسٹوری نہیں چھاپی گئی اور مجھے نوکری سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ کچھ کیجئے۔ یہ سب اس اسٹوری کی وجہ سے ہوا ہے جو آپ نے مجھے دی تھی۔“

فاتح کی انگلیاں کی پینڈ پہ چلنے لگیں۔

”کون سی اسٹوری؟“ پاٹ چہرے کے ساتھ اس نے لکھا۔

”نسر... آپ نے جو مجھے بھٹ دیا تھا اشعر کے بارے میں... میں اس کی بات کر رہی ہوں۔“

”کون ساہٹ؟ آئی ایم سوری ہدی مگر مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہی ہو۔“

حیرت سے لکھا گیا جملہ اس نے بھیجا تو چہرہ شانت تھا۔ چند لمحے بعد ہی جواب موصول ہوا تھا۔

”یا اللہ۔ آپ سارے سیاستدان ایک سے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھئے گا اب کہ میں کیا کرتی ہوں۔“

فاتح نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ہدی کا جواب پڑھا اور اگلی میلہ دیکھنے لگا۔ چہرہ بالکل مطمئن اور پرسکون تھا۔

☆☆=====☆☆

سہ پہر ڈھلی تو کوالا لپسور کے خوبصورت آسمان کو بادلوں نے راستہ دے دیا اور خود دور چھٹ گئے۔ خوشگوار ٹھنڈی شام اونچی عمارتوں والے شہر پہ اترنے لگی۔ ایسے میں اشعر محمود کے شاہانہ قلعے میں اچانک منعقد کی جانے والی دعوت کے ہنگامے جا گئے۔

سرخ رنگ جو چینوں سے منسلک تھا، لان میں کیئرنگ میں برجگہ نظر آ رہا تھا۔ اندر قلعے کے کچن میں جھانک تو چند باوردی ملازم کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اشتہا انگیز کھانوں کی مہک سارے میں پھیلی تھی اور ایک کاؤنٹر کے ساتھ گھڑی ایڈم کی ماں اپرن، ٹوپی اور داستا نے پہنے طعام سے سچی ایک ڈش کو جانے میں مصروف تھی۔

چند میل دور... وان فاتح کی رہائشگاہ پہ بھی شام اترنے کو بے تاب نظر آتی تھی۔

اپنے کمرے کے ڈریس روم کے سامنے کھڑا فاتح اپنے عکس کو دیکھتا نائی کی ناٹ باندھ رہا تھا۔ ایک نظر گھڑی پہ بھی ڈالی۔ دیر ہو رہی تھی۔ تب ہی دروازہ دھاڑ سے کھلا اور عصرہ آندھی طوفان کی طرح اندر آئی۔ فاتح نے ایک نظر عکس میں اسے اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ زرد لباس، میک اپ اور جوڑے میں تیار نظر آتی تھی مگر چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

”ایش کافون آیا تھا۔“

”فکر نہ کرو ہم وقت پہ پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی تو گھر آیا ہوں۔“ نائی کو بل دے کر باہر نکالتے وہ سادگی سے بولا۔

”تم کس کی سائیڈ پہ ہو فاتح؟“ وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کے دائیں طرف آ کے غرائی۔ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے ہوئے تھی۔

”بارین نیشنل کی۔“ وہ آئینے کی طرف متوجہ رہا۔

”تو اگر میرے بھائی کا لحاظ نہیں کرنا تھا تو بارین نیشنل کے رکن کا تو کر لینا تھا۔ تم نے کیسے صحافی سے کہہ دیا کہ وہ اشعر کے خلاف خبر

لگائے؟“ وہ در دے دبا دبا چلائی۔

”میں نے کسی کو کوئی خبر لگانے کو نہیں کہا۔“ اس نے گھڑی اٹھائی اور کلائی میں باندھنے لگا۔

”مگر تم نے اسے ذلیل کرنے کی کوشش کی فاتح!“ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

”ایک خبر کسی کو ذلیل نہیں کر سکتی عصرہ۔ میرے بارے میں بر شام ایک سے زیادہ خبریں لگتی ہیں۔“ گھڑی بند کر کے اس نے کف لنکس

اٹھائے۔

”ایش کے ambitions خاک میں مل سکتے تھے فاتح۔“

”اور میرے عزائم؟ میرے گلوڑ؟“ وہ کف لنک پہنتے ہوئے چہرہ موڑ کے سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں کہہ چکی ہوں، تم چیئر مین کا الیکشن نہیں لڑو گے اور ہم نیلامی کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”اگر کہنے سے فیصلے ہو جاتے ہیں تو چلو میں بھی کہہ دیتا ہوں۔“ دوسرا کف لنک آستین پہ ننھی کرتے ہوئے وہ نظریں عصرہ پہ جمائے

بولا۔

”پچھلے چھ ماہ سے جو اشعر کے دوستوں نے اس کا دماغ خراب کر کے اسے میرے خلاف اٹھنے پہ مجبور کیا ہے نا، اور تب سے مجھے ہر طرف جو مالی خسارہ ہو رہا ہے نا، کبھی میرے شیئرز ڈوب جاتے ہیں، کبھی مجھے مقدموں میں پھنسا کے فلاح کیا جاتا ہے، کبھی مال میں میری ہی دکانوں کو آگ لگ جاتی ہے.... یہ مت سمجھو کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ کون کر رہا ہے۔ اگر میں اب تک خاموش تھا تو اس لئے کہ مجھے امید تھی اشعر پلٹ آئے گا، لیکن وہ مجھے اس نہج پہ لے آیا ہے کہ مجھے اس کو ایک پیغام دینا پڑا ہے۔ وہ یہ مت سمجھے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو میں الیکشن کی کمپنیں نہیں چلا سکتا۔ میں کسی سے بھیک نہیں مانگوں گا مگر الیکشن بھی لڑوں گا۔ فاتح کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے اور تم.... تم۔ آج آخری دفعہ سن لو۔ تمہیں نیلامی کرنی ہے اپنی آرٹ کلکیشن کی تو شوق سے کرو امریکہ جانا ہے میرے بچوں کو بھی لے کر جانا ہے تو تم جاؤ۔ میں ملایشیاء کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔ اب تمہیں کچھ اور کہنا ہے یا ہم پارٹی میں جا رہے ہیں؟“

وہ جیسے چاچا کے.... سختی سے بولا تھا عصرہ محمود بالکل چپ ہو گئی۔ وان فاتح کو کبھی کبھار بہت شدید غصہ آتا تھا اور ایسے وقت پہ عصرہ کو لگتا، وہ ہر ایک کو چھوڑ سکتا ہے۔ بے نیاز۔ سرد مہر۔

”مجھے تمہارا جواب چاہیے عصرہ۔ تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے یا امریکہ جانا ہے؟“ وہ اسی غراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ چھپتی ہوئی آنکھیں عصرہ پہ جمی تھیں۔

عصرہ نے خود کو سنبھالا۔ چہرے کی سرخی قدرتی طور پہ کم ہوتی گئی۔

”کیا تمہیں لگتا ہے مجھے تمہارے خوابوں کا احساس نہیں ہے؟ میں....“

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے عصرہ!“ اور سیاسی بیوی نے گہری سانس لی اور اس کی کہنی تھامی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ غصہ مت کرو۔ ہم نہیں جائیں گے امریکہ۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔“ وہ ٹھنڈی پڑ گئی اور رساں سے اسے ٹھنڈا کرنے لگی۔ ”مگر مجھے نیلامی کرنے دو۔ نیلامی کے پیسوں سے تمہارے فنڈز کا انتظام ہو جائے گا۔ میں نے تمہاری برسیاسی مہم میں حصہ لیا ہے ہمیشہ اس دفعہ بس میں خوفزدہ ہوں فاتح، ورنہ میں....“

”مجھے تمہارے پیسوں کی نہیں، تمہارے سپورٹ کی ضرورت ہے۔“ بیوی کو معلوم ہوتا ہے شوہر کو ٹھنڈا کیسے کرنا ہے اور اسے con

کیسے کرنا ہے۔ فاتح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کف لنک ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ عصرہ نے نرمی سے وہ اس سے لیا تو اس نے مزاحمت نہیں

کی۔

”ایسا سوچنا بھی نہیں کہ میں کبھی تمہیں چھوڑ کے جاسکتی ہوں۔“ وہ کف لنک وجمعی سے اس کے کف پہ پہنانے لگی۔ ”اگر یہ تمہارے لئے اتنا ہی ضروری ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جیتے۔ بات ختم۔ ٹھیک؟“

فاتح بس آنکھیں چھوٹی کیے اسے غور سے دیکھتا رہا، گویا یقین کرے یا نہ کرے، پھر اس نے یقین کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہلکا سا مسکرایا اور سر کو خم دیا۔ ”تھینک یو۔ میں کار میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ پھر کوٹ کو کندھوں پہ برابر کیا اور سیل فون اٹھا کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ اسے عبور کر کے لاونج میں آیا تو ایک دم ٹھنکا۔ ماتھے پہ بل پڑے۔

سامنے بڑے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سنہرے بالوں والی لڑکی بیٹھی تھی۔ سرخ چھوٹی آستین کے چینی طرز کی لمبی میکی میں ملبوس، اس نے میک اپ کچھ ایسا کر رکھا تھا کہ شکل چینیوں کی طرح لگ رہی تھی۔ (مٹے لوگوں کے نقش بھی چینیوں سے ملتے ہیں مگر رنگت گندی مائل یا سانولی ہوتی ہے۔ تالیہ البتہ کافی گوری گلابی سی تھی۔) فاتح کو دیکھ کے وہ سادگی سے مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر کو خم دیا۔ ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ تم ادھر؟“ وہ حیران ہوا اور اسے کچھ برا بھی لگا۔

”مصر عصرہ نے ایرجنسی میں بلوایا تھا۔ وہ کسی پارٹی میں مجھے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔“ وہ اس کی ناگواری دیکھ کے ذرا پھیلکی پڑی، پھر جبراً مسکرائی۔

”ہوں۔“ وہ آگے بڑھ گیا تو وہ بے اختیار بول اٹھی۔

”کیا آپ بھی اس پارٹی میں جا رہے ہیں؟“ فوراً زبان دانتوں تلے دبائی۔ (کیا صبح والی بے عزتی کافی نہیں تھی تالیہ؟ مگر یہ دل کیا کیا کروا دیتا تھا۔)

”ظاہر ہے۔“ وہ بے نیازی سے کہتا آگے بڑھ گیا۔

”سی یو.... تو انکو! (پھر ملتے ہیں میرے محترم!)“ لمبوں سے بے اختیار پھسلا تھا۔ بنا کسی اردائے، کسی سازش، کسی سوچ، کسی مطلب کے.... اس لفظ پہ فاتح ٹھہرا۔ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ سامنے سے آتی عصرہ کی طرف بڑھ گئی تھی اور اب مسکرا کے اس سے مل رہی تھی۔ سنہرے بال چہرے کے ایک طرف ڈال رکھے تھے اور کانوں سے سرخ آویزے لٹک رہے تھے۔ عصرہ مسکراتے ہوئے اسے اشعر کی پارٹی کا بتا رہی تھی جس پہ اشعر نے اسے خاص الخاص مدعو کیا تھا۔ فاتح یونہی اسے دیکھے گیا۔

(تو انکو....) وہ لفظ اتنی محبت اور عقیدت لئے ہوئے تھا کہ اس کی بازگشت لمحے بھر کو سارے گھر میں پھیل سی گئی۔ (تو انکو) (میرے آقا،

مائی لارڈ) بس ایک لمحے کے لئے فاتح نے اسے ذہن میں دہرایا پھر سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔

(تو انکو Tuanku ایک قابل احترام ٹرم ہے جو ملے اللہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور کسی محترم کے لیے بھی۔ جیسے میرے

مالک میرے آقا کہنا)

”ایڈم۔“ باہر نکلتے ہی فاتح نے برے موڈ کے ساتھ ایڈم کو پکارا۔ ”تم میری کار چلاؤ۔ ہم پہلے جائیں گے۔ بیگم صاحبہ اپنی مہمان کے ساتھ دوسری کار میں آئیں گی۔“ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اتنی بری کیوں لگتی تھی اسے؟ ایڈم نے جھٹ چاپی تھام لی۔

راستے میں فاتح خفگی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ ہمیشہ سنجلا ہوا اور پرسکون رہتا تھا سوائے جب اسے بہت زور کا غصہ آتا۔ لیکن یہ لڑکی.... یہ ان دونوں میاں بیوی کی لڑائی کے وقت ان کے کمرے کے باہر بیٹھی تھی یہ بات اسے بہت غیر آرام دہ کر رہی تھی۔ شاید صرف یہی بات تھی۔ یا شاید اس کو دیکھ کے آریانہ یاد آتی تھی.... آریانہ کو وہ اچھی لگی تھی.... اتنی کہ وہ کتنے ہی دن اس کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھی۔ سنہرے بالوں والی تاشہ آگاپودا....

”ایک سوال پوچھوں سر؟“ ایڈم کی آواز نے اسے سوچ سے باہر کھینچ نکالا۔ فاتح نے گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”پوچھو۔“

”سر.... کچھ دن اچھے گزرتے ہیں مگر کچھ دن ہمارے بہت برے گزرتے ہیں۔ دل خراب ہوتا ہے۔ وجہ کبھی پتہ نہیں ہوتی کبھی ہوتی ہے۔ ایسے دنوں میں کیا کیا جائے؟“

”یہ سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ برے دنوں سے لڑنا سیکھو۔ اپنے دل سے پوچھو مسئلہ کیا ہے، غلطی کیا ہے، اور اس کا حل سوچ کے خود کو پرسکون کرنا سیکھو۔ جتنا زیادہ تم برے موڈ کے آگے ہتھیار ڈالو گے، اتنے برگزرتے دن کے ساتھ کمزور ہوتے جاؤ گے۔ جتنا اس سے لڑو گے، پرسکون رہو گے۔“

”سر کبھی کبھی مسئلہ ہمارے کچھ عزیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جن سے ہمارا خونی رشتہ نہیں ہوتا، مگر ان کے بارے میں دل فکر مند رہتا ہے۔ اگر ان کو کچھ غلط کرتے دیکھیں تو ان کو روکنے کا دل چاہتا ہے، مگر ان کی ناراضی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟“

”تمہارا مطلب ہے کسی کے ساتھ کوئی انہونا جچ بولتے ہوئے تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔“ فاتح اب کھڑکی سے باہر بھاگتی عمارتیں دیکھ رہا تھا۔

”جی سر!“ ایڈم نے موڈ کاٹتے شرمندگی سے آواز پست کی۔

”تمہیں معلوم ہے ایڈم.... چودہ سو سال پہلے عرب میں ہمارے رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت سے نوازا تھا۔ غارِ حرا میں فرشتہ ان کے پاس حق لایا تھا۔ جب وہ گھر واپس آئے تو خدیجہؓ نے ان کی بات پہ من و عن اعتبار کیا۔ بات کتنی ہی انہونی کیوں نہ تھی انہوں نے وہ کیا جو ایک اچھا دوست، ایک اچھا ساتھی کرتا ہے۔ اپنے پارٹنر کو کمفرٹ کیا۔ ہمت بندھائی۔ ان کو کہا کہ آپ کو اللہ کبھی ذلیل و رسوا نہیں

کرے گا کیونکہ آپ غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مصائب میں گھرے لوگوں کا سہارا بنتے ہیں۔ مشکل وقت میں اپنے ساتھی کو امید دکھائی ان کی اچھائیاں ان کو یاد دلانیں۔ اور ان کی بات پہ یقین کیا۔ جانتے ہو کیوں؟“

”کیوں؟“

”کیونکہ خدیجہؓ محمد ﷺ کو اتنے اچھے طریقے سے جانتی تھیں کہ ان کو معلوم تھا یہ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ عام معاملات میں بھی سچ بولتے تھے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری برخاص بات کا اعتبار کریں تو تم عام باتوں میں بھی سچے بنا کرو۔“

”اور اگر اس کا وقت نہ ہو؟ اگر مجھے اپنے اس عزیز کو....“ بیک ویو میں فاتح کا چہرہ دیکھا جو بے نیاز سا بارہ دیکھ رہا تھا۔ ”.... ابھی آج ہی کسی شے سے آگاہ کرنا ہو.... تو میں کیا کروں؟“

”تمہیں سچ اور حق کا فرق معلوم ہے، ایڈم؟“ وہ جواباً سوال پوچھ رہا تھا۔ ”سچ تو برہنہ تلوار ہے، جو سامنے آئے گا، کاٹ ڈالے گی۔ مگر حق وہ سچ ہوتا ہے جو درست طریقے سے درست وقت پہ درست جگہ بولا جائے۔“ ذرا ٹھہر کے وہ بارہ دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”تمہیں معلوم ہے، رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سچا کوئی نہیں تھا مگر وہ blunt نہیں تھے۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ لوگوں کے منہ پہ ان کے لباس، گھر اور جسمانی اعضا کے عیوب نہیں بیان کرتے تھے۔ انسؓ بچے تھے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئے۔ دس سال ان کے ساتھ رہے۔ وہ کہتے ہیں، آج تک رسول اللہ ﷺ نے ان کو نہیں ٹوکا کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا۔ ہم لوگ ایسے نہیں کرتے۔ خود میں ایسے نہیں کر پاتا۔ بول دیتا ہوں۔ بعد میں سوچتا ہوں سامنے والے کا دل دکھا دیا۔ مگر بہر حال.... تم نے پوچھا ہے تو تمہیں درست بات بتاؤں گا.... سچ کی جگہ حق کہنا سیکھو۔ یعنی صحیح طریقے سے صحیح وقت پہ سچ بولنا سیکھو۔ اور یہ تم بھی سیکھ سکو گے جب تم خود سے سچے ہو گے۔“

”خود سے سچے کا مطلب، سر؟“ وہ انہماک سے سنتا ذرا یوکر رہا تھا۔

”کبھی اپنی کسی بری عادت سے جنگ کی ہے تم نے؟ بہت سے لوگوں کو بہت سی بری عادتیں ہوتی ہیں۔ ڈرگزر، عورتیں، جوا.... یا کم سے کم انٹرنیٹ پہ غلط اشیاء دیکھنا۔ لوگ ان کے ساتھ خود سے جھوٹ بول کے لڑتے ہیں۔“ اب میں یہ نہیں کروں گا“ کہہ کر چند دن ان کو دبا لیتے ہیں، پھر وہی کام کر بیٹھتے ہیں۔ پھر گلٹ، تو بہ پھر وہی کام۔ یوں یہ ایک گھناؤنا سائیکل چلتا رہتا ہے۔“

”مگر بری عادتوں کو اسی طرح تو چھوڑا جاتا ہے سر، خود سے عہد کر کے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔“ وہ حیران ہوا۔

”ایڈم بری عادت بیماری نہیں ہوتی۔ بیماری کی ایک علامت ہوتی ہے جو ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر کسی کو چکن پاکس نکل آئیں تو وہ دانوں پہ کریم لگانے سے نہیں جاتے۔ دانے تو ایک علامت ہیں۔ اس کو دوا لینی پڑے گا جو جسم کے اندر جا کر اصل مسئلے کو ختم کرے گی۔

cause کو ٹریٹ کرنا ہوتا ہے، علامتوں کو نہیں۔ مگر اس کے لئے خود سے سچ بولنا پڑتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”اپنے آپ سے پوچھنا ہوتا ہے کہ اگر میں یہ کرتا ہوں تو کیوں کرتا ہوں؟ میں کس چیز کی کمی اس چیز میں ڈھونڈ رہا ہوں؟ بری عادت بار بار واپس آئے گی جب تک تم خود سے سچے نہیں ہو گے۔ بیماری کی وجہ کا علاج نہیں کرو گے۔ جب تم اپنے آپ سے سچے ہو گے تو دوسروں کے بارے میں تمہاری رائے بھی سچی ہوگی کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ جو تم دیکھ رہے ہو وہ سچ بھی ہے۔“

”یعنی ہمیں ایک دم سے مداخلت کرنے کی بجائے پہلے تصدیق کرنی چاہیے پھر انصاف کی بنیاد پر فیصلہ کر کے درست طریقے سے بات پہنچانی چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ہم میں مداخلت کی عادت کچھ زیادہ ہی ہو۔“ اس نے گویا اعتراف کیا۔

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ ہر بات کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ وہ بس کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا....

وہاں سڑک کے پار دور اونچی آسمان کو چھوتی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔

یہ ایک ان عمارتوں کی رنگت پیلاہٹ بھری ہوئی... ارگرد ماحول زرد ہو گیا.... وان فاتح نے گردن موڑی تو کار کو ایک بوڑھا ڈرائیور چلا رہا تھا اور فرنٹ سیٹ پر قدرے نوجوان سا شعر بیٹھا تھا۔ جیسے سال پہلے کا ماحول....

پیچھے فاتح کے بائیں ہاتھ ایک لمبے بالوں والی بچی بیٹھی تھی۔ وہ گردن سیدھے رکھے، سنجیدگی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ عمر کم تھی مگر ذہانت اور تمکنت ہر انداز سے جھلکتی تھی۔

”آہنگ“ آپ کو گیارہ بجے فنڈ ریزر میں جانا ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں سے آدھے گھنٹے میں فارغ ہو جائیں کیونکہ پھر میں نے آپ سے ملاقات کے لئے چند انڈسٹریسٹس کو وقت دے رکھا ہے۔“ وہ اپنی ڈیجیٹل ڈائری دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ”اور اگلے انکیشن سے پہلے آپ کو بار بار ان سے ملنا پڑے گا۔“

”شیور!“ سوٹ میں ملبوس، سیل فون دیکھتے فاتح نے ہلکے سے کندھے اچکائے تھے۔

”کا فنڈ ریزر پہ نہیں آسکیں گی، میں نے ان کو آپ کی ری انکیشن مہم کے لئے مختلف ٹاسک دیا ہے، ان کو آج دو ایونٹ امینڈ کرنے ہیں۔ ٹھیک ہے نا، آہنگ۔“ اشعرتا سیدی انداز میں بیک مرر کو دیکھ کے پوچھ رہا تھا، گویا اتنا رعب تھا کہ اگر وان فاتح انکار کر دے تو وہ فوراً سے شیڈ یول بدل دے گا۔

”مجھے تم پہ بھروسہ ہے، آئیش۔ تم میرے چیف آف اسٹاف اسی لئے ہو۔“

اشعرتا مسکرایا، پھر بیک ویو مرر کو ہاتھ سے ترچھا کیا تو اس میں سنجیدہ مگر بوری ہوئی آریانہ بیٹھی دکھائی دی۔ ”آریانہ.... اتنی بری شکل کیوں بنا رکھی ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے ڈیڈ بزرگرتے دن وزیراعظم بننے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔“

آریانہ نے بھنویں بھنچنے کے پہلے اسے دیکھا اور پھر چہرہ موڑ کے باپ کو۔

”کسی کو یاد بھی ہے کہ کل کون سا دن ہے؟“

فاتح کی سیل فون پہ جمی نظریں چونک کے اٹھیں۔ چونکے انداز میں آریانہ کو دیکھا۔

”تمہاری برتھ ڈے تو دبسم میں آتی ہے نا۔“ ذہن نے فوراً جمع تفریق کی۔

”اور جولیانہ اور سکندر کی سالگرہیں بھی دور ہیں۔“ ایش نے بیک ویو میں دیکھتے ہوئے حیرت ظاہر کی۔ آریانہ ہنوز خفگی سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”ڈیڈ... کل آپ کی برتھ ڈے ہے۔“

”اوہ!“ جہاں فاتح کے ہونٹ سکڑے وہیں اشعر کی آنکھوں میں اچنبھا بھرا۔

”آہنگ کا برتھ ڈے تو اپریل میں ہوتا ہے۔“

”نہیں“ آریانہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بچپن سے پیپرز میں غلطی رہ گئی اور اس کو بدلوانہ بڑا مسئلہ تھا۔ جو سالگرہ سیاسی طور پہ میں مناتا ہوں وہ

واقعی میری درست سالگرہ نہیں ہے۔“ پھر مسکرا کے بیٹی کو دیکھا۔ ”اور صرف آریانہ کو میری اصل سالگرہ یاد رہتی ہے۔“

آریانہ نے اسی سنجیدگی سے ہتھیلی پھیلا دی۔ ”میرا گفٹ ڈیڈ!“

فاتح کے ابرو بے اختیار اٹھے۔ ”اصولاً تمہیں مجھے گفٹ دینا چاہیے... نہیں؟“

”مگر میرا تو کوئی سورس آف انکم ہی نہیں ہے ڈیڈ۔“ معصومیت سے کہہ کر وہ آگے بڑھی اور فاتح کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس

نے مزاحمت نہیں کی۔ اسے اپنا ہونہ نکالنے دیا۔ آریانہ نے اس میں سے کریڈٹ کارڈ نکال کے لہرایا۔

”میں آج اس سے اپنے اور آپ کے لئے گفٹ لوں گی اور آپ کو کل مجھے وہیں لے جانا ہوگا جہاں گفٹ ہوگا۔“ دھونس سے بولی۔

”اور کیا ہے تمہارا گفٹ؟“ اس نے والٹ واپس جیب میں ڈالتے دلچسپی سے پوچھا تو آریانہ پہلی دفعہ مسکرائی اور پراسرار انداز میں

بولی۔ ”تا شہ آگا پووا!“

”تا شہ آگا پووا؟“ فاتح نے اچنبھے سے دہرایا۔ ”وہ کون ہے؟“

”کون نہیں ڈیڈ... یہ پوچھیں کہ کیا ہے!“

کار کی رفتار سست ہوئی تو وہ چونکا۔ منظر بدلا۔ چھ سال گزر چکے تھے اور وہ ایڈم کے ساتھ کار میں تھا۔ اشعر کا گھر آچکا تھا جہاں پارٹی

شروع ہو چکی تھی۔ سر جھٹک کے اس نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور چہرے پہ مخصوص مسکراہٹ طاری کر لی جس کے ساتھ اسے اب

نیچے اتر کے مہمانوں سے ملنا تھا۔ سیاستدان کا مسکراتا ہوا چہرہ۔ بزنس فیس۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام گہری ہو رہی تھی اور قلعہ دشمنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لان میں مختلف قسم کے لوگ سرخ سفید یا سیاہ لباس میں خوش گپیوں میں مصروف

ٹہل رہے تھے۔ موسیقی بج رہی تھی۔

”سویہ پارٹی ہے کس کے اعزاز میں؟“ روش پہ چلتی تالیہ معصرہ سے سوال کرتے ہوئے خوشگوار انداز میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

چونکہ وہ عصرہ محمود کے ساتھ کار سے اتری تھی، بہت سی نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں۔

”معلوم نہیں۔ اب مجھے سیاسی دعوؤں کے مقاصد میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔“ عصرہ شانے ذرا اچکا کے بولی تو تالیہ نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ وہ بھرپور تیار اور کافی خوبصورت لگ رہی تھی مگر ذرا اکتائی ہوئی۔ نظریں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

”ایک زمانے میں آپ سیاسی طور پہ بہت ایکٹیو تھیں۔ لوگ کہتے تھے وان فاتح کو اس کی بیوی کی سپورٹ نے وان فاتح بنایا ہے۔“

”تب آریا نہ ہمارے پاس تھی۔“ پھر اس نے گہری سانس لی اور ایک بے تاثر نگاہ تالیہ پہ ڈالی۔

”ہم خود کو کمفرٹبل کر لو.... میں ایش سے مل لوں۔“ اور تالیہ کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔

تالیہ نے نظریں گھما کے اطراف میں دیکھا۔ سرخ لباس پہنے، کلچ اٹھائے، وہ کسی خالی دماغ والی امیر حسینہ جیسی لگ رہی تھی۔ مگر اس کی تیز آنکھیں دائیں سے بائیں سارے لان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جیسے برپارٹی پہ ”مارک“ (جس آدمی سے کچھ چرانا ہو) کے گھر کو وہ case کیا کرتی تھی۔ وہ عموماً ان جگہوں پہ اسی نیت سے جایا کرتی تھی اور عادتاً آج بھی وہی کر رہی تھی حالانکہ اسے کچھ نہیں چرانا تھا۔ سیکورٹی کے کتنے افراد ہیں، کیمرے کہاں لگے ہیں، ہنگامی صورت حال میں بھاگنے کا پہلا راستہ کون سا ہوگا۔ وہ عقابی نظروں سے جائزہ لیتی آگے بڑھتی آئی۔

ایک جگہ سامنے فاتح کھڑا تھا۔ تین لوگوں کے گروہ میں، ہاتھ میں گلاس اٹھائے، وہ مسکرا کے بے فکری سے کسی بات پہ تبصرہ کر رہا تھا۔ بولتے ہوئے چہرہ دوسرے آدمی کی طرف موڑا تو اس کے کندھے کے پیچھے تالیہ کھڑی دکھائی دی۔ فاتح نے اسے نظر انداز کر کے بات جاری رکھی۔ تالیہ بھی شاید وہاں سے ہٹ جاتی مگر.... وان فاتح پہ جمی نظروں کے سامنے ایک دم سفیدی چھانے لگی.... اتنی چمکدار سفیدی کہ وہ ٹھہر گئی.... ساری آوازیں بند ہو گئیں.... ایک خواب سا منظر ابھرا....

لکڑی کی سلاخوں والا بڑا سا پنجرہ جسے چند لوگ اٹھا کے لے جا رہے ہیں.... کسی جنگل میں درختوں کے درمیان.... پنجرے کے دروازے پہ تالے پڑے ہیں اور اندر وہ اکڑوں بیٹھی ہے۔ سنہرے روکھے بال اور چہرے پہ مٹی۔ تھوڑی گھٹنے پہ رکھی ہے اور خاموش سپاٹ لگا ہیں فاتح پہ جمی ہیں جو پنجرے کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہے.... اسی طرح اکڑوں مگر چہرہ.... زخمی لگتا ہے....

”تاشہ.... میرے ساتھ رہو۔“ وہ اسے دیکھ کے آہستہ سے کہتا ہے۔ ”مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اور تمہیں میری۔“

”میں آپ کے ساتھ ہوں، تو انکو۔ (میرے آقا)۔“ وہ بولی تو آواز پھٹی پھٹی سی تھی.... سفیدی مزید چھاتی گئی.... اتنی کہ منظر غائب ہونے لگا....

تالیہ نے چونک کے پلکیں جھپکیں تو پارٹی کا لان واپس دکھائی دینے لگا.... فاتح کے ساتھ والے افراد بکھر گئے تھے یا کیا.... وہ ”واپس“ آئی تو دیکھا وہ گلاس لئے اس کے سامنے کھڑا ہے اور غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔ پارٹی کا شور پھر سے کانوں میں سنائی دینے لگا اور وہ مکمل طور پہ جاگ گئی۔ زبردستی مسکرائی اور سر کو خم دیا۔ ”تو انکو!“

”تم کیا دیکھ رہی تھیں؟“ پوچھتے ہوئے فاتح نے گردن موڑ کے اپنے پیچھے دیکھا اور پھر دوبارہ اسے۔

”میں.....“ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ صبح والی توہین بھول گئی۔ اس کا سحر اتنا تھا کہ الفاظ گڈمڈ ہونے لگے۔ ”یونہی.... پارٹی کو دیکھ رہی تھی۔“

”اچھا؟....“ وہ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ کے سوچتی نظروں سے اسے گویا پرکھ رہا تھا۔ ”مجھے لگاتم کچھ اور دیکھ رہی ہو.... کچھ غیر ماورائی

.... جو ہم نہیں دیکھ سکتے.... جیسے کسی دوسری دنیا میں جھانکنا....“

”کیا کوئی دوسری دنیا وجود رکھتی ہے تو انکو؟“ وہ اس کی آنکھوں پر سے نظریں ہٹا نہیں پار رہی تھی۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”مجھے اس دنیا کی زیادہ فکر ہے۔ ہم نے اس کے لئے بہت کچھ کرنا ہے دوسری دنیاؤں کی مخلوقات اپنی فکر خود کر لیں گی

۔“

”آپ نے کبھی کسی سے درخواست کی ہے تو انکو (Tuanku) کہ وہ آپ کے ساتھ رہے کیونکہ آپ کو اس کی ضرورت ہے؟ کبھی

ایسا موقع آیا؟“

وہ پھر سے مسکرایا اور کندھے اچکائے۔ ”میرے کا زکو بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوگی مگر مجھے....“ انگلی سینے پر رکھی۔ ”وان فاتح کو کسی

کی ضرورت نہیں ہوتی نہ وہ کسی سے ایسی درخواستیں کرتا ہے۔“ نرمی سے کہہ کے وہ گلاس لیے آگے بڑھ گیا۔

سحر ٹوٹا۔ منتر ساختم ہوا۔

تالیہ نے گہری سانس اور سر جھٹکا۔ کھانا لگایا جارہا تھا۔ وہ اپنے نام کی میز ڈھونڈتی آگے بڑھ گئی۔

”تالیہ بنت مراد“ جس گول میز پر اس کے نام کا کارڈ لگا تھا اس پر اس کی نشست کے عین سامنے وان فاتح کا کارڈ تھا۔ فاتح البتہ ابھی

میز پر نہیں آیا تھا۔ تالیہ تلخی سے مسکرائی اور کرسی کھینچی، پھر ٹھہر گئی۔

کرسی کے قریب گھاس پہ لکیر کھینچی تھی۔ جوتے سے کھینچی گئی یہ لکیر کسی دوسرے کسی شخص کو نہ نظر آتی شاید.... لیکن وہ تالیہ تھی۔ اس کا کام

یہی تھا۔ لکیریں کھینچ کے اپنی یاد دہانی کرنا کہ کس جگہ کھڑے ہونا ہے۔ ایسا پوائنٹ جہاں سے کوئی خاص شے دکھائی دیتی ہو۔ چونک کے اس

نے ادھر ادھر دیکھا۔

لکیر والی جگہ پہ ابھی کوئی نہیں کھڑا تھا مگر یقیناً کسی نے وہ جگہ مختص کر رکھی تھی۔ وہ آہستہ سے اس جگہ پہ کھڑی ہوئی اور دھیرے دھیرے

گھومنے لگی۔ یہاں سے کیا نظر آتا تھا؟ میز کی طرف گھومی تو سامنے وان فاتح کے نام کی خالی کرسی تھی۔ کون تھا جو فاتح کے سامنے کھڑا ہونا

چاہتا تھا؟ وہ خاموشی سے اپنی جگہ آ بیٹھی۔ دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔

ان سے فاصلے پہ برف ٹیبل کے قریب اشعر کھڑا تھا۔ سفید کوٹ میں ملبوس، گلاس اٹھائے، وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا ہوا، شاندار لنگ رہا تھا

۔ عصرہ کے جلے بھنے انداز پہ بھی اس کی مسکراہٹ نہیں جا رہی تھی۔

”میں کسی سوشلائٹ کو اتنی اہمیت نہیں دیتی کہ اسے اپنے ساتھ پارٹی پہ لے آؤں۔ ویسے بھی فاتح کو اس لڑکی کا ہمارے گھر آنا جانا پسند

نہیں ہے۔ اب مجھے بتاؤ میں اسے کیوں ساتھ لائی ہوں؟ ہمیں تو اس سے صرف نیلامی کی حد تک مطلب تھا۔“ عصرہ شدید برے موڈ میں تھی۔

”کا کا!“ اس نے مسکرا کے بہن کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے دبایا۔ ”آپ کے شوہر نے جو کھینچا پھیلایا ہے اس کو صاف کرنے کے لئے مجھے اس کی ضرورت تھی۔“

عصرہ کی پیشانی کے بل ڈھیلے پڑے۔ آنکھوں کی خفگی، خفت میں بدلی۔ ”مجھے بہت افسوس ہے اس کے لئے۔“

”صرف افسوس کافی نہیں ہے کا کا۔ آپ کو ثابت کرنا ہو گا کہ آپ مجھے پردھان منتری دیکھنا چاہتی ہیں یا آہنگ کو۔“ وہ مسکرا کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر دلچھے میں بولا تو عصرہ نے بے اختیار اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

”صرف تمہیں ایش۔ میں فاتح کو اس جنون کے ہاتھوں مزید تباہ نہیں ہونے دوں گی۔ وہ غصے میں تھا اور مجھے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ کہنا پڑا کہ ہم امریکہ نہیں جا رہے۔ وہ تو مجھے چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔“

”وہ آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔“

”وان فاتح صرف وان فاتح سے محبت کرتا ہے ایش!“ وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ اس نے اپنے محبوب وان فاتح کو طاقت کی کرسی پہ بٹھانا ہے۔ بس۔“

”اور اس کام سے اسے روکنے کے لیے آپ کا امریکہ جانا ضروری نہیں ہے صرف ان کا اس دوڑ سے نکلنا ضروری ہے۔“ اس کے قریب جھکے وہ سرگوشی میں بولا۔ ”اور صرف آپ یہ کام کر سکتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ چوکی۔

”آہنگ کے پاس فنڈز نہیں ہیں۔ وہ نہ قرض لیں گے نہ عطیہ۔ پہلے وہ مجھ پہ انحصار کیے ہوئے تھے، مگر حال ہی میں جو آگ لگی تھی، ظاہر ہے وہ ایکسٹینٹ تھا اس کے بعد ان کے پاس پیسوں کی شدید کمی ہو چکی ہے۔ ایسے میں وہ ملا کہ والا گھر بیچنے کا سوچ رہے ہیں....“

”واٹ؟“ عصرہ کے اوپر سے گویا ٹرک گزر گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”سناؤ گا گھر؟ تین خزانوں والا گھر؟ یہ تمہیں کس نے کہا؟“

”جس نے بھی کہا۔ غلط نہیں کہا۔“

”وہ اس کے باپا کی وراثت تھی۔ وہ اس کو عزیز ہے۔ میں اسے وہ نہیں بیچنے دوں گی ایش۔“ عصرہ کی آنکھیں گلابی ہونے لگیں۔

اشعر نے گہری سانس لی۔ ایک نظر اطراف کا جائزہ لیا۔ لوگ اب اٹھ اٹھ کے بے کار زر کی طرف آرہے تھے۔ وہ عصرہ کے کان کے قریب جھکا۔ ”اگر آپ آہنگ کو اس جنون سے بچانا چاہتی ہیں، اگر اپنے بچوں کو آریانہ کی طرح کھونا نہیں چاہتیں، تو آپ کو میرے لئے... اپنے لئے... ایک چوری کرنی ہوگی۔“

”ہاں تم نے فون پہ یہ کہا تھا کہ مجھے آج فاتح کے لاکر سے کچھ چرانا ہوگا۔ اب بتاؤ، کیا چیز؟ کیونکہ میں تیار ہوں۔“ وہ گردن کڑا کے عزم سے بولی تو وہ اس کی آنکھوں میں تپش دیکھ سکتا تھا۔

تالیہ کھانے ڈالنے کی بجائے لان کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور کچھ کھولا۔ اس میں ایک موٹے ہیرے والی انگوٹھی پڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے یہ عصرہ کی انگلی میں تھی اور عصرہ ابھی تک ناواقف تھی کہ یہ تالیہ اتار چکی ہے۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور موبائل نکال کے نمبر ملا یا۔ داتن نے پہلی گھنٹی پہ اٹھالیا تھا۔

”تم غلط ہو یا نہ صابری اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ بھلے تم نے میرے لئے ہی کیا، جو کیا، مگر میں تمہیں اس لئے فون نہیں کر رہی کہ....“ داتن کا ہیلو سنتے ہی وہ (مصنوعی) خفگی سے تیز تیز بولتی گئی۔

”جسکٹوں میں بیٹھا زیادہ تو نہیں تھا؟“ وہاں سے بے نیازی سے پوچھا گیا۔

”پتہ نہیں۔ میں نے کون سا چکھے تھے۔“

”تو آدھا ڈبہ خالی کیوں ہے؟“ تالیہ نے بے اختیار فون کو گھورا۔ (موٹی پھر سے میرے گھر میں بیٹھی ہے؟ ہونہ۔)

”مجھے کیا پتہ۔ تم نے دیا ہی آدھا ہوگا۔“ کلس کے بولی۔

”اچھا.... مجھے معاف کر دو۔ میں نے غلط کیا مگر تمہارے لئے ہی کیا۔ اب بھی نہیں چاہتی کہ تم اس ملعون چابی کا پیچھا کرو لیکن اگر تم کرنا ہی چاہتی ہو تو یاد رکھو، تمہیں ایڈم سے چھٹکارا پانا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”کسی کا کچھ چرا کے اس کے کوٹ میں ڈال دو۔ جب اس کے پاس سے برآمد ہوگا تو اس کا اعتبار اور نوکری ختم ہو جائے گی اور وہ تمہارا راز نہیں کھول سکے گا۔“

”ہاں.... عصرہ کی انگوٹھی کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔ ایڈم کی نوکری ختم کروانی پڑے گی آج۔“ وہ دبی سرگوشی میں بولی۔ نظریں اس میز پہ جمی تھیں جہاں اب فاتح اور عصرہ آ کے بیٹھ چکے تھے اور اس لکیر والی جگہ پہ.... فاتح کا سیکرٹری عثمان ہاتھ باندھے آ کھڑا ہوا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے فاتح کے عین سامنے۔

”داتن.... ایک بات بتاؤ.... اور ہاں، تمہیں معاف نہیں کیا میں نے ابھی.... اچھا بتاؤ.... ہم نے جب اس سنگاپوری میسر کو اس کام کیا تھا تو ایک سیاسی ٹرم ہم نے سنی تھی.... ٹریک.... ذرا مجھے یاد کراؤ.... کیا ہوتا ہے ٹریک؟“ وہ آنکھیں عثمان سے ہٹائے بغیر بولی۔ عثمان کی شرٹ کا دوسرا بٹن قدرے مختلف سا تھا۔ اتنے فاصلے سے بھی صرف ایک نظر دیکھ کے ہی تالیہ بتا سکتی تھی وہ بٹن کیمرہ کس کوالٹی کا تھا۔

”ٹریک؟ ٹریک بنیادی طور پہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو موبائل کیمرے یا بٹن کیمرے یا پین کیمرے وغیرہ آن کر کے کسی سیاستدان کے پاس نجی محفلوں میں جا بیٹھتے ہیں اور سیاستدان ٹھہرے سدا کے شو باز قسم کے لوگ.... ان کو بولنے کا شوق ہوتا ہے.... موضوع کو خاص سمت موڑو اور سیاستدان کو کسی کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہنے پہ مجبور کر دو۔ جیسے بچے اپنے دوستوں میں بری زبان استعمال کر لیتے ہیں مگر کبھی نہیں چاہتے کہ والدین کو پتہ چلے۔ سو سیاستدان اپنے دوستوں میں وہ کمفٹ بھی پاس کر دیتا ہے جو وہ عوام یا میڈیا کے سامنے نہیں کرتا

اس کی ویڈیو میں سے ایک آدھ فقرے کی چھانٹی کرو۔ اور یوٹیوب پہ لگا دو۔ کسی بھی سیاستدان کے کیریئر کو ایسی ٹریکروڈیو سے اچھا خاصا نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”تو سیاستدانوں کو بھی سوچ سمجھ کے بولنا چاہیے۔“

”برائے انسان غلطی کرتا ہے تالیہ مگر ہماری غلطیاں پرائیوٹ ہوتی ہیں اور سیاستدانوں کی غلطیاں پبلک۔ مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”فاتح کا سیکرٹری شاید فاتح کے لئے نہیں، اشعر کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ اس وقت خود ٹریکریٹر بنا ہوا ہے۔ گھائل غزال کے پیچھے بھی اشعر تھا اس کے پیچھے بھی ہو گا۔“ وہ دلچسپی سے دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ تو یہ تھا پارٹی کا مقصد۔ انٹرنٹنگ۔

”تالیہ.... یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ اس کی فکر چھوڑو۔ تم ایڈم کا بندوبست کرو۔“

”زیادہ حکم نہ چلاؤ۔ میں ابھی تک ناراض ہوں تم سے۔“

”میں تو بس میری بچی یہی بتانا چاہتی تھی کہ بسکٹ میں میں نے ڈائٹ شوگر کی جگہ اصلی شوگر ڈالی ہے۔“

”کیا؟“ تالیہ کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ فون کان سے ہٹا کے دیکھا۔ ”یا اللہ! داتن تمہیں اندازہ ہے میں نے کتنے کھائے؟ اف اتنی کیلوریز۔“

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے کچھ تک نہیں۔“ مگر تالیہ غصے سے بول رہی تھی۔

”میں کیا نہ صابری، تمہیں اپنی حرام اور حلال دونوں کی کمائی سے عاق کرتی ہوں۔ بات مت کرنا اب مجھ سے۔“ غصے سے فون رکھا تھا۔

”اف... آج ان کیلوریز کو برن کرنے کے لیے زائد ورک آؤٹ کرنا پڑے گا۔ اف اف۔“

میز پہ تمام افراد بیٹھ چکے تھے اور کھانا کھایا جا رہا تھا۔ خوش گپیاں جاری تھیں۔ تالیہ کھانا لے کر آئی تو سب کسی بات پہ ہنس رہے تھے جو یقیناً فاتح نے کہی تھی۔ (اور یقیناً اسے عثمان کے کیمرے نے محفوظ کر لیا تھا۔) اشعر نے سب کو سیلفی کے لیے متوجہ کیا۔ وہ بھی پلاسٹک کی گڑیا کے انداز میں مسکراتی رہی اور اشعر نے سیلفی اتاری۔ سب واپس باتوں میں مصروف ہو گئے تو اشعر مسکرا کے آبنگ کی طرف جھکا۔ ”ابھی ابھی اسی صحافی لڑکی نے وہ ساری خبر ٹویٹ کر دی ہے۔ پوری کیس رپورٹ بنائی ہے۔ میرے کسی پرانے دوست تک کا انٹرویو شامل کر لیا ہے۔“

فاتح نے گہری سانس لی۔ ”برا ہوا۔“

”اوہ آبنگ.... جیسے مجھے اندازہ ہی نہیں کہ وہ نوکری جانے کے بعد سب سے پہلے آپ کے پاس گئی ہو گی مگر آپ نے اس کو ایسا جواب دیا ہو گا کہ اس نے غصے میں آنکھیں بریک کر دی۔ رپورٹرز کو لگتا ہے وہ سیاستدانوں کو پتاتے ہیں اور جواب اگلاتے ہیں۔ مگر سیاستدانوں کو رپورٹرز کو پتانا زیادہ اچھا آتا ہے۔“ اس کے قریب جھکے بظاہر مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے چادلوں سے بھرا چھچھ منہ میں رکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”جیسا کہ میں نے کہا.... برا ہوا۔“ پھر منہ میں ذائقہ گھلاتو خوشگوار حیرت سے اشعر کو دیکھا۔ ”کھانا بہت اچھا ہے۔“

”جی.... بلواتا ہوں آپ کو شیف سے۔“ اشعر نے ایک دم چٹکی سے رٹلی کو اشارہ کیا جو فوراً سر ہلا کے آگے بڑھ گیا۔ عصرہ نے دہلی دہلی سی مدخلت کی۔ ”شیف کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مگر اشعر نے اُن سنا کر دیا۔ فاتح اب شوق سے کھا رہا تھا۔

تالیہ کھا کم رہی تھی اُن سب کے تاثرات زیادہ پڑھ رہی تھی۔ غور سے خاموشی سے۔ پھر پل بھر کو گفتگو میں وقفہ آیا تو وہ کھنکھاری۔

”فاتح صاحب.... مجھے سیاست کی اتنی سمجھ تو نہیں جتنی اس میز پر بیٹھے دوسرے لوگوں کو ہوگی....“ بلند آواز اور مضبوط لہجے میں بات کا آغاز کیا تو تمام افراد کھانا جاری رکھتے ہوئے اسے دیکھنے لگے.... ”مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان نہیں ہے؟ کیا آپ کو چھوڑا ساز یا وہ شاطر نہیں ہونا چاہیے تھا تا کہ آپ غلط لوگوں پہ بھروسہ کر کے دھوکہ نہ کھائیں؟“

”تمہارے خیال میں انسانوں کی پہچان رکھنا اور شاطر ہونا بہت ضروری ہے؟ تا شہ؟“ وہ ہاتھ روک کے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھنے لگا۔ ”تالیہ!“ اشعر نے تھجج کی مگر کسی نے نہیں سنا۔

”سیاستدان کے لئے تو بہت ضروری ہے، سر۔ گھاگ اور شاطر ہونا۔“

فاتح مدھم سامسکرایا۔ ”سیاستدان کے لیے؟ ہاں۔ مگر لیڈر کے لئے.... وٹرنری کے لئے.... جانتی ہو کیا ضروری ہے؟“ نظریں تالیہ کی آنکھوں پہ تھیں۔ ”ایک مقدس کاز کا ہونا۔ نظریے اور اصولوں کا ہونا.... مجھے انسانوں کی پہچان یا شاطر پن کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میرے پاس ایک کاز ہے، کہ مجھے اپنے ملک کو صوفیہ رُحمن جیسے چوروں سے پاک کرنا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں گھاگ نہیں ہوں اور لوگ مجھے دھوکہ دے کر چھوڑ جاتے ہیں مگر میں اس چیز کو ایسے نہیں دیکھتا۔“

”آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں؟“ صبح والی تو ہین بھلائے وہ بے خودی اسے دیکھ گئی۔

”میں جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہوں تا شہ وہ کہتی ہے کہ جو لوگ میرے کاز کے ساتھ مخلص ہوں گے وہ آخر تک میرے ساتھ رہیں گے“ اور جو دھوکے باز، غیر مخلص، بد دیانت لوگ ہیں وہ خود ہی ساتھ چھوڑتے جائیں گے۔ جیسے چھلنی سے کنکر چھن جاتے ہیں۔“

وہ لمحے بھر کو بالکل لا جواب ہو گئی۔ مگر پھر.... کھنکھاری۔ ”مگر تب تک وہ لوگ آپ کو کتنا نقصان پہنچا چکے ہوں گے؟ یہ سوچا کبھی آپ نے؟“

”وہ مجھے اس لئے نہیں چھوڑ جاتے کیونکہ میں سادہ ہوں اور وہ مجھے دھوکہ دے ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نہیں۔“ وہ لقمہ چبانے کو رکھا پھر اسے دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”لوگ میرے ساتھ اپنے مفاد کے لیے اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ کسی کا مفاد خود غرض ہوتا ہے، کسی کا بے غرض۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ مجھے اور میرے نظریے کو نہیں بدل سکتے تو وہ چھوڑ جاتے ہیں۔ لیڈر بننے کے لئے شاطر ہونا ضروری نہیں ہوتا.... نہ جھکنے والا کردار ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

”اشعر صاحب۔“ گفتگو کو مکمل رٹلی کی آواز نے کیا تو سب اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایڈم اور ایک ادھیڑ عمر اسکارف والی عورت کو لارہا

تھا۔ عورت پر سکون اور سادہ لگتی تھی البتہ ایڈم خفیف زدہ نظر آ رہا تھا۔ (ماں کو ان لوگوں سے ملوانے کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ کی شرمندگی۔)

مگر تالیہ دیکھ سکتی تھی کہ دہلی نے ایڈم کو وہیں کھڑا کیا جہاں کچھ دیر پہلے عثمان کھڑا تھا۔ (کل کو وان فاتح کی کوئی ٹریکروڈیو زریلیز ہوئی تو نوٹوگرافز میں اس اینگل پہ کون کھڑا نظر آئے گا؟ ایڈم! یعنی الزام ایڈم پہ لگایا جائے گا۔ واہ۔) تلخی سے سر جھٹکا۔

”اچھا.... یہ کھانا ایڈم کی والدہ نے بنایا ہے؟“ عصرہ نے حیرت سے اشعر کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرایا اور ایڈم کی ماں کو دیکھا۔

”میں آپ لوگوں سے مسز محمد کا تعارف کروانا چاہتا تھا کیونکہ ان کو نوکری کی ضرورت ہے اور ان کا کھانا آپ کچھ ہی چکے ہیں۔ میری سفارش بھی ساتھ ہوگی۔“

فاتح ابھی تک چاول کھا رہا تھا۔ قدرے بے نیاز سا۔ بس مسکرا کے ایک دفعہ دیکھا پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسرے افراد نے سر ہلا کے تو صنفی کلمات کہے۔ عصرہ نے بھی بظاہر خوش دلی سے تعریف کی۔ تالیہ البتہ دلچسپی سے آدھی گھوم کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں اپنے دوستوں میں پتہ کروں گی۔ کسی کو ضرورت ہوئی تو پہلا نام آپ کا تجویز کروں گی مسز محمد۔ کھانا واقعی بہت اچھا ہے۔“ ایک نظر قدرے خفیف سے کھڑے ایڈم کو بھی دیکھا۔

”آپ کا شکریہ میڈم!“ عورت سادگی سے مشکور ہوتی نظر آئی۔

”ایڈم کے بھی بس دو دن رہ گئے نوکری کے۔ آگے کیا ارادہ ہے تمہارا ایڈم؟“ اشعر نے نرمی سے پوچھا۔ وہ ایڈم کے وہاں کھڑے ہونے کے دورانے کو بڑھانا چاہتا تھا سو بات کو طول دے رہا تھا۔

”نسر.... میں نوکری ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”اور اگر نوکری نہ ملی تو؟“

”میرے والد اسٹور پہ کام کرتے ہیں وہاں بیٹھ جاؤں گا پھر۔“ وہ نظریں جھکا کے متانت سے بولا۔

”اسٹور میں بیٹھنے سے تو تمہارے مستقبل کے روشن ہونے کے کوئی امکان نہیں ہیں۔“ اشعر غیک لگائے افسوس سے بولا تو اس کا رخ والی عورت بول اٹھی۔

”ایڈم کا مستقبل بہت روشن ہے اشعر صاحب۔“

”اور یہ آپ کو کیسے پتہ؟“ تالیہ نے دلچسپی سے گفتگو میں مداخلت کی۔

”ایڈم کے ساتھ اس کے تایا کی دعائیں ہیں۔“ ابھی وہ اتنا بول پائی تھی کہ ایڈم نے ہڑبڑا کے اسے دیکھا۔ (نہیں ماں.... اللہ کا واسطہ ان لوگوں کے سامنے نہیں۔) گھبرا کے آنکھوں میں منت کی مگر ماں سب کو متوجہ دیکھ کے بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ ”ایڈم کے تایا اس کے لئے بہت دعا کرتے تھے۔ ان کو سچے خواب بھی آتے تھے۔ انہوں نے....“ مگر ایڈم کی آنکھوں کی منت دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

”کوئی خواب دیکھا تھا انہوں نے ایڈم کے بارے میں؟“ تالیہ نے چونک کے بات پکڑی۔ ایبو کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ سادگی سے گویا ہوئی۔

”جی میڈم۔ جب یہ بہت چھوٹا سا تھا تو انہوں نے اس کے بارے میں کوئی اچھا خواب دیکھا تھا۔ بتایا نہیں کبھی۔ بس ہر وقت دعا کرتے تھے کہ (یہاں پہ ایڈم نے مارے شرمندگی کے آنکھیں بند کر دیں) ایک دن آئے گا جب ایڈم محمد کو اللہ تعالیٰ زمین میں مدفن خزانوں کے راز بتا دے گا، اور اس دن ایڈم دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ طاقتور ہوگا۔“

اس میز پر چند ممبرز پارلیمنٹ اور سینیٹرز اپنی بیویوں کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ عثمان رملی جیسے مضبوط نوکریوں والے لوگ بھی پیچھے کھڑے تھے جن کی عام لوگ سیاستدانوں سے ایک ملاقات کے لیے منتیں کرتے تھے۔ ایسے طاقت ور لوگوں کی میز پر پہلے تو خاموشی چھا گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ فاتح بھی ہنسا تھا اور ایڈم شرم سے زمین میں گر گیا۔ سب نے اس بات کو انجوائے کیا تھا۔

”آمین۔“ قہقہہ تھا تو تالیہ کی آواز گونجی۔

میز پر یکدم خاموشی ہوئی۔ تمام گردنیں اس کی طرف مڑیں۔ اور وہ ایڈم کی ایبو کو دیکھ رہی تھی۔ صرف وہ نہیں ہنسی تھی۔

”شم آمین!“ وہ حوصلہ افزاء انداز میں مسکرا کے ایبو سے کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے بے یقینی سے نظر اٹھائی۔ اسے لگا تالیہ نے طنز کیا ہے مگر اس کا چہرہ کسی بھی کھوٹ سے پاک نگ رہا تھا۔

”آپ میرے معزز دوستوں کے قہقہے کا برا نہ منائیے گا مگر یہ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے مسز محمد۔ اس دنیا میں اگر لوگوں کو سچے خواب آ سکتے ہیں تو وہ سچ بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اشعر صاحب کے دادا کو ہی لے لیجیے۔“ ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”وہ چائے کی پتی کا کام کرتے تھے۔ آٹھ بائی دس کی چھوٹی سی دکان تھی اور اب ان کا گھر دیکھیں۔ (اشعر اور عصرہ دونوں کے ماتھے پر ایک جیسے بل پڑے)۔ سینیٹر ذکری کو لے لیں۔ ان کے والد بجلی کے محکمے میں میٹر ریڈر تھے۔ اور یہ ممبر پارلیمنٹ لائی کھنوی صاحب بیٹھے ہیں جن کا قہقہہ سب سے اونچا تھا۔ یہ جوانی کے دنوں میں اخبار بچا کرتے تھے۔ وہ بھی سائیکل پر۔ خود اپنے انٹرویوز میں بتاتے ہیں اور اب یہ انہی اخباروں کی سرخیوں میں آتے ہیں۔ اور وان فاتح کو ہی لے لیں....“ نظریں گھما کے فاتح کو دیکھا جو دوسروں کی طرح بھنویں اکٹھی کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ان کے والد....“

”وکیل تھے‘ معزز تھے‘ خوشحال تھے اور عزت دار زندگی گزارتے تھے۔“ فاتح نے برہمی سے فقرہ مکمل کیا مگر تالیہ نے بات جاری رکھی۔

”ان کے والد وکیل تھے‘ معزز اور خوشحال تھے مگر کافی شاطر اور گھاگ بھی تھے۔ لوگوں کو خوش رکھتے تھے۔ مگر فاتح صاحب ایسے نہیں ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے کردار اور قد کا تعین اس کے باپ کی وراثت نہیں اس کی اپنی قسمت اور محنت کرتی ہے۔“ وہ اٹھی اور کرسی پیچھے کی۔ سب اس کو ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔ پہلو بدل رہے تھے۔ مگر کسی نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

”میں چلتی ہوں۔ دعوت کا شکر یہ اشعر صاحب۔“ پھر ٹھہری اور عصرہ کو مخاطب کیا۔ ”آپ کی کرسی کے ساتھ ایک انگوٹھی پڑی ہے۔ کیا

آپ کی ہے؟“ عصرہ جو خفا نگ رہی تھی، چونکی۔ گردن گھمائی۔ گھاس پہ انگوٹھی سامنے ہی دک رہی تھی۔ سر جھٹک کے اسے اٹھایا اور بادل نحو است بولی۔ ”تھینک یو تالیہ۔“

تالیہ نے بھی ایک مصنوعی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور پرس اٹھائے آگے بڑھ گئی۔

ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ ان سارے مصنوعی اونچے طاقتور لوگوں میں ایک وہی قدرتی سی لگی تھی۔ ایک دم اس کی ڈھال بن کے آ گئی۔ اور جیسے اس کو کسی کموڈور گیگن سے بچالے گئی ہو۔

اب وہ چلتی ہوئی لان میں آگے جا رہی تھی۔ میز پہ اشعر نے مسکرا کے کوئی اور بات چھیڑ دی مگر ایڈم ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ راستے میں وہ عثمان سے ٹکرائی مگر سنبھل گئی۔ عثمان نے معذرت کی تو وہ اٹس او کے کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ تب ایڈم کو یاد آیا کہ اس کی کار تو فاتح کے گھر کھڑی تھی۔ وہ گھر کیسے جائے گی؟ وہ اجازت لے کر اس کی طرف بھاگتا آیا۔

وہ گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ سڑک کنارے۔ سرخ لباس میں کلچ اٹھائے۔ خاموش، گم صم۔ ایک دم گردن موڑ کے ایڈم کو دیکھا تو انگلی سے اشارہ کیا یعنی ادھر آؤ۔ کوئی رعب سا تھا اس میں جو وہ دوڑا چلا آیا۔ ”جی، جی،“ چپے تالیہ۔ ”اس کے دھوکے جھوٹ سب بھول گیا۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ وہ ڈھال بنی تھی۔“

”میں نے کیب منگوائی ہے۔ میری کار و ان فاتح کے گھر کھڑی ہے۔ میں عصرہ بیگم کے ساتھ آئی تھی۔ میری کار میرے گھر پہنچا دینا۔“ چابی اس کی طرف بڑھا کے تحکم سے بولی۔

تبھی ایک لگژری کیب سامنے آرکی۔ باوردی ڈرائیور نے باہر نکل کے دروازہ کھولا تو ایڈم نے جلدی سے چابی تھام لی اور تالیہ کار میں سوار ہو گئی۔ اس کے انداز میں سب شاہانہ تھا۔ مگر ایڈم کو آج لگا کہ اگر وہ ذرا سا کھرچے تو اندر سے ایک عام ہڈل کلاس لڑکی نکلے گی۔ وہ اسی طرح اسے یک ٹک دیکھے گیا.... یہاں تک کہ کار دور نکل گئی۔

☆☆=====☆☆

لگژری کیب کو الپپور کی سڑک پہ رواں دواں تھی۔ تالیہ پچھلی سیٹ پہ خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی جہاں سیاہ رات میں اونچی روشن عمارتوں دلا شہر دور تک پھیلا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور پرس کھول کے سنہری زنجیر نکالی جس کے آگے ڈلی سی جڑی تھی۔ عصرہ کا بریسلٹ جواب اس کالا کٹ تھا۔ کوئی عجیب اسرار سا تھا اس میں۔ جیسے اس کی یادوں کا جگرہ ہو۔ جیسے اس کے ماضی کا مقبرہ ہو۔

تالیہ نے اسے گردن میں ڈالا اور کندا بند کیا۔ لمبے بھر کی دیر تھی کہ.... زنجیر نے اس کی گردن کو مقید کیا اور..... کو الپپور کی سیاہ روشن رات ارد گرد سے غائب ہوتی گئی.....

تیرہ سالہ تالیہ درختوں کے درمیان ایک ڈوبتی شام میں پہنچ گئی.... وہ خود کو نہیں دیکھ سکتی تھی.... بس اپنے کندھوں پہ آگے کو گرے لمبے بال

اور میلا لباس دکھائی دیتا تھا... منظر اس کی آنکھ سے دیکھا جا رہا تھا۔

اس نے خود کو پتوں سے ڈھکی زمین پہ بیٹھے پایا... چوڑی مار کے... ہاتھوں میں ٹوٹا ماریل تھا جس میں پانی بھرا تھا۔ وہ اسے لبوں کے قریب لے گئی اور اوپر اٹھا کے ہونٹوں کے اندر اندر ڈالا... بھٹنڈا بیٹھا پانی....

”تالیہ!“ پکار پہ وہ جو ماریل کے پیالے سے پانی پی رہی تھی رکی اور گردن موڑی۔ وہی دبلا پتلا آدمی چلا آ رہا تھا۔ لکڑیوں کا گٹھا کندھے پہ اٹھائے، وہ پسینے میں بھیگا تھا۔ ”چلو۔ گھر چلیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ایک جالی دار تھیلا اٹھالیا جس میں ماریل سے ماریل بھرے تھے۔

”بابا۔“ دونوں درختوں کے درمیان سے گزرتے پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے جب اس نے پکارا۔ مراد نے قدم اٹھاتے ہوئے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ ”کیا؟“

”تمہاری چابی تیار ہو جائے گی تو ہم خزانے کے مالک بن جائیں گے کیا؟“

”میں نے کہا تھا، میں یہ ذکر نہیں سننا چاہتا۔“ مراد کے ابرو بھنج گئے۔

”مگر گاؤں کے لوگ...“

”کوئی اور بات کرو تالیہ۔“ اس نے خفگی سے گھر کا تو وہ چپ ہو گئی۔ تھیلا کندھے پہ لا دے چلتی گئی۔ سر خفگی سے خوب خوب جھکالیا۔

”کیا تم کل شکار پہ چلو گی میرے ساتھ؟“ کچھ دیر بعد اس نے نرمی سے پکارا۔

”نہیں۔“ وہ نرموٹھے پن سے قدم اٹھاتی رہی۔ اونچے درختوں کے درمیان گیلی زمین پہ وہ چلتے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی جنگل ہو۔

درختوں کے اوپر آسمان پہ سورج ڈوبتا دکھائی دیتا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کو تھا۔

”ادھر سے مڑ جاؤ۔“ وہ اپنی دھن میں آگے چلتی جا رہی تھی۔ مراد نے شانے سے پکڑ کے موڑا تو وہ چونکی۔

”ہم نے اس طرف نہیں جانا؟“

”نہیں بے وقوف ہم دوسری طرف سے آئے تھے۔“

”جنگل میں سارے راستے ایک سے ہیں بابا۔ تمہیں راستہ کیسے مل جاتا ہے؟“ وہ ناراضی بھول کے پوچھنے لگی۔

”کیونکہ میں زمین کو نہیں دیکھتا۔ آسمان کو دیکھتا ہوں۔ راستہ اوپر دیکھنے والوں کو ہی آسانی سے ملتا ہے۔ وہ دیکھو۔“ اس نے درختوں

سے دور اوپر انگلی اٹھائی تو لڑکی سر اٹھا کے دیکھنے لگی۔

”وہ تارہ... اس کو دائیں ہاتھ رکھو گی اور سیدھ میں چلتی جاؤ گی تو ہم گاؤں پہنچ جائیں گے۔ غور سے دیکھو۔“

”میرے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے بابا۔ تمہیں راستہ معلوم تو ہے۔“ وہ لا پرواہی سے کندھے اچکاتی سامنے دیکھ کے چلنے لگی۔

”میں تمہیں سکھانا چاہ رہا ہوں بیٹے... اگر کبھی کھوجاؤ... جنگل میں یا کسی دور کی جگہ پہ تو اس ستارے کو... غور سے دیکھو۔“ اس نے

زبردستی اس کا سر اٹھایا تو وہ اوپر دیکھنے لگی۔

”اس کو دائیں ہاتھ رکھو اور یوں سیدھ میں چلتی رہو۔ کسی راہ گیر، کسی مسافر، کسی کی مت ماننا۔ صرف اپنے باپا کی بات یاد رکھنا۔ اور صرف اس تارے پہ بھروسہ کرنا۔“ منظر مدھم پڑتا گیا۔۔۔ بوجھ سا بڑھتا گیا تو اس نے بے اختیار لاکٹ فوج اتارا۔

”آپ کی منزل آگئی، میم!“ ڈرائیور دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ وہ کوالا پور کی چمکتی، جاگتی رات میں واپس آ چکی تھی۔

جھرجھری سی لے کر اس نے سر جھٹکا اور سنبھل کے اتری۔ سامنے حالم کا اونچا بنگلہ کھڑا تھا۔

اور کوئی وہاں اس کے انتظار میں موجود تھا۔

☆☆=====☆☆

فاتح پارٹی سے آتے ہی اپنی اسٹڈی میں چلا گیا تھا، جبکہ عصرہ گھر کے بیرونی پورچ میں کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ خاموشی سے ایڈم کو دیکھ رہی تھی جو تابعداری سے بتا رہا تھا۔

”چے تالیہ نے اپنی کار کی چابیاں دی ہیں۔ ان کے گھر ڈراپ کر آؤں کار؟“

”ہوں۔ کر آؤ۔ اور سنو۔“ آہستہ سے بولی۔ ”مگر فاتح کو بالکل پسند نہیں کہ اس کا باڈی مین دوسری امیر خواتین کا پوڈل (پالتو کتا) بن جائے۔ اگر کوئی پوچھے تو کہنا، تالیہ خود لے گئی تھی کار۔ تمہاری جاب کے دو دن رہ گئے ہیں فاتح سے ڈانٹ نہ کھاؤ تو اچھا ہے۔“

”میں خاموش رہوں گا، میڈم!“ ایڈم نے سمجھداری سے تسلیم خم کیا تو عصرہ نے ہاتھ سے برخاست ہونے کا اشارہ کیا۔

اوپر وان فاتح اپنی اسٹڈی میں بیٹھ لیا۔ ٹاپ پہ کچھ ٹاپ کر رہا تھا۔ کوٹ اتار چکا تھا اور استیو کے کف موڑ رکھے تھے۔ آنکھوں پہ عینک لگی تھی اور نظریں اسکرین پہ جمی تھیں۔

موبائل بار بار بج رہا تھا جس کو وہ نظر انداز کر رہا تھا۔ بالآخر ٹنگ آ کے اس نے اٹھالیا۔

دوستوں، عزیزوں کے ایک ساتھ پیغامات آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے چونک کے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج چکے تھے۔ نیا دن شروع ہو گیا تھا۔

”آریانہ نہت فاتح کی یاد میں۔“

”خدا کرے آپ کی بیٹی جو آج کے روز چھ سال پہلے کھوئی تھی، کسی اچھے گھرانے کو مل گئی ہو۔“

”آریانہ جہاں بھی ہو اللہ اسے خوش رکھے اور آپ سے دوبارہ ملا دے۔“

وہ سب آریانہ کے نام کے پیغامات تھے۔ دعائیں۔ گڈ لک میسجز۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ پڑھتا گیا۔ چند ایک کو شکریہ لکھ کے بھیجا۔

پھر ایک دم دل ایسا اداس ہوا کہ اس نے عینک اتار دی اور ٹیک لگالی۔ بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر کے پیچھے رکھ لیا۔ مسکراتی غمزہ نگاہیں

سامنے دروازے پہ جمی تھیں۔ سفید نکھرا نکھرا سا دروازہ... جیسے سفید دودھیا لباس ہو... کسی پری جیسا....

”میرا کریڈٹ کارڈ!“ وہ دونوں ہال میں اوپر تک جاتی کرسیوں کے وسط میں بیٹھے تھے جب فاتح نے اسٹیج کو دیکھتے ہوئے ہتھیلی اس کی طرف پھیلائی۔ ساتھ بیٹھی آریانہ نے جھٹ سے کارڈ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ ہیر بینڈ لگائے وہ خوش اور پر جوش نظر آتی تھی۔

ان کی نشستیں اندھیرے میں تھیں۔ روشنی اسٹیج پہ تھی۔ جہاں ڈرامے کا ایکٹ جاری تھا۔ کردار اپنے اپنے مکالمے بول رہے تھے۔
 ”ان میں سے تاشہ آگاپووا کون ہے؟“ اس نے آریانہ کی طرف جھک کے سرگوشی میں پوچھا۔ وہ جو ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ رکھے دلچسپی سے اسٹیج پر فارمنس دیکھ رہی تھی مداخلت پہ بد مزہ ہوئی اور خفگی سے نگاہیں موڑیں۔

”آپ کو ابھی تک کہانی نہیں سمجھ آئی، ڈیڈ۔“

”مجھے فلشن بور کرتا ہے بیٹا۔“ وہ بے بسی سے شانے اچکا کے بولا۔ آریانہ نے افسوس سے گہری سانس لی۔

”جو لوگ جادوئی چیزوں پہ یقین نہیں رکھتے ان کی زندگی میں کبھی جادو آتا ہی نہیں ہے، ڈیڈ!“

”یہ تم نے خود سے کہا؟“

”اگر آپ اسٹوریز پڑھتے تو آپ کو پتہ ہوتا کہ یہ کس نے کہا تھا۔“ خفگی سے کہہ کر بتانے لگی۔ ”یہ ایک پلے ہے۔ رشین پلے۔ اس

میں ایک پری ہے تاشہ آگاپووا۔“

”وہ کالے کپڑوں والی؟“

”وہ اس کا گارڈ ہے ڈیڈ اور اس کی مونچھیں بھی ہیں۔ تاشہ سفید کپڑوں والی ہے۔“ آریانہ رو ہانسی ہوئی۔

”اچھا ٹھیک... آگے؟“ بظاہر سمجھتے ہوئے اس نے اسٹیج پہ کھڑی لڑکی کو دیکھا جس کے لمبے سنہرے بالوں پہ تاج رکھا تھا اور سفید میکی

پاؤں تک آتی تھی۔ وہ گردن کڑائے کھڑی اپنے قدموں میں جھکے شخص کی بات نخوت سے سن رہی تھی۔

”تاشہ ایک رحم دل پری ہے جو دوسروں کی مدد کے لئے دنیا میں آئی ہے۔“

”مجھے تو یہ کوئی مغرور اور خشک عورت لگ رہی ہے۔ بورنگ پرینی وومن۔“ ابرو اٹھا کے تبصرہ کیا پھر آریانہ کا چہرہ دیکھا تو سنبھلا۔ ”میں

ویسے ہی ایک بات کر رہا تھا۔“

مگر آریانہ مزید کہانی سنانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ہونہہ کر کے سامنے دیکھنے لگی۔ کوئی جدید طرز کی فیوری ٹیل جس کو دکھانے وہ باپ کو

اس کی سالگرہ کے دن کھینچ کے تھمیر لاتی تھی۔

آریانہ کی ناراضی تھوڑی دیر برقرار رہی پھر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھی اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ ایک موقع پہ اس نے جوش سے

فاتح کی کلائی دبائی۔

”تاشہ کتنی پیاری ہے، ڈیڈ۔“ وہ اس گوری گلابی پھولے گالوں والی لڑکی سے نظریں ہی نہیں ہٹا پارہی تھی۔

”میں اس ہاتھ سے لکھتا ہوں، بیٹے۔“ اس نے کراہ کے ہاتھ پیچھے کھینچا۔

”ڈیڈ، مجھے تا شہ کا آٹو گراف لینا ہے۔ جیسے ہی شو ختم ہوگا، آپ مجھے اس کے پاس لے کر جائیں گے۔“ فاتح نے بے اختیار جھرجھری لی

”میں نے آج تک کسی کا آٹو گراف نہیں لیا۔ اس لئے خاموشی سے بیٹھو۔“

”اچھا نوٹو تو لینے دیں۔“ وہ اپنی سیٹ پہ اوپر نیچے اچھلتی دبی آواز میں منت کر رہی تھی۔ اوپر نیچے بیٹھے لوگ گردنیں موڑ کے دیکھنے لگے۔

”بے بی اگر تم یونہی بولتی رہو گی تو ان بے چاروں کے ڈائلاگ مس کر دو گی۔“

آریانہ چونکی۔ پھر فوراً سیدھی ہوئی اور سب بھول بھال کے سامنے دیکھنے لگی۔

پھر کتنے ہی دن وہ تا شہ آگاپووا کی باتیں کرتی رہی۔ آریانہ یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ تا شہ کوئی انسان تھی۔ اس کے نزدیک وہ کوئی پری تھی۔

آریانہ فیری ٹیلڈ میں رہنے والی پیاری سی ننھی بچی تھی جس کی خواہش تھی کہ وہ خود بھی کسی فیری ٹیل کا کردار بن کے کتابوں میں چلی

جائے۔ فاتح اس کو تا شہ سے ملوانے نہیں لے کر گیا، اس بات پہ کتنے دن آریانہ نے اس سے ٹھیک سے بات نہیں کی۔

وہ ممبر پارلیمنٹ تھا۔ لوگ اس سے ہاتھ ملانے دیوانہ وار قطاروں میں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ کسی عام سی اداکارہ کے پیچھے جاتا اپنی

بیٹی کے ساتھ؟ نان سینس۔

مگر آریانہ کا جنون ختم نہیں ہوتا تھا۔ عصرہ نے بھی اس سے شکایت کی، پھر اگلے ہفتے وہ اسے دوبارہ تا شہ آگاپووا کی نمائش پہ لے گیا۔ مگر

اس دفعہ ڈرامے میں جہاں دوسرے تمام اداکار وہی تھے، تا شہ کا کردار کرنے والی لڑکی کوئی اور تھی۔

آریانہ کو مزہ نہیں آیا۔ وہ واپسی پہ منتظم کو روک کے پوچھنے لگی۔ ”بچھلی دفعہ تو تا شہ کوئی اور لڑکی بنی تھی۔ وہ لڑکی کہاں ہے؟“

”ہماری ایکٹرس میڈم روز کی کا خراب ہو گئی تھی، وہ آ نہیں سکی تھیں، تو ہم نے جلدی میں ایک ایکسٹرا سے یہ رول کروایا تھا۔“

آریانہ مزید ادا اس ہو گئی۔ ”تو کیا وہ دوبارہ نہیں آئے گی؟“

”نہیں۔ میں تو اس کا نام بھی ٹھیک سے نہیں جانتا۔ ایک ہی دن آئی اور پھر غائب بھی ہو گئی۔“

وہ آریانہ کو وہاں سے لے آیا مگر اس نے سارا راستہ فاتح سے بحث کی کہ وہ اصلی پری تھی۔

”اوکے۔ مجھے کنوینس کرو کہ وہ اصلی پری کس طرح تھی؟“ کارڈرائیو کرتے ہوئے فاتح نے کھلے دل سے پوچھا تو وہ جوش میں تیز تیز

بولتی گئی۔

”کیونکہ وہ غائب ہو گئی۔ یعنی وہ اڑ گئی ہوگی۔ اور وہ اتنی پیاری تھی ڈیڈ کہ وہ کسی پریوں کی وادی سے آئی ہوئی ہی لگتی تھی۔ کسی کو اس کا نام

تک نہیں معلوم۔“

”میں پتہ ہے کیا سوچ رہا ہوں۔“ وہ تھوڑی کو دونا خنوں سے رگڑتے ہوئے بولا۔ ”اصلی اداکارائیں کبھی پرفارمنس مس نہیں کرتیں۔“

لیکن پچھلے ہفتے اصل ایکٹرس نہیں آسکی کیونکہ اس کی کار خراب ہو گئی تھی! عجیب۔ مجھے لگتا ہے یہ کوئی اداکارہ بننے کی خواہش مند لڑکی تھی جس نے اصل اداکارہ کو کسی مشکل میں پھنسا کے آنے سے روکا ہوا اور خود رول لینے پہنچ گئی ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے وہ پری نہیں تھی؟“ وہ برامان کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے وہ کوئی فراڈ تھی جو کسی دوسرے کی جگہ ناجائز طریقے سے ہتھیا نے جارہی تھی۔“ آریانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”ہر کوئی آپ کے ان... ان politicians جیسا نہیں ہوتا، ڈیڈ۔“ وہ منہ پھلا کے رخ پھیر کے بیٹھ گئی اور فاتح نے گہری سانس لی۔

”میں سچ بولوں بیٹا تو تمہیں برا لگتا ہے مگر وہ کوئی پری نہیں تھی۔“

”پھر وہ شہزادی تھی۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔“

چند ہفتوں بعد آریانہ اس کو بھول بھال گئی... مگر وہ چہرہ... اور وہ نام فاتح کی یادداشت میں فیڈ ہو چکا تھا۔ سنہرے بالوں والی تاشہ آگاپووا۔ ایک دفعہ وہ ان فاتح سے کسی کا تعارف ہو جائے اور کسی کا کوئی امپریشن بن جائے تو وہ اسے کبھی نہیں بھولتا تھا۔

اور جس لمحے اس نے عصرہ کی گیلری میں اس لڑکی کو دیکھا، وہ اسے پہچان گیا تھا۔ وہ پہلے سے دہلی پتلی اور گروڈنگ رہی تھی مگر وہ اللہ یہ وہی تھی۔ پھر اس نے سنا ایڈم نے اس سے بدتمیزی کی ہے۔ ایڈم کا خیال تھا کہ وہ تنگو کامل کے گھر کی نوکرانی کی طرح لگتی تھی۔ یہ بات ایڈم کو کسی نے پوری بولنے نہیں دی مگر فاتح سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے تنگو کامل کی نوکرانی کو نہیں دیکھا تھا، شاید چند سیکنڈ کے لئے کوئی نوکرانی اندر آئی تھی مگر اس کے کندھے کے پیچھے سر جھکائے کھڑی رہی تھی۔ وہ ایڈم کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا، نہ ہی عصرہ نے وہ نوکرانی دیکھی تھی مگر اس کے دل میں موجود اس لڑکی کے لئے لکھا ”فراڈ“ کا لفظ مزید گہرا نقش ہو گیا تھا۔

کچھ غلط تھا اس لڑکی میں۔ کچھ ہراسرار۔ کچھ اچھوتا۔

”وہ پری ہے، ڈیڈ۔ یا پھر کوئی شہزادی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں!“ آریانہ چپکے سے کان میں بولی تو وہ سوگوار بیت سے مسکرا دیا۔ ماضی غائب ہو گیا تھا اور وہ اپنی اسٹڈی میں تنہا بیٹھا تھا.....

موبائل پہ آریانہ کے لئے پیغامات بنوز آرہے تھے۔ اس نے پھر سے عینک لگائی اور ان کو پڑھنے لگا۔

☆☆=====☆☆

اشعر محمود کے اونچے قلعے کے لان میں کیٹرنگ والے چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ صفائی جاری و ساری تھی۔ قلعے کے اندر آؤ تو گول لاؤنج میں وہ صوفے پہ بیٹھا تھا۔ ٹانگیں قینچی صورت میز پہ رکھی تھیں اور ٹائی ڈھیلی کر رکھی تھی۔ ہاتھ میں موبائل تھا جس پہ وہ فاتح کو پیغام لکھ رہا تھا

”آریانہ کو اللہ آپ سے دوبارہ ملا دے۔ آمین۔“ پیغام جانے کے چند لمحے بعد ہی جواب موصول ہوا..... ”شکریہ ایش!“

اشعر نے موبائل پرے ڈالا اور گردن اٹھا کے اوپر جگر جگر کرتا فون دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”بابا... کاش آپ یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ ہوتے۔“ تلخی سے وہ بڑبڑایا تھا.....

فانوس کی روشنی سارے لاؤنچ کوروشن کیے ہوئے تھی۔ اونچی دیواروں پہ خوبصورت بڑی بڑی سی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ قیمتی لمبے صوفے، مٹھلیں نفیس پردے... اس سارے عشرت کدے میں وہ تنہا صوفے پہ نیم دراز تھا....

کبھی اس طرح اس کے باپا یہاں بیٹھے ہوتے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو جھم سے سارا منظر سامنے آ گیا....

وہ سامنے والے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ قدرے بے چین اور غیر آرام دہ سا۔ اور ایک چینی نقوش اور صاف رنگت والے صاحب بڑے صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پہ برہمی تھی۔

”کب تک تم فاتح کے غلام بنے رہو گے؟“

”میں ان کا غلام نہیں ہوں باپا!“ وہ برا مان کے بولا۔ ”میں ان کا کیمپین مینیجر اور پولیٹیکل سیکرٹری ہوں۔ میں ان کو الیکشن جتوانا چاہتا ہوں تاکہ....“

”اور کب تک تم یہ سب کر سکو گے ایش؟“ وہ ناگواری سے کہہ رہے تھے۔ ”تمہارا اپنا بزنس ہے اس کو تمہارا وقت چاہیے۔ تمہاری ایک زندگی ہے۔ کل کو شادی کرو گے۔ کیا تب بھی فاتح کے پیچھے پیچھے ڈامری لئے پھرتے رہو گے؟“

”آجنگ ایک کاز (مقصد) لے کر نکلا ہے اور میں ملایشیاء کے لئے....“

”تمہارا آجنگ بادشاہ آدمی ہے۔ بے نیاز اور بے فکر۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر تم اس کے لئے اپنے کئی سال لگا بھی دو وہ تب بھی اقتدار میں آ کر تمہارے لئے کچھ نہیں کرے گا۔ ایش میرے بیٹے تمہیں اس شخص سے کوئی بدلہ نہیں ملے گا۔“ ان کی آواز دھیمی ہوئی۔ آنکھوں میں اس کے لئے ہمدردی اور فکر مندی تھی۔ اشعر کا دل دکھنے لگا۔

”میں صرف ملایشیاء کے لوگوں کے لئے یہ کر رہا ہوں ڈیڈ۔ مجھے اپنے ملک سے بہت محبت ہے....“

”تم ملایشیاء کو ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہو جو اتنے برس باہر رہا۔ اسے ہم سے زیادہ ملایشیاء سے محبت نہیں ہے ایش۔“

”میں آجنگ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ باریسن نیشنل میری زندگی ہے۔“ وہ تڑپ اٹھا۔ ”میں ہمیشہ باریسن نیشنل سے منسلک رہنا چاہتا ہوں۔“

”ایک کیمپین مینیجر کی طرح؟ ایک پولیٹیکل سیکرٹری کی طرح؟ یا کسی بڑے درندے کی طرح؟“

اشعر چونکا۔ ”بڑا درندہ؟“

”مگر تمہیں اس گندے سمندر میں رہنا ہے تو رہو۔ شوق سے رہو۔ لیکن مچھلی بن کے رہنا ہے یا مگر مچھ بن کے اس کا فیصلہ تمہیں ابھی کرنا ہو گا۔ تم فاتح سے کم نہیں ہو۔ تم نے اس کی کچھلی کیمپین بھی چلائی اور اب وہ دوسری دفعہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے جا رہا ہے۔ پانچ سال بعد وہ وزیر اعظم بننے کا سوچے گا اور تم کہاں ہو گے؟ اس کے پیچھے ڈامری اٹھا کے گھوم رہے ہو گے کیا؟“

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”تم بھی اس دفعہ انکیشن لڑو۔ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہو۔ پھر تم پہ نئے مواقع اور نئے راستے کھلیں گے۔ تم فاتح کی مدد کرتے رہو، مگر اپنے لئے بھی راستے ہموار کرو۔ فاتح تمہیں کچھ نہیں دے گا۔ اس کو کل کو کوئی بہتر سیکرٹری مل گیا تو وہ ایک منٹ میں تمہیں نکال باہر کرے گا لیکن اگر تم ممبر پارلیمنٹ بن جاؤ تو تمہیں کوئی آسانی سے نکال نہیں سکتا۔“

”میں؟“ وہ حیران رہ گیا۔ ”مجھے کون ووٹ دے گا؟“

باپا نے ناگ سے ناگ ہٹائی اور آگے کو جھک کے بیٹھے۔ ”وان فاتح کو کس نے پچھلا انکیشن جتوایا تھا؟ تمہاری محنت نے اور عصرہ کی سپورٹ نے۔ اگر تم اس کے لئے یہ کر سکتے ہو تو اپنے لئے کیا نہیں کر سکتے؟“

فانوس ابھی تک جگر جگر کر رہا تھا۔ اس کی روشنی میں کھویا اشعر شاید مزید ماضی میں رہتا مگر اس کا موبائل بجنے لگا۔ چونک کے وہ سیدھا ہوا اور موبائل اٹھالیا۔

”جی کا کا۔“

”میں فاتح کے لاکر سے فائل نکالنے جا رہی ہوں۔ وہ اسٹڈی میں ہے، اسے علم نہیں ہوگا۔“ وہ دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”تم اسٹریٹ کے کارنر پہ آ جاؤ میں فائل تمہیں دے دوں گی۔“

”میں خود نہیں آؤں گا، رملی کو بھیجوں گا۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاں یہ بہتر رہے گا۔“ اشعر نے مسکرا کے فون بند کیا اور ٹی وی ریموٹ اٹھا کے بٹن دبایا۔ دیوار پہ لگی جناتی اسکرین جل اٹھی۔ اشعر نے چند چینل بدلے اور پھر ایک پہ ٹھہرا۔

”اشعر محمود کی نسل پرست چینی مخالف تنظیم سے وابستگی نے چینی حلقوں میں مایوسی اور بد نظمی کی ہر پیدا کی ہے...“ سنکر آگے کو جھکے، آواز کو سنگین بنا کے بتا رہی تھی۔ اشعر کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے فون اٹھایا اور ٹویٹر کھولا۔ اس کے نام کے مخالف ٹرینڈ چل رہے تھے۔ لوگ اسے گالیاں نکال رہے تھے۔

”وان فاتح... میں بر چیز کے لئے تیار تھا... آپ نہیں تھے... چند دن بعد کا کا کی نیلامی پہ نقلی پینٹنگ کا اسکیئنڈل جہاں آپ کی کریڈیبلٹی تباہ کرے گا وہیں مکان کے اصلی کاغذات کی گمشدگی آپ کو مالی دھچکا لگائے گی۔“ موبائل کے بٹن دباتے ہوئے وہ بڑبڑا رہا تھا۔

”مگر اس سے پہلے... اپنے خلاف ہوئے سارے پراپیگنڈے کو میں اس ایک تصویر سے قتل کرنے جا رہا ہوں۔ اس ایک تصویر کی دھوم اور ہائپ میں بر شے دب جائے گی۔ کسی خبر قتل کرنے کے لئے اس کی وضاحتیں دینا ضروری نہیں ہے صرف اس سے زیادہ دلچسپ خبر لوگوں کو دینا ہوتا ہے۔“

ایک بٹن دبایا اور... تصویر ٹویٹ ہو گئی۔ مسکرا کے اشعر نے فون پرے ڈال دیا۔ اس نے فاتح کا دیا دھچکا بینڈل کر لیا تھا۔ کیا فاتح اس کا دیا دھچکا بینڈل کر پائے گا؟

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پر رات دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ عصرہ نے ٹرے اٹھائے اسٹڈی کا دروازہ کھولا تو وہ ٹیک لگائے عینک آنکھوں پہ جمائے مسکرا کے موبائل پہ ٹائپ کرنا دکھائی دیا تھا۔

”تمہاری بیڈ ٹائم چائے۔“ زبردستی مسکراتی وہ قریب آئی اور میز پہ کپ رکھا۔ کانچ میز کی سطح کے شیشے سے ٹکرایا تو خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ارتعاش اس کی انگلیوں میں بھی تھا جسے اس نے منھیاں باہم پھنسا کے چھپالیا۔ وہ احتیاط سے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

”جلدی سو جانا۔ زیادہ دیر کام نہ کرنا۔“ اسے متوجہ نہ پا کر وہ بولی۔ وہ مسکرا کے میسر دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی پھر مڑی۔

”تھینک یو عصرہ۔ امریکہ جانے کا خیال بدلنے کے لئے۔“

عصرہ کے لبوں پہ سوگوار مسکراہٹ ابھری۔ گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ اب بھی موبائل پہ ٹائپ کر رہا تھا۔

”جو تم چاہو فاتح۔ میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔“

فاتح نے نظریں فون پہ جھکائے مسکرا کے سر کو خم دیا۔

عصرہ وہاں سے نکل آئی۔ اب اس کے قدم تیز تھے۔ لاؤنج میں آ کر ایک نظری سی ٹی وی کیمرے کو دیکھا جو وہ بند کر چکی تھی۔ پھر تیزی سے فاتح کے کمرے میں آئی اور الماری کھولی۔ لاکر کا پاسور ڈوبایا اور اندر کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگی۔ ایک پورٹوفولڈر نکالا اور لا کر بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ سر پہ شال اوڑھے پیروں میں جوگرز پہنے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ رات کو دو گارڈز ہی گیٹ پہ ہوتے تھے۔

”میں واک پہ جا رہی ہوں۔“ وہ اکثر رات کو واک پہ نکل جاتی تھی۔ گارڈز نے صرف سر ہلا دیا۔ وہ فائل شال میں چھپائے سینے پہ بازو لپیٹے تیز تیز چلتی گئی۔

اگلی اسٹریٹ کے کونے پہ رلی کار میں موجود تھا۔ وہ فوراً باہر نکلا۔ عصرہ نے شال سے فائل نکال کے اس کو دی اور کچھ کہے بنا مڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ گھر میں واپس داخل ہو رہی تھی۔

”آپ جلدی آگئیں۔“ گارڈ نے دروازہ بند کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شوگر لو ہو رہا تھا۔“ اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھ کے فکر مندی سے کہا۔ ”مگر فاتح کو میری طبیعت کا مت بتانا۔ اس کے دوسرے مسئلے کم ہیں کیا۔ میں دوا لے لیتی ہوں۔“ گارڈز نے سر تسلیم خم کیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

فاتح بے خبر ابھی تک اوپر اسٹڈی میں موبائل ہاتھ میں لئے سوگوار بیت بھری مسکراہٹ سے پیغامات کا جواب دے رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

حالم کے اونچے گھر کی بیرونی بتیاں روشن تھیں جب باہر سڑک پہ سپر لکس کیب آرکی۔ شو فر نے دروازہ کھولا تو تالیہ مراد نے اونچی سفید

”ڈونٹ وری۔ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ تم بتاؤ، یہ اشعر نے کیا ٹوئیٹ کیا ہے؟ ابھی کسی نے مجھے بتایا۔“ اس نے سمجھ کا ذکر نہیں کیا تا کہ داتن پریشان نہ ہو۔

”تم نے نہیں دیکھا؟ ساری دنیا نے دیکھ لیا۔ میں کہتی تھی نا، یہ اشعر کسی اور چکر میں ہے۔“ کہہ کے داتن نے موبائل پہ بٹن دبائے اور اسکرین سامنے کی۔

”فیمیلی یونین“ لکھ کے اس نے ایک تصویر پوسٹ کی تھی۔ کھانا کھاتے وقت کی سیٹھی جو اشعر نے لی تھی اور فریم میں چار لوگ نظر آ رہے تھے۔ اشعر عصرہ فاتح اور تالیہ۔ سرخ لباس میں مسکراتی ہوئی خوبصورت تالیہ جو نیچے کمٹنس کا مرکز تھی۔

”یا اللہ۔ اس نے میرا چہرہ مشہور کر دیا۔“ اس نے پیشانی چھوئی۔

”ہمارے بہت سے جاننے والے یہ دیکھیں گے تالیہ۔ یہ سب غلط ہو رہا ہے۔“

”میں سب کو سنبھال لوں گی۔ بے فکر رہو۔ ویسے بھی یہ میری آخری وار دات ہے۔“

”لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ اشعر محمود کی منگیتر ہے اور وہ تردید نہیں کر رہا۔“ داتن نے اسے تصویر کی سگینی کا احساس دلانا چاہا۔ ”تصویر وائرل ہو گئی ہے اور صبح سے جسے چینوں نے بند قوں کی زد میں رکھا ہوا تھا اب سارا ملک اس کا میکہ بنا بیٹھا ہے۔“

تالیہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ”وہ مجھے پسند نہیں کرتا داتن۔ وہ خبروں میں رہنے کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میں بھی بدلہ لے آئی ہوں۔“ پرس کھول کے بٹن کیمرہ نکال کے دکھایا۔ ”یہ وائی فائی سے جڑا ہوا نہیں تھا، سو اس پہ جو بھی فوج فاتح کے سیکرٹری نے بنائی ہے وہ اب میرے پاس ہے۔“ داتن نے اسے گھورا۔

”تم اتنی بے فکر کیوں ہو اشعر کی طرف سے؟ کہیں تم اسے پسند تو نہیں.....“

”کموٹی مرغی.... کان کھول کے سنو.... اشعر محمود اگر سمجھ کا پاس ہے تو وہ ان منی لائڈرز کا سربراہ ہے جنہوں نے مجھے انیئر پورٹ پہ رلنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کو کبھی پسند نہیں کر سکتی۔“ تیزی سے کہہ کے پرس سے ایک کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھلایا۔

”تمہارے پاس نیچے میرے لاکر روم میں تمام مشینیں موجود ہیں نا۔ پرنٹنگ وغیرہ کی۔“

”ہاں۔“ داتن نے الجھ کے اس کے کارڈ کو دیکھا جو پولیس آئی ڈی تھی اور اس پہ ساشا کمال لکھا تھا۔

”ساشا کو تاشہ کرو۔ ابھی۔ اسی وقت۔“

”تاشہ؟ وہ جو فاتح تمہیں کہتا ہے۔“

”ہاں۔ یاد ہے وہ پلے تاشہ آگاپو وا جس میں میں نے حصہ لیا تھا؟ اور ڈائریکٹر کے لاکر سے بانڈز چرا کے نقلی رکھ دیے تھے؟ وہ آریانہ کے ساتھ اس پلے کو دیکھتے تھے میٹر گیا تھا اس لئے اس نے مجھے پہچان لیا۔“

”اُف تالیہ۔ اس کو شک تو نہیں ہوا کہ تم فراڈ ہو؟“

”بہت سی امیر لڑکیاں تھیٹر میں شوقیہ اداکاری کرتی ہیں۔ پوچھے گا تو کہہ دوں گی، شوقیہ کام کیا تھا۔“
”مگر.....“

”مگر مگر کچھ نہیں کیونکہ میں اس چیز کا فائدہ اٹھانے جا رہی ہوں۔ تالیہ کے پاس... ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“ مسکرا کے وہ اٹھی، شال کندھوں کے گرد لپیٹی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

قریباً پون گھنٹے بعد وہ اپنے باغیچے کے بیچ پہ ناگ پہ ناگ جمائے بیٹھی نظر آرہی تھی۔ کارڈ اس کی گود میں رکھا تھا۔ برنی جیسی آنکھیں باہر سڑک پہ جچی تھیں جو گیٹ کے جنگلے سے صاف دکھائی دیتی تھی۔

ایڈم اس کی کار سیدھی اندر لے آیا کیونکہ گیٹ کھلا تھا۔ پھر اتر کے اس کے سامنے آیا۔ ادب سے چابی بڑھائی۔
”چے تالیہ۔ آپ کی کار۔“

”ہینھو ایڈم! شہزادی کے سے انداز میں اشارہ کیا۔ وہ متذبذب سانچ کے پر لے کنارے پہ بیٹھ گیا۔ آگے کو ہوئے۔

”تم مجھے کوئی قاتل چور یا جاسوس سمجھتے ہو؟“ وہ کہنی بیچ کی پشت پہ جمائے اس کی طرف گھوم کے بیٹھی اور مسکرا کے گویا ہوئی۔

”میں نے آپ کو ایک گھر میں نوکرانی بن کے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھے اور کیا سمجھنا چاہیے۔“

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ بہر حال میں ایک انڈر کور پولیس آفیسر ہوں اور مجھے وان فاتح کی حفاظت کا ناسک دیا گیا ہے۔“ اعتماد سے گردن کڑائے وہ بولی تو ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔

”واقعی؟“ وہ ٹھٹھکا۔ ”مگر میں کیسے مان لوں۔“

”تم وان فاتح سے پوچھ سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں جج بتا دیں، ہو سکتا ہے وہ تم پہ اتنا اعتماد نہ کریں۔ لیکن کیا تم نے نوٹ نہیں کیا کہ وہ مجھے تاشہ کہتے ہیں۔“

”جی۔ میں نے نوٹ کیا ہے۔“ وہ چونکا۔

”تاشہ کمال۔ رائل ملیشیا پولیس!“ اس نے شان بے نیازی سے کارڈ دو انگلیوں میں پکڑ کے اس کی طرف بڑھایا۔ ایڈم نے اسے تھاما۔ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ پھر ذرا پیچھے ہو کے بیٹھا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”یعنی باس جانتے ہیں کہ آپ....“

”آف کورس وہ جانتے ہیں۔ میری جاب ہی ان کے قریب موجود لوگوں پہ نظر رکھنا ہے کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ وان فاتح کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔“

ایڈم نے گہری سانس لی۔ ”میں جانتا ہوں۔“

”تو یقیناً تم جانتے ہو گے کہ پچھلے ماہ لنکاوی جزیرے پہ کیا ہوا تھا؟ اور تین ماہ قبل سنگا پور میں کس طرح وان فاتح کو دھمکانے کی کوشش

کی گئی تھی؟“

ایڈم چونکا۔ ”نہیں... کیا ہوا تھا؟“ تالیہ نے ”اوہ“ میں لب سکیڑے۔

”اگر وان فاتح نے تمہیں نہیں بتایا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تم پہ بھروسہ نہیں کرتے، یعنی تم ان کے لئے ایک عارضی ملازم ہو۔ جس کو وہ فارغ ہو جانے کے بعد مس بھی نہیں کریں گے۔“

ایڈم کے چہرے پہ اداسی اتری۔ لمحے بھر کو چپ ہو گیا۔ ”پھر آپ مجھ پہ بھروسہ کیوں کر رہی ہیں؟“
 ”دو وجوہات ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم گھر والوں کے سامنے میرا کو blow کرو۔ میری تو یہ نوکری ہے، میں کسی دوسرے ناسک پہ لگا دی جاؤں گی، لیکن وان فاتح کے دشمن چوکنے ہو جائیں گے۔“
 ”اور دوسری وجہ؟“

”میں چاہتی ہوں تم میری مدد کرو۔ اشعر محمود فاتح صاحب کے خلاف جو اقدامات کرنے جا رہا ہے ان کو روکنے میں میرا ساتھ دو۔ اور میں ڈیپارٹمنٹ سے تمہیں اس کام کا پے چیک دلوا دوں گی۔“
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وان فاتح کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔“

”دیکھو ایڈم...“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”پولیس میں جب ہم سے اوپر والے ہمیں تنخواہ یا بونس دیتے ہیں تو اپنی جیب سے نہیں دیتے۔ قومی خزانے سے دیتے ہیں اور اس پہ ہمارا حق ہوتا ہے... تم کیوں آرام سے ملنے والے تمہیں چالیس ہزار ٹھکراؤ گے؟“
 ”تمہیں چالیس ہزار؟“ ایڈم محمد کی آنکھیں کھل گئیں۔ (سات آٹھ لاکھ پاکستانی روپے)
 ”جتنا بڑا آدمی اتنے زیادہ بونس۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ہم اشعر محمود کو پکڑ بھی لیں۔ اور ہاں، مجھے اس کے لئے تمہاری فائل اوپر بھیجی پڑے گی۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپروڈ بھی ہو جائے مگر میں تمہاری سفارش کروں گی۔“
 ”مگر آپ کیوں کریں گی میری سفارش؟“

تالیہ مسکرائی۔ ”کیونکہ ایک دن تم دنیا کے سارے بادشاہوں اور حکمرانوں سے زیادہ طاقتور بن جاؤ گے۔ میں نہیں چاہتی تب تم مجھے بھول جاؤ۔“

ایڈم جھینپ گیا۔ ”وہ تو بس ماں کو لگتا ہے کہ...“ خفت سے سر جھٹکا۔
 ”خیر... اب ہو سکتا ہے کہ تمہیں میری باتوں پہ یقین نہ آئے۔ تم مجھ پہ شک کرو، کہ شاید میں واقعی کوئی چور یا قاتل وغیرہ ہوں، تو ٹھیک ہے یہ تمہارا حق ہے۔ اب آگے تم چاہو تو وان فاتح سے پوچھ لو میرے بارے میں۔ مجھے نہیں معلوم وہ تم پہ کتنا بھروسہ کرتے ہیں، لیکن اپنی تسلی کے لئے تم...“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے آپ کی بات پہ بھروسہ ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں وان فاتح کے لئے

سب کر سکتا ہوں۔ لیکن....“ اس نے اعتراف کیا۔ ”مجھے واقعی پیسے بھی چاہیے ہیں۔ آپ بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا۔“
 ”اتنی جلدی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ مجھے بھی تو دیکھنا ہے کہ میں تم پہ پھر وسوسہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔“ ایڈم کے کندھے ڈھیلے پڑے۔
 ”اوکے۔ یعنی آپ مجھ پہ نظر رکھیں گی۔ ٹھیک ہے۔ جب آپ مناسب سمجھیں مجھے بتا دیجئے گا۔ میری جاب کا کل دسواں اور پرسوں گیارہواں دن ہے۔ پرسوں میری جاب ختم ہو جائے گی۔“

تالیہ اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھا۔ جتنا اس کے انداز میں رعب تھا اتنا ایڈم مودب نظر آتا تھا۔
 ”وان فاتح سے میں بات کر لوں گی۔ تمہارے گیارہ دن ابھی ختم نہیں ہوں گے ایڈم۔“
 ”اوکے!“ ایڈم نے سر کو خم دیا اور مسکرایا۔ پھر اجازت چاہی۔ دفعتاً کارکا۔
 ”تم کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟“

”میں.... مجھے اپنی مگلیتر کو....“ تذبذب سے الفاظ ادا کیے۔ ”تحفہ دینا ہے۔ کیا دینا چاہیے؟“ اگر وہ اس کی ڈھال نہ بنی ہوتی تو وہ نہ کہہ پاتا مگر اس ایک واقعے نے ایڈم کا دل اس کی طرف سے صاف کر دیا تھا۔ اور اب بھی وہ اتنے سادہ انداز میں سب بتائے دے رہی تھی کہ اسے اعتبار آئی گیا تھا۔

”تم کیا دینا چاہتے ہو؟“
 ”کوئی سونے کا زیور وغیرہ جیسا کہ مسز عصرہ نے کہا تھا۔ یا کوئی پرس، کپڑے۔“ وہ کنفیوژڈ نظر آتا تھا۔
 ”تحفے کی قیمت نہیں ہوتی ایڈم۔ وقعت ہوتی ہے۔ تم اس سے پوچھو کہ اس کو اس کے باپا نے کیا تحفہ دیا تھا ان اولین سالگرہوں پہ جو اس کو یاد ہیں؟ تم بچپن کے اس تحفے کو کسی نئی شکل میں دے دو۔ کوئی ناسٹیلجک سی قدیم شے جو اس کو خوشگوار ماضی کی یاد مستقبل میں بھی دلاتی ہے۔ باپ کا تحفہ لڑکیوں کو بہت عزیز ہوتا ہے۔“

ایڈم بالکل ٹھہر گیا۔ دل و دماغ جیسے منور ہو گیا تھا۔ آہستہ سے سر ہلایا۔ ”تھینک یو“ چہ تالیہ۔
 اس کے جانے کے بعد وہ اندر آئی تو داتن لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ تند نظروں سے اسے گھورتی۔
 ”اس کہانی کا کیا مقصد تھا؟“

”وقت حاصل کرنا۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی آگے آئی اور کانوں سے ایر رنگ اتارنے لگی۔ ”بہت سے اسٹیشنل فورس اہلکاروں کو اسی طرح سیاستدانوں کی حفاظت پہ مامور کیا جاتا ہے کہانی ٹھوس تھی۔“
 ”مگر اس نے فاتح سے پوچھ لیا تو؟“

”ظاہر ہے وہ پوچھے گا، لیکن فوراً نہیں۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ تاثر ڈالا ہے کہ فاتح کے لئے وہ اجنبی ہے۔ وہ کچھ عرصہ اس بات پہ غور کرے گا اور مجھے اتنا ہی وقت چاہیے۔ ایک یا دو دن۔ تب تک میں سکھ تلاش کر چکی ہوں گی۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا خزانہ۔“

اب وہ جھک کے جوتے اتار رہی تھی۔

”کوئی خزانہ نہیں ہے تالیہ۔“ داتن نے دکھا اور ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”خزانہ ہے داتن۔ اور وہ ہمارا ہے۔ صرف ہمارا۔“ وہ تیزی سے بولی جیسے خود کو بھی یقین دلایا ہو۔ داتن خاموش ہو گئی۔ باہر پھیلی رات کی طرح۔

☆☆=====☆☆

صبح صادق کی پہلی کرن کو الہ پور پہ پڑی تو جامنی اندھیرے میں ڈوبی اونچی عمارتیں مدھم مدھم سی روشن دکھائی دیں لگیں۔ عصرہ محمود اپنے نرم گرم بستر میں اسے کی ٹھنڈک بھرے کمرے میں لحاف تانے سو رہی تھی جب زور سے دروازہ کھلا۔

”عصرہ!“ فاتح کی آواز... اور اس کا تیزی سے جی جلانا۔ عصرہ کی آنکھیں فوراً کھلیں۔ تیز روشنی میں پہلے تو اس نے آنکھیں چندھیا لیں، پھر پلکیں جھپکیں۔ بصارت واضح ہوئی۔ سامنے فاتح کھڑا تھا۔ ٹراؤزر پہ ٹی شرٹ پہنے اس کے ابرو بھنچے ہوئے تھے اور چہرے پہ پریشانی تھی۔

”عصرہ تم نے میرا لاکھولا ہے کیا؟“

”نہیں۔ کیوں کیا ہوا؟“ وہ بال سمیٹتی، آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔

”ملا کہ والے گھر کی ساری فائلز کل صبح تک اس میں تھیں۔ اب نہیں ہیں۔“

”تم نے اچھی طرح دیکھا فاتح؟ کیا معلوم تم نے کہیں اور رکھ دی ہوں۔“ وہ بستر سے اتری اور سلپرز پہنے۔

”نہیں مجھے یاد ہے۔ اور میرا پاسورڈ بھی کسی کو نہیں معلوم سوائے مجھے اور تمہیں۔“

”تمہارا پاسورڈ بھی تو آریا نہ کی برتھ ڈے ہے۔ آسانی سے کوئی بھی گیس کر سکتا ہے۔ میں ملازموں سے پوچھتی ہوں۔“ اس نے بالوں کو پونی میں باندھا اور شال اٹھا کے کندھوں کے گرد لپیٹی۔

”تم فکر نہ کرو مل جائے گی۔“

”کیسے فکر نہ کروں اس فولڈر میں گھر کے اصل کاغذات ہی نہیں اس کے تاریخی ہونے کی مصدقہ دستاویزات بھی ہیں۔ مہینے لگ جائیں گے مجھے یہ دوبارہ بنوانے میں۔“ وہ دبی آواز میں بظاہر آرام سے کہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے چمکلتی پریشانی اور گردن کے پیچھے ہاتھ رکھا

.... وہ بے حد پریشان تھا۔

”تم نے ٹھیک سے دیکھا نہیں ہوگا۔ میں ڈھونڈ دیتی ہوں۔ ویسے بھی ملازموں میں سے کوئی ایسے نہیں کرے گا۔ ایڈم تو ہمارے ساتھ

کل پارٹی میں تھا اور دوسری میڈ بھی۔ شام کو گھر میں کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ تالیہ بھی کار لینے آئی تو کہہ رہی تھی کہ اسے چابی لاؤنج میں ڈھونڈنے

کے لئے کافی تنگ و دو کرنی پڑی کیونکہ میڈز نہیں تھیں۔“ وہ اس کے ساتھ باہر آتے ہوئے بتا رہی تھی اور فاتح رازمل ایک دم چونک کے

اسے دیکھنے لگا۔

”کون؟ وہ تالیہ؟ ادھر کیوں آئی تھی ہماری غیر موجودگی میں؟“

”اس کی کار یہاں کھڑی تھی نا فاتح۔ پھر مجھے اس کو اشعر کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ وہ اکتا کے کہتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ لا کر سامنے کھلا پڑا تھا اور کاغذات بیڈ پر رکھے تھے۔ عصرہ سلیقے سے چیزیں سمیٹنے لگی۔ ”اور تمہیں اتنی اچانک ملا کہ والے کاغذوں کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

مگر وہ بالکل ساکت چوکھٹ پہ کھڑا تھا۔ ذہن ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔

”وہ لڑکی.... صبح وہ میری اسٹڈی میں تھی.... پھر وہ ہمارے پیچھے ہمارے گھر میں پھرتی رہی اور آج میری فائل غائب ہو گئی۔“ اس کی رنگت سرخ پڑنے لگی۔ فائلیں الٹ پلٹ کرتی عصرہ نے چونک کے سر اٹھایا۔

”اوہو فاتح۔ مل جائے گی فائل۔ پھر تالیہ ایسا کیوں کرے گی۔ وہ تو اشعر....“

”اس کو تم سے متعارف کس نے کروایا تھا وہاں؟ ہم کیسے جانتے ہیں اس لڑکی کو؟“ اس نے تیزی سے سوال کیا جو عصرہ کے لئے غیر متوقع تھا مگر وہ محمود بن عزیز کی بیٹی تھی۔ اس کے ذہن نے فوراً سے جمع تفریق کی اور بہترین جواب سوچ لیا۔

”اشعر نے۔ وہ اس سے شاید پہلے سے واقف تھا۔ شاید وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”اور یہ ان دونوں کا کام ہے۔“ وہ کسی نیچے پہ پہنچ چکا تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ پھر جیسے سمجھ آیا تو ایک دم حیران نظر آئی۔ ”یا اللہ فاتح! اشعر ایسا کیوں کرے گا؟“

فاتح نے گہری سانس لی اور بہت سارا غصہ اندر دبا یا۔

”میں تمہارے بھائی کے بارے میں کوئی تبصرہ اس وقت نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے بتاؤ وہ لڑکی کہاں رہتی ہے۔“

”یہ تو اشعر کو پتہ ہوگا، مگر وہ ابھی میرا پور ٹریٹ مکمل کرنے آئے گی۔ آج دوسری اور آخری سنگ ہے نا۔ لیکن تم....“

”وہ آئے تو اس کو میرے پاس بھیجنا۔ تمہارے بھائی نے اسے بہت آسان پہ چڑھا رکھا ہے اور مجھے لوگوں کو زمین پہ اتارنا اچھی طرح

آتا ہے۔“

”فاتح.... تم اس کو کیا کہو گے؟ اگر اشعر کو پتہ چلا تو....“ وہ ہراساں سی کہنے لگی تو اس نے قطعیت سے ہاتھ اٹھا کے روکا۔

”وان فاتح کے گھر میں.... چوری کرنے سے پہلے.... اس لڑکی کو اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ فاتح کو دنیا میں سب سے زیادہ نفرت چوروں

سے ہے۔ اس نے میرا کتنا نقصان کر دیا ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ جیسے ہی آئے اس کو میرے پاس بھیجو۔“ برہمی سے کہتے ہوئے وہ

آگے بڑھ گیا۔

اس کے جاتے ہی عصرہ کے تاثرات بدلے۔ خوف، ہراسیت، پریشانی سب غائب ہو اور اس نے اطمینان سے گہری سانس لی۔

فاتح نے جلد یا بدیر جان ہی لینا تھا کہ یہ اشعر کا کام ہے۔ مگر اشعر کی مدد کا الزام وہ کس کو دیتا ہے، یہ عصرہ کے نزدیک زیادہ اہم تھا۔ اپنے

بچوں اور اپنے شوہر کو اس جنون سے پہچانے کے لئے وہ ہرجنگ اور ہرجبت میں ہرجائز ناجائز کام کر سکتی تھی۔
گہری سانس لے کر وہ مسکرائی اور کھڑکی کو دیکھا جہاں ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

اور حالم کی رہائشگاہ میں.... بیڈ پہ بے خبر سوئی تالیہ کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی تھی۔ چند لمحے لگے اس کو حواسوں میں واپس آنے میں اور پھر وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔

اس نے ابھی ابھی خواب میں جو منظر دیکھا تھا.... وہ اس کے اندر کے خون کو جوش دلانے اور رو نگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی تھا۔
”خزانہ ہے... خزانہ واقعی ہے...“ اس کے ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے اور چہرے پہ خوشگوار بے چینی در آئی... ”اور جو جگہ میں نے ابھی دیکھی ہے... تو یہاں دفن ہے وہ خزانہ!“ بے یقینی اور خوشی سے اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔
”میں جانتی ہوں خزانہ کہاں دفن ہے۔ صرف... میں.... جانتی ہوں!“ تیزی سے سیلپر پہنے اور باہر کو بھاگی۔

☆☆=====☆☆

حالم کی اگلی قسط انشاء اللہ پندرہ اگست کی رات 8 بجے نمبرہ احمد آفیشل پراپ لوڈ کر دی جائے گی۔
ہمارا بیچ بار بار چیک کرنا نہ بھولیے گا۔

حالم (نمرہ احمد)

باب پنجم:

”تین خزینوں کا مسکن“

اس نے خواب میں دیکھا....

وہ ایک دالان میں کھڑی ہے... سرخ اینٹوں والا کھلا سا صحن... ہر اٹھا کے سامنے دیکھتی ہے تین اطراف میں کمرے ہیں۔ ایک لکڑی کا دو منزلہ گھر... جیسے پرانے لاہور کے بازار میں بنی پرانی حویلیاں....
بالائی منزل کے کمروں کے آگے بالکونیاں کھلتی ہیں جن میں گملے رکھے ہیں....
صحن کے ایک کونے میں ایک گول چبوترہ بنا ہے جس پہ ایک مجسمہ نصب ہے.... چغہ پہنے کھڑے آدمی کا مجسمہ جس کی میان میں تلوار ہے....

وہ خواب کی کیفیت میں قدم اٹھاتی ہے.... آگے چلتی جاتی ہے....
مجسمے کے پیچھے.... وہ اس قلعے اور حویلی نما گھر کی دیوار کے پاس وہ آرکتی ہے.... دیوار کے ایک کونے میں الفاظ کھدے نظر آتے ہیں....
جیسے گیلے گارے اور سینٹ میں کسی نے کھود کھود کے لکھا ہو....

وہ الفاظ چمک رہے ہیں....

”تاشہ“

جوشنہرادیوں جیسی تھی....

اور جس نے ایک غلام سے شادی کی تھی....

نیچے ایک طویل نظم لکھی ہے جو دھندلی سی ہے.... وہ ان الفاظ پہ ہاتھ پھیرتی ہے....

پھر آوازیں سنائی دیتی ہیں.... اس کی اپنی آواز... سکوں کی کھنک کے درمیان....

”ایک دن ایڈم.... میں اور تم.... اس گھر میں دفن خزانہ ڈھونڈنے آئیں گے۔“

وہ چونک کے گردن گھماتی ہے.... گھر تنہا ویران پڑا ہے.... وہاں کوئی نہیں ہے مگر یوں لگتا ہے گویا درود یوار بول رہے

ہیں... جیسے یادیں آواز کی صورت سنائی دے رہی ہیں....

”اس گھر میں خزانہ؟ سن باؤ کے گھر میں؟ مگر چے تالیہ....“

”اونہوں... اس کے اندر نہیں... اس کے نیچے ہے خزانہ... ہمیں نیچے جانا ہوگا۔“

ایک جھٹکے سے تالیہ کی آنکھ کھلی۔

وہ اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں چٹ لیٹی تھی۔ چونک کے وہ اٹھ بیٹھی۔

”خزانہ ہے....“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے وجود میں خوشگوار سی بے یقینی پھیل گئی تھی۔ ”خزانہ واقعی ہے اور

صرف میں جانتی ہوں کہ وہ کدھر ہے۔ سن باؤ کا گھر۔“

وہ نیچے اتری.... سیلیپرز پیروں میں اڑے اور باہر بھاگی۔

نیچے آئی تو داتن کچن میں کام کر رہی تھی۔ پین کیک کی خوشبو.... تازہ مشروم کا آلیٹ.... خستہ کری پفر کی مہک.... وہ اہتمام سے

ناشتہ کر رہی تھی۔ ٹھینا اپنے لئے کیونکہ جانتی تھی تالیہ یہ سب نہیں کھاتی۔

”داتن.... میری کالی موٹی برائمر مرغی....“ وہ خوشی سے چیختی بیڑھیاں اترتی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کندھوں سے تھام

کے اسے اپنی طرف گھمایا۔ داتن کے ہاتھ سے کفگیر گر گیا۔ وہ بوکھلا گئی۔

”کیا ہم پکڑے گئے تالیہ؟“

”داتن.... داتن....“ وہ اتنی خوش تھی کہ موٹی کی بات سنی بھی نہیں۔ ”داتن.... خزانہ ہے.... سن باؤ کے گھر میں.... میں نے خود

دیکھا ہے....“

داتن نے پہلے الجھ کے اسے دیکھا پھر.... اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ سمجھ کے گہری سانس لی۔ ”خواب میں نا؟“

”میرے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔ وہ سن باؤ کا گھر ہے۔ تین ٹینوں کا گھر... تین خزانوں کا گھر۔“

”اور کہاں ہے وہ گھر؟“ وہ سنجیدگی سے تالیہ کا خوشی سے متمایا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ملا کہ میں ایک ہی تو گھر ہے جس کو سن باؤ کا گھر کہتے ہیں۔ وانگ لی کا گھر۔ جو وان فاتح کی ملکیت ہے۔ اور میں نے کل سنا“

وہ اس کو بیچنا چاہ رہا ہے۔“ وہ خوشی سے گلابی پڑتی بتا رہی تھی۔

”تالیہ.... مجھے تم سے بات کرنی ہے اور تمہارے خوابوں پہ پانی پھیرنا ہے۔“ داتن نے آہستہ سے کہا۔

”چونکہ میں امیر ہونے والی ہوں اس لیے تمہاری کسی بدگوئی کا برا نہیں مناؤں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے کچن کے وسط میں اپنی

ایڑیوں پہ گول گول گھومی۔ جیسے کوئی ان سنی دھن بج رہی ہو اور وہ اس پہ رقص کر رہی ہو۔

”لنکادی... میں لنکادی میں ایک پودو دورا جزیرہ خریدوں گی.... پھر میں اس پہ ایک اونچا قلعہ بناؤں گی....“ وہ مہارت سے گول گول گھومتی ایک کونے سے دوسرے پہ جارہی تھی جیسے برف کے اوپر اسکیٹنگ کر رہی ہو۔

”تالیہ... کوئی خزانہ نہیں ہے۔“ داتن نے اسے افسوس سے دیکھا۔

”ایک دفعہ پھر کہو یہ بات موٹی اور تمہیں میں اپنے محل کا سب سے چھوٹا کمرہ دوں گی۔“ اس کے پیر برق رفتاری سے گھوم رہے تھے اور وہ ان کی طرح آگے سیڑھیوں تک جارہی تھی۔

”تالیہ.... وہ چابی ملعون ہے۔“

”اب تمہیں سرورنٹ کو ارٹ ملے گا!“ وہ گھومتے گھومتے رکی.... چہرے سے سنہری بال ہٹائے اور لا پرواہی سے کہہ کے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ داتن بے بسی سے واپس چو لہے کی طرف پلٹ گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو بال فرنج چوٹی میں بندھے تھے۔ زرد گھٹنوں تک آتے فراک اور ٹراؤزر میں ملبوس، اوپر سفید منی کوٹ پہنے وہ ہلکے میک اپ میں تیار لگ رہی تھی۔

داتن کچن کی گول میز پہ لوازمات چنے بیٹھی تھی۔ وہ عجلت میں قریب آئی اور کرسی کھینچی۔ کری بغز کی خوشبو.... پین کیک کی تازگی.... ساری فضا معطر ہو چکی تھی.... تالیہ نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر اتاری۔

”جانتی ہو میں یہ سب نہیں کھاتی، پھر کیوں بناتی ہو میرے لیے؟“

”کس نے کہا تمہارے لیے بنایا ہے؟ ہونہہ!“ داتن نے برامان کے ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی جس میں جوس کا ایک گلاس اور سیب رکھا تھا۔ تالیہ گہری سانس لے کے بیٹھی۔

”ابھی بھی وقت ہے، داتن۔ اپنے وزن کی فکر کرو۔ عورتوں کو فٹ رہنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ موٹا پاموت ہے۔ فٹ رہنا صحت ہے۔“

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ داتن نے پلیٹ بھر رکھی تھی مگر کچھ بھی چھوئے بغیر سنجیدگی سے تمہید باندھی۔

”جلدی کرو کیونکہ عصرہ کا مسیج آیا ہے۔ انہوں نے آج جلدی بلوایا ہے۔ پینٹنگ آج مکمل کرنی ہے۔“ وہ سیب میں دانت گاڑتے ہوئے بولی۔

”یہ کتاب۔“ داتن نے ایک کتاب اٹھا کے دکھائی تو سیب کا ٹکڑا چباتے تالیہ نے آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔ ”ہم شکار باز“

”یہ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ اور میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تمہارے باپا اور تمہارا سارا خاندان.... سب ختم ہو چکا ہے۔ نہ تمہارا گاؤں اب وہاں ہے۔ نہ کوئی خزانہ تمہاری راہ دکھ رہا ہے۔ آرام سے سنو تالیہ.... میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم کہاں سے آئی تھیں

اور کیوں آئی تھیں۔“ داتن نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا جو بالکل ٹھہر گئی تھی....

گھڑی کی سوئیاں آگے چلتی رہیں۔ داتن پدوکا بوتلی رہی۔ تالیہ سنتی رہی۔ درمیان میں چند ایک سوال اس نے پوچھے۔ آخر میں داتن بولی۔ ”میں جانتی ہوں یہ سب تمہارے لئے بہت اہم ہے اور تم شاید اس پہ یقین نہ کرو لیکن....“

اور تالیہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

داتن کا منہ کھل گیا۔ تالیہ ہنوز گردن پیچھے کو پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ پھر سیدھی ہوئی اور محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”کیا دیو مالائی کہانیاں پڑھتی رہتی ہو تم داتن۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا حقیقی دنیا میں۔ ہنوبھی۔“

”اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے تالیہ۔ جو قفل اس چابی سے کھلے گا اس کے پیچھے کوئی خزانہ نہیں ہوگا۔ بلکہ....“

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ عصرہ نے جلدی آنے کا کہا تھا۔“ وہ بے پرواہی سے سبب لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن بہت کچھ کہنا چاہتی

تھی، مگر اس بات پہ ماتھے پہ ہل پڑے۔ ”عصرہ نے ایسے جلدی میں کیوں بلوایا؟“

”پتہ نہیں۔ شاید کہیں جانا ہو۔“

”احتیاط کرنا عصرہ سے۔ کیونکہ سیاسی بیوی سیاستدان سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”کیونکہ وہ واحد انسان ہوتی ہے جو ایک سیاستدان کو بھی con کر سکتی ہے۔“

تالیہ ہنس پڑی اور آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کے اسے دیکھا۔ ”سمیج کا بندوبست کر لینا۔ میں نہیں چاہتی وہ

روز میرے گھر آئے۔ اور کوشش کرنا کہ جب میں گھر آؤں تو میرا مہینے بھر کا راشن ختم نہ ہو چکا ہو۔“

داتن کے سامنے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس بے دلی سے اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

محمود بن عزیزی کے خاندانی قلعے پہ صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ کھلے لان میں دو ہرن آگے پیچھے قلائیں بھرتے دکھائی دے

رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے کار تیار کھڑی تھی۔ گویا مالک کا انتظار ہو رہا ہو۔

اندر آؤ تو اونچی چھت والے ڈائننگ ہال میں لمبی میز بچھی تھی۔ سربراہی کرسی پہ بیٹھا شعر نیپکین سے ہاتھ پونچھتا، کافی کا آخری

گھونٹ بھرتا اٹھ رہا تھا۔ سیاہ سوٹ اور بالوں کے سپاگس.... وہ سنجیدہ اور مغرور لگ رہا تھا۔

”فائل کہاں ہے؟“ ساتھ کھڑے رملی سے پوچھا۔

”کار میں ہے۔ آپ باہر آئیں تو دیتا ہوں۔ آپ حفاظت سے کہیں رکھوا دیجئے گا۔“

”اور نیلامی کی تمام تیاریاں مکمل ہیں؟“

”جی سر۔ اب تو تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں۔“

”ہاں۔ وان فاتح کی بدنامی میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا۔“ وہ تلخی سے مسکرایا اور موبائل اٹھالیا۔ پھر پلٹا تو رملی کے چہرے پہ نظر پڑی۔ اشعر کے ابرو تشویش سے اکٹھے ہوئے۔ ”تمہاری شکل کیوں اتری ہوئی ہے؟“

رملی نے بے چارگی سے کندھے اچکائے۔ ”عثمان سے کیمرہ کھو گیا۔ بٹن کیمرہ جو میں نے اس کو دیا تھا۔“

اشعر محمود کے ماتھے پہ بل پڑے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ ”واٹ؟ کیسے کھو گیا؟ اتنی اہم ویڈیو تھی اس میں۔“

”وہ کہتا ہے کہ جب پارٹی ختم ہوئی تو اس نے دیکھا، بٹن اس کے کوٹ پہ نہیں تھا۔ وہ خود حیران پریشان ہے کہ....“

”جھوٹ بول رہا ہے وہ۔ کہاں جاسکتا ہے کیمرہ؟ اپنی قیمت بڑھا رہا ہے وہ بس۔ اس سے ویڈیو نکلاؤ جیسے بھی ہو۔“ تلخی سے

کہہ کے وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

قلعے کا دروازہ کھولتے ہی خوبصورت سبزہ زار اور اس پہ قلائچیں بھرتے بے فکر سے ہرن نظر آئے۔ سبز گھاس.... جا بجا پھولوں کی

کیاریاں... ایک طرف بیٹھا مور... مگر اشعر کو کچھ بھی حسین نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆=====☆☆

صبح جیسے جیسے باسی ہوتی گئی، کوالا لپور پہ آلودہ دھند سی چھاتی گئی۔ دور سمندر پار انڈونیشیا کا ملک واقع تھا۔ وہاں آج پھر کوئی جنگل جلایا گیا تھا اور فضا ملائیشیا تک آلودہ ہو گئی تھی۔

وان فاتح کے لاؤنج کی کھڑکی سے دھند میں ڈوبالان نظر آرہا تھا۔ عصرہ کھڑکی کے سامنے اونچی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ مسکراتے ہوئے

بت بنی۔ اور سامنے تالیہ ایزل پہ کیونس سجائے، گردن ترچھی کیے پینٹ کرتی نظر آرہی تھی۔

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ ایسے میں مجسمہ بنی عصرہ نگاہ بار بار اٹھا کے وال کلاک کو دیکھتی تھی۔

”آپ کا ملاکہ والا گھر... کیا آپ لوگ اکثر وہاں جاتے ہیں؟ دراصل مجھے تاریخ بہت فیسی نیٹ کرتی ہے۔“ وہ سادگی سے

پوچھ رہی تھی۔ عصرہ مسکرائی۔

”وہ عرصے سے بند پڑا ہے۔ کبھی کبھار چکر لگ جاتا ہے۔“

”اچھا میں نے کانگ ہو کو بھی آپ کی گیلری کی نیلامی پہ مدعو کیا ہے۔“ برش کیونس پہ پھیرتے ہوئے تالیہ نے بات پلٹ دی۔

”کانگ ہو؟ وہ چائینیز آرٹسٹ؟“ عصرہ نے ستائش اور تعجب سے ابرو اٹھائی۔ تالیہ جھینپ کے مسکرائی۔

”چند برس پہلے میں نے پینٹنگ سیکھی تھی ایک آرٹ اسکول سے۔ وہ وہاں پڑھاتے تھے۔ اسی طرح میں ان کو جانتی ہوں۔“

آرٹ بنانے اور اس کو محفوظ رکھنے والے ہی ہوتے ہیں میرے سوشل سرکل میں۔“

”اچھا لگاسن کر۔ تم تو کافی کام کی لڑکی ہو۔ کیا کانگ ہو آئیں گے؟“

”کانگ ہونہ صرف آئیں گے بلکہ ان کو آپ کی گیلری سے تین نوادرات بھی خریدنے ہیں۔“ وہ مگن انداز میں برش کر رہی تھی۔

”اچھا... کون سے نوادرات میں دلچسپی دکھائی انہوں نے؟“

”انہوں نے مجھے لسٹ دی تھی۔ ٹھہریں میں دکھاتی ہوں۔“ برش کا کونا دانتوں میں دبایا اور ساتھ رکھا پرس اٹھایا۔ زپ کھولی۔

احتیاط سے تہہ شدہ کاغذ نکالا اور عصرہ کو جا کر دے آئی۔ پھر واپس کھڑی بے نیازی سے پیٹ کرنے لگی۔

”عثمانی سلطنت کا خطاطی کا اجازہ۔“ عصرہ کاغذ کھول کے پڑھ رہی تھی۔ ”بالکل۔ یہ نیلامی پہ ہوگا۔ اور یہ دسویں صدی کا شمالی

افریقہ کا قرآن کا نیلے رنگ کا نسخہ۔ یہ بھی میری کلیکشن میں ہے۔“ پھر وہ ٹھہر گئی۔ آنکھیں سکڑ کے آخری تصویر دیکھی جو اس کاغذ پہ

چھپی تھی۔ (برش کرتی تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔)

”سنو تالیہ... میرے پاس مظفر شاہ کے زمانے کا تو کوئی سکہ نہیں ہے۔“ اچنبھے سے آنکھیں اٹھائیں تو تالیہ نے بظاہر چونک

کے اسے دیکھا۔

”پتہ نہیں عصرہ... انہوں نے کہا تھا کہ یہ مختلف سکہ ہے۔ اس کے دونوں طرف مظفر ال سلطان لکھا ہوا ہے اور یہ آپ کے ہی

پاس ہے۔“ وہ جیسے یاد کر کے بتا رہی تھی۔

”نہیں میرے پاس تو...“ عصرہ رکی پھر گہری سانس لی۔ ”اچھا وہ... وہ تو نقلی تھا۔ ایک فیملی فرینڈ نے لائینینک سمجھ کے دے دیا۔

مگر کانگ ہو کو کیسے معلوم کہ وہ میرے پاس ہوگا؟“

”جیسے مجھے معلوم ہے کہ ملا کہ سلطنت کی ایک ملکہ کی ہیر پن آپ کے پاس ہے مگر آپ اس کو بیچتی نہیں ہیں۔ کہیں سنبھال کے

رکھتی ہیں۔ آرٹ کلیکٹر ز کو سب معلوم ہوتا ہے کہ کون سے نوادرات کس کے پاس ہیں مسز عصرہ۔“

اس کی بات پہ عصرہ کھلکھلا کے ہنس دی۔ ”ہاں۔ یہ درست کہا تم نے۔ میں بھی پوری خبر رکھتی ہوں۔ مگر یہ سکہ میرے پاس نہیں

ہے۔“

تالیہ نے بے فکری سے کندھے اچکا دیے۔ ”اگر آپ نہیں بیچنا چاہتیں تو انکار کر دیجیے گا، اٹس اوکے۔“

”نہیں تالیہ... یہ واقعی میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آگے دے دیا کیونکہ یہ سونے کا تھا مگر قدیم نہیں تھا۔ چند سال پرانا ہی

ہوگا۔“

تالیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا مگر اس نے بدقت اپنے تاثرات کو نارمل رکھا۔ ”تو اگر وہ مجھ سے نئے مالک کا پوچھیں تو میں کیا

کہوں؟“

”ان کو بتانا کہ وہ سکہ fake تھا۔ ایڈم نے تو اب تک اس کو تڑوا کے جیولری بھی بنوائی ہوگی۔“ وہ رسان سے کہہ رہی تھی۔ نظریں گاہے بگاہے گھڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔ مگر تالیہ کے قدموں تلے زمین مرنے لگی۔

”ایڈم؟ آپ کا ملازم؟ تو وہ آپ نے اسے دے دیا؟“ ساری اداکاری بھول کے تیزی سے بولی۔

”ہاں۔ میں نے ایک تو لے سونے کا کیا کرنا تھا؟“

”جی، یہ تو ہے!“ جلدی سے سنبھل کے مسکرائی اور دوبارہ پیٹ کرنے لگی۔ البتہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھینچ لی تھی۔ دماغ کی چولیس تک بل گئی تھیں۔

”کتنی دیر ہے؟“ عصرہ نے پوچھا، پھر مسکرا کے خود ہی وضاحت دی۔ ”در اصل مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔“

”بس.... چند سیکنڈ مزید۔“ وہ آخری ٹچ دے رہی تھی۔ ذہن میں آندھیاں الگ چل رہی تھیں۔ عجیب گول منجھدار تھا جس میں وہ گھومتی جا رہی تھی۔ اب ایڈم سے کیسے نکلوائے سکے؟ اُف!

پینٹنگ مکمل ہوئی اور عصرہ فارغ ہو کے باہر آئی تو پورچ میں ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب رکی۔

”فاتح دس منٹ تک جا گنگ سے آجائے گا۔ وہ جس وقت آئے یہ لڑکی ڈرائیونگ روم میں بیٹھی ہوتا کہ اس کو سامنے نظر نہ آئے۔ وہ اوپر اسٹڈی میں چلا جائے تو اس کو تالیہ کی آمد کی اطلاع کر دیتا۔“ سنجیدگی سے کہہ کے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔ ”اور میری پینٹنگ کو سنبھال رکھنا۔“ پھر آگے بڑھ گئی جہاں ڈرائیور کار کا پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کسی ملکہ کی سی بے نیازی سے عصرہ کار میں بیٹھی۔ لبوں پہ تلخ مسکراہٹ تھی۔ (بھری محفل میں کل یہ لڑکی بتا رہی تھی کہ میرا باپ چائے کی پتی کا کام کرتا تھا، ہونبہ۔)

تالیہ ہاتھ دھو کے باہر آئی تو ایزل سے پینٹنگ غائب تھی۔ ملازمہ اس کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

”میں نے پینٹنگ اوپر ڈرائی ہوئے رکھ دی ہے، آپ ناشتے کے لئے ادھر آ جائیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اس کے بغیر میں آپ کو نہ جانے دوں۔“

تالیہ نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے سرسری سی اطراف پہ نگاہ دوڑائی۔ ”ایڈم آ گیا؟“

”وہ آنے والا ہو گا۔ آج دیر ہو گئی۔“ ملازمہ نے اسے ڈائیننگ ہال میں بٹھایا، پردے برابر کیے اور غائب ہو گئی۔ تالیہ اب جان گئی تھی کہ سکہ گھر میں نہیں اس لیے ادھر ادھر پھرنے کے بجائے وہیں بیٹھی رہی۔ چند منٹ گزرے کہ ملازمہ دوبارہ نمودار ہوئی۔

”فاتح صاحب آپ کو اوپر اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔“

وہ عام سی بات تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر تالیہ مراد کا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ غلط تھا اس سب میں۔ جیسے تمام ملازم کسی

اسکرپٹ کو پڑھ رہے ہوں۔

وہ اٹھ کے سیدھی اوپر چلی آئی۔ تیز گہری نگاہیں گھما کے اطراف کو بھی دیکھتی تھی۔ جیسے کچھ سو گھننے کی کوشش کر رہی ہو۔

اسٹڈی کا دروازہ دستک دے کر دھکیلا تو منظر سا کھلتا چلا گیا۔ دیوار سے لگے کتابوں کے ریک.... آبنوسی میز اور اس کے پیچھے ٹیک لگا کے بیٹھا وان فاتح راحزل۔ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ کہنی کرسی کے ہتھ پہ جمائے دو انگلیاں گال تلے رکھے فاتح اس کے اوپر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔

”آؤ!“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی قریب آئی۔ کچھ اس کی شخصیت کا سحر تھا۔ کچھ خاموش ماحول تھا.... ہر بڑھتا قدم اسے مرعوب کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ اب فاتح سامنے تھا اور اس کے پیچھے دھندلا شہر دکھاتی کھڑکی۔

”آپ نے مجھے بلایا، تو انکو۔“ وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ ہاتھ گود میں رکھ لیے اور پرس پیروں کے پاس۔

”تم نے کبھی Malay Annals پڑھے ہیں تالیہ؟ سارا جیوا ملایو؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا تو تالیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”سارا جیو ملایو؟ ملایشیاء کی قدیم داستانوں کا مجموعہ جو کئی صدیاں پہلے لکھا گیا تھا آج بھی ہر ملے بچے کو بڑے ہوتے وقت پڑھایا جاتا ہے؟ میں نے اسے پڑھا نہیں ہے مگر اس کے بارے میں سنا بہت ہے۔“

”اس میں ایک کہانی ہانگ تو اکی ہے۔ وہ سلطان منصور شاہ کے پانچ جری سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ سورما۔ بہادر۔ نڈر۔ بے حد طاقتور۔“ وہ اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر بات جاری رکھے ہوئے تھا اور تالیہ پلکیں تک نہیں جھپک پارہی تھی۔

”ان پانچوں کو سلطان نے عظیم ہتھیاروں کی طرح تیار کیا تھا۔ ہانگ تو ان کا لیڈر تھا۔ سب سے طاقتور۔ مگر اس کی بڑھتی مقبولیت اس کے لیے مسائل پیدا کرنے لگی۔ لوگوں کو اس سے حسد ہونے لگا۔ یوں ایک دن سلطان کو غلط فہمی ہوئی کہ ہانگ تو انے حرم کا اصول توڑا ہے تو اس نے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ ہانگ تو ا کو قتل کر دیا جائے۔“

یہاں پہ اس نے وقفہ دیا۔ وہ اب آنکھوں کی پتلیاں سکڑے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”وزیر دانا آدمی تھا۔ اس نے ہانگ تو ا کو قتل کرنے کے بجائے چھپا دیا۔“ فاتح نے نظریں تالیہ پہ جمائے بات جاری رکھی۔ ”مگر باقی چاروں کے اندر غصہ اور بغاوت جنم لینے لگی یہاں تک کہ ایک دوسرے سورمانے ایک دن محل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ ہانگ تو ا کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ سلطان نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر کوئی سپاہی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں وزیر نے بادشاہ سے ہانگ تو ا کے لئے امان طلب کی اور بتایا کہ اس نے ہانگ تو ا کو مارا نہیں تھا اور صرف وہی اپنے ساتھی سورما

کو بچھاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ وزیر ہانگ تو اگلے آیا اور بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دونوں سو رماؤں میں مقابلہ ہوا اور ہانگ تو انے باغی سو رما کو جو ہانگ تو کی موت کا ہی بدلہ لینے آیا تھا، مار دیا اور ایک دفعہ پھر سے سلطان کا پسندیدہ بن گیا۔“

اسنڈی میں سنانا چھا گیا۔ فاتح کے عقب میں کھڑکی کے شیشے پہ اتنی دھند جمع تھی کہ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔

”تمہارا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے، تاشہ؟“

”یہی کہ یہ ایک بے کار کہانی ہے جس میں ہانگ تو نے اس سلطان سے وفا کی جو اسے ناحق قتل کی سزا سنا چکا تھا، اور اس دوست کی جان لے لی جو اس کے لئے ہی لڑ رہا تھا۔ میں نے یہ کہانی سن رکھی ہے اور میں کبھی نہیں سمجھ سکی کہ ہانگ تو کے دوست نے ہانگ تو کو زندہ دیکھ کے ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیے۔ یا شاید وہ اپنی انا کے پیچھے لڑتا رہا؟ آپ کا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے، تو انکو؟“

”یہی کہ اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ طاقت کی جنگ۔ جیسے ہی ہانگ تو نے طاقتور سلطان کی طرف جاتا دروازہ کھٹا دیکھا، اس نے اپنے دوست کو مارنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ کچھ لوگ انسانوں سے وفادار ہوتے ہیں، کچھ طاقت سے۔ اور میں یہی تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں تاشہ!“ وہ آگے کو ہوا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسا دئے بات جاری رکھی۔

”تم نے وان فاتح کے گھر سے ایک شے چرائی ہے۔ (وہ چوکی۔) اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہ مجھے واپس لا دو تا کہ میں تمہارے خلاف پولیس میں شکایت نہ کروں۔“

تالیہ بالکل سن ہو گئی۔ پیر سے نیچے رکھے پرس کو چھوا جس میں وہ بریسلٹ ابھی بھی موجود تھا۔ (یا اللہ... ان کو کیسے علم ہوا؟)

”میں نے... آپ کے ہاں سے... چوری کی ہے؟“ بے یقینی سے دہرایا۔

”اور تم نے وہ فائل اشعر کو دی ہے، میں جانتا ہوں۔“

تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ وہ ٹھٹکی۔ ”کون سی فائل؟“

”میں جانتا ہوں تم یہ ایش کے لئے کر رہی ہو۔ اس کے ساتھ پر قیش زندگی گزارنا تمہارا خواب ہو گا۔ میرا خیال ہے تم اتنی امیر نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو کیونکہ ایک زمانے میں تم ایکسٹرا کردار کی طرح تھیٹر میں کام کرتی تھیں۔ تاشہ آگاپووا۔ یاد ہے؟ اس کے علاوہ بھی تمہارے بارے میں کچھ بہت dishonest سا ہے جو مجھے کھٹکتا ہے، لیکن مجھے اس سب سے کوئی غرض نہیں کیونکہ آج کے بعد تم ہمارے گھر نہیں آؤ گی۔“

تالیہ کی رنگت سرخ پڑ چکی تھی۔ لب کپکپانے لگے تھے۔ وہ انھی اور ہتھیلیاں میز پر رکھے جھکی۔

”آپ نے مجھے ایک ہی سانس میں جھوٹی، چور، فراڈ اور gold digger کہہ دیا ہے، فاتح صاحب!“ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کے وہ غرائی۔

”جیسا کہ میں نے کہا، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم اپنی زندگی میں کیا کرتی ہو۔ مجھے صرف اپنی فائل واپس چاہیے۔“ وہ ہلکے سے کندھے اچکا کے رسان سے بولا تھا۔ بالکل ٹھنڈا۔ کوئی غصہ، طیش کچھ بھی نہیں۔

”میں نے آپ کی کوئی فائل نہیں چرائی۔“ اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں اور گلارندھر ہاتھا۔

”دیکھو تالیہ... تا شہ... واٹ ایور... کل تک اگر مجھے میری فائل نہیں ملتی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں پڑے گا۔ تمہاری اپنی کریڈیٹ بلیٹی خراب ہوگی۔ ویسے بھی اشعر کو جیسے ہی طاقت میری طرف نظر آئے گی وہ اپنی پرانی صفوں میں واپس آنے کے لئے تمہارے ساتھ وہی کرے گا جو ہانگ تو انے اپنے دوست کے ساتھ کیا تھا۔“

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی کہ کمرے میں بھی بھرنے لگی تھی۔ تالیہ اسی طرح ہتھیلیاں میز پر رکھے زخمی نظروں سے اسے دیکھ گئی۔

”تم ایک آزاد انسان ہو۔ میری فائل تو مجھے مل جائے گی لیکن تمہیں اپنی نظروں میں معتبر ہونے کے لیے کوئی اخلاقی قدم لینا ہوگا۔ اب تم جاسکتی ہو۔“

وہ میز سے ہاتھ ہٹا کے سیدھی ہوئی.... چند لمحے سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”آپ کو واقعی انسانوں کی پہچان نہیں ہے، تو انکو!“

وہ اب سیل فون اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو رہا تھا۔ سنجیدہ اور بے نیاز۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

تالیہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ اس کی کمر سے دروازہ لگا تو وہ مڑی اور باہر نکل آئی۔

دھند سی جیسے چھٹی۔ سانس بحال ہوئی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے۔

وان فاتح کا اونچا محل خاموش پڑا تھا۔ ملازم کونوں میں دبک گئے تھے۔ سارا کھیل اسے سمجھ آ گیا تھا۔

”عصرہ محمود... تم نے مجھے con کیا۔ تم نے عالم کو con کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ عالم کون ہے!“

وہ تیزی سے زینے پھلانگ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

گدلی دھند نے قلعے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ دھند میں اشعر کی کار تیار کھڑی تھی اور اشعر ناشتے کے بعد ریلی سے بات کر کے برے موڈ کے ساتھ ابھی باہر نکلا تھا۔ مگر پھر وہ ٹھنک کے رکا۔ ایک کار تیزی سے اندر آئی۔ اس کی فوگ لائٹس آن تھیں۔ وہ سیدھی برآمدے کے سامنے آرکی۔ چند لمحے بعد عصرہ اس سے نکل کے برآمدے کے زینے چڑھتی اوپر آئی۔ سر کی کوٹ اور اسکرٹ

میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے وہ برے موڈ میں لگ رہی تھی۔

”کا کا... اتنی صبح؟“ وہ مسکرایا مگر عصرہ نہیں مسکرائی۔

”میں پریشان ہوں، ایش۔ فاتح بہت غصے میں ہے۔“

”ان کو شک تو نہیں ہوا؟“ اس نے نرمی سے عصرہ کو دونوں شانوں سے تھاما۔

”شک؟ اسے یقین ہے یہ تمہارا کام ہے۔“

”مجھے اپنی فکر نہیں ہے، آپ کا پوچھ رہا ہوں۔ آپ پہ تو شک نہیں ہوا۔“ وہ پر اعتماد تھا۔ عصرہ نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا

چھوڑ دیا۔

”مجھے خود سے شک ہٹانے کے لئے تالیہ کا نام لینا پڑا۔ وہ ابھی گھر پہ آئی ہے اور فاتح جس طرح اس کی بے عزتی کرے گا اس

کے بعد تمہاری یہ پسندیدہ لڑکی ہمارے خاندان کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔“

”یہ لڑکیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں، اس کی پرواہ نہ کریں۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”آپ نے بس اپنی شادی کو متاثر نہیں

ہونے دینا۔ اچھا کیا جو تالیہ کا نام لے لیا۔“

”اسی کے لئے تو سب کچھ کیا مگر اب میں panic کر رہی ہوں۔“ وہ پریشان تھی۔ بار بار پیشانی چھوتی۔ کبھی گردن کی پشت پہ

ہاتھ رکھتی۔ ”مجھے ڈر ہے فاتح کو معلوم نہ ہو جائے۔“

”کون بتا سکتا ہے؟ رات کو تو دو گارڈز ہی ہوتے ہیں صرف۔“

”ان کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ مگر وہ نیا لڑکا ایڈم۔ وہ ہاڈی مین۔ وہ گڑ بڑ کر سکتا ہے۔“

وہ دونوں اونچے ستونوں والے برآمدے میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ صبح کی گدلی دھند ارد گرد پھیلی تھی اور ملازم باادب

فاصلے پہ جا کھڑے ہوئے تھے۔

”میں رملی سے کہتا ہوں کہ عبد اللہ سے کہئے ایڈم اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھنا عبد اللہ دو روز قبل ہی بھاگا بھاگا

واپس آئے گا۔ اب بتائیں، کوئی اور مسئلہ؟“

عصرہ ادا سی سے مسکرائی۔ ”ایش... کیا میں اپنے شوہر کو دھوکا دے رہی ہوں؟“

”اگر یہ دھوکہ پہلے دیا ہوتا تو آج آریا نہ ہمارے پاس ہوتی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو عصرہ کی آنکھوں میں

پانی بھرنے لگا۔

”وہ کسی اچھے خاندان میں تربیت پا رہی ہوگی، ایش، مجھے یقین ہے۔ وہ ایک دن ہم سے ضرور آ ملے گی۔“

”ان شاء اللہ‘ کا۔“ اس نے کہتے ہوئے شفقت سے عصرہ کو گلے سے لگالیا۔ عصرہ نے اس کے کندھے پہ سر رکھے آنکھیں بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کے چہرے پہ لڑھکے۔

”بیمار آدمی کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے‘ کا۔ اس کو کھانا اور دوا زیر دستی کھلانی پڑتی ہے۔ آہنگ جنون کے ہاتھوں بیمار ہیں‘ آپ کی دوا ان کو ناگوار گزر رہی مگر یہی ان کا علاج ہے۔“ وہ نرمی سے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
چند لمحے وہ خاموشی سے دھند میں کھڑے رہے پھر عصرہ اس سے علیحدہ ہوئی اور آنکھ کا کونا صاف کرتی مسکرائی۔
”اب میں مطمئن ہوں۔ تم عبد اللہ کو بلواؤ۔ صبح تو ایڈم کو میں نے کام سے مارکیٹ بھیج دیا تھا‘ اب آتا ہے تو اس کا بندوبست کرتی ہوں۔“

پھر اس نے گردن گھما کے دیکھا۔

”دھند چھٹ رہی ہے۔ شکر۔“ سبزہ زار تھوڑا تھوڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ دھند ہلکی ہو رہی تھی۔ سورج روشن چمکنے لگا تھا۔ اسے واپس گھر جانا تھا۔ تھینا تالیہ اب تک جا چکی ہوگی۔ جان چھوٹی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ سورج اب مکمل طور پہ طلوع ہو چکا تھا۔ دھند قریباً چھٹ چکی تھی۔ ایڈم ہاتھ میں شاپنگ بیگ لئے لاؤنج میں داخل ہوا تو عصرہ سامنے بڑے صوفے پہ براجمان تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے‘ مسکراتی ہوئی وہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔
”میم‘ کیا مجھے دیر ہوگئی؟ سر آفس چلے گئے؟“ وہ باہر فاتح کی کار غائب دیکھ کے پریشان ہو گیا تھا۔
”عثمان ہے ان کے ساتھ بے فکر رہو۔ سامان آسانی سے مل گیا تھا؟“ وہ نرمی سے گردن اٹھائے اسے دیکھتی پوچھنے لگی۔
”جی میم.... سب کچھ مل گیا۔ میں پھر اب آفس جاؤں؟“

”ایڈم.... ریلیکس۔ تم آج چھٹی لو اور گھر جاؤ۔“

ایڈم جو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا‘ چونکا۔ ”مگر آج باس کی پارلیمنٹ میں تقریر ہے‘ ان کو کافی کے دو گک چاہیے ہوتے ہیں اور“

”عبد اللہ واپس آ گیا ہے۔“ اس نے نرمی سے ہم پھوڑا تو ایڈم کی متفکرانہ انداز میں چلتی زبان کو بریک لگ گئی۔ لب ”اوہ“ میں سکڑے۔ پھر نگاہیں جھکا لیں۔

”یعنی میری جاب ختم‘ میم؟“ آسمان سے آہستہ آہستہ وزمین پہ آگرا۔ اتنے دھیرے سے کہ چوٹ لگنے کی آواز بھی نہیں آئی۔
”ہاں مگر ایش تمہارے اور تمہاری ماں کے لئے نوکری کا بندوبست کر رہا ہے۔ عبد اللہ تمہارے ہی محلے کا ہے نا؟ کوئی نوکری ملی تو

عبداللہ تمہیں بتا دے گا۔ یہ پیسے رکھ لو۔ یہ تنخواہ کے علاوہ ہیں۔ تم نے اپنی منگیت کے لئے تحفہ لینا تھا نا۔“ عصرہ نے ایک پھولا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”میم تنخواہ تو بینک میں آئے گی وہی کافی ہے، میں یہ نہیں رکھ سکتا، اور تحفے کے لئے وہ سکہ بہت تھا۔“ وہ اداسی سے بولا۔

”رکھ لو۔ جیولرزمیننگ کے الگ پیسے لیتے ہیں۔ لے لو ایڈم۔“ ایڈم نے نظریں جھکائے ہاتھ بڑھایا اور لفافہ تھام لیا۔

”اب پریشان نہ ہو۔ جاؤ اور اپنی منگیت کے لئے تحفہ لو۔ کبھی کوئی کام ہو تو آ جانا۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔“ مسکرا مسکرا کے اب عصرہ محمود کے جڑے دکھنے لگے تھے۔ اس سے زیادہ اداکاری وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب جلد وہ اکتانے والی تھی۔ ایڈم نے اس کا صبر نہیں آزمایا۔

”میں باس سے آخری دفعہ مل آؤں آفس جا کر؟“ وہ جیسے اس نو دن کی کہانی کا closure چاہتا تھا۔

”آج اس کا موڈ نہیں اچھا۔ اس کو تقریر بھی کرنی ہے۔ وہ یوں ڈسٹرب ہوگا ایڈم۔“

”نہیں نہیں، میں ان کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ فوراً سنبھل گیا۔ اپنا مقام یاد آ گیا۔ پھر اسے خدا حافظ کہہ کے لفافہ تھامے باہر نکل آیا۔ عصرہ نے گہری سانس لی اور ریموٹ اٹھا کے ٹی وی لگالیا۔ سارے مسئلے ختم ہوئے۔

ایڈم باہر آ کے خالی خالی سا اطراف میں دیکھنے لگا۔ کہاں وہ بھاگ بھاگ کے سامان لے کر فاتح کے گھر پہنچا، اور کہاں سارے دن کی مصروفیت چٹکی میں ختم ہو گئی تھی۔ فراغت ہی فراغت... نو دن کی تیز مصروف زندگی... وہ ان طاقتور لوگوں کے درمیان بیٹھنا... سب را کھ ہو گیا تھا۔

اور اس نے کتنے ہی مواقع گنوا دیے۔ نہ تالیہ مراد کے بارے میں فاتح سے پوچھ سکا کہ وہ واقعی پولیس آفیسر ہے یا نہیں۔ نہ ہی عثمان کے بارے میں فاتح کو آگاہ کر سکا کہ وہ جھوٹ بول کے اشعر سے ملنے جاتا رہتا ہے۔ ایڈم کی تو زندگی سوائے ناکامی کے کچھ نہیں ہے۔ (اس نے سوچا۔) اب وہ تاشہ یا تالیہ جو بھی تھی اس کو کیا جواب دے گا؟ اب وہ فاتح کی حفاظت کیسے کرے گا؟

سوال بہت سے تھے اور جواب ندارد۔ وہ سر جھٹکتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ان لوگوں کو اس کی ضرورت کہاں تھی بھلا؟ وہ اس کے بغیر بھی ٹھیک تھے۔ اسے فاطمہ کا تحفہ لینا تھا۔ سارے کام ایک طرف وہ اس سکے کو تڑوا کے فاطمہ کے لئے انگوٹھی بنوانے جائے گا آج

اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ اسے اب اپنی چھوٹی بے رونق معمولی زندگی میں واپس جانا ہی تھا۔

☆☆=====☆☆

گدلی دھند کا غبار دھیرے دھیرے چھٹتا جا رہا تھا۔ اس پارک میں بڑی سی جھیل بنی تھی۔ کنارے پہ جاگنگ ٹریک تھا جو دور

درختوں میں گم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ واک کر رہے تھے، کچھ بیٹھے ستارہ تھے۔ ایسے میں بھاری بھر کم داتن، متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی چلتی آرہی تھی۔ دفعتاً ایک بیچ کے سامنے وہ رکی۔

اس پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ سفید منی کوٹ پہنے۔ سر ہاتھوں میں گرائے۔

”یعنی تمہیں شکار بازوں کی داستان پہ یقین آئی گیا اور اب تم پوری کہانی دوبارہ میرے منہ سے سنتا....“

”عصرہ نے میرے ساتھ کھیل کھیلایا ہے۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ دیکھ کے داتن چونکی۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ پڑ رہے تھے۔ وہ سخت ہرٹ لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ داتن پریشانی سے ساتھ بیٹھی اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”عصرہ نے مجھے جلدی بلوایا تاکہ میں پینٹنگ مکمل کر لوں اور پھر وہ غائب ہوگئی تاکہ وہ ان فاتح مجھے ڈانٹیں.... اور انہوں نے داتن.... انہوں نے مجھے چور کہا.... بددیانت، جھوٹی اور فراڈ کہا۔“

”یہ سب تو ہم ہیں تالیہ۔“

تالیہ نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مگر انہوں نے مجھ پہ کسی فائل کی چوری کا الزام لگایا جو میں نے نہیں چرائی۔ یہ زیادتی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے وسیع جھیل تھی اور ساتھ ٹریک۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، خفا خفا سی جھیل کنارے چلنے لگی۔ داتن نے اس کا پرس اٹھایا اور پیچھے لپکی۔

”یعنی اب وہ تمہیں اپنے گھر نہیں آنے دیں گے؟ چلو اچھا ہوا، اس سکے سے جان چھوٹی۔“

”اس سکے کے لیے ان کے گھر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ایڈم کے پاس ہے اور اسے میں سنبھال لوں گی، مگر داتن.... انہوں نے مجھ پہ غلط الزام لگایا۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، اور داتن اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں ہانپنے لگی تھی۔ تالیہ کے اس طرف جھیل تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ داتن تالیہ اس کو دیکھنا چاہتی تو تیز آتی روشنی آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے، پھولے سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔

”تم نے کون سا دوبارہ ان سے ملنا ہے جو ان کی باتیں اہمیت رکھیں؟“

”عصرہ نے مجھے پھنسا لیا ہے۔ وہ جانتی ہے کس نے فائل چرائی ہے، یقیناً اس کے بھائی نے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو اپنے شوہر کی فائل چرانے والی لڑکی سے پینٹنگ مکمل نہ کرواتا۔ اس نے اصل چور کو پچانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ مجھے وہ فائل فاتح کو واپس لا کے دینی ہے۔“ وہ جھیل کے سرے پہ چل رہی تھی۔ سنہری چوٹی کندھے پہ آگے ڈال رکھی تھی، جس سے ناراض لٹیں نکل کے گردن کو چھو رہی تھیں۔

”پہلے گھائل غزال اور اب یہ فائل... فاتح کے مسائل تمہارے مسائل نہیں ہیں، تالیہ۔“ داتن کا سر پیٹ لینے کا دل چاہا۔
 ”گھائل غزال کو بھی میں دیکھ لوں گی مگر وہ جو بھی فائل ہے وہ اس کے لئے ضروری ہے۔“ وہ رکی اور داتن کی طرف گھومی۔ اب
 دھوپ میں چمکتی جھیل اس کے پیچھے تھی جس کے باعث وہ اندھیرے میں نظر آرہی تھی۔ داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے اسے
 دیکھا۔

”تمہیں ابھی سکھ بھی ڈھونڈنا ہے اور سمجھ کو بھی سنبھالنا ہے ایسے میں تم سب چھوڑ کے وہ فائل اشعر سے چرانا چاہتی ہو؟“
 ”کس نے کہا کہ میں اسے چراؤں گی؟“ وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔ وہ ایسے صرف تب مسکراتی تھی جب اس کے پاس پلان ہوتا تھا اور
 تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔
 ”پھر کون؟“

”حالم!“ اندھیرے میں کھڑی تالیہ مسکرائی۔ کرنیں اس کے اطراف سے نکل کے سامنے پڑ رہی تھیں۔ ”حالم واپس لائے گا وہ
 فائل!“

داتن پدو کا کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ چھجا بنایا ہاتھ نیچے گر گیا۔
 ”تم حالم کو اس معاملے میں لانا چاہتی ہو؟“
 ”ہم نے پچھلے سال ایک ممبر پارلیمنٹ فارض ڈینیئل کی بیوی کا لاکٹ چرایا تھا اور حالم نے بھاری رقم لے کر لاکٹ واپس لا دیا
 تھا۔ آگے تمہیں معلوم ہے کہ فارض صاحب کو کیسے استعمال کرنا ہے۔“
 داتن نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”وان فاتح نے تمہاری توہین کی۔ تم پھر بھی اس کے ساتھ اچھائی کیوں کرنا چاہتی ہو، تالیہ؟“
 تالیہ کے اطراف سے اتنی تیز دھوپ نکل رہی تھی کہ اس کا چہرہ تاریک لگ رہا تھا۔ داتن اس کے تاثرات نہیں دیکھ پارہی تھی مگر
 اس کی آواز... اس میں عجیب جادوئی پن تھا۔

”کیونکہ ایک دن آئے گا جب وہ مجھے کہیں گے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ ان کو میری ضرورت ہے۔ میں اس دن کے انتظار
 میں وہ وعدہ نبھارہی ہوں جو ابھی انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور عقب میں سورج کی کرنیں جھیل کے پانی پہ رقص کر
 رہی تھیں... گویا سونے کا چمکتا ہوا ڈھیر ہو جو حد نگاہ تک پھیلا ہو.....

دو دن سے چھائی گدلی دھنداب چھٹ رہی تھی اور دن طلوع ہو رہا تھا.....

ملائیشین پارلیمنٹ کی عمارت میں ایک اونچا ٹاور تھا جو ایک زمانے میں شہر کا بلند ترین ٹاور ہوا کرتا تھا۔ یہ ملے کرنسی کے سکے پہ بھی نقش کیا ہے، مگر کم لوگ جانتے ہیں کہ اونچے ٹاور میں صرف درکرز کے آفس وغیرہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ جو بظاہر چھوٹی ٹینٹ نما عمارت بنی ہے پارلیمنٹ اور سینیٹ کے ایوان دراصل اس میں موجود ہیں۔

اس وقت وان فاتح پارکنگ میں رکی کار سے باہر نکل رہا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس بالوں کو دائیں طرف جمائے وہ ازلی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے ہوئے تھا۔

”میری کافی کا دوسرا گک کہاں ہے؟“ عثمان سے چھوٹے ہی پوچھا تو عثمان گڑبڑا گیا۔

”سوری سر، عبداللہ کی ڈیوٹی ہے اور وہ پہنچا نہیں ہے ابھی تک۔“

”تو ایڈم کہاں ہے؟“ فاتح نے صرف ایرواٹھایا۔ نہ غصہ نہ اکتاہٹ۔

”سروہ بھی شاید چھٹی پہ....“

”ویری پور مینجمنٹ۔“ بغیر غصے کے تبصرہ سا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے ہی سوٹ اور روایتی لباس ٹوپوں میں موجود افراد

عمارت میں داخل ہوتے نظر آرہے تھے۔ فاتح کو دیکھتے ہی بہت سے اس کی طرف بڑھے۔ وہ بھی مسکراتا ہوان کے قریب آیا۔ سر کے خم سے سلام کا جواب دیا۔ اکثریت ممبرز پارلیمنٹ کی تھی۔

”وان فاتح.... آپ کے گھر سنا ہے چوری ہوگئی؟“

”کوئی کاغذات وغیرہ تھے؟ پولیس میں رپورٹ کی؟“

”اللہ کرے زیادہ نقصان نہ ہوا ہو۔“

فاتح کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر کے خم کے ساتھ ”شکریہ... زیادہ مسئلہ نہیں ہے“ کہہ کے آگے بڑھتا گیا۔ جیسے ہی عمارت کے

اندر لفٹ تک پہنچا اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور قدرے برہمی سے وہ عثمان کی طرف پلٹا۔ ”یہ بات ساری دنیا کو کیسے معلوم ہوئی؟“

”پتہ کرتا ہوں سر۔“ وہ فوراً واپس دوڑا اور فاتح نے سر جھٹکتے ہوئے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

ملے پارلیمنٹ کے ساتھ بنے اونچے ٹاور میں اپوزیشن پارٹیز کو جو فلور ملے تھے وہ تیرہویں اور چودہویں تھے جس بات کا اکثر

مذاق بنایا جاتا تھا کیونکہ یہ بدقسمت نمبرز سمجھے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک بدقسمت فلور پہ وہ اپنے آفس میں داخل ہوا ہی تھا کہ عثمان واپس آیا۔

”ابھی آدھا گھنٹہ قبل...“ وہ ہانپ رہا تھا۔ ”... سب ممبرز پارلیمنٹ کو ان کے ورک ای میل پہ میلر ملی ہیں جس پہ ایک جعلی خبر بنا کے

لکھا گیا ہے کہ آپ کے گھر چوری ہوئی ہے۔“

”اشعر۔“ اس نے دل میں سوچا اور عثمان کو جانے کا اشارہ کر دیا اور اپنی ڈائری کھول لی۔

اب وہ آفس میں اکیلا تھا۔ نفیس سا آفس جو لیڈر آف دی اپوزیشن کو ملا کرتا تھا۔ پچھلے سال اپوزیشن کے لیڈر نے (جو کہ فی الوقت باریسن نیشنل کا چیئر مین بھی تھا) اس منصب سے استعفیٰ دے دیا تھا، جس کے بعد اپوزیشن نے وان فاتح کو اپوزیشن لیڈر چنا تھا۔ پچھلے ایک سال سے یہ اس کا آفس تھا۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو اس نے نوٹس سے نظر اٹھائی۔ عبداللطیف صاحب چوکھٹ میں کھڑے تھے۔ سفید بالوں اور جناح کیپ والے عبداللطیف روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ فاتح نے عینک اتاری، نوٹس رکھے اور مسکرا کے ان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”یہ چوری کا کیا قصہ ہے؟“ وہ کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”ملا کہ والے گھر کے ڈاکو منٹس غائب ہو گئے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ اشعر نے یہ کیا ہے۔ مگر خیر...“ اس نے شانے اچکائے۔

”دل جائیں گے۔“

”مگر اشعر نے یہ کیا کیسے؟“ وہ حیران ہوئے تھے۔ کھڑکی کے بلاسٹڈز بند ہونے کے باعث آفس میں نیم اندھیرا سا تھا مگر فاتح کا چہرہ پھر بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔

”1849ء میں ایک آدمی ہوتا تھا امریکہ میں ولیم تھامسن نام کا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ”بظاہر بڑا قیمتی لباس پہنے متاثر کن سا لگتا تھا۔ ایک دن وہ سڑک پہ آیا اور ایک ایک شخص کو روک کے پوچھنے لگا، کیا آپ کو مجھ پہ اتنا کانفیڈنس ہے کہ آپ کل تک کے لئے اپنی گھڑی میرے پاس رکھوا دیں؟ یہ اتنا ڈائریکٹ سوال تھا جس کا تعلق ایک انسان کی عزت نفس سے تھا کہ بہت سے لوگوں نے لحاظ میں اس کو اپنی گھڑی دے بھی دی۔ وہاں سے اس کھیل کا نام کانفیڈنس گیم یا con گیم پڑا اور ایسے آدمی کو کانفیڈنس مین یا con مین کہا جانے لگا۔ کون آرٹسٹ (بہروپیہ) وہ آدمی ہوتا ہے جو اس چیز کو استعمال کرتا ہے جس پہ ان کے شکار کا مکمل بھروسہ ہوتا ہے... اور... (گہری سانس لی)... عصرہ ہر دوسرے آرٹ کلکٹر یا آرٹسٹ سے بہت جلدی متاثر ہو جاتی ہے اس لئے اشعر نے ہماری زندگیوں میں ایک اسی شعبے سے تعلق رکھنے والے شخص کو داخل کیا جس نے یہ چوری کی۔“

”مرد ہے یا عورت؟“ انہوں نے حیرت بھری دلچسپی سے پوچھا۔

”میں اس کے پیچھے اس کے بارے میں یوں بات نہیں کرنا چاہتا۔ جو بھی ہے اپنے کیے کی سزا اس کو مل جائے گی۔“ وہ بے نیاز لگتا تھا۔

”اور اگر کاغذات نہ ملے؟“ ان کو تشویش ہوئی۔

”اللہ مالک ہے۔ میں کوئی اور حل نکال لوں گا۔ اور پھر میں کہاں ان چیزوں سے ہار مانتا ہوں، عبداللطیف۔“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ دروازہ ذرا سی دستک سے کھلا۔ دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا، پھر دونوں کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”فارض صاحب... آئیے۔“ فاتح نے گرجوشی سے مسکرا کے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جو صاحب اندر آئے وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ پستہ قد اور چینی نقوش کے حامل، عینک لگائے خوش مزاج سے لگتے تھے۔ سلام کیا اور کرسی سنبھالی۔

”میں نے آپ کے گھر میں چوری کا سنا، فاتح!“ وہ تشویش سے بیٹھتے ساتھ ہی بولے۔ ”پولیس کارروائی کر رہی ہے کیا؟“

”زیادہ فکر کی بات نہیں۔“ اس نے نرمی سے مسکرا کے ان کو تسلی دی۔

”آپ مطمئن لگ رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اندر سے پریشان ہیں، لیکن آپ ٹھہرے لیڈر... کبھی کمزوری ظاہر نہیں کریں گے۔ بہر حال... آپ نے کسی انویسٹی گیٹر کو ہائر کرنے کا سوچا ہے؟ یقیناً آپ اپنے گھر پولیس والوں کا داخلہ پسند نہیں کریں گے۔“

”میں ہینڈل کر لوں گا۔“ وہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا فارض صاحب کی بہت عزت کرتا ہے۔

”پچھلے سال میری بیوی کا ایک قیمتی لاکٹ چوری ہوا تھا۔ اس کی نانی کی نشانی۔ وہ بھی بھری پارٹی میں سے۔ مجھے کسی نے اس اسکام اور فراڈ انویسٹی گیٹر کا بتایا تو میں نے اس سے رابطہ کیا۔ اس نے چند گھنٹوں میں برآمدگی کر دی۔ چوری کے پہلے چند گھنٹے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس کا نمبر دیتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی پرائیوٹ انویسٹی گیٹر زہ مجھے اتنا اعتماد نہیں ہے۔“

”مجھ پہ تو ہے نا؟ میں نے اس آدمی سے کام لیا ہوا ہے۔ انتہائی ذہین اور شاطر ہے۔ تھوڑا گھمنڈی اور مغرور بھی ہے، پیسے بھی کافی لے گا لیکن اس کی مہارت کے اتنے پیسے تو بنتے ہیں، فاتح صاحب۔“ وہ مصر ہوئے۔

”اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔“ اس نے رمان سے بات کو نال دیا۔

فارض ڈیمینیل باہر آئے اور فون پہ ایک نمبر ملا کے کان سے لگایا۔

”حالم... میں نے تمہاری طرف ریفر کیا ہے، وان فاتح کو۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ رابطہ کرتے ہیں تم سے یا نہیں۔ اب تک چوری کی خبر اتنی پھیل چکی ہے کہ بہت سے انویسٹی گیٹر زان سے رابطہ کر کے ان کو اپنا کلائنٹ بنانے کی کوشش کریں گے۔ تمہارا احسان تھا مجھ پہ، میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔“ پیشانی کو مسلتے ہوئے مایوسی سے کہہ رہے تھے۔

”خیر... مجھے کون سا کلائنٹس کی کمی ہے...“ جواب میں حالم کا کھڑلجہ سنائی دیا تھا۔ ”میں تو آپ کے لئے کہہ رہا تھا... جب وان فاتح کا مسروقہ مال برآمد کر کے دوں گا تو وہ آپ کے ہی مقروض ہوں گے۔ ورنہ مجھے کیا۔ ہونہ۔“ کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔

فارض صاحب نے گہری سانس لے کر فون کان سے ہٹایا۔ مغرور اور گھمنڈی حامل... وہ کبھی نہیں بدل سکتا تھا۔

☆☆=====☆☆

وہ کوالا لمپور کا ایک مصروف بازار تھا۔ درمیان میں پتھر ملی روش تھی جس پہ خریدار چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں ایک دکان کے آگے چھتری تلے کرسیاں میز لگی تھیں جن میں سے ایک پہ تالیہ بیٹھی تھی اور ابھی اس نے ہونہ کہہ کے فون بند کیا تھا۔ داتن نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”اگر حامل اپنے سابقہ کلائنٹ کو تھوڑی خوش اخلاقی دکھا دے تو حامل کا کیا جاتا ہے؟“

”کس خوشی میں؟ حامل کا ماریٹ میں کوئی امیج ہے، کوئی رعب ہے، اسے ختم تھوڑی کرنا ہے؟“ وہ زوٹھے پن سے بولی۔ ٹیک لگائے، ناگ پہ ناگ جمائے بیٹھی تھی۔ سفید کوٹ اتار دیا تھا اور زرد فرائک نمائیش دکھائی دے رہی تھی۔ سنہری چوٹی آگے کو ڈال رکھی تھی۔

”خیر... میں نے ای میل کر کے دس منٹ میں ساری پارلیمنٹ میں چوری کی خبر پھیلا دی تھی۔ فارض سمجھا ہوگا کہ حامل کو بھی اسی طرح اڑتے اڑتے خبر ملی ہے اور وہ کلائنٹ بنانا چاہ رہا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ فاتح پھنس گیا؟“

”دیکھتے ہیں۔“ وہ پرامید تھی۔ پھر گھڑی دیکھی۔

”ایڈم آنے والا ہوگا۔ تم اب جاؤ اور کام شروع کرو۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ کس نے فائل چرائی ہے۔“

”ابھی تو فاتح نے ہمیں ہار ہی نہیں کیا۔“

”کہانا، مجھے وہ وعدہ نبھانا ہے جو اس نے مجھ سے کبھی مستقبل میں لینا ہے۔ جاؤ موٹی! کام شروع کرو۔“ داتن ناک سکڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی اور بیگ اٹھالیا۔

”یہ وہ پہلا کیس ہوگا جو حامل ایمانداری سے حل کرے گا، کیونکہ پچھلے ہر کیس میں حامل خود ہی چور ہوتا تھا۔“ چڑانے کو بولی مگر تالیہ نے اثر نہیں لیا۔ بس میز پہ رکھا سفید بیٹ اٹھا کے سنہری بالوں پہ رکھ دیا اور چہرے کے سامنے اخبار پھیلا لیا۔ گویا اب وہ چند منٹ یہاں سستانا چاہتی تھی۔

”چے تالیہ!“ زیادہ دیر نہیں گزری جب ایڈم کی آواز پہ اس نے اخبار ہٹا کے دیکھا۔ وہ سادہ پیٹ شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں شاپنگ بیگ اٹھائے سامنے والی کرسی کھینچ رہا تھا۔ کنپٹی پہ پسینے کے قطرے تھے گویا دھوپ میں چل کے آ رہا ہو۔

”تم نے اس بازار میں ملنے کے لئے کیوں کہا؟“ تالیہ نے ایک نظر شاپنگ بیگ پہ ڈالی جو اس نے میز پہ رکھ دیا تھا۔

”در اصل میں یہاں آیا ہوا تھا، اگر کہیں دور ملتا تو بس کا کرایہ بہت لگ جاتا۔“ وہ سادگی سے کہہ کے بیٹھ گیا۔ چہرے پہ شفاف سی

مسکراہٹ تھی۔ ”میری جاب ختم ہوگئی آج“ چے تالیہ۔“

”آج کیوں؟“ وہ چونکی۔ ”ابھی تو دو دن رہتے تھے۔“

”کیونکہ عبداللہ واپس آ گیا ہے۔“

”خیر... میرے نزدیک تمہارے گیارہ دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ تمہاری جاب جاری ہے۔“ وہ ٹیک لگائے سر پہ ترچھا بیٹ رکھے، مسکرا کے بولی۔

”اوکے۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ پر جوش اور متحس تھا۔ تابعدار سا تابعدار۔

”ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ وان فاتح کے دشمن صرف وان فاتح کے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس گھر میں موجود ایک قدیم artefact کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں... تم نے جب فاتح صاحب سے میرا ذکر کیا ہوگا تو انہوں نے بتایا تو ہوگا نا؟“ گہری آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ اس نے نفی میں سر بلایا۔

”میں ان سے مل بھی نہیں سکا اور پوچھنا عجیب سا لگتا تھا۔“ (شکر!)

”خیر... تم ان کے لئے اجنبی ہو ظاہر ہے وہ نہیں بتائیں گے۔“ تالیہ نے سکون کی سانس لی۔ ”یہ لینٹیک بیس فی الوقت ان کے پاس موجود نہیں ہے اور وان فاتح نہیں جانتے کہ وہ کہاں گیا۔ یہ دیکھو... کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟“ اس نے ایک کاغذ کھول کے ایڈم کے سامنے رکھا۔

وہ پولیس رپورٹ لگتی تھی۔ نیشنل ٹریزر۔ (قومی ورثہ) اور ساتھ اس کی تاریخی اہمیت۔ مگر ایڈم کی نظر پر عذ تصویر پہ جم گئی۔ سنہرے رنگ کا سکہ۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”یہ؟ یو...“ اس نے بوکھلا کے تالیہ کو دیکھا۔ ”یہ تو مسز عصرہ نے مجھے دے دیا تھا۔“

”اوہ!“ تالیہ نے لب سکڑے۔ ”شاید عصرہ فاتح صاحب کو بتانا بھول گئیں۔ خیر ایڈم۔ تمہیں وہ سرکار کو واپس کرنا ہوگا کیونکہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔“ وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ایڈم بلکہ سرکاری خزانہ واپس لوٹانے پہ سرکار تمہیں بونس دے گی اور...“ وہ رساں سے اس کو تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر....

”میں نے اس کو تڑوا کے اپنی منگیتر کے لئے ابھی ابھی انگوٹھی بنوائی ہے“ چے تالیہ۔“

تالیہ کا سارا سکون اور اعتماد غارت ہوا۔ دماغ بھک سے اڑا۔ ”واٹ؟“ وہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔

”تم.... بے وقوف.... بے عقل جلد باز انسان.... یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ کدھر... کدھر ہے وہ انگٹھی....“ پھر اس نے خود ہی شاپر میز سے جھپٹا اور کھولا۔ ڈبے کے اندر سے انگٹھی نکالی۔ انگلیوں میں ٹٹول کے اسے دیکھا۔ ”اس نے تمہارے سامنے سکے کو پگھلایا؟ بتاؤ میں جو پوچھ رہی ہوں۔“

”نہیں۔ وہ سکہ اندر لے گیا اور انگٹھی کے ساتھ واپس آیا۔ ڈیزائن میں نے اسے بتا دیا تھا۔ فاطمہ کو اسکے والد نے بچپن میں....“

مگر تالیہ کو اسکی لواستوری میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ ”کہاں ہے وہ شاپ؟“

”یہیں قریب میں ہے... مگر اب کیا ہو گا چے تالیہ۔“ وہ پریشانی سے کھڑا ہوا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ ایک ہاتھ میں پرس اٹھایا دوسرے میں انگٹھی دبوچی اور چار حانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ بازار میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دونوں بھیڑ میں آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔

آگے چلتی تالیہ کی چوٹی کندھے پہ سامنے کو پڑی تھی۔ پیچھے چلتے ایڈم کو اس کی گردن کی پشت پہ گول سا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ایوان میں نشستیں انگریزی کے حرف لاء کی صورت لگی تھیں۔ مرکزی مقام پہ اسپیکر کا اونچا چوڑا ترہ تھا جہاں وہ اپنی بلند کرسی پہ بیٹھا کاغذات کو عینک لگا کے پڑھ رہا تھا۔ اولین نشستوں پہ وزیراعظم بیٹھی نظر آرہی تھی۔ گردن کڑائے سر پہ اسٹول لئے وہ بت کی طرح بیٹھا کرتی تھی۔ اوپر ہال میں لاء کی ہی صورت میں گیلری بنی تھی جہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ رپورٹرز اور حاضرین وہاں بیٹھے ایوان کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔

پارلیمنٹ کسی بھی جمہوری ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا ہے۔ جمہور کا مطلب ہے ”عوام“۔ جمہوری ملک وہ ہوتا ہے جہاں عوام ووٹ دے کر اپنا صدر یا وزیراعظم چنتے ہیں۔ بادشاہت جن ملکوں میں ہوتی ہے وہاں بادشاہ اپنا وارث خود چنتا ہے جو عموماً اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

ملائیشیاء چونکہ جمہوری ملک ہے اس لئے اس کا پارلیمان ملک کا سب سے بڑا اور مقدس ادارہ ہے۔ یہاں جو لوگ اپنے اپنے علاقوں سے ووٹ لے کر جیت کے آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں اور ملک کے قانون بناتے ہیں۔ سیاستدانوں کا صرف ایک کام ہوتا ہے۔ مل بیٹھ کے قانون بنانا۔ ملک کے اداروں کو مضبوط کرنا۔

آج بھی یہاں یہی ہو رہا تھا۔ صوفیہ رحمن بل لائی تھی، یعنی ایک نیا قانون اس نے تمام ممبرز پارلیمنٹ کے سامنے رکھا تھا اور اس کے لئے ووٹنگ ہو رہی تھی۔ صوفیہ کی جماعت کے قریباً دو سو سے زائد لوگ پارلیمان میں تھے اور وان فاتح کی باریسن نیشنل کے

ساتھ لوگ۔ رپورٹرز جمائیں روکتے پہلے سے لکھ رہے تھے کہ بل پاس ہو جائے گا۔ کہاں دوڑھائی سواور کہاں ساٹھ۔ وہ عبداللطیف کے قریب کرسی پہ ٹیک لگائے انگلیاں بانیں گال تلے رکھے کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دوسری طرف اشعر آ کے بیٹھا۔

”میں نے پارلیمنٹ میں آتے ہی سنا کہ آپ کے گھر چوری ہو گئی ہے؟ کا کا نے بھی نہیں بتایا۔“ تشویش سے اس کی طرف جھکے وہ بولا تو فاتح نے صرف ایک گہری نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”Who Cares?“ اور سامنے دیکھنے لگا۔

اشعر البتہ ابھی تک تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”امید ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا ہوگا۔“ وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مائیک درست کیا۔ اس کی تقریر کا وقت ہو چکا تھا۔ اشعر زیر لب مسکرا دیا۔ ”جناب اسپیکر مجھے کچھ کہنا ہے۔“ سوٹ میں ملبوس مدہم مسکراہٹ لئے وہ دراز زد اور اسمارٹ سا آدمی کہنے لگا۔ ”حکومتی اراکین کو چاہیے کہ وہ تحمل رکھیں۔ میں ان کو بور نہیں ہونے دوں گا۔“

ہال میں قہقہہ گونجا۔ دلچسپی بڑھی۔ توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی۔ ”کل مجھے کسی نے کہا کہ آج اس بل کو ڈھائی سو ووٹ مل جانے ہیں تو ہم ساٹھ اپوزیشن اراکین کے ”ناں“ میں ووٹ کرنے کا کیا فائدہ؟“ وہ گردن گھما کے پورے ہال کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں ملائی شیاء کے لوگوں کو آج ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میرے لوگ جب بھی ایک بڑے عدد کے مقابلے میں چھوٹے عدد کی مخالفت دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ان چند لوگوں کی ہاں یا ناں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ غلط سوچ ہے۔ کیونکہ مخالفت عددی نہیں اصولی ہوتی ہے۔ ہم لوگ صوفیہ رحمن کے اس قانون کے خلاف ووٹ اس کو ہرانے کے لیے نہیں ڈال رہے۔ ہم اپنا اختلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے آئے ہیں۔ ہم تھوڑے ہیں مگر ہم ناں میں ووٹ دے کر سارے ملک کو پیغام دینے آئے ہیں کہ یہ جو ہورہا ہے یہ غلط ہے.... ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ اپنی کم تعداد سے گھبرائے بغیر ہم نے غلط کو غلط کہنا ہے.... اور اگر ہم یہ کہنا سیکھ لیں تو ہم میں سے ایک ایک مخالف کے دس دس پہ بھاری ہوگا۔ کیونکہ صوفیہ رحمن صاحبہ صرف اپنی اور اپنے والد کی کرپشن کو چھپانے کے لئے....“

ہال میں شور گونجنے لگا.... تا دہی فقرے.... نعرے.... وان فاتح بھی مزید اونچا بولنے لگا.... ”اور اپنی چوری کو بچانے کے لئے....“ (حکومتی ارکان جگہوں سے کھڑے ہو گئے) ”روزنت نئے بل لے آتی ہیں.... تاکہ لوگوں کو بے وقوف بناسکیں....“ (لوگ کھڑے کھڑے ڈیسک بجانے لگے جس کا مطلب احتجاج تھا۔ فاتح کی آواز مزید بلند ہو گئی اور گردن پہلے سے زیادہ اونچی)

”مگر پردھان منتری صاحبہ.... یاد رکھیے گا... جب تک وان فاتح رامنزل زندہ ہے... وہ آپ سے آپ کی چوری کا حساب مانگتا رہے گا... اور ایک دن آپ کو اس ملک میں سرچھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔“

کسی نے بل کی کاپیاں ہوا میں اڑائیں... کسی نے فائلیں نیچے گرائیں... اپوزیشن کے ساتھ اراکین کا غذا اچھالتے ہوئے نعرے بھی لگا رہے تھے...

”اور اسی کے ساتھ ہم اس بل کی مخالفت میں ایوان سے واک آؤٹ کرتے ہیں۔“ کہہ کے وہ مائیک پہ جھکا اور ڈیمک پہ دو دفعہ زور سے ہاتھ مارا پھر سیدھا ہوا اور نشست کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

بارین نیشنل کے اراکین کاغذوں کے پرزے اچھالتے اس کی معیت میں دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حکومتی اراکین شور کر رہے تھے اور اسپیکر مسلسل ”بیٹھ جائیے“ ایسے نہ کیجئے۔“ کہہ کے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپوزیشن اراکین باہر نکلے تو وہاں کھڑے رپورٹرز دھڑا دھڑا تصاویر کھینچنے لگے۔ فاتح جو سب سے آگے تھا، مسکرا کے ہاتھ فضا میں بلاتا آگے بڑھ گیا۔

”مسز عصرہ کا فون ہے سر!“ وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب عثمان نے اپنا فون اسے لا دیا۔ فاتح نے فون کان سے لگایا۔ ”کیا ہوا؟“

”تمہیں کال کر رہی تھی، تم اٹھ نہیں رہے تھے۔ فائل کا کچھ پتہ چلا۔“ وہ فکر مند لگ رہی تھی۔

”تمہارے بھائی کو بہتر پتہ ہوگا۔“ وہ لفٹ میں داخل ہوا۔

”وہ تالیہ... جاتے ساتھ اشعر کو بتائے گی اور اشعر بہت برا منائے گا کہ ہم نے تالیہ پہ شک کیا۔“

”شک کیا؟ مجھے یقین ہے یہ اسی کا کام ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔ لفٹ نیچے جا رہی تھی۔ عثمان خاموشی سے ساتھ کھڑا تھا۔

”کیا ہم اور بیجمل فائل دوبارہ نہیں نکلوا سکتے؟ جب گھر تمہارے نام رجسٹرڈ ہے تو مسئلہ کیا ہے؟ وہ فائل اگر ایش نے چوری بھی

کروائی ہے تو اب وہ تو ہمیں نہیں ملنی۔“

”بہت وقت لگ جائے گا اس میں۔ خیر میں مصروف ہوں۔ گھر آ کے بات کرتا ہوں۔“ اس نے فون عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

اب وہ اکتایا ہوا لگنے لگا تھا۔

”فارض کو ڈھونڈو۔ اس سے ہو مجھ سے پارکنگ میں ملے۔ ہرنوں کے پاس۔“ کچھ سوچ کے بولا تو عثمان نے اثبات میں سر ہلا

دیا۔ لفٹ کے دروازے کھلنے کو تھے۔ فاتح نے چہرے پہ وہی مسکراہٹ طاری کر لی۔

سیاستدان کا بزنس فیس....

بازار میں سرخ اینٹوں کی روشنی تھی جس پہ بھیڑ کے درمیان وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ سفید ہیٹ پہنے، سنہری چوٹی آگے کو ڈالے، تالیہ آگے تھی اور ایڈم پیچھے۔ وہ جس جارحانہ انداز میں جا رہی تھی، ایڈم بار بار اس کا غصیلا چہرہ دیکھ کے سوچتا کہ یہ تو جاتے ساتھ ہی جیولر کی گردن دبوچ لے گی....

جیولر اسٹور پہنچتے ہی تالیہ سیدھی اندر گھس گئی۔ ایڈم پیچھے لپکا۔ شوکیس کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ تالیہ کو دیکھ کے وہ خوش اخلاقی سے مسکرا کے اٹھا۔ ”السلام علیکم میڈم!“ کہیں پیچھے تیز پٹکھے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

”وعلیکم السلام انکل۔ یہ میرا بھائی ابھی آپ سے انگوٹھی لے کر گیا تھا۔ بہت ہی جلد باز ہے یہ۔ مجھے بتائیے میں اس کا کیا کروں؟ آخر یہ کب بدلے گا؟“ وہ کرسی پہ بیٹھتے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ دوستانہ لہجہ، قدرے پچگانہ آواز۔ ایڈم محمد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ بالکل بھی غصے میں نہیں لگ رہی تھی۔ ”اب دیکھیں نا.... ہماری ماں کا سکہ ہی بیچ دیا، وہ بھی اپنی بیوی کے لئے۔ جس دن سے اس کی شادی ہوئی ہے، ہم بہن بھائی تو مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ اب بتائیں، میں ماں کو کیا جواب دوں گی؟“ معصومیت سے پوچھتے ہوئے پلکیں جھپکیں۔

”وہ سکہ تو ہم نے پگھلا دیا میم۔“ سیلز مین متانت سے اس کے مقابل کھڑے ہوا۔

”ان چے (مسٹر)....“ وہ آگے کو ہوئی اور بے بسی بھری معصومیت سے بولی۔ ”وہ سکہ ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ ہمارے دو چھوٹے چھوٹے اکلوتے ماں باپ ہیں۔ وہ شدید ناراض ہوں گے۔“

ایڈم بس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ منہ کھولے۔

”میم.... وہ صحیح کہہ رہا ہے، سکہ ہم نے پگھلا دیا ہے۔ ہم آپ کی رقم واپس کر سکتے ہیں، مگر سکہ نہیں۔“ ایک ادھیڑ عمر صاحب کوٹنے سے اٹھ کے اس طرف آئے تو تالیہ نے مسکرا کے گردن موڑی اور دلچسپی سے ان کو دیکھا۔ پھر ہیٹ اتار کے شوکیس پہ رکھا۔

”آپ نے ناشتے میں انڈا کھلایا تھا کیا؟“

ان صاحب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ”جی؟“

”آپ کی شرٹ پہ ادھر انڈے کا داغ لگا ہے۔ شاید آپ ناشتے کے بیچ میں تھے جب آپ کے اس ملازم نے آپ کو کال کر کے

بتایا کہ ایک بے وقوف (ایڈم کی طرف اشارہ کیا) ایک لہٹیک سکہ لے کر آیا ہے اور آپ بھاگے بھاگے چلے آئے۔ جیولر اور اتنے آرام سے لہٹیک پگھلا دیں، میں کیسے مان لوں، ہوں؟“ پھر سے پلکیں جھپکیں۔

”بیٹے مجھے واقعی سکے کی تاریخی اہمیت کا علم نہیں۔ ہم فوراً سونا پگھلا دیتے ہیں اور وہ اس نے میرے سامنے پگھلا دیا ہے۔“ وہ پکے رہے۔

تالیہ نے کہنی شوکیس پہ رکھی اور ہتھیلی پہ گال جمایا۔ ”میں پولیس کو بلا لوں، انکل؟“

”ہم نے قانونی طریقے سے انگوٹھی بنائی ہے، بل وغیرہ سب ہمارے پاس ہے۔ پولیس کیا کرے گی بیٹا؟“

”نہیں انکل، انگوٹھی کے لئے نہیں۔ ان پنکھوں کے لئے۔“ اس نے مسکرا کے ابرو سے اشارہ کیا۔ سب کی گردنیں مڑیں۔ کونے

میں ایک دروازہ تھا جو دکان کے اندر کھلتا تھا۔ ادھیڑ عمر یلز مین کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ”کیا مطلب؟“

”یہ دکان بالکل کونے میں ہے۔ الگ تھلگ سی۔ اور اس کے ہیمنٹ سے پنکھوں کی آواز آرہی ہے۔ آپ نے ہیمنٹ میں

پنکھے کیوں چلا رکھے ہیں؟ ہوں۔ مجھے سوچنے دیں۔“ ہتھیلی پہ گال رکھے آنکھیں بند کر کے سوچا پھر کھول کے مسکرائی۔

”نیچے تہ خانے میں... جڑی بوٹیاں اگاتے ہیں آپ ہے نا... نشہ آور بڑی بوٹیاں... ڈرگز... ان کی بو یہاں تک آرہی ہے مجھے

تمہیں آرہی ہے نا، بھائی؟“

ایڈم نے مٹھن مرا ثبات میں بلایا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ دونوں دکانداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”اب بازار کے لوگ تو آپ سے ڈرتے ہیں، کسی کو بتاتے نہیں، لیکن میں تو نہیں ڈرتی، میں تو پولیس کو بلا سکتی ہوں۔ ہاں لیکن

میں اتنی بری نہیں ہوں۔ کیوں آپ کے رزق پہ پیر ماروں۔ اس لئے...“ دوسری ہتھیلی سیدھی پھیلائی۔ ”میرا سکہ میرے ہاتھ پہ رکھ

دیں اور سمجھیں کہ ہم نے آپ سے کبھی کچھ لیا ہی نہیں۔“

ادھیڑ عمر دکان کا مالک چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو تھیلی ہاتھ میں تھی۔ اس

سے پہلے کہ وہ اسے تالیہ کے ہاتھ پہ رکھتا ایڈم نے ”شکریہ“ کہہ کے وہ اس سے لے لی۔

”یہ واپس لے لیجیے۔“ سنجیدگی سے اس نے انگوٹھی والا بیگ پرے دھکیلا۔

”ارے میں اس کی ہیمنٹ کرتی ہوں۔“ تالیہ نے پرس کھولا مگر وہ باہر جا رہا تھا۔

”ضرورت نہیں۔“ وہ خشک لہجے میں کہہ کے نکل گیا تو تالیہ سنبھل کے مسکرائی اور ”تھینک یو انکل“ کہتی اس کے پیچھے لپکی۔

وہ باہر روش پہ چلتا جا رہا تھا۔ سنجیدہ خاموش۔

”تمہارے موڈ کو کیا ہوا ہے؟“ ایڈم نے ایک خفا نظر اس پہ ڈالی۔

”آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے جھوٹ بول دیے۔“

”کیا تم نے نور سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ میں نے تمہیں تحفے دے کر بھیجا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولی تو ایڈم نے مڑ کے اسے

دیکھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے سر پہ ترچھا بیٹ رکھے وہ اندروالی بچگانہ سادہ لڑکی سے مختلف نظر آرہی تھی۔

”جی، آپ کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا تھا مجھے۔ لیکن آپ نے ایک ڈرگز کے چلتے کاروبار کو نظر انداز کر دیا اس سکے کے پیچھے۔“
”تو میں کیا کر سکتی تھی؟“

”آپ پولیس آفیسر ہیں، ان کو گرفتار کر تیں اور سکہ برآمد کر لیتیں۔“

”یہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے۔ جو کام ضروری ہوتا ہے اس پہ فوکس کیا جاتا ہے ہاں۔“ وہ روش کے درمیان میں کھڑے تھے۔
لوگ ان کے اطراف میں آ جا رہے تھے۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔

”مگر آپ.... آپ اتنی آسانی سے جھوٹ کیسے بول لیتی ہیں؟“

”I Lie for a Living!“ وہ سنجیدگی سے اس کے زچ چہرے پہ نظریں جمائے بولی۔ ”اب مجھے یہ سکہ دوتا کہ میں اس کو سرکار کو لٹاؤں اور تمہارا بونس تمہیں دلاؤں۔“ ہتھیلی پھیلائی۔

”کیا آپ واقعی پولیس آفیسر ہیں؟ یونو، میں فورسز میں تھا۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں ان چیزوں کے بارے میں۔“
”اوہ۔“ تالیہ کے ابرو بھنجے۔ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ”تم مجھ پہ شک کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے۔ کرو شک۔ بلکہ ایسا کرو، یہ سکہ بھی تم ہی رکھو۔ میں رپورٹ لکھ دوں گی اور اس کیس سے الگ ہو جاؤں گی۔ آگے ڈیپارٹمنٹ جانے اور تم جانو۔“

کہہ کے وہ غصے سے آگے بڑھ گئی تو وہ کچھ خفا، کچھ الجھا ہوا مڑا۔ ”چے تالیہ!“

تالیہ تیور کے گھومی اور انہی برہم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں بھی جیور کی طرح سکے کالا لچ آ گیا ہے، تم اپنے لئے رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو۔ اگر مجھ پہ اعتبار نہیں تو جو چاہے کرو۔ ہاں اگر اعتبار آ جائے تو مجھے فون کر لینا۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔“ پھر وہ رکی نہیں۔ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔ ایڈم نے اسے نہیں پکارا۔ وہ شش و پنج میں کھڑا رہا۔

بازار سے باہر نکلتے ہوئے اس نے داتن کا نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگائے، کار کی طرف آئی۔ اب وہ قدرے پریشان لگ رہی تھی۔

”سکہ مل گیا ہے، مگر وہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم کو مجھ پہ شک ہو رہا ہے۔ نہیں، میں اس سے وہ چرا نہیں سکتی۔ اس کو چرایا نہیں جا سکتا۔ فی الحال ایڈم اس کا مالک ہے اور اسے وہ مجھے اپنی مرضی سے دینا ہوگا۔ اس کا شک کم ہو تو وہ مجھے کال کر لے گا، نہیں تو کوئی اور حل سوچتی ہوں.....“

وہ کار میں بیٹھتے ہوئے کہہ ہی رہی تھی کہ مانوس سی رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ چونکی۔ پھر جلدی سے پرس کھولا اور سیاہ سیل فون نکالا۔

حالم کافون جس کی اسکرین پہ فارض کا نمبر چمک رہا تھا۔ تالیہ نے گہری سانس لی۔ اور داتن کافون کاٹ دیا۔
 ”سنہرے بالوں والی ساری لڑکیاں خالی دماغ کی نہیں ہوتیں تو انکو! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ آپ یہ بات سمجھ لیں۔“
 تلخی سے مسکرا کے بڑبڑائی اور فون کان سے لگالیا۔ ”بولو فارض۔“

☆☆=====☆☆

پارلیمان کے اونچے ناور کے عقب میں ایک سبزہ زار بنا تھا جس کے گرد باڑ لگی تھی۔ اس کو ہرنوں کی پارکنگ کہا جاتا تھا۔ بہت سے کن چیل اور ہرن وہاں ٹہل رہے تھے۔ ایک زمانے میں چینی پارلیمنٹ اسپیکر ملا میثیاء کے دورے پہ آئے اور ہرنوں کا تحفہ لائے۔ یہ سارے ہرن انہی کی اولاد تھے اور یہیں رکھے جاتے تھے۔

فارض صاحب باڑ سے ٹیک لگائے منتظر کھڑے تھے جب انہوں نے وان فاتح کو سامنے سے آتے دیکھا۔ وہ تنہا آ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے۔ عثمان یا گارڈز کے بغیر۔
 ”کیا آپ نے اپنا ذہن بدل دیا؟“

”میں تمہارے انویسٹی گیٹر کو ہار کرنا چاہتا ہوں، لیکن catch (معالے کا منفی رخ) کیا ہے؟“ مسکرا کے پوچھتے وہ باڑ کے قریب آیا۔ دھوپ سارے کو جھلسا رہی تھی ایسے میں ایک درخت تلے مادہ ہرن تین ننھے غزالوں کو لئے سستانے بیٹھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے وہ چاروں ان دو ممبرز پارلیمنٹ کو آمنے سامنے کھڑے گفتگو کرتے دیکھ رہے تھے۔

”کیج؟“ فارض نے اچنبھے سے پوچھا۔

”کم آن فارض۔ یہ ہونہیں سکتا کہ بلیک مارکیٹ کے کسی انویسٹی گیٹر کو ہار کیا جائے اور کوئی کیج نہ ہو۔“
 ”وہ قانونی طریقے سے کام کرتا ہے لیکن وہ رجسٹرڈ نہیں ہے، اپنا چہرہ نہیں دکھاتا، اور پیسے Bitcoin کے ذریعے لیتا ہے۔ Bitcoin لیگل ہوتا ہے۔“ (یہ ایک ڈیجیٹل کرنسی ہوتی ہے جو ٹریس نہیں کی جاسکتی۔)

فاتح گردن موڑ کے دور سڑک کو دیکھنے لگا۔ اونچی عمارتیں.... سڑک.... دور تک پھیلا سبزہ۔ ہرن ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر چہرہ واپس موڑا۔

”ٹھیک ہے۔ اسے کال ملاؤ۔“ فارض نے فوراً فون نکالا اور نمبر ملایا۔

”وان فاتح تم سے بات کرنا چاہتے ہیں، حالم۔“ اور پھر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

”السلام علیکم!“ اپنی بھاری آواز میں فاتح بولا تو دوسری جانب لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر مردانہ آواز ابھری۔

”سوچ رہا ہوں سیاستدان پہ سلامتی واپس بھیجوں یا نہیں، کیونکہ آپ لوگ پیٹھ میں چھرے گھوپنے کے لئے مشہور ہوتے ہیں۔“

لیکن خیر... آپ مختلف دیکھتے ہیں اس لئے علیکم السلام وان فاتح رازمل۔ بتائیے..حالم آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“
فاتح نے گہری سانس لی۔ ”کم از کم سیاستدان میں لوگوں کو فیس کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے، وہ انکمپنڈ فون سے مشینی آواز میں بات نہیں کرتے۔“

”مجبوری ہے، جناب، آپ کی حکومتیں میرے جیسے لوگوں کی کمائی سے ٹیکس کاٹنے کے درپے ہوتی ہیں۔ اپنی اصل آواز کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”ہوں۔ خیر تم بتاؤ... تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟“ وہ اب آنکھیں چھوٹی کر کے دور سڑک پہ جمائے ہوئے تھا۔ مادہ ہرن ابھی تک بڑی بڑی آنکھوں سے اس کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے بچے البتہ گھاس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ تو منحصر ہے اس پہ کہ آپ مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہیں!“

”میرے گھر سے کل رات ایک فائل چوری ہوئی ہے۔“

”دیا پارک سٹی والے گھر سے؟“ اس نے پروفیشنل انداز میں پوچھا گویا معلومات نوٹ کر رہا ہو۔ فاتح نے خود کو آرام دہ محسوس کیا۔

”ہاں۔ میرے کمرے کے لاکر سے۔“

”سیف کون سا ہے آپ کا؟“

”فائر سیف۔“

”وہ تو ریراتھ میگنیٹ سے پانچ سینڈز میں کھل جاتا ہے، پاسورڈ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ خیر... چوری کیا ہوا ہے؟“

”ایک فولڈر جس میں ڈاکومنٹس تھے۔“

”اس کی پہچان؟“

”نیلے رنگ کا ہے۔ میرے ملاکہ والے گھر کے کاغذات تھے۔ مجھے وہ ضروری چاہیے ہیں۔“ لمحے بھر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

جیسے حالم چونکا ہو۔ ”سن باؤ کا گھر؟“ تیزی سے پوچھا۔

”ہاں... وہی گھر۔“

”آخری دفعہ کاغذات کب دیکھے آپ نے؟“ حالم سنبھل گیا تھا۔

”کل صبح۔“

”اور چوری کا علم کب ہوا؟“

”آج صبح جب میں نے اچالا کر کھولا۔“

”یعنی چوبیس گھنٹے کی ونڈو ہے جس میں کسی نے آپ کالا کر کھول کے پیپرز نکالے۔ کوئی نشان، کوئی زور زبردستی کے آثار؟ ملازموں کو ز دو کو ب کیا گیا ہو؟“ اس کے سوالات فاتح کو مزید آرام دہ کر رہے تھے۔

”اونہوں۔ صفائی سے کام کیا گیا ہے۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوا۔“

”اور کب تک واپس چاہیے ہیں ڈاکومنٹس؟“

”کل صبح تک۔“

”مل جائیں گے۔“ وہ اتنے آرام سے بولا تو فاتح ہلکا سا حیران ہوا۔

”اتنی جلدی کیسے ڈھونڈو گے تم؟“

اس کی حیرت پہ ساتھ کھڑے فارض صاحب تقاخر سے مسکرائے جیسے اپنے انتخاب پہ فخر ہوا ہو۔

”وان فاتح... کبھی کوئی میجک شو دیکھنے گئے ہیں آپ؟“

”شاید۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”لوگ جادوگروں کے تماشے دیکھنے کیوں جاتے ہیں؟ حیران ہونے کے لئے.... دھوکہ کھانے کے لئے... amazed ہونے کے لئے۔ اگر جادوگر آپ کو amaze نہیں کر رہا، اگر وہ آپ کو دھوکہ نہیں دے پارہا، اگر آپ کو اس کی ٹرک پہلے سے معلوم ہوگئی ہو، تو وہ اچھا جادوگر نہیں ہوتا۔ آپ بور ہوتے ہیں۔ آپ کو مزہ نہیں آتا۔ اس لیے آپ کو میرا طریقہ کار معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میرے پاس دھوکہ کھانے آئے ہیں، حیران ہونے، ٹرکڈ ہو جانے... اگر آپ کی تشفی نہ ہو تو میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔“

”چلو... دیکھتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہارے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔“

”آخری سوال، آپ کو کسی پہ شک ہے؟ کون یہ کام کر سکتا ہے۔“

”تم جادوگر ہو، تم اپنے جادو سے خود معلوم کرو کہ کون یہ کر سکتا ہے۔“ وہ جیسے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”پھر جادو دیکھنے اور سہنے کے لئے تیار ہو جائیے، وان فاتح!“، عالم کا جواب اسی کے انداز میں آیا۔ ”اور ہاں... اگلی دفعہ مجھے

اپنے نمبر سے فون کیجیے گا۔ مجھے درمیانی لوگ نہیں پسند۔“

”اور تمہاری فیس!“

”وہ کام کے بعد ہوگی اور... میری مہارت اور آپ کی شخصیت کے مطابق ہوگی۔ خدا حافظ!“، کال کٹ گئی۔ فاتح کی مسکراہٹ

مزید گہری ہوئی۔ ستائشی انداز میں ابرو اچکا کے فون فارض کی طرف بڑھایا۔

”کون ہے یہ آدمی؟ آئی لائیک ہم!“

”جو بھی ہے کمال ہے!“ وہ بھی خوشدلی سے مسکرا کے بولے اور اس کے ہمراہ آگے کوچل دیے۔ واپس جاتے ہوئے فاتح کی مسکراہٹ قدرتی تھی۔ جیسے وہ خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا ہو۔ جیسے عرصے بعد کسی سے بات کر کے اتنا لطف آیا ہو۔ مادہ ہرن ابھی تک آنکھیں کھولے سپاٹ سی ان دو افراد کو دیکھ رہی تھی جو دور ہوتے جا رہے تھے۔ دور بازار کے پار کنگ میں کار میں بیٹھی تالیہ نے سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون بند کیا اور انکیشن میں چابی گھمائی۔ ”عصرہ کو ایک واضح پیغام دینے کا وقت آ گیا ہے۔“ اس نے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے اور کار سڑک پہ ڈال دی۔

☆☆=====☆☆

وہ دور وہ سرمئی سڑک تھی۔ دونوں اطراف لکڑی کی اونچی شاہیں اور ریستوران بنے تھے۔ یہ کسی زمانے میں دو منزلہ گھر ہوتے تھے اب جدید تراش خراش کے بعد ان کو دوکانوں میں بدل دیا گیا تھا۔ عصرہ کی گیلری بھی انہی میں سے ایک تھی۔ گیلری کے اندر کھلا سا ہال بنا تھا۔ کسی شاپنگ مال کی طرح بالائی دونوں منزلوں کی بالکونیاں یہاں سے نظر آتی تھیں۔ چھت بہت اونچی تھی۔ سیاح آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے نوار دات دیکھ رہے تھے۔ عصرہ کا آفس دوسری منزل پہ تھا مگر اس وقت وہ آفس میں نہیں تھی۔ وہ اسٹوریج روم میں اپنی نگرانی میں سامان کو پیک کروا رہی تھی۔ ارد گرد اسٹاف کام میں لگا دکھائی دیتا تھا۔

”سیکیورٹی ٹیگ کو ڈبل چیک کریں۔ انچے وکرم....“ اس نے مڑ کے ایک انڈین شخص کو پکارا۔ (جیسے بچے سے مراد ”مس“ تھا ویسے ہی ”ان بچے“ سے مراد سڑ تھا۔) ”آپ سے میں یہ توقع کرتی ہوں کہ میرے کسی آرٹ پیس کو نیلامی کی جگہ پہنچنے سے قبل آنچ بھی نہیں آئے گی۔“

”میم! تالیہ بہت مراد آئی ہے۔“ سیکرٹری نے اندر جھانکا تو عصرہ بری طرح چونکی۔ پھر گہری سانس لی۔ ”اس نے آنا ہی تھا۔ اسے میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ مجھ پہ چھینے چلائے تو باہر کے لوگ اس کی آوازیں سنیں۔“

”آفس میں ہی بٹھایا ہے، لیکن وہ چھینے گی کیوں؟ وہ تو گیلری کے بڑے ڈونرز میں سے ہے۔“ سیکرٹری اب بھی۔ ”فاتح نے اس کی صبح بے عزتی کی ہے۔ مجھے لجاجت سے اس سے معذرت کر کے یہ معاملہ ختم کرنا ہوگا۔“ عصرہ نے پرس سے ننھا آئینہ نکالا، اسفنج سے ناک اور گال پہ میک اپ درست کیا۔ کوٹ کو نیچے کھینچ کے شکنیں درست کیں، پھر چہرے پہ فکر مندی کے

تاثرات ڈالے اور باہر نکل آئی۔

ہال عبور کر کے وہ اوپر آئی تو اچھی خاصی فکر مند لگ رہی تھی۔ تالیہ کو دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے دیکھا تو اندر قدم رکھتے ہی شروع ہوئی۔ ”آئی ایم سوسوری تالیہ.... مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے پیچھے یہ سب ہو جائے گا اور تم....“

وہ اپنی سیٹ کی طرف آتے ہی بے حد دکھ انداز میں کہہ رہی تھی کہ....

”السلام علیکم مسز عصرہ.... میں اچھی خبر لائی ہوں۔“

تالیہ مراد خوشگوار چہرے کے ساتھ چپکی تو عصرہ کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ٹھہر کے تالیہ کا چہرہ تکتے لگی۔

وہ صبح والا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی سنہری چوٹی آگے کو ڈالے سر پہ بیٹ تر چھار کھے گلابی گالوں والی پیاری سی لڑکی مسکراتے ہوئے بہت پر جوش لگ رہی تھی۔

”میری کانگ ہو سے بات ہوئی ہے وہ سکوں کی شرط رکھے بغیر بھی آنے کو تیار ہیں اور آپ جانتی ہیں کانگ ہو کے آنے کا مطلب ہے وہ دو تین بڑے ڈونرز کو ساتھ میں لائیں گے۔ میں سوچ رہی تھی کہ.... آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیں۔“

آخر میں ذرا حیرت سے بولی تو ششدر کھڑی عصرہ سنبھلی پھیکا سا مسکرائی اور اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھی۔ آنکھیں ابھی تک حیران اور الجھی ہوئی تھیں۔

”اچھا صبح میں نے پینٹنگ کو فائنل ٹچ دے دیا تھا۔ یہ ایک کار پینٹنگ شاپ کا ایڈریس ہے۔“ ایک کارڈ میز پہ رکھا۔ ”ہے تو پرانی چھوٹی سی شاپ مگر آپ کے پورٹریٹ کی اس آدمی سے لا جواب فریمنگ کوئی نہیں کر سکتا۔ چونکہ نیلامی سر پہ آن پہنچی ہے آپ اس کو آج ہی بلوا لیجیے گا۔“

”شیوورا!“ عصرہ زبردستی مسکرائی۔ تشویش بھری آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”صبح میں گھر واپس آئی تو پورٹریٹ دیکھ لیا تھا... مگر تم جا چکی تھیں۔ ملازم بتا رہے تھے کہ فاتح نے شاید تم سے بات وغیرہ کرنی تھی؟ میرے آنے تک وہ بھی جا چکا تھا ملاقات نہیں ہو سکی۔“ وہ غور سے اسے دیکھتے سرسری سا بولی گویا پانی کی گہرائی ماپنی چاہی۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔

”جی انہوں نے مجھے اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے وان فاتح کا کیرز ما اور سحر ہی اتنا ہوتا ہے کہ میں تو سارے الفاظ

ہی بھول جاتی ہوں۔ کہاں سوچا تھا میں نے کہ میں وان فاتح کے سامنے بیٹھ بھی سکوں گی۔“

عصرہ نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا۔ اچنبھے بھری آنکھیں تالیہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ ”خیریت سے بلایا تھا اس نے

”جی... کچھ زیادہ بات نہیں کی انہوں نے۔“ اس نے گویا لاعلمی سے شانے اچکائے۔ ”وہ مجھے ہانگ تو اکی کہانی سنار ہے تھے۔ سارا جیو املا یو کی ایک داستان۔ میں تو ہر دفعہ اتنی سٹار اسٹرک ہو جاتی ہوں کہ ان کی آدھی بات سن ہی نہیں پاتی۔ اور ہاں...“ اس نے پیشانی کو چھو کے جیسے یاد کیا۔ ”انہوں نے مجھے کہا کہ اشعر صاحب کے پاس ان کی کوئی فائل ہے جو میں اشعر صاحب سے واپس لا دوں۔ میں تو بس یس سر کرتی رہی، ورنہ سب میرے سر سے گزر گیا۔ اب اشعر صاحب سے میری اتنی فرتکلیس کہاں۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے، بہر حال ان سے ملنا اور بات کرنا ہی اتنا آزر ہوتا ہے کہ بس۔“ آنکھیں میچ کے مسکراتے ہوئے کھولیں، جیسے بچے کسی بات کا مزہ لیتے ہیں۔

”خیر، مجھے کہیں جانا ہے تو آپ اس کارپینٹر کو بلا لیجیے گا۔ میں نے ایک فرینچ کرٹک سے بات بھی کی ہے، اگر وہ اگلے ہفتے ملا میثیاء میں ہوئی تو وہ بھی اینڈ کر لے گی نیلامی۔ وہ اکثر یہیں ہوتی ہے۔“ مسکراتے ہوئے بیگ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔ ”انشاء اللہ نیلامی پہ ملاقات ہوگی۔“

عصرہ نے بدقت سراثبات میں بلایا۔ جگہ سے نہیں اٹھی۔ ”فاتح ذرا مختلف طبیعت کا ہے تو... آئی ایم شیور اس کی بات کا کوئی غلط مطلب نہیں ہوگا۔“

”کس بات کا؟“ وہ انجانے پن سے بولی تو آنکھوں میں سادگی تھی۔
عصرہ جبراً مسکرائی اور کارڈ اٹھالیا۔ ”کچھ نہیں۔ میں ابھی... اس کو... یلو لیتی ہوں رائٹ۔“
”صحیح!“ تالیہ مسکرا دی اور پھر باہر چلی آئی۔ نکلتے ساتھ ہی چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پہ چڑھالیا اور گزرتے گزرتے راہداری میں رکھے فلور لیپ کو پیر سے ٹھوکر ماری۔ لیپ اوندھاز مین پہ آگرا۔ دو ورکرز لیپ کی طرف دوڑے تھے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔

اندر عصرہ اپنے آفس میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ چپ۔ بالکل چپ۔ تبھی کسی افتاد کی طرح سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔
”مس تالیہ تو آپ سے اتنی اچھی باتیں کر رہی تھیں، مگر جاتے جاتے انہوں نے کارز لیپ کو گرا دیا۔“
”اچھی باتیں؟“ عصرہ نے سلگتی کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ ”وہ صرف مجھے ایک پیغام دینے آئی تھی۔“
سیکرٹری کے لب حیرت سے کھل گئے۔ ”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہنے آئی تھی کہ وہ ان کیمرز میں مجھ سے زیادہ اچھی ہے اور یہ کہ وہ ایک بہت خطرناک لڑکی ہے، مجھے اس سے ڈرنا چاہیے۔“ اس نے بے اختیار کپٹی چھوئی۔ ”یہ لڑکی کسی چیز کے پیچھے ہے۔ اسے کچھ چاہیے۔ یہ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں اسے روک نہیں سکتی۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے ہتھیلیاں آپس میں ملتی شدید ڈسٹر ب نظر آرہی تھی۔

نیچے تالیہ مراد ہال عبور کرتی نظر آرہی تھی۔ ہیل کی ٹک ٹک سارے میں گونج رہی تھی۔

گیلری سے نکلتے ہی تالیہ نے پرس سے ایک ننھا ائیر بڈ نکالا اور کان میں ڈالا۔ پھر سیدھی کار کی طرف چلتی گئی۔
 ”تم کہاں تھیں تالیہ؟“ آلے سے داتن کی آواز گونجی۔

”میں عصرہ کو وارن کرنے گئی تھی۔ اور اب میں اس کے بھائی کے پاس جا رہی ہوں۔ تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟“ وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نے الارم کمپنی کی طرف سے جا کروان فاتح کے گھر سے ملحقہ اسٹریٹس کے کیمرے چیک کیے ہیں.... اور بوجھو مجھے کیا ملا؟“ داتن مزے سے کہہ رہی تھی۔ ”رات کو عصرہ چند منٹ کے لئے واک کرنے نکلی تھی اور اس نے جوگرز کی جگہ سینڈل پہن رکھے تھے۔ وہ کسی اسٹریٹ میں غائب ہوئی جہاں کیمرہ نہیں تھا اور دو منٹ میں ہی واپس آ گئی۔ اس کی شال میں مجھے لگتا ہے کہ اس نے فائل چھپا رکھی تھی۔“

”یعنی اس اندھیر کارز میں اس نے فائل کسی کو ڈراپ کی؟“

”یہینا اشعر کا کوئی آدمی ہوگا۔“

”کوئی ویڈیو.... کوئی تصویر جس میں وہ فائل دیتے دکھائی سے رہی ہو؟“

”نہیں تالیہ لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اشعر کے خاص بندوں کا فون ٹریس کرواؤں کہ وہ رات کو اس جگہ آئے تھے یا نہیں اور....“

”داتن ریلیکس.... ہم انویسٹی گیٹر نہیں ہیں۔ اس لئے کسی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔“ کارا اشارت کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی تو داتن لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔

”تو پھر ہم نے کرنا کیا ہے؟“

”وہی جو ہمیں آتا ہے۔ یعنی چوری۔“ اس نے کار سڑک پہ ڈال دی۔ لمبی سرمئی سڑک اطراف میں درختوں کی لمبی قطار کے باعث چھایا میں تھی۔

”لیکن ہمیں یہ کون بتائے گا کہ فائل کہاں ہے؟“

”اشعر بتائے گا۔“ اس نے گلاسز اتارے اور مسکرا کے اسٹیرنگ وہیل گھماتے موڑ کاٹا۔

چند لمحوں بعد وہ سیاہ موبائل اسٹینڈ پہ لگائے اسپیکر آن کیے ہوئے تھی۔ فاتح کا نمبر ملا رکھا تھا اور گھنٹی جا رہی تھی۔

”ہیلو؟“ اس کی بھاری آواز کار میں گونجی تو تالیہ کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”غالباً فارض نے آپ کو میرا نمبر دے دیا تھا تبھی آپ نے کال اٹھالی ورنہ میں نے سنا تھا آپ غیروں کی کیا اپنوں کی کال بھی نہیں اٹھاتے۔“

دوسری جانب سے گہری سانس لی گئی۔ ”سنی سنائی سے زیادہ فرسٹ ہینڈ انفارمیشن پہ بھروسہ کیا کرو، حالم!“
(اور آپ نے عصرہ کی سن کے جو مجھ پہ الزام لگا دیا وہ؟) مگر بولی نہیں صبر کر گئی۔
”تو جادوگر کے شو کے لئے تیار ہیں آپ؟“

”ابھی تک تمہارا شو شروع نہیں ہوا کیا؟ تم نے تو صبح تک فائل واپس کرنی تھی۔“
”کوئی بھی جادوگر اپنے اسٹنٹ کے بغیر کرتب نہیں کھیلتا لیکن اسٹنٹ کے علاوہ بھی ایک چیز وہ کرتا ہے۔ حاضرین میں سے وہ کسی ایک کو بلاتا ہے اور اس کو کوئی کام کرنے کا کہتا ہے۔ کیا آپ کرتب کا حصہ بننا چاہیں گے؟“
”میں کسی سے احکامات نہیں لیتا، حالم!“ وہ بے نیاز تھا۔

”مگر اپنی فائل کے لیے آپ کو میرے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی، جیسے حاضرین میں سے آیا شخص اسٹیج پہ آتے ہی جادوگر کے تابع ہو جاتا ہے۔“

”حالم... اگر تمہیں یقین ہے کہ تم میرا وقت ضائع نہیں کر رہے تو میں یہ کروں گا ورنہ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔“
”آپ نے مجھے ایک بہت چھوٹا دورانیہ دیا ہے کام کا۔ اس لئے آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔ کچھ دیر بعد میں آپ کو ٹیکسٹ کروں گا، عین اسی وقت آپ ایک کام کریں گے۔“

وہ ساری تفصیل بتاتی گئی۔ حالم کا روایتی گھمنڈی انداز سمجھانے والے انداز میں بدلتا گیا۔ یہ پہلا کلائنٹ تھا۔ جس کے لئے لہجہ نرم ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے سامنے سر اور دل دونوں جھک جاتے تھے۔ وہ تو انکو تھے۔

”شبیور۔ میں کردوں گا۔ لیکن ٹیکسٹ مت کرنا، میرے فون پہ رنگ کرنا۔ میں میٹنگ میں ہوں تو فون نہیں دیکھتا۔“ وہاں ازلی بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

”رائٹ، سر!“ وہ ضبط سے بولی اور اسٹینڈ پہ لگے فون کی اسکرین پہ انگلی پھیری۔ کال ختم ہو گئی۔ منہ میں کچھ بڑبڑا کے مر جھٹکا اور نظریں سڑک پہ جمادیں۔

☆☆=====☆☆

ایڈم محمد اس سکے کو جیب میں لئے جانے کتنی دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا تھا۔ گھر آیا تو ننھا باغیچہ گرمی میں جھلس رہا تھا۔ مرغی ڈر بے میں کسی کو نے میں چھپی بیٹھی تھی۔ پھول مر جھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ تھکا ماندہ اندر داخل ہوا تو ماں راہداری میں کچن

کے دروازے پہ کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کے آنکھوں میں حیرت ابھری۔
”تم جلدی آگئے۔ خیریت؟“

”عبداللہ خلافِ توقع آج واپس آگیا ہے اس لئے میری چھٹی ہو گئی۔“
”مگر ایڈم... میری تو ابھی دس منٹ پہلے عبداللہ کی والدہ سے بات ہوئی ہے۔ عصرہ نے اس کو بلوایا تھا، مگر بس نہ ملنے کی وجہ سے وہ کل صبح تک ہی آپائے گا۔“

ایڈم وہیں ٹھنک کے رک گیا۔ ”نہیں، مسز عصرہ نے کہا کہ وہ آچکا ہے۔ اسی لئے تو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔“
”کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی اور وجہ سے نہیں بھیجا؟“ ایبوتشولیش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایڈم کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

کیسی دنیا تھی یہ؟ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا؟ وہ گم صم سا ہو گیا۔ پھر اٹنے قدموں باہر نکل آیا۔
برآمدہ دھوپ سے محفوظ تھا۔ وہاں چھایا تھی۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور ننھے باغیچے کو دیکھنے لگا۔ پیرقینچی صورت میز پہ رکھ لئے۔ چہرہ سوچ میں ڈوبا لگتا تھا۔

پھر اس نے فون نکال کے ڈرائیور کا نمبر ملایا۔ ڈرائیور ساری سیاستوں اور اندر کی سازشوں سے بے خبر ہوتا تھا۔ نہ اس کا اتنا عہدہ تھا، نہ مقام کہ اسے کوئی شریک کرتا۔

”ایڈم تم آج آئے کیوں نہیں؟“ وہ اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گیا۔ ”فاتح صاحب پارلیمنٹ جاتے وقت ہمیشہ دو کپ کافی کے پیتے ہیں۔ عثمان کو بھول گیا تھا اس نے صرف ایک دیا۔ یہ کیا طریقہ ہے۔“ اپنی طرف سے ڈرائیور نے رعب جھاڑا۔
”وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟“

”ابھی میں ان کو گھر لایا ہوں پھر یہاں سے ہم نے آگے جانا ہے۔ باڈی مین کا فرض بھی عثمان ادا کر رہا ہے۔ تمہارا پوچھا بھی تھا فاتح صاحب نے۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن سنو۔“ وہ احتیاط سے پوچھنے لگا۔ ”آج گھر میں کچھ ہوا ہے کیا؟“
”کیا مطلب؟“

”کوئی غیر معمولی واقعہ؟ کوئی ایٹھو؟ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے...“
”صبح فاتح صاحب کی اہم فائل چوری ہو گئی۔ ملازمہ بتا رہی تھی کہ صاحب نے وہ جو پینٹر لڑکی آتی ہے اس سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ صاحب بہت غصے میں تھے صبح۔ ادھر پارلیمنٹ میں سب کو پتہ تھا۔ دو تین ڈرائیورز نے تو مجھ سے بھی آکے پوچھا۔“

”چے تالیہ سے؟“ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”صاحب نے چے تالیہ سے پوچھ سگھ کی؟“

”ملازم کہہ رہے ہیں کہ صاحب کو شک ہے چے تالیہ نے ہی چوری کی ہے۔“ وہ اتنا باخبر تھا جتنا ہر ڈرائیور ہوتا ہے۔ ایڈم کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ”میں آتا ہوں“ کہہ کے فون رکھا اور باہر کو بھاگا۔

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ گھنٹی بجاتے ہی گارڈ باہر نکل آیا۔ ”تمہارا کام ختم ہو چکا ہے ایڈم، تم کیوں آئے ہو؟“ گارڈ کو شاید ایڈم کو اندر نہ آنے دینے کی ہدایت دی گئی تھی۔

”مجھے فاتح صاحب سے ملنا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولا تھا۔

”ایسے تو صاحب نہیں ملتے۔ وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔“

”صرف پانچ منٹ کے لئے ملنے دو“ میں چلا جاؤں گا۔“ ابھی الفاظ منہ میں تھے کہ آٹو میٹک گیٹ کھلتا چلا گیا۔ ایڈم نے چونک کے دیکھا۔ فاتح کی کار باہر نکل رہی تھی۔ فاتح پچھلی سیٹ پہ سر جھکائے، عینک لگائے، موبائل دیکھ رہا تھا۔ البتہ ڈرائیور نے ایڈم کو دیکھ کے کار آہستہ کر دی۔ ایڈم بھاگ کے فاتح کی کھڑکی تک گیا۔ بے چینی سے دست دی۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا، پھر ہنسنے لگی رکھی۔ شیشہ نیچے ہوتا گیا۔

”تم کہاں تھے صبح سے ایڈم؟“ اس نے سادگی سے پوچھا تو اگلی سیٹ پہ بیٹھا عثمان پورا گھوم کے تندہی سے بولا۔

”سر عبداللہ نے پہنچ جانا تھا تو اس کو فارغ کر دیا۔“

”کیا میں نے تم سے پوچھا ہے عثمان؟“ وہ اسی سنجیدگی سے عثمان کو دیکھ کے بولا تو وہ چپ ہو گیا۔ فاتح نے گردن اس کی طرف موڑی۔ ”اور تم ٹھیک ہو ایڈم؟“

”جی سر!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”سر عبداللہ ابھی تک نہیں آیا، کیا میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔“ وہ کار کی کھڑکی کو پکڑے کھڑا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ایڈم۔ ایم فائن۔ تھینکس۔ خیال رکھو اپنا۔“ نرمی سے کہہ کے فاتح نے عینک اٹھالی تو ایڈم کو پیچھے ہونا پڑا۔ شیشہ اوپر ہوتا گیا۔ کار آگے بڑھ گئی اور وہ وہیں خالی ہاتھ کھڑا رہ گیا۔

”اب تم جاؤ۔“ گارڈ اس کے سر پہ آپہنچا۔ جیسے اسے نکالنے کی جلدی ہو۔ لیڈر جا چکا تھا۔ وہ رکتا بھی تو کس کے لئے۔

گرمی کی حدت بڑھ گئی تھی۔ وہ باہر سڑک کنارے چلتا گیا۔ ذرا سی دیر میں پسینے سے پورا بھیگ گیا تو ایک جگہ درخت تلے فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے سکہ نکال کے دیکھنے لگا۔

وہ گول سنہری سکہ تھا جس کے دونوں طرف مظفرال سلطان لکھا تھا۔ اس نے سکہ مزید اونچا کی۔ اس کے گول دائرے کے ساتھ

نئے نئے حروف تھے جو مٹ مٹ کے ابھر رہے تھے... ایڈم کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دھوپ میں لمحے بھر کو وہ نظر آئے تھے۔ 1437۔ پھر وہ غائب ہوتے گئے۔ ایڈم بالکل سناٹے میں رہ گیا۔ یہ نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ یہ کوئی عجیب چیز تھی۔

اس نے جلدی سے سکہ ڈبے میں رکھ کے جیب میں ڈال دیا۔ پھر پریشانی سے سر پکڑ لیا۔

چے تالیہ سے وہ پہلی دفعہ کب ملا؟ جب وہ اس سکے کو تنگو کامل کے گھراپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔ چے تالیہ نے دو ماہ وہاں کیوں نوکری کی؟ دو ماہ پہلے تو اسے نہیں معلوم ہو گا کہ وہ ان فاتح نے اس گھر مہمان بن کے آنا ہے۔ کیا وہ اس سکے کے پیچھے تھی؟ ایک نئے خیال نے اسے چونکا دیا۔

کیا یہ اس کا بار بار عصرہ کے گھر آنا.... یہ سب سکے کے لئے تھا؟ لیکن نہیں۔ وہ تو فاتح کی حفاظت پہ مامور ایک پولیس آفیسر تھی جس کو فاتح پہلے سے جانتا تھا تبھی اس کو تاشہ کہتا تھا۔ لیکن ایک منٹ... اگر وہ پہلے سے اس کو جانتا ہوتا تو چوری کے بارے میں تالیہ سے پوچھ گچھ کیوں کرتا؟ اتنی کڑی پوچھ گچھ کی ہوگی تو ملازم گواہ ہیں نا اس کے!

اس کا ذہن شک اور یقین کے درمیان ڈول رہا تھا۔ بالآخر اس نے موبائل نکالا اور تالیہ کے نمبر پہ ایک پیغام لکھا۔ ”ہم کب مل سکتے ہیں؟“ اور بھیج دیا۔

اب اسے جواب کا انتظار تھا۔

☆☆=====☆☆

دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی البتہ گرمی اور جس ویسا ہی تھا۔ ایسے میں وہ نیلے شیشوں والا بزنس مائور سر اٹھائے کھڑا تھا جس کے انیسویں فلور پہ اشعر محمود کا آفس واقع تھا۔

انیسویں فلور پہ کشادہ سی لابی بنی تھی جس کے سامنے لفٹ کے دروازے اس وقت کھل رہے تھے اور تالیہ مراد باہر نکل رہی تھی۔ لباس بدل لیا تھا۔ گلابی قمیض پہ سیاہ منی کوٹ پہنے، کہنی پہ بیگ ڈالے، سنہری چوٹی کندھے پہ آگے گرائے اور سر پہ ترچھا سفید ہیٹ جمائے وہ باہر آئی اور ریسپشن ڈیسک کے قریب رکی۔

”تالیہ بنت مراد.... مجھے اشعر محمود سے ملنا ہے۔“

”جی، ان کا آفس بالکل کارز میں ہے۔“ لڑکی نے تہذیب سے گائیڈ کیا تو وہ ”ہوں“ کہہ کے نخریلی امیر زادیوں کی طرح آگے بڑھ گئی۔ کنکھیوں سے لابی کے صوفے پہ اخبار پھیلائے مطالعے میں منہمک داتن کو دیکھا مگر رکی نہیں۔

”فاتح وہ کردے گا نا جو تم نے کہا ہے؟“ داتن اخبار سامنے رکھے آہستہ سے بولی۔ کان میں لگا آلہ دور جاتی تالیہ کو آواز پہنچا گیا۔

”حالم کی بات کون نال سکتا ہے۔“ وہ بے پرواہی سے بولی۔ اب وہ راہداری کے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔

اشعر کے آفس کے باہر بیٹھی سیکرٹری فوراً اٹھی۔ ”چے تالیہ... اشعر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
سیاہ منی کوٹ والی لڑکی نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سیاہ موبائل سے نمبر ملایا۔ دو گھنٹیاں اور کال کاٹ دی۔ اب وہ اشعر سے ملنے کے لیے تیار تھی۔

وہاں سے چند میل دور... ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے کے اسٹوڈیو روم میں وان فاتح موجود تھا۔ سیٹ لگا تھا، کیمرے سیٹ ہو رہے تھے۔ اسکرپٹ اپنے کاغذات پڑھ رہا تھا اور فاتح مطمئن سا ناگ پہ ناگ جمائے کافی پیتے ہوئے سارا منظر نامہ دیکھ رہا تھا۔ تب ہی جیب میں رکھافون تھر تھرایا تو اس نے نکال کے دیکھا۔ حالم کا نمبر دیکھ کے مسکرایا اور موبائل واپس رکھ دیا۔ پھر قریب کھڑے عثمان کو بلایا۔

”یہ کافی لے جاؤ۔ میں فریش ہو چکا ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”خیریت، سر؟“ عثمان نے مسکرا کے اس کا تازہ دم چہرہ دیکھا۔

”ہاں۔ صبح ایک انویسٹی گیٹر کو ہار کیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ فائل مل گئی ہے۔ اللہ کا شکر۔“

عثمان کا منہ کھل گیا۔ ”واقعی؟ اصلی فائل؟ کہاں سے ملی؟“

”جس نے چرائی تھی اس کے سیف سے۔“ مگ اس کی طرف بڑھادیا اور سامنے دیکھنے لگا جہاں اسکرپٹ اپنی نشست پہ بیٹھ رہا تھا۔

عثمان پھیکا سا مسکرایا۔ ”مبارک ہو، سر!“ اور مگ لئے آگے بڑھ گیا۔

واپس اشعر کی آفس بلڈنگ میں آؤ تو لابی کے صوفے پہ بیٹھی، بظاہر اخبار پڑھتی داتن دبی آواز میں ہونٹ کم سے کم ہلائے کہہ رہی تھی۔

”اب تک وان فاتح نے اپنے سیکرٹری کے سامنے فائل مل جانے کا ذکر کر دیا ہوگا۔ وہ فوراً اپنے اصل خداؤں کو بتائے گا، اور وہ پریشان ہو کے اس جگہ جائیں گے جہاں فائل رکھی ہے۔ میں اس کا پیچھا کروں گی اور یوں وہ خود ہمیں فائل تک لے جائیں گے اور ہم اس کو چرائیں گے۔“

تالیہ نے جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اندر اشعر کے آفس میں بیٹھی تھی۔

آفس بہت روشن تھا۔ دو متصل دیواریں شیشے کی تھیں۔ وہ بلڈنگ کا کارز آفس تھا (اوپنی عمارتوں میں بنے آفسز کا بہترین آفس کارز آفس ہوتا ہے جہاں ایک کے بجائے دو دیواریں شیشے کی ہوتی ہیں اور وہاں سے سارے شہر کا نظارہ کرنا بہت دلفریب لگتا ہے۔)

اشعر ٹیک لگائے اپنی کرسی پہ براجمان مسکرا رہا تھا اور سامنے تالیہ مراد سنجیدہ سی بیٹھی نظر آرہی تھی۔ بیٹ سر پہ ترچھا رکھا تھا۔

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی ان چے اشعر!“ وہ ناخوشی سے کہہ رہی تھی۔ (ان چے یعنی مسٹر....)

”آپ کہیے چے تالیہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ مسکرا کے بولا۔ گہری چھوٹی آنکھیں تالیہ کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ ایک معزز انسان ہیں اور میں ایک سوشلائٹ اور آرٹ لور ہوں۔ کوالا لپور کے آرٹ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں میرا ایک نام ہے پہچان ہے۔ میرے کسی بھی قسم کے سیاسی عزائم نہیں ہیں نہ مجھے سیاست میں دلچسپی ہے۔ اس لئے کل جو تصویر آپ نے ٹویٹ کی اس کے بعد سے مجھے موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے جو میرے لئے تکلیف کا باعث ہے۔“ وہ ڈسٹرب نظر آ رہی تھی۔ اشعر کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔

”جی مجھے بھی وہ سب بالکل اچھا نہیں لگا۔ اب تصویر اتارنا برا لگتا ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میڈیا کی تو عادت ہے بات کا بتنگڑ بنانا۔“

”آپ کوشش کیجیے کہ اس کی سختی سے تردید کر دیں تاکہ میرے عزیز واقارب کو اس سب سے تکلیف نہ ہو۔ میرا آپ کی فیملی کا حصہ بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”تردید بات کو مزید اچھا کرتی ہے۔ آپ سیاست نہیں سمجھتیں چے تالیہ۔ خاموش رہنا اور نظر انداز کرنا بہتر ہے۔“ وہ اب آگے ہو کے بیٹھا تھا سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں اس سیاست کو سمجھنا بھی نہیں چاہتی اپنے اشعر۔ صبح وان فاتح نے بھی مجھے آپ کے حوالے سے باتیں کہیں جو مجھے اچھی نہیں لگیں۔ وہ کسی فائل کا ذکر کر رہے تھے پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ براہ مہربانی آپ لوگ اپنی سیاست میں مجھے نہ دھکیلیں۔“ وہ پاٹ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میں آبنگ کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ وہ paranoid ہیں۔“ وہ نرمی سے کہنے لگا تو تالیہ نے خفگی سے سر جھٹکا۔

”مجھے سچ میں آپ کے باہمی مسائل میں دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف آرٹ آپ کی فیملی کے قریب لایا ہے۔“

”تو آپ کو آرٹ پسند ہے؟“ وہ بات کو طول دیتے ہوئے مسکرا کے پوچھنے لگا۔ تالیہ ذرا سا مسکرائی۔

”ہر قسم کا آرٹ۔ چاہے وہ کیونوس پہ بکھیرا جائے.... یا سٹیج پہ پرفارم کیا جائے یا کتاب میں کہانی کی صورت لکھا جائے۔ آرٹ حیران کرنے کا نام ہے۔ لوگ آرٹ دیکھنے پتہ ہے کیوں آتے ہیں اپنے اشعر؟ تاکہ وہ حیران ہوں۔ amazed ہوں۔ دھوکہ کھا جائیں اور جب ان پہ دھوکہ کھلے تو وہ ششدر رہ جائیں۔ لوگ عام زندگیوں میں ہر چیز پہلے سے جان لینا چاہتے ہیں تاکہ دھوکہ نہ کھائیں مگر آرٹ پہ وہ صرف حیران ہونے اور اپنا دماغ بھک سے اڑا دینے کے لئے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے نا؟“

”تو آپ کو لوگوں کو حیران کرنا اچھا لگتا ہے؟“ وہ محظوظ ہوا۔

”جی۔ مجھے وہاں سے آنا اچھا لگتا ہے جہاں سے انہوں نے توقع بھی نہیں کی ہوتی۔“ اس کی مسکراتی، چمک دار آنکھیں اشعر پہ جی تھیں۔ ”آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟“

اشعر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلند یوں پہ کھڑے ہو کے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“ تالیہ نے دیکھا، اس کے عقب میں شیشے کی دیوار سے دور تک پھیلی اونچی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ دروازہ دستک کے ساتھ کھلا اور رملی نے اندر جھانکا۔ ”سر... سواری مگر ضروری بات ہے۔“ ادھر داتن کان میں بولی۔ ”رملی ابھی اٹھ کے گیا ہے۔ عثمان نے اسے بتا دیا ہے شاید کہ فائل مل گئی ہے۔“

اشعر اس مداخلت پہ بد مزہ ہوا، ابھی خفگی سے رملی کوٹو کئے والا تھا کہ تالیہ بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آپ کام کیجیے۔ میں چلتی ہوں۔“ انداز سنجیدہ اور لیا دیا سا تھا۔ اشعر نے گہری سانس لی، مسکرایا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اوکے۔ نیلامی پہ ملاقات ہوگی، چے تالیہ۔“ ”سی یو۔“ باہر آ کر وہ سیل فون پہ مٹن دباتی چلتی آئی جیسے کوئی ضروری میل کر رہی ہو۔ اشعر کے آفس کے سامنے لاؤنج سا بنا تھا۔ وہ ٹائپ کرتے کرتے وہیں بیٹھ گئی۔

”میں تیار ہوں۔ جیسے ہی رملی نکلے گا، میں اس کا پیچھا کروں گی۔“ داتن کی آواز کان میں گونجی تو تالیہ جھکے سر کے ساتھ بولی۔ ”اے جلد ہی پریشان ہو کے نکلنا چاہیے۔“

ایک منٹ گزرا۔ دو منٹ۔ پانچ منٹ۔ بالآخر رملی باہر آیا اور سیدھا اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا جو سامنے ہی تھا۔ کرسی سنبھالی اور کام کرنے لگا۔ تالیہ غیر آرام دہ ہوئی۔ چند منٹ مزید گزرے۔ نہ اشعر آفس سے نکلا، نہ رملی اپنی جگہ سے اٹھا۔ داتن بھی گڑبگڑا گئی۔ اس کے کان میں بولی۔

”تالیہ.... یہ لوگ فائل چیک کرنے باہر کیوں نہیں نکلے؟ کسی بینک کی طرف، یا گھر کی طرف؟ کہیں تو رکھی ہوگی انہوں نے فائل۔“

تالیہ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ہرن جیسی آنکھیں جو اطراف کا ایکس رے کر لیتی تھیں۔ پتلیاں سکوڑ کے اس نے اشعر کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

”یا شاید وہ فائل چیک کر چکے ہیں۔“ اسے ساری سمجھ آرہی تھی۔ ”داتن.... فائل اس کے آفس میں ہی موجود ہے۔“ ”اوہ!“ داتن کی فکر مند آواز آئی۔ ”آفس میں واردات کرنے کے لئے ہفتے بھر کی تیاری چاہیے۔ کوئی لمبا con کھیلنا پڑے گا۔“

”ہمارے پاس ہفتہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس چند منٹ ہیں۔ مجھے وہ فائل ابھی چرانی ہے۔“

”مگرتالیہ....“

”ساری زندگی میں نے لالچ میں چوریاں کی ہیں داتن۔ ساری زندگی میں نے پیسے کے لئے جھوٹ بولے ہیں۔ میں چور ہوں، جھوٹی ہوں، مگر مجھے پہلی دفعہ کسی سے وعدہ نبھانا ہے۔ تو انکو کے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ان کو کل صبح سے پہلے فائل دینی ہے تو دینی ہے۔ سروس باتھرومز میں آؤ، ہمارے پاس پلاننگ کے لئے دس منٹ ہیں۔“ وہ دبی آواز میں بولتی آگے بڑھ گئی۔ بجائے لفٹ کی طرف جانے کے وہ ایک دوسری راہداری میں مڑ گئی۔ داتن نے گہری سانس لی۔

”وہ ایک بے نیاز سیاستدان ہے جو پرسوں تک تمہیں یاد بھی نہیں رکھے گا۔ شکر یہ کہہ کے آگے بڑھ جائے گا۔ طاقتور سیاستدانوں سے محبت کرنے والی لڑکیاں ہمیشہ پچھتاتی ہیں، تالیہ۔“ افسوس سے داتن بولی تھی مگرتالیہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن نیا پلان سوچ رہا تھا۔

لابی کی گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

☆☆=====☆☆

اسٹوڈیو میں کیمرے آن تھے۔ تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ تین اطراف میں سبز رنگ کے کارڈ بورڈ کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ انٹرویو ریکارڈ ہوتے وقت سبز کارڈ بورڈ لگایا جاتا تھا اور بعد میں جب ٹی وی پہ دکھایا جاتا تو سبز رنگ پہ مختلف مناظر ایڈٹ کر دیے جاتے۔

ہنر سنجیدگی سے بیٹھا فاتح کو دیکھ کے سوال پوچھ رہا تھا....

”جب آپ وژن کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں بیس سال بعد کا ملائیشیا کیسا آتا ہے؟“

وان فاتح پر اعتماد سا بیٹھا تھا۔ اس سوال پہ ہلکا سا مسکرایا اور گویا ہوا۔ ”ملا کہ سلطنت جیسا۔ تمہیں معلوم ہے جیفری، بلکہ میں ملائیشیا کے لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ چھ سو سال پہلے کا ملا کہ کیسا تھا؟“.....

اشعر کے آفس فلور کے سروس باتھرومز میں وہ دونوں کھڑی تھیں۔ تالیہ نے بیگ سنک کے سامنے انڈیل رکھا تھا اور اندر سے کچھ چیزیں نکالتے ہوئے داتن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کے جواب میں اس کی تائید کر رہی تھی.....

”جیفری، چھ سو سال پہلے ملا کہ میں مسلمان سلاطین کی حکومت تھی۔ وہ سلطنت خطے میں ایک مضبوط اور طاقتور حیثیت رکھتی تھی۔

اس دور کے لوگ ہمارے جیسے نہیں تھے۔ کہتے ہیں وہ عظیم لوگ تھے مگر آج میرے ملک کے لوگوں کو ان سے زیادہ بہادر بننے کی

ضرورت ہے۔“.....

داتن باتھروم کے کونے میں رکھی ڈسٹ بن میں اخبار پھاڑ پھاڑ کے ڈال رہی تھی۔ جب ڈسٹ بن بھر گئی تو اس نے لائٹ سے

کاغذ کو سلگایا۔ جلد ہی اخبار نے آگ پکڑ لی۔ شعلے بلند ہونے لگے.....

”آج میرے ملک کے لوگ عجیب منفی رویوں میں ڈوبے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف ان کے مظلوم بچے سے ہوتی ہے۔ یہ کس نے ہم انسانوں کو ہر وقت مظلومیت کی چادر اوڑھے رکھنا اور ہمدردی تلاش کرنا سکھایا ہے.....؟“

باتھ روم ایریا میں داتن ڈسٹ بن کو آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی اور تالیہ اپنا لباس بیگ میں اڑس رہی تھی۔ اس وقت اس نے سیاہ ٹائٹس شرٹ اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چست اور تیار۔ تیز تیز چلتے ہاتھ بیگ کی زپ بند کر رہے تھے۔ پھر بیگ کندھے پہ ڈالا اور کونے والے لٹائلٹ میں گھسی جس کے اوپر روشن دان کی جالی لگی تھی۔ وہ اوپر چڑھی اور وینٹ کا ڈھکن اتارا.....

”آپ صرف سوشل میڈیا کو ہی دیکھ لیں، جیفری۔ مجھے اکثر لوگ وہاں اپنے دکھوں کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کے پاس اگر تین چیزیں ہوں رزق، عزت اور صحت اور وہ پھر بھی وہ غمزدہ ہو اور ہمدردی طلب کرتا نظر آ رہا ہو تو وہ ناشکرا ہوتا ہے.....“

تالیہ نے روشن دان کی جالی اتار کے نیچے پھینکی اور بلی کی طرح اندر گھس گئی۔ اندر لمبی سرنگ سی تھی۔ یہ وینٹ تھے اور ہوا کے لئے ساری عمارت میں پھیلے تھے۔ اتنے چوڑے کہ وہ اس میں سینے کے بل لیٹ کے ریگ ریگ کے آگے بڑھ سکتی تھی....

نیچے داتن ابھی تک آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی...

”میں جس ملک کا خواب دیکھتا ہوں وہاں مجھے لوگوں کو یہ سکھانا ہے کہ مظلومیت اور کمزوری کو خود پہ طاری کرنا چھوڑ دیں۔ نکل آئیں اس مانیڈ سیٹ سے کہ دنیا نے ہم پہ ظلم ڈھادیا۔ خاندان والوں نے ہمارے ساتھ برا کر دیا۔ دوستوں نے یوں دھوکہ دیا۔ ہم دکھی، ہم اداس۔ ہر وقت دوسروں سے ہمدردی مانگنا۔ یہ منفی رویے ہیں۔ ہمیں ان سے نکلنا ہوگا۔ مجھے بالکل ایسے لوگ اٹریکٹ نہیں کرتے جو چاہتے ہیں کہ لوگ ہر وقت ان کے غموں کی داستان سنتے رہیں۔“

داتن نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو دھواں باہر کونکلا۔ وہ آگے آئی اور رہداری میں لگا فارالارم کھینچ دیا۔ ساری عمارت الارم سے گونج اٹھی۔ موٹی عورت تیز تیز آگے چلتی گئی۔ ہر ڈسٹ بن کے ساتھ رکتی... لائٹس سے آگ جلاتی اور آگے بڑھ جاتی... سی سی ٹی وی وہ پہلے ہی جام کر چکی تھی...

”انسان بہت عظیم مخلوق ہے۔ اس میں بہت طاقت ہے۔ اسے تو ساری دنیا کو سنبھالنا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہی نہیں سنبھال پائے، کتنے دکھ کی بات ہے! ہمیں اگر زندگی میں ”خوشی اور کامیابی“ حاصل کرنی ہے تو ہمیں ایک مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔“

”اور مثبت رویہ کیسے اپنایا جاتا ہے آپ کی نظر میں؟“

وینٹ کے اندھیر سرنگ میں وہ کہنیاں گھیٹ گھیٹ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ کندھے پہ چھوٹا بیگ بھی لاد رکھا تھا جس میں ضروری سامان تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد راستے میں کوئی جالی آتی اور وہ اس سے جھانکتی۔ نیچے آؤٹرز کے کمرے نظر آتے جہاں ہڑبونگ

مچی تھی۔ لوگ فارالارم سن کے چیزیں سمیٹ رہے تھے باہر بھاگ رہے تھے.....

”مثبت رویہ ماضی کے دکھوں اور بچھتاؤں سے نکلنے کا نام ہے۔ اگر آپ سے کچھ غلط سرزد ہوا ہے ماضی میں اور سب سے ہی ہوتا ہے تو اس پہ معافی مانگ کے اس سے سبق سیکھیں اور اس پہ ہر وقت کڑھنا چھوڑ دیں۔ آپ انسان ہیں آپ سے ہر وقت سیدھا نہیں چلا جاسکتا۔ چند ایک بار اگر گھر بھی گئے تھے آپ تو اس کو بھول جائیں اور آگے کا راستہ دیکھیں۔“

اشعر کے آفس کے عین اوپر وہ وینٹ میں ریگتے ریگتے پہنچ چکی تھی۔ اب اس کی کہنیوں تلے چوکور جالی تھی جس سے آفس نظر آ رہا تھا۔ اشعر چیزیں سمیٹا اٹھ رہا تھا۔ باہر سے اس کو سیکرٹری بلارہی تھی۔ فارالارم مسلسل چنگھاڑ رہا تھا.....

”اور اگر آپ کو ماضی میں بڑے بڑے غم ملے ہیں تو ان کے پچھتاوے سے نکل آئیں۔ غلط فیصلوں پہ دکھی ہونا چھوڑ دیں۔ زندگی میں کوئی بھی چیز برا تجربہ نہیں ہوتی اگر آپ اس سے سبق سیکھ لیں۔ یہ ہوتی ہے مثبت اپروچ۔ جو برا ہوا ہے آپ کے ساتھ یا جو برا آپ نے کیا ہے..... دونوں سے سیکھنے کے پہلو نکالیں سبق حاصل کریں اور ریلیکس ہو جائیں۔ پھر وہ تجربہ آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔“

اشعر موبائل اور والٹ لئے باہر بھاگ گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ آفس تنہا رہ گیا۔ تالیہ نے وینٹ میں لیٹے لیٹے بیگ سے ایک آلہ نکالا اور بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر لگی اور آفس کے دونوں سی سی ٹی وی کیمرے بجھ گئے۔ اس نے جالی اتاری اور نیچے کود گئی۔ عین اشعر کی میز پہ۔ چہرے کو وہ سیاہ ski ماسک سے ڈھانک چکی تھی.....

”میں چاہتا ہوں میرے ملک کے لوگ دوسروں کو ہر وقت انعام دینا اور مظلوم بننا چھوڑ دیں۔ یہود و نصاریٰ نے ہمارے ملک کی ترقی روک رکھی ہے کفار ہمارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں ان بے کار باتوں سے نکل آئیں۔ اگر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی تو یہ اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ لوگ تو ہر قوم کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ تو پھر دوسری قوموں نے ترقی کیوں کر لی؟ یہ آئینہ دیکھنے کا وقت ہے۔ اپنی غلطیاں بحیثیت قوم مان لینے کا وقت ہے۔“

تالیہ مراد اب اشعر کے آفس کی میز کا ایک ایک دراز کھول کے چیک کر رہی تھی۔ ہاتھوں پہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔ اللہ نے انسان میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ کامیاب آدمی کون ہوتا ہے بھلا؟ وہ جو ماضی کے غم سے نکل آتا ہے اور مستقبل کے بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے۔ ہمارے خواب اتنے بڑے اور انوکھے ہونے چاہئیں بخیر کی کہ وہ ہمیں ڈرائیں۔ پہلی دفعہ ان کو سوچ کے بھی خوف آئے۔ انسان صرف چھوٹے موٹے خوابوں کے لئے نہیں پیدا ہوا۔“

وہ اب دیواروں کی پینٹنگز ہٹا ہٹا کے دیکھ رہی تھی۔ 90 فیصد لوگ آفسز میں سیف کسی پینٹنگ کے پیچھے بناتے تھے۔ مگر پینٹنگز کے پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ سارے آفس میں کوئی سیف نہ تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی اور آنکھیں بند کیں۔

اگر وہ اشعر محمود ہو تو وہ اس آفس میں سیف کہاں بنائے گی؟ سوچو تالیہ! انسان کی کمزوری وہ ہوتی ہے جس پہ وہ بھروسہ کرتا ہے۔ اشعر کس پہ بھروسہ کرتا ہے؟

”خوابوں کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جان ماری پڑتی ہے۔ لوگ مسئلوں کا آسان حل مانگتے ہیں اور جب وہ نہ ملے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو victimhood بالکل نہیں پسند۔ ہمارے کچھ مسئلے ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھیک ہونے میں لمبا عرصہ لگنا ہوتا ہے تو منفی لوگوں کی طرح اس عرصے کو مظلوم بن کے اپنے دکھوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے انسان کو آگے کے بارے میں اچھا سوچنا چاہیے۔ اسے اتنا مثبت بننا چاہیے کہ اس سے مثبت شعائیں پھوٹنے لگیں۔ وہ جہاں جائے ان مثبت خوشگوار روشنیوں کو بکھیرتا جائے۔“

آفس کے وسط میں کھڑی تالیہ نے آنکھیں کھولیں اور اب کے آفس کو دیکھا تو اس کی نظریں مختلف تھیں۔ (میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلند یوں سے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔) وہ دکیل ہونے کے ساتھ ساتھ آرکیٹیکٹ بھی تھا۔ اس نے یہ آفس خود ڈیزائن کیا تھا۔

تالیہ نے دیکھا۔ دیوار پہ ایک بک شیلف نصب تھا۔ اس نے بتی بجھائی۔ بلاسٹڈز بند کیے۔ کمرہ اندھیر ہو گیا۔ پھر اس نے ننھی نارچ نکالی جس میں نیلی روشنی سی تھی۔ اس نے وہ روشنی شیلف پہ پھینکی۔ اوپری قطار میں چوتھے نمبر پہ رکھی کتاب کے اوپر نیچے نشانات نظر آرہے تھے۔ (یہ نارچ اندھیرے میں وہ نشان بھی دکھادیتی ہے جو روشنی میں نظر نہیں آتے۔) تالیہ نے مسکرا کے بتی جلائی اور اس کتاب کو ذرا سا باہر کھینچا۔ بک شیلف میں گڑبڑا ہٹ ہوئی اور وہ میکا کی انداز میں بائیں طرف کو سرکنے لگا.....

”میں زندگی میں کبھی کسی چیز کو لے کر پچھتا تا یا گلٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ جو غلطیاں کی ہیں زندگی میں ان کا مجھے احساس ہے مگر میں ہمیشہ حل ڈھونڈتا ہوں۔ بجائے خود کو لعنت ملامت کرنے کے ہم ہر روز رات کو اگر یہ تسلیم کر لیں کہ ہم انسان ہیں غلطیاں ہم سے ہو جاتی ہیں کوئی بات نہیں ہم اس سے سبق سیکھیں گے اور اگلے دن کو ایک نئے دن کے طور پہ گزاریں گے تو نیند اچھی آئے گی۔“

بک شیلف سامنے سے ہٹ چکا تھا اور پیچھے دیوار میں ایک سلور سیف نصب تھا۔ تالیہ نے کان میں لگا آلہ دبایا۔ ”داتن۔ یہ گلین ریڈر ہے۔ بیس منٹ لگیں گے مجھے۔ اشعر کے آفس اور راہداری کے درمیان مزید diversion کری ایٹ کرو۔ آگ‘ دھواں کچھ بھی۔“

”تالیہ... جلدی کرو... وقت کم ہے دیوانی لڑکی!“ داتن پریشانی سے کہہ رہی تھی.....

”اور جتنے میرے ساتھ زندگی میں حادثے ہوئے میں ان کو بھی ایک تجربہ سمجھتا ہوں۔ میری بیٹی آریا نہ... سب جانتے ہیں کہ وہ

کھو گئی.... سب جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ میں چاہتا تو اس کا غم لے کر تارک الدنیا ہو جاتا.... خود کو پلیم کرتا.... دنیا بھر کو پلیم کرتا.... مگر میں نے اس کو ایک تجربے کے طور پر لیا۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی، لیکن کیا میں نے اس امانت کا شکر ادا کیا تھا؟ اور اب مجھے اپنے باقی دونوں بچوں کو کیسے پالنا ہے ان کے لئے اللہ کا شکر گزار کیسے ہونا ہے، میں بس یہی سوچتا ہوں۔ مثبت رویہ وہ دیکھنے کا نام ہے جو آپ کے پاس بچ گیا ہے اور منفی رویہ ہر وقت اس کو سوچنے کا نام ہے جو کھو گیا ہے۔“

وہ کانوں میں ہیڈ فون لگائے سیف کے سامنے کھڑی مختلف سمتوں میں اس کا پہیہ گھما رہی تھی۔ ماسک تلے چہرے پہ پسینہ آ رہا تھا۔ وہ آوازیں سن رہی تھی۔ کس حرکت پہ کہاں کلک ہوتا تھا۔ سیف کا دھات دھیرے دھیرے اسے راز بتا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کاغذ پہ مختلف نمبرز لکھتی جا رہی تھی۔ جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

”مجھے اپنے ملک کے لوگ مایوس اچھے نہیں لگتے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مثبت بنیں۔ پر امید۔ اونچے خواب رکھنے والے۔ وسیع سوچ رکھنے والے۔ میں چاہتا ہوں لوگ شکر گزار بنیں۔ جو ہے اس کی قدر کریں۔ جو نہیں ہے اس کو زیادہ نہ سوچا کریں۔“ واضح کلک کی آواز آئی۔ تالیہ نے گہری سانس لے کر پہیہ گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

اندر سامنے سامنے نیل فولڈر والی فائل رکھی تھی۔ اس نے فولڈر نکالا، صفحے پلٹائے، تصدیق کی۔ پھر اپنے بیگ سے چند صفحے نکال کے فائل کے اندر لگائے، اور اصلی صفحات بیگ میں ڈال دیے۔

”قومی وہی ترقی کرتی ہیں جو اونچے خواب دیکھتی ہیں اور یاد رکھنا جیفری۔ اگر آپ کو آپ کا خواب ڈراتا نہیں ہے، تو وہ بڑا خواب ہے ہی نہیں۔“

باتھ روم کے روشن دان سے وہ نیچے اتری۔ وہاں دھواں بھرا تھا، مگر دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ماسک اتارا۔ بال کھولے۔ گلابی شرٹ سیاہ لباس کے اوپر پہنی۔ بیٹ سر پہ لیا، جوتے تبدیل کیے اور تیزی سے باہر کودوڑی۔ دھوئیں کے باعث کھانسی آنے لگی تھی۔ فائر الارم ہنوز بج رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ عمارت میں داخل ہو چکا تھا.....

”اگر ہم دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا، اور ہم دیکھیں گے کہ دنیا خود بخود بد دلنے لگی ہے۔ یہ سوچ اور وزن کی تبدیلی ہے جو میں ایک بہتر ملائیشیا میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اسٹوڈیو میں بیٹھا شخص مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور ہنسنے سمیت سب محویت سے اسے سن رہے تھے۔

”تھینک یو وان فاتح آپ کے وقت کے لئے۔“ ہنسنے کے کیمرے کی طرف رخ پھیرا۔ ”ناظرین، مجھے امید ہے کہ آپ نے بھی میری طرح بہت کچھ سیکھا ہوگا اور....“ انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔

فاتح اب اپنی شرٹ پہ لگا مائیک اتار رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی۔ ذہن میں عالم اور فائل کا خیال بار بار آ رہا تھا۔

کو الالہ پور پہ رات اتر رہی تھی۔ اونچی عمارتیں بتیوں سے جگمگانے لگی تھی۔ ایسے میں نکلون شیشون سے ڈھکی عمارت کے ایک فلور پہ جہاں باریسن نیشنل کا آفس تھا، وان فاتح لفٹ سے اتر رہا تھا۔ عثمان اور گارڈز ہمراہ تھے۔ آفس کیبن روشن تھے اور ورکرز کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کو دیکھتے ہی بہت سی گردنیں مڑیں۔ لوگ کھڑے ہوئے۔ سلام دعا۔ وہ اتنے سالوں سے اس سلیبرٹی پروڈوکر کا عادی تھا۔ سب کو مسکرا کے جواب دیتا آفس کی جانب آگیا۔ ابھی دروازے کے قریب ہی تھا کہ جانے کس سمت سے ایک کیپ والا لڑکا نکل آیا۔ وہ پیروں میں پہیوں والے جوتے پہنے، مرمریں فرش پہ گویا skate کرتا تیزی سے سامنے آیا تھا۔ (ایسے میسنجر لڑکے اکثر پہیوں والے جوتے پہنے راہداریوں میں زن سے گزرتے دکھائی دیتے تھے۔)

”وان فاتح۔“ کوریر۔“ ایک پیکیج اس کی طرف بڑھایا اور ٹیلیٹ اسکرین آگے کی۔ فاتح ہلکا سا مسکرا دیا اور ٹیلیٹ اسکرین پہ انگوٹھا رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا یہ کس کی طرف سے ہوگا۔

آفس میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے پیکیج کھولا۔ اندر کاغذات رکھے تھے۔ ترتیب سے۔ وہ جیسے جیسے صفحات پلٹتا گیا، آنکھوں میں خوشگوار حیرت بھرتی گئی۔ اسی اثناء میں فون بجاتا وہ چونکا۔ پھر نمبر دیکھ کے مسکرایا۔

”تمہارا میجک شو کامیاب رہا، عالم۔“

”کیا آپ متاثر ہوئے؟“

”بہت زیادہ۔ مگر ہر میجک شو کے بعد حاضرین کرتب کاراز جانا چاہتے ہیں۔“

”مگر کیا آپ نے کسی جادوگر کو اسٹیج پہ کھڑے ہو کر اپنے راز بتاتے دیکھا ہے؟“

”بیک اسٹیج تو بتایا جاسکتا ہے نا!“

”آپ کیا جانا چاہتے ہیں؟“

”یہ تم نے کہاں سے لئے؟“

”اشعر محمود کے آفس کے سیف سے۔ میں نے چند ردی کاغذ فائل کے اندر رکھ دیے ہیں، تاکہ ان کو فوراً شک نہ پڑے۔ اب

آپ ان کاغذات کی حفاظت کیجیے گا۔“

”تم نے مجھے عثمان کے سامنے یہ سب کہنے کا کہا، تمہارے خیال میں وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے۔“

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے، اگر میں اتنے کم عرصے میں جان گیا ہوں تو آپ کیوں نہیں

جانتے ہوں گے بھلا؟“ عالم لمحے بھر کو بھی نہیں چوک رہا تھا۔ ترنت جوابات دے رہا تھا۔

فاتح ہلکا سا ہنس دیا۔ ”یہاں کوئی کسی کا وفادار نہیں ہوتا، ہمیں صرف کام نکلوانا ہوتا ہے۔ کسی اور کو رکھوں تو وہ بھی پک جائے گا۔“

”وفاداری آج بھی اپنا وجود رکھتی ہے وان فاتح۔ کچھ لوگ وفاداری کے ایسے وعدے کر لیتے ہیں کہ اس کے لئے آگ میں بھی کود پڑتے ہیں۔ خیر...“ عالم نے گہری سانس لی۔ ”آپ کا کام ہو گیا۔ مجھے اجازت؟“

”اور تمہاری فیس؟“

”میں نے یہ فیس کے لئے نہیں کیا۔ سیاستدانوں سے کون پاگل پیسے لے گا؟ سیاستدانوں سے تو فیورز مانگے جاتے ہیں۔ آپ

اب میرے مقروض ہیں۔ کبھی کوئی کام لے کر آؤں تو کر دیجیے گا۔ وہی میری فیس ہوگی۔“

فاتح نے ٹیک لگالی اور فون کان سے لگائے مسکرا کے اس کو سننے گیا۔

”کبھی مجھ سے ملنے آؤ، عالم۔“

”میں آپ کی توقعات کے برعکس ہوں، سر۔ ایسی خواہش نہ کریں تو اچھا ہوگا۔“ اس کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

”ہوں... ویسے عالم کا کیا مطلب ہوا؟“

”خواب دیکھنے والا۔“

فاتح کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا۔ ”یعنی کہ visionary!“ پھر جیسے یاد آیا۔ ”تم نے بتایا نہیں، یہ کام کس کا تھا

؟“

چند لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ ”آپ چور کا نام جاننا چاہتے ہیں؟“ عالم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اور میں یہ جانے بغیر فون نہیں رکھوں گا۔ میری ہٹ دھرمی سے سارا ملا میٹیا، واقف ہے۔“

”تو پھر سنئے۔ آپ کے گھر پر چوری... (وقفہ دیا)... تالیہ مراد نامی لڑکی نے کی تھی۔ وہ کوئی سوشلائٹ ہے اور جس کا آپ کے گھر

کچھ دنوں سے آنا جانا ہے۔“

فاتح نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔ ”یعنی میرا شک درست تھا۔ گڈ جاب، عالم۔“

”میں آپ کے لئے حاضر ہوں وان فاتح۔ جہاں آپ کہیں، جب آپ کہیں۔“ اور کلک کے ساتھ فون بند ہو گیا۔ فاتح نے

خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون پرے ڈالا اور صفحات اٹھا کے پھر سے دیکھنے لگا۔ سارے دن کی کلفت دور ہو گئی تھی۔

تکون عمارت کے باہر... اندھیر پارکنگ میں وہ دونوں موجود تھیں۔ تالیہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی فون کان سے ہٹا رہی تھی

اور داتن ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے دھچکا لگا تھا۔

”یہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تالیہ مراد چور ہے؟ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو اپنے ساتھ؟“

”تو کیا کہتی؟“ وہ اداسی سے داتن کو دیکھ کے بولی۔ ”آپ کی بیوی چور ہے؟“

”ہمارے پاس ویڈیو ہے عصرہ کی۔“

”داتن وہ کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرتے۔ ان کا کوئی دوست نہیں۔ وہ کسی سے جلدی متاثر نہیں ہوتے۔ مگر انہوں نے عالم کو ٹھیکس

تک نہیں کہا کیونکہ وہ صرف اجنبیوں کو شکریہ کہتے ہیں۔ وہ عالم کو اجنبی نہیں سمجھتے۔ عالم نے ان کا اعتماد جیتا ہے۔ مجھے ان کو وہی بتانا تھا جو وہ سننا چاہتے تھے۔“

”مگر تم نے اپنا میج ہی کیوں خراب کیا؟“ داتن صدے میں تھی۔

”میں نے ان سے سچ بولا ہے۔ تالیہ نے ان کے گھر چوری کی تھی۔ بریسلیٹ چرایا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ کسی سے اتنا بڑا سچ بولا ہے۔ اور میرا میج تو ان پہ پہلے ہی خراب ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ کے کارا اشارٹ کرنے لگی۔ داتن ابھی تک صدے سے چور اس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم نے آج اپنی جان خطرے میں ڈالی، تم نے آج اندھا دھند کھائی میں چھلانگ لگائی، میں نے تمہیں کبھی ایسا نہیں کرتے دیکھا تالیہ۔ ایسے مت کرو اس کے لئے۔ تمہارا دل بیمار پڑ گیا تو جسم کسی کام کا نہیں رہے گا۔“

”مجھے لگتا ہے میرا دل پہلے ہی بیمار پڑ چکا ہے، لیانہ صابری۔“ وہ بولی نہیں، بس دل میں کہا اور اسٹیرنگ وہیل گھما دیا۔

کار آگے بڑھ گئی اور تکیوں عمارت پیچھے رات میں کھڑی رہ گئی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہا، نگاہ کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ایسے میں فاتح کے کمرے میں آؤ تو وہ ڈریسنگ روم میں کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور وہ بیگر سے کپڑے اتار رہا تھا۔ دو جوڑے لئے اور کمرے میں واپس آیا جہاں بیڈ پہ ایک چھوٹا سفری بیگ کھلا پڑا تھا۔ پھر ایک دم ٹھنکا۔

عصرہ سامنے کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔ خاموش۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے۔ اسے دیکھ کے جبراً مسکرائی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

وہ آگے آیا اور بیگ میں کپڑے تہہ کر کے رکھنے لگا۔ ”ملا کہ۔ کل چھٹی ہے نا۔“

”کیوں جا رہے ہو؟“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

”سن باؤ (تین خزانوں) کے گھر کو بیچنے سے پہلے ایک آخری دن اس میں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی کیسے پیچو گے؟ کاغذات تو ہیں ہی نہیں۔“

”کاغذات مل گئے ہیں۔“ وہ سر جھکائے بیگ میں سامان اڑس رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”کیا مطلب؟ کہاں سے ملے؟“ تیزی سے بولی۔

”مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں نے اور بجنل ڈاکومنٹس کہیں اور رکھے تھے۔ یہاں صرف کلرڈ کاپیز تھیں۔“ اس کی نگاہیں جھکی تھیں اور وہ شیو کا سامان ایک خانے میں ڈال رہا تھا۔

”واٹ؟“ وہ شل رہ گئی۔ ”تو جو کاغذات یہاں تھے.... جو تالیہ نے چرائے تمہارے بقول وہ صرف فوٹوکاپی تھی؟“

”ہوں!“ اب ڈریسر مرمر کی طرف بڑھ گیا۔ جھک کے دراز کھولا اور جرائیں نکالیں۔ وہ بالکل بے نیاز لگ رہا تھا۔

عصرہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ پھر اس نے لب بھنج لئے۔ بازو سینے پہ لپیٹ لئے۔ ”تو صبح سے اتنا ہنگامہ کیوں مچایا ہوا تھا؟“

”کیونکہ وہ کاغذات اہم تھے۔“ وہ جرائیں لے کر واپس آیا اور ان کو بیگ میں ڈالا۔ ابھی تک عصرہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

”اور میری نیلامی؟ میرے ڈونرز؟ وہ اہم نہیں تھے؟“ عصرہ کے اندر ابال سا اٹھنے لگا تھا۔ بے بسی... غصہ... فرسٹریشن... وہ شدید کیفیات کا شکار تھی۔

”تم نے میری اس ڈونز کو بے عزت کیا جو کانگ ہو جیسے لوگوں کو مدعو کر رہی تھی، جس نے میرا پورٹریٹ بنایا، جو گھائل غزال خریدنے جا رہی ہے۔ میں پہلے دن سے تمہاری منت کر رہی ہوں کہ اس کے ساتھ سلوک اچھا رکھو، مجھے اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے مگر تم....!“

فاتح نے اکتا کے چہرہ اٹھایا۔ ”اس نے چوری تو بہر حال کی ہے، کاپیز ہی سہی۔“

”بس دان فاتح!“ عصرہ نے ہاتھ اٹھا کے سرخ چہرے کے ساتھ اسے روکا اور کھڑی ہوئی۔ ”کبھی وہ چور ہے تو کبھی میرا بھائی۔ اور کبھی کہتے ہو فائل کھوئی ہی نہیں۔ وہ آج میرے آفس آئی تھی اور وہ شدید دکھی تھی۔“ فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

”اس نے بدتمیزی کی تمہارے ساتھ؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے کہ اس نے کیا کیا۔ میں تمہارے ایک ایک معاملے میں تمہارا ساتھ دوں اور تم میرے کام کو خراب کرو۔ بس بہت ہو گیا۔ ایکشن لڑنا ہے، لڑو۔ ملاکہ والا گھر بچنا ہے، پیچو۔ لیکن میرے دوستوں سے اب تم دور رہو گے۔ اتنے سالوں سے تمہارے جنون کے پیچھے ہم خوار ہو رہے ہیں۔ اب اور نہیں۔“

”تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ کاغذات مل گئے ہیں، نہ کہ غصہ کرنا چاہیے۔“ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں سرخ

انگاہہ ہو رہی تھیں۔

”کس بات پہ خوش ہوں؟ میرے بھائی پہ الزام لگایا تم نے؟ میری ڈونز کو بے عزت کیا تم نے؟ اس فائل کے پیچھے جو کھوئی بھی نہیں تھی۔ ایک بات میری سن لو فاتح۔ اگر آئندہ تم نے میرے دوستوں کے ساتھ یہ کیا تو....“ وہ انگلی اٹھا کے کہہ رہی تھی کہ....

”ایک بات میری بھی سن لو عصرہ... اگر مجھے کبھی پتہ چلا کہ تم نے اس کام میں اپنے بھائی یا اس لڑکی کی مدد کی ہے، تو یاد رکھنا اس کے بعد ہم اس موڑ پہ آجائیں گے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔“ وہ ٹھنڈے انداز میں بولا، ایسے کہ نگاہیں اس کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ عصرہ نے انگلی گرا دی۔ مگر وہ ٹھنڈی نہیں پڑی تھی۔ غصے سے پیر پختی مڑی اور باہر نکل گئی۔

اسے پسینہ آرہا تھا۔ جسم تپ رہا تھا۔ تیزی سے وہ کمرے میں واپس آئی۔ دروازہ بند کیا۔ پھر ڈریسنگ روم میں آئی۔ یہاں کا بھی دروازہ مقفل کیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے کال ملائی۔

”ایش... فاتح کہہ رہا ہے اسے فائل مل گئی ہے۔“ پیشانی چھوتی، وہ دبی آواز میں بولی تو شدید پریشان لگ رہی تھی۔

”ہاں کا کا... آنگ نے یہی بات آگے پیچھے بھی دوسرے لوگوں کے سامنے بھی دہرائی ہے کہ اس کو کسی انویسٹی گیٹر نے فائل واپس لا دی ہے مگر ڈونٹ وری... فائل میرے پاس ہی ہے۔“ اس کی مطمئن آواز سنائی دی تھی۔

”نہیں۔ میں فاتح کو جانتی ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اصل فائل کھوئی ہی نہیں تھی۔ He is a terrible liar۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر اس کی شکل پہ لکھا ہے کہ اس کو واقعی فائل مل گئی ہے۔“

”ریلیکس کا کا۔ میں نے خود چیک کیا ہے وہ میرے پاس ہی ہے۔“

”میں کیا کہہ رہی ہوں، اشعر وہ فائل تمہارے نہیں، فاتح کے پاس ہے۔ وہ اسے تم سے نکلوا چکا ہے۔ شاید کسی انویسٹی گیٹر کے ذریعے۔ وہ وان فاتح ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور اسے مجھ پہ بھی شک ہو رہا ہے۔“

”کا کا۔ ہم صبح بات کریں گے۔ میرے آفس میں پہلے ہی حالات خراب چل رہے ہیں۔ میں سارے دن کا تھکا آیا ہوں۔“ وہ بے زار ہوا تو عصرہ کی تیوریاں جڑھ گئیں۔

”میں نے تمہارے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا اور تمہیں پرواہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم انکیشن لڑو یا فاتح، مجھے پرواہ نہیں ہو گی۔ میں صرف اپنا فائدہ نقصان دیکھوں گی جیسے تم لوگ دیکھتے ہو۔“ کہہ کے ٹھک سے فون بند کیا۔ اشعر شاید وضاحت دے رہا تھا مگر اس نے نہیں سنا۔

پھر وہ گھومی تو ڈریسمر سامنے آیا۔ وہ خاموش ڈریسنگ روم میں تنہا کھڑی تھی۔ قدم قدم چلتی آئینے کے قریب آئی اور اپنا عکس دیکھا۔ انگلی کے پوروں سے آنکھوں کے کنارے کو چھوا۔

”آریانہ کے نقش بھی مجھ میں ملتے تھے۔ نین اتج میں پہنچ کے وہ بھی ایسی ہی لگنے لگے گی۔ آج کے دن وہ کھوئی تھی۔ چھ سال

پہلے۔ تیرہ سال کی ہو گئی ہوگی وہ۔“ چند لمحے وہ خود کو دیکھتی رہی، پھر مسکرائی، جیسے چہرے کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ کریم اٹھائی اور نرمی سے چہرے پہ لگانے لگی۔ جلد چمکنے لگی تو وہ دل سے مسکرائی اور فون اٹھالیا۔
اب وہ واپس کمرے میں آتے ہوئے آرام دہ انداز میں بات کر رہی تھی۔
”کیسی ہوتا لیہ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں، مسز عصرہ؟“ تالیہ کی سنجیدہ مگر نرم آواز سنائی دی۔ عصرہ بڑی کرسی پہ بیٹھ گئی اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی، پھر بھورے بالوں کی ایک لٹ انگلی پہ لپیٹتے ہوئے گویا ہوئی۔
”میں فاتح کی طرف سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج کل الیکشن کی وجہ سے ٹینس ہے۔ جلد خفا ہو جاتا ہے۔ جانے تمہیں کیا کیا کہہ بیٹھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ ان کو تو قوم دو چار قتل بھی معاف کر دے گی۔“ تالیہ کی اداس ہنسی گونجی۔
”مگر میں مداوا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسی کوئی بھی بات ہمارے درمیان آئے۔“ عصرہ کی بادامی آنکھیں جیسے تانے بانے بنتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”مداوا مت کہیں.... درخواست سمجھ لیں۔ ایک چھوٹا سا کام آپ میرے لئے کر سکتی ہیں۔“
”شیور۔ بتاؤ۔ مجھے خوشی ہوگی۔“ اور پھر تالیہ کی بات سن کے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔
”بالکل تالیہ۔ یہ میں کر سکتی ہوں۔ اور کل ہی کر سکتی ہوں۔“
کھڑکی سے باہر جس آلہ و رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

حالم کا اونچا بنگلہ رات کے اس پہر خاموش پڑا تھا۔ تالیہ، داتن کو ڈراپ کر کے کار اندر لائی تو پورچ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ کار سے نکلی اور سوچ بورڈ کی طرف آئی۔ مگر ٹھک کے رک گئی۔ سانس بھی روک لیا۔ پھر ایک دم گھومی۔
وہ پورچ کے ستون کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، مسکراتا ہوا۔ سمج۔
تالیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔ ایک نظر گیٹ کو دیکھا جو چارنٹ کا جنگلہ نما تھا۔ کوئی بچہ بھی اس کو پھلانگ لے۔ مگر پھر بھی یہ سمج کی طرف سے ایک جراثیم مندانہ قدم تھا۔ وہ اس کے گھر کے گیٹ کے اندر تک پہنچ چکا تھا۔
”کیوں آئے ہو؟“ بھنویں اکٹھی کر کے وہ غصے سے بولی۔ سمج نے ایک ہاتھ جیب سے نکالا اور چھوٹی سی کچھڑی داڑھی کھجائی

”تم سے ملاقات کا دل چاہ رہا تھا۔ سارا دن تو تم بڑے لوگوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ رات کو ہی فارغ ہو کے گھر آتی ہو۔“
 ”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“ اس نے بازو لمبا کر کے غصے سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ایئر پورٹ
 وہ بیگ وہ تکلیف ... سب ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ایک اس آدمی سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اس نے جیسے کبھی ساتھ چھوڑا ہی نہیں
 تھا۔

”یہ میرا کاؤنٹ نمبر ہے۔“ اس نے ایک پرچی تالیہ کی طرف بڑھائی۔ تالیہ برہمی سے اسے گھورتی رہی۔ پرچی نہیں تھامی تو
 سمجھنے لگا۔ اسے اس کی کار کی چھت پہ چپکا دیا۔ وہ sticky نوٹ تھا۔ فوراً چپک گیا۔
 ”تمہارے پاس دو دن ہیں۔ کل اور پرسوں۔ پھر میں وہ کروں گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ ان دو دنوں
 میں میرے وظیفے کی رقم کا تعین کر لو، میرا لائف ٹائم پلان تیار کر دو اور اس کاؤنٹ میں پہلی قسط بھجوا دو۔“ وہ چبا چبا کے کہہ رہا تھا
 ”اگر دو دن تک مجھے رقم نہ ملی تو تمہارا یہ تاش کے پتوں کا گھر (انگلی سے اونچے بنگلے کی طرف اشارہ کیا) نیچے آن گرے گا۔“
 گھنٹی بجی تو دونوں نے چونک کے دیکھا۔ جنگلے نما گیٹ کے باہر نیم اندھیرے میں کھڑا ایڈم نظر آ رہا تھا۔ سمجھنے لگا کہ کالر کھڑکا کے
 سیدھے کیے۔

”تمہارے مہمانوں کے سامنے تمہاری اصلیت کھولنے کا دل تو بہت چاہ رہا ہے مگر کیا کروں، مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے
 ۔ اور دو دن تک اس زبان کو میں بند رکھوں گا۔ صرف دو دن ہیں تمہارے پاس، میڈم تالیہ۔“ مسکراتی نظر اس پہ ڈالی اور گیٹ کی
 طرف چلا گیا۔ البتہ باہر نکلتے ہوئے اس نے سر سے پیر تک ایڈم کو دیکھا ضرور تھا۔
 ”آ جاؤ ایڈم!“ خفا کھڑی تالیہ نے وہیں سے پکارا۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایڈم کے کسمپرسی کا جواب دے کر اسے گھر آنے کا
 بولا تھا۔

ایڈم ایک ناپسندیدہ نظر اس آدمی پہ ڈالتا اندر آیا۔ تالیہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ وہیں کار کے ساتھ اندھیر پوچ میں کھڑی رہی۔
 بیگ کہنی پہ تھا اور بازو سینے پہ پٹیٹ رکھے تھے۔

ایڈم ذرا فاصلے پہ رکا۔ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، ذرا دہشت انگیز رنگت والا ایڈم آنکھوں میں الجھنیں لئے ہوئے تھا۔
 ”بولو۔ کیوں آئے ہو؟“ وہ خفا اور اکتائی ہوئی لگتی تھی۔

”کیا یہ آدمی آپ کو تنگ کر رہا تھا؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ میں پولیس آفیسر ہوں، ان لوگوں سے نبٹ سکتی ہوں۔“

”یہی جاننے آیا ہوں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں واقعی یا نہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھنڈے انداز میں بولا تو تالیہ کے

ماتھے پہ بل پڑے۔ اس نے ہتھیلی پھیلائی۔
”میرا سکہ؟“

”آپ نے تو کہا تھا وہ سرکار کا ہے۔“

”مگر وہ واپس میرے ذریعے ہی جائے گا۔“

”نہیں چے تالیہ۔“ اس نے غور سے تالیہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں وہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ مجھے آپ پہ اعتبار نہیں رہا۔“ تالیہ نے مٹھی نیچے گرا دی۔

”ایسا کیا کیا ہے میں نے جو تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟“

”آپ نے ابھی تک یقین دلانے کے لئے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔“

”میں تمہیں ایک بونس آفر کر رہی تھی ایڈم۔“ وہ جھلا کے حیرت سے بولی۔

”آپ مجھے لالچ دے رہی تھیں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے آپ شروع دن سے اس سکے کے پیچھے تھیں۔ میرا نہیں خیال وان فاتح آپ سے واقف ہیں ورنہ وہ گھر میں ہونے والی چوری کے بارے میں آپ سے سوال جواب کیوں کرتے؟“
تالیہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔ ”وہ سب عصرہ اور اشعر کو دکھانے کے لئے تھا تا کہ اصل چور مطمئن رہے کہ فاتح کو اس پہ شک نہیں اور ہم اس کو پکڑ لیں!“

”یہ سب کہانیاں ہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلارہا تھا۔ آنکھوں میں افسوس تھا۔ ”اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں تو آپ کو مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔ سچ بولنے سے معاملہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور جھوٹ اسے مستقبل کا حصہ بنا دیتا ہے۔ آپ کون ہیں۔ آپ کا مقصد کیا ہے اور میں آپ کی مدد کر کے درست کروں گا یا نہیں، مجھے صرف سچ بتائیں چے تالیہ۔“
اندھیر پورچ میں کھڑی سنہرے بالوں والی لڑکی چند لمحے تندہی سے اسے دیکھتی رہی۔

”میرا نام تاشہ کمال ہے اور میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ اگر چاہتی تو پولیس بھیج کے وہ سکہ تم سے ری کور کر کے تمہیں چوری کے الزام میں جیل بھیج سکتی تھی مگر مجھے تم پہ ترس آیا اور میں نے سوچا کہ تمہیں بونس ملنا چاہیے۔ بہر حال کل تک سوچ لو۔ کس طرح واپس کرنا ہے تم نے وہ سکہ، یہ فیصلہ کر لو۔ اس کے بعد ہم دونوں ساتھ کام نہیں کریں گے۔“

”یعنی آپ مجھے پورا سچ نہیں بتائیں گی۔“ ایڈم زخمی لہجے میں بولا اور پھر شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتا قدم قدم پیچھے ہٹا گیا۔
”اب میں سچائی کی تلاش خود کروں گا چے تالیہ۔“ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور تالیہ خاموشی سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

ایڈم چلا گیا اور وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ آج کے لئے بہت سچ بول چکی وہ۔ اب مزید نہیں۔ اسے ایڈم کا کوئی اور حل سوچنا پڑے

”وہ تمہارے خواب میں تمہارے ساتھ خزانہ دھونڈ رہا تھا۔ اس کو خزانے کا راز بتا دو، تالیہ!“ دل میں کسی نے کہا مگر اس نے سختی سے دل کو جھڑکا۔

”میں خزانہ کسی کے ساتھ شیئر نہیں کروں گی۔ میں ایڈم کو سچ نہیں بتا سکتی۔ اسے لالچ آگیا اور اس نے سارا خزانہ خود حاصل کرنے کا سوچ لیا تو؟ او نہوں۔ خزانہ صرف میرا ہے۔ میرے باپا اور میرے گاؤں والوں کا ہے۔“

رات تاریک ہوتی گئی اور وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ آلتی پالتی کیے بیٹھی سوچتی رہی۔ ہاتھ میں سنہرا لاکٹ پکڑ رکھا تھا۔ بار بار خود کو جھڑکتی۔ اپنی ہی تردید کرتی۔ سکہ اس کا تھا۔ چابی اس کی تھی۔ وہ اس کو شیئر نہیں کرے گی۔

مگر کیا واقعی چابی اس کی تھی؟ اس نے سنہری لاکٹ کو دیکھا اور پھر اسے گردن میں پہنا۔ پیچھے ہلک بند کرتے وقت وہ تیار تھی۔ وہ اس کی یادوں کا پنجرہ تھا اور وہ اس میں کھو جانے کو تیار تھی....

منظر ایک دم بدلا.... آنکھوں کے سامنے روشنی چھانے لگی۔ آگ کی سی روشنی.... جیسے بھڑکتے شعلے ہوں۔ وہ مدھم ہوئے تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔

مراد انگلیٹھی کے پاس بیٹھا ہے.... جھک کے وہ لوہے کے چمٹے سے دہکتی چابی انگاروں کے اوپر سے اٹھاتا ہے... وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے پنچوں کے بل اس کے پاس بیٹھی دلچسپی سے اس کی حرکات دیکھ رہی ہے....

چابی سنہری دہک رہی ہے... مراد اس کو احتیاط سے اٹھائے کھڑا ہوتا ہے پھر واپس ایک میز کی طرف آتا ہے... وہ بھی فوراً اٹھ کے پیچھے لپکتی ہے...

اب وہ دونوں میز کے مخالف سروں پہ کھڑے ہیں.... درمیان میں ایک پیالہ ہے جس میں پانی جیسا کوئی مائع ہے... مراد کو پسینے آ رہے ہیں وہ ایک ہاتھ سے پیشانی پونچھتا ہے اور دوسرے سے... چمٹا پیالے کے اوپر لاتا ہے... پھر چابی اندر گراتا ہے... وہ ڈبکی کھاتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے....

تالیہ کے لب کھل جاتے ہیں... وہ ہراساں سی آنکھیں اٹھاتی ہے....

”باپا.... یہ تو ٹوٹ گئی....“

”اس کو ٹوٹنا ہی تھا، تالیہ.... پھر سے جڑنے کے لئے!“

”وہ کیسے؟“

”یہ چاند کی ایکسوس تک اس پانی میں پڑی رہے گی۔ پھر اس کو نکال کے جوڑا جائے گا۔ ابھی یہ اتنی گرم ہے کہ یہ میری روح

تک کھا جائے گی۔“ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھے مسکرا کے اسے بتا رہا ہے۔ وہ درمیانی عمر کا آدمی ہے۔ دبلا پتلا، مگر چہرہ بے حد پر کشش ہے۔ سیاہ بال کندھوں تک آتے ہیں۔ سر پہ رو مال پلیٹ رکھا ہے۔ زبوں حالی، غربت، کمرے کی ہر شے سے ٹپکتی ہے۔

”اور اسے کون جوڑے گا، بابا؟“ ننھی لڑکی کھوئے کھوئے انداز میں پوچھتی ہے....

”جو اس کا مالک ہوگا۔ یعنی میں۔ جو بھی اس کوٹوئے کے بعد جوڑتا ہے، وہی چابی کا مالک ہوتا ہے۔ یہ خزانے کی کنجی ہے تالیہ۔ سوچو.... اگر ہم خزانے کا قفل کھول لیں تو اپنے لوگوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے....“

”جب ہمارے پاس خزانہ آجائے گا تو کیا آپ کا خاندان ہیں قبول کر لے گا، بابا؟ کیا وہ لوگ....“

مگر مراد کی آنکھوں میں سرخی ابھرتی ہے۔

”میں ان کا ذکر بھی نہیں سنتا چاہتا، تالیہ۔ وہ ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے ہمارے گاؤں پہ؟ اب چلو یہاں سے۔ اور سنو، تم اس کمرے میں میری اجازت کے بغیر نہیں آؤ گی۔“ وہ انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتا ہے اور ننھی لڑکی جھٹ سر بلا دیتی ہے....

بوجھ بڑھ گیا تھا.... یادیں بھاری ہو رہی تھیں.... تالیہ نے کراہ کے لاکٹ نوچ ڈالا....

کوئی فلم سی بند ہوئی۔ روشنی چھٹ گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی تھی... تکیہ گود میں رکھے۔ سب کچھ کتنا مختلف تھا اس کمرے اور اس کمرے میں.... کچھ غلط تھا ادھر... کچھ عجیب سا.... کچھ ایسا جو اس کا دماغ پکڑ نہیں پارہا تھا....

کیا معلوم داتن درست کہہ رہی ہو اور....؟

اونہوں۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ ایسا ناممکن ہے۔ کبھی نہیں۔ یہ موٹی بھی نا!

وہ چپت لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا مطلب ہوا حالم کا؟“

”کبھی مجھ سے ملنے آؤ، حالم!“

ذہن میں کسی کا محظوظ لہجہ گونجا تو وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔ ایک عجیب دن کا دورے بہتر انجام ہوا تھا....

☆☆=====☆☆

اگلی صبح ابھی فجر قضا ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب وان فاتح کی رہا، شگاہ پہ صبح کے بنگاے جاگ اٹھے۔

آسمان ابھی گہرا نیلا تھا اور پورچ میں بتیاں جلی تھیں۔ ملازمہ کار میں اس کا بیگ رکھ رہی تھی اور وہ ساتھ کھڑا موٹر سائیکل پہ کچھ ٹائپ

کر رہا تھا۔ نیلی جنیز کے اوپر سفید ڈریس شرٹ پہنے اس نے آستین کہنیوں تک موڑ رکھے تھے اور پاؤں میں جو گرز تھے۔ ہمیشہ کی طرح یگ اور فریش۔

پھر موبائل جیب میں ڈال کے ڈرائیور سے چابی مانگی۔ ”میں خود ڈرائیو کروں گا تم گھر جاؤ۔“
 ”مگر سر... سکیورٹی اسٹاف؟“

”کیا میں ایک دن کی چھٹی پہ نہیں جاسکتا؟“ ذرا سا مسکرا کے پوچھا اور ڈرائیونگ ڈور کھولا۔ ڈرائیور فکر مند سا ہوا۔
 ”سر دو گھنٹے کا سفر ہے... آپ مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔“

فاس سے پہلے کہ فاتح کچھ کہتا اندر سے عصرہ آتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی وہ دونوں بچوں کو باہر لارہی تھی جو سوئے سوئے سے لگ رہے تھے مگر منہ دھلے اور بال بنے ہوئے تھے۔ فاتح نے اچنبھے سے ابرو اٹھائے۔
 ”یہ کیا؟“

عصرہ نے مسکرا کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”سن باؤ کے گھر میں آخری دن ہم سب کو ساتھ گزانا چاہیے۔“ پھر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ”تم پچھلی کار میں سکیورٹی گارڈز کے ہمراہ آؤ گے۔ جاؤ۔“ پھر اس نے فاتح کو دیکھا جو ذرا حیران ہوا تھا۔ ”تمہیں اعتراض ہے کیا؟“

فاتح کے چہرے پہ مسکراہٹ ریگ گئی۔ ”بالکل نہیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ ہم سب ایک ساتھ جائیں۔“ وہ خوش ہوا تھا۔ ”مگر میں ساری فوج کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔“ ابرو سے سکیورٹی کی کار کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ تمہارے لئے نہیں ہیں فاتح۔ وہ ہمارے بچوں کی حفاظت کے لئے ہیں۔ اور مجھے شاید جلدی واپس آنا پڑے دوپہر تک تو مجھے الگ کار چاہیے ہوگی۔“ وہ سارے فیصلے کر چکی تھی۔ سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے فرنٹ سیٹ پہ استحقاق سے بیٹھی تھی۔

وان فاتح نے سمجھ کے سر ہلا دیا اور بیلٹ پہنتے ہوئے گردن موڑی۔ پیچھے جولیانہ اور سکندر بیٹھے تھے۔ وہ مسکرایا۔

”آج میں تمہارے دادا کا گھر آخری دفعہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ اور میں بہت خوش ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ ہو۔“

”ڈیڈ... ہم وہ گھر کیوں بیچ رہے ہیں۔“ سکندر ادا اس سا ہوا۔ گیارہ سالہ خوبصورت بچہ جو اپنی عمر سے زیادہ ذہین لگتا تھا۔

”ہم کون سا وہاں رہتے ہیں سکندر؟“ جولیانہ نے ناک چڑائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

”کتنے دنوں بعد ڈیڈ نے تمہارے لئے وقت نکالا ہے کیا تم دونوں ان کو یونہی تنگ کرتے جاؤ گے؟“ عصرہ نے نرمی سے ٹوکا تو

سکندر نے سمجھداری سے سر ہلایا۔

”میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ ڈیڈ جو بھی کریں گے صحیح کریں گے۔“

”ڈیڈ!“ جولیانہ نے ابرو اکٹھے کیے چہرہ واپس موڑا۔ ”اس گھر کو ”سن باؤ“ (تین خزانوں) والا گھر کیوں کہتے ہیں؟“ فاتح نے چابی انکیشن میں گھمائی اور مسکرا کے اسٹیرنگ وہیل پھیرا۔ ”یہ ایک دلچسپ کہانی ہے اور تمہیں پتہ ہے تمہارے ڈیڈ کو تمہیں کہانیاں سنانا کتنا اچھا لگتا ہے ہوں؟“ وہ اب کار پیچھے موڑ رہا تھا۔
صبح کی سفیدی دور افق پہ پھیل رہی تھی اور کوالا پور جاگنے لگا تھا۔
یہ ایڈم کی نوکری کا گیارہواں اور آخری دن تھا جو ساری دنیا کے لیے اسی رات بارہ بجے ختم ہو جانا تھا مگر ان تین انسانوں کے لئے وہ کبھی نہ ختم ہونے والا دن بنے جا رہا تھا....

☆☆=====☆☆

صبح کی سفیدی اب سنہرے پن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اشعر محمود کی آفس بلڈنگ کے ۳۵ فلورز مکمل طور پہ جاگ چکے تھے اور کام کے دھنی لوگ منہ اندھیرے ہی جا ب پہ پہنچ چکے تھے۔
صبح اٹھنے والے... تازہ ذہن کے ساتھ کام کرنے والے.... اپنی زندگیوں کے ایک ایک منٹ کو استعمال کرنے والے لوگ... کامیابیاں پھر ایسے ہی تو نہیں ملا کرتیں.... برکتیں ایسے ہی تو گھروں پہ نازل نہیں ہوتیں... رزق ایسے ہی تو نہیں بڑھ جاتا۔
صبح اٹھنے والوں اور سورج نکلنے کے بعد اٹھنے والوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کامیابی اور ناکامی میں۔
اشعر محمود اپنے آفس میں کھڑا تھا۔ بک شیلف سامنے سے ہٹا تھا اور دیوار میں نصب سیف کھلا پڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑے بھنویں بھینچ فائل کے صفحے پلٹا رہا تھا۔ جیسے جیسے اگلا صفحہ سامنے آتا اس کی رنگت تبدیل ہوتی گئی۔ آخر میں وہ مڑا اور پوری قوت سے فائل دیوار پہ دے ماری۔ صفحات ادھر ادھر بکھر گئے۔ خالی صفحات۔
ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا رہی کھنکھارا۔ ”سر.... میں نے خود چیک کیا تھا۔ جب مسز عصرہ نے فائل دی تھی تو اس میں اصلی ڈاکومنٹس تھے۔“

”اب اس میں صرف بلینک پیپرز ہیں۔ عثمان کی کال کے بعد میں نے صرف سیف کھول کے فائل کو دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ فائل پڑی ہے۔ اُف۔“

”کسی نے آگ کے دوران کل شاید کاغذات تبدیل کیے ہوں۔“
اشعر غصے سے اس کی طرف گھوما اور غرایا۔ ”سیف کی حالت دیکھو۔ ایک ضرب تک نہیں لگی اس پہ۔ کسی نے اسے کھولا تک نہیں۔ اندر زیورات ہیں، پیسے ہیں ایک چیز بھی نہیں ملی۔ تم نے پیپرزدیکھے ہی نہیں تھے شاید۔“ اس نے سر پکڑ لیا۔ ”میں نے بھی دیکھے بغیر اندر ڈال دیے۔ میں جلدی میں تھا۔ اُف۔“

”سر... کل مس تالیہ نہ مراد بھی تو آئی تھیں۔“ رملی چونکا۔ اشعر نے گھور کے اسے دیکھا۔

”وہ سارا وقت میرے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ اپنی غلطی اس کے سرمت ڈالو۔ یہ خالی دماغ کی سوشلائٹس کو ایوننگ ڈرم سزاور فیشن سے فرصت نہیں ملتی جو اس طرح کا کچھ سوچیں۔ نان سینس۔“ بے زاری سے کہہ کے وہ اپنی سیٹ تک آیا۔ رملی چپ ہو گیا۔

”وان فاتح صرف ایک صورت میں سرینڈر کرے گا اگر اس کے پاس الیکشن لڑنے کے لئے پیسے نہ ہوں۔“ اشعر نے سیٹ کا رخ پیچھے شیشے کی دیوار کی جانب موڑ لیا جس کے پار اونچی اونچی عمارتیں اور نیچے سڑکوں پہ بہتا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صبح کی کرنیں عمارتوں کے اطراف سے نکل کے سیدھی اس طرف آرہی تھیں۔

”ہمیں کسی بھی طرح وان فاتح کو پیسے کی طرف سے بے فکر نہیں ہونے دینا۔ وہ کسی سے قرضہ نہیں لے گا، نہ کا کا سے کچھ مانگے گا۔ یہ گھر کروڑوں کی مالیت کا ہے۔ یہ گھر نہیں بکنا چاہیے۔“ پھر اس نے کرسی واپس موڑی۔ اب چہرے سے غصہ چھٹ چکا تھا اور اس کی جگہ گہری سوچ نے لے لی تھی۔

’مارکیٹ میں یہ خبر مشہور کر دو کہ وہ گھر haunted ہے۔ چونکہ وہ سن باؤ سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے خریداروں چینی زیادہ دلچسپی لیں گے۔ سن باؤ چینی مسلمان تھا۔ سو کسی ایسے آسیب یا نحوست کا ذکر کرنا جو چینیوں کو متاثر کرتی ہو۔“

رملی کی آنکھیں چمکیں۔ ”درست۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔ مگر سر... یہ چوری؟“ اس نے سیف کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا نہیں خیال کوئی چوری ہوئی ہے بہر حال سی سی ٹی وی فوٹیج چیک کرو ایک ایک فریم دیکھو۔ کوئی بھی مشتبہ شخص نظر آئے تو رپورٹ کرو۔“ وہ سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رملی نے جھٹ سر بلایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اشعر نے اس کی پشت کو سوچتی نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا رملی مجھے دھوکہ دے رہا ہے؟ کہیں یہ فاتح کے ساتھ تو نہیں مل گیا؟“ اس کا ذہن دوسرے نہج پہ سوچ رہا تھا۔

یہ ایسی دنیا تھی جہاں سائے کا بھی اعتبار نہیں تھا۔

☆☆=====☆☆

سورج نکل آیا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لئے رش کم تھا۔ فاتح کی کار ملا کہ کے قریب ہی تھی۔ چند منٹ کا سفر ابھی باقی تھا۔

وہ سن گلاسز لگائے، کہنیوں تک آستین موڑے اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کلائی میں پہنی بھوری گھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔ عصرہ باہر بھاگتے درختوں اور اونچے نیچے سبز ٹیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے پیچھے بیٹھے اپنے اپنے آئی پیڈز پہ لگے تھے۔ غرض سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

تبھی فاتح نے بیک و یومر پہ نظر ڈالی تو سکندر کے اسکرین پہ جھکے چہرے پہ غصہ دیکھا۔ فاتح نے سن گلاسز اتار کے پرے رکھے اور آئینے میں پیچھے دیکھتے اسے پکارا۔ ”سکندر... کیا تم انٹرنیٹ پہ کسی سے بحث کر رہے ہو؟“

سکندر نے چونک کے سر اٹھایا۔ عصرہ نے بھی مڑ کے دیکھا۔

”گیم کھیل رہا تھا۔“ سکندر نے خفت سے ٹیب نیچے کر لیا۔

”میں تمہارا باپ ہوں، سکندر۔ مجھے معلوم ہے تم کچھ پڑھ رہے تھے۔“

سکندر نے ناک سکڑا۔ ”اوکے۔ میں کچھ کمئٹس پڑھ رہا تھا۔ میرے بھی کچھ فیورٹس ہیں، ڈیڈ اور مجھے برا لگتا ہے اگر لوگ ان کو برا کہیں۔“ پھر اس کے چہرے پہ بے بسی بھرا غصہ در آیا۔

”ڈیڈ لوگ اتنے بدتمیز اور پاگل کیوں ہوتے ہیں؟ کسی مشہور انسان (ایک چور نظر باپ کے کندھے پہ ڈالی) جس کو وہ جانتے تک نہیں ہوتے، اس کے خلاف اتنے برے برے کمئٹس کیسے لکھ دیتے ہیں؟“

”کس کے بارے میں کیا لکھا ہے لوگوں نے؟“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے موڑ کاٹتے ہوئے مطمئن سا پوچھ رہا تھا۔

سکندر نے ایک نظر گود میں رکھی اسکرین پہ ڈالی جس پہ وان فاتح کا ٹویٹر کھلا پڑا تھا۔ فاتح نے صبح مارٹن لوتھر کنگ کا کوئی قول پوسٹ کیا تھا اور اس پہ ہزاروں کمئٹس آئے پڑے تھے۔ مثبت کمئٹس سکندر نے صرف پڑھ کے گزار دیے تھے مگر ہر منفی پہ اس کا دل دکھتا گیا تھا۔

’بکواس بند کرو‘ پہلے خود تو سیکھ لو‘ کرپٹ سیاستدان‘ ملک کو لوٹ کے کھا گئے ہو‘ تم سارے ملے ہوئے ہو‘ یہ وان فاتح حکومت میں آ کے وہی کرے گا جو صوفیہ رحمن کرتی آئی ہے۔ سب کرپٹ ہیں۔ آئی بیٹ پالیٹکس۔‘

سکندر نے چہرہ اٹھایا۔ باپ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

’میرا ایک... ایک فیورٹ سیلبرٹی ہے اس کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ پہ لوگ اس پہ تنقید کر رہے ہیں۔‘

”اور اس سے تمہارا دل دکھ گیا؟“

”دکھنا نہیں چاہیے کیا، ڈیڈ؟ لوگوں کو کیا پتہ کہ وہ آدمی کون ہے میرے لئے؟“ اس کا گلارندھ گیا۔ عصرہ نے اداسی سے سر جھٹکا۔

جولیانہ باہر دیکھتی رہی۔ سب جانتے تھے سکندر کس کی بات کر رہا تھا۔

”سکندر...“ وہ ڈرائیور کرتے ہوئے... ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جب رسول اللہ ﷺ پہ پہلی دفعہ وحی

نازل ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جانتے ہو کیا حکم دیا تھا؟ کہ وہ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف بلا لیں۔ اور جانتے ہو تین سال تک

آپ ﷺ نے دوسروں کو اچھے کام کرنے کا حکم کیسے دیا؟ خاموشی سے، privately۔ چھپ کے۔ کھلم کھلا علی الاعلان نہیں۔

صرف اپنوں کو بتایا اور وہ سب مانتے گئے کیونکہ وہ اپنے تھے۔ سمجھتے تھے۔ احترام کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سچائی سے واقف تھے۔“

سکندر ابھی تک اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا جو نرمی سے کہے جا رہا تھا۔
 ”تین سال بعد رسول اللہ ﷺ نے کھلم کھلا لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔ اور اسلام ہوتا کیا ہے؟ اچھے کاموں کی طرف بلانا۔ اور برے کاموں سے روکنا۔ جب آپ ﷺ نے یہ کام شروع کیا تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوئے۔ وہ جواتے عرصے سے جس طریقے پہ زندگی گزار رہے تھے وہ طریقہ سوالیہ نشان بن گیا۔ لوگ پھر گئے۔ دشمن بن گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے لگے۔ ابولہب کی بیوی نعوذ باللہ آپ ﷺ کو مذم کہہ کے پکارنے لگی، یعنی کہ Condemned۔ جس کی مذمت کی جائے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نام سنا تو انہوں نے کیا فرمایا؟“

سکندر نے مدد کے لئے بہن کو دیکھا جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، پھر واپس چہرہ موڑا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“
 ”آپ ﷺ نے فرمایا، مذم تو میرا نام ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ساری باتوں کو اس طرح انکوری کر دیا کہ یہ جب مجھے جانتی ہی نہیں ہے تو یہ جو کہہ لے، یہ مجھے نہیں کہہ رہی، مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ اسی طرح بیٹے، جب بھی آپ کسی معاشرے میں reforms اور بہتری لانے کھڑے ہوتے ہو... ان کو بتاتے ہو کہ ان کا حکومت کرنے کا طریقہ یا ادارے چلانے کا طریقہ غلط ہے.... جب آپ جھوٹے کو جھوٹا اور چور کو چور کہتے ہو... تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوتے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو کس چیز کی ضرورت ہے حتیٰ کہ آپ ان کو ثابت کر کے نہ دکھا دیں۔ مگر اس عرصے میں ایک طبقہ جس کے مفاد اسی پرانے سسٹم کے ساتھ ہیں، وہ بلبل اٹھتا ہے۔ یہ جو صحافی تمہارے اس فیورٹ سیلیبرٹی (سکندر نے پلکیں جھکا لیں) کے خلاف روز اخبار میں لکھتے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے، وہ اندر سے اپنے لکھے پہ خود بھی یقین رکھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان سب صحافیوں اور میڈیا والوں کو سب پتہ ہوتا ہے کہ کون اچھا ہے، کون کم اچھا ہے اور کون برا ہے مگر ان کے حکومت کے ساتھ مفادات ہوتے ہیں۔ بیٹے کی نوکری، کاروباری ٹھیکے، سیاستدانوں سے دوستی... عدالتوں میں کیسز.... یہ انہی وجوہات کی بنا پہ اچھے کو برا بنانے کے پیش کرتے ہیں۔ سیاست میں یہ نہ دیکھا کرو کہ کیا کہا جا رہا ہے یہ دیکھا کرو کہ کون کہہ رہا ہے۔“

”فاتح... تم سیاستدانوں کو انبیاء سے نہیں ملا سکتے۔“ عصرہ نے قدرے خفگی سے ٹوکا تھا۔

”میں ملا بھی نہیں رہا، نہ ہی ملانا چاہیے۔ لیکن انبیاء کی زندگیوں میں ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ مشکل میں کیا کرنا ہے، یہ ہم نے انہی کی زندگیوں سے تو سیکھنا ہے۔ میں صرف یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب بھی آپ کسی معاشرے کی اصلاح کے لئے یا کوئی بھی بڑا کام کرنے نکلیں گے، تو لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑا لوگوں نے تو ہم کیا ہیں اور تمہارا فیورٹ

سیلیئر ٹی کیا ہے۔ لوگ ہمیں نہیں بتا سکتے کہ ہم نے زندگی کیسے گزاری ہے۔ اس اتالوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیا کرو۔“

”مگر ڈیڈ... میرے اپنے فرینڈز فیس بک پہ جب میرے فیورٹ سیلیئر یٹی کے خلاف کمنٹس کر رہے ہوتے ہیں تو میرا دل ان کا گلامروڑ دینے کا چاہتا ہے۔“

”اور میرا دل چاہتا ہے میں ان سے دوستی ختم کر لوں۔“ باہر دیکھتی جولیانا داسی سے بولی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”بڑے ہو جاؤ سکندر... سیاستدانوں اور سیلیئر ٹیز کے پیچھے آپس کی دوستیاں اور تعلقات نہیں خراب کیے جاتے۔ لیڈر کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کون کون ان کے لئے لڑ کے ناراض ہوا بیٹھا ہے۔ اگر بحث کرنی ہے تو آئیڈیاز پہ کرو۔ اپنے فیورٹ سیاستدانوں کو انسان سمجھ کے۔ انبیاء کے بارے میں بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ فرشتے کیوں نہیں ہیں۔ آج کے لیڈرز کے بارے میں بھی لوگ یہی چاہتے ہیں کہ وہ فرشتے ہوں۔ تم اپنے لیڈر کو انسان قبول کر لو۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ۔ مگر اس کے جرائم کے ساتھ نہیں۔ ذاتی خامیاں سب میں ہوتی ہیں لیکن اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سیاستدان اپنے ملک کے لوگوں کو اپنی چوری کی وجہ سے نقصان پہنچا چکا ہے اور سیاستدان بس اسی طرح ہی نقصان پہنچا سکتا ہے نا تو تم اس سیاستدان کو قبول مت کرو۔ اس کو ڈیفینڈ مت کرو۔ باقی تمہیں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ملے گا۔ اگر تم اپنے لیڈر کو اس کی imperfections کے ساتھ قبول کر لو اور اس کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو تو تمہیں ہر وقت دوستوں سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”مگر ڈیڈ... دوست جب برے کمنٹس دیں تو میرا دل دکھتا ہے۔“ سکندر بضد تھا۔

”پھر اپنے دل کو مضبوط کرو اور ہر ایک سے یہ توقع رکھنا چھوڑ دو کہ وہ تمہاری بات سمجھے گا۔ ہر بات ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسے شروع کے تین سال رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کو نصیحت نہیں کی اس لئے تم بھی ہر ایک سے الجھنا چھوڑ دو۔ کچھ وقت گزرتا ہے، معاشرے بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں اور خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا لیڈر بہتر ہے اور جو نہیں سمجھتے وہ خود ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔“

”مگر ڈیڈ...“

”سکندر... اللہ الحق ہے... سچ کا خدا ہے۔ اگر تمہارا فیورٹ سیلیئر یٹی سچا ہے تو اللہ ساری دنیا کو اس کی سچائی دکھا دے گا۔ سچ اپنے آپ کو خود ثابت کر لیتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کو وقار کے ساتھ انور کرنا ایک آرٹ ہے۔ اس کو جو سیکھ لیتا ہے اللہ اس کو عزت دیتا ہے۔“

وہ زور دے کر مگر نرمی سے کہہ رہا تھا۔ سکندر نے سر ہلایا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہا تھا مگر مطمئن بہر حال نہیں تھا۔ مطمئن رہنا بھی شاید ایک آرٹ تھا۔

کار ملا کہ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ ملا کہ ایک خوبصورت شہر تھا جو سمندر کنارے واقع تھا اور جہاں سیاحوں کی بہتات تھی۔ تاریخی طرز کا شہر جو لوگ پیدل گھوم پھر کے دیکھا کرتے تھے۔ بازار سے کارگزار تے ہوئے فاتح کے چہرے پہ مانوس مسکراہٹ بکھر گئی۔

بالآخر وہ اس ٹھنڈی میٹھی سڑک پہ آ گئے تھے جہاں قطار میں ایک جیسے گھر بنے تھے جن کو ریٹینو ویٹ کر کے کافی شناہت اور ریستوران بنا دیا گیا تھا۔ کبھی یہ چینی تاجروں کا مسکن ہوتے تھے۔ اور یہ رہا اس کا گھر... اس نے کار سڑک کنارے پارک کی اور مسکراتے ہوئے بیلٹ کھولی پھر باہر نکلا....

سامنے سڑک کے اوپر ایک گھر بنا تھا۔ سرخ رنگ کا گھر (جیسے پرانے لاہور کی گلیوں میں قدیم ہندوستانی طرز کے گھر ہوتے ہیں جن کی کھڑکیاں سڑک پہ کھلتی ہیں)۔ ایسا ہی وہ دو منزلہ گھر تھا۔ وہ سڑک سے ہی شروع ہوتا تھا۔ نیچے دو کمروں کی کھڑکیاں درمیان میں داخلی دروازہ۔ فاتح نے گردن اٹھائی۔ اوپر تین کمروں کی بالکونیاں بنی تھیں۔ خاموش پڑا خوبصورت گھر جس سے قدیم زمانوں کی مہک آتی تھی۔

”چلو آؤ.... میں تم لوگوں کو سن باؤ کی کہانی سناتا ہوں۔“ وہ خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے کار کی طرف مڑا جہاں بچے اور عصرہ باہر نکل رہے تھے مگر اگلے ہی لمحے فاتح کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

چند فٹ کے فاصلے پہ ایک سلور کار پارک تھی اور اس کے بونٹ سے ٹیک لگائے وہ کھڑی تھی۔ سر پہ سفید ہیٹ ترچھا رکھے وہ مسکرا کے سینے پہ بازو لپیٹے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”آنے کے لئے شکریہ تالیہ۔“ عصرہ سیدھی اس کی طرف گئی اور مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر واپس گھومی اور فاتحانہ مسکراتی نگاہوں سے فاتح کو دیکھا۔ ”تالیہ سن باؤ کا گھر دیکھنا چاہتی تھی تو میں نے اسے انوائیٹ کر لیا۔ امید ہے اس بہانے ہم اپنے نیلامی کے پراجیکٹ پہ بھی بات کر لیں گے۔“ جتنا تے انداز میں بات مکمل کی۔

وان فاتح نے لب بھنج لے۔ ابرو برہمی سے اکٹھے ہوئے۔ ایک خاموش چپھتی ہوئی نظر اس لڑکی پہ ڈالی جو سادگی سے مسکرا رہی تھی اور گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ جانے وہ اتنی بری کیوں لگتی تھی؟

☆☆=====☆☆

کوالا لپور کے اس متوسط طبقے کے علاقے میں صبح سستی طلوع ہوئی تھی۔ کم از کم ایڈم کے لئے وہ سست ہی تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھیلا سا کچن میں کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ناشتہ میز پہ لگا تھا مگر وہ بمشکل چند لقمے زہر مار کر پایا تھا۔ پھر پلیٹ پرے دھکیل دی۔

ماں سامنے کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ ”نوکری کے لئے پریشان ہو، ایڈم؟“

ایڈم نے افسردہ نگاہیں اٹھائیں۔ ”مجھے لگتا ہے میں ناکام انسان ہوں، ایبو۔“

”کیوں، ایڈم؟“ اس نے پیار سے پوچھا اور سامنے آ بیٹھی۔ اسکارف لپیٹے سادہ سی عورت جس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔

”سب مجھے دھوکہ دے کر ٹھکرا کے گزر جاتے ہیں۔ کسی کی نظر میں میری اہمیت ہی نہیں ہے۔“

”اہمیت تو خود بنائی جاتی ہے۔“

”کیسے؟ ذہانت، مہارت، ٹیلنٹ، دولت وغیرہ سے؟“ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

”نہیں۔ اپنے قدرتی اعتماد اور مثبت سوچ سے۔ جتنا تمہارے اندر سے مثبت شعائیں پھوٹیں گی، اتنا تم لوگوں میں محبوب ہوتے

جاؤ گے۔“

”اور مثبت شعائیں کیسے پھوٹتی ہیں، ماں؟“

”جب تم سچ بولو اور دوسروں سے توقعات لگانا چھوڑ دو۔ نروپے پیسے کی، نہ توجہ اور محبت کی۔ جو لوگوں کے پاس ہے، اس کا لالچ

چھوڑ دو۔ لوگ تمہارے گردیدہ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو اپنی محبت میں گرفتار کروانے کا ایک یہی کلیہ ہے۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“ اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر کوئی مجھے بے وقوف بنا کے آگے نہ بڑھ جایا

کرے۔“

”کس نے بنایا ہے تمہیں بے وقوف؟“

”چپے تالیہ نے۔ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں۔“ وہ خفگی سے تیز تیز بولنے لگا۔ ”وہ کبھی کچھ کہتی ہیں، کبھی کچھ۔ کبھی وہ مجھے

اچھی لگتی ہے اور کبھی بالکل ناقابل اعتبار۔“

”اس نے اس دن بھری محفل میں تمہاری حمایت کی تھی۔“

”کہانا، کبھی اچھی بھی لگتی ہے!“ اس نے منہ بسورا۔

”تو بری کب اور کیوں لگتی ہے؟ کس بات نے تمہیں اس سے بدظن کیا؟“

ایڈم اس بات پہ چونکا۔ ذہن میں بجلی کی طرح کوئی خیال کوندا تھا۔ جیسے ایک پانی کی لہری آتی ہے اور سارے جالوں کو بہا لے

جاتی ہے، پھر پیچھے ذہن بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

اس ایک لمحے میں ایڈم پہ آشکار ہوا کہ وہ اسے ناقابل اعتبار کب سے لگنے لگی تھی۔

”پمپورو!“ وہ بڑبڑایا۔ ماں نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ ”پمپورو کون؟“

”اُف ایو۔ تم کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟“ وہ تیزی سے اٹھا۔ رستے میں جو کرسی میز آئی، اس سے اس نے ٹھوکر کھائی مگر رکا نہیں۔ سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

بیڈ کے نیچے سے ننھا صندوق باہر کھینچا اور کھولا۔ اندر سے دھول مٹی سانس میں آئی مگر اس نے ناک پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اتنا پر جوش تھا کہ دمہ خراب ہونے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ صندوق میں کتابیں بھری پڑی تھیں۔ وہ جلدی جلدی ان کو الٹ پلٹ کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک موٹی تاریخی کتاب نکالی اور جلدی جلدی صفحے پلٹائے۔

وہ تاریخی داستانوں پر مبنی تھی اور اس میں ایک چھوٹا سا باب پمبورو (شکار باز) نام کا تھا۔ مطلوبہ صفحہ کھولا تو ایڈم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے بلیک اینڈ وائٹ میں اسی نشان کا اسکیچ بنا تھا جو اس نے کل بازار میں تالیہ کی گردن کی پشت پہ دیکھا تھا۔ پمبورو گروہ کا خاص گول نشان۔

اس نے جلدی جلدی اس صفحے کو پڑھا۔ وہ شکار بازوں کا ایک قدیم گروہ تھا جو کسی خزانے کے پیچھے تھے۔ ان کو خزانہ ملا یا نہیں، خزانہ کیا تھا وہاں کچھ نہیں لکھا تھا بس ایک چابی کا ذکر تھا اور ساتھ میں ایک مبہم سا اسکیچ بھی۔ گول سکے کی طرح کی چابی جس کے ایک کونے میں ڈلی جڑی تھی۔ مزید کوئی تفصیل اس تاریخی کتاب میں درج نہیں تھی۔ یقیناً اس موضوع پہ دوسری کتابیں بھی موجود ہوں گی مگر ایڈم کے پاس ان کو پڑھنے کا وقت نہیں تھا۔ ساری کہانی ذہن میں کھلتی جا رہی تھی۔

چابی کے دو حصے تھے۔ سکہ اور یہ لمبی سی ڈلی۔ سکہ اس کے پاس تھا۔ تالیہ مراد وہ سکہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کی مدد سے خزانے کا قفل کھول سکے۔ خزانہ ملا کہ میں کہیں تھا کیونکہ شکار بازوں کا تعلق ملا کہ سے تھا۔ وہ کوئی پولیس آفیسر نہیں تھی۔ وہ صرف ایک ٹریڈر بن رہی تھی۔

وہ کتاب رکھ کے تیزی سے الماری کی طرف لپکا۔ اندر سے ڈبیا نکالی جس میں سکہ تھا۔ وہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ سنہری دھات دمک رہا تھا، مگر آج اس میں کوئی بند سے نہیں ابھرے تھے۔ اس نے سکہ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ایک کونے میں ننھا سا سوراخ تھا۔ یہیں سے ڈلی اندر جائے گی اور وہ چابی مکمل ہو جائے گی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگلا سوال زیادہ پریشان کن تھا۔ کوئی بھی خزانہ جو کسی بھی ملک کے کھنڈرات یا زمین کے نیچے سے نکلتا ہے وہ سرکار کی امانت ہوتا ہے۔ یہ خزانہ یا ست کا تھا۔ وہ اسے تالیہ مراد کو نہیں لینے دے گا۔ اسے وان فاتح کو خبر کرنی ہوگی۔ اس نے جلدی سے ڈرائیور کا نمبر ملا یا۔ وہ اس وقت بے چینی، فکر مندی اور جوش کے ملے جلے تاثرات کے زیر اثر تھا۔

”ہیلو؟ ہاں سنو۔ وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟ آفس یا گھر؟“

”ہم تو ملا کہ میں ہیں ایڈم۔ فاتح صاحب کے پرانے گھر۔“

”اوہ۔“ ایڈم کا جوش ٹھنڈا ہوا۔ ”کب تک آ جاؤ گے واپس؟“

”شاید شام تک۔ معلوم نہیں۔“

”اچھا سنو... وہ تالیہ مراد صاحبہ... وہ دوبارہ تو گھر نہیں آئیں؟ اور چوری کا کچھ پتہ چلا؟“

”اس گھر تو نہیں، مگر ادھر ملا کہ میں وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ہیں۔ وہ لوگ اندر گھر دیکھ رہے ہیں۔ تم کیوں پوچھ

رہے ہو؟“

ایڈم کرنٹ کھا کے جگہ سے اٹھا۔ ”چے تالیہ صاحب کے ساتھ ملا کہ میں ہیں؟“ پھر اسے یاد آیا۔ کتنی دفعہ کاسن رکھانا م۔ ”سن باؤ

کے گھر میں؟“ بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں مگر تم کیوں...“

لیکن ایڈم نے فون کاٹ دیا۔ دماغ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ سن باؤ کا گھر... تین خزانوں والا گھر... کیا چے تالیہ وہاں

خزانے کی تلاش میں گئی ہیں؟ کیا یہ ممکن تھا کہ خزانہ اسی گھر میں چھپا ہو؟ اوہ نو... اسے وان فاتح کو بتانا تھا۔

اس نے جلدی سے الماری کھولی، جو جوڑا ہاتھ آیا، کھینچ نکالا اور ہاتھ روم کی طرف بھاگا۔

آدھے گھنٹے بعد ایڈم ملا کہ جانے والی ایک بس میں سوار ہو رہا تھا۔ سکہ اس کے لباس کی اندرونی جیب میں محفوظ رکھا تھا۔

☆☆=====☆☆

وہ کوالا لپور کی ایک خوبصورت سوسائٹی تھی۔ ایک طرف مکان قطار سے بنے تھے اور ان کے آگے سڑک پہ ٹریفک بہہ رہا تھا

۔ ایسے میں ایک گھر کا دروازہ لاک کر کے سمیچ باہر نکلا، اور سڑک کنارے چلنے لگا۔ ٹراؤز پر پہنے، وہ منہ میں کچھ چباتا،

چھٹی والے دن گروسری لانے والے مردوں میں سے ایک لگ رہا تھا۔

اسے قریبی گروسری اسٹور پہ جانا تھا۔ جیسے ہی اسٹور سامنے آیا وہ اس کے دروازے کے قریب آیا مگر... راستے میں کوئی رکاوٹ کی

طرح حائل ہوا تھا۔ یا شاید کسی پہاڑ کی طرح۔

وہ سیاہ کھلے بلاؤز اسکرٹ والی موٹی سی عورت تھی۔ سیاہ رنگت، اور گھنگریا لے کندھوں تک آتے سیاہ بال۔ وہ اس کو گھورے جا

رہی تھی۔ پرپش تیز نگاہوں سے۔

سمیچ کی پیشانی پہ بل پڑے۔ ”کیا ہے؟ ہنوسا منے سے۔“

”تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔ آنکھوں کی تپش کی نسبت الفاظ ٹھنڈے تھے۔

سمیچ کے دونوں ابرو استہزائیہ انداز میں اٹھے اور لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔

”اوہ... تو تمہیں تالیہ نے بھیجا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ میری حفاظت میں ہے۔“

سمیج چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر زور سے ہنس دیا۔ داتن اسی طرح اسے گھورے گئی۔

”تو تالیہ نے اپنی باڈی گارڈ بھیجی ہے اور کیا ہی اعلیٰ باڈی گارڈ بھیجی ہے۔ واہ۔ اپنی جان بچانے کے لئے دو کوس تک تو تم سے

بھاگا نہیں جائے گا بی اور تم آئی ہو مجھے دھمکانے۔ واہ۔“ وہ ہنستے ہوئے سر جھٹک رہا تھا۔

”تالیہ میری بیٹی ہے۔ اور بہن بھی۔ اور دوست بھی۔ کبھی کبھی وہ میری ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ میں

اس کے نزدیک تم جیسے کچرے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے اور اس سے دور رہنا چاہیے کیونکہ میں ایک

بہت خطرناک عورت ہوں۔“

سمیج نے طنزیہ مسکراتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”اور تم کیا کرو گی؟“

”میں تمہارا سانس بھی روک سکتی ہوں‘ سمیج!“ وہ اسی طرح اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مگر سمیج نہیں ڈرا۔ اس موٹی عورت

سے کون ڈر سکتا تھا جو ایک ہاتھ میں چاکلیٹس اور رنگ برنگے چپس کے پیکٹ اٹھائے ہوئے کھڑی تھی۔ اُف۔ بے چاری۔

”اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کو ہاتھوں کی زبان میں سمجھاتا، لیکن تم عورت ہو اور بے شک دو تین عورتوں کے برابر ہو“

لیکن مجھے تم پہ ترس آگیا ہے۔ سو... تمہارے لئے... اتنا ہی کافی ہے...“ کہہ کے وہ گھوما اور سڑک سے گزرتی پولیس کی کار کو اشارہ

کرتے ہوئے چلایا۔ ”آفیسر... آفیسر۔“ یہاں جگہ جگہ پولیس کی پٹرول کارز گھوم رہی ہوتی تھیں۔ پولیس اہلکار نے فوراً کاررو کی اور

اپنا پستول نکالتا ہا ہر نکلا۔

”کیا ہوا، سر؟“ باوردی آفیسر تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ سمیج نے خاموش کھڑی داتن کا بازو کہنی سے پکڑ لیا اور چہرے پہ

بے پناہ پریشانی طاری کر لی۔

”یہ عورت میرا بوہ چارہ ہی تھی، پلیز اس کی تلاشی لیں، یہ...“ دکھی اور پریشان انداز میں اس نے بات شروع ہی کی تھی کہ....

”مسز لیانہ... آپ...“ آفیسر پستول ہاتھ میں لئے قریب آیا اور لیانہ کا چہرہ دیکھ کے خوشگوار حیرت سے مسکرایا۔ ”کیسی ہیں آپ

؟“ پھر سمیج کی طرف دیکھا۔ ”سب ٹھیک ہے، میم؟“

سمیج کے الفاظ منہ میں رہ گئے تھے۔ اس نے رک کے باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ موٹی عورت بالآخر مسکرائی۔ اور

نرمی سے اپنی کہنی چھڑائی۔

”ہاں... سب ٹھیک ہے... یہ ہمارا دوست ہے... سمیج... سا منڈوالی اسٹریٹ میں مکان نمبر 26 اے میں رہتا ہے۔ تم آتے

جاتے اس کو دیکھنا تو اس کا خیال رکھنا ہوں۔“

”ہاں شیور۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ پرسوں زید کی برتھ ڈے پہ آرہی ہیں نا آپ؟“ وہ مسکرا کے ادب سے پوچھ رہا تھا۔

”تمہارے بیٹے کی سالگرہ ہو اور میں نہ آؤں ایسا ہو سکتا ہے فیاض؟“ وہ ہاتھ جھلا کے بولی تو آفیسر ہلکا سا ہنس دیا، پھر خوش اخلاقی سے دونوں کو سلام کیا اور گن ہولسٹر میں اڑستا، کار کی طرف بڑھ گیا۔

داتن اب فرصت سے سمج کی طرف گھومی جس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ قدرے شل قدرے چوکنا لگتا تھا۔

”اب میں دوبارہ وہ تمام الفاظ دہراؤں گی جو میں نے ابھی کہے۔ لیکن امید ہے اس دفعہ تم ان کو غور سے سنو گے۔“ وہ اس کو گھورتے چبا چبا کے بولنے لگی۔

”تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔ میں کہہ رہی ہوں سمج... اس کا.... پیچھا چھوڑ دو۔“ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی اور سمج ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

”وہ میری حفاظت میں ہے... وہ میری بیٹی بھی ہے، بہن بھی اور دوست بھی... اور کبھی کبھی....“ وہ قریب آرہی تھی اور سمج شل چہرے کے ساتھ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

”وہ میری.... ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ اس کے نزدیک.... میں تم جیسے کچرے کو.... برداشت بھی نہیں کر سکتی....“ اسٹور کی بیرونی دیوار سے سمج کی کمرنگرائی.... وہ مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا.... نہ اس کے ہاتھ میں پستول تک ریگ جانے کی سکت تھی۔ داتن مزید قریب آئی۔ وہ اس کے سیاہ چہرے کا ایک ایک نقش دیکھ سکتا تھا۔

”اس لئے.... تمہیں مجھ سے.... ڈرنا چاہیے.... اور تالیہ سے.... دور رہنا چاہیے.... کیونکہ.... میں.... ایک بہت.... خطرناک عورت ہوں... اور میں تمہارا.... سانس بھی روک سکتی ہوں، سمج!“ اس کے بالکل قریب آ کے وہ غرائی۔ وہ چپ، شل کھڑا رہا۔ پھر وہ مڑی اور اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد سمج نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

بھاری بھرکم عورت اب کینڈیز اور بچوں والی جیلز کے ریک کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی اور مختلف پیکٹ اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔ سمج بنوز ساکت کھڑا تھا۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ پہ دوپہر پھیل رہی تھی۔ فضا نرم آلود تھی۔ دور سمندر کی لہروں کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ بازار میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ٹریفک، دکانداروں کا شور اور آوازیں۔ ایسے میں سرخ گھر کے اندر آؤ تو بڑے کمرے سے گزر کے صحن آتا تھا۔ وہاں تالیہ گردن اونچی اٹھائے کھڑی بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

اندر ایک کمرے کا دروازہ بند کیے وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فاتح دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے سخت ناخوش لگ رہا تھا۔
 ”اس لڑکی کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ہمارا فیملی ہالیڈے تھا۔“

”کون سی فیملی؟ جس کو تو تم اپنی سیاست کے پیچھے چھوڑنے تک تیار ہو گئے تھے؟ اگر صرف سیاست ہی میسر کرتی ہے فاتح تو میں بھی وہی کر رہی ہوں۔ وہ میرا بزنس انٹرسٹ ہے اور جیسے میں تمہارے مفادات میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں تم بھی دو گے!“
 ”اس نے ہمارے گھر سے چوری کی ہے عصرہ!“ لیکن عصرہ نے درشتی سے بات کاٹی۔

”مگر تمہاری فائل تو کھوئی ہی نہیں ہے فاتح۔ اور اگر کی بھی ہے تو کیا ہوا۔ کیا بارین نیشنل میں کرپٹ سیاستدان نہیں ہیں جن کے ساتھ تم روز اٹھتے بیٹھتے ہو اور میں ان کی دعوتیں کرتی ہوں۔ جیسے ان چوروں کو میں برداشت کرتی ہوں میری چور کلائنٹ کو تم کرو گے۔“

فاتح نے لب بھنج لیے اور چہرہ موڑ لیا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔
 ”ویسے بھی ابھی تم یہی کہہ رہے تھے نا کہ سیاستدانوں کے پیچھے دوستوں کو آپس کے تعلقات نہیں خراب کرنے چاہئیں۔“ تلخی سے کہہ کے وہ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔

تالیہ ابھی تک دالان میں کھڑی گردن اٹھائے گھر کے بالائی کمروں کو دیکھ رہی تھی جب دھیرے دھیرے سارے گھر والے اسی طرف آتے گئے۔ بچے عصرہ اور پھر ان کے پیچھے فاتح بھی۔ وہ بیٹنوں والی سفید شرٹ کے آستین موڑے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم اٹھاتا قریب آیا تو تالیہ نے گردن موڑی۔ وہ نارمل لگ رہا تھا۔ ٹھنڈا۔ پرسکون۔ بے نیاز۔ بزنس فیس۔

”اس گھر کو سن باؤ کا گھر کیوں کہتے ہیں فاتح صاحب؟“ وہ سادگی سے اسے دیکھ کے بولی تو فاتح نے رخ موڑ لیا اور آگے چلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ صحن کے دوسرے کونے میں نصب اونچے چوترے تک جا ٹھہرا جس کے اوپر ایک مجسمہ نصب تھا۔

”یہ وانگ لی کا مجسمہ ہے۔“ اس نے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ دھوپ آج نہیں تھی۔ موسم ٹھنڈا اور نرم آلود تھا۔ ہر سو چھایا سی تھی۔ ایسے میں سرخ اینٹوں سے بنے صحن میں وہ سرمئی اونچا مجسمہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ ایک چینی آدمی پورے قد سے کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے۔ لمبے بال سر پہ ٹوپی لمبی باریک مونچھیں... اور کندھوں سے پیر تک گرتا چغہ۔ میان میں تلوار۔ چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ۔

تالیہ دھیرے دھیرے چلتی قریب آئی۔

”اور وانگ لی کو ”سن باؤ“ کیوں کہتے تھے ویڈ؟“ سکندر بھی باپ کے پاس آرکا۔

”سن باؤ.... یعنی تین خزانے یا تین گھینے۔ بدھ مت کے تین گھینے ہوتے ہیں بدھا، دھرم، سنگھا۔ ان کو سن باؤ کہا جاتا ہے۔“

وانگ لی ایک چینی غلام تھا، پندرہویں صدی میں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پہ کم عمری میں ہی محل میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ پھر چینی بادشاہ کا خاص سفیر مقرر ہوتا ہے، اور ایک بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔ ”وہ کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا گردن اٹھا کے مجسمے کو دیکھتا بتا رہا تھا۔ تالیہ کے آنے کی کلفت، بے زاری۔ وہ سب بھول گیا تھا۔“

”اس کو بادشاہ نے سن باؤ کا لقب عطا کیا تھا۔ وہ اکثر ملا کہ آتا تھا، ساری دنیا سے گھوم پھر کے، سامان تجارت اور مختلف حکومتوں سے معاہدے کر کے وہ سمندر کے راستے ملا کہ آتا۔ اس نے اور دوسرے تاجروں نے یہاں ویرہاؤ سز بنائے تھے۔ یہ گھر وانگ لی نے بنوایا تھا۔ یہاں وہ سامان وغیرہ رکھتا اور خود بھی رہا کرتا تھا۔ اپنے آخری قیام میں وہ کافی عرصہ ادھر رہا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا ایکسپلورر، تاجر اور ایڈمرل تھا۔ اس نے چینی حکومت کو دنیا کی بہترین سپر پاورز میں سے بنا دیا تھا۔ کہتے ہیں وہ کمال کا آدمی تھا۔“

”آپ کے والد نے وانگ لی کا گھر کیوں خریدا؟“ وہ فاتح کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی جو ابھی تک اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ جولیانہ درختوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اور عصرہ اندر کمروں کی طرف چلی گئی تھی تاکہ گھر کی مرمت کے کام کا جائزہ لے سکے۔

”میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ تب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ وانگ لی کا گھر ہے۔ میں باپا کے ساتھ سامنے کسی دکان پہ بیٹھا تھا، پھر ادھر آ گیا۔ یہ مجسمہ... تب یہ ٹوٹا پھوٹا تھا، عصرہ نے بعد میں اس کو ٹھیک کر دیا، یہ مجسمہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ عجیب کشش تھی اس میں۔ اب بھی ہے۔ مانوسیت۔ اپنائیت۔ جیسے کوئی دوست ہوتا ہے نا۔“ اس کی گردن اٹھی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ ایسے کمر پہ باندھ رکھے تھے جیسے وانگ لی نے باندھے ہوئے تھے۔

”کس نے بنایا تھا یہ مجسمہ؟“ سکندر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”شہزادی تاشہ نے!“

تالیہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ ”شہزادی تاشہ کون تھی؟ یونٹ میں نے بھی ایک دفعہ ایک تھیٹر شو میں تاشہ آ گا پوا کا کردار کیا تھا۔“ ”وہ آریانہ کو بہت پسند تھی۔“ سکندر فوراً بولا مگر فاتح نے چہرہ موڑ کے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”وہ کوئی روسی فیری ٹیل تھی جو دس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ میں ملا کہ سلطنت کی شہزادی تاشہ کی بات کر رہا ہوں۔“ پھر دوبارہ سے مجسمے کو گردن اٹھا کے دیکھنے لگا۔

”تو کون تھی شہزادی تاشہ؟“ تالیہ کی نظریں بے اختیار دیوار کی جانب انھیں۔ شمالی دیوار جہاں اس نے وہ نظم لکھی دیکھی تھی۔ خواب کے برعکس وہ دیوار خستہ حال نہیں تھی۔ شاید رینوویشن میں مرمت کر دی گئی تھی۔ وہاں کسی بھی قسم کی لکھائی کا نشان نہیں تھا۔

”شہزادی تاشہ فاتح کے پسندیدہ کرداروں میں سے ہے۔“ عصرہ باہر آتے ہوئے محظوظ انداز میں بولی۔ ”فاتح کسی عورت کی

تب تک تعریف نہیں کرتا جب تک وہ اس کی شدید مستحق نہ ہو مگر شہزادی تاشہ سے وہ ہمیشہ متاثر رہا ہے۔“

وہ مسکرا کے پلٹا۔ ”میں اکثر تمہاری تعریف کرتا ہوں۔“

عصرہ نے مسکرا کے شانے اچکائے اور پھر تالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”شہزادی تاشہ ملا کہ کی سب سے حسین شہزادی تھی۔ وہ سلطان کی بیٹی نہیں تھی، بلکہ بندہ ہارا کی بیٹی تھی۔“

”بندہ ہارا کیا ہوتا ہے، ماما؟“

”وہی جو تمہارے باپا بننا چاہتے ہیں۔ پردھان منتری۔ وزیر اعظم۔ اس زمانے میں سب سے طاقتور بادشاہ ہوتا تھا، اور اس کے بعد وزیر اعظم۔ مگر آج کے ملایشیاء میں وزیر اعظم سب سے طاقتور ہوتا ہے اور اس کے بعد بادشاہ۔“

”جھینکس ٹو ڈیو کریسی!“ وہ واپس جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلتا گیا۔ صحن کے دوسرے کونے میں درخت لگے تھے جو اس کے باپا نے لگوائے تھے۔ جولیاندو ہیں بیٹھی تھی۔ وہ جھک کے اس کو سرگوشی میں کچھ کہنے لگا اور وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔ تالیہ نے ان سے نظر ہٹائی اور عصرہ کی طرف متوجہ ہوئی جو بتا رہی تھی۔

”شہزادی تاشہ کے بارے میں Malay annals میں کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن چند دوسری تاریخی کتابوں میں تھوڑا بہت ضرور لکھا ہے۔ وہ پردھان منتری کی بیٹی تھی۔ بے حد ذہین، عقلمند اور دانا۔ کہتے ہیں وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ عورتوں والے کام بھی، مردوں والے کام بھی۔ گھڑ سواری، تیر اندازی، تلوار زنی ہو، یا پھر کھانا پکانا، کڑھائی، سلائی، لکھنا پڑھنا غرض تاشہ کسی ساحرہ کی طرح تھی۔ اسے کئی زبانوں پہ عبور حاصل تھا۔ وہ سیاسی سمجھ بوجھ بھی رکھتی تھی اور اپنے باپ اور سلطان تک کو سیاسی مشورے بھی دیتی تھی۔ ایک وقت میں وہ اتنی طاقتور تھی کہ مورخ لکھتے ہیں، وہ سارے محل کو چار رہی تھی۔ کہتے ہیں سلطان بھی اس سے بہت متاثر تھا اور اس کو اپنے لئے چاہتا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”معلوم نہیں۔ کہتے ہیں اس کی کہانی کا انجام دکھی تھا۔ مگر وہ اکثر سن باؤ کے گھر آیا کرتی تھی۔ یہاں اسی آنگن میں۔ اسی نے یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کہتے ہیں سن باؤ سے اس کی دوستی تھی۔ یا معلوم نہیں کیا تھا جو وہ اس گھر میں اکثر آتی تھی۔“ عصرہ نے آخر میں گہری سانس لے کر شانے اچکا دیے۔ پھر گردن موڑی اور سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سن باؤ کا کمرہ تھا۔ وہ یہاں انگیٹھی کے پاس بیٹھا کرتا تھا اور وہ ادھر والاں میں کھڑے مجسمہ بناتی تھی۔ بالکل ادھر جہاں تم کھڑی ہو۔“

تالیہ ایدھیوں پہ الٹی گھومی۔ اب اس کے سامنے سن باؤ کا کمرہ تھا اور اوپر... اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اوپر تین کمرے تھے جن کی بالکونیاں سڑک کی طرف بھی کھلتی تھیں اور ایک ایک کھڑکی ادھر صحن میں بھی کھلتی تھی۔

”اوپر کون رہتا تھا؟“ وہ سوچتی نظروں سے بولی۔

”اوپر؟“ عصرہ نے اچنبھے سے اوپر دیکھا۔ ”شاید سامان وغیرہ رکھا جاتا ہو کیونکہ سن باؤ کا کوئی خاندان تو تھا نہیں۔ وہ غلام تھا

نا!“ (غلام شادی سے معذور ہوتے تھے۔)

”اس جگہ سے کھڑے ہو کر سن باؤ کا کمرہ اتنا صاف نہیں دکھتا جتنا اوپر والا کمرہ دکھتا ہے۔“

وہ اوپر دیکھتی بے خودی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ ”شاید کوئی سن باؤ کے ساتھ رہتا تھا یہاں۔ شہزادی ایک محل سرا سے ملنے نہیں آتی تھی۔ شاید وہ اس سے ملنے آتی تھی جو اوپر اس کمرے میں رہتا تھا....“

فاتح جو ابھی تک جولیا نہ سے جھک کے کچھ کہہ رہا تھا اس بات پہ چونک کے پلٹا اور سیدھا ہوا۔

”یہ میرا کمرہ ہے۔“

تالیہ اسے دیکھ کے اداسی سے مسکرائی۔ ”شاید اس کمرے کے کئیں کو بھی شہزادی تاشہ اتنی ہی پسند ہو جتنی آپ کو ہے۔“ اور آگے بڑھ گئی۔ فاتح نے چند لمحے اس کی بات پہ غور کیا پھر بیٹی کی طرف واپس مڑ گیا۔ عصرہ سیل فون سے تصویریں بنا رہی تھی اور سکندر جسے کے قدموں میں بیٹھا اس پہ غور کر رہا تھا۔

تالیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صحن کے دوسرے کونے میں بنے کنویں تک آئی۔

قدیم طرز کا کنواں جو کسی زمانے میں سن باؤ کے زیر استعمال تھا۔ وہ کنویں کے سر پہ رکی اور اندر جھانکا۔ پھر مڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

تالیہ نے جیب سے لائٹ نکالی اور اس کی نیلی روشنی کنویں کے اندھیروں کی سمت پھینکی۔

کنویں کی ایک دیوار کے ساتھ دھبے سے لگے تھے جو نیچے گہرائی میں اتر رہے تھے۔ وہ مزید آگے ہوئی۔ وہ دیوار میں کھدے ننھے ننھے سے زینے تھے جن کی مدد سے نیچے اتر جا سکتا تھا۔

نیچے کیا تھا؟

تالیہ مراد مسکرائی اور لائٹ بند کی۔ اسے معلوم تھا خزانہ کہاں ہے۔

پھر وہ مڑی اور اعلانیہ انداز میں اونچا سا بولی۔

”تو انکو.... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔“

☆☆=====☆☆

حالم کی اگلی قسط انشاء اللہ یکم ستمبر کی رات 8 بجے نمبرہ احمد آفیشل پراپ لوڈ کر دی جائے گی۔

ہمارا بیچ بار بار چیک کرنا نہ بھولیے گا۔

حالم (نمرہ احمد)

باب ششم:

”باز گشتِ دختر“

اس نے دیکھا.....

بھوری لکڑی سے بنا دو منزلہ گھر ہے....

تازہ بے روغن لکڑی.... مخروطی چھتیں.... اوپر بالکونیاں ہیں

اندر ایک کھلا صحن ہے....

ایک طرف کنواں ہے....

بالائی منزل کے کمروں کی پچھلی کھڑکیاں صحن میں کھلتی دکھائی دے رہی ہیں....

کوئے والے کمرے کی کھڑکی میں کوئی کھڑا ہے.... کوئی ہیولہ سا....

جیسے کوئی دراز قد تو انا مرد ہو....

اور وہ نیچے دیکھ رہا ہے....

جہاں صحن کے کوئے میں ایک نسوانی وجود کھڑا ہے....

اس نے ٹھٹھکیں چغہ پہن رکھا ہے.... جوشا بنزادیاں سفر میں پہنا کرتی تھیں....

اس کی کھڑکی کی طرف پشت ہے.... بالوں پر ریشمی اوڑھنی لے رکھی ہے اور سر پہ جھمٹا کی پشت دکھائی دے رہی ہے....

چغہ کے آستینوں سے نکلتی سپید ہانہوں میں سونے اور ہیرے کے نگین ہیں....

خوبصورت ہاتھوں میں زمرہ اور یاقوت جڑی اٹکھٹیاں ہیں....

اور وہ ہاتھ مہارت سے مٹی اور گارے سے چبوترے پہ کچھ بنا رہی ہیں....

انداز سے لگتا ہے کوئی مجسمہ ہے....

اور وہ لڑکی.... وہ شاہزادی.... وہ مجسمہ بناتے ہوئے بار بار رکتی ہے۔

گردن ذرا سی موڑتی ہے....

شکل ابھی بھی دکھائی نہیں دیتی.... بس ماتھے کے اوپر تاج کا کوندہ کپٹی سے جھلکتا ہے....
 بار بار گردن موڑنے کی خواہش کے باوجود وہ واپس چہرہ پھیر جاتی ہے....
 جیسے واقف ہے اس بات سے.... کہ اوپر کھڑکی میں کوئی اسے دیکھ رہا ہے....
 پھر دفعتاً وہ سر جھکا کے ہلکا سا ہنستی ہے.... اور گردن موڑنے لگتی ہے....
 اور کسی دھوکے کی طرح خواب فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے....

☆☆=====☆☆

”تو انکو... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔“

یہ فقرہ لبوں سے نکالنے سے چند منٹ قبل تالیہ نے یہ خواب دیکھا تھا۔

جس وقت وہ والان میں داخل ہوئی تھی اور گردن اوپر اٹھائے بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی (اور اندر فاتح اور عصرہ تلخی سے اس کے بارے میں بات کر رہے تھے) اس وقت تالیہ کی نظروں کے سامنے وہ منظر کسی خواب کی طرح چلنے لگا تھا۔ قدیم زمانوں کی زردی لئے.... یہ گھر مختلف نظر آتا تھا تب.... اور وہ مجسمہ بناتی شہزادی جو اوپر کھڑے شخص کی نگاہوں سے واقف تھی.... وہ اس کے انداز کی شوخی اور ہلکی سی ہنسی... سپید جلد اور زیورات بتاتے تھے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہوگی جتنا تاریخ کی کتابوں میں لکھا تھا....

وہ خواب سے چونکی تو خود کو سن باؤ کے گھر میں کھڑے پایا۔

فاتح اور نیچے باہر آگئے تھے اور اب فاتح مجسمے کے بائے میں بتا رہا تھا۔ پھر گفتگو کا رخ شہزادی تاشہ کی طرف مڑ گیا اور عصرہ بتانے لگی کہ کس طرح وہ یہاں مجسمہ بناتی تھی....

مگر عصرہ نہیں جانتی تھی کہ تالیہ کو بعض دفعہ دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی خواب یا وژن نظر آ جاتے ہیں۔ اس قدیم مکان میں بیچھے سو برس قبل شہزادی کس سے ملنے آتی تھی.... وہ دیکھ چکی تھی اسی لئے جب اس نے مداخلت کر کے بتایا کہ شہزادی سن باؤ کے لیے نہیں اھر آتی تھی تو یہ اندازہ نہیں تھا۔

یہ وجدان تھا۔

فاتح جولیانہ کے ساتھ مصروف ہو گیا اور عصرہ تصاویر بنانے لگی تو وہ کنویں تک آئی۔ اندر نیچے اترنے کے لئے نشان بنے تھے۔ پانی اب بھی کنویں میں موجود تھا۔ وہ مسکرائی اور پلٹی۔

”تو انکو... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔“ اعلانیہ بلند سا بولی تو صحن میں موجود ہر شخص چونکا۔ فاتح جو جھک کے بیٹی سے بات کر رہا تھا،

چند لمحے ساکت سا جھکار ہا پھر سیدھا ہوا اور اسے دیکھا تو چہرہ سنجیدہ تھا۔

”ایکسیکو زمی؟“

”میں.... یہ گھر.... (اطراف میں اشارہ کیا) خریدنا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکرائی۔

”اور تمہیں کس نے کہا تاشہ کہ میں یہ گھر بیچنا چاہتا ہوں؟“

”آپ نے کل صبح ہی اس گھر کو مارکیٹ پہ ڈال دیا تھا۔ ملاکہ کے تمام پراپرٹی ڈیلرز واقف ہیں تو میں کیوں نہیں ہوں گی؟“

”مگر میں تمہیں یہ گھر نہیں بیچ سکتا۔“ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کیاری کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں کے درمیان سرخ اینٹوں کا پکا صحن حائل تھا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ تم اس کو افورڈ نہیں کر سکتیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ استہزائیہ مسکراہٹ۔

”آپ کو کیوں لگا میں اس کو افورڈ نہیں کر سکتی؟“

”کیونکہ میرا خیال تمہارا بینک بیلنس اتنا ہے جتنا تم بتاتی ہو۔“

عصرہ جو موہا بل اونچا کیے بالائی کمرے کی تصاویر اتار رہی تھی اس بات پہ گردن موڑ کے تادیبی نظروں سے فاتح کو دیکھا جو تالیہ کی طرف متوجہ تھا۔

”واقعی!“ وہ سر کو خم دے کر سادگی سے مسکرائی۔ ”میرا بینک بیلنس واقعی اتنا نہیں جتنا بتاتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا.... ”بلکہ... اس سے کہیں زیادہ ہے‘ تو انکو!“

”یعنی اتنا شے چھپاتی ہو تم.... پھر تو پورا ٹیکس بھی نہیں دیتی ہو گی۔ یہ دونوں جرائم ہیں۔ سچ۔ میری حکومت میں تم جیل جانے والے پہلے لوگوں میں سے ہو گی۔“ افسوس سے بولا اور پلٹ گیا۔

تالیہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ اب وہ اندر جا رہا تھا۔

”وہ مذاق کر رہا تھا۔“ عصرہ نے تصویر اتارتے ہوئے وضاحت دی تو وہ چونکی، پھر جبراً مسکرائی۔

”وان فاتح کے ساتھ گزرا کرنا بھی ایک آرٹ ہے، نہیں؟“

عصرہ ہنس دی اور سر جھٹکا۔ ”وہ بہت اچھا شو برپا اور سیاست دان ہے۔“

”خدا کرے وہ اتنا ہی اچھا میزبان بھی بن جائے۔“ بولی نہیں صرف دل میں سوچا۔

تبھی فون بجنے لگا۔ تالیہ نے نکال کے دیکھا تو ایڈم کا نام جل بھڑا تھا۔

”کانگ ہو کا فون ہے۔ نیلامی کے بارے میں جانا چاہتے ہوں گے۔ میں ذرا ان کو سن لوں۔“ مسکرا کے اس پیئر کا نام لیا جس کے

بارے میں عصرہ کو بتایا تھا کہ نیلامی پہ مدعو کر رکھا ہے اور فون کان سے لگائے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہاں بولو....“ گھر سے باہر نکلی تو سڑک پہ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ارد گرد شاپس اور ریسٹوران بنے تھے۔ ٹھنڈی سی چھایا میں

گھری صاف ستھری سڑک جس پہ قدیم گھروں کو سرخ سفید پینٹ کر کے ڈولز ہاؤس کی طرح نیا بنا دیا گیا تھا۔ دکانوں کے آگے چھتیاں لگی تھیں جہاں لوگ کرسی میزوں پہ بیٹھے چائے قبوے پی رہے تھے۔ ایسے میں وہ فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے فون پہ ایڈم کو سنے لگی جو کہہ رہا تھا۔

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟“

”ہاں مگر شام کو۔ میں ابھی گھر پہ نہیں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، آپ ملا کہ میں ہیں۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔“

تالیہ چونکی۔ ”میری جاسوسی کرنے لگے ہو کیا؟“

”نہیں۔ ہاں۔ شاید۔ اچھا ہم کہاں مل سکتے ہیں۔“

”تم کیوں ملنا چاہتے ہو ایڈم؟“

”کیا آپ کو وہ سکھ نہیں چاہیے؟“ تالیہ اس سوال پہ خاموش ہو گئی۔ گاڑیاں ساتھ سے گزر رہی تھیں اور وہ فٹ پاتھ کنارے آگے چلتی جا رہی تھی۔

”سکھ ساتھ لا رہے ہو؟“

”جی.... کیونکہ خزانہ ملا کہ میں ہی ہے نا۔“

تالیہ مراد رک گئی۔ بالکل ساکت۔ شل۔

”خاموش کیوں ہو گئیں آپ چے تالیہ۔ چابی کا دوسرا حصہ آپ کے پاس ہے لیکن سکھ میرے پاس ہے۔ اور خزانہ ملا کہ میں۔ اتنا مشکل نہیں تھا گیس کرنا۔“

”مجھے نہیں پتہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ سکھ سرکار کی مانت ہے۔“ اس نے کہنے کی کوشش کی۔

”ہم کہاں مل سکتے ہیں، چے تالیہ؟“ وہ بے چینی سے بولا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ بولی نہیں۔

”اگر آپ کو سکھ چاہیے تو آپ کو مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔ سچ آپ کو آزاد کر دے گا چے تالیہ۔“

”وانگ لی کے کنویں پہ مجھ سے ملو۔“

”کون سا کنواں؟ جو وانگ لی کے گھر میں ہے؟ سن باؤ کا گھر؟“

”نہیں اسٹو پڈ۔ وہ تو فاتح صاحب کا گھر ہے۔ میں بوکیت چینہ پہاڑی کی بات کر رہی ہوں جہاں وانگ لی نے کنواں بنوایا تھا۔ جس کا

پانی چھ سو سال سے خشک نہیں ہوا۔“

”پانچ سو ستاون سال، چے تالیہ۔ اور اس کو وانگ لی کا کنواں نہیں کہتے۔ یہ نام سیاحوں نے غلط العام کر رکھا ہے۔ وہ کنواں وانگ لی

نے شہزادی ”یان سوفو“ کے لئے بنوایا تھا۔ اس کو ”یان سوفو“ کا کنواں کہتے ہیں۔“
”تمہیں اتنا کیسے معلوم ہے؟“

”کیا آپ کتابیں نہیں پڑھتیں؟“ وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

”اب اس کا کیا کروں؟“ کال ختم کر کے وہ وہیں فٹ پاتھ کنارے کھڑی سوچتی رہی۔ پھر مڑی تو سامنے ایک دکان کے آگے تنی چھتری تلے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ وہاں آئے سامنے دو بوڑھے بیٹھے شطرنج کی بساط درمیان میں رکھے غور و فکر کر رہے تھے۔ وہ آگے آئی اور ان کے عین سر کے اوپر جھکی سوچتی نظروں سے بساط دیکھی۔

”اگر سیاہ والی فوج اپنے اس پیادے کو ایک قدم چلائے....“ دو انگلیوں سے پیادہ اٹھایا تو دونوں نے چونک کے گردنیں اٹھائیں۔ سفید ہیٹ والی لڑکی بوڑھ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی....

”اور سفید فوج اپنے فیلے کے ذریعے اس سیاہ گھوڑے کو مار دے تو سیاہ رخ اس فیلے کو مار دے گا اور سفید پیادہ یوں چل جائے تو سیاہ ملکہ کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ کر دیا سیاہ ملکہ نے سفید بادشاہ کو.... شبہ مات!“ اس نے جھکے جھکے دو تین گوٹ چلائے اور سیدھی ہو کے مسکرائی پھر سیاہ فوج کے بوڑھے مالک کو دیکھا جو ہکا بکا بیٹھا تھا۔

”بروقت دفاعی انداز میں کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ جب آپ کو لوگ کوٹنے سے لگا دیں تو جارحانہ حکمت عملی اپنانی پڑتی ہے۔ پیادے کو ملکہ بنا پڑتا ہے۔ یو آر ویلکم انکل۔“ ہیٹ کوتر چھا کرتے ہوئے سر جھکا کے تعظیم ابولی اور مڑ گئی۔

سفید فوج کا مالک بوڑھا پریشان سا بساط کو دیکھ رہا تھا۔

”مگر... میرا دوسرا سفید گھوڑا تو راستے میں حائل تھا۔ وہ... کہاں گیا....؟“

اور فٹ پاتھ پہ آگے بڑھتی تالیہ نے مٹھی میں دبایا سفید گھوڑا مسکرا کے فضا میں اچھال دیا۔

”ایمانداری سے بھی کوئی جیت سکتا ہے بھلا.... وہ بھی اس دنیا میں؟“

اب وہ واپس سرخ لکڑی کے روغن زدہ گھر کی طرف جارہی تھی۔ اسے عصرہ سے اجازت لے کر ہوٹل جانا تھا اور شام کو خزانے کے بارے میں اگلا لمحہ عمل تیار کرنا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ خزانہ لیے بغیر ملا کہ سے واپس نہیں جائے گی۔

سن باؤ کے گھر کے دروازے کے سامنے وہ رکی اور گردن اوپر اٹھائی۔ بالائی کمروں کی بالکونیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ اندر صحن میں ان کمروں کی کھڑکیاں تھیں جہاں سے شہزادی مجسمہ بناتے وقت اوپر موجود شخص کو دیکھتی تھی۔ مگر کیا وہ یہاں بالکونی میں بھی بیٹھتا ہو گا جب دور سے گھوڑے پہ شہزادی تاشہ آتی ہوگی؟

اس نے گردن موڑ کے شمال کی سمت دیکھا۔ ابھی تو یہاں دکانیں تھیں اور ان کے پیچھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ محض چند

میل کے فاصلے پہ ملا کہ سلطنت کا محل واقع تھا۔ جو ملک آج ملائیشیا تھا، وہ کسی زمانے میں ایک بڑا سا ملک تھا جو ملا کہ سلطنت کہلاتی تھی۔ ملائیشیا کے آس پاس کی ریاستیں بھی اس میں شامل تھیں۔ سولہویں صدی میں جب ملا کہ پہ پرتگال نے قبضہ کیا تو اس محل کو جلا ڈالا۔ پھر ڈچ آئے۔ اور گزشتہ صدی میں انگریز۔ 1957 میں ملائیشیا کو آزادی ملی اور اب ملا کہ اس کی صرف ایک ریاست ہے۔ محل تو صدیوں پہلے جلا دیا گیا تھا مگر چند برس قبل ملائیشیا کی حکومت نے پرانی کتابوں اور نقشوں کی مدد سے محل کا خاکہ نکالا اور اسے ہو بہو ویسا ہی تعمیر کروایا۔ اب وہ ایک میوزیم تھا۔ کسی زمانے میں شہزادی تاشو وہیں رہتی ہوگی۔

وہ بالکونی کو دیکھے گئی۔ جانے کون ہوگا یہاں جس کے لئے بندابار کی خوبصورت بیٹی آیا کرتی تھی؟ یقیناً کوئی جری مرد ہوگا۔ وہ جتنی حسین طرحدار اور لائق تھی، کسی عام مرد کے لئے نہیں آئے گی۔ پتہ نہیں کیا کہانی ہوگی اس کی۔ وہ سو گوار مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اے معلوم تھا کہ وہ کبھی اس کی داستان نہیں جان پائے گی۔

ظاہر ہے وہ غلط تھی۔

☆☆=====☆☆

تالیہ الوداعی کلمات کہہ کے چلی گئی تو عصرہ اوپر آئی۔ بیرونی زینے عبور کر کے بالکونی پارکی اور پہلے کمرے میں داخل ہوئی۔ توقع کے عین مطابق وہ وہیں موجود تھا۔

کمرہ سادہ تھا۔ ایک طرف سنگل پلنگ بچھا تھا۔ دوسری جانب الماری تھی۔ فاتح اس وقت دیوار کے سامنے کھڑا تھا جہاں کھڑکی تھی۔ عصرہ کی جانب پشت کیے وہ نیچے صحن میں مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔

”بچے کھانا کھانے باہر جانا چاہتے ہیں۔ چلو گے؟“ اس نے نرمی سے پکارا۔

”ہوں!“ وہ بے توجہی سے نیچے دیکھتا رہا۔

”اس گھر کو بیچنا مشکل لگ رہا ہے کیا، فاتح؟“ وہ اس کے کندھے کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ نیچے صحن اور کنواں صاف دکھائی دیتا تھا۔

”نہیں تو۔ میں یہاں کم رہا ہوں۔ کبھی چھٹیوں میں آتے تو میں یہ کمرہ لے لیتا تھا۔ چار پانچ ماہ میں ایک آدھ دن کے لئے۔“

”مت ظاہر کرو کہ تمہیں اس کو بیچنے سے فرق نہیں پڑتا۔“

”واقعی نہیں پڑتا۔ بیچ ہی رہا ہوں، ڈھانہیں رہا۔“ باہر دیکھتے ہوئے اس نے شانے اچکائے۔

”نئے مالک ڈھادیں گے۔ کوئی کافی شاپ، کوئی ٹی ہاؤس بنادیں گے اس کو۔“

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ نیچے دیکھتا رہا۔ سینے پہ بازو لپیٹے اس کی سیاہ آنکھیں مجسمے پہ جمی تھیں۔ جینز کے اوپر سفید شرٹ پہنے بال ماتھے پہ بکھیرے، وہ عام دنوں سے مختلف لگ رہا تھا۔

”فاتح... ریسٹوران!“ اس نے یاد دلایا تو وہ گہری سانس لے کر اس کی جانب گھوما۔

”میں کچھ آرڈر کر لوں گا۔ تم جاؤ۔ موسم خراب لگ رہا ہے، تمہیں پھر واپس بھی جانا ہوگا۔“
عصرہ چند لمحوں کے لیے غور سے اسے دیکھے گئی۔

”ہاں، ہم لنچ کر کے واپس چلے جائیں گے، موسم اچھا نہیں ہے، لیکن تم.... تم کب آؤ گے؟“
”میں رات تک آؤں گا۔“

”اکیلے کیا کرو گے ادھر؟“ وہ قدرے تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

فاتح نے مسکراتے ہوئے اطراف میں دیکھا۔ ”اکیلا کہاں ہوں؟ عنقریب اشعر مشہور کرنے والا ہے کہ اس گھر میں بھوت پریت بھی رہتے ہیں۔“

عصرہ کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں۔ ”تمہیں کیسے معلوم؟“

”اور کس طرح کسی پر اپنی کی قیمت گرائی جاتی ہے؟ تمہیں لگتا ہے میں اس کے طریقوں سے واقف نہیں ہوں؟“ ابرو اچکا کے مسکرایا۔
”سینے پہ بازو پیٹے وہ بے فکر لگ رہا تھا۔ عصرہ کی پیشانی پہ سلوٹھیں پڑیں۔“

”کیوں ایش کے بارے میں ایسے اندازے لگاتے ہو فاتح؟ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔“

”مگر وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ دکھاوے کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی کھل جاتا ہے۔“ شانے ذرا سے اچکائے گویا اسے پرواہ نہیں تھی۔ عصرہ نے ضبط سے گہری سانس لی۔

”خیر.... جو بھی کرو.... تمہاری سیاست، تم دونوں جانو۔ ہم لنچ کرتے ہی واپس نکل جائیں گے۔ تم کچھ آرڈر کر لینا۔“

”شیور!“ وہ بے پرواہ تھا۔ یا شاید قانع۔

عصرہ نے ایک الوداعی نظر اس پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ اور بچے کار میں بیٹھ رہے تھے، وان فاتح اوپر بالکونی میں کھڑا تھا۔ عینک لگائے، وہ جھک کے موبائل پہ ٹائپ کر رہا تھا۔ ابھی گلی میں لوگوں کی نظر اس پہ نہیں پڑی تھی ورنہ وہ تائبند ہوتا کہ خدا کی پناہ۔

”فاتح!“ کار کا دروازہ کھولتے وقت عصرہ نے اسے پکارا تو فاتح نے سر اٹھایا، پھر ان کو دیکھ کے مسکرایا اور عینک اتاری۔

”خدا حافظ!“ دایاں ہاتھ اٹھا کے الوداع کہا۔ سکندر نے ”خدا حافظ ڈیڈ!“ پکارا اور جولیا نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ وہ تینوں اندر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا کے ان کو دیکھتا رہا۔ سکندر کی نظریں اسی پہ جمی تھیں۔ بار بار فکر مندی سے وہ باپ کو دیکھتا تھا جو ریلنگ پہ دونوں ہتھیلیاں رکھے، جھک کے ان کو دیکھ رہا تھا۔

”ماما.... ہمیں ڈیڈ کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے۔“ کار آگے بڑھ گئی تو وہ بے چینی سے پیچھے مڑ کے ماں سے بولا۔

”بیٹا، تمہارے ڈیڈ 48 سال کے ہیں۔ بے فکر ہووہ راستہ نہیں بھولیں گے اور بالکل بھی نہیں کھوئیں گے۔ ان کو بھی کوئی space

چاہیے۔“ وہ جو سیل فون پہ لگی تھی قدرے اکتا کے بولی تو سکندر گردن موڑ کے سرک کنارے بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگا۔
اس کا دل خراب ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔
(کیا بڑے لوگ راستہ نہیں بھولتے؟)

☆☆=====☆☆

ملاکہ کا دار الحکومت ملاکہ شہر تھا جو سمندر کنارے واقع تھا۔ جس ہوٹل میں تالیہ نے کمرہ لیا تھا اس کی کھڑکیاں ساحل کی طرف کھلتی تھیں۔
فرنیچر وندوپہ پڑے سفید پردے ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے اور نیچے ٹھانٹھیں مارتا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔
بیڈ پہ اس کا سامان بکھرا پڑا تھا اور وہ سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک بیک بیک تھا۔ جیسے اسکول کالج جانے والے کندھوں پہ پہنتے ہیں۔ وہ کچھ چیزیں نکال نکال کے اس بیک میں رکھ رہی تھی۔ رسی ٹیپ چند اوزار، پیسے، کریڈٹ کارڈز، گلوڑ۔ چھوٹے سے بیک بیک کو بھرنے کے بعد وہ روم فرنیچر تک آئی اور اندر سے پانی کی ایک بوتل نکالی ایک کولا کا کین اور اور چند چاکلیٹ بار۔
”اتنی کیلوریز؟ اونیہوں۔“ چاکلیٹ واپس رکھ دی۔ پانی اور کولا کو بیگ میں ڈال دیا۔ ایک تیز دھار خنجر رکھا۔ ٹیزر (کرنٹ لگا کے بے ہوش کرنے کا آلہ) کالی مرچوں کا اسپرے اور ایسے تمام لوازمات جو وہ کسی بھی واردات کے وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی اس میں ڈالے اور زپ بند کی۔ پھر اسے کندھوں پہ پہنا اور خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔
تبھی موبائل بجا۔

ایڈم کنویں پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ اسے وہیں رکنے کا کہہ کے باہر نکل آئی۔ ذہن تیزی سے مختلف ممکنات کو سوچ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ملاکہ کے ساحل کا یہ حصہ انگ تھلگ سا تھا۔ یہاں اونچی چٹانیں تھیں اور نیچے سمندر بہت نظر آ رہا تھا۔ لہریں انڈائنڈ آتیں اور چٹانوں سے سرخ کے واپس لوٹ جاتیں۔ یہاں اکا دکا لوگ نظر آتے تھے۔ دور تک ریت سنسان پڑی تھی۔
ایسے میں ایک چٹان کے اوپر وان فاتح کھڑا تھا۔ اس کی سفید شرٹ ہوا کے باعث پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے سمندر کو دیکھتے ہوئے سو گوار سا مسکرا رہا تھا.....

لہروں کی جھاگ میں شکیں بن بن کے ابھرتیں اور ابھرا بھر کے مٹی تھیں۔ بہت سی یادیں گویا انڈتی چلی آرہی تھیں۔ چھ سال گزر گئے۔
چھ سال اور ایک دن۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آریانہ کے ساتھ اس روز کیا ہوا تھا۔
سوائے وان فاتح کے....

اسے ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ آخری دن ان دونوں نے ملاکہ میں ساتھ گزارا تھا۔
ملاکہ آ کے سب سے پہلے وہی یاد آتی تھی۔

ملا کہ سے جاتے وقت سب سے آخر میں بھی وہی یاد آتی تھی۔

وہ ایک نم صبح تھی۔ سن باؤ کے گھر میں چھایا سی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا تھا۔ ایسے میں صحن میں وہ بیٹھی تھی۔

ننھی آریانہ۔ اس مجسمے کے قریب پنچوں کے بل بیٹھے وہ اس کے پاؤں دیکھ رہی تھی۔ لمبے بال کمر پہ بکھرے تھے۔ وہ چینی نقوش والی گوری سی لڑکی تھی جس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔

وہ اس کی پشت پہ آکھڑا ہوا۔ آریانہ نے گردن موڑی تو دیکھا۔ فاتح مسکرا کے اسے دیکھ رہا تھا۔ ٹی شرٹ اور جینز پہنے وہ چھٹی والے لاپرواہ حلیے میں لگتا تھا۔

”کیا تمہیں بھی سن باؤ پسند ہے۔“ وہ پنچوں کے بل اینٹوں والے فرش پہ بیٹھا۔ آریانہ نے واپس چہرہ مجسمے کی طرف موڑ لیا۔

”وڈیڈ... کیا یہ آدمی اصل میں تھا کوئی؟“

”ہاں بیٹا۔ اس کا نام وانگ لی تھا۔“

”اس کا مجسمہ کیوں بنایا شہزادی تاشہ نے؟“

”کیونکہ وہ شہزادی تھی۔ اور شہزادیاں اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔“

اوپر بادل زور سے گرجے اور یکا یک موٹی موٹی بوندیں صحن میں گرنے لگیں۔

”کاش میں بھی شہزادی ہوتی۔“

وہ ہنس دیا۔

”تمہیں کیوں لگا کہ تم شہزادی نہیں ہو؟“ سرخ اینٹوں والا صحن بارش میں بھیک رہا تھا اور وہ دونوں پنچوں کے بل ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

”کیونکہ آپ بادشاہ نہیں ہیں۔“ وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اداس نظر آتی تھی۔

”تاشہ کا باپ بھی بادشاہ نہیں تھا۔ بند اہار تھا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”پردھان منتری۔ (وزیر اعظم)“

وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر آپ پردھان منتری بن جائیں تو میں خود بخود شہزادی بن جاؤں گی؟“

”ہاں۔“ وہ کھڑا ہوا اور جھک کے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ آریانہ کسی اور سوچ میں لگتی تھی....

”مگر یہ تو چیٹنگ ہوئی۔ شہزادی تو بائی برتھ شہزادی ہوتی ہے۔ ایسے ہی کوئی تھوڑی شہزادی بن جاتا ہے۔“ وہ بھیگی ہوئی بچی اس کی گردن

کے گرد بازو حمال کیے سر اس کے کندھے پہ رکھے بولی۔ وہ اسے اٹھائے اندر برآمدے میں لارہا تھا۔

”یہ چیٹنگ نہیں ہے۔“ برآمدے میں آ کے وہ ٹھہرا اور آریانہ کو نیچے اتارا۔ وہ فرش پہ کھڑے ہوتے ہی حیرت سے سر اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

”چیٹنگ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“

”دھاندلی۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔۔۔ اور دونوں ہنس دیے۔

تبھی اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا۔

”اندر جاؤ اما کے پاس اور اب بارش میں نہیں بھینکا۔“ وہ تابعداری سے اندر جانے لگی پھر رکی۔

”کل ہم کیبل کار (چیر لفٹ) پہ جائیں گے ناؤیڈ؟“

فاتح نے صرف سر ہلا دیا اور فون کان سے لگاتے ہوئے برآمدے کے دوسرے سرے تک چلتا آیا۔ چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی تھی۔

”کہاں ہو فاتح؟“ مردانہ آواز دوستانہ انداز میں سنائی دی۔

”میں چھٹی پہ ملا کہ آیا ہوا ہوں۔ کیوں؟“ وہ اب برآمدے کے ستون کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ اوپر مخروطی چھت کے کناروں سے پانی

ٹپک ٹپک کے نیچے گر رہا تھا۔ سامنے صحن بھگتا دکھائی دے رہا تھا۔

”فاتح۔۔۔“ وہ کوئی سیاسی دوست تھا۔ تذبذب سے بولا۔ ”صوفیہ صاحبہ ایک پیغام دینا چاہتی تھیں۔“

”پردھان منتری کی بیٹی صوفیہ رحمن صاحبہ؟“ وہ استہزائیہ مسکرایا۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب صوفیہ رحمن کے باپا ملک کے وزیر اعظم

تھے۔)

”ہاں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تم اور تمہارے ساتھ قریباً ۲۰ ممبر پارلیمنٹ۔۔۔“

”میرا جواب ناں میں ہے۔“

”تم نے ابھی ان کی پیشکش سنی ہی نہیں ہے۔“

”اچھا ہے نہیں سنی، کیونکہ سن لوں گا تو اس پہ گواہ بن جاؤں گا اور اگلا جلسہ جہاں بھی کرنے جاؤں گا وہاں لوگوں کے سامنے دہرا دوں گا

کہ صوفیہ رحمن کیسے لوگوں کو اپنے الائنس میں شامل ہونے کے لئے دھمکاتی ہیں۔“

”وہ ملک کی اگلی وزیر اعظم ہیں۔ ان کی بات تو سن لو۔“

ایک دم بارش کی بو چھاڑا تہی تیز ہو گئی کہ جس سے پہ گرتے قطروں کی تڑتڑاہٹ سے سارا آنگن گونج اٹھا۔

”میں ضرور سنتا اگر مجھے صوفیہ کے ساتھ بیک ڈور ڈیل کرنی ہوتی۔ یہی کہنا چاہتی ہوگی نا وہ کہ میں بیس پچیس لوگوں کے ساتھ باریسن

نیشنل چھوڑ کے اس کی پارٹی میں آ جاؤں اور وہ مجھے وزیر بنادے گی؟ ابھی انکیشن میں دو سال پڑے ہیں وہ ابھی سے اپنی حکومت کے لئے

جوڑ توڑ شروع کر رہی ہے۔“ وہ ستون سے ٹیک لگائے کھڑا موبائل کان سے لگائے بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

”صوفیہ رٹمن ایک خطرناک عورت ہے۔“

”صوفیہ رٹمن ایک بزدل عورت ہے۔ اور اسے شاید بھول گیا ہے مگر ہم دونوں یونیورسٹی میں ساتھ پڑھے ہیں۔ اس کو کہنا مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ کیسی تھی اور یہ بھی کہ میں کیسا تھا۔ اسے مجھے ایسی آفر دیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ بی این کا ایک رکن بھی اس کی طرف نہیں جائے گا۔“

”تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ اس آفر کو قبول کر لیتا۔“

”تمہارے خیال میں ایسی آفرز مجھے پہلے کبھی نہیں دی گئیں؟ اگر مجھے دوسروں کے ساتھ سمجھوتے کر کے وزیراعظم بنا ہوتا تو کب کا بن چکا ہوتا۔ میرا خواب ہے کہ میں اپنے ملک کا وزیراعظم بنوں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم خواب ہے۔ اپنے ملک کی اعلیٰ ترین سطح پر نمائندگی۔ لیکن مجھے اسٹرگل کر کے وزیراعظم بنا ہے۔ اور ہاں صوفیہ سے کہنا اس نے جو کرنا ہے کر لے۔ اس کے باپا اور اس کو لوگوں کو خریدنے کی عادت ہو گئی ہے۔ عادت بدلنے میں وقت لگے گا۔“

اس نے موبائل رکھا اور پھر گردن نکال کے آسمان کو دیکھا۔ وہ سیاہ پڑتا بر سے جا رہا تھا... جیسے رونے لگ گیا ہو... زار و قطار....

آج... وان فاتح چٹان کے اوپر کھڑا تھا۔ ہاتھ جیبوں میں تھے اور سو گوار مسکراہٹ سے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ لہروں میں ہنسی جھاگ میں دکھائی دیتا منظر بدل رہا تھا....

وہ سرسبز اونچی پہاڑیاں تھیں جہاں اونچے کھمبوں کی مدد سے تاروں پہ نعلتی کیبل کار (چیمیز لفٹ) نیچے آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ پہاڑی پہ ٹریک بھی بنا تھا جہاں ہائیکنگ کے شوقین لوگ چڑھتے تھے۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔ زیادہ لوگ اوپر کیبل کار (چیمیز لفٹ) پہ بیٹھ کے سفر کرنا پسند کرتے تھے۔ عصرہ اشعر اور سکندر کے ساتھ اوپر کیبل کار پہ چلی گئی تھی۔ جبکہ آریانہ کے شوق فاتح جیسے تھے۔ اسے قدرت کے قریب، جنگلوں اور پہاڑوں میں پیدل چلنے میں مزا آتا تھا۔

ٹریک پہ جانے سے پہلے آریانہ پاپ کارن کا اسٹال دیکھ کے چل گئی۔ ”مجھے یہ کھانے ہیں۔“

”ابھی واپسی پہ کھانا تو کھاؤ گی نا، پھر یہ کیوں؟“ وہ ہلکا سا خفا ہوا۔ جواب میں اس نے پورا چہرہ اٹھایا اور بڑی بڑی آنکھیں جھپک کے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

”اچھا۔ کھاؤ۔“ فاتح نے گہری سانس لی اور جیب سے بنوہ نکالا۔ پھر آریانہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے پاپ کارن اسٹال تک لے آیا۔

اسے بیٹھے پاپ کارن پسند تھے۔ کیریمل والے۔ پورا پیکٹ بھر کے لیا اور اپنی لمبی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ ”میں ان کو واپسی پہ کھاؤں گی۔“

”مگر یہ تب تک ٹھنڈے ہو جائیں گے، بے بی۔ پاپ کارن گرم کھائے جاتے ہیں۔“

”اس سے میری جیکٹ گرم ہو جائے گی نا۔“ کہنے کے ساتھ اس نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکائیں۔ فاتح مسکرا دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں سرسبز پہاڑی پہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ اس نے جینز میٹیریل کی شرٹ پہن رکھی تھی اور آریانہ نے پتلی سی سفید جیکٹ۔ نیچے سفید فراک اور سفید ہی جرابیں تھیں۔ جوگرز بھی سفید۔ سر پہ ہیمز بینڈ پہنے وہ چھوٹی سی پری لگتی تھی۔

”میں نے صبح ماما کو کہا کہ جب آپ پر دھان منتری بن جائیں گے تو میں شہزادی بن جاؤں گی۔“

”اور ماما نے کیا کہا؟“ وہ مسکراہٹ دبائے جوگرز کی مدد سے اوپر چڑھ رہا تھا۔

”انہوں نے کہا، صرف میں شہزادی کیوں بنوں گی؟ جولیانہ بھی بنے گی۔“

وہ ہنس دیا۔ عصرہ کو اس سے شکایت ہوتی تھی کہ وہ آریانہ اور جولیانہ میں فرق کرتا ہے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ آریانہ بڑی تھی تو زیادہ قریب تھی۔

”ہاں، ظاہر ہے جولیانہ بھی بنے گی۔“ اس نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔ وہ سرسبز پہاڑیاں تھیں جہاں بادل نیچے تک اترے ہوئے تھے۔ ان کے سروں کے اوپر سے کیبل کارگزر رہی تھی۔ کتنا خوبصورت تھا اس کا ملک۔ وہ فخر سے مسکرایا۔

”آپ کو جنگل اور پہاڑ اچھے لگتے ہیں، ڈیڈ؟“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”بہت زیادہ۔ میں برسوں صبح کے جنگلوں میں شکار کے لیے جایا کرتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے نہیں جاسکا مگر دل چاہتا ہے۔ پارلیمنٹ اور کوالا لپور کی مصروف زندگی سے بالکل کٹ کے کچھ دن پہاڑوں میں گزارنے کا۔“

”آپ کو ایسی جگہوں پہ کیوں مزہ آتا ہے؟“

”کیونکہ جو ملاح طوفانی بارش میں سمندر میں کشتی لے کر نہیں نکلتے، وہ کبھی اچھے ملاح نہیں بن سکتے۔ انسان کو ہر روز خود کو کسی چیلنج کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اس سے بہت کچھ سیکھ سکے۔“

آریانہ کو بات سمجھ نہیں آئی مگر اس نے سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے جا رہے تھے کہ عقب سے آواز آئی۔

”ان چے فاتح (مسٹر فاتح)۔ آریانہ۔“ وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

نیچے سے جولیانہ کی نینی چلتی آرہی تھی۔ یہ ایک انڈین عورت تھی جو چند ماہ سے ان کے گھر ملازمت کر رہی تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کرتی کیونکہ عصرہ ایک ورکنگ وومن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی بیوی بھی تھی۔ غرض اس عورت شریانے سارا گھر سنبھال رکھا تھا۔

”سر....“ وہ پھولتی سانس کے ساتھ قریب آئی۔ ”عصرہ بیگم آریانہ کو بلارہی ہیں۔“

”کیوں؟“

”سکندر رضد کر رہا ہے کہ وہ آریانہ کے بغیر کچھ نہیں کھائے گا۔ سکندر کو بخار بھی ہو رہا ہے۔“

”چلو، ہم واپس چلتے ہیں۔“

”نہیں، سر۔ عصرہ بیگم نے کہا ہے کہ میں آپ کو ٹیک سے نہ روکوں۔ آپ عرصے بعد ہالینڈ پہ آئے ہیں۔ صرف آریانہ کو لے

آؤں۔ آپ ٹریک جاری رکھیں۔“ وہ ہمدردی سے بولی تو آریانہ فوراً بولی۔

”آپ جائیں ڈیڈ۔ میں سکندر کو سنبھال لوں گی۔“ اس نے سمجھداری سے کہا۔ تو اس نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ آریانہ کا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا ہاتھ شریا دیوی نے تھامنا تو وہ اس کے ساتھ آگے بڑھی۔ فاتح نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ مڑی اور اس کو دیکھ کے مسکرائی۔

”سی یو... ڈیڈ!“ اور پلکیں دو دفعہ جھپکائیں۔ وہ ہلکا سا ہنسا اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شریا اسے لیے نیچے اترنے لگی اور وہ اوپر پہاڑی پہ چڑھنے لگا۔

وہ چند منٹ تک اوپر چڑھتا گیا اور پھر یکا یک رک گیا۔ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سکندر تو ابھی ٹھیک تھا۔ اسے بخار کیوں ہو رہا ہے؟ وہ واپس پلٹ آیا۔ ٹریکنگ میں دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ وہ نیچے اترنے لگا۔ رفتار تیز تھی اسے امید تھی کہ وہ جلد آریانہ اور شریا سے جا ملے گا۔ مگر وہ اسے ٹریک پہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ نیچے اترتا آیا۔ سچ راستے میں رک کے اس نے سیل فون نکالا اور عصرہ کو کال ملائی۔

”سکندر ٹھیک ہے۔ اسے کیا ہونا ہے؟“ وہ مطمئن لگ رہی تھی۔

وہ ایک عجیب سا لمحہ تھا۔ جیسے کوئی روح کھینچ لیتا ہے۔

”تم نے شریا کو ہماری طرف نہیں بھیجا؟“

”نہیں۔ میں تو خود اس پہ غصہ بیٹھی ہوں۔ وہ آدھے گھنٹے سے غائب ہے۔ کیا وہ تمہاری طرف آئی ہے؟ فاتح؟“ وہ پوچھ رہی تھی مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ فون رکھتا ایک دم نیچے بھاگا تھا۔

پہاڑیاں خاموش تھیں۔ سبزہ منہ بند رکھے ہوئے تھا۔

”آریانہ... آریانہ!“ وہ چلاتے ہوئے نشیب میں اتر رہا تھا....

اگلا ایک گھنٹہ کسی سلوموشن فلم کی طرح طے ہوا۔ وہ جیسے ہی ٹورسٹ اسپاٹ تک پہنچا... عصرہ اشعر اور بچے ادھر ہی آگئے.... پل بھر میں سارے گیٹنگ ہائی لینڈ کو خبر ہو گئی کہ وان فاتح کی بیٹی غائب ہو گئی ہے.... کیمروں کے جلتے بجھتے فلیش.... موبائل اسکرینز کی روشنیاں.... پولیس کے سائرن.... لوگ چلا رہے تھے.... اس کے ساتھ دوڑ رہے تھے.... وہ بھی بھاگ رہا تھا.... دائیں بائیں.... حلق کے بل چلاتے ہوئے آریانہ کو آوازیں دے رہا تھا.... مگر آریانہ نہیں تھی.... وہ غائب ہو گئی تھی....

کسی نے کہا ایک بچی کو چند ماسک والے افراد وین میں ڈال کے لے گئے ہیں....

وہ مڑک تک بھاگتا آیا.... ٹھنڈے موسم میں پسینہ پسینہ ہوئے.... مگر نہ کوئی وین تھی.... نہ اس کا نام و نشان.... پولیس آگے پیچھے بھاگی

.... کسی نے سی سی ٹی وی کا ریکارڈ کھولا مگر کیمرے میں وین نہیں تھی۔ نہ کیبل کار (چیمز لفٹ) کے کسی کیمرے نے شریا اور آریانہ کو دیکھا تھا۔ پولیس وین کو ڈھونڈتی رہی اور بعد میں علم ہوا کہ وین کی ہوائی اڑانے والا بھی لاپتہ ہے.... وہ صرف پولیس کا وقت ضائع کرنے کی کوشش تھی اور کامیاب رہی تھی.... کوئی وین نہیں تھی.... ساری ناکہ بندیاں بے سود تھیں....

چند منٹ میں کیبل کار (چیمز لفٹ) اسٹاپ جائے حادثہ بن گیا۔ خوف و ہراس کی فضا قائم تھی۔ رپورٹرز دھڑا دھڑائی وی چینلوں پہ بیان دے رہے تھے، کیمرہ مین تصاویر اتار رہے تھے۔ اشعر روتی ہوئی عصرہ کو ہوٹل لے گیا مگر وہاں سے نہیں گیا۔ وہ اب گینٹنگ ہائی لینڈ کے ریسٹورانوں کی طرف آگیا تھا۔ آگے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ ایک ایک کمرہ چیک کر رہا تھا۔ آریانہ... آریانہ... کیا وہ واقعی اس کا نام پکار بھی رہا تھا یا گلا پیٹھ جانے کے باعث صرف لب بل رہے تھے؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ساری دنیا ختم ہو گئی تھی اور صرف ایک حقیقت باقی تھی۔ آریانہ نہیں تھی۔

رات سرکتی رہی۔ بارش نہیں ہوئی۔ آسمان بھی شل تھا جیسے۔ پولیس رپورٹ تیار کر چکی تھی۔ ریسکیو ٹیمیں ناکام لوٹ چکی تھیں۔ کسی کو آریانہ نہیں ملی۔ قوی امکان تھا کہ شریا اب تک بچی کو لیے شہر سے دور جا چکی ہوگی۔ وہ اس وقت ایک پولیس آفیسر کے ساتھ وہیں کے مقامی ریسٹوران میں بیٹھا تھا۔ پولیس نے اسے باخبر کیا تھا کہ اغوا کار فون کریں گے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ کھڑکی سے باہر سیاہ آسمان اور دور تک پھیلی پہاڑیاں دیکھتا رہا۔ اس کا دل کہتا تھا، آریانہ یہیں ہے۔ وہ انہی پہاڑوں میں ہے۔ وہ قریب ہے۔ بہت قریب۔

آدھی رات بیت گئی جب پولیس نے اسے گھر جا کے آرام کرنے کا کہا تو وہ بنا احتجاج کے اٹھ آیا۔ مگر وہ گھر نہیں گیا۔ وہ واپس اسی ٹریک کی طرف چلتا گیا۔ سرسبز پہاڑی پہ بناراستہ جہاں اس نے آریانہ کا ہاتھ آخری دفعہ چھوڑا تھا۔

بچپن میں جب کوئی شے کھو جاتی تو اس کی ماں کہا کرتی تھی۔ چیزیں ہمیشہ وہیں ڈھونڈنی چاہئیں جہاں وہ کھوئی تھیں۔ وہ ہمیشہ وہیں سے ملتی ہیں۔

پولیس کے کسی سپاہی سے جو نارچ اس نے لی تھی وہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی اندھیر پہاڑی پہ پھینکتا وہ اسی جگہ واپس آیا۔ پھر وہاں سے نیچے اترنے لگا.... بالکل ایسے جیسے اس نے شریا اور آریانہ کو اترتے دیکھا تھا۔ پولیس نے یہ سارا علاقہ چھان مارا تھا مگر وہ ایک گمشدہ بچی کو ڈھونڈ رہے تھے۔

وہ اپنی سات سالہ بیٹی کو نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

وہ ٹریک سے ہٹ آیا۔ شریا فاتح کے مڑتے ہی بچی کو بہلا پھسلا کے اس طرف لے آئی ہوگی جہاں اس کی مدد کے لیے کوئی موجود ہوگا۔ وہ ان جھاڑیوں کی طرف آگیا جہاں لوگ نہیں چلا کرتے تھے۔ نارچ کی روشنی اس پاس مسلسل پھینک رہا تھا البتہ اب وہ اسے پکار نہیں رہا تھا۔ اس کے انداز میں احتیاط تھی۔

دور ایک طرف روشنی میں کچھ چمکا۔ وہ تیزی سے قریب آیا۔ کیمریل لگا پارپ کارن۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ دوڑ کے اس کو نے تک آیا۔ یہاں مٹی پہ نشانات تھے۔ گھاس مسلا ہوا تھا۔ مزاحمت۔ زور زبردستی۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترتا، نارچ کی روشنی ڈالتا گیا۔ وہاں کچراستہ سا بنا تھا جس پہ ذرا ذرا دیر بعد پاپ کارن کا ٹکڑا گرا نظر آتا تھا۔ وہ تیز دوڑنے لگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس کی فیری ٹیلو کی رسیا بیٹی.... جانے اس نے ہنسل اور گریٹل کی طرح بریڈ کرمب خود گرائے تھے یا جیب سے لڑھکتے گئے تھے.... اس کا دل بھر آ رہا تھا مگر وہ دوڑتا گیا۔ وہاں گھسیٹنے کے نشان تھے... قدموں کے کھرے تھے... اور وہ رک نہیں رہے تھے.... پولیس اور دوسرے لوگوں کو وین کے پیچھے لگا کے وہ دو افراد جو اس کی بیٹی کو اٹھائے ہوئے تھے وہ اس راستے سے نکل گئے تھے۔ شریا کیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی تھا۔

اس نے چند گھاٹیاں عبور کیں۔ کچھ پرنا لے پھلانگے.... اور دوڑتا ہوا نیچے اترتا گیا۔ پاپ کارن اب ختم ہو چکے تھے۔ اونچی نیچی گھاٹیاں اندھیرے میں ڈوبی تھیں۔ ”آریانہ!“ وہ چیخا۔ نارچ چاروں اطراف میں ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جنگل سا علاقہ خاموش پڑا تھا۔ ایک طرف سڑک دکھائی دیتی تھی۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ وہ دوڑ کے اس تک آیا۔ راستے میں باڑ وغیرہ لگی تھی مگر اس نے اسے پھلانگ لیا۔

کار لا کڈ تھی اور خالی تھی۔ اگر یہ اغوا کاروں کی کار تھی تو وہ واپس کیوں نہیں گئے؟ وہ ابھی تک پہاڑوں میں کیوں چھپے ہوئے تھے؟ وہ دوبارہ سے پہاڑی کی طرف آیا اور اسے پکارتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔ ”آریانہ۔ آریانہ۔“ مگر اندھیرے میں ڈوبے پہاڑ خاموش رہے۔ وہ سب جانتے تھے مگر غم بانٹنے کے عادی نہ تھے۔ اسی لیے خت اور اونچے تھے۔

نیچے ایک چھوٹا سا جھرنابہر رہا تھا۔ وہیں تھکا ہارا اس کے کنارے بیٹھ گیا۔ ارد گرد حشرات الارض ریگ رہے ہیں یا کوئی جنگلی جانور اس طرف آ سکتا ہے اسے پرواہ نہ تھی۔ وہ بس وہیں بیٹھا رہا۔

پھر رات کی سیاہی میں سورج کی کرنیں گھٹنے لگیں اور پہاڑ روشن ہونے لگے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نڈھال قدموں سے واپس اوپر چڑھنے لگا۔

وہ جو پوری رات کی خواری اور ٹھوکروں کے باجوہ نہیں ملی تھی..... وہ واپسی کے چند قدم اٹھانے پہل لگئی۔ ایک درخت کی کھوہ میں.... وہ لیٹی ہوئی تھی۔

دور سے اسے دیکھ کے فاتح ٹھہر گیا۔ بالکل ساکت۔ جامد۔

اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ سفید اسکرٹ بلاؤز اور اوپر جیکٹ پہنے وہ لیٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ پہلو میں ڈھلکے ہوئے بازو کے ساتھ پاپ کارن بکھرے تھے۔ ساتھ ہی خون بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ من من کے قدم اٹھاتا قریب آیا اور گھٹنوں کے بل آریانہ کے پاس بیٹھا۔ پھر آہستہ سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

اس کا چہرہ صاف تھا۔ آنکھیں ذرا سی کھلی تھیں۔ مگر چہرے پہ ایک خراش بھی نہ تھی۔ سر کا پچھلا حصہ پچکا ہوا تھا۔ گردن سے نیچے جسم بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔

مگر اس کا چہرہ صاف شفاف تھا۔ شہزادیوں جیسا۔

ہاں... صرف وان فاتح جانتا تھا کہ اس روز... آریانہ مر گئی تھی۔

صبح پھیل رہی تھی اور جب اس نے گردن جھکا کے دیکھا تو دور نیچے کھائی میں اسے دولاٹھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک شریا کی تھی۔ دوسرے اس کے ساتھی کی تھی۔ ان کا منصوبہ بچی کو ریغمال بنانے کا تھا مگر پہاڑی سے اترتے ہوئے یا تو اغوا کار پھسلا تھا یا شاید آریانہ مزاحمت کر رہی تھی... اور یوں وہ تینوں بلندی سے نیچے گرے تھے۔ آریانہ شاید سوفٹ تک کسی چٹان پہ گری اور وہ دونوں مزید نیچے لڑھکتے گئے تھے۔ ان کی ہلاکت موقع پہ ہی ہو گئی تھی اور لاشوں کی حالت بری تھی۔

مگر... فاتح نے پھر سے آریانہ کو دیکھا... آریانہ کا چہرہ صاف اور نکھرا ہوا تھا۔ لب ہلکی مسکراہٹ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس بات پہ خوش تھی کہ اس نے اغوا کار کو دھکا دیا ہے... مگر دھکا کھاتے ہی وہ آریانہ کو ساتھ لے کر گرا تھا۔ وہ تکلیف سے تڑپ تڑپ کے نہیں مری تھی۔ وہ اتنی تیز سے نیچے آن گری تھی کہ یقیناً اس کی موت فوراً ہوئی تھی۔ چند سیکنڈز میں۔ مسکراہٹ کولیوں سے جدا ہونے کا وقت بھی نہیں ملا تھا۔

اور پاپ کارن سے کیریمیل کی خوشبو ابھی تک آرہی تھی۔

وہ کبھی زندگی میں ایسے نہیں رویا تھا جیسے اس دھندلی صبح آریانہ کے سر ہانے بیٹھ کے رویا تھا۔ وہ بار بار اس کا سفید چہرہ چومتا، پھر سر جھکائے رونے لگ جاتا۔ ہاتھ خون آلود ہو گئے... گردن آنسوؤں سے بھینکتی رہی اور وہ روتا گیا۔

کتنے گھٹنے، کتنے پہرہ وہاں بیٹھا ہوا سے یاد نہیں۔

پھر وہ اٹھا۔ ہاتھوں سے چہرہ صاف کیا اور قریب سے مٹی کھودنے لگا۔ اپنے ناخنوں سے مٹی کھود کھود کے گڑھا بنایا۔ پھر اپنی اوپری شرٹ اتاری۔ اس میں احتیاط سے بچی کے اعضاء کو لپیٹا۔ سر کے نیچے اس کا جسم ایسا قیمہ بنا ہوا تھا کہ ہاتھ لگانے پہ ہی اعضاء بھر بھری مٹی کی طرح بکھرنے لگتے تھے۔ اس حالت میں کوئی اس کی بچی کو نہیں دیکھے گا، یہ تو طے تھا۔

آنسو برابر آنکھوں سے بہہ رہے تھے مگر اب وہ بے آواز تھے۔ اس نے آریانہ کو کٹھڑی صورت قبر میں ڈالا۔ پھر نیچے اتر آیا۔ جھرنے کے پانی سے وضو کیا۔ گرم دل پہ ٹھنڈی پھواریں مزید گھائل کرتی گئیں۔

واپس آ کے... قبر کے کنارے... اس نے آریانہ کے لئے آخری نماز پڑھی۔

پھر بدقت بہت مجتمع کی اور گڑھے کو مٹی سے بھرنے لگا۔ پھر اٹھا کے اوپر رکھے۔ بھاری وزنی پتھر۔ قبر بند ہو گئی۔ آریانہ آرام وہ جگہ پہ پہنچ گئی تو وہ اٹھا۔ ایک نظر نیچے دیکھا جہاں دور کئی سوفٹ نیچے دولاٹھیں پڑی تھیں۔ اسے ان سے نفرت بھی نہیں محسوس ہوئی۔ وہ جانتا تھا ان کو

صوفیہ نے بھیجا تھا۔ ان کو تو صرف آریانہ کو اغوا کرنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مر جائے۔

عصرہ کو اشعر گھر لے گیا تھا۔ وہ بھی اپنی کار میں سیدھا کے ایل آگیا۔ کسی سے ملے بغیر کمرے میں گیا۔ خون آلود شرٹ تو آریانہ کے ساتھ دفن ہو گئی تھی مگر نیچے والی شرٹ پہ بھی دھبے تھے۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور تازہ دم ہو کے باہر آیا۔ تو عصرہ سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس سے پوچھ رہی تھی کہ آریانہ ملی یا نہیں۔

”میں وہاں گیا تھا۔ وہ نہیں ملی۔“ اس نے بس اتنا جواب دیا۔ عصرہ کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ وان فاتح اب بالکل سنجیدہ تھا۔ چپ۔ خاموش۔ یہ بھی ایک آرٹ تھا۔ اس نے سیکھ لیا تھا۔

اگلے چند دن تفتیش ہوتی رہی۔ سارے ملک میں سوگ سا تھا۔ صرف آریانہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ان دنوں ملائیشیاء کی حکومت اور باغی کیمونسٹ پارٹی کی عسکری لڑائیاں عروج پہ تھیں۔ بہر حال اس نے پولیس کو اس مشتبہ کار کی اطلاع دے دی تھی اور انہوں نے جلد ہی اس آدمی کو ٹریس کر لیا۔ اس کا تانہ بانہ صوفیہ رحمٰن کی ایک فیکٹری کے کسی ملازم سے ملتا تھا۔ نہ بھی ٹریس ہوتا تو سب کو معلوم تھا یہ کسی اور کی نہیں، حکمران خاندان کی حرکت ہے۔ وہ جانتا تھا وہ آریانہ کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ اغوا کر کے پریشر ڈالنا مقصد تھا۔ جوہو اوہ صرف ایک حادثہ تھا، مگر بہر حال وہی اس کے ذمے دار تھے۔

پولیس کو ان دنوں کی لاشیں بھی نہیں ملیں۔ شاید ان کو گدھ کھا گئے تھے۔ مگر ان کی گمشدگی اور ان کا صوفیہ رحمٰن سے تانہ بانہ مل جانا.... یہی ہنگامہ کھڑا کرنے کو بہت تھا۔

جس دن پولیس کی حتمی رپورٹ سامنے آئی اس دن کیمونسٹ پارٹی کے مسلح ارکان نے فوج کے ساتھ جھڑپیں تیز کر دیں۔ اس صبح وہ عصرہ کے پاس آیا تو وہ بیڈ کے کنارے اکڑوں بیٹھی کھانے کو تک رہی تھی جو ان چھوار کھا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھیں بے کیف تھیں۔ آج آریانہ کو کھوئے چوتھا دن تھا اور وہ صدیوں کی بیمار لگتی تھی۔ فاتح کو داخل ہوتے دیکھ کے اس نے چونک کے نظریں اٹھائیں۔ ان میں آس سی جاگی۔

”آریانہ؟“

اب وہ ”آریانہ ملی“ نہیں پوچھتی تھی۔ صرف ایک نام کافی ہوتا اور سارے سوال اسی میں شامل ہوتے۔ وہ ہر دفعہ نفی میں سر ہلاتا تھا۔ آج نہیں ہلایا۔ اس کے سامنے جا کر بیٹھا اور اس کے ہاتھ تھامے جو ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔

”عصرہ... جو میں کہہ رہا ہوں... اسے غور سے سنو۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں کبھی نہ ملے دوبارہ، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ نہیں ہے۔ وہ ہے۔ کہیں نہ کہیں ہے۔“ اسے دیکھتے ہوئے وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

”اب ہمیں صبر کرنا ہے۔ اپنے باقی دونوں بچوں کو سنبھالنا ہے۔ ایک گھنٹے بعد پورٹرز ہمارے گھر کے دروازے پہ موجود ہوں گے۔ ہم دونوں کو ساتھ باہر نکلنا ہے اور بڑے صبر اور حوصلے سے دنیا کو بتانا ہے کہ ہم اپنی بچی کے لئے پر امید ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ہمیں مل جائے گی مگر

اس وقت ہمیں ان فوجیوں کے درد کو سمجھنا ہے جو ان جھڑپوں میں شہید ہو رہے ہیں۔ ”عصرہ ایک لفظ پہ چونک چوٹ گئی۔“
 ”کیا وہ ہمیں مل جائے گی فاتح؟“

”ہو سکتا ہے وہ ہمیں کبھی نہ ملے لیکن مجھے یقین ہے وہ کسی اور کو مل جائے گی۔ کسی نے اسے سنبھال لیا ہو گا اور وہ وہاں خوش رہے گی۔“ وہ کچھ اور کہہ رہا تھا مگر عصرہ کو اس بات نے نئی امید دی تھی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں صاف کیں۔
 ”وہ زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ ہمیں مل جائے گی۔“ اس نے کہتے ہوئے ٹرے اپنے قریب کی تو آنکھیں پھر سے ابل پڑیں۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا وہ عصرہ کو وہ سب نہیں بتا سکتا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش نہیں کر سکتا تھا اور عصرہ سچ سننے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ سو اس وقت وہ ان فاتح کو سچ چھپا دینا ہی بہتر لگا تھا۔ اسے لگا تھا یہ جھوٹ نہیں ہوتا۔ مگر یہ کچھ تو ہوتا ہے نا۔

جھاگ میں ابھرتے ڈوبتے مناظر تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ فاتح چٹان پہ کھڑا... لہروں کو پتھروں سے سر پٹختے دیکھتا رہا... اس کی مسکراہٹ کی سو گواریت ہنوز قائم تھی۔

اگلا منظر جو پانی کی سطح پہ چمکنے لگا وہ اس کے بیڈروم کا تھا... وہ سنگھار میز کے شیشے کے سامنے کھڑا تھا۔ بابر سے اشعر آواز دے رہا تھا۔
 ”آ بنگ... رپورٹرز پہنچ چکے ہیں۔“

وہ آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ بلیک پینٹ پہ سفید شرٹ پہنے ہوئے جس کے کالر کھڑے اور کف کھلے تھے۔
 ”آ رہا ہوں۔“ اس نے جواباً کہا تو اشعر دروازے سے ہٹ گیا۔

فاتح نے کف کے بٹن بند کرنے شروع کیے...
 (پہاڑی کے دامن میں سرخ مانع میں بھیگی لاش نظروں کے سامنے گھومنے لگی....)
 اس نے دوسرے کف کا بٹن کاج میں ڈالا....

(وہ دوزانو بیٹھے جھک کے اس کا سفید چہرہ جو مر رہا تھا... آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔)
 فاتح نے خشک آنکھوں سے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے شرٹ کا نچلا بٹن بند کیا۔
 (وہ ہاتھوں سے ماتحتوں سے زمین کھود رہا تھا... آنسو برآمد مٹی پہ گر رہے تھے۔)
 دو تین... اس نے اوپری بٹن بند کیا اور نائی اٹھائی۔

(وہ گھنٹی کو گڑھ کے اندر لٹا رہا تھا... پھر مٹی میں آئی آستین سے گیلی آنکھیں پونچھیں۔)
 نائی کی گرہ باندھتے ہوئے وہ آئینے میں نظر آتی اپنی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔
 (وہ سینے پہ بازو باندھے قبر کے سرہانے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔)

اس نے کوٹ پہنا، شکنیں برابر کیں اور پرفیوم اٹھایا۔

(وہ مٹی کی ڈھیری کے ساتھ اکڑوں بیٹھا تھا۔ ویران۔ خاموش۔ اب آنکھیں خشک تھیں۔ اب صرف دنیا میں خاموشی تھی۔)

پرفیوم چھڑکا، برش سے بال درست کیے اور ایک آخری نظر خود پہ ڈالی۔ چہرہ خاموش تھا اور آنکھوں سے... آنکھوں سے جیسے کچھ چلا گیا تھا۔ کچھ ایسا جواب کبھی لوٹ کے نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ عصرہ اس کے ساتھ تھی۔ اسٹول سر پہ لئے، اس کی آنکھیں خشک مگر ویران تھیں۔ مائیک اور کیمرے ان کے سامنے تھے اور وان فاتح تیز دھوپ کے باعث آنکھوں کی پتلیاں ذرا سکیڑے، کہہ رہا تھا....

”دنیا میں ہر مسئلہ اللہ کی طرف سے ہمارا امتحان ہوتا ہے۔ اور اللہ شاہد ہے، ہم اس امتحان میں ناکام نہیں ہوئے۔“

(وہ سبز پہاڑوں کے دامن میں پتھروں سے ڈھکی قبر کے سر ہانے اکڑوں بیٹھا تھا۔ گیلی آنکھیں دور آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔)

”ہماری بیٹی پانچ دن پہلے کیبل کار (چیئر لفٹ) اسپاٹ پہ ہم سے نکھڑ گئی۔ پولیس تا حال اس کو ڈھونڈ نہیں سکی، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کس کا کام ہے۔“ صحافیوں نے ایک دم سوالوں کی بوچھاڑ کی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کے انہیں خاموش کرایا۔

(وہ ابھی تک مٹی اور پتھروں کی ڈھیری کے کنارے بیٹھا تھا۔ ارد گرد پہاڑ تھا اور خاموش کھڑے تھے۔)

”میں اپنی بیٹی کے اوپر سیاست کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں مل جائے۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں کبھی نہ ملے، لیکن اس وقت ہمارا ملک ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے۔“

(اس نے آہستہ سے قبر کے پتھروں کو چھوا۔ ان پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔)

”اس وقت سارے ایوان کو اکٹھا ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ لڑائیوں کا وقت نہیں ہے۔ اگر ہم نے ان کمیونسٹ اتہاپسندوں کو شکست دینی ہے تو ہمیں اپنے ذاتی اختلافات بھلا کے ایک تیج پہ اکٹھا ہونا پڑے گا۔“

(اب وہ نکھرے ہوئے پاپ کارن جنم رہا تھا۔ وہ جو آنکھوں سے کھویا تھا وہ وہیں کھویا تھا۔)

”میں کل پارلیمنٹ جاؤں گا۔ باریسن نیشنل اور ہمارے چیئر مین کے ساتھ، ہم سب کل وزیر اعظم آذررٹمن کے ساتھ بیٹھیں گے اور کمیونسٹ تنظیم کے ساتھ معاہدے کا ڈرافٹ تیار کریں گے۔“ مائیک اس کے چہرے کے آگے لہرا رہے تھے اور کیمروں کے فلیش جل بجھ رہے تھے۔ وہ دائیں سے بائیں رپورٹرز کے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

(جو کھویا وہ وہیں رہ گیا۔ پاپ کارن اس نے جیب میں ڈال دیے اور اب وہ اوپر چڑھ رہا تھا... اوپر ایک لمبا سفر پڑا تھا جو اسے طے

کرتا تھا....)

”میں بھولوں گا نہیں یہ سب.... وزیر اعظم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وان فاتح کبھی نہیں بھولے گا جو اس کی بیٹی کے ساتھ ہوا.... لیکن اس وقت اگر ہم اکٹھے نہ ہوئے تو ہمارے فوجی مرتے رہیں گے۔ میں نے اپنا بچہ کھویا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید کوئی اپنا بچہ کھوئے۔“

(وہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ جھاڑیاں پتھر گھاس۔ وہ برشے عبور کر رہا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔)

”میں کسی کے خلاف کوئی کیس نہیں کرنے جا رہا۔ اس وقت میرا ملک کسی لڑائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے... آریانہ کے معاملے کو... اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔ میں اس وقت صرف امن و امان کا سوچ رہا ہوں۔ آپ کے آنے کا شکریہ۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کے ذرا سالہرایا پھیکا سا مسکرایا اور وہ دونوں میاں بیوی پلٹ گئے... دروازہ کھولا اور اندر چلے گئے جبکہ ان کے پیچھے کیمرے کے فلش دھڑا دھڑ جلتے بجھتے رہے... بالآخر دروازہ بند ہو گیا...

وہ ابھی تک چٹان کے اوپر کھڑا تھا... جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ زخمی سا مسکراتے ہوئے۔ سفید شرٹ بار بار ہوا سے پھڑپھڑاتی اور اڑتی۔ وہ پاپ کارن کے ٹکڑے اس نے کسی تبرک کی طرح اپنے پاس سنبھال رکھے تھے۔ دودانے اس کے والٹ میں ہوتے تھے۔ گزرتے ماہ و سال نے ان کو سنکھا دیا تھا مگر وہ موجود تھے۔

دور ایک ملے نوجوان کسی بھورے بالوں والی فائرلڑکی کے ساتھ ساحل پہ چلتا آرہا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مگن تھے۔ یکا یک لڑکے کی نظر چٹان پہ کھڑے فاتح پہ پڑی تو اس کا منہ کھل گیا

”یہ وہ ان فاتح ہے۔“ بے یقینی سے بولا تو لڑکی نے ماتھے پہ ہاتھ کاچھبانا کے اس جانب دیکھا پھر ناک سکوڑی۔

”تم لوگ اس آدمی کے لئے اتنے پاگل کیوں ہو؟ کیا اس لئے کہ وہ وحشیہ اور خوبصورت ہے؟“

نوجوان نے برا منہ بنا کے اسے دیکھا۔ ”وہ ایک اچھا اور ایماندار سیاستدان ہے۔“

”ہمارے ملک میں اس طرح کے بہت سے سیاستدان ہوتے ہیں جو اتنے ہی نیچرل اور ایماندار ہوتے ہیں۔ اس آدمی میں ایسا کیا ہے

جو تم لوگ اس سے اتنی محبت کرتے ہو؟ میں تمہیں جج نہیں کر رہی صرف پوچھ رہی ہوں۔“

”پہلے اتنی محبت نہیں کرتے تھے۔ یہ اچھا لگتا تھا بس۔ لیکن پھر...“ وہ بے تاب بی سے دور کھڑے تنہا آدمی کو دیکھ کے بتانے لگا۔ ”پھر اس

کی بیٹی کھو گئی۔ کچھ کہتے ہیں وہ صرف کھوئی ہے۔ کچھ کہتے ہیں شاید وہ مر گئی ہو لیکن لاش وغیرہ نہ ملی ہو۔ مگر سارا ملک جانتا تھا کہ یہ صوفیہ رٹمن

اور ان کے والد نے کروایا ہے۔ اس وقت ملک میں ویسے ہی انتشار پھیلا تھا۔ اگر وہ ان فاتح چاہتا تو حکومت گرانے کے لئے سڑکوں پہ آتا،

لوگوں کو اکٹھا کرتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ dividing force نہیں بنا۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ خود کو ’مظلوم‘ بنا کے نہیں پیش

کیا۔ وہ سروائیور بن کے سامنے آیا۔ اس نے بیٹی کے نام پہ ووٹ نہیں مانگے۔ سیاستدان اپنے خاندان کی اموات یا حادثوں کو کیش کرواتے

ہیں ساری دنیا میں، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے ملک کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر کمیونسٹ پارٹی سے مذاکرات ہو گئے اور ملایشیاء میں امن

ہو گیا۔ اس وقت سے لوگ اس کی دل سے عزت کرنے لگے ہیں۔“

”تو مذاکرات کے بعد اس نے کیس کو فالو کیوں نہیں کیا؟“

”ایسا نہیں ہوتا ہیلن۔ جب آپ ایک دفعہ وقار کا مظاہرہ کرتے ہو تو پھر قہو کے کو نہیں چاہتے۔ جب معاملہ جانے دیا تو جانے دیا۔

بہر حال اسی دن کے بعد وہ مزید مقبول ہوتا گیا۔ ”پھر موبائل نکال کے بے قراری سے بولا۔ ”آؤ سیلفی لیتے ہیں اس کے ساتھ۔“
لڑکی مسکرا دی اور وہ دونوں تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ لڑکی کے پاس ڈی ایس ایل آر کیمرہ تھا۔ وہ برابر فاتح کی تصاویر اتار رہی تھی۔ وہ اب پلٹ گیا تھا اور تصاویر پشت کی آرہی تھیں مگر وہ بتاتی گئی۔

”سر... السلام علیکم۔“ پر جوش سانو جوان قریب آیا اور اسے پکارا تو وہ پلٹا۔ پھر اسے دیکھ کے مسکرایا اور ہاتھ ملایا۔

”میں کریم ذوالکفلی ہوں سر!“

”اچھا... کیا کرتے ہو تم کریم؟“

”سر میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ میری دوست ہے ہیلن جو کینیڈا سے آئی ہے۔“ وہ جذبات سے گلابی پڑتا کہہ رہا تھا۔

”کیا ہم سیلفی لے سکتے ہیں۔“

”شیور۔“ اس نے سر کو خم دیا اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ وان فاتح نے ہاتھ سامنے باندھ لئے اور اسکرین میں دیکھ کے مسکرایا۔ لڑکا تصاویر اتارتا گیا۔ پھر جب اس نے کیمرہ نیچے کر لیا تو فاتح اس کی طرف کھوما۔

”تو تم پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہو۔ کس چیز میں؟“

”کیمسٹری میں سر۔“ خوشی سے بتایا۔

”کریم تمہیں معلوم ہے ہمارے ملک کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت کس چیز کی ہے؟“

نوجوان نے پہلے لڑکی کو دیکھا، پھر فاتح کو، پھر ذہن میں اس کی ساری تقاریر اور ایوارڈز دہرائے اور جلدی جلدی بتانے لگا۔

”دھاندلی کے بغیر صاف شفاف انتخابات کی۔ اور... اور کرپشن سے پاک مضبوط اداروں کی۔ اور حکمرانوں کے احتساب کی۔“

فاتح ایک دم کھل کے ہنس دیا۔

”کریم!“ محظوظ انداز میں اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس وقت تم جیسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی سیاست

میں ضرورت ہے.....!“ پھر اس کا کندھا تھپکا، اور مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں لا جواب سے.... دم بخود سے.... اس کو جاتے دیکھ رہے تھے۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ توانا اور مضبوط آدمی اب ریت پہ دور

جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

”اسی لئے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔“ لڑکی نے نوجوان کو کہتے سنا تو سر کو جنبش دی۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

ساحل پہ چند سیاحوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ دوڑ دوڑ کے اس کے پاس آرہے تھے۔ فاتح مسکرا کے تصاویر بنوانے رک گیا تھا۔

دوپہر کا سورج اب ڈھل رہا تھا۔

بوکیٹ چائینہ (چینی پہاڑی) ایک اونچی پہاڑی تھی جو سیاحوں کا مسکن تھی۔ یہاں صدیوں پہلے چینی شہزادی 'یان سوفو' کا محل ہوا کرتا تھا اور ایک کنواں بھی جو اس کے لئے سن باؤ نے کھدوایا تھا۔ شہزادی یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی تھی جسے اس کے باپ نے کنیروں اور خادموں کے ساتھ ملاکہ کے سلطان مرسل سے شادی کرنے بھیجا تھا۔ سلطان نے ان کے آتے ہی یہ پہاڑی اور اس کے محلات چینی لوگوں کے لئے مختص کر دیے تھے۔ شہزادی سلطان سے شادی کر کے ملکہ بن گئی جبکہ اس کی کنیروں اور باقی دستے نے مقامی لوگوں سے شادی کی اور یہیں آباد ہو گئے۔

وہ کنواں وانگ لی نے شہزادی کے لیے کھدوایا تھا۔ جب شہزادی سلطان سے شادی کے لیے آئی تو بادشاہ نے وانگ لی کو بطور خاص چین سے ملاکہ شہزادی کے ہمراہ روانہ کیا تھا۔ کنواں اب ایک سیاحتی مرکز تھا اور کہتے تھے 'جو اس میں ایک دفعہ سکھ اچھالتا ہے' وہ دوبارہ ملاکہ دوبارہ ضرور آتا ہے۔

تالیہ نے البتہ سکھ نہیں اچھالا تھا۔ وہ کنویں کے کنارے خاموش کھڑی تھی۔ گھٹنوں تک آتی فراک نما قمیض پہ منی کوٹ پہن رکھا تھا۔ ارد گرد سیاح گھوم پھر کے تصاویر اتار رہے تھے اور دوسری متبرکات اشیاء دیکھ رہے تھے۔

”چے تالیہ۔“ ایڈم کی آواز پہ وہ پرسکون سی پٹی۔

وہ سادہ سا ملے لڑکا سامنے کھڑا تھا۔ عام سی پینٹ شرٹ پہنے، چہرے پہ سفر کی تھکان، آنکھوں میں سنجیدگی۔ تالیہ سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹا ہی ہوگا۔ اسے اس پہ غصہ نہیں آیا۔ بس کندھے اچکا کے بولی۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”میرے پاس سکھ ہے۔ آپ کے پاس دوسرا ملکا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”تم مجھے سکھ دے دو۔ میں سرکار سے تمہیں بونس دلوا دوں گی۔“

”یعنی آپ واقعی رائل ملایینیاء پولیس کی آفیسر تاشہ ہیں۔“ اس نے شک و شبہ سے آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

”ہاں ایڈم اور وان فاتح کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مجھے اس خزانے کو بھی ڈھونڈنا ہے جس کی وجہ سے لوگ فاتح صاحب کے پیچھے پڑے ہیں۔“ وہ پراعتماد تھی۔ لہجہ بھی نرم تھا۔ ایڈم کا یقین ڈانوا ڈول ہونے لگا۔

”اور خزانہ کہاں جائے گا؟“

”سرکار کی امانت ہے تو ظاہر ہے سرکار کے پاس جائے گا۔ مگر خزانہ ڈھونڈنے پہ ہمیں انعام میں معاوضہ بھی ملے گا۔“

”تو مزید کوئی آفیسر کیوں نہیں ہے آپ کے ساتھ؟“

تالیہ کے ماتھے پہ سلوٹ پڑی۔ وہ دوقدم قریب آئی اور آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔

”اول تو مجھے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں اور دوم۔ مجھے کسی دوسرے پہ اعتبار نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ کوئی بھی آفیسر لالچ میں میری جان لے کر خزانے کے ساتھ فرار ہو سکتا ہے۔“

”اور آپ خود بھی تو یہ کام کر سکتی ہیں۔“

”اگر کر سکتی ہوتی تو اتنا بڑا کیس مجھے میرے سینئرز دیتے؟“ وہ ترکی بہ ترکی جوابات دے رہی تھی۔ ایڈم چیپ ہو گیا۔ دونوں کنویں کے

پاس آنے سامنے کھڑے تھے اور ان کے اوپر آسمان پہ سورج ڈھلتا دکھائی دے رہا تھا۔

”میں سکے دے دوں گا، مگر آپ مجھے خزانے کی جگہ پہ ساتھ لے جائیں گی۔ ہم دونوں خزانہ ایک ساتھ ڈھونڈیں گے۔ اور پھر سرکار کے

حوالے کر دیں گے۔“ وہ سوچ کے بولا۔ ساتھ تھوک بھی نکالا۔ اندر کہیں وہ اس لڑکی کے رعب میں بھی تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے میں خود سب کچھ کر لوں گی۔ بس تم مجھے سکے دو۔“

”چے تالیہ... اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ پہ اعتبار کروں تو آپ کو بھی مجھ پہ اعتبار کرنا ہو گا۔“

”مجھے تم پہ اعتبار ہے ایڈم!“ تالیہ نے لہجہ نرم کیا۔ اسے احتیاط سے کام لینا تھا۔

”مجھے کیسے معلوم کہ آپ سکے لے کر فرار نہیں ہو جائیں گی؟“

”میں کیا کروں جو تم میرا اعتبار کرو؟“

”آپ چابی کا دوسرا حصہ مجھے دے دیں۔“

تالیہ کا تو مانوس رہی گھوم گیا ”کیا مطلب؟ کیوں دے دوں؟ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“

”میں کچھ دیر ان دونوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ دیکھ لوں کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے پہ اعتبار ہے یا نہیں۔“

”اور تم جو چابی لے کر بھاگ جاؤ؟“

”چے تالیہ میں سچا انسان ہوں۔ دھوکہ نہیں دوں گا آپ کو۔ لیکن اگر آپ مجھے چابی نہیں دے سکتیں تو میں کیسے یقین کروں کہ خزانے کا

انعام مجھے دیں گی؟“

اس بات پہ وہ چیپ ہو گئی۔

”میں ابھی اس سکے کے ساتھ تھانے جا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھے چابی کا دوسرا حصہ تھما دیں تو میں کسی اور کے پاس نہیں جاؤں گا۔

آپ کی اگلی کال کا انتظار کروں گا۔ ہم اکٹھے خزانہ ڈھونڈنے جائیں گے۔“

”اگر تم کسی تھانے گئے تو میرا پراجیکٹ فیل ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ انوالوڈ ہو جائیں گے۔ اوپر والے مجھ سے خفا ہوں گے۔ جاب

کے بھی کچھ پروٹوکولز ہوتے ہیں ایڈم۔“ وہ چڑ گئی۔ کیا چیز تھایہ لڑکا؟ اسے گھمائے جا رہا تھا۔

”میں کسی کنویں بتاؤں گا کہ چابی آپ نے مجھے دے دی تھی۔ مگر میرا اعتبار کمانے کے لیے آپ کو یہ کرنا ہو گا ورنہ سکے میں نہیں دوں گا۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھ گئی۔ وہ سکے چرانہیں سکتی تھی۔ زبردستی چھین بھی نہیں سکتی تھی۔ ایڈم کو وہ سکے اپنی رضامندی کے ساتھ تالیہ کو دینا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ ایڈم کو نہیں معلوم خزانہ فاتح کے گھر میں ہے۔ اور اس کا خواب... اس کے مطابق وہ دونوں اکٹھے خزانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ یعنی اسے اب اپنے خواب کے آگے ہتھیار ڈالنے ہوں گے۔ اسے ایڈم کے ساتھ خزانہ شیئر کرنا ہوگا۔

”ٹھیک ہے۔ میں خزانے کی جگہ پہنچ کے تمہیں بلا لوں گی۔ تب تک تم اس چابی کو رکھ سکتے ہو۔“ اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سنہری زنجیر میں پروئی ڈلی نکال کے اس کی طرف بڑھائی۔ ”لیکن یاد رکھنا اگر تم اس کو لے کر بھاگے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی تم یاد رکھو گے۔“

”میں دھوکے باز نہیں ہوں۔ امانت لوں دوں گا۔“ اس نے زنجیر تھام لی۔ تالیہ کا دل ڈوب کے ابھر اگرا سے رسک لینا تھا۔

”مگر یاد رکھنا۔ تم دونوں حصوں کو آپس میں نہیں جوڑو گے۔ یہ کام میں خود کروں گی۔ سنا تم نے ایڈم؟ تم چابی کو نہیں جوڑو گے۔“ تنبیہ کرتے ہوئے اس نے بریسلٹ چھوڑ دیا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں میں اسے نہیں جوڑوں گا۔“ اس نے احتیاط سے اسے اپنی جیب میں ڈال دیا۔

”تم مجھے جھوٹا کہتے ہو نا ایڈم۔ چلو آج میں تمہاری سچی زبان پہ بھروسہ کر کے دیکھتی ہوں۔ رات کو میں تمہیں جہاں بلاؤں، وہیں آ جانا۔“

ایڈم نے سر کو خم دیا۔ وہ آگے بڑھنے لگی تو وہ بول اٹھا۔

”آپ یاں سوفو کے کنویں میں کوئی سکے نہیں اچھا لیس گی؟ کہتے ہیں اگر دوبارہ ملا کہ آنا ہے تو سکے اچھا لانا ہوگا۔“

وہ رکے بغیر بے گانگی سے بولی۔ ”میں دوبارہ ملا کہ آنا ہی نہیں چاہتی۔ یہ کیس ختم ہو تو میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گی۔ دور کسی جزیرے پہ گھر بناؤں گی۔ بس۔“ اور اس کے قریب سے گزر کے آگے بڑھ گئی۔

کار میں واپس بیٹھتے ہی اس نے موبائل نکالا اور اسکرین پہ چند مین دبائے۔

ایڈم کی جیب میں جو ننھا سا جی پی ایس ٹریسر اس نے ڈالا تھا وہ آن ہو گیا تھا۔ وہ جہاں بھی جائے گا، تالیہ کو معلوم ہوتا رہے گا۔ وہ کسی تھانے یا کسی مشتبہ ایڈریس پہ جائے گا تو وہ جان جائے گی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جو چابی اتنے برس بعد بھی گھوم پھر کے اس کے پاس آگئی تھی، ایڈم اس کو اس سے نہیں چھین سکتا تھا۔

سوچوں میں گم اس نے کار اشارت کی۔

اس کا بیک پیک فرنٹ سیٹ پہ خاموش رکھا تھا۔ اندر رکھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ تالیہ نے رکھی ہی نہیں تھی۔

☆☆=====☆☆

شام ڈھل گئی اور ملا کہ پہ رات اتر آئی۔

سن باؤ کے گھر والی گلی میں رات کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ بتیاں جگمگانے لگیں اور گاہکوں کا رش ریستورانوں کے برآمدوں میں بڑھتا

گیا۔ ایسے میں سڑک کنارے ایک کینے کے باہر تالیہ مراد اخبار چرے کے سامنے پھیلائے بیٹھی تھی۔ بیک بیک ساتھ رکھا تھا اور بار بار اخبار کا کونہ موڑ کے سن باؤ کے گھر کو دیکھتی تھی۔

گھر کا دروازہ بند تھا اور باہر فاتح کی کار کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی واپس آیا تھا اور تالیہ کو امید تھی کہ اب وہ کوالا پور جانے کے لئے نکل جائے گا۔ صبح پار لیمان کا اجلاس تھا اور فاتح کو لازمی وہاں پہنچنا ہوگا۔

بالآخر دروازہ کھلا اور وان فاتح سفری بیگ سمیت باہر آتا دکھائی دیا۔ اسی سفید شرٹ کے آستین کہنیوں تک چڑھائے وہ عجلت میں ننگ رہا تھا۔ پھر اس کی کارزن سے تالیہ کے ساتھ سے گزر گئی تو اس نے سکون کی سانس خارج کی۔

اب اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنا تھا جب گلی میں رش ختم ہونے لگے... اور وہ اندر جاسکے۔ آج واردات کی رات تھی۔ راستہ صاف تھا۔ اس نے اخبار نیچے کیا اور ویٹر کو آرڈر لکھوانے لگی۔ ہاٹ چاکلیٹ۔

وان فاتح ڈرائیو کرتے ہوئے چند گلیاں آگے آیا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھا کے دیکھا۔ ایڈم کا نمبر جل بجھ رہا تھا۔ جانے کس وقت ایڈم نے اپنا نمبر اس کے فون میں فیڈ کیا تھا۔ اب وہ ملازم نہیں رہا تھا تو یقیناً گلی نوکری کی بات کرنا چاہتا ہوگا۔ اس سے نہیں ہوتے تھے یہ کام۔ بے زاری سے اس نے فون پرے ڈال دیا۔

وہ دوبارہ بجنے لگا۔ اب کے اس نے برہمی سے موبائل اٹھایا تو دیکھا اس کا پیغام آیا پڑا تھا۔ فاتح نے کار کی رفتار آہستہ کی اور پیغام کھولا۔

”سر! میں ملا کہ میں ہوں۔ آپ کے گھر کے قریب۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ چے تالیہ کے بارے میں۔ پلیز مجھ سے مل لیں۔“
فاتح کی آنکھیں پر سوچ انداز میں چھوٹی ہوئیں۔ کال دوبارہ آنے لگی تو اس نے فون اٹھالیا۔
”ہاں ایڈم.... بولو۔“

”سر.... میں جو کنکرا سٹریٹ پہ ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ وہ بے قراری سے بولا۔
”ایڈم مجھے لمبا سفر کرنا ہے تم....“

”سر آپ مجھے اتنا تو جانتے ہیں نا کہ اس بات پہ یقین کر سکیں کہ میں آپ کو کسی بے کار کام کے لئے نہیں روکوں گا۔“ وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ فاتح نے گھڑی دیکھی۔

”میں جو کنکرا سٹریٹ کے کارنر تک آ رہا ہوں۔ میرے پہنچنے تک اگر تم پہنچ جاؤ تو ٹھیک ورنہ میں آگے نکل جاؤں گا۔“
”میں ابھی آیا۔“ شاید وہ فوراً بھاگ پڑا تھا۔ فاتح نے رفتار آہستہ کی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

دس بجنے والے تھے....

واپس سن باؤ کے گھر والی گلی میں آؤ تو تالیہ کا ہاٹ چاکلیٹ کا گلاس ان چھوڑا رکھا تھا اور چوکنی نظریں سرخ گھر کے دروازے پہ جمی تھیں...

پھر اس نے گھڑی دیکھی اور اٹھ گھڑی ہوئی....

چوک پہ فاتح نے کار ایک طرف روکی، پھر اے سی فل کھول دیا اور گھڑی دیکھی۔ وہ چند منٹ ایڈم کی بات سننے رک سکتا تھا۔ خیر ہے۔ مگر دو منٹ بھی نہیں گزرے جب فرنٹ ڈور پہ دستک ہوئی پھر ایڈم تیزی سے اندر بیٹھا۔

”سر، میں جانتا ہوں آپ سوچ رہے ہوں گے کہ....“

”پہلے سانس لو ایڈم۔“ اس نے آرام سے کہا تو ایڈم رکا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ خود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ پھر وقت ضائع کیے

بغیر وہ بولنے لگا۔ ”سر... کیا آپ اس کو پہچانتے ہیں؟“

ایڈم نے جیب سے دونوں چیزیں نکال کے اس کے سامنے رکھیں۔ فاتح نے چونک کے دیکھا۔ ایک عصرہ کا بریسلٹ تھا اور دوسرا سکہ۔ اس نے بھنویں اچنبھے سے اکٹھی کیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”سر، یہ مجھے چے تالیہ نے دیا ہے۔“

فاتح کے ماتھے پہ ہل پڑے اس نے بریسلٹ اٹھایا اور الٹا پلٹا کے دیکھا۔ ”یہ عصرہ کا ہے۔“

”سر.... یہ اور سکہ ملا کر... چابی بن جاتا ہے۔ یہ چابی....“ وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ فاتح نے سکہ اٹھایا اور اس کو میز ہا کیا۔ سوراخ نظر آیا

تو اس نے ڈی کو انڈر ڈال دیا۔ ہلکے سے کلک کی آواز آئی اور چابی مکمل ہو گئی۔ ایک لمحے کو وہ تیز چمکی اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی۔

وہ لمحہ امر ہو گیا....

”نہیں سر.... یہ جوڑنی نہیں تھی۔“ ایڈم فکر مند ہوا۔ ”چے تالیہ نے منع کیا تھا؟“

”مجھے مت بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ، یہ اس لڑکی کے پاس کیسے آیا؟“

وہ بھنویں بھنچے اس چابی کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ اس پہ ہند سے سے ابھر رہے تھے۔ 1437

”آپ چے تالیہ کو تاشہ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ ان کا اصل نام ہے؟ کیا وہ کوئی پولیس آفیسر ہیں؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ چونکا۔ ”وہ ایک زمانے میں تھیٹر کی کوئی ایکسٹرا ایکٹرس ہوا کرتی تھی اور اس نام کا ایک کردار کرتی نظر آئی تھی۔“

ایڈم کا منہ کھل گیا۔

”تو وہ.... واقعی.... پولیس آفیسر نہیں ہیں؟“

فاتح نے بھنویں بھنچے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”مجھے شروع سے بتاؤ یہ سب کیا چل رہا ہے۔“

کارٹرک کنارے کھڑی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف ترچھے ہوئے بیٹھے تھے۔

ایڈم نے تھوک نگل کے خشک گلاتر کیا اور بولنا شروع کیا۔

جج۔ سب کچھ۔

☆☆=====☆☆

گلی میں رش اب ماند پڑ گیا تھا۔ دکانیں ابھی تک کھلی تھیں مگر گہا گہی کم ہو چکی تھی۔ تالیہ اپنا ہاٹ چاکلیٹ ان چھوا چھوڑ کے اب سن باؤ کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازے پہ تالہ تھا۔ اس نے اس میں لاک پک گھسائی اور چند لمحوں میں تالہ کھل گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک پہ کوئی بھی اس طرف متوجہ نہ تھا اور جتنے اعتماد سے وہ دروازہ کھول رہی تھی اسے کسی نے دیکھ کے بھی گھر کی مالکن پہ محمول کیا ہوگا۔

اندر گھر سنان اور اندھیر تھا۔ اس نے ہنسل نارچ آن کی اور روشنی اطراف میں ذاتی آگے بڑھنے لگی۔ کنواں کونے میں خاموش پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اس تک آئی اور اس کے دہانے سینے کے بل لیٹی اور کنویں کی دیوار کو اندر سے چھوا۔ وہاں دیوار میں کھدے ننھے ننھے سے زینے تھے جن کی مدد سے نیچے اتر جا سکتا تھا۔ اس نے عصرہ کی ویب سائٹ پہ پڑھا تھا کہ سن باؤ کے کنویں میں قدیم لاک سسٹم تھا ان زینوں کی مدد سے جب اس کو کھولا گیا تو اندر چند پرانے سکے اور سن باؤ کے استعمال کی چیزیں ملیں جن سے معلوم ہوا کہ یہ گھر واقعی سن باؤ کا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ان ننھے ننھے سوراخوں میں کچھ اور بھی ہوگا۔

سینے کے بل لیٹی وہ کنویں کے اندر جھکی۔ چوٹی لیٹی ہو کے نیچے لٹکے لگی۔ وہ تین سوراخ تھے۔ اتنے بڑے جتنی ایک اینٹ ہوتی ہے۔ گویا اینٹ کی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی۔ اس نے پہلے سوراخ میں ہاتھ ڈالا۔ وہ خالی تھا۔

وہ اٹھی اور کنویں کی منڈیر پکڑ کے اندر اتری۔ احتیاط سے پہلے سوراخ میں ہاتھ رکھے اب وہ کنویں کے اندر لگی نظر آرہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے دوسرا سوراخ ٹٹولا۔ وہ بھی اندر سے خالی تھا۔

اسے پسینہ آنے لگا۔ پیر کو دیوار کے ایک ابھرے پتھر پہ جمایا اور مزید نیچے اتری۔

اب تیسرا سوراخ اس کے سامنے تھا۔ تالیہ نے ہڑکتے دل سے اس میں ہاتھ ڈالا۔

یہ سوراخ زیادہ اندر تک گہرا تھا۔ اس پاس بے تحاشا کائی جمع تھی۔ اندر کوئی پتھر سا پڑا تھا جو مٹی میں جما ہوا تھا۔ وہ زور سے اسے کھینچنے لگی۔ مگر وہ نکل کے نہیں دے رہا تھا۔

چند فٹ نیچے کنویں کا پانی جمع تھا۔ عجیب جس زدہ ماحول تھا۔ اسے پسینے آنے لگے۔ پھر پیر سے بندھا خنجر نکالا اور اندر سوراخ میں مارنے لگی۔ یہاں تک کہ پتھر علیحدہ ہو گیا۔ اس نے پتھر باہر نکالا اور دیوار کی اینٹوں کو پکڑے واپس اوپر چڑھ آئی۔

باہر آ کے اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔ صحن اندھیرے میں ڈوبا تھا سوائے نارچ کی روشنی کے۔ تالیہ نے روشنی پتھر پہ مرکوز کی جس پہ کائی جمع تھی اور اسے صاف کرنے لگی۔

بدقت پتھر کی سطح واضح ہوئی۔ اس پر قدیم جاوی رسم الخط میں ایک عبارت کھدی تھی۔ کائی نے عبارت میں سبز رنگ بھر دیا تھا۔
 ”نکن ملا یو پلانگ دی دنیا۔“ (مے قوم کبھی بھی دنیا سے غائب نہیں ہوگی۔)
 یہ ہانگ تو اکا مشہور قول تھا جس کو یاد کرتے کرتے مے بچے بڑے ہوتے تھے۔
 ”نکن ملا یو پلانگ دی دنیا۔“ اس نے سوچتے ہوئے الفاظ دہرائے۔ پھر آنکھیں بند کیں۔ یہ کوئی نشانی تھی۔
 کوئی پیل۔

کیا مطلب ہو اس کا؟

مے نسل کبھی بھی دنیا کے چہرے سے غائب نہیں ہوگی۔

مے نسل کبھی بھی غائب نہیں ہوگی۔

مے نسل کبھی بھی مٹے گی نہیں.... غائب نہیں ہوگی....

اس نے آنکھیں کھولیں۔ الفاظ دوبارہ دیکھے مگر اب وہ ان کو پڑھ نہیں رہی تھی۔ وہ اس انداز کو دیکھ رہی تھی جس میں وہ لکھے تھے۔ تیر کی صورت۔ آخر میں چھوٹے ہو جاتے۔ جس پوزیشن میں پتھر پڑا تھا اس لحاظ سے وہ نیچے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

تالیہ مسکرائی اور نیچے کنویں میں جھانکا جہاں پانی کسی بھرے ہوئے گول تھال کی صورت نظر آ رہا تھا۔

وہ پتھر کنویں کے اوپر لائی اور اسے گرا دیا۔ پتھر نے پانی میں ڈبکی کھائی اور لمبے بھر کو سکوت چھا گیا۔

وہ سر جھکائے دیکھتی رہی۔ فلیش لائٹ پانی پہ تان رکھی تھی۔

دھیرے دھیرے پانی سمٹتا گیا۔ گھٹتا گیا۔ جیسے سوکھ رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی سطح نیچے ہوتی گئی۔ کائی زدہ دیواریں برہنہ ہونے لگیں۔

وہ نیچے جاتا گیا اور بالآخر.... وہ ”غائب“ ہو گیا۔

غائب.... یہی نشانی تھی۔

وہ کنویں میں جھانک رہی تھی کہ صحن کے دوسرے کونے میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ وہ چونک کے گھومی۔ مخالف طرف.... مجسمے کے ساتھ...

زمین میں کچھ ابھرا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف آئی۔

وہ لکڑی کا ایک ٹریپ ڈور تھا۔ جیسے فرش میں لگا ڈھکن ہو۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔ مگر اب وہ کائی زدہ ڈھکن

یوں نظر آ رہا تھا گویا صدیوں سے یہیں موجود ہو۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ خزانہ کنویں کے نیچے نہیں تھا۔ خزانہ اس کے

نیچے تھا۔

اس نے ڈھکن اٹھایا۔ وہ آرام سے اٹھ گیا۔ تالیہ نے روشنی نیچے پھینکی۔ وہاں زینے تھے جو نیچے گم ہو رہے تھے۔ آخر میں مدہم سا ایک

دروازہ تھا۔ اسے دروازے کی چابی چاہیے تھی۔ آف ایڈم۔

”ایڈم۔ کہاں ہو تم؟“ اس نے فون ملایا اور اس کی آواز سنتے ہی بولی۔

”میں جو نکرا سٹریٹ پہ ہوں۔ کیا آپ کو خزانہ مل گیا۔“

”ہاں۔ تم سن باؤ کے گھر آؤ۔“

”آپ سن باؤ کے گھر ہیں؟ وان فاتح کے گھر؟“

”ہاں۔ ڈونٹ وری وہ چلے گئے ہیں۔ تم جلدی آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ اور سنو۔“ آخر میں قدرے غرائی۔ ”اگر تم نے کسی بھی قسم کی

چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گی ایڈم۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولا تھا۔

تالیہ نے بیک بیک کندھوں پہ ڈالا اور زینے اترنے لگی۔ مارچ کی روشنی اپنے آگے پھینکتی جا رہی تھی۔ سنہری چوٹی بنائے، منی کوٹ اور لمبی قمیض پہنے لڑکی بہت پر جوش لگ رہی تھی۔

سیڑھیاں ایک دروازے پہ جا کے ختم ہو گئیں۔

وہ لکڑی کا قدیم دروازہ تھا۔ اس پہ عجیب و غریب سے ہند سے لکھے تھے... یہی تھا خزانے کا راستہ۔

یہی تھا اس کا وہ آخری موقعہ... وہ آخری واردات جس کی وہ کب سے منتظر تھی۔

جزیرے کے اوپر وہ اونچا محل... وہ پرسکون زندگی...

ان سب خوابوں کی تکمیل کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی اس نے ایڈم کو چابی دے کر خطرہ مول لیا ہے، مگر اس کے خواب سچ بولتے

تھے ہمیشہ۔ ان کے مطابق ایڈم اور وہ اس کھوج میں اکٹھے تھے۔ وہ اس کو بھی حصہ دے دے گی۔ دس فیصد۔ بس یہی بہت ہے۔

اب وہ دروازے کے ساتھ کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ موبائل اسکرین کے مطابق ایڈم کا ٹریسر جو نکرا سٹریٹ سے چل پڑا تھا اور

اب وہ قریب ہی تھا۔ ایڈم نے دھوکہ نہیں دیا۔ گڈ۔ وہ پر جوش سی دروازے کی سطح پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

اندر کیا ہوگا؟ ضروری نہیں ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر ہوں۔ انہوں۔ ان سے بھی کچھ زیادہ بیش قیمت ہوگا اندر۔ جیسے نوادرات۔

قدیم آرٹ۔ سکے۔ برتن۔ زیورات۔ مجسمے۔ کروڑوں کے بکتے تھے یہ سب۔ اگر یہ خزانہ سن باؤ کے دور کا تھا یعنی پندرہویں صدی کے وسط

کا، تو قریباً چھ سو سال قدیم تھا۔ بلیک مارکیٹ میں وہ باری باری سب کو فروخت کر دے گی، اور تمام رقم آف شور منتقل کر کے وہ یہاں سے

چلی جائے گی۔ ڈن۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی اور ایڈم کی آواز آئی۔ ”چے تالیہ؟“

”نیچے آ جاؤ ایڈم۔“ اس نے دروازے پہ لکھے ہند سے پڑھتے ہوئے پکارا۔

”یہ آپ نے کھوا ہے؟“ ایڈم نے سیڑھیوں کے اوپر سے جھانکا تو اس نے گردن اٹھائی۔

”باتوں کا وقت نہیں ہے۔ مجھے چابی دو۔“ اس کا سرخ سپید چہرہ جوش سے تمنہار ہا تھا۔

اوپر کھڑے ایڈم کے چہرے پہ بیجان سا ابھرا۔

”چابی جوڑ دی گئی ہے۔ دونوں کلزے جڑ گئے ہیں۔“

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھوں میں غصہ در آیا۔ ”واٹ؟ تم.... اسٹوپڈ.... میں نے منع کیا تھا تمہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس کو جوڑو۔“

”اس کی نہیں.... میری ہمت ہوئی ہے۔“ ایڈم کے پیچھے سے کوئی نکل کے سامنے آیا۔

تالیہ بہت مراد پتھر ہو گئی۔

وہ فاتح تھا۔

اس کا سانس رک گیا۔ بے اختیار وہ دروازے کی طرف کئی۔ مگر اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا زینے اترنے لگا۔

تالیہ کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ اس نے بے یقینی سے فاتح کے پیچھے آتے ایڈم کو دیکھا جس کے چہرے پہ افسوس تھا۔

”آپ نے مجھ سے سچ نہیں بولا تو میں نے باس سے سچ بول دیا۔“

وان فاتح اس کے عین سامنے آن رکا۔ سلگتی، سخت نظریں اس پہ جمی تھیں۔ تالیہ کی کمر دروازے سے لگی تھی۔ بدقت جھوک نکلا۔ ”توانکو!“

”تم.... میرے گھر میں.... کیا کر رہی ہو؟“

”میں.... میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور....“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر رنگت اڑی ہوئی تھی۔ یہ سب بہت غیر متوقع تھا۔

”تم کوئی پولیس آفیسر نہیں ہو۔ میں بتاتا ہوں تم کیا ہو۔“ وہ اس کے قریب رکا اور چبا چبا کے بولا۔ ”لا لچی، جھوٹی اور چور! یہ ہو تم!“

الفاظ تھے کہ کیا۔ تالیہ نے لب بھنج لیے۔ چند گہرے سانس لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے سب خاموش رہے پھر اس لڑکی کی پیشانی پہ غصے

سے سلوٹیں پڑنے لگیں۔ افسوس اور طیش سے اس نے فاتح کے عقب میں زینے پہ کھڑے ایڈم کو دیکھا۔

”وہ عثمان.... وہ اس دن تمہیں ٹریپ کر رہا تھا، مگر میں نے تمہیں بچایا، میں نے ہر موقع پہ تمہیں بچایا، اور یہ کیا تم نے میرے ساتھ۔“

چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔“ انگلی اٹھا کے تنبیہ کی۔ (ایڈم کا دل جانے کیوں دکھا۔) پھر فاتح کو دیکھا۔ ”میں جو بھی ہوں اس سے آپ کا

کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چابی میری ہے۔ میرے باپا نے بنائی ہے۔ یہ خزانہ بھی میرا ہے۔“

”یہ گھر میرا ہے۔ تمہیں کس نے اجازت دی تھی تم یہاں کھدائی کرو؟“ وہ غرایا۔ اتنا زور سے کہ وہ ہم کے ذرا پیچھے ہوئی، پھر دوبارہ ہمت

کر کے گردن کڑائی۔

”گھر آپ کا ہے۔ نیچے دبا خزانہ نہیں۔ اور میں نے یہاں کوئی کھدائی نہیں کی۔ یہ خزانے کا راستہ ہے۔“

”اول تو اس گھر کے نیچے کوئی خزانہ نہیں ہے اور اگر ہے بھی سہی تو وہ سرکار کا ہے۔ وہ کسی میوزیم میں جائے گا۔“
 تالیہ نے تڑپ کے اسے دیکھا۔ ”وہ میرا ہے۔ اس پہ میرا حق ہے۔ خیر یہ فیصلہ ہم کورٹ میں کریں گے۔ مجھے میری چابی دیں۔ میں جارہی ہوں یہاں سے۔“ دو ٹوک انداز میں ہتھیلی پھیلانی۔
 ”اور تمہیں لگتا ہے میں تمہیں ایسے جانے دوں گا؟ ایڈم!“ اس نے نظریں تالیہ پہ مرکوز رکھے اسے پکارا۔
 ”جی سر۔“

”پولیس کو کال کرو۔ ابھی۔ بتاؤ کہ گھر میں چور آگیا ہے۔“
 ”جی ہاں۔“ اس نے فون نکالا تو وہ تڑپ کے بولی۔
 ”میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ یہ میرا حق ہے۔ یہ میرا ہے۔“ اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ وہ دروازے کے ساتھ کھڑی تھی اور فاتح اس کے عین سامنے اسے غصے سے گھور رہا تھا۔
 ”ایڈم‘ میں کہہ رہا ہوں کال کرو پولیس کو۔“

”ایک منٹ۔“ وہ جلدی سے بولی۔ دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”پولیس کو مت بلاؤ۔ ہم تینوں خزانہ بانٹ سکتے ہیں آپس میں۔“
 فاتح نے گویا بے بسی سے دونوں ابرو اٹھائے۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم کیا چیز ہو؟“
 ”آپ کو انیکشن کے لیے پیسے چاہیے ہیں؟ ہے نا۔“ وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔ ”آپ گھر نہ بچیں۔ خزانے میں سے اپنا حصہ لے لیں۔ بیس فیصد اور ایڈم بھی....“ ایک سلگتی نظر اس پہ ڈالی۔ ”دس فیصد رکھ سکتا ہے باقی میرا۔“
 ”صرف دس فیصد۔“ ایڈم نے برا سامنے بنایا تو وان فاتح نے گردن گھما کے غصے سے اسے دیکھا۔
 ”کوئی خزانہ نہیں بانٹ رہا یہاں۔ اول تو یہاں کوئی خزانہ ہے نہیں اور اگر ہوا بھی تو یہ ملک کی امانت ہے۔ تم پولیس کو بلاؤ۔“ پھر واپس گھوما تو وہ کھڑی بے بسی سے لب کاٹ رہی تھی۔

”تم آج جیل جارہی ہو۔ ایک لمبے عرصے کے لئے۔ میں نے فائل والے واقعے کو جانے دیا مگر تم میرے گھر میں آگئیں؟“
 ایڈم موبائل پہ کہہ رہا تھا۔ ”سن باؤ کا گھر... وان فاتح کا گھر۔ وہاں پولیس کی ضرورت ہے۔ ایمر جنسی ہے۔“ پھر تالیہ کو دیکھا۔ ”ایک چور گھس آیا ہے۔ جی‘ جلدی بھیجیں کسی کو۔“ دوسری طرف سے یقین دہانی کروادی گئی تو اس نے فون ہٹالیا۔ تالیہ نے صرف تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔ پھر فاتح کو دیکھا۔

”میں نے کوئی فائل نہیں چرائی آپ کی۔ اور کہاں ہے وہ فائل؟ ابھی کیا الزام لگائیں گے آپ پولیس کے سامنے مجھ پہ؟“
 ”میری بیوی کا بریسلٹ۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سنہری چابی نکال کے لہرائی۔
 ”کیا ثبوت ہے کہ میں نے یہ چرایا ہے؟ یہ تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں پولیس کے سامنے انکار کر دوں گی۔“

”میری بات کے آگے تمہاری بات معتبر لگے گی کیا؟“ وہ بھنویں اکٹھی کیے برہمی سے کہہ رہا تھا۔

تالیہ نے سلگ کے ایڈم کو دیکھا۔ ”چھوڑو گی نہیں میں تمہیں۔“

ایڈم نے اتنی ہی خفگی سے منہ بسورا۔ ”آپ نے اگر مجھ سے سچ بولا ہوتا تو....“

”تو تب بھی تم یہی کرتے“ ڈفر۔ اس لئے اب چپ رہو۔“ جھڑک کے بولی تو وہ چپ ہو گیا۔

”تمہیں ایڈم کی نہیں اس وقت اپنی فکر کرنی چاہیے کیونکہ تم لمبے عرصے کے لیے جیل جا رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”آپ مجھے جیل بھیج دیں مگر میں ایک دفعہ خزانہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے دروازہ

کھولنے دیں۔“

”اوہ۔ تمہارے خیال میں سو کالڈ خزانہ دیکھ کے میرا ارادہ بدل جائے گا؟“ وہ تلخی سے مسکرایا۔

”کیا آپ کو خود خوف ہے کہ خزانہ دیکھ کے آپ کا ارادہ بدل جائے گا؟ آپ دروازہ کھولنے سے ڈرتے ہیں کیا؟“ وہ اپنے حواسوں پہ

قابو پا چکی تھی اور اب چیلنجنگ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ وہ لمحے بھر کو چپ ہوا۔

”مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ پولیس کے آنے تک دروازہ کھول کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا، تم مجھے لالچ دے

سکتی ہو۔“

”دیکھتے ہیں....“ وہ اسی انداز میں مسکرائی اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ یہ چیلنج.... یہ مسکراہٹ.... گویا کہہ رہی ہو پیسے سے

کوئی بھی خریدا جاسکتا ہے.... یہ انداز وان فاتح کو افسانے کے لئے کافی تھا۔ وہ قریب آیا اور دروازے کے تالے میں چابی گھسائی۔

”تم جیل جاؤ گی، سمجھ آیا۔“ ایک نظر اسے دیکھا۔

تالیہ نے تعظیم سے سر ہلا دیا۔ ”جو حکم... تو اٹکو!“

تالیہ ایک بڑی سی زنجیر پہ لگا تھا اور زنجیر نے دروازے کو جکڑا ہوا تھا۔ فاتح نے چابی گھمائی تو ایڈم پریشانی سے پکار اٹھا۔

”سر.... اس کو مت کھولیں۔ پتہ نہیں اندر کیا ہو۔“

تالیہ نے کھول کے اسے دیکھا۔ ”تم تو چپ ہی رہو۔“

”میرے پاس گن بھی ہے، بچے تالیہ۔“ اس نے شرٹ اٹھا کے ہولسٹر میں لگا پستول دکھایا۔ ”اگر آپ اس دروازے کے ذریعے فرار کا

سوچ رہی ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیں۔ فی الوقت میں وان فاتح کا باڈی مین ہی نہیں باڈی گارڈ بھی ہوں۔“

تالیہ نے برہمی سے چہرہ موڑ لیا۔ فاتح صرف مسکرایا بولا کچھ نہیں۔ وہ زنجیر اتار رہا تھا۔

”ویسے میرا نہیں خیال اندر کوئی خزانہ ہے۔ تم نے اپنا وقت اور زندگی صرف ضائع کی ہے، little thief۔“ افسوس سے کہتے ہوئے

اس نے دروازہ دھکیلا۔

آگے اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ تالیہ نے فلیش لائٹ کی روشنی پھینکی تو روشنی نظر آئی۔ پتھروں کی بنی خالی روش۔ فاتح نے ہاتھ بڑھایا۔ ”مارچ!“ بس ایک لفظی حکم اور تالیہ نے چپ چاپ مارچ اسے تھما دی۔ اس نے روشنی آگے پھینکی اور اندر داخل ہوا۔

”سر ہمیں پولیس کا انتظار کرنا چاہیے۔“ ایڈم بے بسی سے بولا مگر وہ دونوں چوکھٹ عبور کر چکے تھے۔ وہ بھی چارونا چار پیچھے آیا۔ دروازے میں سے آخری داخل ہونے والا شخص ایڈم تھا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ ہلکی سی آواز سے بند ہو گیا۔ راہداری تاریک تھی۔ کہیں ٹپ ٹپ کی آوازیں آرہی تھیں گویا پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ تینوں قطار کی صورت آگے بڑھتے گئے۔ ”پھر؟ کہاں ہے تمہارا خزانہ؟“ فاتح آنکھیں چھوٹی کیے اطراف میں دیکھتا روشنی آگے ڈال رہا تھا۔ ”ہوگا۔ آگے ہوگا۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ دل تجسس سے لبریز تھا۔ اس کے خواب جھوٹے نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک موڑ مڑ کے وہ آگے آئے تو راہداری چوڑی ہو گئی۔ دو مخالف سمتوں سے دوراہداریاں آ کے مل رہی تھیں اور دونوں میں پانی تھا۔ اتنا کہ پاؤں ڈوب جاتے۔ تالیہ کو عجیب سا احساس ہونے لگا مگر وہ رک نہیں۔ وہ چلتی رہی۔ ”پانی چل رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟“ اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ پیر پانی میں ڈوب چکے تھے اور وہ عجیب پانی تھا جو لگتا تھا دوا بہریت کر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے۔

اوپر چھت سے قطرے زور زور سے بہنے لگے۔ ٹپ ٹپ۔ پھر تڑاڑ۔ تالیہ کو پہلی دفعہ لگا کچھ غلط ہے مگر نہیں... وہ ہار نہیں مانے گی۔ خزانہ آگے ہوگا۔ کسی محفوظ جگہ پہ۔

”تو کہاں ہے تمہارا خزانہ؟“ تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ پانی سے بھری دونوں راہداریوں کے ملاپ پہ موجود تھی۔

ایک وہ ٹھہری۔ بے یقینی سے اطراف میں دیکھا۔ پھر اوپر۔ جھماکے سے کچھ یاد آیا۔ دو دریاؤں کا سنگم۔ برقی بارش۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مدھم روشنی میں دیکھنا چاہا۔ وہ تنگ سے دو دریا تھے۔ زمین گدلی تھی۔ اس کے پیر کچڑ میں اتھڑ گئے تھے۔ یہی تو اس کا خواب تھا۔ دو دریاؤں کا سنگم۔ وہ چونک گئی۔ اپنے پیروں کو دیکھا۔ وہ پانی اور مٹی سے لتھڑے ہوئے تھا۔ اس کے خواب علامتی نہیں تھے۔ وہ مستقبل کا عکس تھے۔ ہو بہو۔

”رک کیوں گئی ہو؟ چلو۔ میں تمہارے خزانے والے ڈرامے کا بھی فائل شو ڈاؤن دیکھنا چاہتا ہوں۔ آؤ۔“ وہ اسے رکتے دیکھ کے سخت سے بولا تو وہ چلنے لگی۔ مگر حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اوپر چھت اندھیر تھی گویا آسمان ہو۔ پانی ٹپ ٹپ برس رہا تھا۔ وہ تینوں بھیگتے جا رہے تھے مگر چل رہے تھے۔

دوسری راہداری.... یا دوسرا دریا.... اب سکڑتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ پتھروں سے بنی سوکھی روش نظر آنے لگی جیسی شروع میں دروازہ کھولتے ہی نظر آئی تھی۔ اس کے آگے ایک اور دروازہ تھا۔ ہو بہو پہلے جیسا دروازہ۔ مگر نیا نکور۔ لکڑی کی خوشبو تک آرہی تھی۔ پانی ٹپکنا اب بند ہو گیا تھا۔

”تمہارا خزانہ تو نہیں آیا ابھی تک۔“ طنز سے بولتے ہوئے اس نے دروازے کے قفل میں چابی ڈالی۔ تالیہ خاموش رہی۔ ایڈم البتہ بے چین سا لگتا تھا۔

”سرسر... ہمیں واپس جانا چاہیے۔ کیا پتہ آگے چپے تالیہ کے لئے فرار کا راستہ ہو ان کے گینگ کے ساتھی ان کا انتظار کر رہے ہوں۔“
 ”یہ فی الحال کہیں نہیں بھاگ سکتی۔“ تالیہ کھول کے اس نے زنجیر اتاری۔ چابی مدھم سی چمک رہی تھی۔ تالیہ کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔
 اس پہ بند سے ابھرے تھے۔ 885۔

”885؟“ وہ الجھن سے بولی۔ ایڈم چونکا۔ بند سے اب مٹ رہے تھے۔

”اس دن اس پہ کوئی اور بند سے ابھرے تھے 1437۔“

”1437؟“ تالیہ نے بے خودی کے عالم میں دہرایا۔ فاتح نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے سیڑھیاں تھیں۔ وہ تینوں چاہنے اور نہ چاہنے کے درمیان اوپر چڑھنے لگے۔ جس وقت فاتح اوپر موجود ٹریم ڈور کا دھکن ہٹا کے پرے رکھ رہا تھا، تالیہ کے ذہن میں وہی الفاظ گردش کر رہے تھے۔

چودہ سو سنتیس.... چودہ سو سنتیس.... آٹھ سو پچاسی....

ایک جھماکے سے اسے یاد آیا تھا۔

داتن!

☆☆=====☆☆

دوروز قبل:-

حالم کے گھر کے لاؤنج میں ناشتے کی خوشبو پھیلی تھی۔ پین کیک، خستہ کری پف اور دیگر اشتہا انگیز لوازمات میز پہ سجے تھے اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ تالیہ گھڑی دیکھ رہی تھی اس کو عصرہ کی پینٹنگ بنانے جانا تھا، مگر داتن نے اسے روک رکھا تھا۔

”یہ کتاب.... شکار بازوں کے متعلق ہے....“ وہ ایک قدیم کتاب دکھاتے ہوئے بتانے لگی۔ تالیہ نے توجہ دینے کی کوشش کی۔

”اس کے مطابق ان کے پاس ایک علم ہے جس سے وہ ایک ایسی چابی بنا سکتے ہیں جو خزانے کا دروازہ کھول سکتی ہے۔“

”دیکھا۔ یعنی خزانہ Exist کرنا ہے۔“ تالیہ چبک کے بولی۔

”تالیہ....“ داتن سنجیدگی سے آگے ہوئی۔ ”شکار بازوں کے مطابق وہ دنیا کے سب سے بڑے خزانے کا قفل کھول سکتے ہیں۔ جانتی ہو

انسانوں کا سب سے بڑا خزانہ کیا ہے؟“

”کیا؟“

”وقت!“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی تو تالیہ کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

”وقت؟“

”ہاں۔ شکار بازوں کے مطابق... اگر وہ وقت کے دروازے کو کھول لیں تو وہ وقت میں سفر کر سکتے ہیں۔ کسی مستقبل کے زمانے میں جا

سکتے ہیں۔ کسی ماضی کے عہد میں واپس پہنچ سکتے ہیں۔“

”داتن...“ اس نے لیانہ کو یوں دیکھا گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ”کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔“

”تم نے بھی تو کیا تھا نا۔“ داتن نے کہتے ہوئے کتاب اس کی طرف دھکیلی۔ تالیہ الجھن سے اس کو دیکھنے لگی۔

”میں نے کب؟“

”جب تم چرچ میں پہلی دفعہ مسز مار یہ کو ملی تھیں تو تمہارا لباس عجیب تھا اور تم عجیب لہجے میں بولتی تھیں۔ تمہارے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں

تھا اور تم کسی گاؤں کا ذکر کرتی تھی۔ کوئی تمہیں لینے نہیں آیا کیونکہ تمہارے ماں باپ... تمہارا گاؤں... وہ سب اس زمانے کے نہیں تھے۔

تمہارے باپا نے تمہیں ماضی کے کسی زمانے سے... اس دروازے کے پار بھیجا تھا... میں نہیں جانتی کیوں... لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ تم

اکیسویں صدی کی لڑکی نہیں ہو۔ تم کسی پرانے عہد سے آئی تھیں۔“

”ہیں؟“ اس کو واقعی داتن کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا تھا۔

”وقت کے سفر کا اصول ہے۔ جو بھی روشنی کی رفتار سے تیز چل لے وہ وقت کی قید سے دور نکل آتا ہے۔ کسی اور زمانے میں۔ اور پیچھے

اس کا زمانہ وہیں منجمد ہو جاتا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو۔“

”جس سکے کو تم ڈھونڈ رہی ہو وہ مظفر شاہ کے زمانے کا ہے یعنی قریباً چھ سو سال پہلے کا زمانہ۔ تمہاری گردن کا یہ نشان بتاتا ہے کہ تم نے

وہ دروازہ کھولا تھا۔ یہ نشان صرف دروازہ کھولنے والوں کی گردنوں پر ہوتا ہے۔ وقت کی مہر۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ دروازہ تم نے مظفر شاہ

کے زمانے میں کھولا تھا۔ پندرہویں صدی کے وسط میں۔ وہ وقت وہیں رک گیا تھا۔ تم آگے نکل آئی تھیں۔ اگر تم دوبارہ واپس جاؤ تو وہ دور

وہیں سے شروع ہو گا جہاں سے تم نکلی تھیں۔ اسی لمحے اسی دن سے۔ یہاں جتنے سال بھی گزر جائیں، پیچھے وقت آگے نہیں بڑھتا تھا۔“

”اور میں وہاں دوبارہ جاؤں گی کیسے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”کیونکہ اس چابی کے آگے کوئی خزانہ نہیں ہے۔ یہ ایک دروازے کی چابی ہے اگر تم نے اس کو کھول لیا تو آگے دو دریا ہوں گے۔ وہی

دو دریا جو تم نے خواب میں دیکھے تھے۔ ماضی اور مستقبل کے دریا۔ ایک دفعہ تم نے وہ دریا پار کر لئے تو وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔ میں

اسی لئے تمہیں روکتی ہوں اس ملعون چابی کا پیچھا کرنے سے۔ کیونکہ روانگی اور واپسی کا چکر پورا کرنے کے بعد چابی تحلیل ہو جائے گی۔ دروازہ غائب ہو جائے گا۔ تالیہ تم پندرہویں صدی میں واپس چلی جاؤ گی۔ اسی دن میں جب تم گیارہ سالہ بچی کے طور پہ وہاں سے غائب ہوئی تھیں۔ تم کبھی واپس نہیں آسکو گی۔“ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔ تالیہ نے بدقت اس کی باتوں کو ہضم کیا۔

”تم یہ کہہ رہی ہو کہ میں.... پندرہویں صدی کی ایک لڑکی ہوں....“

”ہاں وہ خواب یا دکر دجو اپنے باپا کے بارے میں تم نے دیکھے.... جنگل لکڑیاں... مشعلیں.... موم بتیاں.... تم کہتی تھیں نا کہ ان میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ تھا۔ قدیم زمانہ۔“

”یعنی کہ میں.... پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی ہوں جو شکار باز بھی تھا اور اس نے مجھے خزانہ لینے وقت میں آگے بھیج دیا۔ میں نے وہ دروازہ پار کر لیا اور میں سن 2000 میں آگئی۔ اور اگر اب میں واپس جاؤں تو اسی دن میں واپس جاؤں گی جب میں گیارہ سالہ لڑکی کے طور پہ دروازے کو عبور کر گئی تھی۔“

”ہاں۔ دروازے کے پار.... یہی شہر یہی ملک ہوگا۔ تمہارا گاؤں، تمہارے ماں باپ ہوں گے مگر زمانہ یہ نہیں ہوگا۔ یہ 2016 ہے۔ وہ کوئی پندرہویں صدی کا سال ہوگا۔ تم وقت میں پھنس جاؤ گی۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔“

”تم واقعی ان ساری فضولیات پہ یقین رکھتی ہو، داتن؟“

جواب میں داتن آگے ہوئی اور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یہ دنیا بہت عجیب ہے تالیہ۔ یہاں سب ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے سائنس اس کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اس لئے کہ سائنس کی عمر ابھی بہت کم ہے۔“

”کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا داتن۔ یہ صرف بے کار کی باتیں ہیں۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”ہوائی جہاز کے بننے سے پہلے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ انسان فضا میں اڑ نہیں سکتا۔ مافوق الفطرت چیزوں کا مذاق نہ اڑاؤ۔ اگر عقل ان کو سمجھنے سے قاصر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہوتی نہیں ہیں۔“

”تو تمہارا مطلب ہے کہ اگر میں نے وہ قفل کھول لیا تو میں واپس اس زمانے میں پہنچ جاؤں گی جب میں پندرہویں صدی میں کسی غریب لکڑہارے کی بیٹی تھی؟ اور میں وہاں پھنس جاؤں گی.... کیونکہ ایک چکر پورا کرنے پہ چابی تحلیل ہو جاتی ہے۔“

اس کی طنز یہ ٹون پہ داتن کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ ”میں جانتی ہوں یہ سب تمہارے لئے بہت اہم نا ہے اور تم شاید اس پہ یقین نہ کرو لیکن....“

اور تالیہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

داتن کا منہ کھل گیا۔ تالیہ ہنوز گردن پیچھے کو پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ پھر سیدھی ہوئی اور محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”کیا دیو مالائی کہانیاں پڑھتی رہتی ہو تم داتن۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا حقیقی دنیا میں۔ ہو بھی۔“ اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

بین یک اور کری پف کی خستہ اشتہا انگیز خوشبو وہیں پھیلی رہ گئی....

☆☆=====☆☆

فاتح نے لکڑی کا ڈھکن ہٹایا تو اوپر سے روشنی آرہی تھی۔ وہ تینوں باری باری باہر نکلے تو روشنی دیکھ کے لمحے بھر کو مبہوت رہ گئے۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے دن جیسی روشنی؟ وہاں آس پاس اونچے درخت تھے۔ گھنے سرسبز اور اونچے۔ دن نکلا ہوا تھا مگر درختوں کے باعث ٹھنڈی چھایا تھی۔ جیسے عصر کا وقت ہو۔

فاتح نے کلائی بلند کی اور گھڑی دیکھی۔ ڈیجیٹل واچ رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کے ابرو چنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ گردن گھما کے تالیہ کو دیکھا۔

”یہ کہاں لے آئی ہو تم ہمیں؟“

”یہ تو کوئی جنگل ہے۔“ ساکت کھڑا ایڈم بول اٹھا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے اوپر آسمان کو دیکھا۔

”یہاں روشنی کیوں ہے؟“

”یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کہاں لے آئی ہو ہمیں۔“

وہ ٹکڑا سا کچرہ دیکھنے لگی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

”خزانہ....“ خشک گلے سے اس نے کہنا چاہا۔ ”دروازے کے پار خزانہ ہونا چاہیے تھا۔ کوئی قدیم خزانہ۔“

”سر، ہمیں واپس جانا چاہیے۔ مجھے تو یہ عجیب سی جگہ لگ رہی ہے۔“ ایڈم قدرے پریشانی سے بولا اور واپس مڑا۔ مگر پھر وہ

دھک سے رہ گیا۔

”مجھے خزانے کی کہانیاں مت سناؤ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے۔“ فاتح درشتی سے تالیہ سے مخاطب تھا۔ وہ واقعی پریشان ہو

گئی تھی۔

”تو انکو میرا خیال تھا یہاں خزانہ ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا یقین کریں۔“

”سر....“ ایڈم کی پھٹی پھٹی سی آواز آئی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ غصے سے کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم لمبے عرصے کے لئے جیل جا رہی ہو، تو یہ جگہ مجھے پہلے بتاؤ کہ کیا کھیل کھیل رہی ہو تم ہمارے ساتھ۔“

”مجھے خود سمجھ نہیں آرہی۔ ہم تو نیچے گئے تھے۔ تو یہ جنگل کہاں سے شروع ہو گیا۔“ وہ پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”سر....“ ایڈم حواس باختہ سا پکار رہا تھا۔ ”وہ دروازہ کہاں گیا جس سے ہم آئے تھے؟“

ان دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا۔ زمین میں جہاں لکڑی کا ٹریپ ڈور (ڈھکن) تھا، جس کو ہٹا کے وہ اوپر آئے تھے وہ اب وہاں نہیں تھا۔ کچی مٹی برابر تھی۔ وہ تینوں اونچے درختوں کے درمیان ایک جنگل میں کھڑے تھے۔

تالیہ نے بیگ نیچے پھینکا اور بے اختیار آگے بڑھی۔ ایک درخت سے دوسرے درخت تک۔ وہ ایک ایک تنے کو ہاتھ لگا کے ٹول رہی تھی جیسے کچھ کھوج رہی ہو۔ خزانہ۔ راستہ۔ کوئی نشان۔ مگر وہاں نہ بندہ تھا نہ بندے کی ذات۔

خاموش پرسکون درختوں کے جھنڈ جو ہر جگہ پھیلے تھے۔ اتنے گھنے درخت کہ چند میٹر دور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور اوپر ان کے پتے باہم گلے ملتے تھے۔ جیسے سبز چھت سی بنی ہو۔ چھت کے سوراخوں میں کہیں کہیں سفید آسمان جھلکتا تھا۔

”ایڈم، پولیس کو کال کرو اور اپنی لوکیشن دو۔“ اسے آگے دوڑتے دیکھ کے وہ برہمی سے بولا تو شل کھڑے ایڈم نے سیل فون نکالا۔ ”سگنل نہیں ہیں۔“

”میں خود کرتا ہوں۔“ فاتح نے اپنے فون کی اسکرین روشن کی۔ سگنل غائب تھے۔ اس نے ایس او ایس بھیجنے کی کوشش کی۔ بے سود۔ اکٹا کے چہرہ اٹھایا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی پریشانی سے ایک درخت کے ساتھ کھڑی تھی۔

”ہم کہاں ہیں؟“ وہ بے یقین سی خود سے بڑبڑا رہی تھی۔

”میرے سامنے اداکاری مت کرو تالیہ۔“ اس کو اس کے نام سے پکار کے درشتی سے بولا۔ سفید شرٹ کے آستین چڑھائے وہ ایرو بھینچے شدید بے زار لگ رہا تھا۔

”یہ کوئی جنگل ہے۔“ ایڈم نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔ ”رین فاریسٹ۔“

”پانچ سو میٹر بھی نہیں چلے ہوں گے ہم۔ میرے گھر کے اتنے قریب کون سا جنگل ہے بھلا؟ مجھے بتاؤ تالیہ یہ کون سی جگہ ہے۔“

اور یہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے روشنی کیوں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم تو انکو۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔ خزانہ، محل، جزیرہ۔ عیش و عشرت کی زندگی۔ سب جنگل کی خاک میں مل چکا تھا۔

”تم پہلے سے جانتی تھیں کہ یہاں کیا ہے۔ بتاؤ مجھے سب کچھ بتاؤ۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے نہیں معلوم۔ میرا اعتبار کریں۔“

”مجھے تمہارے ایک لفظ پہ بھی اعتبار نہیں ہے۔“ فاتح نے سر جھکایا اور انگلیوں سے آنکھیں مسلیں، گویا چند لمحے کو سوچا۔ پھر آگے

بڑھ گیا۔ چند منٹ تک وہ آگے چلتا گیا۔ درخت۔ درخت۔ نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ وہ اب غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا۔ واپس آیا تو وہ اسی طرح شل کھڑی تھی۔

”یہ کوئی الوژن ہے؟ نا؟ اور تم illusionist ہو۔ تم نے یہ کسی فلم کا سیٹ بنایا ہے۔ ایک الوژن۔ جہاں تم جیسے لوگ شکار کو

گھیر کے اس کو ذہنی طور پہ مفلوج کر کے اس کے راز، کریڈٹ کارڈ نمبرز، بینک پاس ورڈز لے لیتے ہیں۔ کیا تم میرے ساتھ اس وقت یہی کر رہی ہو؟“ وہ برہمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تم ابھی تک مجھے con کر رہی ہو؟“

”میرا یقین کریں تو انکو مجھے نہیں معلوم یہ کون سی جگہ ہے۔“ وہ ایک دم زور سے چیخی۔ ساری اداکاری، سارے دکھاوے، سارے ملمعے غائب ہو گئے۔ وہ پریشان تھی۔ شدید پریشان۔

مگر فاتح نے نفی میں سر بلایا۔ ”میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم یہ سب نہ جانتی ہو۔“

ایڈم ان دونوں سے بے نیاز زمین پہ اس جگہ بیٹھا جہاں وہ ٹریپ ڈور تھا اور وہاں سے پتے اور لکڑی کی ٹہنیاں ہٹانے لگا۔ نیچے مٹی ہی مٹی تھی۔ وہ روہانسا سا ہو کر سیدھا ہوا۔ ”ہم واپس کیسے جائیں گے؟“

”وہ چابی۔ وہ چابی کہاں ہے؟“ وہ چونکی۔ فاتح نے اسے گھورتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا... مگر مٹی باہر نکالی تو اس میں راکھ تھی۔ پل بھر کو وہ ساکت رہ گیا۔ پھر بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔

”کیا تم نے وہ میری جیب سے نکال لی؟ کیا چیز ہو تم؟“

مگر تالیہ کی نظریں اس کی مٹی میں موجود راکھ پہ جم گئی تھیں۔ چابی راکھ ہو گئی تھی۔ اس کا چکر پورا ہو گیا تھا۔

”نہیں!“ اس نے بے یقینی سے نفی میں سر بلایا۔ ”یہ شاید خواب ہے۔ یقیناً... میں خواب دیکھ رہی ہوں۔“

فاتح نے اکتا کے سر جھٹکا اور دوسری سمت میں آگے چلنے لگا۔ درخت درخت۔ ایک مسلسل چڑیوں کے چہچہانے کا شور۔ دور پانی کے چلنے کی آواز گویا کوئی جھرنابہر رہا ہو۔ ہوا۔ آسمان۔ ہر شے حقیقی تھی۔ اس نے درختوں کو چھو کے دیکھا۔

”نہیں۔ یہ سچ نہیں ہو سکتا۔ ملاکہ میں ایسا کون سا جنگل ہے؟ یہ کوئی الوژن ہے۔ یہ لڑکی ڈرامہ کر رہی ہے۔“ اس نے موبائل فضا میں بلند کیا مگر وہ سگنل کچھ نہیں کر رہا تھا۔ وان فاتح کی فرسٹریشن اور بے چینی بڑھنے لگی۔

تالیہ ایک درخت کے تنے سے لگی، آنکھیں موندے کھڑی تھی۔

”یہ یقیناً ایک خواب ہے۔ ابھی میں جاگ جاؤں گی۔“ وہ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ دل میں بار بار کوئی کہتا کہ آنکھیں کھولو، مگر نہیں۔ یہ خواب ہی تھا۔ اس کا خزانہ اصلی تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ دروازے کے آگے سنسان ویران جنگل ہو۔ نہیں۔ وہ ابھی نیند میں ہے۔ جب وہ جاگے گی تو وہ وان فاتح کے گھر جائے گی۔ خزانہ کنویں کے نیچے تھا۔ وہ اسے ڈھونڈ لے گی۔

ایڈم ابھی تک زمین پہ بیٹھا ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا۔ پھر کسی خیال کے تحت رکا۔ ”پولیس آنے والی ہوگی۔ اوہ ہاں۔ پولیس سیڑھیاں دیکھ لے گی اور یہاں پہنچ جائے گی۔“ اس کی رنگت بحال ہونے لگی۔ آنکھوں میں امید جاگی۔ ”شکر ہے میں نے ان کو فون کر دیا تھا۔“ وہ ہاتھ جھاڑتے اٹھ کھڑا ہوا۔

تبھی دان فاتح واپس آتا دکھائی دیا۔ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور ناک پہ غصہ دھرا تھا۔ عین تالیہ کے سامنے آ کے رکا۔
 ”آنکھیں کھولو اور مجھے بتاؤ لڑکی، کہ یہ سب کیا ہے؟“

تالیہ نے آنکھیں کھولیں۔ جنگل ایک ٹھوس حقیقت کی طرح اس کے گرد موجود تھا۔

”تو اٹکو....“ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ذہن خواب کے مفروضے سے نکلا تو پریشانی پھر سے چھانے لگی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں.... میں نہیں جانتی یہ کون سی جگہ ہے۔ میں صرف خزانے کے لئے آئی تھی۔“

”مجھے کہانیاں مت سناؤ۔ مجھے سچ بتاؤ تالیہ!“ وہ دو تین قدم قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں برہمی سے دیکھا۔ تالیہ کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

”میں کیا کروں جو آپ کو یقین آئے کہ میں بھی اتنی ہی ناواقف ہوں جتنے آپ ہیں۔ میں سچ بول رہی ہوں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی

عجیب وحشت ناک جنگل تھا۔ عجیب ناراض شخص تھا۔

”چپے تالیہ“ آخر آپ پورا سچ بتا کیوں نہیں دیتیں۔ آپ کو کہاں ملی یہ چابی۔ کس نے بتایا نیچے خزانہ ہے؟“ زمین پہ بیٹھا ایڈم جھلا کے بولا۔

”میں اس چابی کو خواب میں دیکھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پیچھے خزانہ ہے، مگر میری دوست کہتی تھی کہ خزانہ نہیں ہے بلکہ....“ وہ ٹھٹک کے رکی۔ ایک دم شل ہو گئی ہو۔ ایسے جیسے کسی نے سر پہ پیلچہ دے مارا ہو۔

”بلکہ؟“ فاتح نے غور سے تالیہ کو دیکھتے ابرو اٹھائی۔

”نہیں۔“ تالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ فضولیات بول رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں ہے۔“ وہ بے یقین تھی۔

”کیا؟ مجھے بتاؤ کیا کہا اس نے؟“

”وہ کہتی تھی کہ.... اس دروازے کے پار دو دریا ہیں، ماضی اور مستقبل کے۔ ان کو پار کر کے میں وقت میں پیچھے چلی جاؤں گی۔

کسی قدیم عہد میں جہاں سے میں کبھی واپس نہیں آسکوں گی۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔“

”ظاہر ہے کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔“ وہ اکتا گیا۔

”کر سکتا ہے۔“ ایڈم کی آواز پہ دونوں نے گردن موڑی۔

”آئن سٹائن کی تھیوری ہے نا۔ اگر روشنی کی رفتار سے تیز چلو تو انسان ماضی یا مستقبل میں جا سکتا ہے اور اس کی واپسی تک وقت

رک جاتا ہے۔“ وہ تحیر سے کہتا آگے آیا۔ اس کی حیرت بھری نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”تو آپ واقعی پمپورو میں سے ہیں۔ پمپورو

کے بارے میں ہم بچپن میں کہانیاں سنتے تھے۔ کہ وہ وقت میں سفر کر سکتے تھے۔ انہوں نے دروازے بنائے تھے جن میں چابی ڈالنے سے وقت کا قفل کھل جاتا تھا۔“ وہ بنا پلک جھپکے تالیہ کو دیکھتا قدم اٹھاتا قریب آ رہا تھا۔ ”آپ کی گردن پہ نشان ہے؟ آپ پمپورو ہیں۔ بچپن میں ایک کہانی سنی تھی میں نے، کہ یہ نشان صرف ’مسافروں‘ کی گردنوں پہ ہوتا ہے۔ کیا واقعی ہم نے وقت کا دروازہ پار کر لیا ہے؟“

”سٹ اپ ایڈم۔“ وہ بے زاری سے بولا۔ ”فضول باتیں مت کہو۔ یہ سب (تالیہ کو دیکھا) اس لڑکی کا کوئی ڈرامہ ہے۔ اس کو سب معلوم ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں صرف خزانے کے لیے...“

”تم اور تمہاری کہانیاں۔“ فاتح سر جھٹک کے پلٹ گیا اور موبائل دیکھنے لگا۔ گوگل میپ۔ نو سنگل۔ والی فائی، جی پی ایس، موبائل ڈیٹا، کچھ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کی گردن جھکی تھی۔ تالیہ اور ایڈم کی نظریں اس کی گردن پہ جم گئی تھیں۔

”آپ کی گردن پہ بھی نشان ہے؟“ ایڈم متحیر سا بولا تو وہ چونکا۔ پھر بے اختیار گردن کی پشت کو چھوا۔ انگلیوں نے کھال میں کوئی فرق محسوس کیا تھا جو اس کے ماتھے کی سلوٹس غائب ہونے لگیں۔ ایڈم نے اپنے تیل سے اس کی گردن کی تصویر بنائی اور اسکرین اس کے سامنے کی۔ ”یہ تو بچے تالیہ نہیں بنا سکتیں۔ ہو سکتا ہے وہ درست کہہ رہی ہوں۔“

وہ اسکرین پہ اپنی گردن کی پشت دیکھ کے منجمد ہو گیا۔ یہ بنا درد کے جلنے کا نشان تھا۔

”نہیں۔“ تالیہ پریشانی سے نفی میں سر ہلارہی تھی۔ ”کوئی بھی وقت میں سفر نہیں کر سکتا۔“

”سکے پہ مظفرال سلطان لکھا تھا۔“ ایڈم تیز تیز بول رہا تھا۔ ”پہلے 1437 لکھا آ رہا تھا مگر یہاں آتے ہی 885 لکھا آنے

لگا۔“

”ان ہندسوں کا کیا مطلب ہے؟“ وہ اچنبھے سے بولی۔ وان فاتح ابھی تک اسکرین پہ تصویر دیکھ رہا تھا۔

”یہ سال 2016 ہے۔ اسلامی کیلنڈر کا 1437 واں سال۔ لیکن یہاں آتے ہی...“ ایڈم خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا

۔ ”ہندسے بدل کے 885 ہو گئے۔ یعنی عیسوی کیلنڈر کا 1459 واں سال۔ پندرہویں صدی کا وسط۔“ وہ دھک سے رہ گیا۔

(پندرہویں صدی سے مراد 1401 سے 1500 تک کے تمام سال ہوتے ہیں۔ جیسے 1980 انیسویں صدی میں نہیں بلکہ

میسویں صدی میں شمار کیا جاتا ہے۔)

”کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ایسا ممکن نہیں ہے ایڈم!“ تالیہ کو وحشت ہونے لگی۔

”1459 سن عیسوی یا 885 سن ہجری وہ سال تھا جب سلطان مظفر شاہ کا انتقال ہوا تھا۔ شاید ہم واقعی مظفر شاہ کے دور میں پہنچے

گئے ہیں۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ تڑپ کے پیچھے ہوئی۔ ”میں ملایشیاء کی ہی ایک لڑکی ہوں۔ میں کوئی پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی نہیں ہوں اچھا۔“

”یہاں دن نکلا ہوا ہے۔ چے تالیہ۔ یہاں موبائل سگنلز نہیں کام کر رہے۔“

”جب پولیس آئے گی تو میں ان سے کہوں گا کہ تمہیں بھی اس لڑکی کے ساتھ گرفتار کر لیں ایڈم۔ کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہو۔“ فاتح غصے سے بولا مگر اس کی آواز میں ویسی گرج نہیں تھی۔

”سر... پمبورو کی کہانیاں سب نے سن رکھی ہیں۔ شاید وہ کہانیاں سچ ہوں۔ ہم واقعی پندرہویں صدی میں...“

”یہ اس لڑکی کا کوئی کرتب ہے۔ مجھے اس کی کسی بات پہ اعتبار نہیں ہے۔“ وہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ”پہلے اس نے میرے گھر سے فائل چرائی پھر...“

تالیہ تڑپ کے اس کی طرف گھومی۔ ”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں نے آپ کی فائل چرائی ہاں؟“

”گواہ ہیں میرے پاس۔“

”اچھا۔ کیا دیکھا گواہوں نے؟ مجھے بھی تو پتہ چلے۔“ تالیہ کی آواز بلند ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے وہ بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ فاتح کے ابرو اسی طرح تنے رہے۔

”تم اشعر کی پارٹی سے اپنی کار لینے میرے گھر آئیں، جب گھر میں ہم لوگ نہیں تھے۔ پھر تم نے میرے لاکر سے...“

”مگر چے تالیہ تو گھر نہیں آئی تھیں۔“ ایڈم حیرت سے بول اٹھا۔ ”ان کی کار تو میں خود ان کے گھر ڈراپ کرنے گیا تھا۔“

فاتح کے الفاظ وہیں ٹوٹ گئے۔ اس نے ابرو اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔ ”تم گئے تھے؟“

”جی، مجھے مسز عصرہ نے کہا تھا کہ کار چے تالیہ کے گھر چھوڑ آؤں۔ چے تالیہ تو نیکیسی لے کر سیدھی اپنے گھر گئی تھیں۔“

فاتح نے تالیہ کو دیکھا جو چھتی خاموش نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ پھر اس نے دوبارہ ایڈم کو دیکھا۔ ”تمہیں... عصرہ نے کہا تھا؟“

”جی۔ اور آپ کو بتانے سے منع کیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس لئے چے تالیہ کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوتا۔ اچھا تبھی مسز عصرہ نے مجھے اگلے دن آپ سے ملنے نہیں دیا اور...“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ بس!“ اس نے برہمی سے ہاتھ اٹھا کے روکا۔ تالیہ کی سلگتی نظریں ابھی تک اس پہ جمی تھیں۔ وہ ماتھے پہ ہل لئے پلٹا

اور ایک طرف چلتا گیا۔ وہ ذہنی طور پہ ڈسٹرب ہو گیا تھا، صاف ظاہر تھا۔

تھوڑی دور وہ ایک درخت تلے رک گیا۔ ان دونوں کی طرف پشت کیے اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھ کے آنکھیں کرب سے بند

کیں۔ (عصرہ... تم... اشعر کے ساتھ... اُف۔)

وہ دونوں وہاں خاموشی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر تالیہ نے ایک نگاہ غلط ایڈم پہ ڈالی۔

”یہ مت سمجھنا کہ تم نے میری حمایت کی ہے تو میں وہ سب بھول جاؤں گی جو تم نے کیا۔“

ایڈم نے جواباً خفگی سے اسے دیکھا۔ ”میرا کیا قصور ہے؟ میں نے تو منع بھی کیا تھا کہ دروازے کو مت کھولیں مگر....“

”چپ کرو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“

وہ ناک سے مکھی اڑاتی جھلا کے بولی۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ فاتح فاصلے پہ خاموش کھڑا رہا۔ تالیہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ اور ایڈم ایک پتھر پہ

بیٹھا رہا۔

”مجھے یقین تھا کہ خزانہ ہے۔“ کچھ دیر بعد وہ خود سے بولی تھی۔ ”خزانہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خزانہ نہ ہو۔“

”آپ کو اب بھی خزانے کی فکر ہے؟ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں، چے تالیہ۔“ ایڈم بگڑا تو تالیہ نے گھور کے اسے دیکھا۔

”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ خزانہ میرے لیے کیا تھا۔“

”میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ واقعی پندرہویں صدی ہوئی تو؟ ہم اگر واقعی وقت میں پانچ سو ستاون برس پیچھے چلے گئے ہوں

تو؟“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“ اس نے اوپر دیکھا۔ ”یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہوگا۔ میں ڈھونڈتی ہوں۔“ بیگ کندھے پہ ڈالتی وہ شمال کی

جانب چل دی۔ مٹی، پتھر، ٹھنڈیاں۔ وہ برشے کو جو گرز سے عبور کرتی درختوں کے درمیان آگے بڑھتی گئی۔ چند منٹ ہی چلی ہوگی کہ اسے

احساس ہوا، یہ جنگل اصلی تھا اور بہت گھنا تھا۔

تالیہ مراد کا دل بیٹھنے لگا۔

یہ خزانے کا لالچ اسے کہاں لے آیا تھا۔ کیسی جگہ تھی؟ کون سی دنیا تھی یہ؟

”تم پندرہویں صدی کی لڑکی ہو تالیہ۔ کسی غریب لکڑہارے کی بیٹی جو کسی وجہ سے وقت میں سفر کر کے آگے نکل آئی تھیں۔ تم واپس جاؤ

گی تو وقت وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے تم گئی تھیں۔ جہاں سے مراد نے اپنی گیارہ سالہ بیٹی کو کھویا تھا۔“ داتن کی آواز گونجنے لگی۔ اس

وحشت زدہ جنگل میں تو داتن کی آواز کی بازگشت بھی سنائی دیتی تھی۔

اسے خوف سا آنے لگا۔ فوراً پلٹی اور تیز تیز واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ ابھی وہ ایڈم اور فاتح سے چند میٹر ہی دور تھی کہ اس کا پیر پٹا۔

وہ اوندھے منہ نیچے گری۔

فاتح چونک کے گھوما، پھر تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ایڈم بھی جگہ سے اٹھا۔

گرتے ساتھ ہی وہ کراہی مگر ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کے فوراً سے انھی اور کپڑے جھاڑے۔ منہ پہ گیلی مٹی لگ گئی تھی۔ اس نے ہتھیلی

سے وہ صاف کی۔ پھر ٹھکی۔ ”میرے خواب۔“

”کون سے خواب؟“ وہ جو اس کو گرتے دیکھ کے تیزی سے آیا تھا، سنبھلتے دیکھ کے چہرے پہ وہی بے زاری واپس لائے رک گیا تھا۔
 ”میرے خواب.... وہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں.... میں نے خواب میں دیکھا تھا یہ جنگل.... ہم تینوں تھے ادھر اور ہماری گردنوں میں پھندے تھے۔“ وہ خود سے بول رہی تھی جیسے۔ بالکل مبہوت ہوئے۔ ”تو میرے خواب علامتی نہیں تھے۔ وہ ہو بہو مستقبل کا عکس تھے۔“
 ”اور کیا دیکھا تم نے خواب میں؟“ وہ بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ سوال پہ تالیہ پہلے چونکی، پھر ماتھے پہ ہل ڈال دیے۔ ہاتھ جھاڑے اور ’کچھ نہیں‘ کہتی آگے بڑھ گئی۔

☆☆=====☆☆

جنگل میں تیز روشنی محض آدھے گھنٹے میں گھپ اندھیرے میں بدل جاتی تھی۔ جیسے ہی مغرب کا وقت ہوا چند منٹوں میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ پرندوں کی چچہاہٹ اونچی ہونے لگی۔ دور جھرنے کے بہنے کی آواز البتہ برابر سنائی دے رہی تھی۔
 درختوں کے درمیان ایک قطعے پہ ایڈم کہیں سے تین پتھر اٹھالایا تھا۔ بڑے بڑے تین پتھر اور خود ایک پہ بیٹھ گیا تھا۔ اب اس ڈوبتی شام میں وہ بار بار گھڑی دیکھ کے ان کو تسلی دے رہا تھا۔

”پولیس ہمیں لینے آجائے گی، کوئی تو آجائے گا۔ ان کو وہ میٹروں میں جا لیں گی اور پھر وہ ہمیں یہاں سے نکال لے جائیں گے۔“
 تالیہ ساتھ والے پتھر پہ بیٹھی اس کو سنتی رہی۔ فاتح کا پتھر خالی تھا۔

وہ دور ایک درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں ٹہنی لئے اس سے پتے توڑ توڑ کے پھینک رہا تھا۔ گاہے بگاہے موبائل نکال کے دیکھتا۔ نو سگنل۔

پھر ایڈم بھی خاموش ہو گیا۔ پرندے گنگناتے رہے۔ جھرنے کا پانی بہتا رہا۔ اور حقیقت ہرگز رتے پاں گہری ہوتی گئی۔ اٹل۔ اور ٹھوس۔
 یہ الوژن نہیں تھا۔ یہ واقعی کوئی جنگل تھا۔ کس زمانے کا تھا، کوئی واقف نہ تھا۔ وہاں زمان اور مکان کے سارے پیمانے ختم ہو چکے تھے۔
 ”کوئی نہیں آیا ابھی تک۔“ تالیہ نے کلائی پہ گھڑی دیکھی۔ کوالا پور کے وقت کے مطابق رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ مگر یہاں اندھیرا ابھی چھایا تھا۔

”کوئی آجائے گا۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ وہ فاتح غائب ہو جائیں اور کوئی ان کو لینے نہ آئے۔ سارے ملک میں کہرام آجائے گا۔“ پتھر پہ بیٹھے ایڈم نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ تالیہ نے گھور کے اسے دیکھا۔

”خیر.... میں بھی کوئی لاوارث نہیں ہوں۔ رات گھر نہ پہنچی تو وہ موٹی میرے لئے بھی آجائے گی، دیکھنا۔“
 ”کون موٹی؟“ وہ حیران ہوا۔

”میری برائے مرغی جیسی دوست کیا نہ۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”کسی کو یوں موٹی نہیں کہتے، چے تالیہ۔“ وہ برامان گیا۔

”میں تو اس کو کالی اور بد صورت بھی کہتی ہوں۔“ وہ اونچے پتھر پہ ناگ پہ ناگ رکھے بیٹھی تھی اور چہرہ دائیں ہتھیلی پہ گرا رکھا تھا۔

”کیوں؟“ ایڈم کی آنکھیں صدمے سے کھل گئیں۔ درخت تلے بیٹھا فاتح ٹہنی سے پتے توڑ توڑ کے پھینکتا جا رہا تھا۔

”کیونکہ اس سے کوئی اور پیار نہیں کرتا۔ دوست مطلب کے لئے تعلق رکھتے ہیں، اور بچے غرض کے لئے۔ کوئی اس کو صحیح غلط نہیں بتا سکتا۔ وہ بچاس سے اوپر ہے، مگر اس کا وزن بڑھتا جا رہا ہے، ڈاکٹرز نے اس کو کہہ دیا ہے کہ اگر وہ اسی رفتار سے چاکلیٹ اور جنگ فوڈ کھاتی رہی تو وہ جلد مر جائے گی۔ میری نصیحتوں اور لیکچرز کا جب اس پہ کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے اسے موٹی، کالی اور بد صورت مرغی وغیرہ کہنا شروع کر دیا، تاکہ وہ اپنے وزن اور صحت کا احساس کرے۔“

”یہ تو غلط بات ہے۔“ اسے بہت برا لگا تھا۔

”تو کیا کروں؟ موٹی کہنے پہ وہ برامان ہی نہیں مناتی تھی۔ بد صورت کہتی ہوں تو اب پتلا ہونے کے طریقے گوگل کرنے لگی ہے۔ دو چار نام اور رکھوں گی تو اپنے وزن کو سیریسلی لے گی۔ اپنی لاپرواہی اور بداحتیاطی کی وجہ سے موٹے ہونے والوں کو بار بار ان کی صحت کا احساس دلانا چاہیے۔ کیونکہ انسان جتنا پتلا اور فٹ ہو، وہ اتنا ہی خوش اور motivated رہتا ہے۔ وہ چونکہ ایک عورت ہے اس لیے اگر کسی اور وجہ سے ڈانٹ پہ نہیں جائے گی تو کم از کم اچھا لگنے کے لئے تو چلی ہی جائے گی۔“

”پھر بھی چے تالیہ.... یہ کافی بے رحمانہ انداز ہے۔“

تالیہ نے تندہی سے اسے گھورا۔ ”تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوا کہ تالیہ تمہاری کوئی ایوریج فیئر ٹیل گرل نہیں ہے جو سادہ اور معصوم سی ہو۔ میں کرمل ہوں اور کرملو ایسے ہی ہوتے ہیں ہاں۔“ پھر ناک سکڑ کے منہ پھیر لیا۔

دفعۃً فاتح درخت تلے سے اٹھا۔ تالیہ نے نکٹھیوں سے دیکھا، وہ اب اس طرف آرہا تھا۔ وہ چہرہ موڑ کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کے سامنے پتھر پہ آ کے بیٹھا۔

”بولنا شروع کرو۔“ انداز غصیلانہ تھا مگر نرم بھی نہ تھا۔ وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا؟“

”سب کچھ بتاؤ مجھے۔ شروع سے۔ سچ سچ۔“

”اور آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں سچ بول رہی ہوں؟ میں تو جھوٹی اور چور ہوں نا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سلگ کے بولی۔ وہ ہنوز اسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں چھوٹی کیے۔ ماتھے پہ بال بکھرے ہوئے تھے اور سفید شرٹ کے آستین اوپر چڑھار کھے تھے۔ وہ جس فاتح سے واقف تھی، یہ اس سے مختلف نظر آتا تھا۔

”سچ کی پہچان ہو جاتی ہے۔“

”جیسے آپ کو سز عصرہ کی باتوں کی ہو جاتی ہے۔“

”وہ الگ بات ہے۔ تم نے میری فائل....“

”میں نے آپ کی فائل چرائی ہے، بالکل چرائی ہے، لیکن آپ کے گھر سے نہیں۔“

فاتح نے بے اختیار ابرو اٹھایا۔ ”مطلب؟“ ایڈم بھی حیران سا اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے وہ.... اشعر محمود کے.... سیف سے چرا کے.... آپ کو واپس کی ہے۔“ وہ اسی طرح چبا چبا کے بولی۔ گلے میں آنسوؤں کا

گولہ سا اٹکا۔

فاتح نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ”ایکسیوزمی؟“

تالیہ آگے ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”کیا میرا بچک شوا چھا نہیں لگا آپ کو، وان فاتح؟“

پل بھر کو وہ بالکل ساکت رہ گیا۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔ پھر پتلیاں حیرت اور بے یقینی سے سکڑیں۔ ”تم.... نہیں....“

”کیا کبھی کسی جادوگر کو اسٹیج پہ کھڑے ٹرک کاراز بتاتے دیکھا ہے آپ نے وان فاتح؟ مگر بیک اسٹیج تو بتایا جاسکتا ہے نا۔ آپ نے کہا تھا

کبھی مجھ سے ملنے آؤ، عالم گھر میں نے کہا تھا نا کہ میں آپ کی توقعات کے برعکس ہوں، سر۔ ایسی خواہش نہ کریں تو اچھا ہوگا۔“

فاتح کی قوت گویائی چند لمحے کے لیے زائل ہو گئی۔

”تم.... تم عالم ہو؟“

”کوئی مجھے بھی بتائے.... عالم کون ہے؟“ ایڈم نے نا سمجھی سے باری باری دونوں کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ تینوں

پتھروں کے گرد آگے درخت اندھیرے میں ڈوبے خاموشی سے ان کو سن رہے تھے۔

”کیا اب میری بات کا یقین کریں گے آپ؟“ وہ شکوے سے بولی۔ آنکھوں کے کنارے بھگنے لگے۔

فاتح نے سر اثبات میں ہلایا۔ ”بولنا شروع کرو۔“ اس کا سارا غصہ، کوفت، حقارت، سب غائب ہو گیا تھا۔

تالیہ نے پہلے اسے دیکھا، پھر ایڈم کو۔ ”اچھا ہو اگر آپ لوگ مجھے جج نہ کریں۔“

”تم بولنا شروع کرو، تالیہ۔ جج بولنا صرف شروع میں مشکل لگتا ہے، پھر یہ وقت کے ساتھ ساتھ آسان ہو جاتا ہے۔“ وان فاتح کی آواز

میں نرمی تھی۔ وہ متوجہ تھا۔ سنجیدہ تھا۔ کچھ بدل گیا تھا۔ میجک شو کے الفاظ کے ساتھ ہی سارا سماں بدل گیا تھا۔

تالیہ نے گہری سانس لی، آنکھوں کے کنارے رگڑے اور اندھیر درختوں کو دیکھ کے کہنے لگی۔ ”میرا اصل نام تالیہ مراد ہے۔ میں گیارہ

برس کی عمر میں ایک چرچ میں پائی گئی تھی۔ پہلے میں نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں سے آئی ہوں، لیکن اب....“ اس نے گردن اٹھا کے اوپر دیکھا

۔ جہاں گھنے درختوں کے پار گہرا پڑتا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم نے نارچ جلا دی تھی جس سے سفید نیلی سی روشنی تینوں پتھروں کے گرد

پھیلی تھی۔

”اب مجھے یقین آرہا ہے کہ شاید داتن درست کہتی تھی۔ میں واقعی پندرہویں صدی کے کسی لکڑہارے کی بیٹی ہوں جو پمبوروتھا۔ اس نے چابی بنائی تھی۔ جانے کس قسم کی۔ میرے باپ کو خزانہ چاہیے تھا گاؤں کے لئے۔ شاید اس نے مجھے وقت میں آگے بھیج دیا۔ اور میں اکیسویں صدی میں آگئی۔ یتیم خانے کی منتظم نے مجھ سے میرا بریسلٹ اتروالیا تو چابی ٹوٹ گئی اور میری یادداشت ختم ہوگئی۔“

وہ دونوں اسے سن رہے تھے۔ جنگل پہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ پرندوں کی آوازیں دم توڑ رہی تھیں۔ اب تالیہ نے سر جھکا لیا تھا۔ ”میں کچھ سال یتیم خانے میں رہی۔ پھر ایک فیملی مجھے ایڈاپٹ کر کے لاہور لے گئی۔ وہ میرے اوپر ظلم کرتے تھے۔ میں نوکرانی کی طرح بڑی ہوئی۔ جیب خرچ اور کھانے کے لئے مجھے چوری اور جھوٹ کی عادت پڑ گئی۔ میں چھوٹی باتوں پہ بڑے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی ہوئی۔ سات سال پہلے انٹرنیٹ پر رشتہ ڈھونڈ کے میرے ماں باپ نے میری شادی کر دی۔“

فاتح نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔ ”تم شادی شدہ ہو؟“

تالیہ نے جھکے سر کے ساتھ گردن ہلائی۔ ”وہ کوالا پور میں رہتا تھا۔ وہی آدمی جو اس روز تم نے دیکھا ایڈم۔“ (فاتح نے فوراً ایڈم کو دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔) ”ایئر پورٹ پہ آئی تو پتہ چلا وہ میرے ذریعے منی لانڈرنگ کرنا چاہتا ہے۔ میں ایئر پورٹ سے بھاگ گئی۔ داتن کے ساتھ۔ پھر اس سے طلاق لے لی اور...“ وہ بولتی گئی۔ رات گہری پڑتی گئی۔

کوالا پور میں گزارے سات سال... جالم بنا اور لوگوں کی چیزیں چرا کے واپس ڈھونڈ لانے کی فیس لیا... گھائل غزال... خزانہ... وہ سب بتاتی گئی۔ اپنے خواب... تمام جزئیات کے ساتھ۔

”تم نے بتایا کیوں نہیں کہ گھائل غزال نقلی ہے؟“ وہ افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے شاکی نظریں اٹھائیں۔ اس پاس اندھیرا تھا مگر چاند کی چاندنی کے باعث وہ صاف نظر آرہا تھا۔

”کیونکہ جج بولنا مجھے مشکل لگتا ہے۔“

”اب کیسے بول رہی ہو۔“

وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”کیونکہ اب آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

دونوں نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”کیا؟“

”سوری ایڈم، مگر ہمیں کوئی لینے نہیں آئے گا۔ ہم وقت کی قید میں پھنس چکے ہیں اور اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ چابی تحلیل ہو چکی ہے۔ دروازہ غائب ہو گیا ہے۔ اور اب چونکہ آپ (فاتح کو دیکھا) مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتے تو مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ ہاں میں چور ہوں، اسکا مر ہوں، جھوٹی بھی ہوں۔ پھر کیا کر لیں گے آپ لوگ؟ سوائے مجھ سے نفرت کے؟“

”نہیں تالیہ۔ میں تمہیں جج نہیں کروں گا۔“ وہ اب کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ نہ غصہ۔ نہ کوئی ترحم۔ ”تم نے کہا تم اس کام کو

چھوڑنا چاہتی تھیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تمہیں احساس تھا۔ میں ماضی میں رہنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

مگرایڈم کا ذہن تالیہ کے بے رحم الفاظ پہ اٹک گیا تھا۔ ”آپ ہمت کیوں ہار رہی ہیں؟ پولیس ہمیں لینے آجائے گی۔“
 ”کوئی نہیں آئے گا ایڈم۔ ہم واپس نہیں جاسکتے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”آئے گا ضرور آئے گا۔ میں پازینو ہوں۔ سر، کیا انسان کو مثبت نہیں ہونا چاہیے؟“ اس نے دکھی ہو کر فاتح کو مخاطب کیا۔
 فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن اٹھا کے اوپر دیکھنے لگا تھا۔ آسمان سے آوازیں آنے لگی تھیں۔ گڑ گڑاہٹ۔ ذرا سی بجلی چمکی اور پھر... بڑا اثر بارش برسنے لگی۔

”یا اللہ!“ تالیہ نے بوکھلا کے بیک پیک سر پہ تانا۔ تینوں تیزی سے کھڑے ہوئے مگر بوچھاڑ اتنی تیز تھی کہ چند لمحوں میں ہی بھیگ گئے تھے۔

”ہمیں کوئی شیلٹر ڈھونڈنا ہوگا۔“ فاتح نے نارچ اٹھا کے روشنی ایک طرف پھینکی۔

”پولیس آئے گی۔ کوئی تو آئے گا۔“ ایڈم اسی طرح مغموم سا کھڑا بھیگ رہا تھا۔ اسے اور کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔

”میں نے اس طرف چٹانیں دیکھی تھیں۔ میرے ساتھ آؤ تم دونوں۔ ایڈم میں کہہ رہا ہوں میرے ساتھ آؤ۔“ وہ بلند آواز میں بولا تو ایڈم چونکا اور پھر اس کے پیچھے چلنے لگا مگر وہ غائب دماغ لگتا تھا۔

جنگل میں اندھیرا تھا اور چاندنی مدھم سی درختوں کے درمیان پہنچ رہی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ پورے چاند کی رات تھی ورنہ درخت اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی بھی پوری اندر داخل نہ ہو پاتی تھی۔

”چلو ایڈم۔“ وہ بار بار رک جاتا تو تالیہ کو جھڑک کے کہنا پڑتا۔ فاتح رازمل سب سے آگے تھا۔ نارچ کی روشنی راستے میں پھینکتا وہ راستہ دکھا رہا تھا۔ درختوں کے درمیان پتھروں، کیچڑ، پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کا خاردار راستہ جس کو وہ تینوں آگے پیچھے عبور کر رہے تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ تڑتڑاتی بوندوں کے درمیان وہ چلا کے بولی۔

”اس طرف ایک چٹان میں کھوہ سی بنی تھی۔“ وہ مڑے بغیر تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔

”مزید کتنا چلنا پڑے گا؟“

وہ تیور کے گھوما۔ وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ بال ماتھے پہ گیلے ہو کے جمے تھے اور آنکھوں میں غصہ تھا۔ اس کے رکنے پہ وہ بھی ہڑبڑا کے رکے

”تم پکنک پہ آئی ہو یہاں ہاں؟“

”میں بس پوچھ رہی تھی۔“ وہ خفیف ہوئی۔ وہ اسے گھور کے واپس مڑا اور تیز تیز چلنے لگا۔

چند منٹ وہ اس گھنے اندھیر جنگل میں چلتے رہے۔ ساری دنیا جیسے ختم ہو گئی تھی۔ سارے شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے تھے۔ کائنات بس

ایک جنگل تک محدود تھی اور وہ اس میں موجود واحد انسان تھے۔ جیسے طوفان نوح ابھی گزرا ہو.... پانی سمٹ چکا ہو.... اور ان کو دنیا پھر سے

آباد کرنی ہو....

ایسی حسین وحشت.....

ایک ڈھلان کے نیچے کھوہ سی بنی تھی۔ چھوٹا سا غار جو پتھروں کے گرنے کے باعث بن گیا تھا۔ اس کا دہانہ کھلا تھا اور وہاں پانی کا تالاب سا بنا پڑا تھا۔ فاتح اس کے کنارے آ کر اسے اشارہ کیا۔ (اندر آ جاؤ۔) وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اندر بارش نہیں تھی۔ خشک بھورے پتھروں کی غار... جیسے کوئی محفوظ سائبان ہو۔ اس نے بیگ اتار کے نیچے پھینک دیا۔ سکون سا محسوس ہوا تھا۔

”اندر آؤ ایڈم!“ فاتح ابھی تک غار کے دہانے پہ بارش میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ ایڈم قدرے ست روی سے غار میں آیا اور سیدھا ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ ان دونوں کے سائبان میں آ جانے کے بعد وہ اندر داخل ہوا۔

”کیا کوئی بھی ہمیں بچانے نہیں آئے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم غائب ہو جائیں اور کسی کو پرواہ بھی نہ ہو۔“ ایڈم وہیں کونے میں بیٹھ گیا اور تھوڑی گھنٹوں پہ نکا دی۔ وہ اداس دکھائی دیتا تھا۔ فاتح نے نارچ جلا رکھی تھی جس کی روشنی غار کی دیوار پہ گر رہی تھی۔ پورا غار نیلی سرمئی روشنی سے روشن ہو گیا تھا۔

”کوئی نہیں آئے گا ایڈم۔ بغیر چابی کے کوئی وہ دروازہ کیسے کھولے گا؟ یاد ہے تمہارے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔“ تالیہ اکتا کے بولی۔

”مگر ہمیں مثبت سوچ رکھنی چاہیے۔ قہیناً کوئی آئے گا اور ہمیں بچالے جائے گا۔“
فاتح خاموشی سے متصل دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ مسلسل نارچ کا بٹن جلا بجھا رہا تھا۔ غار میں روشنی پھیلی، پھر اندھیرا چھا جاتا۔ پھر روشنی، پھر اندھیرا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”کوئی نہیں آئے گا ایڈم۔ ہم مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔“
ایڈم کی آنکھوں میں کرچیاں سی ابھریں۔ ”کیا کسی کو ہماری پرواہ بھی نہیں ہوگی؟“
”میں بتا رہی ہوں نا، ہم نے دروازہ بند کر دیا تھا۔“

مگر ایڈم نے سر دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ ”یا اللہ... میرا کیا تصور تھا؟“ وہ بے بسی سے روہانسا ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ چے تالیہ ہمیں اس مصیبت میں پھنسانیں گی تو میں کبھی بھی ملا کہ نہ آتا۔ میں کے ایل سے بھی دور بھاگ جاتا۔“
”میں نے پھنسا یا ہے مصیبت میں؟“ وہ غصے سے بلبلائی۔ ”کتنا کہا تھا مجھے سکھ دے دو، تمہیں خود شوق ہوا تھا سراغ رساں بننے کا۔ ہم تمہاری وجہ سے اس میں پھنسے ہیں۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں تھا کچھ بھی بننے کا۔“ اس نے جھٹکے سے سراٹھایا۔ ”میری شادی ہے دو ماہ بعد۔ میری ایو اور باپا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”تمہیں لگتا ہے مجھے شوق تھا اس... اس جنگل میں پھنس جانے کا؟ میں کے ایل میں کتنی خوش تھی، میرے کتنے خواب تھے، تم سوچ بھی

نہیں سکتے۔“

”میں بھی کے ایل میں خوش تھا۔ مجھے نہیں چاہیے تھا خزانہ۔ آپ نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا کہا تھا۔“

”سارا قصور تمہارا ہے، تم فاتح صاحب کو بھی درمیان میں لے آئے، تم نے مجھے مشکل میں ڈالا ہے، میں نے تمہیں نہیں۔“

وہ دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا اور تالیہ کھڑی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف چہرہ موڑے تیز تیز بولے جا رہے تھے۔

وہ کمر پہ ہاتھ رکھے ان کو دیکھے گیا۔ افسوس سے... نا پسندیدگی سے....

بارش تھم گئی تھی۔ جیسے وہ ایک لمحے میں اچانک سے شروع ہوئی تھی ویسے ہی اچانک سے تھم گئی۔ وہ دونوں ابھی تک ترکی بہ ترکی ایک

دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ فاتح غار سے باہر نکل آیا۔

پتوں اور سوکھی ٹہنیوں سے اُنی زمین کی مٹی گیلی ہو چکی تھی۔ پھسلن زندہ اور گیلی۔ دو قدم چلنا محال تھا۔ وہ نارچ کی روشنی سامنے پھینکتا چند

میٹر دور چلتا آیا۔

یہاں ایک بڑا سا گڑھا بنا تھا جس میں بارش کا پانی تالاب صورت جمع ہو گیا تھا۔ وہ اس کے کنارے آکا اور سامنے دیکھا۔

پانی کے دوسرے کنارے پہ آریانہ کھڑی تھی۔ فاتح زخمی سا مسکرایا۔

اسے کبھی خواب نہیں آتے تھے۔ جتنی ڈسٹرب نیند وہ سوئے وہ خواب نہیں دیکھتا تھا۔ آریانہ تو اسے کبھی خواب میں نہیں دکھائی دی تھی۔

عصرہ کے خوابوں میں وہ اکثر آتی تھی۔ البتہ جب وہ بہت پریشان ہوتا وہ تصور کرتا کہ آریانہ اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اس سے بات

کر رہا ہے۔ صبح جاگنگ پہ جاتے ہوئے... کبھی اپنے ڈریسر مرر کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے... وہ اپنا ذہن کلیر کرنے اور کسی نتیجے پہ

پہنچنے کے لئے اپنا مسئلہ اس تخیلاتی آریانہ کے سامنے رکھا کرتا تھا جو دراصل اس کے سب کانشس مائنڈ سے نکات ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاتی

اور اس کو جواب دیتی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ خود سے باتیں کر رہا ہے، مگر اسے آریانہ کو اس گفتگو کا مخاطب بنانا اچھا لگتا تھا۔

”ڈیڈ!“ وہ سفید لباس میں ملبوس بھیر بینڈ لگائے، سامنے کھڑی مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں بیٹا۔“

”آپ پریشان ہیں؟“

”بہت زیادہ۔“

”کیوں؟“

”میں پھنس گیا ہوں آریانہ۔ میں اس جادوئی دنیا میں پھنس گیا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔

”اور آپ غصہ بھی ہیں۔“

”ہاں۔ مجھے ان دونوں پہ غصہ آ رہا ہے جو ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہیں۔ مجھے لوگوں کا مظلوم بننا نہیں اچھا لگتا۔“

”تو لوگ کیا کریں؟“ وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی غور سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بارش کے پانی سے بھرا نالہ حائل تھا۔
 ”اس بات کو سمجھ لیں کہ کوئی ہمارے ساتھ برا نہیں کرتا۔ یا تو ہم اسے اجازت دیتے ہیں۔ یا وہ ہماری تقدیر ہوتی ہے۔“
 ”اور یہ سمجھ کے وہ کیا کریں؟“

”کیا مطلب کیا کریں؟“ اس نے خفگی سے بھنویں بھنچی۔ ”دوسروں کو اپنی حالت کا الزام دینا چھوڑیں، اپنی قسمت کو قبول کریں اور باہر نکل کے دنیا کا مقابلہ کریں۔“ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔
 ”اور جو برے واقعات سے ہمارا دل غم کا شکار ہو جاتا ہے اس کا کیا ڈیڈ؟“ وہ یاسیت سے پوچھ رہی تھی۔ بلکی ٹھنڈی ہوا میں اس کے ہنیر بینڈ سے نکلنے والے اڑاڑ رہے تھے۔

”انسان برے واقعے کو اپنی یادوں میں خود اچھا واقعہ بھی بنا سکتا ہے۔“
 ”کیسے؟“ آریانہ کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔
 ”یہ دیکھ کے کہ غلطی کہاں ہوئی اور شکر ادا کر کے کہ اسے ایک سبق سیکھنے کا موقع ملا۔“ وہ اب قدرے آرام سے بول رہا تھا۔ اس کا ذہن دھیرے دھیرے ریلیکس ہو رہا تھا۔

”کیا آپ اس مصیبت کو فیس کر رہے ہیں جو آپ کو پھانسی ہوئے ہے؟“
 ”میں کم از کم کسی کو الزام نہیں دے رہا۔“
 ”مگر آپ لیڈر ہیں ڈیڈ۔ لیڈر کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کو وہ چرواہا بننا ہے جو سرکش بھینٹوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان سے کام لینا جانتا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے افسوس سے کہہ رہی تھی۔ ”مگر مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ نے خود بھی ان حالات کو قبول نہیں کیا ابھی۔“

”میرا ایک ملک ہے پیچھے آریانہ۔ مجھے... ایک... ملک چلانا ہے۔“
 ”وہ ملک اب پیچھے رہ گیا ہے ڈیڈ۔“ اس کے الفاظ وان فاتح کے دل میں بھالے کی طرح کھب گئے۔ تکلیف اتنی تھی کہ چہرے پہ ظاہر ہونے لگی۔

”میں نے اتنے سال ایک مقصد کے لئے کوشش کی ہے۔ وہ... میرا... ملک ہے آریانہ! مجھے اگلے ہفتے تک انکیشن کے لیے پیپر جمع کروانے ہیں۔“ در اس کے دل سے ہوتا سارے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔
 ”اب وہ سب ختم ہو گیا ہے ڈیڈ۔ اب آپ کو اس جنگل کو قبول کرنا ہوگا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ آنکھوں میں بے پناہ زخمی پن تھا۔ ”میرے بغیر میرے ملک کا کیا ہوگا؟“
 ”آپ کو اس وقت یہ سوچنا ہے صرف کہ آپ کے بغیر آپ کا کیا ہوگا؟“ وہ بھی دکھی لگ رہی تھی۔

”کیا میرا ملائیشیا وقت کی دھول میں غائب ہو گیا ہے؟“ اس کے حلق میں کچھ پھنسا۔

”ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کسی موقع پہ ظاہر ہو جائے، ڈیڈ۔ مگر اس وقت آپ ’مسلطنتِ ملاکہ‘ میں ہیں۔ یہ جنگل اور اس سے مقابلہ کرنا ہی سب سے بڑی لڑائی ہے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا مجھے کیا کرنا ہے۔“

”ڈیڈ!“ وہ نرمی سے مسکرائی۔ ”میں اتنے گھنٹوں سے دیکھ رہی تھی۔ آپ اس درخت کے پاس اداس بیٹھے تھے۔ آپ اتنی جلدی اداس نہیں پڑتے تھے مگر وہ آپ کا فطری رد عمل تھا۔ آپ انسان ہیں، آپ گھبرا سکتے ہیں، میں مانتی ہوں۔ لیکن آپ بہت بہادر انسان ہیں، آپ نے زندگی میں اس سے بڑے امتحان دیکھے ہیں۔“

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”یہ جنگل ڈسٹرکٹ اتارنی آفس کی دوسری کیمپین سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔“

”یاد ہے ڈیڈ، کتنے مسئلوں میں پھنسے تھے ہم، مگر نکل آئے تھے نا۔“ وہ ہلکا سا ہنس دی تو اس نے مسکرا کر سر ہلادیا۔

”تو اب میں کیا کروں؟“

”آپ نے اپنے ساتھ ان دونوں کو بھی جنگل سے نکالنا ہے۔“

”وہ دونوں میرے لیے اجنبی ہیں۔ ایک میں مجھے دلچسپی نہیں اور دوسری مجھے شدید نا پسند رہی ہے۔“

”لیکن آپ پھر بھی ان کو سنبھال سکتے ہیں، ڈیڈ۔ پارٹی چیئرمین کا الیکشن ابھی نہیں ہوا مگر سب جانتے ہیں کہ موجودہ چیئرمین کی پچھلے ایک سال سے غیر دلچسپی کے باعث باریسن نیشنل کو آپ ہی سنبھال رہے ہیں۔“

”وہ ایک سیاسی پارٹی ہے، بیٹا۔ وہ اور بات ہے۔“

”سیاست ایک جنگل ہے اور باریسن نیشنل کے اس وقت ڈھائی لاکھ سے زیادہ ممبرز ہیں۔ آپ کے کارکن جن سے آپ بروقت ای میل، فون، جلسوں، اور باہمی ملاقاتوں کے ذریعے جڑے رہتے ہیں۔ آپ سے جو کارکن ایک دفعہ ملاقات کر لے آپ کو وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ آپ سیاست دان ہیں۔ ڈونٹ ٹیل می جو شخص اپنے ہزاروں کارکنوں کے نام تک یاد رکھتا ہے، وہ ان دو لوگوں کو نہیں سنبھال سکتا؟“

وہ بالآخر مسکرا دیا۔ ”تم چاہتی ہو میں ان دونوں کے بارے میں اپنے جذبات پس پشت ڈال کے ان کو کارکنوں کی طرح ٹریٹ کروں؟

ان سے کام لوں اور ان کو لیڈ کرتے ہوئے اس جنگل سے نکالوں؟“

”آپ کو یقین آچکا ہے اب تک ڈیڈ، کہ آپ واقعی وقت میں پیچھے جا چکے ہیں۔ آپ کو جنگل سے نکلنا ہو گا اور آبادی ڈھونڈنی ہو

گی۔ اس کے لیے آپ کو وہی کرنا ہو گا جو آپ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔“

”Like Father, Like Daughter!“ وہ کھل کے مسکرایا۔

نالے کا دوسرا کنارہ اب خالی تھا۔ آریانہ جا چکی تھی۔

وان فاتح کے ذہن کے سارے جالے صاف ہو چکے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک مختلف انسان نظر آتا تھا۔ وہی جو پار لیمان میں گردن کڑا کے کھڑا ہوئے تقریر کرتا تھا... جو کسی جلسے میں اسٹیج پہ کھڑا مسکراتے ہوئے عوام کی طرف ہاتھ ہلاتا تھا... جو کیمپین آفس میں تیز تیز چلتے ہوئے تحکم سے شاف ورکرز کو ہدایات جاری کرتا تھا... وہ چند گھنٹوں کے لئے کھو گیا تھا مگر اب وہ واپس آ چکا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے غار کی طرف اٹھنے لگے۔

واپسی کا سفر ویسے بھی جلدی طے ہو جاتا ہے۔

وہ غار کے دہانے تک آیا تو وہ دونوں ابھی تک درشتی سے بحث کر رہے تھے۔ تلخ کلامی اب تالیہ کے چور ہونے تک پہنچ چکی تھی اور وہ جواباً اس کو سکے کالا لچ آ جانے کا طعنہ دے رہی تھی۔ فاتح نے تارچ جلا کے ایک کونے میں کھڑی کی تاکہ سارا غار روشن بھی ہو جائے اور کسی کی آنکھوں میں روشنی بھی نہ پڑے۔

”وہ ٹھیک کہہ رہی ہے ایڈم۔“ وہ سنجیدہ آواز میں بولا تو دونوں نے چونک کے اسے دیکھا۔

”ہمیں لینے کوئی نہیں آئے گا۔ انتظار ترک کر دو۔“

تالیہ کے لب ابھی مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے کہ....

”مگر وہ غلط کہہ رہی ہے کہ ہم کبھی واپس نہیں جاسکتے... ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے کیونکہ نہ میں ایڈم کی طرح انتظار کرتا ہوں کہ دوسرے آ کر مجھے مصیبت سے نکالیں، نہ میں تالیہ کی طرح دنیا میں صرف تلخ حقیقتوں کو دیکھتا ہوں۔“ تالیہ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ ناک سکڑ لی۔

”مگر سر... کوئی آئے گا۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے۔ آپ تو خود کہتے تھے کہ ہمیں مثبت سوچنا چاہیے ہمیشہ۔“ اس کے الفاظ غار سے ٹکرا کے واپس پلٹ رہے تھے۔ باہر پانی اور پرندوں کا شور پھر سے سنائی دینے لگا تھا۔

”دوسروں پہ تکیہ کرنا مثبت سوچ نہیں ہوتا۔ وان فاتح نے کبھی دوسروں کا انتظار نہیں کیا کہ وہ آ کر اس کو مصیبت سے نکالیں گے۔ ہمیشہ خود کوشش کی ہے۔ اس سے بڑے بڑے جنگل دیکھے ہیں میں نے اور میں کبھی نہیں ہارا۔ مجھے نہیں معلوم ہم کتنے وقت کے لیے اس جگہ پھنسے ہیں مگر دو باتیں آج دماغ میں بٹھا دو۔“

وہ دونوں دم سادھے اس کو بولتے دیکھ رہے تھے۔ رعب سارعب تھا۔ ادب سا ادب تھا۔ ایڈم دھیرے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”پہلی بات، ہم یہاں کسی دوسرے کی وجہ سے نہیں پھنسے۔ ہم اپنی مرضی سے آئے تھے۔ اور دوسری یہ کہ.... ہم یہاں سے.... واپس اپنی دنیا میں... ضرور جائیں گے۔ از دیٹ کلیمیر؟“

تالیہ نے سر ہلا دیا۔ ایڈم نے سر جھکا دیا۔

”مگر تب تک ہمیں ان حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ایڈم... تم ملٹری میں رہے ہو، تم نے جنگل میں ٹریننگ حاصل کی ہوگی۔ تم تالیہ کو بتاؤ“

جنگل کے بارے میں پہلی بات کیا پڑھائی جاتی ہے؟“ وہ آستینوں کو مزید موڑتے ہوئے کسی کمانڈر کی طرح حکم دے رہا تھا۔
ایڈم نے چہرہ اٹھایا اور خالی خالی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

”بتاؤ ایڈم.... ساری دنیا کے جنگلوں کے بارے میں پہلی اور بنیادی بات کون سی بتائی جاتی ہے؟“
ایڈم کے لب ہلے۔

“Never Fight the Jungle.”

غار میں ایک دم ہیبت ناک سی خاموشی چھا گئی۔ تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔
”سنا تم نے تالیہ۔ ہم دونوں جانتے ہیں اس بات کو۔ تم بھی جان لو۔ جنگل سے کبھی لڑائی نہیں کی جاتی۔ صرف اس کے اندر سے راستہ بنا کر اس سے نکلنا ہوتا ہے کیونکہ جنگل اور انسان کی لڑائی میں جنگل ہمیشہ جیت جاتا ہے۔“
”لڑیں گے نہیں تو زندہ کیسے رہیں گے؟“ اس کا دل ڈوبا۔

”زندہ رہنے کے لئے لڑنا ضروری نہیں ہے، خود کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔“ وہ قدرے نرمی سے بولا تو تالیہ نے سر ہلا دیا مگر وہ ابھی تک متذبذب لگتی تھی۔ کیا یہ وہی آدمی تھا جو اتنے دن اس کو نظر انداز کرتا یا جھڑکتا نظر آیا تھا۔ اس کے بعد بے اعتباری کا فیر آیا۔ پھر چیخ سن کے چپ ہو گیا اور اب....؟؟؟ اتنا نرم؟ اسے حوصلہ ہوا۔
”کیا ہم... واقعی واپس جاسکتے ہیں۔“

”اگر ہم آسکتے ہیں تو جا بھی سکتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کب، لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم دونوں کو واپس لے جانے کے لئے مجھے جو کرنا پڑا، میں کروں گا۔“
”مگر....“

”تالیہ....“ وہ ایک دم الارٹ ساسیدھا ہوا۔ ”ہلنا مت۔“
وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ آنکھیں حیرت سے چھوٹی کیں۔ ”کیا ہوا؟“
”ساکن کھڑی رہو۔ بالکل اسٹل۔ خاموش اور اسٹل۔ اب میں جو کہنے جا رہا ہوں اس پر ری ایکٹ مت کرنا۔“
وہ بالکل ساکت ہو گئی، مگر چہرے پر حیرانی تھی۔ نظریں گھما کے ایڈم کو دیکھا جو دھیرے دھیرے اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ ”سس....“
اس نے تب وہ پھنکار سنی۔ سارا وجود سن ہو گیا۔

”ریلیکس رہو۔ تمہارے سر کے اوپر سانپ ہے اور یہ زہریلا ہے۔ مگر ہلنا مت تالیہ۔ ہلنا مت۔“ وہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ دم سادھے کھڑی رہی۔ پھر پلکیں جھپک کے اثبات میں اشارہ کیا۔
ایک سیاہ چمکیلا سانپ اوپر دیوار پہ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔

”اگر تم اچانک ملیں تو یہ حملہ کر دے گا۔ سانپ ہمیشہ ڈر کے حملہ کرتا ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ ”ایڈم... تم بہت آہستہ سے نیچے پڑا بیگ اٹھاؤ اور کھولو۔ تالیہ مجھے بتاؤ تمہارے پاس کوئی نوکیلی چیز ہے۔“

”خیر ہے۔“ وہ بدقت بول پائی۔ وہ دیوار سے لگی تھی۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور پیشانی پہ پسینہ آرہا تھا۔ ایڈم نے آہستہ سے پیر سے بیگ کو قریب کیا اور دھیرے دھیرے نیچے بیٹھا....

سانپ بل نہیں رہا تھا مگر گردن دائیں بائیں کر کے وہ آگے پیچھے دیکھ رہا تھا۔
 ”سانپ دشمن ہوتا ہے۔ اور دشمن کو ہرانے کا طریقہ کیا ہے جانتی ہو؟“ وہ تالیہ کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ایڈم نے بیگ کی زپ کھولی۔

”کیا؟“ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

”دشمن کے سامنے panic نہیں کرتے۔ خود کو ریلیکس رکھتے ہیں۔ اس کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس سے ڈرتی ہو۔“
 ایڈم نے بیگ کھولا.... اندر چند اوزار رکھے تھے۔ خنجر سامنے ہی تھا۔ سب کچھ بھیگا ہوا تھا۔ اس نے خنجر نکال کے فاتح کے ہاتھ میں دیا۔
 ”آپ کو....“ وہ فاتح کو دیکھتے ہوئے رک رک کے بولی۔ ”لگتا ہے کہ.... میں.... panic کر رہی ہو؟“
 ”ظاہر ہے تم panic کر رہی ہو.... بلکہ تم سفید پڑ رہی ہو.... ریلیکس.... ایک سانپ ہی تو ہے۔“ اس نے خنجر دستے سے ہاتھ میں پکڑا۔
 ”نظریں کسی شکاری کی طرح سانپ پہ جمی تھیں۔“

”میں.... خوفزدہ.... اس لئے نہیں ہوں کہ....“ اس کے ابرو سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ کر رہے تھے اور لب ہلائے بغیر بدقت بول رہی تھی۔ ”کہ مجھے سانپ کا ڈر ہے۔“

”زیلی.... پھر....“ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ قریب آرہا تھا....

”مجھے.... اس بات کا ڈر ہے کہ.... آپ دونوں....“ اس نے گلابی پڑتی آنکھوں سے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”مجھے.... اس سانپ کے.... حوالے کر کے.... اکیلا.... چھوڑ جائیں گے۔“

وہ ٹھہرا۔ قدرے بے یقینی قدرے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے میں اتنا برا ہوں؟“

”نہیں۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں اتنی بری ہوں۔“ ایک آنسو آنکھ کے کنارے سے ٹپکا اور پسینے کے ساتھ غلط ملط ہو گیا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ سانپ پہ نظریں جمائے مزید قریب آیا اور پھر ایک دم بازو بڑھا کے چاقو اس کے اندر گھونپ دیا۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ سانپ کا سر کٹ کے نیچے جا گرا۔ اور لمبا سا دھڑ دیوار پہ پڑنے لگا۔

وہ تیزی سے باہر کو بھاگی۔ ایڈم نے سر کے گرتے ہی اسے بوٹ تلے پھیل دیا۔

وان فاتح نے اس کا تڑپتا دھڑاٹھایا اور الٹ پلٹ کے بغور دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس کی تڑپ دم توڑ گئی۔

وہ ہراساں سی بابر کھڑی تھی۔ رسی نما دھڑاٹھائے وہ بابر آیا اور اسے دور اچھال دیا۔ جنگل کے گھنے درختوں اور اونچی نیچی ڈھلان میں وہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ پھر اس نے فرصت سے اس لڑکی کو دیکھا جو بار بار تھوک نگل رہی تھی۔ اسے دیکھتا پا کے وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

”میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ اگر آئندہ کہوں کہ میں تمہیں بچالوں گا تو اس کا مطلب ہے میں.... تمہیں... بچالوں گا۔“

”ہاں۔ جھوٹ تو صرف میں بولتی ہوں۔ آپ سب تو بہت عظیم انسان ہیں۔“ اس کا جانے کیوں گلا رندھ گیا۔ بھگی آواز میں کہتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

چاندنی اتنی مدہم تھی کہ وہ چند قدم ہی آگے جا پائی۔ پھر رکی۔ (اگر یہاں بھی سانپ ہوئے؟ اوہ نو۔) وہ واپس پلٹی اور غار کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ مٹی گیلی تھی اس لئے اس کے قدموں نے چاپ پیدا نہیں کی۔ پتے تک نہیں کھڑکے۔ وہ غار کے قریب تھی کہ سماعت سے آوازیں ٹکرائیں۔ اندر فاتح اور ایڈم کچھ بول رہے تھے۔ وہ رک کے سننے لگی۔ ایڈم نے جانے مننا کے کیا کہا تھا کہ وہ جواب میں کہنے لگا تھا۔

”میں آئندہ کبھی نہ سنوں کہ تم اس کو اس کی پرانی زندگی کا حوالہ دے رہے ہو۔ یاد رکھو اس نے ہم سے سچ بولا ہے۔ اس کے لئے بہت ہمت چاہیے ہوتی ہے۔“

وہ چونک کے غار کو دیکھنے لگی۔

”مگر سر، چند گھنٹے پہلے تک تو وہ اسی زندگی میں تھیں۔ انہوں نے وہ چھوڑی تو نہیں ہے اور کیا معلوم وہ اب بھی کچھ نہ کچھ جھوٹ بول رہی ہوں۔“

”وہ جھوٹ نہیں بول رہی اب۔“

”ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ اب سچ بول رہی ہیں۔“

”ہمیں پتہ چلانے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ہمیں صرف انسان کے اندر کی اچھائی پہ بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کسی پہ ہمارا یقین اس کو سچا بناتا ہے۔ بہر حال، آئندہ میں تمہارے منہ سے نہ سنوں یہ سب۔“ تالیہ کا دل بھر آیا۔

”آئندہ؟“ ایڈم کا دماغ ایک ہی لفظ پہ اٹک گیا۔

”ہاں ایڈم.... آئندہ! کیونکہ اس جنگل سے نکلنے میں ہمیں ابھی کافی وقت لگنا ہے....“

”کافی وقت کیوں؟“

”کیونکہ جنگل.... زندہ ہوتا ہے۔“

غار کے بابر کھڑی لڑکی جہاں بہت سے بوجھ سے آزاد ہوئی وہیں ایک بازگشت اسے چاروں طرف سنائی دینے لگی۔

جنگل زندہ ہوتا ہے۔ جنگل ہمیشہ زندہ ہوتا ہے۔

☆☆=====☆☆

رات لمحہ بہ لمحہ بیت رہی تھی۔

رات صدی بہ صدی بیت رہی تھی۔

اتنی سیاہ گھور اندھیرا رات... لگتا تھا کبھی ختم ہی نہیں ہوگی۔ جنگل میں دور دور سے مسلسل آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پرندوں اور جانوروں کی۔ مگر وہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایڈم غار سے نکل آیا تھا اور باہر ایک پتھر پہ بیٹھا تھا۔ فاتح قریب میں مارچ سے روشنی ڈالے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور انداز میں ٹھہراؤ تھا۔

تالیہ کافی فاصلے پہ بارش کے جمع ہوئے پانی کے جوہڑ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سیل کی مارچ اس نے جلا رکھی تھی کہ جانے کب کوئی سانپ بچھونکل آئے۔ جنگل زندہ تھا۔ احساس ہو گیا تھا۔ پتھروں کے نیچے... درختوں پہ... چٹانوں پہ ریگلتے کتنے جانور اور کیڑے مکوڑے ان کے ساتھ موجود تھے۔ وہ جنگل کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

اس کے پاس پانی کی ایک ہی بوتل تھی جس سے وہ تینوں پانی پی چکے تھے اور پانی ختم ہو چکا تھا۔ کولا کاکین بھی ختم ہو چکا تھا۔ شدید جس اور گرمی ہو رہی تھی۔

”سر...“ ایڈم نے فاتح کو یوں پتھروں میں کچھ تلاش کرتے دیکھا تو پکار اٹھا۔ ”آپ اتنے آرام دہ کیسے لگ ہو گئے ہیں؟ میرا تو مارے مایوسی کے برا حال ہے۔“ وہ اداس لگ رہا تھا۔

”وان فاتح نے اس سے بڑے حادثے دیکھے ہیں ایڈم۔“

”کیا آپ جنگلوں میں بہت آیا کرتے تھے؟ چھینوں وغیرہ میں...“

”تم نے تو ملٹری میں ٹریننگ لی ہے، تم سے زیادہ وقت نہیں گزارا ہو گا میں نے جنگلوں میں۔“ اس نے ایک لکڑی کی ٹہنی زمین سے اٹھائی اور خنجر سے اسے کاٹا۔

تالیہ رخ موڑے پانی کے قریب بیٹھی تھی البتہ کان وہیں لگے تھے۔ خنجر سے ٹہنی کے کاٹنے کی آواز کی گونج پلٹ پلٹ کے سنائی دی تھی۔

”ملٹری کی یاد بھی تکلیف دہ ہے...“ ایڈم نے چہرہ ہاتھوں میں گرا دیا۔ ”میں وہ سب بھلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔“

”کیوں؟“ فاتح اس کے سامنے پتھر پہ آ بیٹھا اور گھٹنے پہ ٹہنی رکھ لی۔ پھر خنجر سے اسے چھیلے لگا۔

”کیونکہ مجھے نسلی تعصب کی وجہ سے وہاں سے نکالا گیا تھا۔ میں وہ سب نہیں بن سکا وہاں جو میرے دوست بنتے گئے۔“

”تو اس میں اتنا غمگین ہونے والی کون سی بات ہے؟ ہر انسان کسی نہ کسی مقام پہ جاب میں دھکا کھاتا ہے۔“ وہ اب سر جھکائے لکڑی کو

مہارت سے خنجر سے چھیل رہا تھا۔ ایڈم نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”سر... میری جاب چلی گئی میرا کیریئر ختم ہو گیا۔ اس دھکے نے میری زندگی برباد کر دی۔“

”اور تم نے اس سے کیا سیکھا؟“ خنجر چلاتے ہوئے پوچھا۔ جواب نہیں آیا تو نظریں اٹھا کے ایڈم کو دیکھا۔ ”کیا تم نے اس واقعے سے کچھ نہیں سیکھا؟“

تالیہ نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا اور مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ میری زندگی کا ایک ٹریجک ترین واقعہ تھا۔“

”ایڈم، ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دو چیزوں سے آزاد کر دیا تھا۔ ماضی کے غم اور (تالیہ کو کنکھوں سے دیکھا۔) مستقبل کے خوف سے۔ کوئی برا واقعہ تمہارے ساتھ گزرا بھی ہے تو تم اس کو اپنا استاد بنا لو۔ بس۔ بات ختم۔“

”وہ کیسے؟“

”سوچو کہ یہ کیوں ہوا؟ اور اگلی دفعہ وہ کام نہ کرو۔ اس کو میچور ہونا یاد کرونا کہتے ہیں۔ کیوں تم لوگ پرانے غم سینے سے لگائے بیٹھے رہتے ہو۔ دنیا ماضی اور مستقبل کی قید سے آزاد لوگوں کی ہے۔“ چاقو کے لکڑی پہ چلنے کی آوازیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔

”مگر مجھے لگتا ہے میں ایک ٹوٹا فیلیئر ہوں۔ میں بات بات پہ گلٹی فیمل کرتا ہوں۔ یہ کیا بول دیا، یہ کیوں کر دیا۔“

تالیہ نے ناک سکوڑ کے چہرہ موڑ لیا۔ (گلٹی کا بچہ۔ اتنے دن میرے پیچھے پڑا رہا۔)

”یہ ان لوگوں کی نشانی ہے جو نہ خود سے پیار کرتے ہیں اور نہ ہی خود پہ بھروسہ کرتے ہیں۔“

”میرے پاس خود سے پیار کرنے کے لئے کوئی وجہ ہی نہیں ہے سر۔“ اس نے پھر سے چہرہ جھکا لیا۔

”تو پھر خود پہ بھروسہ کرنے کی وجہ ڈھونڈو۔ کسی کام میں تو تم بھی اچھے ہو گے۔“ وہ ٹہنی کو اب ایک طرف سے کاٹ رہا تھا۔ ایسی مہارت سے گویا ساری عمر یہی کام کرتا آیا ہو۔

”اگر ہوتا تو جاب نہ مل جاتی؟ میرا تو کوئی ٹیلنٹ ہی نہیں ہے۔“ اس کی گردن ابھی تک جھکی تھی۔ اطراف میں کھڑے اونچے درخت خاموشی سے ان کو دیکھتے رہے۔

”ہر انسان میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ تم میں بھی ہو گا۔ مایوسی چھوڑو اور یاد کرو۔ تم نے صبح کے جنگلوں میں تربیت لی ہے۔ جنگل میں انسان کو جو معلوم ہوتا ہے، وہ اس کی جان بچاتا ہے اور جو معلوم نہیں ہوتا (توقف کیا) وہ مار ڈالتا ہے۔“

اس کی آواز کی سنسنی اور رات کا اندھیرا۔ تالیہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

ایڈم نے پیشانی کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”مجھے کچھ بھی نہیں یاد۔ ہم تربیت لیتے تھے۔ ہمارے پاس گزرتی تھیں۔ ہم دشمن کا سوچتے تھے۔ دشمن کے مورچے، بارودی سرنگیں۔“ اس نے کراہ کے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ایک ٹوٹا فیلیئر ہوں سر۔“

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کو چھیلتا رہا۔ ایڈم چند لمحے بے بسی سے اسے دیکھتا رہا، پھر لبوں کو جنبش دی۔ ”آپ کی بیٹی بھی

پیازوں میں کھوئی تھی نا، سر۔“

خنجر سے لکڑی کو چھیلنے اس کے ہاتھ تھے۔ سوگوار بیت سے مسکرایا اور نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”ہاں۔ گینگ ہائی لینڈ کے ٹریک پہ۔“
تالیہ پھر سے مڑ کے اس کو دیکھنے لگی۔ اسے آریانہ کے ذکر پہ وان فاتح کے چہرے پہ جس دکھ کی توقع تھی وہ وہاں نہیں تھا۔

”کیا آپ اس کے بعد دوبارہ بھی جنگل یا پیازوں میں گئے؟ آپ کو تکلیف نہیں ہوتی تھی؟“

”ظاہر ہے میں گیا۔ اور تکلیف کا علاج فرار سے نہیں کیا جاتا۔ جو تکلیف دیتا ہے اس سے بھاگ جاؤ تو کیا زخم بھر جائے گا؟ نہیں بے وقوف انسان۔ ماضی سے نکل کے حال میں جینے سے زخم بھرتے ہیں۔ تالیہ.... مجھے تمہارا کوٹ چاہیے۔“ آخر میں گردن گھما کے پانی کی طرف دیکھا جہاں وہ گردن موڑے بیٹھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میرا کوٹ کیوں؟“ اس نے اچنبھے سے ساتھ رکھے کوٹ کو دیکھا جو گرمی کے باعث اس نے اتار دیا تھا پھر اسے اٹھایا اور گول مول کر کے فاتح کی طرف اچھال دیا۔

”کیونکہ میں فیر تھری میں ہوں اور تم دونوں ابھی فیر ون سے نہیں نکلے۔“ کوٹ اس کے قریب گرا تو فاتح نے جھک کے وہ اٹھایا اور اسے الٹایا۔ پھر اندر ایک جگہ خنجر رکھا۔ ”جنگل میں آنے کے بعد.... تمہیں ملٹری میں بتایا گیا ہو گا ایڈم.... انسان تین فیرز سے گزرتا ہے۔“
خنجر کو اندر گھونپا اور زور سے نیچے لایا۔ کوٹ کی اندر وئی لائنگ ٹرپ کی آواز کے ساتھ کلتی چلی گئی۔ تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ (میرا رالف لارین کا کوٹ۔)

”فیر ون.... جب انسان جنگل میں اترتا ہے اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون سی دنیا میں آ گیا ہے۔ خوف کا فیر۔“
اب وہ ہاتھوں سے لائینگ پھاڑ رہا تھا۔ ریشمی کپڑے کے پھٹنے کی آواز دور دور تک جاتی اور بازگشت پلٹ کے سنائی دیتی۔
”فیر ٹو.... جب اسے احساس ہوتا ہے کہ جنگل زندہ ہے۔ سانپ، بچھو، کیڑے.... وہ اس کے فرش اور درختوں میں چھپ کر انسان کو دیکھ رہے ہیں۔“

تالیہ کی گردن کے بال کھڑے ہونے لگے۔ وہ پانی سے ذرا دور سمٹی۔ ایڈم نے اپنے پیر اوپے کر کے دوسرے پتھر پہ رکھ لیے۔
”اور فیر تھری!“ اس نے خنجر رکھ دیا اور کوٹ اٹھا کے دیکھا۔ لائنگ کھل جانے کے باعث جو بڑا سا کپڑا بن گیا تھا۔ ”جب انسان جنگل سے لڑنے کا ارادہ ترک کر کے سمجھداری سے پلان بناتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ بہتر ہو گا اگر تم لوگ جلد اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لو اور آگے کا سوچو۔“ وہ کوٹ اور ٹہنی اٹھائے کھڑا ہوا اور نارچ کی روشنی آگے بھینکتا ایک طرف چلتا گیا۔ وہ دونوں گردنیں موڑ کے اسے جاتے دیکھتے رہے یہاں تک کہ روشنی غائب ہو گئی۔

”فاتح صاحب کہاں گئے؟“ وہ بول اٹھا۔

”وہ اتنے مطمئن کیسے ہو سکتے ہیں؟“ وہ بڑبڑائی۔ گردن اٹھا کے اطراف کو دیکھا جہاں مہیب پراسرار درخت اسے دیکھ رہے تھے۔

زندہ درخت۔ زندہ جنگل۔ اسے جھر جھری آئی۔ ایڈم بھی یہی سوچ رہا تھا مگر بولا نہیں۔

دور.... کافی فاصلے پہ وہ تارچ کی روشنی آگے ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ سفید لباس والی آریانہ چپکے سے اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔

”مجھے پتہ ہے ڈیڈ، آپ ان کے سامنے خود کو کتنا مضبوط ظاہر کریں، آپ خود بھی پریشان ہیں۔“

”ظاہر ہے میں پریشان ہوں، فرسٹرینڈ ہوں، بلکہ وحشت زدہ ہوں۔“ وہ ایک درخت کے قریب رکھا اور اس سے لگی موٹی ٹہنی کو چھوا۔

”تو آپ کو واقعی یقین ہے کہ آپ ان کو اس جنگل سے نکال لیں گے؟“

”میں نے تمہیں ہمیشہ کیا سکھایا ہے آریانہ؟“ وہ آرام سے بولتے ہوئے ٹہنی کو درخت سے اتارنے لگا جو بل کی صورت میں اس سے

لپٹی ہوئی تھی۔ ”انسان امید نہیں چھوڑتا۔ جتنے برے حالات ہوں، آنکھیں ہمیشہ ’انعام‘ پر رکھی ہوتی ہیں۔ صبر کے بیٹھے پھل پہ۔“

”Eyes on the Prize!“ وہ ہلکا سا ہنسی۔ مگر اس کی ہنسی کی بازگشت نہیں سنائی دیتی تھی۔

”اور اگر میں ان دونوں کو ایک جنگل سے نہ نکال سکا....“ اس نے ٹہنی اتارتے ہوئے زخمی سا مسکرا کے آریانہ کو دیکھا۔ ”تو میں اپنے

ملک کے کروڑوں لوگوں کو ان حالات سے کیسے نکالوں گا جس میں وہ جی رہے ہیں؟“

وہ مسکرا دی۔ فاتح ٹہنی کے بل کھولنے لگا۔ جب اسے اتار کے وہ مڑا تو آریانہ غائب ہو چکی تھی۔

وہ گہری سانس لے کر واپسی کے لئے قدم اٹھانے لگا۔

‘Eyes on the Prize’

☆☆=====☆☆

رات ایسی طویل تھی کہ کلتی ہی نہیں تھی۔ اندھیرا چھٹتا ہی نہیں تھا۔ چاند کی روشنی پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اس کے موبائل کی بیٹری گر رہی تھی مگر

وہ پھر بھی اسے جلانے بیٹھی تھی۔ نیند کا احساس تو غالب نہیں آیا مگر اب بالآخر بھوک لگنے لگی تھی۔

پتھروں اور پتوں پہ بوٹ رکھنے کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ فاتح اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ذرا چوکنی سی ہو کے بیٹھی۔ مڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ

اس کے ساتھ والے پتھر پہ آ کے بیٹھا اور کوٹ کا کلر اس کو دکھایا۔

”تمہیں اس کی ضرورت تو نہیں تھی؟“

اس نے اس نظر پر اٹھا کے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو انکو۔“ آواز دھیمی تھی۔

”کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے؟“

”چاکلیٹ.... رکھتے رکھتے رہ گئی۔ اب بہت یاد آرہی ہیں۔“

”صبح ہوتے ہی ہم کھانا ڈھونڈیں گے۔ فکر مت کرو۔“ وہ نرمی سے کہتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میں نے آپ کے گھر میں چوری کی.... آپ کو حاملہ بن کے دھوکہ دیا۔ گھائل غزال.... نیلامی.... گھر خریدنا.... پینٹنگ بنانا.... میں نے

اتنے اس کام کیے اور آپ ایک دم میرے ساتھ اچھے ہو گئے ہیں۔ کیوں؟“

”کیونکہ تم نے مجھ سے سچ بولا ہے۔“ وہ اسی نرمی سے بولا تھا۔

”میرے پاس کوئی اور آپشن تھا کیا؟“

”تالیہ اگر تم اب ہمیشہ....“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کیا لفاظ ادا کیے۔ ”مجھ سے سچ بولو گی... تو مجھے تم سے کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔“

”مگر آپ دل سے میری عزت نہیں کرتے نا۔“ وہ دکھی ہوئی۔ ”اگر ہم واپس گئے بھی تو آپ مجھے ایک دن میں ہی بھول جائیں گے۔“

”تمہیں واپس جانے کا یقین نہیں ہے؟“ رات کے اندھیرے میں وہ شخص سامنے بیٹھا تھا جس پہ ایک دوسری دنیا میں جانے کتنے لوگ

فدا تھے۔ جس کا ایک ایک منٹ کیلکولیڈ ہوتا تھا۔ پولیٹیکل سیکرٹری کی ڈائری میں نوٹ شدہ۔ اور اب.... وہ اس کے سامنے فرصت سے بیٹھا

تھا۔ ایک تنہا جنگل میں۔ جہاں کرنے کو کوئی اور کام نہ تھا۔

”میں کبھی بھی ہمت نہیں ہارتی تھی تو انکو۔ ایڈم کی طرح میں ماضی میں بھی نہیں رہتی۔“ وہ سو گواریت سے پانی کو دیکھتے ہوئے بتانے لگی

۔ ”میرے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔ پلان اے فیل ہوا تو سی نہیں تو ڈی۔“

”اور بی؟“

”تالیہ کے پلان ہیں تالیہ کی مرضی۔“ ذرا سے کندھے اچکائے۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”مگر اب میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔“ اس نے تھوڑی گھٹنوں پہ رکھ دی اور تالاب کو دیکھنے لگی۔ ”میں اتنے عرصے سے ایک بڑی

واردات کا انتظار کر رہی تھی۔ میرے مستقبل کے سارے خواب اس کے ساتھ جڑے تھے۔ پھر خزانے کا ذکر آیا تو مجھے لگا یہی میرے

سارے مسئلوں کا حل ہے لیکن اب.... جب خزانہ نہیں ہے تو میرا مستقبل ہی ختم ہو گیا ہے۔ مجھے کوئی امید نہیں رہی۔“

”تم مستقبل کے خوف کا شکار ہو۔ یہ ماضی کے غم جیسا ہی برا ہوتا ہے۔“ وہ افسوس سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اندھیر جنگل خاموشی سے ان کی

گفتگو سن رہا تھا۔ اور دور بیٹھا ایڈم بھی۔

”آپ کو مستقبل سے خوف نہیں آتا؟“

”مثلاً کس چیز سے؟“

”جب آپ وزیر اعظم نہیں بنیں گے تو جو جگہ بنائی اور شرمندگی ہو گی۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ آپ وزیر اعظم نہیں بن سکتے تو انکو۔“

”اچھا۔“ وہ دلچسپی سے مسکرایا۔ ”اور میں وزیر اعظم کیوں نہیں بن سکتا۔“

”کیونکہ آپ سیاسی طور پہ مضبوط نہیں ہیں۔ سیاستدان آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ آپ ان جیسے داؤ بیچ آزمانا نہیں جانتے۔“

آپ.... اس کی آواز بلند ہوئی۔ بے بسی بھرے غصے سے۔ ”آخر آپ کیوں لڑ رہے ہیں سیاسی جنگیں آپ کو خود بھی معلوم ہے کہ آپ نے

ہار جانا ہے۔ آپ سب چھوڑ کے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملک سے چلے کیوں نہیں جاتے؟“

”تم نے کبھی فٹبال میچ دیکھا ہے؟“ وہ اسی طرح دلچسپی سے مسکراتا گویا ہوا تو تالیہ نے گہری سانس لی اور اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔
 ”جی تو انکو۔ دیکھا ہے۔“

”ایک دفعہ میں امریکہ میں ایک میچ دیکھنے گیا۔ بچپن کی بات ہے۔ جانتی ہوں ایک ٹیم نے چار گول کر لیے تھے اور دوسری کے گول صفر تھے۔ میچ کے آخری تین منٹ تھے اور دوسری ٹیم کے کھلاڑی آخری حد تک مقابلہ کر رہے تھے۔ بار بار حملہ کرتے۔ ہمت ہارے بغیر۔ تین منٹ میں ان کو جیتنے کے لیے پانچ گول چاہیے تھے۔“
 ”وہ تین منٹ میں پانچ گول تو نہیں کر سکتے تھے پھر کیوں؟“

”یہی تو میں نے سوچا.... سب کو معلوم ہے کہ پہلی ٹیم جیت جائے گی، پھر دوسری ٹیم آخری سیکنڈ تک کیوں لڑ رہی ہے؟ ہتھیار ڈال دے اور بس کر دے۔ اور پھر پہلی ٹیم جیت بھی گئی لیکن آخری سیکنڈ تک دوسری ٹیم کے لڑنے کے جواں مردی سے لگے رہے۔“

خاموش مگر زندہ جنگل سن رہا تھا۔ ایک ایک حرف کو بغور پرکھ رہا تھا۔ وان فاتح کہے جا رہا تھا۔
 ”مگر جب میں بڑا ہوا اور میں نے دنیا دیکھی تو مجھے احساس ہوا کہ... لڑائی صرف جیتنے کے لئے نہیں لڑی جاتی۔ دوسری ٹیم ہتھیار ڈالتی تو بھی ہار جاتی۔ آخری منٹ تک مقابلہ کرتی تو بھی ہار جاتی۔ پھر بھی اس نے لڑنے کو اس لئے چنا کیونکہ جب ہم لڑنے کے ہار جاتے ہیں تو ہم اس سے کچھ سیکھتے ہیں۔“

تالیہ کا موبائل پتھر پہ پڑا چمک رہا تھا اور اس کی روشنی فاتح کے چہرے کو منور کیے ہوئے تھی۔
 ”پھر ہم اپنی غلطیوں کا جائزہ امید کے ساتھ لیتے ہیں اور اگلی دفعہ زیادہ جذبے سے میدان میں اترتے ہیں۔ زندگی میں یا ہم نیچے جا رہے ہوتے ہیں یا اوپر۔ ہمیں ہر لمحہ خود کو اپنے کیریئر رشتوں اور عمل میں بہتر کرنا ہوتا ہے۔ جہاں ہم رکے... وہاں ہم (ہاتھ سے اشارہ کیا) نیچے گئے۔“

”آپ کو اس بھیا تک جنگل میں کون سی امید نظر آرہی ہے؟ میری تو زندگی ہی ختم ہو گئی ہے۔“
 وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ شدید مضطرب اور جڑے چڑی دکھائی دیتی تھی۔
 ”تم نے کہا تم ان کاموں کو چھوڑ دینا چاہتی تھیں۔ کیوں؟“

”کیونکہ میں تنگ آ گئی تھی۔“ وہ دبا دبا سا چلائی۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ”میں لوگوں کو دھوکے دے دے کر ان سے جھوٹ بول بول کر بے زار آچکی تھی۔ مجھے سکون چاہیے تھا۔“

”گڈ۔ اب تمہیں یہاں کسی سے جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا۔“
 تالیہ مراد بالکل ٹھہر گئی۔ گم صم۔ لا جواب۔

”یوسی....“ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھا۔ ”تم یہاں بنا خوف و خطر سچ بول سکتی ہو۔ یہاں کوئی پولیس نہیں ہے۔ اگر یہ واقعی پندرہویں

صدی ہے تو یہاں کوئی تمہیں اکیسویں صدی کے جرائم کے لئے نہیں پکڑے گا، تالیہ۔ تم نے سرے سے سب شروع کر سکتی ہو۔“
اس کے کھڑے ہوتے ہی آسمان کا وہ ذرا سا حصہ جو گھنے درختوں سے نظر آتا تھا سفید پڑنے لگا۔ سورج کی پہلی کرنیں درختوں کے
سچ سے گزر کے جنگل کے فرش پہ پڑیں تو وہ دنگ رہ گئی۔

رات کو بالآخر صبح نے مات دے دی تھی رات دم توڑ گئی تھی۔ کیا واقعی؟
وہ تو سمجھنے لگی تھی کہ دنیا سے سارے اجالے ختم ہو گئے تھے مگر... نہیں...

اس نے چونک کے وان فاتح کو دیکھا جو اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا... امید ابھی بھی باقی تھی۔

اس کے چہرے پہ مغموم مسکراہٹ بکھر گئی۔ فاتح کو دیکھتے ہوئے اس نے سر خم دیا۔ گویا کچھ باتیں دماغ میں بیٹھی تھیں۔

”میں کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے مڑا اور درختوں کی قطار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یکدم رکا اور ہاتھ کو جھٹکا
دیا۔ کوئی جھکی ہوئی نوکیلی شاخ اس کے ہاتھ کی پشت کو کھرچ گئی تھی۔ جنگل میں ہر طرف سب کچھ اتنا نوکیلا اور تیز تھا کہ پہچانا ممکن تھا۔ وہ
رک کے اپنا ہاتھ دیکھنے لگا۔ سطح پہ معمولی سا کٹ لگا تھا اور خون کے دو قطرے بہتے تھے۔

”تو اٹکوا“ وہ پریشانی سے کھڑی ہوئی۔ ”آپ کو زخم آیا ہے۔“

”ذرا سا کٹ ہے۔“

”آف کورس مجھے پتہ ہے کہ یہ ذرا سا کٹ ہے مگر یہ اوپن wound ہے اور ہم جنگل میں ہیں۔ یہ تو septic ہو جائے گا۔“ وہ اٹھی
اور فکر مندی سے کہتی قریب آئی۔

ایڈم جو ابھی تک سامنے اس سا بیٹھا تھا بس سر اٹھا کے دیکھنے لگا۔ افسوس اور مزید اداسی سے۔

”امید ہے septic نہیں ہوگا۔“ فاتح نے ہاتھ نیچے کر لیا اور عام سے انداز میں تسلی دی مگر وہ پریشانی سے اسے دیکھتی رہی۔

”میرے پاس تو صرف اوزار ہیں۔ کوئی اینٹی سپیک ساتھ رکھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی کبھی خود کو۔ اب کیا ہوگا؟ ہم تو ان چھوٹے
چھوٹے زخموں سے ہی مر جائیں گے۔“ صبح کی پھیلتی سفیدی بھی اس کی امید کو ناامیدی میں بدلنے سے نہ روک سکی۔

ایڈم بن محمد نے ایک دم سراٹھایا۔ ”antiseptic“ وہ بڑبڑایا۔

دونوں نے گردنیں موڑ کے اسے دیکھا۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں وہ کھڑا ہوا تھا۔

”ہمیں اینٹی سپیک کی کیا ضرورت ہے؟ ہم رین فوریسٹ میں ہیں۔ یہ قدرت کی سب سے بڑی میڈیسن کینیڈ ہے۔“ چونکے

ہوئے انداز میں ایڈم اپنی ایڑیوں پہ گھوما۔ گول چکر کی صورت اس نے چاروں طرف دیکھا۔

(رین فوریسٹ اور جنگل میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جنگل میں درخت بھی ہوتے ہیں آسمان بھی دکھائی دیتا ہے اور زمین پہ پودے اور

جھاڑیاں بھی اُگی ہوتی ہیں۔ رین فوریسٹ کے درخت اتنی گچھک ہوتے ہیں اور اوپر جا کے اتنے گھنے ہو جاتے ہیں کہ ان کی کیونو پی سی بن

جاتی ہے۔ سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ سکتی۔ سوز مین پہ پودے اور جھاڑیاں کم کم ہوتے ہیں۔ اور درخت بارش کے پانی کے باعث نشوونما پاتے ہیں۔)

وہ جو پہلے درختوں سے انا جنگل دکھائی دے رہا تھا.... ایک دم وہ کچھ اور دکھائی دینے لگا.... مختلف قسم کے پتے.... مختلف قسم کی لکڑیاں.... کہیں کہیں اگے جنگلی پھول.... جڑی بوٹیاں.... برشے جیسے چمکنے لگی تھی.... ان کے نام.... ان کے کام.... صبح کی سفیدی نے ذہن کو کسی اور طرح سے بیدار کر دیا تھا۔

”ملائیشیاء کے رین فاریسٹ میں دس ہزار سے زیادہ اقسام کے پودے اور درخت ہوتے ہیں۔ یہ تو قدرت کی پوری فارمیسی ہے۔“ وہ مسخور سا کہہ رہا تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“ وہ مشتہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”سیریسلی جے تالیہ.... آپ کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟“ وہ تیزی سے فاتح کے قریب آیا جو فور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اٹھا کے دیکھا۔

”ہمیں جنگل میں سیکھایا گیا تھا کہ کیا کھانا ہے اور زخم پہ کیا لگانا ہے اور میں خود جڑی بوٹیوں سے اپنے دے کا علاج کرتا تھا۔ میرے پاس ایک کتاب بھی تھی۔“ اس نے فاتح کا ہاتھ اٹھا کے معائنہ کیا۔ ”آپ کا اوپن wound ہے۔ اس کے لئے ہمیں....“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”destroyer پلانٹ کے پتے چاہیے ہیں۔ رین فاریسٹ میں اس کی بہتات ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں نے سفید پھولوں والا یہ پودا کل اس طرف دیکھا تھا۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“

”اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لئے بھی۔“ فاتح مسکرا کے اس کا جوش دیکھ رہا تھا۔

ایڈم کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بے کار اور ناکام نہیں ہے، یہ خیال اس کے اندر بجلیاں بھر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے تالیہ کا خنجر اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ پھر ذرا ٹھہرا اور قریب میں ایک پودے کے پتوں کو توڑ مروڑ کے ان کا رخ موڑ دیا۔ چند قدم آگے بڑھا اور قطار میں ایک اور پودے کے پتے مروڑ کے موڑے۔

”یہ کیا کر رہا ہے؟“ وہ ابھی تک شک سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”وہ راستے پہ نشانیاں چھوڑ رہا ہے۔ تاکہ واپس آسانی سے پہنچ جائے۔ وہ خود پہ بھروسہ کرنا سیکھ رہا ہے۔ جو اسے معلوم ہے، وہ جان بچائے گا، جو نہیں معلوم، وہ جان لے سکتا ہے۔“ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے مسکرا کے اسے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ ”تم فکر مت کرو۔ وہ کھانے کے لئے کچھ لے آئے گا۔ پھر ہم اگلا لائحہ عمل تیار کریں گے۔“

”اوکے!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرائی۔ چلو شکر ہے وہ صحرائیں نہیں تھے، بلکہ جنگل میں تھے۔ یہاں مختلف پھل مل جائیں گے کھانے کے لئے۔ پانی کے تازہ جھرنے بھی کہیں بہہ رہے تھے، آواز آرہی تھی۔ یہ بارش کے پانی کا جو ہڑتو گندا تھا، مگر جھرنے تک جب

وہ جائیں گے تو خوب سیر ہو کے پی لیں گے۔

اس نے خود کو تسلی دی۔

جنگل میں اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ درخت کافی اونچے تھے اور اوپر جا کر ان کے پتے آپس میں گلے ل رہے تھے، گویا سبزی چھت بنا رکھی تھی۔ سبز چھت کے درمیان بڑے بڑے سوراخوں سے روشنی چھاؤں کی صورت اندر آتی لیکن گرمی اور جس بلا کا تھا۔ روشنی سنہری ہو گئی تھی جب ایڈم واپس آیا۔ اپنی اوپری شرٹ اس نے اتار دی تھی اور اب صرف سیاہ شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسری شرٹ میں جانے کون سے پتے اور جڑی بوٹیاں بھر لایا تھا۔

فاتح وہیں پتھر پہ بیٹھا تھا۔ ایڈم نے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک پتے کو مروڑ کے اس کا رس زخم پہ لگایا۔

”یہ کسی بھی اینٹی سپٹک سے زیادہ تیزی سے اثر کرے گا۔“ وہ جوش سے بتا رہا تھا۔

”تھینک یو ایڈم!“ وہ مسکرا کے اس کا انداز دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ کھڑا ہوا اور ایک پتے میں کچھ لپٹا ہوا تالیہ کی طرف بڑھایا۔

”یہ کھانے کے لئے ہے۔“ تالیہ کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ اس نے بھاری سا وہ پٹا پکڑا اور ساتھ پتھر پہ بیٹھی۔ گھٹنوں پہ بتا رکھ کے کھولا تو مسکراہٹ غائب ہوئی۔

پتے پہ ایک قطار سے کوئی انگلی جتنی چیزیں رکھی تھیں۔ پہلے اسے اچنبھا ہوا۔ گردن جھکائی۔ پھر ان چیزوں کے پڑنا نگیں بازو نظر آئے تو وہ بلبلہ کے کھڑی ہوئی۔

”یہ تو Grass hoppers ہیں۔“ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھا۔ ”تم... تم گراس ہو پرزلائے ہو؟“

”ریلیکس چے تالیہ! ان کے سر کاٹ دیے تھے میں نے۔ اب آپ کھا سکتی ہیں۔ میں نے بھی دو کھائے ہیں۔ ادھر یہی ملے گا۔“

وہ گردن پہ ہاتھ رکھتی دور ہئی۔ اسے متلی ہونے لگی تھی۔ ”دور ہو جاؤ تم مجھ سے ایڈم!“

”گراس ہو پر میں انرجی ہوتی ہے۔ میں نے اتنی مشکل سے پکڑے ہیں۔ انرجی نہیں ہوگی تو آپ زیادہ دیر چل نہیں سکیں گی۔“

”چپ کر جاؤ ایڈم!“

”وہ درست کہہ رہا ہے۔ جنگل سے لڑتے نہیں ہیں تالیہ۔ آنکھیں بند کر کے کھا لو۔“

”گراس ہو پرز؟“ اس نے صدمے سے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔ ”پورے جنگل میں اس کو صرف گراس ہو پرز ملے؟ کوئی پھل“

کوئی سبزی.... کچھ نہیں ملا؟“

”چے تالیہ.... میں کتنا چل سکتا تھا؟ مجھے سامنے یہی نظر آیا۔ اور یہ جنگل نہیں ہے۔ یہ رین فاریسٹ ہے۔“

”میں.... میں جھرنے کی طرف جا رہی ہوں۔“ اس کا اندر کھول رہا تھا۔ وہ تیزی سے مڑی۔ جہاں سے جھرنے کی آواز آرہی تھی اس

طرف بڑھی۔

”سوری مگر آپ جھرنے کا پانی نہیں پی سکتیں۔ نہ بارش کا پانی پی سکتی ہیں۔“ وہ اب اپنے پتے اور پھول جوڑ رہا تھا جیسے اپنی میڈلسن کیمینٹ سے بہت خوش ہو۔

وہ تلملا کے پٹی اور گھور کے اسے دیکھا۔ ”وہ کیوں؟“

”کیونکہ وہ پانی صاف نہیں ہوتا۔ اس میں جراثیم اور پیراسائٹ ہوتے ہیں۔ اس کو ابالے بغیر نہیں پیا جاسکتا اور درختوں کی لکڑی اتنی گیلی ہے کہ ہم اسے جلا بھی نہیں سکتے۔“ تالیہ کا دل ڈوبنے لگا۔ امید پھر سے ناامیدی میں بدلنے لگی۔

”تو ہم پانی کیسے پیئیں گے؟ ہم کیسے زندہ رہیں گے؟“ خاموش کھڑے درختوں کی میبت پھر سے طاری ہونے لگی۔

”یہ ٹہنیاں...“ فاتح نے بیٹھے بیٹھے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ جانے بانس کا درخت تھا یا کیا اس کی سیدھی سیدھی ٹہنیاں تھیں۔ جیسے بھوری لکڑی کی ڈنڈیاں ہوں۔

”ان کو کاٹیں گے تو اندر سے پانی نکلے گا۔ تازہ خالص پانی۔ تم وہ پی سکو گی۔“

تالیہ چپ ہو گئی۔ پھر ایک ناپسندیدہ نظر پتے پہ قطار میں رکھے گراس ہو پر زپہ ڈالی جن کے سر کٹے ہوئے تھے۔ (بدتمیز انسان نے رکھے بھی کیسے سجا کے ہیں۔)

”مگر... یا اللہ... میں یہ کیسے کھا سکتی ہوں؟“

”اچھا؟ میں تو سمجھا تھا تم ایورج فیئر ٹیل گرل نہیں ہو۔“ وہ سادگی سے بولا۔ سفید شرٹ گدلی ہو رہی تھی مگر چہرہ جھرنے سے ابھی دھو کے آیا تھا اور تازہ دم مسکرا رہا تھا۔ گیلے بال ہاتھ سے پیچھے کو کر دیے تھے۔

تالیہ نے لب بھنج لیے۔ وہ دونوں اب پہلے سے زیادہ آرام دہ نظر آتے تھے۔ فیر ٹو۔

”میں... ایورج فیئر ٹیل گرل... ہوں بھی نہیں۔“ وہ چبا چبا کے بولی اور قریب آئی۔ پتے سے ایک مرا ہوا گراس ہو پر اٹھایا۔ (آخ

تھو) مگر ساری کراہیت کو اندر دبائے اس نے وہ منہ میں ڈال لیا۔ آنکھیں زور سے میچیں اور چبایا۔

کرچی... کرچی اور انتہائی بد ذائقہ۔ یا اللہ۔ مگر کراہ تک منہ سے نہیں نکالی۔ آخری لقمہ حلق سے اتارتے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے مگر

وہ اسے چباتی گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

”مجھے نہیں معلوم میرے باپا کو کس سے خطرہ تھا جو انہوں نے مجھے ایک دوسری دنیا میں بھیج دیا، لیکن خدا کی قسم جس دن مجھے وہ شخص ملا

جس نے میرے گاؤں اور میرے باپا کو ان مسائل کا شکار کیا تھا، میں اس کی جان لے لوں گی۔“ بے بسی بھرے غصے سے بول رہی تھی۔ حلق

تک کڑوا ہو چکا تھا۔

”گڈ۔ تمہارے پاس پلان ہے فائنلی۔ خیر۔ میرے پاس بھی پلان ہے۔“ فاتح اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی چھوٹی آنکھوں میں ڈھیر

ساری امید تھی۔

”ہمیں STOP کرنا ہے۔ ایس ٹی او پی۔ ایس سے stop۔ ٹی سے think۔ او سے observe اور پی سے plan۔ ہم جب بھی جنگل جاتے تھے... اس STOP تدبیر کے ذریعے اگلا لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔“
وہ کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے کھڑا کہہ رہا تھا اور وہ دونوں اس کو سن رہے تھے۔
”ہم اسٹاپ اور تھنک کے مرحلے سے نکل آئے ہیں۔ اب مشاہدہ کرنا اور پلان کرنا ہے۔ اس لیے سنو۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆

(ہم اس وقت جنگل میں ہیں اور جنگل سے نکلنے کا واحد راستہ اس کے سب سے اونچے مقام تک پہنچنا ہوتا ہے۔)
وہ تینوں درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ لمبی قمیض اور الجھے بالوں والی تالیہ بیگ اٹھائے سب سے پیچھے تھی اور وان فاتح سب سے آگے۔

(ہمیں اونچائی کی طرف سفر کرنا ہے، جہاں سے ہم دیکھ سکیں کہ جنگل سے نکلنے کا راستہ کیا ہے اور وہاں سے کسی کو مدد کے لئے پکار سکیں۔
یقیناً آس پاس آبادی ہوگی۔)

ایڈم چلتے ہوئے پتے موڑ رہا تھا۔ فاتح آنکھیں چھوٹی کر کے متلاشی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا اور وہ سب سے پیچھے بڑھ چلا جا رہی تھی۔

(ہم ایک دن میں جنگل میں ڈیڑھ میل سے زیادہ نہیں چل سکیں گے۔ زمین سلیپری ہے، پیر پھنس جاتے ہیں۔)
زمین پہ سرخ بھوری مٹی گیلی تھی۔ اس میں پتھر، پتے، ٹہنیاں سب بکھرا ہوا تھا۔ وہ بدقت قدم اٹھا پار ہی تھی۔ بار بار کوشش کرنی پڑتی۔
اونچائی کو جاتے درخت خاموشی سے وقت کے ان تین مسافروں کو نرم زمین پہ اوپر چڑھتے دیکھ رہے تھے۔

(چونکہ جنگل زندہ ہے، ہمیں ڈنڈوں اور جوتوں کی آوازوں کے ساتھ سانپوں اور بچھوؤں کو اپنی آمد کی خبر کرنی ہوگی تاکہ وہ چھپ جائیں۔ وہ صرف ڈر کے حملہ کرتے ہیں۔ جب وہ ہمیں دیکھ لیں گے تو دور ہٹ جائیں گے۔)

ان تینوں نے لاٹھیاں اٹھا رکھی تھیں جو دراصل درختوں کی موٹی ٹہنیاں تھیں اور وہ ان کو زمین پہ رکھتے ہوئے قدم اٹھا رہے تھے۔ پتوں اور پتھروں پہ آواز پیدا ہوتی تھی۔ جنگل کا معاملہ عجیب تھا۔ درخت کے تنے پہ اگر آواز پیدا کر دیا ذرا سا جھٹکا دو تو اوپر شاخوں تک جا کر وہ آواز کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ نیچے تھوڑی سی حرکت اوپر جاتے جاتے اتنے شور بن جاتی۔

(ہمیں بہت سارا پانی پینا ہوگا۔ ٹہنیوں کو توڑ کے ہم رات بھر کے لئے ان کو بوتل پہ اور پتوں کے برتنوں میں الٹا کھڑا کر دیں گے۔ صبح تک کافی پانی جمع ہو جائے گا۔)

وہ ایک درخت کے پاس رکے کھڑے تھے۔ ایڈم ٹہنیاں کاٹ کاٹ کے ان کو دے رہا تھا۔ تالیہ نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کے ٹہنی

منہ پہ لٹکانی تو قطرہ بہ قطرہ پانی اندر گرنے لگا۔ تھوڑا اور آہستہ۔ مگر تازہ صاف پانی تھا۔

(یہ تالیہ کے کوٹ سے میں نے مچھلی پکڑنے کے لئے جال بنایا ہے، اگر ہم اس سے مچھلیاں پکڑ سکیں تو ہمیں گراس ہو پرز کی ضرورت نہیں پڑے گی)

وہ ایک جھرنے کے کنارے بیٹھے تھے۔ ایڈم چند کیڑے خنجر پہ اٹھائے، پانی پہ چھڑک رہا تھا۔ فاتح نے ایک ٹہنی کا loop سا بنایا، انگریزی حرف P کی طرح، اوپر کپڑا چڑھا کے بازو اور اس 'جال' کو پانی میں ڈال دیا۔ اس کے غم بال ماتھے پہ بکھرے تھے، جن کو وہ بار بار ہاتھ سے پیچھے کرتا تھا۔ وہ پتھر پہ بیٹھی اس کو دیکھے گئی۔ وہ اس لئے دیے اور سپاٹ سیاستدان سے مختلف نظر آ رہا تھا جس سے وہ چند دن پہلے ملی تھی۔ مگر تب اور اب میں فرق تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے حلیے کو دیکھا۔ گرد آلود قمیض، چہرہ بھی میلا۔ سنہری چوٹی سے نکلتے بال۔ وہ سوشلائٹ، وہ طرح دار امیر زادی.... وہ غائب ہو گئی تھی۔

(مگر ہو سکتا ہے کہ ہمیں مچھلی نہ ملے اور ہمیں انہی کیڑوں پہ گزارا کرنا پڑے۔)

فاتح نے ٹہنیوں اور کپڑے کا جال پانی سے باہر نکالا تو وہ خالی تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکا دیے۔ اس جھرنے کی مچھلیاں بہت تیز اور ہشیار تھیں۔ ہاتھ نہیں آرہی تھیں۔

(ہم زیادہ دیر جھرنے کے پاس رک نہیں سکیں گے۔ اگر مچھلیاں ہاتھ نہ آئیں تو ہمیں آگے بڑھتے رہنا ہوگا۔ ہر چند قدم پہ درختوں کی اقسام بدل جاتی ہے۔)

وہ اب گھنے اور موٹے تنے والے درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ ایڈم ایک درخت کے پاس رکا اور قدرے جوش سے کچھ بتانے لگا۔ وہ برے منہ کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔ وان فاتح سنتے ہوئے بار بار چہرے پہ آ یا پسینہ پونچھتا تھا۔

(ہو سکتا ہے ہمیں یہاں کوئی اور درخت مل جائیں جیسے ivory palm۔ اس کا پھل تمہارے کھانے کے قابل ہوگا، تالیہ۔)

ایڈم ایک پیتے کی شکل کے پھل کو کاٹ کے اندر کا گودا اس کی طرف بڑھا رہا تھا اس نے برے دل کے ساتھ تھاما اور منہ میں رکھا۔ یہ بھی بد ذائقہ تھا۔ یا اس کے منہ کا ذائقہ ہی کڑوا ہو چکا تھا۔ اُف وہ مر جانا چاہتی تھی۔

(رات کو سونے کے لئے ہم ان سانپ بچھوؤں کے ساتھ جنگل کے فرش کو شیر نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں hammock بنانے ہوں گے۔)

شام اتر آئی تھی، مگر روشنی کافی تھی۔ وہ ایک جگہ رکے ہوئے تھے اور لکڑیاں جوڑ رہے تھے۔ تالیہ ٹہنیاں کاٹ رہی تھی۔ فاتح لکڑی کے دو پول زمین میں گاڑھے ان کے درمیان ٹہنیوں کا جھولا بنا رہا تھا۔ بار بار وہ رک کے رسی نما ٹہنی کھینچتا اور اس کی مضبوطی چیک کرتا۔ یہ جھولا زمین سے چار پانچ فٹ اونچا تھا۔

(مجھ پر بہت زیادہ ہیں یہاں اور ایڈم کا کہنا ہے کہ ہمیں چیونٹیوں کی بنائی سرخ مٹی جو وہ پتوں کو توڑ کے بناتی ہیں، خود پہ لگانی ہوگی)

تا کہ چھپر اور کیڑے دور رہیں۔ یہ مٹی ابھی تک نظر نہیں آئی۔ چند میل کے سفر میں مل ہی جائے گی۔)

رات جنگل پہ چھائی تھی۔ وہ لکڑی کے دوپوڑ کے درمیان بنے ٹہنیوں کے جھولے پہ لیٹی تھی اور کھلی آنکھیں دور اوپر درختوں کے پتوں سے پار نظر آتے سیاہ آسمان پہ جمی تھیں۔ اس کے چہرے پہ سرخ مٹی لگی تھی۔

(اور جب ہم اس جنگل سے نکل جائیں گے تو ہمیں ملا کہ جانا ہوگا۔)

صبح کی سفیدی پھیلی تھی اور وہ جھرنے کے پاس بیٹھی ہاتھ منہ دھور ہی تھی۔ ایڈم قریب بیٹھا کسی ٹہنی کو چبا کے سوچنے رک جاتا۔ وہ مختلف پودوں کو ٹیسٹ کر رہا تھا کہ کون سا کھانے کے قابل ہے۔ وان فاتح ایک درخت کے ساتھ کھڑا پانی کے لئے ڈنڈیاں کاٹ رہا تھا۔

(ملا کہ یہاں سے کتنا دور ہے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ہمیں ملا کہ جانا ہوگا اور تالیہ کے والد کو ڈھونڈنا ہوگا۔)

کڑی دوپہر میں وہ خاموشی سے درختوں کے درمیان اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ بیگ اب فاتح نے اٹھا رکھا تھا۔ چہروں اور بازوؤں پہ سرخ مٹی لگی تھی۔ شکلیں میلی اور بدنما ہو رہی تھیں۔

(فی الحال تو آسمان نظر نہیں آرہا مگر جیسا کہ تالیہ کا کہنا ہے اس کے باپ نے اسے ستاروں سے گاؤں کا راستہ سمجھایا تھا، ہم جب جنگل سے نکلیں گے تو ستاروں سے راستہ ڈھونڈ لیں گے۔)

ایک اور رات اتر آئی تھی اور وان فاتح ٹہنیوں کے بستر پہ لیٹا تھا۔ ہاتھ میں اس نے اپنا بٹوہ کھول رکھا تھا جس میں آریانہ کی تصویر لگی تھی۔ اس نے تصویر سے اندر جھانکا۔ باپ کارن کے دودانے اندر چھپے ہوئے تھے۔ پھر اس نے تاریخ دیکھی۔ آج کاغذات نامزدگی جمع ہونے شروع ہو گئے ہوں گے۔ وقت کم رہ گیا تھا۔)

(مراد ایک شکار باز ہے۔ اگر وہ پہلے چابی بنا سکتا تھا تو وہ اب بھی چابی بنا لے گا۔ اس چابی کے ذریعے ہم واپس اپنی دنیا میں چلے جائیں گے۔)

جنگل میں روشنی پھیلی تھی اور وہ تینوں فاصلے فاصلے پہ بیٹھے تھے۔ تالیہ نے چہرہ گھٹنوں پہ گر رکھا تھا اور فاتح ایک ٹہنیوں کے گٹھے کو جوڑ رہا تھا۔ ایڈم دور بیٹھا اپنے موبائل پہ تصویریں آگے آگے کرتا جا رہا تھا۔ باپ، ماں، فاطمہ... اس کے دوست... عید کی تصویریں... عید کے پکوان... محلے کی دوکان۔ بیٹری اتمٹی۔ ٹون بجی اور موبائل بجھ گیا۔ پرانی زندگی سے تعلق کی جو ڈور بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔

(میرا نہیں خیال کہ تالیہ تم نے جو ہما ہم تینوں کے سر پہ دیکھا تھا وہ حکومت یا بادشاہی کی علامت تھا۔ ہمارے کچھ اور چیزوں کی علامت بھی ہوتا ہے۔)

رات کے اندھیرے میں جنگل کے درخت خاموش کھڑے تھے اور وہ ٹہنیوں کے جھولے پہ سکر کے لیٹی آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پہ سرخ مٹی ہنوز لگی تھی۔ آنکھیں ویران تھیں۔

”ہم سولہ جولائی کی رات دروازہ پار کر کے آئے تھے۔ کل بیس جولائی شروع ہو جائے گی۔“

ان دونوں کے بستر دور بنے تھے۔ مگر وہ اس کی آواز سن سکتے تھے۔ فاتح بستر پہ نہیں تھا۔ پتھروں پہ بیٹھا ہنؤہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ کسی نے تالیہ کو جواب نہیں دیا۔ ہر روز چل چل کے گرمی اور جس سے توانائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔

”نہیں جولائی کو میری سالگرہ ہوتی ہے۔ جو تیم خانے میں لکھوائی گئی تھی۔“

وہ دونوں خاموش رہے۔ وہ اوپر آسمان کو دیکھتے ہوئے بے خودی کے عالم میں بولے جا رہی تھی۔

”مگر میری طرح میری سالگرہ بھی جعلی ہی ہوگی۔“ ایک آنسو آنکھ سے نکلا، کپٹی پہ بہتا نیچے ٹپکا اور جنگل کے فرش پہ جا گرا۔

وہ دونوں خاموش رہے۔ درخت خاموش رہے۔ دور پتھروں اور غاروں میں چھپے سانپ بچھو خاموش رہے۔

(ہما صرف خوش بختی یا حکومت کی علامت نہیں ہوتا۔ یہ اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لینے والا پرندہ ہے۔ یہ rebirth کی علامت ہے۔ نئی

زندگی کا نشان۔

نئی دنیا، نئے زمانے میں ایک دوسری زندگی کی پیش گوئی)

☆☆=====☆☆

اونچے درختوں کے پتوں سے چھن کے آتی روشنی نے جنگل منور کر رکھا تھا۔ وہ تینوں قطار میں چلتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ اب سامنے سیدھی زمین شروع ہو گئی تھی۔ درخت اتنے زیادہ اور قریب قریب آگے تھے کہ چند میٹر سے آگے کیا ہے دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ غڈ ہال سی چل رہی تھی۔ ڈنڈہ زمین پہ مارتی.... بے جان قدم اٹھاتی۔

”ایڈم.... کیا ہم ان پودوں میں سے کچھ کھا سکتے ہیں؟“ فاتح سب سے آگے چلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں سر۔ ان پودوں میں سفید اور پیلی berries ہیں، یہ زہریلے ہوں گے۔ اور مشروم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکثر زہریلے

ہوتے ہیں۔“

وہ بڑی سمجھداری سے بتاتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔ تالیہ تنک کے اس کی پشت کو دیکھتے چل رہی تھی۔

”اور یہ ان پودوں کے پتے بہت چمکیلے ہیں سر۔ یہ بھی زہریلے ہیں۔ اور یہ والا میں نے اس لئے نہیں توڑا کیونکہ اس کے پتے تین تین کے گروپ میں ہیں۔ اور جن پودوں کے پتے تین تین کے گروپ میں ہوں، وہ کھانے کے لائق نہیں ہوتے اور یہ والے جو اس طرف ہیں۔“ وہ اشارہ کر کے بتا رہا تھا۔ ”یہ پہلے بھی گزرے تھے۔ ان سے بادام کی خوشبو آتی ہے اور یاد رکھیے گا، کبھی بھی بادام کی خوشبو والے پودے سے کچھ نہیں کھاتے کیونکہ....“

”کیونکہ وہ زہریلا ہوتا ہے۔“ وہ تلخی سے پیچھے سے بولی۔ ”ایڈم تمہارے اس جنگل میں کچھ ہے جو زہریلا نہ ہو۔“

”ریلیکس کریں چے تالیہ۔ ہم اس جنگل میں آپ کی وجہ سے....“ (وان فاتح نے گردن موڑی تو گڑبڑا کے بولا) ”نہیں ہیں۔ ہم اپنی

وجہ سے ہیں۔“ آواز دھیمی کر لی۔ فاتح نے ایک تنبیہی نظر اس پہ ڈالی اور آگے بڑھ جاتا مگر تالیہ مراد نے ایک دم اپنا بیگ پھینکا اور ان دونوں

کے سامنے آئی۔

”اے کہنے دیں تو انکو۔ وہ سچ کہہ رہا ہے۔“ وہ درد سے چلائی تھی۔ منہ پہ مٹی لگی تھی اور سنہری بال گول مول پونی میں باندھ رکھے تھے۔
- ٹراؤزر کے پانچے کچھڑا لود تھے اور قمیض کے دامن پہ کانٹے لگے تھے۔

”تالیہ....“ اس نے رسان سے پکارنا چاہا مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

”آپ دونوں اس میں میری وجہ سے پھنسے ہیں۔ میں ذمہ دار ہوں، میں قصور وار ہوں۔ ہم چار دن سے اس جنگل میں بھٹک رہے ہیں، ہم گراس ہو پز ٹرمائیٹ اور عجیب عجیب سے پودے کھا رہے ہیں، یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ یہ سب میرے لالچ کا انجام ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم اس میں میری وجہ سے پھنسے ہیں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ایلنے لگے۔ ایڈم خفیف سا ہوا۔ ”چے تالیہ، میرا یہ مطلب نہیں تھا....“

”میرے پاس پلان ہوتا تھا تو انکو میرے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔ مگر اب نہیں ہے۔ کیونکہ میں چار دن سے گلٹی فیل کر رہی ہوں۔“ وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گرتی گئی۔ گردن جھکا دی اور بچوں کی طرح رونے لگی۔

”اب میرا ذہن بلیٹک ہو گیا ہے۔ ساری تدبیریں، سارے راستے کھو گئے ہیں۔ داتن نے مجھے کتنا منع کیا، مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ یہ میری سزا ہے۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو رہی تھی۔ وہ دونوں سامنے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں کمزور اور تلخ نہیں تھی۔ میں بہت بہادر اور مضبوط تھی۔ میں برسے کا حل نکال لیتی تھی مگر اب.... میرا دل اتنا بوجھل، اتنا دکھی ہے کیونکہ میں نے آپ دونوں کی زندگی بھی خراب کر دی ہے۔ اس کو بولنے دیجیے تو انکو۔ وہ سچ کہہ رہا ہے۔“

فاتح نے لکڑیوں کی گٹھی پر پھینکی اور اس کے سامنے جھکا جیسے بڑا کسی بچے کے سامنے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جھکتا ہے۔

”Make a wish!“

تالیہ نے ہاتھ ہٹا کے بھیکے چہرے سے اسے دیکھا۔ ”جی؟“

”آج تمہاری سالگرہ ہے۔ کوئی خواہش کرو۔“

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ گئی۔ آنسو سرخ مٹی والے چہرے پہ نہروں کی صورت بہہ رہے تھے۔

”تم بتاؤ تالیہ.... تمہیں اس وقت سب سے زیادہ کس چیز کی خواہش ہے؟“

”میں واپس کے ایل جانا چاہتی ہوں اور ایک اچھی زندگی....“

”اؤں ہوں.... وہ تمہاری ضرورت ہے۔ میں خواہش پوچھ رہا ہوں۔“

”خواہش!“ اس نے آنکھیں بند کیں تو آنسو ایل کے گردن تک لڑھکتے گئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

”میں ملاکہ کے ہوٹل فریج سے چاکلیٹ رکھتے رکھتے رہ گئی تھی۔ میں نے آپ کے گھر کے سامنے والے کینے میں بھی ہاٹ چاکلیٹ

آرڈر کر کے ان چھوا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے چاکلیٹ کھانی ہے تو انکو۔“ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔ اسے اپنی بے بسی پہ غصہ آرہا تھا۔ رحم بھی آ رہا تھا۔ وہ اتنی کمزور کیسے پڑ سکتی تھی؟

”کتنی کیلوریز ہوں... مجھے پرواہ نہیں۔ مجھے بس بڑا سا چاکلیٹ کیک کھانا ہے۔ اتنی... اتنی ساری چاکلیٹ!“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے بتایا۔ وہ چند لمحے جھکے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر سیدھا ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ قریب میں ایک موٹے تنے کا درخت لگا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ایک پھل توڑا جو سخت خول میں تھا۔ دیکھ کے ہی طبیعت مکدر ہو جاتی تھی۔ پھر فاتح نے اسے چاقو سے کاٹا اور اندر سے سفید گودا کا خنجر پہ نکال کے اس کی طرف بڑھایا۔ اس گودے میں سخت سخت سے جج نظر آرہے تھے۔

”تم تصور کرو یہ چاکلیٹ ہے۔ تصور کرنے سے یہ واقعی تمہیں چاکلیٹ لگے گی۔ اور تم اسے شکر کر کے کھا لو۔“ وہ دوستانہ انداز میں سفید شے بڑھائے ہوئے تھا جو دیکھنے سے ہی بد مزہ لگتی تھی۔ تالیہ نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”یاد ہے تم نے کہا تھا... کہ اگر کبھی مجھ پہ ایسا وقت آیا کہ میرے ساتھ ملے قوم میں سے سوائے ایک کے کوئی نہ کھڑا ہو تو تم اپنی پوری سچائی سے کہتی ہو کہ تم وہ ایک شخص ضرور ہو گی۔ اس لیے کیونکہ تم مجھے اپنا لیڈر مانتی رہی ہو۔ اب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم اس کو شکر ادا کر کے کھا لو۔“

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا، آنسو پونچھے اور کھڑے ہوتے ہوئے خنجر لے لیا۔ پھر اس گودے کو (آف) تھوڑا سامنے میں ڈالا اور بند ہونٹوں سے ذرا سا چبایا۔

ایک دم اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

”یہ تو.... یہ تو چاکلیٹ ہے۔“ اس نے بے یقینی سے اس گودے کو دیکھا۔ خوشبو ذائقہ.... سب چاکلیٹ والا تھا۔ ایسا لذیذ نرم مادہ جو منہ میں جاتے ہی کھل گیا تھا۔

”پہی برتھ ڈے تالیہ۔ اور سالگرہ اسی دن ہوتی ہے جس دن ہم اسے مناتے ہیں۔“ وہ مسکرا کے کہتا آگے بڑھ گیا۔

”مگر یہ کیا تھا؟ تو انکو؟ وان فاتح؟“ وہ حیران سی پکار رہی تھی مگر وہ آگے جا رہا تھا۔

”آپ ذرا صبر کر لیتیں تو میں بتانے والا تھا چے تالیہ کہ میں ان زہریلے پودوں کو اس لئے نہیں ہاتھ لگا رہا کیونکہ سامنے cocoa

کا درخت ہے۔ اس کا جج چاکلیٹ بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے وہ کڑوا ہوتا ہے مگر یہ گودا میٹھا ہوتا ہے۔ پھولوں جیسا میٹھا۔ سر کو آپ

سے زیادہ درختوں کی پہچان ہے۔“

ایڈم اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

وہ چند لمحے بے یقین رہی پھر اس کی آنکھوں میں خوشی اور کوئی انہونی کیفیت ابھری۔ وہ دوڑ کے اس درخت کے پاس گئی۔ وہ اونچا بڑا

قدیم درخت اپنی شاخوں پہ ایسے ڈھیروں پھل لا دے ہوئے تھا۔ جانے اس میں اتنی توانائی کہاں سے آگئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور

بلی کی طرح شاخ پہ چڑھ گئی۔

آگے جاتے فاتح کے قریب آتے ایڈم نے سرگوشی میں کہا۔ ”چاکلیٹ حلق میں جاتی ہے تو دماغ میں وہ ہارمون ریلیز ہوتے ہیں جو ہمیں خوشی دیتے ہیں۔ ریلیکس کرتے ہیں۔ امید ہے چے تالیہ کاموڈاب اچھا ہو جائے گا۔“
 ”تمہیں کیسے معلوم؟“

”آپ کتابیں نہیں پڑھتے کیا؟“ وہ خفگی مگر اعتماد سے کہتا آگے بڑھ گیا جہاں ایک ٹیلے پر سرخ مٹی نظر آرہی تھی۔ اسے پوٹلی میں مزید وہ ”مچھر مار دوا“ بھرنی تھی۔

تالیہ ابھی تک درخت پہ چڑھی اپنی قمیض کے دامن میں وہ بہشتی پھل اکٹھا کر رہی تھی۔ مٹی سے اٹے چہرے پہ مسکراہٹ اور رونق واپس پلٹ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ گرمی اور جس بڑھ گیا تھا۔ وہ تینوں قریب قریب چلتے جا رہے تھے۔ ایک دم چھایا سی چھا گئی اور ٹپ ٹپ بارش برسنے لگی۔ وہاں ہر روز اتنی دفعہ بارش برستی تھی کہ اب ان کو کسی سایے کی تلاش ہی نہ رہی تھی۔ بس ایک درخت تلے آکھڑے ہوئے۔ پھوار یہاں بھی ان کو بھگوئے جا رہی تھی۔

فاتح نے گھڑی دیکھی۔ ”سورج ڈوبنے میں ابھی پون گھنٹہ ہے۔“ پھر آسمان کو دیکھ کے کچھ سوچنے لگا۔

”آپ کو کیسے پتہ؟“ وہ چونکی۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ میں بہت سے کوکوں کے پھل باندھ کے اٹھائے ہوئے تھے۔

”کیونکہ میں نے اپنی گھڑی صبح صادق پہ اندازے سے سیٹ کر دی تھی۔“ جواب میں خاموشی رہی تو اس نے ان دونوں کو دیکھا۔

”کیا تم لوگوں کی گھڑیاں ابھی تک کے ایل کے وقت کے مطابق ہیں؟“

”ہم نے کون سا یہاں ہمیشہ رہنا ہے تو انکو۔“ وہ خفیف سی ہو کے بولی۔

”اور مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ شاید ہم اس جنگل سے نکلیں تو سامنے ملایشیا ہی ہو۔ شاید ہم اپنے زمانے کے ہی کسی جنگل میں کھوئے

ہوئے ہوں۔“ وہ اب مایوس نہیں تھا۔ بس اس کی امیدیں کسی اور طرح کی تھیں۔

فاتح سر جھٹک کے سامنے دیکھنے لگا۔ وہاں اونچائی پہ کچھ بلند وبالا درخت اگے تھے۔

”سنو لڑکی...“ اس نے سوچتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”تم Cat burglar ہونا؟“

”بہت شکریہ یاد دلانے کے لیے۔“ اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”یاد رکھو.... جو تمہیں معلوم ہے وہ تمہاری جان بچائے گا۔“ وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”وہ درخت دیکھ رہی ہو؟“ اس نے

بارش میں بھیگتے اونچے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے خیال میں یہ اس جنگل کا سب سے بلند ترین مقام ہے۔ تمہیں دیواروں پہ

چڑھنے کی عادت ہوگی۔ بارش تھمتھے تو تم اس درخت پہ چڑھ کے وہ اوپر اس کی چوٹی تک جاؤ گی اور وہاں سے تمہیں دور دور تک کا سارا علاقہ دکھائی دے گا۔“

”او کے مگر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”تمہیں دیکھنا ہوگا کہ جنگل سے نکلنے کا قریبی راستہ کون سا ہے۔ میدانی علاقہ کس طرف ہے۔ کوئی انسان اس پاس ہے یا نہیں۔ پھر ہم اسی سمت میں سفر کریں گے۔“

”اور اگر ہر طرف درخت ہی درخت ہوئے تو؟“

”تو آپ یہ دیکھئے گا پے تالیہ کہ اس پاس کوئی جنگل ہے یا نہیں۔ ہم جنگل کی طرف چلے جائیں گے۔“

”معتقد ہم پہلے ہی جنگل میں کھڑے ہیں۔“

”یہ جنگل نہیں ہے گوکہ ہم اس کو جنگل کہہ رہے ہیں۔ یہ رین فاریسٹ ہے۔ بعض دفعہ بڑے بڑے جنگلوں کے درمیان چند میل کا علاقہ رین فاریسٹ بنا ہوا ہوتا ہے۔“ ایڈمرسان سے سمجھا رہا تھا۔ ”اگر ہم کسی جنگل میں نکل جائیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ وہاں پہ جانور اور پرندے ہوں گے جن کا ہم شکار کر سکتے ہیں۔ اور پھل بھی ہوں گے۔ آسمان بھی نظر آئے گا۔“

”اچھا بس کرو۔ ایسے بولتے جا رہے ہو جیسے مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔“ اس نے ہونہر کر کے ناک سکوڑی۔ ”تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے میں نے کتنے کام کیے ہیں زندگی میں۔ اور ہاں.... مجھے شکار کرنا بھی آتا ہے۔“

”آپ کے والد شکاری جوتھے۔“

”اور لکڑہارے بھی۔ میں پچھلی زندگی میں بھی غریب تھی اور نئی زندگی میں بھی ایک عرصہ غریب رہی۔ ہاؤ فنی۔“

وہ تینوں درختوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بارش اس پاس بر سے جا رہی تھی۔ تالیہ مکمل طور پہ بھیگ چکی تھی مگر اب بارش سے فرق پڑنا ختم ہو گیا تھا۔ وہ تھمی تو وہ دونوں آگے بڑھ گئے، مگر وہ وہیں رکی رہی۔ بالکل ساکت۔ جامد۔

”تالیہ۔“ فاتح نے پلٹ کے پکارا تو وہ چونکی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے غور سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی نیند سے جاگی ہے۔

”میں نے دیکھا وہ میرے گاؤں کے لوگوں کو پکڑ رہے تھے۔“ وہ کسی اور کیفیت میں تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”کیا دیکھا تم نے؟ مجھے بتاؤ۔“

”وہ سپاہی میرے گاؤں سے پمبور کو چن چن کے گرفتار کر رہے تھے۔ وہ ان کو قید میں ڈال کے مار دیں گے۔ اب وہ میرے گھر

آ رہے تھے۔ وہ میرے باپا کو بھی پکڑ کے لے گئے۔ اسی لیے میں نے چابی اٹھائی۔“ وہ چونک گئی۔ ”میرے باپا نے مجھے نہیں بھیجا۔ وہ تو قید

میں ڈال دیے گئے ہیں۔ میں خود گئی تھی دروازے کے پار۔ تاکہ مدد لے کر آؤں اور اپنے گاؤں والوں کو قید میں مرنے سے بچاؤں۔“

اس نے ندھال سے انداز میں اپنا سرتنے کی پشت سے ٹکا دیا۔

”کس کی قید سے؟ کیا تم نے کچھ سنا کہ تمہارے باپا کو کس نے قید کیا ہے؟“

تالیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ حیران سی لگ رہی تھی۔ ”وہ بندہ ہمارا اور شہزادی کے سپاہی تھے۔ شہزادی تاشہ کے۔“
لمحے بھر کو جنگل میں سکوت چھا گیا۔ چڑیوں کی آوازیں بھی پس منظر میں چلی گئیں۔

”شہزادی تاشہ کے سپاہی؟“ وان فاتح رامنزل بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ تالیہ نے سر ہلایا۔

”وہ سب کہہ رہے تھے کہ شہزادی ظالم ہے۔ اس نے سارے گاؤں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ سوری تو انکو‘ شہزادی تاشہ اتنی حسین تو ہے جتنی وہ تاریخ کی کتابوں میں بتائی جاتی ہے کہ اس دن میں نے خواب میں اس کو مجسمہ بناتے دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لگتی تھی۔ لیکن وہ ندا تھی رحم دل ہے نہ ہی اتنی اچھی جتنا آپ اس کو سمجھتے تھے۔“ اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ ”شہزادی تاشہ ذمہ دار ہے میرے گاؤں اور میری تباہی کی۔ خدا کی قسم میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے مجھ سے میری سارے خواب لے لیے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے لوگ اس کے بارے میں یونہی کہہ رہے ہوں، شاید وہ اتنی بری نہ ہو۔“ وہ فوراً مدافعا نہ انداز میں بولا تھا مگر تالیہ کی آنکھوں میں کچھ سلگنے لگا تھا۔

”شہزادی کی وجہ سے ہوا ہے یہ سب۔ وہ ذمہ دار ہے اس سب کی۔ اس نے میرے باپا کو قید میں ڈالا ہوا ہے۔ چار دن پہلے میں اس دنیا سے گئی تھی۔ یہاں وقت نہیں گزرا۔ چار دن سے میرے باپا اس کی قید میں ہیں۔ خدا کی قسم میں اس کو نہیں چھوڑوں گی۔“ پھر اس نے کلائی اوپر کی اور آستین تلے چھپی گھڑی باہر نکالی۔ ”مجھے بتائیے یہاں کیا وقت ہوا ہے۔ مجھے وقت کے سارے حساب کتاب ابھی سے طے کرنے ہیں۔“

اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں اور آواز رندہ رہی تھی۔

بارش ایک دفعہ پھر سے سلطنت ملا کہ اس جنگل پہ برسے لگی تھی۔

☆☆=====☆☆

حالم کی اگلی قسط انشاء اللہ پندرہ ستمبر کی رات 8 بجے نمبرہ احمد آفیشل پراپ لوڈ کر دی جائے گی۔

ہمارا بیچ بار بار چیک کرنا نہ بھولیے گا۔

حالم (نمرہ احمد)

باب ہفتم:

”تاشہ پسونا“

اس نے خواب میں دیکھا....

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے.... نیم تاریک....

آتش دان میں لکڑیاں جل رہی ہیں....

الماری کے سامنے مراد کھڑا ہے.... ہاتھ میں ایک بوتل ہے....

اندر پانی کی طرح کابے رنگ مشروب ہے....

بوتل کے پینڈے میں ایک سکہ اور ڈلی بیٹھی ہے....

وہ الماری کا پٹ کھول کے بوتل اندر رکھتا ہے....

پھر مڑتا ہے... تو ٹھٹھک جاتا ہے....

وہ لڑکی چوکھٹ پہ کھڑی ہے.... انگلیاں مروڑتی.... خوف کے باوجود خود کو سنجیدہ رکھے.... مراد تیزی سے اس کے قریب آتا ہے.... بچوں

کے بل اس کے سامنے بیٹھ کے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیتا ہے....

”تالیہ.... میں جانتا ہوں تم خوفزدہ ہو اور....“

”نہیں تو۔“ وہ پر یقین انداز میں سر کونفی میں ہلاتی ہے مگر فضا میں خوف اور پریشانی کی خوشبو رچی بسی ہے۔

”اور تم پریشان بھی ہو۔“ وہ اس کو سننے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہے جا رہا ہے۔ ”مگر برے دن جلد ختم ہو جائیں گے۔ اچھے دن

قریب ہیں۔“

”یہ شور کیسا ہے بابا؟“ ”الور سونگائی“ میں سرشام ہی کیسے لوگ گھس آئے ہیں؟“

مراد گہری سانس لیتا ہے۔ ”یہ بند ہار اور شہزادی کے سپاہی ہیں۔ یہ پورے گاؤں سے شکار بازوں کو گرفتار کر کے محل کے قید خانوں میں

ڈال رہے ہیں۔“

اسے اپنے اندر غصہ ابلتا محسوس ہوتا ہے۔ ”شہزادی اتنی ظالم کیوں ہے بابا؟ وہ کب تک الور سونگائی کے لوگوں پہ ظلم کرتی رہے گی؟“ پھر

یکدم وہ اپنے اندر خوف محسوس کرتی ہے اور یہ خوف اس کو چونکا دیتا ہے۔ وہ مراد کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھامتی ہے۔
 ”باپا.... کیا وہ آپ کو بھی گرفتار کر لیں گے؟“ پھر ہراساں سی وہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔ ”میں آپ کو گرفتار ہونے نہیں دوں گی۔“
 باہر گھر کا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑاتا ہے۔ مراد اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کھڑا ہوتا ہے۔
 ”تالیہ.... وہ آگئے ہیں۔ میری بات غور سے سنو، بیٹی۔“

وہ دھیرے دھیرے سمجھا رہا ہے مگر دروازے پہ شور بڑھتا جا رہا ہے۔ سپاہی آواز لگا رہے ہیں کہ وہ محل سے آئے ہیں.... مراد حاضر ہو.... وہ مسلسل خوف اور پریشانی سے نفی میں سر ہلائے جا رہی ہے....
 ”تالیہ.... قوم کاراہیر قوم کا باپ ہوتا ہے.... اس کو قربانی دینی پڑتی ہے.... یہ میری قربانی کا وقت ہے.... وہ مجھے لینے آئے ہیں.... مگر تم سے میں اتنا چاہتا ہوں تالیہ.... کہ تم میرا ایک حکم مان لو....“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا ہے۔ تالیہ کی آنکھیں بھگینے لگتی ہیں مگر وہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔

”جی باپا.... میں کیا کروں.... مجھے بتاؤ باپا۔“

”یہ قربانی تمہیں اور سونگائی کے لوگوں کے لئے دینی ہوگی.... تالیہ.... اور اپنے باپا کی انھی گردن اور وقار کے لئے.... دو گئی؟!“
 آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل رہے ہیں.... خوف اور بے یقینی کی فضا.... ہراسیت.... اور دروازے پہ ہوتی زوردار دستک....
 اور یہیں خواب ٹوٹ گیا تھا.....

☆☆=====☆☆

وہ سال تھا 1459 عیسوی۔

اور سلطنت تھی سرزمین ملاکہ کی جو کئی ریاستوں اور ملکوں سے وسیع و عریض تھی۔

اس میں کہیں وہ گھنارین فاریسٹ واقع تھا جس کے اندر برستی بارش اب تھم چکی تھی اور کچھ زدہ زمین پہ وہ تینوں چل رہے تھے۔
 تالیہ کی پیشانی خفگی سے سکڑی ہوئی تھی۔ تیز چلتے چلتے وہ فاتح کے برابر پہنچ گئی اور پھر دو قدم آگے نکل گئی۔ وان فاتح نے ایک گہری نظر اس کی پشت پہ ڈالی۔

”مضروری نہیں ہے شہزادی ویسی ہی ہو جیسی تمہارے خواب میں تمہیں بتائی گئی ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے اسے ظلم کرتے نہیں دیکھا۔ صرف اس کے ظلم کے قصے سنے ہیں۔“

تالیہ نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا تو آنکھوں میں غصہ تھا۔

”اس کے آدمیوں نے گاؤں میں فساد برپا کیا ہوا تھا۔ وہ میرے باپا کو پکڑ کے لے جانے والے تھے۔ اور اس وقت باپا نے مجھے ایک حکم دیا تھا.... قہینا چابی کے ذریعے دروازہ پار کرنے کا۔“ اس کی آواز اونچے درختوں سے ٹکرا کے پلٹنے لگی۔ ”شہزادی تاشہ کی وجہ سے میرا

خاندان ٹونا اور گاؤں تباہ ہوا۔ اور یہ سب چار دن پہلے ہوا ہے۔ وقت یہاں رک گیا تھا۔ چار دن پہلے جب ہم دروازہ پار کر کے ادھر آئے تو اسی دن میرے باپا کو قید میں ڈالا گیا ہوگا۔ چار دن سے ہم اگر ان درختوں میں بھٹک رہے ہیں تو میرے باپا قید خانے میں اذیت کاٹ رہے ہوں گے۔ کیا یہ شہزادی تاشہ کے ظالم ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؟“

”سر ٹھیک کہہ رہے ہیں چے تالیہ۔“ ایڈم چھڑی سے زمین کو ٹوٹتا قریب آیا۔ ”کیا معلوم وہ سپاہی شہزادی کے نہ ہوں۔ تاریخ کی کتابوں کے مطابق بند ہارا انتہائی مکار اور سازشی آدمی تھا۔ مگر اس کی بیٹی... تاشہ... وہ بہت اچھی شہزادی تھی۔“

تالیہ لب بھنج کے ایڈم کو دیکھنے لگی جو اس کے کھا جانے والے تاثرات سے بے نیاز بولے جا رہا تھا۔ البتہ فاتح بس غور سے اس کی پیشانی کی سلوٹیں دیکھ رہا تھا۔ چار دن سے بدل نظر آتی تالیہ کے اندراب چنگاریاں سی بھر چکی تھیں۔

”ٹھیک ہے.... پر تگالیوں نے تاریخ کی کتابیں جلادیں اس لئے ہمیں سلطان مرسل شاہ یا شہزادی تاشہ کا ذکر بہت کم ملتا ہے مگر جتنا ذکر موجود ہے اس کے مطابق وہ ملا کہ کی سب سے خوبصورت شہزادی تھی۔ اتنی سحر انگیز کہ اس کے سامنے چاند سورج شرمنا جائیں۔“ وہ قدیم کتابوں کے الفاظ یاد کر کے دہراتے ہوئے ارد گرد درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ ”وہ جب محل کی بارہ دریوں میں چلتی تھی تو ادب سے لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ جب وہ دربار میں آتی تو وزراء، درباری اور غیر ملکی سفیر بے اختیار کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ بولتی تھی تو سلطان دم سادھے اس کو سنا کرتا تھا۔ وہ بہت سی زبانیں بول سکتی تھی۔ تیر اندازی، تلوار زنی، گھڑ سواری، نیزہ بازی... وہ سب جانتی تھی۔ وہ لکھ پڑھ بھی سکتی تھی۔ رقص اور دوسرے فنون لطیفہ سے بھی واقف تھی۔ چین اور ملا کہ کا کوئی ایسا کھانا نہ تھا جو شہزادی تاشہ پکانہ سکے۔ کوئی ایسا ناکانہ نہ تھا جس کو وہ کاڑھ نہ سکے۔ وہ حرم کی نگران تھی۔ بند ہارا کی سب سے قابل اعتماد مشیر۔ وہ سیاست کے داؤ پیچ سے بھی واقف تھی۔ غرض کیا تھا جو رجبہ کی بیٹی کو کرنا نہیں آتا تھا؟ اسی لئے اس کو تاشہ سونا کہا جاتا تھا۔“

”تاشہ سونا؟“ تالیہ نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ ابرو اٹھایا۔ اس ان دیکھی عورت کی اتنی تعریف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”سونا یعنی enchantress۔ ساحرہ.... جادو گر نی۔“

”اور یہ ساری باتیں تمہیں کیسے معلوم ہیں ایڈم!“ وہ پھنکاری۔

”کیونکہ میں کتابیں پڑھتا ہوں چے تالیہ۔ کیوں؟ آپ نہیں پڑھتیں؟“ کچھ زیادہ ہی سادگی سے پوچھا۔ تالیہ کی رنگت اب ضبط سے سیاہ پڑنے لگی تھی۔ دانت کچکچار کھٹے تھے۔

”تمہاری تاریخ کی کتابیں جھوٹی ہو سکتی ہیں مگر میرے خواب نہیں۔ وہ ایک ظالم شہزادی ہے اور بس!“

”اتنی ساری کتابیں ایک ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“ بالآخر فاتح سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو وہ تڑپ کے اس کی طرف

کھوی۔ ایڈم کہہ رہا تھا تو صرف برا لگا تھا، مگر اس کا انداز تو مانو تالیہ بنت مراد کے اندر آگ لگا گیا۔

”میرے خواب جھوٹ نہیں بولتے تو انکو۔ میری زندگی کی تباہی کی ذمہ دار آپ کی تاشہ سونا ہی ہے۔“

”میں نہیں مان سکتا۔“ وہ بے نیازی سے نفی میں سر ہلاتا آگے جا رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ تالیہ اور اس کے خواب غلط ہو سکتے تھے، مگر اس کے ذہن میں بنانا شہسونا کا میج نہیں۔

”وان فاتح کو شہزادی تاشہ کی طرفداری کا شوق کیوں ہے ہاں؟“ اسے دور جاتے دیکھ کے وہ بے بسی سے بولی۔

”کیونکہ وان فاتح اس کے فین ہیں۔ وہی فین جو آپ فاتح صاحب کی ہیں۔ فین۔“ زور دے کر بولا۔

”ہونہ۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”فاتح صاحب کو احتیاط سے کسی عورت کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ آخر وہ شادی شدہ ہیں۔“

”کیوں؟ آپ کو جلن ہو رہی ہے کیا؟“ وہ بیگ کندھے پہ ڈالتا اور واچکا کے بولا اور پھر بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ لپک کے ایک پتھر اٹھایا اور ایڈم کی کتابوں سے بھری کھوپڑی کا نشانہ باندھا۔ مگر پھر ضبط کر گئی۔

(میں اور جلیس؟ ہونہ۔ لیکن اس کو تو میں چھوڑوں گی نہیں۔) پتھر پرے پھینک دیا اور ڈنڈے کو زمین پہ رکھتی قدم اٹھانے لگی۔ ماتھے پہ سلوٹیں پڑی تھیں اور اندر غصہ ہی غصہ ابل رہا تھا۔

شہزادی تاشہ کے گناہوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔

جنگل مزید گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مسلسل گدلی، گیلی زمین پہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ بار بار پیر پھسلتا اور خود کو سنبھالنا پڑتا۔ ایڈم وقفے وقفے سے گردن کے پیچھے ہاتھ رکھتا، پھر سر جھٹکتا۔ شاید اسے کہیں تکلیف تھی۔ (ہونہ۔ اور پڑھے کتابیں۔)

”کیٹ برگر!“ ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے فاتح اسے پکارتے ہوئے رکا۔ وہ سفید گدلی شرٹ کے آستین چڑھائے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے ہوئے تھا۔ گیلے بال ماتھے پہ جمے تھے اور مٹی والا چہرہ اوپر اٹھائے اونچائی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا وہ برسوں سے اس جنگل میں بھٹک رہا ہو۔

”جی تو انکو!“ وہ ڈنڈا نیچے پھینکتی سامنے آئی۔ گالوں پہ مٹی جمی تھی، ابھی چوٹی کندھے پہ گری تھی اور آنکھوں میں ناراضی تھی۔

”اس درخت پہ چڑھو۔ اوپر آخری شاخ تک اور وہاں سے دیکھ کے بتاؤ کہ... اس جنگل کے پار کیا ہے۔“ وہ اوپر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے حکم دے رہا تھا۔

تالیہ نے ہتھیلی سے گال پہ لگی مٹی صاف کی، آستین مزید پیچھے کو چڑھائیں اور تیز قدموں سے درخت کی جانب بڑھی۔ وہ چار دن کی تھکی اور پست حوصلہ تالیہ نہیں تھی۔ شہزادی تاشہ پہ آتا غصہ تو اتنی دے رہا تھا۔

درخت کانٹوں سے بھرا تھا۔ سب کچھ اتنا نواکھلا تھا کہ احتیاط سے چڑھنا پڑتا مگر اس کے لئے یہ آسان تھا۔ ہاتھوں پہ اس نے پھٹے کوٹ کا کپڑا لپیٹ لیا اور اوپر چڑھتی گئی۔ بالکل کسی بلی کی طرح۔

وان فاتح اور ایڈم گردنیں اٹھائے، ہاتھوں سے آنکھوں پہ سایہ کیے اس کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اونچے درخت پہ غائب ہو گئی۔ پھر چند منٹ بعد وہ نیچے اترتی دکھائی دی۔

”تو... کیا دیکھا تم نے؟ کیا ہے جنگل کے چاروں طرف؟“

”اوہ گاڈ تو انکو۔“ وہ درخت سے اترتے ہی آنکھوں میں حیرت اور خوشی سموئے بولی۔ ”ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہم تو 2016ء میں ہی ہیں۔ جنگل کے باہر کوالا لپور ہے۔ دو میل کے فاصلے پہ مجھے سینٹرل پارک نظر آرہا ہے۔“

ایڈم کا منہ بے یقینی سے کھلا۔ خوشی سے لب وا ہوئے۔ پھر ذرا ٹھہرا۔ فاتح کو دیکھا جو بالکل سنجیدہ تھا۔ ایڈم کی مسکراہٹ سٹٹی۔ شک سے تالیہ کو دیکھا۔

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں؟“

”ظاہر ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ کیوں؟ تم چہرے نہیں پڑھ سکتے کیا؟“ ناک سکوڑ کے جتا کے بولی اور اس کی طرف سے رخ پھیر لیا (ہونہہ)۔ ایڈم پہ گویا اوس پڑ گئی۔

”قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پہ شمال کی طرف یہ رین فاریسٹ ختم ہو جاتا ہے۔“ وہ اب سنجیدگی سے فاتح کو بتا رہی تھی۔ ”اس کے آگے درختوں کا سلسلہ ہے مگر وہ کسی جنگل کے درخت لگتے ہیں۔ وہاں روشنی ہوگی، غذا ہوگی، جانور ہوں گے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی آبادی دکھائی نہیں دی۔ بس درخت ہی درخت ہیں۔“

”یعنی ہمیں کل صبح ہوتے ہی شمال کی طرف سفر کرنا ہوگا۔ ایک دفعہ ہم جنگل پہنچ جائیں، آگے کوئی راستہ مل ہی جائے گا۔“ وہ پرامید نگ رہا تھا۔

(رین فاریسٹ اور جنگل میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جنگل میں درخت ذرا فاصلے پہ ہوتے ہیں اس لیے آسمان دکھائی دیتا ہے اور سورج کی روشنی زمین تک پہنچ سکتی ہے یوں زمین پہ پودے اور جھاڑیاں خوشی خوشی نشوونما پاتے ہیں۔ مگر رین فاریسٹ کے درخت اتنے گھٹک ہوتے ہیں اور اوپر جا کے اتنے گھنے ہو جاتے ہیں کہ ان کی کینوپی سی بن جاتی ہے۔ سبز چھت۔ یوں سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ سکتی اس لیے زمین پہ پودے اور جھاڑیاں بہت کم اگتی ہیں اور درخت بارش کے پانی کے باعث نشوونما پاتے ہیں۔ اکثر بڑے بڑے جنگلوں کے درمیان کچھ حصے پہ ایک گھنا سا رین فاریسٹ اُگ آتا ہے۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی رین فاریسٹ تھا جو یقیناً کسی بڑے جنگل کے درمیان میں تھا۔)

☆☆=====☆☆

مغرب اترنے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ ایڈم خفا نظر آرہا تھا مگر اس سے زیادہ تھکا ہوا۔ وہ وہیں ایک پتھر پہ بیٹھ گیا اور پیشانی چھو کے دیکھنے لگا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ سامنے کھڑے فاتح نے تشویش سے پوچھا۔

”تو اتانی ختم ہو رہی ہے میری۔ شاید بخار ہو رہا ہے۔“ وہ نڈھال نگ رہا تھا۔

”کیوں؟ تم نے اپنی کتابوں میں بخار کا علاج جزی بوٹیوں سے کرنا نہیں سیکھا؟“ وہ پلکیں جھپک جھپک کے بولی تو فاتح نے ایک برہم

نظر اس پہ ڈالی۔

”اس کی طبیعت خراب ہے، تالیہ۔“

”اوہ۔ افسوس ہوا۔ مگر فکر نہ کرو۔ ہم شہزادی تاشہ کے پاس پہنچ جائیں تو وہ ایڈم کا علاج کر دے گی۔ بہت بھردار اور نیک دل شہزادی ہے نا وہ۔“

”جی ہاں۔ اور بہت خوبصورت بھی۔“ وہ نقاہت سے چہرہ اٹھا کے بولا۔

”چھ سوسال پرانی شہزادی کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوبصورت بھی تھی؟“

”پانچ سو ستاون سال، چہ تالیہ!“ نقاہت سے آنکھیں بند کرتے، تنے سے ٹیک لگاتے وہ تھج کر نا نہیں بھولا تھا۔ وہ ہونہہ کر کے رہ گئی۔

(تاشہ... تاشہ... اسے اس نام سے چڑھونے لگی تھی۔)

اوپر درختوں کے جھروکوں سے دکھائی دیتا آسمان تیزی سے اندھیر ہونے لگا۔ یہاں سورج ڈھلنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر گھپ اندھیرا ہو جاتا تھا۔

فاتح اندھیرے کی پرواہ کیے بغیر آگے درختوں کی طرف بڑھ گیا تو وہ ایک تنے کے ساتھ بیٹھی اور تھیلے سے کوکوپھل نکال لیا۔ یہ کٹا ہوا تھا۔ وہ انگلی سے گودا پوروں پہ نکال نکال کے منہ میں ڈالنے لگی۔ جیسے جار میں سے مایونیز کھار ہی ہو۔ ایک سرسری نظر ایڈم پہ ڈالی جو نقاہت سے آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

”تم تو نہیں کھاؤ گے نا؟“

ایڈم نے آنکھیں کھول کے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”بہت شکریہ۔ چہ تالیہ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔“

وہ مسکرائی، شانے اچکائے اور انگلی لبوں میں ڈال لے سفید گودا کھائے گئی۔ ایڈم نے بے بسی بھری ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”آپ شاید نارگٹ اور یخڈ زندگی گزارنے کی عادی ہیں۔ اگلے مارک کے بارے میں سوچتے رہنے کی۔ تب ہی جیسے ہی آپ کو معلوم

ہوا کہ شہزادی تاشہ آپ کی دشمن ہے... آپ کے اندر توانائی سی بھر گئی ہے...“

وہ جوانگی سے گودا چوس رہی تھی۔ رکی اور آنکھیں گھما کے اسے دیکھا۔

”اگر کوئی تمہارے باپا کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دے صرف اس لئے کہ وہ اپنے گاؤں کے غریبوں کے لئے لڑ رہے تھے، تو کیا تم بدلہ

نہیں لینا چاہو گے؟“

”اور آپ بدلہ کیسے لیں گی شہزادی تاشہ سے؟“

”پہلے اپنے باپا کو اس کی قید سے چپکے سے نکال لاؤں گی اور پھر...“ وہ کچھ سوچ کے مسکرائی۔ نچلا لب دانتوں سے دبایا۔ ”شہزادیوں

کے پاس بہت زیور ہوتا ہے۔ سونے، چاندی، ہیرے، زمر، دیا قوت۔“ اس کے جیسے منہ میں پانی آ رہا تھا۔ ”شہزادی تاشہ سے اس سے اچھا بدلہ کیا ہوگا کہ اس کا سارا زیور اس سے چھین کے اس کو قلاش کر دیا جائے؟“

”یا اللہ، بچے تالیہ۔“ ایڈم نے بے اختیار پیشانی چھوئی۔ ”آپ نے کہا تھا آپ چوری چھوڑ دیں گی۔ مگر آپ ابھی بھی شہزادی کے ہیرے جو ابرات کا لالچ رکھے ہوئے ہیں۔“

”لالچ میرے ڈی این اے میں شامل ہے۔“ اور گودے سے بھری انگلی لبوں میں رکھ لی۔ ایڈم صدمے سے اسے دیکھ گیا۔

”کیا واقعی آپ تاشہ کے محل میں چوری کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں؟“

”تالیہ کے پلاز ہیں۔ تالیہ کی مرضی!“ اس نے شانے اچکائے، آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ (خواب میں دیکھا شہزادی کا زیور اس سے بھرا ہاتھ یاد آیا۔ اگر وہ یہ زیور چرا کے واپس اپنے زمانے میں لے جائے تو اس کی قیمت.... اُف!) اسے مزا آنے لگا۔ وہ فی الفور میں پہنچ چکی تھی۔

”وان فاتح کہاں رہ گئے۔“ یکدم ایڈم نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

”وہ تمہارے لئے آگ کا بندوبست کرنے گئے ہیں۔“

”مگر میں کتنی دفعہ بتا چکا ہوں کہ سارے فاریسٹ کی لکڑی گیلی ہے۔ نم لکڑی سے آگ نہیں جلے گی۔“

”ان کو کیا معلوم؟ وہ کتابیں تھوڑی پڑھتے ہیں۔“

ایڈم نے اس دفعہ جواب تک نہیں دیا۔ بس آنکھیں موند لیں۔

فاتح واپس آیا تو ایک ہاتھ میں لکڑیاں اٹھائے ہوئے تھا۔ گیلے بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور تنفس پھولا ہوا تھا۔

نیچے بیٹھ کے اس نے لکڑیاں سامنے رکھ دیں۔ پھر چند پتلی سوکھی ٹہنیوں کو گھونسلے کی صورت رکھا اور ایک بڑی گیلی لکڑی اٹھائی گویا

درخت کے تنے کی چھال ہو جو لمبائی میں اکھاڑ لایا تھا۔

”سر.... یہ گیلی ہیں۔ ان سے آگ کیسے جلے گی؟“

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ خنجر سے لمبی لکڑی کے سرے کو کاٹا اور اسے مٹر کے پھلکے کی طرح کاٹ کے دو حصوں میں کھولتا گیا۔ اندر ایک

پتلی لمبی لکڑی پڑی تھی۔

”یہ ڈیڈ وڈ ہے۔ مردہ خشک لکڑی۔ اس سے ہم آگ جلا نہیں گے۔“ بغیر جتائے کہتے ہوئے اس نے مردہ لکڑی سوکھی ٹہنیوں کے ساتھ

رکھی۔ ایڈم کی رنگت خفت سے گلابی ہوئی۔ فوراً تالیہ کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیوں؟ تم نیشٹل جیو گرافک نہیں دیکھتے کیا؟“ آنکھیں جھپکا کے سادگی سے پوچھا۔ اس کا جسم پہلے درد سے ٹوٹ رہا تھا، اوپر سے بچے

تالیہ کی باتیں۔ وہ سرخ پڑتے کانوں کے ساتھ رخ ہی موڑ گیا۔

جنگل کے اس حصے میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ واحد آواز پرندوں کی تھی یا اس خنجر کی جسے فاتح ایک گیلی موٹی لکڑی پہ رگڑ رہا تھا۔ لکڑی کا بور اس ٹہنیوں کے ڈھیر پہ گرنے لگا۔ (یہی سفوف آگ کو بھڑکانے کے کام آتا تھا۔)

جس طرح وہ زمین پہ بیٹھا گردن جھکائے لکڑی چھیل رہا تھا اس کو دیکھ کے تالیہ کے دل میں افسوس جاگنے لگا۔

”آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا... تو انکو... کہ آپ مجھے سو سال پیچھے چلے جائیں گے۔“

(”پانچ سو ستاون سال۔“ ایڈم رخ پھیرے بغیر خفگی سے بڑبڑایا۔)

”میں حال کے بارے میں سوچتا ہوں تالیہ۔“

”کبھی آپ مجھے تاشہ کہتے تھے۔“ وہ مزید اداس ہوئی۔

”تب مجھے تم پہ بھروسہ نہیں تھا۔“

”اور اب؟“

”اب ہے۔“ وہ سر جھکائے چاقو لکڑی پہ رگڑے جارہا تھا۔ بار بار گیلے بال انگلیوں سے پیچھے کرتا، لیکن وہ پھر سے ماتھے پہ آن گرتے۔

”آپ کا چیئر مین کا الیکشن سر پہ تھا۔ چار دن سے آپ غائب ہیں۔ سارا ملک آپ کو ڈھونڈ رہا ہوگا... اور اشعراب چیئر مین بن جائے

گا۔“ اندھیرے کے ساتھ اس پہ پھر سے قنوطیت طاری ہونے لگی۔

”جب ہم واپس جائیں گے تو میں راستہ نکال لوں گا۔ وان فاتح کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“

”ایک منٹ۔“ ایڈم نے رخ موڑا۔ چہرے پہ حیرت تھی جو اندھیرے کے باوجود عیاں تھی۔ ”وقت کا اصول ہے کہ اگر ہم اس میں سفر

کریں تو ہماری واپسی تک وہ رک جاتا ہے۔ یعنی ہم اس کے آگے بڑھنے سے پہلے واپس آسکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے پیچھے سن باؤ کے

گھر میں وقت وہیں ٹھہر گیا ہو۔ ہم کئی دن بعد بھی واپس جائیں تو وقت وہیں سے شروع ہو۔“

”اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے ایڈم۔ ہمیں ابھی یہ بھی یقین نہیں ہے کہ ہم کس دور میں واپس آئے ہیں!“

”مجھے یقین ہے یہ وہی دور ہے تو انکو۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”چار دن پہلے جب ہم اس جنگل میں آئے اس سے چند لمحوں قبل ہی گیارہ

سالہ تالیہ نے دروازہ پار کیا تھا۔ وقت ٹھہر گیا تھا۔“

”مگر آپ گیارہ سالہ لڑکی کے طور پہ نہیں لوٹیں۔“ ایڈم بول کے پچھتایا۔ وہ تندہی سے اس کی طرف گھومی۔

”چابی سے وقت آگے اور پیچھے ہوتا ہے ایڈم۔ ایک پلا پلایا انسان چھوٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ سائنس نہیں پڑھی کیا تم نے؟“

”یا اللہ! ایسے ہی ایک بات کہہ رہا تھا!“ وہ جڑ گیا۔

”دستقبل کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑو حال کی فکر کرو۔“ وہ اب ٹہنیوں کو جوڑ رہا تھا۔ پھر اس نے چاقو اور ایک لوہے کا

آلہ (لاک پک) جو تالیہ کے بیگ میں تھا نکالا اور ان کو اوپر تلے رکھ کے رگڑا۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ چنگاریاں نکلتیں مگر آگ نہ جلتی۔

تالیہ آگے کوچھکی اور پھونکیں مارنے لگی۔ فاتح بار بار دونوں دھاتوں کو گرگڑتا۔ یکا یک شعلہ سا جلا اور لکڑیوں نے آگ پکڑ لی۔ تالیہ ابھی تک پھونکیں مار رہی تھی۔ فاتح نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم فیڑتھری میں آ چکی ہو۔“ آگ نے سارے کوروشن کر دیا تھا۔

”میں فیڑتھری سے آگے نکل چکی ہوں۔ معلوم نہیں آپ لوگ میرا ساتھ دے بھی سکیں گے یا نہیں۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈنڈا اٹھالیا۔ فاتح نے اسے نہیں روکا۔ وہ آگے چلتی جا رہی تھی۔ شاید یونہی جنگل میں ٹہلنے۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟ تالیہ؟“ ایڈم فکر مندی سے پکارا تھا۔ ”اس وقت جنگل خطرناک ہوتا ہے۔“

”یہ جنگل نہیں، رین فاریسٹ ہے۔ کیوں؟ ڈکشنری نہیں پڑھتے کیا؟“ وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم نے منھیاں بھیجنے لیں۔

”جب ہم واپس جائیں گے تو پہلا کام چے تالیہ کو پولیس کے حوالے کرنے کا کریں گے۔“

وہ جو ایڈم کے تھیلے سے پتے نکال نکال کے ان کا معائنہ کر رہا تھا دھیرے سے ہنس پڑا۔

”وہ چوری چھوڑ چکی ہے ایڈم۔“

ایڈم نے تڑپ کے اس کی طرف چہرہ موڑا۔ ”آپ کی اطلاع کے لیے وہ شہزادی تاشہ سے بدلے کے طور پہ اس کا زیور چرانا چاہتی ہیں۔ وہ اب بھی چوری کا ہی سوچ رہی ہیں سر۔“

”ہم اس وقت ایک کرائس میں ہیں ایڈم۔“ آگ کے دوسری جانب وہ اکڑوں بیٹھا گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نزدگی کے کچھ کرائس جنگل کی مانند ہوتے ہیں اور جنگل میں صرف ایک سمت میں چلا جاتا ہے۔ ورنہ بھول بھلیاں مار ڈالتی ہیں....“

تالیہ ان سے دور ڈنڈا زمین پہ مارتی چلتی جا رہی تھی۔ مسکراہٹ غائب تھی۔ وہ اداس لگتی تھی۔

”ہر انسان کرائس میں مختلف طریقے سے رد عمل دیتا ہے۔ بعض دفعہ اپنے برے وقت کو کاٹنے کے لئے اسے لالچ کا سہارا لینا پڑتا ہے....“

وہ ایک درخت تلے جا ٹھہری اور گردن اٹھا کے اوپر دیکھنے لگی....

”انسان کو ایک فیئسی چاہیے ہوتی ہے۔ کچھ ایسا جس کی تکمیل اس کو متحرک رکھے.... دنیا والوں کے نزدیک وہ فیئسی.... وہ ناممکن خواب بری چیز ہو سکتا ہے لیکن جو انسان اس جنگل میں گھرا ہوتا ہے اس کے لئے واحد روشنی وہی فیئسی ہوتی ہے۔“

اب وہ درخت کے تنے سے سر نکالے کھڑی اوپر دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں اداس تھیں۔ ہاتھ دل پہ رکھا تھا۔

”تو اگر کبھی انسان صرف چلتے رہنے کی غرض سے... کسی اچھوتی چیز کی خواہش دل میں زندہ رکھے... کوئی خواب، کوئی فینٹسی... جس کا انتظار... جس کے ملنے کی تمنا اسے امید دلائے، اور اس کے قدم مثبت سمت اٹھتے رہیں... تو اس اوکے۔ کبھی کبھی خود کو تھوڑی رعایت دے دینی چاہیے۔“

تالیہ نے آنکھیں موند لیں اور دھیمے سروں میں کوئی گیت سا گنگنا نے لگی۔
 ”اور کرائس سے نکل آنے کے بعد وہ عجیب خواہشیں خود ہی غائب ہو جاتی ہیں... اس لیے عجیب خواہشوں اور خوابوں پہ کبھی نام نہیں ہونا چاہیے۔ ہم انسان ہیں اور یہ ہماری ضرورت ہیں۔ اس لیے... خود کو رعایت دے دیا کرو...“
 اب وہ آنکھیں کھولے اوپر درختوں کے سروں کو دیکھتی گنگنا رہی تھی۔ ہاتھ ابھی تک دل پہ تھا۔
 ”رہی تالیہ... تو اگر اسے لگتا ہے کہ بہت سے زیور اسے خوشی دے سکتے ہیں تو اسے اس خیال میں جینے دو۔ اگر یہ خیال اسے جنگل سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس اوکے۔“
 ”مگر وہ مجھے اتنی باتیں سن رہی ہیں۔“ الاؤ کے پار نیم دراز ایڈم خفا ہوا۔
 ”وہ صرف تمہیں تنگ کر رہی ہے۔“
 ”مگر کیوں؟“

”کیا اس کے پاس کرنے کو کچھ اور ہے؟“ الاؤ کے پار بیٹھے فاتح نے ابرو اٹھا کے پوچھا تو وہ چپ ہو گیا۔ ڈنڈے کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ اب واپس آرہی تھی۔ ایڈم خاموش ہو گیا۔ سارا جنگل خاموش ہو گیا۔
 اب ایک اور رات بہت سے شور اور بہت سی خاموشی میں کٹتی تھی۔

☆☆=====☆☆

صبح ہوئی تو سورج یوں نکلا گویا کبھی ڈوبا ہی نہیں تھا۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ اور ایڈم کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔ وہ کبھی پیٹ پہ ہاتھ رکھتا، کبھی گردن پہ۔ مگر چلتے رہنا بھی مجبوری تھی۔

وہ تینوں آگے پیچھے گدلی زمین پہ چلتے جا رہے تھے۔ ایڈم بار بار پیچھے رہ جاتا تو فاتح کور کنار پڑتا۔
 ”کیا تم کوئی دوا، کوئی بوٹی جانتے ہو جو تمہاری تکلیف رفع کر سکے؟“ فاتح اس کے لیے فکر مند تھا۔
 ”میں خود نہیں جانتا سر مجھے ہو کیا رہا ہے۔“

”نہیں جانتے تو جلدی چلو پھر... ہمیں دن کی روشنی میں اس رین فاریسٹ سے نکلنا ہے۔“ وہ ڈپٹ کے کہتی آگے بڑھ گئی تو ایڈم نے جہاں دکھ سے اسے دیکھا، وہیں فاتح کا دماغ کھول اٹھا۔

”وہ بیمار ہے، تالیہ!“ آواز میں غصہ اور گرج تھی۔ وہ رکی اور گردن موڑ کے بے نیازی سے ان دونوں کو دیکھا۔

”ایڈم بیمار نہیں ہے۔ اب جلدی چلیں۔“ اور سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔ فاتح ضبط کر گیا، پھر ایڈم کے کندھے کو تھپکا۔ ”ہمت کرو۔“ ایڈم نے اثبات میں سر ہلایا اور قدم اٹھانے لگا۔

قریباً ڈھائی گھنٹے گزرے تھے جب چلتے چلتے ایک دم ڈھیر ساری روشنی نظر آئی۔ سب سے آگے چلتی تالیہ ٹھہر گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر وہ تیزی سے اس طرف دوڑی۔

درخت ختم ہو گئے تھے۔ باہر گھاس تھی۔ سبز چھت کی حدود بھی ختم ہو گئی۔

جیسے کوئی طلسم ساٹوٹا تھا۔ قید ختم ہوئی تھی۔

اس نے بے یقینی سے سر اٹھایا۔

اوپر کھلا آسمان تھا۔ صاف سنہری آسمان جہاں سورج چمک رہا تھا.... وہ دونوں بازو پھیلائے بے یقینی سے ایڑیوں پہ گھومی۔ گول۔ گول۔

یہاں سے جنگل شروع ہو رہا تھا۔ جنگل کی زمین گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی تھی۔ فاصلے فاصلے پہ موٹے تنے کے درخت اُگے تھے۔ یہ مختلف قسم کے درخت تھے۔ درمیان میں اتنا فاصلہ تھا کہ آسمان نظر آتا۔ زمین اور درخت یہاں بھی گیلے گیلے سے تھے مگر مٹی گھاس کے باعث پھسلن زدہ نہیں تھی۔ کہیں جنگلی پھول اُگے تھے۔ دور بستے پانی کی آواز۔ جانوروں کی مختلف بولیاں۔ زندگی سے بھرپور وہ ”جنگل“ تھا۔ ایک خوبصورت جنگل۔

وہ خوشی سے مڑی تو وہ دونوں بھی درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے دکھائی دیے۔ فاتح بیگ کندھے پہ ڈالے آگے تھا اور نڈھال سا ایڈم پیچھے۔ (بیگ وہ تینوں باری باری اٹھاتے تھے۔ ابھی ایڈم کی باری تھی اور تالیہ نے ایڈم کو بیگ پکڑا بھی دیا تھا مگر فاتح نے وہ اس سے لے لیا تھا۔)

”چلیں.... ہم نے اس طرف جانا ہے۔ میں نے اوپر سے دیکھا تھا۔ اس طرف آگے جنگل کم گھٹا ہو جائے گا۔“ وہ اشارہ کرتے ہوئے بولی تو فاتح کو اسے ٹوکنا پڑا۔

”تالیہ ہمیں ٹھہرنا ہو گا۔ ایڈم مزید نہیں چل سکتا۔“

”کیوں؟“ وہ ایڈم کی طرف گھومی اور کمر پہ ہاتھ رکھے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

”کیونکہ اگر اس کی جگہ تم بیمار ہوتیں تو بھی میں یہی کرتا۔“

”غلط کرتے۔ اور وہ کوئی بیمار نہیں ہے۔ اب چلیں۔“ وہ رکھائی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

”میں چل سکتا ہوں، سر! اس اوکے۔“ وہ اداسی سے کہتے ہوئے قدم اٹھانے لگا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا اسے رونا آرہا ہو مگر ضبط کر

رہا ہو۔ وہ ان تینوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ کم عمر اور سادہ۔ اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی۔ جب وہ بیمار ہوتا تو وہ کس طرح.... سر جھٹک کے اس نے یادوں کو ذہن سے جھٹکا اور بہت سے آنسو پی کر چلنے لگا۔ اسے تالیہ سے کسی قسم کی رعایت کی امید نہ تھی۔ ان کے راستے میں بہت سے درخت آئے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی پھلدار نہ تھا۔ ان جان چیزیں اُگی تھیں۔ کافی آگے ایک جگہ چشمہ بہہ رہا تھا۔ صاف، ٹھنڈے پانی کا۔ قریب ہی درخت اُگے تھے۔ فاتح نے ایڈم کو ادھر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چشمے کی طرف آیا۔ جھک کے پانی سے ہاتھوں کے کٹورے بھرے اور اسے منہ پہ ڈالا۔

”تالیہ.... ہم یہاں ٹھہر رہے ہیں۔ میں آگ جلاتا ہوں، تاکہ ایڈم کو حرارت ملے۔ اسے ٹھنڈنگ رہی ہے۔ تم اس کے لئے کوئی دوا ڈھونڈو۔“

”کیوں؟ وہ بیمار تھوڑی ہے۔“ وہ نروٹھے پن سے کہتی اٹھی، اپنا خنجر نکالا اور ایک طرف چل دی۔ فاتح نے برہمی سے مڑ کے اسے دیکھا۔ وہ دور جا رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کے اپنے اوپر پانی ڈالنے لگا۔ جنگل میں شدید خارش اور الرجی سے بچنے کے لیے بار بار خود کو پانی سے دھونا بہت ضروری تھا مگر یہ پانی بھی تالیہ پہ آیا غصہ کم نہیں کر پار ہاتھا۔

☆☆=====☆☆

ایڈم بن محمد نقاہت سے آنکھیں موندے ایک درخت سے لگا بیٹھا تھا۔ فاصلے پہ فاتح ایک دوسرے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے چند جنگلی پھول اپنے ہاتھ پہ رگڑ رہا تھا۔ کبھی کسی کو سونگھتا، کسی کو پھینک دیتا۔ فکر مندی سے بار بار ایڈم کو دیکھتا جس کی گردن اب ڈھلکی ہوئی تھی۔ دونوں کے درمیان الاؤ جل رہا تھا۔

یکایک بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برسنے لگیں۔ اس نے بوٹیوں کا تھیلہ پرے ڈال دیا اور خود بے بسی سے ٹیک لگالی۔ بارش نے چند لمحوں میں ہی الاؤ بجھا ڈالا۔ تب ہی قریب آتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے گردن نہیں موڑی۔ جانتا تھا کہ وہ تالیہ ہی ہے۔ بس سامنے دیکھتا رہا۔

پیچھے کہیں سے تالیہ کے آنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ گھسیٹ کے لا رہی تھی۔ کنکھیوں سے نظر آ رہا تھا کہ تالیہ برن کے ایک بچے کو گھسیٹ کے لا رہی تھی۔

وہ زندہ تھا شاید۔ تڑپ رہا تھا۔ گردن میں خنجر گھونپا ہوا تھا، خون بے جا رہا تھا مگر وہ اسے قابو کیے ہوئے تھی۔ بدقت کھینچتی وہ اسے فاتح کے سامنے لائی، اور اس کی گردن پہ اپنا کیچڑا لود پیر رکھ کے بیٹھی اور چاقو اس کی گردن سے نکالا۔ خون بھل بھل بنے لگا۔

فاتح خاموش نظروں سے اسے دیکھ گیا۔ اس کے منہ پہ مٹی لگی تھی اور الجھے سنہرے بال گرد آلود تھے.... چہرے پہ زخم کے نشان بھی تھے اور چبھتی ہوئی نظریں فاتح پہ جمی تھیں۔

برن اس کی گرفت میں کسمسار ہاتھا، پھڑ پھڑا رہا تھا، مگر تالیہ نے اپنا پاؤں اس کی گردن پہ جمار کھا تھا۔

”آپ نے مجھ سے پوچھا تھا.... یاد ہے....“ وہ نظریں اس پہ جمائے کیچڑ پہ رکھا چاقو اٹھاتے ہوئے مصنوعی ساغرانی۔ ”کہ تا شہ تمہارے ٹیلنٹ کیا ہیں؟ تمہاری زندگی میں کامیابیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا آتا ہے؟“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کے ادا کر رہی تھی۔ چاقو اب برن کی گردن سے لگا رکھا تھا۔

”مجھے.... یہ آتا ہے۔“ اور ساتھ ہی چاقو تیزی سے اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ معصوم جانور چلایا.... بڑپا.... خون کے تازہ چھینٹے فاتح کے چہرے اور شرٹ پہ آگرے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر جھٹکا۔ بولا کچھ نہیں.....

برن تڑپ رہا تھا.... خون بہہ رہا تھا.... اس کے کپڑے.... زمین.... سرخ خون سے رنگین ہوتی جا رہی تھی.... اور وہ زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے مہارت سے ننھے غزال کی گردن کو ذبح کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی مزاحمت دم توڑتی گئی اور وہ بے جان ہو گیا۔

”اس طرف بہت سے برن ہیں۔ مگر ایک وقت میں ایک ہی کافی ہے ہم پہ۔ کیوں؟ تو انکو؟ کیسا لگا میرا نشانہ؟“ وہ جتاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ”ویسے بھی حالم کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا“ جیسے حالم کے خواب کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ ”پھر خنجر چلاتا ہا تھروکا۔“ یہی منظر میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یعنی میرے خواب علامتی نہیں تھے۔ وہ ہو بہو حقیقت کا عکس تھے اور میں ان میں علامتیں تلاش کرتی رہی۔“ فاتح اسی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”اور جو میں نے تمہیں لینے بھیجا تھا؟ ایڈم کی دوا؟“

”مگر ایڈم بیمار نہیں ہے۔“ وہاں بے نیازی سی بے نیازی تھی۔ وان فاتح کے تو سر پہ لگی، تلوں پہ بجھی۔ ماتھے پہ بل پڑے۔ وہ کچھ سخت کہنے ہی لگا تھا کہ.....

”جب میں ملایشیا آئی تھی تو میرا وزن اس سے پچیس کلو زیادہ تھا۔ میں نے کئی ماہ لگا کے وزن گھٹایا۔ اور تب سے وزن کے ساتھ جنگ لڑ رہی ہوں اور اس دوران میں نے فاتح بھی کیے۔ اور ڈپریشن میں اور یٹنگ بھی کی۔ غرض میں ہر طرح کی ’بھوک‘ سے لڑتی رہی ہوں۔“ وہ خون آلود ہاتھوں سے گوشت کے ٹکڑے برن کے اندر سے نکال رہی تھی۔ اتنی مہارت اور صفائی سے کہ وہ رک کے دیکھنے لگا۔ (وہ واقعی کسی شکاری کی اولاد تھی۔) پیچھے لینا ایڈم بھی سن رہا تھا گوکہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

”مجھے قدرتی جزی بوٹیوں کا تو علم نہیں مگر میں کئی سال سے ایک ایسی عورت کے ساتھ رہی ہوں جس کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی ’بھوک‘ ہے۔ ان سات سالوں میں اس کو پچاس قسم کے مختلف پیٹ درد ہو چکے ہیں جن کے لئے میں اس کے ساتھ ڈاکٹرز پہ گئی ہوں اور ہر دفعہ وجہ ایک ہی نکلتی ہے۔ بھوک۔ خوراک۔ اس لئے وان فاتح.... جب تالیہ کہہ رہی ہو کہ ایڈم بیمار نہیں ہے، تو ایڈم بیمار نہیں ہے۔ ایڈم.... صرف.... بھوکا ہے!“

گوشت کی چند بوٹیاں اس نے ایک پتے پہ رکھیں اور اٹھ کے بجھے الاؤ کے قریب آئی۔

”آپ سلیم ٹی ہیں، فٹ رہتے ہیں، مجبوری ہے کہ رہنا پڑتا ہے، آپ کی بھوک آپ کے تابع ہے۔“ وہ لکڑیوں پہ بوٹیاں سینخوں کی طرح پرونے لگی۔ ”میں کیٹ بر گلر (چور) ہوں، مجھے روشن دانوں اور وینٹ کی سرنگوں میں گھسنا ہوتا ہے، دبلار ہنا میری مجبوری ہے۔ مگر ایڈم

کی بھوک اس کے تابع نہیں ہے۔ وہ نارمل انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور وہ چار دن سے غیر فطری غذا کھا رہا ہے۔ ایڈم بیمار نہیں ہے، تو انکو۔ ایڈم صرف بھوکا ہے۔ اور جب وہ یہ بھنا ہوا گوشت کھائے گا، تو اس کی توانائی واپس آ جائے گی۔ لیکن یہ بات پتہ نہیں کیوں ایڈم کو خود نہیں سمجھ آئی۔ کیوں ایڈم.... وہ معصومیت سے اس کی طرف گھومی۔ ”تم نے کبھی متوازن غذا کے اوپر لکھی کوئی کتاب نہیں پڑھی؟“ فاتح کے لبوں پہ مسکراہٹ ریگ گئی۔ اس کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔ ایڈم اپنی جگہ گنگ ہو گیا۔ پہلے تو اسے تالیہ کے اس ”خیال رکھنے کے عمل“ پہ یقین ہی نہ آیا۔ پھر جب محسوس ہوا کہ وہ اس کو دیکھ رہی ہے تو خفگی سے رخ موڑ گیا۔ دونوں ہاتھ ابھی تک پیٹ پہ تھے۔ درد بہت شدید تھی۔

بارش تھمنے کے بعد جب دوبارہ آگ جلائی گئی اور لکڑی کی سیخوں پہ دہکتی گوشت کی بوٹیوں کو آگ نے چھو تو ان سے مختلف قسم کے رس نکلنے لگے۔ اشتہا انگیز خوشبو سے بوجھل دھوئیں کے مرغولے اٹھ اٹھ کے فضا میں گم ہونے لگے۔

باربی کیوں زبردست مہک نے تینوں کی طبیعت پہ بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ اتنے دن بعد.... اتنی بھوک کاٹنے اور اذیتیں اٹھانے کے بعد.... بھنے گوشت کی وہ مہک.... ایک دم ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔

اور پھر مہک سے بوجھل دھواں اوپر فضا میں گم ہونے لگا.....

مگر کیا وہ واقعی گم ہو رہا تھا؟ یا وہ مختلف سمتوں میں پھیلتا جا رہا تھا؟

جنگل سے لڑائی نہیں لڑی جاتی.... کیونکہ جنگل زندہ ہوتا ہے۔ اور جنگل میں انسان کا پتہ اس کی آواز اور چاپ سے پہلے اس کی ”خوشبو“ دے دیتی ہے....

یہ خوشبو ان کی جنگل میں پہلی سنگین غلطی تھی۔

☆☆=====☆☆

دو پہر اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ جنگل کے ان خوبصورت درختوں کے بیچ وہ تینوں الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ ایڈم اپنے پتے پہ رکھا بھنے گوشت کا ٹکڑا شوق سے کھا رہا تھا۔ البتہ وہ خاموش تھا۔ فاتح کھاتے ہوئے کبھی اس کو دیکھتا اور کبھی تالیہ کو۔ تالیہ.... جو خاموش ہو ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”جب فوڈ پیارٹمنٹ ایڈم بن محمد کے پاس تھا تو ہمیں کیا ملتا تھا کھانے کو؟ تو انکو؟“ وہ بوٹی توڑتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کے بول رہی تھی۔ گوشت سخت تھا مگر کھانے لائق تھا۔ ”مرے ہوئے منخوس گراس ہو پرز.... بد مزہ پیتا.... اور تو اور اس نے ہمیں termites بھی کھلائے

.... وہ کیڑے.... اور ایک دفعہ تو کوئی چھپکلی بھی لے آیا کہ چے تالیہ، یز ہریلی نہیں ہے، یہ آپ کھا سکتی ہیں۔“

ایڈم نے بس منتقم خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ فاتح کی طرف متوجہ تھی۔

”اور.... وہ کراہت آمیز جانور جس کا نام بھی مجھے یاد نہیں.... وہ کھلایا اس نے ہمیں.... تو انکو! اور وہ مونا سا کیڑا.... کریب.... اور....“

”اور کوکا پھل۔“ فاتح نے دھیرے سے یاد دلایا مگر تالیہ نظر انداز کر گئی۔

”اور وہ گندا سا پھول... آخ تھو... کیا کیا نہیں کھلایا اس نے ہمیں... مگر جب نوڈیہ پارٹمنٹ تالیہ مراد کے ہاتھ میں آیا تو کیا کھانے کو ملا ہمیں؟“

اب وہ باری باری دونوں سے رائے مانگ رہی تھی۔ اگر بنا نمک کے باوجود اتنا لذیذ گوشت تالیہ نے نہ بھونا ہوتا تو ایڈم اسے ابھی پھینک دیتا مگر ضبط کر گیا۔ سر جھکائے کھاتا گیا۔ توانائی آنے لگی تھی۔ پیٹ درد عناقہور ہاتھا۔

”تالیہ مراد کی وجہ سے ہمیں یہ غزال ملا کھانے کو، تو انکو۔ یہ لذیذ غزال۔ سوچیں اگر میں نہ ہوتی تو آپ کا کیا بنتا۔“ وہ لقمہ چباتے ہوئے مزے سے کہہ رہی تھی۔ پھر ہاتھ جھاڑ کے اٹھی۔

”میں جھرنے پہ ہاتھ دھونے جا رہی ہوں۔“ پھر اپنا بیگ اٹھا کے وان فاتح کے قریب سے نکل کے چلی گئی۔ ایڈم نے دانت کچکچا کے اسے جاتے دیکھا۔

”ایڈم... وہ تمہارا خیال رکھ رہی ہے۔“ وہ تخیل سے سمجھانے والے انداز میں بولا تو ایڈم نے تڑپ کے اسے دیکھا۔

”یہ خیال رکھنا ہے؟“

”یہ اس کی دوستی ہے۔“

”پھر نہ معلوم دشمنی کیسی ہوگی۔“

فاتح نے کوکو کے چھلکے کے کٹورے سے پھر اپنی پیادہ پھر درخت کے تنے سے ٹیک لگالی۔

”اس کا ذہن عام انسانوں سے کہیں زیادہ تیزی سے کام کرتا ہے، اس لئے مجھے یقین ہے، اس کی دشمنی بہت خطرناک ہوگی۔ شہزادی تاشہ کو خبردار رہنا چاہیے۔“

ایڈم نہیں بنسا۔ بس پتا پرے رکھ دیا۔ ”مجھے ایسی دوستی نہیں چاہیے جس میں ہر وقت اتنی باتیں سننی پڑیں۔“

”دوستی میں باتیں سننی پڑتی ہیں۔ دوستی میں ہی تو سننی پڑتی ہیں۔“

مگر ایڈم کے ماتھے کے بل صاف نہیں ہوئے۔ ”صرف اس لئے کہ آپ کا دوست آپ کا خیال رکھ رہا ہے، آپ اس کی ہر بری بات برداشت کرتے جاؤ؟“

”اگر کوئی دوست آپ کے لئے toxic نہیں بن رہا، تو اس کو برداشت کرنا چاہیے۔“

وہ دونوں کھلے جنگل کی گھاس پہ بیٹھے تھے۔ فاصلے فاصلے پہ درخت اُگے تھے۔ بارش کے بعد اب برسو ٹھنڈی چھایا پھیلی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے کہ دوستی کیا ہے؟ میں فلسفوں میں نہیں الجھتا۔ زیادہ فکر اس بات کی کرتا ہوں کہ دوستی بچائی کیسے جاتی ہے؟“

دونوں کے درمیان جلتا والا اب ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ سرخ انگارے سلگتے دکھائی دے رہے تھے۔

”کیا دوستی کو بھی بچانے کی ضرورت ہوتی ہے؟“

اس سوال پہ فاتح کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

”زندگی میں ہموار زمین کی طرح ہوتی کون سی چیز ہے، ایڈم؟ رشتے، کیرئیر، شوق.... بر چیز یا تو اوپر جاتی ہے یا نیچے۔ اگر دوستی پہ محنت

ندکی جائے تو اس کا گراف نیچے چلا جاتا ہے۔“

”اور کیسے محنت کی جاتی ہے دوستی پہ؟“

”دیکھو.... کوئی آپ کو اسے زبردستی نبھانے پہ مجبور نہیں کر سکتا۔“ وہ بولتے ہوئے تھوڑی کوناخن سے رگڑ رہا تھا۔ نظریں دور اس سمت لگی تھیں جہاں تالیہ گئی تھی۔ ”یہ خون کے تعلق سے بے نیاز ہوتی ہے۔ صرف دل سے کی جاتی ہے اور وہی لوگ اپنے دوست کے دل سے نہیں اترتے جن میں وہ دو چیزیں ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمائی ہیں۔ بہت سادہ اور خوش نصیبی۔ ان دو چیزوں کی مدد سے ایک دوست دوسرے کے دل میں آئی عداوت کو اچھی باتوں سے دور کر سکتا ہے۔ یہ صبر انسان کو خود پیدا کرنا ہوتا ہے اور بخت اسے اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔“

”بخت؟“ اس نے اچنبھے سے دہرایا۔ ”کیا اچھا دوست نصیب سے ملتا ہے؟“

”بالکل! لیکن آج کل کے بچے تو اپنے دوستوں کی تنقید تک نہیں سہہ سکتے۔ ایسے نازک لوگوں کو بخت نہیں لگا کرتے، ایڈم۔ اس کے لیے برداشت سے دوستوں کی بری بھلی باتوں پہ منفی رد عمل دینے سے خود کو روکنا ہوتا ہے۔ جو تحمل سے اپنے دوست کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے، اسے ہی اللہ بخت لگاتا ہے۔ اور یہ خوش بختی اس کو مزید اچھی دوستیاں عطا کرتی ہے۔“

”یعنی کسی عام دوست کو برداشت کرنے پہ اللہ یا تو اسی کو خاص بنا دے گا یا آپ کو کوئی اور خاص دوست عطا کرے گا؟“

”میں نے تو ایسے ہی ہوتے دیکھا ہے۔ لوگوں کی فطرت سمجھ کے ان کو ذیل کرو گے تو دل زیادہ نہیں دکھے گا۔ مجھے دیکھو۔ ہزاروں

کارکنوں سے سب کی عادات اور طبیعت کے مطابق ہر روز ذیل کرتا ہوں اور....“ وہ ٹھہرا۔ ”کرتا تھا۔“

الفاظ تھے کہ کیا، سارے جنگل میں ایک اداس سی خاموشی چھا گئی۔ کربناک سا سکوت۔ دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔

ان سے دور.... ایک طرف تالیہ چلتی جا رہی تھی۔ پھر ایک جگہ درختوں کی اوٹ میں وہ ٹھہری اور احتیاط سے پیچھے دیکھا۔ آنکھوں میں

شرارت تھی۔ صد شکر کہ فاتح یا ایڈم میں سے کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ گڈ۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بٹوہ نکالا۔ وان فاتح کا بٹوہ جو ابھی اس کے قریب سے گزرتے ہوئے تالیہ نے اچک لیا تھا۔ اس

کے ہاتھ کی صفائی کمال تھی۔

”میں بھی تو دیکھوں، ہر رات سونے سے پہلے اپنے بٹوے سے کیا نکال کے دیکھتے ہیں فاتح صاحب۔“ نچلا لب شرارت سے دبائے

اس نے بٹوے کو کھولا۔ اندر رقم تھی جو کافی کم تھی۔ کریڈٹ کارڈ۔ آئی ڈی کارڈ۔ آریا نکی تصویر۔ اور تصویر کے پیچھے کچھ پھولا ہوا۔

اس نے دو انگلیاں خانے میں گھسا کے وہ شے باہر نکالی جو تصویر کے پیچھے چھپی تھی۔ پلاسٹک کا ننھا سا زپ لاک بیگ۔ بالکل آدھی انگلی کے جتنا۔ ایئر رائٹ۔ تالیہ اچنبھے سے اس کو آنکھوں کے سامنے اوپر لائی۔ شفاف پلاسٹک کے اندر پاپ کارن کے چند ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے تھے۔

اس کے ابرو حیرت سے اکٹھے ہوئے۔

(وان فاتح جیسا بڑی عمر کا پریکٹیکل آدمی.... سیاستدان.... پورے ملک کی حکمرانی کے قریب ہونے والا شخص.... وہ پلاسٹک بیگ میں یہ پاپ کارن کے ٹکڑے کیوں رکھے گا؟) ٹکڑے پرانے لگتے تھے۔ بہت پرانے۔ یہ غلطی سے اندر نہیں آئے تھے۔ بالخصوص محفوظ کیے گئے تھے۔

وہ سوچ میں گم ہوئے جیب میں ذاتی مڑی تھی کہ نظروں کے سامنے جھماکہ سا ہوا.... کیا خواب دیکھا تھا اس نے بھلا جب پہلی دفعہ وہ وان فاتح سے مل کے تنگو کامل کے گھر سے لوٹی تھی؟ چونک کے تالیہ نے اطراف کے درختوں کو دیکھا.... یہی درخت تھے وہ۔ یہی گدلی زمین۔ وہ ایڈم اور فاتح سے دور آئی تھی اور اس کی گردن میں پھندا آپڑا تھا.... ایسا ہی کچھ تھا اس کے خواب میں۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ.... وہ جنگل میں اکیلے نہیں تھے.... وہ تیزی سے واپس بھاگی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس پھولنے لگا تھا۔

☆☆=====☆☆

پیچھے جنگل کے اس حصے میں ویسا ہی سکون تھا۔ فاتح درخت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے ہوئے تھا.... اور ایڈم سستی سے سرتلے بازوؤں کا تکیہ بنائے گھاس پہ لیٹا تھا جب ان دونوں نے قریب آتے قدموں کی آواز سنی۔ ”کیا معلوم ہے تالیہ اس دفعہ کوئی شیر شکار کر لائی ہوں۔“ ایڈم جل کے بولا تھا۔ فاتح ہلکا سا ہنس دیا اور آنکھیں کھول کے گردن گھمائی۔ درختوں کے پار سے قدم نزدیک آتے سنائی دے رہے تھے۔ ٹہنیاں ہٹاتے ہاتھ۔ پیچھے سے نکلتے سراپے.... دو سے زیادہ قدم.... مردانہ قدم.... فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ خطرے کی گھنٹی بجی۔

”ایڈم!“ وہ تیزی سے اٹھا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ آنے والے ان کے سروں پہ پہنچ چکے تھے۔

وہ تین آدمی تھے۔ لمبے بال.... سانولی رنگت.... ماتھے پہ پٹی اور پاجامے کے اوپر بنا آستین کے قمیض پہنے.... ایک سے حنیسے اور ہاتھوں میں خم دار، چمکتی تلواریں۔ ان دونوں کو دائرے کی صورت گھیرا اور تلواریں ان کی طرف تان لیں۔

فاتح نے احتیاط سے ان کو دیکھتے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا دیے۔ ایڈم بھی تیزی سے سیدھا ہوا اور ہاتھ جیب تک گیا جس میں پستول

تھا۔

”ایڈم... کوئی بیوقوفی مت کرنا... یہ ہمارے جیسے لوگ نہیں ہیں۔“ اس نے دبی آواز میں انگریزی میں گھر کا۔ ایڈم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ تب ہی ان تینوں میں سے ایک غرا کے کچھ بولا۔ ایڈم جو دھیرے سے ہاتھ اٹھائے سیدھا ہور ہاتھ، مگر ٹکران کے چہرے دیکھنے لگا۔ وہ آدمی پھر سے کچھ غرایا اور ان پہ تانی تلواریں آگے کی۔

اور وان فاتح کو احساس ہوا کہ اسے ایڈم سے انگریزی میں بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اگر وہ ملے بھی بولتا تو وہ تب بھی اس کی بولی نہ سمجھ سکتے۔ بھلے ملک وہی تھا زبان وہی تھی قوم وہی تھی مگر چھ سو سال پہلے کی ’ملے زبان‘ مختلف تھی۔ لہجہ الفاظ سب کچھ جدا تھا۔ وہ تینوں قدیم ملے میں بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے اور فاتح اور ایڈم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

”ہم مسافر ہیں... راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ فاتح نے ہاتھ فضا میں بلند کیے کہنے کی کوشش کی۔ ان کا سر غنہ جس کے چہرے پہ زخم کا قوس نما نشان تھا نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر دوبارہ اپنی بات دہرائی جیسے اب غصے میں آ رہا ہو۔ درختوں کے جھنڈ میں سے تالیہ دوڑتی چلی آرہی تھی۔ ان سے کچھ دور وہ ٹھہر گئی۔ پتوں سے لدی ٹہنی ہٹائی اور سامنے نظر آتا منظر دیکھا جہاں تین افراد ان دونوں کوزغے میں لئے تلواریں تانے کھڑے تھے۔

تالیہ کا سانس رک گیا۔ یا اللہ... اب وہ کیا کرے؟ اس نے بے اختیار منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ سر غنہ اب چلا کے اپنی بات دہرا رہا تھا۔ ”تم کون ہو؟ اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم اپنے مالک سے بھاگے ہوئے ہو؟ جواب دو!“

فاتح نے بے بسی سے ایڈم کو دیکھ کے کندھے اچکائے جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو وہ آدمی کیا پوچھ رہا ہے۔ درخت کی اوٹ سے دیکھتی تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

وہ اس زبان سے واقف تھی۔ وہ لہجہ وہ الفاظ... یہی اس کے باپا بولتے تھے ان خوابوں میں... وہ ان کو بنا کسی دقت کے سمجھ سکتی تھی۔ تو یہ تھا وہ عجیب پن جو ان خوابوں میں تھا؟ صرف زمانہ نہیں وہ زبان کا فرق تھا جو بتاتا تھا کہ کچھ غلط ہے....

وہ تینوں اب آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔ یہاں تک آواز نہیں آرہی تھی۔ فاتح نے دفعتاً ہاتھ دھیرے سے گراتے ہوئے مصاحفی انداز میں بات کرنے کی کوشش کی۔ ”میں یہاں جنگل میں راستہ ڈھونڈنے...“ مگر سر غنہ نے تیزی سے تلواریں اس پہ تان لی تو اس نے ”اوکے اوکے ریلیکس“ کہتے ہوئے دوبارہ ہاتھ اٹھا دیے۔ ان جنگلیوں کا کیا بھروسہ۔ وہ تلواریں چلا ہی دیتے۔

تالیہ نے جیب سے خنجر نکالا اور ایک آنکھ بند کیے تاک کہ نشانہ باندھا۔ سر غنہ کے کندھے کا نشانہ۔ پھر مہارت سے خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور.....

کسی نے پوری قوت سے اس کے سر کی پشت پہ ضرب ماری تھی۔ اس کا ہاتھ فضا میں ہی رہ گیا۔ خنجر پھسل کے نیچے جا گرا... اور اسے اپنا وجود کسی کٹی ٹہنی کی طرح زمین نے گرتا محسوس ہوا....

اندھیرا... گھپ اندھیرا... وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر درد کی شدت سے وہ کھل کے نہیں دے رہی تھیں۔ سر کسی لکڑی سے ٹکا رہا تھا اور جسم ہوا میں جھول رہا تھا۔ گویا وہ کسی چلتی چیز پہ سوار ہو.... اور سواری تیزی سے راستے پہ آگے بڑھ رہی ہو اور اس کا جسم ساتھ ساتھ بل رہا ہو.... ہلکے ہلکے جھٹکے.... اس نے پلکیں بدقت کھولیں.... ذرا سی جھری سے روشنی نظر آئی پھر وہ بوجھ سے واپس گر گئیں....

☆☆=====☆☆

سخت نیند میں پلکیں اٹھانا بہت پر مشقت کام نگ رہا تھا، مگر کانوں میں آتی آواز نے اس کو جگادیا۔

گیارہ سالہ تالیہ نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

یتیم خانے کے اس کمرے میں دو بکر رکھے تھے جن میں اوپر تلے چار بستر بچھے تھے۔ باقی تین لڑکیاں اپنے اپنے بستروں میں سو رہی تھیں۔ صرف اوپری بکر پہ لیٹی تالیہ تھی جو آواز سے جاگ گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ بابر امداری سے روشنی آرہی تھی۔ تالیہ نے لیٹے لیٹے گردن دروازے کی سمت موڑی۔ وہاں دو ہیولے سے کھڑے تھے۔ دو عورتیں جو دھیمی آواز میں بات کر رہی تھیں۔ اس کا دماغ اس زبان کو سمجھ نہیں پارہا تھا جو وہ بول رہی تھیں۔

”کیا وہ اپنے نام کے علاوہ کچھ نہیں بتاتی، ماریہ؟“ ایک نے دوسری سے پوچھا۔ تالیہ خاموشی سے لیٹی وہ انجان زبان سننے لگی۔

”اس نے صرف اپنا نام بتایا، اور پھر اس نے چند باتیں کہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا سوائے چند الفاظ کے۔ وہ عجیب لہجے میں بولتی ہے“

”شاید کوئی علاقائی زبان۔“

”تمہیں کیا سمجھ آیا؟“

”میرا گاؤں.... گاؤں کے لوگ.... مر جائیں گے.... باپا کا ذکر.... مدد.... مجھے خالی جگہیں خود پر کرنی پڑیں۔“

”اور دوبارہ وہ کچھ نہیں بولی؟“

”نہیں۔ ایسے لگتا ہے وہ سب کچھ بھول گئی ہے۔“ مسز ماریہ ادا سی سے کہہ رہی تھیں۔

”پولیس نے بھی کوئی سراغ نہیں لگایا؟“

”بچی کی تصاویر ٹی وی تک پہنچی ہیں، اخباروں میں بھی لگوائی ہیں مگر ایسے لگتا ہے وہ آسمان سے گری ہے یا زمین سے اُگی ہے.... کیونکہ

اسے لینے کوئی نہیں آیا نہ ہی کوئی اسے جانتا ہے!“

نیم اندھیرے میں کھڑے دونوں ہیولے باتیں کر رہے تھے اور اوپر بکر پہ کروٹ کے بل لیٹی لڑکی سن رہی تھی مگر ان کی بات سمجھ نہیں پا

رہی تھی۔

”کیا وہ کھاتی پیتی ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔ وہ کھانا پینا تو نہیں بھولی۔ اپنے کام بھی خود کرتی ہے۔ سمجھدار ہے۔ بس باقی باتیں بھول گئی ہے۔“

”کل جب میں کھانے کی میز کے ساتھ سے گزری تو میں نے دیکھا ماریہ وہ اپنی کلائی کو بار بار چھو کے دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی لڑکی اپنے کڑے کو مس کرتی ہے۔“

”ایسے ہی کچھ دیکھ رہی ہوگی۔ آپ زیادہ سیرئیس نہ لیں۔‘ مسز ماریہ جلدی سے بولیں۔ کھڑے کھڑے انہوں نے پہلو بدلا۔

”کوئی چوڑی، کڑا وغیرہ تو نہیں پہن رکھا تھا اس نے جب وہ یہاں آئی تھی؟ مجھے لگتا ہے اسے صرف یہی بات یاد ہے کہ اس کی کلائی میں کچھ تھا۔“ دوسری عورت سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی، مگر مسز ماریہ اس کو کہنی سے تھام کے آگے لے جانے لگیں۔

”آپ تالیہ کی فکر نہ کریں۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ میں اسے کسی ایچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گی اور ان شاء اللہ اس کی یادداشت واپس آ جائے گی۔“

جاتے جاتے مسز ماریہ نے دروازے کو بند کر دیا۔ پٹ چوکھٹ سے آن لگا تو روشنی کا راستہ رک گیا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ اور اس گھپ اندھیرے میں وہ آنکھیں پوری کھولے اندھیر پڑی دیوار کو تنکے لگی۔

☆☆=====☆☆

تالیہ نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پلکیں جدا ہوئیں تو روشنی سی اند آئی۔ نقابہت سے اس نے پلکیں جھپکائیں۔ منظر دھندلا تھا۔ سبزہ سا ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ یا وہ کسی سواری پہ تھی جو چلتی جا رہی تھی۔ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی.... ہوائے گھوڑے کے ناپوں کے.... تیز آواز.... پتھریلی زمین پہ سر پٹ دوڑنے کی آواز....

بوجھ بڑھ گیا تو اس نے پلکیں واپس گرا دیں.... پھر سے ساری دنیا اندھیر ہونے لگی....

☆☆=====☆☆

وہ گلاب سیاہی مائل سرخ تھے۔ اتنا گہرا سرخ رنگ کہ ان پہ سیاہ رنگ کا گمان ہوتا تھا۔ کھڑکی میں ان گلابوں پہ بڑا سا گلدستہ رکھا تھا۔ کرسی پہ بیٹھی وہ پھولے گالوں والی قدرے موٹی بچی ان پھولوں کو تنکے جا رہی تھی۔

ساتھ والی کرسی پہ مسز ماریہ بیٹھی تھیں جو میز کے اس پار براجمان ڈاکٹر کی طرف متوجہ تھیں۔ وہ چھوٹے بالوں اور چشمے والی سانولی خاتون تھیں جن کے چہرے پہ تالیہ کے لیے خالص فکر مندی تھی۔

”میں نے ساری رپورٹس بھی دیکھی ہیں اور تالیہ کا بذاتِ خود معائنہ بھی کیا ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ تالیہ ان کے آفس کی برشے سے بے نیاز صرف ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تالیہ جسمانی لحاظ سے بالکل فٹ ہے۔ اس کی عمر گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی مگر قد کاٹھ میں یہ عمر سے بڑی لگتی ہے۔ ہڈیاں

مضبوط ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ خالص اور متوازن غذا پہ بڑی ہوئی ہے۔“

”مگر یہ ہمیں بہت برے حال میں ملی تھی۔ جیسے کسی غریب گھرانے کی افلاس کی ماری لڑکی ہو۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس کا گھرانہ غریب ہی ہو مگر شاید کسی ایسی جگہ رہتی ہو جہاں اچھا کھانے کو ملتا ہو جیسے کوئی گاؤں وغیرہ۔ وہ ہاتھوں سے کھاتی ہے مگر نفاست سے۔ یعنی خاندانی ہے اور اس کی تربیت اچھی ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ ایک ایک بات پہ زور دے رہی تھیں۔

”مگر اس کی یادداشت۔“ مسز ماریہ کی سوئی وہیں انگی تھی۔

”کسی ذہنی صدمے کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی ہے، یہ درست ہے، مگر بظاہر اسے کوئی چوٹ نہیں لگی۔ گردن پہ جلنے کا نشان ہے مگر میرا نہیں خیال اس کا تعلق اس کی یادداشت کھونے سے ہے۔ میں نے اس سے بات کر کے دیکھی ہے۔ اس کے چند الفاظ سمجھ میں آتے ہیں، شاید دور کسی گاؤں کی علاقائی زبان بولتی ہے جس سے ہم واقف نہیں مگر چند الفاظ ملے کے ہی ہیں۔“

”اگر اس کی یادداشت کھو گئی ہے تو وہ اپنی زبان کیوں نہیں بھولی؟“

”غیر.... کچھ علوم.... زبانیں.... یہ سب پر دستچرل میموری میں اسٹور ہوتے ہیں۔ اور یادیں ذہن کے دوسرے خانوں میں بنتی ہیں۔ بہت سے کیسز میں لوگ اپنی عادتیں نہیں بھولتے۔ وہ پیانو بجالیتے ہیں، مختلف زبانیں بول لیتے ہیں، کھانا پینا نہیں بھولتے۔ ان کو بہت کچھ کرنا آتا ہے۔ بس ان کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ ان کو کیا کیا کرنا آتا ہے۔“

ایک ترجم بھری نظر انہوں نے تالیہ پہ ڈالی جو ابھی تک پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ گردن ترچھی تھی اور لمبے سیاہ بال چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔

”یعنی اس کو بہت کچھ کرنا آتا ہے اور موقع ملنے پہ وہ خود دیکھ لے گی کہ وہ کیا کیا کر سکتی ہے مگر ابھی اسے وہ یاد نہیں۔“

”بالکل۔“

”اور کیا اس کی یادداشتیں بھی واپس آئیں گی۔“

”میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کوئی جسمانی چوٹ تو اسے لگی نہیں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسے جلد سب کچھ یاد آ جائے۔“

مسز ماریہ نے ایک فکر مند نظر اس پہ ڈالی جو اب بھی کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ مسز ماریہ کی نظریں اس کے ہاتھوں پہ جھکیں۔ وہ ایک انگلی کلائی کے گرد دائرے کی صورت پھیر رہی تھی۔ گویا کوئی کھوئی ہوئی شے یاد آتی ہو.....

مسز ماریہ کا دل بری طرح دھڑکا.... کتنا اچھا ہوا اسے وہ برے سلیٹ بھولا رہے جو انہوں نے اتنا مہنگا بیچا تھا۔ اگر اسے وہ یاد آ گیا اور اس نے بنگامہ کھڑا کر دیا اور دوسری ٹیچرز کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کریں گی؟

وہ جھرجھری سی لے کر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

تالیہ نے پلکیں دقت سے جھپکائیں..... اس کا جسم ابھی تک ہلکا ہلکا مل رہا تھا۔ سواری چل رہی تھی.... منظر ذرا دھندلا تھا مگر چند لمحوں بعد دھند چھٹی گئی.....

اس نے دیکھا کہ لکڑی کی سلاخوں سے بنا چوکور سا پنجرہ ہے جس میں وہ بیٹھی تھی... اور نقاہت سے سر لکڑی کی سلاخوں سے ٹکا رکھا تھا۔ وہ پنجرہ کسی سواری پہ رکھا تھا... گھوڑا گاڑی پہ شاید.... اور گھوڑے اس کو دوڑاتے دور جا رہے تھے۔ پتھریلی پکی سڑک.... اور سڑک کنارے دور دور تک اُگے سبز کھیت.... شام کا نیلگوں وقت.... ٹھنڈی ہوا.... اور وہ پنجرہ.....

درد.... سر کے پچھلے حصے میں درد کی ہر پھر سے اٹھنے لگی تو اس نے نقاہت سے آنکھیں موند لیں۔

☆☆=====☆☆

یتیم خانے کا عقیبی لان سر سبز گھاس سے ڈھکا تھا۔ ایک طرف جھولے لگے تھے جن کے آگے پیچھے بہت سے بچے پھر رہے تھے۔ کچھ ٹولیوں کی صورت گھاس پہ بیٹھے تھے۔

ایسے میں ایک تنہا بچہ وہ بیٹھی تھی۔ پہلے کی نسبت ذرا موٹی بچی جس کے گال خوش خوراک سے مزید پھول گئے تھے۔ وہ سر جھکائے گھٹنوں پہ کاپی رکھے صفحے پہ قلم چلا رہی تھی۔

مسز ماریہ نے دور سے اسے بیٹھے دیکھا تو گہری سانس بھری اور قریب آئیں۔ اس کے ساتھ بچہ پہ جگہ سنبھالی تو تالیہ نے آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور مسکرائی، پھر دوبارہ سر جھکا کے قلم چلانے لگی۔ لمبے سیاہ بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔

”کل مسز حلیمی نے بتایا کہ تم نیند میں ڈر گئی تھیں۔ کوئی برا خواب دیکھا تھا تم نے؟“

تالیہ نے قلم صفحے پہ رگڑتے سر ہلایا۔ ”مجھے یاد نہیں کیا دیکھا، مگر کچھ برا ہی تھا۔“ کندھے ذرا سے اچکائے۔ ان چند ہفتوں میں وہ ٹوٹی پھوٹی زبان سیکھ گئی تھی اور اب بات سمجھ اور سمجھا لیتی تھی۔

”مثلاً کیا؟“ مسز ماریہ محبت اور اچانکیت سے پوچھتے ہوئے اس کے بال نرمی سے پیچھے ہٹانے لگیں۔

”اندھیرا سا تھا.... اور میں کسی سے کہہ رہی تھی کہ شہزادی خالم ہے وہ گاؤں کو تباہ کر رہی ہے۔“ وہ خاکے میں سیاہ رنگ بھرتے سادگی سے بولی۔

”کون سی شہزادی؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“ پھر سے شانے اچکا دیے۔

”تم بہت کھانے لگی ہو تالیہ۔ اس لئے معدہ ڈسٹرب ہو جائے تو برے خواب آتے ہیں۔ اچھا دکھاؤ، کیا بنایا ہے تم نے؟“ انہوں نے بات بدلتے ہوئے نرمی سے کاغذ لینا چاہا تو اس نے مسکرا کے کاغذ خود ہی آگے بڑھا دیا۔ مسز ماریہ نے کاغذ چہرے کے سامنے لا کر دیکھا۔

”ہوں.... اچھا ہے، لیکن تم بس ایک یہی چیز کیوں بناتی ہو؟ جزیرے کے اوپر پہاڑی، چاروں طرف سمندر اور پہاڑی کی چوٹی پہ

محل....“

بچی نے دونوں ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ گرا دیا اور شانے اچکا دیے۔ انہوں نے کاغذ سے نظر ہٹا کے اسے دیکھا۔
”کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم ایسے محل میں رہو؟“

تالیہ کی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں چمکیں۔ مگر گال سرخ ہوئے۔ قدرے خجالت قدرے جوش سے اس نے سر ہلایا۔ مسز ماریہ نے مسکرا کے اسے کاغذ واپس کر دیا۔

وہ جب واپس آفس آئیں تو ٹھنک کے رکیں۔

وہاں ایک درمیانی عمر کا آدمی بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ماریہ کی رنگت بدلی۔ جلدی سے دروازہ بھیڑا اور اندر آئیں۔
”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس آدمی نے مسز ماریہ کو دیکھتے ہی ابرو غصے سے بھنچ لیے۔

”وہ سنار میری جان لے لے گا، ماریہ۔“

”آہستہ بولو.... کوئی سن لے گا۔“ وہ اضطراب سے کہتے ہوئے سامنے بیٹھیں۔ نووارد پہ جی آنکھوں میں پریشانی تھی۔

”ماریہ.... وہ بری سلیٹ اور وہ سکے.... وہ تم سے خرید کے جس سنار کو میں نے بیچا وہ کب سے اپنے پیسے واپس مانگ رہا ہے۔“
”مگر کیوں؟“

”کیونکہ وہ دونوں چیزیں پگھل کے ہی نہیں دے رہیں۔ وہ کوئی ملعون زیور ہے۔ جب سے اس نے خریدا ہے اس پہ آفتیں آرہی ہیں۔ وہ بہت پریشان ہے۔“

”اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ میں پیسے خرچ کر چکی ہوں۔“ انہوں نے فوراً ہاتھ جھلائے۔ نووارد نے غصے سے دانت کچکچائے۔ ”ماریہ.... اگر وہ مجھے اسی طرح تنگ کرتا رہا تو میرے پاس تم سے پیسے لے کر اسے واپس دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔“

”اس کو کہو وہ اسے آگے بچ دے۔“ وہ تیزی سے کہہ رہی تھیں۔ آدمی نے برہمی سے اسے دیکھا۔

”وہ ملعون چیز ہے، ماریہ۔ اسے ڈر ہے کہ وہ اس کا بیچھا نہیں چھوڑے گی۔“

”میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے نہیں پتہ۔“ وہ خود کو سنبھال چکی تھیں اور اب الٹا اس پہ غصہ ہو رہی تھیں۔

”وہ لڑکی جس کے ہاتھ میں یہ تھا۔ تم اس سے احتیاط کرنا.... کیا معلوم وہ بھی کسی سحر کے زیرِ سایہ ہو۔ ملعون۔ سحر زدہ۔“ وہ اسے متنبہ کرنا نہیں بھولا تھا۔

ان سے دور.... باہر بیچ پہ بیٹھی تالیہ اب ایک نئے کورے کاغذ پہ خاکہ بنا رہی تھی۔ ایک مختلف جزیرہ.... ایک مختلف محل.... یہ ستونوں والا

تھا اور زیادہ خوبصورت تھا۔

☆☆=====☆☆

”تالیہ...تالیہ..!“

مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی.... اندھیرے میں جیسے کوئی دھیمی سی سرگوشی ہو جو نیند کے سحر کو توڑ دے... تکلیف کے باوجود اس نے بدقت آنکھیں کھولیں.... دھندلا سا منظر دکھائی دیا....

پنجرے میں اس کے سامنے کوئی بیٹھا تھا... بیولہ سا... قریب... اس کی طرف فکر مندی سے جھکا ہوا....

”تالیہ..!“

اس نے پلکیں جھپکائیں... تصویر واضح ہوئی.... وہ کوئی مرد تھا.... شکل ابھی تک دھندلی تھی... گدلی سفید شرٹ، ماتھے پہ آگے کوگرے بال.... چھوٹی آنکھیں.... اور آنکھوں میں فکر مندی....

”تم ٹھیک ہوتا لیہ؟“ تشویش میں ڈوبی آواز.... اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ کس کی آواز تھی؟ شناسا.... بہت شناسا....

☆☆=====☆☆

چوکھٹ میں وہ بچکچاتی ہوئی بارہ سالہ لڑکی کھڑی تھی۔ پہلے سے کافی موٹی ہو چکی تھی مگر بال اب بہت چھوٹے تھے۔ چہرے پہ تذبذب تھا۔

سامنے ایک آفس تھا جس میں فائلوں سے بھری اونچی الماریاں رکھی تھیں۔ کرسی خالی تھی اور آفس کی مالکن (یتیم خانے کی کچن انچارج) مسز ایگنیس ایک الماری کے سامنے کھڑی تھیں۔ دستک پہ پلٹیں اور ذرا کوفت سے اسے دیکھا۔

”ہاں تالیہ.... بولو.... کیسے آئیں؟“

وہ ایک گال پہ آئے بال کان کے پیچھے اڑتی اندر داخل ہوئی۔ پھر ہاتھ باہم مروڑتے ہوئے بچکچا کے کہنے لگی۔

”مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی میم۔“

”جلدی بولو مجھے بہت کام کرنے ہیں۔“ وہ بے زاری سے کھڑے کھڑے بولیں۔

”وہ.... میم.... میم میں کھانا.... بہت.... کم ہوتا جا رہا ہے بروز۔ کیا آپ مقدار بڑھانیں سکتیں؟“ وہ اب صاف ملے بول رہی تھی۔

”نہیں۔ اور کچھ؟“

تالیہ نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ ”میم میرا پیٹ نہیں بھرتا۔ میں کیا کروں؟ مجھے ساری رات بھوک سے نیند نہیں آتی۔“

”بھوک نیند اور لالچ جتنا بڑھاؤ بڑھتی ہے جتنا گھٹاؤ گھٹتی ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اپنی بھوک کم کرنے پہ ہسیان دو۔“

”میم پہلے ٹھیک تھا کھانا اب آپ لوگوں نے مقدار کم کر دی ہے اور....“

”بات سنو تالیہ۔“ وہ اسے گھور کے درشتی سے بولیں۔ ”جو مل رہا ہے نا، یہ بھی لوگوں کی خیرات سے مل رہا ہے اور خیرات پہ پلنے والے

نخرے نہیں کرتے۔“

تالیہ کی آنکھوں سے قطرے ٹپ ٹپ گالوں پہ لڑھکنے لگے۔

”اب جاؤ۔“ کروفر سے ہاتھ جھلا کے کہا تو وہ مڑ گئی۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا، میم اینکینس کی میز پہ خوبصورت ڈیزائنریگ رکھا تھا۔ میم کے جوتے بھی نئے تھے۔ کلائی کی گھڑی بھی قیمتی لگ رہی تھی۔ یہ سب کھانے کی مقدار گھٹانے سے پہلے تو نہیں ہوتا تھا۔ ہتھیلی سے آنکھیں رگڑتی وہ باہر نکل آئی۔ سامنے سے خاکروب واپس اور جھاڑو لئے چلا آ رہا تھا۔ دھینا اس نے اب آفس کی صفائی کرنی تھی۔

اگلی صبح وہ ابھی بستر میں سو رہی تھی جب کسی نے زور سے اس کا الحاف کھینچا۔ تالیہ ہڑبڑا کے اٹھی۔

”نیچے اترو۔“ کمرے میں اتنے سارے لوگ۔ ان کے غصیلے چہرے۔ وہ نیند کی کیفیت میں چند لمحے ٹکڑ ٹکڑ دیکھتی رہی پھر حواس واپس آئے تو تیزی سے بنکر کی سیڑھیاں پھلانگ کے نیچے اتری۔

میم اینکینس کمر پہ ہاتھ جمائے سرخ چہرے کے ساتھ سامنے کھڑی تھیں۔

”میرے پیسے کہاں ہیں؟“ انگارہ ہوتی آنکھوں سے سوال کیا۔

”جی؟“ تالیہ نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

”ڈرامے نہیں کرو۔ کل تم آئی تھیں میرے آفس۔ میز پہ میرے بیگ میں نوٹوں کی گڈی رکھی تھی۔ وہ تمہارے جانے کے بعد غائب ہوئی۔ کہاں ہے وہ؟“

اس کے اوپر سے گویا ٹرک گزر گیا۔ بری طرح کچلے جانے کا احساس اسے یوں پہلی دفعہ ہوا تھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔ تالیہ چور نہیں ہے، میم۔ تالیہ نے چوری نہیں کی۔“

زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پہ لگا۔ وہ تیور کے نیچے گری۔

اینکینس کے پیچھے کھڑی افسر وہی مسز ماریہ نے روکنا چاہا لیکن پھر ٹھہر گئیں۔ وہ مداخلت نہیں کر سکتی تھیں۔ آفس پالکس۔

”اس کے سامان کی تلاشی لو۔ اور آج سے تالیہ کا ایک وقت کا کھانا بند۔ جب تک یہ میرے پیسے واپس نہیں کرتی۔“ اینکینس ہدایات دے رہی تھیں۔

اور وہ گال پہ ہاتھ رکھے صدمے سے نیچے گری پڑی تھی۔ آنکھوں سے گرم گرم پانی بہہ رہا تھا.... اور نظروں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا.... پس منظر میں آوازیں آرہی تھیں.... اس کا سامان کھولنے کی.... کچھ نہ ملنے کا اعتراف کرنے کی.... مگر اینکینس کی چیخ و پکار جاری تھی....

☆☆=====☆☆

”تالیہ.... تم ٹھیک ہو؟“

گھوڑے کے ناپوں کی آواز اس کو واپس کھینچ لائی تھی۔ اس کا جسم تیز دوڑتی سواری کے باعث جھول رہا تھا۔ بدقت اس نے آنکھیں کھولیں اور پلکیں جھپکائیں۔

وہ سامنے بیٹھا فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے پلکیں سکڑ کے دیکھا۔ اس کا چہرہ واضح ہوا۔

”تو اٹکو۔“ وہ ذرا سا اٹھ کے بیٹھی۔ وہ وان فاتح تھا اور وہ پنجرے میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے پنجرے کی سلاخوں سے سڑک کنارے دوڑتے کھیت نظر آرہے تھے۔

”تم ٹھیک ہو؟“ اس نے پھر پوچھا۔ آواز بار بار پلٹ کے سنائی دیتی جیسے وہ کنویں میں بول رہا ہو۔ شاید اس کے کان بج رہے تھے۔ ”ہوں!“ اس نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ پوچھنے لگا مگر اب اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔ صرف لب ہلنے لگے۔ گھوڑے کے ناپوں کی آواز اس کی سماعت پہ چھانے لگی۔ تالیہ نہیں جانتی تھی کہ اس شور میں وہ کیا کہہ رہا ہے۔

☆☆=====☆☆

وہ ایک لمبا سا برآمدہ تھا جس سے کئی کمروں کے دروازے باہر کھلتے تھے۔ شام کے اس پہر وہ خاموش پڑا تھا۔ دفعتاً ایک دروازہ کھلا اور یتیم خانے کا خاکروب باہر نکلتا دکھائی دیا۔ منہ میں کچھ چباتا وہ دروازہ بھڑکے آگے بڑھ گیا۔

دیواری اوٹ سے تالیہ دھیرے سے نکلی۔ اس کے پھولے گال پہ نیل کا واضح نشان تھا اور آنکھوں میں سلگتا ہوا غصہ۔ خاکروب اب بے پرواہ سادور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے تک آئی۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ وہ اناڑی چور تھا لیکن اگر اتنا ہی ذہین ہوتا تو خاکروب تھوڑا ہی ہوتا؟

وہ تیزی سے اندر گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر بتی جلائی۔ سادہ کمرہ.... الماری.... صندوق۔ وہ تیزی سے آگے آئی اور ایک ایک چیز کھولنے لگی۔ چند منٹوں میں کمرے کا حشر نشر ہو گیا۔ جو آخری چیز اس نے کھولی وہ تکیے کا غلاف تھا۔ اسے الٹا یا تو نوٹوں کی گڈی زمین پہ آن گری۔

وہ تلخی سے مسکرائی اور گڈی اٹھائی۔ (تو یہ تھی وہ رقم جس کے لئے اکیئیس نے مجھ پہ جھوٹا الزام لگایا؟ میرے بعد خاکروب آیا تھا۔ یہ واقعی اسی نے چرائی تھی۔)

اس نے رقم لباس میں چھپائی، ایک نظر کمرے کو دیکھا اور پھر اسے اسی طرح چھوڑ کے باہر نکل آئی۔ یہ اس کی پہلی چوری تھی اور تھی تو وہ بھی اناڑی چور مگر جانتی تھی خاکروب کبھی بھی گڈی نکال لینے والے کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے نوٹوں کی گڈی چھپا دی اور پھر بستر پہ اُلٹی پاتی کر کے بیٹھی سو جتی گئی۔

کیا وہ یہ رقم اکیئیس کو واپس کر دے؟ مگر پھر گال پہ ہاتھ رکھا تو کراہ نکلی۔ دروا بھی تک ہوتا تھا۔ سرفرت سے ہلایا۔ برگز نہیں۔

تو پھر وہ اس کا کیا کرے؟ چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے وہ سو جتی رہی۔

اس رات جب میس میں کھانا لگا تو اس نے آہستہ آہستہ کھانا کھایا۔ یہاں تک کہ سب اٹھ گئے اور وہ ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ نرملا دیوی جو وہاں کام کرتی تھی، کوفت سے اس کی میز تک آئی۔ ”تم اٹھو گی یا نہیں؟“

”نرملا دیوی....“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے لجاجت سے بات شروع کی۔ دل دھڑک رہا تھا۔

”کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟“

”بتاؤ۔“ وہ سننے رک گئی۔ تالیہ نے ایک تہہ شدہ نوٹ کپڑوں سے نکال کے اس کی طرف بڑھایا۔ نرملا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”تالیہ۔ تم نے واقعی مسز ایگنیس کے پیسے چرائے تھے؟“

”دشش۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اگر میں تمہیں روز پیسے دوں تو تم مجھے زیادہ کھانا دیا کرو گی؟ بہت زیادہ۔“

نرملا نے ایک نظر نوٹ کو دیکھا اور چہرے پر غصہ لے آئی۔

”کیوں بھئی؟ میں کیوں کروں گی ایسا؟ بلکہ میں ابھی مسز ایگنیس کو بتا دوں گی۔“

”کیا بتاؤ گی؟ کہ تالیہ نے آپ کے پیسے چرائے ہیں؟ سارا یتیم خانہ پہلے سے ہی سمجھتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ پیسے رکھ لو تو تمہیں ہی

فائدہ ہوگا....“ وہ جتنی تیزی سے بولی.... نرملا جواب ہو گئی....

پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور نوٹ تھام لیا....

☆☆=====☆☆

”اس نے تمہارے سر پہ مارا تھا کچھ شاید۔ کیا تمہیں درد ہو رہا ہے؟“ فاتح کے الفاظ اب کچھ کچھ سنائی دینے لگے تھے۔ گھوڑا گاڑی سر

پٹ دوڑ رہی تھی اور وہ پنجرے کے کونے میں بیٹھی یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ویرانی اور خالی پن سے۔ ذہن اس کے الفاظ کو جھڑ نہیں کر پا رہا تھا۔

”سر میں درد ہے کیا؟“ وہ فکر مندی بھری نرمی سے سوال پوچھ رہا تھا۔

”ہم.... کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے خود کو کہتے سنا....

پنجرے کے باہر اب کھیت نیلے اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے تھے.... شاید مغرب پھیل رہی تھی....

☆☆=====☆☆

نرملا دیوی راہداری میں چلتی جا رہی تھی جب تالیہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ وہ پہلے سے بڑی اور سنجیدہ نظر آتی تھی۔ قدر نما کے برابر

پہنچنے کو تھا۔ گال زیادہ پھول گئے تھے۔ راہداری کے وسط میں اس نے نرملا کو روکا تو وہ اکتائے ہوئے انداز میں رکی۔

”کیا ہے؟“ لا پرواہی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ساڑھی پہ جیبوں والا لمبا سوئٹر پہنے وہ ایک تیز طرار عورت لگتی تھی۔

”نرملا دیوی.... میں نے تم سے چاول زیادہ مانگے تھے اور تم نے مجھے نہیں دیے۔“

”کیونکہ تم اب مجھے پیسے نہیں دے رہیں۔“

”میرے پیسے ختم ہو گئے ہیں۔“

”ہاں میں جانتی ہوں، تم جب بازار جاتی ہوڑپ کے ساتھ تو اپنے کپڑوں میں کتنے کیک اور چاکلیٹس چھپا کے واپس لاتی ہو۔ اگر تم فضول خرچی نہ کرتیں تو اتنے سارے پیسے ختم نہ ہوتے۔“ وہ ناک سکڑ کے بولی۔

”مگراتنے ماہ تو میں نے تمہیں پیسے دیے ہیں۔ اب نہیں ہیں تو کیا کروں۔“ وہ روہا ہنسی ہوئی۔

”تم چور ہو۔ چرا لو کسی سے۔ لیکن اگر پیسے نہ دیے تو زیادہ کھانا نہیں دوں گی۔“ وہ ہونہ کہہ کے آگے بڑھی۔ تالیہ راستے میں کھڑی تھی، سو اس کو ایک ہاتھ سے تالیہ کو پرے دھکیلنا پڑا۔ اور اسی وقت تالیہ کا ہاتھ نرملا کے سویٹر کی جیب میں گیا۔ نرملا چلتی گئی۔ تالیہ نے بند مٹھی کھولی۔ اندر چابی تھی۔

(آخر میں چور ہوں نا۔) اس نے دکھ سے وہ چابی دیکھی۔ ان میں سے ایک میس کے فریج کی چابی تھی۔ جو نرملا کی دسترس میں رہتی تھی۔

اگلی صبح چابی نرملا کی جیب میں واپس آچکی تھی مگر جب ناشتے کے لئے اس نے فریج کا دروازہ دیکھا تو اس کا لاک کھلا تھا اور لاک کے اندر چابی ٹوٹی ہوئی تھی۔ شاید کل جلدی میں فریج بند کرتے ہوئے چابی لاک کے اندر ٹوٹ گئی ہو اور اسے علم نہ ہو سکا ہو۔ مگر شکر کے دروازہ لاک نہیں ہوا تھا۔ ورنہ یہاں سب اتنے سست تھے، کوئی بھی لاک تبدیل کروانے کی ہمت نہ کرتا۔

اب وہ فریج کو لاک نہیں کر سکتی تھی مگر دروازہ کھول بند کر سکتی تھی۔ (خیر ہے کسی دن لاک بدلوادوں گی۔ کون سا بچوں کو علم ہے کہ دروازہ اب لاک نہیں ہوگا اور وہ کچھ چرائیں گے۔) اس نے بے پرواہی سے اندر سے دودھ نکالا اور دروازہ بند کر دیا۔

مگر ایک بچی کو علم تھا کہ اب رات کو وہ بے پاؤں میس میں جا کر کھانا کہاں سے چرانا ہے۔

☆☆=====☆☆

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کی آواز پھنسی پھنسی سی نکلی تھی۔

پتھر پٹی سڑک پہ دوڑتی کھوڑا گاڑی کو مسلسل جھٹکے آرہے تھے۔ کھیت اب اندھیرے میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

”میں نہیں جانتا۔ انہوں نے گن پوائنٹ پہ....“ وہ رکا۔ ”تکوار تان کر ہمیں اندر بیٹھنے پہ مجبور کیا۔ اور پھر یہ تمہیں بھی لے آئے۔ تم بے

ہوش تھیں۔“

”اور ایڈم؟“ اس نے نظریں گھمائیں۔ دوسرے کونے میں ایڈم اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسے خود کو دیکھتا پا کے سر کو خم دیا۔

”یری خبر، چے تالیہ۔ میں ابھی تک زندہ ہوں۔“

اس کی نظریں ایڈم کے ہاتھوں پہ جم گئیں۔ وہ آگے کو اکٹھے تھے اور کلائیوں کے گرد سی بندھی تھی۔ سی اس کی گردن تک جاتی تھی۔ اور

پیروں میں بھی۔ وہ پوری طرح سے بندھا تھا۔

”اس کے ہاتھ....“ وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی.... ”کیوں بندھے ہیں؟“

اب سارے پاندھیرا اچھا ہاتھ۔ سڑک تار یک ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

یتیم خانے کی پتھریلی عمارت اس ڈوبتی شام میں یوں کھڑی تھی کہ اس کے سایے لمبے ہو کے گھاس پہ گر رہے تھے۔ سورج کا نارنجی تھال ڈوبنے کے قریب تھا۔ تالیہ ایک درخت سے ٹیک لگائے گھٹنوں پہ کاپی رکھے قلم تیز تیز چلا رہی تھی۔ کاغذ پہ ایک سیاہ سفید سا کچھ ابھر رہا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پہ مخروطی چھت والا محل۔

دفتر باؤٹ میں مقید دو پیراس کے سامنے آر کے۔ ایسے سیاہ چمکدار بوٹ کہ ان میں چہرہ نظر آئے۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ وہ ٹوپس میں ملبوس ایک آدمی تھا جس کے سر پہ انگریزوں والا سیاہ ہیٹ تھا اور ہاتھ جیبوں میں تھے۔ صاف رنگت، چینی نقوش، دلکش مسکراہٹ اور ہاں.... کوٹ کی اوپری جیب میں انکا پیلا گلاب جو پہلی نظر میں ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا تھا۔ اجنبی یہاں کم کم نظر آتے تھے۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی حیرت بھانپ کے نووارد نے ہیٹ اتار اور سر جھکایا۔ ”کیسی ہوتی، کم عمر لڑکی؟“

وہ مسکرائی نہیں۔ بس سنجیدگی اور اچھنبے سے اس کو دیکھ گئی۔

بھورے بالوں والا وہ آدمی بہت سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ عمر چالیس سے اوپر ہوگی۔ اور آنکھیں کسی کم عمر لڑکے جیسی جوان تھیں۔ ”تمہارے بال کس نے کاٹے ہیں، ننھی لڑکی؟“

وہ اس کے سامنے گھاس پہ کھڑا تھا۔ پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ پتھریلے قلعے کے سایے غائب ہو رہے تھے۔ تالیہ چپ رہی۔

”اچھے نہیں کاٹے۔“ اس نے ہیٹ دوبارہ سر پہ جمالیا۔ تالیہ نے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو چھوا۔ وہ پہلے کی طرح لمبے نہیں تھے بلکہ کانوں سے ذرا نیچے تک باب کٹ کی صورت آتے تھے۔

”کیا تمہیں لمبے بال نہیں پسند؟“

تالیہ نے سر جھکالیا اور بولی تو آواز میں سادگی تھی۔

”ہم یتیم ہیں اور ہم خیرات پہ پلتے ہیں۔ جتنے لمبے بال اتنا زیادہ شیمپو۔ یہاں سب کے بال چھوٹے ہوتے ہیں۔“

”اور تمہارے کپڑے؟“ وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگالی۔

”ہمارے کپڑے کبھی درست سائز کے نہیں ہوتے۔ لوگ اچھے کپڑے اور کھلونے کبھی خیرات میں نہیں دیتے، اُن بچے (مسٹر)۔۔۔؟“

وہ کی اور بچکچا کے گردن اٹھائی۔

”ذوالکفلی!“ وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔

”ذل... کف... لی؟“ وہ مسحور سے توڑ توڑ کے دہرانے لگی۔ جیسے اس ویران کھنڈر قلعے میں کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔

”ہاں۔ صرف ذوالکفلی۔ میں راکٹر ہوں اور یتیم خانے کی زندگی پہ ناول لکھ رہا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟“

”میں؟“ اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”مسز ماریہ نے مجھے یتیم خانے کے ان کوارٹرز میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“ اس نے قلعے کی اوپری منزل کی طرف اشارہ

کیا۔ وہاں ٹاور کی سب سے اونچی کھڑکی تھی۔ ”لیکن یہاں کوئی ٹھیک سے بات ہی نہیں کرتا۔ تم کرو گی؟“

”ہوں۔“ اس نے گردن اثبات میں ہلائی۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

”کل رات جب میں ادھر رہا تو... چے...؟“ وہ رکا۔ (مس؟)

وہ تیزی سے بولی۔ ”تالیہ بہت مراد۔“ وہ مسکرایا۔ کیا سحر انگیز مسکراہٹ تھی اس کی۔

”چے تالیہ۔ بلکہ مجھے کہنا چاہیے۔ پتری تالیہ (شہزادی تالیہ)....“ تالیہ کے گالوں پہ سرخی پھیلی۔ مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا پتری تالیہ... رات جب میں یہاں رہا تو چیخنے کی آوازیں آتی تھیں۔“

”ہر رات آتی ہیں۔ یتیم خانے میں کبھی خاموش راتیں نہیں گزرتیں ان چے ذوالکفلی۔“

”مگر کل رات وہ لڑکا کیوں چیخ رہا تھا۔“

”کیونکہ جب بھی کوئی نیا شخص یتیم خانے میں آتا ہے۔ (اس کی نظریں ذوالکفلی کے چہرے پہ بہت مان سے جم گئیں۔) اور وہ ہم سے

پیار سے بات کرتا ہے... تو ہمیں لگتا ہے وہ ہمارا فوسٹر فار بن جائے گا۔ اور وہ ہمیں اس جگہ سے دور لے جائے گا۔ وہ ہمیں فیملی دے دے

گا۔ اس نے بھی یہی سمجھا لیکن وہ لوگ جب اس کو پسند کیسے بغیر چلے گئے تو وہ ساری رات روتا رہا۔“

”ویری سیڈ۔“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ پھر نگاہ تالیہ کے کاغذ پہ پڑی تو قدرے چونکا۔

”کیا بنا رہی ہو تم؟“ اس نے کاغذ لیا تو وہ مسکرا دی۔

”مجھے محل بنانا اچھا لگتا ہے۔“

”مگر مجھے محل میں رہنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا تو وہ دونوں ہنس دیے۔ قلعے کے اوپر شام کے سایے اب مزید گہرے ہو رہے

تھے۔

☆☆=====☆☆

”اس کے... اس کے ہاتھ کیوں بندھے ہیں؟“ وہ تکلیف کے باعث گھٹا گھٹا سا بول پائی۔ سامنے بیٹھے فاتح نے گہری سانس لی۔

”کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ ہم بھاگ جائیں اس لیے انہوں نے ہمیں باندھ دیا ہے۔“
 گھوڑا گاڑی پنجرہ لا دے سڑک پہ سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ ارد گرد کھیتوں پہ رات چھاتی جا رہی تھی۔
 ”ہم؟“ اس نے چونک کے دہرایا۔ حواس ذرا جاگے۔ گردن جھکائی تو دیکھا۔ گود میں رکھے اس کے اپنے ہاتھ بھی رسیوں میں بندھے
 تھے اور وہ رسی اس کی گردن تک آ کر اسے مقید کیے ہوئے تھی۔ پھر پیروں تک جاتی۔ پیر تک بندھے تھے۔
 اس نے بدک کے ہاتھ اوپر کھینچے مگر رسیوں کی گرفت مضبوط تھی۔

”ریلیکس چے تالیہ.... ہم کوشش کر چکے ہیں.... یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ دور بیٹھا دھندلا سا نظر آتا ایڈم بولا تھا۔
 وہ سنے بغیر مختل حواسوں کے ساتھ بار بار ہاتھ اوپر کھینچ رہی تھی.....
 گھوڑے کے ناپوں کی آواز سماعتوں میں صور پھونکنے جا رہی تھی.....

☆☆=====☆☆

ملاکہ شہر میں واقع یتیم خانے کا پتھر یلا قلعہ دھوپ میں کھڑا دکھ رہا تھا۔ اندر ایک راہداری میں چند بچے چلتے جا رہے تھے۔ سب سے
 پیچھے وہ دونوں تھے۔ پیلے گلاب کو کوٹ کی اوپری جیب میں دکائے، سیاہ ہیٹ پہنے ذوالکفلی.... اور.... اس کے ساتھ چلتی تالیہ۔
 ”آج سب خوش کیوں ہیں پتری تالیہ؟“ وہ سامنے چبکتے بچوں کی طرف اشارہ کر کے بولا تھا۔
 سرخ سیبوں جیسے موٹے گالوں والی تالیہ مسکرا کے بتانے لگی۔ ”کیونکہ ملاکہ کی کسی امیر فیملی کے بچے کی آج سالگرہ ہے۔ جب امیر
 لوگوں کے بچوں کی سالگرہیں ہوتی ہیں نا تو وہ یتیم خانے میں مٹھائی یا چاکلیٹ بھیجتے ہیں.... یا ایک وقت کے چاول وغیرہ.... بہت مزہ آتا
 ہے۔ کاش امیر بچوں کی سالگرہیں روز ہوا کریں تاکہ ہمیں ان کے مال سے کچھ حصہ ملتا رہا کرے۔“
 وہ آس سے بولی تو وہ راہداری کے درمیان رک گیا اور اس کی طرف گھوما۔ وہ بھی بے ساختہ ٹھہر گئی۔
 ذوالکفلی گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھے اس کی جانب جھکا اور سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”امیر لوگ بھی ہم جیسے ہوتے ہیں تالیہ.... مگر وہ امیر اس لئے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمارا پیسہ لوٹتے ہیں۔ ان کی دولت اصل میں ہماری
 ہوتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ تالیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

”کیونکہ جو ٹیکس ہم دیتے ہیں وہ قومی خزانے میں جاتا ہے۔ امیر لوگ خزانے سے بہانے بہانے سے رقم نکلاتے ہیں۔ کبھی پرائیویٹ
 کی صورت میں، کبھی بینکوں سے قرضے کی صورت میں۔ امیر لوگ پھر وہ رقم کبھی واپس نہیں کرتے۔ اسی رقم سے وہ اپنے بچوں کی سالگرہیں
 کرتے ہیں۔“

”یعنی ان کا پیسہ ہمارا ہوتا ہے؟“

”ہاں.... اور اپنا پیسہ واپس لینا کوئی جرم نہیں ہوتا۔“ وہ سیدھا ہو گیا۔ پھر مسکرایا۔ ایک دم سے اس مسکراہٹ نے اس کے سنجیدہ تلخ چہرے کو ڈھانک دیا۔

”چلو اوپر چھت پہ چلیں۔ میں ملا کہ کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔“ تالیہ نے گہری سانس لی۔

”آپ کو چھت سے بروقت شہر دیکھنا کیوں پسند ہے ان بچے ذوالکفلی؟“ وہ افسوس سے بولی تھی۔ وہ جواب میں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں اب راہداری میں چلتے دور ہوتے جا رہے تھے.... ان کی آوازیں مدھم مدھم ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

”تالیہ۔ مت کرو۔ رکو۔ اسٹاپ اسٹ۔“ وہ اب کے جھڑک کے بولا تو وہ جو سی مسلسل کھینچ رہی تھی ٹھہری.... گردن اٹھا کے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا....

”یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے ہمیں کیوں پکڑا ہے؟“ پلکیں جھپکائیں تو بصارت واضح ہوئی جیسے پانی گد لے شیشے کو صاف کر دے.... جامنی اندھیرے میں فاتح کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔

”میں نہیں جانتا۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھتا۔“ وہ مدھم آواز میں بتانے لگا۔ ”انہوں نے ہمارے اوپر تلواریں تان لی تھیں۔“ ”تو آپ لوگوں نے مزاحمت کیوں نہیں کی۔ ایڈم کے پاس تو پستول بھی تھا۔“ وہ شاکی نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے ان کی بہادری پہ شک ہوا ہو۔

”میں تو اس کو شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر سرنے روک دیا۔“ ایڈم گلہ آمیز انداز میں بولا۔

”ایڈم نے آج تک ایک جیتا جاگتا انسان نہیں مارا، میں تم دونوں کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ اور پنجرے کی سلاخوں سے ٹیک لگالی۔ سفید گدلی شرٹ کے آستین اوپر چڑھائے، مٹی لگے چہرے کے ساتھ وہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بھی ویسے ہی بندھے تھے۔

”اور جب میں نے ان کی گاڑی دیکھی تو کوئی مزاحمت نہیں کی۔ گاڑی کا مطلب تھا کہ وہ راستوں سے واقف ہیں۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھتا مگر وہ بار بار ایک ہی لفظ دہرا رہے تھے۔ ملا کہ۔ یقیناً یہ گاڑی ملا کہ شہر جا رہی ہے۔“

”اور آپ نے خود کو بندھوا کے جانوروں کی طرح اس پنجرے میں ڈالنے دیا ان کو۔ کوئی مزاحمت نہیں کی؟“ وہ غصے سے بولی۔ سراسیمہ تک گول گول گھوم رہا تھا۔

”صرف اس لئے کہ وہ ملا کہ جا رہے تھے۔ ان کو جنگل سے نکلنے کا راستہ معلوم تھا۔ کیا تم بھول گئیں؟ Eyes on the Prize۔

اور ہماری منزل ملا کہ ہے۔ منزل پہ سمجھوتہ نہیں کیا جاتا۔ راستوں اور طریقوں پہ کر لیا جاتا ہے۔“

وہ بالکل چپ ہو گئی.... پھر سر دھیرے سے سلاخوں سے نکا دیا اور نظریں باہر دوڑتے کھیتوں پہ جمادیں۔

چاند نکل آیا تھا اور کھیت اندھیرے میں چاندنی کے باعث مدھم مدھم سے نظر آرہے تھے....
گھوڑوں کے قدم دھول اڑاتے تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے....

☆☆=====☆☆

قلعے کے باغیچے میں بہار کے ڈھیروں پھول کھلے تھے اور ان کی خوشبو گھاس پہ بیٹھے لوگ محسوس کر سکتے تھے۔
وہ گھاس پہ اُلٹی پالٹی کیے بیٹھی تھی اور سامنے ہیٹ والا مسکراتا ہوا ذوالکفلی بیٹھا تھا۔

”اور کیا ہے وہ جادو جو آپ نے مجھے دکھانا تھا؟“ وہ مسکرا کے دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔ انداز میں اعتماد اور انسیت تھی۔
”ہاں وہ...!!“ وہ مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تالیہ آگے کوچھکی اور جب مٹھی بابر نکال کے کھولی تو اس میں ایک سکہ تھا۔
”یہ کھونا ہے اور یہ دنیا والوں کے پاس کھونا ہے گا مگر جب یہ تمہارے ہاتھ میں آئے گا تو....“

تالیہ نے دلچسپی سے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ ذوالکفلی نے سکہ اس کے ہاتھ پہ رکھا اور اس کی مٹھی بند کی۔ اب ذوالکفلی کے ہاتھ اس کے
ہاتھ کے اوپر نیچے رکھے تھے۔ پھر اس نے تالیہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

”مگر تمہارے ہاتھ میں وہ کھونا نہیں رہے گا۔ وہ تمہارے دل جیسا ہو جائے گا۔ خوشبودار اور خوبصورت۔“ اس نے ہاتھ کھینچ لیے۔ تالیہ
نے بند مٹھی دھیرے سے کھولی۔

اندر سکہ نہیں تھا۔

اندر پیلا گلاب تھا۔

اس کی آنکھیں بے یقینی سے پوری کھل گئیں۔ ”یہ کیسے؟“ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ گئے۔

”میں جادوگر ہوں پتری تالیہ (شہزادی تالیہ)۔“ وہ آواز کو بھاری کر کے بولا تو وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں ہنس دی۔
”اور وہ سکہ کہاں گیا؟“

”تمہاری جیب میں۔“

تالیہ نے جلدی سے فرائ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر سکہ واقعی رکھا تھا۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔
”کیا آپ مجھے یہ جادو سکھا سکتے ہیں؟“ وہ لجاجت سے بولی مگر ذوالکفلی گھڑی دیکھتے اٹھ رہا تھا۔
”مجھے ابھی چھت سے ڈوبتا سورج دیکھنا ہے۔ اس کے بعد۔“

”پلیز ابھی۔“ وہ منت کرنے لگی مگر وہ مسکرا کے اپنا ہیٹ درست کرتا آگے بڑھ گیا۔

”سب کہتے ہیں ذوالکفلی صاحب یہاں تمہاری وجہ سے ٹھہرے ہیں۔“ ایک کم عمر بچہ اس کے قریب آ کے بیٹھا اور دھیرے سے کان
میں سرگوشی کی۔ تالیہ کا چہرہ مزید چمک اٹھا مگر بظاہر خفگی سے اس کی طرف مڑی۔

”وہ ناول لکھ رہے ہیں بس اس لئے ٹھہرے ہیں۔“

”نہیں۔ کل مسز انکینیس بھی کہہ رہی تھیں۔ وہ ایسے بچے کو ایڈاپٹ کرنا چاہتے ہیں جن سے ان کی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔ وہ شاید تمہارے فوٹو فارورڈ بن کے تمہیں ایڈاپٹ کر لیں گے۔ تم لکی ہوتا لیہ... تم یہاں سے چلی جاؤ گی۔“ وہ سمجھداری سے کہہ کے اٹھ گیا تو وہ مسکرا کے پھر سے ان دونوں چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔

ایک کھونا سکھ اور ایک پیلا گلاب....

واؤ... جسٹ واؤ۔

☆☆=====☆☆

رات گہری ہو رہی تھی اور گھوڑا گاڑی کی رفتار قدرے سست ہو گئی تھی۔ وہ ہنوز پنجرے کی سلاخوں سے سر ٹکائے ہوئے تھی۔ البتہ نیند اب پوری طرح کھل چکی تھی اور آنکھیں دور سڑک پہ جمی تھیں۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا۔ اتنے تارے، اتنے تارے... گویا سیاہ دوپٹے پہ افشاں انڈیل دی گئی۔

”اس دنیا میں سب کچھ ہمارے ملائیشیا سے مختلف ہے... بس ایک ہو ایسی ہی ہے...“ وہ سڑک کو تکتے ہوئی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے، چچا تالیہ، ہوا بھی ویسی نہیں ہے۔“

”کیا؟“ تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔

”جب ساٹھ ستر سال پہلے امریکہ نے جاپان پہ ایٹم بم برسائے تھے تو وہ بم ساری دنیا کی فضا کو آلودہ کر گئے تھے۔ یعنی ہمارے Planet اترھ کی فضا میں، مٹی میں، پھلوں میں، ہر چیز میں ہلکا ہلکا سا Cesium-137 شامل ہو گیا تھا اور قیامت تک شامل رہے گا۔ اس سے پہلے یہ قدرتی طور پہ فضا میں نہیں ہوتا تھا۔ یعنی ابھی....“ ایڈم نے گہری سانس اندر کھینچی۔ ”ابھی فضا اس سے پاک ہے۔ مگر ظاہر ہے، آپ کو کیا معلوم۔ آپ کتابیں تھوڑی پڑھتی ہیں۔“

فاتح نے فوراً تالیہ کا چہرہ دیکھا (کوئی ردِ عمل؟) مگر... خلافِ توقع اس نے برا نہیں مانا۔ بس سر واپس سلاخوں سے ٹکادیا۔

ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ جھٹکا اتنا زور کا تھا کہ تالیہ کا سر جھول کے دوبارہ سلاخوں سے آنکرایا۔ لبوں سے کراہ نکلی۔

گاڑی کی اگلی نشستوں سے کوئی جست لگا کے اتر اور پیچھے آیا۔ سر پہ پٹی باندھے وہ سانولا سا آدمی تھا۔ اس نے ان تینوں کو باری باری گھورتے ہوئے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ اندر بڑھایا جس میں تین رول سے تھے۔ خوشبو بھی اچھی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ تالیہ کا ہاتھ سب سے پہلے بڑھا۔ اس نے جلدی سے رول تھاما اور آنکھوں کے قریب کر کے دیکھا۔ روئی جیسی چیز میں اپنا قیے جیسا آمیزہ۔

اس نے ندیدوں کی طرح دانت اندر گاڑھے۔ گلیا بھی تھا جیسے کوئی ساس اندر لگی ہو۔ مختلف سا ذائقہ تھا مگر مزیدار تھا۔ اتنے دنوں کی

محرومی جاگ اٹھی۔ وہ جلدی جلدی کھانے لگی۔ فاتح نے باقی دونوں رول تھامے اور ایک ایڈم کی طرف بڑھا دیا۔ رسیاں سختی سے بندھی تھیں مگر لمبی تھیں۔ وہ ہاتھ قدرے آگے پیچھے بڑھا سکتا تھا۔

اب وہ آدی اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ فاتح نے قدرے اکتا کے اسے دیکھا۔

”وقت ضائع مت کرو ہم تمہاری زبان نہیں سمجھتے۔“

”کیا تم ہمیں ملا کہ لے کر جا رہے ہو؟“ وہ لقمے سے بھرے منہ کے ساتھ ایک دم بولی۔

اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ.... لہجہ.... زبان.... اس کے ساتھی مسافروں کے لیے اجنبی تھا۔ وان فاتح نے بے یقینی سے ابرو اٹھایا۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔ وہ آدی بھی چونکا تھا۔

”ہاں۔ ہم ملا کہ جا رہے ہیں۔“

”مگر تم نے ہمیں باندھا کیوں ہے؟ ہمارا جرم کیا ہے؟“ وہ رات کی تاریکی میں سلاخوں کے پار کھڑے آدی سے نڈر انداز میں پوچھ رہی تھی۔ فاتح بس اسے دیکھ رہا تھا۔ رول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ہم جانتے ہیں تم اپنے مالک کی قید سے بھاگے ہوئے غلام ہو۔ ہم تمہیں وہاں لے کر جا رہے ہیں جہاں جانے کے تم حقدار ہو۔“ قدرے سختی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی جھٹکے سے چل پڑی۔ تالیہ کا سر پھر سے سلاخوں سے ٹکرایا تھا۔ عین وہاں جہاں گومڑ تھا.....

☆☆=====☆☆

تیرہ سالہ تالیہ مراد سر جھکائے کرسی پہ بیٹھی تھی۔ میز کے پار کرسی پہ مسز ماریہ براجمان تھیں اور تالیہ کے سامنے بیٹھے پولیس آفیسر کو دیکھ رہی تھیں۔

”چے تالیہ! پولیس آفیسر اس کی طرف جھکے سنجیدگی سے مخاطب تھا۔

تالیہ نے ویران چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں ایسے خالی تھیں جیسے لئے ہوئے لوگوں کا دل خالی ہو جاتا ہے۔

”مسز ماریہ نے بتایا ہے کہ سارے یتیم خانے میں سب سے زیادہ ذوالکفلی تم سے گھلتا ملتا تھا؟“

تالیہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلادیا۔

”اب تک تم جان ہی چکی ہو گی کہ وہ ایک جھوٹا مکار شخص تھا۔ ایک کون آرٹسٹ۔ ایک چور۔“ وہ بے رحم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ تالیہ کی

آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ ”وہ کوئی رائٹر نہیں تھا۔ وہ جعلی کاغذات پہ ادھر آیا اور اوپر تاور سے وہ سامنے والی عمارت کا جائزہ لیا کرتا تھا۔

جہاں ایک آرٹ آکشن (نیلامی) ہونی تھی۔“

تالیہ نے پھر سے سر ہلادیا۔ سارے الفاظ معنی کھو چکے تھے۔ ذوالکفلی کے غائب ہونے کے بعد ساری دنیا جیسے اندھیر ہو گئی تھی۔

”کل رات اس نے نیلامی پہ ایک قیمتی ہیرا چرایا ہے۔ اور اب وہ غائب ہو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں اس نے تمہیں امید دلائی ہوگی کہ وہ تمہیں ایڈاپٹ کر لے گا مگر وہ ایک اسکا مرتھا تالیہ۔“

”اس نے مجھے کوئی امید نہیں دلائی تھی۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”مہر حال.... ہم نے اس کو گرفتار کرنا ہے.... کیا تم ہماری مدد کرو گی؟“

تالیہ نے ایک نظر مسز ماریہ کو دیکھا۔ پھر آفیسر کو۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”ہمارے پاس اب تک ذوالکفلی کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔ مسز ماریہ کا کہنا ہے کہ تم اسکیج بنانے میں ماہر ہو۔ کیا تم اس کا اسکیج بنا سکتی ہو یا ہمارے اسکیج آرٹسٹ کی مدد کر سکتی ہو؟“

وہ چند ثانیے اس کو دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے ایک کاغذ اٹھایا۔ پین ہولڈر سے قلم نکالا اور سر جھکائے قلم کاغذ پہ رگڑنے لگی۔ پولیس آفیسر نے گہری سانس لے کر ٹیک لگالی اور کلانی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ کام آسان ہو گیا تھا۔

”کیا اس نے کسی کو نقصان پہنچایا تھا؟ کسی کی جان لی تھی؟“ وہ تیزی سے قلم چلاتے سر جھکائے بولی۔

”نہیں مگر وہ چور تھا۔ اس نے ہیرا چرایا ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے مسز عثمان کے لئے۔“

”مسز عثمان وہی جن کی پوتی کی سالگرہ پہ یتیم خانے میں کھانے کے ڈبے آتے ہیں؟“

”ہاں، وہی، تالیہ۔“ مسز ماریہ نے تائید کی۔ وہ خاموشی سے اسکیج بناتی گئی۔ پھر سر اٹھایا اور کاغذ اس کے سامنے کیا۔ آفیسر نے غور سے اسے دیکھا اور مسز ماریہ کی طرف بڑھا دیا۔

”ذوالکفلی سے کم لوگ ہی ملے تھے۔ وہ عموماً کمرے میں رہتا تھا اس لیے یتیم خانے میں زیادہ لوگوں نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اگر مسز ماریہ آپ تصدیق کر دیں کہ یہ وہی آدمی ہے تو مجھے دوبارہ یتیم خانے کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔“

مسز ماریہ نے ”شیور“ کہتے ہوئے مسکرا کے کاغذ تھاما، پھر اس پہ نظر ڈالی تو مسکراہٹ مٹ گئی۔ وہ ایک موٹے بھدے آدمی کا چہرہ تھا۔ ناک آنکھیں، سب کچھ جدا تھا۔ انہوں نے چونک کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ انہی کو دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے۔

”کیا یہی ذوالکفلی ہے، مسز ماریہ؟“ آفیسر نے پھر سے کلانی کی گھڑی دیکھ کے غفلت میں پوچھا۔

”سر... جب میں دو سال پہلے یتیم خانے میں آئی تھی تو میری کلانی میں ایک بریسلٹ تھا... سونے کا... مگر پھر وہ....“ تالیہ ایک دم سادگی سے کہنے لگی.... اس سے پہلے کہ آفیسر اس کی طرف متوجہ ہوتا، مسز ماریہ جلدی سے بولیں۔

”جی یہی ہے وہ۔“ اور تیزی سے کاغذ واپس بڑھایا۔ رگلت قدرے پھیل گئی تھی۔

”شکریہ۔“ اس نے کاغذ تھاما اور تالیہ کو دیکھا۔ ”تمہارے بریسلٹ کا کیا؟“

تالیہ نے ایک چھپتی ہوئی نظر مسز ماریہ پہ ڈالی جو حیران بھی تھیں اور پھیل گئی بھی پڑی ہوئی تھیں۔ پھر ذرا سا مسکرائی۔ ”میں کہہ رہی تھی کہ میرا

بریسلیٹ.... بالکل آپ کی گھڑی جیسا لگتا تھا۔ اتنا ہی خوبصورت۔“
 ماریہ کے لبوں سے بے اختیار سکون بھری سانس خارج ہوئی۔ اف۔
 ”اوکے۔“ آفیسر رسما مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ذوالکفلی کی تصویر دکھا کے مزید ہمارے لوگوں کو براساں نہیں کریں گے۔ کیونکہ اگر بات پھیل گئی کہ تالیہ نے تصویر بنائی ہے یا تصویر ہماری طرف سے آپ کو ملی ہے تو ذوالکفلی یا اس کے ساتھی ہمیں جانی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“
 ”آپ بالکل بے فکر رہیں، مسز ماریہ۔ ہم دوبارہ آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔“ وہ اب شکریہ ادا کر رہا تھا۔
 اس کے جانے کے بعد آفس میں کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر تالیہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
 ”تم نے ذوالکفلی کو کیوں بچایا؟“ وہ پوچھے بناندرہ سکیں۔ ”وہ ایک چور ہے۔“
 ”نہی لڑکی مڑی اور سپاٹ نظروں سے ان کو دیکھا۔ ”یہاں کون چور نہیں ہے؟“
 مسز ماریہ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ تالیہ بنت مراداب باہر جا چکی تھی۔

☆☆=====☆☆

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز رات کے مقدس سناٹے کو چیر رہی تھی۔ اس کے سر کا گومڑ پھر سے درد کرنے لگا تھا۔ مگر وہ پرواہ کیے بنا مرغوبیت سے اس رول کو کھارہی تھی۔

”تم ان کی زبان بول سکتی ہو۔“ فاتح ابھی تک تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ منہ لقمے سے پھولا ہوا تھا۔ (یہ وہ نزاکت سے ٹیبل پہ چھری کاٹنے سے کھانے والی سوشلائٹ نہیں تھی جو ایک رات عصرہ اشعر اور اس کے ساتھ ان کے ڈائننگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے گھائل غزال کی بات کر رہی تھی۔)
 ”مگر کیسے؟“

”کیونکہ....“ لقمے کے باعث آواز پھنسی پھنسی نکلی۔ ”میں گیارہ سال اسی ملاکہ میں بڑی ہوئی تھی۔ زبان آتی ہے مجھے اور ہاں.... وہ کہہ رہا تھا کہ شاید ہم بھاگے ہوئے غلام ہیں۔“

”مگر تمہاری یادداشت تو کھو گئی تھی۔ تمہیں زبان کیسے یاد رہ گئی۔“

”پتہ نہیں۔“ تالیہ نے کندھے اچکائے اور تیزی سے کھانے لگی۔

”کیونکہ سر....“ ایڈم کھنکھار کے بولا۔ رول اس کے ہاتھ میں بھی تھا مگر وہ ذرا تہذیب سے کھارہا تھا۔

”یادداشتیں اور علوم ایک جگہ دماغ میں اسٹور نہیں ہوتے۔ گو کہ ابھی تک اس کی وجہ نہیں معلوم ہو سکی کہ اکثر یادداشت کھو جانے والے لوگوں کو اپنی زبان اور بہت سی عام معلومات کیسے یاد رہ جاتی ہیں، مگر شاید اس لئے کہ ان کے ذہن کا وہ حصہ متاثر ہوتا ہے جہاں ان کی

یاد دے رہی ہیں۔ وہ نہیں جہاں معلومات ہوتی ہیں۔ آپ کھا کیوں نہیں رہے سر؟“ کہتے ہوئے وہ اپنا رول لبوں تک لے گیا اور لقمہ دانتوں سے توڑا۔

فاتح نے جواب میں سوچتی نظروں سے اس رول کو دیکھا۔ ”اس میں گوشت ہے۔“
 ”ملا کہ مسلمان ملک ہے سر۔ یہ حلال ہوگا۔ ویسے بھی اس حالت میں سب جائز ہوتا ہے۔“
 ”یہ بات نہیں ہے۔ گوشت بردور میں ایک قیمتی غذا رہی ہے۔ اور ان لوگوں نے ہمیں قیدی بنایا ہے۔ قیدیوں کو اتنی اچھی غذا کون دیتا ہے؟“ وہ سوچ میں ڈوبا تھا۔

مگر وہ دونوں اس کی بات پہ غور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ خاموشی سے اپنا اپنا کھانا کھا رہے تھے۔
 رات قطرہ قطرہ گچھلتی جا رہی تھی.....

☆☆=====☆☆

یتیم خانے کے قلعے کا باغیچہ آج رنگوں اور روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے غبارے بکھرے تھے۔ ایک جانب اسٹیج تھا جہاں تقریب تقسیم انعامات ہو رہی تھی۔ چند مشہور سوشل ورکر خواتین... جی سنوری امیر بیگمات... اور سوئڈ بوئڈ اصحاب کرسیوں پہ براجمان تھے۔

مسز ماریہ بھی ایک کرسی پہ براجمان مسکرا رہی تھیں۔ سامنے بچے قطاروں میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ سب اچھے سے تیار ہوئے تھے (یتیم خانے کے بچے کم عمری میں ہی خود تیار ہونا سیکھ لیتے تھے کیونکہ ان کو کوئی تیار کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔) چند بچے اسٹیج پہ قطار میں کھڑے تھے۔ ایک ایک کر کے آگے آتے اور زیورات سے سچی خاتون سے انعام وصول کر کے اسٹیج سے اتر جاتے۔

مسز ماریہ کی نگاہ قطار میں تیسرے نمبر پہ کھڑی تالیہ پہ پڑی تو مسکراہٹ ذرا سٹی۔ وہ بالوں کی پونی بنائے خاموش سی کھڑی تھی۔ ذوالکفلی کے جانے کے بعد سے وہ چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ اور اگر کبھی مسز ماریہ سے سامنا ہو جاتا تو ان کو یوں دیکھتی کہ ان کو نگاہ چرائی پڑتی۔ بات صرف بریسلٹ کی نہیں تھی۔ کوئی بھی بچے کی بات نہ مانتا۔ بات اپنے دل کے چور کی تھی۔ انہوں نے پھر سے نگاہ چرائی۔

سامنے والے دونوں بچے بیٹے تو تالیہ کی باری آئی۔ خاتون نے مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا اور میز پہ رکھا کھلونے کا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔ تالیہ نے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ بس نظریں اٹھا کے ان کو دیکھا۔

”کیا مجھے وہ والا نہیں مل سکتا؟“ اس نے انگلی سے ایک دوسرے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ خاتون کی مسکراہٹ سٹی، مگر پھر... اسٹیج پہ بیٹھے اپنی طرف متوجہ لوگوں کو دیکھا... اور کیمرا مین کو جو تصاویر بنا رہا تھا۔ جلدی سے سنبھل کے مسکرائیں اور ”کیوں نہیں“ کہہ کے ایک دوسرا ڈبہ اٹھایا اور اس کی طرف بڑھایا۔

تالیہ نے بہت شوق سے وہ ڈبہ پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔ نیچے اپنی سیٹ پہ جاتے ہی اس نے وہ ڈبہ کھولا۔ اندر تیر کمان تھی۔ کھلونے والی

کمان جو اچھی کوالٹی کی تھی اور چند تیر۔ اس نے بہت محبت اور اپنائیت سے اس پہ ہاتھ پھیرا۔ اس سے متعلق کوئی یاد ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اتنا اپنا اپنا سا لگتا تھا کہ....
آگے جو ہوا وہ خود ہی ہوا۔

اس نے خود کو تیروں کا ترکش کمر پہ پہنتے دیکھا۔ پھر کمان سیدھی کر کے تیر اندر لگایا اور اسٹیج کے کونے میں لگے غباروں کی طرف نشانہ باندھا.... وہاں گیس والے غبارے ایک ساتھ بندھے تھے جیسے... غباروں کا گلدستہ ہو۔ اس نے کھینچ کے تیر چلا دیا۔
تیر زن سے اڑتا ہوا عین اس جگی لگا جہاں غباروں کے دھاگوں کا جوڑ تھا۔ چٹخنے کی آواز آئی اور غبارے غول کی صورت فضا میں بلند ہوئے۔

لوگوں نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ گردنیں مڑیں۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ تیر کش سے تیر نکال کے ایک کے بعد ایک فضا میں نشانے پہ چلا رہی تھی۔ فضا میں اڑتے غباروں کو باری باری تیر لگ رہے تھے۔ وہ 'ٹھاہ... ٹھاہ' کی آوازوں کے ساتھ پھٹنے لگے۔ مگر تالیہ نہیں رکی۔ ہاتھوں میں کوئی جنون سا در آیا تھا۔
بچے چیخیں مارتے اٹھ گئے۔ اسٹیج پہ بھی ہلچل مچ گئی۔ مگر وہ تاک تاک کے فضا میں اڑتے غباروں کا نشانہ لیتی ان پہ تیر بر سار ہی تھی۔ کوئی تیر خطا نہیں جا رہا تھا۔

غبارے پٹاخوں کی آواز کے ساتھ پھٹتے جا رہے تھے۔

زور سے مسز ماریہ نے اس کے ہاتھ سے کمان کھینچا اور ایک زمانے دار تھپڑا سے رسید کیا تو وہ ہوش میں آئی.... اور ادھر ادھر دیکھا۔
حیرت اور خوف سے دور ہٹے بچے.... اسٹیج پہ کھڑے لوگ... کیمرہ مین دھڑا دھڑا تصویریں اتار رہا تھا۔ وہ ایک دم ڈر سی گئی۔ جلدی سے پیچھے کو ہٹتی۔ مسز ماریہ برہمی اور بے یقینی سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

اس لمحے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی کو وہ مزید اپنے یتیم خانے میں برداشت نہیں کر سکتیں۔ انہیں جلد از جلد اس کو ایڈاپٹیشن کے لئے دینا ہوگا۔ انہیں اس سے چھٹکارا چاہیے تھا۔
یہ لڑکی سحر زدہ تھی۔

☆☆=====☆☆

گھوڑا گاڑی تاریک راستے پہ تیز دوڑ رہی تھی۔ فاتح اکڑوں بیٹھا تھا اور بندھے ہوئے ہاتھ گھٹنوں پہ رکھے تھے۔ رول وہ کھا چکا تھا مگر سوچ میں ڈوبا تھا۔ باقی دونوں بھی خاموش تھے۔ ایسے میں وہ بار بار اپنے بندھے ہاتھ جیب تک لے جانے کے لئے اٹھاتا پھر ٹھہر جاتا۔ نہ ہاتھ وہ جیب تک لے جاسکتا تھا نہ جیب میں وہ بوہ تھا جس کے اندر جھانکنے کی تڑپ اس کی عاتقوں میں شامل تھی۔ جانے وہ کہاں گر گیا تھا۔

تالیہ ہنوز سلاخوں سے سر نکائے بیٹھی تھی۔ ایڈم باری باری ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اب ہم نے کیا کرنا ہے؟“ اس نے یکسانیت سے اکتا کے سوال پوچھا تو تالیہ نے چہرہ موڑا۔ اس کی آنکھیں پاٹ سی تھیں۔

”ہم نے شہزادی تاشہ کو ڈھونڈنا ہے۔ اور وہ ہمیں میرے باپا تک لے جائے گی۔“

”مگر چہ تالیہ.... ہم اس وقت قید میں ہیں۔“ اس نے جتا کے یاد کرایا۔

”اب نہیں رہیں گے۔“ کہتے ہوئے وہ سیدھی ہو بیٹھی اور بندھے ہوئے ہاتھ سامنے اٹھائے۔ پھر کلائیوں کو موڑنے لگی۔ ایڈم کی

نظروں میں اچنبھا بھرا۔

”رسیاں پکی بندھی ہیں.... یہ چوڑیاں نہیں ہیں جن سے آپ کلائیاں نکال لیں۔“

تالیہ نے ایک سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی۔ ”میں کے ایل کی سب سے ماہر چور اسی لئے ہوں کیونکہ مجھے اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے نکالنے کا

فن آتا ہے۔“ وہ ایک مخصوص زاویے پہ ہاتھوں کو اکٹھا کر کے موڑے جا رہی تھی۔

فاتح نے ستائش سے ابرو اٹھائی۔ ”میں نے سن رکھا تھا کہ ایسے ٹکس ہوتے ہیں مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ حقیقت میں ممکن ہے۔ پہلی

دفعہ دیکھ رہا ہوں۔ کس سے سیکھا تم نے یہ؟“

اس نے نظریں اٹھا کے فاتح کو دیکھا۔ ”ایک جادوگر سے۔“ اس کے ہاتھ مسلسل رسیوں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رسی کلائی کی

جلد کو چھیل رہی تھی۔ خون بہہ رہا تھا مگر ہاتھ اندر ہی اندر مڑ کے چھوٹا ہو رہا تھا۔ گویا پٹھے خود کو اکٹھا کر لینے کے عادی تھے۔

☆☆=====☆☆

وہ لاہور کی ایک اپر کلاس کالونی تھی جہاں قطار میں چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے تھے۔ تیسرے نمبر کے بنگلے کے اندر کچن میں آؤ تو اونچی

سیاہ پونی والی تالیہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ وہ بیس اکیس برس کی تھی مگر کافی موٹی اور گول منول۔ شلوار قمیص پہنے، دوپٹہ سائیڈ

پہ باندھے وہ مگن سی کھلے تلے آخری برتن کھگال رہی تھی۔ پھر اسے ٹوکری میں رکھا تو لیے سے ہاتھ پونچھے، چولہا بند کیا اور باہر نکل آئی۔

صوفے پر فربہ بی مائل ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی تھیں۔ ٹی وی چل رہا تھا اور وہ فون کان سے لگائے کسی سے محو گفتگو تھیں۔ تالیہ جس پل اندر آئی

انہوں نے اسی وقت فون رکھا۔

”کھانا پک گیا؟“

”جی امی۔ کچن بھی صاف ہو گیا ہے۔“ وہ صاف اردو میں بات کر رہی تھی۔ ”ناشتہ ٹیبل پہ لگا دیا ہے، اور دادا جی کو ان کے کمرے میں

ناشتہ ابھی دے آتی ہوں (شہناز بیگم کے ماتھے پہ ہل پڑے بہر حال خاموش رہیں۔) پھر میں کالج چلی جاؤں گی۔“ پھر ہچکچا کے رکی۔

”امی.... کالج کا ٹرپ جا رہا ہے مری، دو دن کے لئے۔ مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔“

انہوں نے گردن پوری گھما کے اسے دیکھا۔ ”میرے پاس ان فضولیات کے لئے پیسے نہیں ہوتے تالیہ۔ شفقت صاحب کتنی محنت سے

کھاتے ہیں، ہماری دو بیٹیاں ہیں جن کی ہم نے شادی کرنی ہے۔ اگر یونہی جمع پونجی خرچ کر دیں گے تو شادیاں کہاں سے کریں گے؟“

”مگر منابل اور زیمل بھی تو پچھلے ہفتے ٹرپ پہ گئی تھیں، ارسل بھی جاتا ہے۔ اور ان کے ٹرپ تو منگے والے ہوتے ہیں۔“

”کیونکہ ان کا کالج مہنگا والا ہے۔ تم سرکاری کالج میں پڑھتی ہو، اس لئے اپنی چادر دیکھ کے پاؤں پھیلا کر دو۔“ تاک سکوڑ کے سر جھٹکا اور ریموٹ اٹھالیا۔

وہ چند لمحے چھپتی نگاہوں سے ان کو دیکھتی رہی۔ وہ ابھی سو کے اٹھی تھیں اور بال جوڑے میں بندھے تھے۔ ٹی وی پہ ڈرامہ دیکھتے ہوئے بار بار جمائی بھی روکتی تھیں۔ تالیہ سے مکمل بے زار۔

”میں ایک فرینڈ سے ادھار لے کے چلی جاؤں؟“

”میری بلا سے جو بھی کرو۔“ انہوں نے ہاتھ جھلا کے اسے دفاعان ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ سر کو خم دے کر وہاں سے چلی آئی۔

اوپر آ کے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس نے بڑے بیڈروم کا دروازہ کھولا جو شہناز اور شفقت صاحب کا تھا۔ کمرہ خاموش پڑا تھا۔ اس کے فوسٹر فادر آفس جا چکے تھے اور شہناز رات کا پیٹ ٹیلی کا سٹ ڈرامہ دیکھنے سے پہلے ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے والی نہ تھیں۔ وہ دبے قدموں اندر آئی اور اسٹڈی ٹیبل کے سامنے رکی۔ تیسرا دروازہ کھولا۔ اندر ایک خفیہ خانہ تھا۔ تالیہ نے اسے کھولا۔ چابی نکالی۔ پھر ڈریسنگ روم میں آئی اور آخری الماری میں چابی لگائی۔ دروازہ کھل گیا۔

اندر ایک دراز میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ اس نے بینک کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھائی جو پورے ایک لاکھ کی تھی۔ مہارت سے Staple کی ہن اتاری چند نوٹ درمیان سے نکالے اور پھر اسٹڈی ٹیبل کے دراز سے بڑا اسٹینلر نکالا۔ گڈی کو دوبارہ اسٹینلر کیا اور احتیاط سے واپس رکھ دیا۔ کوئی بھی ثبوت چھوڑے بنا وہ اپنے کمرے میں آگئی اور پیسے چھپا دیے۔

(جاؤں گی تو میں ضرور۔ ہونہ)

کچھ دیر بعد وہ نیچے دادا جی کے کمرے میں ان کو ناشتہ کروا رہی تھی۔ وہ خیف اور کمزور سے تھے۔ سر کے سارے بال سفید تھے۔ بستر پہ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اسٹول پہ بیٹھی چائے پرچ میں ڈالتی اور ان کے لبوں کے قریب لے جاتی۔ وہ گھونٹ بھرتے۔

”تالیہ!“ مسکرا کے اسے اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ ”تم میری سگی پوتی نہ ہو کر بھی میری کتنی خدمت کرتی ہو۔“

”رنیلی دادا جی.... یہاں اس گھر میں کوئی اپنی بات مجھے ایڈاپٹ ہونے کا احساس دلائے بغیر کیوں نہیں ختم کر سکتا؟“ وہ ہنس کے بولی اور پھر سے چائے پرچ میں انڈیلنے لگی۔

”تم اس گھر میں خوش نہیں ہونا؟“

”آپ خوش ہیں؟“ انہوں نے گہری سانس لی اور چھت کود کیھنے لگے۔

”میں گدہ نہیں کر سکتا۔ شفقت کا باپ ہوتا تو اس کا حق تھا کہ وہ میری خدمت کرتا۔ لیکن میں اس کا چچا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے گھر رکھا ہوا ہے۔ یہی بہت ہے۔“

”آپ نے تین دکانیں جو اب کے نام کر دی تھیں۔ اب بھی وہ نہ رکھتے آپ کو۔“ اس نے چائے سے بھری پرچ ان کی طرف بڑھائی مگر وہ اب سیر ہو چکے تھے۔

”پیسے سے خوشی نہیں خریدی جاسکتی۔“

”کبھی کسی محل میں رہنے والے کو اداس دیکھا ہے آپ نے؟“ اس نے پرچ اور پیالی پرے رکھ دی۔ پھر گھڑی دیکھی۔ کالج کی بس میں ابھی وقت تھا۔ وہ گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگے۔

”تمہیں محل اچھے لگتے ہیں نا؟“

”بہت زیادہ‘ داداجی۔“ آنکھیں میچ کے اس نے جیسے مزہ لیا۔ ”میرا دل چاہتا ہے ایک دن میں نیند سے جاگوں تو سامنے ایک سڑک ہو... ایک طرف سمندر ہو... اور سیدھ میں سڑک اوپر ایک پہاڑی تک جاتی ہو... اس پہ ایک محل بنا ہو اور وہ میرا ہو... دیکھئے گا داداجی... تالیہ ایک دن میں بہت امیر ہو جائے گی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ بولے تو وہ چونکی۔ عموماً وہ اس کی ان باتوں پہ تبصرہ نہیں کرتے تھے۔ آج کچھ مختلف تھا۔

”کوئی بات ہے داداجی؟“ اس نے ٹھٹک کے ان کا چہرہ دیکھا۔ انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تالیہ... میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں‘ آج ہوں‘ کل نہیں اس لئے...“

”آپ اب کیا فلموں کی طرح مجھے اپنی وصیت بتانے لگے ہیں؟“ وہ پھر سے ہنس دی۔ وہ نہیں ہنسے۔ سنجیدہ رہے۔

”یاد ہے کافی عرصے پہلے میں نے تمہیں ایک علاقے میں ایک پلازہ دکھایا تھا جس میں بارہ دکانیں تھیں؟ جب تم مجھے وہیل چیئر پہ وہاں لے گئی تھیں؟“

”جی‘ مجھے یاد ہے۔ کیوں؟“

”وہ سارا پلازہ میرا ہے۔ ان دکانوں کا مالک میں ہوں۔“

تالیہ مراد کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ چند لمحے شل رہی‘ پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”اباجی کو یہ بات نہیں معلوم‘ داداجی؟“

”میں مرتے وقت وہ اس کو دینا چاہتا تھا‘ ان کا کرایہ میرے اکاؤنٹ میں آتا ہے۔ میرا رشتے کا پوتا جبران ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔“

مگر اب میں وہ پلازہ شفقت کو نہیں دینا چاہتا۔ میں وہ... اس کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا۔ ”تمہیں دینا چاہتا ہوں۔“

تالیہ کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ سانس تک بند ہو گیا۔

”دادا جی....“

”ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ جبران آئے گا تو میں اس سے قانونی کارروائی کا کہوں گا۔ وہ خاموشی سے تمہارے نام ہو جائے گا اور جب تمہاری شادی ہوگی تو تم اس کوچے کے اپنی مرضی کا محل خرید لینا کیونکہ میرا دل کہتا ہے کہ ایک دن ہماری تالیہ کسی محل میں راج کرے گی۔“

وہ یک ٹک ان کو دیکھ کر جا رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے.....

☆☆=====☆☆

گھوڑا گاڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی.... پنجرے میں بیٹھی تالیہ مسلسل کلاسیوں کو گھما رہی تھی۔ ہاتھوں کو اکٹھا کر کے وہ خاص زاویے پر ان کو مروڑ کے رسی کو چوڑی کی طرح اوپر دھکیل رہی تھی۔ خون آلود ہاتھ دھیرے دھیرے باہر نکل رہا تھا۔ فاتح افسوس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے زخمی ہاتھوں کو نہیں.... اس کے چہرے کو.... جہاں کوئی عجیب سا خالی پن تھا.... شاید وہ ماضی کی کسی یاد میں گم تھی.....

☆☆=====☆☆

چھوٹے سے بنگلے میں معمول سے زیادہ خاموشی تھی۔ کچن میں کھڑی تالیہ نے دوپٹہ سر پہ اوڑھ رکھا تھا اور دادا جی کے لئے دلیہ نکال رہی تھی۔ امی صبح ہی سلور کے پیالے لائی تھیں اور حکم ملا تھا کہ چینی کے برتنوں میں دادا جی کو کھانا نہیں دینا، مبادا وہ ٹوٹ نہ جائیں۔ خیر، یہ چاندی کے برتن بھی پیارے تھے۔ قیمتی اور خوبصورت۔

تالیہ نے مسکرا کے دلیہ ان میں نکالا، چمچ، پلیٹ ساتھ لے کر چلی آئی۔ لاؤنج کے پرلے کونے پہ دادا جی کا کمرہ تھا اور خلافتیہ آج امی اور ابا وہیں موجود تھے۔ دادا جی کا بھانجا جبران بھی آیا ہوا تھا۔

وہ اندر داخل ہوئی، سب کو سلام کیا، ایک نظر سارے پہ دوڑائی (امی کا بے چین انداز.... ابا کی خاموشی.... پرسکون اور قدرے خوش بیٹھے دادا جی۔ آج کل امی، ابا اکثر دادا جی کے پاس جا بیٹھتے تھے اور دادا جی کے ان سے گلے دور ہوتے جا رہے تھے۔ جبران بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔)

اس نے خاموشی سے پیالہ دادا جی کی سائیڈ ٹیبل پہ دھرا تو امی فوراً بولیں۔

”تم جاؤ، جبران کھلا دے گا۔“

”جی اچھا۔“ تالیہ نے بس مسکرا کے دادا جی کو دیکھا، وہ بھی جواباً مسکرائے اور سر کو خم دیا۔ وہ واپس پلٹ آئی۔ مگر ذہن میں کچھ کھٹک رہا تھا

۔ (جبران کے چکر زیا وہ نہیں لگ رہے؟ کل بھی وہ لان میں امی کے ساتھ بیٹھا تھا جب میں ٹیوشن سے آئی تھی۔ کوئی تو بات ہے۔)

وہ کچن میں آئی اور چوکی پہ بیٹھ کے ہتھیلی گال تلے رکھے سوچے گئی۔ (کیا تھا جو اسے کھٹک رہا تھا؟)

قریباً پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ابا کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ”تالیہ... تالیہ۔“ وہ ایک دم ڈر گئی۔ پھر بھاگی بھاگی اندر گئی۔ دروازہ کھولا تو... ان سب کے چہرے ویسے نہ تھے جیسے وہ چھوڑ کے گئی تھی۔ ابا غصے سے سرخ تھے تو امی کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھیں... اور دادا جی... ان کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں آنسو۔

”کیا ہوا؟“ وہ ہکلائی۔

”یہ دلیہ تم نے بنایا ہے نا؟“ امی چمک کے بولی تھیں۔ اس نے جلدی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”جی... کیا اچھا نہیں بنا؟“ اس کی نظریں دادا جی کی آنکھوں پہ لگی تھیں۔

”اچھا؟ ارے اس میں زہر ملا ہوا ہے۔“ انہوں نے پیالے سے چاندی کا چمچ نکال کے سامنے لہرایا۔

”زہر؟“ تالیہ کا سر گھوم گیا۔

”وہ تو شکر ہے میں نے صحت کے پیش نظر گھر میں چاندی کے برتن استعمال کروانے شروع کیے۔ اللہ نے ابا جی کی زندگی بچانی تھی سو

ہم نے وقت پہ دیکھ لیا کہ سارا پیالہ اور چمچ سیاہ پڑ رہا ہے۔ ایسا صرف تب ہوتا ہے جب زہر چاندی کے چمچ کو چھو جائے۔“

وہ چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے پتھر بن گئی۔ ایک نظر اس پیالے کو دیکھا جو واقعی سیاہ پڑ رہا تھا۔ آدھا دلیہ زمین پہ گرا ہوا تھا۔ اور پھر مری

مری نظروں سے دادا جی کو دیکھا۔ ”مجھے نہیں پتہ یہ کیسے ہوا۔ میں نے خود دلیہ بنایا ہے، کسی نے کیسے اس میں کچھ ڈال دیا۔“

”کسی نے نہیں، تم نے ڈالا ہے۔“ ابا جی غصے سے چلائے تھے۔

”تالیہ...!“ دادا جی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا۔ ”تالیہ... تم چاہتی تھیں... میں جلدی مر جاؤں؟ اتنی جلدی کیا تھی بیٹے؟“ وہ سارے

حساب کتاب کیے بیٹھے تھے۔ پندرہ منٹ سے عدالت لگی تھی اور ساری تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ دادا جی کو یقین دلایا جا چکا تھا۔ ثبوت اس کے

خلاف جاتے تھے۔

اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ رنگت سفید پڑ گئی۔ بے یقینی سے ان کو دیکھتے نفی میں گردن ہلائی۔

”میں نے نہیں کیا یہ... دادا جی... میں ایسے کیوں کروں گی؟“ گلا رندھ گیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے چوکھٹ پکڑ لی۔ چکر سے آ

رہے تھے۔

امی اس کو جواب میں گالیاں دینے لگی تھیں۔ لے پالک جانے کس بچ خانہ ان کی تھی وہ۔ ابا کہہ رہے تھے کہ انہوں نے پولیس بلالی

ہے۔ ان کی رشتے دار خاتون سب انسپکٹر بس آنے ہی والی ہوگی اور وہ تالیہ سے سارا معاملہ اگلوا لے گی۔

مگر وہ بھاگی نہیں۔ وہ چوکھٹ کو پکڑے کھڑی بے یقینی سی تھی۔ جبران بالکل چپ بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

”دادا جی... میں نے یہ نہیں کیا۔ میرا یقین کریں۔ یہ سب مجھ پہ الزام لگا رہے ہیں۔“ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔

داداجی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے چہرہ پر بے پھیر لیا۔ جبران نے ان کا ہاتھ تھامنا تو انہوں نے جواب میں زیادہ سختی سے جبران کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خون، خون ہوتا ہے۔ وہ اپنوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ اپنے جیت گئے تھے۔ تالیہ کا دل پھر سے کچلا گیا۔

”میں نے یہ نہیں کیا۔“ وہ زور سے چیخی۔ ”یہ سب آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ جبران نے ان کو دکانوں کا بتا دیا ہے۔ داداجی یہ آپ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔“

وہ بھاری بھر کم عورت پیچھے سے آئی تھی۔ تھانیدارنی۔ اور اب وہ اس کو پیچھے کھینچ رہی تھی۔ حوالات کی باتیں کر رہی تھی... مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی وہ اس کی گرفت میں پھڑ پھڑاتی ہوئی چلا رہی تھی۔

”اللہ گواہ ہے میں نے یہ نہیں کیا۔ داداجی میری طرف دیکھیں۔ داداجی میری بات سنیں۔ داداجی میں آپ کی تالیہ ہوں۔ میں آپ کو فجر پہ وضو کروانے آتی ہوں۔ میں آپ کو آدھی آدھی رات کو پانی پلانے آتی ہوں۔ داداجی میں آپ کی واحد فیملی ہوں۔ آپ میری واحد فیملی ہیں۔ میری بات تو سنیں۔“ وہ اب رو رہی تھی مگر وہ عورت اسے پیچھے کھینچ رہی تھی۔ اس نے چوکھٹ پہ ہاتھ سختی سے جمار کھے تھے... ناخن لکڑی پہ گاڑ دیے تھے۔ کھینچنے اور گھسیٹنے کے باعث وہ چوکھٹ سے رگڑتے نشان چھوڑ گئے... کچھ ناخن ٹوٹ گئے... انگلیوں سے خون رسنے لگا مگر وہ چلائے جا رہی تھی....

”داداجی... میری طرف دیکھیں تو سہی... داداجی...“

☆☆=====☆☆

زخمی ہاتھ ایک جھٹکے سے رسیوں کی قید سے آزاد ہوئے تھے۔ اس نے وحشیانہ انداز میں رسی پر بے پھینکی، پھر گردن سے رسی کا طوق نکالا اور تیزی سے پیروں کے گرد سے گانٹھیں کھولنے لگی۔ پیر آزاد کرتے ہی وہ فاتح کی طرف بڑھی۔

”پہلے ایڈم۔“ اس نے فوراً اسے روکا۔ اور وہ رک گئی۔ فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر اثبات میں سر ہلایا اور ایڈم کی طرف آئی۔ ایڈم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ فوراً اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔ البتہ خود دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس وقت تالیہ کی خوش گفتاری سننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

☆☆=====☆☆

وہ چھوٹا اور سادہ سا کمرہ تھا۔ تالیہ کا کمرہ۔ اس بھاری بھر کم عورت نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی اور تالیہ کو کرسی پہ بٹھا کے اس کے ہاتھ دوپٹے سے پیچھے باندھ دیے تھے۔ میز پہ قلم کا غدر رکھا تھا۔ تالیہ کا سر جھکا تھا اور وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ عورت آگے آئی اور اس کا چہرہ زبردستی اوپر اٹھایا۔

”شکر کرو شفقت بھائی نے مجھے گھر پہ بلایا، سب انسپکٹر دردانا نام ہے میرا۔ جانتی ہو تم مجھے اچھی طرح۔ بلکہ پورا علاقہ واقف ہے مجھ سے۔ تھانے لے کر جاتی تو تم ایک گھنٹے کی مار برداشت نہ کر سکتی۔“ جھٹکے سے اس کی تھوڑی چھوڑی۔ اس کا بھیگا چہرہ پر بے لڑھک گیا۔

عورت اب اس کے سر پہ جھکی غرا کے کہنے لگی۔ ”اس کاغذ پہ اعترافِ جرم لکھو کہ کس طرح تم نے دادا جی کو زبردینی کی کوشش کی۔ ورنہ میں تمہارا وہ حال کروں گی کہ تم یا درکھو گی۔“

”مجھے دادا جی کے پاس لے جاؤ۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ روتے بلکتے ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔ تھانیدارنی نے زور کا جھانپڑ اس کے چہرے پر سید کیا۔ وہ کرسی سمیت نیچے جا گری۔ دردانہ جھکی اور گردن سے دیوچ کے اسے اٹھایا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ لکھو۔ بلکہ لکھ تو میں نے دیا ہے اس پہ دستخط کر دو۔“

وہ اسٹامپ پیپر تھا اور وہ تیار تھا۔

تالیہ کے آنسو یکدم رک گئے۔ وہ بالکل ٹھہر گئی۔ چند لمحے کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے ناک سے گیلی سانس اندر کھینچتے سر اٹھایا اور دردانہ کو دیکھا۔ ”اچھا... کہاں کرنے ہیں سائن؟“ وہ بد لے ہوئے انداز میں بولی تو دردانہ نے گہری سانس لی۔ اور پیچھے سے آکر اس کے ہاتھ کھونٹے لگی۔

”اسی کاغذ پہ.... بالکل نیچے.... جہاں تمہارا نام لکھا ہے.... اور ساتھ تاریخ بھی ڈالو۔“ وہ دوپٹے کی گرہیں کھول رہی تھی۔

”اگر میں سائن کر دوں تو تم مجھے دادا جی سے ملنے دو گی؟“

دردانہ اس کے پیچھے کھڑی تھی اس بات پہ تلخی سے مسکرائی مگر بظاہر نرمی سے بولی۔ ”ہاں۔ بالکل۔“

”اچھا۔ میں کر دیتی ہوں سائن۔“ وہ رضامندی سے جلدی سے بولی اور گردن کاغذ پہ جھکالی۔ اب وہ تحریر پڑھ رہی تھی۔ دردانہ نے آخری گرہ کھولی تو اس نے ہاتھ کھینچ لئے اور قلم اٹھالیا۔ پھر کاغذ چہرے کے سامنے لائے تحریر پڑھنے لگی۔ وہ تحریر جس کے مطابق وہ دادا جی کو مارنے کا اعتراف کر رہی تھی۔

دردانہ گہری سانس بھر کے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ تالیہ نے کاغذ میز پہ رکھا اور سائن کرنے جھک گئی، ساتھ ہی منہ میں کچھ بولی۔

دردانہ نے ابرو اٹھایا۔ ”کیا؟“

وہ پھر جھکے جھکے کچھ بڑبڑائی۔ دردانہ نے اکتا کے چہرہ جھکایا۔ ”کیا بک رہی....“

اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ تالیہ کی مٹھی کی پشت زور سے اس کی ناک پہ آگئی تھی۔ دردانہ تورا کے پیچھے کواڑھکی۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل نہیں پائی تھی، مگر یہ اختتام نہ تھا۔ یہ صرف آغاز تھا۔

”مجھے مارا تم نے؟ ہاں؟ تالیہ نہت مراد کو مارا تم نے؟“ وہ بھوکی شیرینی کی طرح اس پہ جھپٹی اور اسے گردن سے پکڑ کے اٹھالیا، پھر تازہ توڑ اس کے چہرے پہ مکے مارنے لگی۔ دردانہ نے چلاتے ہوئے اس کے بال کھینچنے مگر تالیہ بھی کافی صحت مند تھی اور اس کا جنون اور جوش کہیں زیادہ تھا۔ چند لمحوں میں اس نے دردانہ کو پھر سے نیچے گرا دیا اور کرسی اٹھالی۔

”میں تالیہ نہت مراد ہوں.... میں محلوں میں رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔ میں دنیا پہ حکمرانی کرنے کے لئے بنی ہوں۔ مجھے مارا تم

نے؟“ وہ دیوانہ وار کرسی کی ٹانگ اس پہ برسائے جارہی تھی۔ دردانہ زمین پہ گری دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کر رہی تھی اس کے سر سے خون بہنے لگا تھا مگر تالیہ اسے مارے جارہی تھی۔

چند منٹ بعد جب تالیہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تو باہر راہداری میں کھڑے ابا امی اور جبران نے پر امید نظروں سے اس طرف دیکھا.... دروازہ کھلتا گیا اور جو منظر سامنے آیا.... اس سے ان کی مسکراہٹیں مٹیں۔

سامنے کرسی پہ دردانہ بے حال خون آلود چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی اس کے ہاتھ پیچھے کو بندھے تھے اور گردن نقابہت سے ڈھکی تھی۔ امی کا منہ شاک سے کھل گیا۔

”دردانہ!“ اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتیں، دروازے کی اوٹ سے وہ نکل کے سامنے آئی۔

الجھی پونی سے نکلتے بال، ماتھے پہ گھڑا اور خون.... سرخ انگارہ برنی جیسی آنکھیں، اور ہاتھ میں پکڑی چھری۔ (جو وہ الماری میں رکھتی تھی، چوری شدہ پھل رات گئے کاٹ کے کھانے کے لئے!) اس چھری کو لہراتے ہوئے وہ ان سب کو گھورتی آگے آئی۔

”اور کس کو کرانا ہے مجھ سے اعترافِ جرم۔ ہاں؟ اور کون مجھے مارنے آئے گا؟ کس میں ہمت ہے کہ اب وہ تالیہ کو ہاتھ بھی لگائے!“ ابا تو وہیں کھڑے رہے مگر امی دو قدم پیچھے کو ہٹ گئیں۔

”اب بٹوسا منے سے تم لوگ۔ مجھے دادا جی سے ملنا ہے۔“ وہ لال بھبھو کا چہرے کے ساتھ غرا کے بولی تھی۔ ”اور اگر کوئی درمیان میں آیا تو میں اس کی جان لے لوں گی۔“

”اس کو.... اس کو نہ چھیڑو شفقت بھائی۔“ پیچھے سے نڈھال سی بندھی ہوئی دردانہ درد سے چلائی۔ ”یہ واقعی مار دے گی آپ کو۔ یہ پاگل ہو چکی ہے۔“

”تالیہ....“ جبران نے پکارا تو تالیہ نے غصے سے اس کو دیکھا۔

”تم نے کیا ہے یہ سب ان کے ساتھ مل کے۔ میں دادا جی کو تم لوگوں کی اصلیت بھی بتاؤں گی اور ثبوت بھی دکھاؤں گی۔ میں تم لوگوں کو....“

”تالیہ دادا جی کا کچھ دیر پہلے ہارٹ فیل ہو گیا ہے.... دادا جی مر گئے ہیں تالیہ۔“ وہ بنا کسی دکھ کے بے تاثر سا بولا۔

تالیہ کے کندھے ڈھلک گئے۔ چھری والا ہاتھ پہلو میں آگرا۔ چند لمحے وہ ساکن سی کھڑی رہی.... پھر بے اختیار سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ تیز تیز زینے پھلانگے اور دھاڑ سے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

جبران درست کہہ رہا تھا۔

دادا جی جا چکے تھے۔

اسے دیر ہو گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

لب بھینچے، سر جھکائے، اس نے جھٹکے سے رسی کی آخری گانٹھ کھولی تو ایڈم کے ہاتھ کھل گئے۔ وہ جلدی جلدی باقی رسی خود اتارنے لگا۔ سوچا شکر یہ کہ بے مگر چے تالیہ کا جواب خوشگوار نہیں آتا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

وہ واپس مڑی اور اس سے قبل کہ وہ فاتح کی طرف آتی، گھوڑا گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ وہ تینوں بری طرح چونکے۔ فاتح نے گردن موڑ کے پنجرے کی سلاخوں سے دیکھا۔ گاڑی کے سامنے کیا آیا تھا جو وہ رکی تھی، معلوم نہیں پڑتا تھا، مگر اتنا نظر آتا تھا کہ سامنے کوئی لمبی چوڑی سی دیوار تھی۔

”یہ کیسی دیوار ہے؟“ تالیہ اپنی طرف سے جھانکنے کی سعی کر رہی تھی مگر کچھ واضح نہ تھا۔

”یہ شہر کی فصیل ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”ملا کہ شہر کی فصیل۔“

وان فاتح کے الفاظ تھے کہ کیا... تالیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

وہ تاریخی شہر... سلطنت ملاکہ کا دار الحکومت ”ملاکہ“ ان کے سامنے تھا... جہاں سلاطین کے محل تھے.... جہاں شہزادیاں رہتی تھیں.... کیا وہ واقعی ملاکہ میں داخل ہونے والے تھے؟

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

گھوڑا گاڑی رک چکی تھی۔ چند افراد کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ تالیہ نے سننے کی کوشش کی۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ یہ شہر کی فصیل ہی ہے کیونکہ گاڑی بان غالباً کسی پیریدار سپاہی سے کہہ رہا ہے کہ وہ کسی....“ اس نے کان لگا کے غور سے سننا چاہا۔ ”کسی‘ ابو الخیر‘ کا آدمی ہے اور اس کے پاس قیمتی سامان ہے۔ اب فصیل کا سپاہی اس کو اندر جانے کی اجازت دے رہا ہے۔“ وہ سن کے ترجمہ کر رہی تھی۔

بھاری گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور گاڑی پھر سے چل پڑی۔

تالیہ نے جلدی سے رسیاں واپس ہاتھوں اور گردن میں لپیٹ لیں، یوں کہ لگے وہ ہنوز مقید بیٹھی ہے۔ اسے دیکھ کے ایڈم نے بھی تقلید کی

اب وہ تینوں دم سادھے بیٹھے تھے۔

گھوڑا گاڑی اب شہر کے اندر داخل ہو چکی تھی.....

☆☆=====☆☆

چھوٹے بنگلے میں اگر بتیوں کی مہک پھیلی تھی۔ لاؤنج میں سفید چادریں پچھی تھیں جن پہ جابجا کھجور کی گنھلیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ فضا میں بریانی کی خوشبو بھی رچی بسی تھی۔ چادریں البتہ خالی تھیں۔ لوگ مردے کو پڑھ بخش کے جا چکے تھے۔ وہاں صرف وہ بیٹھی تھی۔ سر پہ سفید

دو پڑاؤں سے اکڑوں بیٹھی، گھٹنوں پہ گال نکائے۔ آنسو آنکھ میں بنوڑا نکاتا تھا۔ ماتھے کا گومڑا بنیلا ہو چکا تھا۔
 دفعتاً شفقت صاحب اندر داخل ہوئے۔ چادروں کے ایک طرف جوتے اتارے اور ننگے پاؤں چلتے اس کے قریب آئے اور سامنے بیٹھے۔

”تالیہ۔“ انہوں نے آہستہ سے پکارا۔ نہ سخت لہجہ تھا نہ نرم۔ بس مطمئن۔ وہ گھٹنے پہ گال رکھے بیٹھی دور خلا میں دیکھتی رہی۔
 ”گھر کی بات تھی اس لئے میں نے تھانے کچہری کے معاملات کو سنبھال لیا ہے۔ پولیس تمہیں گرفتار نہیں کرے گی۔ سمجھو معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔“

دادا جی نے اس کے نام دوکانوں کا انتقال ہی نہیں کروایا تھا ابھی اس لیے یقیناً انہوں نے جبران سے مل کے سب کچھ آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اب تالیہ کو سزا دینا بے کار تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پلکوں کے کنارے پہ آنسو آنکھ کا تھا، مگر گرتا نہیں تھا۔
 ”تمہارے لئے ایک میرج بیورو سے بات کی تھی۔ ایک اچھا رشتہ ڈھونڈا ہے ہم نے۔ لڑکا ملائیشیا کا ہے۔ تمہارے ملک کا۔ اگلے ہفتے نکاح ہو گا اور چند دن بعد تم ملائیشیا چلی جاؤ گی۔ ہم تمہیں اچھا زیور اور کپڑے دے کر رخصت کریں گے اور ہمارے سارے فرائض ادا ہو جائیں گے۔ جو تم نے چاہا جی کے ساتھ کیا اس کی معافی تم خدا سے مانگتی رہنا، مگر آئندہ ہمارا تم سے کوئی لینا دینا نہیں ہو گا۔“
 وہ جب اسی طرح بت بنی بیٹھی دوسری طرف دیکھتی رہی تو وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میرے پاس کبھی جیب خرچ جتنے پیسے جمع نہیں ہوئے، لیکن جب بھی کچھ بچا پاتی، تو ایک تنظیم کو خیرات کے طور پہ بھیجتی جو ایشیا کے مختلف ممالک میں کام کر رہی ہے۔“ وہ دیوار کو دیکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی تو وہ وہیں رک گئے۔

”وہ تنظیم ایک مہم چلا رہی ہے جس کے تحت یتیم خانوں میں وولینٹیر پروگرام کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ وولینٹیر پروگرام سمجھتے ہیں آپ کیا ہوتے ہیں؟ جب اسٹوڈنٹس یا سوشل ورکر رضا کارین کے چند دن کے لئے یتیم خانے میں آتے ہیں، بچوں کے ساتھ وقت بتاتے ہیں اپنی رپورٹس، تھیسز، اور پیپرز لکھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور ان کو لگتا ہے وہ بہت نیک کام کر کے گئے ہیں، مگر نہیں۔“ اس کی دوسری آنکھ میں بھی آنسو آنک گیا مگر گرا نہیں۔

وہ وہیں کھڑے اس کو سننے گئے۔

”یہ رضا کار یتیم بچوں کو خالم وارڈن سے زیادہ نقصان پہنچا جاتے ہیں۔ چند دن میں بچے ان کے ساتھ ایک بونڈ بنا لیتے ہیں۔ براجنسی کو دیکھ کے بچوں کو لگتا ہے وہ ان کو ایڈاپٹ کر لے گا مگر جب وہ اپنے بھرے کاغذوں اور رجسٹرز کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں تو بچے کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ ساری عمر کے لئے دوبارہ کسی سے محبت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔“

شفقت صاحب وہیں کھڑے اس کے جھکے سر کو دیکھے گئے۔ جیسے بدقت برداشت کر رہے ہوں۔

وہ دیوار کو دیکھتی رہتی تھی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”اور اگر کبھی وہ زندگی میں آگے جا کر کسی اجنبی کو اپنا مان بھی لے اور اس سے محبت کر بھی بیٹھے تو بھی آخر میں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بغیر خون کے رشتے پھیکے ہی ہوتے ہیں اور خون ہمیشہ جیت جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی سے محبت کرنا، کسی سے اچھ ہونا اس بچے کے لئے ناممکن بن جاتا ہے۔ اسی لئے میں اتنے سال اس تنظیم کو خیرات دیتی رہی تا کہ دوبارہ کوئی رضا کار کوئی اجنبی کسی یتیم بچے کا دل نہ توڑ سکے۔“

وہ اب خاموش ہو گئی تھی۔ چہرہ بنوز گھٹنوں پہ رکھا تھا اور آنسو ٹپک کے ہی نہ دے رہے تھے۔ شفقت صاحب نے سر جھٹکا اور اپنے ننگے پیر دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ (تالیہ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے اسے یتیم خانے سے آزادی دی۔ اس کو چھت دی۔ اس کو پال پوس کے بڑا کیا۔ اب اس کی شادی کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے کسی غریب بچی کے لیے؟ غربت کی وجہ سے ہی والدین نے اسے یتیم خانے میں پھینکا ہوگا۔ اگر اپنے اصل گھر میں پلتی بڑھتی تو فقیروں کی سی زندگی گزارتی۔ مگر بھی انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔“ وہ افسوس کرتے باہر نکل گئے۔

اگر بتی کی مہک کا نور میں گھل کے عجیب سی خوشبو بنا رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو اعصاب کو مزید بھاری کر دیتی ہے۔

☆☆=====☆☆

اندھیر املا کہ شہر پہ پھیلا تھا۔ گھوڑا گاڑی ست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دونوں اطراف میں اندھیرا تھا۔ کہیں ایک منزلہ کمرے سے بنے تھے۔ کہیں ریڑھیاں رکھی تھیں جن کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ کہیں گھوڑے بندھے تھے۔ اکاؤ کا مشعل کسی مکان کے سامنے روشن تھی تو تھی، درندہ برطرف اندھیرا تھا۔ گھوڑا گاڑی اب ایک گلی میں مڑ گئی تھی۔ دونوں اطراف میں چاندنی میں واضح ہوتے مکان بنے تھے۔ بالائی منزلیں سن باؤ کے گھر جیسی تھیں۔ ویسی ہی بالکونیاں.... ویسے ہی دالان۔ وہ سلاخوں سے چہرہ لگائے، محویت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ پھاڑ کے اس خاموش سوئے ہوئے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

عجیب قدیم شہر تھا.... عجیب قدیم مکان تھے.....

بالآخر گھوڑا گاڑی ایک بڑے گیٹ کے سامنے جا رکی۔

آگے گیا ہوگا؟ تالیہ کا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا.....

☆☆=====☆☆

کوالا پور کا خوبصورت شہر اس دوپہر بہت روشن دکھائی دیتا تھا۔ سڑک کنارے ایک اخبار کے اسٹال پہ وہ رکی کھڑی تھی۔ کوالا پور آنے اور سمیع سے چھٹکارا پانے کے چند ماہ کے اندر وہ خوش خوراکی کے باعث مزید بھری بھری سی ہو گئی تھی۔ گال پہلے سے زیادہ پھول گئے تھے۔ ایسے میں وہ اخبار میں چھپے وان فاتح کے انٹرویو کو دیکھ رہی تھی جب دکاندار نے اس کو چناؤ کا کہا۔ اس نے اخبار اور پھولوں کا تاج دونوں پکڑ رکھے تھے۔

”آپ کو اخبار چاہیے یا تاج؟ یا دونوں؟“

اور تالیہ نے چند لمحوں میں ہی چناؤ کر لیا تھا۔ اس نے اخبار چھوڑ دی۔ اور تاج سر پہ رکھ لیا۔ وہ پھولوں سے بنا تھا اور پھول بھاری نہیں ہوتے۔ وہ اپنے فیصلے پہ مطمئن سی فٹ پاتھ پہ آگے چل دی۔

اسے پارلر پہنچنا تھا جہاں اس کی شفٹ کا وقت ہونے والا تھا۔ تاج کے باعث فٹ پاتھ پہ چلتے لوگوں نے کئی بار مڑ کے اسے دیکھا تھا۔ کسی نے ستائشی فقرہ بھی کہا۔ وہ بے نیازی چلتی گئی۔

ایک دم سے ٹپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کے گردن اٹھائی۔ پتہ بھی نہ چلا تھا اور آسمان نے اپنے تھال الٹ دیے تھے۔ موسلا دھار بارش کا ایک شروع ہو گئی تھی۔ اس کے پاس چھتری نہ تھی۔ وہ بھاگ کے دوکانوں کے چھجے تلے آکھڑی ہوئی۔ مگر ان چند قدموں کے فاصلے نے ہی اسے بھگو ڈالا تھا۔

منہ بسورے اس نے سر کا تاج اتار تو دیکھا سفید اور زرد پھول گیلے ہوئے اڑھڑنے لگے تھے۔ ان کو جوڑنا چاہا تو ایک طرف سے تین زرد گلاب ٹوٹ کے قدموں میں آگرے۔ وہ بے اختیار نیچے جھکی اور زمین پر گرے پھولوں کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا.... گیلی زمین پہ گرے زرد گلاب.... ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔

چند منٹ بعد بھگی ہوئی تالیہ ایک دفتر کے اندر کھڑی تھی۔ کرسی پہ بیٹھا شخص اسے سامنے والی کرسی پیش کر رہا تھا مگر وہ عجلت میں کھڑی ہی رہی۔

”اگر اخبار میں ایک اشتہار لگوانا ہو تو کتنے پیسے لگیں گے؟“ وہ بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔ دفتر کے شیشوں پہ بارش تڑا تڑبہ سے جاری تھی۔

☆☆=====☆☆

گھوڑا گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ آگے چار دیواری کے اندر کھلا سا احاطہ تھا۔ وہاں دور دور تک گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ دیواروں پہ چند مشعلیں روشن تھیں جن کے باعث منظر نامہ نیم روشن تھا۔

گاڑی کو روک کے چند افراد نے وہ پنجرہ اٹھایا اور اسے نیچے لا اتارا۔ پھر ایک کونے میں رکھ کے خود آگے بڑھ گئے۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جیسے سب ان کو بھول کے سونے جا چکے ہوں۔ نیم اندھیرا اور سناٹا۔ فاتح نے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ کچی مٹی کے احاطے میں ایک جگہ بھی ہوئی لکڑیاں رکھی تھیں گویا شام میں جلتی رہی ہوں گی۔ ایک کونے میں کنواں بنا تھا۔ سامنے بہت سے گھوڑے قطار میں تھے۔

”یہ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟“ تالیہ کی آواز پہ وہ چونکا۔ وہ ابھی ہوئی سی سوال کر رہی تھی۔ ”کیا یہ ہمیں مار دیں گے؟“

”اگر مارنا ہوتا تو اتنی اچھی غذا نہ دیتے۔“ وہ بولا تو تالیہ نے ایک نظر پنجرے کے دروازے پہ ڈالی۔

”اس کو باہر سے تالہ لگا ہے۔ اگر ہم کھول بھی لیں تو اس عجیب شہر میں ہم کہاں جائیں گے؟ تو انکو؟ میرے باپا جانے کہاں ہوں گے۔ کس سے راستہ پوچھیں گے؟“ اس نے اپنے ہاتھ کی کھلی رسیوں کو مایوسی سے دیکھا۔ ”ہم یہ رسیاں کھول کے بھی قید ہی ہیں۔“

”تالیہ...! ادھر دیکھو... تالیہ۔“ فاتح نے سختی سے پکارا تو تالیہ نے اداسی سے سر اٹھایا۔

”تم پہ پھر سے چار دن پہلے والی قنوطیت طاری ہو رہی ہے۔ ایسے مت کرو۔ مجھے نہیں معلوم تم زندگی میں کن حالات سے گزر چکی ہو، مگر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ماضی کا ہر واقعہ ہمیں مستقبل کے امتحان کی تیاری کروانے کے لئے پیش آتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پھر سے ہمت ہار دو۔ ہم تمہارے باپا کے بہت قریب ہیں۔ اس لئے شاباش.... ہمت کرو اور دروازہ کھولو.... یا میرے ہاتھ کھولو تا کہ میں اس کو توڑنے کی کوشش کروں۔“ تالیہ نے گہری سانس لی اور گردن اٹھالی۔ ساری اداسی اس قدیم فضا میں اڑ کے خاک ہو گئی۔

”آپ کی ریڈنگ گلاسز آپ کی جیب میں ہیں نا؟“ وہ ذرا پرسکون انداز میں سوال کرنے لگی تو فاتح کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

”ہاں کیوں؟“ وہ بندھے ہاتھ بدقت جیب تک لے گیا، عینک نکالی اور اس کی طرف اچھالی۔ تالیہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے فضا میں کچھ کر لیا۔ پھر عینک کھولی اور کڑک کی آواز کے ساتھ اس کا بازو توڑ دیا۔ پھر سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ باہر نکال کے تالے میں عینک کے ٹوٹے بازو کا نوکیلا حصہ ڈالا اور گھمانے لگی۔

”یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا؟“ وہ متحیر ہوا تھا۔ ایڈم البتہ چپ رہا۔ بچے تالیہ کی تعریف کا کوئی موڈ نہیں تھا اس کا۔

سلاخوں سے لگی بازو باہر لے جا کے تالے کے اندر ”چابی“ گھماتی تالیہ فاتح کو دیکھ کے مسکرائی۔

”ایک جادوگر سے!“

عینک کے بینڈل کی بن تالے کے اندر کی بنوں کو دھیرے دھیرے کھول رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

وہ ایک کیفے تھا جہاں کوٹنے والی کرسی پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ گال تلے رکھے وہ دوسرے ہاتھ سے میز بجاتی منتظری نظر آتی تھی۔

نظریں دروازے پہ لگی تھیں۔ میز پہ ایک اخبار بھی پڑا تھا جس میں ایک واضح اشتہار سامنے نظر آ رہا تھا۔

”میرے فادر جن کا نام ذوالکفلی ہے کچھ عرصے سے لاپتہ ہیں۔ میں ان کو اس پیغام کے ذریعے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہر شام مندرجہ ذیل پتے پہ ان کا انتظار کرتی ہوں۔ میرے پاس ان کا دیا زرد گلاب اور کھونا سکے اب بھی موجود ہے اور میں ان کے پلٹ کے آنے کی آج تک منتظر ہوں۔ اگر ان کو میرا احسان یاد ہے تو براہ مہربانی پلٹ آئیں۔ تالیہ!“

ساتھ میں کتاب میں رکھے ایک سو کھنڈر دگلاب اور کھوٹے سکے کی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جو وہ ہمیشہ اپنے سامان میں اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اتنے برس تک تالیہ نے اس پھول کو نہیں کھویا تھا۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ایک ہیٹ والا آدمی اندر داخل ہوا۔ ہیٹ اس نے ماتھے پہ جھکا رکھی تھی۔ صرف ہونٹ نظر آتے تھے۔ یا چھوٹی

چھوٹی سفید سیاہ داڑھی۔

وہ سیدھا اس کی میز تک آیا اور کرسی کھینچی۔ پھر ہیٹ اتار کے رکھا تو چہرہ واضح ہوا۔

ذوالکفل اب بوڑھا ہو گیا تھا۔ سر کے بال آدھے سفید تھے۔ جیب میں زرد پھول بھی نہ تھا مگر آنکھیں وہی تھیں۔ مسکرا کے اس نے تالیہ کود لیکھا۔

”کتنے دن سے اشتہار دے رہی ہو تالیہ؟“

وہ گال ہتھیلی پہ جمائے اسے دیکھتی مسکرائی۔ ”آٹھ دن سے۔ شہر کے تینوں بڑے اخبارات میں۔ وہ اس عجیب و غریب سے اشتہار پہ حیران ہوتے ہیں مگر میں جانتی تھی یہ آپ کی نظروں سے ضرور گزرے گا۔“

وہ صرف مسکرا دیا۔ نظریں اس پہ جمی تھیں۔ ”آئی ایم سوری۔ میں کسی الوداع کے بغیر ہی چلا گیا، لیکن میں نے کبھی تمہیں ایڈاپٹ کرنے کی امید نہیں دلائی تھی۔ مجھے معاف کر دینا اگر ایسا ہوا ہو تو۔“

”مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ کم از کم اب نہیں۔“

”شاید تب بھی نہیں تھا، تبھی تم نے غلط خاکہ بنایا تھا۔ پولیس میں میرے منجر بھی ہوتے ہیں، خبر مل ہی جاتی ہے۔ وہ تمہارا احسان تھا۔ میں شکر گزار ہوں۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ ہاتھ باہم پھنسائے سنجیدگی سے اس کی طرف جھکا۔

”میں چاہتی ہوں آپ مجھے اپنی طرح بنادیں۔ بہرہ و پیہ۔ چور۔“

ذوالکفل کے چہرے پہ شاک ابھرا۔ وہ ایک دم چیخے ہوا۔ ”تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟ تم تو اتنی پیاری لڑکی ہو۔ تمہیں یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔“

وہ اسی طرح ہتھیلی پہ چہرہ جمائے بیٹھی اطمینان سے اسے دیکھ گئی۔

”مجھے فیری ٹیلو میں وہ شہزادیاں نہیں پسند ذوالکفل صاحب جو ایک زہریلا سب کھا کے مر جاتی ہیں.... یا گھڑی کے بارہ بجاتے ہی خوابوں کی تقریب چھوڑ کے بھاگ جاتی ہیں۔ جنہیں کوئی بھی بھیڑ یا دادی کے کپڑے پہن کے بے وقوف بنا سکتا ہے۔ مجھے تو وہ شہزادیاں پسند ہیں، جوز برکی بو کو میلوں دور سے سونگھ سکیں... جو اپنی شیشے کی جوتی محل سے خود کھینچ کے واپس لے آئیں۔ جو اپنے جسم سے سوئیاں نکالنے کے لئے شہزادوں کا انتظار نہ کریں... جو اپنی برشے کو برف بنادینے کی صلاحیت سے خوفزدہ نہ ہوں... جو ونڈر لینڈ میں خود کو جان بوجھ کے گم کر لیں جب کہ ان کو سارے راستے آتے ہوں اور جب وہ کسی beast کے قلعے میں داخل ہوں تو ان کو اچھی طرح معلوم ہو کہ اندر کیا ان کا منتظر ہے۔ سو ذوالکفل صاحب، میں پیاری لڑکی ہوں نہ بننا چاہتی ہوں۔ میں وہ ظالم لڑکی بننا چاہتی ہوں جو ایک دن اپنے محل میں راج کرے گی اپنی مرضی کی شہزادی بن کے۔“

وہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ بس بنا پلک جھپکے اسے دیکھ گیا۔

”تم کہاں رہ رہی ہو؟“ کوئی سحر سائونا تو اس نے سوال کیا۔

”ایک نئی دوست کے ساتھ جوائنر پورٹ پہنچ گئی۔ لیا نہ صابری۔ مگر اس کو نہیں معلوم کہ میں آپ سے رابطے میں ہوں۔ جو میرے اور آپ کے درمیان ہوگا وہ ہمارے درمیان ہی رہے گا۔ وہ میرے ہر کام میں میرا ساتھ دے گی مگر میں یہ چھوٹے موٹے ای میل اس کام نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے بڑے کام کرنے ہیں۔“

”تمہیں ان بڑے کاموں کی قیمت ساری زندگی چکانی پڑے گی۔ تمہاری نیک روح بدی سے داغدار ہو جائے گی۔“

”مجھے پرواہ نہیں ہے۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟“

”ہاں!“ ذوالکفلی نے اس کی آنکھوں پر نظریں جمائے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہیں میں کو الیپور کی بہترین کون آرٹسٹ بنا سکتا ہوں۔ تمہارے اندر نیچرل ٹیلنٹ ہے کہانی بازی کا۔ اور تم ذہین بھی ہو۔ لیکن تمہیں اپنا وزن کم کرنا ہوگا۔“

تالیہ نے گال تلے سے ہاتھ ہٹایا اور حیرت سے اسے دیکھا۔ ”اچھا ٹھیک ہے میں موٹی ہوں مگر وزن کا اس کام سے کیا تعلق۔“

”تم نے کہا تم بہترین بننا چاہتی ہو۔ کسی بھی فیلڈ میں بہترین بننے کے لئے سستی اور مونا پے سے نجات ضروری ہے۔ جتنا انسان فٹ ہوتا ہے اتنا اس میں اسٹیمنا ہوتا ہے اور اتنی وہ محنت کر سکتا ہے۔ اگر تم کچھ سیکھنا چاہتی ہو تو پہلے پچیس کلو وزن کم کرو۔ اور پھر مجھے اس ای میل ایڈریس پہ میل بھیجو۔ اس سے پہلے میں تمہیں کچھ نہیں سکھاسکوں گا۔“ اس نے ایک چٹ سامنے رکھی۔ جس پہ ایک ای میل ایڈریس درج تھا۔ تالیہ نے اچنبھے سے چٹ اٹھائی۔

”میں ساتھ ساتھ وزن کم کر لوں گی، کیا آپ ابھی سے...“

”ہرگز نہیں۔ موٹے لوگ بے کار لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے چڑ ہے موٹے لوگوں سے۔ وہ اس بات سے واقف ہی نہیں ہوتے کہ پتلا اور فٹ ہونا ان کی زندگی کو کیسے روشن کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے وزن کو محنت سے کم کر کے خود کو فٹ کر لیتے ہیں وہ اپنی اپنی فیلڈ میں بہت آگے جاتے ہیں۔ میں مونا پے کی لعنت کے ساتھ کسی کے ہمراہ کام نہیں کر سکتا۔ پچیس کلو۔ ٹھیک!“ تنبیہ کرتے ہوئے سنجیدہ چہرہ بنائے وہ اٹھا اور ہیٹ اٹھا کے سر پہ رکھا۔ وہ چٹ ہاتھ میں لئے گم صم ہی اسے دیکھے گئی۔

”میں تمہیں دنیا کا ہر کام سکھا دوں گا۔ تم منٹوں میں بہروپ اور آوازیں بدل لوگی۔ تنگ سوراخوں سے گزر جایا کروگی۔ تالے تمہارے ہاتھ میں آتے ہی کھل جایا کریں گے۔ تم ہر کام سمجھ لوگی۔ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں ہر کام ”کرنا“ بھی آجائے گا، لیکن تم لوگوں کو کنوینس کر سکوگی کہ تم سب کرنا جانتی ہو۔ اس لیے جب تیار ہو جاؤ تو مجھ سے رابطہ کرنا۔“ ایک آخری نظر اس پہ ڈال کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا اور وہ گم صم ہی اس ہیٹ والے پراسرار آدمی کو جاتے دیکھتی رہی۔

☆☆=====☆☆

عینک کا ہینڈل تالے کے سوراخ میں وہ مختلف زاویوں سے گھما رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھٹک کی آواز کے ساتھ وہ کھل گیا۔ تالیہ مسکرائی

اور تالہ نکال کے زمین پہ گرادیا۔ پھر فاتحانہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

”صدیوں سے قدیم چینی تالے ایک ہی طرز پہ بنتے آرہے ہیں۔ یہ تو کافی آسان تھا۔“ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور باہر اتری۔
- مانگیں سیدھی کرنے پہ دروازہ نکال محسوس ہوئی مگر ساتھ میں خوشگوار احساس بھی ہوا۔ وہ آزاد تھی۔

اسی پل سامنے دیوار سے بندھا کھڑا گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اپنے مالکوں کا وفادار جانور اس کو باہر نکلتے دیکھتے ہوئے زوردار آوازیں نکال رہا تھا۔ وہ جلدی سے مڑی۔

”ایڈم... فاتح صاحب کی رسی کھولو... ہمیں نکلنا ہو گا اس سے پہلے کہ وہ لوگ باہر نکل آئیں۔“ اس کی براساں نظریں عمارت کے بند دروازوں پہ جمی تھیں جہاں سب سونے اندر جا چکے تھے۔ ایڈم نے جلدی جلدی اپنے پیر کھولے پھر فاتح کے ہاتھوں کی طرف آیا۔
”ایڈم جلدی کرو۔“ وہ دبا دبا سا چلائی

دوسرے کھوڑے بھی ایک ساتھ آوازیں نکالنے لگے تھے۔ ایک نے فضا میں اگلے ٹاپ بھی بلند کر دیے۔ عمارت کے اندر سے آوازیں آنے لگیں... جیسے لوگ جاگ گئے تھے۔
”ایڈم! وہ چیخی۔“

”میں کھول رہا ہوں۔“ وہ بدحواسی سے فاتح کے ہاتھوں پہ بندھی رسی کی گانٹھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اندھیرا اور اتنی گانٹھیں... کچھ بجھائی ندے رہا تھا۔ یکدم فاتح نے ہاتھ پیچھے کھینچ لئے۔ ایڈم نے چونک کے سر اٹھایا.....

”تم جاؤ...“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”تم دونوں جاؤ اور مراد کو ڈھونڈو۔“

تالیہ سناٹے میں رہ گئی۔ ”نہیں... ہم آپ کو کیوں چھوڑ دیں؟ نہیں۔“

”بے وقوفی مت کرو وہ لوگ جاگ گئے ہیں وہ پہنچ گئے تو ہم تینوں پھنس جائیں گے۔ جاؤ۔ بھاگو۔“ وہ اب کے برہمی سے اونچا سا بولا۔
- ہاتھ اس نے پرے کر لئے تھے۔ ایڈم شکوہ تھا۔

”سر... ہم کیسے... آپ کا کیا ہو گا؟“

”وان فاتح کو زندگی میں کبھی کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ تم دونوں میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اپنا معاملہ خود سنبھال لوں گا۔
تم جاؤ۔ جاؤ۔“

تالیہ نے بے یقینی اور خوف سے اسے دیکھا... پھر عمارت کو۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں۔ کھڑکیوں کے پٹ کھلے پھر دروازے....
اس نے بے بس نگاہ فاتح پہ ڈالی۔ وہ اس نگاہ کو سمجھ گیا تھا۔

”تم نے کہا تھا اگر سارے ملائیشاء میں میرے ساتھ صرف ایک شخص کھڑا ہو تو وہ تم ہوگی۔ کوئی بھی انسان میری بات ماننے والا نہ رہے تم تب بھی میری بات مانو گی۔ کیا تمہیں وعدے نبھانے آتے ہیں تالیہ؟“

تالیہ کے دل پہ زور دار پتھر آگرا۔ اس نے ایڈم کو دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بھاگواڈم۔“ پھر دوبارہ فاتح کو دیکھا۔ ”تالیہ آپ کو بچانے آئی گی، تالیہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گی، تو انکو۔“

مگر پنجرے میں بیٹھا شخص شانے اچکا کے بولا تھا۔ ”No Offence“ مگر فاتح کو کبھی کسی کی مدد یا ساتھ کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔ اب جاؤ۔“

یہ حکم تھا۔

وہ دونوں پیچھے دیکھے بنا ایک ساتھ بھاگے تھے۔

☆☆=====☆☆

عمارت کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے۔ دو تین آدمی ہڑبڑائے ہوئے سے باہر آئے۔ ایک کی نظر دور گیٹ پہ پڑی جس کا بڑا سا کنڈا تالیہ کھول رہی تھی۔

”روکو... پکڑو!“ وہ حواس باختہ سا چلایا مگر تالیہ کنڈا کھول چکی تھی۔

گیٹ کھل گیا۔ اور وہ دونوں باہر بھاگ گئے۔

پنجرے میں بیٹھے وان فاتح نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہر طرف ان لوگوں کی روکو پکڑو کی پکار مچ گئی تھی۔ کسی نے مشعل اٹھائی، کسی نے گھوڑے پہ چھلانگ لگائی۔ بہت سے لوگ گیٹ کے پار ان کے تعاقب میں دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آنکھیں موندے اکڑوں بیٹھا تھا۔ آریانہ دھیرے سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”کیا آپ کو واقعی کسی کی ضرورت نہیں ہے، ڈیڈ؟“

فاتح نے آنکھیں کھولیں۔ سفید لباس والی آریانہ پلکیں جھپک جھپک کے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مدھم سا مسکرایا۔

”کبھی پڑی تو نہیں۔ لیکن تالیہ کو لگتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

”لیکن نہیں... آپ درست کہہ رہے تھے... میرا نہیں خیال آپ کو کسی کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے لئے کافی ہیں۔“

”میں بھی ایسے ہی سمجھتا ہوں۔“ وہ پوری سچائی سے بولا تھا۔

اسی اثناء میں ایک آدمی پنجرے کی طرف دوڑتا آیا اور مشعل کی روشنی میں کھلی رسیاں دیکھنے لگا۔ وہ دم بخود تھا۔ پنجرے کے دروازے پہ ضرب کا کوئی نشان نہ تھا... وہ جھکا اور زمین پہ گرا تالہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ صحیح سلامت تھا۔ جیسے چابی سے کھولا گیا ہو، نہ کیڑا لگا ہوا۔

”کس نے کیا ہے یہ؟ تالہ کس نے کھولا ہے؟ بتاؤ۔“ وہ مقامی زبان میں تالہ لہرا کے غصے سے فاتح سے بولا تھا۔

”اب آپ کیا کریں گے، ڈیڈ؟“ آریانہ کی قدرے خائف سی سرگوشی سنائی دی.....

”یہ تالہ...“ فاتح اپنی زبان میں تالے کی طرف انگلی کر کے اشاروں میں سمجھانے لگا۔ ”اس آدمی نے کھولا ہے۔ وہ جو....“ اس نے

بالوں کی طرف اشارہ کیا ”لجے بالوں والا ہے چہرے پر زخم کا قوس نما نشان ہے۔ وہ آیا تھا اور اس نے یہ تالہ کھول کے ان کو بھگا دیا۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اشارے کر کر کے بتا رہا تھا۔ آدمی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے چونک کے مڑ کے دیکھا۔ زخم کے نشان والا آدمی گھوڑے پہ سوار ہو رہا تھا۔

”کیا اس نے بھگایا ہے ان کو۔“ اس نے اشارے سے پوچھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”ہاں اس کے پاس چابی تھی... اس نے تالے میں ڈالی اسے کھولا اور ان کو بھگا دیا۔“ فاتح نے ہاتھوں سے ساری علامتیں بنا کے دکھایا۔ آدمی نے دانت کچکا پالنے۔ غصے سے دروازہ بند کیا، تالہ مقفل کیا اور اپنے گھوڑے کی طرف دوڑا۔

”آپ کیا کر رہے ہیں ڈیڈ؟“ وہ اس کے کندھے کو ہلا کے الجھن سے پوچھنے لگی۔

”سیاست!“ وہ آنکھیں چھوٹی کر کے دور جاتے گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

”کس طرف جاتا ہے۔“ وہ دونوں تیز تیز دوڑ رہے تھے جب ایڈم نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ گیٹ کے پار تاریک گلیاں تھیں۔ صرف چاند کی چاندنی پھیلی تھی جس سے بمشکل ہاتھ کو ہاتھ بھائی دیتا تھا۔

”پتہ نہیں۔ بس بھاگو۔“ وہ تیز دوڑ رہی تھی۔ اندھیرگی میں وہ دونوں بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ پیچھے اس عمارت سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ جاگ چکے تھے اور ان کے تعاقب میں تھے۔

گلیوں کے درمیان سے ہوتے وہ کھلے سے احاطے میں آ گئے۔ یہاں دونوں اطراف میں لکڑی کی دکانیں اور چھابڑیوں کی قطاریں لگی تھیں جو رات کے اس پہر چادروں سے ڈھکی تھیں۔ شاید وہ بازار تھا۔ وہ بنا مڑے بھاگتے گئے۔

تعاقب کرنے والوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ تالیہ کے سر پٹ دوڑتے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ مگر وہ دوڑے جا رہی تھی۔

سامنے شہر کی طویل فصیل تھی۔ وسط میں گیٹ لگا تھا مگر وہ گیٹ کی طرف نہیں گئے۔ وہ دیوار کے ساتھ آگے دوڑتے گئے۔ یہاں تک کہ گیٹ کے پہریداروں سے دور نکل آئے۔ ایک دوسرے کو کسی ہدایت کی ضرورت نہیں پڑی۔ بولنے یا پوچھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ ایڈم نے دیوار پہ جست لگائی اور اوپر چڑھنے لگا۔

دور سے مشعلوں کی روشنی قریب آرہی تھی... آوازیں شور... تالیہ دیوار پہ ہاتھ جمائے پیر اوپر جمانے لگی۔ فصیل اتنی اونچی نہ تھی۔ صرف علامتی تھی۔ چند لمحوں میں وہ دونوں وقت کے مسافر دیوار کے پار کود چکے تھے۔

سامنے لمبی سڑک تھی... اور اس کے گرد کھیت تھے۔ وہ دونوں کھیتوں کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

”وان فاتح کہتے ہیں ان کو میری ضرورت نہیں۔“ وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”مگر میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ اس کے الٹ تھا۔“

وہ کھیتوں میں داخل ہو چکے تھے۔ پیچھے فصیل کا گیٹ کھلتا دکھائی دے رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ یقیناً وہ لوگ شکاری کتے ساتھ لائے تھے۔

”وہ مجھے خواب میں کہہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔“

”سیرنسیسلی بچے تالیہ.... کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے؟“ وہ حواس باختہ سا بھاگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور انہوں نے کہا تھا کہ ان کو میری ضرورت ہے.... اور مجھے ان کی.... لیکن آج انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا۔“

کھیتوں کے دائیں طرف جھاڑیاں تھیں اور ان کے پار جنگل۔ ایڈم کے قدم اس طرف اٹھنے لگے۔ وہ بھی اسی سمت میں بھاگ رہی تھی

یہ کوئی اور جنگل تھا۔ اس رین فاریسٹ سے میلوں دور۔ مگرو سیاہی تھا۔ اونچے درخت... جھاڑیاں.... کہیں بلندی کہیں نشیب..... وہ دونوں بھاگتے چلے گئے....

تیز سانس لینے کی آوازیں.... ہانپتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے پیچھے دیکھنا اور اندھا دھند دوڑنا....

کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں تعاقب کر رہی تھیں....

پھر ایک دم وہ رک گئی.... جھک کے گہرے گہرے سانس لینے لگی.... وہ جو چند قدم آگے نکل گیا تھا، واپس مڑا۔

”بچے تالیہ.... رکھیں گی تو ان کا شکار بن جائیں گی.... دوڑیے....“ وہ اس کے کندھے کے پیچھے گھبراہٹ سے کچھ دیکھتا تھا....

”نہیں....“ اس نے پھوٹی سانسوں کے درمیان دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ”ان کے پاس شکاری کتے ہیں۔ تالیہ نہیں بھاگے گی۔“ وہ

کہتے ہوئے دائیں طرف بڑھی.... چند قدم اٹھائے....

”بچے تالیہ.... آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”تالیہ اور ایڈم میں یہی فرق ہے... تم ایڈم شکار بن کے سوچتے ہو.... میں شکار باز بن کے سوچتی ہوں....“ وہ ادھر ادھر جھاڑیوں میں

باتھ مار رہی تھی۔ ”اگر میں شکاری ہوتی تو تالیہ اور ایڈم کو کیسے ڈھونڈتی؟“

”کیسے؟“

”دو چیزیں.... دو چیزیں ہوتی ہیں شکاری کتوں کے پاس جن سے وہ شکار کو پکڑتے ہیں....“ اس نے جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرتے

انگلیوں کی وی بنا کے پیچھے دکھائی۔ ”ان کی رفتار اور سونگھنے کی حس....“ وہ دھونکنی کی طرح چلتے تنفس کے درمیان رک رک کے کہہ رہی تھی

۔ ”رفتار اتنی تیز ہوگی جتنا تیز مالک چل سکتا ہے“ اس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی ہوتی ہے.... شکاری کتوں کو زنجیر کے بغیر کوئی نہیں جنگل

میں لاتا.... اور اس کا مالک اتنا تیز نہیں ہے.... وہ زخم کے نشان والا آدمی.. وہ مونا ہے... اس لیے کتوں کو ہم تک پہنچنے میں وقت لگے

گا.... ہمیں کتے سے زیادہ نہیں اس کے مالک سے زیادہ تیز بھاگنا ہے۔“

بھونکنے کی آوازیں ہر پل قریب ہو رہی ہیں.....

”اور دوسری چیز....؟“ وہ گھبرایا کھڑا تھا۔

”کتے کی حس مشامہ... سونگھنے کی خوشبو....“ کہتے ہوئے اس نے چاند کی روشنی میں چند پتے توڑ کھینچے... ”کالی مرچ کا پودا... اور وہ دیکھو...“ بازولمبا کر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ شہتوت کا درخت.... منگلدو.... انڈین شہتوت.... ان کی خوشبو کتوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے.... وہ اس بو کا تعاقب نہیں کرتے.... ان کو خود پل لو ایڈم.... ہم شکاریوں سے اور کسی طرح سے نہیں بھاگ سکتے....“

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا ہے تالیہ؟“ وہ دم بخود کھڑا تھا۔ تالیہ نے زرد چہرہ اٹھا کے نقاہت سے اسے دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ بے حال ہو گئی تھی، کلاسیوں سے خون ہنوز رس رہا تھا۔

”کیونکہ میں شکار باز ہوں۔“ پھر وہ ایک درخت کی جانب لپکی۔ ”اور اس لئے بھی کیونکہ کے ایل کے جس کون آرٹسٹ نے مجھے چوریاں کرنا سکھایا تھا اس نے مجھے پولیس کے کتوں سے بچنا بھی سکھایا تھا۔“ ایک درخت کے پاس وہ رکی اور دیوانہ وار پتے توڑنے لگی۔ ایڈم فوراً جھاڑیوں کی طرف دوڑا۔

”کالی مرچ یا شہتوت سے زیادہ skunked اچھی رہتی ہے کتوں کو دھوکہ دینے کے لئے۔“ اپنا علم یاد آیا تو جھاڑ دیا۔ ”مگر میرے خواب کے مطابق یہاں مرچیں اور توت ہی ہیں۔“ وہ پتوں کو مسلنے لگی۔ ان کا رس.... ان کی خوشبو.... ناقابل برداشت تھی مگر تالیہ دیوانہ وار ان کو خود پلے ملے گئی۔

ایڈم بھی خود پلے پتے اور ان کے ننھے پھول مسل مسل کے مل رہا تھا۔ اس پاس تیز خوشبو آنے لگی۔ تالیہ کوز دردار چھینک آئی۔ اس نے ناک بند کر لیا اور پھر ایک درخت کی کھوہ میں جا بیٹھی۔

دور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جنگل میں ذرا سی حرکت جو درخت کے قدموں میں کی جاتی اس سے درخت ہلکا سا ہلتا اور وہ حرکت اوپر پتوں تک پہنچتے پہنچتے زوردار جھنجھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مزید بھاگنے کا مطلب تھا اپنی پوزیشن سے تعاقب کاروں کو آگاہی دینا۔ وہ مزید بھاگ نہیں سکتے تھے۔ ایڈم بھی اس کے ساتھ کھوہ میں آ بیٹھا۔ اب وہ دونوں اس پاس کے درختوں سے بھی چھپ چکے تھے۔

چند لمحے خاموشی سے کٹ گئے۔ پرندوں کی چھبھاہٹ دور کتوں کے غرانے کی آواز.... دوڑتے قدم.... یہ جنگل کسی رین فاریسٹ کی طرح ہی تھا۔ گیلا.... کچڑا لود.... گھنے درخت.... اور ہر طرف اندھیرا۔ ایسے میں ایڈم نے ساتھ بیٹھی تالیہ کو دیکھا جو گھٹنوں کو سینے پہ لگائے، مٹی بیٹھی، محتاطی تعاقب کاروں کی چاپ سن رہی تھی۔ آدھی کھلی چوٹی آگے کو ڈالے، مٹی لگا چہرہ، گالوں پہ زخم کے نشان۔ اسے اس سے ہمدردی ہوئی۔

”آپ کو آپ کے خواب یوں مدد بھی دیتے ہیں؟“ ذرا نرمی سے پوچھنا چاہا۔
 ”ہاں... کیوں؟ تم خواب نہیں دیکھتے کیا؟“ وہ پٹاخ سے بولی۔ ایڈم کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ لب بھنج لئے۔

”آپ کو برداشت کرنا چھ سو سال پیچھے آنے سے زیادہ مشکل ہے، چے تالیہ۔“

”پانچ سو ستاون سال۔ کبھی ریاضی کی کتابیں نہیں پڑھیں، کیا؟“

وہ بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ پھر سے لب کھولے ہی تھے کہ تالیہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی۔

”دشش۔“ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ ایڈم کا سانس تھم گیا۔ بدقت جھوک نکلا۔ وہ البتہ بالکل ساکن بیٹھی تھی۔

چہرے پہ پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

”آپ کو ڈر نہیں لگ رہا، چے تالیہ؟“ وہ دبا دبا سا بولا۔ تالیہ نے آنکھیں گھما کے اسے دیکھا۔

”میں لوگوں کے سوتے ہوئے ان کے کمروں میں گھس کے چیزیں بنا آواز کے نکال لاتی ہوں۔ تالیہ کو کسی سے ڈر نہیں لگتا۔“ ذرا رک

۔ ”سوائے سمج سے۔“ آخری فقرہ لبوں میں ادا کیا مگر اس نے سن لیا تھا۔ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”آپ اتنی بہادر ہو کے اس آدمی سے کیوں ڈرتی ہیں؟“

”پتہ نہیں۔“ وہ لمحے بھر کو سوغوار نظر آئی، پھر جلد ہی چہرے کو واپس سنجیدہ کر لیا۔ ”آوازیں دور جا رہی ہیں۔ ہے نا؟“ بھونکنے کی آواز

مدھم مدھم ہو رہی تھی۔

”کتے شاید واپس پلٹ رہے ہیں۔ قوت کے بچوں نے کام کر دکھایا۔“ وہ مسکرایا۔

چند منٹ میں آوازیں پست ہوتی گئیں اور پھر بالکل ہی دم توڑ گئیں۔ جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ واحد شور پرندوں اور مینڈکوں کی

آوازیں کا تھا۔

تالیہ کھوہ سے نکل آئی اور اوپر درختوں کے جھروکوں سے دکھائی دیتے آسمان کو دیکھا۔ یہاں سے وہ واضح نظر نہ آتا تھا۔ بس سیاہی پہ چند

تارے تھے جیسے۔

”تارے!“ وہ چونکی۔ ”ہمیں جنگل سے نکل کے اس تارے کو ڈھونڈنا ہے جو ہمیں الور سو نگائی لے جائے گا۔“

”وہ کیا ہے؟“ ایڈم بھی باہر نکل آیا۔

”میرے گاؤں کا نام۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ ایڈم اس کے پیچھے لپکا۔

”کیا آپ کو وہ تارہ یاد ہے؟“

”مجھے تاروں کا سارا ڈیزائن یاد ہے، میں پہچان لوں گی۔ تالیہ کچھ نہیں بھولتی۔“ کہہ کے وہ رکی۔ ”سوائے اپنی زندگی کے دس گیارہ

سالوں کے۔“ اور ایک دم کھکھلا کے ہنس دی۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

”چے تالیہ‘ آپ بہت ذہین ہیں۔“ وہ بے اختیار بولا تو تالیہ نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”اور آپ جیسے ذہین لوگوں کو کدھر ہونا چاہیے جانتی ہیں؟“

”کدھر؟“ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”جیل میں!“ وہ سنجیدگی سے جتا کے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ غصے سے اس کی پشت کو دیکھا اور پھر پیچھے لپکی۔

”ابھی وہ جیل بنی نہیں جس میں تالیہ مراد کو قید کیا جاسکے۔“

”بن بھی چکی ہے اور پچھلی رات ہم اس میں گزرا بھی آئے ہیں میڈم!“

”اور وہ توڑی کس نے تھی ہاں؟“ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتی اس کے ہمراہ باہر جا رہی تھی۔ درختوں کی حد و ختم ہوئی تو سامنے سڑک نظر آئی۔ وہ جنگل کو کاٹ کے بنائی گئی تھی اور سیدھی ملاکہ شہر کی فصیل تک جاتی تھی۔

سڑک پہ قدم رکھتے ہی تالیہ نے گردن اوپر اٹھائی تو سیاہ آسمان اپنے تاروں کے ساتھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند لمحے اوپر دیکھتی رہی پھر بازو بلند کر کے اشارہ کیا۔

”اگر ہم اس تارے کو اس جانب رکھیں تو....“ اشاروں سے بتانے لگی۔ ”ہم اور سونگائی پہنچ جائیں گے۔ ہمیں اس سمت میں سفر کرنا ہے۔“

”اوکے!“ ایڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سڑک کے درمیان میں کھڑے تھے۔ ایک جانب ملاکہ تھا.... دوسری جانب کار راستہ اور سونگائی کو جاتا تھا۔ تالیہ نے باری باری دونوں طرف میں دیکھا۔

”ہو سکتا ہے میرے باپا ابھی تک اور سونگائی میں ہوں۔“ وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی پھر چونکی۔ ”لیکن وان فاتح ملاکہ میں ہیں۔“

”لیکن ہمیں پہلے اور سونگائی جا کر آپ کے والد کا تہ پتہ معلوم کرنا ہے۔ وہاں لوگ کچھ بتائیں گے تو ہم ان کو ڈھونڈ سکیں گے۔“

”اور وان فاتح کو یہیں چھوڑ دیں؟“

”ہم فاتح صاحب کے لئے واپس آئیں گے مگر ہمیں وہی کرنا ہے جو انہوں نے ہمیں کرنے کا حکم دیا ہے۔“

”اگر باپا قید ہو چکے ہیں تو وہ ملاکہ میں ہی ہوں گے یا کسی دوسرے شہر میں۔ اور سونگائی جانے کا فائدہ نہیں۔“

”لیکن فاتح صاحب نے کہا تھا کہ....“

”تم میں اور مجھ میں جانتے ہو کیا فرق ہے؟“ وہ تیزی سے بولی۔ چبھتی ہوئی نظریں ایڈم پہ جمی تھیں۔

”میں کتابیں پڑھنا جانتا ہوں یہی نا؟“

”تم حکم ماننے کے لئے بنے ہو ایڈ ہونے کے لئے۔ اور تالیہ حکم دینے کے لئے بنی ہے۔ ایڈ کرنے کے لئے۔ اس لئے تم وہی کرو جو

میں کہہ رہی ہوں۔“ انگلی سے سینے پہ دستک دی تو اس کا انداز حتمی تھا اور آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ ”میں وان فاتح کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔ ہمیں پہلے ان کا سوچنا ہے۔“

”مگر آپ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ...؟“

”کہ کیا؟ یہی کہ ان کو قید چھوڑ کے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ جاؤں؟ مجھے زیادہ عزیز وہ وعدہ ہے جو انہوں نے ابھی مجھ سے لیا ہے۔ مجھے وہ وعدہ نبھانا ہے۔“ اور اس نے تفصیل کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”مگر ملا کہ میں وہ لوگ ہماری تلاش میں ہوں گے۔ ہم ان سے کیسے بچیں گے؟“ تالیہ جواب میں مسکرائی۔

”وہ دو بد حال، پھٹے کپڑوں اور میلے چہرے والوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر ہم ایسے نہ رہیں تو وہ ہمیں کیسے ڈھونڈیں گے؟“

ایڈم نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

”بتاتی ہوں۔ پہلے واپس چلو۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے شہر کی دیوار بھلا گئی ہے۔“

وہ سڑک پہ آگے بڑھ گئی۔ اندھیر سڑک، دونوں طرف جنگل اور درمیان میں کھڑا ایڈم... اس نے ایک بے بس نظر الور سوئنگائی تک جاتے راستے پہ ڈالی اور پھر تالیہ کے پیچھے چل دیا۔

☆☆=====☆☆

صبح کی سفید روشنی اس وسیع احاطے میں پھیل رہی تھی۔ پنجرے میں تنہا بیٹھا وان فاتح آنکھوں کی پتلیاں سکڑے دور نظر آتے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں شکاری کتے اور کھوڑے واپس آکھڑے ہوئے تھے۔ نا کام۔ نامراد۔ وہ تالیہ یا ایڈم کو پکڑ کے نہیں لائے تھے۔ اور ان کے سوار آتے ساتھ ہی ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے تھے۔ چہرے پہ زخم والا غصے اور حیرت سے کچھ کہہ رہا تھا اور دوسرا آدمی انگلی اٹھا اٹھا کے اس کو کھری کھری سنارہا تھا۔ فاتح خاموشی سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔ جانتا تھا کہ ان کا وقتی جھگڑا تالیہ اور ایڈم کو کافی مہلت دلا چکا ہوگا۔

ایسے میں ایک اور آدمی پنجرے کے قریب آیا، تالیہ کھولا اور اسے کندھے سے کھینچ کے باہر آنے کو کہا۔

فاتح نے زور سے کندھا جھٹکا اور بندھے ہاتھ سیدھے اٹھائے۔

”مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ میں خود آ رہا ہوں۔“ زبان وہ نہیں سمجھا تھا مگر اشارہ سمجھ گیا تھا۔ رعب تھا یا کیا وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وان فاتح بندھے ہاتھوں پیروں کے ساتھ نیچے اترا اور سر اٹھا کے چمکدار سفید ہوتا آسمان دیکھا۔ گردن سے بندھی رسی پیروں تک جاتی تھی، مگر اس طرح کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتا تھا۔

آدمی اسے اپنے تعاقب میں چلاتا ایک طرف لے آیا۔ عمارت کے دائیں جانب ایک لمبا سا برآمدہ بنا تھا جس میں سلاخوں کے دروازے تھے۔ گویا ایک طویل ساقید خانہ ہو۔ آدمی نے سلاخ دار دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ اندر چلا آیا۔ وہ طویل ہیرک تھا۔ اور اس میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ نحیف، کمزور، کچھ تو اتنا۔ پھٹے

پرانے کپڑوں میں ملبوس.... چہروں پہ تھکن اور زخم لئے.... کوئی بیٹھا تھا، کوئی لیٹا تھا۔ سب نے اس آدمی کو اندر آتے دیکھا جو گدلے لباس اور چہرے پہ لگی مٹی کے باوجود بارعب اور باوقار لگتا تھا۔

اس کا اغوا کار اب اس کی رسیاں کھولنے لگا۔ فاتح نے مزاحمت کیے بغیر ہاتھ سامنے کر دیے۔ رسیاں کھولنے میں کافی دیر لگی۔ پھر وہ بابر نکل گیا تو ان فاتح نے کلاں ہاتھوں سے دبائیں گویا درد سے سکون پانے کی کوشش کی۔

ارد گرد تمام قیدی اسی کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹھے ہوئے، کھڑے ہوئے، لیٹے ہوئے۔ سب کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔

وہ سلاح دار دروازے کے ساتھ جا کھڑا ہوا، یوں کہ پشتِ سلاخوں سے لگائی اور چہرہ ان بد حال، مفلس قیدیوں کی طرف موڑ لیا۔ پھر وہ ہاتھ اٹھا کے ماتھے تک لے گیا۔ (سلام) سر کو خم دیا۔

وہ خالی چہرے اور ویران آنکھوں والے لوگ ٹکڑا کر اس کو تنک رہے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں ڈیڈ؟“ ننھی پری نے کان میں سرگوشی کی۔

”یہی کہ یہ لوگ کون ہیں اور اس حال میں کیوں ہیں؟ کس نے حق دیا ان اغوا کاروں کو کہ وہ جیتے جاگتے آزاد انسانوں کو جانوروں کی طرح اس پنجرے میں قید کر ڈالیں؟“ وہ الجھتا ہوا تھا... سوچ رہا تھا۔ لب ہلائے بنا آریا نہ کو جواب دے رہا تھا۔

”آپ ان کی فکر کیوں کرتے ہیں؟ ڈیڈ؟ آپ کو مراد اور اس کی چابی کا انتظار کرنا ہے جس کے ذریعے آپ جلد از جلد واپس اپنی دنیا میں چلے جائیں جہاں ملک کی سب سے طاقتور کرسی آپ کی منتظر ہے۔“ آریا نہ پریشانی سے بولی تھی۔ (وہ اس کا سب کانٹس مائنڈ تھا جو اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔)

وہ دائیں سے بائیں ان خالی چہروں پہ نظریں دوڑا رہا تھا۔ ہر آنکھ میں کرب اور غم کی عجب داستان رقم تھی۔ اس مایوس لمحے میں فاتح رازِ مل کے اوپر عجیب سا انکشاف ہوا۔

”ہم تینوں کا غلطی سے وہ دروازہ پار کرنا... میں سمجھتا رہا وہ ایک حادثہ ہے.... لیکن نہیں۔“ وہ چونک گیا تھا۔ ”وہ حادثہ نہیں تھا۔ میں یہاں کسی وجہ سے آیا ہوں۔ چھ سو سال پہلے کے ملاکہ میں کچھ ہے جو میرا منتظر ہے۔ کوئی مقصد، کوئی کام۔ کوئی شے جو چھ صدیاں پہلے ادھوری رہ گئی تھی اور اسے پورا کرنے کے لئے وقت نے خود کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ ہم وقت کے قیدی ہیں، مگر کسی وجہ سے۔ اور جب تک وہ پوری نہیں ہوگی....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وقت ہمیں واپس جانے نہیں دے گا۔“ آریا نہ دھک سے رہ گئی۔

”اور وہ وجہ آپ کو کیسے معلوم ہوگی، ڈیڈ؟“

اس نے ان لئے پٹے چہروں سے نظر ہٹا کے ساتھ کھڑی بے چین سی آریا نہ کو دیکھا اور مسکرایا۔

”کیا کوئی ایسی پہیلی ہے جو تمہارا باپ حل نہ کر سکا ہو، بی؟“

مگر آریا نہ نہیں مسکرائی۔ وہ پریشانی سے اس کو دیکھ گئی۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ کاقدیم شہر جا گئے لگا تھا۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی لوگ اٹھ اٹھ کے کام کے لئے گھروں سے باہر نکلنے لگے تھے۔ ایسے میں وقت کے وہ دو مسافر ایک گھر کیے باہر کونے میں چھپے بیٹھے تھے۔

وہ لکڑی کا دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر ٹیرس اور کمروں کے دروازے بنے تھے۔ سیڑھیاں بیرونی تھیں۔ گھر کی چھت دوسرے گھروں کی طرح لکڑی کی مخروطی طرز کی تھی۔ وہاں ساری گلی میں مخروطی چھتوں والے لکڑی کے ایک جیسے گھر ہی بنے تھے۔

دفعۃ ٹیرس کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر جاتا دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے گیا، وہ دونوں دیوار کی اوٹ سے نکلے اور جھک کے چلتے ہوئے تیزی سے کمرے میں جا گئے۔ تالیہ آگے تھی اور ناخوش سا ایڈم پیچھے۔ باہر ابھی تک جامنی اندھیرا پھیلا تھا۔

اندر آتے ہی جو منظر سامنے آیا، اس میں زمین پر فرش بچھونا بچھا تھا جس پر ایک ننھا بچہ سو رہا تھا اور ایک عورت ان کی جانب پشت کیے چادر جھاڑ رہی تھی۔ تالیہ بلی کی چال چلتی اس کے پیچھے آئی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ عورت کو مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اس کے بازو کے زرعے میں چند لمحوں میں بے ہوش ہو گئی۔ تالیہ نے احتیاط سے اسے اس کے بچھونے پر ڈال دیا۔

”جب یہ جاگے گی تو اسے لگے گا یہ کمزوری سے چکر کھا کے گر گئی تھی۔“ وہ مڑی تو دیکھا، ایڈم ناخوشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا اس عورت کو تکلیف دینا ضروری تھا؟“

”تو کیا کہتی؟ محترمہ، ہم آپ کے گھر چوری کرنے آئے ہیں، خاموشی سے سائیڈ پر ہو جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں؟“

”کانٹ بلیو میں ایک چوری کی واردات میں شریک ہو رہا ہوں۔“

”اس سے پہلے تم دھوکہ دہی کی واردات میں بھی شریک ہو چکے ہو جب تم مجھے دھوکہ دے کر فاتح صاحب کو سن باؤ کے گھر لے آئے تھے

.... چابی جوڑ کے۔ اس لئے زیادہ پارسانہ بنو۔“

”اللہ نے زندگی رکھی تو واپس جاتے ہی اپنے ہاتھوں سے آپ کو جیل بھجواؤں گا۔“ وہ جل کے بولا تھا۔ تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ

صندوقوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”یہ کھانا پیتا گھر اندنگ رہا ہے۔ قیمتی چیزیں ہوں گی ان کے پاس۔ خدا کرے اس گھر میں کوئی اور نہ ہو۔ اس لئے جلدی سے اپنے

لئے کپڑے ڈھونڈو۔ خاوند کے آنے سے پہلے ہمیں تیار ہو کے یہاں سے نکلنا ہے۔“ وہ صندوق کھول کے کپڑے الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

کمرے کی دیوار پہ لگی مشعل جل رہی تھی اس لئے سب صاف نظر آ رہا تھا۔

بچہ ہنوز سویا ہوا تھا۔

فجر باسی ہو گئی اور ملا کہ پہ سورج طلوع ہونے لگا تو شہر کی گلیوں نے دیکھا۔ وہ دونوں چپکے سے سیڑھیاں اتر کے گلی میں آگئے تھے اور اب

ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

اور یہ وہ بد حال وقت کے مسافر برگز نہ لگتے تھے۔

تالیہ نے جامنی ریشمی باجو کرنگ پہن رکھا تھا۔ پیروں تک آتا ہنگا نما لباس اور گھٹنوں تک آتی قمیص، کندھے سے دوپٹہ گزار کے دوسرے پہلو پہ باندھ لیا تھا۔ انگلیوں میں دو انگوٹھیاں اور گردن میں موتیوں کی ملا تھی۔ حمام میں رکھے عجیب دودھ سے بنے ملبو بے سے اس نے بال بھی دھو لئے تھے۔ کنگھی بھی کی تھی۔ اور اب سنہری بال کنگھی ہوئے چہرے کے دونوں اطراف میں گر رہے تھے۔ کان میں مصنوعی بڑا سا پھول لگا رکھا تھا۔ اور سر پہ ہیٹ پہن رکھا تھا یہ طے طرز کا ہیٹ تھا نہ کہ انگریزی طرز کا جو وہ ملائیشیا میں پہنتی تھی۔ یہ ایلٹو کی شکل کا تھا اور ڈوری تھوڑی تلے اڑس دی جاتی تھی، یوں کہ آدھا چہرہ چھپ جاتا تھا۔

ایڈم نے بھی ایسا ہی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ نیچے کھلا سا پا جامہ، اوپر لمبی قمیص، اور اس پہ نیلے رنگ کی پتلی جیکٹ جو سامنے سے کھلی تھی۔ گویا کوٹ ہو۔ یہ مقامی لباس تھا اور اس پہ کافی کھلاتھا۔

شہر جا گئے لگا تھا۔ لکڑی کے مکان... ان کے درمیان آتے جاتے لوگ۔ کافی عورتوں کے سروں پہ دوپٹے تھے۔ اور لباس کھلے سے تھے۔ مردوں کے لباس ایڈم کی طرح تھے۔ چند ایک نے گزرتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا بھی۔

غیر آرام دہ ایڈم جو بدقت کھلے جوتوں میں چل رہا تھا۔ اور گردن کڑا کے شان بے نیازی سے چلتی تالیہ۔

”سنو... تم میرے بھائی ہو۔“ راستے میں ہدایت دی۔

اللہ مجھے جہنم میں بھی آپ کا بھائی نہ بنائے۔“

”میں کورا سٹوری بتا رہی ہوں۔“ وہ بنا اثر لئے بولی۔ ”ہم چین سے آئے ہیں۔ مصالحوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس زمانے میں یہی

کاروبار بہت ان تھا۔ لوگ انڈیا سے سمندر کے راستے ملا کہ کی بندرگاہ تک آتے اور مصالحے بیچتے تھے۔“

”تو ہم انڈیا سے کیوں نہیں آئے؟ چین سے کیوں آئے ہیں؟“

”کیونکہ ہم انڈین نہیں لگتے، دوفر۔ ہم چینی لگتے ہیں۔“ وہ اسے گھرکتے ہوئے قدم اٹھا رہی تھی۔

چلتے چلتے وہ دونوں بازار کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ وہاں لکڑی کی دکانیں گلیوں میں بنی تھیں۔ قبوہ خانے بھی تھے جہاں بابر کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ ریڑھیوں پہ سامان رکھ کے بھی لوگ فروخت کر رہے تھے۔ غرض فجر کے ساتھ ہی بازار میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ بس ایک چیز نہ تھی جو آج کی دنیا میں ہوتی تھی۔ شور۔ ٹریفک کا، موسیقی کا، آوازوں کا۔ اوں ہوں۔ برگز نہیں۔ آبادی کم تھی۔ لوگوں کے اپنے بولنے کی آوازیں ہی آرہی تھیں بس۔ وہ دونوں باقارچال چلتے آگے بڑھتے گئے۔

جہاں کئی عورتیں سر سے پیر تک ڈھکی تھیں، وہاں کئی کندھوں سے گھٹنوں تک کا لباس پہنے ہوئے تھیں، یوں کہ کندھے بھی برہنہ تھے۔ اونچے جوڑے بنائے وہ مردوں کے ساتھ بازار میں کام کر رہی تھیں اور انہیں کوئی برا ساں نہیں کر رہا تھا۔

”عجیب ماحول ہے چھ سو سال پہلے کے ملاکہ کا۔“ وہ اچنبھے سے بڑبڑائی۔

”پانچ سو ستاون سال‘ چے تالیہ۔“ وہ جتا کے بولا تھا۔ ”اور ہم بازار میں کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس پیسے تو ہیں ہی نہیں۔“

ایک یہی چیز تھی جو ان صندوقوں سے ملتی تھی۔ ایک سکہ یا دمڑی بھی نہیں۔ غالباً وہ اپنے پیسے کہیں چھپا کے محفوظ رکھتے تھے۔

تالیہ رک گئی۔ ایک دکان کے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھا جو کپڑے کا ایک تھیلا اٹھا رہا تھا۔ پھر اس نے سونے کا ایک سکہ دکاندار کی طرف بڑھایا۔

”سونا۔ ہمیں سونا چاہیے۔“ وہ بڑبڑائی۔ زیرک نگاہیں چاروں اطراف میں دوڑائیں۔ قدیم زمانے کے اس بازار میں لوگ معمول کی خریداری کر رہے تھے۔ نگاہ ایک عورت پہ جار کی جو لہنگے قمیص اور سر پہ دوپٹے میں ملبوس تھی، اور ایک سبزی کی ریڑھی پہ کھڑی، مختلف قسم کے پالک کے پتے اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور کلانی میں موٹے ٹنگن تھے۔

”تم یہیں رکو۔ میں ابھی اس کے ہاتھ سے تھوڑا سا زیوراتار کے لاتا ہوں۔“

”ہیں؟“ ایڈم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”مگر کیسے؟“

تالیہ نے ہیٹ ذرا سر پہ اوپر کیا تو دھلا دھلا یا صاف چہرہ اور اس پہ چھائے مشکوک تاثرات ایڈم کو نظر آئے۔

”کیوں؟ تمہیں کیوں بتاؤں؟ تاکہ کل کو تم وہی تکنیک سیکھ کے چوریاں کرتے پھر دو اور تمہارا گناہ بھی میرے سر آئے؟“

”آپ مجھے اچھی نیت سے بتادیں نا۔ میری حفاظت کی نیت سے۔ تاکہ کل کو اگر میں بھرے بازار میں ہوں تو مجھے معلوم ہو کہ چور اچکے

کیسے میرے ہاتھ سے گھڑی اتار سکتے ہیں اور میں ان کو موقع نہ دوں۔“

تالیہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھ گئی۔ بات میں وزن تھا۔

”ویسے تو یہ کام پریکٹس سے آتا ہے مگر تکنیک یہ ہے کہ....“ وہ خفیہ انداز میں شان بے نیازی سے بولی۔ ”پہلے نارگٹ سے ہاتھ ملاؤ۔

زور سے۔ اور اس کی گھڑی یا انگوٹھی کو زور سے دباؤ۔ جب بھی ہاتھ میں اپنی چیز زور سے دبائی جاتی ہے تو ہماری جلد پہ وہ ایک ”احساس“

چھوڑ جاتی ہے۔ اگلے ہی لمحے گھڑی کو آہستہ سے اتار لو۔ مگر چونکہ زور سے دبا ہوا تھا تو نارگٹ کو لگے گا کہ اس نے ابھی تک ہاتھ میں کچھ پہن

رکھا ہے۔ اسے کافی دیر بعد سمجھ آئے گی کہ اس کا ہاتھ خالی ہے۔ آئی سمجھ؟“

ایڈم نے حیرت اور بے یقینی سے دونوں ابرو اٹھائے۔ ”واؤ... اور گردن سے زیور کیسے اتارا جاتا ہے؟“

”تم کون سا زیور پہنتے ہو گردن میں جو میں تمہیں تمہاری حفاظت کے لئے اس تکنیک کا راز بتاؤں۔ چپ کر کے کھڑے رہو ادھر۔ میں

ابھی آرہی ہوں۔“ تاک سکوڑ کے ہونہ کہتی آگے بڑھ گئی۔

ایڈم بظاہر ریڑھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس پہ بڑے بڑے دوریان (ایک قسم کا پھل) رکھے تھے۔ ان کی مہک اتنی تیز تھی کہ ہر سو پھیلی

تھی۔ وہ ان کو اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگا۔ دوکاندار نے کچھ کہا تو وہ گڑبڑا کے مسکرا دیا اور پھل واپس رکھ دیے۔

کنکھیوں سے تالیہ اس عورت سے ٹکراتی، پھر اس کے ہاتھ تھام کے خود کو سنبھالنے کے لئے اس کا شکریہ ادا کرتی نظر آرہی تھی۔ لمحوں بھر کا کھیل تھا۔ وہ واپس آئی اور رومال میں چھپے کڑے دکھائے۔ انگلیوں میں پہن بھی لی تھی۔

”اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کر دیجیے گا تو انکو۔“ ایڈم محمد نے بے اختیار آسمان کو دیکھا۔ ”میں صرف اپنی جان بچانے کے لئے ان خاتون کا ساتھ دے رہا ہوں جن کے جہنم میں جانے میں مجھے کوئی شک نہیں رہا۔“

وہ کرار سا جواب دیتی مگر ایک دم برطرف شور مچا۔ آوازیں۔ گھوڑوں کی ٹاپ۔ لوگ دونوں طرف میں ہٹنے لگے۔ ہٹو بچو کے نعرے لگے۔ بگل۔۔۔ اعلانات۔۔۔ راستہ صاف ہونے لگا۔

وہ دونوں بھی جلدی سے ایک دکان کے چھپرے تلے آکھڑے ہوئے۔

”کیا ہو رہا ہے؟ راستہ کیوں صاف کیا جا رہا ہے؟“ وہ حیران پریشان سا تالیہ سے پوچھنے لگا کیونکہ اعلان اور نعروں کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

تالیہ یک ٹک اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے کوئی قافلہ سا آرہا تھا۔

”جے تالیہ۔۔۔ بتائیں نا۔۔۔ یہ اعلان کس چیز کا ہے؟“

”شہزادی۔“ وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی۔ ”ملاکہ کی شہزادی کی سواری آرہی ہے۔ ادب سے راستہ چھوڑا جا رہا ہے۔“ اس کی آنکھیں اس طرف لگی تھیں۔ ان میں پیش ہی ابھرنے لگی تھی۔

”ظالم شہزادی آرہی ہے ایڈم۔۔۔ وہ دیکھو۔“

سب کچھ سلوموشن میں ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم نے فوراً اس جانب دیکھا۔ کچھ جوش، کچھ خوشی سے۔

شمال کی سمت سے قافلہ سا آرہا تھا۔ آگے گھڑسوار تھے۔ کوئی بگل بجا رہا تھا۔ کوئی تلواریں تانے ہوئے تھا۔ درمیان میں شاہی طرز کی بگھی تھی۔ سونے چاندی کے تاروں سے اس پہ نقش و نگاہ ہوئے تھے اور سیاہ چمکدار گھوڑے اس میں جتے تھے۔ وہ سست روی سے چل رہی تھی۔ بگھی کی کھڑکی کھلی تھی پر وہ ہنستا اور اندر۔۔۔ تالیہ نے انہی پر پیش نگاہوں سے بگھی کو دیکھتے گردن اونچی کی۔۔۔

گھوڑے قریب آرہے تھے۔ دونوں طرف لوگ شوق اور رعب کے زیر اثر شاہی سواری کو دیکھ رہے تھے۔ نعرے بھی گونج رہے تھے۔۔۔ جو یقیناً شہزادی کے حق میں تھے۔ جواب میں کھڑکی سے انگلیوں سے مزین خوبصورت ہاتھ نکلا۔ اب شہزادی اپنے ہاتھ سے ان نعروں کا جواب دے رہی تھی۔ بگھی کے پیسے قریب آرہے تھے۔ جہاں ایڈم دم بخود کھڑا تھا وہاں تالیہ کا سانس تک رک چکا تھا۔

کھڑکی قریب آئی۔ اندر بیٹھی عورت کا نیم رخ نظر آیا۔ بڑا سا تاج جس سے لڑیاں نکل رہی تھیں۔ سرخ لباس جس کے کندھوں پہ سنہرے تاروں کا کام نظر آتا تھا۔ بندھے بالوں کا جوڑا اور کانوں میں لمبے لمبے ہیروں اور سونے کے آویزے۔ لبوں پہ سرخ لب اسٹیک۔ وہ خوشبوؤں میں بسی شہزادی خوب گوری اور چھوٹی آنکھوں والی تھی۔ کافی خوش شکل تھی۔ بس خوش شکل۔ مسکرا کے اب وہ اس طرف دیکھ

رہی تھی جہاں تالیہ اور ایڈم کھڑے تھے۔

تالیہ بنا پلک جھپکے نگاہیں اس پہ جمائے ہوئے تھی۔

دفعہ شہزادی کی نظریں تالیہ مراد پہ آریں۔ تالیہ نے ہیٹ اوپر اٹھایا۔ سنہری بال اور ان کے بالے میں دمکا چہرہ۔ زخم کے نشان اور آنکھوں کی سردفرت....

شہزادی کی کاجل لگی آنکھوں نے چند لمحے تک اس لڑکی کو دیکھا پھر نگاہیں آگے لے گئی۔ مگر وہ.... وہ انہی سردفروں سے اس کو دیکھے گی۔ کبھی دور چلی گئی۔ سپاہیوں کے گھوڑے آگے بڑھ گئے۔

ایک سحر سا ٹوٹا۔

”اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنا سنا تھا۔“ ایڈم مایوسی سے بولا۔ تالیہ نے تلخی سے سر جھٹکا۔ پھر ساتھ کھڑے بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ وہ بھی دور جاتے قافلے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

”کیا آپ لوگ شہزادی کو پسند کرتے ہیں؟“ آدمی نے چونک کے اسے دیکھا تو وہ مسکرائی۔

”میں اور میرا بھائی پہلی دفعہ چین سے ملا کہ آئے ہیں علاقے سے واقف نہیں ہیں اس لئے پوچھ رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ مختلف تھا اور وہ یزبان ٹھیک سے بول نہیں سکتی تھی۔ مگر آدمی سمجھ گیا۔ سر ہلایا۔

”جب اتنے مسلح سپاہی ساتھ ہوں تو کون شہزادی کو ناپسند کر سکتا ہے۔“ انداز میں طنز تھا۔

”میں نے سنا ہے شہزادی بہت ظالم ہے۔ اور سونگائی سے بہت سے لوگ قید کروائے ہیں اس نے۔“

”ایسا ہی ہوا ہے۔ پورے ہفتے سے گرفتاریاں جاری ہیں۔ سارے قید خانے بھر چکے ہیں۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ یہ قید خانے کہاں ہوں گے؟“ وہ سرسری سا پوچھ رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آدمی نے کندھے اچکا

دیے۔

”محل میں ہی ہوں گے مگر یہ ظلم شہزادی نے اکیلے نہیں ڈھایا۔ بند ہمارا اس میں برابر کا شریک تھا۔ یہ سارے بندے اسی کی ایما پہ پکڑے

گئے ہیں۔“

”ظاہر ہے وہ اس کا باپ ہے، دونوں ایک جتنے ہی قصور وار ہیں۔“ وہ تنفر سے بولی۔

بوڑھا گردن گھما کے نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کس کا باپ؟“

”شہزادی تاشہ کا باپ۔ ملا کہ کا بند ہارا (وزیر)۔“

بوڑھے آدمی کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔ ”بند ہارا شہزادی کا باپ نہیں ہے اور یہ شہزادی ”یان سوفو“ تھی، جو چین کے بادشاہ کی

بیٹی ہے اور مرسل شاہ سلطان کی ہونے والی بیوی۔ بندابار تو سلطان کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ شہزادی سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“
تالیہ ہکا بکارہ گئی۔ سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”تو یہ شہزادی تاشہ نہیں تھی؟“

”شہزادی تاشہ کون ہے؟“ وہ آدمی اتنا ہی حیران تھا۔ ایڈم بے بسی سے ترجمے کا منتظر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”شہزادی تاشہ.... ملا کہ کی شہزادی.... بندابار کی بیٹی.... جس کے قصے دور دور تک مشہور ہیں۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ کچھ غلط تھا۔

”میں نے محل میں کافی عرصہ کام کیا ہے، بیٹی۔ ہمارے ملک میں تاشہ نام کی کوئی شہزادی نہیں ہے۔ میں یہ نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔“

تالیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ تاریخ کی کتابیں کیسے غلط ہو سکتی تھیں؟

”تو پھر.... بندابار کی بیٹی کا کیا نام ہے؟“

”پچھلے بندابار کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں تھی.... دو بیٹے تھے مگر پانچ زور قبل اس کو پھانسی دے دی گئی اور بیٹے جلاوطن کر دیے گئے۔ اس نے

سلطان کے پھوپھی زاد کے ساتھ مل کے سارے پمپور کے لوگوں کو پکڑوایا، مگر وہ سلطان کا پھوپھی زاد.... اس نے محل میں آتے ہی بندابار

کا پتا بھی صاف کر دیا اور خود نیا بندابار بن بیٹھا۔“

”اور اس کی بیٹی؟“ اس کی آواز کانپنی۔

”اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ دس گیارہ سال کی۔ وہ چند دن پہلے کھو گئی تھی۔ مگر راجہ مراد کو لگتا ہے اپنی بیٹی کے کھونے کا کوئی غم نہیں ہے۔“

بوڑھا آدمی افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ”سب جانتے ہیں وہ سلطان سے ناراض ہو کے الور سونگائی میں جا بسا تھا۔ سب جانتے ہیں وہ خود پمپورو

تھا مگر اس نے اپنے ساتھیوں سے غداری کی۔ چال چلی۔ اس نے سارے لوگوں کو پکڑوایا اور سلطان کا پسندیدہ بن بیٹھا۔ پچھلا بندابار

شہزادی ”یان سو فو“ کا بھدر تھا۔ اسی کی طرح ظالم، مگر راجہ مراد ”یان سو فو“ سے زیادہ ظالم ثابت ہونے والا ہے۔ سلطان آنکھیں بند کر

کے اس پر اعتبار کرتا ہے اور جج پوچھو۔ تو اس وقت.... سرزمین ملا کہ سب سے طاقتور شخص.... اصل بادشاہ.... راجہ مراد ہی ہے.... وہ ہمیشہ

سے شاہی خاندان کا حصہ تھا.... چند سال غریب لوگوں کے ساتھ رہ کے بھی وہ نہیں بدلا۔ وہی تکبر، وہی طاقت کی حرص۔“ بوڑھا نفرت اور

غصے سے بول رہا تھا۔ ساتھ کھڑے دو آدمی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

تالیہ مراد سفید چہرے کے ساتھ پیچھے ہٹی۔ ایک قدم.... دو قدم.... آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ سرخ آنسو جن میں خوف تھا۔ وحشت تھی

۔ بے یقینی تھی۔

”راجہ مراد کہاں رہتا ہے؟“

”ابھی تو وہ سبز پہاڑی والے محل میں رہائش پذیر ہے۔ یہاں سے چند کوس دور.... اس طرف....“ ایک آدمی جوش سے بتانے لگا۔ وہ

مردہ چہرے کے ساتھ پلٹی۔ ایڈم نا سمجھی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”چے تالیہ.... یہ کیا کہہ رہا تھا۔“

تالیہ نے اسی سمت قدم اٹھاتے زیور کی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔

”تم یہیں رکو۔ میرا انتظار کرو۔“

”مگر میں کیسے...“

”حکم مانو، ایڈم۔ حکم مانو۔“ وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔ قدم رک نہیں رہے تھے۔ وہ چلتی جا رہی تھی۔ ایڈم وہیں ٹھہر گیا۔ حیران پریشان۔
فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ راستے صاف تھے۔ آبادی کم تھی۔ راستہ بتانے والے بہت تھے۔ وہ ساحل کی سمت میں جا رہی تھی۔ بے جان
قدموں سے۔ تو انا قدموں سے۔ سرد مردہ دل سے۔ گرم کھولتے ہوئے دل سے۔ پتھریلی آنکھوں سے۔ آگ کی لپٹیں لئے آنکھوں سے

سڑک کے ارد گرد اونچے ناریل کے درخت لگے تھے۔ سڑک پہاڑی پہ اوپر تک جاتی تھی۔ ایک طرف ٹھانٹیں مارتا سمندر نظر آ رہا تھا۔
جہاں سپاہی تھے۔ کشتیاں کھڑی تھیں۔ وہ سڑک کے آغاز پہر کی اور گردن اٹھا کے اوپر دیکھا۔

سامنے سبز پہاڑی کی چوٹی پہ ایک خوبصورت محل واقع تھا۔

بھوری لکڑی کا بنا مخروطی چھت کا اونچا محل۔

اس کی چار دیواری کا بیرونی گیٹ بند تھا اور باہر شاہی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔

تالیہ بہت مراد نے ہیٹ کی ڈوری دو انگلیوں سے کھینچی اتنے زور سے... اتنے زور سے... کہ وہ ٹوٹ گئی اور ہیٹ نیچے جا گرا۔ سمندر
سے آتی ہوا سے اس کے سنہری بال پیچھے کواڑنے لگے۔ اور ان کے ہالے میں دمکتا سفید گلابی خوبصورت چہرہ دور سے پہریداروں کو نظر
آنے لگا۔ وہ چوکنے ہو گئے

”وہ ملا کہ کی سب سے خوبصورت شہزادی تھی۔“

وہ چمکدار آنکھیں محل پہ جمائے قدم قدم اوپر سڑک پہ چڑھ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

”متمنی سحر انگیز کہ اس کے سامنے چاند سورج شرم جائیں۔“

شاہی پہریدار رک کے اس کو دیکھنے لگے جو جامنی لباس میں، گردن میں موتی پہنے نیچے سے اوپر چلتی آرہی تھی۔ (چرچ کے احاطے

میں وہ ایک ڈری سہمی لڑکی ہے جس کو مسز ماریہ نے نرمی سے تھاما ہے... اور اسی نرمی سے اس کا بریسلٹ اتار لیا ہے۔)

”وہ جب محل کی بارہ دریوں میں چلتی تھی تو ادب سے لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔“ وہ دھیرے دھیرے اوپر چڑھ رہی تھی۔

سنہری بال ہوا سے پیچھے کواڑ رہے تھے۔

(مسز انگینس نے اسے چور کہتے ہوئے زور سے اس کے منہ پہ تھپڑ مارا ہے... گیارہ سالہ بچی تیرا کے نیچے جا گری ہے۔ اب وہ چلا چلا

کے اپنے پیسوں کا پوچھ رہی ہیں۔)

”جب وہ دربار میں آتی تو وزراء، درباری اور غیر ملکی سفیر بے اختیار کھڑے ہو جاتے تھے۔“

(وہ دبے پاؤں رات کو یتیم خانے کے فریج سے بن نکال کے منہ میں ٹھونس رہی ہے۔ خوف سے بار بار دروازے کو بھی دیکھتی ہے۔)

تالیہ مراد بنا پلک جھپکے پتھر نگاہیں گیٹ پہ جمائے اوپر چڑھ رہی تھی۔ قدم بہ قدم۔

”وہ ہوتی تھی تو سلطان دم سادھے اس کو سنا کرتا تھا۔“

(وہ گھاس پہ بیٹھی اسکیچ بنا رہی ہے.... مسکرا رہی ہے اور زرد گلاب کوٹ میں اٹکائے ذوالکفلی اس کے ساتھ بیٹھا کسی بات پہ ہنس رہا ہے

۔)

”وہ بہت سی زبانیں بول سکتی تھی۔“

(وہ لاہور کے اس بنگلے میں فرش پہ پوچا لگا رہی ہے.... رگڑ رگڑ کے.... اور قریب بیٹھی ماں کی اردو اور پنجابی کی گالیاں سن رہی ہے۔

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔)

”تیر اندازی، تلواری، گھڑ سواری، نیزہ بازی.... وہ سب جانتی تھی۔“

(وہ اونچے اڑتے غباروں پہ ایک کے بعد ایک کر کے تیر چلا رہی ہے.... کمان ہاتھ سے کھینچی جاتی ہے اور ایک زوردار تھپڑ اس کو آکے لگتا

ہے۔)

”وہ لکھ پڑھ بھی سکتی تھی۔“

(وہ تاریک کمرے میں لیمپ جلانے کتابیں کھولے بیٹھی پڑھ رہی ہے.... ہاتھ میں سیب ہے جسے وہ ساتھ ساتھ کھا بھی رہی ہے۔)

”رقص اور دوسرے فنون لطیفہ سے بھی واقف تھی۔“

(وہ ذوالکفلی کے ساتھ جم میں کھڑی ہے۔ اوپر لگے ہینڈل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے وہ اپنے پیر مشقت سے زمین سے اٹھا لیتی

ہے۔ اور وہ گھڑی پہ وقت نوٹ کر رہا ہے۔ پھر اسے مزید بہتر کرنے کے لیے کہتا ہے۔)

”جین اور ملا کہ کا کوئی ایسا کھانا نہ تھا جو وہ پکا نہ سکے۔“

(وہ سوپ پارلر کے کچن کے کاؤنٹر ٹاپ پہ آلتی پالتی کر کے بیٹھی ہے سر پہ جالی دار ٹوپی ہے اور سوپ بناتے بوڑھے شیف سے ہنس کے

کچھ کہہ رہی ہے۔)

”کوئی ایسا ناکانہ تھا جس کو وہ کاڑھ نہ سکے۔“

(وہ حفاظتی عینک لگائے دستانے پہنے احتیاط سے ایک گلدان پہ دھاگے پیٹ رہی ہے۔ ساتھ ہی اصلی قدیم گلدان پڑا ہے جس کی جگہ

اس کو یہ گلدان رکھنا ہے۔)

”وہ حرم کی نگران تھی۔“

(وہ پتھروں اور ٹھنڈوں سے موٹی دردانہ کو فرش پہ گرائے مار رہی ہے۔ دردانہ ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ اس کا خون بہہ رہا ہے۔ مگر وہ اس کو پیٹے چلی جا رہی ہے۔)

”بند ہارا کی سب سے قابل اعتماد شیر۔“

(وہ انیر پورٹ کے ہاتھ روم سے ڈر ڈر کے بیگ لئے نکلتی ہے۔ خوف.... ڈھیر سا خوف۔)

”وہ سیاست کے داؤ بیچ سے بھی واقف تھی۔“

(وان فاتح اس کو اسٹڈی میں بلا کے اسے فائل کی وجہ سے چور کہہ رہا ہے... پھر وہ عصرہ کو زیر لب کوستی تیز تیز سیڑھیاں اتر رہی ہے۔)

”غرض کیا تھا جو راجہ کی بیٹی کو کرنا نہیں آتا تھا؟“

(وہ جنگل میں برنوں کو دور درختوں سے چھپ کے دیکھ رہی ہے۔ پھر تاک کے خنجر مارتی ہے۔ خنجر فضا میں تیرتا ہوا سیدھا ننھے غزال کی گردن میں جا لگتا ہے۔ وہ وہیں تڑپ کے گر جاتا ہے۔ سرخ خون بہہ رہا ہے۔)

”اسی لئے اس کو ناشہ سونا کہا جاتا تھا۔“

تالیہ مراد چلتے چلتے گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔ پہریدار برہمی اور ناگواری سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟“ گرج کے پوچھا۔

تالیہ نے آنکھیں اٹھا کے باری باری ان تینوں کو دیکھا۔

(”ہوٹا یعنی enchantress۔“)

”راجہ مراد کو باہر بلاؤ۔ میں راجہ سے ملنے آئی ہوں۔“ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ اوپر محل کی ایک کھڑکی میں کھڑے آدمی نے چونک کے

اسے دیکھا تھا۔

(ساحرہ...)

تالیہ نے آنکھیں مزید اوپر اٹھائیں۔ دور محل کی کھڑکی میں کھڑا شخص.... جو سونے کے تاروں سے مزین شاہی چھتے میں ملبوس تھا.... اور

جس کے سر پہ قیمتی کپڑا بندھا تھا.... وہ کوئی لکڑہارا.... کوئی مفلوک الحال آدمی نہ تھا۔

وہ انھی گردن والا.... عقاب بنی نگاہوں سے اسے دیکھنے والا.... راجہ مراد ہی تھا۔

اور وہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اچھنبے سے گیٹ پہ کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو گردن اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اور تم ہو کون؟“ پہریدار نے گرج کے پوچھا۔

”میں؟“ اس نے اپنے سینے پہ انگلی رکھی۔ نظریں اوپر پہ جمی تھیں۔

”میں راجہ مراد کی بیٹی ہوں۔“ بلند آواز میں کہا۔

کھڑکی میں کھڑا آدمی سن رہ گیا۔ یک ٹک۔ بے سدھ۔

”راجہ کی ایک ہی بیٹی تھی جو....“ پہریدار نے مداخلت کی کوشش کی۔

”جو پانچ دن پہلے کھو گئی تھی“ میں جانتی ہوں۔ اس کا نام تالیہ تھا۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں راجہ کی بڑی بیٹی ہوں اس کی چینی بیوی کی واحد اولاد جس کو راجہ نے چھین بھیج دیا تھا۔ اور اب راجہ نے ہی مجھے واپس بلایا ہے۔“ اس کا مرنے کہانی گھڑی تھی۔ ”اس لئے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ اور دروازے کھول دو کیونکہ میں.... میں بند ہارا کی بیٹی ہوں۔“ وہ گردن اٹھائے اونچی گرج دار آواز میں کہہ رہی تھی۔ انگلی سے سینے پہ دستک بھی دے رہی تھی۔ منتقم آگ برساتی نظریں اوپر جمی تھیں۔ پہریداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”میں کہہ رہی ہوں دروازہ کھولو.... کیونکہ میں.... میں ملاکہ کی شہزادی ہوں.... جاؤ اور بند ہارا کو خبر کرو۔“

پہریدار نے سر کو قہرے ادب سے خم دیا۔

”اور.... شہزادی.... میں کس نام سے ان کو خبر کروں؟“

(وہ آرٹ گیلری کے آفس میں کھڑی تھی۔ اور عصرہ مسکرا کے سامنے کھڑے فاتح سے اس کا تعارف کر رہی تھی۔ ”یہ تالیہ مراد ہے۔“

فاتح نے سر کو خم دیا اور مسکرا کے رسماً بولا۔ ”کیسی ہوتی؟“ تاشہ؟“)

”میرا نام....“ تالیہ نے انھی گردن اور سر دائیکھوں سے اوپر دیکھتے کہا۔

”تاشہ بہت مراد راجہ ہے۔ بند ہارا سے کہو... اس کی بیٹی شہزادی تاشہ آئی ہے...“

☆☆=====☆☆

حالم کی اگلی قسط آپ نمرہ احمد آفیشل بیج پر پندرہ اکتوبر کو پڑھ سکیں گے ان شاء اللہ

حالم (نمرہ احمد)

باب ہشتم:

”ہم قیدی وقت کے“

اس نے خواب میں دیکھا....

وہ اس چھوٹے کمرے میں مراد کے سامنے کھڑی ہے....

آتش دان میں لکڑیوں کے چمکنے کی آواز سنائی دے رہی ہے....

دروازے پہ سپاہی آواز لگا رہے ہیں کہ وہ محل سے آئے ہیں... مراد حاضر ہو....

”تالیہ... قوم کاراہر قوم کا باپ ہوتا ہے... اس کو قربانی دینی پڑتی ہے.... یہ میری قربانی کا وقت ہے.... وہ مجھے لینے آئے ہیں... مگر تم

سے میں اتنا چاہتا ہوں تالیہ... کہ تم میرا ایک حکم مان لو....“ مراد سنجیدگی سے کہہ رہا ہے۔ تالیہ کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں مگر وہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔

”جی بابا... میں کیا کروں.... مجھے بتاؤ بابا۔“

”یہ قربانی تمہیں الورسو نگائی کے لوگوں کے لئے دینی ہوگی... تالیہ... اور اپنے بابا کی انھی گردن اور وقار کے لئے.... دو گی نا؟!“

آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل رہے ہیں.... وہ ”ہاں“ میں گردن ہلاتی ہے۔

”میں یہ چاہتا ہوں تالیہ... کہ تم....“ وہ اس کے ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہتا ہے۔ ”تم ان تمام باتوں کو اپنے اندر راز

کی طرح دفن کرو جو تم نے مجھ سے، مہمورو کے متعلق سنی تھیں۔“

آنسو تالیہ کی آنکھ میں ٹھہر جاتا ہے۔ ”وہ کیوں، بابا؟“

”کیونکہ مہمورو کا باب آج سے بند ہو رہا ہے۔ سلطان مرسل نے ہمیں واپس شاہی محل بلوایا ہے۔ اب ہم محل میں رہیں گے تالیہ اپنی

اصلی جگہ پہ۔“

تالیہ ایک دم اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچتی ہے۔ ”اور شکار بازوں کا کیا ہوگا؟“

”ان کو شہزادی کے سپاہی گرفتار کر رہے ہیں، مگر ہمیں کوئی نہیں گرفتار کرے گا۔ یہ دستک دینے والے ہمیں محل لے جانے کے لئے آئے

ہیں، گرفتار کرنے نہیں۔“

وہ بے یقینی سے اس کو دیکھتی ہے۔ ”مگر باپا... شہزادی کے سپاہیوں کو کیسے معلوم کہ کون شکار باز ہے، کون نہیں؟ کس نے بتائے پمبورو کے لوگوں کے نام انہیں؟“

”کسی قوم کا راہنما اس کا باپ ہوتا ہے، اس کو مشکل فیصلے لینے پڑتے ہیں۔ چند نام دینے کے عوض سوچو میں محل میں جا کر اپنے ہزاروں لوگوں کی بھلائی کے لئے کتنے کام کر سکتا ہوں۔“

”اور گاؤں کے لوگ؟ وہ تو قید خانوں میں مر جائیں گے۔ تو وہ خزانہ؟ وہ جو آپ نے لانا تھا۔ اس کا کیا؟“ وہ قدم بہ قدم پیچھے ہٹ رہی ہے۔ چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔

”دشش... اس کا ذکر اپنے سینے میں دفن کر دو اور میرے ساتھ محل چلنے کی تیاری کرو۔ خزانہ ہمارا ہے، اور ہمارا ہی رہے گا۔“

دستک اب مسلسل ہو رہی ہے۔ مراد حاضر ہو۔ بار بار پکارا جا رہا ہے۔ مراد اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

”میں ابھی ان کے ساتھ محل جا رہا ہوں، سلطان کی خدمت میں پیش ہونے۔ تم دروازہ بند کر لو اور باہر نہ نکلتا۔ اچھا!“ وہ پیار سے اس کے سر کو تھپکتا ہے مگر وہ ایک دم سر جھٹک دیتی ہے۔ مراد اثر لیے بنا باہر کی طرف بڑھ جاتا ہے....

تالیہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ مراد اسے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سپاہی اس کو تعظیم پیش کرتے ہیں اور گھبی کی طرف لے جاتے ہیں۔ تالیہ آس پاس دیکھتی ہے۔ قریب میں بہت سے مکان قطاروں میں بنے نظر آ رہے ہیں اور سپاہی ان کے دروازے توڑ توڑ کے اندر سے لوگوں کو نکال رہے ہیں... عورتیں ان کے پیر پڑ رہی ہیں، بچے رو رہے ہیں مگر وہ ان کے مردوں کو گھسیٹ کے گھوڑا گاڑیوں میں ڈال رہے ہیں۔

تالیہ کی آنکھیں بے بسی سے گلابی پڑنے لگتی ہیں۔

وہ ایک دم بھاگ کے الماری کے پٹ کھولتی ہے۔ اندر چھپی بوتل نکالتی ہے اور بلند کر کے دیکھتی ہے۔ بوتل کے پینڈے میں چابی کے دونوں ٹکڑے بیٹھے ہیں۔

اسے معلوم ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ یہ مشروب پئے بغیر وہ چابی تک نہیں پہنچ سکتی۔

وہ کارک کھینچ کے بوتل لبوں سے لگاتی ہے، اور مشروب اپنے اندر اندیل لیتی ہے... گھونٹ بہ گھونٹ... مشروب اس کے خون میں شامل ہو جاتا ہے.... یہاں تک کہ چابی کے دونوں ٹکڑے اس کے لبوں سے آٹکراتے ہیں۔ وہ ان کو تھیلی پہ نکال لیتی ہے اور ڈلی کو سوراخ میں ڈالتی ہے۔ ہلکے سے کلک کے ساتھ چابی جڑ جاتی ہے۔ لمحے بھر کو وہ چمکتی ہے اور پھر.... ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

تالیہ زنجیر میں پروٹی چابی کو کھائی میں پہن لیتی ہے....

اور یہیں خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

”چے تالیہ.... یہ کیا کہہ رہا تھا؟“ ایڈم جھنجھلا کے اس کے پیچھے آیا۔

شہزادی کی سواری جاچکی تھی اور اس بوڑھے سے بات کرنے کے بعد تالیہ بے خودی بازار میں چلتی جا رہی تھی۔

”تم یہیں رکو.... میرا انتظار کرو۔“ کہہ کے اس نے زیور کی پوٹلی ایڈم کی طرف بڑھائی۔

”مگر میں کیسے....“

”حکم مانو ایڈم۔ حکم مانو۔“

”مگر مجھے بتائیں تو سہی کہ اس آدمی نے کیا کہا۔“

وہ ٹھہری اور اس کی طرف گھومی۔ اس کی آنکھیں عجیب ہو رہی تھیں۔

”اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شہزادی یاں سوفو تھی۔“

”تو یہ شہزادی تاشہ نہیں تھی؟“

”شہزادی تاشہ کوئی نہیں ہے ایڈم۔ شہزادی تاشہ کوئی نہیں ہے۔“

ایڈم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”مگر میں نے خود کتابوں میں اس کا ذکر پڑھا ہے‘ چے تالیہ۔“

تالیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”وہ میں ہوں۔“

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ لمحے بھر کو دونوں خاموش کھڑے رہے۔

”خیر.... آپ کا قصور نہیں ہے۔ شہزادی کی سواری دیکھ کے میں بھی چند لمحے کے لیے خود کو شاہی منظر نامے کا حصہ سمجھنے لگا تھا مگر اب وہ

جاچکی ہے۔ آپ واپس آجائیں۔“ ساتھ ہی تالیہ کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ ”یہ کتنی انگلیاں ہیں‘ آپ بتا سکتی ہیں؟“

مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ ”ابھی جب میں اس بوڑھے سے بات کر کے ہٹی تو میں نے وہ خواب دوبارہ دیکھا جو جنگل میں دیکھا تھا مگر اس

دفعہ وہ مکمل تھا۔ میرے باپا کو وہ لوگ گرفتار کرنے نہیں آئے تھے۔ عزت سے لے جانے آئے تھے۔ اور ہم تاشہ کی نہیں شہزادی یاں سوفو کی

بات کر رہے تھے۔ میرا باپ شہزادی کے مظالم میں برابر کا شریک ہے۔ میں کسی لکڑہارے کی نہیں‘ بنداہا مرا درجہ کی بیٹی ہوں۔“

ایڈم بالکل شل کھڑا رہ گیا۔ ہکا بکا۔

”اس لئے تم یہیں رکو۔ جس گھر سے ہم نے کپڑے چرائے تھے اس کے عقب میں میرا انتظار کرو۔ میں رات کو تم سے ملنے ادھر آؤں گی

۔ ابھی مجھے اپنے باپا کے پاس جانا ہے۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

”مگر....“

”حکم مانو ایڈم۔ حکم مانو۔“ اس کے قدم رک نہیں رہے تھے۔ چند ساعتیں لگی تھیں اس کو بنداہا کے محل پہنچنے میں۔

”کس نام سے خبر کروں، شہزادی؟“ محل کا پہریدار مودب انداز میں پوچھ رہا تھا اور تالیہ اوپر دیکھ رہی تھی جہاں محل کی ایک کھڑکی میں وہ شخص کھڑا تھا۔

”میرا نام تاشہ بنت مراد ہے۔ شہزادی تاشہ۔“

☆☆=====☆☆

کچھ دیر بعد وہ سپاہیوں کی معیت میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ وسیع سبزہ زار۔ درمیان میں پتھریلی روش۔ اس پاس اونچے برآمدے اور ان کے اوپر مخروطی چھتیں۔ وہ محل قدیم فن تعمیر کا ایک شاہکار تھا۔

برآمدہ عبور کر کے وہ محل کے اندر آئے۔ کھلی کھڑکیوں کے باعث راہدار یوں میں مناسب روشنی تھی مگر بابر کی نسبت قدرے اندھیرا تھا۔ سپاہی اسے ایک چھوٹے کمرے میں لے آیا جہاں طویل میز بچھی تھی اور اس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ اسے وہاں چھوڑ کے پہریدار غائب ہو گیا۔ تالیہ نے کرسی کھینچی مگر بیٹھی تو چونک گئی۔ کرسی کی گدی ایسی نرم... جیسے وہ ہوا پہ بیٹھی ہو۔ اس نے میز کی لکڑی پہ ہاتھ پھیرا... ملائم اور چمک دار۔ اس سے تو خوشبو بھی آتی تھی۔ تالیہ نے تحیر سے نظریں گھمائیں۔ بظاہر وہ ملائیشیا کے اچھے گھروں کے جیسا ایک سنگ روم ہی تھا مگر برشے مختلف تھے۔

پہریداروں نے ایک دم دروازہ کھولا تو وہ چونکی۔ راجہ مراد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کمر پہ بندھا تھا اور دوسرا پہلو میں گرا تھا۔ پیروں تک آتی شاہی پوشاک... گردن میں موتیوں کی مالا... سر پہ کپڑے کی ٹوپی۔ اس سے نکلتے لمبے بال جو کندھوں کو چھوتے تھے۔

اس کی نظریں اوپر اٹھتیں مراد کے چہرے پہ آن رکیں۔

وہ دبلا پتلا چہرہ تھا۔ قدرے سانولا۔ جیسے دھوپ میں رنگ سڑ گیا ہو۔ وہ ادھیڑ عمر مگر چہریرے بدن کا توانا مرد تھا۔ آنکھیں بالکل تالیہ کے جیسی تھیں... سیاہ اور گہری مگر ان میں کچھ تھا جو تالیہ کی روشن آنکھوں میں نہ ہوتا تھا۔ ایک تپش، ایک چھتا ہوا اثر۔ جیسے ان آنکھوں کے ذریعے مراد دوسرے کے اندر تک اتر جاتا ہو۔

انہی آنکھوں سے وہ تالیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”بابا!“ لب پھڑپھڑائے۔ عجیب میکانیکی سا انداز تھا۔ خون کے رشتے کی کشش، جذباتیت، کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ یہ وہ مراد نہیں تھا جس کو وہ خوابوں میں دیکھتی تھی... غریبوں کے لیے لڑنے والا ایک ہیرو... جس کے لوگوں کے لیے وہ خزانہ ڈھونڈنے نکلی تھی۔

یہ تو کوئی اور تھا۔ اس شخص کے ساتھ تو طاقت اور دولت کے جن یوں چپکے تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔

ملعون۔ آسیب زدہ۔

”میں... میں تالیہ ہوں۔“ اس نے پھر پکارا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں چھوٹی کیے اسے گھورے گیا۔

”پانچ روز پہلے میں چابی لے کر چلی گئی تھی اور ایک دوسری دنیا میں کئی سال گزارنے کے بعد میں پانچ روز پہلے ہی واپس بھی آ گئی تھی۔ یہ پانچ دن میں نے سلطنتِ ملاکہ کے جنگلوں میں بھٹکتے گزارے۔ بدقت یہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ آپ بندہ ابراہن چکے ہیں۔ اور....“ وہ سوگواریت سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ ایک دم مراد اس پہ چھپٹا اور اس کی گردن زور سے دبوچی۔ تالیہ کا سانس لمحے بھر کو بند ہو گیا۔ اسے لگا وہ اسے مار دے گا مگر....

مراد نے ایک جھٹکے سے اس کو موڑا، اس کے بال ہٹائے اور گردن کی پشت دیکھی۔ (وقت کی مہر) پھر گہری سانس لی۔ گرفت ڈھیلی کی اور اسے سیدھا کیا۔

”تالیہ!“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تو اس نے رکی سانس بحال کی۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

”کتنے سال؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا تو لب ہلتے ہوئے بھی محسوس نہ ہوتے تھے۔

”سترہ۔“ وہ ابھی تک دہلی ہوئی تھی۔

”کون سا زمانہ تھا؟“

”جیسے سو سال بعد کا۔“

”تب دنیا کیسی تھی؟“ وہ سوال در سوال کر رہا تھا۔ تالیہ نے ایک پس کے لئے اطراف میں دیکھا۔

”اس سے بہت مختلف۔ بہت انگ۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”کیا تمہاری شادی ہوئی؟ بچے ہیں؟“ اس کا انداز میکا کی سا تھا۔ بس اس کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی اپنائیت، محبت.... کچھ بھی نہیں۔

”ہماری دنیا میں اتنی جلدی شادیاں نہیں ہوتیں۔“ وہ غم آنکھوں سے مسکرائی۔

اس قدیم دیوان خانے میں وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے مگر درمیان میں گویا صدیوں کا فاصلہ تھا۔ دو دنیاؤں کی دوری تھی۔

”اچھی بات ہے کہ تمہیں اس دنیا نے زنجیر نہیں کیا۔ تم آزاد ہو۔“

ان الفاظ میں کوئی سرد پن سا تھا جو تالیہ مراد کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سے گزرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”بے شک۔ میں آزاد ہوں۔ مگر مجھے وہ چابی واپس جانے کے لئے....“

”تم نے اپنا نام غلط بتایا؟ کیوں؟“ وہ اس کی نہیں سن رہا تھا۔

”کیونکہ کوئی یقین نہ کرتا کہ میں تالیہ ہی ہوں۔ پانچ دن میں میں اتنی بڑی کیسے ہو گئی۔ اس لئے میں نے خود کو تاشہ کہلوا لیا۔“

”اور تاشہ کون ہے؟ میری تو کوئی دوسری بیٹی نہیں تھی۔“

”تاشہ.... اس دنیا میں میرا نام تھا.... مجھے وہاں سب یہی کہہ کے پکارتے تھے۔“ جو منہ میں آیا بولے گئی۔

”اور کیا تمہیں خزانہ ملا؟“

تالیہ نے نفی میں دائیں بائیں گردن ہلاتی۔ ”نہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ کیونکہ میں نے بھی خزانے کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔“ وہ سپاٹ تھا۔ بالکل سپاٹ۔

”بابا... میں چاہ رہی تھی کہ مجھے وہ چاہی...“

”میں خادمِ اعلیٰ کو حکم دے رہا ہوں۔ تمہارے لئے خواب گاہ اور شاہی لباس تیار کر دے گا۔ تم آرام سے رہو اور خوب کھاؤ پیو۔ تم

بندہ ہارا کی بیٹی ہو۔ تمہیں بندہ ہارا کی بیٹی کے جیسا لگنا چاہیے۔“

اور بس!

راجہ مراد انہی تیز قدموں سے باہر نکل گیا جن سے وہ آیا تھا۔ دروازے پر بے داروں نے کھولے۔ اور اس کے جانے کے بعد بند بھی کر دیے۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

ایسا سکوت اور خاموشی۔ جیسے وہ کسی سونے سے بنی قبر میں ہو۔

ایک دم وہ بھاگ کے کھڑکی کی طرف لپکی اور پردہ ہٹایا۔ نیچے محل کے سبز زار پہ پہریداروں اور ملازموں کی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ حاملہ آنکھوں نے فوراً اسے عقابی انداز میں اس سارے احاطے کا جائزہ لیا۔ محل کے گیٹ کس طرف ہیں؟ پہریدار کتنے ہیں اور کہاں ہیں؟ فرار کے کتنے راستے ہیں؟ ممکنہ ہتھیار؟ سکیورٹی جھول؟

(کیا میں ایک قید سے نکل کے دوسری میں آگئی ہوں؟) ذہن میں کوئی بار بار پوچھ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

بازار کی گلی کے دونوں اطراف دکانوں پہ گاہکوں کا رش لگا تھا۔ ایڈم زیور کی پونلی لباس میں چھپائے، لوگوں کے درمیان آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھتا چوکنا اور محتاط سا۔ لٹو کی شکل والا ہیٹ سر پہ پہن رکھا تھا۔ سوچہ مکمل طور پہ واضح نہ تھا۔

چند موڑ مڑے تو ایک دکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ ایڈم کے قدم اسی جانب اٹھ گئے۔

وہ بڑا سا ہال تھا۔ اندر جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ دور دور تک میزیں بچھی نظر آرہی تھیں جن پہ بیٹھے لوگ بے فکری سے باتوں میں مصروف قبوے پی رہے تھے اور کھانے کھا رہے تھے۔ ایڈم کی انگی سانس بحال ہوئی۔ یہ کوئی سرائے تھی۔ یا شاید قبوہ خانہ۔

اس نے کندھوں کو اکڑایا، اور اندر داخل ہو گیا۔ آگے ایک آدمی چل رہا تھا۔ ایڈم کے حنیے جیسا حلیہ بنائے وہ کندھے پہ ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ ایڈم نے دیکھا کہ اس نے تھیلا ایک میز پہ دھرا اور کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ پھر چٹکی بجائی اور اندر ونی دروازے سے نکلتے لڑکے کو دیکھ کر انگلیوں کی وی دکھائی۔

ایڈم اس کے انداز کی نقالی کرتے ایک دوسری میز تک آیا اور اسی طرح بیرے کو انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی۔ لڑکا اثبات میں سر ہلا کے اندر چلا گیا۔ اندر غالباً قبوہ خانے کا باورچی خانہ تھا۔

اب ایڈم نے احتیاط سے قرب و جوار میں بیٹھے افراد کا جائزہ لیا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت بیٹھے بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا، کوئی سنجیدگی سے کچھ سنتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ زبان وہی انجان سی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بیران دونوں کے لیے انگ انگ کھانا لے آیا۔ پہلے تھیلے والے کے سامنے طشت سجائی۔ پھر ایڈم کے پاس آیا اور ایک سوپ کا پیالہ اور ایک مشروب کا گلاس سامنے رکھا۔ پیالے میں دھاتی چمچ رکھا تھا جس سے ایڈم نے سوپ چکھا۔ مچھلی کا سا ذائقہ آیا مگر برا نہیں تھا۔ وہ چمچ بھر بھر کے پینے لگا۔

سنگھیوں سے اس نے دیکھا کہ تھیلے والا کسی کے آواز دینے پہ پیالہ چھوڑ کے اٹھ گیا ہے۔ دو تین چار افراد کا ایک گروہ بیٹھا تھا جو ہنس کے اونچے نعروں سے اس کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تھیلے والا ہنستے ہوئے جواب دیتا باری باری ان سے ہاتھ ملانے لگا۔ شاید کوئی پرانے دوست تھے۔

ایڈم نے سوپ درمیان میں چھوڑا تیزی سے اٹھا اور اس کی میز کے قریب سے گزرتے گزرتے اس کا تھیلا اٹھالیا، پھر پیچھے دیکھے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اتنے رش میں کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

گلی میں جاتے ہی اس نے ایک طرف سر پٹ دوڑ لگا دی۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، یہاں تک کہ مکانوں والی اسی گلی میں آپہنچا جہاں ایک مکان میں صبح انہوں نے لباس تبدیل کیا تھا۔

ایک درخت تلے رک کے گہرے گہرے سانس لیتے اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔
 ”اے میرے اللہ تعالیٰ!“ ایڈم نے بے چارگی سے اوپر دیکھ کے شکوہ کیا۔ ”اس چوری کا گناہ آپ کو چے تالیہ کے سر ڈالنا ہوگا۔ انہوں نے ہی مجھے ایسے کام کرنے کی ترغیب دی ہے۔“

پھر کانوں کو باری باری چھو کے استغفار پڑھا اور تھیلا کھولا۔ دن کی روشنی اتنی تھی کہ وہ با آسانی اندر جھانک سکتا تھا۔
 اور اندر جھانک کے اسے جھٹکا لگا۔ اس میں چند سکوں کے علاوہ قلم، دوات اور کاغذوں کا ایک بندل رکھا تھا۔ مزید کوئی پیسہ نہ تھے۔ ایڈم نے کاغذ نکال کے دیکھے۔ وہ ذرا سخت مادے کے بنے قدرے زردی مائل سفید تھے۔ پہلے صفحے پہ چند الفاظ لکھے تھے۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔

”بنگاریا ملایو۔“ (ملے گل حظمی۔)

”بنگاریا ملایو!“ اس نے اچنبھے سے دہرایا۔ یہ نام اس نے کہاں سنا تھا؟ بنگاریا (گل حظمی) ملائیشیاء کا قومی پھول تھا مگر یہ نام.... یہ کچھ سنا سنا لگ رہا تھا۔

اور پھر ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ بنگاریا ملایو تاریخ کی ایک کتاب تھی جو اسکول کے نصاب میں پڑھائی جاتی تھی۔ وہ مرسل شاہ کے عہد میں لکھی گئی ایک تاریخی داستان تھی جو شہزادی تاشہ پسونہ کی زندگی پہ مبنی تھی۔ اس میں اس دور کے حالات کا بھی تذکرہ تھا۔ مگر یہ

داستان ایڈم نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ اسکول میں اس نے آپشن میں چھوڑ دی تھی، اور شہزادی تاشہ کا جتنا ذکر اسے معلوم تھا، وہ ساتھ والے کلاس فیروز کی منہ زبانی سن رکھا تھا۔ بگاریا ملايو پڑھنے کی اس نے زحمت ہی نہیں کی تھی البتہ دوسری تاریخی کتب اس نے ڈھیروں کی تعداد میں پڑھ رکھی تھیں۔

”از عبد اللہ بن ابوبکر۔“ ساتھ لکھنے والے نے اپنا نام درج کر رکھا تھا مگر آگے تمام صفحات کورے تھے۔ ابھی اس نے کتاب تحریر کرنا شروع نہیں کی تھی۔

تو سرائے والا آدمی کوئی لکھاری تھا۔ یا مورخ۔ اور اس کو لوگ جانتے پہچانتے تھے۔ تبھی چند لمحوں میں وہ لوگوں میں گھر گیا تھا۔ مگر... ایڈم الجھا۔

بگاریا ملايو کے مصنف کا یہ نام نہ تھا۔ اس کا نام کوئی اور تھا۔ مگر شاید اسے یاد کرنے میں غلطی ہو رہی ہو۔ خیر... اس نے تھیلہ اکنڈھے پہ چڑھ لیا۔ تھیلے کا لمبا سا سٹریپ تھا جس کو کندھے پہ پہنوا تھیلہ پہلو میں آگرتا تھا۔ ایڈم نے سکے جیب میں رکھے، ہیٹ سر پہ درست کی اور اب کے قدرے اعتماد سے ایک طرف کوچل دیا۔

☆☆=====☆☆

صبح اس قدیم احاطے پہ بھی پھیلی تھی۔ برآمدوں میں بنی طویل جیل کی سلاخوں کے ساتھ کچھ قیدی کھڑے تھے، کچھ نیچے بیٹھے تھے۔ وان فاتح بھی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ دو آدمی قیدیوں میں کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ دونوں اس جیل کے پہرے دار بھی تھے۔ ایک کی بغل میں تھیلہ لٹکا تھا جس میں کھانے کا سامان تھا۔ وہ تھیلے میں ہاتھ ڈالتا، ایک گیند جیسی سفید چیز نکالتا اور ایک ایک قیدی کو دیتا آگے بڑھتا جاتا۔ قیدی جھپٹ کے اسے تھامتے اور دانتوں سے کترنے لگتے۔ دوسرا پہریدار کوڑا (ہنر) لہراتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ عجیب خوف اور ہیبت تھی اس کے انداز میں۔ قیدی سر جھکائے اپنے اپنے گوشے تھامتے اور فنافٹ کھانے لگتے۔

فاتح خاموشی سے کوڑے والے کا کوڑا دیکھ رہا تھا۔ یہ کس کے لئے تھا بھلا؟

دفعۃً پہریدار فاتح سے چند قدم کے فاصلے پہ آکا۔ وہاں ایک سنہری بالوں والا قیدی بیٹھا تھا۔ وہ الیہو تھا۔ (پیدائشی بہت گورے سنہری بالوں والے لوگ) چہرے پہ ناراضی اور لالچ تھی۔ پہریدار نے کھانا اس کی طرف بڑھایا، اور ابھی الیہو نے ہاتھ بھی نہ اٹھایا تھا کہ اس نے کھانا گرا دیا۔

وہ الیہو کے قدموں میں مٹی پہ گر گیا۔ جہاں فاتح بے یقین رہ گیا، وہاں سارے میں خاموشی چھا گئی۔ سب مڑ مڑ کے دیکھنے لگے۔ الیہو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”اے کھاؤ!“ پہریدار گرج کے بولا، مگر الیہو بس اسے غصے سے دیکھے گیا۔ پہریدار دوبارہ چلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

کوڑے والا آگے آیا اور کوڑا لہرا کے الیہو کے بازو پہ مارا۔ الیہو نے آنکھیں بند کر لیں۔ لبوں سے کراہ نکلی۔ مگر اس نے ہاتھ نہیں

بڑھایا۔ اب ایک پہریدار اس کو مار رہا تھا، دوسرا چلا چلا کے گرد آلود کھانا کھانے کو کہہ رہا تھا، مگر الہینو خاموشی سے مار کھاتا رہا۔
 قیدیوں کی گردنیں وان فاتح کی طرف گھومنے لگیں۔ نیا آنے والا جری مرد جو سب میں ممتاز لگتا تھا، یقیناً شجاع بھی ہوگا، شاید وہ اس
 مظلوم کو اس ظلم سے بچائے۔ وہ سب کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کر رہا تھا، مگر خاموش بیٹھا رہا۔ بوڑھے کے بازوؤں سے اب خون رسنے لگا تو
 پہریدار اسے چھوڑ کے آگے بڑھ آئے۔ باقی قیدیوں میں کھانا تقسیم کیا۔ ایک سفید گیند فاتح کی طرف بھی بڑھائی جو اس نے تھام لی۔
 ارد گرد بیٹھے لوگ مایوسی سے واپس اپنے اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کو امید تھی کہ وہ پہریداروں کو دو لگا دے گا، ان کا ہاتھ
 روک دے گا، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وان فاتح خاموشی سے اپنا کھانا کھا رہا تھا۔ نظریں اب بھی چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔
 بالکل خاموشی ہے۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ شہر میں سمندر کنارے چھوٹی چھوٹی سبز پہاڑیاں بنی تھیں جن میں سے ایک کی چوٹی پہ بندہ ہارا کا وہ خوبصورت محل واقع تھا۔ محروطی
 چھتوں سے مزین، وہ لکڑی کا بنا محل تھا اور اس کے برے بھرے سبزہ زاروں میں شاہی پہریدار پہرہ دیتے دکھائی دے رہے تھے۔
 ایک اونچی کھڑکی میں تالیہ مراد کھڑی نظر آ رہی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، سنجیدگی سے وہ نیچے جھانک رہی تھی۔ اس کے تو اتنے لمبے بال بھی
 نہ تھے جو کھڑکی سے گرا کے اس کی سیڑھی بن جاتے اور اسے آزاد کر دیتے۔
 دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ مڑی اور پردہ تیزی سے بند کر دیا۔ اب کمرے میں روشنی قدرے کم ہو گئی تھی۔ یہ وہی دیوان خانہ تھا جس
 میں کچھ دیر پہلے وہ راجہ مراد سے ملی تھی۔ دستک پھر سے ہوئی۔
 ”آ جاؤ یار۔“ وہ سستی سے بولی، پھر فوراً آواز کو بارعب بنایا۔
 ”آ جاؤ!“ کندھے سیدھے کیے اور گردن کڑالی۔
 دروازے کھلے۔ اور ایک ملے لڑکی اندر داخل ہوئی۔ چوٹی بنائے، روایتی لباس کو زرد اور سرمئی رنگ میں پہنے، (گویا یونیفارم ہو) وہ
 سامنے آئی اور سر جھکا کے سلام کیا۔ ”سلام، شہزادی!“
 ”ہاں بولو۔“

لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ وہ کوئی کنیز لگتی تھی۔

”آقا نے مجھے آپ کی خدمت پہ مامور کیا ہے۔ میرا نام شریفہ ہے۔ آج سے میں آپ کی خاص خادمہ ہوں۔“

”اچھا!“ اس نے بے نیازی سے سر کو خم دیا۔

”مجھے آپ کے لباس کا ناپ لینا ہے۔ آج آپ مہمان خانے میں رہیں گی، صبح تک ہم آپ کے لیے پوشاک تیار کروادیں گے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ لے لو ناپ۔“ اس نے ابرو اچکا کے بظاہر لا پرواہی سے کہا۔ کنیز پلٹی اور کسی کو اشارہ کیا۔ ایک لمبی قمیض اور ٹوپی والا

تائی زیان (خواجه سر غلام) اور دو کنیریں اندر آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ناپ کے فیٹے، مختلف اوزار اور چند ایک تھال تھے جن پہ طرح طرح کے رنگوں کی ریشم تہہ کی گئی رکھی تھی۔ کسی میں زیورات، کسی میں موتی۔

تالیہ نے ایک نظر دیوار پہ لگے بیضوی آئینے کو دیکھا جس کے کناروں پہ سنہری کام ہوا تھا۔ تالیہ کا عکس اس میں صاف نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پہ بے چینی اور آنکھوں میں ناخوشی تھی۔ عجیب سی اداسی اور پریشانی۔

یہی سب وہ چاہتی تھی۔ نہیں؟

محل۔ شاہزادیوں والی زندگی۔ زیور۔ مگر.... یہ سب پا کر بھی اسے سب سے زیادہ فکر کس کی تھی؟
اس کی جسے وہ پنجرے میں چھوڑ آئی تھی۔

وہ جس کے ہاتھ بندھے تھے۔

وہ جس کی زنجیریں کھول کے وہ اسے آزاد نہیں کر سکی تھی۔

وہ جو اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا کہ مجھے چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔

(وہ یہ کیوں نہیں کہتا تھا کہ میرے ساتھ رہو؟ کب کہے گا وہ یہ؟)

اس نے بازو اٹھا دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی خدمت پہ مامور غلام اور کنیریں جھٹ پٹ اس کا ناپ لینے لگے۔

(میرے ساتھ رہو۔ تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔)

وہ آواز.... وہ پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

بازار میں وہی معمول کی گہما گہمی لگی تھی۔ کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ بول بھی رہے تھے مگر ویسا شور اور آوازیں نہ تھیں جو اپنے زمانے میں ایڈم نے بازاروں میں سنی تھیں۔ ٹی وی کا شور، ٹریفک کی آوازیں۔ ملاکہ کا قدیم شہر ان سب سے پاک تھا۔ وہاں ایک خاموشی سی تھی۔ مقدس، پرسکون خاموشی۔ جس کو گھوڑوں کے ناپوں کی چاپ یا بگھیوں کے پہیوں کی آوازیں بھی گھائل نہ کر سکتی تھیں۔

ایسے میں ایڈم غور سے تمام عمارتوں کو دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لٹو کی شکل کا ہیٹ سر پہ تھا، اور چوری شدہ تھیلا کندھے پہ۔ وہ ایک ایک دورا ہے پہ رکتا، اور پھر اندازے سے ایک طرف بڑھ جاتا۔ رات وہ کس طرف سے بھاگتے ہوئے شہر سے باہر گئے تھے، اس کی اچھی یادداشت کو صد شکر کچھ بھولا نہیں تھا۔

ایک موڑ مڑا تو بے اختیار لبوں سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ سامنے ہی اس وسیع احاطے کا گیٹ تھا جس کے اندر وان فاتح بند تھا۔ ایڈم ٹھہر گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ یہ بازار کا ہی علاقہ تھا، رہائشی علاقہ نہ تھا۔ یہاں گلی میں ایک ہی چائے خانہ بنا نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔

اس چائے خانے میں بیٹھ کے وہ آسانی سے اس احاطے پہ نظر رکھ سکتا تھا۔ وان فاتح کے ”قریب“ پہنچ کے ہی اس کے اندر توانائی بھر گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

وہ احاطہ دراصل ابوالخیر نامی امیر تاجر کی حویلی کے گرد بنا تھا اور برآمدے میں تعمیر شدہ وہ طویل جیل اس کی ذاتی ملکیت تھی جہاں فاتح سمیت بہت سے دوسرے انسان قید تھے۔ رات بھر وہ اندر مقید رہتے اور دن بھر وہ مشقت کرتے۔

صبح سلاخ دار دروازے کھول دیے گئے اور پہریدار قیدیوں کو قطار کی صورت باہر نکال لائے۔ برقیہ کے پیروں اور ہاتھوں میں لمبی زنجیر بندھی تھی۔ اتنی لمبی کہ وہ ہاتھ پیر ہلا کے کام کر سکتا تھا اتنی چھوٹی کہ وہ تیز بھاگ نہ سکتا تھا۔

پہریدار دو قیدیوں کو اپنے ساتھ حویلی کے اندر لے گئے اور جب واپس آئے تو وہ دونوں ان کے ہمراہ نہ تھے۔ جانے ان کے ساتھ کیا ہوا۔ کوئی پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

باہر سڑک پار ایک اونچی عمارت بنائی جا رہی تھی جس کے پاس لکڑی، گارے، مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ قیدیوں کو وہاں تعمیراتی کام کرنا تھا۔ باہر آتے ہی تمام قیدی روز کی روٹین کے مطابق اپنے اپنے کام میں جت گئے۔ فاتح بھی انہی لمبی زنجیروں میں بندھا تھا۔ جینز گھٹنوں سے پھٹ گئی تھی اور سفید شرٹ شدید گدلی ہو چکی تھی۔ شیو بھی پانچ روز کی بڑھی ہوئی تھی۔ دوسرے غلاموں کی پیروی میں وہ بھی خاموشی سے کام کرنے لگا۔ دھوپ تیز تھی اور زنجیروں کے باعث چلنے میں مشکل پیش آتی تھی مگر اس نے گارے کا تھال سر پہ رکھا اور اس طرف لے جانے لگا جہاں دوسرے قیدی جا رہے تھے۔

سورج سوائیز سے پہنچا تو فاتح سڑک پہ چلتے لوگوں سے بے نیاز کھڑا ایک دیوار پہ گار الپٹا دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ بار بار آستین سے پیشانی پہ آیا پسینہ پونچھتا۔ سڑک کنارے وہ لوگ دیوار تعمیر کر رہے تھے۔ ادھر اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑتا، ادھر کوئی پہریدار آ کے کمر پہ چھڑی رسید کرتا۔

قریب میں ایک خوانچہ فروش اپنی ریڑھی دھکیلتا آ رہا تھا۔ جب وہ فاتح کے قریب پہنچا تو کسی گاہک نے اسے روک لیا۔ وان فاتح اپنے ساتھ کھڑی ریڑھی سے بے نیاز دیوار پہ ہاتھوں سے گار الگار ہاتھا۔

”سر!“ سرگوشی پہ اس کے ہاتھ ٹھٹھک کے رکے۔ چونک کے مڑنے لگا مگر.....

”گارڈز دیکھ رہے ہیں سر۔ میری طرف مت گھومیں۔ اپنا کام کریں۔“ فاتح نہیں گھوما، بس آہستہ سے از سر نو گار اٹلنے لگا۔ پھر اسی آہستگی سے رخ ذرا سا موڑ لیا۔

اب اسے کٹکیوں سے نظر آ رہا تھا کہ ریڑھی کے ساتھ سر جھکائے ہیٹ پہنے وہ معزز سا دکھائی دیتا آدمی ایڈم ہی تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ لب ہلائے بغیر بولا۔ دل کو سکون ساملا تھا۔

”جی سر۔ مگر آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“ ایڈم سر جھکائے منہ میں بولتا ریڑھی کی ایک ایک چیز اٹھا کے دیکھ رہا تھا۔
 ”اور تالیہ؟“ اس نے اپنے متعلق سوال نظر انداز کیا۔

”آہ.... چے تالیہ!“ ایڈم نے گہری سانس بھری۔ ”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ تو وہی ٹھیک ہیں۔“
 ”تم اور سوئگائی کیوں نہیں گئے؟ تمہیں مراد کو ڈھونڈنا تھا۔“ فاتح اب جھک کے تھال سے مزید گارا ہاتھوں پہ اٹھا رہا تھا۔ انداز میں ناخوشی تھی۔

”ہم شہر سے باہر تک گئے، پھر چے تالیہ ہمیں واپس لے آئیں۔ وہ آپ کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہتی تھیں۔“
 ”بے وقوف!“ خفگی سے سر جھٹک کے سیدھا ہوا اور پتھروں کی تہہ پہ گارا بھرا۔ ”ابھی کہاں ہے وہ؟“
 ”صبح ہم نے ایک گھر سے کپڑے... ادھار لے کر پہنے (تھوک نکل کے کہا) اور پھر ہم بازار آ گئے۔ وہاں سے وہ مجھے رات میں ملنے کا کہہ کے بند ہمارا کے محل چلی گئیں۔“
 ”وہ محل کیوں چلی گئی؟“

ایڈم نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے فاتح کو دیکھا، جس کا یہاں سے نیم رخ نظر آتا تھا۔ وہ سنجیدہ صورت بنائے گارے کی تہہ پہ پتھروں کی تہہ لگا رہا تھا۔ پسینے سے بھیلے بال حکمن آلود پیشانی پہ جمے تھے۔
 ”وہ دراصل.... بات یہ ہے کہ....“ ایڈم نے تھوڑی کھجائی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے یہ بات کہے۔ ”چے تالیہ کو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ.... وہ خود ہی.... دراصل.... شہزادی تاشہ ہیں۔“
 گارالپتے وان فاتح کے ہاتھ تھم گئے۔ بالکل ساکت۔

”جی یہ سچ ہے سر۔“ اس کی خاموشی پہ ایڈم کا حوصلہ بڑھا۔ ”وہ شہزادی تاشہ جن کے قصے ہم پڑھتے تھے، جن کے بارے میں بنگارا یا ملا یو لکھی گئی تھی، وہ دراصل چے تالیہ ہی ہیں۔ وہی بند ہمارا کی بیٹی ہیں اور وہ....“
 فاتح سر جھکا کے ایک دم ہنس پڑا۔ ایڈم کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔
 ”اس نے محل کی طرف جانے سے پہلے تمہیں کہا کہ وہ شہزادی تاشہ ہے اور تم نے یقین کر لیا؟“ محظوظ انداز میں سر جھٹکا تو ایڈم کو سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہے۔
 ”سر، وہ واقعی....“

”This is Taliyah for you , Adam!“ وہ اب بدقت مسکراہٹ دبا کے دیوار پہ گیلی مٹی لپ رہا تھا۔ ”وہ ایک کون آرٹسٹ ہے، وہ کہانیاں گھڑتی ہے، She lies for a living۔ اس نے تم سے مذاق کیا.... ایک کہانی گھڑ دی اور تم نے یقین کر لیا۔ تمہیں کتنی دفعہ بتایا ہے میں نے کہ وہ تمہیں تنگ کرنے کے لئے ایسا کرتی ہے۔“

”نہیں سر، آپ غلط سمجھ رہے ہیں، وہ واقعی....“

”وہ جہاں بھی جا رہی ہوگی، وہ شیز نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔ تھوڑی عقل استعمال کرو۔ اس کی عادت ہے تمہارے ساتھ مذاق کر کے تمہیں شرمندہ کرنا۔“

خوانچہ فروش اب ایڈم سے مایوس ہو چکا تھا جو ہر چیز کو مسلسل الٹ پلٹ کے دیکھے جا رہا تھا مگر خریدنے کی بات نہیں کرتا تھا۔ نگ آ کے وہ اپنی ریڑھی دھکیلنے لگا۔ پیریدار دور کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ ایڈم نے بے بسی سے اطراف میں دیکھا۔ یہاں کھڑے رہنے کا جواز چھوٹ رہا تھا۔

”سر.... وہ واقعی میں شیزادی تاشہ ہیں، وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں، وہ....“

”مراؤ کوڈ ہونڈو۔ اور سونگائی جاؤ اور چابی لے کر آؤ۔ اور اگر مراد قید میں ہے تو اس قید خانے کا پتہ لگاؤ۔“

فاتح کام میں مصروف تھا۔ ایڈم کے پاس اب آگے بڑھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

تھال خالی ہوا تو فاتح نے زنجیر والے ہاتھوں سے اسے اٹھاتے ہوئے پیچھے دیکھا۔ ایڈم اب وہاں نہیں تھا۔

”تالیہ بھی اس بے چارے کے ساتھ بہت زیادتی کر دیتی ہے۔“ مسکراہٹ دبا کے سر جھٹکا اور تھال اٹھائے آگے بڑھ گیا۔

☆☆=====☆☆

عشاء کی اذان کے ساتھ ہی ملا کہ شہر کی ساری مشعلیں اور قدیلیں بجھتی گئیں۔ مسجدوں سے گھروں کا رخ کرنے کے بعد لوگوں نے دروازوں کے کنڈے چڑھائے اور کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔ شہر گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اوپر تاروں سے جھللاتا آسمان البتہ خوب خوب روشن تھا۔

ایسے میں چند مکانوں کے عقب میں ایک درخت تلے ایڈم بیٹھا تھا۔ تھیلے کو سینے سے لگائے، وہ احتیاط سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے گرد و نواح میں دیکھتا تھا۔ رات کے اس پہر سب کچھ سنسان اور خاموش تھا۔

”ایڈم!“ پیچھے سے نسوانی سرگوشی ہوئی تو وہ اچھل ہی پڑا۔ پھر تالیہ کو دیکھ کے جان میں جان آئی۔ وہ صبح والے لباس میں تھی، مگر سر پہ لٹو والا ہیٹ تھا۔ ایڈم نے چہرے پہ خفگی طاری کی۔

”کہاں تھیں آپ؟“ دبی دبی آواز میں پوچھا۔

”میں اپنے باپا کے پاس گئی تھی۔ راجہ مراد میرے باپا ہیں۔“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے جلدی سے بولی۔ اداس بھی لگ رہی تھی۔ سنہری بال جوڑے میں تھے اور چند لٹیس گالوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایڈم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”نہیں۔ میں تو کامیڈین ہوں۔ میری زندگی میں تم سے مذاق کرنے کے علاوہ دوسرا کام کون سا رہ گیا ہے؟“ اس کے تو سر پہ لگی تلووں

پہنچھی۔ ایڈم خفیف سا ہوا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے، میں کیسے یقین کروں کہ آپ ایک دم سے شہزادی نکل آئی ہیں؟ ہاں؟ کل تک تو آپ لکڑہارے کی بیٹی تھی، اور آج بندہ ہارا کی؟“

تالیہ نے گہری سانس لی۔

”دیکھو ایڈم!“ آرام سے سمجھانے لگی۔ ”اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی حیثیت کے مطابق نوازتا ہے۔ کسی کو کچھ کم دیتا ہے، کسی کو زیادہ دیتا ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے صرف کھوپڑی سے نوازا ہے، اور اندر دماغ کے نام پہ جو دیا ہے، نا وہ پہلے ہی بہت تھوڑا ہے۔ اس پہ زیادہ زور دو گے تو خدا نخواستہ ختم ہو جائے گا۔ سوچ کر کے میری بات سنو!“ ٹون بدل کے غرائی تو ایڈم کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔

”اچھا۔ مان لیا۔ آپ ہی شہزادی ہیں۔“ بھنویں اکٹھی کر کے ناراضی سے بولا۔ ”تو پھر شہزادی تاشہ پہ اتنے دن سے غصہ کیوں کر رہی تھیں؟“

”کیونکہ میں اپنے خواب کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی تھی۔ جس شہزادی کو اس میں ظالم کہا جا رہا تھا وہ یان سوفوتھی۔ شہزادی تاشہ کوئی نہیں تھی۔ میرے باپا سلطان مرسل کے پھوپھی زاد ہیں۔ سلطان مرسل کے والد کی حکومت میں ان کو شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ الور سوئنگائی نامی گاؤں چلے گئے اور وہاں باغیوں کی ایک تنظیم بنالی جس کا نام پمبور تھا۔ وہ سلطان کی پالیسیز سے نالاں تھے اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے مگر جب سلطان مر گیا اور اس کا بیٹا مرسل سلطان بن گیا اور اس کے بندہ ہارا اور شہزادی یان سوفونے مل کے پمبور کے لوگوں کو گرفتار کیا اور ان کے گھر اجاڑے، تو باپا نے اپنے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور بندہ ہارا کے ساتھ مل گئے۔ یوں بندہ ہارا نے ان کو دوست سمجھ کے ان کو مرسل سے معافی دلوا دی۔ اس کے بعد باپا نے مرسل شاہ پہ جانے کون سا جادو کیا کہ باپا کے کہنے پہ مرسل نے پچھلے بندہ ہارا کو پھانسی چڑھا دیا اور باپا کو بندہ ہارا کی گدی دے دی۔ اب شہزادی یان سوفو باپا کی دشمن ہو گئی ہے۔ چند دن بعد اس کی سلطان مرسل سے شادی ہو رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے مرسل شاہ اپنی شہزادی سے زیادہ میرے باپا کے زیر اثر ہے۔“

”بڑے کوئی دن ہیں آپ کے باپا۔ وہی تو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کس پہ گئی ہیں۔“ پھر تالیہ کے گھور کے دیکھنے پہ گہری سانس لی۔ ”مخیر... ہمیں ان کی لڑائیوں سے کیا۔ آپ یہ بتائیں، آپ کے باپا چابی دے رہے ہیں یا نہیں؟“

”یہ سب اتنا سادہ نہیں ہے۔“ وہ ڈپٹ کے بولی اور سارے دن کی روداد سنا دی۔ اندھیرے میں درخت تلے کھڑے وہ دو ہیولے لگتے تھے جو دبی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔

”یعنی راجہ مراد آپ کو اسی دنیا میں رکھنا چاہتے ہیں، اور وہ چابی کے بارے میں کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں؟“ وہ ساری بات سن کے سوچتے ہوئے بولا۔

”وہ عجیب انسان ہیں ایڈم۔ شاطر، چالاک اور بہت ہشیار۔ ہمیں ان سے چھپا کے پلان کرنا ہے جو بھی کرنا ہے۔“

”آپ بابر کیسے نکلیں محل سے۔“

”جھپٹیں پھلانگنا اور دیواریں کودنا آتی ہیں مجھے۔“ ناک سے مکھی اڑائی۔

”تو اب آپ محل میں رہیں گی؟“ قدرے رشک سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔ تم ابھی کسی سرائے میں رہ لو۔ میں تمہارے لئے سکے لائی ہوں۔“ اس نے ایک پوٹلی سی ایڈم کی طرف بڑھائی۔ ایڈم نے جلدی

سے وہ تھام لی۔ ”یہ تو بھاری ہے۔ خیر... اب تو آپ کے پاس کافی دولت آگئی ہوگی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بمشکل ایک کمرے سے نکال کے لائی ہوں۔ کسی کو اپنی طرف سے مشکوک بھی تو نہیں کر سکتی نا۔“ پھر ٹھہر گئی

۔ اور غور سے دیکھا۔ ایڈم تھیلے میں پوٹلی ڈال رہا تھا۔

”یہ تم نے کہاں سے لیا؟ دکھاؤ۔“ مشکوک انداز میں بولی تو اس نے جھٹ تھیلہ اکھول کے دکھایا۔

”ایک سرائے میں بیٹھے کسی آدمی سے چرایا ہے۔ وہ بنگارا ملا یو کے نام سے کتاب لکھ رہا تھا مگر پیسے وغیرہ نہیں تھے اس کے پاس۔

کنگال رائٹر۔ ہونہ۔“ مایوسی سے کورے صفحے نکال کے دکھائے اور واپس اندر ڈال دیے۔ پھر یاد آیا۔

”میں آج ملا فاتح صاحب سے۔“

تالیہ چونکی۔ ”واقعی؟“

”جی جے تالیہ۔ ان کو ساتھی قیدیوں سمیت اس احاطے کے باہر والی دیوار کی تعمیر کا حکم ملا ہے وہ وہیں تھے۔ میں نے ان سے بات کی۔

ان کو یہ سب....“ (تالیہ کی طرف شرمندہ سا اشارہ کیا۔) بھی بتایا۔“

”یہ سب کیا؟“

”یہی کہ.... آپ ہی.... (تھوک نگلا) شہزادی تاشہ ہیں۔“

”اچھا!“ اس نے گردن ذرا کڑاتے ہوئے نزاکت سے لٹ انگلی سے پیچھے کی۔ ”تو کیا کہا انہوں نے؟“ سرسری سا پوچھا۔

”یہی کہ آپ تو پیدائشی چور ہیں اور ماشاء اللہ سے جھوٹی کہانیاں گھڑنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے اس لیے یہ بھی کوئی کہانی ہی ہے جو

آپ نے مجھے فیڈ کر دی ہے اور بہتر ہے کہ میں آپ کی بات کا یقین نہ کروں اور اور سو ننگائی جا کر کلڑ ہارے مراد کو ڈھونڈوں اس سے چابی

لوں اور ہم تینوں واپس چلے جائیں۔ ان کو لگتا ہے میں آپ کی من گھڑت کہانیوں پہ جلدی اعتبار کر لیتا ہوں کیونکہ....“ آنکھیں سادگی سے

جھپکائیں۔ ”میں کتابیں جو بہت پڑھتا ہوں۔“

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر دانتوں پہ دانت جمائے تالیہ مراد کا چہرہ مارے غصے کے سیاہ پڑتا گیا۔

”ہونہ۔ ان کو انسانوں کی پہچان کبھی بھی نہیں تھی۔“ اور پیرٹخ کے اٹھ گئی۔ ایڈم نے بڑبڑا کے پکارا۔

”آپ جارہی ہیں.... تو پھر اب ہم کہاں ملیں گے؟“

”کل صبح احاطے کے سامنے وان فاتح کے ساتھ میرا انتظار کرنا۔ روشنی ہونے کے پورے گھنٹے بعد میں تم سے ادھر ہی ملوں گی۔“ وہ مڑے بغیر بولی اور آگے بڑھ گئی۔ ایڈم ارے ارے کرتا رہ گیا مگر وہ اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔

ایڈم نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ شہر گھپ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ مکان تاریک پڑے تھے۔ سرائے چند کوس کے فاصلے پر تھی۔ وہ وہاں پہلے ہی کمرہ لے چکا تھا اور اسے چینی سمجھ کے اشاروں کی زبان میں بات کر کے سرائے کے مالک نے تسلی بھی کر لی تھی۔ اس کا کمرہ فی الحال اس کا انتظار کر رہا تھا سو وہ اسی سمت میں چل دیا۔ یہ تھیلی اس کے لیے کافی تھی۔

☆☆=====☆☆

صبح سورج کا تھال ملا کہ قدیم آسمان پر نمودار ہونے لگا تو روشنی کی کرنیں سلاخ وارد یوار سے اندر گرنے لگیں۔ دو پہر بیدار حسب معمول دروازے تک چلتے آئے تو ان کے قدموں کی چاپ سن کر قیدی بیدار ہونے لگے۔ گد لے میلے جسموں اور کپڑوں والے بے حال مقید لوگ.... کوئی اٹھ کھڑا ہوا، کوئی کونے میں کھسک گیا۔

ایسے میں اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھا وان فاتح بار بار اس الیو کو دیکھ رہا تھا جو پہریداروں کی آمد کے ساتھ ہی غصے میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور نفرت کے ملے جلے تاثر نمودار ہو گئے تھے جیسے وہ ایک خاموش احتجاجی لڑائی کے لئے تیار ہو۔ ہر روز اس کا کھانا گرا دیا جاتا تھا اور اسے ذلیل کیا جاتا تھا۔ شاید وہ کوئی معزز آدمی تھا جو ان کی قید میں آپھنسا تھا اور وہ اپنے خودداری اور باعزت زندگی کو بھول نہیں پارہا تھا۔

تالہ کھول کے دونوں پہریدار اندر داخل ہوئے ایک ہنٹر لہرا رہا تھا اور دوسرے نے کھانے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ باری باری کھانا بانٹا وہ پہریدار آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ الینو کے پاس آ رہا۔ دوسرے قیدی خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے کہ چلو دیکھتے ہیں آج کیا ہوتا ہے۔

پہریدار نے تمسخر سے اسے دیکھتے تھیلے سے چاولوں کی گیند نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ پھر ابرو سے اشارہ کیا گویا کہ ”ہا ہو“ لے لو۔“

فاتح تیزی سے اٹھا اور پہریدار کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

جہاں پہریدار چونکا وہیں سارے میں خاموشی چھا گئی۔ سب نے دم سادھ لئے۔

فاتح نے کھانا لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اپنی گہری آنکھیں وہ پہریدار کی آنکھوں میں ڈالے ہوئے تھا۔ کوئی رعب تھا یا کیا، پہرے دار نے کھانا گرانے کی بجائے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

فاتح نے اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر.... گیند کو خود مین پر گرا دیا۔

بہت سے لوگوں کے منہ کھل گئے۔ الینو خود دھک سے رہ گیا۔ ہنٹر والے کا ہوا میں ہنر لہراتا ہاتھ ٹھہر گیا۔

پھر فاتح نیچے جھکا، گرد آلود گیندا اٹھائی اس کی گرد جھاڑی اور کھڑے ہوتے ہوئے ایسٹو کی طرف مڑا۔

”اٹھو!“ جدید ملے میں کہتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا۔ بھلے الفاظ ایسٹو کو نہ سمجھ آئے ہوں، مگر اشارہ سب کو سمجھ میں آ رہا تھا۔ ایسٹو بس اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے اٹھ گیا۔

”اے کھاؤ! ابھی!“ سختی سے کہہ کے کھانا اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ ”کسی دوسرے سے دشمنی میں اللہ کے رزق سے منہ نہیں موڑتے۔ ہمارا جسم بھی ہمارے پاس اللہ کی امانت ہوتا ہے۔“

ایسٹو نے میکا کی انداز میں کھانا لبوں کی طرف بڑھایا، تو فاتح نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ ”ٹھہرو۔“ پھر مڑا اور ہنٹر والے کی طرف اشارہ کر کے تھیلے والے سے بولا۔

”یہ آئینہ... اس قید خانے میں.... یہ ہنٹر لے کر... نہیں آئے گا۔ اس سے کہو.... یہ واپس جائے۔“ وہ چبا چبا کے کہتا ساتھ میں اشارہ بھی کر رہا تھا۔ دو دفعہ پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔

”یہ آدمی آج سے روز کھانا کھائے گا، ہر آدمی کھانا کھائے گا مگر یہ ہنٹر لے کر دوبارہ اندر نہیں آئے گا۔ ٹھیک؟“ اس کی آنکھیں پہریدار کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ پیچھے ایسٹو لبوں کے قریب تو شہ روکے ہوئے کھڑا تھا۔ سارے قیدی دم سادھے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ تھیلے والے نے اثبات میں سر ہلایا اور ہنٹر والے کو اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پہ غصہ اور مزاحمت در آئی۔ اس نے احتجاجاً کچھ کہا مگر جواباً تھیلے والے نے اسے جھٹک دیا۔ ہنٹر والے نے برہمی سے فاتح کو دیکھا، پھر زور سے ہنٹر زمین پہ مارا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

فاتح نے ایسٹو کو اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا اور کھانا کھانے لگا۔ تھیلے والے پہریدار نے ایک گیند نکال کے فاتح کی طرف بڑھائی۔ فاتح نے ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالتے ہوئے اسے تھام لیا۔

پہریدار اب خاموشی سے باقی قیدیوں کو ان کا کھانا دینے لگا، البتہ بار بار وہ مزے کے فاتح بن رامل کو دیکھتا ضرور تھا۔

☆☆=====☆☆

سنہری صبح ملا کہ کی اس پہاڑی پہ پھیل رہی تھی۔ نیچے سمندر کی لہریں ٹھانٹیں مارتی دکھائی دے رہی تھیں اور اوپر محل کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ایسی ہی ایک کھڑکی سے اندر جھانکتو تو سامنے مسہری پہ تالیہ مراد بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

کسی بت کی طرح گردن کڑائے، کمر سیدھی رکھے، وہ سپاٹ چہرہ لئے ہوئے تھی۔ دو کنیز اس کو تیار کر رہی تھیں۔ اس نے سرخ کا مدار لباس پہن رکھا تھا، جیسے لہنگا ہو اور اوپر لمبی قمیض۔ کانوں میں قیمتی پتھر جڑے آویزے تھے۔ ایک کنیز اس کے بالوں کا اونچا جوڑا بنا رہی تھی اور دوسری ناخن تراش رہی تھی۔ شریف نامی کنیز ہاتھ باندھے سامنے کھڑی تھی۔

”باپا کہاں ہیں؟“ دفعتاً تالیہ نے شریفہ سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

”راجہ مراد محل کے لئے روانہ ہونے والے ہیں۔“ (اس کا اشارہ سلطان کے محل کی طرف تھا جو یہاں سے چند کوس کے فاصلے پہ واقع تھا۔)

”مجھے ان سے ملنا ہے۔“ تالیہ نے ایک دم ہاتھ کھینچا اور بے چینی سے کھڑی ہوئی۔ دوسری کنیر کے ہاتھ سے اس کے بال بھی نکل گئے۔ ”میں ان کو خبر کر دیتی ہوں شہزادی۔ وہ ملنا چاہتے ہوں گے تو روانگی کو موخر کر دیں گے۔ آپ یہیں بیٹھیے۔“ شریفہ نے ادب سے کہا تو وہ ذرا سنبھلی۔ پھر سرسری سا ”ہاں“ خبر کر دو“ کہہ کے مصنوعی انداز میں گردن کڑائی اور واپس بیٹھ گئی۔ شریفہ باہر نکل گئی اور دونوں کنیریں اس کو تیار کرنے لگیں۔

”شہزادی آپ کے بالوں کا رنگ اتنا حسین کیسے ہے؟“ پیچھے کھڑی کنیر نے اس کے بال سنوارتے ہوئے حسرت سے پوچھا۔ ”زیادہ سوال مت پوچھو۔ اپنا کام کرو۔“ وہ رعب سے بولی تو کنیر خفیف سی ہو کے جلدی جلدی بال بنانے لگی۔ دوسری کنیر اٹھی اور پاؤں سے بھرا پیالہ لے آئی۔ تالیہ نے اس میں جھانکا اور ناک چڑھائی۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ سنگھار ہے۔ خالص ترین گندم کو پانی میں پندرہ دن تک رکھتے ہیں پھر پیس کے چھان کے، سکھا دیتے ہیں۔ استعمال کرنے سے پہلے اسے عرق گلاب میں ملاتے ہیں۔ چہرے کو خوب سفید کر دیتا ہے یہ۔“

(آہ۔ فاؤنڈیشن۔) وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ کنیر ان مہارت سے وہ اس کے چہرے پہ لگا رہی تھی۔ پھر انجلیکا کے سرخ چوں کے سفوف سے اس کے گالوں کو گلابی کیا۔ اسکے بعد ڈیا سے ایک پیسٹ انگلی پہ نکالا اور ہونٹوں پہ ملنے لگی۔ وہ چربی اور نازبو سے تیار کردہ لپ اسٹک تھی۔ دوسری کنیر اس کا جوڑا بنا چکی تھی اور سامنے کو نکالی لٹوں کو اب گرم دہکتے لوہے کے راڈ پہ لپیٹ کے گھنگریالا کر رہی تھی۔

وہ چپ چاپ سارے کام اپنے اوپر ہوتے دیکھتی رہی۔ دیوار پہ لگے آئینے میں اس کا سجا سنورا روپ بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ جنگل میں اتنے دن مٹی سے اٹے چہرے سے پھر نے کے بعد اسے بر شے قبول تھی۔

☆☆=====☆☆

راجہ مراد جس کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اس کا دربار تھا۔

تالیہ کے سامنے جب پہریداروں نے دروازے کھولے تو اس نے دیکھا وہ مستطیل کمرہ ہے، اور سیدھ میں قالین بچھے ہیں۔ دائیں بائیں کرسیاں قطار میں رکھی ہیں۔ جب دربار لگتا تو وہاں درباری بیٹھتے تھے۔ ابھی وہ خالی تھیں۔

قالین جہاں ختم ہوتا وہاں اونچا چبوترہ بنا تھا جس پہ راجہ مراد تخت پہ شان سے بیٹھا میز پہ رکھے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ سنہری اور سفید شاہی پوشاک پہنے، سر پہ سرخ ریشمی پٹی باندھے اس کی نظریں کاغذوں پہ جھکی تھیں۔ آہٹ پہ محض نظر اٹھا کے دیکھا تو سامنے سے سرخ سنہری لباس میں مسکراتی ہوئی تالیہ چلتی آرہی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ قریب آگئی اور چبوترے کے زینوں کے ساتھ رکی۔

”باپا!“ مسکرا کے بولی۔ ”صبح بخیر۔“

راجہ مراد نے صرف سر کو خم دیا۔ ہاتھ ہنوز روکے ہوئے تھا۔

”آپ کو محل کے لئے روانہ ہونا ہے، اس لئے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ میں اس چابی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مجھے وہ چابی دوبارہ بنا دیں تو میں اپنی دنیا میں واپس جاسکتی ہوں۔ مجھے وہاں چند ایک کام نبھانے ہیں، اس کے بعد میں واپس آ جاؤں گی، یہی میرا گھر ہے اور میں اپنے محل کو کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے واپس آنا ہی ہے۔ مگر چند دن کے لئے مجھے ادھر جانا ہوگا“ سو اگر آپ....“ وہ ایسے پیار سے کہہ رہی تھی جیسے کسی بچے کو بہلایا پھسلایا جاتا ہے۔

”تم سیدھ میں نہیں چلتیں۔“ وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے بولا تو تالیہ کے الفاظ ٹوٹ گئے۔

”جی؟“

”تمہاری چال درست نہیں ہے، تمہارا لہجہ خراب ہے، تمہارے آدھے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے، تم بہت تیز تیز گفتگو کرتی ہو۔ تم نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے سر جھکا کے مجھے سلام نہیں کہا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ محل میں آنے کے بعد تم مجھے ’باپا‘ نہیں ’بندابارا‘ کہو گی۔ تمہیں ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔“ اس نے کاغذ رکھے اور ایک شان سے اپنا چغہ سمیٹتے ہوئے اٹھا۔ چبوترے پہ کھڑا وہ تالیہ کو بہت اونچا بہت پر ہیبت لگا تھا۔

اس نے بے اختیار تھوک نگا۔

”چابی۔ مجھے وہ چابی چاہیے، ‘باپا۔“

”میرے پاس کوئی چابی نہیں ہے، تا شہ۔ آج کے بعد میں اس کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا۔ وہ سب پیچھے رہ گیا ہے۔“ وہ چبوترے کے زینے اتر اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔ ایسی آہنی گرفت تھی وہ کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”تمہاری دنیا یہ ہے، وہ نہیں۔ وہاں تمہارے لئے کچھ نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں تم اس دنیا کو بھلا کر یہیں رہو۔ عیش و عشرت سے زندگی گزارو۔ راج کرو۔ دولت اور طاقت کا مزہ حاصل کرو۔ میں کبھی بھی دوبارہ تمہارے منہ سے اس دنیا کا ذکر نہیں سننا چاہتا۔ وہ بابا اب بند ہو چکا، تا شہ!“ اس کے الفاظ تھے کہ کوئی تخیل بستہ ہوا جو تالیہ کی ہڈیوں میں گھس کے خون کو جمار ہی تھی۔

وہ پھیکا سا مسکرائی اور سر کو اثبات میں خم دیا۔

”جیسے آپ کا حکم، باپا۔“ مراد نے اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹائے اور آگے بڑھ گیا۔

حالم کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ ایک دم وہ مڑی۔

”مگر اس دنیا کے محل زیادہ خوبصورت تھے آقا۔ میں تو ایک دن میں ہی اس محل سے اکتا گئی ہوں۔ کیا ہم اس کی تزئین و آرائش نہیں کر

”سکتے؟“

مراد کمر پہ ہاتھ باندھے بابر جبار ہاتھ اس بات پر کا اور واپس پلٹا۔

”یہ محل کافی خوبصورت ہے، تاہم! اور محل تو کیا، ملاکہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ تمہاری دنیا سے زیادہ خوبصورت۔“ پھر وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”تمہیں شاید اس بات پر یقین نہیں ہے۔ تم یوں کرواؤ اپنے شاہی عملے کے ساتھ شہر کا دورہ کراؤ۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ملاکہ اور تمہاری دنیا میں کیا فرق ہے۔“ اور پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

(ہماری دنیا اور آپ کی دنیا بہت مختلف ہے، راجہ مراد!) وہ تندہی سے سوچے گئی۔ ماتھے پہ بل پڑے تھے۔ پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔ اسے بابر جانا تھا مگر عالم ہمیشہ ایسے بات کرتا تھا کہ سامنے والے کو لگے سارا آئیڈیا اسی کا تو تھا۔ اب وہ با آسانی بابر جاسکتی تھی۔ پلان اے۔ چابی مانگنے کی آخری کوشش بھی ناکام گئی تھی۔ مگر خیر۔ وہ صرف ایک کمزور سا پلان اے تھا۔ اب اسے پلان سی پہ عمل کرنا تھا۔

☆☆=====☆☆

ملاکہ شہر کے بازار میں صبح سویرے ہی رونق لگ گئی تھی۔ گاہکوں کا رش دکانوں پہ لگا تھا۔ خانچہ فروش صدالگاتے اپنا سامان بیچ رہے تھے۔ ایسے میں بازار کی اس گلی میں آؤ جہاں وہ احاطہ واقع تھا تو اس کے سامنے والی زیر تعمیر حویلی کے اندر بابر مزدور کام پہ لگے دکھائی دیتے تھے۔ حویلی کی چار دیواری ایک جگہ سے چار ہاتھ اونچی تھی اور اس کے اوپر وان فاتح جھکا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ڈرائیو ڈاور پتھروں کی بنی اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا، اور وہ گارے سے لتھڑے ہاتھوں سے ان کو اٹھا اٹھا کے دیوار پہ جمار ہاتھ۔ سفید گدلی شرٹ مزید گدلی ہو چکی تھی۔ ہانبوں پہ کل والی مٹی ہنوز جمی تھی اور ذرا سا گارا ماتھے اور گال پہ بھی لگا تھا جس سے وہ بے نیاز، بے خبر نظر آتا تھا۔

”سر!“ ایڈم نے قریب آ کے پکارا تو وہ چونک کے پلٹا۔ ایڈم کے سر پہ ہیٹ تھا اور ہاتھ معزز افراد کی طرح کمر پہ باندھ رکھے تھے۔ لباس کل والا تھا۔ فاتح نے فوراً پہریداروں کی طرف دیکھا، اور پھر قریب کھڑے البیو کو اشارہ کیا۔ البیو نے سر ہلایا اور اس پاس کھڑے تین چارقیدیوں کو نگاہوں کی زبان میں کچھ کہا۔ چند ہی لمحوں میں تمام مزدور اپنی اپنی جگہ سے آگے پیچھے ہٹ گئے، اور انہوں نے کچھ اس طرح سے اپنی ترتیب جوڑی کہ دور کھڑے پہریداروں کے راستے میں حائل ہو گئے۔ فاتح اور ایڈم ان کی نظر سے چھپ گئے۔

”لگتا ہے آپ نے کچھ نئے دوست بنائے ہیں سر!“ ایڈم متعجب ہوا۔ جس ریڑھی کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا، اس کو بھی بھول گیا کیونکہ اب کوئی پہریدار اس طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ”کل تک تو یہ آپ کے دوست نہیں تھے۔“

فاتح نے مسکرا کے گارے میں لتھڑی اینٹ اٹھائی اور دیوار پہ جمائی۔

”کل تک وہ مجھے کوئی جنگجو سمجھ رہے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے لیے پہریداروں سے لڑائی کر لوں۔“

”تو کیا آپ جنگجو نہیں ہیں سر؟“

”ہر ایک کا لڑنے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ میں سیاست دان ہوں۔ میں مغاہمت بات چیت اور تدبیر سے درمیانی راہ نکالنے پہ یقین رکھتا

ہوں، جس میں دونوں فریقین کو ان کی مرضی کی شے مل جائے۔ خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ پھر احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”تم بتاؤ، کیا تم الورسوںنگائی جا رہے ہو تالیہ کے باپا کو ڈھونڈنے؟“

”نہیں۔ چے تالیہ نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے یہیں ملیں گی۔ ابھی کچھ دیر میں۔“ ایڈم نے ہیٹ ذرا اوپر سر کا یا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ تم دونوں کو چاہیے کہ فوراً یہاں سے نکلو۔“ وہ واقعی جھنجھلایا۔

”سر.... وہ.... ایڈم نے بار بار لب کھولے، پھر بند کر دیے۔ فاتح گارے سے لتھڑے ہاتھ کمر پہ رکھے، ناخوشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”سر.... شہزادی تاشہ دراصل (تھوک نگا) چے تالیہ ہی ہیں۔“

فاتح نے اچھنبے سے دونوں ایر واٹھائے۔ ”واقعی؟ اور یہ تمہیں تالیہ نے خود بتایا ہے؟“

”جی۔ وہ سچ کہہ رہی ہیں۔ بندہ ہارا ان کے باپا ہی ہیں۔ راجہ مراد۔ اور وہ اب محل کی مکین ہیں۔“

”اچھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہے؟ اس کا محل اس کا باپ؟“

ایڈم نے بے اختیار گردن کی پشت کھجائی۔ ”نہیں، مگر انہوں نے کہا تھا کہ شہزادی تاشہ وہ خود ہی ہیں.... وہ شہزادی تاشہ جن کے قصے ہم

کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ وہ تمام قصے ابھی پیش نہیں آئے۔ وہ اب پیش آنے ہیں۔ اور اب وہ تاریخ کا حصہ بنیں گے۔“

”اوکے!“ وہ قدرے برہمی سے مز اور زور زور سے اینٹیں اٹھا کے دیوار پہ جمانے لگا۔ ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”سر.... اگر

وہ واقعی شہزادی ہیں تو وہ بے پناہ اختیارات کی مالک ہوں گی اور یوں....“

فاتح تیور کے اس کی طرف گھوما اور افسوس سے اسے دیکھا۔

”تمہیں واقعی اس کے اس افسانے پہ یقین ہے؟“

ایڈم نے جواب نہیں دیا۔ وہ فاتح کے کندھے سے پیچھے کچھ دیکھ رہا تھا۔ لب آدھے کھل گئے تھے۔ بازار میں شور سا مچا تھا۔ منادی

کرنے والے نے اعلان کیا۔ گھوڑوں کے تاپوں کی آواز آئی۔ سپاہیوں نے بگل بجائے۔ بازار میں بکھرے لوگوں نے سمٹ کے دونوں

اطراف میں قطاریں بنالیں۔ سرادب سے جھکائے۔ راستہ صاف ہو گیا۔

فاتح بن رانزل کسی خواب کی سی کیفیت میں گھوما۔

سامنے سڑک صاف تھی اور اس پہ شاہی سپاہی چمکتی تلواریں لئے چلتے آرہے تھے۔ ان کے پیچھے سنہری اور چاندی رنگ کی بگھی تھی جس

کی چھت کھلی تھی۔ ایسے کہ بگھی میں بیٹھی شہزادی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وقت کا جادو تھا.... یا تاشہ پسونا کا سحر.... وہ بالکل مبہوت رہ گیا....

سرخ زرتار لباس پہنے.... بالوں کا جوڑا بنائے.... بالوں پہ ہیروں کا تاج سجائے.... بڑی شان سے کہنیاں اطراف میں جمائے وہ

مسکراتی ہوئی قطار میں ہاتھ باندھے کھڑے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ سرخ لباس بگھی کی سیٹ پہ پھول کی طرح پھیلا تھا۔ منادی کرنے والا اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہی دے رہا تھا اور لوگ اشتیاق سے گردنیں اٹھا اٹھا کے ایڑھیاں اونچی کر کے بندھارا کی سندر بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

اور وان فاتح بالکل ساکت ہوئے کے ایل کے اس بہرہ و سہ کو دیکھ رہا تھا جس کو ہر طرح کا بھیس بدلنا آتا تھا۔ وہ پلک تک نہیں جھپک پارہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت سے زیادہ بے یقینی اور تعجب تھا۔

شہزادی تاشہ نے ہاتھ اٹھا کے اشارہ کیا تو بگھی بان نے بگھی روک دی۔ کسی نے لپک کے دروازہ کھولا۔ کسی نے نیچے پائیدان رکھا۔ وہ اسی شان سے زینے اترتی نیچے آئی۔

لوگ مزید پیچھے ہٹنے لگے۔ تالیہ ٹہلنے والے انداز میں دکانوں کے سامنے سے گزرنے لگی۔ پھر ایک دکان کے چھپر کے قریب رکی۔ ادھر میز پر بہت سے سرخ سیبوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ تالیہ نے سیبوں میں ہاتھ ڈالا... چند سیب ادھر ادھر ہٹائے اور جب ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک موٹی سی سنڈی تھی۔

”کیا تم سنڈیوں اور کیڑوں والے سیب لوگوں کو کھلا رہے ہو؟“ سنڈی لہرا کے اس نے دکاندار کو دکھائی اور پھر غصے سے نیچے پختی دکاندار کا منہ کھل گیا۔ بجوم میں کئی لوگوں نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”گرفتار کر لو اس دکاندار کو۔ اس کو اپنی لاپرواہی کی سزا ملنی چاہیے۔“ شہزادی تحکم سے بولی تو سپاہیوں نے جھٹ سے دکاندار کو پکڑا اور اسے گھسیٹے ہوئے آگے لے گئے۔ وہ بے چارہ چیختا چلاتا رہا مگر اس کو کوئی نہیں سن رہا تھا۔

لوگ مزید پیچھے کھسکنے لگے۔ بازار میں ایک خوف کی فضا قائم ہو رہی تھی۔

اور وان فاتح.... وہ بالکل خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

شہزادی اب سڑک پہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک ادا سے وہ اپنا انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ ریڑھیوں کے کناروں پہ پھیرتی جا رہی تھی۔ دفعتاً وہ ٹھہری۔ دائیں جانب ایک ریڑھی پہ کپڑوں کے تھان رکھے تھے۔ ریڑھی والے نے اسے اپنے پاس رکتے دیکھ کے ہی دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ تالیہ نے دو انگلیوں میں مسل کے کپڑے کو دیکھا۔

”کیا یہ تم چین سے لائے ہو؟“

ریڑھی بان نے جھٹ سر اثبات میں ہلایا۔ ”جی!“

”اسے بھی پوچھ گچھ کے لئے محل لے جاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں یہ دوسرے ملک سے مال برآمد کرنے پہ محصول (ٹیکس) بھی دیتا ہے یا نہیں۔“ شہزادی نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تو ریڑھی بان نے گھبرا کے سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ بنا کسی تامل کے اس پہ جھپٹے اور اسے کھینچ کے لے گئے۔

”چے تالیہ ویسے شہزادی کے روپ میں اتنی بری نہیں لگ رہیں۔“ ایڈم نے قدرے جوش سے فاتح کے قریب سرگوشی کی۔ (رش کے باعث سب اکٹھے کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔ ایڈم کا اس کے ساتھ کھڑے ہونا کسی کو قابل توجہ نہیں لگا تھا۔)

”یہ معصوم لوگوں کو کیوں گرفتار کر رہی ہے؟“ وہ دور سے آتی شہزادی کو دیکھ کے ذرا الجھن سے بولا۔

”یقیناً یہ لوگ معصوم نہیں ہوں گے۔ بے شک چے تالیہ چور ہیں، فراڈ ہیں، مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ کسی اچھے اور نیک انسان کو کبھی گرفتار نہیں کروائیں گی۔“ ایڈم نے خلوص سے کہتے ہوئے اسے تسلی دی۔ وہ ہیٹ ذرا اٹھا کے تالیہ کو دیکھتا فخر سے مسکرا رہا تھا۔ اس سے سارے گلے شکوے اس کو اس پر اعتماد روپ میں دیکھ کر ختم ہونے لگے تھے۔

”اس ہیٹ والے آدمی کو بھی گرفتار کر لو۔ یہ گستاخ میری طرف دیکھ کے تمسخرانہ اشارے کر رہا ہے۔“ شہزادی نے تندہی سے ایڈم کو دیکھتے ہوئے دور سے اس کی طرف اشارہ کیا تو سپاہی اس جانب لپکے۔ دوسرے لوگوں نے جلدی جلدی راستہ چھوڑا۔

ایڈم بن محمد کا منہ کھل گیا۔ بے اختیار وہ پیچھے ہٹا۔

”مم۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟ چے تا۔۔۔ شہزادی تا شہ۔۔۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ ارے چھوڑو مجھے۔“ مگر اس کی چیخ و پکار کا سپاہیوں پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے دبوچ کے آگے لے گئے۔ ایڈم ان کی گرفت میں مسلسل پھڑپھڑاتے ہوئے چلا رہا تھا۔ ششدر، حیران پریشان۔

تالیہ نے گردن اٹھا کے اوپر دہکتے سورج کو دیکھا اور پھر نزاکت سے اپنی پیشانی چھوئی جس پہ پسینے کی نادریدہ بوندیں موجود تھیں۔

”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ واپس چلو۔“ غلام کو اسی بے نیازی سے حکم دیا اور کبھی کی طرف مڑی۔ مڑتے مڑتے ایک لمحے کو اس نے فاتح کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شہزادی کو متوجہ پا کر ایک ایر واٹھائی اور لب بے آواز ہلائے۔ ”سیر نیسلی؟“

ملا کہ کی شہزادی نے دور کھڑے اس بد حال ’غلام‘ پہ نظریں جمائے ادب سے پلکیں جھپکا کے اٹھائیں اور ہونٹوں کو جنبش دی۔ ”تو اعلو“ (میرے آقا) اور دونوں پہلوؤں سے کاہل لباس اٹھائے کبھی پہ سوار ہو گئی۔

لوگ پھر سے اطراف میں سمٹ کے شاہی قافلے کو راستہ دینے لگے۔

وہ اسی طرح خاموشی سے دور جاتی کبھی کو دیکھے گیا۔

”(وہ اتنی پیاری تھی ڈیڈ کہ وہ کسی پریوں کی وادی سے آئی ہوئی لگتی تھی۔“

”میرا خیال ہے وہ کوئی فراڈ تھی جو کسی دوسرے کی جگہ ناجائز طریقے سے ہتھیانے جا رہی تھی۔“

”بر کوئی آپ کے ان سیاستدانوں جیسا نہیں ہوتا ڈیڈ۔“

”میں سچ بولوں بیٹا تو تمہیں برا لگتا ہے۔ مگر وہ کوئی پری نہیں تھی۔“

”پھر وہ شہزادی تھی۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔“

اور اب بھی ننھی آریا ندا اس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔
 ”وہ شہزادی ہے، ڈیل۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔“

☆☆=====☆☆

تالیہ محل کے اندر سبزہ زار پہ آگے بگھی سے اتری تو دیکھا... سبزے کے اختتام پہ جہاں سے محل شروع ہوتا تھا، وہاں بیرونی زینے بنے تھے۔ ان کے قدموں میں مسلح سپاہیوں کا ہجوم لگا کھڑا تھا۔ وہ لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے، تیز تیز چلتی سامنے آئی تو سپاہیوں نے راستہ چھوڑا۔

زمین پہ ایک پھٹے پرانے لباس والا بد حال آدمی رسیوں سے بندھا، سجدے کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کے بال لمبے اور سفیدی مائل تھے۔ چہرے اور بازوؤں پہ تشدد کے صاف نشانات نظر آتے تھے۔

دائیں جانب ایک جلا دکھڑا تھا جس کا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا تھا اور ہاتھ میں تیز دھار چمکتی ہوئی ننگی تلوار تھی۔ وہ بار بار اوپر محل کے داخلی دروازے کی طرف دیکھتا جہاں دروازے بند تھے۔ گویا وہ سب کسی کے منتظر تھے۔

”کون ہے یہ آدمی؟ اس کو کیوں مارا جا رہا ہے؟“ وہ بے یقینی اور اضطراب سے ان سب کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔
 اندر اپنے کمرے میں بند ہار امرادر لہجہ کھڑا تھا۔ اس کے سامنے کنیز شریفہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ مراد کمر پہ ایک ہاتھ رکھے، سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”کیا تم میری بیٹی پہ نظر رکھ رہی ہو؟“

”جی، راجہ۔“ اس نے سر کو گہرا خم دے کر نظریں اٹھائیں۔ ”شہزادی کی ہر حرکت پہ میری نظر ہے اور میں اس کی خبر آپ کو دیتی رہوں گی۔ ابھی ابھی شہزادی بازار سے واپس آئی ہیں۔ میں قافلے سے آگے تھی اس لیے جلدی پہنچ گئی۔ بازار میں....“ وہ متذبذب سے رکی۔

”بازار میں کیا؟“ وہ سپاٹ سا بولا۔

”شہزادی کافی نازک طبع واقع ہوئی ہیں۔ انہوں نے کھڑے کھڑے معمولی باتوں پہ تین راگیروں اور دکانداروں کو گرفتار کر کے شاہی قید خانے میں ڈلوادیا ہے۔“

”کیسی باتوں پہ؟“ اس نے سوچتے ہوئے ابرو اٹھائی۔

”میں وہیں موجود تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ کسی کو محصول نہ دیئے، کسی کو صفائی کا خیال نہ رکھنے پہ گرفتار کیا ہے اور ایک کو تو صرف اس بات پہ کہ اس نے شہزادی کی طرف دیکھ کے اشارہ کیا ہے۔ شہزادی شاید صرف ان لوگوں کو اذیت دینا چاہتی تھیں۔“

”اُنہوں۔ وہ مجھے تنگ کرنا چاہتی ہے تا کہ میں اسے واپس بھیج دوں۔“ وہ سوچ میں ڈوبا بولا۔ شریفہ چونکی۔

”واپس کہاں؟ چین؟“

مراد نے چونک کے اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔ ”ہاں۔ چین۔ اب تم جاؤ اور اس پہ نظر رکھو۔ اس کی ایک ایک حرکت کی خبر مجھے ہونی چاہیے۔“

”راجہ....“ وہ ڈرتے ڈرتے نظریں جھکائے بولی۔ ”شہزادی آپ کی صاحبزادی ہیں۔ کیا آپ کو ان سے.... کسی قسم کا کوئی.... خطرہ ہے یا کوئی....؟“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کے تھوک نگا۔

مراد راجہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔ شریفہ کا دل زور سے دھڑکا۔ سر مزید جھکالی۔

”نیچے دالان میں ایک آدمی جلاد کے ہاتھوں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ جانتی ہو اس کا جرم کیا تھا؟“

شریفہ نے نظریں مزید نیچے کر لیں اور کپکپاتی آواز میں بولی۔ ”کیا؟“

”وہ میرے برکام کی ٹوہ رکھتا تھا۔“

”مجھے معاف کر دیجیے راجہ۔“ وہ ایک دم جھکی اور راجہ مراد کے جوتوں پہ دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ”میری جان لے لیجئے۔ آئندہ آپ میرے لبوں سے کوئی سوال نہیں سنیں گے۔“

مراد نے کوفت سے پیر ہٹایا اور آگے بڑھ گیا۔

جب وہ محل سے نکلا اور بیرونی زینے اترنے لگا تو اس کی شاہی پوشاک زمین کو چھو رہی تھی اور بازو کمر پہ بندھے تھے۔

نیچے جلاد کے قریب تالیہ کھڑی تھی۔

”باپا....“ اسے دیکھتے ہی بے چینی سے زینے چڑھتی اوپر آئی۔ ”یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ آدمی پرانے بندہ ہارا کاتائی ثیان (غلام) ہے۔ کیا آپ اس کو اس لئے سزا دے رہے ہیں کیونکہ....“ آواز دھیمی کی۔ ”کیونکہ یہ آپ کے مخالف کا آدمی تھا؟ یا واقعی اس نے کوئی ناقابل تلافی جرم بھی کیا ہے؟“

تالیہ اس سے تین زینے نیچے کھڑی تھی۔ اس لیے راجہ کو دیکھنے کے لیے گردن پوری اٹھائے ہوئے تھی۔

”اور اگر اس نے کوئی جرم نہیں کیا سوائے جنگی جرائم کے تو آپ اس کو معزول کر کے جلاوطن کر دیں۔ یہ آپ کی سلطنت میں کبھی دوبارہ داخل نہیں ہو سکے گا۔ لیکن کیا اس کو مارنا ضروری ہے؟“

راجہ مراد نے اپنا ہاتھ کمر کے پیچھے سے نکالا اور ہتھیلی پھیلائی۔ تالیہ نے نازک انگوٹھیوں سے مزین اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے نیچے اترنے لگا۔

سیڑھیوں کے قدموں میں کھڑے سپاہی منتظر سے راجہ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے تو راجہ اس کو ساتھ لئے آگے چلا گیا۔

سپاہی پیچھے رہ گئے۔ وہ دونوں گھاس کنارے بنی پتھر ملی روش پہ آگے بڑھتے گئے۔

دفعۃً راجہ ٹھہرا اور پورا اس کی طرف کھوما۔ تالیہ کا ہاتھ ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ناشہ...“ وہ نظریں اس پہ جمائے نرمی سے پوچھنے لگا۔ ”تم اپنی اس دنیا میں سب سے زیادہ کس چیز کے پیچھے بھاگی تھیں؟“
 ”دولت کے!“ وہ بناپلک جھپکے اس کی گہری آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

”اور کیا تم اس دولت کو حاصل کر پائی؟“

اس کی نگاہوں کے سامنے عالم کا بنگلہ، قیمتی لباس اور زیور گھوم گئے تو اس نے سر ہلادیا۔
 ”کسی حد تک۔ جی ہاں۔“

”اور کیا تم وہ ساری دولت دنیا کو دکھاپائی یا تم نے اس کا ایک بڑا حصہ چھپا دیا؟ صندوقوں میں؟ زمین میں؟ دور دراز جزیروں پہ؟ جیسے ہماری دنیا میں چھپایا جاتا ہے۔“

مراد نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ بناپلک جھپکے اب وہ تالیہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سرد تھے مگر تالیہ کے گرم تھے۔

”جی۔ چھپا دیا تھا۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ (حالم کے مکان کے تہہ خانے میں چھپائی گئی پینٹنگز اور نوادرات۔ بینکوں میں رکھا گیا پیسہ۔ اسے سب یاد آگیا۔) ”میں نے تقریباً سب کچھ ہی چھپا دیا۔“

”کیونکہ دولت چھپانے سے محفوظ رہتی ہے مگر طاقت دکھانے سے بڑھتی ہے۔ تم دولت کی تمنا کرتی ہو۔ میں طاقت کی کرتا ہوں۔ تبھی تو دولت چھوڑ کے اور سونگائی جا بسا تھا۔ کیونکہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں۔ جب دولت ملے تو صرف دولت ملتی ہے۔ مگر جب طاقت ملے تو دولت خوبو دیکھی چلی آتی ہے۔ اس لئے طاقت چھپا کے نہیں رکھی جاتی۔ اس کو دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ آدمی...“ تالیہ کی آنکھوں پہ نظریں جمائے ابرو سے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ ایک آدمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ’قربانی‘ ہے۔ اس کی موت ظلم نہیں ہے، بلکہ ایک پیغام ہے۔ جب نیا حکمران کسی علاقے پہ آتا ہے تو وہ ایک بستی کو تباہ ضرور کرتا ہے تاکہ ساری سلطنت میں ایک پیغام چلا جائے کہ حکمران... بدل چکا ہے۔ اور وہ کسی کو رعایت نہیں دے گا۔ مجھے افسوس ہے اس تائی ثریان کے لئے مگر اس کو چھوڑ دینے سے میں دنیا کو کیا پیغام دوں گا؟ کہ راجہ مراد ایک پھانسی چڑھے بندہ ہمارا کے خاص غلام کو مار تک نہیں سکا؟ کیا راجہ مراد اتنا کمزور نکلا؟ چڑیا کے دل جیسا کمزور؟“ وہ تعجب سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھوں میں تالیہ کے ہاتھ مقید تھے اور وہ یک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔ سارے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

”طاقت دولت کی طرح چھپانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ مظاہرے سے بڑھتی ہے۔ مضبوط ہوتی ہے۔ اور یہ آدمی صرف ایک پیغام ہے۔ کہ اس ملک پہ حکمرانی کرنے والا چہرہ بدل چکا ہے۔ دھاک بٹھانے کے لئے ایسے پیغام دینے پڑتے ہیں۔“

اس نے تالیہ کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا اور دوسرے سے تھامے واپس قدم بڑھا دیے۔ وہ بالکل گم صم سی اس کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں اس قیدی کے قریب آ کر کے۔

سجدے میں جھکے رسیوں سے بندھے قیدی نے اپنا چہرہ اٹھایا اور آنکھیں چندھیا کے راجہ مراد کو دیکھا۔
 ”ایک دن یہ وقت تم پہ بھی آئے گا مراد راجہ... ڈرو اس وقت سے...“ وہ غم و غصے سے اونچی آواز میں بولا تھا۔
 راجہ مراد نے کمر پہ دونوں ہاتھ باندھ لئے اور گردن جھکا کے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔
 ”تمہاری کوئی آخری خواہش؟“

قیدی نے گہری سانس لی اور قدرے سیدھا ہو کے بیٹھا۔ پھر گردن کڑائی اور ذرا اٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔
 ”میری آخری خواہش یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹوں اور میری بیوی کو...“

راجہ مراد نے ایک دم قریبی سپاہی کے نیام سے تلوار کھینچی اور ایک ہی وار میں قیدی کی گردن پہ پھیر دی۔

اس کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ گردن سے لکیر کی صورت خون نکلا۔ ساتھ ہی چہرے پہ شاک اور خوف ابھرا۔ پھر لبوں سے خون باہر کو پھلکا۔
 گردن سے چند چھینٹے تالیہ کے چہرے پہ گرے۔ اس کی آنکھیں مارے شاک کے پوری کھل گئیں۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹی۔
 اگلے لمحے... قیدی بیٹھے بیٹھے منہ کے بل زمین پہ گر گیا۔
 خاک کا جسم خاک میں جا ملا۔

مراد راجہ نے استعجاب سے ایر واچکا کے اپنے پیروں میں گٹھری صورت پڑی نقش کو دیکھا۔
 ”کیا اسے واقعی لگا تھا کہ مجھے اس کی آخری خواہش سننے میں دلچسپی ہے؟“

پھر اس نے اپنے لباس سے رومال کھینچ اتارا اور تلوار پہ شروع سے آخر تک پھیرا۔ رومال نے خون صاف کر دیا۔ تلوار کی چمک لوٹ آئی۔
 اس نے تلوار سپاہی کی طرف اچھال دی۔

”اس کی گردن اتار کے چوک میں لٹکا دو اور لوگوں میں منادی کرا دو کہ سلطان مرسل شاہ کے بندہ ہارا کے خلاف سازشیں کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ کہہ کے وہ مڑا۔ ہاتھ پیچھے باندھ لئے اور زینے چڑھنے لگا۔

تالیہ ابھی تک ہکا بکا کھڑی تھی۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور گالوں پہ خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ کے بازار پہ سبہ پہر ڈھل رہی تھی۔ مزدور ابھی تک زیر تعمیر حویلی پہ کام میں مصروف تھے۔ بھوکے پیاسے، تھکے ہارے، وہ مذہال سے ایک ایک شے اٹھا کے مطلوبہ جگہوں پہ فراہم کر رہے تھے۔ فاتح ایک ریڑھی پہ لکڑیاں لادے، زنجیروں کے باعث بدقت اس کو دھکیلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی کا پسینہ بھی پونچھتا۔ پھر دانت پہ دانت جمائے ضبط سے اسے آگے دھکیلنے لگتا۔

دفعتاً کسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ ذرا چونک کے کھوما۔

سامنے دو بہریدار کھڑے تھے۔ ایک وہی تھا جو صبح کھانا دینے آتا تھا۔ دوسرا کوئی اور تھا۔

”کیا؟“ اس نے کندھے اچکا کے پوچھا۔

جواب میں پہریدار دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اسے کچھ سمجھانے لگا۔ فاتح نے آنکھیں چندھیا کے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ آؤں؟“ اشارے سے تصدیق چاہی۔ پہریدار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھا۔ چلو۔“ فاتح نے گردن کو جنبش دی اور ریڑھی کو ذرا دھکیل کے ایک طرف کھڑا کرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ریڑھی پہ

رکھی لکڑیوں میں سے ایک نوکیلا تیز لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کے مٹھی میں دبایا اور پھر ان کے ہمراہ چلنے لگا۔

وہ دونوں اسے واپس احاطے میں لے آئے۔ اس نے سختی سے نوکیلا ٹکڑا مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ جسم کا رواں رواں الرٹ تھا۔ ابھی کسی نے

اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ اس کو ان کے اندر اتارنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

احاطے کا اندرونی دروازہ کھول کے وہ ایک راہداری میں آگے بڑھتے گئے۔ وان فاتح کے اعصاب تن رہے تھے۔ وہ غیر آرام دہ محسوس

کر رہا تھا۔ مگر رکنا نہیں۔ ان کے ساتھ چلتا گیا۔ ایک کے بعد دوسری راہداری۔ یہ حویلی کا اندرونی حصہ تھا اور کافی خوبصورت تھا۔

دیواروں میں بنے خانوں میں چینی کے خوبصورت برتن سجے تھے۔ چھت سے جلتے ہوئے فانوس لٹک رہے تھے۔ وہ اطراف کا سرسری

جائزہ لیتا آگے بڑھتا گیا۔

وہ اسے ایک بڑے کمرے میں لے آئے۔ مستطیل کمرہ جو بہت وسیع تھا۔ وہ استعجاب سے گردن گھما گھما کے دیکھنے لگا۔ مٹھی میں بھینچے

لکڑی کے ٹکڑے پہ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

وہاں لکڑی کی اونچی لمبی میزیں بچھی تھیں۔ چولہے بنے تھے۔ ٹوکریوں میں سبزیاں رکھی تھیں۔ پکوان چڑھے تھے۔ اشتہا انگیز

خوشبو۔ دھواں۔

یہ یقیناً اس حویلی کا باورچی خانہ تھا۔

”یہ ساتھ والا کمرہ تمہارا ہے۔ اور یہ لباس تم آج سے پہن کے کام کرو گے۔“ پہریدار نے ایک تہہ شدہ لباس اس کی طرف بڑھایا تو وہ

چونکا۔

لکڑی کا ٹکڑا آہستہ سے پہلو میں گرا دیا۔ اور پھر احتیاط سے لباس تھام لیا۔ باورچی خانے میں موجود تمام لوگ اس طرح کے سرمئی لباس

میں ملبوس تھے۔ پا جامہ اور ڈھیلی سی لمبی قمیص۔ وہ سب ہاتھ روک کے اس کو دیکھنے لگے۔

ایک سفید بالوں والا آدمی قریب آیا اور اپنی زبان میں پہریدار سے کچھ پوچھا۔ پہریدار نے جواباً کچھ بتایا اور پھر فاتح کی کلاسیوں کی

زنجیر چابی سے کھولنے لگا۔ پھر اس نے اس کے پیر آزاد کیے۔ ان کا کام ختم ہوا۔ وہ فاتح کو اس بوڑھے کے حوالے کر کے چلے گئے۔

بوڑھا اسے اپنے ساتھ ایک اور کمرے میں لے آیا جہاں حمام تھا۔

بھاپ اڑاتا پانی۔ صاف کپڑے۔ صندل کی خوشبو لئے نکلیاں۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ باورچی خانے میں داخل ہوا تو اس کے گیلے بال پیچھے کو سٹ چکے تھے اور سر مکی پا جائے قمیص میں وہ تروتازہ اور نکھرا ہوا لنگ رہا تھا۔ بوڑھے نے فوراً ایک پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ فاتح نے اسے تھام لیا تو دیکھا اندر سوپ تھا جس میں گوشت کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اس نے بے اختیار دوسرے کارکنوں کو دیکھا جواب چو کیوں پہ بیٹھے اپنا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے پیالے اس سے چھوٹے تھے اور ان میں جھلکتا سوپ پتلا تھا اور کم بھی۔

بوڑھے نے اشارہ کیا تو وہ ایک لکڑی کے اسٹول پہ بیٹھا اور پیالہ لبوں سے لگایا۔ لذیذ سوپ اندر تک اتر کے جسم میں توانائی بھرتا گیا۔ گھونٹ بھر کے فاتح نے یونہی کھڑکی کو دیکھا تو عقبی طرف باغیچہ سا نظر آ رہا تھا جس میں دبے اور بکرے بندھے کھڑے تھے۔ قطار میں بندھے پہلے بکرے کو ایک آدمی جھک کے گھاس کھلا رہا تھا۔

بری بری ڈھیر ساری گھاس... اس آدمی کی پشت فاتح کی طرف تھی۔ بکرانہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی پشت پہ ایک تیز دھارٹو کا بندھا تھا۔ ایسا ٹوکا جس سے بکرے کو با آسانی ذبح کیا جاسکتا تھا۔ وان فاتح نے ایک نظر اس کے آگے ڈالے گئے گھاس پہ ڈالی اور دوسری اپنے پیالے میں تیرتے ابلے گوشت کے ٹکڑوں کو۔

اس کا دل ایک دم کھانے سے بیزار ہونے لگا۔ وہ بے دلی سے پیالہ واپس رکھ دینا چاہتا تھا مگر... کسی بھی وجہ سے رزق سے منہ نہیں موڑتے۔ رزق اللہ بھیجتا ہے۔ وہ جبراً سوپ پینے لگا۔

☆☆=====☆☆

محل کے گنبد دھوپ میں پگھل پگھل رہے تھے۔ کھلی کھڑکیوں کے باعث اندر بھی سارے میں روشنی پھیلی تھی مگر تہہ خانے میں جاتی گول گول میٹر جیوں سے نیچے جاؤ تو وہاں بنی جیل اندھیر پڑھی تھی۔ دیوار پہ مشعلیں روچن تھیں جن سے اتنا نظر آتا تھا کہ بڑے سے کمرے میں دو اطراف میں کوٹھڑیاں بنی ہیں جن کے سلاخ دار دروازے ہیں اور درمیان میں گزرنے کا راستہ ہے۔

ایسی ہی ایک کوٹھڑی میں بیڑیوں میں بندھا ایڈم موجود تھا۔ زمین پہ اکڑوں بیٹھے ہاتھوں میں سرگرائے وہ حیران پریشان سا لنگ رہا تھا۔ بار بار پیشانی پہ بل آتے، کبھی آنکھوں میں غصہ در آتا، اور کبھی مضطرب ہو جاتا۔ سارا دن گزر گیا، نہ کچھ کھانے کو ملا نہ کوئی حال پوچھنے آیا۔ باقی دونوں قیدی جو اس کے ساتھ کوٹھڑی میں بند تھے مسلسل آہ و بکا کر رہے تھے۔ اور بار بار اپنا قصور تو وہ بھی پوچھے جارہا تھا مگر پھر پیداروں کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگتی تھی۔

اوپر محل کی بارہ دریوں سے گزر کے شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں آؤ تو کھڑکیوں کے ریشمی پردے ہٹے ہوئے تھے اور ڈھلتے سورج کی دم توڑتی روشنی اندر جھانک رہی تھی۔

تالیہ اسی زرتار لباس میں ملبوس، بے چینی سے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔ کنیز شریفہ ہاتھ باندھے سامنے کھڑی تھی۔ نظریں دائیں سے بائیں گھماتی وہ تالیہ کو ٹہلتے دیکھ رہی تھی۔

”آپ پریشان ہیں، شہزادی!“

”صرف پریشان؟“ وہ رکی اور بگڑ کے اسے دیکھا۔ ”میں بہت زیادہ پریشان ہوں شریفہ۔ میرے سامنے میرے باپا نے ایک شخص کی گردن مار دی۔ (اس نے ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا جسے وہ کتنی ہی دفعہ دھو چکی تھی) مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے اور مجھے دیکھو... میں بھرے بازار سے تین دکانداروں کو گرفتار کر والائی اور اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ ان کے ساتھ کیا کروں۔“ وہ قریباً روہانسی ہو گئی تھی۔

”شہزادی۔ جب بھی کوئی قیدی گرفتار ہو کے آتا ہے تو بندہ ہمارا اس کو سزا سنا دیتے ہیں۔ یا اگر ان کے مزاج اچھے ہوں تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔“ شریفہ محل میں عرصے سے کام کر رہی تھی۔ پانچ دن پہلے آنے والے نئے بندہ ہمارے عہد وفا کرنے سے پہلے وہ پچھلے بندہ ہمارا کی کنیز بھی رہی تھی۔ ”آپ ان کو معاف کر سکتی ہیں یا سزا سنا سکتی ہیں۔“

”معاف کرنے سے تو میں کمزور لگوں گی۔ برگز نہیں۔“ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ پھر پلنگ کے کنارے پہنچی اور دونوں ہتھیلیوں سے دائیں بائیں پلنگ کی ریشمی چادر کو بھینچ لیا۔ وہ مضطرب بے چین میں لگتی تھی۔

”ان تینوں نے گستاخی کی تھی اور ان کو اس کی کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔“

شریفہ نے گہری سانس لے کر فوسوس سے سر جھٹکا۔ شہزادی کا رہا سہا رعب جو کل تک شریفہ نے محسوس کیا تھا اس کے بچگانہ رویے کے باعث اب اس کے دل سے جانے لگا تھا۔ سو وہ گردن پوری اٹھائے کھل کے بولنے لگی۔ ”شہزادی آپ اب ایک قدم اٹھا چکی ہیں۔ اب آپ کو شرمندگی سے بچنے کے لئے اس پہ قائم رہنا چاہیے۔“

”شرمندگی؟“

”شہزادی یا ان سو فو کو جانتی ہیں آپ؟ وہ چینی بادشاہ کی صاحبزادی ہیں۔ چند ماہ قبل وہ سلطان مرسل سے شادی کرنے کے لئے اپنے والد کی رضامندی کے ساتھ ایک بڑے چینی قافلے کے ہمراہ ملا کہ آئی ہیں۔ وہ بوکی چینہ (چینی پہاڑی) والے محل میں قیام پذیر ہیں مگر ان کا اکثر یہاں آنا جانا رہتا ہے۔ یہ چند ماہ ان کی شادی کی تیاریوں میں گزر گئے۔ دو ہفتے بعد ان کی اور سلطان مرسل کی شادی ہے۔ شہزادی یا ان سو فو نے ان چند ماہ میں اپنے بہت تعلقات بنا لئے ہیں اور وہ سلطان کے فیصلوں پہ اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے ہی الور سو نگائی کے لوگوں پہ ظلم ڈھایا اور وہ آپ کے والد کی دشمن ہیں۔ ان کو خبر مل گئی کہ آپ جذباتی فیصلے کرتی ہیں تو وہ آپ کو شرمندہ کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی۔“

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ تالیہ کے کندھے ڈھیلے پڑے اور رنگت پھیلنے پڑ گئی۔

”شہزادی!“ وہ سجاؤ سے سمجھانے لگی۔ ”آپ کو قیدیوں کو سزا دینی ہوگی۔“

”سزا....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں ان کو سخت سے سخت سزاؤں گی۔ ان سے بھاری سے بھاری مشقت کروائی جائے گی۔ ایسے ٹھیک

رہے گا۔“

”بالکل شہزادی۔ یہ بہترین رہے گا۔“

تالیہ ایک دم کھڑی ہوئی اور جیسے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے گردن کڑا کے بولی۔

”میں.... میں خود اپنے سامنے ان کومز اسناؤں گی۔ مجھے قید خانے میں لے چلو۔“

”جو آپ کا حکم شہزادی۔“ شریفہ نے گہری سانس لے کر تالیہ کے چہرے کو دیکھا جو تائی ثریان کی گردن مار دینے کے بعد سے مرجھایا ہوا تھا اب کھل اٹھا تھا۔

ایڈم سر جھکائے مذہال پڑا تھا جب اس نے قریب آتے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ چونک کے سیدھا ہوا۔ کونے میں لگی گول میڑھیوں سے چند افراد نیچے اتر رہے تھے۔ ایڈم تیزی سے کھڑا ہوا۔ اسے سرخ اور سنہری لباس کی جھلک دکھائی دی تھی۔

نیچے آنے والوں میں سب سے آگے تالیہ تھی۔ اس کا لمبا لباس زمین پہ جھاڑو دے رہا تھا اور وہ ہاتھ باہم پھنسائے بہت شان سے چلتی ہوئی سلاح دار دروازے تک آئی تھی۔ سر کا تاج نیم اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔ باقی دونوں قیدی بھی شہزادی کے احترام میں ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”اتنا تو بتا دیں کہ آپ نے مجھے کیوں پکڑوایا ہے شہزادی صاحبہ!“ ایڈم سلاحوں کو پکڑے روہانسا ہو کے بولا۔ ”صبح سے بھوکا پیاسا پڑا ہوں۔ کوئی پوچھنے تک نہیں آیا۔ اچھا فائدہ ہوا ہمیں آپ کے شہزادی ہونے کا۔“

شہزادی نے اچھنبے سے اسے دیکھتے ہوئے ساتھ کھڑے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

”میں خود نہیں سمجھ پارہا۔“ سپاہی نے لاعلمی ظاہر کی۔

ایڈم نے افسوس سے ان دونوں کو دیکھا جو نا سمجھی سے ایڈم کو دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔

”آپ کی یہ اداکاری میرے اوپر گراں گزر رہی ہے، چے تالیہ۔ آپ سمجھتی کیا ہیں مجھے؟ میں انسان نہیں ہوں کیا؟ میرے اندر سیل ڈالے جاتے ہیں کیا؟“

وہ کوفت سے سپاہیوں کی طرف گھومی۔ پھر ایڈم نے دیکھا کہ وہ باری باری تینوں کی طرف اشارہ کر کے ان کو ہدایات دے رہی تھی۔ زبان انجان تھی۔ مگر جیسے ہی باقی دونوں قیدیوں نے اس کے الفاظ سنے وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے نیچے کو جھک گئے۔ ایڈم بیجان میں کھڑا رہ گیا۔ وہ آخر کیا حکم دے رہی تھی؟

تالیہ انہی اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی سلاح دار دروازے کے قریب آئی اور اپنے مرمریں ہاتھ سے ایک سلاح تھامی۔ پھر قدرے برہمی سے ایڈم کو دیکھ کے اسی انجان زبان میں کچھ بولی جیسے اس کی سرزنش کر رہی ہو اور سنگین نتائج کی دھمکی دے رہی ہو۔

”مجھے کچھ کھانے کو ہی بھجوا دیں یا۔ وہ پنجرے والے کم از کم کھانا تو اچھا دیتے تھے۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔ تالیہ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور

پلٹ گئی۔ اس کی معیت میں سپاہی بھی مڑ گئے اور چند لمحوں میں وہ لوگ جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے۔

ایڈم سلاخوں کے قریب آیا اور آہستہ سے اپنا جوتا اس شے کے اوپر رکھا جوتا لیہ کے ہاتھوں سے پھسل کے نیچے جا گری تھی۔ وہ چند لمحے دم سادھے وہاں کھڑا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ دوسرے قیدی نڈھال سے واپس بیٹھ گئے ہیں اور پہریدار اس طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ دھیرے سے وہیں بیٹھتا گیا اور پھر آہستہ سے وہ شے اٹھائی۔

وہ ایک ننھا سا کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

ایڈم نے اسے کھولا اور مشعل کی پھڑ پھڑاتی روشنی میں غور سے پڑھا۔ اس پر انگریزی میں لکھا تھا۔

”مجھے پلان بنانے آتے ہیں، ایڈم مگر تمہیں صرف کتابیں پڑھنا آتی ہیں۔“

ایڈم نے پیغام کو ٹھٹی میں دبایا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔

(بچے تالیہ کے ہر پلان میں مجھ پہ طنز کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟)

☆☆=====☆☆

شام ڈھلتے ہی محل کی بیرونی دیوار پہ لگی قندیلیں روشن ہونے لگیں تو سارا محل دور سے جگمگاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

محل کے اندر بہت سے چوکور باغ تھے۔ ایسے ہی ایک باغ کے وسط میں تالاب بنا تھا جس کے اندر سنگ مرمر کا نیلا ہٹ مائل فرش بچھا تھا۔ دیواروں پہ جگمگاتی مشعلوں کے باعث تالاب کا پانی جھملا تا دکھائی دیتا تھا۔

تالاب کے زینوں پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پہ تھوڑی ٹکائے، آنکھیں بند کیے وہ مغموم سی بیٹھی نظر آتی تھی۔ یا شاید بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔

برآمدے سے شریفہ طشتری اٹھائے گزر رہی تھی۔ تالیہ کو بے خبر پا کے اس نے رفتار تیز کر دی۔

محل کے اندر دیواروں پہ جا بجا قندیلیں اور لالٹین لگے تھے۔ کہیں موم بتیوں کے اسٹینڈ تھے۔ چھتوں سے روشن فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ زرد روشنی ماحول کو مزید پرفسوں اور خوابناک بنا رہی تھی۔

شریفہ تیزی سے اوپر آئی اور شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کا دروازہ کھولا۔ پہریداروں کو وہ پہلے ہی بھیج چکی تھی۔

دروازہ بھیڑ کے وہ اندر آئی اور جلدی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اس میں بڑے بڑے دراز بنے تھے۔ وہ ایک ایک کو کھولنے لگی۔ شام میں اس نے دیکھا تھا کہ تالیہ نے اس کے آتے ہی کوئی شے جلدی سے گاؤتیکے کے پیچھے چھپائی تھی۔ وہ کوئی ریشمی گلابی رومال میں بندھی شے تھی جو شریفہ کے ذہن میں کھٹک گئی تھی۔

آخر شہزادی کا راز کیا تھا؟

اس نے بستر کے ساتھ رکھا صندوق کھولا اور چیزیں اوپر تلے کیں۔ کونے میں وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ گلابی ریشم میں لپیٹا ہوا کوئی بندل ہو جیسے۔ شریفہ مسکرائی اور اسے نکال کے چہرے کے سامنے لائی۔

یکدم کمرے میں جلتی قندیل بجھ گئی۔ ایک دم سارے میں اندھیرا چھا گیا۔ شریفہ چونک کے گھومی۔

کھڑکی کے پٹ اچانک سے کھل گئی تھے اور تیز ہوا کے باعث پردے اڑتے جا رہے تھے۔ آسمان پہ بادل گرج رہے تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی بھی چمکتی۔ ہوانے ہی قندیل بجھائی تھی۔

شریفہ قندیل آگے بڑھی، مگر اسی پل بجلی چمکی تو سامنے کوئی ہیولہ سا نظر آیا۔ وہ بالکل ساکت رہ گئی۔ اندھیرا دوبارہ چھا گیا۔
کنیز ریشمی رومال میں لپٹی شے سینے سے لگائے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ دل زور سے دھڑکا۔
”کل رات کیا ہوا تھا شریفہ؟“ بجلی دوبارہ چمکی تو پل بھر کو کمرہ روشن ہوا۔

کھڑکی کے سامنے وہ کھڑکی تھی۔ اس کے کھلے سنہری بال ہوا سے پیچھے کواڑ رہے تھے۔ آنکھیں شریفہ پہ جمی تھیں۔ اور آواز.... یہ وہ آواز نہیں تھی جس میں وہ دو دن سے اس سے بات کرتی آرہی تھی۔
یہ تو لگتا تھا جیسے کوئی اور عورت ہے۔

”کل رات تمہیں یاد ہے کیا ہوا تھا شریفہ؟“ نیم اندھیرے میں وہ سرخ لباس کو دونوں پہلوؤں سے اٹھائے قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔
شریفہ خوف سے پیچھے ہونے لگی۔

”تم رات کے دوسرے پہر کسی کھٹکے سے اٹھی تھیں۔ تم نے اپنے کمرے میں کوئی آہٹ سنی تھی۔ یاد ہے؟ تم نے ادھر ادھر دیکھا پھر بلی کی آواز آئی تو تم مطمئن ہو گئیں۔“ تالیہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ شریفہ پیچھے ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کی کمر دیوار سے ٹکرائی۔

”تم دوبارہ سو گئیں۔ پھر تم نے کوئی آہٹ نہیں سنی کیونکہ بلی کوئی آہٹ پیدا ہی نہیں کرتی۔ وہ دبے قدموں آتی ہے۔ سانس بھی نہیں لیتی۔ آہستہ آہستہ.... وہ تمہاری موجودگی میں....“ بجلی کڑکی تو کمرہ روشن ہوا اور کھلے بالوں والی حسین شہزادی نظر آئی۔ اس کی تیز نظریں اور وہ آنکھیں.... شریفہ کا خون منجمد ہونے لگا۔

”تمہاری موجودگی میں وہ تمہارے سارے سامان کی تلاشی لے لیتی ہے مگر سانس لینے کی آواز بھی نہیں نکالتی۔ اور اسی خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ مگر اس شے کے ساتھ۔“

”شہزادی“ میں آپ کے کمرے میں صرف صفائی کے لئے....“ اس نے کہنا چاہا، مگر پھر تالیہ کے الفاظ پہ چونکی۔ کرنٹ کھا کے اپنے ہاتھوں میں موجود شے کو دیکھا۔ ”جی؟“

”اے کھول کے تو دیکھو کہ یہ کیا ہے؟“

باہر وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ بارش کی بوندیں تیز تیز سنے لگی تھیں۔ ایسے میں شہزادی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی قندیل کے پاس رکی اور سلائی لگا کے اسے آنچ دکھائی۔ شعلہ سا بھڑکا اور سارا کمرہ روشن ہو گیا۔

شریفہ نے تیزی سے رومال اتارا۔ اندر چند کاغذ سیدھے رکھے تھے۔ وہ دراصل کاغذات کا ایک بندل تھا۔

شہزادی آگے بڑھی اور کھڑکی بند کر دی۔ پھر پردے جھٹکے سے برابر کیے۔ ہوا کا راستہ رک گیا۔ بارش کی تڑتڑاہٹ ختم ہو گئی۔ اب صرف زرد روشن کمرہ تھا اور شریفہ جو ان کاغذوں کو کھول کے دیکھ رہی تھی۔ پہلے صفحے پہ نگاہ دوڑائی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے یقینی سے چہرہ اٹھا کے تالیہ کو دیکھا جو گردن اٹھائے، شان سے مسکرا رہی تھی۔

”یہ تمہارے خطوط ہیں۔ جو تمہارے نام لکھے ہیں کسی نے۔ بھلا کس نے؟“ شہزادی نے لمحے بھر کو سوچا۔ ”سابق بندہ ہمارا کی فوج کے جرنیل بھوپال نے۔ وہ پہلے اسی محل میں رہتا تھا۔ تم سے محبت بھی کرتا تھا، مگر اب وہ تمہیں خط لکھ کے مراد راجہ کی فوج اور اس کے رازوں کے بارے میں سوال کرتا رہتا ہے۔ وہ مضرور ہے اور میرے باپا کے آدمی اس کی تلاش میں ساری سلطنت میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں لیکن اس کو ڈھونڈ نہیں پا رہے۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ وہ تم سے رابطے میں ہے؟“

خطوط شریفہ کے ہاتھ سے پھسل گئے۔ وہ ایک دم دوڑتی ہوئی آئی اور تالیہ بہت مراد کے قدموں میں گر گئی۔ ”شہزادی میری جان لے لیجئے، مگر خدا را میرا یقین کریں۔ میں نے اس کو کبھی کوئی راز نہیں بتایا۔“

تالیہ تیزی سے جھکی اور جھٹکے سے اسے کندھے سے دیوچ کر اوپر کھڑا کیا۔

”جان لے لوں گی تمہاری اگر تم دوبارہ میرے قدموں میں گریں۔ میرے سامنے ایک انسان کی طرح کھڑے ہو کے بات کیا کرو شریفہ! یوں جانوروں کی طرح قدموں میں نہ گرا کرو!“ وہ غصے سے غرائی تو شریفہ ہاتھ باندھے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ خوف اور گھبراہٹ سے سفید پڑ چکا تھا۔

”شہزادی.... میں قسم کھاتی ہوں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔“

”میں جانتی ہوں....“ تالیہ نے جھٹکے سے اسے چھوڑا اور گہری سانس بھری۔ ”جو خط تم نے اسے کل لکھا تھا اور ابھی بھیجا نہیں تھا، وہ میں نے پڑھ کے واپس رکھ دیا تھا۔ تم اسے کچھ نہیں بتاتیں۔ میں جانتی ہوں۔ کیونکہ تمہیں محل کا عیش و آرام پسند ہے۔ تم اس سے صرف محبت بھری باتیں کرنا چاہتی ہو مگر وہ صرف تم سے دفاعی حکمت عملی کے رازوں کے بارے میں جاننے کے لئے رابطہ رکھتا ہے۔ البتہ....“ وقفہ دیا.... ”کوئی صرف اس کے خط پڑھتے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ رازوں کی تجارت دو طرفہ ہے۔“

شریفہ نے گھبراہٹ کے نفی میں سر ہلایا۔ ”خدا را راجہ کو مت بتائیے گا۔ آپ جو کہیں گی میں کروں گی۔ خدا کے لئے شہزادی، مجھے معاف کر دیں۔ بدلے میں آپ مجھ سے جو چاہے کروالیں۔“

تالیہ نے نزاکت سے چہرے پہ آئی سنہری لٹ پیچھے کی۔ ”تمہاری باتیں مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔ مگر یہ تم دل سے نہیں کہہ رہیں۔ تم اندر ہی اندر یہ سوچ رہی ہو کہ صبح ہوتے ہی تم یہ خط میرے کمرے سے چرا لوگی اور دوبارہ سے میرے باپ کے ساتھ مل جاؤ گی۔ ہے نا؟“

”شہزادی، میں....“

”تمہیں کیا لگتا ہے بے وقوف‘ میں نہیں دیکھ رہی کہ تم کس کس وقت میرے باپا سے مل کے آتی ہو اور ان کو میری ہر بات کی خبر دیتی ہو؟“
 چھپ کے کسی کی نقل و حرکت پہ نظر رکھنے کے کام میں تم مجھ سے اچھی نہیں ہو سکتیں۔ تم ابھی تا شہ نہت مراد کو جانتی نہیں ہو۔“
 شریفہ نے خفت سے آنکھیں جھکا دیں۔ شہزادی آگے بڑھی اور نیچے گرا بنڈل اٹھایا، پھر واپس صندوق تک گئی اور اسے اندر ڈال کے بے نیازی سے دھلکن گرا دیا۔ پھر اسی شان سے واپس گھومی۔

”یہ خطاب اسی جگہ رہیں گے اور تم چاہو تو ان کو واپس چرا سکتی ہو، لیکن بات یہ ہے شریفہ کہ تا شہ نہت مراد سے کوئی کچھ بھی نہیں چرا سکتا۔ کیونکہ....“ وہ پلنگ تک آئی اور تکیے تلے سے ایک بنڈل نکالا۔ پھر اوپری کاغذ اٹھا کے شریفہ کے سامنے لہرایا۔
 ”کیونکہ تا شہ صرف شہزادی نہیں ہے۔ وہ ایک ساحرہ بھی ہے جسے دنیا کا ہر کام آتا ہے۔“

شریفہ نے چہرہ اٹھا کے اس کاغذ کو دیکھا اور جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی اس کی آنکھیں حیرت اور الجھن سے پھیلتی گئیں۔
 ”یہ اس جرنیل کا خط ہے شریفہ اور اس پہ اس کی مہر بھی لگی ہے اور اس میں وہ تمہاری راجہ مراد کے خلاف مدد پہ تمہارا شکر یہ ادا کر رہا ہے۔“

”یہ خط.... یہ خط تو میں نے کبھی نہیں پڑھا۔“

”درست۔ کیونکہ اس نے یہ خط تمہیں کبھی نہیں لکھا۔ یہ خط میں نے لکھا ہے۔ اس کی لکھائی میں۔ اس کی مہر لگا کے۔ چند منٹوں میں میں نے ایک پورا خط لکھ لیا۔ نقول تیار کرنا میرے اوپر بہت آسان ہے شریفہ۔“

کنیز نے حیرت، الجھن اور خوف سے اسے دیکھا۔ ہاتھ پھر سے جوڑ لئے۔ ”شہزادی میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔“
 ”جس دن یہ خط میرے صندوق سے غائب ہوئے نا اس دن میں اس طرح کے پچاس نئے خط بنا کے راجہ مراد کو دکھا دوں گی۔ جرنیل کی خفیہ مہر اور لکھائی وہ پہچانتے ہیں اور میں ان خطوط میں وہ وہ باتیں لکھوں گی کہ راجہ تمہاری گردن ایک لمحے میں اتار دے گا۔“
 کہہ کے اس نے جعلی خط زور سے بستر پہ پھینکے۔ شریفہ کو خوف سے جھنکا سا آیا۔

”میں تا شہ پیونا ہوں اور جو چیز ایک دفعہ دیکھ لوں وہ مجھے نہیں بھوتی۔ میرے دماغ سے تم ان خطوط کو....“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے کپٹی پہ انگلی سے دستک دی۔ ”کبھی نہیں چرا سکتی۔“

”شہزادی!“ شریفہ کی آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے چہرہ جھکا دیا۔

”میں آج سے آپ کی غلام ہوں۔ راجہ نے مجھے آپ کی جاسوسی کرنے کا کہا تھا اور میں یہ صرف اس لئے کر رہی تھی کیونکہ میں ان کی غلام تھی مگر آج سے مجھ پہ سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ میں آپ کے لئے وہ سب بھی کروں گی جو میں کسی اور کے لئے نہیں کرتی۔ بس مجھے معاف کر دیجئے شہزادی۔“ وہ دوبارہ جھکنے لگی مگر تالیہ کی تنبیہ یاد آگئی۔ سو ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔

تالیہ مسہری تک آئی ایک شان سے لباس پھیلا کے اس پہ بیٹھی اور ناگنگ پہ ناگنگ جمالی۔ پھر گالوں پہ جھومتی سنہری لٹ دوا انگلیوں کے

درمیان سے گزارتے ہوئے گویا ہوئی۔

”تم آج سے نہ صرف میری کینز ہو بلکہ تم اس محل میں میری آنکھیں اور میرے کان ہوگی۔ تم میرا ہر حکم بلاچوں چراں مانوگی۔ تم میرے لئے بروہ کام کرو گی جو میں تمہیں کہوں گی۔ اس کے بدلے میں میں تمہیں اچھا مال اور اچھی خوراک دوں گی۔ اور سب سے بڑھ کے میں تمہیں عزت دوں گی۔ میں تمہیں اپنے پیروں کو چاٹنے سے بچاؤں گی۔ میں تمہیں ایک انسان کی طرح رکھوں گی۔ لیکن جس دن تم نے مجھ سے غداری کی، اس روز.... میں.... تمہاری.... جان لے لوں گی۔“ آخری الفاظ چباچبا کے ادا کیے۔ اس کی آنکھیں شریفہ کے اندر تک اتر رہی تھیں۔ وہ فوراً سے بولی۔

”آپ مجھے ہمیشہ وفادار پائیں گی شہزادی۔ میں نے محل سے کوئی غداری نہیں کی، نہ کروں گی۔ آپ حکم دیجئے، میں آپ کے لئے کیا کروں؟“

”ہوں۔“ تالیہ نے ایک انگلی اپنے کان کے آویزے پر پھیرتے ہوئے سوچتی نظروں سے شریفہ کو دیکھا۔
 ”آج جب ہم بازار گئے تھے تو وہاں ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ وہ اور اس کے سامنے والی حویلی کی کس کی ہے؟“
 ”وہ؟“ شریفہ نے جلدی جلدی ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے اور بتانے لگی۔ وہ دونوں حویلیاں ابوالخیر کی ہیں۔ وہ ملاکہ کا سب سے بڑا تاجر ہے۔ بہت مال، میٹوں اور غلاموں والا۔“

”ہوں.... کس چیز کا تاجر ہے وہ؟“
 ”مچھلی، گوشت اور مصالحوں کا۔ وہ ہندوستانی تاجروں سے سخت خار کھاتا ہے اور ان کے مصالحے چرا لیتا ہے یا خراب کروا دیتا ہے اور اپنے مصالحے مہنگے دام بیچتا ہے۔ وہ رئیس ہے اور اس کے ہاں سلاطین، وزراء اور امراء کا روز کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ راجہ مراد کا خاص دوست ہے وہ۔“

”اور وہ لوگ جو عمارت تعمیر کر رہے تھے وہ کون تھے۔“
 ”وہ اس کے غلام ہیں۔ عام لوگوں کی طرح وہ منڈی سے غلام نہیں خریدتا بلکہ لوگوں کو اغوا کر کے زبردستی غلام بنالیتا ہے۔ پھر ان سے مفت میں کام کروا تا ہے۔ برسوں سے لوگ اس کے پاس یونہی قید ہیں مگر اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وہ ہر بندہ ہارا کا دوست جو ہوتا ہے۔“

”تو کیا سارے غلام ہمیشہ اس کے پاس قید رہتے ہیں؟“
 ”نہیں۔ وہ چند غلاموں کو جو کسی ہنر سے آراستہ ہوں اور دیکھنے میں تو مند اور مضبوط ہوں ان کو وہ الگ کر لیتا ہے۔“
 تالیہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ ”اچھا۔ اور ان کو وہ اچھی خوراک دیتا ہے نا؟ تاکہ وہ صحت مند لگیں؟“
 شریفہ نے سر ہلایا۔

”جی ہاں۔ وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، انہیں سارے ہنر سکھاتا ہے اور انہیں خوب تیار کر کے ہر تھوڑے عرصے بعد نیلامی میں بیچ دیتا ہے۔“

”نیلامی؟“ وہ چونکی۔ ”انسانوں کی نیلامی؟“ اس کا دل ڈوبا۔

”جی شہزادی۔ چین میں بھی تو ہوتی ہوں گی نیلامیاں۔“ اس کا انداز دفاعی مگر مغموں ہو گیا۔ ”بڑے بڑے امراء اور شہزادے ایسی نیلامیوں سے اپنے لئے خاص غلام خرید کرتے ہیں۔“ وہ رکی۔ ”کیا آپ اس کے پاس سے کسی غلام کو خریدنا چاہتی ہیں؟“

”جو میں چاہتی ہوں وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تم وہ نہ کر سکو، لیکن اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ کام تم کو ہی کرنا ہے۔ برصورت۔“ اس کے الفاظ سرد تھے اور سنگین بھی۔ دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔

دیوار پہ لگی قدیل بلکی سی پھڑ پھڑا رہی تھی۔ باہر تڑا تر بارش برے سے جاری تھی۔

☆☆=====☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے باورچی خانے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے۔ ان کے اندر فرش پہ بھوسے کے بستر تھے اور دروازوں کی جگہ پردے لہرا رہے تھے۔ ایسے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ چپت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ بازوؤں کا تکیہ بنا کے سر تلے رکھا تھا اور گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔

باہر بارش موسلا دھار برس رہی تھی۔ وقفے وقفے سے بجلی چمکتی اور اوپر لگے روشن دان سے اندر آ کے سارا کمرہ روشن کر دیتی۔ روشن دان چندفٹ ہی اونچا تھا۔ اور شیشے کا بنا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔

یکدم پردہ ہلکا سا سر کا اور ننھی سی آریا نہ اندر داخل ہوئی۔ کھلے بالوں پہ سفید ہینر بینڈ لگائے، سفید فراق پہنے وہ آہستہ سے ایک دیوار سے جا لگی اور اداسی سے اسے دیکھنے لگی۔

”ڈیڈ!“

”ہوں۔“ وہ چھت کو تکتے ہوئے بڑبڑایا۔

”آپ دکھی ہیں نا؟ ہونا بھی چاہیے۔ آخر آپ ایک قیدی ہیں۔ وقت کے قیدی۔ اس گندے میلے احاطے میں پھنسنے قیدی، جہاں کوئی کبھی بھی آپ کو زخمی کر سکتا ہے۔ مار بھی سکتا ہے۔ جہاں یہ آپ سے جانوروں کی طرح کام کرواتے ہیں۔ آپ کو اب اس زندگی اور خدا سے مایوس ہو جانا چاہیے۔“ وہ دھیرے دھیرے اس کو تلخ حقیقت سے روشناس کروا رہی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے میں جب لاء پڑھ رہا تھا تو میں کیا بننا چاہتا تھا؟“ وہ چھت کو دیکھتے ہوئے بولا تو وہ چڑسی گئی۔

”آپ کو اپنی قسمت کو کونسا چاہیے؟ آپ کو رونا چاہیے۔ آپ کو اچھی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔“

”میں شیف بننا چاہتا تھا۔“ وہ چھت کو دیکھ کے مسکرایا۔ ”مجھے کھانے سے محبت تھی۔ سلاد کے پتوں کا رنگ۔ آگ پہ پیاز بھوننے کی

خوشبو... اسٹیک کے پکنے کی آوازیں۔ لمبی کے دانوں کی ساخت.... مجھے کھانے سے محبت تھی آریانہ۔ اور مجھے کچن کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کے سبزیاں کاٹنے میں جو مزا آتا تھا وہ اور کسی چیز میں نہیں آتا تھا۔ مگر میں اتنا مصروف ہوتا تھا کہ کچھ نہیں بنا پاتا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے یاد کر کے کہہ رہا تھا۔ چہرے پہ زخم کے نشان ابھی تک نظر آرہے تھے۔ شیونازہ کی تھی مگر لیڈ سے چند خراشیں پڑ گئی تھیں۔

”ڈیڈ... اس مایوسی اور بددلی کو دیکھیں جو آپ کے ارد گرد پھیلی ہے۔ یہ کچرا... یہ انسانوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرنا.... ڈیڈ...“ اس کا دماغ، آریانہ کے روپ میں اس کو یاد کروا رہا تھا کہ اسے دنیا کے دوسرے اکثر لوگوں کی طرح صرف برا ہی سوچنا ہے مگر وہ اپنے دل سے کچھ اور کہے جا رہا تھا۔

”شادی کے بعد ویسے ہی عصرہ کھانا بناتی تھی۔ پھر میں سیاست میں آ گیا۔ امریکہ میں جب میں اسٹیٹ انارنی کا الیکشن لڑنے نکلا تو میرے ساتھ پی آر کے لوگ ہوتے تھے بروقت۔ اور جب میں مشہور ہوتا گیا تو میرا اسٹاف بڑھتا گیا۔ لوگ میری ہر حرکت پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں ملائیشیا واپس آیا تو میرا نام مزید بڑھ گیا۔ پرائیویسی ختم ہو گئی۔ ملازم، کنسلٹنٹ، کمپنیں اسٹاف۔ ہاؤس مین۔ بروقت کوئی ساتھ چپکا ہوتا تھا۔ سیاست، ٹی وی شوز، پبلک appearances، میرا ایک بزنس فیس تھا۔ مجھے اپنے امیج کے مطابق کام کرنا تھا۔ میں کرتا رہا۔“

بارش کی بوندیں گرتی رہیں، بجلی چمکتی رہی اور وہ بولتا رہا۔ آریانہ ساتھ ہی کچھ کہہ رہی تھی مگر وہ اسے نہیں سن رہا تھا۔

”بروقت میڈیا، رپورٹرز، مخالف سیاستدان، میری اپنی پارٹی کے لوگ اور میرا خاندان، میرے فینز میری ہر حرکت کو جج کر رہے ہوتے تھے۔ اور جب میں تنہا ہوتا تو بھی اتنا مصروف ہوتا کہ کچن میں قدم تک نہ رکھ پاتا۔ مگر وہ شوق کبھی ختم نہیں ہوا۔ میں قید تھا۔ مجبور یوں، اور کاموں میں۔ مگر اب... اب میں آزاد ہوں۔“

”آپ قید ہیں، ڈیڈ!“ وہ روہا سی ہوئی۔ ”ہر چیز میں مثبت پہلو دیکھنا چھوڑ دیں، ڈیڈ۔“

”نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ پہلی دفعہ میں آزاد ہوا ہوں، آریانہ۔“ اس نے نظروں کا زادیہ موڑا اور مسکرا کے دیوار سے لگی پریشان اور ڈری ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ ”مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا۔ کوئی میرا اسکیمنڈل نہیں بنائے گا۔ کوئی مجھے جج نہیں کرے گا۔ میں کبھی اتنا آزاد نہیں ہوا۔ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مجھے اس ملک کو نہیں چلانا۔ مجھے کوئی پارٹی نہیں چلانی۔ دیکھو ارد گرد.... یہاں کوئی مجھ میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ مجھے کسی کے سامنے اپنا بزنس فیس قائم نہیں رکھنا۔ میں آزاد ہوں۔ اور میں اس باورچی خانے میں کھانا پکا سکتا ہوں۔“

”آپ پھنس چکے ہیں۔ آپ مظلوم ہیں۔ آپ وکٹم ہیں۔ آپ....“

”میں مظلوم نہیں ہوں۔ میں نے اپنی مرضی سے وہ دروازہ پار کیا تھا۔ یہ میری چوائس تھی۔ اور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں یہاں خوش ہوں۔ نہیں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں مشکل وقت میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے نہیں بیٹھوں گا۔ میں اس سے کچھ سیکھ کے ہی نکلوں گا۔ تمہارے باپ نے آج تک ہمت نہیں ہاری۔ give up نہیں کیا۔ تو اب وہ کیوں ہمت ہارے گا۔ نکل تو میں آؤں گا اس سے۔ مگر مجھے اس قید کو

بھی ایک تجربے جیسا سمجھنا ہے جو مجھے کچھ سکھائے۔ مجھے اس سے بہتر انسان بن کے نکلنا ہے۔ زیادہ آزاد۔“
 ”آپ کو ڈرنا چاہیے کہ یہ جنگلی لوگ آپ کو مار نہ دیں۔“

”مرنا کیا ہوتا ہے آریا نہ؟“ اس نے گہری سانس لی اور بازوؤں کا تکیہ سر تلے رکھے دوبارہ سے اوپر دیکھنے لگا۔ ”ایک دنیا سے دوسری میں چلے جانا اور جب آپ ایک نئی دنیا میں چلے جاتے ہو تو پچھلی کے فائدے نقصان بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر مار بھی دیں تو کیا ہوگا؟ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت بھی صرف ایک تجربہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں دنیا سے جانے سے پہلے وہاں کتنی اچھائی اور positivity پھیلا کے جاتا ہوں۔ جب انسان کو یہ ایمان آ جاتا ہے نا تو وہ موت سے نہیں ڈرتا۔“

اس نے پھر سے دیوار کو دیکھا تو اب آریا نہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اپنے تمام تر واہموں اور غدشات سمیت غائب ہو چکی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔ اس کی مثبت سوچ نے اندر سر اٹھاتے منفی پن کو شکست دے دی تھی۔
 گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بارش اب ہلکی ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

صبح کا سورج ابھی پوری طرح قدیم ملا کہ پہ طلع نہیں ہوا تھا۔ نارنجی لکیریں جامنی آسمان پہ بکھری تھیں جب سپاہی ان تین قیدیوں کو اپنے زنگے میں لئے محل کے سبزہ زار پہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ زنجیروں میں بندھے تھے اور وہ جھکے سروں کے ساتھ قطار میں چل رہے تھے۔

ایڈم سب سے پیچھے تھا اور اس کا چہرہ سب سے زیادہ لٹکا ہوا تھا۔

(جب ہم واپس جائیں گے تو ان شاء اللہ چے تالیہ کے خلاف عدالت میں گواہی دیں اور ان کو جیل بھجوانے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔) وہ بار بار زنجیر میں مقید ہاتھ شیو پہ پھیر کے تہیہ کرتا تھا۔

سپاہی ان کو لئے گھوڑوں کے اصطل تک آگئے۔ تلوار کی نوک سے ایک سپاہی نے پہلے قیدی کو اصطل کے اندر دھکیلا۔ وہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا۔ وہاں موجود مستعد کھڑے سپاہی نے کندھے سے پکڑ کے قیدی کا جائزہ لیا، پھر اس کو گھما پھر کے دیکھا، پھر اس کی زنجیر کھول دی اور اسے کوئی پر مشقت کام سمجھانے لگا۔ قیدی مرے مرے انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر اس نے جھک کے کدال اٹھائی۔ سپاہی اس کو عرب سے ہدایات دیتا ایک طرف لے گیا۔

تو یہ تھی ان کی سزا۔

برقیدی کو مشقت کرنی تھی۔ ایڈم بن محمد کا دل مزید بچھ گیا۔

دیگر سپاہی ان دونوں کو لئے آگے بڑھ گئے۔ محل کی عقبی طرف ایک جگہ بہت سے جنگی آلات رکھے تھے اور منہ اندھیرے ہی شاہی غلام ان کو بنانے اور ان کی صفائی پہ جت جاتے تھے۔ بھٹی جل رہی تھی اور لوہے کو اندر دھکایا جا رہا تھا۔ وہاں موجود سپاہیوں نے دوسرے قیدی کو

ہاتھوں ہاتھ لیا اور فافٹ کام پہ لگا دیا۔

اب وہ ایڈم کو لئے مزید آگے آئے۔ وہ گرم صم سان کے ساتھ چلتا آیا۔

(چپے تالیہ پہ ملائیشیاء کے آئین کے مطابق چوری اور دھوکہ دہی کے ساتھ ساتھ معصوم شہریوں کو اغوا کر کے جس بے جا میں رکھنے اور ان سے مشقت کروانے کا مقدمہ بھی بنتا ہے۔) لب کاٹتے وہ سوچ رہا تھا۔

آسمان کی رنگت بلکی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اسے لئے محل کی عمارت کے ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ بہت سے دروازوں پہ پہریدار کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔ پھر ایک اونچے اور بھاری لکڑی کے دروازے کے سامنے رکے۔ ایڈم ذرا ٹھٹھک کے آہستہ ہوا۔

وہاں شریفہ اور ایک دوسری کنیز کے ہمراہ... وہ کھڑی تھی۔

تاج سر پہ سجائے بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے تھی۔ سر پہ کپڑا تھا جو تاج سے نکلتا ہوا کمر تک گر رہا تھا۔ نیچے اس نے گہرا نیلا اور سنہری لباس پہن رکھا تھا۔ ایڈم کو دیکھ کے شان سے مسکرائی تھی۔

”میری کیا سزا تجویز کی ہے چپے تالیہ آپ نے؟“ وہ اسے دیکھتے ہی خفگی سے بولا۔ کسی کو اس کے الفاظ سمجھ میں نہ آئے تھے نہ کسی نے توجہ دی۔ بس پہریداروں نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔ اور خود دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ شہزادی کے سامنے کھڑا اپنی سزا کا منتظر تھا۔

”جیسے میں نے آپ سے گیلری میں بدتمیزی نہیں کی تھی، مگر آپ نے وہاں بھی خوب واویلا مچایا تھا ویسے ہی میں نے آپ سے اب بھی بدتمیزی نہیں کی تھی، لیکن پھر بھی آپ نے مجھے گرفتار کروا دیا اور...“ وہ غصے سے بولنے لگا مگر شہزادی تاشہ نے ہاتھ اٹھا کے نزاکت سے اشارہ کیا تو پہریداروں نے جھٹ اس دروازے کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیے۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایڈم نے چونک کے دیکھا۔

اندر ایک طویل سا ہال تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ وہاں قطار در قطار لکڑی کے ریکس لگے تھے جن پہ ترتیب سے کتابیں جچی تھیں۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔

”یہ شاہی لائبریری ہے ایڈم۔“ وہ اس کو دیکھ کے مدھم آواز میں بولی۔ (پہریدار اور کنیزیں اس کو اجنبی زبان میں بات کرتے دیکھ کے بھی خاموش رہے۔ جب شہزادی کچھ بول رہی ہو تو وہ گونگے بہرے بن جاتے تھے) ”اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اس کی تمام کتابوں کو نئی جلدیں عطا کرو گے۔ یعنی جلد بھی بناؤ گے اور اس کو چپکاؤ گے بھی۔ یوں تم ساری کتابیں پڑھ بھی لو گے جو کہ قدیم طے میں لکھی ہیں۔ ہمارے اسکولز میں کلاسیکل طے کی چند کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ تم نے بھی پڑھی ہوں گی۔ تم ذہین ہو، رسم الخط سے واقف ہو۔ چند دنوں میں الفاظ اور زبان پہ عبور حاصل کر لو گے۔ کرنا بھی چاہیے کیونکہ جب تک تم زبان نہیں سیکھو گے، ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ اس لئے جب تالیہ کہے کہ اس کے پاس پلان ہے تو اس پہ بھروسہ کیا کرو کیونکہ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔ چہرہ سنجیدہ تھا اور وہ ہکا بکا سن رہا تھا۔

پھر وہ کنیزوں اور غلاموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تمہاری شہزادی کو سات زبانیں آتی ہیں۔ یہ قیدی چینی زبان بولتا ہے اور یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی فضول گوئی نہیں سمجھ سکوں گی۔ ہونہ۔“ غرور سے کہہ کے لباس پہلوؤں سے اٹھائے آگے بڑھ گئی۔ کنیزوں اور غلاموں کی گردنیں فخر سے اٹھ سی گئیں اور وہ اس کے پیچھے ہو گئے۔ دوسرے سپاہی ایڈم کو لئے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ابھی تک ادھ کھلے منہ کے ساتھ بار بار گردن موڑ کے شہزادی کو دیکھتا تھا۔

اندر کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ایک دیوار سے دوسری تک۔ قطار در قطار ریکس۔ علم کے خزانے۔ قدیم کتابیں۔ ان کی خوشبو۔ مدھم جلتی روشنیاں۔ لکھائی کے لئے بنی میزیں۔ ان پر رکھی سیاہی کی ڈیاں۔ پرندوں کے پروں والے قلم۔ وہ مسحور سا گول گھوم گھوم کے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

سپاہی اب درشتی سے اس کو کام سمجھانے لگا۔ جلد کیسے بنانی ہے اور کیسے کتاب پہ لگانی ہے۔ ایڈم نے بالآخر گہری سانس لی۔
(چلو... اغوا اور جس بے جا کی دفعات میں اپنے مقدمے سے نکال دوں گا۔)
اس نے رحم دلی سے تالیہ کے بہت سے گناہ معاف کیے اور سپاہیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔
اس کی مشقت سب سے دلچسپ تھی۔

☆☆=====☆☆

ابوالخیر کی حویلی پہ وہ رات جب گہری ہونے لگی تو اس کی ساری کھڑکیوں کی روشنیاں دھیرے دھیرے گل ہوتی گئیں۔ ایسے میں باورچی خانے میں ہنوز لالٹین جل رہا تھا۔ سفید مونچھوں والا باورچی آستین چڑھائے ڈوٹی ہاتھ میں پکڑے تند ہی سے ایک کم عمر لڑکے کو جھڑک رہا تھا جو سر جھکائے، مٹھیوں سے آٹے نما کوئی شے گوندھ رہا تھا۔ ادھر اس کا ہاتھ درست طریقے سے نہ مڑتا، ادھر باورچی ڈوٹی کھینچ کے اس کے کندھے پہ مارتا۔

وان فاتح ٹوکری پہلو پہ اٹھائے باورچی خانے میں داخل ہوا تو مچھلیوں کی بو بھی ساتھ ہی اندر آئی۔ ٹوکری کٹی ہوئی صاف مچھلیوں سے بھری تھی جسے اس نے میز پہ لا دھرا اور پھر ناگواری سے باورچی کو دیکھا جو اس لڑکے کو کوستے ہوئے ڈانٹ مار کے کام کروا رہا تھا۔ لڑکے کے آنسو بہہ رہے تھے اور شانے سے خون بھی رس رہا تھا۔ فاتح خاموش کھڑا اسے گھورتا رہا۔

باہر سے کسی نے آواز دی تو باورچی برے منہ بنائے باہر نکل گیا۔ لڑکے نے بھیگا چہرہ اٹھا کے گلہ آمیز نظروں سے فاتح کو دیکھا۔
”غصے والی شکل کیوں بنا رہے ہو اگر میری مدد نہیں کر سکتے تو؟“ اس کو جیسے اس ٹوٹنے کا دکھ تھا۔ الفاظ نہ سمجھ آئے ہوں انداز بتاتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”مجھے اس پہ نہیں تم پہ غصہ ہے۔ اگر کوئی تمہیں مار رہا ہے اور تم اس کا ہاتھ خود نہیں پکڑ سکتے تو کوئی تمہیں اس کے ظلم سے نہیں بچا سکتا۔ جب تک تم اپنے لئے نہیں لڑو گے، کوئی تمہارے لئے نہیں لڑ سکتا۔“

لڑکے کو البتہ سمجھ نہ آئی تھی۔ بس خفگی سے آنسو پونچھتا پھر سے آنا گوندھنے لگا۔

فاتح اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ رات سیاہ پڑ رہی تھی اور دھیرے دھیرے ساری حویلی نیند کی آغوش میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ البتہ بھوسے کے بستر پہ چپت لینا کافی دیر بس چھت کو دیکھتا رہا۔ ذہن میں وہ آریا نہ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ دوسرا پہر گزرنے لگا جب ایک دم اسے لگا اوپر روشن دان سے کوئی سانپ گرا ہے۔ وہ کرنٹ کھا کے اٹھا اور چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر اندھیرے میں آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے دیکھا۔

وہ سانپ نہیں تھا۔ وہ روشن دان سے لٹکی رہی تھی۔ وان فاتح کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔

ری سے اوپر چڑھنا قطعاً مشکل نہ تھا۔ چند منٹ میں وہ روشن دان سے نکل کے اوپر آگیا جہاں چھت کا شیڈ بنا تھا۔ طویل شیڈ جو مڑوٹی تھا اور اوپر عمارت کے مینار تک جاتا تھا۔ ری وہاں چمنی سے بندھی تھی۔ اور چمنی کے پاس... وہ آرام دہ سی بیٹھی تھی۔

فاتح احتیاط سے اوپر چڑھتا اس تک آیا۔ پھر گردن گھما کے دیکھا۔ پہریدار بہت نیچے تھے۔ وہ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

تالیہ نے شاہی لباس کی بجائے سادہ کھلا سیاہ پاجامہ اور سیاہ لمبی قمیص پہن رکھی تھی۔ آلتی پالتی کر کے بیٹھی وہ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے بس سادگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب فاتح نے قدم روکے۔

”شہزادی!“ سر کو خم دیا۔

وہ اٹھی نہیں۔ بس سر کو جنبش دی۔ ”تو انکو!“

(جگہ مڑوٹی تھی۔ ذرا ہلتی تو نیچے پھسل سکتی تھی۔)

فاتح نے ادھر ادھر دیکھا۔

”تم یہاں کیسے آئیں؟“

تالیہ گردن اٹھا کے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتی مسکرائی۔

”جو مجھے آتا ہے، وہ میری جان بچا سکتا ہے۔ اور مجھے دو ہی کام آتے ہیں۔ ملی کی طرح دیواریں پھاند کے دوسروں کے گھروں میں داخل ہو جانا اور کسی بھی آرٹ ورک کی ہو بہو نقالی کر لینا۔ ان کاموں نے مجھے ایک کنیز کی وفاداری خرید دی اور وہ مجھے یہاں تک لے آئی۔“

فاتح احتیاط سے اس کے ساتھ بیٹھا۔ ”تو کیا تم واقعی شہزادی تاشہ ہو؟“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”جی ہاں۔ وہ تاشہ جس کا ذکر آپ کتابوں میں پڑھتے تھے وہ میں ہی ہوں۔ وہ تمام کام جو اس نے کیے تھے وہ

میں اب کروں گی۔ ماضی نہیں بدل سکتا۔ ہم دراصل تاریخ کو بدل نہیں رہے۔ بلکہ ہم اس وقت تاریخ میں موجود ہیں اور ہم تاریخ کو بنا

رہے ہیں۔“

”تم نے بنگارا یا ملا یو پر بھی ہے؟“

وہ دونوں مخروطی چھت پہ بیٹھے تھے اور ان کو سامنے دور دور تک ملا کہ کاقدیم شہر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

”نہیں، تو انکو۔“ اس نے فاتح کو دیکھ کے کہا۔ دونوں نے چہرہ ایک دوسرے کی طرف موڑ رکھا تھا۔ ”میں نے صرف شہزادی تاشہ کا نام

سنا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس نے کون سے کارنامے انجام دیے تھے۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں نے بنگارا یا ملا یو پر بھی ہے۔“

تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔

”تو مجھے بتائیے کہ میں یہاں کون سے بڑے کام کرنے جا رہی ہوں۔“ وہ بے چینی سے پوچھنے لگی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر مسکرا

کے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ کتاب تمہارے بارے میں لکھی گئی تھی مگر اس میں ان عظیم کاموں کا ذکر بھی ہے جو میں نہیں جانتا تم کر سکتی ہو یا نہیں۔ اس لئے میں

تمہیں ان کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ تم اپنی فری ول کو استعمال کر کے اپنی مرضی سے جو کرنا ہے کرو۔ یا تو وہ کتاب جھوٹی تھی یا تم واقعی

اتنی ہی عظیم ہو جتنا کہ اس میں لکھا تھا...“ اس نے گہری سانس لی۔ ”خیر... ایڈم کو تم اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہو گئیں۔“

وہ جوانہاک سے سن رہی تھی اس کے بات بدل دینے پہ بد مزہ ہوئی۔ ذرا سے شانے اچکائے۔ ”ہاں وہ محل میں پورے عیش و آرام

سے رہا ہے۔ درجنوں غلام اس کی خدمت پہ مامور ہیں۔ تجھے سو کتابیں اس کو مطالعے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ تین وقت کا کھانا شاہی

باورچی خانے سے آتا ہے اس کا۔ اور کیا چاہیے اس کو۔“

”مطلب تم نے اس کو شاہی لائبریری میں قید با مشقت پہ رکھ دیا ہے۔“

”اب یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے تو انکو۔ چونکہ میری نظر مثبت ہے تو میرے خیال میں وہ بڑے آرام سے ہے۔“ مزے سے بولی اور

مسکراہٹ دبائی۔ فاتح بھی مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

سلطنت ملا کہ کاقدیم چاند آسمان پہ تیر رہا تھا اور ایسے میں وہ دونوں اس مخروطی شہ پہ بیٹھے اطراف سے بے خبر نظر آتے تھے۔

”تم کیسی ہو؟“ فاتح نے دھیرے سے پوچھا۔

”میرے پاس پلان ہے، تو انکو۔ راجہ مراد مجھے چابی نہیں دیں گے اس لئے میں ایڈم کو زبان سکھا رہی ہوں تاکہ وہ میرے ساتھ رہ سکے

۔ آپ کو بھی میں آپ کے مالک سے خرید کے محل میں لے جاؤں گی۔ پھر ہم اس چابی کو مل کے تلاش کریں گے اور...“

”میں پوچھ رہا ہوں“ تم“ کیسی ہو تالیہ؟“ وہ نرمی سے بولا تو تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”میں؟“ وہ گم صم ہوئی۔

”اپنے باپا سے اتنے عرصے بعد ملی ہو۔ اپنے ملک واپس آئی ہو۔ خوش ہو؟“

وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ ”یہ میرا ملک نہیں ہے۔ یہ میرے لوگ نہیں ہیں۔ میرا ملک صرف ملائیشیا ہے۔ 2016ء کا ملائیشیا اور مجھے اس میں واپس جانا ہے۔“

”اور تمہارے باپ؟“

”مجھے ان سے کوئی اپنائیت، کوئی محبت محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ میری فیملی صرف داتن ہے۔ اور کوئی نہیں۔“ وہ ادا اس ہوئی۔ چہرہ موڑ لیا۔ اب وہ دور اندھیرے میں ڈوبے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ تو تم محسوس کر رہی ہو۔ راجہ مراد کیسا محسوس کرتا ہے؟“

”پتہ نہیں۔ میرا نہیں خیال ان کو مجھ میں کوئی دلچسپی ہے۔ انہوں نے پہلے ہی دن میرے پیچھے ایک کنیز کو لگا دیا۔“

”یا شاید تم فرض کر چکی ہو کہ تمہیں کوئی بھی انسان اپنی فیملی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے تم اپنی اصل فیملی سے مل کے بھی پر امید نہیں ہو۔ تم اپنی عزت نہیں کرتیں، تالیہ۔“

اس نے شا کی نظریں فاتح کی طرف موڑیں۔ ”میں سترہ سال بعد ان سے مل رہی ہوں مگر ان کے انداز میں کوئی محبت، کوئی والہانہ پن نہ تھا۔“

”تم اس سے سترہ سال بعد مل رہی ہو، وہ تمہیں پانچ دن بعد مل رہا ہے۔ پانچ دن صرف تم اس سے دور رہی ہو۔ ظاہر ہے وہ نارمل ہو گا۔“

”کیا آریا نہ کوکھونے کے پانچویں دن آپ نارمل تھے؟“ الفاظ تھے کہ کیا... فاتح ایک دم خاموش ہو گیا۔

”کیا اگر پانچویں دن اس چیئر لفٹ ٹریک پہ آپ جاتے اور وہ آپ کو مل جاتی تو کیا آپ اس سے محبت کا اظہار کرنے میں سرد مہری یا کنجوسی سے کام لیتے۔“

”میرا کیس مختلف ہے۔ میں اکیسویں صدی کا باپ ہوں۔ پہلے زمانے میں لوگ اتنے expressive نہیں تھے۔ باپ عموماً سخت گیر ہوتے تھے۔“

”ہاں!“ اس نے گہری سانس بھر کے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہماری دنیا اور اس دنیا میں بہت فرق ہے۔ اور اپنی دنیا میں واپس جانے کے لئے ہمیں راجہ مراد سے لڑنا پڑے گا۔“

”تم اپنے باپ کو اپنا دشمن کیوں سمجھتی ہو؟“

”کیونکہ وہ کوئی ہیرو نہیں ہیں۔ وہ خطرناک ہیں۔ قاتل ہیں۔ ظالم ہیں۔ انہوں نے اپنے لوگوں سے وعدہ کیا تھا، ان کی بھلائی کا وعدہ اور پھر انہوں نے اپنا ضمیر بیچ کے اس وعدے کو بھلا دیا اور ایک طاقت ور عہدہ حاصل کر لیا۔ ایسے شخص کو کیا کہتے ہیں تو انکو؟“

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”سیاست دان۔“

وہ لمحے بھر کو کچھ بول نہ پائی۔ ”میرے بابا... ایک ظالم، خطرناک...“

”سیاستدان ہیں۔ تمہارے بابا صرف ایک سیاستدان ہیں۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ تھل سے کہہ رہا تھا۔ ”سیاستدان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی جنگ، کسی لڑائی، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمہیں سوائے ایک چیز کے۔“

”کیا؟“

”The art of Politics“

تالیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”جو ہماری دنیا کے سیاستدان کرتے ہیں؟ ملک کا پیسہ چور کرنا، لوگوں سے وعدے کر کے ووٹ لینا، اور پھر ان کو بھلا دینا، طاقت کا غلط استعمال کرنا... یہ سب چیزیں اس پندرہویں صدی کے ملاکہ میں فٹ نہیں ہوتیں۔“

”اوہ تالیہ!“ وہ پیچھے ہوا اور بازوؤں کا تکیہ بنا کے نیم دراز انداز میں مخروطی شیڈ سے ٹیک لگالی۔ تالیہ کو گردن موڑ کے اسے دیکھنا پڑا۔ وہ اوپر آسمان پہ نظر آتے تاروں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

”یہ تو برے سیاستدان کرتے ہیں۔ میں تمہیں برا بننے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم راجہ مراد سے چابی حاصل کر سکتی ہو اگر تم اس کو اسی کے انداز سے ہینڈل کرو۔“

”اور ان کا انداز جانتے ہیں آپ؟ کل ایک آدمی کی گردن اڑادی صرف عوام کو پیغام دینے کے لئے کہ ملک میں نیا بندہ ہارا آگیا ہے۔“

”ملک میں نئی شہزادی بھی تو آئی ہے۔ کیا شہزادی نے چند لوگ گرفتار کرنے کے علاوہ لوگوں کوئی پیغام دیا؟“

”میں طاقت کا اظہار کرنے کے لئے لوگوں کی گردنیں نہیں مار سکتی۔“

”گردنیں مارنا طاقت کے اظہار کا واحد طریقہ نہیں ہوتا۔ وہ برا ہے، تم اچھی ہو۔ تم اپنے طریقے سے اپنی طاقت کا اظہار کرو۔ طاقت کوئی ہموار زمین نہیں ہوتی۔ یا تو یہ اوپر جا رہی ہوتی ہے یا نیچے۔ تمہیں اس کو بڑھانا ہوگا۔“

”مگر کس طرح؟“ وہ الجھن سے بولی۔ پھر چونکی۔ ”آپ نے بنگارایا ملا یو پڑھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کچھ ایسا کیا؟ کہ شہزادی تاشہ نے محل میں آتے ہی طاقت کا اظہار کیا تھا؟ کیا کیا تھا میں نے؟“ وہ بے چین ہو گئی۔

”کیا تھا نہیں... کروگی۔ اب تم جو کروگی وہ تاریخ بنے گا۔ اور ابھی وہ کتابوں میں بھی لکھا جائے گا۔ وہی جو میں نے پڑھا ہے یا تو وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ تم حقیقت میں کیا کرتی ہو۔ ہو سکتا ہے مورخین نے کتابوں میں سچ نہ لکھا ہو۔“

اس نے بدولی سے ابرو بھینچے۔ ”یعنی آپ نہیں چاہتے کہ میں ”اپنی“ ہی نقل کر لوں۔“

”جو تم سمجھو۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر میں وہی کروں گی جو مجھے درست لگے گا۔ لیکن مجھے صرف ایک بات بتادیں۔ شہزادی تاشہ کا انجام کیا ہوا تھا؟ عصرہ کہتی تھیں اس کا انجام ٹریجک تھا۔ میں نے نہیں پڑھ رکھا۔ آپ نے تو پڑھا ہے نا۔“

وہ چند تائیے کو اسے دیکھتا رہا، پھر گہری سانس لی۔ ”کیا تمہارے باپا کے پاس چابی موجود ہے یا اس کوئی بنانی پڑے گی؟“ وہ بات ٹال گیا تھا۔ تالیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔ مت بتائیں۔ وقت خود ہی سب ظاہر کر دے گا۔“ پھر اس کا چہرہ دیکھ کے عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”آپ کو کسی چیز سے خوف کیوں نہیں آتا؟ کبھی مایوس کیوں نہیں ہوتے آپ؟“

وہ جو گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھا تھا اس بات پہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”میں نے زندگی میں بہت سی جنگیں لڑی ہیں۔ مجھے بھی سیٹ بیک ملتے ہیں مگر میں ایک دن کی بری باتوں کو صرف اس دن تک خود پہ طاری رکھتا ہوں۔ اگلی صبح میں نئی امید اور فریش ذہن کے ساتھ اٹھتا ہوں اور اپنے مقصد پہ فوکس کرتا ہوں۔“

”سب آپ جیسے نہیں بن سکتے۔“

”ظاہر ہے سب میرے جیسے نہیں بن سکتے۔ آسان تھوڑی ہے میرے جیسا بننا۔“

تالیہ اداسی سے مسکرا دی۔ پھر گردن گھما کے نیچے پھیلے احاطے کو دیکھا۔ یہاں سے احاطے کی صرف چار دیواری نظر آتی تھی۔ تبھی وہ پہریداروں کی نظروں سے محفوظ تھے۔

”میں اب چلتی ہوں۔ آپ نیچے اتر جائیں اور آرام کریں۔“

”اپنا خیال رکھنا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے سچ سچ قدم اٹھاتے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر لباس میں چھپایا ہوا نکالا۔ گیلا ہوا اب سوکھ چکا تھا اور اس میں وان فاتح کے آئی ڈی کارڈ، کریڈٹ کارڈ، رقم اور پاپ کارن کے ٹکڑے اسی طرح رکھے تھے۔ وہ ہوا واپس کرنے آئی تھی مگر نہیں کر سکی۔ نہ جانے کیوں۔

چند ساعتوں بعد محل کے سبزہ زار پہ وہ خاموشی سے شریفہ کے ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں نے چغے پہن رکھے تھے اور ٹوپیاں سروں پہ گرا رکھی تھیں۔ لاہری کے سامنے وہ رکی اور چغے کی ٹوپی پیچھے گرائی تو پہریدار اسے دیکھ کے چونکے۔ پھر ادب سے پیچھے ہٹ گئے۔

اندر فرش پہ کتابیں پھیلائے، چمڑے کو کاٹا ہوا ایڈم بیٹھا تھا۔ چراغ اور قدیلیں روشن تھیں۔ وہ گال تلے ہاتھ رکھے ایک کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ ایک کتاب کی جلد چپکا کے اسے سوکھنے کے لئے سامنے رکھا تھا۔

آہٹ پہ وہ ہڑبڑا کے سیدھا ہوا۔ پھر جلدی سے سیدھا کھڑا ہوا۔

چغے والی شہزادی قریب آ رہی تھی۔ ساتھ کوئی نہ تھا۔

”آپ کو معلوم ہے چے تالیہ.... اسکول میں ہمیں قدیم طے میں لکھی چند کتابیں پڑھانی گئی تھیں۔ قدیم طے بھی قدیم انگریزی کی طرح ہے۔“ وہ کتاب ہاتھ میں لئے جوش سے بتانے لگا۔ تھکا ہوا لنگ رہا تھا مگر جوش قابل دید تھا۔ ”Chaucer کی کینز بری ٹیلر چودھویں صدی میں لکھی گئی تھی اور پہلی نظر میں اس کی انگریزی بالکل سمجھ نہیں آتی مگر غور سے پڑھو تو زبان وہی ہے، صرف تلفظ اور ہجے مختلف ہیں۔ یہ

قدیم ملے کی کتابیں میں تھوڑی بہت سمجھ سکتا ہوں کیونکہ صرف الفاظ کے سبب زیادہ ہیں اور یہ لوگ ان کو مختلف طریقے سے ادا کرتے ہیں ورنہ زبان تقریباً وہی ہے۔“

”تم نے بنگارا یا ملا یورپی ہے؟ شہزادی تاشہ کی داستان؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”نہیں تو... کبھی دل ہی نہیں چاہا۔“

”یعنی تمہیں نہیں معلوم کہ شہزادی تاشہ نے کون کون سے کارنامے سرانجام دیے تھے؟“

”نہیں بچے تالیہ۔ مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔“ پہلے وہ الجھا۔ پھر چونکا۔ ”اوہ میں سمجھ گیا۔ آپ بردفعہ کی طرح اس

امتحان میں بھی چیننگ کر کے پاس ہونا چاہتی ہیں؟ نا۔ آپ اس کتاب سے اسٹڈیاز چرانا چاہتی ہیں۔ صحیح کہتے ہیں پور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“

”پور ہیرا پھیری سے جائے یا نہ جائے یہ قیدی ضرور اپنے سر سے جائے گا۔“ دانت جما کے سر دلچھے میں بولی تو ایڈم کامنہ بن گیا۔

”میں ملائیشیا کا ایک قانون پسند شہری ہوں۔ آپ جو سارا دن میرے اوپر ظلم ڈھاتی ہیں ان کا حساب آپ کو ایک دن دینا ہوگا۔“

”کام پہ دھیان دو اور زیادہ دماغ خرچ مت کرو۔ کہیں ختم ہی نہ ہو جائے۔“ اور پھر ایک برہم سا ہونہہ کر کے وہ پلٹ گئی۔

وہ ماتھے پہ لکیریں ڈالے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

”اگر بے جا گمان کرنا گناہ نہ ہوتا تو میں ضرور سوچتا کہ کہیں بچے تالیہ نے اصلی شہزادی تاشہ کو قید کر کے اس کی جگہ تو نہیں لے لی۔ ویسے

ملائیشیا کے قانون کے مطابق کسی دوسرے کی شناخت اپنا لینے پہ کون سی دفعہ لگتی ہے؟“

وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس بیٹھا اور چمڑے کا کلڑا اٹھالیا۔ ابھی اسے کافی سارا کام کرنا تھا۔

☆☆=====☆☆

صبح کی سفیدی محل کے میناروں سے ٹکرائی تو جامنی آسمان پہ تیرتے بادلوں کے تاریخی کنارے غائب ہونے لگے یہاں تک کہ دو دھیا

پن سارے پہ چھا گیا اور آسمان خوب روشن ہو گیا۔

شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں سنگھار میز کے سامنے کرسی پہ وہ بیٹھی تھی اور ٹیک لگائے بے نیاز مغرور نظروں سے آئینے میں خود کو دیکھ

رہی تھی۔ پیچھے کھڑی شریفہ اس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھی دانت کا بنا کنگھا پھیر رہی تھی۔

ایک بازو اس نے پھیلا رکھا تھا جس میں ایک دوسری کینز سونے کے کنگن چڑھا رہی تھی۔

”راجہ نے کہا ہے کہ شاہی اتالیق کو بلوایا جائے۔ وہ آپ کو مختلف فنون اور آداب کی تربیت دیں گے۔ اس کے علاوہ...“

تالیہ نے ابرو اٹھا کے برہمی سے عکس میں اپنے پیچھے کھڑے اسے دیکھا۔

”تاشہ کو سب آتا ہے۔ اسے کچھ بھی نیا سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر شہزادی میری عرض سنئے۔ شہزادیوں کو شاہی آداب سیکھنے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔“

”میں پہلے ہی بہت باادب اور سلیقہ مند ہوں۔ راجہ سے کہو میری فکر نہ کیا کریں۔“
شریفہ خاموش ہو گئی۔

تبھی دروازے پہ دستک ہوئی اور ایک تائی ثیان ہاتھ باندھے اندر داخل ہوا۔

”شہزادی یان سوفو آپ سے ملنے آئی ہیں۔“

تالیہ چونکی۔ فوراً شریفہ کو دیکھا۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کا سنگھار مکمل ہو چکا تھا، لبوں پہ لپ اسٹک بھی لگی تھی اور آنکھوں میں کاجل بھی۔ مگر بال بنانے ابھی رہتے تھے۔

”شہزادی کو انتظار کرواؤ۔ مجھے ابھی دیر ہے۔“ بے نیازی سے بولی اور واپس پیچھے ہو کے بیٹھ گئی۔ آئینے میں وہ اپنی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جن میں یان سوفو کے ذکر کے بعد سے پیش سی بھر گئی تھی۔

وہ ظالم شہزادی جس نے اور سو نگائی کے لوگوں پہ ظلم ڈھایا تھا... اور نہ جانے کتنے لوگوں کو قید میں ڈالا تھا... جس کی حد سے بڑھی حرکتوں پہ بھی سلطان اس ٹوکنا نہ تھا کیونکہ وہ چین کے بادشاہ کی بیٹی تھی اور سلطان کی محبوب منگیترا... جس سے چند دن بعد سلطان کی شادی ہونا تھی... وہ اس وقت ملا کہ کی سب سے طاقتور عورت تھی۔ سوائے راجہ مراد کے اس کے مقابلے پہ کوئی نہ تھا۔

اس کی سازشیں وجہ بنی تھیں کہ تالیہ کا اور سو نگائی اجڑ گیا اور وہ وقت کا دروازہ پار کر گئی۔

اور آج وہ اس شہزادی سے ملنے جا رہی تھی۔

تالیہ نے آج گلابی زرتار لباس پہنا تھا۔ بالکل شاکنگ پنک۔ لہنگا ساقدموں کے نیچے سے فرش پہ جھاڑ دیتا تھا اور قمیض گھٹنوں تک آتی تھی۔ دونوں کہنیوں پہ ریشمی دوپٹہ پیچھے سے ڈال رکھا تھا جو لباس کے ساتھ ہی فرش کو چھوتا تھا۔ سنہری بال آدھے باندھے، وہ بالوں پہ تاج پہنے، باہر محل کے سبز ہزار کی روش پہ چلتی آرہی تھی۔ دونوں کنیریں اور خادم ایک قدم پیچھے تھے۔

باغ میں ایک جگہ چھوٹے چھوٹے درخت لگے تھے۔ ان کے ساتھ شہزادی یان سوفو کھڑی تھی۔ اس نے چینی طرز کی لمبی میکی پہن رکھی تھی اور بالوں کے جوڑے میں لمبی اسٹک انکی نظر آتی تھی۔ سیاہ بالوں والی دراز قد اور پرکشش شہزادی مسکرا کے دور سے اس کو آتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو کنیریں اور خادم کھڑے تھے وہ سب بھی چینی تھے۔

گلابی لباس والی تاشہ دونوں پہلوؤں سے لباس اٹھائے، قریب آئی تو اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

”شہزادی۔“ اس نے سر جھکا کے آداب کہا تو یان سوفو نے جواباً اپنا سر بھی جھکایا۔ ”شہزادی!“ پھر مسکرا کے اسے دیکھنے لگی۔

”ماشاء اللہ۔ راجہ مراد کی بیٹی تو میری سوچ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آپ کو اس محل میں دیکھ کے بہت خوشی ہوئی شہزادی تاشہ۔ مگر اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ تین ماہ سے ہم ملا کہ میں رہ رہے ہیں، مگر کسی نے ہم سے ذکر تک نہ کیا کہ سلطان کے چھوٹے زاد راجہ مراد کی کوئی بیٹی

چین میں بھی رہتی تھی۔ ویسے چین کے کس شہر میں اتنے سال گزارے آپ نے؟“ تالیہ جبراً مسکرائی۔
 ”کسی ایک شہر میں گزارے ہوں تو بتاتی۔ اتنے شہروں میں رہی ہوں کہ مجھے تو سارا چین اپنا ہی لگتا ہے۔“
 یان سوفو کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔

”آپ کی بہن کی گمشدگی کا سن کے افسوس ہوا۔ کیا تالیہ ابھی تک نہیں ملی؟“

”ناشہ اور میں نے تالیہ کا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ضرور مل جائے گی۔“

آواز پہ وہ چونک کے بے اختیار گھومی۔ راجہ مرادوش پہ چلتا آرہا تھا۔ ہاتھ کمر پہ باندھ رکھے تھے اور سپاٹ چہرے پہ سردی مسکراہٹ تھی۔
 کندھوں پہ پہنی پوشاک قدموں تک آرہی تھی۔

تالیہ کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے ہوئے۔ وہ اس کے ساتھ آکھڑا ہوا تو اسے مضبوط سہارے کا سا احساس ہوا۔ نہ جانے کیوں۔
 ”راجہ! آپ کو دیکھ کے اچھا لگا۔ کیا آپ نے میرا کام کر دیا؟ پوچھتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا، آپ کو زحمت بھی بہت دے رہی ہوں،
 مگر کام ضروری تھا۔“ یان سوفو نرمی اور خفیت سے بولی تھی۔ وہ خفیت مصنوعی تھی یا شاید اس کا انداز ایسا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے شہزادی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ جو سامان آپ کو درکار تھا وہ میں نے آپ کے محل بھجوا دیا ہے اور
 ہاں... آپ کا چور بھی پکڑا گیا ہے۔“

”آپ کا بہت شکریہ راجہ!“ وہ ممنون ہوئی۔ پھر تالیہ کا چہرہ دیکھا جو باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”میرے محل سے چھوڑا سا سونا چوری ہوا تھا۔ راجہ نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے سپاہی چور کا سراغ لگالیں گے۔ میرا ہی ایک ملے غلام تھا جو
 بھاگا ہوا تھا۔ اور بالآخر راجہ نے اس کو ڈھونڈ ہی نکالا۔“

تالیہ نے محض سر ہلا دیا۔ اس کے اعصاب تن رہے تھے۔ شہزادی اب پھر سے راجہ کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ شہد سے بیٹھے لہجے، ممنون
 چہرے۔ کیا یہ دونوں دشمن نہیں تھے؟

”یہ رہا آپ کا مجرم!“ چند سپاہی دور ایک شخص کو رسیوں میں باندھ لے کر جاتے نظر آ رہے تھے۔ غالباً وہ راجہ کے ساتھ ہی آئے تھے
 ۔ راجہ نے اشارہ کیا تو وہ اس شخص کو وہیں لے آئے۔ اس کی آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی اور ہاتھ پیر بھی زنجیر پا تھے۔

یان سوفو نے ایک محظوظ نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اب سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”اس کی پٹی کھولو۔ میں چاہتی ہوں کہ سزا کے وقت یہ میری آنکھوں میں دیکھے۔“

”آپ اس کو ابھی سزا دینا چاہتی ہیں۔“ راجہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

یان سوفو نے چمک کے اسے دیکھا۔ ”کیا آپ نہ دیتے؟“

”میرا مطلب تھا اس جگہ؟ باغ میں؟ خیر!“ راجہ خاموش ہو گیا۔ سپاہیوں نے قیدی کی پٹی کھول دی۔ اس نے شہزادی کو دیکھا اور

نظریں خفت سے جھکا لیں۔ تالیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔

شہزادی نے ایک ہاتھ پھیلا یا تو ایک سپاہی نے اس پہ تلوار رکھی۔ دوسرے سپاہی نے قیدی کا دایاں ہاتھ رسی سے نکال کے زور زبردستی سے سامنے کیا۔ تالیہ کا سانس ٹھم گیا۔

(یہ آدمی چور نہیں ہے۔ اگر چور ہوتا تو منت سماجت کرتا۔ یہ تو سزا کے لئے تیار ہے۔) اس نے چونک کے راجہ مراد کو دیکھا جو کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا، سنجیدگی اور خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ (یہ آدمی باپا نے پکڑا ہے۔ اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ باپا نے اصل چور کو بچانے کے لئے اس کو سامنے کر دیا ہے۔) ایک سنسنی خیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی گئی۔

”اسلام میں جو چور کی سزا ہے وہی میں، شہزادی یاں سوفو، تمہیں دیتی ہوں۔“ کہہ کے شہزادی نے مہارت سے تلوار بلند کی۔ چور نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ تلوار نیچے آئی اور اس کا ہاتھ کلائی سے کاٹ کے نیچے گرا گئی۔ خون کے چھینٹے سیدھے تالیہ کے اوپر آتے مگر وہ تیزی سے پیچھے ہو گئی۔ بے اختیار اس نے باپ کی کہنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آدمی درد سے چلا رہا تھا۔ بازو سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

یاں سوفو نے تلوار واپس تھما دی اور مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ لوگ سپاہی کو لئے واپس مڑ گئے۔ اس کا خون یہاں وہاں گھاس پہ گرتا جا رہا تھا۔

”شکر یہ بند اہارا۔ مجھے امید ہے آئندہ بھی آپ میرے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے میری مدد کرتے رہیں گے۔“

یہ کہہ کے شہزادی مڑ گئی۔ اس کا عملہ بھی ساتھ ہی پلٹ گیا۔ اور سبک رفتاری سے وہ روش پہ آگے بڑھتے گئے۔ تالیہ اسی طرح سن کھڑی تھی۔ مراد کی کہنی سے آستین اس نے سختی سے بھیج رکھی تھی۔ آنکھیں دور جاتی یاں سوفو پہ جمی تھیں۔ ”باپا۔“ لب پھڑ پھڑائے۔ مراد نے گردن موڑ کے غور سے اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔

”شریفہ کہہ رہی تھی کہ آپ میرے لئے شاہی اتالیق بھجوانا چاہتے ہیں جو مجھے شاہی آداب کی تربیت دے۔“ اس کی آواز میں

کپکپاہٹ تھی اور نظریں وہیں جمی تھیں۔ ”آپ کل صبح اس کو میرے پاس بھجوا دیں۔ میں شہزادیوں کی طرح رہنا سیکھنا چاہتی ہوں۔“ راجہ مراد ہلکا سا مسکرایا۔ ایک ہاتھ سے تالیہ کا کندھا زرا دبایا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی بھنجی مٹھی سے اس کی کہنی پھسل گئی۔ مٹھی خالی رہ گئی۔ اور دور اسی نکتے پہ جمی نظریں ویسے ہی خالی تھیں۔

☆☆=====☆☆

قدیم کتب خانے میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ کونے میں زمین پہ دوزانو بیٹھا ایڈم ایک چوکی پہ کاغذ پھیلائے، سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کے لکھ رہا تھا۔ چراغ چوکی پہ رکھا تھا اور اس کی پھڑ پھڑاتی زرد روشنی صفحات کو روشن کیے ہوئے تھی۔

(میرا نام ایڈم بن محمد ہے اور میں ہمیشہ سے ایک مستقبل کے خوف کا شکار انسان رہا ہوں۔) کوہ قدیم جاوی رسم الخط میں لکھ رہا تھا....

(میں اپنے اتوار، سوموار کے آنے کے خوف میں ضائع کر دینے والا انسان ہوں۔ میں ہمیشہ کل کیا ہوگا اور میں یہ کیسے کروں گا سوچنے والا انسان ہوں۔)

ابوالخیر کی حویلی کی رسوائی میں کھڑا بوڑھا باورچی سینوں پہ گوشت کے ٹکڑے پرورہا تھا اور ساتھ کھڑے فاتح کو سمجھا رہا تھا۔ وہ پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے غور سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہا تھا۔

(مستقبل کے خوف کے ساتھ ناکامی کا خوف بھی میرے اوپر ہمیشہ طاری رہا ہے۔ میں زندگی کا ہر باب شروع کرنے سے قبل یہ سوچتا ہوں کہ کیا کروں جو ہمارے بچ جاؤں؟)

محل کے برآمدے میں اتالیق چند خادموں کے ہمراہ کھڑا تھا اور انگلیوں پہ لمحے شمار کر رہا تھا۔ جبکہ تالیہ سر پہ سیبوں کا تھال رکھے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سیدھی لکیر میں۔ چند قدم اٹھائے ہی تھے کہ تو اذن بگڑا۔ سارے سیب نیچے آگرے۔

(مگر وہ فاتح کہتے ہیں کہ زندگی ان پہ مہربان ہوتی ہے جو یہ سوچ کے نئے باب شروع کرتے ہیں کہ ہمیں جیتنا کیسے ہے؟) فاتح چولہے پہ چڑھے برتن میں بوتل سے مائع انڈیل رہا تھا.... آگ نے مائع کو چھوڑا اور شعلہ سا بھڑکا۔ اس کے ہاتھ کو آگ کی لپٹ نے چھو اور وہ کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹا.... جملن کا شدید احساس....

(میں ان ساری کتابی باتوں کو مانتا ہوں کہ ہاں، ہمیں ہمیشہ مثبت ہی سوچنا چاہیے وغیرہ وغیرہ مگر میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ مثبت سوچنے کا آغاز کیسے کیا جائے۔)

چھوٹی میز کے گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ درمیان میں بڑے پیالے میں پانی رکھا تھا۔ اتالیق غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بار بار پانی میں ہاتھ مارتی تھی۔ پانی اچھل کے باہر آگرتا۔ وہ بے بسی سے اس کو دیکھتی اور کندھے اچکاتی۔ (اس کا کیا فائدہ استاد؟)

(میں بھی فاتح صاحب جیسا مثبت آدمی بننا چاہتا ہوں مگر میں کہاں سے شروع کروں؟) فاتح جلے ہاتھ کے ساتھ گوندھے میدے کو تیل رہا تھا۔ روٹی بار بار ٹوٹ جاتی۔ وہ ضبط کر کے پھر سے شروع کرتا۔ پھر ایک دم اس نے روٹی اکٹھی کر کے مٹھی میں بھینچی اور دیوار پہ دے ماری۔ پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ چند لمحے گزرے اور اس نے گہری سانسیں لے کر خود کو نارمل کیا اور دوبارہ سے پیڑے نکالنے لگا۔

(اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پہلے میں اپنے اندر کے منفی بن کو نکالنے کی سعی کروں؟ مجھے سب سے پہلے کون سی چیز منفی روئل کی طرف دھکیلتی ہے؟ لوگوں کی باتیں۔ غصہ دلاتی، خوف دلاتی باتیں۔)

وہ مسہری پہ بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں ریشمی کپڑا تھا جس پہ سوئی سے وہ کچھ کاڑھ رہی تھی۔ اتالیق اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا کمر پہ ہاتھ باندھے جھک کے ناکا دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا تو تالیہ نے غصے سے کپڑا گول مول کر کے واپس پھینک دیا۔ اتالیق آگے بڑھا، جھک کے کپڑا اٹھایا اور ادب سے واپس شہزادی کو لادیا۔ تالیہ نے روہانسی ہو کے اسے دیکھا اور تھام لیا۔

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان جلد باز بنایا گیا ہے۔ یعنی جلد رد عمل دے دینے والا۔ اس کا مطلب ہے ہم انسانوں کو اپنے اندر فیڈ اس پروگرام کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں ذرا ذرا سی بات پہ رد عمل دینے سے خود کھڑکنا ہوگا۔)

وہ رسوئی میں کھڑا تھا۔ اور سامنے ڈھیروں پیالیاں رکھی تھیں۔ وہ چائے دان کو ہوا میں کٹی فٹ بلند کیے پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ قبوے کی دھاری نیچے آتی اور ایک ایک کپ کو بھرنے لگتی۔ جہاں اسکا ہاتھ ڈھیلا ہوتا اور قبوہ باہر چھلکتا، وہیں ایک ہٹا کٹا پہریدار زور سے چھڑی اس کی کمر پہ مارتا۔ وہ مضبوط سے لمحے بھر کو آنکھیں میچتا، پھر دوبارہ سے گہری سانس لے کر چائے انڈیلتا....

(میں نے یہ سیکھا ہے کہ جب تک میں برائے کی بر بات کو دل سے لگاتا رہوں گا، تب تک میں اذیت میں رہوں گا۔ کسی دوسرے انسان کو صرف الفاظ سے میرا سکون چھیننے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔)

وہ گاؤں کے سہارے بیٹھی تھی اور ہاتھوں میں ستارا اٹھا رکھا تھا۔ اس کی مختلف تاروں کو چھیڑتی وہ اسے بجانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتالیق کھڑا افسوس سے نفی میں سر ہلارہا تھا۔ وہ دانت کچکا کے مزید تیز تیز انگلیاں تاروں پہ رگڑنے لگی۔ انگلیوں کے پوروں سے خون نکلنے لگا۔

(اصل طاقت تو ٹخنڈے رہنے میں ہے۔ اصل طاقت ور لوگ وہی ہیں جو لوگوں کی برائے پہ یقین نہیں کر لیتے بلکہ اکثر باتوں کو درگزر کر جاتے ہیں اور ان کو بے جا سوچتے نہیں رہتے۔)

دو چولہوں پہ کڑا ہیاں رکھی تھیں۔ وہ بیک وقت تیزی سے دونوں ہاتھوں سے ان میں چیزیں الٹ رہا تھا۔ پھر کڑا ہی کے ہینڈل کو پکڑ کے اٹھا کے سبزیوں کو الٹا پلٹا۔ انداز میں مہارت اور چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ دور بیٹھے بوڑھے باورچی نے محض نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرا کے جھک کے اپنا کام کرنے لگا۔

(اگر دوسروں کے مونہوں سے نکلے الفاظ ہمیں کنٹرول کرنے لگ جائیں تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم نے اپنی پوری ذات کا کنٹرول دوسروں کے ہاتھوں میں دے رکھا ہے۔ نہیں۔ اگر مجھے مثبت انسان بننا ہے تو مجھے پہلے قدم کے طور پہ اپنے ”موڈ“ کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں واپس لینا ہوگا۔)

وہ سر پہ ایک کتاب کے اوپر سیدر کھے سفید چاک کی کھینچی لائن پہ سیدھ میں چل رہی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اب پیر نہیں رہا تھا۔ وہ بالکل سیدھی چل رہی تھی۔

(میں بطور انسان کے اکیلا ہی اس دنیا میں آیا تھا اور اکیلا ہی جاؤں گا۔ میرے دوست اور میرے گھر والے بھی بروقت میری پسند کی بات نہیں کہہ سکتے۔ میں دن میں بہت دفعہ بہت سی باتوں پہ دھی ہوں گا اور اس دکھ سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟)

ابوالخیر کی طویل ڈائننگ ٹیبل سجی تھی۔ اوپر فانوس جل رہا تھا۔ سربراہی کرسی پہ ابوالخیر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کھڑا غلام چائے دان سے اس کی ننھی پیالی میں سرعت سے قبوہ انڈیل رہا تھا۔ دھار برابر تھی۔ ایک قطرہ بھی باہر نہیں چھلکا تھا۔

(ثبت سوچ! مجھے یہ مثبت سوچ رکھنی ہے کہ جو میری بات یہ شخص میرے بارے میں منہ سے نکال رہا ہے، یہ اس کی رائے ہے اور جیسے اس کی زندگی کے بارے میں بہت سی دوسری آراء غلط ہو سکتی ہیں ویسے ہی یہ بھی غلط ہے۔)

تالیہ اور اتالیق لکڑی کی میز کے دونوں سروں پہ بیٹھے تھے۔ اس نے زور سے پانی کے پیالے پہ ہاتھ مارا۔ پانی چھلکا۔ اتالیق نے دوبارہ کرنے کو کہا۔ اس نے دوبارہ سیدھا ہاتھ مارا مگر اتالیق نے جلدی سے پیالہ ہٹالیا۔ اس کا ہاتھ میز پہ پوری قوت سے لگا۔ لکڑی کی میز تڑاخ سے تین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ تالیہ کی آنکھیں حیرت اور استعجاب سے پھیل گئیں۔

(اور کسی کی غلط آراء کے پیچھے صرف بے وقوف لوگ اپنا سوڈ خراب کرتے ہیں۔)

اس کے سامنے tapestry رکھی تھی اور وہ کھڑے کھڑے اس پہ مہارت سے سوئی سے نائکے کاڑھے جارہی تھی۔ ایک پورٹریٹ سا نقش ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا کے رفتار تیز کیے گئی۔

(میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح مجھے وان فاتح کی طرح ہمیشہ جیت کا سوچنا ہے یا مستقبل کے خوف سے نکل آنا ہے۔ میں واقعی نہیں جانتا مگر میرے خیال میں زندگی کو جتنا اب تک میں سمجھا ہوں، اگر میں مثبت انسان بنا چاہتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے اپنے موڈ، اپنی مسکراہٹوں اور اپنے آنسوؤں کا اختیار دوسروں کی زبانوں سے واپس لینا ہوگا۔)

وہ سلائیوں کو ہاتھ میں پکڑے، باغیچے میں کرسی پہ بیٹھی، تیزی سے اون کے دھاگے کو بنے جارہی تھی۔ الٹا، سیدھا، اون کے گھر، برشے اس کی انگلیوں پہ بہت آسان ہوتی جارہی تھی۔

(جب تک میں برآمدی کی رائے پہ دھی ہوتا رہوں گلیا جواب میں اس پہ غصہ کرتا رہوں گا میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔)

وہ چمچے کی مدد سے بھنی ہوئی بوٹیاں اٹھاٹھا کے طشتری میں رکھ رہا تھا۔ سارے باورچی خانے میں باربی کیو کا دھواں اور مہک پھیلی تھی۔ باورچی نے کلبی کے ایک ٹکڑے کو منہ میں رکھا تو اس کے تاثرات خوشگوار ہو گئے لیکن پھر چہرہ بخیدہ بنائے آگے بڑھ گیا۔

(میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بڑا آدمی کون ہوتا ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہے مجھے کہ سارے بڑے آدمی مثبت سوچ والے لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ایک بات مجھے اچھے سے معلوم ہو گئی ہے۔)

اتالیق کتاب اٹھائے اس سے کچھ پوچھ رہا تھا اور وہ سامنے کرسی پہ مودب بیٹھی، کتاب کو دیکھے بغیر مسکرا کے لفظ بہ لفظ سب سنائے جا رہی تھی۔

(انسان کو چھوٹا اس کی سوچ بتاتی ہے۔ بڑی سوچ، اچھی سوچ اسے آزاد کرتی ہے۔)

وہ چہرہ ہاتھ میں لئے لکڑی کے تختے پہ کٹ کھٹ سرخ بری سبزیاں کاٹ رہا تھا۔

(اگر میں اپنی سوچ کو آزاد کرنا سیکھ جاؤں، اور میں اپنے برقم کے خوف سے خود کو نکال لوں، تو میں اتنا ہی ٹھنڈا اور آزاد انسان بن جاؤں گا جتنا فاتح صاحب ہیں۔ جتنے سارے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں میں ابھی سارے گرنہیں سیکھ پایا لیکن تھوڑی بہت زندگی کی حقیقت

مجھے معلوم ہونے لگی ہے۔)

تالیہ تیر کمان کوتا نے فضا میں نشا نہ باندھے زور سے کمان کھینچ رہی تھی۔ تیر فضا میں اڑتا ہوا سیدھا ایک پرندے کے اندر پیوست ہو گیا۔ اس نے مسکرا کے کمان نیچے کی۔ پرندہ گھاکل ہو کے سیدھا نیچے آن گرا۔

(اور جو میں معلوم ہوتا ہے وہ ہماری جان ہمیشہ بچاتا رہے گا)

ایڈم نے سیاہی میں ڈوبا قلم پرے رکھا اور اس مسکراہٹ سے کانڈاٹھا کے دیکھا۔ اس پہ سیاہی ابھی گیلی تھی۔ اس نے کانڈا کا کنارہ چراغ کے شعلے پہ سلگایا۔ آگ نے کانڈا کو پکڑ لیا اور وہ پھیلنے لگی۔ وہ اپنے الفاظ کو جلتے ہوئے دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اس کے الفاظ را کھ کا ڈھیر بن گئے۔ قدیم ملے میں لکھے خوبصورت، پختہ الفاظ۔

☆☆=====☆☆

(چار ہفتے بعد)

اس صبح سورج نکلتے ہی بادل ایسے چھائے کہ آسمان پھر سے سیاہ پڑنے لگا۔ سارے پہ چھاتا سی تن گئی اور ٹپ ٹپ بارش برسنے لگی۔ محل کے کتب خانے کی کھڑکی کے ساتھ کرسی میز پہ بیٹھے ایڈم نے کتاب سے سراٹھا کے کھڑکی کے شیشے سے تڑتڑکراتی بوندوں کو دیکھا اور پھر چہرہ موڑا۔ مناسب خوراک اور صاف لباس کے باعث وہ نارمل لگ رہا تھا۔

”کیا میں اب شہزادی تاشہ سے مل سکتا ہوں؟ چار ہفتے سے میں قید ہوں اور شہزادی اول روز کے بعد دوبارہ مجھ سے نہیں ملیں۔“ انداز شکایتی تھا مگر لہجہ صاف تھا۔

پیچھے کھڑے پیریڈار سپاہی نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی۔

”شہزادی آج کل اتالیق کے ساتھ مصروف ہوتی ہیں۔ اور وہ بروقت قیدیوں سے ملاقات نہیں کرتیں۔ اس لئے اپنے کام سے کام رکھو۔“

ایڈم نے گہری سانس لے کر چہرہ واپس کتاب پہ جھکا دیا۔ اس کے ساتھ کے دونوں قیدیوں کو شہزادی کے فرمان کے مطابق رہا کر دیا گیا تھا۔ ایک وہ ہی رہ گیا تھا۔ مگر اس دوران وہ قدیم ملے بول، سمجھ اور لکھ لیتا تھا۔ وہ جدید ملے سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ پھر بہت سی کتابیں یہاں دستیاب تھیں اور کتابیں پڑھنے میں وہ ہمیشہ سے اچھا رہا تھا۔

کتب خانے سے دور محل کے ایک اونچے مینار میں بنی کھڑکی شہزادی تاشہ کی خواب گاہ میں کھلتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کھڑکی پہ بھی بوندیں تڑتڑکرتی رہتی تھیں۔

اندر پلنگ پہ ٹیک لگائے تالیہ بیٹھی تھی۔ ریشمی لحاف سینے تک ڈالے، وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ بال کھلے تھے اور ہاتھوں میں کوئی

کتاب پکڑ رکھی تھی۔ بار بار جمائی روکتی تھی۔ قریب شریفہ ہاتھ باندھے کھڑی تیار ہی تھی۔

”سلطان مرسل کو پیغام بھجوایا تھا کہ آپ ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ پچھلے چار ہفتوں میں کئی بار پیغام پہنچا چکے ہیں ہم مگر ملکہ یاں سوفو منع کروادیتی ہیں۔ آپ اپنے باپا سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ سلطان سے آپ کی ملاقات کروادیں۔“ (یاں سوفو کی سلطان سے شادی ہو چکی تھی اور اب وہ ملکہ بن کے سلطنت محل میں منتقل ہو چکی تھی۔ تالیہ شادی پہ نہیں گئی تھی۔ ابھی وہ اتنے سارے لوگوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔)

”رہنے دو۔“ کتاب پڑھتے پڑھتے تالیہ نے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ ”باپا کو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کافی دن سے سلطان سے ملنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ملکہ اس کے قاصد کو سلطان تک پہنچنے سے قبل ہی واپس موڑ دیتی تھی۔

”آپ اتالیق کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے سوا سارا دن اس کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں شہزادی؟ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کیونکہ اتنے پر تعیش کمرے اور ہر طرح کی اچھی خوراک کے باوجود بھی آپ اداس نظر آتی ہیں۔“

تالیہ نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ (کیونکہ یہاں زندگی بہت آسان ہے۔ یہ دنیا بہت مختلف ہے۔ یہاں کھانے کو بہت کچھ ہے۔ تلے ہوئے، بھنے ہوئے گوشت سے بھر پور کھانے۔ اتنی کیلوریز۔ اور پھر یہاں میں میلوں جا گنگ نہیں کر سکتی۔ یہاں جم نہیں ہے۔ یہاں پارٹیز نہیں ہیں۔ یہاں سوئمنگ نہیں کی جاسکتی۔ صرف ایک چیز ہے۔ نارگٹ۔ راجہ کی دسترس سے وہ چابی چرائی ہے مجھے۔ سارے پلان اسی کے گرد گھومتے ہیں۔)

سو جتنی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔ پھر احساس ہوا شریفہ کچھ کہہ رہی ہے وہ چونکی۔ ”کیا؟“

”آپ کو ابوالخیر کی حویلی میں دلچسپی تھی ناشہزادی۔ آج شام ابوالخیر نے راجہ مراد کو اپنے ہاں دعوت پہ مدعو کیا ہے۔ سلطان مرسل اور ملکہ بھی وہاں ہوں گے۔“

”اچھا۔ واقعی۔“ وہ کتاب پرے پھینک کے ایک دم سیدھی ہوئی۔

(”کھانے کی دعوت ہے؟ جانے کھانا کون بنا رہا ہوگا۔“) دل اس خیال پہ زور سے دھڑکا۔ چہرہ تہمتا اٹھا۔ ”تم میرا بہترین لباس اور زیور تیار کرو۔“

”آپ... آپ بھی جائیں گی دعوت میں؟“

”ناشہ کو کوئی روک کے دکھا سکتا ہے کیا؟!“ وہ شریفہ کو دیکھ کے مسکرائی تھی۔

☆☆=====☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے احاطے میں بنی جیل شام ڈھلتے ہی بھرنے لگی تھی۔ قیدی غلاموں کو واپس لا کے اس میں بھرا جا رہا تھا۔ سارے دن کی مشقت کے بعد تھکے ہارے قیدی اندر آ کے نڈھال سے ادھر ادھر لڑھکنے لگے تھے۔

ایسے میں صرف وہی غلام باہر تھے جو احاطے کے دوسرے کاموں پہ مامور تھے یا جن کو حویلی کے اندر خدمت پہ رکھ لیا گیا تھا، جیسے فاتح رامنزل جو باورچی خانے میں کام کر رہا تھا۔

وہ سر جھکائے کھڑا مچھلی کے قتلے بنانا نظر آتا تھا۔ ماتھے پہ مقامی لوگوں کی طرح پٹی باندھ رکھی تھی۔ سرمئی پاجامے کے اوپر کرتے کی آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ رنگت کافی جھلس گئی تھی۔ پہلے سے کمزور بھی لگ رہا تھا گوکہ اسے اچھی غذا ملتی تھی مگر وہ جو بہت مناسب ڈائٹ فوڈ کھانے کا عادی تھا اسے یہ غذا اب کہیں جا کے بمشکل سوٹ کی تھی، ورنہ شروع شروع میں اکثر معدہ الٹنے کو آ جاتا تھا۔ مگر وہ تحمل سے برداشت کر لیتا تھا۔

ایک ساتھی باورچی ساتھ آ کے کھڑا ہوا اور چولہے پہ چڑھے پتیلے کا ڈھکن اتار کے دیکھنے لگا تو فاتح نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”کون آرہا ہے جس کے لئے اتنا اہتمام کیا جا رہا ہے؟“ وہ اب قدیم طے کے چند الفاظ بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ایڈم جیسی شستہ گفتگو تو نہیں کر سکتا تھا، مگر اشاروں اور چند الفاظ سے بات سمجھا لیتا تھا۔

”سلطان مرسل.... ملکہ یان سوفو.... بند اہار ارجہ مراد....“ دوسرا باورچی مہمانوں کے نام گنواتا گیا۔

فاتح کے سبزی کاٹتے ہاتھ دھیسے پڑے۔

”کیا بند اہار کے ساتھ کوئی اور نہیں آئے گا؟“ سر جھکائے سرسری سا پوچھا۔

”مثلاً کون؟“ وہ دستکچے میں ڈوئی ہلارہا تھا۔

”ملکہ ایک خاتون ہیں اور ابوالخیر کے گھر میں کوئی خاتون نہیں رہتی تو کیا ملکہ تنہا بیٹھیں گی؟ کس سے باتیں کریں گی؟“ مزید سرسری سا

پوچھا۔

”وہ تنہا کیوں ہوں گی۔ ان کے سب سے معزز قرابت دار کو جو مدعو کر رکھا ہے ابوالخیر نے۔“

”کون؟“ وہ چونکا۔ غلام نے ڈھکن واپس رکھا اور ایک اچھلتی نظر اس پہ ڈالی۔

”وہ جس کو ابوالخیر ہر چند دن بعد حویلی میں بلا لیتے ہیں۔ جو رات گئے تک یہاں بیٹھا ملکی امور پہ گفتگو کرتا ہے اور شطرنج کھیلتا ہے....“

سن باؤ تائی ثریان۔ (تین نگینوں والا غلام۔)

فاتح نے اتنی تیزی سے گاجر کا ٹکڑا کاٹا کہ چٹخنے کی زوردار آواز آئی۔ فوراً سے چہرہ اٹھایا تو اس پہ مختلف رنگ تھے۔ جیسے وہ شاک میں

ہو۔

”سن باؤ۔ (تین خزینے) تائی ثریان (غلام)؟“ باورچی کو دیکھ کے دہرایا۔ ”یعنی چینی بادشاہ کا تائی ثریان (مخت غلام) جو ملکہ یان

سوفو کے ساتھ چین سے آیا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟“

”وانگ لی۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

فاتح کا چہرہ یوں تھا گویا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ پھر وہ جبراً مسکرایا۔ ”مجھے اس کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیا آج میں برتن لگا سکتا ہوں؟“

باورچی نے چونک کے اسے دیکھا، پھر فوراً دور کھڑے ہوڑھے نگران کو۔ اس کا چہرہ جیسے دمک اٹھا تھا۔ ”ہاں کیوں نہیں۔ تم سب سیکھ تو چکے ہو۔ میں تمہارے کمرے میں آج آرام کر لوں گا۔ تم نگران کو کہنا میری طبیعت خراب ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ میں تمہاری جگہ سنبھال لوں گا۔“ وہ بدقت مسکرایا۔

”تو پھر یہ شور بہ تم ہی اندر لے جاؤ۔ وانگ لی کب کا آیا بیٹھا ہے۔ ابھی دوسرے مہمان نہیں آئے۔“ دیکھنے کی طرف اشارہ کر کے وہ غلام خوشی خوشی پیچھے ہٹ گیا۔ فاتح نے دور دوسرے ملازموں کے سر پہ کھڑے نگرانی کرتے ہوڑھے کو دیکھا اور گہری سانس لی۔ چند منٹ اس کو راضی کرنے میں بھی لگنے تھے۔

جس لمحے وہ لکڑی کی طشتری میں چاندی کے پیالے میں شور بہ رکھے باورچی خانے سے نکلا تو سامنے طویل راہداری نظر آرہی تھی۔ وان فاتح قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(یہ سن باؤ وانگ لی کا مجسمہ ہے۔ سن باؤ.... یعنی تین خزانے یا تگینے۔ بدھ مت کے تین تگینے ہوتے ہیں (تین عقائد)۔ بدھا۔ دھرم۔ سنگھا۔)

وہ طشتری اٹھائے راہداری میں آگے چلتا جا رہا تھا۔ بار بار لب کاٹتا۔ سر جھٹکتا۔

(وانگ لی ایک چینی غلام تھا۔ پندرہویں صدی میں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے ثل بوتے پہ کم عمری میں ہی محل میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔)

اس نے راہداری کا موڑ مڑا اور بڑے سے دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وہاں ایک کونے میں شطرنج کی بساط ہوئی میز پہ بچھی تھی اور اس کے گرد دو کرسیوں پہ آمنے سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ابوالخیر اور.... اور وانگ لی۔

(پھر وہ چینی بادشاہ کا خاص سفیر مقرر ہوتا ہے اور ایک بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔)

فاتح ان کے قریب آیا اور ادب سے طشتری سے پیالہ نکال کے ابوالخیر کے سامنے رکھا۔

ابوالخیر ہندی رنگ لمبے بالوں والا آدمی تھا۔ جیسے بر شیر کے بال اس کے چہرے کے دائیں بائیں پڑے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک آنکھ تیر لگنے سے ضائع ہو چکی تھی مگر وہ اس کے اوپر کسی قسم کا patch نہیں پہنتا تھا۔ بد میت مجروح، کافی آنکھ جو پھولے انگور کی طرح تھی اسی طرح سب کو نظر آتی رہتی اور طبیعت عجیب کر دیتی۔ غلام دبے الفاظ میں اس کو کانا دجال، بھی کہتے تھے۔

(یہ گھر وانگ لی نے بنوایا تھا۔ میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ تب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ وانگ لی کا گھر ہے۔)

پھر وہ ترچھا ہوا اور دوسرا پیالہ وانگ لی کے سامنے رکھا اور پھر... نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

(میں باپا کے ساتھ سامنے کسی دکان پہ بیٹھا تھا، پھر ادھر آ گیا۔ یہ مجسمہ... جب یہ ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ عصر ہونے بعد میں اس کو ٹھیک کر دیا۔ یہ مجسمہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔)

وہ فریبہ سا، لمبے سیدھے سیاہ بالوں والا ایک ادھیڑ عمر چینی شخص تھا۔ پیروں تک آتا چنہ پن رکھا تھا اور تھوڑی تلے ہتھیلی رکھے سوچ میں ڈوبا شطرنج کی بساط کو دیکھ رہا تھا۔ سارے بال پتلی پتلی مینڈھیوں میں بندھے تھے۔ سر پہ چینی طرز کی ٹوپی تھی۔ پھولے گال اور چھوٹی آنکھیں۔ اور چہرے کی وہ سادگی۔ ہو بہو مجسمے سا۔

(عجیب کشش تھی اس مجسمے میں۔ اب بھی ہے۔ مانوسیت۔ اپنائیت... جیسے کوئی دوست ہوتا ہے۔)

وانگ لی نے یکدم نظر اٹھا کے اس غلام کو دیکھا، اور ہلکا سا مسکرایا، پھر شور بے کاپیالہ اپنے آگے کرتے ہوئے دوبارہ توجہ شطرنج کی طرف مبذول کر لی۔

”تمہاری چال کا توڑ سوچ رہا ہوں، ابو الخیر۔ کیوں تا یہ پینے تک ہم کھیل کر روک دیں۔“ شور بے (سوپ) کوچنگ میں بھرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ انداز میں ایک خوش مزاجی اور زندہ دلی تھی۔ جیسے وہ بات بہ بات ہنس دینے کا عادی ہو۔

(کس نے بتایا تھا یہ مجسمہ؟)

”میری چال کا توڑ کرنا اتنا آسان نہیں ہے، وانگ لی۔ میں وہاں سے آتا ہوں جہاں سے دوسروں کے فرشتوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔“

وان فاتح خالی طشتری اٹھائے پلٹ گیا۔ اب وہ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔

(کس نے بتایا تھا یہ مجسمہ؟) سکندر نے اس کو روک کے پوچھا تھا۔

(شہزادی تاشہ نے۔) اس نے جواب دیا تھا۔

وہ اب واپس راہداری میں جا رہا تھا۔ باورچی خانہ چند گز کے فاصلے پہ تھا۔

(پھر تاشہ کا کیا ہوا؟)

(معلوم نہیں.... کہتے ہیں اس کی کہانی کا انجام دکھی تھا۔ مگر وہ اکثر سن باؤ کے گھر آیا کرتی تھی۔ اسی نے یہ مجسمہ بتایا تھا۔ کہتے ہیں سن باؤ سے اس کی دوستی تھی۔ یا معلوم نہیں کیا تھا جو وہ اس گھر میں اکثر آتی تھی۔)

باورچی خانے میں واپس آ کے وان فاتح نے طشتری (ٹرے) میز پہ دھری اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

وقت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ کب کسی کو کہاں لے جائے، کیا سے کیا بنا دے۔

☆☆=====☆☆

شام مزید گہری ہوئی اور مغرب اتر آئی تو رات کے کھانے کا وقت ہو چلا۔ ملاکہ میں لوگ سر شام ہی کھانا کھا کے سو جاتے تھے۔ پھر علی الصبح فجر کی پہلی اذان کے ساتھ اٹھتے اور کاموں میں جت جاتے۔

ابوالخیر کے دیوان خانے میں آدھ درجن فانوس جگمگا رہے تھے۔ طویل ڈانگ ٹیبل پہ جگہ جگہ کینڈل برار کھے تھے جن میں لمبی کھڑی موم بتیاں سارے کوروشن کر رہی تھیں۔ خوبصورت دیوان خانے میں وہ زرد روشنی خوابناک سا ماحول بنائے ہوئے تھی۔

سربراہی کرسی پہ سلطان مرسل بیٹھا تھا جو بہت مرغوبیت سے بھنے برن کا گوشت کھا رہا تھا۔ سر پہ قیمتی پتھروں سے مزین ٹوپی اور نیچے سرخ زرتار چغہ پہنا تھا۔ وہ بمشکل چوبیس پچیس برس کا خوش شکل اور لاابالی سانو جوان لگتا تھا۔ لمبے بال چوٹی میں بندھے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ ملکہ یان سوفو بیٹھی تھی۔ لاپرواہ شوہر کی نسبت وہ سلجھے ہوئے انداز میں کھانا تناول کر رہی تھی اور بار بار چھوٹی آنکھوں سے طرف کا جائزہ بھی لیتی تھی۔ سن باؤ وانگ لی ملکہ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور وہ کھانا کھاتے ہوئے عادتاً مسکرا کے ڈالٹے کی تعریف بھی کر رہا تھا۔

سلطان کے بائیں ہاتھ موجود ابوالخیر بس خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا البتہ وہ کچھ بے چین تھا۔ بار بار اپنے ساتھ بیٹھے مراد کو دیکھتا جو اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تسلی دے دیتا۔ وہ سب سے زیادہ مطمئن پرسکون اور پراعتماد تھا۔ جیسے وہاں موجود ہر شخص کی سوچ سے واقف ہو۔ جب ابوالخیر کی نگاہوں کا اصرار بدھتا گیا تو مراد نے مسکرا کے مرسل شاہ کو مخاطب کیا۔

”آقا.... جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا محل کو اس وقت ایک نئے خزانچی کی ضرورت ہے۔ ایک قابل وزیر خزانہ۔ جو محل میں سارے ملک سے آئے گئے خراج اور محصول (ٹیکس) کا حساب رکھ سکے اور اسے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اچھے سے خرچ کر سکے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔“

”ہاں تو کرونا۔“ دونوں کہنیاں میز پہ جمائے مرسل نے خوش دلی سے کہا اور پھر دانتوں سے برن کی بوٹی توڑی۔ ذائقہ منہ میں گھلاتو اس نے جیسے سر دھنا۔ ”ابوالخیر تم اتنا اچھا برن بنا سکتے ہو۔ تمہیں تو ہمارے شاہی باورچی خانے میں ہونا چاہیے۔ ایسا برن تو میری ماں بھی نہیں بنا سکتی۔“ ساتھ ہی وہ ہنسا۔

کوئی بھی جواب نہ ہنسا۔ ملکہ نے آنکھیں میچ کے جیسے ضبط کیا اور ابوالخیر نے ایک شاکی نظر مراد پہ ڈالی۔ مراد نے جواباً پلکیں جھپکا کے اشارہ کیا۔ (دھیرج۔ صبر۔ ٹھنڈا کر کے کھاؤ۔) ابوالخیر نے سر جھٹکا اور مسکرا کے بولا۔ ”آقا کو پسند آیا میری خوش نصیبی ہے۔“ وانگ لی نے محض ایک افسردہ نظر مرغوبیت سے کھانا کھاتے سلطان پہ ڈالی۔ اسے جیسے ملا کہ کی قسمت پہ افسوس ہوا تھا۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو ابوالخیر نے نظر اٹھائی۔ نیا غلام صراحی اندر لارہا تھا۔ ابوالخیر نے سر کے خم سے اسے تائیدی اشارہ کیا تو فاتح اندر آیا رواج کے مطابق جھک کے سلطان کو سلام کیا۔ باقی سب کھانے میں اور اپنی سوچ میں گم تھے اور سلطان کھانے میں۔ ایسے میں صرف وانگ لی نے محسوس کیا کہ اس تو انا وجیہ مرد غلام نے سلطان کے سامنے سر جھکاتے ہوئے بھی گردن پوری نہیں جھکائی اور اپنی آنکھیں مسلسل اٹھائے اس نے گہری نظروں سے سلطان کو بغور دیکھا تھا۔ پھر سیدھا کھڑا ہوا نظریں جھکا دیں اور صراحی سے سلطان کی پیالی میں قبوہ اندینے لگا۔

وانگ لی یونہی اس کو دیکھنے لگا۔ قبوے کی دھار پیالی میں گر رہی تھی۔ فاتح کی نظریں جھکی تھیں۔ ایک دم اس نے نظریں اٹھائیں اور وانگ لی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

غلام کی نظروں میں ایسی چمک تھی... ایسا ٹھنڈا آدمی لگا تھا وہ اس کو کہ وانگ لی نظر نہ جھکا سکا۔ پھر فاتح نے نظریں جھکا دیں اور اپنا کام کرنے لگا۔

یکدم دروازے پہ ہلچل مچی۔ ابوالخیر چونک کے اٹھا... سلطان نے بھی چہرہ اٹھایا۔
 ”کیا کوئی اور بھی مدعو ہے؟“ ابوالخیر۔ ”مرسل شاہ کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ باہر سے تیزی سے خادم اندر داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے اطلاع دی۔

”شہزادی تاشہ بنت مراد شریف لائی ہیں۔“

میز پہ بیٹھے سب افراد چونکے تھے۔ اور سر جھکائے قبوہ اندر ملتا فاتح ہلکا سا مسکرایا تھا۔

One a socialite , always a socialite!)

وہ تھینا پارٹیز کو مس کرتی ہے)

ابوالخیر نے فوراً اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پہریداروں نے دیوان خانے کے دروازے کھولے۔ چوکھٹ پہ وہ کھڑی تھی۔

وہ دو پیالوں میں قبوہ اندر چکا تھا۔ صراحی سیدھی کر کے نظریں اٹھائیں تو وہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔

سنہرے بال گھنگریالے کر کے آگے ڈالے تھے۔ سر پہ حجاب کے نام پر ریشمی سبز کپڑا تھا جو برائے نام تاج تلے اٹکا تھا اور پیچھے کمر پہ گرنا تھا۔ وہ پاؤں تک آتی لمبی کادار میکسی پہنے ہوئے تھی۔ گھاس جیسے سبز رنگ کی میکسی اور موٹے موٹے زمر سے جڑے زیورات۔ ایسا خوبصورت سبز رنگ کہ چہرہ دور سے دملکا دکھائی دیتا تھا۔

اس نے قبوہ ڈالتے غلام کو ایک نظر بھی نہ دیکھا۔ بس خوبصورت آنکھیں سلطان پہ جمائے رکھیں۔

”دیر سے آنے کے لئے معذرت چاہتی ہوں“ آقا۔ آج طبیعت ذراست تھی۔ تیاری میں وقت لگا۔“ سامنے آ کے پوری جھکی اور سیدھی ہوئی۔

سلطان مرسل نے پرندے کی بوٹی دانت سے توڑتے نظریں اٹھائیں تو ٹھٹھک گیا۔ وہ سچی سنوری لڑکی اب باقی سب کو باری باری تعظیم پیش کر رہی تھی۔ مرسل شاہ کی نظر اس سے ہٹنا بھول گئی۔

ملا کہ میں سنہرے بالوں والی عورت اس نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ وہ بھی اتنی حسین۔

”آپ کی آمد ہمارے لئے فخر کا باعث ہے شہزادی۔“ ابوالخیر اٹھا اور سر کو تعظیم سے جھکایا۔ خادم نے سلطان کی سیدھ میں پڑی میز کی دوسری سربراہی کرسی اس کے لئے کھینچی۔ وہ مسکرا کے لباس پھول کی طرح گرد پھیلاتی اس پہ بیٹھی تو سلطان ہنوز اسے تک رہا تھا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی مدعو ہیں شہزادی!“ ملکہ بظاہر مسکرا کے بولی تو راجہ مراد ہلکا سا کھٹکھٹا ہوا۔

”ابوالخیر نے بمع اہل و عیال مدعو کیا تھا اور تاشہ ہی میرا پورا خاندان ہے۔“ کہہ کے وہ گھونٹ گھونٹ قبوہ پینے لگا۔

”آپ کی بہن کے بارے میں سن کے افسوس ہوا۔“ سلطان مرسل نے زبان کھولی۔ پھر مدد طلب نظروں سے بائیں ہاتھ بیٹھی بیوی کو دیکھا۔ ”تالیہ“ اس نے سرگوشی کی۔ سلطان نے فقرہ دہرایا۔ ”آپ کی بہن تالیہ کے بارے میں سن کے افسوس ہوا۔ کیا اس کی کوئی خیر خبر ملی؟“

صراحی میز پر رکھ کے فاتح قدم قدم پیچھے ہٹا اور ابوالخیر اور مراد کی کرسیوں کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس سوال پہ اس نے بھی تالیہ کی طرف نگاہیں موڑ دیں۔

”آپ کا شکریہ آقا۔“ اس کے چہرے پہ ادا سی پھیلی۔ ”تالیہ ایسی کھوئی ہے کہ نہ جانے اب واپس آ سکے گی بھی یا نہیں۔ خدا معلوم کیسے لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہو۔ برے برے خیال آتے ہیں مجھے۔ جیسے وہ کسی قید میں ہے اور بے بس ہے۔“

مراد نے گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اسے دیکھا، پھر خاموشی سے سلطان کو جس نے افسوس سے سر ہلادیا تھا۔

”خدا تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان کریں۔“ پھر ذرا کھٹکھٹا اور ٹوکری سے ایک پھل نکال کے اس میں دانت کاڑھے۔

(ملکہ اب غیر آرام دہ نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ بار بار ناگواری سے تالیہ کو دیکھتی تھی جو کھانا شروع کر چکی تھی۔)

”چین کے کس شہر میں اتنے برس گزارے ہیں آپ نے؟“

”دارالحکومت میں کچھ عرصہ رہی ہوں۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”مگر اس سے زیادہ وقت ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزارا ہے۔ اس کا

نام تو کچھ اور ہے مگر میں اس کو کوالا پور کہتی تھی۔“

ہاتھ باندھے کھڑے فاتح نے ابرو اکٹھے کر کے تادہ بنی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر وہ سوپ میں چیچ ہلاتی سلطان کو دیکھ کے سادگی سے بتا

رہی تھی۔ ”کوالا پور۔ یعنی گدے پانیوں کا سنگم۔“

”واہ۔ اور کیسا تھا آپ کا کوالا پور؟“ وہ پھل کا ٹکڑا چباتے ہوئے محظوظ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے ایک نظر چھت اور اطراف پہ ڈالی۔

”اس دنیا سے بہت مختلف۔ ایک ترقی یافتہ خوبصورت شہر۔ جہاں برقم کا عیش میسر تھا، مگر لوگ خالص نہیں تھے۔ وہ لالچ اور طاقت کی

ہوس کا شکار تھے۔“

”وہاں کچھ لوگ بھیس بدل کے دوسروں کی قیمتی چیزیں چرا لیتے تھے۔ رات کی تاریکی میں نقب لگا جاتے تھے۔ اور کچھ....“ وہ ادا سی

سے مسکرائی۔

”کچھ دن دہاڑے، بھیس بدلے بغیر سیاست کے نام پہ لوگوں سے ان کا اعتماد مانگتے، اور پھر حکومت کے بہانے خراج کے پیسوں کو

بے نامی جاسید اداوں میں چھپا دیتے ہیں۔ کھلم کھلا چوری۔

”وہاں ایسے ایسے ملازم بھی تھے جو ایک شخص کی چاکری کرتے مگر تنخواہ کسی اور سے لیتے...“ (فاتح بس اس کو دیکھ رہا تھا۔ باقی سب بھی سن رہے تھے اور وہ بو لے جا رہی تھی۔)

”وہاں ایسی طاقتور بیویاں بھی تھیں جو بیٹھے بولوں سے دوسروں سے فائدے حاصل کرتیں اور پھر مکھی کی طرح ان کو نکال باہر کرتیں۔ (یان سو فو نے پہلو بدلا)

”وہاں ایسے بدعنوان عہدیدار بھی تھے جو عوام کے خراج کے پیسوں سے ڈھیروں جاسیدا دیں اور اونچے قلعے نما گھر بنا لیتے تھے۔ (ابو الخیر داڑھی کو نوچتے ہوئے سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔)

”وہاں ایسے حکمران بھی تھے جو اپنی ناک تک پونچھ نہیں سکتے تھے مگر ان کو حکومت کے لئے ان کے ماں یا باپ کی گدی پہ بٹھا دیا جاتا تھا (وانگ لی نے فوراً سے سلطان کی طرف دیکھا مگر یہ باتیں اس بگڑے بادشاہ کی عقل سے اوپر کی تھیں۔)

”وہاں لوگوں کو خراج اور سودی معاشی نظام کے ذریعے ان دیکھی زنجیروں میں باندھا جاتا تھا۔ قوموں کی قومیں قرضے دے دے کے غلام بنالی جاتی تھیں۔ دن رات وہ غلام قومیں مشقت کرتی تھیں مگر ان کی زنجیریں ان کو بھاگنے دوڑنے تک نہیں دیتی تھیں اور وہ اپنے حقوق سے بے خبر کام کرتے رہتے تھے۔

”کوالا پور، ملاکہ سے بہت مختلف تھا میرے آقا۔ وہاں عوام کے خراج کا پیسہ چوری کیا جا رہا تھا مگر عوام کو خبر ہی نہ تھی۔ مگر وہاں بھی ایک آدمی ایسا تھا جس سے مجھے امید تھی کہ وہ سب سے مختلف ہے۔“

اس نے نظریں موڑ دیں اور راجہ مراد کو دیکھا۔ وان فاتح اس کے پیچھے کھڑا تھا، مگر وہ مراد کو دیکھتی رہی۔ سب کی نگاہیں مراد کی طرف مڑیں۔

”مجھے یقین ہے کہ وہی ایک ایسا شخص ہے جو ملاکہ کے لوگوں کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کو کھونے کا دکھ سہا ہے۔“ مراد ہلکا سا مسکرایا، اور سر قدرے جھکا لیا۔ تالیہ نے نظریں ذرا اوپر اٹھائیں۔ فاتح اسی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہ ملی۔ کیا نہ تھا ان نگاہوں میں۔

”وہ ایسا شخص ہے جو سیاست اور حکومت کے فن سے آشنا ہے۔ ایک وہی ہے جو مجھے لگتا تھا کہ اگر میرے ملک کا سب سے طاقتور عہدہ سنبھال لے... وزیراعظم بن جائے... یعنی کہ بند اہارا... تو میرے ملک کے اکثر مسائل حل ہو جائیں گے۔“ اس نے نظریں سلطان کی طرف موڑیں۔ ”اسی لئے میں واپس آئی ہوں تاکہ اس کو مضبوط کر سکوں۔ ان کی مدد کروں۔ ان کا دایاں بازو بن جاؤں۔ اور میں وہ سب کام کروں جس کے باعث وہ مجھ پہ فخر کریں۔“ پھر گردن فخر سے بلند کی۔ ”میں تاشہ بنت مراد ہوں۔ میں کوئی عام عورت نہیں ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ میرے ارد گرد موجود مرد مجھے کوئی بے مصرف خوبصورت عورت سمجھ کے نظر انداز نہ کر دیں۔“

(بورنگ پر بیٹنی دوسن) کرسی کے پیچھے کھڑا غلام مسکرایا تھا۔

تالیہ اب کھانا نکالنے لگی۔ سلطان جو سحر زدہ سا پھل کھانا بھول گیا تھا، آخر میں اثبات میں سر ہلانے لگا اور دوبارہ سے پھل اٹھالیا۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد راجہ مراد کھٹکھارا۔

”آقا... شہزادی تاشہ اپنا تعارف کروا چکی ہیں۔ اس لیے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں وزیر خزانہ کے لئے ابو الخیر سے بہتر نام کسی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ میری ایک تجویز ہے۔“

یان سوفو نے اتنی گہری سانس بھری کہ وہ سب اسے دیکھنے لگے۔ وہ دانت پہ دانت جما کے مسکرائی۔ ”آقا... مراد راجہ کی ذہانت اور وفاداری پہ کوئی شک کربھی نہیں سکتا۔ ان کا تجویز کردہ نام بہت مناسب ہو گا میں جانتی ہوں۔ لیکن ابو الخیر کے لئے اس عہدے سے زیادہ بہتر کام ہیں جہاں ان کی قابلیت کو ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس عہدے کو اگر سن باؤ کے حوالے کر دیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

”سن باؤ ملے نہیں ہیں ایک چینی باشندے ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔“ راجہ مراد نے فوراً ہاتھ اٹھا کے ملکہ کو ٹوکا۔ ”سن باؤ چینی حکومت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان کے اوپر بھی اگر ہم اپنے کاموں کی ذمہ داری ڈال دیں تو ہمارے دوست ملک چین کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔ ہمیں سن باؤ کو ایسے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیے۔“

اپنے ذکر پہ سن باؤ نے سر جھکا دیا تھا۔ ابو الخیر البتہ دلچسپی سے داڑھی کے بال نوچتا دونوں اطراف کے دلائل سن رہا تھا۔

”بس بہت ہو گیا۔“ مرسل شاہ نے میز پہ ہاتھ مارا تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایک موم بتی نیچے گر گئی۔ فاتح فوراً آگے بڑھا اور موم بتی اٹھا کے سیدھی کھڑی کی۔ پھر واپس اپنی جگہ پہ جا کھڑا ہوا۔

”شہزادی تاشہ کا کیا خیال ہے اس عہدے کا اہل کون ہونا چاہیے۔“

سلطان کے الفاظ تھے یا کیا۔ راجہ مراد کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ملکہ کارنگ اڑا۔ ابو الخیر نے برہمی سے ہنسیں بھینچیں اور سن باؤ نے حیرت سے پہلے سلطان اور پھر تالیہ کو دیکھا۔

تالیہ نے رومال سے نزاکت سے لب تھپتھپائے اور پلکیں اٹھائیں۔ پھر مسکرا کے نرمی سے بولی۔

”آقا مجھے اپنا خیال ظاہر کرنا ہے، تجویز پیش کرنی ہے یا مشورہ دینا ہے۔“

”مشورہ!“ مرسل نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”اچھا مشورہ اگلے ہی لمحے نہیں دیا جاسکتا، آقا۔ آپ کے سامنے دو نام ہیں۔ ابو الخیر اور سن باؤ وانگ لی۔ مجھے ان دونوں شخصیات کا مطالعہ کرنے کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔ اگر آقا مجھے صبح تک کا وقت دے دیں تو میں کل محل میں حاضر ہو کے خود آقا کو اپنا مشورہ سنا دوں گی۔ عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کی اپنی صوابدید پہ منحصر ہو گا۔ ایسے ٹھیک ہے نا، ملکہ!“

سادگی سے پلکیں جھپکا کے یاں سو فو کو دیکھا۔ وہ خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئی تھی۔ مگر جبراً مسکرائی۔ ”ہاں یہ مناسب رہے گا۔“
 ”بالکل۔ کل صبح آپ مشاورت کے لئے تشریف لے آئے گا شہزادی۔“ مرسل شاہ اس سے نظریں نہیں ہٹا پارہا تھا۔ ملکہ نے غیر آرام
 وہ پہلو بدلا۔

ابوالخیر نے خشمگین نگاہوں سے مراد کو گھورا جس نے جواب میں ”دھیرج“ کا اشارہ کیا اور تالیہ کو دیکھا۔ مگر سنہرے بالوں والی شہزادی
 شاہی آداب کا خیال رکھے پوری توجہ سے قبوے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔
 وان فاتح ہاتھ باندھے کھڑا مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 بنگارایا ملاو کے پہلے باب میں یہی لکھا تھا۔ مگر آگے... آگے کیا ہوگا؟ اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

☆☆=====☆☆

رات مزید سیاہ ہوئی تو ابوالخیر کی حویلی سے چلتے قافلے بندابار کے محل کے اندر پڑاؤ ڈالتے دکھائی دینے لگے۔ محل کے باہر بھی رکی اور
 خادم نے دروازہ کھولا تو تالیہ پائے دان پہ پیر رکھتی ایک شان سے نیچے اتری۔ لباس پہلوؤں سے اٹھایا اور قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ
 ... گھوڑے کے تیز ناپ قریب آتے سنائی دیے۔
 وہ رک کے دیکھنے لگی۔

مراد راجہ اپنا سیاہ چمک دار گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ ماتھے پہ سرخ پٹی بندھی تھی اور لمبے سیاہ بال ہوا سے پیچھے کواڑ رہے تھے۔ وہ کھڑی
 رہی یہاں تک کہ وہ اس کے قریب آیا اور گھوڑا روک لیا۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کیا تو تمام غلام اور کنیریں دور ہٹتے چلے گئے۔
 ”اچھا لگا تمہارا آنا۔ تمہاری باتیں بھی اچھی لگیں۔ سلطان بھی کافی متاثر ہوئے تم سے۔“ گھوڑے پہ بیٹھے بیٹھے اس نے نظریں جھکا کے
 نیچے کھڑی تالیہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ دونوں محل کی عمارت کے باہر کھڑے تھے۔

”سلطان؟ کون سلطان؟ وہ بچہ جس کو تخت پہ بٹھا دیا گیا ہے اور جو کھانے پینے اور موسیقی سے لفظ اندوز ہونے کے بعد فارغ اوقات
 میں آپ کے حکم کے مطابق شاہی حکم ناموں پہ مہر لگا دیتا ہے؟ وہ سلطان؟“
 ”وہ ہمارے آقا ہیں، تاشہ!“ مراد کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آواز میں گرج پیدا کی۔ تالیہ گردن اٹھائے اس کو دیکھتی رہی۔ چند ثانیہ کو
 قدیم ملاکہ کے اس محل کے سبزہ زار پہ خاموشی چھا گئی۔ آسمان پہ دمکتا چاند اور بادل بھی ٹھہر کے ان دونوں کو دیکھتے رہے۔

”Cesium-137“

مراد کے ابرو تانسجی اور کوفت سے بھنے۔ ”کیا؟“

”آپ نے مجھ سے پوچھا تھا راجہ کہ تمہاری اور ہماری دنیا میں کیا فرق ہے۔ صرف Cesium-137 کا فرق ہے۔ (سراٹھا کے
 آسمان کو دیکھا اور ناک سے سانس اندر کھینچی۔) ابھی یہ عنصر ہوا میں شامل نہیں ہوا مگر.... (واپس چھپتی نظروں سے باپ کو دیکھا۔) آج سے

پانچ سو سال بعد جب ایٹم بم پھٹے گا، اور دوسری جنگِ عظیم ہوگی تو یہ اس دنیا کی فضا میں شامل ہو جائے گا۔ کوالا لمپور اور قدیم ملاکہ میں صرف Cesium-137 کا فرق ہے، ورنہ خدا کی قسم دنیا تب بھی ایسی ہی ہوگی اور دنیا اب بھی ویسی ہی ہے۔“
وہ ایک دم اتنی نفرت سے بولی کہ مراد اسے دیکھ کے رہ گیا۔

”وہی لالچ... وہی حکومت ملتے ہی اپنی پسند کے آدمی اعلیٰ عہدوں پہ لگاتا... عوام کا خراج (ٹیکس) چوری کرنا... موروثی سیاست کرنا... باپ کی جگہ پہ بغیر کوئی کامیابی حاصل کیے بگڑے بیٹے کو بٹھا دینا... آپ بند اہار نہیں ہیں راجہ... آپ صرف... ایک... سیاستدان ہیں۔ اور یہ مت سمجھیں کہ میں سیاستدانوں سے پہلی دفعہ مل رہی ہوں۔“ آخر میں استہزائیہ مسکرا کے سر جھٹکا تو گھوڑے پہ بیٹھا مراد نیچے اترا۔ پیر رکاب سے آزاد کیے، گھوڑے کو تھپکا تو وہ ایک طرف بھاگ گیا، اور پھر وہ تالیہ کی طرف گھوما اور تھل سے بولا۔

”ایسے ہی ہوتا ہے۔ طاقت ملتی ہے تو شروع شروع میں سب کے دماغ ایسے ہی اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ دھیرج، تاشہ۔ میرے ساتھ مل کے کام کرو۔ یان سوفو کے آدمی کو لگانے کا مطلب جانتی ہو؟ وہ سارا خزانہ لوٹ کے چین بھجوا دے گا۔ اگر تمہیں سلطان نے یہ طاقت دے دی ہے کہ تم اس فیصلے میں ان کی معاونت کر سکو تو تمہیں وہ فیصلہ کرنا چاہیے جو اس ملک کے لئے اچھا ہو۔ ہم ایک چینی عورت سے سلطان کی شادی تو کروا سکتے ہیں مگر سارا ملک بیچ کے اس کے حوالے نہیں کر سکتے۔“

تالیہ اس بات پہ مسکرا دی۔

”جیسا کہ میں نے کہا، میری دنیا اور آپ کی دنیا ایک سی ہے، راجہ۔ مگر ان دونوں دنیاؤں میں آج بھی بڑے مقاصد کے لئے جینے والے، نڈر اور اچھے لوگ موجود ہیں۔ یقین مانیے، آپ کی بیٹی اگر پہلے ان لوگوں میں سے نہیں تھی، تو اب ہوگی۔ اب میں سیدھ میں چلتی ہوں اور آپ کو راجہ کہہ کے پکارتی ہوں۔ آپ کو ایک اچھی بیٹی سے نہیں ڈرنا چاہیے، راجہ۔“ اس نے نرمی سے مسکرا کے باپ کی کہنی تھامی اور جیسے یقین دلایا۔

”اور ان دونوں دنیاؤں میں سارے بڑے حادثات اچھے لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں، میری بیٹی۔“

وہ ہموار لہجے میں کہہ کے آگے بڑھ گیا۔ اس کی کہنی تالیہ کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

”شریفہ۔“ اپنی خواب گاہ میں آتے ہی تالیہ نے کنیز کو اشارہ کیا تو وہ فوراً دروازہ بھیڑ کے چلی آئی۔

”جی شہزادی۔“

”آج رات تم باپا کے پاس جا کے ان کو یہ بتاؤ گی کہ میں ابوالخیر کے حق میں فیصلہ دینا چاہتی ہوں۔ تمہیں میری باتوں سے یہی لگتا ہے،

ٹھیک۔“

”لیکن شہزادی اگر آپ نے سن باؤ کے حق میں فیصلہ دے دیا تو وہ مجھ پہ شک کریں گے۔“ وہ متامل ہوئی۔

”اپنے وزن سے زیادہ بھاری ضرب نہ لگاؤ، شریفہ۔ جو کہا ہے، وہ کرو۔“

اس نے کنیر پہ ایک برہم نظر ڈالی تو اس نے جلدی سے تسلیم خم کر دیا۔ تالیہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس کا دماغ مسلسل تانے بانے میں رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

حویلی کے باورچی خانے کے بابر وہ ایک کھلی جگہ پہ بیٹھا تھا جہاں پانی کے ٹب بھرے رکھے تھے اور وان فاتح دوسرے غلاموں کے ساتھ برتن دھو رہا تھا۔ غلام دبے لفظوں میں آج کے شاہی مہمانوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ جس نے جس کی جتنی جھلک دیکھی تھی وہ اس کو بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا۔

”بندہ ہارا کی حسین بیٹی“ گفتگو کا مرکز تھی۔ وہ جاتے وقت ایک غلام کو موتیوں کی مالا دے گئی تھی اور ان موتیوں کی چمک باقی سب کی آنکھیں خیرہ اور دل مغموم کیسے ہوئے تھی۔ فاتح مسکرا کے سر جھکائے برتن دھوتے سنے گیا۔

”جلدی اندر آؤ۔ تمہیں مہمان کے لئے شور بہ لے کر جانا ہے۔“ بوڑھا باورچی عجلت میں اس کے سر پہ آگے بولا تو فاتح نے چونک کے سر اٹھایا۔ گیلی چنگیر چھوڑ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”مہمان تو جا چکے ہیں۔“

”سن باؤ کو ابوالخیر نے شطرنج کی ایک بازی کے لئے روک لیا ہے۔ میں نے شور بہ تیار کر دیا ہے تم لے جاؤ۔“
بوڑھا کچھ بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے سر کو خم دیا اور ہاتھ پونچھتا اندر آیا۔ سامنے لکڑی کی میز پہ سنہری طشتی رکھی تھی جس میں سنہرا پیالہ سوپ سے لبا ب بھرا پڑا تھا۔ ساتھ میں سنہرا چچ بھی رکھا تھا۔ یہ کھانا نظم کرنے کا شور بہ تھا جو رات گئے پیا جاتا تھا۔

”کیا ہم اس پیالے میں پیش کریں گے؟ اور ان چاندی کے برتنوں کا کیا؟“

”جو کہا ہے وہی کرو۔ لے جاؤ اسے۔“ بوڑھے نے ہاتھ جھلا کے کہا۔ فاتح میز کے قریب آیا۔ سوپ میں سے بھاپ تھوڑی بہت نکل رہی تھی۔ وہ کافی دیر پہلے ڈالا گیا تھا۔ ابھی اس نے باورچی خانے میں ابوالخیر کی آواز سنی تھی۔ وہ باورچی سے کچھ کہنے آیا تھا۔ سوپ کا پیالہ بھی پتیل کا تھا۔ نہ کے چاندی کا۔

طشتی اٹھاتے ہوئے اس کا ذہن تیزی سے چلنے لگا۔

بوڑھا باورچی اڑی رنگت کے ساتھ وہیں نیچے بیٹھ گیا اور سر جھکائے آنکھیں میچ کے قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ استغفار۔ توبہ۔ گلٹ۔
وان فاتح کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے آہستہ سے قدم آگے بڑھا دیے مگر ذہن اسی پتیل کے پیالے پہ اٹک گیا تھا۔

کیا ابوالخیر، سن باؤ کو زبردستی جبار ہاتھا؟

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتا تھا۔ وہ غلام تھا۔ اسے آگے جانا تھا۔

(اس زمانے میں عموماً arsenic بطور زہر استعمال ہوتا تھا۔ چاندی کے برتن میں آرسینک ملا کھانا اگر ڈالا جائے تو برتن سیاہ پڑ جاتا تھا

اور زہر کی تشخیص ہو جاتی تھی۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کے باعث بھی امراء اور اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے کیونکہ چاندی جراثیموں کو بھی ماردیتی تھی اور زہر کے بارے میں خبردار بھی کر دیتی تھی۔)

دیوان خانے میں شام والی جگہ پہ اسٹول کے ارد گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ مگر اب پہلے جیسی گفتگو ان کے مزاجوں میں نہ تھی۔ ابوالخیر خاموشی سے سن باؤ کا جائزہ لے رہا تھا جو منہ پہ دو انگلیاں رکھے غور سے بساط کو دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پہ ابوالخیر نے فاتح کو آتے دیکھا تو سر کو خم دیا۔ (ادھر رکھ دو۔)

چند گز کا فاصلہ میلوں کا ہو گیا تھا۔ وہ بھاری قدم اٹھاتا قریب آیا اور جھک کے اسٹول پہ طشت رکھا، ایسے کہ اس کی پشت ابوالخیر کی طرف تھی اور چہرہ سن باؤ کی طرف۔ سن باؤ نے شطرنج سے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔

فاتح نے سیدھے ہوتے ہوئے آنکھوں کو پہلے پیالے پہ جھکایا... پھر سن باؤ کو دیکھا... اور ہونٹوں کو ”نو“ میں گول کر کے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ (نہیں۔)

سن باؤ چونکا۔

فاتح نے نظریں جھکا دیں اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سن باؤ بظاہر شطرنج کو دیکھنے لگا مگر اس نے تھوک نگا تھا۔

لمحے بھر کا کھیل جیسے برسوں کا احسان چڑھا گیا۔

فاتح رامنزل خاموشی سے چلا آیا۔ دروازے کے باہر رک کے اس نے اوٹ سے دیکھا۔

سن باؤ اب مہرہ اٹھا کے چال چل رہا تھا۔ بظاہر بے دھیانی میں مخالف پیادہ مار کے اس نے گوٹ کو اسٹول پہ رکھنا چاہا تو پیالے کو ہاتھ لگا۔ نازک پیالہ کنارے پہ رکھا تھا فوراً لڑھک گیا۔ سارا سوپ نیچے چھلک گیا۔ ابوالخیر جہاں دھک سے رہ گیا، وہیں سن باؤ پریشانی سے کھڑا ہو گیا۔

فاتح نے سکون کا سانس لیا۔ ابوالخیر غلاموں کو پکار رہا تھا۔ وہ فوراً کپڑا لئے اندر لپکا۔ اسٹول کے قریب پنجوں کے بل بیٹھے اس نے فرش صاف کیا اور اوندھے پڑے پیالے کو طشت میں رکھا۔

”تازہ شور بہلاؤ۔ جلدی۔“ ابوالخیر نے برہمی سے حکم دیا مگر سن باؤ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں اب چلتا ہوں۔ کافی تھک گیا ہوں۔“ وہ اٹھ کے شائستگی سے معذرت کرنے لگا۔ ابوالخیر جبراً مسکرا کے کھڑا ہوا اور اس سے مصافحہ کیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں، وانگ لی۔ اس غلام نے ٹھیک سے پیالہ رکھا نہیں تھا۔ اگر تم ذرا دیر بیٹھ جاتے تو...“

”نہیں میری اپنی غلطی ہے۔ مجھے چال چلتے ہوئے احساس نہیں ہوتا کہ میرے دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے سادگی سے کہہ

کے ابوالخیر سے ہاتھ ملایا۔ فاتح خاموشی سے سر جھکائے طشت اٹھائے کھڑا ہو گیا۔

جس وقت وانگ لی بابر اپنے گھوڑے پہ سوار ہو رہا تھا فاتح باورچی خانے کے دروازے پہ کھڑا تھا جو سامنے صحن میں کھلتا تھا۔ سن باؤ وانگ لی نے رکاب میں پیر ڈالتے ایک نظر دور کھڑے سینے پہ بازو لپیٹے نظر آتے غلام کو دیکھا اور سر کو ہلکا سا خم دیا۔ تشکر۔ احسان مندی۔ ممنونیت۔ کیا تھا جو اس کی آنکھوں میں نہ تھا۔

فاتح نے محض آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ مثبت اشارہ.... چہرے کو پاٹ رکھا۔ وانگ لی گھوڑے پہ سوار ہوا اور اسے ایڑھ لگا دی۔ وہ اس کے قدموں کی دھول کو کافی دیر تک دیکھتا رہا۔

☆☆=====☆☆

سلطان مرسل شاہ کا ”سلطنت محل“ بالکل ویسا تھا جیسا آج کے ملاکہ میں تھا۔ فرق یہ تھا کہ سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے جب ملاکہ پہ قبضہ کیا اور مسلمان سلطنت کا خاتمہ کیا تو بہت سی دوسری چیزوں اور عمارتوں کے ساتھ اس محل کو بھی جلا ڈالا۔ اب ملائیشیا میں کچھ سال پہلے پرانی کتابوں، نقشوں اور تاریخی اوراق سے محل کا نقشہ اور پینٹنگز ڈھونڈ کے اکٹھی کی گئیں اور ان کو سامنے رکھ کے ہو بہو ویسا ہی محل تعمیر کیا گیا جو کہ اب ایک میوزیم ہے۔

ملکہ یان سوفو بیدار ہونے کے بعد آج عجلت میں تیار ہوئی تھی۔ رات سلطان اس سے بات کیے بغیر ہی اپنی آرام گاہ میں چلا گیا تھا۔ سلطان کا حصہ انک تھا اور محل کا حرم انک۔ ملکہ حرم کی نگران تھی۔ وہ حرم میں رہتی تھی۔ مگر آج صبح وہ وقت سے پہلے تیار ہو کے حرم سے باہر نکل آئی اور اپنی کنیزوں کی معیت میں محل کے مرکزی حصے تک آئی۔ درمیان میں وسیع و عریض لان پھیلا تھا۔

وہ سنگھار زدہ چہرے پہ پریشانی طاری کیے دربار کی طرف جا ہی رہی تھی کہ دیکھا.... سامنے راہداری میں راجہ مراد چلتا آرہا ہے۔ اس کا رخ بھی دربار کی طرف تھا۔ یان سوفو کے ماتھے پہ بل پڑے۔ لب بھنج کے تیزی سے آگے آئی اور دربار کے دروازے پہ راجہ کا راستہ روک دیا۔

وہ جو کمر پہ ہاتھ باندھے سنجیدہ صورت بنائے چلتا جا رہا تھا چونک کے رکا پھر اسے دیکھا تو سر پورا جھکا کے اٹھایا۔ ”ملکہ!“

”صبح ہی صبح آقا سے ملنے جا رہے ہیں آپ راجہ؟“

مراد دھیرے سے مسکرایا۔ ”میں تہجد پڑھتے ساتھ ہی الور سو گائی چلا گیا تھا وہاں سے واپسی پہ اپنے محل جانے کی بجائے سیدھا ادھر آ گیا۔ آقا کو میری ضرورت ہوگی۔“

”یہ شاید آپ جلد از جلد آقا سے مل کے ان کے فیصلے پہ اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔“ وہ مسکرا کے بولی۔ ”مگر آپ کو اس کے لئے انتظار

کرنا ہوگا۔ کیونکہ میں پہلے آقا کے پاس جا رہی ہوں۔“

”جیسا آپ کا حکم ملکہ!“ اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مراد نے سر جھکا کے اٹھایا۔ یان سوفو مسکرا کے آگے بڑھی اور دربار کے

دروازوں کے سامنے کھڑے پہریداروں کو حکم دیا۔

”آقا کو خبر کرو۔“

”معدرت ملکہ مگر آقا مصروف ہیں۔“

جہاں یان سو فوٹھنگی، وہیں پیچھے کھڑے مراد نے بھی چونک کے اس طرف دیکھا۔

”ابھی تو درباری اور وزراء بھی تشریف نہیں لائے تو پھر آقا کس کے ساتھ مصروف ہیں؟“

”شہزادی تاشہ آئی ہوئی ہیں، ملکہ۔ آقا نے کہا ہے کہ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔“

یان سو فو کا چہرہ خفت اور غضب سے سرخ پڑنے لگا، مگر وہ پیچھے مڑ کے مراد کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

اندر دربار مستطیل سا تھا۔ دونوں اطراف اونچی شاہی کرسیوں کی قطاریں لگی تھیں جو خالی تھیں۔ آخر میں چبوترے پہ بڑا سا شاہی تخت رکھا تھا۔ تخت پہ مرسل اپنی پوشاک پھیلائے بیٹھا تھا۔ ٹوپی اور تاج سر پہ تھا اور وہ دلجمعی سے اپنے سامنے کھڑی تالیہ کو دیکھ رہا تھا جو رات کی طرح بناؤ سنگھار سے لیس تھی۔ مگر آج لباس سفید اور ہلکا زرد تھا۔ اور بال گنگریا لے کر کے کندھے پہ آگے کو ڈال رکھے تھے۔ مودب سی سامنے کھڑی وہ کہہ رہی تھی۔

”آپ کو چناؤ خود کرنا ہے، آقا۔ میرا بہترین مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ فیصلہ کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ خود لیں۔“

”آپ بیٹھ جائیے، شہزادی۔“ وہ بے ساختہ بولا تھا۔

”آقا!“ وہ مسکرائی۔ ”یہ ملکہ کی جگہ ہے اور یہاں بیٹھنا شاہی آداب کے خلاف ہے۔ مجھے معاف کیجئے، میں کھڑی ٹھیک ہوں۔“

”پھر آپ ہی بتائیے، مجھے کس کا انتخاب کرنا چاہیے۔“

مرسل نے گہری سانس لی۔ وہ آگے ہو کے بیٹھا تھا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

”وانگ لی بہت ایماندار اور اچھا آدمی ہے، وہ پوری دنیا گھوما ہے، ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا تجربہ رکھتا ہے۔ وہ ابھی ایک لمبا عرصہ

ملاکہ میں رہے گا۔ جبکہ ابوالخیر کو تجارت اور حساب کتاب کا بہت تجربہ ہے۔ اس کے ملاکہ میں براونچے شملے والے سے تعلقات ہیں اور وہ

بہت ذہین بھی ہے۔“

”یعنی دونوں ہی اچھے ہیں مگر دونوں کو تو نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔“

”آقا۔ بات یہ ہے کہ وانگ لی کبھی نہ کبھی چین چلا جائے گا، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم کسی ایسے آدمی کو رکھیں جو ملاکہ میں ہی رہے اور

جس کی قبر بھی اسی ملک میں بنی ہوتا کہ ہمیں اس کی وفاداری پہ شک کرنے کا جواز ہی نہ ملے۔“ وہ دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھی۔ ”فیصلہ

آپ کو ہی کرنا ہے۔۔۔ جیسے آپ چاہیں، جو آپ بہتر سمجھیں مگر میری رائے میں۔۔۔“

دربار کے دروازے کھلے تو باہر کھڑی ملکہ اور مراد تیزی سے اس طرف گھومے۔ چند وزراء اور درباری جو پہنچ چکے تھے وہ بھی فوراً سیدھے

ہوئے۔

مرسل شاہ اور تالیہ ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے۔ مرسل نے ہاتھ کمر پہ باندھ رکھے تھے اور گردن کڑا کے چل رہا تھا جبکہ تالیہ لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے مسکراتی ہوئی باہر آرہی تھی۔ ملکہ کو دیکھ کے فوراً جھکی۔

”ملکہ!“

یان سوفو نے اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی زحمت بھی نہ کی۔ گھور کے مرسل کو دیکھا مگر وہ اس طرف متوجہ نہ تھا۔

”بند ہارا۔“ مرسل نے اٹھی گردن کے ساتھ حکم جاری کیا۔ ”تم وزیر خزانہ کی تعیناتی چاہتے تھے نا۔“

مراد نے، ”جی آقا“ کہتے ہوئے ایک بے چین نظر تالیہ پہ ڈالی۔

”سرکاری دستاویزات بنوا کے لے آؤ۔ میں ابوالخیر کو ملا کہ کانیا وزیر خزانہ مقرر کرتا ہوں۔“

جہاں مراد کے لبوں سے ایک تھکی ہوئی سانس نکلیں، وہیں یان سوفو کی آنکھیں بے یقینی اور غصے سے پھیلیں۔

”مگر آقا....“ وہ منمنائی۔

تالیہ اور مراد نے فاتحانہ مسکراتی نظروں کا تبادلہ کیا تھا۔

”شہزادی تاشہ آج سے دربار کا حصہ ہوں گی۔ میری خاص مشیر کے طور پہ۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جلد از جلد ان کی ’کرسی‘ (زور دیا) اور قلمبندان مہیا کر دیا جائے۔“

مراد نے مسکرا کے سر جھکایا۔ ”جو حکم آقا۔ میں ابھی بندوبست کر دیتا ہوں۔“

سامنے برآمدے میں کھڑے وزراء اور درباریوں نے مسکرا کے مبارک سلامت کی آوازیں بلند کیں۔ تالیہ نے مسکرا کے سر جھکا کے مبارک با قبول کی پھر مرسل شاہ کی طرف دیکھا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک عرض کروں، آقا؟“

یان سوفو تند ہی سے اسے گھور رہی تھی مگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ مرسل مسکرا کے حوصلہ افزائی سے بولا۔ ”کہیے شہزادی۔“ اس کی گردن آج پہلے سے زیادہ اٹھی ہوئی تھی۔

”میں شاہی مشیر کے طور پہ اپنا پہلا حکم جاری کرنا چاہتی ہوں۔“

مراد کی مسکراہٹ مٹئی۔ چونک کے اسے دیکھا۔ وہ واضح الجھا ہوا نظر آتا تھا۔

”بالکل۔ جو آپ مناسب سمجھتی ہیں، کہیے۔“

تالیہ نے چہرہ برآمدے میں کھڑے درباریوں اور وزراء کی طرف موڑا۔ وہ سب قیمتی پوشاک اوڑھے، خوبصورت پتھروں سے مزین ٹوپیاں پہنے کھڑے معزز افراد تھے۔ اس کی نگاہیں ان کے درمیان کھڑے ایک بوڑھے شخص پہ رکیں جو ہاتھ میں کانڈوں کا دستہ اٹھائے ہوئے تھا۔

”سیرل بن مرلی صاحب۔ آپ شاہی مورخ ہیں اور ملا کہ کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔“

اس کا پکارنا تھا کہ سب کو سانپ سوگھ گیا۔ گردنیں اس کی طرف مڑیں۔ سیرل اچنبھے سے آگے آیا۔

”جی شہزادی۔“ جہاں وہ حیران تھا وہاں ہلکا سا خوفزدہ بھی۔ حکومت ملتے ہی یہاں سب طاقت کے اظہار کے پہلے قدم کے طور پر کسی کی گردن مار دیتے تھے۔

”کیا آپ نے قدیم مصر پر لکھی کتابیں پڑھی ہیں؟“

”آ۔۔۔ نہیں شہزادی۔۔۔ مگر۔۔۔“

”اور آپ قدیم یونان کی تمام جنگوں کی تاریخوں سے واقف ہیں؟“

”نہیں مگر۔۔۔“

”اور آپ کو ہندوستان کے شاہی خاندان کا چودہ نسلوں تک کا شجرہ زبانی یاد ہے؟“

”نہیں، لیکن۔۔۔“

”آپ کو آپ کی شاہی ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے، سیرل۔ آج سے آپ آزاد ہیں۔“

وہاں ٹھنڈی خاموشی چھا گئی تو وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”بے فکر رہیے۔ میں آپ کی گردن مار دینے کا حکم نہیں جاری کروں گی۔ تاشہ کو اپنی طاقت کا اظہار کرنے کے لئے کسی کا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تاشہ کے پاس۔۔۔“ انگلی سے دماغ پر دستک دی۔ ”یہ ہے۔“

پھر ذرا سا مسکرائی۔ ”آپ آزاد ہیں۔ میں شاہی سپاہیوں کو حکم جاری کرتی ہوں کہ عزت و اکرام سے آپ کو اس محل سے رخصت کر دیں۔ آپ شہر چلے جائیے اور کوئی نیا کام ڈھونڈ لیں۔“

یان سوفو تن فن کرتی آگے آئی۔ ”کیا کسی کو نوکری سے اس لئے برخاست کر دینا درست ہے کہ اس کو یونان کی تاریخ نہیں معلوم؟“

”آپ کو معلوم ہے، ملکہ؟“ وہ اسی روانی سے بولی تو یان سوفو کا سانس اٹک گیا۔ چہرہ تو ہین سے سرخ ہوا۔ چند عزیزین یہاں تک کہ مراد نے بھی تادہ بنی نظروں سے تالیہ کو گھور مگر وہ مرسل شاہ کی طرف متوجہ تھی۔

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آقا کے پاس صرف مسائل لے کر آتے ہیں۔ میں مسائل کا حل لے کر بھی آتی ہوں۔ بچھلے دنوں میں نے اپنے کتب خانے میں ایک ایسے نوجوان خادم کو پایا ہے جو کتابیں پڑھنے اور لکھنے سے شغف رکھتا ہے۔ وہ بنگارا یا ملا یونانی ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ میں اس کی تحریر سے بہت متاثر ہوئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اسے شاہی مورخ مقرر کر دیا جائے اور پھر جو تاریخ وہ لکھے آقا کی شان میں جو قصیدے اس کے قلم سے تحریر ہوں، وہ صدیوں تک سلطنت ملا کہ کے لوگوں کو زبانی یاد رہیں۔ وہ اپنے کام میں اتنا ماہر ہے آقا کہ مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ اس کے لکھے الفاظ کو قیامت تک کے لئے امر کر دے گا اور ایک وقت آئے گا جب ملا کہ کے بچے

مدرسوں میں نصاب کے طور پر ہمارے آقا کے قصے پڑھ کے بڑے ہوں گے۔ آقا کے ذکر کے بغیر کسی شخص کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکے گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو شاہی مورخ مقرر کر دوں، آقا۔“ وہ جتنی نرمی اور ادب سے کہہ رہی تھی وہاں کھڑا ہر شخص محو کے سن رہا تھا۔

”اس کا تعارف سن کے اچھا لگا مجھے۔ اس کو بلاؤ اور مورخ کا قلمبندان اس کے حوالے کر دو، مراد۔“ راجہ کو حکم جاری کرنے کے بعد تالیہ سے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔ ”ویسے نام کیا ہے اس کا؟“

تالیہ طمانیت سے مسکرائی۔

”آدم۔ آدم بن محمد۔“

☆☆=====☆☆

دربار پر خاست ہوتے ہی یان سو فو تن فن کرتی اپنے کمرے میں واپس آئی تھی۔ تمام غلاموں کو اس نے باہر بھیج دیا اور ایک چینی عہدیدار کو اپنے پاس بلایا۔

جب وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو وہ اس کے قریب آئی اور چبا چبا کے کہنے لگی۔

”شہزادی تاشہ خود کو راجہ مراد کی بیٹی... اس کی کسی چینی بیوی کی اولاد کہتی ہے۔ جس شہر کا نام اس نے بتایا تھا، تم ابھی چین جاؤ اور اس شہر کا دورہ کرو۔ ایک ایک شخص سے مراد کی بیٹی تاشہ کے متعلق پوچھو۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ یہ کون ہے۔ کیا یہ واقعی شہزادی ہے یا کوئی کرائے کی عورت جسے مراد نے میرے خلاف تیار کر کے مرسل کے پاس بھیجا ہے۔“

وہ دانت پیس کے کہہ رہی تھی اور اس کی رنگت سرخ پر رہی تھی۔

”اصطبل سے تازہ دم گھوڑا، سفر کا سامان باندھو اور ابھی فوراً روانہ ہو جاؤ۔“

وفا دار چینی عہدیدار نے فوراً سر جھکایا۔ ”جو حکم ملکہ۔“ اور تیزی سے باہر کولپکا۔

ادھر ابوالخیر کے باورچی خانے میں کھڑے چاول صاف کرتے فاتح نے سراٹھا کے ایک دم بوڑھے باورچی کو مخاطب کیا۔

”آج کیا تاریخ ہے؟“

بوڑھا جو مصروف انداز میں سبزے کے پتے نکال رہا تھا، تاریخ بتانے کے سرسری سا پوچھنے لگا۔ ”کیوں؟ آج کے دن کیا ہوتا ہے؟“

فاتح سو گواریت سے مسکرایا۔ ”آج کے دن شہزادی تاشہ نے آدم بن محمد کو شاہی مورخ مقرر کیا تھا۔ وہ آدم بن محمد جس نے بنگارا ملا یو نامی کتاب لکھی تھی جو چھ سو سال بعد بھی نصاب میں پڑھائی جاتی رہے گی۔ آدم بن محمد۔“ دل میں سوچ کے وہ مسکرایا اور سر جھٹکتے ہوئے چاولوں پہ جھک گیا۔

☆☆=====☆☆

بند ہارا کے محل میں شہزادی تاشہ کے کمرے کے پردے ہٹے تھے اور دن کی روشنی اندر آرہی تھی۔ سلطنت محل سے واپس پہ وہ سیدھی کمرے میں آگئی تھی اور بستر کنارے پہ بیٹھی مسکرا کے ایڈم کا متوقع ردِ عمل سوچ رہی تھی جو اپنے مورخ بن جانے کی خبر سن کے دینے والا تھا۔ اسے بار بار ہنسی آرہی تھی مگر کنیزوں کی موجودگی کے باعث وہ اسے دبائے ہوئے تھی۔

کنیزیں اور غلام اس سامان کو اس کے کمرے میں رکھ رہے تھے جو مرسل شاہ نے تاشہ کے گھر جاتے ہی بھجوایا تھا۔ خالص ریشم، شہد، موتیوں کی ملائیں... اور... تالیہ نے وہ مخملیں ڈبی کھولی... ایک قیمتی انگوٹھی۔

اس پہ آنسو شکل کا سرخ یا قوت جزا تھا اور ننھے ہیرے آنسو کے کناروں پہ لگے تھے۔ وہ اتنی خوبصورت اور سحر انگیز تھی کہ چند لمحے کے لئے وہ بھی شل رہ گئی۔ پھر لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ اس نے انگوٹھی نکالی اور انگلی میں پہنی۔

اگلے ہی لمحے آنکھوں کے سامنے ایک منظر لہرایا۔

ایک خواب....

رات کا سیاہ آسمان تھا.... چاند چمک رہا تھا.... پہاڑی کا راستہ دشوار گزار اور پتھریلا تھا.... اونچا نیچا.... اور وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے... تالیہ آگے تھی... ایڈم پیچھے تھا... لباس اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا... بس تاریکی میں گویا دو ہیولے تھے جو اوپر چڑھتے جاتے تھے۔ تالیہ کے ہاتھ میں وہی سرخ یا قوت والی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

”چے تالیہ...“ وہ پیچھے سے ہانپتا ہوا بولا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”کیا ایڈم!“

”آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟“

”میں ہم دونوں کو بہت امیر کرنے جا رہی ہوں ایڈم!“ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

”کیسے؟“ وہ پلٹی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تاشہ کے خزانے سے جسے ہم دونوں کھود کے نکالیں گے۔“

”کیا؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”کیا تم اب بھی نہیں سمجھو ایڈم کہ تاشہ نے اس دیوار پہ وہ نظم کیوں لکھی تھی؟“ وہ مسکرائی۔

”کیوں؟“

”تاکہ ایڈم اور تالیہ اس دیوار تک جائیں اور وہاں مدفن خزانے کے راز کو کھود نکالیں۔ ہم دنیا کے سب سے طاقتور لوگ بن جائیں گے“

ایڈم۔“

”اور وان فاتح؟“ وہ پوچھ رہا تھا مگر تصویر دھندلی پڑتی گئی....

وہ چونکی۔ خواب ٹوٹا۔ اس نے بے یقینی سے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا۔ یہی انگوٹھی اس نے خواب میں بھی پہن رکھی تھی۔

وہ سمجھی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اس دن ہو گئی تھی جس دن ایڈم اور وہ مل کے سن باؤ کے گھر جا کے خزانے کو نکالنے کا سوچ رہے تھے۔ مگر نہیں۔ اس کے خواب ہو بہو مستقبل کا عکس ہوتے تھے۔

یعنی یہ منظر ابھی آنا تھا۔

یہ ”مستقبل“ تھا۔

یعنی... اس نے بے یقینی سے سوچا.... خزانہ واقعی اپنا وجود رکھتا ہے۔

خزانہ ہے۔

خزانہ واقعی ہے۔

تالیہ کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمکیں۔

وہ چابی لے کر جب ایڈم اور فاتح کے ساتھ واپس جائے گی تو وہ خالی ہاتھ نہیں جائے گی۔

خزانہ اس کا تھا۔ صرف اس کا۔

اور وہ اسے لے کر ہی قدیم ملاکہ سے واپس جائے گی۔

☆☆=====☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

حالم (نمرہ احمد)

باب نہم:

”جہاں ملتے ہیں تین چاند!“

اس نے خواب میں دیکھا.....

گہری سیاہ رات ہے.....

آسمان پہ پورا چاند چمک رہا ہے.....

اور وہ ٹھنڈی ریت پہ ننگے پیر چل رہی ہے...

ننھی ننھی چیزیں پیروں میں چھو رہی ہیں.....

مگر وہ جیہن سے بے پرواہ قدم اٹھا رہی ہے...

چنے کی ٹوپی نے اس کا سر ڈھانپ رکھا ہے.....

مگر ہوا کے باعث وہ پشت سے پھڑ پھڑا رہا ہے...

دفعاً ایک مقام پہ وہ ٹھہرتی ہے.....

سامنے آسمان پہ مکھن کی ٹکيا جیسا چاند چمک رہا ہے...

وہ نظریں دائیں طرف موڑتی ہے.....

وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کی چوٹی خوب روشن ہے...

جیسے شیشے کی بنی ہو...

اس چوٹی کے چمکتے شیشے میں ایک دوسرا چاند نظر آ رہا ہے.....

وہ ایک دم گھومتی ہے...

ہوا سے چنے کی ٹوپی پیچھے کوڑھلک جاتی ہے.....

سنہری بال پیچھے کواڑنے لگتے ہیں۔

اور اس کی سیاہ آنکھیں سامنے جم جاتی ہیں.....

وہاں سیاہ زمین ہے..... بالکل سیاہ کاغذ جیسی....

اور ایک چاند اس زمین پہ چمک رہا ہے....

”جہاں ملتے ہیں تین چاند۔“

وہ چونک کے بڑبڑاتی ہے....

پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلتے ہیں...

”یہاں.... ہاں، یہاں ملتے ہیں تین چاند!“

☆☆=====☆☆

تالیہ کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھلی۔

چند لمحے وہ چپٹ پڑی رہی۔ پھر ایک طرف ہاتھ مارتا کہ ٹیبل لیپ جلائے.... یاریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کرے.... یا موبائل اٹھا

کے وقت دیکھے.... مگر.... پلنگ کے ساتھ تپائی پہ ایسا کچھ نہ کھا تھا۔ نہ موبائل، نہ ریموٹ۔

ذہن کو بیدار ہونے میں چند لمحے لگے اور پھر اسے یاد آیا کہ وہ کوالا پور میں نہیں تھی۔

وہ قدیم ملاکہ میں تھی۔

وہ سست روی سے اٹھی اور دیا سلائی سلگا کے چند موم بتیاں روشن کیں۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

یہ آدھی رات کا وقت تھا اور سارا محل خاموش پڑا تھا۔ تالیہ نے کھڑکی کے پردے ہٹا کے جھانکا تو آسمان پہ باریک کمان سا چاند جگمگا رہا

تھا۔

”جہاں تین چاند ملتے ہیں۔“ چاند کو تکتے ہوئے بے خودی سے دہرایا۔ ”کیسی عجیب سی جگہ تھی وہ....“

پھر چونک کے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ انگلی میں سرخ یا قوت اور ہیروں والی آنسو شکل انگلی بنوڑ موجود تھی۔ کیسا عجیب سا آنسو تھا وہ۔

دل کے رنگ جیسا۔

خون کے رنگ جیسا۔

ایک دم جیسے کوئی یاد آیا۔

اس نے میز سے گھڑی اٹھائی اور وقت دیکھا۔ یہ کاغذ کی بنی قدیم گھڑی تھی جس کے دو خانے تھے۔ اوپر والے میں ریت بھری تھی اور

سورخ سے ذرہ ذرہ کر کے ریت نچلے خانے میں گر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ۔ اس نے ریت کی مقدار سے اندازہ لگایا کہ ابھی رات کے بارہ یا

ایک بجے تھے۔ وہ مسکرائی اور گھڑی رکھ دی۔

اسے کسی سے ملنے جانا تھا۔

☆☆=====☆☆

ابوالخیر کی حویلی اس وقت اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ اوپر تیر کمان جیسا چاند جگمگا رہا تھا۔ چند پہریدار جمائیاں لیتے پھانک اور چار دیواری کے گرد بہرہ دے رہے تھے۔ مگر باورچی خانے کی چمنی کے ساتھ مڑوٹی چھت پہ بیٹھی تالیہ ان کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

وہ سیاہ پا جامے قمیص میں ملبوس بالوں کو سیاہ کپڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ دور سے وہ کوئی نوجوان لڑکا نظر آتی تھی جو اکڑوں بیٹھا، اداسی سے گھٹنوں پہ سر رکھے ہوئے تھا۔ ہاں ہاتھ میں دقتی سرخ آنسو والی انگلی اس کی نسوانیت کا پتہ دیتی تھی۔ اوپر چڑھتے فاتح کی پہلی نظر اس انگلی پہ پڑی تھی۔ دوسری اس کے تاریکی میں ڈوبے چہرے پہ۔ رسی پرے پھینکتا وہ اس کے قریب آ کے بیٹھا۔

”تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

تالیہ نے سر اٹھا کے اسے سادگی سے دیکھا۔

”مجھے راجہ کے کمرے کی تلاشی لینے کا موقع ابھی تک نہیں مل سکا۔ چابی کہاں ہے، میں نہیں جانتی، لیکن جیسے ہی وہ ہمیں ملی، ہم

واپس.....“

”میں وزیر خزانہ کی تعیناتی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“ وہ کھنکھار کے بولا تو وہ چپ ہوئی۔ ”اوہ!“

”سن باؤ وانگ لی..... یا.....! ابوالخیر... تم نے کس کو چنا؟“

”کس کو چننا چاہیے تھا؟“

”ظاہر ہے وانگ لی کو۔ اس میں وہ دونوں خوبیاں ہیں جو ہمیں کسی کو جاب دیتے وقت امیدوار میں تلاشی چاہئیں۔ اس جاب کو کرنے

کی قابلیت اور امانت داری۔“ اس کا ذکر کرتے ہوئے فاتح کی آواز میں نرمی گھل گئی۔ ”جبکہ ابوالخیر ایک بدنیت اور نا اہل آدمی ہے۔“

وہ چند لمحے اس کا چہرہ مکتی رہی۔ ”میں نے ابوالخیر کا نام تجویز کیا ہے اور سلطان نے تائید کرتے ہوئے فیصلے پہ مہر لگا دی ہے۔“

حویلی کی چھت پہ سناٹا چھا گیا۔ فاتح چند لمحے تو کچھ کہہ نہیں سکا۔ پھر اس کے ابرو بھنج گئے۔

”تم نے ابوالخیر کی طرفداری کیوں کی؟“

”کیونکہ مجھے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے مضبوط حلیفوں کی ضرورت ہے۔ اور مجھے مراد راجہ کو بھی خود سے خفا نہیں کرنا۔“

”تو تم نے یہ اپنے لئے کیا ملاکہ کے لوگوں کے لئے نہیں؟“

تالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور سادگی سے اسے دیکھا۔

”آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے، تو انکو؟“

”میں ملاکہ کے لوگوں کو وانگ لی جیسے ایماندار اور قابل آدمی کا تحفہ دیتا۔“

”وہ غیر ملکی ہے۔ بھلے اس کی ہمارے سلاطین اور رئیسوں سے گہری دوستی ہی کیوں نہ ہو، وہ ہمیشہ یہاں ایک اجنبی آدمی ہی رہے

گا۔ بالفرض میں اس کا چناؤ کر بھی دیتی تو صبح ہونے سے پہلے ابو الخیر یا رجبہ مراد سے مروا دیتا۔ مقابلہ ختم ہو جاتا اور ہمیں ابو الخیر کو ہی وزیر بنوانا پڑتا۔ (فاتح سر جھٹک کے سامنے دیکھنے لگا) یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، تو انکو... جہاں اتنی آسانی سے قتل نہیں ہو سکتے۔ یہ بادشاہت ہے۔ یہاں کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہاں عدالتیں حکمرانوں کے تابع ہوتی ہیں۔ میں ایک چینی کو ملا کہ کا وزیر خزانہ بنوا بھی دیتی تو لوگ اسے تسلیم نہ کرتے اور اگر وہ مر جاتا تو اس کے لئے کوئی نہ روتا۔ میں نے اس کی جان اور اپنے ملک کا امن بچایا ہے۔ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ اگر سیاست یہ نہیں ہوتی تو میں نہیں جانتی کہ سیاست کیا ہوتی ہے۔“

”وانگ لی اس ملک کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا۔“ وہ تلخی سے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بنکار املا یو میں کیا لکھا ہے؟ کیا وانگ لی کوتاہی نے وزیر بنایا تھا؟“

فاتح نے گہری سانس لی۔ ”اس میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں درج نہیں تھیں۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ شاید وہ عظیم کارنامے جو وانگ لی نے سر انجام دیے تھے وہ وزیر بن کے کیے ہوں اور مورخ ان کو لکھنا بھول گیا ہو۔“

”مورخ!“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”جانتے ہیں شاہی مورخ کون ہے؟“

”جانتا ہوں۔“ اسے اس وقت مورخ کے ذکر میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خفا نگاہیں سامنے پھیلی تھیں جہاں اندھیرے میں ذوقا قدیم ملا کہ پھیلا تھا۔ دو چار گھروں میں مشعلیں جلتی نظر آرہی تھیں۔ یوں لگتا جیسے سیاہ چادر کے سارے سنہری تارے ٹوٹ گئے ہوں اور صرف ایک آدھ تارہ انکا ہوا جگمگا رہا ہو۔

”ابو الخیر اور رجبہ کی بلیک میلنگ سے ہار ماننے کی بجائے یہ عہدہ وانگ لی کو دے کر اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کیا جاسکتا تھا۔“

”آپ کی وانگ لی سے کتنی بات چیت ہوئی؟“

”بات چیت؟“ فاتح کی آواز آہستہ ہوئی۔ نظریں دور پھیلے ملا کہ پہنچی تھیں۔ ”میں باورچی خانے میں تھا جب اس کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس کے نام نے مجھے چونکایا تھا۔ میں طشت لے کر اندر گیا اور اس کے سامنے شور بہ رکھا۔ اس نے مجھے صرف ایک نظر دیکھا۔ میرے اوپر دوسری نظر اس نے رات کھانے پہ ڈالی جب تم بھی وہاں موجود تھیں اور امور سلطنت پہ گفتگو کی جارہی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد ابو الخیر نے اسے زہر ملا شور بہ میرے ہاتھوں پلوانا چاہا مگر میں نے اسے خبردار کر دیا۔ پھر جب وہ اپنی سواری پہ چڑھ رہا تھا تو میں باورچی خانے کی چوکھٹ پہ کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ میری اس سے اتنی ہی ملاقات ہوئی بس۔“

تالیہ ایک دم ہنس پڑی۔ فاتح نے قدرے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ لبوں پہ رکھے ہنستی جارہی تھی۔

”اتنا مزاجیہ کیا تھا اس میں؟“

تالیہ نے بدقت مسکراہٹ روکے منہ سے ہاتھ ہٹائے۔

”آپ فین مومنٹ میں ہیں۔“

”کیا؟“ اس نے ناگواری سے ابرو اٹھائی۔

”ایک زمانے میں میں ’تالیہ مراد‘ کسی کے گھر کام کرتی تھی۔“ ہتھیلی گال تلے جمائے مزے سے بتانے لگی۔ ”ایک روز کچن میں میں نے ساتھی ملازماؤں سے پوچھا کہ اتنا ہتمام کس کے لئے کیا جا رہا ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ملک کا گلا وزیراعظم مدعو ہے۔ (فاتح ہلکا سا مسکرایا۔ اب وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔) اور پھر میں نے اس سیاستدان کو جوس پیش کیا۔ میں بھی اعلیٰ ایوانوں کی گفتگو کے دوران دروازے سے باہر کھڑی سنتی رہی تھی اور میں نے بھی کچن کی کھڑکی سے ان دونوں میاں بیوی کو اپنی سواری میں سوار ہوتے دیکھا تھا مگر مجھے اس سیاستدان نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ بلکہ جب میں نے ان ہی کے گھر ان ہی کی ڈانٹنگ ٹیبل پہ ان کو گھائل غزال کے جعلی ہونے کی سازش سے مطلع کرنا چاہا تو مجھے لگا وہ میرا یقین نہیں کریں گے۔ اچھی بات ہے کہ آپ نے سچ بولنے کی ہمت کی اور سن باؤ کو مطلع کر دیا۔ میں نہیں کر سکتی تھی۔ مگر شاید اس لئے کہ میں ان کے سامنے ہمیشہ فین مومنٹ میں ہوتی تھی۔ تالیہ دی فین گرل۔“

آخر میں وہ دوبارہ ہنسی مگر اب کی بار وہ ہنسی تلخ تھی۔ استہزائیہ۔ اپنا مذاق اڑاتی ہوئی۔

”میں اس کا فین نہیں ہوں۔ میں....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ تالیہ چند لمحوں فقرہ مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ وقت کے اس قیدی سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

عموماً ملاقات کے ختم ہونے کا احساس ڈائری اٹھائے اس کا سیکرٹری دلایا کرتا تھا اور پھر اگلی مینٹنگ کے بارے میں مطلع کرتا تھا۔ تالیہ نے یونہی ادھر ادھر دیکھا۔ آج اس کا کوئی سیکرٹری، کوئی باڈی مین اس کے وقت کا حساب رکھے ہوئے ارد گرد منڈلا نہیں رہا تھا۔ وان فاتح ان کی زندگیوں سے نکل چکا تھا اور چند دن پولیس نے اسے تلاش کرنے کے بعد کیس فائلز کے ڈھیر میں بھلا بھی دیا ہوگا۔ اس کے سیکرٹری نے اگلی جاب بھی شروع کر دی ہوگی۔ سب آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ صرف وہی پیچھے رہ گئے تھے۔ قید۔

وان فاتح اب رسی سے نیچے اتر رہا تھا اور بالوں کو رومال میں لپیٹے بیٹھی تالیہ یا سیت سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ جنگل کے ان سارے دنوں کے بعد آج وہ عرصے بعد دوبارہ سے فین مومنٹ میں گھری تھی۔ مگر کیا وہ اب تک فاتح بن رامنزل کی فین تھی؟ یا الوژن ٹوٹ چکا تھا؟

مگر پھر.... الوژن کے پار.... کیا نظر آیا تھا اسے؟

☆☆=====☆☆

اس صبح بندہ ہار کے محل سے سورج کی کرنیں ٹکرا رہی تھیں۔ دربار کی کھڑکیوں سے چھن کے آتی روشنی دربار کو منور کیے ہوئے تھی۔ اونچے تخت پہ شہزادی تاشہ ریشمی لباس کو پھول کی طرح پھیلائے بیٹھی تھی۔ سر پہ ہیروں کا تاج سجا تھا اور ہاتھ میں چاندی کا آمینہ تھامے وہ آنکھوں کا سنگھار دیکھ رہی تھی۔

دفعۃً دروازے کھلے اور منادی کرنے والے نے صدا لگائی۔ ”قیدی ’آدم‘ حاضر ہو۔“

ایڈم اندر داخل ہوا تو پیچھے دروازے بند کر دیے گئے۔ وہ دربار کی چوکھٹ پہ تنہا کھڑا تھا۔ کوئی کنیز، کوئی غلام موجود نہ تھا اور تخت پہ بیٹھی شہزادی آئینہ دیکھنے میں مصروف تھی۔

ایڈم نے اطراف پہ نظر دوڑائی۔ عالیشان وسیع وعریض دربار.... چھت پہ بنے نقش و نگار.... کھڑکیوں پہ گرے مخملیں پردے.... ہر شے رعب طاری کر دینے والی تھی۔ مگر ایڈم نے دل چھوٹا نہ کیا۔ آج عرصے بعد اسے صاف لباس دیا گیا تھا، جس میں کلف بھی لگا تھا۔ پاجامہ اور چھوٹا کرتا۔ ہم رنگ جوتے۔ وہ اعتماد سے قدم اٹھاتا تخت کے سامنے آیا اور سر جھکا کے سلام کیا۔

”شہزادی!“ سر اٹھا کے تالیہ کے چہرے کو براہ راست دیکھا۔

”میں جانتا ہوں آپ شرمندہ ہیں، مجھے اتنے دن جیل میں رکھنے اور تیسرے درجے کا کھانا دینے کے لئے۔ مگر آپ بے فکر رہیں، میں نے آپ کو معاف کیا کیونکہ آپ نے مجھے دنیا کی بہترین کتابوں سے روشناس بھی تو کروایا ہے۔“ بڑی سخاوت سے انگریزی میں بولا۔

تالیہ نے ناک سکوڑی، آئینہ پرے رکھا اور تندہی سے اسے کھورا۔

”گرفتاری کے وقت یہ تھیلا تمہارے پاس سے ملا تھا۔“ سرخ انگوٹھی والی انگلی سے شہزادی نے اشارہ کیا تو ایڈم نے دیکھا، درباریوں کی خالی کرسیوں میں پہلی کرسی کے سامنے میز تھی جس پہ ایک تھیلا رکھا تھا۔ ساتھ موم بتی، کاغذ، قلم، سیاہی وغیرہ ترتیب سے رکھے تھے۔ ایڈم نے تھیلا اٹھا کے دیکھا۔

”جی یہ میرا ہی ہے۔“ اس نے اندر سے کاغذ نکال کے دیکھے۔ پھر قدرے حیران ہوا۔ ”ایک منٹ۔ پہلے صفحے ”بنگارا یا ملایو“ اور نیچے مصنف کا نام بھی لکھا تھا۔ ابو بکر تم گنگ.... وہ صفحہ کہاں گیا؟“

”وہ صفحہ میں نے پھاڑ کے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“

”مگر وہ کیوں؟“

شہزادی نے ایک شان بے نیازی سے سنہری لٹ پیچھے کی۔

”اگر میں وہ رہنے دیتی تو قید خانے کا داروغہ جان لیتا کہ یہ دستہ تمہارا نہیں، کسی ابو بکر کا ہے۔ تم پہ چوری ثابت ہو جاتی اور مجبوراً قانون کے مطابق اسے تمہارا ہاتھ کاٹنا پڑتا۔“

ایڈم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”ہیں؟“

”نہیں خیر ہے، اگر تمہیں اپنا ہاتھ پیارا نہیں تو کھل کے بتا دو۔ میں ابھی کٹوائے دیتی ہوں۔“

”ارے واہ.... کیسے کٹوائے دیتی ہیں؟“ وہ چمک کے بولا۔ ”پہلے بتائیے مجھے چوری کرنا سکھائی کس نے تھی؟“

”جس نے سکھائی تھی اس نے اپنے سکھانے کا ثبوت تو چھوڑا نہیں ہوگا۔ ہے نا۔“ تھیلی پہ چھوڑی جمائے پلکیں جھپکا کے اسے دیکھا۔

ایڈم لمحے بھر کو چپ ہوا۔ پھر نظریں اس کاغذ پہ جھکا لیں۔

”غیر... فی الحال اس کتاب پہ کسی دوسرے کا نام نہیں لکھا۔ یعنی یہ تھیلا میرا ہی ہے۔“ گھور سے تالیہ کو دیکھا۔ وہ اونچے تخت پہ بیٹھی تھی اور ایڈم نیچے کھڑا تھا۔

”یہ ہوئی نابات۔ اب تم محفوظ ہو۔ ویسے وہ کون تھا جس کی یہ کتاب تھی۔“ وہ مسکرا کے دوستانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

”ہونہ۔“ تھا کوئی کنگال رائٹر۔ بلکہ رائٹر تو پھر بہتر ہوتے ہیں وہ تو بے چارہ کوئی مورخ تھا۔“ ایڈم نے خوب ناک چڑا کے سر جھٹکا۔

تالیہ نے مزید دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”اور مورخین کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔“

”مورخین؟ ہا!“ اس نے بد مزگی سے سر جھٹکا۔ ”میرے نزدیک مورخین اتنی ہی دوئیں لوگ ہوتے ہیں۔“

”اچھا؟ دوئیں؟“ تالیہ نے دوبار پلکیں جھپکائیں۔

”اور نہیں تو کیا۔ آپ کے خیال میں کیا یہ سچ لکھتے ہیں؟ یہ بادشاہوں کی عظمت کے قصے جو ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں، اس میں زیادہ تر مبالغہ آرائی ہوتی ہے جو مورخین اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔ تقریباً سارے بادشاہ طاقت کی ہوس میں مبتلا ظالم لوگ ہوتے تھے۔ سوائے دو چار کے، انسانی تاریخ کرپٹ حکمرانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر تاریخ کی کتابیں پڑھو تو بادشاہ رحم دلی اور عظمت کا پیکر لگتے ہیں۔ خوشامدی درباری مورخین کے کارنامے۔ ہونہ۔“

”ہوں۔ کتنے نیک خیال ہیں تمہارے۔ اور بنگارایا ملایو کے مورخ کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ مسکرا کر اس کے دلچسپی سے پوچھ رہی تھی۔

”بنگارایا ملایو میں نے پڑھی تو نہیں ہے، مگر اس کا رائٹر... اس کا کنگال رائٹر دیکھا تھا اس دن میں نے سرائے میں۔“ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ ”ابھی اس نے کتاب کا پہلا صفحہ بھی نہیں لکھا۔ یعنی یہ کتاب ابھی اس نے لکھنی ہے۔ ہوں۔ یعنی اب وہ آپ کے پاس آئے گا اور آپ کی خوشامد کرے گا۔ جواب میں آپ اس کو مالا مال کر دیں گی کیونکہ میں نے سنا ہے بنگارایا ملایو میں شہزادی تاشہ کی وہ خوبیاں بیان کی گئی ہیں جن کا آپ میں ہونا مشکوک ہے۔ اور ایسا صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایک لالچی، مفاد پرست اور جھوٹے آدمی کو شاہی مورخ کا عہدہ دینا ہے۔“

اپنی طرف سے مسکرا کے وہ تاک تاک کے نشانے لگا رہا تھا۔ مگر تالیہ دلچسپی سے سنے جا رہی تھی۔

”چچ چچ... کتنا کوئی جھوٹا اور بیچ آدمی ہو گا ہمارا اگلا شاہی مورخ۔“

”ہونہ۔ شہزادی کی خوشنودی کے لیے ایمان بیچ دینے والا مورخ۔ اور وہ کنگال رائٹر ابو بکر... وہ... ایک منٹ... جو بنگارایا ملایو میں پڑھائی جاتی تھی اس کے مصنف کا نام ابو بکر نہیں تھا۔ اس کا نام آدم بن محمد تھا مگر خیر... ہو گا وہ بھی جھوٹا اور...“

ایڈم کو بولتے بولتے ایک دم چپ لگی۔ جیسے کسی نے سر پہ کچھ دے مارا ہو۔

ایک دم وہ آگے بڑھا اور جس میز پر اس کا تھیلا پڑا تھا وہاں رکھی تختی اپنی طرف موڑی تاکہ اس پہ کنندہ نام سامنے آسکے۔ وہ کرسی شاہی مورخ کی تھی اور بھلا کون سا نام لکھا تھا اس پہ؟

”آدم بن محمد۔ شاہی مورخ۔“

ایڈم کے لب بے یقینی سے کھل گئے۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے۔

شہزادی اپنا گاؤں جھلکتی اٹھی اور ایک شان سے چبوترے کے زینے اترنے لگی۔ ایڈم سانس روکے اس تختی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ شاہی مورخ کی کرسی اور اس کا سامان تھا۔

تالیہ اس کے قریب رکی اور ایک رول شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

”آدم بن محمد۔ آج سے تم ملاکہ کے سلطان مرسل شاہ کے شاہی مورخ تعینات کیے جاتے ہو۔“ کاغذ جھٹکا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ شاہی حکم نامہ تھا اور نیچے مرسل شاہ کی مہر نصب تھی۔ ”تم بنگار لایا ملا یو لکھو گے۔ تاشہ پھونا کے دور کی کہانی جو صدیوں یاد رکھی جائے گی۔ تمہارے نام کے ساتھ۔ تم... ایڈم بن محمد ملاکہ سلطنت کے ”آدم بن محمد“ ہو۔“

وہ بالکل ششدر کھڑا تھا۔ ”کیا واقعی ”میں“ وہ عظیم کتاب لکھوں گا؟ میں؟“

”بالکل۔“ وہ مسکرائی۔ ”اور تم اس داستان میں سب جچ لکھو گے۔ تمہاری شہزادی کبھی تمہیں جھوٹ لکھنے کو نہیں کہے گی۔ تم میری تاج اور تخت کی اس جنگ کو دیکھ کر جو محسوس کرنا وہی جچ لکھ ڈالنا۔“

”واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔ ”میں سب جچ لکھ سکتا ہوں؟“

”بالکل بھی نہیں،“ مسکراہٹ غائب کی اور ماتھے پہ بل ڈال کے اسے گھر کا۔ ”اتنے اعلیٰ عہدے مفت میں نہیں ملا کرتے۔ اس لیے میرا احسان مانو اور جو میں کہوں وہی لکھنا ہے تم نے۔ تمہارے ایک ایک لفظ پہ میری نظر ہوگی اچھا! زیادہ اسماٹ بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ایک انگال رائٹر کا تھیلا چوری کروانے کے جرم میں ہاتھ کٹوا دوں گی تمہارا۔ ہونہ۔“ ایک ادا سے سر جھٹکا اور آگے چل دی۔ اس کا ریٹھی شاہی لباس اس کے پیچھے پیچھے فرش پہ جھاڑو دیتا جا رہا تھا۔

ایڈم نے کینہ تو نظروں سے اسے دور جاتے دیکھا۔

”اگر اس تاشہ کو ساحرہ کی جگہ جادوگر نے بنا کے پیش نہ کیا تو میرا نام بھی ایڈم بن..... آدم بن محمد نہیں... ہاں۔“ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔

میز پر رکھے شاہی حکم نامے کی سیاہی سوکھ چکی تھی اور مومی مہر جم چکی تھی۔ ساتھ سچے قلم دوات اب اپنے لکھاری کے منتظر نظر آتے تھے۔

☆☆=====☆☆

صبح کی سفیدی نے ابوالخیر کی حویلی کے صحن کو روشن کر رکھا تھا۔ صحن کے کونے میں بچوں کے بل بیٹھا فاتح مشکیزے سے پانی ہاتھوں میں

بھرتا چہرے پہ ڈال رہا تھا۔ نماز کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور آج کسی نے دوبارہ آواز تک نہیں دی تھی۔ وہ اٹھا تو روشنی پھیل چکی تھی

آستین سے گلیا چہرہ رگڑتا وہ کچن کی طرف چل دیا۔ زندگی عجیب مختلف سی ہو چکی تھی۔ وہ صبح کی میلوں دور کی جاگنگ۔ وہ شام کا جم۔ وہ کے ایل کی عمارتوں کے کارڈورز میں اپنے جیسے افراد کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے سیکرٹری کی بریفنگ سننا۔ وہ میٹنگز اور کانفرنسز کی سربراہی کرنا۔ وہ لوگوں سے بھرے ہال اور اسٹیج پہ کھڑا تقریر کرتا وان فاتح۔ وہ کیمروں اور مائیکس کے سامنے فلیش لائٹس کی چمک میں اتر ویو دیتا آدمی۔ وہ سب کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔ بجلی اور برقی آلات سے غیر مانوس ایک قدیم شہر میں وہ پھنس گیا تھا جہاں وہ صرف ایک قیدی غلام تھا۔ اور کچھ نہیں۔ یہ سب کہاں جا کے ختم ہوگا؟ وہ اس بارے میں کم سے کم سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔

خیالات کو ذہن سے جھٹکتا وہ باورچی خانے میں آیا تو سب مصروف نظر آتے تھے۔ ایک طرف دیگچے میں غلاموں کے لئے پھیکا بد مزہ دلیہ بن رہا تھا۔ باقی تمام چولہوں پہ ابوالخیر اور اس کے اقارب کے لئے شاہانہ ناشتے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے آیا اور چاولوں کا تھال اٹھایا تو نگران باورچی نے روک دیا۔

”تم رہنے دو۔“ کڑا ہی میں آٹے کے پیڑے تلے ہوئے وہ عام سے انداز میں بولا۔ ”تمہارے لئے نیا لباس رکھا ہے۔ وہ تم پہن لو۔ اور ابھی آرام کرو۔ کوئی کام ہوا تو بلوالو گا۔“

فاتح بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ پھر بے دلی سے تھال پرے ڈالا اور اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ وہاں تازہ پوشاک رکھی تھی۔ صاف ریٹمی ٹوپی۔ نئے جوتے۔

عجیب وحشت ناک چیزیں تھیں وہ۔ جیسے مہنی بیڑیاں اتار کے طلائی بیڑیاں پہنائی جا رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ نیا لباس پہنے، ماتھے پہ سبز پٹی باندھے، اصطبل کے زینوں پہ بے کار سا بیٹھا تھا۔ اس کی طرح کے دو اور غلام بھی آج نئے لباس میں آگے پیچھے ٹہلتے نظر آرہے تھے۔ ان کا بھی یہ آرام کا دن تھا۔ کسی بڑی قربانی سے پہلے کا آرام!

اصطبل میں جگہ جگہ گھوڑے بندھے تھے۔ ہر گھوڑے کی اپنی کوٹھڑی تھی جس میں وہ آرام سے بیٹھا کچھ کھاتا پیتا نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں وہ ایجو غلام ایک گھوڑے کو بار نکال کے لایا اور اس کی گردن کے چمک دار بال کھینچنے لگا۔ (بال گھڑسواری کے دوران مشکل پیدا کر سکتے ہیں) اس لئے ان کو سنوار کے کھینچ کے اکٹھا کیا جاتا ہے تاکہ وہ سستے رہیں۔

فاتح ایک دم آستینیں چڑھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”نمبردار... رکو۔“ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ اس کے قریب آیا۔ ”اس کے بالوں کو مت چھوؤ۔ ابھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گھوڑے کے کھانے کے وقت سے پہلے اس کے بالوں کو نہیں چھوتے۔“

ایجو نے رخ نہیں موڑا، نہ ہی کوئی تاثر دیا۔ بس سنجیدہ چہرے کے ساتھ جھٹکے سے بال چھوڑ دیے۔ فاتح نے ایک گہری نظر اس کے

چہرے کے زاویوں پہ ڈالی۔

”میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

الہیو نے اکھڑا اکھڑا سا چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ ارد گرد کام کرتے غلام بھی رک کے ان دونوں کو دیکھنے لگے تھے۔ وہاں ابو الخیر کا کوئی سپاہی موجود نہ تھا۔ سارے کام غلام ہی نبھار رہے تھے۔

”اس گھوڑے کو واپس اندر لے جاؤ۔ ویسے بھی یہ ٹھوس بھورے رنگ کا ہے۔ ٹھوس رنگوں کے گھوڑوں کو سدھانا مشکل ہوتا ہے، یہ کام تم سے نہیں ہوگا۔ وہ سفید گھوڑا جس میں بھورے دھبے ہیں..... (باز ولسا کر کے تحکم سے ایک طرف اشارہ کیا۔) اس کو لے کر آؤ اور اس کے بالوں سے شروع کرو۔ دھبوں والا گھوڑا اتنا تھرا نہیں ہوتا۔“

الہیو نے تلخی سے گھوڑے کی لگام پختی اور پورا اس کی طرف گھوما تو آنکھوں میں غصہ تھا۔

”تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“

”تا کہ یہ گھوڑا تمہیں دوتی مار کے ہلاک نہ کر دے۔ خدا کی قسم اگر اس نے ایسا کیا تو ابو الخیر کو تم سے زیادہ گھوڑے کے پیروں کی فکر ہو گی۔“

”اور کیا تمہیں ہماری فکر ہے؟ برگز نہیں۔ تم تو اب جا رہے ہو۔ اگلے ہفتے نیلای ہے جس پہ تمہیں فروخت کر دیا جائے گا۔ کسی رئیس یا سلطان کے محل میں تم عیش کرو گے۔“

فاتح قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”میرا نام فاتح بن رامزل ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی وعدے نہیں توڑے۔ کبھی اپنے لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ غور سے سن لو میری بات۔“ کہہ کے وہ اپنے قدموں پہ آہستہ آہستہ گھوما۔

ارد گرد کام روک کے کھڑے تمام غلام یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

”بچھلے ایک ماہ میں بروز جب میں تم سے ملتا ہوں تو ایک ہی بات کہتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں ایک غلام سے دوسرے تک کا سفر کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ”کہ اپنے لئے لڑنا سیکھو۔ کسی کو اجازت مت دو کہ وہ تمہیں جسمانی اذیت پہنچائے یا تمہیں اپنا غلام بنائے۔ اللہ نے ہم سب کو آزاد پیدا کیا ہے مگر کچھ انسان ہم سے یہ آزادی چھین لیتے ہیں۔ آزادی واپس لینے کے لئے لڑنا پڑتا ہے، جان ماری پڑتی ہے۔ اور اگر تم لوگ....“ اس کی آواز دھیمی مگر صاف تھی۔ سب دم سادھے سن رہے تھے۔

”اگر تم لوگ اپنے لئے نہیں لڑ سکتے تو بھی میں تمہارے لئے لڑوں گا۔ میں تمہارے لئے واپس آؤں گا۔ میں تمہیں اس قید سے نکالوں گا۔ میں اپنے لوگوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور مجھے وعدے نبھانے آتے ہیں۔“

وہ واپس الہیو کی طرف گھوما۔ الہیو کے کندھے ڈھیلے پڑ چکے تھے البتہ آنکھوں کا شاکی پن کم نہ ہوا تھا۔

”اس لئے جب فاتح بن رامنزل تمہیں حکم دے کہ گھوڑے کے شر سے خود کو بچاؤ تو اس حکم کی تعمیل کرنا سیکھو۔ مجھے وہ لوگ نہیں پسند جو مجھ پہ بھروسہ نہیں کرتے!“

پھر اس نے بھورے گھوڑے کی گردن تھپتھپائی۔ گھوڑے نے فوراً سر اس کی طرف جھکا دیا۔

”تم ادھر آؤ!“ ایک دوسرے غلام کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ سارے کام چھوڑ کے بھاگا چلا آیا۔

”اس کو کھانا کھلاؤ“ اور پھر استرا لے کر اس کے بال اطراف سے کاٹ دو، مگر تب جب وہ پرسکون ہو۔ پھر اس کے بالوں کی مینڈھیاں بناؤ تاکہ وہ گردن کے ایک طرف پڑی رہیں۔ برتیسرے دن تم اس کی مینڈھیاں کو کھول کے نکٹھا کر کے دوبارہ ان کو گوندھ دو گے تاکہ اس کا ایک بھی بال خراب نہ ہو۔“

غلام نے ادب سے سر کو خم دیا۔ فاتح نے گھوڑی کی گردن سے ہاتھ ہٹایا اور ایک آخری نظر الینو پہ ڈالی جو قدرے نرم قدرے خفا سا کھڑا تھا۔

”میں تمہارے لئے واپس آؤں گا، لیکن صرف تب جب تم مجھ پہ بھروسہ کرو گے۔ معجزے صرف ان لوگوں کو ملتے ہیں جو معجزوں کے ہونے پہ یقین رکھتے ہیں۔“ اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تمام غلام راستہ چھوڑ کے ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا چلتا جا رہا تھا اور وہ مڑ مڑ کے اسے دیکھ رہے تھے۔

ان کے میلے، گدے، مفلوک الحال چہروں پہ ڈھیروں امید تھی اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی۔

☆☆=====☆☆

”سلطنت محل“ کا دربار اس دو پہر ویران ویران سالگتا تھا۔ درباریوں کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ تخت پہ سلطان مرسل شاہ بیٹھا میز پہ رکھے کاغذ دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی نازک سی پیالی سے قبوے کے گھونٹ بھی بھر رہا تھا۔

اس کے کندھے کے قریب کھڑا راجہ مراد ایک کے بعد ایک کاغذ اس کے سامنے رکھتا اور اس کے متن سے آگاہ کرتا۔

”ہم آپ کے چچا (سابق سلطان) کے مقرر کردہ تمام اعلیٰ عہدیداروں کو ان کی نشستوں سے معزول کر کے اپنے وفادار آدمی ان جگہوں پہ بٹھا رہے ہیں۔ یہ کوتوال کی تعیناتی کا حکم نامہ ہے، آقا۔ آپ مہر لگا دیجئے۔“ کہتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے مرسل کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھ رہا تھا۔

”مفسد بن غالب۔“ مرسل نے گھونٹ بھرتے ہوئے نئے کوتوال (پولیس چیف) کا نام پڑھا۔ ”کیا یہ آدمی سابق کوتوال سے زیادہ اچھا ہے؟ سابق کوتوال اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے باعث عوام میں بہت مقبول تھا، مراد۔“ اے جیسے اچھا ہوا۔

”بالکل آقا، وہ مقبول تھا، مگر وہ آپ کے چچا زاد بھائیوں کا حامی ہے۔“ مراد جلدی سے بولا۔ تیز چمکتی آنکھیں مرسل کے چہرے پہ جمی تھیں۔

”آپ کے چچا زاد بھائی (سابق سلطان کے بیٹے) سلطان بنا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو آپس میں لڑوا کے محل سے نکالا تھا۔ وہ مفرور ہیں مگر کبھی نہ کبھی واپس آنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ ایسے میں پولیس چیف ان کا حمایتی ہو تو شہر کی پولیس ان کی مدد کرے گی۔ ہمیں برا علیٰ عہدے پہ اپنے وفادار لوگ چاہیے ہیں“ آقا۔

”ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“ مرسل نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ”یہ آدمی.... ایک تاجر ہے۔ کیا یہ شہر کی پولیس سنبھال سکے گا؟“

”آقا، ملازم رکھنے کی سب سے بڑی شرط وفاداری ہوتی ہے۔ وہ آقا کو دشمنوں سے محفوظ رکھے گا۔ اس سے اوپر ہمیں کیا چاہیے؟“

”ہاں یہ بھی ہے۔“ مرسل آگے جھکا اور مہراٹھا کے کاغذ پہ ثبت کی۔ راجہ مراد نے جلدی سے کاغذ کو رول کر کے سمیٹا اور پھر دوسرا کاغذ سامنے کیا۔

”میں شہر کا قاضی بھی بدل رہا ہوں۔ عارف بن مہور انیا قاضی ہو گا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے سوداگر ہے مگر قرآن وحدیث اور علوم فقہ میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔“

”گزشتہ قاضی اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے مشہور تھا، مراد۔“ مرسل نے قدرے الجھن سے پہلو بدلا۔ ”اور یہ آدمی تو سوداگر ہے۔ یہ عدالتیں کیسے چلائے گا۔“

”آپ کا خدشہ درست ہے آقا، مگر کیا چیز زیادہ بہتر ہے؟ ایک مقبول قاضی جو کسی بھی وقت دشمنوں سے جا ملے اور آقا کو قید یا جلاوطن کروادے یا ایک ایسا قاضی جو آقا کے ساتھ وفادار ہو؟“

مرسل نے جواب نہیں دیا۔ بس بے زاری سے مہراٹھا کے ثبت کی تو مراد نے گہری سانس خارج کی۔ پھر اگلا کاغذ سامنے رکھا۔

”یہ نئے سفیروں کی فہرست ہے جن کو ہم دوسرے ممالک میں آقا کے ترجمانوں کی حیثیت سے بھیجیں گے، یہ لوگ میرے وفادار اور پرانے جاننے والے ہیں۔ یہ آقا کی ایسی حفاظت کریں گے جیسی میں کرتا ہوں۔“ وہ اب نئے نئے صفحات سامنے رکھ رہا تھا اور مرسل شاہ ان پہ مہر ثبت کر رہا تھا۔ درمیان میں جمائی روکنے کے لئے اس نے منہ پہ ہاتھ رکھا اور بولا۔

”بس یا اور؟“

”یہ محکمہ اوقاف کے نئے سربراہ کا حکم نامہ ہے۔ یہ شہر کا معروف تاجر ہے اور اس کا کاروبار تین براعظموں تک پھیلا ہے۔ گزشتہ وزیر اوقاف بہت مقبول تھا کیونکہ وہ غریبوں تک زکوٰۃ اور صدقات کے پیسے ایمانداری سے پہنچاتا تھا مگر یہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کے یہ ہمارا وفادار ہے۔“

مرسل شاہ نے بغیر مزاحمت کے کاغذ پہ مہر ثبت کی اور پیچھے کو ٹیک لگالی۔ مراد نے تمام کاغذات رول کر کے ایک ٹرے میں رکھے اور ساتھ ہی نرم خوئی سے کہنے لگا۔ ”آقا.... طاقت حاصل کرنا کمال نہیں ہے۔ طاقت کو برقرار رکھنا اصل فن ہے۔ کوئی بھی شخص تنہا حکومت نہیں

چلا سکتا۔ اس کو طاقتور لوگوں کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے تاکہ سب مل کے آقا کے تخت کی حفاظت کریں۔ جب تک ہم اہم عہدوں پہ اپنے لوگ نہیں بٹھائیں گے، ہم سلطنت ملاکہ کو اپنے طریقے سے نہیں چلا سکیں گے۔“

”ہوں۔“ وہ بورساہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر یونہی سرسری سا بولا۔ ”تمہاری بیٹی.... تاشہ.... ہم نے ان کا ذکر پہلے نہیں سنا۔“
طشت میں کاغذوں کے رول سجاتے مراد کے ہاتھ تھمے۔ پھر آہستہ سے آنکھوں کو گھما کے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اپنی جواہرات سے مزین انگوٹھیوں کو انگلیوں میں گھماتا سامنے دیکھ رہا تھا۔

”تاشہ میری پہلی بیوی سے ہے۔“ مراد تول تول کے کہنے لگا۔ ”ملک کے حالات اچھے نہ تھے اس لیے میں نے اس کو چین میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے بھیج دیا تھا۔ مگر جب میرے ملک کی باگ دوڑ ایک ایسے سلطان کے ہاتھ میں آ گئی (مرسل کی طرف اشارہ کیا) جو اپنی قوم کی حفاظت کرنا جانتا ہے تو میں نے اسے بلوایا (مرسل شاہ نے مسکرا کے فخر سے گردن ذرا کڑالی۔) اب ملاکہ میں رہنا اس کے لئے محفوظ تھا اور تالیہ کے کھونے کے بعد میں بہت اکیلا ہو گیا تھا۔ مجھے امید ہے وہ آقا کے دربار کے لئے نیک بخت ثابت ہوگی۔“
”ہاں۔ بالکل۔“ مرسل شاہ مسکرا کے کھڑا ہوا اور ہاتھ کمر پہ باندھے چبوترے کے زینے اترتا گیا۔ وہ تازہ دم سا خوشگوار بیت میں گھرا نظر آتا تھا۔

طشت میں باقی حکم نامے رکھتے مراد نے غور سے اس کی پشت کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ پنہاں تھی۔

☆☆=====☆☆

بندہارا کے محل کے پائیں باغ کا آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا نظر آ رہا تھا۔ دوپہر کے باوجود باغ میں ٹھنڈی چھایا سی پھیلی تھی۔
شہزادی تاشہ کنیزوں اور غلاموں کی معیت میں روش پہ قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پیروں تک آتا زرتار جامنی گاؤن پہنے سر پہ تاج سجائے وہ معمول کے مطابق سولہ سنگھار سے آراستہ تھی۔

باغ کے وسط میں ایڈم کھڑا تھا۔ پا جامے پہ اور کوٹ نما گاؤن پہنے سر پہ ٹوپی اوڑھے وہ سنجیدہ نظر آتا تھا۔ جب تالیہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے بھی سر پورا جھکا کے اٹھایا۔ ”شہزادی!“

”شاہی مورخ میرے ساتھ آئے۔“ دو انگلیوں سے اشارہ کیا اور روش پہ آگے بڑھ گئی۔ کنیزیں اور خادم پیچھے رہ گئے اور مورخ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ (کنیزیں کافی فاصلہ رکھ کے پیچھے چلنے لگیں۔)

”تم نے اپنی کتاب لکھنی شروع کر دی ایڈم!“ سینے پہ بازو لپیٹے وہ چلتے چلتے پوچھنے لگی۔ ایڈم نے ایک جلی بھنی نظر اس پہ ڈالی۔
”جی۔ میں نے سارا قصہ لکھ لیا ہے کہ کس طرح مرسل شاہ اور پرانے بندہارا نے مرسل کے چچا کا تخت الٹا اس کو مارا اس کے بیٹوں کو محل بدر کیا اور خود تخت پہ قبضہ جمایا۔ اس سارے کام میں سابق بندہارا کی مدد کرنے والا مرسل کا پھوپھی زاد بھائی راجہ مراد تھا۔ تخت پہ قبضے کے بعد جب مرسل اپنے کزن کو محل میں لے آیا تو مراد نے سب سے پہلے سابق بندہارا کا پتا صاف کیا اور اس کو مروادیا۔ پھر خود

بند ہار اُت بیٹھا۔ اب میں اس مقام پہ پہنچ چکا ہوں جہاں مجھے (کھٹکھار کے بولا) مراد رجبہ کی بیٹی کا تعارف لکھنا ہے۔
 ”بہت خوب۔“ تالیہ نے محظوظ انداز میں ارد گرد اُلہاتے درختوں پہ نظر دوڑائی۔ ”تو پھر لکھنا شروع کرو۔“

”جی جی... میں تو آپ کی ہدایات کا انتظار کر رہا تھا۔“

”تو پھر لکھو کہ شہزادی تاشہ بہت مراد ملا کہ کی سب سے حسین شاہزادی تھی۔ (سنہری بالوں کو جھٹکا) اتنی حسین کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے
 آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، شہر کے سارے رئیس اس پہ جان دیتے اور...“

اللہ کو جان دینی ہے میں نے چے تالیہ۔“ اس نے دونوں کان چھوئے۔ ”اتنا جھوٹ؟ یا اللہ... ایسی کوئی حسین بھی نہیں ہیں آپ۔ اتنا
 زیور اور کاندرا کپڑے کسی کو بھی پہنا دیں تو وہ خوبصورت لگے۔“
 ”اچھا تم بھی پہن لو... تو خوبصورت لگو گے؟“

”میں خواتین کی بات کر رہا تھا اچھا۔ اور یہ جن بالوں پہ آپ بہت فخر کرتی ہیں نا، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ڈائی شدہ ہیں۔“
 تالیہ نے (ہونہہ) سر جھٹکا پھر آگے چل دی۔ گردن اٹھا کے مسکرا کے درختوں کو دیکھتی ایک دفعہ پھر سے شروع ہو گئی۔
 ”لکھو کہ اس نے چین میں اعلیٰ پائے کے اساتذہ کے ہاں تربیت حاصل کی تھی۔ وہ ہر طرح کے علوم و فنون سے آراستہ تھی۔“
 ”کون سے اساتذہ؟ کون سے علوم و فنون؟ یہ ایک مہینہ ملا کہ میں رہ کے چند باتیں کیا سیکھ لیں آپ نے، آپ تو بھول ہی گئیں کہ
 ساری عمر آپ ملایشیاء کی گلیوں میں بٹوے چراتی اور جیسس کاٹتی رہی ہیں۔“ مگر وہ اثر لیے بغیر بولتی جا رہی تھی۔

”لکھو کہ وہ بارہ زبانیں جانتی تھی۔“ پھر لبوں پہ انگلی رکھ کے سوچا۔ ”اُنہوں۔ بارہ زیادہ ہو جائیں گی۔ آٹھ کر دو۔“
 ”آٹھ؟ آٹھ زبانیں؟“ وہ جل بھن کے سیاہ ہوتا گھوم کے اس کے سامنے آیا۔ ”آپ مجھے ان آٹھ زبانوں کے نام بتا دیں جو شہزادی
 تاشہ کو آتی ہیں تو قسم خدا کی، میں آپ کو مان جاؤں گا۔“

”تو سنو.....“ وہ انگلیوں پہ گنوانے لگی۔ ”ملے اردو، چینی، انگریزی۔“ چار پہ گنتی ختم ہو گئی تو رکی۔

ایڈم نے اپنے پوروں پہ گنتے ہوئے فاتحانہ ابرو اٹھایا۔

”چار زبانیں رہتی ہیں ابھی۔“

مگر شہزادی کی انھی گردن میں ذرا بھی جھکاؤ نہ آیا۔ مسکرا کے بولی۔ ”ٹیکسٹ میسجر والی رومن ملے، ٹیکسٹ میسجر والی رومن اردو... رومن
 چینی اور رومن انگریزی جو ملے حروف تہجی میں لکھی جاتی ہے۔ لو... آٹھ زبانیں پوری ہوئیں۔ اب آگے لکھو....“
 مسکرا کے آگے بڑھ گئی اور وہ دانت کچکا پچھا پیچھے لپکا۔

”لکھو کہ اس کی رحم دلی کے قصے سارے ملا کہ میں مشہور تھے وہ اتنی رحم دل تھی کہ....“ اونچے گملوں میں رکھے پھولوں کے اوپر سے
 ہاتھ گزارتی وہ خوشگوار موزوں میں بول رہی تھی۔

”کہ نیک معصوم لوگوں کو گرفتار کروادیتی تھی، کال کوٹھڑیوں میں بند رکھتی تھی اور.... اور....“ وہ جلا بھنسا کہہ رہا تھا مگر وہ رکی اور پھر سے اس کی طرف گھومی تو چہرے پر برہمی تھی۔

”ابھی بلوایا میں نے اس کنگال رائٹر ابو بکر کو اور اس نے اپنا تھیلا پہچان لیا، تو دایاں ہاتھ کئے گا تمہارا۔ دایاں!“
 ”یعنی آپ ظلم و جبر سے مجھ سے جھوٹ لکھوانا چاہتی ہیں؟ مطلب کہ... وہ ساری تعریفیں جو بنگارا یا ملا یو میں آپ کی لکھی گئی تھیں، وہ آپ نے مورخ کو ذرا دھمکا کے لکھوائی تھیں۔“

”اور نہیں تو کیا۔ ویسے بھی مورخ بڑے دو نمبر لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بادشاہوں کی عظمت کے قصے جو ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں، وہ کوئی سچ تھوڑا ہی ہوتے ہیں؟ خوشامدی، درباری، پیسہ کل لالچی مفاد پرست مورخ۔“ وہ اس کے الفاظ معصومیت سے لونارہی تھی۔
 ”میں نہیں بنوں گا ایسا مورخ، اچھا۔“ اس کی رنگت گلابی پڑ گئی تھی۔ ”اور اگر آپ ظلم و جبر سے مجھ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھوا بھی لیں تو اس میں برکت نہیں ہوگی۔ جھوٹ جس چیز میں بھی شامل ہو جائے اس کی برکت لے جاتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، شریفہ کنیر بھاگتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ تالیہ رکی اور دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھبنا کے دیکھنے لگی۔
 ”شہزادی!“ اس نے جھک کے تعظیم پیش کی اور ایک رول ہوا کاغذ اس کے سامنے کیا۔ تالیہ نے کاغذ کھولا اور پڑھا۔
 برلفظ کے ساتھ پیشانی پہ بل پڑتے گئے۔ شریفہ کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ فوراً ہٹ گئی۔
 یہ کیا ہے، چے تالیہ؟“ وہ اس کے چہرے کی سنگینی دیکھ کے سنجیدہ ہوا۔

”آج کے جاری ہونے والے حکم ناموں کی ایک نقل۔“ وہ فکر مند نظر آرہی تھی۔ ”راجہ مراد نے شہر کا کوتوال (پولیس چیف) قاضی، وزیر اوقاف اور سفیروں کو بدل دیا ہے۔ اس نے پرانے عہدیداروں کی جگہ اپنے دوست لگا دیے ہیں۔“

”تو آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ نئی حکومت آتی ہے تو چہرے تو بدل ہی جاتے ہیں۔“

وہ چند لمحے ایڈم کو دیکھتی رہی۔ ”حکومت کیا ہوتی ہے ایڈم؟“

”حکومت.... مطلب بادشاہ، وزیر... یا ہمارے دور میں وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کے ممبرز وغیرہ۔“

”تمہارے خیال میں یہ لوگ کوئی ملک چلاتے ہیں؟“

”ہاں۔ کیونکہ یہ حکمران ہوتے ہیں۔“

”غلط.... کوئی بھی ملک صرف اس کا وزیر اعظم، بادشاہ یا ممبرز پارلیمنٹ نہیں چلاتے۔ ملک کو اس کے ’دارے‘ چلاتے ہیں۔“

”دارے؟“ ایڈم نے سوالیہ ابرو اٹھایا۔

”ہاں۔ جیسے عدلیہ کا ادارہ۔ پولیس کا ادارہ۔ فوج کا ادارہ۔ زکوٰۃ صدقات تقسیم کرنے کا ادارہ۔ خزانے کا ادارہ۔ سفارتکاری کا ادارہ۔“

”ملک اداروں سے مل کے بنتا ہے۔ اور ملک تب مضبوط ہوتا ہے جب اس کے ادارے مضبوط ہوتے ہیں۔“

”ادارے مضبوط مطلب؟“ وہ دونوں پھر سے روش پہ چلنے لگے تھے مگر ان کی گفتگو کی نوعیت بدل چکی تھی۔

”یعنی جب ان اداروں کے سربراہ قابل اور ایماندار لوگ ہوں گے تو ہی ادارہ مضبوط ہوگا۔ شہر کا قاضی ایماندار ہوگا تو بادشاہ کو بھی کٹہرے میں لے آئے گا۔ کوئٹہ ایماندار ہوگا تو شہزادے کو بھی گرفتار کر لے گا۔ لیکن جو بادشاہ اور بندہ اہل صرف اپنی طاقت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، وہ مضبوط ادارے برداشت نہیں کر سکتے۔“

”یعنی وہ اداروں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تاکہ ادارے ان کے جرائم پکڑ نہ سکیں۔“

”بالکل۔ اور اداروں کو کمزور کیسے کیا جاتا ہے بھلا؟“

”آپ بتائیے... کیسے؟“ وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

”میرٹ ختم کر کے۔ اب بتاؤ مجھے میرٹ کیا ہوتا ہے؟“

”میرٹ یعنی... یعنی... مجھے معلوم ہے میرٹ کیا ہوتا ہے مگر...“

”میرٹ کا مطلب ہوتا ہے نوکری اس کو دی جائے جس میں دو باتیں ہوں۔ وہ اس کام کا اہل ہو اور وہ ایماندار ہو۔ یہ وان فاتح سے سنا تھا میں نے۔ مگر راجہ مراد جیسے سیاستدان اداروں کے سربراہ ایسے لوگوں کو بنا دیتے ہیں جو نہ ایماندار ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کام کے اہل۔ یہ لوگ...“ اس نے کاغذ لہرایا۔ ”یہ تاجر اور سوداگر ہیں۔ ان کو عدلیہ یا پولیس کی الف بے بھی نہیں آتی مگر ان کو صرف راجہ کی دوستی کے باعث عہدہ ملا ہے۔“

”مگر چے تالیہ... حکمرانوں کو یہ عہدے اپنے وفادار لوگوں کو دینے پڑتے ہیں تاکہ ان کا تحت محفوظ رہے۔ اب اگر راجہ نے میرٹ کو پس پشت ڈال کے خود سے مخلص لوگوں کو یہ عہدے دے دیے تو اس میں اتنا غلط کیا ہے؟“

جواب میں تالیہ نے گہری سانس لی اور ہاتھ سے دور ہاتھ باندھے کھڑے خاموش اور کنیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ راجہ کے ذاتی ملازم ہیں۔ ان کو ملازمت پہ رکھتے وقت کیا راجہ نے صرف وفاداری دیکھی ہوگی؟ یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ ان کو کام کرنا بھی آتا ہے یا نہیں؟ باورچی خانے میں کیا راجہ کسی ایسے غلام کو جگہ دے گا جس کو چائے تک نہ بنانی آتی ہو؟“

”نہیں تو۔“

”کیا راجہ جیسے سیاستدان اپنے گھروں اور دفتر میں اہلیت اور ایمانداری دیکھے بغیر کسی کو نوکری دیتے ہیں؟ کیا وہ اپنے ذاتی کاروبار کا اکاؤنٹ کسی بے ایمان آدمی کو بنا دیتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

”وہ تو ملک کے اداروں کی باگ دوڑ بغیر میرٹ کے کیوں کسی کے حوالے کر دیتے ہیں؟“

”کیونکہ... ایڈم نے گہری سانس لی۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”وہ ملک کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے۔“

”اور یہ لوگ.... جو راجہ نے تعینات کیے ہیں....“ اس نے کاغذ پھر سے لہرایا۔ ”یہ نہ صرف نا اہل ہیں بلکہ یہ تو بزنس مین ہیں۔“

”بزنس مین کو سیاسی عہدے دینے میں کیا قباحیت ہے، شہزادی؟“ اس کی آواز خود بخود دودب ہو چلی تھی۔

”ایڈم بن محمد....“ وہ ایک قدم آگے آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”مجھے آٹھ زبانیں نہیں آتیں۔ نہ ہی میں نے چین کے استادوں سے تربیت حاصل کی ہے نہ میں نے کتب خانے کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ مگر مجھے ایک بات اس محل نے سکھادی ہے کہ اپنے ملک کی باگ دوڑ ایک تاجر کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیتے۔ کیونکہ اسے صرف ایک کام کرنا آتا ہے۔ فروخت کر دینا۔“

ایڈم بالکل دھک سے رہ گیا۔ وہ اب سر جھکائے کاغذ کو پھر سے پڑھ رہی تھی۔ اس کی صبح پیشانی سلوٹ زدہ تھی۔ وہ فکر مند تھی۔ وہ ملاکہ کے لوگوں کے لئے فکر مند تھی۔

”راجہ آتے ساتھ ہی برادارے کو کنٹرول کر رہا ہے۔ یقیناً کچھ ایسا ہے جو وہ کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ادارے اس کے خلاف نہ کھڑے ہوں۔ ایسا کیا ہے جو راجہ چھپا کے کر رہا ہے۔“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

ایڈم بس چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

”تمہیں میں نے اپنے ساتھ اس لئے رکھا ہے کیونکہ ہمیں مل کے چابی ڈھونڈنی ہے۔ تمہیں اپنی کتاب میں میری خوشامدی لکھنی پڑیں گی تاکہ راجہ کو یہ لگے کہ میں خوشامد سے خوش ہوتی ہوں اس لئے ایک خوشامدی کو برجگہ ساتھ لئے پھرتی ہوں۔ اس طرح کسی کو میرے اور تمہارے تعلق پہ شک نہیں ہوگا اور ہم ساتھ کام کر سکیں گے۔ ہمیں راجہ مراد کاراز بھی کھوجنا ہے اور وہ چابی بھی۔ میں ابھی تک راجہ کے کمرے میں نہیں جاسکی۔ کسی دن ہمیں اس کمرے کی تلاشی بھی لینی ہوگی۔ اور....“ وہ ٹھہری اور آواز دھیمی کی۔ ”مجھے لگتا ہے خزانہ واقعی ہے۔ کوئی خزانہ جو ہمارا منتظر ہے... اور اسے صرف میں اور تم نکالیں گے۔ اس لئے تم... تم لکھو یہ سارے جھوٹ میرے بارے میں۔ میں جانتی ہوں میں اتنی اچھی نہیں ہوں مگر ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لئے یہ کرنا ہوگا اور جو ہمیں کرنا آتا ہے وہ.....“

”وہ ہمیشہ ہماری جان بچاتا رہے گا۔“ ایڈم نے سمجھ کے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نظریں تالیہ کی چہرے پہ جمی تھیں۔ وہ اب دور کھڑی کنیز کی طرف گھوم چکی تھی۔

”شریفہ!“ ایک آواز پہ کنیز دوڑی چلی آئی۔

”ابوالخیر کو پیغام بھیجو کہ اس کو وزیر خزانہ بنا دیا گیا ہے۔“

”مگر، شہزادی اس کو تو یہ خبر کب کی مل چکی ہوگی۔“

”وہ بھی آگے سے یہی کہے گا۔ پھر جواب میں کہنا کہ اگر خبر مل گئی تھی تو شہزادی کے شکریے کے لئے وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟“

بگڑے ہوئے موڈ میں بولی اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہیں گھاس پہ بیٹھا اور اپنا دستہ کھول لیا۔ قلم کی نوک سیاہی میں ڈبو کے کاغذ پہ جمائی اور پھر دوبارہ سے تالیہ کو دیکھا جواب برآمدے کے زینے چڑھ رہی تھی۔ بال کندھوں

پہچھول رہے تھے اور رنگت دھوپ میں سنہری لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں سوچ تھی۔ گہری سوچ۔
اس کے سراپے کو نظروں میں رکھے ایڈم کاغذ پہ الفاظ اتارنے لگا۔

”نام تھا جس کا تاشہ بنت مراد۔۔۔

تھی وہ ملاکہ کی سب سے حسین شاہزادی۔

نہ تھا اس کا حسن صرف ظاہری۔۔۔

بلکہ روشن تھا اس کا باطن بھی۔

نیت تھی اپنے ملک کے لئے نیک اور دل تھا غریب پرور۔

سمجھتی تھی وہ سیاست کی دانائی کو خوب خوب

بلکہ اگر تم پوچھو مورخ سے تو شاید وہ کہے

کہ ملایا کے سارے جزوں میں سب سے زیادہ

بس وہی بریات کو سمجھتی تھی۔“

وہ دل سے لکھ رہا تھا۔ اپنے اندر کے لکھاری کو دریافت کر رہا تھا۔ اور تالیہ کے اندر کی شہزادی کو صدیوں کے لیے ”ملایا کے پھول“ کے

صفحات میں قید کر رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

اس شام عصر کے بعد سے ہی آسمان سیاہ بادلوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ قدیم ملاکہ پہ سایہ سا ہو گیا اور پھر موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔

لگیاں اور چوبارے لمحوں میں جل تھل ہو گئے۔ لوگ گھوڑے اور جانور جلدی جلدی اندر باندھنے لگے۔ سڑکوں سے خوانچہ فروش اپنا سامان
ڈھانپ کے گھروں میں گھس گئے۔ بارش نے سارا شہر سنسان کر دیا۔

اپنی کوٹھڑی میں نیچے بیٹھا فاتح کپڑے تہہ کر رہا تھا۔ ایک چمڑے کا سفری تھیلا اسے مہیا کیا گیا تھا جس میں اس نے اپنے استعمال کی

چیزیں بھرنی تھیں۔ کل نیلای کے بعد اسے اس تھیلے کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ ابوالخیر کے تربیت یافتہ غلام اعلیٰ آداب و

اخلاق سے آراستہ ہوتے تھے، ان کا سامان، ان کا لباس برشے ان کے اعلیٰ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتی تھی، اسی لئے وہ مہنگے داموں

فروخت کیے جاتے تھے، مگر صرف امراء اور سلاطین کو۔

”کیا تم واقعی ہمیں یاد رکھو گے؟“

آواز پہ وہ چونکا۔ کپڑے کی تہہ لگاتے ہاتھ تھمے۔

چوکھٹ پہ کم سن غلام لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور امید دونوں تھے۔

فاتح نے گہری سانس لے کر کپڑے پر رکھا اور انگلی سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے آگے آیا اور اس کے بستر کے کنارے بیٹھا۔ (بستر فرشتی تھا۔ گویا وہ دونوں زمین پہ ہی آمنے سامنے بیٹھے تھے)

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا؟“

لڑکے نے اداس آنکھیں اٹھائیں۔ ”کیونکہ ہم جیسوں کو کوئی یاد نہیں رکھتا۔“

”مفید!“ اس نے نرمی سے لڑکے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ ہم انسانوں کو کبھی کسی دوسرے کا غلام نہیں بننا چاہیے۔ نہ محبت میں، نہ مجبوری میں۔ تمہیں اپنے حق کے لئے لڑنا ہوگا۔ اور جب تم جیسے لوگ اپنے لیے لڑو گے تو دیکھنا... کئی صدیوں بعد ایک زمانہ ایسا آئے گا جب انسانوں کو غلام بنانے کا یہ رواج ختم ہو جائے گا۔“

لڑکے کی آنکھوں میں بے یقینی بھرا آئی۔ ”واقعی؟ یہ صدیوں پرانا رواج ختم بھی ہو جائے گا؟“

”ہاں، مفید بن مہورا۔ ایک زمانہ آئے گا جب یہ ظلم کا رواج ختم ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تب لوگ صرف چند گھنٹے دوسروں کے ہاں ملازمت کریں گے، مگر ان کو بھاری تنخواہ ملے گی۔ مراعات، گھر، کھانا ملے گا۔ ان کے حقوق ہوں گے۔ وہ جب چاہیں نوکری چھوڑ کے جاسکیں گے۔ وہ آزاد ہوں گے۔“ مفید جیسے جیسے سنتا جا رہا تھا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

”یہ زمانہ کب آئے گا؟“

فاتح چند لمحے خاموش رہا۔ ”باقی دنیا کے لیے یہ کئی سو سال بعد آئے شاید، مگر ملاکہ کے لوگوں کے لیے مرسل شاہ کے ہی عہد میں ایک وقت آئے گا جب کوئی تم سب غلاموں کو ان ظالم لوگوں سے نجات دلائے گا۔“

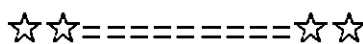
”تم مستقبل کے بارے میں اتنا کیسے جانتے ہو؟“

اس سوال پہ وہ زخمی سا مسکرایا۔

”یوں سمجھو میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسے زمانے کا جب انسان آزاد ہوگا۔ میں تمہارے لئے وہ زمانہ تو نہیں لاسکتا لیکن تم سب کو ایک ایسے انسان سے ملوانے کا ذریعہ ضرور بننا چاہوں گا جو ملاکہ کی تاریخ بدلے گا۔ اس کے بعد اس ملک میں کم از کم چند سالوں تک کوئی کسی کو جبر سے اپنا غلام نہیں بنا سکے گا۔ بس تم... تم بھروسہ کرو۔“

”تم پہ؟“

”نہیں۔ اپنے آپ پہ۔“ اس کے کندھے کو نرمی سے تھپکا اور واپس کپڑے تہہ کرنے لگا۔ لڑکا نا سمجھی اور اداسی سے اسے دیکھ گیا۔ آزادی کا خواب..... بہت عجیب مگر بہت خوشگوار تھا۔ باہر برستی بارش کی طرح جس میں اگر مٹی کی سوندھی مہک تھی تو خوفناک آوازوں کا ذراوا بھی شامل تھا۔



بارش بنوز موسلا دھار برس رہی تھی۔ راجہ مراد کا محل اندھیرے میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔ تیز ہوا درزوں سے اندر داخل ہوتی اور راہداریوں میں روشن مشعلوں کے شعلے پھڑ پھڑانے لگتے۔ ایک راہداری سے تالیہ تیز قدم اٹھاتی گزر رہی تھی۔ تاج سر پہ تھا اور گردن بے نیازی سے اکڑی تھی۔ کنیریں دائیں بائیں دو قدم پیچھے تھیں۔
دفعۃً وہ رکی۔ کنیریں بھی فوراً رک گئیں۔

ایک طرف تنگ سے زینے نیچے کوجار ہے تھے۔ وہاں پہریدار کھڑے تھے۔ تالیہ نے ابرو اٹھتے کیے۔
”نیچے کیا ہے؟“

”یہ راجہ مراد کا خزانے کا کمرہ ہے۔ محل چلانے اور دیگر اخراجات کے لئے تمام مال یہیں رکھا جاتا ہے اور قیمتی زیورات وغیرہ بھی۔ اس جگہ بھاری نفری تعینات رہتی ہے۔“
”کیا میں اندر جا سکتی ہوں؟“

”راجہ کے علاوہ کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ وہ ہر روز اس جگہ کا معائنہ کرتے ہیں۔“
”ہوں۔ حیرت ہے میں نے یہ پہلے نہیں دیکھا۔“ اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔ کنیر شریفہ نے قدرے اچنبھے سے قدم اس کے پیچھے بڑھائے۔ (ہر روز تو شہزادی یہاں سے گزرتی ہے۔ بلکہ اپنی آمد کے دوسرے روز تو اس نے اس جگہ کا پوچھا بھی تھا تو اب؟) خیر۔ اس نے بھی سر جھٹک دیا۔ (شہزادی کی ادائیں!)

اپنے کمرے میں آ کے اس نے شریفہ کو حکم دیا۔ ”مورخ کو بلا بھیجو۔“ وہ جیسے بیزار اور تھکی تھکی ہو۔
مورخ کو اس کے کمرے میں بھیج کے شریفہ اور دوسری کنیریں چلی گئیں۔ اب باہر صرف دربان کھڑے تھے۔
ایڈم اندر آیا تو اس شاہی پر تعیش کمرے کو دیکھ کے حیران رہ گیا۔ منہ کھل گیا اور گردن چاروں طرف گھوم گئی۔
اوپنی چھت ریشمی لحاف سے مزین بستر، نرم قالین.... کرسٹل اور چینی کے بنے آرائشی برتن۔ لٹکتے ہوئے جھلملاتے فانوس جن پہ دیے بجے تھے۔

تالیہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ٹھٹک گیا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ شہزادی سے مختلف... سیاہ پاجامے اور کرتے میں ملبوس،
بال سیاہ ٹوپی میں ڈھک رکھے تھے۔ ایڈم نے منہ بنایا۔

”اتنے عیش سے رہنے والوں کا قیامت کے دن الگ سے حساب ہوگا۔“
”کوئی بات نہیں ایڈم۔ فوج کی نوکری سے نکال دیے جانے والوں کا حق بنتا ہے کہ وہ حسد کریں۔“
ایڈم کو اتنے ترش جواب کی امید نہیں تھی۔ اس کے سر پہ لگی تلووں پہ ہنسی۔
”اصلی فوجی ہونا نقلی شہزادی ہونے سے بہتر ہوتا ہے، چے تالیہ۔“

”تم بھول رہے ہو کہ راجہ مراد شاہی خاندان سے ہیں اور میں بائی بلند شہزادی ہوں۔“ گردن فخر اور استہزاء سے کڑائی۔

”جی نہیں۔ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ ایک زمانے میں کے ایل کی گلیوں میں لوگوں کی جیبیں کاٹتی پھرتی تھیں۔“

”اور تم بھول رہے ہو کہ ابھی بلو الیانا میں نے اس کنگال رائٹر کو تمہارا دایاں ہاتھ کٹے گا۔ دایاں!“

اس پہ ایڈم نے زور سے ہونہ کیا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”کسیے۔ کیوں بلوایا ہے؟ اپنی مزید جھوٹی تعریفیں لکھوانے کے لئے؟ یاد رکھیے گا اللہ کو جان دینی ہے میں نے اس لئے.....“

”آج بارش ہے اور محل کے باہر تعینات پہریدار پناہ کے لئے اندر گھس گئے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو ایڈم رک کے سننے لگا۔

”نیچے ایک کمرہ ہے جہاں راجہ اپنا خزانہ رکھتا ہے۔ اس کمرے کی تلاشی کا آج سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں کافی دنوں سے اس

کی تاک میں تھی۔“

”اوہ۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ بھی سنجیدہ ہوا۔

”تم اس رسی کو پکڑو گے۔ میں کھڑکی سے نیچے جاؤں گی اور اس کمرے کے روشن دان سے اندر اتر جاؤں گی۔ کمرہ خالی ہوتا ہے۔ اور

محل کے سبزہ زار پہ اس وقت پہریدار بھی نہیں ہیں اس لئے کوئی مجھے نہیں دیکھے گا۔“

”کیا راجہ نے وہ چابی یا ایسی کوئی چابی وہاں چھپائی ہوگی؟“ اس کے اندر امید جاگی۔

”بالکل یہ ہو سکتا ہے۔ اور....“ وہ رکی۔ تذبذب سے ایڈم کے تاثرات دیکھے۔ ”اور کیا معلوم اس کمرے میں راجہ کے خزانے پہ ہمارا

نصیب لکھا ہو۔“

ایڈم کی آنکھیں اچنبھے سے پھیلیں۔ ”کیا مطلب؟“

”ایڈم....“ وہ دبے دبے جوش سے کہتی قریب آئی۔ ”وہ خزانہ جس کی مجھے تلاش تھی میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اور تم اس کو

تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ یہ خواب آنے والے وقت کا ہے۔ یہ واقعہ ابھی ہوتا ہے۔“

”اف چے تالیہ۔ اللہ کی پناہ۔ آپ اس خزانے کا خیال دل سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔“ ایڈم نے بے اختیار سر پہ ہاتھ رکھا۔ ”اس

خزانے کے لالچ نے ہمیں وقت کا قیدی بنا ڈالا ہے۔ اس لئے اس کو بھول جائیں اور صرف چابی تلاش کریں۔“

”اگر ایسا خزانہ ہوا تو کیا تم....“

”بھول جائیں اس خزانے کو۔ رسی لٹکائیں اور نیچے اتریں۔“ وہ جھنجھلا کے بولا تو وہ چپ ہو گئی اور زبردستی مسکرائی۔ ”شیور۔ میں تو ایسے

ہی کہہ رہی تھی۔“ اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

چند منٹ بعد وہ اس کمرے کے روشن دان سے اندر اتر رہی تھی۔ بلی کی طرح دیوار پہ سیدھی اترتی اس نے فرش پہ بنا آواز کے جست

لگائی۔ پھر سانس روک کے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک مشعل روشن تھی۔ قطار میں چند صندوق رکھے تھے۔ اور ان کے اوپر چند رجسٹر شیلف میں پڑے تھے۔ ہر صندوق کے اوپر حساب کتاب کی تختی لکھی تھی۔ وہ تیزی سے ان تک آئی۔ ان کو تالے لگے تھے۔ تالیہ نے ایک ننھی سلاخ جیب سے نکالی اور باری باری ان کے تالے کھولنے لگی۔

کل چھ صندوق تھے۔ کسی میں چاندی کے سکے تھے، کوئی طلائی سکوں سے آدھا بھرا تھا۔ کسی میں چند زور تھے۔ ہر صندوق کے اندر بھی حساب کتاب کے پرچے پڑے تھے۔ رجبہ ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا، یعنی وہ ایک شے بھی نہیں چرا سکتی تھی۔ ویسے بھی ان صندوقوں نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ محل کے اخراجات کے لئے تھے۔ اور ان میں مال کچھ اتنا زیادہ نہ تھا کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں۔ آخری صندوق تو ویسے بھی خالی تھا۔

وہ واپس رسی کی طرف آئی۔ پھر رکی۔

آخری صندوق خالی تھا؟

وہ اٹنے قدموں واپس آئی اور اس صندوق کو دوبارہ دیکھا۔

وہ باقی سب سے چھوٹا تھا۔ لکڑی کا صندوق جس کے اوپر نشان تھے۔ جیسے ضربیں لگی ہوں۔ تالیہ نے اس پہ ہاتھ پھیرا۔ لکڑی نرم تھی۔ اس نے جھک کے دیا سلائی جلائی اور صندوق کے کونوں کو دیکھا۔ پھر ناخن سے اسے کھرچا۔ اندر ریت پھنسی تھی۔ اس نے ڈھکن کھولا۔ وہ خالی تھا۔ البتہ اس کے کونے میں ایک جگہ ایک سکہ پھنسا تھا۔ سونے سکہ جو پھنس جانے کے باعث نظر نہیں آیا تھا۔

تالیہ نے اسے زور سے کھینچا تو وہ نکل آیا۔ صندوق کے اندر بھی جگہ جگہ ریت کے ذرے پڑے تھے۔

وہ واپس اوپر آئی تو سانس چڑھا ہوا تھا۔ ایڈم تب تک گھوم پھر کے اس کا کمرہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ شیلف پہ رکھی کتابوں کا معائنہ کر رہا تھا۔

”میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ نے ان میں سے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔“

”ایڈم۔“ وہ پھولے سانس کے ساتھ قریب آئی۔ اور ٹوپی کھینچ اتاری۔ سنہرے بال کندھوں پہ گر گئے۔ ”اندر کچھ خاص نہیں ہے سوائے

ایک خالی صندوق کے۔“

”خالی صندوق؟“

”اس میں ایک سکہ پھنسا ہوا تھا۔“ اس نے مٹھی کھول کے دکھایا۔ سونے کا چھوٹا مگر موٹا سا سکہ۔

ایڈم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ”پھر؟“

”باقی سارے صندوق بھاری تھے۔ سو کھے تھے۔ ان میں حساب کتاب کے کاغذ تھے۔ وہ وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ان کو کوئی وہاں سے

ہلاتا نہیں ہے۔ مگر یہ چھوٹا صندوق ہلکا تھا۔ یہ بار بار اٹھایا اور واپس لے جایا جاتا ہے۔“ وہ جوش سے بتا رہی تھی۔ ”یہ ابھی تم تھا، یعنی شام کو ہی

کوئی اسے بارش میں واپس لایا ہے۔ مگر اتنے خفیہ طریقے سے کہ معلوم ہی نہیں ہوا مجھے۔“
 ”شام کو بارش کے دوران تو چاول اور دوسرا غلہ محل میں آیا ہے صرف۔ میں باہر ہی بیٹھا تھا۔“
 ”اس صندوق کو اس سامان میں چھپا کے لایا گیا ہے۔“
 ”مگر وہ خالی کیوں تھا؟“

”اس پر رسیاں باندھنے کے نشان تھے۔ اور اس میں ریت پھنسی تھی۔ جیسے اس کو ساحل کی ریت پر گھسیٹ کے کہیں لے جایا گیا ہو۔ وہ بار بار سفر کرتا ہے۔ اور وہ یہاں خالی واپس آتا ہے۔“
 ”مگر خالی کیوں؟“ تالیہ چپ ہو گئی پھر سکے کو دیکھا۔
 ”شاید جب وہ یہاں سے جاتا ہے تو خالی نہیں ہوتا۔ اس میں سکے بھرے ہوتے ہیں۔ اور اس کو کسی ریتیلی جگہ پہ لے جا کر خالی کیا جاتا ہے اور پھر واپس لایا جاتا ہے۔ یہ کام جلدی جلدی کیا جاتا ہے، تبھی ایک پھنسا ہوا سکہ ان کی نظروں سے اوجھل گیا۔“
 چند لمحے لگے ایڈم کو ساری کتھا سمجھنے میں۔

”یعنی راجہ اس صندوق کے ذریعے سونے کے سکے کہیں منتقل کر رہا ہے۔“
 تالیہ کی آنکھیں چمکیں۔ ”ہاں۔ راجہ مراد کا اصل خزانہ کہیں اور ہے۔ یہ کمرہ تو محض گھر کے اخراجات چلانے کے لئے ہے۔ راجہ اپنی دولت کو کہیں اور جمع کرتا جا رہا ہے۔“
 ”مگر وہ چابی..... ہمیں تو اس سے مطلب ہے نا۔“

”راجہ کی محفوظ جگہ اگر کہیں اور ہے تو وہ چابی بھی کہیں اور ہوگی۔ اگر ہم اس صندوق کی جگہ کا پتہ لگالیں تو چابی بھی مل جائے گی۔“
 ”مگر کیسے؟“

”میں کچھ سوچتی ہوں۔“ وہ اب کھڑکی کے ساتھ گری سی لیٹنے لگی۔ دماغ الجھ سا گیا تھا۔ مورخ نے ایک تنقیدی نظر اس کمرے پہ ڈالی اور منہ میں بڑبڑایا۔

”انگ سے حساب ہو گا یا درکھیے گا۔“ جلد دل سے بولا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جواباً منہ میں بڑبڑائی۔ ”بھگوار فوجی۔“
 ”ہونہہ۔ نقلی شہزادی۔“ اس نے سن لیا تھا اس لئے کہے بغیر باہر نہیں نکلا۔

☆☆=====☆☆

”ملا کہ سلطنت محل کے دربار کی کھڑکیوں سے اس صبح روشنی چھن چھن کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ تخت چھٹا تھا۔ دربان مستعد کھڑے تھے۔ درباری وزراء اور امراء قطار میں لگی کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں خالی تخت سے دربار کے دروازے پہ بار بار اٹھتی تھیں۔ سلطان مرسل کا انتظار کیا جا رہا تھا جو آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اتنی صبح خیزی کا عادی نہ تھا اور اس کے انتظار میں وزراء اور جرنیلوں کو پہروں بیٹھنا

پڑتا تھا۔

دربار سے چند کوس دور محل کے دوسرے حصے میں آؤ تو اپنی خواب گاہ میں مرسل شاہ بستر پہ نیم دراز تھا۔ آنکھیں موندے وہ اونگھتا ہوا دکھائی دیتا تھا جب دربان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ملکہ کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔
مرسل نے قدرے بے زاری قدرے مجبوری سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کے بیٹھا۔
ملکہ یان سوفو کا درلباس میں ملبوس تاج سر پہ سجائے، کروفر سے اندر داخل ہوئی اور اس کے سامنے آرکی۔ اٹھ کے بیٹھے جمائی روکتے مرسل شاہ نے محض پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے ملکہ؟ اتنی صبح صبح؟“

”چین سے قاصد آیا ہے اور بری خبر لایا ہے۔“ وہ سخت خفگی کے عالم میں بتانے لگی۔ ”میرے والد شاہ چین، جب سے آپ سے ملاقات کر کے گئے ہیں بیمار پڑے ہیں۔ ان کے جسم پہ پھوڑے نکل آئے ہیں۔ جو کہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔“
مرسل نے ابرو تعجب سے بھنچے۔ ”یہ کیسے ہوا؟“

یان سوفو نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”شاہی طبیب کا خیال ہے کہ ان کو آپ کی نظر لگی ہے۔“
”میری نظر؟“ مرسل کا منہ کھل گیا۔

”جی آقا، آپ کی نظر۔ میرے والد کی جان بھی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس کا جلد از جلد تریاق کرنا ہوگا۔“
مرسل فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ پریشان نظر آتا تھا۔ ”مم... میں کیا کروں پھر؟“

”طبیب نے نوٹ کا لکھ بھیجا ہے۔ آپ کو اس کے مطابق غسل کرنا ہوگا اور غسل کا پانی بادشاہ سلامت کو بھیجا جائے گا، جو ان کے پھوڑوں کے لئے تریاق کا کام دے گا۔ جو بھی ہو آقا، آپ کو میرے والد کے لئے ہر کوشش کرنا ہوگی۔“

تن فن کرتی جیسے آئی تھی ویسے ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مرسل ہکا بکا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ منہ ابھی تک کھلا تھا۔
دربار میں مرسل شاہ کا انتظار ہوتا رہا، مگر وہ نہیں آیا۔

باہر والا ان کے پار ایک تھکے ماندے گھوڑے کے ساتھ دھول میں انا سوار کھڑا تھا۔ باہر آئی یان سوفو اسے دیکھ کے رکی، اپنی کنیزوں کو قہقہہ جانے کا اشارہ کیا، اور لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے تیزی سے سواری کی طرف آئی۔
”ملکہ! اس نے جھک کے تعظیم پیش کی۔“

”تم واپس آ گئے۔“ وہ بے چینی سے دبی دبی آواز میں بولی۔ والا ان کے فوارے کے ساتھ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور کنیزوں کا گروہ دور خاموش سے کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔
”جی ملکہ۔“

”شہزادی تاشہ کے بارے میں معلوم ہوا کچھ؟“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”ان کے شہر کے کوتوال سے مل کے آرہا ہوں۔ اس نے تاشہ شہزادی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے لئے وقت مانگا تھا۔ جب مقررہ وقت پہ اس کے پاس گیا تو اس نے یہ مراسلہ تھمایا۔ یہ سرب مہر ہے اور مجھے اس کو کھولنے کی اجازت نہیں۔ کوتوال نے خاص رازداری سے کہا تھا کہ اسے آپ ہی کھولیں گی۔“

اس نے ریشمی رومال میں لپٹا ایک رول اسے تھمایا جسے ملکہ نے فوراً لباس میں چھپالیا۔

اپنی خواب گاہ میں آ کے اس نے دروازے بند کیے، جلدی سے بستر کے کنارے بیٹھی اور ریشمی کپڑے کی مہر پھاڑی۔ پھر اندر سے رول شدہ کاغذ نکالا۔ اس پر انگ مہر تھی۔ (موم پگھلا کے دونوں سرے بند کر رکھے تھے۔) اس نے احتیاط سے اسے کاٹا اور دھڑکتے دل سے کاغذ کھول کے سامنے کیا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ بالکل شل رہ گئی۔

کاغذ خالی تھا۔

بالکل کوراسفید۔

☆☆=====☆☆

بندہ ہار کے محل کا ملاقاتی کمرہ آج صبح خوب روشن تھا۔ کل کی بارش کے بعد سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور سنہرا چمکتا ہوا دن طلوع ہوا تھا۔ اونچی کھڑکی کے ساتھ ابوالخیر کھڑا برابر جھانک رہا تھا۔ اس کے لمبے بال چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔ دربان نے شہزادی کی آمد کا اعلان کیا تو وہ چہرے پر مسکراہٹ لئے پلٹا۔

پٹ کھلے اور تالیہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ سر پہ پہنے تاج سے لٹکتا کپڑا کندھوں پہ پھیلا تھا۔ نیچے گھیردار پاؤں کو چھوتا کاندرا ریشمی لباس تھا۔ تاشہ کی گردن سیدھی اور چہرہ سنجیدہ تھا۔

”شہزادی۔“ اس نے جھک کے سلام کیا۔ شہزادی کے چہرے پہ ذرہ برابر بھی مسکراہٹ نہیں آئی۔

”لگتا ہے ابوالخیر صاحب کو خبریں دیر سے ملتی ہیں۔“

”میں معذرت چاہتا ہوں شہزادی، طبیعت نا ساز تھی اس لئے پہلے حاضر نہیں ہو سکا۔“ پھر دوبارہ سے جھکا اور سرواپس سیدھا کیا۔ گہری

نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ ”میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے آقا سے میری سفارش کی۔“

”میں نے وہ فیصلہ کیا جو آقا اور ملاکہ سلطنت دونوں کے حق میں بہتر تھا۔“ وہ اب کے ہلکا سا مسکرائی۔

”کچھ تحائف حرم میں بھجوائے ہیں میں نے امید ہے آپ کو اچھے لگیں گے۔“

”ہاں میں نے ابھی دیکھے نہیں۔“ بے نیازی سے کندھے پہ آئے بال پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ”اب تو سارے تحائف ہی ایک سے

لگتے ہیں ابو الخیر۔ وہی زیور وہی ریشم وہی چینی کے برتن۔“

ابو الخیر نے اپنی شیر جیسے آنکھوں کی پتلیاں سکڑ کے اسے دیکھا۔ ”جی یہ بات تو درست ہے آپ کی۔ (اسے جیسے تذبذب ہوا) اگر شہزادی کے ذہن میں میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو مجھے آگاہ ضرور کیجئے گا۔“

”خدمت تو میں نے سنا ہے آپ بہت اچھی کرتے ہیں۔ میرے باپا کی کرتے رہتے ہیں۔ مگر مجھے اپنے لئے کچھ درکار نہیں۔ میرے پاس....“ دونوں بازو پھیلا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ”اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ غصے سے گردن کڑائے مسکرائی۔

”الحمد للہ شہزادی!“ اس نے ادب سے سر کو خم دیا البتہ ابھی تک سوچتی نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔

”مگر ملا کہ کے لوگوں کے پاس سب کچھ نہیں ہے۔ تو کیوں نا میں اپنی رعایا کے لئے کچھ ایسا بنا جاؤں جو میرے اس دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کے کام آتا رہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف چلی آئی اور باہر جھانکا۔ محل کے باغات یہاں سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

”اتنی کم عمری میں دنیا سے جانے کی باتیں شہزادی؟“

تالیہ مڑی، یوں کہ اب چہرہ ابو الخیر کی طرف اور پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ ”اس دنیا سے جانے کی واحد صورت صرف موت نہیں ہے ابو الخیر۔ سفر کے طریقے اور بھی ہوتے ہیں مگر وہ آپ کی سمجھ سے ہٹ کے ہیں۔“ روشنی اس کی پشت سے آرہی تھیں، ایسے میں شہزادی کا چہرہ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ وہ مسکرا رہی ہے یا اس پر افسوس کر رہی ہے۔

”آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟“

”میں اپنی گمشدہ بہن تالیہ بنت مراد کے نام کی ایک مسجد بنوانا چاہتی ہوں ایک عظیم الشان مسجد جو رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کارِ خیر میں بھرپور حصہ لیں گے۔“

ابو الخیر بالآخر کھل کے مسکرایا اور سر کو پورا جھکا کے سیدھا کیا۔ ”میرے لئے اعزاز کی بات ہوگی، شہزادی۔ آپ بے فکر ہو جائیے۔ میں آج ہی مسجد کا نقشہ تیار کرواتا ہوں اور اس نقشے کی منظوری کے بعد خزانے سے مطلوبہ رقم نکال کے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرواتا ہوں۔“

”مگر میں مسجد میں اعلیٰ پائے کی تزئین و آرائش بھی چاہتی ہوں جو سرکاری امداد سے پوری نہ ہو سکے گی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہی تھی۔

”وہ آپ میرے ذمے چھوڑ دیں۔ ہر کام بطریق احسن مکمل ہوگا۔ آپ کی خواہش جلد آپ کے سامنے مجسم صورت کھڑی ہوگی۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔

”کب تک؟“

”بس نیلای ختم ہو جائے، پھر میں اس کام کو شروع کرتا ہوں۔“

”نیلامی؟“ اس کا دل دھڑکا مگر بظاہر سادگی سے پوچھا۔ ”کوئی غلاموں کی نیلامی کرتے ہیں یا آپ؟“

”جی۔ کل نیلامی ہے میرے ہاں۔ ہمارے پاس بہترین قسم کے غلام ہیں۔ اعلیٰ تربیت اور آداب سے آراستہ۔ آپ بھی اگر تقریب کو رونق بخشیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”نہیں، شکریہ۔ میں نے کیا کرنا ہے غلاموں کا۔ یہاں بہت غلام ہیں پہلے سے۔“ اس نے بے نیازی دکھائی۔

”کیا شہزادی تاشہ نے کوئی مسجد بنوائی تھی؟“ کچھ دیر بعد جب ایڈم اور وہ پائیں باغ کی روش پہ ٹہل رہے تھے تو ایڈم نے حیرت سے پوچھا۔ ”اور اگر بنوائی بھی تھی تو وہ اب ملائیشیاء میں کس جگہ واقع ہے۔ میں نے تو ایسی کسی مسجد کا نہیں سنا۔ ہاں ہو سکتا ہے پرتگالیوں نے ملاکہ پہ قبضے کے بعد اس مسجد کو شہید کر دیا ہو اور....“ وہ مغموم ہونے لگا تو وہ ایک دم اس کی طرف کھوی۔

”کوئی مسجد نہیں بنے گی ایڈم۔ نہ ہی ابوالخیر اور میں کوئی مسجد بنانا چاہتے ہیں۔“

ایڈم کا منہ کھل گیا۔ ”کیا مطلب؟ تو ابوالخیر پیسے کس چیز کے دے گا؟“

”مسجد صرف کاغذوں میں بنے گی، ہم اس کا نقشہ منظور کروا کے اس کے لئے سرکاری خزانے سے فنڈز حاصل کریں گے اور ان کو میں خود استعمال کروں گی۔ ابوالخیر جو بھی رقم مجھے آمیندہ رشوت کے طور پہ دے گا اس پہ قانون اس کو پکڑ نہیں سکتا کیونکہ کاغذوں میں وہ رقم چندے کے طور پہ دی جا رہی ہوگی۔“

”یعنی کہ مسجد.... مسجد نہیں بنے گی؟“

”نہیں ایڈم۔ یہ مسجد صرف ایک شیل کمپنی ہے۔ آف شیور کمپنی۔“

”آف شیور کمپنی کیا ہوتی ہے۔“

”بس کاغذوں میں لکھ دو کہ یہ میری کمپنی ہے، میں اس کی مالک ہوں اور اس کی ملکیت میں یہ یہ عمارتیں شامل ہیں اور اس کو رجسٹرڈ کروا لو۔ پھر اپنا سارا مال جو رشوت یا کرپشن میں کمایا ہو اس کو اس کمپنی کی آمدنی کے طور پہ ظاہر کرو۔ اور بس۔“

”یعنی کہ آپ..... آپ حکومتی خزانے سے جو پیسے لیں گی وہ کرپشن کے زمرے میں آئیں گے؟ اور جو چندے کے نام پہ ابوالخیر سے رقم لیں گی وہ رشوت ہوگی۔ وہی میں کہوں، آپ اور مسجد؟ جی نہیں۔ اتنا نیک کام آپ سے نہیں ہوگا۔“ وہ دونوں ایک دفعہ پھر باغ کی روش پہ ٹہلنے لگے تھے۔ زمر دگھاس کے درمیان وہ دودھ جیسے سفید پتھروں سے بنی روش بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

”ہمیں وان فاتح کو خریدنا ہے کل۔“

”وان فاتح؟“ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ ”کیا غلاموں کی نیلامی ہو رہی ہے؟“

”ہاں۔ ابوالخیر نے بتایا ہے۔ جو تحفے اس نے صبح بھیجے تھے ان میں موجود جو ابرات کو ہم مال کے طور پہ استعمال کر لیں گے۔ اور سنو اس کے بھیجے صندوقوں میں سے ایک صندوق بالکل اس جیسا ہے جو باپا کے خزانے والے کمرے میں رکھا ہے۔“

”یعنی اشرفیوں سے بھرا وہ صندوق جس کو رجبہ بار بار پیسے لانے اور لے جانے کے لئے استعمال کرتا ہے، وہ اس کو ابوالخیر کی طرف سے ملتا ہے؟“ وہ کسی نکتے پہ پہنچ رہے تھے۔

”ہاں، اور اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس مال کو یہ لوگ کہاں سے حاصل کرتے ہیں اور یہ جا کہاں رہا ہے.....“

”ہم نہیں، آپ۔“ وہ انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتا دو قدم پیچھے ہٹا۔ ”اس جہنم میں لے جانے والے سیاہ کام سے مجھے نا آپ دور رکھیں۔ پہلے ہی آپ کی وجہ سے بہت گناہ کر چکا ہوں میں۔“

”جیسے ایک کنگال رائٹر کی چیزیں چرا کے اس کا روپ دھارنا؟“ وہ چمک کے بولی تو ایڈم نے انتقامانہ نظروں سے اسے گھورا۔

”میں اب آپ کی اس دھمکی سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ اگر میرا راز کھلا تو مجھے یہ عہدہ دینے والے کو بھی سزا ملے گی ہے نا۔“

”تمہیں اس عہدے پہ سلطان مرسل نے رکھا ہے۔ اب ان کو کون سزا دے سکتا ہے بھلا؟“ آخر میں مسکرائی تو ایڈم نے مارے ضبط کے منٹھی بھینچ لی۔

”اس لئے اب جاؤ۔ اور اپنی کتاب پہ کام کرو۔“

تیکھے انداز میں کہہ کے وہ آگے بڑھ گئی اور ایڈم جلی بھنی نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

نقلی سہی، مگر شہزادی تو تھی۔ آہ۔

ایڈم بن محمد کے پاس سے مڑی تو وہی مسکراہٹ چہرے پہ در آئی جو ہمیشہ اس کو ستانے کے بعد اسے چھپانی پڑتی تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ لگن ہی اندر آئی تو راہداری میں رجبہ مراد آتا دکھائی دیا۔ فوراً رکی، چہرہ سنجیدہ بنایا اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔

”رجبہ!“

وہ کمر پہ ہاتھ باندھے پاٹ نظروں سے اسے دیکھتا قریب آیا۔ لمبے بال کندھوں کو چھو رہے تھے اور گردن کا سر یا اول روز کی طرح تھا۔

”تم اور ابوالخیر، تالیہ، کے نام کی مسجد بنوا رہے ہو؟“

تالیہ نے نظریں اٹھائیں اور ہلکا سا مسکرائی۔ ”آپ کو میرا یہ کام پسند آیا ہوگا، مجھے امید ہے۔ میں آپ کے ہی نقش قدم پہ چلنا چاہ رہی ہوں، رجبہ۔“

مراد کے لب مدھم ہی مسکراہٹ میں ڈھلے۔ ”ہوں، مجھے خوشی ہے۔“

تالیہ نے پھر سے سر جھکایا اور اس کے ساتھ سے نکل کے آگے بڑھی، مگر مراد کی آواز نے اسے روک دیا۔

”اور اپنی ماں؟ اس کے لئے کبھی کچھ تعمیر کرنے کا نہیں سوچا تم نے؟“

تالیہ بالکل ساکت رہ گئی۔ تھوک نگلا اور بظاہر مسکراتی ہوئی پلٹی۔ ”ماں کے لئے؟“

مراد اس کی طرف گھوما، ایسے کہ اس کے چہرے پہ نرمی تھی۔ ”تمہاری ماں کو مرے ہوئے چھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ تم سات برس کی

”تھیں جب وہ طاعون سے مری تھی۔ کیا اس کی قبر پہ جانے کا دل نہیں چاہتا تھا راتالیہ؟“
 پہلی دفعہ مراد کے چہرے پہ احساس کی رمت دکھائی دی تھی۔ جیسے دکھ کا کوئی سایہ ہو۔ جیسے ماضی کا کوئی شائبہ ہو۔
 ”میں ماں کا ذکر کر کے آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی، بابا۔ یہ ذکر آپ کی کمزوری سامنے لے آئے گا، اور آپ پھر صورت زیادہ طاقتور لگتے ہیں۔ ایسے ہی رہا کریں۔“ پھر سر جھکا کے بولی۔ ”رہے!“ اور پلٹ گئی۔
 اسے اپنی ماں یاد نہیں تھی، مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس کے پاس سوچنے کو اور بہت کچھ تھا۔

☆☆=====☆☆

سوموار کی شام ابوالخیر کی حویلی کے سامنے کھلے میدان میں میلا لگا تھا۔ رنگ برنگی جھنڈیوں سے جا بجا سجاوٹ کی گئی تھی۔ ایک جانب اونچا چبوترہ (اسٹیج) سا بنا تھا اور سامنے قطار در قطار کرسیاں رکھی تھیں جن پہ شہر کے معززین بیٹھے تھے۔ جگہ جگہ جھللاتے قلموں اور مشعلوں نے رات میں روشنی کا سماں باندھ رکھا تھا۔

چبوترے کے عقب میں عارضی دیواریں لگی تھیں۔ جہاں سے ایک آدمی باری باری غلاموں کو باہر لاتا اور چبوترے پہ دھکیل دیتا۔ غلام کسی فیشن ماڈل کی طرح لمبے چبوترے پہ آگے چلتا جاتا اور سرے پہ جا کے رک جاتا۔ اس کے ہاتھوں سے پیروں تک لمبی بیڑیاں بندھی ہوتیں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے حاضرین کو دیکھتا۔

کرسیوں پہ بیٹھے امراء اور رئیس اپنے اپنے کارڈ بلند کرتے اور اس کی بولی لگاتے جاتے۔ جہاں بولی رکتی وہاں فروخت کا اعلان کر دیا جاتا۔ اعلان کرنے والا ابوالخیر کا قریبی غلام محمود مرنی تھا۔ وہ برا اعلان سے پہلے اول قطار میں ٹھاٹھ سے بیٹھے ابوالخیر کو ضرور دیکھتا تھا۔ جواب میں ابوالخیر مسکرا کے سر کو جنبش دیتا تو وہ اعلان کر دیتا۔

نیلامی کی تقریب ابھی جاری تھی۔ آغاز میں معمولی غلام اور لونڈیاں پیش کی جا رہی تھیں۔ ایسے میں چبوترے کے پیچھے جاؤ تو وہاں لمبی قطاروں میں پنجرے رکھے تھے جن میں غلام قید تھے۔

آخری پنجروں میں سے ایک میں فاتح کھڑا تھا۔ اس نے پنجرے کی سلاخوں سے کمر نکال رکھی تھی اور سینے پہ بازو لپیٹے کچھ سوچ رہا تھا، جب پیچھے کوئی کھنکھارا۔ وہ چونک کے پلٹا۔

اس کے پنجرے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ چنوں میں ملبوس، سر پہ ٹوپیاں گرائے۔ نیم اندھیرے کے باوجود وہ ان کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ ایڈم اور تالیہ۔

فاتح نے گہری سانس لی اور احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔ قریبی پنجروں کے پاس بھی لوگ منڈلا رہے تھے وہاں رش سا لگا تھا۔ پہریدار روک ٹوک نہیں کر رہے تھے۔ بولی لگانے سے قبل لوگ غلاموں کو جانچ لیں، اچھا تھا۔

”ہم آپ کو خریدنے آئے ہیں تو انکو۔“ سیاہنڈ میں اس کا چہرہ پر امید سا دمک رہا تھا۔ سنہری لٹیس ٹوپی سے نکل رہی تھیں جن کو وہ بار بار

اندراڑستی تھی۔

”مجھے نہیں، میری آزادی کو خریدنے!“ وہ سلاخوں کو پکڑے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے جتا کے بولا تھا۔

وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”ظاہر ہے آپ کو کون خرید سکتا ہے۔“

”اتنی رقم ہے تمہارے پاس؟“ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”جی سر۔“ ایڈم جھٹ بولا۔ ”سب سے اونچی بولی ہم لگائیں گے۔“

”اور اتنی رقم آئی کہاں سے؟“ سنجیدگی سے تالیہ کو دیکھا۔

”میرے باپا مجھے کافی سارا جیب خرچ دیتے ہیں۔ میں نے بہت کچھ جمع کر لیا تھا۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”ہوں... اور ابوالخیر تمہیں پہچانے گا تو نہیں؟“ اسے تشویش ہوئی۔

”کیسے پہچانے گا؟“ اس نے پھر شانے اچکائے۔ فاتح نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ پوری طرح سے چننے میں چھپی ہوئی تھی۔

”ویسے بھی بولی ایڈم لگائے گا۔ میں خاموش رہوں گی۔“ وہ اب اس کو طریقہ کار بتا رہی تھی مگر فاتح کی نظریں اس کے پیروں تک جو

جھکیں تو اٹھی نہیں۔ تالیہ رک گئی۔ سر جھکا کے پیر دیکھے۔ ان میں پیلے رنگ کے جوتے تھے جن پہ موتی لگے تھے۔

”یہ جوتے تم نے کہاں سے لئے؟“ فاتح نے نظریں اٹھائیں تو ان میں کچھ عجیب سا تھا۔

”یہ؟“ اس نے بے پرواہی سے سر جھٹکا۔ ”شہزادیوں کے پاس ان چیزوں کی کمی نہیں ہوتی تو انکو۔“

”یہ ہاتھ سے بنے ہیں تالیہ۔ اور یہ ابوالخیر کا ملازم محمود مرنی بناتا ہے۔ صرف خاص تحفوں کے لئے۔ یہ اس نے میرے سامنے ایک

صندوق میں رکھے تھے جس میں بہت سے دوسرے تحفے بھی تھے۔ تو کیا وہ تحفے ابوالخیر نے تمہیں بھیجے تھے۔“ اس کا انداز ایک دم پھنکارتا

ہوا ہو گیا۔ ایڈم نے بے اختیار تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ پل بھر کو وہ پھینکی پڑی۔ مگر ابھی بھی جیسے وہ اچنبھے میں تھی۔

”شاید۔ مگر تحفے تو آتے رہتے ہیں اور...“

”سن باؤ کی جگہ ابوالخیر کو وزیر بنانے کے بدلے میں اس نے رشوت دی ہے نا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہی سے پوچھ رہا تھا۔

”مگر آپ خفا کیوں ہو رہے ہیں؟“

”کیونکہ ابوالخیر صرف تحفے نہیں بھیجتا، سونے چاندی کے زیورات بھی بھیجتا ہے۔ اور ابھی تم نے مجھے کہا کہ نیلامی کے لئے رقم تمہارے

جیب خرچ سے آئی ہے، مگر مجھے لگ رہا ہے وہ بھی رشوت کے طور پہ ابوالخیر کی دی گئی ہوگی۔“

وہ لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔ ”اگر ایسا ہے بھی تو ہم اسے اسی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ جو ہمیں معلوم ہے

۔ وہ ہماری جان بچائے گا۔“

”اور تم نے کہا تھا تم اب جھوٹ نہیں بولو گی۔“ وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتا سلاخیں چھوڑ کے پیچھے ہٹا۔ ”تم نے اتنی آسانی سے مجھ سے

جھوٹ بول دیا۔“

وہ بار بار لب کھوتی پھر بند کر دیتی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ”میرے پاس تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا اور...“

”اور تم نے جھوٹ بول دیا؟ اس طرح نہیں ہوتا تالیہ... کسی بھی رشتے اور تعلق میں خواہ وہ صرف ورکنگ ریلیشن شپ ہی ہو، صرف سچ بولا جاتا ہے۔ تم مجھے سچ بھی بتا سکتی تھیں۔“

”آپ کو مجھ پر غصہ ہے کس بات کا؟“ اس کی آواز ہلکی سی بھرا گئی۔

”میں ابھی بات نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے برہمی سے کہہ کے رخ موڑ لیا۔ وہ دکھ اور غصے سے کچھ کہنے لگی تھی مگر ایڈم نے آہستہ سے

پکارا۔ ”چلیں۔ ہماری باری آنے والی ہے۔“

وہ رخ موڑے کھڑا تھا۔ ایک دم وہ اتنا ناراض اتنا اجنبی لگنے لگا تھا۔ جیسے اپنے گھر کی لائبریری میں لگتا تھا۔ جیسے کے ایل میں اس سے بیزار سا لگا کرتا تھا۔

وہ ملا متی نظروں سے اسے دیکھتی پلٹ گئی۔

کچھ دیر بعد فاتح بیڑیوں میں بندھا چبوترے پہ چلتا آ رہا تھا۔ اس نے سفید کرتا پا جامہ پہن رکھا تھا، پیشانی پہ سبز پٹی بندھی تھی اور چہرہ پاٹ، بے تاثر تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا آخری سرے تک آیا اور رک گیا۔ وہ سامنے حاضرین کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بس میکا کی انداز میں دور سیاہ افق پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

محمود مرنی چبوترے کے دوسرے سرے پہ کھڑا اعلان کرتے ہوئے بولا۔ ”فاتح بن رانزل... بولی شروع ہوتی ہے پانچ سو دینار سے۔ کیا کوئی پانچ سو طلائی سکے دے گا اس نومند غلام کے لئے؟“

کرسیوں پہ آخری قطار میں بیٹھے ایڈم کے قریب وہ جھکی۔ ”وان فاتح نے اپنا نام درست بتایا ہے ان کو؟“

”وہ جھوٹ نہیں بولتے، چے تالیہ۔“

”ہونہہ۔“ وہ سر جھٹک کے سیدھی ہوئی۔ ایڈم نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی بلند کی۔ ”چھے سودینار۔“ چھڑی پہ بڑا سا پتلا لگا تھا جس پہ ایک ہندسہ لکھا تھا۔

”چھے سودینار۔“ محمود مرنی نے زور سے کہا۔ ”کیا کوئی اس سے اوپر دے گا۔“

”سات سودینار۔“

”نو سودینار۔“

”ایک ہزار۔“ تین چار آوازیں بلند ہوئیں۔

”پندرہ سودینار۔“ ایڈم نے اپنا کارڈ مزید اونچا کیا۔

”بولی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ کیا کوئی مزید رقم دے گا؟“ محمود جوش سے اعلان کر رہا تھا۔

”دو ہزار دینار....“ دوسرے کونے سے آواز آئی تو تالیہ نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

آخری قطار میں بیٹھا وہ سن باؤ وانگ لی تھا۔ آرام سے بیٹھا، کچھ منہ میں چباتے ہوئے، وہ کارڈ بلند کیے ہوئے تھا۔

تالیہ کے ابرو تن گئے۔ ”قیمت بڑھاؤ ایڈم۔“ وہ بے چینی سے بولی۔

”بائیس سو دینار۔“

”بچیس سو دینار۔“ وانگ لی نے دوبارہ کارڈ بلند کیا۔ اب کی دفعہ اگلی قطار میں بیٹھے ابو الخیر نے بھی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کے

چہرے پہ نا پسندیدگی آگئی تھی مگر وانگ لی ساتھ میں کوئی پھل بھی کھائے جا رہا تھا۔ فاتح نے افق سے نظریں ہٹا کے وانگ لی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ چینی مہم جو جواب میں صرف مسکرایا اور سر کو خم دیا۔

”تین ہزار دینار۔“ ایڈم نے اونچا سا کہا اور اس کی طرف جھکا۔ ”کیا اتنے پیسے ہیں ہمارے پاس؟“

”رقم کی فکر مت کرو۔ ہم انتظام کر لیں گے۔“

”چار ہزار دینار۔“ وانگ لی نے اطمینان سے رقم بڑھائی۔ تالیہ نے پہلو بدلا۔

”پانچ ہزار دینار۔“ ایڈم کو پسینے آرہے تھے مگر وہ صدا لگائے جا رہا تھا۔

”پانچ ہزار دینار۔ زبردست۔ کیا کوئی ہے جو....“ محمود مرنی جوش سے اعلان کر رہا تھا جب ٹھہر گیا۔ ابو الخیر نے اشارہ کیا تھا۔ وہ فوراً چوڑے سے اتر اور مالک کے پاس آیا۔ اس کے کان میں جھک کے بات کی ہدایات سنیں۔ اور پھر اوپر آ کے حاضرین کی طرح رخ کیے کھٹکھارا۔

”چونکہ یہ معاملہ اب سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اس لئے اس غلام فاتح بن رامزل کی بولی ہم واپس لے رہے ہیں۔ یہ غلام اب

نیلامی کے لئے دستیاب نہیں ہے۔“

تالیہ اور ایڈم نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ حاضرین میں سے حیرت اور اچنبھے سے بھری آوازیں بلند ہوئیں۔

”بجائے مقابلہ بازی اور نفرت انگیزی پھیلانے کے ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ اس غلام کو ایک مقررہ قیمت پہنچ دیا جائے۔ جو بھی شخص اس

کو خریدنا چاہتا ہے وہ دس ہزار دینار ادا کر دے اور اسے لے جائے۔“

”میں ادا کروں گا۔“ ایڈم بھی تیزی سے اٹھا۔ چغے کی ہڈ سے اس کے چہرے پہ سایہ سا پڑا تھا۔ لوگ مڑ مڑ کے اسے دیکھنے لگے۔

”میں بھی ادا کروں گا۔“ وانگ لی بیٹھے بیٹھے بولا۔ پھولے گال مسلسل کچھ کھانے کے باعث بل رہے تھے۔

البتہ ابو الخیر نے بس مسکرا کے چوڑے پہ کھڑے محمود کو اشارہ کیا۔ جو اب محمود کسی رٹے رٹائے طوطے کی طرح بولا۔

”اگر دونوں فریقین مطلوبہ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں تو ہم یہ فیصلہ غلام پہ چھوڑتے ہیں کہ وہ کس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔“ وہ فاتح کی

طرف گھوما۔ ”فاتح بن رامزل.... تم فریق نمبر چھ کے ساتھ جانا چاہتے ہو یا فریق نمبر بیس کے۔“

وہ بولی لگانے والے فریقوں کے کارڈز پہ لکھے نمبرز پڑھ کے کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے فوراً ایڈم کے کارڈ کا نمبر پڑھا۔ بیس نمبر۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

بیڑیوں میں بندھے فاتح نے مجمع میں کھڑے دونوں آدمیوں کے نمبرز دیکھے۔

ایڈم بیس نمبر اٹھائے امید اور بے چارگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

پھر اس کی نظریں سن باؤ کی طرف انھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے دوریاں پھل کھاتے ہوئے دوسرے سے چھ نمبر کارڈ بلند کیے ہوئے تھا۔ فاتح نے لب کھولے۔

”میں چھ نمبر کے ساتھ جاؤں گا۔ سن باؤ وانگ لی کے ساتھ۔“

ابوالخیر کے چہرے پہ ناپسندیدگی پھیل گئی مگر اس نے ضبط کر کے تالی بجا لی۔ تمام حاضرین تالیاں بجانے لگے۔ صرف ایڈم تھا جو ہکا بکا کھڑا تھا اور تالیہ.... وہ بے یقین، شل سی بیٹھی تھی۔

”فاتح بن رامزل دس ہزار دینار میں وانگ لی کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اگلے غلام کو لایا جائے۔“ منادی ہور ہی تھی، شور بڑھ گیا تھا۔ چنے کی ٹوپی کے ہالے میں اس کا چہرہ پھیکا پڑ رہا تھا۔

ایڈم ہنڈ ہال سا واپس بیٹھا۔ ”یہ کیا ہو گیا؟“

تالیہ دھیرے سے انھی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ایڈم پیچھے لپکا۔

”چے تالیہ....“ وہ تاریک خاموش گلیوں سے گزرتے جا رہے تھے جب اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا۔ تالیہ کی ہڈیوں سے گر چکی تھی۔ سنہری بال چہرے پہ بکھرے تھے اور وہ سامنے دیکھتی چل رہی تھی۔

”فاتح صاحب نے ایسا کیوں کیا؟“

”کیونکہ انہوں نے ایک عرصہ وانگ لی کے جسم سے محبت کی ہے۔ وہ ان کو یوں لگتا تھا جیسے کوئی بچھڑا دوست ہو۔ وہ اپنے دوست کے پاس واپس جانا چاہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ دوست دوست ہوتا ہے اور فین فین۔“

”مگر....“

”ہم دونوں ان کے فین ہیں بس ایڈم۔ صرف فین۔ ادنیٰ کارکن۔ ہم کبھی ان کے دوست نہیں بن سکتے۔“ وہ تیز تیز چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ چہرہ گلابی پڑ رہا تھا۔ آواز رندہ رہی تھی۔

”اور آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

وہ رک گئی۔ چونک کے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے..... میں...“ وہ کہتے کہتے رکی پھر سر جھٹکا۔ ”جو میرے منہ سے نکلا، میں بولتی گئی۔ اب کیا ان کو تفصیل بتاتی کہ کہاں سے آئی رقم۔ مگر اس میں کوئی اتنا خفا ہونے والی بات تو نہیں تھی کہ وہ یوں کرتے میرے ساتھ۔“

”آپ نے ان سے جھوٹ بولا تھا، چے تالیہ۔“

”میں نے جان کے ایسا نہیں کیا، بس.... بس جو میری سوچ میں آیا میں نے بول دیا۔“

”بس.... آپ کی سوچ میں ہی نہیں آیا وہ جواب اس لئے آپ نے وہ دیا۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ جانتی ہیں انسانوں اور جانوروں میں کس عضو کا فرق ہوتا ہے؟“

”میرے پاس ان باتوں کا وقت نہیں ہے، ایڈم۔“

”اس کا۔“ اس نے انگلی سے ماتھے پہ دستک دی۔

”دماغ؟ یہ تو جانوروں میں بھی ہوتا ہے۔“ اس نے سینے پہ بازو لپیٹے اور آنکھیں تیکھی کر کے اسے دیکھنے لگی۔

”دماغ نہیں۔ دماغ کا سامنے والا حصہ۔ فرنل لوب۔ انسان کی فرنل لوب ہوتی ہے۔ پیشانی کے اندر کا حصہ۔ جانور اس سے محروم

ہوتے ہیں۔“

وہ لب بھنجے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

”جب آپ کی آنکھ کچھ دیکھتی ہے تو اس فرنل لوب کو پیغام بھیجتی ہے۔ (اس نے آنکھ سے پیشانی تک لکیر کھینچی، گویا راستہ متعین کیا۔)

پھر فرنل لوب اس بات کو سوچتی ہے اور پیغام بھیجتی ہے پچھلے حصے کو۔ (انگلی ماتھے سے سر کے پیچھے لے گیا۔) پچھلا حصہ ہاتھ کو حکم دیتا ہے کہ

یہ کام کرو یا ٹھہر جاؤ۔ (انگلی پچھلے حصے سے دوسرے ہاتھ تک لے گیا۔) یوں ہم وہ کام کرتے ہیں یا صبر کر کے خود کو روک لیتے ہیں۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ.... جانوروں میں یہ فرنل لوب نہیں ہوتی۔ ان کی آنکھ جیسے ہی کچھ دیکھتی ہے ڈائریکٹ پچھلے حصے کو پیغام دیتی ہے، وہ ہاتھ کو حکم

دیتا ہے اور جانور ہر شے چیز پھاڑ کر دیتا ہے، کیونکہ وہ اس بات کو ”پیشانی“ تک لاتا ہی نہیں ہے۔ وہ اس کو process ہی نہیں کرتا۔

اس کو سوچتا ہی نہیں۔“

وہ بس پتلیاں سکوڑے اس کو دیکھے گئی۔

”انسان ہر بات فرنل لوب کے پاس لاتا ہے، اس پہ غور کرتا ہے، مگر جب کوئی کام عادت بن جائے، تو آنکھ اس کو دیکھتے ہی پیشانی کو

پیغام پہنچانے کی بجائے ڈائریکٹ پچھلے حصے کو پیغام دے دیتی ہے جو ہاتھ کو کہتا ہے کہ کر ڈالو اور ہاتھ کر ڈالتا ہے۔ یوں سارے اعضاء

پیشانی کو بائی پاس کر جاتے ہیں۔ وہ شارٹ کٹ بنا لیتے ہیں۔ جیسے ہم کمرے میں داخل ہوتے ہی عادی سوچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے لائٹ

جلاتے ہیں۔ یوں عادتیں بنتی ہیں۔ مگر پھر... اس نے گہری سانس لی۔

”کچھ کاموں میں دماغ کے پچھلے حصے کو مزاحمت دینا پڑتا ہے۔ وہ پیشانی کو بائی پاس کرنے لگ جاتا ہے اور وہ کام ہماری ایڈکشن بن جاتے ہیں۔ لت۔ نشہ۔ کیوں ہیروئن ایڈکٹ یا شرابی یا انٹرنیٹ پہ غلط چیزیں دیکھنے والے ان عادتوں کو چھوڑ نہیں پاتے؟ کیونکہ ان کے اعضاء وہ کام کرتے وقت پیشانی کو Skip کر دیتے ہیں۔ وہ اس کو سوچتے نہیں۔ اس سے پوچھتے نہیں۔ اس بات کو پراسیس ہی نہیں کرتے۔ اس کو Compulsive رویہ کہا جاتا ہے۔ بناسوچے سمجھے عادتاً کر ڈالے جانے والا عمل۔“

”تم کہنا چاہتے ہو کہ میں Compulsive liar ہوں؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”جے تالیہ۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”آپ کو کہانیاں گھڑنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ آپ بلا ضرورت جھوٹ بول دیتی ہیں۔ اب وان فاتح کو آپ سچ بھی بتا سکتی تھیں مگر آپ کو لگتا ہے کہ سچ کوئی سمجھے گا نہیں۔ سب Compulsive liars کو یہی لگتا ہے۔ یہ بزدلی ہے۔ سچ بہادی ہے۔ خود اعتمادی ہے۔ ایڈکشن کا بہترین حل ول پاور استعمال کرنا ہے، ہر بار پیشانی (اس نے ماتھے پہ انگلی سے دستک دی) کے سامنے معاملہ رکھنا ہے اور اس معاملے پہ سوچنا ہے۔ نفع نقصان۔ پھر اس کو کرنا ہے۔ خود کو غلط کاموں سے روکنے کا یہی طریقہ ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ اپنی اس عادت کو بدلیں تو آپ کو اپنی فریمل لوب کو استعمال میں لانا ہوگا۔“

”یعنی میں جو بھی کر لوں، آخر میں تم دونوں کے نزدیک میں ایک جھوٹی اور بددیانت چور ہی رہوں گی؟ تھینک یو ایڈم۔“ دکھ اور غصے سے بولتی وہ پلٹی اور تیز تیز ایک طرف بڑھ گئی۔ ایڈم گہری سانس لے کر اسے جاتے دیکھتا رہا۔

اہ اندھیر گلی میں آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے سنہری بال ہنڈ سے نکل کے اڑاڑ رہے تھے۔

☆☆=====☆☆

چار عربی نسل گھوڑوں کا وہ مختصر سا قافلہ ملا کہ کی گلیوں میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پچھلے تین گھوڑوں پہ غلام سوار تھے اور پہلے کی لگام وان فاتح نے تھام رکھی تھی۔ اس پہ فریبی سا چو لے گالوں والا وانگ لی سوار تھا۔ لمبے بال چوٹی صورت بندھے تھے اور رات کے اس پہر بھی چہرے کی چکنی جلد چمک رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے لگام تھامے، نئے غلام کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

فاتح کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ مشینی انداز میں سارے کام سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں وانگ لی کے لئے شناسائی کی کوئی رمت تک نہ تھی۔

گلی کے وسط میں پہنچ کے وانگ لی نے گھوڑا روک دیا تو فاتح نے نظر اٹھائی۔

سامنے ایک بڑا سا پھانک تھا۔ سرخ پھانک۔ اس کا سانس لمبے بھر کو تھم گیا۔

تین خزینوں کا مسکن۔ سن باؤ کا گھر۔

وہ نئے دور سے مختلف تھا۔ نئے دور میں اس گھر کا دروازہ عصرہ نے بنوایا تھا اور سامنے گلی تھی اور گلی کے دوسری طرف دکانوں کی قطار۔

مگر اس قدیم دور میں سن باؤ کے گھر کے سامنے کا علاقہ کئی کوس دور تک خالی سبزہ زار پہ مشتمل تھا۔ دور درختوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ اس گھر کے ساتھ قطار میں ایسے دوسرے کئی گھر بھی بنے تھے اور وہ سب نئے دور سے بڑے نظر آتے تھے۔

سن باؤ گھوڑے سے اتر اتو فاتح نے لگام چھوڑ دی۔ دو غلام گھوڑے لئے پلٹ گئے۔ فاتح اور ایک غلام اس کے ساتھ اندر آئے۔ دروازہ عبور کیا تو سامنے راہداری سی تھی۔ وہ بالکل گم صم سا ادھر ادھر دیکھتا راہداری سے گزر کے اندرونی برآمدے تک آیا جس کے آگے چوکور صحن بنا تھا۔

دوسرے غلام نے جلدی جلدی چند مشعلیں روشن کیں تو اندھیرے میں اجالا سا ہو گیا۔ سن باؤ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اور وہ.... وہ برآمدے میں مبہوت سا کھڑا برشے کو دیکھ رہا تھا۔

برآمدے میں آتش دان کے ساتھ خالی کرسی رکھی تھی۔ ایسے ہی عصرہ نے نئے دور میں رکھی تھی۔ صحن کے ایک کونے میں کنواں بنا تھا اور دوسرا کونا.... فاتح کی نظریں اس طرف گئیں۔ وہ خالی تھا۔ وہاں کوئی مجسمہ نہ تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا صحن کے وسط میں آرکا۔ کوئی طلسم سا تھا اس گھر میں۔ یہ اس کے گھر جیسا بالکل نہ تھا۔ رنگ روغن، فرنیچر، پودے، سب مختلف تھے، مگر یہ اس کے گھر جیسا ہی تھا۔ ویسا ہی پرسوں اور پراسرار۔

”فاتح بن رامل نام ہے تمہارا؟“

وہ بے ساختہ پلٹا۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ سن باؤ آکھڑا ہوا تھا۔ لبوں میں سگار دبائے وہ دیا سلائی سے اس کو سگار ہاتھا۔ ”جی، مالک!“ اس نے سر خم دیا، مگر نظر نہ جھکائی۔ یہ اس کا جھک کے بھی نہ جھکنے والا انداز تھا جو ہر دفعہ کی طرف سن باؤ کو آج بھی بہت اچھوتا لگا تھا۔

”جانتے ہو تمہیں اتنی قیمت دے کر کیوں خریدا یا ہوں؟“

”نہیں جانتا، مالک۔“

سن باؤ نے گہرا کش بھرا اور سگار باہر نکال کے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے منہ سے دھواں چھوڑا۔ ”کیونکہ تم نے میری جان بچائی تھی۔ اللہ فرماتا ہے احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“

”میں شکر گزار ہوں، مالک۔“

سن باؤ چند لمحوں سے دیکھتا رہا۔ سگار کا کنار اس رخ دکھتا رہا۔

”تم نے مجھے مطلع کیا تھا کہ میرے شور بے میں زبر ہے۔ مجھے تمہاری اس وفاداری کی خصلت نے متاثر کیا اور میں تمہیں یہاں لے آیا۔ اب مجھے بتاؤ کہ ابوالخیر مجھے کیوں مارنا چاہتا تھا؟ اور یہ سب اس کی ایماء پہ ہوا تھا؟“

”مالک! میں نہیں جانتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ غلام سپاٹ کھڑا تھا۔

سن باؤ نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔ ”تم نے مجھے زہر کے بارے میں مطلع کیا تھا اور...“

”میں اپنے سابقہ مالک کی کوئی برائی آپ سے بیان نہیں کروں گا، مالک۔ یہ میرے آداب کے خلاف ہے۔“

سن باؤ نے گہری سانس لی اور افسوس سے اسے دیکھا۔ ”میں نے تمہیں سونے کا ایک ڈھیر دے کر خریدا اور تم نے پہلی ہی رات میری

حکم عدولی کر دی۔ انجام جانتے ہو اس کا؟“

وہ کنویں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس تاریک قدیم صحن میں۔ اس بات پہ ہلکا سا مسکرایا۔

”وفا داری! آپ نے کہا آپ کو میری وفاداری نے متاثر کیا، مالک۔ جبکہ آپ کی جان بچانے کا عمل انسانی ہمدردی کے زمرے میں آتا

ہے۔ اور جو ابھی آپ نے سب کہا، وہ حکم نہیں امتحان تھا۔ آپ میرا امتحان لے رہے تھے اور میں اس امتحان میں پورا اتر اہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ جانچ رہے تھے کہ آیا میں اپنے سابقہ مالک کی برائی بیان کروں گا یا نہیں۔ تو جو وفا داری آپ کو میری پیشانی پر ثبت نظر آئی تھی،

جس کو پڑھ کے آپ نے مجھے خریدا اس وفا داری کو ہلکامت جانیے۔ اگر آج سابقہ مالک کی برائی نہیں کر سکتا تو کل کو آپ کی بھی نہیں کروں

گا۔ آپ مجھے وفا کے ہر امتحان میں پورا پائیں گے۔“

سن باؤ برآمدے سے ایک قدم نیچے اتر اتر چہرہ آدھے چاند کی چاندنی میں روشن نظر آیا۔ اس پہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”میری قیافہ شناسی (چہرے پڑھنا) کبھی غلط نہیں ہوتی۔ فاتح، مجھے خوشی ہے کہ میں نے درست انتخاب کیا ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح نماز

فجر کے بعد سے کام شروع کرنا ہوگا تمہیں۔“

وہ مڑنے لگا تو فاتح بول اٹھا۔

”آپ ایک عظیم آدمی ہیں، مالک۔“

فریبی چینی سفارتکار ٹھہرا اور پلٹ کے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم مجھے کتنا جانتے ہو۔“

غلام سادگی سے مسکرایا۔ ”آپ ایک جنگی قیدی کے طور پہ چینی شاہ کے دربار میں لائے گئے تھے۔ وہاں آپ کو غلام (تائی ژان) بنایا

گیا تھا۔ آپ نے برسوں شاہ چین کی خدمت کی۔ آپ شاہ کے وفادار غلام ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی یاں سوفو کو شادی کے لیے رخصت

کرتے وقت بھی شاہ نے آپ کو ان کے ساتھ بھیجا۔ آپ ملک ملک گھومے ہیں اور چائے کے جنگلات سے آپ کو عشق ہے۔ اس کے علاوہ

آپ نے سات بحری سفر کیے ہیں جو تارتخ میں یاد رکھے جائیں گے۔“

”جیسے... میں نے تجھے سفر کیے ہیں۔“

فاتح ٹھہر گیا۔ رات ایک دم سو گوار ہو گئی۔

”آپ ساتواں بھی کریں گے، مالک۔“

”اچھا؟ مجھے تو سمندر میں اترے زمانے بیت گئے۔ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟“

”مجھے بھی پیشانی کی لکیروں میں چھپا مستقبل پڑھنا آتا ہے۔ مگر میں چاہوں گا کہ آپ وہ ساتواں سفر کبھی نہ کریں۔“

”کیوں؟“ وہ چونکا۔

”ان سوالوں کے جواب نہیں پوچھنے چاہئیں جو اگر ہمیں معلوم ہو جائیں تو برے لگیں ہمیں۔“

سن باؤ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ”مجھے زمانے ہوئے ایک بھکشنے کہا تھا کہ مجھے سمندری سفر

نہیں کرنے چاہئیں۔ اس دنیا میں میرا آخری سفر بھی سمندر میں ہو گا جہاں سے میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ کیا واقعی ایسا ہو گا؟“

فاتح نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ ہاتھ کرپہ باندھے تھے اور آنکھوں میں سارے جواب تحریر تھے۔

”مگر خیر..... تمہیں مستقبل کا کیا علم!“ سن باؤ نے مسکرا کے سگار پھینکا، انگارے کو جوتے سے مسلا اور پھر ادھر ادھر طائرانہ نظر ڈالی۔ ”تم

کوئی بھی کونا لے سکتے ہو۔ سوائے اس برآمدے اور میرے کمرے کے، سارا گھرا پناہی سمجھو۔“

وان فاتح نے گردن اٹھا کے بالائی منزل کے اس کمرے کی کھڑکی کو دیکھا جو صحن میں کھلتی تھی۔

”وہ اوپر والا کمرہ..... وہ میرا ہو گا۔“

”وہ؟“ سن باؤ نے تعجب سے ابرو اچکائے۔ ”وہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہے اور اسے صاف کرنے کی ضرورت.....“

”وہ میرا ہے، مالک۔ مجھے وہی کمرہ چاہیے۔“ ادب سے اس کی بات کاٹی تو وانگ لی نے شانے اچکائے۔

”جیسے تمہاری مرضی، فاتح!“ اور پلٹ گیا۔ اب وہ ہلکا ہلکا زیر لب کوئی چینی دھن گنگنا تا اندر کی طرف جا رہا تھا۔

تاریک صحن میں وہ کنویں کے ساتھ کھڑا اس قدیم خاموشی کو محسوس کرتا رہا۔

صحن کا دوسرا کونا خالی تھا۔

صاف، ہموار۔

وہاں کوئی مجسمہ نہ تھا۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ شہر فجر کی نماز کے ساتھ ہی جاگ اٹھتا تھا اور بازار کھل جاتے تھے۔ محل میں بھی کام شروع ہو جاتے۔ شاہی مکین تیار ہو کے اپنی

خواب گاہوں سے نکل آتے اور اپنے اپنے دربار سجالیتے۔ یہاں زندگی سورج کی روشنی کی محتاج تھی۔ سورج جیسے جیسے سوانیزے پہ پہنچتا،

مصرفیت عروج پہ جا پہنچتی۔

”سلطنت محل“ میں سلطان کا دربار سجا تھا اور مرسل شاہ تخت پہ براجمان نیم دلی سے مراد راجہ کو سن رہا تھا جو نئے حکم نامے اس کے

سامنے رکھ رہا تھا۔ درباری وزراء معرعو بیت اور حسد سے مراد رجبہ کو دیکھ رہے تھے جو سلطان کے بائیں ہاتھ کھڑا، ساری طاقت کا منبع لگ رہا تھا۔ یہ معمول کی کارروائی تھی اور ہر روز کی طرح جاری و ساری تھی۔

بابر محل کے پائیں باغ میں ملکہ یان سو فواپنی کینروں کی معیت میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ بڑا ساج پہنے وہ سولہ سنگھار سے آراستہ تھی۔ البتہ مزاج برہم لگتا تھا۔

سامنے سے تین افراد آتے دکھائی دیے تو ملکہ رک گئی۔ وہ تینوں قریب آئے اور جھک کے اسے تعظیم پیش کی۔ پھر ادھیڑ عمر آدمی جو کہ محل کا طبیب تھا، سر اٹھا کے کہنے لگا۔

”ملکہ... میں سلطنت محل کا پرانا طبیب ہوں۔“

”جانتی ہوں۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”کیا میرا چینی طبیب ملا ہے آپ کو؟“

”جی ملکہ۔ وہ حاضر ہوا تھا اور اس نے وہ ٹوکا بتایا ہے جس سے چینی شاہ تندرست ہو سکتے ہیں۔“ رکا اور ٹھہر کے بولا۔ ”اس کے خیال میں۔“

یان سو فو کی خوبصورت پیشانی پہ بل پڑا۔ ”یہ آزمودہ ٹوکا ہے۔ آپ سلطان کے غسل کا پانی اکٹھا کریں اور اسے میرے طبیب کو دیں تاکہ وہ چین لے جائے اور میرے باپا کا علاج کر سکے۔ یہ کام ابھی تک ہوا کیوں نہیں ہے؟“

بوڑھے طبیب نے گہری سانس لی۔ ”معذرت ملکہ، مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے اس ٹوکے کی افادیت من گھڑت لگتی ہے۔ سلطان کا غسل کا پانی سلطان پہ جادو ٹونے کرنے کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ ہم کسی اور کی جان بچانے کے لئے سلطان کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“

یان سو فو نے لب بھنجے۔ چہرہ گلابی پڑنے لگا۔ ”یہ میرے باپا کی صحت کا سوال ہے۔ آپ میری حکم عدولی کیسے کر سکتے ہیں۔“

”ملکہ میرا کام سلطان کو درست مشورہ دینا ہے۔ ماضی میں بھی طبیب کا قول اس محل میں سلطان کے قانون سے بھی اوپر رہا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں مگر میں آپ کے چینی طبیب کے ٹوکے پہ سلطان سے عمل نہیں کروا سکتا۔ ملا کہ کے قانون کے مطابق طبیب کی بات حرف آخر ہوتی ہے اور اسے قاضی وقت بھی نہیں بدل سکتا۔“ ہاتھ باندھے وہ ملکہ کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک ڈھکا چھپا استہزاء تھا۔

یان سو فو نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ ”آپ کو اپنا قول بدلنا ہوگا، طبیب!“

”سلطنت محل کے طبیب اپنے اقوال نہیں بدلا کرتے، کیونکہ وہ مریض کی بہتری کو مقدم رکھتے ہیں۔ چاہے طبیب کا سر ہی کیوں نہ کٹوا دیا جائے۔“ وہ ہٹ دھرم تھا۔

یان سو فو کو ایک دم اپنا آپ بہت بے بس لگا۔ اس نے طبیب کے ساتھ کھڑے معالجوں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ سب ملے تھے۔ ملے

نقوش والے اجنبی لوگ۔ اور وہ چینی تھی۔ وہ ان میں غیر تھی۔ اس کے حلق میں آنسو گرنے لگے۔ پر ایسا ملک۔ پر ایسا محل۔ یہ سب اس کے لیے اجنبی تھا۔ آخر کیوں شاہ چین نے شادی کر کے اس کو یہاں بھیج دیا؟ وہ اب کیسے رہے گی یہاں؟

آہ.... ہم شہزادیوں کی سیاسی، ناخوش شادیاں۔ اسے خود پہ ترس آیا۔

”آپ نے درست فرمایا، طبیب صاحب۔“ آواز پہ وہ سب چونکے۔ یان سوفو نے گردن موڑی۔

تالیہ مسکراتی ہوئی، کاہل لباس پہلوؤں سے اٹھائے، چلی آرہی تھی۔ اپنی کینڑوں کو دور کھڑا کیے، وہ تنہا قریب آئی تھی، اور ان دونوں کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ طبیب نے چونک کے اسے دیکھا، اور یان سوفو... اس کے کان سرخ ہونے لگے۔ وہ کم از کم بندہ ہارا کی بیٹی کے سامنے اپنی بے بسی کا تماشا نہیں لگانا چاہتی تھی۔

”شہزادی!“ طبیب نے تعظیم پیش کی۔ یان سوفو نے صرف اسے کھورا۔

”آپ نے درست فرمایا، طبیب صاحب۔“ مسکراتے ہوئے تالیہ نے بات جاری رکھی۔ سہرے بالوں پہ سجا تاج اور اس کی آنکھیں دونوں چمک رہی تھیں۔ ”آپ کا سر بھی کٹ جائے تو آپ کو اپنا قول نہیں بدلنا چاہیے۔“

یان سوفو نے دانتوں پہ دانت جمائے۔ مٹھیاں سختی سی بھیجنے لیں۔ یہ بے بسی.... یہ لا چاری۔

”لیکن اگر تنخواہ کٹ جائے تو؟“ سہری لٹ کوانگلی سے پیچھے کرتے شہزادی تاشہ نے سوال پوچھا تو طبیب چونکا۔

”میں سمجھا نہیں شہزادی۔“

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور چہرے پہ ایک دم برہمی آگئی۔

”چینی شاہ کی بیٹ.... ملا کہ کی ملکہ.... یہاں کھڑی ہو کے صرف ایک بیٹی کی حیثیت سے آپ سے سوال کر رہی ہے کہ آپ اس کے والد کی جان بچائیں اور آپ اس کو جواب میں قانون کی شقیں پڑھا رہے ہیں؟“

وہ غرا کے بولی تو طبیب نے ادب سے نظریں جھکائیں۔ یان سوفو کی مٹھیاں ڈھیلی پڑیں۔ وہ گم صا... سی تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔

”صرف اس لئے کہ ملکہ کی شکل آپ سے مختلف ہے، آپ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کے ملکہ کو اذیت دینا چاہ رہے ہیں؟“ وہ طبیب کے جھکے چہرے پہ نظریں جمائے پھنکار رہی تھی۔

”اگر بات قانون کی ہے تو خاص مشیر کا عہدہ طبیب کے عہدے سے بڑا ہے۔ میں سلطان کی خاص مشیر ہوں۔ ابھی ابوالخیر کو حکم جاری کر سکتی ہوں کہ آپ کی تنخواہ آدھی کاٹ دی جائے۔ اور یقین کریں، میں دلیل کے طور پہ ایسے اعداد و شمار دکھا سکتی ہوں جو یہ ثابت کریں گے کہ آپ حق سے بڑھ کے تنخواہ لے رہے ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں آپ کو ایک دوسرا موقع دوں گی۔“

پھر ملکہ کی طرف اشارہ کر کے حکم سے بولی۔

”ملکہ سے معافی مانگیئے اور اپنا سران کے حکم کے آگے جھکا دیجئے۔ نہ صرف آپ کی تنخواہ اور مراعات بڑھیں گی، بلکہ عزت بھی دگنی ہو

جائے گی۔“

یان سوفو کے چہرے کی سرخی زائل ہو چکی تھی۔ وہ بس تالیہ مراد کا چہرہ تک رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے۔ سانس روکے۔ بندہارا کی بیٹی ابھی تک طبیب سے مخاطب تھی۔ جس کے چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا، دوسرا جا رہا تھا۔

”کیونکہ اگر آپ نے انکار کیا تو میں قاضی وقت کے پاس فتویٰ لینے جاؤں گی کہ آپ منکر حدیث ہیں۔ نظر لگنے کا علاج حدیث پاک ﷺ میں نظر لگانے والے کے غسل کے پانی سے کیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ جائے طب نبوی کی کتابیں کھولیں، اور پڑھیے۔ چینی ٹوٹکا ہماری حدیث سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ملکہ نے آپ سے چند بوندیں پانی کی ہی تو مانگی ہیں۔ یہ سوچ کے انکار مت کیجئے کہ ملکہ تنہا ہیں۔ اگر آپ نے یا اس محل میں کسی ملے عہدیدار نے....“ ارد گرد نظر دوڑا کے اونچی آواز میں بولی۔ ”دوبارہ کسی چینی عورت کو تنہا جان کے اس پہ ظلم کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا، ملاکہ میں رہنے والی ہر چینی عورت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی، مجھ سمیت۔“ سینے پہ انگلی سے دستک دی۔ ”کیونکہ میری ماں بھی چینی تھی اور میں نے بھی چین میں پرورش پائی ہے۔“

”مجھے معاف کر دیجئے، ملکہ۔“ طبیب فوراً جھکا اور ملکہ کے جنوؤں پہ ہاتھ رکھ دیے۔ ”میری جان لے لیجئے مگر اسندہ حکم عدولی نہیں ہوگی۔“

یان سوفو نے قدموں میں جھکے طبیب کو نہیں دیکھا۔ وہ بس گردن موڑے ایک ٹک تالیہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر لبوں کو جنبش دی۔

”جاؤ، حمام کا انتظام کرو اور پانی بھجواؤ۔“ گم صم نظریں اب بھی تالیہ پہ جمی تھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ پراعتاد پر سکون، نارمل سی۔

وہ سب دور چلے گئے اور کینریں پیچھے ہٹ گئیں تو سن ہی کھڑی یان سوفو نے اسے پکارا۔

”اس سب کا کیا مقصد تھا؟“

تالیہ پوری کی پوری اس کی طرف گھومی۔ تاج سے نیچے اس کے سنہری بال ہلکی ہوا سے کندھوں پہ چھول رہے تھے۔ اور چہرے پہ سادہ سی مسکراہٹ تھی۔

”میں آپ کو یہ بتا رہی تھی، ملکہ کہ میری ماں واقعی چین کی تھی اور میں نے چین میں ہی پرورش حاصل کی ہے، کیونکہ جب چینی کوتوال کے مراسلے خالی نکلیں تو شک لازمی پڑتا ہے۔“

یان سوفو بالکل دھک سی رہ گئی۔ لب کھل گئے۔ تالیہ نے لباس سے ایک سرخ ریشم میں لپٹا رول شدہ کاغذ نکالا۔

”یہ وہ مراسلہ ہے جو چینی کوتوال نے آپ کے نام بھیجا تھا۔ آپ کا آدمی واپسی پہ جس سرائے میں ٹھہرا، وہاں میرے آدمی نے مراسلے

بدل ڈالے۔ میں اصلی مراسلے لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کو دوبارے بتانے۔“

وہ مراسلہ یان سوفو کی طرف بڑھائے ہوئے تھی۔ اور یان سوفو بالکل بت بنی کھڑی تھی۔

”کوئی بھی رشتہ، کوئی بھی تعلق، غلط پیر پہ نہیں شروع ہونا چاہیے۔ اس میں ہمیشہ سو فیصد سچائی ہونی چاہیے۔ اس لئے یہ خط میں خود آپ کو

پیش کرتی ہوں۔ اس کو کھول کے پڑھ لیں یا چاہیں تو اس کو کھولے بنا میری دوسری بات سن لیں۔“

”بولو۔“ وہ پلک تک نہیں جھپک پارہی تھی۔ سوانیزے پہ آئے سورج تلے وہ دونوں باغ میں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔

”میں.... آپ کی.... دشمن... نہیں ہوں۔ میں مرسل شاہ کو آپ سے دور نہیں کرنا چاہتی۔ میں مرسل شاہ کو صرف راجہ مراد سے دور کرنا

چاہتی ہوں۔ میں ان کو ایک مضبوط اور طاقتور سلطان بنانا چاہتی ہوں۔ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے اور وہ ہے راجہ مراد۔“

”اور تم راجہ مراد کی بیٹی ہو۔“

”تو پھر وہ مجھے سن باؤ کے گھر کھانے پہ کیوں نہیں لے کر گیا؟ پھر وہ مجھ سے ڈرتا کیوں ہے؟ اس نے کیوں اتنے سال مجھے خود سے دور

رکھا۔ اور اس کی مرضی کے خلاف میں واپس کیوں آئی ہوں۔“

یان سو فو بھنویں اکٹھی کیے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”میں نے ابو الخیر کو خزانچی اس لئے بنایا تا کہ سن باؤ کو ہم سرکاری عقابوں کی نظروں سے محفوظ انگ تھلگ رکھ سکیں گے۔ سن باؤ اس سے

بڑے کاموں کا اہل ہو سکتا ہے۔ ہم اس سے دوسرے کام لے سکتے ہیں۔“

”ہم؟“ یان سو فو کا ذہن اس ایک لفظ پہ اٹک گیا۔

”جی ملکہ۔ اگر آپ اس خط کو پڑھے بغیر جلاؤ لیں تو میں اور آپ ’ہم‘ ہو سکتے ہیں۔ دو چینی عورتیں.... اور مقابل ہوگا سارا ملاکہ۔“ وہ

رول ملکہ کی طرف بڑھائے، مسکرا کے بولی تو یان سو فو نے ایک نظر خط پہ ڈالی۔

”کیا تم نے پڑھا ہے کہ کو تو ال نے تمہارے بارے میں کیا لکھا ہے؟“

”مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ملکہ۔ میں خود کو اچھے سے جانتی ہوں۔ وہ مجھے مجھ سے بہتر نہیں جان سکتا۔“

”اور دوسری بات کیا تھی؟“

تالیہ کی مسکراہٹ مزید زخم زدہ ہوئی۔ ”میں جہاں سے آئی ہوں، تھوڑے عرصے بعد وہاں واپس چلی جاؤں گی۔ میں واپس جانے کے

لئے آئی تھی۔ ملاکہ سے ایک چیز لے کر جانے کے لیے۔ کیونکہ میری دنیا، میری زندگی اور میری محبتیں وہ سب وہاں ہے۔ یہاں میرا کچھ بھی

نہیں ہے۔“

یان سو فو کو جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ابرو اٹھائے۔ ”تم محل کے عیش و آرام چھوڑ کے اپنے گاؤں چلی جاؤ گی؟“

”میرے گاؤں میں محل نہیں ہیں، گھر ہیں۔ وہاں میں شہزادی نہیں ہوں، عام لڑکی ہوں۔ مگر میری محبتیں اور یادیں وہیں ہیں۔ وہاں

کوئی ایسا تھا جس پہ میں نے دل ہارا تھا اور مجھے اسی کے لئے واپس جانا ہے۔“

یان سو فو کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑتے گئے۔ ”تو کیا وہاں تم کوئی محبوب چھوڑ کے آئی ہو؟“ پہلی دفعہ اس کے لہجے میں نرمی گھلی۔

تالیہ نے ادا سی سے مسکرا کے سر کو خم دیا۔ ”جی ملکہ۔ ایک آدمی تھا۔ مجھے اتفاق سے ملا تھا۔ وہ جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔“

(آنکھوں میں تینگو کامل کے نیم روشن ڈرائنگ روم کا منظر جاگا۔ وہ جھک کے اسے جوس پیش کر رہی تھی۔) وہ جو میرا نام بھول جایا کرتا تھا۔ (وہ سرخ لباس میں آرٹ گیلری کے آفس میں عصرہ اور اشعر کے ساتھ کھڑی تھی اور وہ اسے تاشہ کہہ کے پکار رہا تھا۔) وہ جو میرے جیسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ (وہ ڈاننگ ٹیبل کے مخالف سروں پہ بیٹھے بات کر رہے تھے اور گھائل غزال میز پہ رکھی تھی۔) وہ جو مجھے بلاوجہ ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ (وہ لائبریری میں کھڑی تھی اور فاتح ورزش کے لباس میں تو لیے سے گردن پونچھتا، اسے تلخی سے کچھ کہہ رہا تھا۔) مجھے اس کا وہی روپ پسند تھا۔ اور مجھے وہی واپس چاہیے۔۔۔“ اور پھر دونوں ہاتھوں میں رول ملکہ کی طرف بڑھایا۔

”آپ اپنے تجسس کی تکمیل چاہتی ہیں یا خوابوں کی؟ فیصلہ آپ کا ہے۔“

یان سو فو چند لمحے اس سرخ رومال کو دیکھتی رہی، پھر اسے اٹھالیا اور مڑ گئی۔ اب وہ تیز تیز اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تالیہ وہیں کھڑی رہی، بازو سینے پہ پیٹ لئے اور اسے جاتے دیکھتی رہی۔

برآمدے میں داخل ہوتے ہی یان سو فو دیوار پہ لگی مشعل کی طرف بڑھی اور سرخ رومال میں لپٹا کاغذ اس میں جھونک دیا۔ پھر ساتھ رکھی دیا سلائی سلائی اور مشعل کا شعلہ پھڑکا دیا۔ آگ کی لپٹوں نے ریشم کوفر اپنی پیٹ میں لے لیا۔ کاغذ اور کپڑا دونوں جلنے لگے۔

یان سو فو برآمدے کے سرے پہ آرکی اور فاتحانہ نگاہوں سے دور کھڑی تالیہ کو دیکھا۔ بندابارا کی بیٹی مسکرائی اور سر کو پورا جھکا کے اٹھایا۔ ملکہ کی گردن مزید تن گئی۔ وہ عرصے بعد خود کو بہت مضبوط محسوس کر رہی تھی۔

وہ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ایک دوسری عورت کا ساتھ چاہیے تھا۔

”اس کاغذ میں کیا تھا؟ آخر کو تو ال نے آپ کے بارے میں لکھا کیا تھا؟“ اس دوپہر ایڈم نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے سر گوشی کی تھی۔ وہ دونوں سادہ جھنوں میں ملبوس ملاکہ کے بازار میں بھیس بدلے چل رہے تھے۔

”کاغذ خالی تھا۔ ملکہ کی ایک کنیر نے شریفہ کو بتا دیا کہ ملکہ ملازم کو چین بھیج رہی ہے میرے تعاقب میں تو ہم نے اس ملازم کو فرید لیا۔ وہ چین گیا ہی نہیں۔ وہ کو تو ال سے ملا ہی نہیں۔ دونوں کاغذ خالی تھے۔“

”تو آپ نے ملکہ کو بے وقوف بنایا؟“

”نہیں ایڈم، میں نے ملکہ سے سچ بولا۔ میں نے اس کو اپنی طاقت بھی دکھائی، اور اپنی کمزوری بھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ دوسرے کاغذ میں بھی کچھ نہیں ہوگا اور اگر ہے بھی تو وہ میرے جیسی طاقتور حلیف سے بڑھ کے نہ ہوگا۔ اور اسے یہ تسلی بھی ہوگئی کہ میں مرسل شاہ کو اس سے چھیننے نہیں آئی ہوں۔ اس لئے اس نے بہتر فیصلہ کیا۔“

وہ دونوں اب بازار کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ صاف چہرے، سادہ کپڑے اور چہروں پہ ٹوپی کا سایہ، وہ بھیس بدل کے عام لوگ نظر آتے تھے۔ بازار کی گہما گہمی اور رش عروج پہ تھا، پھر بھی خاموشی سے محسوس ہوتی تھی۔ نہ ٹریفک کا ہارن، نہ موسیقی کی آوازیں۔ کوئی مقدس خاموشی تھی جو اس دنیا میں جانے کتنی صدیوں سے تھی۔

ایک دکان کے سامنے قبوہ چائے کے لئے کرسیاں میزیں رکھی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ایڈم نے چائے منگوالی اور پھر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا جو بے زاری بیٹھی ایک طرف چہرہ موڑ کے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کل رات سے خاموش خاموش ہیں۔ اور پھر آپ نے آج یاں سو نو کو حلیف بنالیا۔ کیا اس سب کا تعلق فاتح صاحب کی باتوں سے ہے؟“

تالیہ نے سرد مہری نظریں اس کی طرف موڑیں۔ ”میں ان کے لئے ایک جھوٹی اور بددیانت لڑکی تھی اور رہوں گی۔ کل رات جو انہوں نے میرے ساتھ کیا اس کے بعد میں اپنی زندگی کی ترجیحات خود سیٹ کر رہی ہوں ایڈم۔ وہ اب اپنے فرار کا راستہ خود ڈھونڈیں گے۔ نہ میں ان پہ انحصار کروں گی نہ وہ مجھ پہ۔ کل ہم الگ ہو گئے تھے۔“

”اور میں؟ میں کس گنتی میں ہوں بھئی؟“ اس نے منہ بسورا۔

”تم مورخ ہو تاریخ لکھو۔ تاریخ بنانے کا کام مجھ پہ چھوڑ دو۔“ وہ خفگی سے بولی۔ بیرا چائے لے آیا تو اس نے شیشے کی نازک پیالی اٹھا لی اور گرم گرم گھونٹ بھرنے لگی۔

”آپ ان سے ناراض ہیں، ٹھیک ہے۔ مگر مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ کیا ان باتوں کی وجہ سے جو میں نے کل آپ سے کہیں؟“ ساتھ ہی اپنی پیشانی پہ انگلی رکھی، جیسے باتوں کا موضوع یاد دلایا ہو۔

تالیہ نے ایک اچھلتی نگاہ اس پہ ڈالی۔ ”تم نے درست کہا تھا۔ جو لوگ اپنی فرائض کو استعمال نہیں کرتے، وہ ایڈکٹ ہو جاتے ہیں۔ ڈرگز غلط چیزوں اور جھوٹ کے۔ مگر کچھ لوگ سچ کے بھی ایڈکٹ ہوتے ہیں۔ وہ پیشانی سے سوچے بغیر دوسرے کے جذبات کا احساس کیے بغیر اگلے کوچ کر کے نصیحت شروع کر دیتے ہیں۔ ایڈکشن بر چیز کی غلط ہوتی ہے ایڈم۔ بھاشن دینے کی بھی۔ سچ بولنے کی بھی۔“ خالی پیالی میز پہ دھری اور خفگی سے چہرہ موڑ لیا۔ ایڈم گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی پیالی رکھی اور اپنا دستہ کھول لیا۔ دوات نکالی اور قلم اس میں ڈبو ڈبو کے لکھنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، آپ کا برواقعہ اتنا بڑھا چڑھا کے لکھنا پڑتا ہے کہ بس! اور شاہی مورخ کے طور پہ مجھے ہر جمعے کے روز یہ صفحات دربار میں سنانے ہوتے ہیں اور پھر ان کو شہر کے تمام کتب خانوں میں پہنچانا ہوتا ہے تاکہ ان کو محفوظ کیا جائے اور ملک بھر میں ان کی نقول لکھ لکھ کے بھیجی جائیں۔ یہ کتاب ایک قسط دارناول کی طرح ہے جس کو ہر ہفتے پڑھا جاتا ہے۔ اور یہ ہم اس ہفتے سے چین اور پرنگال بھی بھیجیں گے جہاں....“ لکھتے لکھتے اسے احساس ہوا کہ وہ خاموش ہے تو سر اٹھایا۔

تالیہ گردن موڑے اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں کھڑکی سی بنی تھی اور اندر باورچی تھا۔ ایک آدمی سامنے کھڑا اس کو بارعب انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے وزیر خزانہ ابوالخیر نے بھیجا ہے۔ اس ماہ کا محصول ادا کرو۔“ ساتھ ہی ایک کاغذ اس کے سامنے کیا۔

”یہ تو محمود مرنی ہے۔“ ایڈم نے سرگوشی کی۔ تالیہ خاموشی سے اس کو دیکھ گئی۔

”محصل میں دو گنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کیا سلطان کو ہم پر ترس نہیں آتا؟“ باورچی احتجاجاً دبا دبا سا بولا۔ محمود مرنی آگے ہوا اور کہنیاں کھڑکی پر رکھ کے جھکا۔

”میں ظاہر کروں گا کہ تمہاری یہ گستاخی میں نے سنی ہی نہیں ہے۔ اس لئے... محصل دو!“ غراتے ہوئے تھیلی پھیلائی۔ باورچی کے کندھے ڈھلک گئے۔ وہ چپ چاپ اندر گیا اور پھر واپس آ کے ایک بھاری تھیلی اس کے ہاتھ پر رکھی۔ محمود نے تھیلی لی اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

تالیہ فوراً اٹھی اور بظاہر عام سے انداز میں چلتی اس کے تعاقب میں ہوئی۔ وہ اب دوسری دکان کی طرف جا رہا تھا۔ وہ چغے کی ٹوپی میں چہرہ چھپائے، سینے پہ بازو لپیٹے، ایک دکان کے چھپرے تلے کھڑی اس کو دیکھ گئی۔ چائے کی ادائیگی کر کے ایڈم بھی ساتھ آ کھڑا ہوا۔

”یہ محمود مرنی کس چیز کے پیسے لے رہا ہے دکانداروں سے؟“ چے تالیہ؟“

”محصل کے۔“ تالیہ کی سوچتی آنکھیں دکانوں پہ جمی تھیں۔

”محصل کیا ہوتا ہے؟“

”ٹیکس۔ گورنمنٹ ٹیکس۔ ملک کے ہر شخص سے یہ ٹیکس وصول کر کے ایک جگہ بھرا جاتا ہے۔ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اور اس کو کہتے ہیں ’قومی خزانہ‘۔“

(محمود اب دوسرے دکاندار سے رعب سے محصل مانگ رہا تھا۔)

”ہاں... یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ٹیکس قومی خزانے میں ہی جاتے ہیں۔“

(محمود مرنی بڑے سے تھیلے میں ہر دکان سے چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھر کے اگلی دکان کی طرف بڑھ جاتا تھا۔)

”ہمارے ٹیکس قومی خزانے میں نہیں جاتے۔ بلکہ قومی خزانے میں ہوتے ہی ہمارے ٹیکس ہیں۔ اسی لئے تو قومی خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا

کیونکہ لوگ تو ہر ماہ ہر سال ٹیکس دے رہے ہوتے ہیں، ایڈم!“

(اگلی کے آخر میں ایک بگھی کھڑی تھی۔ محمود تھیلے اس تک آیا۔ سپاہیوں نے اندر رکھا صندوق کھولا اس نے ساری تھیلیاں اس میں

الٹ دیں۔)

”مگر سیاستدان وغیرہ کہتے ہیں کہ قومی خزانہ خالی ہونے والا ہے۔ وہ سب کیا ہوتا ہے؟“

(کچھ دیر بعد بگھی ایک عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہاں صندوق نکالے گئے اور ایک بڑے کمرے میں لے جا کے رکھے گئے۔

جہاں ایسے کئی صندوق رکھے تھے۔ یہ وزارت خزانہ کا ایک کمرہ تھا۔)

”سیاستدان بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا جھوٹ بولنے سے کیا جاتا ہے؟“

(صندوقوں کے کمرے میں اب چند افراد کھڑے بر صندوق کا حساب کاغذوں پر تحریر کر کے ان کو تالے لگا رہے تھے۔)
”تو یہ محصول قومی خزانے میں بھرنے کے بعد کہاں جاتا ہے؟“

(ایک عہدیدار اب وزیر خزانہ کی مہر والے حکم نامے دکھا کے چند صندوقوں کو مختلف گاڑیوں میں لا رہا تھا۔)

”اس سے حکومت کے اداروں میں تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ پولیس، فوج، عدلیہ وغیرہ کے دفتر اور تنخواہیں۔ اسی لئے سرکاری ملازم عوام کے ملازم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تنخواہ taxpayer's money سے آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس محصول سے سڑکیں، پل اور دوسرے ترقیاتی کام کیے جاتے ہیں۔ کیا تم نے اپنی کتابوں میں یہ سب نہیں پڑھا؟“

(صندوقوں سے بھری ایک گاڑی ابو الخیر کی حویلی پہنچ چکی تھی۔ محمود نے صندوق اتروائے اور انہیں بڑے کمرے میں پہنچا دیا۔)
”مگر یہ تو آئیڈیل منظر نامے میں ہوتا ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں کیا ہوتا ہے؟“

(صندوقوں کے اوپر تالیہ بنت مراد کی مسجد کا نام درج تھا۔ ابو الخیر نے چار صندوقوں میں سے ایک کو الگ کیا، اس سے مسجد کی بنیادیں کھدوانے کا حکم دیا اور اس کو روانہ کر دیا۔)

”ہمارے جیسے ملکوں میں اس محصول کا تھوڑا سا حصہ ملک اور ملکی اداروں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ باقی سب مل کے کھاتے ہیں۔ برعکس اب اس کے اندر سے اپنا حصہ الگ کرتا جاتا ہے۔ اسی کو کرپشن کہتے ہیں۔ جیسے جتنا مال ابو الخیر مسجد کے نام پر نکلوائے گا، اس میں تھوڑا سا تعمیر کے لیے بھیجے گا۔ اور باقی خود رکھے گا۔“

(باقی تین صندوقوں سے اس نے اشرفیاں نکلوائے لکڑی کے تین خاص صندوقوں میں بھریں۔ ایک خود رکھا اور دو صندوقوں کو گاڑی میں لا دیا۔)

”یعنی ان غریب محنت کش لوگوں نے اعتماد کر کے ابو الخیر اور سلطان کو جو محصول دیا ہے، یہ حکمران اسی محصول کو اپنی دولت کی بڑھوتی کے لئے خرچ کرتے جاتے ہیں؟“

(اب وہ گاڑی بان کورات کی تنہائی میں حکم دے رہا تھا کہ یہ صندوق شہزادی تاشہ کے محل خاموشی سے پہنچا دیے جائیں۔)
”ہاں ایڈم۔ اسی لئے ملک کے حکمران صادق اور امین ہونے چاہیے ہیں تاکہ وہ اس محصول کی امانت کو نبھاسکیں۔ ابو الخیر کی طرح اپنی اور اپنے دوستوں کی دولت میں اضافہ نہ کریں۔“

(رات کی تاریکی میں وہ صندوق تاشہ کے محل میں لائے گئے اور خاموشی سے اس کی خواب گاہ میں رکھ دیے گئے۔)
”اچھا میں بچپن سے سمجھتا تھا کہ سیاستدان جو قومی خزانہ لوٹتے ہیں، یعنی جو کرپشن کرتے ہیں، وہ دراصل ’ملک‘ کا پیسہ ہوتا ہے۔ جیسے... جیسے ملک میں کوئی خزانے کے کنویں ہوں جو بھرے ہوں اور بس اس کو وہ لوٹ رہے ہوں۔ اور میں سوچتا تھا کہ خیر ہے، اگر تھوڑی بہت کرپشن سیاستدان کر بھی لیں تو چلو، ملک پر خرچ بھی تو کر رہے ہیں نا وہ۔“

(ابوالخیر اب اپنے دفتر میں بیٹھا کاغذوں پہ حساب کتاب تحریر کر رہا تھا۔ بنیادیں ڈالوانے کا خرچہ اس نے تین گنا بڑھا کے لکھا۔ جو کام ایک اشرافیوں سے بھرے صندوق سے ہو جاتا تھا اس نے اس کی قیمت تین گنا تحریر کی اور دستخط کر دیے۔)

”ملک کا کوئی خزانے کا کنواں نہیں ہوتا، قومی خزانہ صرف محصول پہنی ہوتا ہے۔ ملک کے لوگ اس کو بھرتے ہیں، اور بھرتے جاتے ہیں۔“

(اگلی صبح کاغذات کو تصدیق کے لئے بندابار کو بھیج دیا گیا۔ راجہ مراد نے مسکرا کے تفصیلات پڑھیں اور مہر لگا دی۔)

”یعنی جب سیاستدان کرپشن کرتے ہیں تو دراصل وہ ہر غریب آدمی کی تنخواہ کا ایک حصہ چوری کر رہے ہوتے ہیں! یعنی ابوالخیر جو صندوق راجہ مراد کو بھیجتا ہے وہ اسی طرح مختلف فنڈز سے نکالا گیا حصہ ہوتا ہے۔“

(مسجد کی بنیادوں کے لئے دیا گیا فنڈ کاغذوں میں پورے کا پورا ایمانداری سے استعمال ہونا لکھا گیا اور کاغذ جسر کی صورت الماری کی زینت بن گئے۔)

”بالکل اور تم مجھ جیسے چوروں کو ناپسند کرتے ہو جو صرف امیروں سے چراتے تھے؟ اصل چور تو یہ حکمران ہیں جو غریبوں سے چراتے ہیں۔“

ایڈم نے آنکھیں چھوٹی کر کے تالیہ کا چہرہ دیکھا۔ ”اس بات پہ میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔“

وہ ابھی تک ان دکانداروں کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بقایا جمع پونجی گن رہے تھے۔

(وہ خالی میدان جہاں مسجد کی تختی لگی تھی... وہ خالی تھا۔ وہاں تھوڑی سی کھدائی کی گئی تھی۔ مگر ان کھوکھلی جڑوں پہ کوئی عمارت کھڑی نہیں کی جانی تھی۔ مسجد کے نام پہ قومی خزانے سے نکلوائے گئے چار صندوقوں میں سے ایک یہاں لایا گیا تھا۔ ایک ابوالخیر نے رکھا تھا اور دوسرے نے تالیہ کو بھجوا دیے تھے۔

اسے کرپشن کہتے تھے۔

(بدعنوانی۔)

☆☆=====☆☆

سن باؤ کے خوبصورت گھر پہ دو پہر اتری تھی۔ صحن میں لگے کنویں کی منڈیر پہ جھکافا تخری سے ڈول باہر کھینچ رہا تھا۔ کرتے کی آستین اوپر چڑھائے وہ پسینے میں بھیگا تھا مگر چہرہ سنجیدہ اور پرسکون تھا۔ ماتھے کی سبز پٹی بھی گیلی ہو چکی تھی۔

گاہے بگاہے وہ کنویں کی اندرونی دیوار کا جائزہ بھی لیتا تھا۔ تالیہ نے دیوار سے وہ پتھر کیسے نکالا تھا جس کو کنویں کے پانی میں ڈالنے سے صحن کے اندر سے سیڑھیاں نکلی تھیں، وہ قطعاً واقف نہ تھا۔ لیکن خیر.... بغیر چابی کے وہ اس دروازے کو کھول بھی نہیں سکتے تھے۔ چابی... انہیں چابی چاہیے تھی۔

پانی کا ڈول اوپر آیا تو اس نے اسے گھڑے میں اندر دیا۔ تبھی دروازے پہ دستک ہوئی۔ فاتح نے انگوٹھے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور گھڑا رکھ کے دروازے کی طرف آیا۔

بابر محمود مرنی کھڑا تھا۔ سرکاری یونیفارم پہنے وہ سنجیدہ لگتا تھا۔ فاتح نے ایک نظر اس کے پیچھے ڈالی جہاں فاصلے پہ بگھی اور سرکاری سپاہی کھڑے نظر آتے تھے۔

”سن باؤ وانگ لی سے خراج وصول کرنے آیا ہوں۔“ اس نے سادہ انداز میں کہا۔

”مالک گھر نہیں ہے۔ مگر خراج کی تھیلی وہ رکھوا گیا تھا۔ میں لاتا ہوں، بلکہ تم اندر آ جاؤ۔“ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں محمود مرنی کو اشارہ کیا۔ محمود نے پیچھے دیکھا اور سپاہیوں کو وہیں رکنے کا کہا۔ پھر فاتح کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

دروازہ بند ہوتے ہی محمود کے چہرے پہ بے چینی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے گھوم کے اس کے سامنے آیا اور پریشانی سے فاتح کو دیکھا۔

”تم نے کہا تھا تم ہمارے لئے کچھ کرو گے۔ اب بتاؤ، کیا تم ہمیں آزاد کروا سکتے ہو۔“ سارا رعب، سارا طنطنہ ختم ہو گیا اور وہ فاتح کے سامنے ڈھلکے کندھوں والا ایک غلام نگ رہا تھا جو ابوالخیر کے آگے بے بس تھا۔

فاتح نے تپائی پہ دھری تھیلی اٹھائی اور اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اسے تسلی دلائی۔

”محمود مرنی.... تم ان چند غلاموں میں سے ہو جن پہ ابوالخیر بھروسہ کرتا ہے اور ان کو بابر جانے کی اجازت ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم بھی آزاد ہونا چاہتے ہو۔“

”میں نے مالک کے ساتھ کبھی دغا نہیں کیا مگر مجھے نفرت ہے مالک سے۔ وہ مجھے خرید کے نہیں میرے گاؤں سے اغوا کر کے لایا تھا۔“

اس کے آدھے سے زیادہ غلام ناجائز غلام ہیں۔ مجھے بتاؤ، فاتح.... ہم کیسے آزاد ہوں گے۔“

فاتح نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”وانگ لی تمہیں اس قید سے نجات دلائے گا۔ وہ ابھی آنے والا ہے۔ تم اس سے بات کرو اور اپنی کہانی اس کے سامنے رکھو۔ وہ تمہارا

کیس لے کر قاضی وقت کے پاس جائے گا اور قاضی ابوالخیر کو حکم جاری کرے گا کہ تمام ناجائز غلام آزاد کیے جائیں۔ یوں وانگ لی کی

کوششوں سے مرسل شاہ کے دور میں نیا قانون پاس ہو گا جس کے مطابق تمام ناجائز غلام آزاد ہو جائیں گے۔“

محمود مرنی نے الجھن سے اسے دیکھا۔ ”تم تو یوں بتا رہے ہو جیسے تم نے ہماری قسمت پڑھ رکھی ہو۔“

فاتح دھیمسا مسکرایا۔ ”وانگ لی ایک عظیم انسان ہے اور میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہی تم لوگوں کو نجات دلوائے گا۔ یہ بات

تاریخ کی کتابوں میں لکھی جائے گی۔“

بابر گھوڑے کی آواز آئی تو محمود مرنی چونکا۔ فاتح نے گہری سانس لی۔ ”تم اندر بیٹھو۔ میں قبوہ بنا کے لاتا ہوں۔ تمہیں صرف ایک دفعہ

وانگ لی سے بات کرنی ہے وہ فوراً راضی ہو جائے گا۔“

محمود مرنی پھیکا سا مسکرایا۔ اس کی بے بس آنکھوں میں امید جاگی۔ ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“
کچھ دیر بعد وان فاتح رسوائی سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں طشت تھا جس پہ ننھی چینی پیالیاں اور چائے دان رکھی تھیں۔ ساتھ میں شہد کی بوتل تھی۔

اس نے طشت برآمدے کی میز پر رکھا اور چینک سے پیالیوں میں قبوہ اندیلنے لگا۔
سامنے آرام کرسی پہ وانگ لی بیٹھا مقابلہ بر اجمان محمود مرنی کو سن رہا تھا جو پریشانی اسے اپنی داستان سن رہا تھا۔
”سب جانتے ہیں سن باؤ، کہ ملا کہ کے قانون میں غلام دو طرح سے بنائے جاسکتے ہیں۔ یا تو وہ جنگ کے قیدی ہوں یا پھر منڈی میں باقاعدہ معاہدہ کر کے ان کو خرید لیا گیا ہو۔ مگر ابوالخیر لوگوں کو اغوا کر کے لاتا ہے اور جبری غلام بنالیتا ہے۔ اس کو راجہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ یوں اس کو مفت میں غلام مل جاتے ہیں۔ ہم سب آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے۔“
فاتح نے جھک کے طشت سن باؤ کے سامنے کیا۔ اس نے آرام سے پیالی اٹھائی اور لبوں سے لگائی۔ فاتح طشت لئے محمود مرنی کے پاس گیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا کے اسے حوصلہ دلایا۔ محمود نے پر امید سا مسکراتے قبوہ اٹھایا اور سن باؤ کو ذرا اعتماد سے مخاطب کیا۔
”سن باؤ... آپ ہمیں سمجھائیں کہ ہمارا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ہم کس طرح ابوالخیر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔“
فاتح اب طشت لئے پیچھے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے وہ منتظر سا سن باؤ کو دیکھنے لگا۔
”محمود مرنی... تم جانتے ہو میں بھی ایک غلام تھا۔ تائی ژان۔“
”جی۔ اسی لئے ہمیں لگا کہ آپ ہمارا درد...“

”اور مجھے بھی جبری طور پہ غلام بنایا گیا تھا۔ میں شاہ چین کے پاس کم عمری میں آیا تھا اور مجھ پہ بہت ظلم بھی ڈھائے گئے، مگر میں ڈنار ہا میں نے اپنے آقا کے دل میں جگہ بنائی۔ میں نے محنت کی اور مجھے ان کا قرب حاصل ہوا۔ مجھے بڑے بڑے عہدے ملے اور میں آج آزاد ہوں، ملک ملک گھومتا ہوں، جہاں چاہے رہتا ہوں، مگر بردن کے اختتام پہ اپنے آقا کو خط لکھ کے ساری صورتحال سے آگاہی دیتا ہوں۔ میں آج بھی شاہ چین کا غلام ہوں اور...“ سن باؤ نے پیالی رکھی اور آگے کو جھک کے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
”مجھے... اس غلامی پہ... فخر ہے۔“

پیچھے کھڑے وان فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”میں نے آج تک شاہ چین کے خلاف دوسروں سے مدد نہیں مانگی۔ میں نے اپنے آقا سے محبت کی اور وفاداری نبھائی۔ ہر غلام کو جودو جہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ سوچنا بھی مت کہ میں کسی غلام کو اس کے آقا کے خلاف بغاوت کا مشورہ دوں گا۔ آج تو تم آگے ہو اور میں نے معاف کر دیا لیکن اگر دوبارہ آئے تو میں ابوالخیر کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اس لئے گھر جاؤ اور اپنے آقا کی خدمت کرو۔ غلام ہر طرح سے بنائے جاتے ہیں اور یہ ان کی قسمت ہوتی ہے کہ انہیں اپنے مالک کی خدمت کرنی ہوتی ہے۔ تم بھی میرے جیسا مقام حاصل کر سکتے ہو اپنی وفا اور

محنت سے۔ اور یاد رکھنا ملاکہ کا کوئی رئیس، کوئی قاضی تمہارے ساتھ نہیں کھڑا ہوگا کیونکہ سب کے گھروں میں جائز اور ناجائز غلام موجود ہیں۔“

محمود مرنی خاموشی سے اٹھا، تھیلی اٹھائی اور فاتح پہ ایک دکھ بھری جتاتی نظر ڈال کے مڑ گیا۔ دروازہ کھل کے بند ہونے کی آواز آئی مگر فاتح اپنی جگہ سے بل نہ سکا۔

وانگ لی اب پیالی سے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ہلکا سا ملال تھا۔
 ”مجھے ان غلاموں سے ہمدردی ہے، فاتح۔ مگر میں اس اجنبی دیس میں اجنبی ہوں۔ میں کبھی بھی ان غلاموں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں میری پیشانی لکھروں میں کوئی تحریر ایسی نظر آئی ہے تو یقین کرو تم نے غلط پڑھا ہے۔“ وانگ لی نے پیالی رکھ دی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔

اور فاتح بالکل سن کھڑا تھا۔

پتھر کا بت ہو کوئی جیسے۔

ٹوٹا ہوا خواب ہو کوئی جیسے۔

☆☆=====☆☆

بندہ ہمارے محل کی عقبی کھڑکیوں سے دور نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ تالیہ کی خواب گاہ میں دو صندوق کب کے لا رکھے گئے تھے اور وہ ان کو کھولے بیٹھی تھی۔ اوپر چاولوں کی تہہ لگی تھی۔ تلاشی کے وقت ابو الخیر کے ملازم نے یہی بتایا تھا کہ یہ دم کئے گئے چاول ہیں جو شہزادی کے لئے بھجوائے گئے ہیں۔ تہہ ہٹاؤ تو اندر ریشمی کپڑے میں سکے بھرے تھے۔

”یقیناً یہ کرپشن کے سکے راجہ مراد کو بھی چاولوں اور دالوں کے نیچے چھپا کے بھجوائے جاتے ہوں گے۔ صاف شفاف کرپشن جس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکتا۔ خیر.....“ اس نے صندوق بند کیا اور کھڑکی میں رکھی گھڑی کی ریت دیکھی۔ سبہ پہر کا وقت تھا۔ راجہ اس وقت حکومتی امور میں مصروف رہتا تھا۔ ابھی کمرے میں نہیں آیا ہوگا۔ ایک خیال سا اس کے ذہن میں کوندا۔

کچھ دیر بعد وہ اشرفیوں کی تھیلی بھر کے راجہ کی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

”راجہ اندر نہیں ہیں۔“ پیریداروں نے ادب سے اطلاع دی۔

”میں ان کے لئے خاص تحفہ لائی ہوں۔ انتظار کر لوں گی۔“ وہ بظاہر خوشی بھرے جوش سے بتاتی اندر چلی آئی۔

وہ اسے روک بھی نہ سکے۔

اندر آتے ہی اس نے تھیلی میز پر رکھی اور جلدی سے الماری کی طرف بڑھی۔ اسے کھولا۔ برخانہ کھنگالا۔ بستر صفائی سے الٹ پلٹ کیا۔

چابی تو درکنار وہاں کچھ بھی ایسا نہ تھا جو قابل توجہ ہو۔ صرف کپڑے۔ کچھ اشرفیاں۔ کاغذ۔ مہر۔ کتابیں۔

وہ آخری صندوق بند کرنے لگی تو ٹھٹھکی اندر ایک بوتل رکھی تھی۔ خالی بوتل۔

بوتل دیکھ کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ایک خواب سا ذہن کے پردے پہ چلنے لگا.....

وہ الماری کھولتی ہے.... بوتل نکالتی ہے.... اس کے اندر مائع سا بھرا ہے۔ اور پیندے میں سکھ اور چابی تیر رہی ہے۔ وہ بوتل سے مشروب پی لیتی ہے اور چابی نکال کے جوڑ دیتی ہے۔ وہ لمحہ امر ہو جاتا ہے۔

اندھیر راستہ.... اوپر تاروں بھرا آسمان.... اور وہ ایک ستارے کو دیکھتی چلتی جا رہی ہے.... چلتی جا رہی ہے.... جیسے خواب میں اسے کوئی راستہ دکھا رہا ہے....

کوئی روشنی سی اس کی راہبر ہے.... وہ چلتی جا رہی ہے.... چلتی جا رہی ہے....

یہاں تک کہ اسے وہ سیڑھیاں نظر آتی ہیں.... وہ نیچے اترتی جاتی ہے.... آگے وہ قدیم دروازہ ہے.... وہ زنجیروں سے لپٹے اس کے تالے میں چابی گھساتی ہے اور زبردست بڑبڑاتی ہے۔

”باپا اگر اوروں سو ننگائی کے لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے تو کیا ہوا.... میں خود جاؤں گی اور خزانہ ڈھونڈ کے لاؤں گی۔“

وہ زبردست راہدار یوں میں چلتی جا رہی ہے.... اوپر بارش برس رہی ہے.... نیچے دو دریا ہیں.... پھر سیڑھیاں جن کو عبور کر کے وہ اوپر آتی ہے اور ڈھکن ہٹا کے زمین پہ باہر نکل آتی ہے۔ پھر ڈھکن برابر کر کے سیدھی ہوتی ہے اور ادھر ادھر دیکھتی ہے....

وہ ایک چرچ میں کھڑی ہے۔ لکڑی کے ڈیسک قطار در قطار لگے ہیں۔ صلیب جگمگا رہا ہے۔ موم بتیاں بجھی ہیں اور وہ چرچ کے وسط میں حیران پریشان کھڑی ہے....

آوازوں نے ارتکاز توڑا تو تالیہ نے چونک کے آنکھیں کھولیں۔ وہ راجہ مراد کی خواب گاہ میں خالی بوتل ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ یہ وہی بوتل تھی جو کم سن تالیہ نے پی کے پھینک دی تھی۔

اس نے جلدی سے بوتل اندر واپس رکھی اور چیزیں درست کرتی خواب گاہ کے وسط میں آکھڑی ہوئی۔ بالوں میں انگلیاں چلاتے وہ اب یوں ست روی سے کھڑی تھی جیسے کافی دیر سے باپا کی منتظر ہو۔

راجہ کسی سے تیز تیز بات کرتا ہوا آ رہا تھا۔ بند دروازوں کے باوجود اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کسی خاص خادم کو مصروف انداز میں ہدایات دے رہا تھا۔

”اگر کشتی میں سوراخ ہو گئے ہیں تو نئی کشتی لے لو۔ مگر میں نہ سنوں کہ کشتی نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی دیر سویر ہوئی ہے۔“ دروازہ کھلا اور وہ بولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پھر کمرے کے وسط میں کھڑی تالیہ کو دیکھ کے رکا۔ ہاتھ سے خادم کو جانے کا اشارہ کیا۔

”تم.... یہاں؟“ ساتھ ہی اس نے فوراً اپنی الماری کو دیکھا جس کے اندر بوتل چھپی پڑی تھی۔

”جی۔ میں تحفہ لائی تھی۔“ وہ مسکرا کے بولی اور میز پر رکھی تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔

مراد آگے آیا اور تھیلی اٹھا کے انگلیوں کے پوروں سے ٹٹولی جیسے اشرفیاں محسوس کی ہوں۔

”ہوں۔ ابو الخیر کے تحفوں میں سے ایک نذرانہ... اچھا لگا مجھے۔“ ہلکا سا مسکرایا۔ اور اسے واپس رکھ دیا۔ پھر اپنی قبا کندھوں سے جھٹک کے برابر کی اور تالیہ کے مقابل آکھڑا ہوا۔ شاہی قبا میں ملبوس، ماتھے پہ سرخ پٹی باندھے، کندھے تک آتے بالوں والا مراد اب اپنی عقابلی نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھا۔ ”تم اس دنیا سے مانوس ہوتی جا رہی ہو۔“

”ہونا بھی چاہیے۔ آخر مجھے یہیں رہنا ہے۔“ وہ مصنوعی سا مسکراتی رہی۔

”مگر تم پھر میرے کمرے کی تلاشی کیوں لے رہی تھیں؟“

لیکن وہ تیار تھی۔ اسی طرح مسکرا کے بولی۔

”جانتے ہیں اس دوسری دنیا میں میں کیا تھی؟“

”کیا؟“

تالیہ آگے بڑھی اور چہرہ راجہ کے کان کے قریب کر کے سرگوشی کی۔

”میں وہ تھی جو بنا چاپ دروازوں کے اندر گھس جاتی تھی، دیواروں پہ ریگ کے اوپر چڑھ جاتی تھی، الماریوں اور صندوقوں کے اندر

داخل ہو جاتی تھی۔“

”جیسے ناگن ہو کوئی؟“ راجہ نے ابرو اٹھایا۔

”جیسے بلی ہو کوئی!“

وہ سرگوشی میں بولی اور پھر کندھوں سے اپنا ریشمی لباس ذرا جھٹکا اور مسکرا کے ہٹ گئی۔

راجہ پر سوچ نظروں سے اسے باہر جاتے دیکھنے لگا۔

راہداری میں تیز تیز آگے بڑھتی تالیہ کی پیشانی پہ پسینے کی چند بوندیں تھیں جن کو اس نے ہتھیلی کی پشت سے رگڑ کے صاف کر دیا تھا۔ راجہ

سے ایک دفعہ پھر اسے ہلکا ہلکا سا خوف آنے لگا تھا۔

☆☆=====☆☆

قدیم ملاکہ کے بازار میں ایک جگہ ایک خوبصورت سا چائے خانہ بنا تھا۔ عام سرائے اور قبوے خانوں کے برعکس یہ قدرے انگ تھلگ

تھا اور چاروں طرف سے سبز گھاس سے مزین باغیچے سے گھرا تھا۔

عمارت کے اندر نیم تاریک سا طویل ہال تھا جہاں میزیں کرسیاں لگی تھیں۔ ہر جگہ سرخ پردے اور سرخ کاغذی غبارے نظر آتے تھے

۔ وہ چینی چائے خانہ تھا اور وہاں صرف چینی افراد کام کرتے تھے۔ تقریباً سب وہی تھے جو ملکہ یاں سو فو کے چینی وفد میں آئے تھے اور یہاں آ

کے مقامی عورتوں سے شادی کر کے یہیں بس گئے تھے۔

اس چینی چائے خانے کا نام ”جیا“ تھا۔ جیا قدیم چینی میں ’چائے‘ کو کہتے تھے۔ یہ لفظ پھر ”جیا“ سے ”چا“ بنا جس سے ”چائے“ اخذ کیا گیا۔ ’جیا‘ اس زمانے میں بھی ایک پرانی اور کلاسیکل اصطلاح تھی اور چائے خانے کا نام اس پر رکھنا کسی اعلیٰ اور ادبی ذوق کے حامل شخص کا کام تھا اور وہ شخص کوئی اور نہیں، تین گلیوں والا غلام وانگ لی تھا۔

’جیا‘ وانگ لی کا ذاتی قبوہ خانہ تھا جہاں وہ اکثر اپنی شا میں گزارتا تھا۔ یہاں شہر کے امراء اور روساء آیا کرتے تھے اور سیاست و سیاحت پر لمبی بحثیں ہوتی تھیں۔

اس شام بھی سن باؤ وانگ لی ’جیا‘ کے اندر ایک میز پر براجمان خوشگوار انداز میں محو گفتگو تھا۔ سامنے شاہانہ لباس میں چند اعلیٰ عہدیدار بیٹھے اس کو سن رہے تھے۔ فاتح اس کے کندھے کے پیچھے کھڑا جھک کے چینک سے پیالی میں دھار کی صورت چائے انڈیل رہا تھا۔ وہ کرتے کی آستینیں پیچھے چڑھائے، سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تھا۔

سامنے بیٹھے شخص نے پیالی اٹھاتے ہوئے ایک نظر اس کو دیکھا۔ ”اس کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں وانگ لی۔ یہ کون ہے؟“ سن باؤ نے مسکرا کے اسے دیکھا جواب سنجیدہ سا کھڑا تھا۔ ”یہ میرا غلام ہے۔ میں نے ابوالخیر سے اسے خریدا ہے۔“ ”اچھا... تو یہ ہے وہ غلام جس کے اوپر لمبی لمبی بولیاں لگائی گئی تھیں۔“ دوسرے شخص نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ لمبے بالوں اور داڑھی والا درمیانی عمر کا آدمی تھا۔

فاتح نے ادب سے سر کو خم دیا ایسے کہ نظریں اس پہ جمائے رکھیں۔ جھکائیں نہیں۔ ”کہاں سے آئے ہو تم؟“ داڑھی والے نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ”ابوالخیر کی حویلی سے...“ اس نے دوسری پیالی میز پر رکھی اور سر جھکائے چینک سے قبوہ اندر اندر بیٹھا۔ ”دیکھنے میں اعلیٰ حسب نسب کے لگتے ہو۔ پیچھے سے کہاں کے ہو؟“ داڑھی والے نے اسی دلچسپی سے پیالی اٹھاتے پوچھا۔ ”قاضی صاحب کا مطلب ہے کہ ابوالخیر کے پاس کس علاقے سے آئے تھے۔“ وانگ لی نے وضاحت کی۔ فاتح نے بس خاموش نظریں گھما کے وانگ لی کو دیکھا اور پھر ایک پاٹ نظر قاضی پہ ڈالی۔

”ابوالخیر کے پاس لوگ آتے نہیں ہیں۔ لائے جاتے ہیں...“ چبا چبا کے بولا تو میز پہ سناٹا چھا گیا۔ قاضی نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور کھوجتی نظروں سے اس غلام کو دیکھا جو چینک اٹھائے بات کہہ کے پلٹ گیا تھا۔ ”تم ابوالخیر پہ الزام لگا رہے ہو۔ وہ وزیر خزانہ ہے اور ہمارا دوست۔“ دوسرے آدمی نے پیچھے سے ناگواری سے تنبیہ کی۔ وانگ لی بھی ہلکا سا کھٹکھارا۔

”فاتح کا الزام ضروری نہیں ہے کہ غلط ہو مگر... (سفارتکارانہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے۔) یہ درست ہے کہ ایسے آدمی پہ الزام لگانے سے ڈرنا چاہیے جس کے ماشاء اللہ اتنے رئیس اور امراء دوست ہوں۔“ خوش مزاجی سے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جو آگے

چلتا جا رہا تھا ایک دم رکا۔ نہات ضبط سے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

(تو ثابت ہوا کہ سفارتکار آخر میں سفارتکار ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اصل سے نہیں بھاگ سکتا۔ نہ وانگ لی، جو ان اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ سفارتکارانہ تعلقات نہیں خراب کر سکتا تھا۔ اور....) وہ دھیرے سے پلٹا تو اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔ (اور نہ وہ خود اپنے اصل روپ کو زیادہ دیر تک مصلحتوں کے پردے میں چھپا سکتا تھا۔)

اس کے اندر کوئی جوار بھانا ساپکنے لگا تھا۔

طشت قریبی میز پہ ڈالا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا واپس ان کے سامنے آیا۔ پھر میز کے دونوں کناروں پہ ہاتھ رکھے اور ان کی طرف جھکائیوں کی جھپڑوں کی تینوں کے سامنے تھا۔

”میرا نام فاتح بن رامنزل ہے۔ مجھے اللہ نے بر طبقے میں سے گزار کے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میں نے رئیسوں کی دوستی بھی دیکھی ہے اور شاہوں کے محلوں میں ان کے ساتھ بھی بیٹھا ہوں۔ میں اعلیٰ سوار یوں میں بھی گھوما ہوں اور میں نے ملک ملک کی سیر بھی کی ہے۔ میں کسی کی امارت یا طاقت کے رعب میں نہیں آیا کرتا، نہ میں طاقتور کی دوستی کے چھن جانے سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے قبریں کھودی ہوئی ہیں، مالک۔ مجھے ان چیزوں سے مت ڈراؤ جن سے فاتح نہیں ڈر سکتا۔ بھلے سامنے قاضی وقت ہو یا وزیر خزانہ، میں ملا کہ کے ان بے بس غلاموں کے حقوق کے لئے آخری سانس تک لڑتا رہوں گا۔“ پھر سیدھا ہوا، ایک نظر ان تینوں کے دم سادھے چہروں پہ ڈالی اور مڑ گیا۔ پھر اندر جانے کی بجائے تیز تیز باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ پیچھے سے کیا کہہ رہے تھے، اسے پرواہ نہ تھی۔ باہر آ کے گھاس پہ وہر کا اور گہرے گہرے سانس لئے۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ چند گھوڑے باہر گھاس کے اس پار کھڑے تھے۔ کچھ لوگ ٹہل رہے تھے۔ ایسے میں وہ آسمان کا نارنجی پن دیکھنے لگا اور تب ہی.... نگاہ ہٹائی تو سامنے.... ایک سنگی پتھر پہ.... قبوہ خانے کے دروازے کے ساتھ.... ایڈم بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دستہ تھا اور دوسرے پتھر پہ دو ات لکھے وہ قلم ڈبو ڈبو کے اس پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

فاتح کو اپنی طرف دیکھتا پا کے ایڈم نے صرف ایک دفعہ نگاہ اٹھائی اور واپس اپنا کام کرنے لگا، جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ یقیناً فاتح سے ملنے آیا تھا مگر ماحول ایسا تھا کہ وہ مل نہیں سکتا تھا۔ اس لئے نظر انداز کیے بیٹھا رہا۔ مگر وہ فاتح کے ذہن میں ایک دم جھکڑ سے چلنے لگے۔ یادوں میں جھماکہ سا ہوا اور کچھ یاد آیا....

وہ ڈھائی سال پہلے.... وہ کار میں بیٹھا لمبے سفر پہ جا رہا تھا.... ڈرائیور کار چلا رہا تھا اور وہ پچھلی نشست پہ بیٹھا، عینک لگائے، کتاب پڑھ رہا تھا جس کے سرورق کے اوپری حصے پہ ”بنگاریا ملائیو“ (ملایا کا پھول) اور نیچے ”آدم بن محمد“ لکھا تھا۔ صفحے پہ لکھی تحریر پڑھ کے وہ مسکرا رہا تھا....

”اور یہ اسی ماہ کی بات ہے جب وانگ لی کے چائے خانے ”جیا“ میں....

ہوئی ایک شام گرم، بھٹوں کی نذر....

ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا ریمسوں اور قاضی کے خلاف...

اور کرنے لگا غلاموں کی حمایت...

جن کو قید کرتے تھے با اثر لوگ غوا کر کے....

اور بولا وہ بھری محفل میں آواز بلند کر کے...

نہیں ڈرتا میں ریمسوں کی دوستی کے چھن جانے سے...

کیونکہ اللہ نے مطمئن کر رکھا ہے میرا نفس شاہوں کی دوستی سے...

کھو ماہوں میں اعلیٰ سوار یوں میں رہا ہوں میں اونچے مخلوں میں...

پھر اہوں میں ملک ملک اپنے ہاتھوں سے کھودی ہیں میں نے قبریں...

تو نہ ڈراؤ مجھ سے ان چیزوں سے جو مجھے خوفزدہ نہیں کرتیں...

لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے لئے آخر دم تک۔

کیونکہ میں وانگ لی ہوں۔ سن باؤ تائی شان۔

شاہ چین کا سب سے وفادار غلام!“

جیا کے بابر گھاس پہ کھڑے فاتح کو وہ الفاظ حرف بہ حرف یاد تھے۔

چند لمحے کے لئے وہ شاک میں چلا گیا۔ وانگ لی؟ یہ الفاظ کہنے والے کا نام کتاب میں وانگ لی کیوں تھا؟

یہ الفاظ وانگ لی نے تو نہیں کہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ایڈم کے سر پہ آیا اور اس کے کاندھوں پہ نظر ڈالی۔ وہ تاریخ کی کتاب کو خوبصورت نثریہ نظم کی صورت لکھ رہا

تھا۔ وہی الفاظ۔ وہی کلمات۔

”پھر اہوں میں ملک ملک اپنے ہاتھوں سے کھودی ہیں میں نے قبریں...

تو نہ ڈراؤ مجھ سے ان چیزوں سے جو مجھے خوفزدہ نہیں کرتیں...

لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے لئے آخر دم تک....

کیونکہ میں فاتح بن رامنزل ہوں۔

ایک آزاد انسان!“

ایڈم نے آخری الفاظ تحریر کیے تو وہ ایک دم اس پہ جھپٹا اور اسے گریبان سے پکڑ کے دیوار سے لگایا۔ صفحات بکھر گئے۔ دوات الٹ گئی۔

ایڈم بوکھلا گیا۔

”یہ کیا لکھ رہے ہو تم؟“ اسے دیوار سے لگائے وہ غرایا۔ ”کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟“

”میں.... میں اپنی کتاب لکھ رہا ہوں۔“ گردن دبوچے جانے کے باعث ایڈم کی آواز پھنسی پھنسی سی نکلی۔ ”ایمانداری... اور اور سچائی کے ساتھ۔“

”جھوٹ.... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیونکہ یہ نہیں لکھا تھا تم نے اس کتاب میں۔“ ایک جھٹکے سے اس نے گریبان چھوڑا اور صدمے بھری نظروں سے اسے دیکھتا پیچھے ہٹا۔ ”میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ میں نے اتنے سال وہ کتاب پڑھی ہے۔ جو باتیں تم وانگ لی سے منسوب کرتے رہے ہو وہ اس نے نہیں کہی تھیں۔“

ایڈم نے گریبان درست کیا۔ ارد گرد متوجہ ہوئے لوگوں کو مسکرا کے ”سب ٹھیک ہے“ کا اشارہ کیا۔ اور جھک کے کانڈ سمیٹے۔ پھر سیدھا ہوا اور گہری سانس لے کر فاتح کو دیکھا جس کا چہرہ صدمے اور غصے سے بے رنگ ہو رہا تھا۔

”میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔ میں اسے اب لکھ رہا ہوں۔ مگر میں اس میں کبھی بھی آپ کے الفاظ کو وانگ لی سے منسوب نہیں کر سکتا“ سر۔ ”دبی آواز میں وہ بولا تھا۔“ میں اس کتاب کو پوری ایمانداری سے لکھوں گا۔ اور اگر بعد میں اسے کوئی تبدیل کر دے تو وہ وانگ بات ہے مگر میں.... ایسا... نہیں کروں گا۔“

مگر فاتح کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ دکھ اور ملال میں گھرا کھڑا تھا۔ اس کا ہر ایک سے اعتبار اٹھ سارہا تھا۔ ”آپ کو لگتا تھا کہ وانگ لی ان غلاموں کو آزاد کرائے گا؟ برگز نہیں۔“ اس نے تلخی سے کہتے نفی میں سر ہلایا۔ ”محل میں رہ کے یہ تو جان ہی گیا ہوں سر... کہ اس سفارتکار کے اپنے ذاتی کارنامے جتنے بھی ہوں، وہ صرف شاہ چین کا وفادار ہے۔ بنگارا ملا یو میں اگر اس کی کسی جدوجہد کا ذکر ملتا ہے تو ہو سکتا ہے کتاب غلط کہتی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جدوجہد دراصل کسی اور کی ہو۔“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”وانگ لی ایک تحریک چلائے گا۔ وہ ان غلاموں کو آزاد کروائے گا۔ مجھے تفصیلات نہیں معلوم مگر.... وانگ لی... اسے ہی چلانی تھی تحریک...“

”شاید وہ سب وانگ لی نے نہ کیا ہو۔ شاید وہ سب آپ نے کیا ہو۔ مجھے نہیں معلوم وانگ لی کا نام کتاب میں کیوں ہے مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وانگ لی وہ ”ہیر“ نہیں ہے جو آپ اسے سمجھتے ہیں۔ آپ اس کے فین ہیں اور اب آپ اس سے مایوس نظر آتے ہیں مگر سر... فینڈم تو صرف ایک بلبہ ہے۔ ست رنگہ بلبہ۔ لوگ اس بلبہ کی قید میں اڑتے چلتے جاتے ہیں اور جب یہ پھٹتا ہے تو وہ نیچے آگرتے ہیں اور.... ٹوٹ جاتے ہیں... مگر....“

وہ ٹھہرا اور اداسی سے مسکرایا۔ ”میں سوچتا ہوں سر... کیا ٹوٹنا ضروری ہے؟ کیا مایوس ہونا لازم ہے؟ ان کے لئے ہمارا پیار تو خالص تھا نا۔ کیا ہوا جو وہ اتنے عظیم نہ تھے جتنا ہم ان کو سمجھتے تھے۔ ہم تو اپنی وفا میں سچے تھے نا۔“

فاتح کی آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو کے پہلو میں آگرے۔

”کبھی کبھی ہم پر ستار ان شخصیات سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ اس لئے الوژن کے ٹوٹنے پہ ہمیں خود نہیں ٹوٹ جانا چاہیے۔“

جیا سے کچھ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ ایڈم کے لئے مزید رکنا محال تھا۔ وہ جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹتا اٹھا اور سر جھکائے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وان فاتح اسے ملال سے جاتے دیکھتا رہا۔

”وہ سب وانگ لی نے نہیں کیا تھا“ ڈیڈ۔ ”آریا نہ ایک دم کہیں سے آئی تو اس نے دیکھی نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ سفید فراک میں ملبوس وہ سایے جیسی بچی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔“ آپ نے عرصے بعد اپنے اوپر بھروسہ چھوڑ کے کسی دوسرے پہ بھروسہ کرنا شروع کیا۔ غلط کیا۔ آپ کو اپنے سے امید لگانی تھی۔ بھلے تاریخ کی کتابوں میں جو بھی لکھا ہو۔“

اس نے سر جھکا کے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ کیا یہ ہاتھ ان غلاموں کو نجات دلانے جا رہے تھے؟
کوئی اپنے اصل سے نہیں بھاگ سکتا۔ پھر کیا ضرورت ہے بھاگنے کی؟
اس نے چہرہ اٹھایا اور جیا کی عمارت کو دیکھا۔

ایک بات طے تھی۔ وہ سب جیا سے شروع ہوا تھا۔ اسی چائے خانے سے۔ مگر کیسے؟ تفصیلات اس کتاب میں درج نہ تھیں۔ اسے خود ہی کچھ سوچنا تھا۔

اس کی آنکھیں عمارت پہ جمی تھیں۔ اور ذہن دھند لکوں میں پھنسا تھا۔

☆☆=====☆☆

سلطنت محل کے حرم میں خوشگوار سی صبح دھوپ سینک رہی تھی۔ پائیں باغ میں گھاس کی ننھی پیڑی تھی جس پہ کینو پی بنی تھی۔ کینو پی کی چھتری تلے میز کرسیاں لگی تھیں۔ وہاں ملکہ یان سوفو ٹیک لگائے گرم چائے سے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی۔ سنہری تاج سر پہ رکھا تھا اور بالوں کا جوڑا بندھا تھا۔ وہ نو جوان اور خوبصورت تھی مگر عہدے کا رعب اب شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

دفعۃً وہ پیالی رکھ کے مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔ نیچے نشیب سے کنیروں کی معیت میں تالیہ چلی آرہی تھی۔ اوپر آ کے اس نے جھک کے تعظیم پیش کی۔
”ملکہ!“

یان سوفو نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔ ”آئیے شہزادی۔ بیٹھیے۔“

تالیہ مسکرا کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھی۔ نارنجی ریشمی میکسی میں ملبوس بہیروں سے مرصع تاج پہنے وہ بالوں کو گھنگریالا کیے نکھری ہوئی نگ رہی تھی۔

”شہزادی تاشہ کی طرف سے تحفہ قبول کیجئے۔“ اس نے اشارہ کیا تو دو کنیزیں آگے آئیں اور ایک چوکور شے سامنے کی جس پہ کپڑا گرا تھا۔ کپڑا ہٹایا تو نیچے ایک تین فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی پینٹنگ تھی۔ تصویر دیکھتے ہی یان سوفو کے لب کھل گئے۔

وہ یان سوفو کا پورٹریٹ تھا۔ طرح داری مسکراتی ہوئی ملکہ۔

ہو بہو اصل کا عکس۔

یان سوفو کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ اس نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا جس نے سر کو پورا جھکا کے اٹھایا۔

”یہ میں نے بنایا ہے، ملکہ۔ آقا دیکھیں گے تو ان کو اچھا لگے گا۔ اس کو آقا کی خواب گاہ میں ہونا چاہیے۔“

”میں بہت متاثر ہوئی ہوں، تاشہ۔“ پھر کنیزوں کو اشارہ کیا۔ ”اس کو آقا کی طرف بھجوادو۔“

وہ رخصت ہوئیں تو متاثر اور ممنون سی یان سوفو نے تالیہ کو دیکھا۔

”آپ کے اس فن سے نا آشنا تھی میں۔ یہ کہاں سے سیکھا آپ نے؟“

”جب میں یتیموں کی طرح ایک دور افتادہ قلعے میں بڑی ہوئی تھی تو یہ کام سیکھا تھا۔ آپ کو اچھا لگا، میری محنت وصول ہوگئی۔ اور یہ پہلی

دفعہ نہیں ہے کہ میں نے کسی حکمران کی بیوی کی تصویر بنائی ہے۔ دوبارہ وہی کام کرنا اچھا لگا مجھے۔“ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

چند لمحے دونوں کے بیچ خاموشی حاکم ہوگئی۔ پھر یان سوفو کھنکھاری۔

”چین سے آج صبح اچھی خبر آئی ہے۔ گزشتہ ہفتے سے میرے باپا رو بہ صحت ہیں۔ نظر بد کے تریاق کے پانی نے اپنا اثر کیا ہے۔ میں

اس کے لئے آپ کی ممنون ہوں، شہزادی!“

”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، ملکہ۔ والد کا رشتہ کسی بیٹی کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی کمزوری بن سکتا ہے۔“

یان سوفو غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جس پہ اداسی گھل گئی تھی۔ ”آپ کی اپنے والد سے ناچاقی کس بات پہ ہے؟“

تالیہ نے پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرائی۔ ”وہ مجھے واپس نہیں بھیجنا چاہتے اور میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔“

پھر گردن موڑی تو دیکھا، نیچے سبزہ زار پہ برنوں کی جوڑی ٹہل رہی تھی۔ یونہی اسے اشعر کے قلعے کا لان یاد آیا۔ اور وہ برن... اس نے

سر جھٹکا۔ یان سوفو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بغور دیکھ رہی تھی۔

”کچھ یاد آگیا آپ کو، شہزادی؟“

”میرا شہر... میرا گھر... جہاں بہت سے لوگ ہیں جن سے میں دوبارہ ملنا چاہتی ہوں۔“

”تو مل آئیے نا۔ اس میں ایسا مسئلہ کیا ہے۔“

اس نے گہری سانس لے کر یان سوفو کو دیکھا۔ ”آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ اگر ایک دفعہ وہاں چلی گئی تو واپس نہیں آسکوں گی، اسی لئے باپا

مجھے جانے نہیں دے سکتے۔“

”واپس تو صرف ایک جگہ سے نہیں آیا جاتا، پتری تاشہ (شہزادی تاشہ) اور وہ ہے تین چاند والا آسیب زدہ جزیرہ۔ اس کے علاوہ ہر جگہ سے واپسی ممکن ہے۔“ ملکہ نے مسکرا کے ناک سے مکھی اڑائی۔

”تین چاند والا جزیرہ؟“ وہ چونکی۔

”ہاں۔ ملایا کا وہ آسیب زدہ جزیرہ جس میں ساری کشتیاں اور جہاز ڈوب کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔“

تالیہ ہلکے سے ہنس دی۔ ”نہیں! ادھر نہیں۔ مجھے جہاں جانا ہے، وہ جگہ اتنی پر آسیب نہیں ہے جتنے پر اسرار وہاں کے لوگ ہیں۔ ٹھنڈے اور معاف نہ کرنے والے۔“ اس کا چہرہ پھر سے بجھ گیا۔ ملکہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا وہ بھی ایسا ہے؟“ اس کے سوال نے خوشگوار صبح میں اداس نغمے گھول دیے۔ تالیہ گردن موڑ کے درختوں کو دیکھنے لگی۔

”وہی تو ایسا ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی پہ منہ موڑ لینے والا۔ معاف نہ کرنے والا۔ میں تو اسے ہر سردمہری اور بے رخی کے لئے معاف کر دیتی تھی، ملکہ۔ پھر مجھے ندامت میں ڈال کے وہ میرے سارے اچھے کاموں پہ پانی کیوں پھیر دیتا ہے؟“

”ندامت میں یا شرمساری میں ڈال کے؟“

تالیہ نے اداس نگاہیں اس کی طرف موڑیں۔ ”دونوں میں کیا فرق ہے؟“

”بہت فرق ہے۔ ندامت کہتی ہے کہ میں نے غلطی کی ہے اور مجھے آئندہ نہیں کرنی۔ جبکہ شرمساری کہتی ہے کہ میں خود ایک غلطی ہوں، ایک ناکامی، ایک بربادی۔ ندامت اچھی چیز ہے، پتری تاشہ۔ مگر شرمساری تو جان لے لیتی ہے۔“

وہ بس ملکہ کا چہرہ دیکھ گئی۔ وہ کم عمر تھی، مگر جب نخوت اور بغض کے پردے دونوں کے درمیان سے چھٹے تو اندر سے ایک مخلص عورت نکل کے سامنے آئی تھی۔

”میں اپنی غلطی پہ نادم ہوں، یا شرمسار، مجھے کیسے علم ہوگا؟“

”اگر تم اپنے آپ کو ناپسند کرنے لگی ہو تو تم شرمسار ہو اور یہ مہلک رویہ ہے۔ میں شاہ چین کی دختر ہوں، میں نے اعلیٰ پائے کے اساتذہ سے تربیت حاصل کی ہے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ سکھایا ہے کہ اپنی غلطیوں پہ ندامت اچھی چیز ہے، مگر شرمساری اور خود سے مایوسی انسان کو اس کی اپنی نظروں میں گرا دیتی ہے۔ اگر تم اپنی عزت نہیں کرو گی تو کبھی پر اعتماد اور آزاد انسان نہیں بن سکتیں۔“

”میں نے کسی کا اعتبار توڑا ہے۔ اب میں اپنی عزت کیسے کروں؟“

”ہوں۔“ ملکہ نے لمحے بھر کو سوچا۔ ”اپنی غلطی کو چھوٹا نہ سمجھو مگر پھر یہ بھی دیکھو کہ تم اس کو درست کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہو۔ یہ کام

بے حد صبر اور عزم و ہمت والا ہے۔ تمہیں اس جدوجہد پہ اپنی عزت کرنی چاہیے۔“

تالیہ جبراً مسکرائی اور سر اثبات میں ہلایا۔ ”میں کوشش کروں گی۔“

”کیا تم محبت کرتی ہو اس سے؟“ وہ نرمی سے سوال کر رہی تھی۔

”محبت؟“ وہ زخمی سا مسکرائی۔ ”پتہ نہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے ہم نے کئی زمانوں کا سفر ایک ساتھ کاٹا ہے۔ اس کے لئے جان دے بھی سکتی ہوں، اور لے بھی سکتی ہوں۔ اس سے ناراض ہوں مگر اس کے ساتھ وفا دار ہوں۔ سچ پوچھیں تو دل سے صرف اسی کو تو انکو بولتی ہوں۔ سلطان مرسل کو بھی اس دل سے ”آقا“ نہیں کہتی۔ یہ محبت تو نہیں ہوتی شاید۔“

ملکہ ہنس دی۔ پھر محظوظ انداز میں اسے دیکھا۔ ”یہ محبت نہیں ہوتی تو اور کیا ہوتی ہے؟“

”شاید پرستار ہونا اسی کو کہتے ہیں۔“

”یہ پرستار کیا ہوتا ہے۔“ ملکہ کے لئے لفظ نیا تھا یا شاید اصطلاح۔

”آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ ہمارے شہر کے روگ ہیں۔ ہمارے زمانے والوں کو لگتے ہیں۔“ اور دل میں دہرایا۔ (تالیہ دی فین گرل۔)

”تم اچھی باتیں کرتی ہوتا شہ۔ میرا نہیں خیال تمہارے یہ شہر چھوڑ جانے سے میں خوش ہوں گی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ اتنی جلدی میں اور تم

اتنے قریب کیسے آ گئے۔“

تالیہ ہنس دی۔ کھلکھلا کے۔ بہت دل سے۔

”دنیا میں کوئی تعلق اتنا مخلص اور گہرا نہیں ہوتا جتنا ان دو عورتوں کا ہوتا ہے جن کا دشمن ایک ہی مرد ہو۔“

ملکہ بھی ہنس دی اور دلچسپی سے آگے ہوئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”میں تمہاری واپس جانے میں مدد کروں گی۔ تم میرے شوہر

کو بندہ ہمارا کے تسلط سے نکالنے کے لئے کیا کر سکتی ہو؟“

”ہمیں سلطان کا دل راجہ کی طرف سے کھٹا کرنا ہوگا۔ سلطان کا جس دن راجہ سے اعتبار ٹوٹا، اس دن راجہ کمزور ہو جائے گا۔ دوسرا....“ وہ

آگے ہوئی اور آواز دھیمی کی۔ ”ہمیں راجہ کی دولت کا سراغ لگانا ہوگا۔ میری اطلاع کے مطابق راجہ اپنی دولت کہیں بھیج رہا ہے۔ اگر ہم اس

دولت کو حاصل کر لیں تو راجہ کی کمزوری ٹوٹ جائے گی۔ وہ میری اور آپ کی بر بات ماننے پہ مجبور ہوگا۔ راجہ کی تیسری طاقت اس کے رئیس

دوست ہیں، ہمیں ان رئیسوں کو خوش کرنا اور اعتماد میں لے کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔ ہمارے پاس ان کو دینے کے لئے کچھ ایسا ہونا چاہیے جو

راجہ کے پاس بھی نہ ہو۔ وہ ہمارے ساتھ آملیں تو راجہ تمہارا ہو جائے گا۔“

”تم نفرت کرتی ہو راجہ سے؟“

”نہیں۔ میں ان کے لئے کچھ بھی محسوس نہیں کرتی، ملکہ۔ نہ وہ میری کمزوری ہیں، نہ طاقت۔ اور یہی میری سب سے بڑی طاقت ہے

۔“ وہ رسان سے مسکرا کے بولی تو ملکہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

دنیا میں واقعی ایسا دوسرا کوئی تعلق نہ تھا۔

دو عورتیں ایک ہی مرد کے خلاف۔

الامان۔

☆☆=====☆☆

”جیا“ کے نیم اندھیر ہال میں موم بتیوں نے زرد پرفسوں روشنی پھیلا رکھی تھی۔ مہمان مختلف کرسیوں پہ بیٹھے خوش گپیوں کے دوران چائے پی رہے تھے۔ وہاں صرف چائے نہیں بلکہ کھانا بھی دیا جاتا تھا جو خالص چینی لوزمات پہ مبنی ہوتا تھا۔ فاتح ست روی سے قبوے سے بھری چینک اٹھائے ایک میز پہ آیا جہاں دو اورنگ اصلی نوجوان بیٹھے تھے۔ ایک سن رہا تھا اور دوسرا نم آنکھیں پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور اس دن وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی۔ میرے خط واپس آنے لگے۔ ایک ہندوستانی تاجر اس کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ اور پھر...“ وہ اشکبار سا اپنے ناکام عشق کی داستان سن رہا تھا۔ فاتح نے پاٹ انداز میں چائے اس کی پیالی میں انڈیلی اور واز کے ساتھ چینک میز پہ رکھی۔

”اتنی چائے نہیں منگوائی ہم نے۔ صرف ایک پیالی منگوائی تھی۔“ غم سننے والا ساتھی بگڑ کے بولا تو فاتح چونکا۔ لباب بھری چینک کو دیکھا اور گہری سانس لی۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔ میرا دھیان کہیں اور تھا۔ غلطی سے پوری کتیلی بنا دی۔“ ناکام عاشق رومال سے ناک پونچھ رہا تھا جبکہ اس کا دوست حقلی سے فاتح کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ یہ چائے پی لیں۔ ہم اس کے پیسے نہیں لیں گے۔ یہ لیجئے، آپ بھی پی لیجئے۔“ اس نے ایک خالی پیالی دوست کے سامنے رکھی۔ دوست نے حیرت سے ابرو اٹھایا۔

”واقعی؟ یہ مفت ہے؟“

”جی۔ یہ جن خاص پھولوں کی چائے ہے اس کی طلب ’جیا‘ کے کسی دوسرے مہمان کو نہیں۔ اس لئے یہ کوئی اور نہیں پئے گا۔ آپ پی لیجئے۔“ متانت سے کہتا پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے لڑکے نے جلدی سے چائے پیالی میں انڈیلی اور پھر گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے دلچسپی سے اپنے دوست کی داستان سننے لگا۔

”وہ گئی ہے تو لگتا ہے جسم کا کوئی حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ میں بے کار ہو گیا ہوں۔ دل چاہتا ہے ساری ساری رات اسی قبوہ خانے میں بیٹھا سے یاد کرتا رہوں۔ اس کے بارے میں نظمیں لکھتا رہوں۔“ فاتح واپس جا رہا تھا جب ناکام عاشق کی آواز کانوں میں پڑی۔ لمحے بھر کو وہ ٹھنکا پھر آگے بڑھ گیا۔

”استینیس پیچھے چڑھاتے وہ باورچی خانے میں آیا تو نگران باورچی نے بگڑ کے اسے دیکھا۔

”تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے فاتح؟ تم نے پوری چینک ضائع کر دی۔“

”چند پتے اور زیادہ پانی ہی تو لگا ہے۔ ویسے بھی جیا کا کاروبار مند اجارہ ہے۔ روز کھانا بچ جاتا ہے اور ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اچھا ہے وہ پی لیں گے۔ دل بڑا رکھا کرو۔“ بے نیازی سے کہہ کے وہ دوسرا طشت اٹھائے باہر آ گیا۔ پیچھے دونوں باورچی اس کے بارے میں کچھ بول رہے تھے اس نے پرواہ نہیں کی۔

وہ دونوں کنوارے میز پہ بنوز بیٹھے تھے۔ عاشق داستانِ غم سنائے جارہا تھا اور دوست تسلی سے سن رہا تھا۔ چنک آدھی ہو چکی تھی۔ پیالیاں بار بار بھری جارہی تھیں۔ چینی کی چنک اور قبوہ کی دھار اندیلنے کی آواز.... وہ کھڑا اس سارے منظر نامے کو دیکھ رہا تھا اور ایک اچھوتا خیال اس کے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا تھا۔

”وہ برکھڑی، بردروازے میں نظر آتی ہے۔ آسمان کے برتارے میں اس کا عکس ہے۔ برپھول میں اس کی خوشبو ہے۔“ رومال سے آنکھیں رگڑتا عاشق اب رک کے پیالی سے کھونٹ بھرنے لگا تھا۔
وان فاتح ہلکا سا مسکرایا۔

☆☆=====☆☆

سلطان مرسل شاہ کا دربار اس شام تنبا اور ویران پڑا تھا۔ عصر ڈوبنے لگی تو ساری موم بتیاں، مشعلیں اور دیے جلا دیے گئے۔ طویل دربار روشنوں سے جگمگا اٹھا۔ مرسل شاہ اپنے تخت پہ بیٹھا، سامنے میز پہ پھیلی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ ابرو ستائش سے اٹھے تھے اور بار بار وہ ’واہ‘ کہہ اٹھتا۔

دربار نے دروازے کھولے اور تالیہ اندر داخل ہوئی تو دروازے بند کر دیے گئے۔ دور سیدھ میں اونچے تخت پہ بیٹھے سلطان نے سر اٹھایا اور مسکرا کے اسے دیکھا۔

”آئیے، پتری تاشہ!“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ نے ادب سے سر جھکا کے ”آقا“ کہا اور ریشمی لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے قدم قدم آگے آئی۔ چوتر کے زینے چڑھی اور تخت کے ساتھ ایک مٹھلی اسٹول پہ بیٹھی۔ پھر گھنگریالی لٹیں انگلی سے کندھے پہ پیچھے کیوں اور سادگی سے مسکرا کے سلطان کا چہرہ دیکھا۔

”کیا آقا کو میرا کام پسند آیا؟“

”کام؟ یہ تو کوئی معجزہ ہے جیسے۔“ وہ سر دھن رہا تھا۔ سر پہ ہیروں جواہرات سے مرصع ٹوپی پہنے اور کندھوں پہ زرتار سنہری قبا اوڑھے وہ اپنا انگوٹھیوں والا ہاتھ تعریفی انداز میں بلند کیے ہوئے تھا۔

”یوں لگتا ہے ملکہ کو اس تصویر میں قید کر دیا گیا ہو۔“

”ملکہ کا یہ مقام نہیں کہ ان کو قید کیا جائے۔ ہم تو صرف ان کے عکس کو قید کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔“

مرسل نے گردن موڑ کے مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”یہ فن کہاں سے سیکھا آپ نے؟“

”آزاد انسان کی ہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ پنچھی کی طرح ہر ملک کی فضا میں اڑتا پھرتا ہے۔ اور بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ مجھے فضا میں پسند ہیں آقا۔ یہ محل کے اونچے گنبد نہیں جو قید کر لیتے ہیں۔“

مرسل نے گال تلے تین انگلیاں رکھیں اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

”تو کیا ہم سب قید ہیں؟“

”اتنے آزاد بھی نہیں ہیں۔ مگر آپ کی بھی مجبوری ہے۔“ وہ سرخ آنسو والی انگوٹھی کو انگلی سے گھماتی سادگی سے بولی۔ ”بند ہار کی ہر بات آپ کو ماننی پڑتی ہے۔“

”رابعہ مراد کے احسان ہیں مجھ پر۔ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔“

”تو کیا وہ سب احسان میں کیا تھا انہوں نے؟“ تالیہ کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیلیں۔ ”میں تو سمجھی.... آقا کی محبت اور وفاداری میں کیا تھا۔“

مرسل یکدم گم صم ہو گیا۔ جیسے چونک چونک گیا ہو۔ پھر تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”مگر میں ٹھہری آقا کی ایک ادنیٰ کنیز.... مجھے ان باتوں کی کیا سمجھ۔ قہینا آقا بہتر جانتے ہوں گے۔“

وہ چند تانیے اسے دیکھتا رہا۔ کسی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا۔ دربار کی موم بتیوں کے شعلے ہلکے سے ٹٹمے۔

”میں آپ کو اپنے حرم میں لانے جا رہا ہوں، پتری تاشہ!“

وہ جو اپنی دانست میں دانائی سے چوٹ کر کے اٹھنے لگی تھی، لمبے بھر کو پتھر ہو گئی۔ چونک کے اسے دیکھا۔

”جی؟“

”اول درجے کی خاتون بنا کر میں آپ کو.... اپنے حرم میں.... لانے جا رہا ہوں، شہزادی۔“ وہ خوشگوار انداز میں بتا رہا تھا اور اس کی

رنگت پیلی پڑنے لگی تھی۔ ”ویسے بھی سلطان کی بیوی اور خاتون کا انتظام اور شادی کے معاملات طے کرنے کا اختیار ایک شخص کو ہوتا ہے اور

وہ ہوتا ہے ملاکہ سلطنت کا بند ہار۔ اور مجھے یقین ہے رابعہ مراد کو اس بندھن پر اعتراض نہیں ہوگا۔“

وہ بہت اطمینان اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ”آپ کو میرے حرم میں ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ۔ میرے ہر

فیصلے میں۔ میں ایک طاقتور اور آزاد سلطان بننا چاہتا ہوں شہزادی، مجھے یقین ہے آپ میری مدد کریں گی۔“

سلطان پر اعتماد تھا۔ تخت پہ بیٹھ کے تاج پہن کے مرد پر اعتماد ہو ہی جاتے ہیں۔ انکار کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔

تالیہ پھیکا سا مسکرائی۔ پھر ذرا کھنکھاری۔ ”میری طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے آقا۔ پھر حاضر

ہوں گی۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔ مرسل نے سر کو خم دیا اور اسے اجازت دی۔

وہ اٹنے قدموں پیچھے ہٹتی گئی اور پھر مڑی۔ جیسے ہی پٹی تاثرات بدلے۔ چہرے پہ غصہ در آیا۔ کان سرخ ہوئے۔ وہ طویل دربار میں تیز

تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تنفس مارے جذبات کے تیز ہوتا جا رہا تھا۔
 ”واہ.... آفرین....“ مرسل اب پھر سے بے حد دلچسپی سے اس پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

فجر کی اذان قدیم ملاکہ کی کسی مسجد سے گونجتی گرد و نواح میں پھیل رہی تھی۔ سن باؤ کے صحن میں تاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا۔ برآمدے میں آرام کرسی پہ وہ سو رہا تھا۔ اوپر کمبل تھا جیسے کسی نے بعد میں ڈالا ہو۔ میز پر رکھا دیا بجھا تھا اور ایک کتاب آدھی کھلی پڑی تھی۔
 اذان کی آواز پہ وانگ لی کی آنکھ کھلی۔ ذرا سا کسمایا اور آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ پھر چونک کے اپنے اوپر پڑا لحاف دیکھا۔ ادھر ادھر گردن گھمائی۔

”فاتح“ آواز دی۔

وہ صحن کے کونے میں گھرے کے پانی سے جھک کے وضو کر رہا تھا۔ چہرہ اور بازو گیلے تھے۔ پاؤں اب دھو رہا تھا۔ آواز پہ آخری دفعہ پانی بہایا اور ”جی مالک“ کہتا گھڑا رکھتا اس طرف گھوما۔ پھر قدم قدم چلتا برآمدے تک آیا۔ اندھیر برآمدے میں تاروں بھرے آسمان تلے کھڑا غلام جس کے ہاتھ منہ گیلے تھے بہت سادگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وانگ لی نے گہری سانس لی۔
 ”تم کیا مجھ سے خفا ہو فاتح۔“

وہ ہلکا سا مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میں زیادہ دیر خفا نہیں رہتا مالک اور آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ میری توقعات غلط تھیں۔“
 پھولے گالوں والے وانگ لی کے معصوم صورت چہرے پہ اداسی گھل گئی۔ ”شاید میں اتنا عظیم نہ تھا جتنا تم مجھے سمجھتے تھے۔“
 اس کی آواز کی اداسی صحن کی سرخ اینٹوں سے ٹکرا کے درختوں کے شاخوں سے لپٹنے لگی۔

”نہیں مالک۔ آپ صرف مختلف تھے۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے مگر ہر کوئی خاص ہوتا ہے۔ ہم جب خود کو نہیں بدل سکتے تو دوسروں کو کیسے بدل سکتے ہیں۔ ہمیں صرف دوسروں کو قبول کرنا ہوتا ہے۔“

”تو تم نے مجھے قبول کر لیا ہے؟“

”قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو آپ کی خامیوں کا احساس نہ دلائیں۔ اصلاح کی ضرورت ہر انسان کو ہر وقت ہوتی ہے۔“
 وہ اب گلی آستینیں واپس موڑ رہا تھا۔ سینے پہ کمبل ڈالے بیٹھے وانگ لی نے تکان سے گہری سانس لی۔

”میں جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک میری خامی یہ ہے کہ میں غلاموں کے حقوق کے لئے نہیں لڑتا۔“

”نہیں۔ آپ کی خامی یہ ہے کہ آپ فضول خرچ ہیں۔“

وانگ لی کو اسکی توقع نہیں تھی۔ وہ ٹکڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”غلاموں کو بھول جائیے۔ اپنی فکر کیجئے۔ آپ نے ایک غلام کی ہزاروں دینار میں بولی لگائی۔ کیا ضرورت تھی اس کی جب کہ آپ اتنے

امیر نہیں ہیں۔ 'جیا' مسلسل نقصان میں جا رہا ہے۔ آپ کو اپنے کاروبار کو واپس پیروں پہ کھڑا کرنا ہوگا۔"

"میرے بہت سے کاروبار ہیں مگر ہاں... میں جیا کے لئے فکر مند رہتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ہوئے کرسی پہ جھولنے لگا۔ رات کی مقدس خاموشی میں ہلکی ہلکی آواز پیدا ہوئی۔

"میرے پاس ایک طریقہ ہے جیا کو اپنے قدموں پہ کھڑا کرنے کا۔ اگر آپ کو مجھ پہ ذرا سا بھی بھروسہ ہے تو اس پہ عمل کر کے دیکھئے۔" وہ آگے آیا اور احتیاط سے وانگ لی کا چہرہ دیکھتے اس کے قدموں کے قریب بیٹھا۔ جیسے غلام بیٹھتے ہیں۔ مگر گردن اور نگاہیں اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں نہیں جھکاتا تھا۔

"کیا؟"

"ہم منادی کر دیتے ہیں کہ جیا میں کنوارے مردوں کو کھانا اور چائے مفت ملے گی۔"

"ایں؟" وانگ لی ہڑبڑا کے سیدھا ہوا۔ "ہم کیوں کسی کو مفت کھانا دیں؟"

"روز کتنا کھانا ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ لوگ دوسرے دنوں چائے خانوں کا رخ کر لیتے ہیں۔ جیا سنسان ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ دوسری دکانوں میں اس لئے جاتے ہیں کیونکہ وہ بھری ہوتی ہیں۔ انسان بھیڑ چال کا رسیا ہے۔ وہ دوسروں کی پیروی کرتا ہے۔ دکان میں ہجوم دیکھ کے سب کو اشتیاق ہوتا ہے کہ وہاں جانا چاہیے۔ ہم بھی ایسا ہجوم اکٹھا کر سکتے ہیں۔"

"مفت کھانے کے لالچ میں تو سارے شہر کے مرد آ جائیں گے فاتح۔ یہ تو سراسر نقصان ہے۔" وہ متذبذب تھا۔

"مگر ہجوم تو لگے گا۔ اور ان کی دیکھا دیکھی شادی شدہ مرد عورتیں سب آئیں گے اور پیسے دیں گے۔ ویسے بھی کنوارے زیادہ تر ناکام عاشق ہوتے ہیں۔ چائے پہ خوش ہوتے ہیں۔ گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ اتنا زیادہ نہیں کھا سکتے وہ۔" وہ اس کے گھٹنوں کے پاس بیٹھا آہستہ آہستہ ہمارا ہاتھ۔

وانگ لی توجہ سے سن رہا تھا۔ اسے یہ خیال بھلا معلوم ہونے لگا تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ سب سے زیادہ کنوارے مرد جس ایک طبقے میں ہوتے ہیں وہ غلاموں کا طبقہ ہوتا ہے۔

☆☆=====☆☆

دوپہر چمکیلی تھی اور آسمان بادلوں سے بالکل صاف تھا۔ 'جیا' چائے خانے کے اندر ہجوم لگا تھا۔ باہر سبزے پہ کچھ لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اندر میزیں کچا کچھ بھری تھیں۔ ایسے میں دو چغہ پوش چوکھٹ سے اندر داخل ہوئے تو مرکزی ہال میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ دھوئیں اڑ رہے تھے اور خوش گپیوں کی آوازیں مل کر شور و صورت بلند ہو رہی تھیں۔ غرض 'جیا' میں رونق لگی تھی۔

ایک چغہ پوش نے دو سے کے قریب سرگوشی کی۔ "یہاں اتنا رش کیوں ہے ایڈم؟"

دوسرا قریب کھسکا اور بولا۔ "کیونکہ اس چائے خانے کے مالک نے تمام کنوارے مردوں کے لئے کھانا اور چائے مفت کر دی ہے، چے

تالیہ۔ تین دن میں اس چائے خانے کی رونق بحال ہوگئی ہے۔“
 ”تو ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔“

”کیونکہ میں کنوارہ ہوں اور آپ کی مہربانی سے جو میری شادی ہونے والی تھی وہ وقت کی قید کے باعث نہیں ہو پائے گی۔ اس لئے مجھے اب یہاں سے مفت دال روٹی توڑنے دیجئے، شہزادی۔“

”ارے واہ۔ میں نے کیا کیا تھا؟ تمہیں ہی شوق تھا میرے خزانے کے ایڈ ونچر کو خراب کرنے کا۔“ وہ اس کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھتی کہے جا رہی تھی۔ گول زینے اوپر جاتے تھے اور وہاں ایک چھوٹا ہال بنا تھا۔ ”تمہیں اور مجھے وہ خزانہ ڈھونڈنا تھا اور تم نے کیا کیا؟“

”میں نے کیا کیا؟“ وہ اوپر آئے اور آگے پیچھے ایک میز کی طرف بڑھے۔

”تم نے جا کر چابی اور سکہ وان فاتح کو دے دیا اور انہوں نے وہ دروازہ کھول دیا۔ تم اپنی وجہ سے کنوارے ہو اچھا۔“ اس نے ایک کرسی کھینچی اور اسے دبی آواز میں جھڑکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”تمہارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ جو بات میرے اور تمہارے درمیان تھی تم اس میں وان فاتح کو لے آئے۔ تم بردفعا ان کو بیچ میں لے آتے ہو۔“

میز پہ ہلکا سا ہاتھ مارا اور بات مکمل کر کے چہرہ موڑا تو... میز کے اس طرف کرسی پہ وہ بیٹھا تھا۔

تالیہ کا سانس تھم گیا۔

سفید کرتے پا جامے میں ملبوس، ٹیک لگائے، گہری سپاٹ نظروں سے تالیہ کو دیکھتا ہوا۔

تالیہ نے فوراً ایڈم کو دیکھا جو تیسری کرسی کھینچ کے بیٹھ رہا تھا۔

”یہ یہاں کیسے؟ یہ تو سن باؤ کے گھر...“ پھر چونک کے اطراف میں دیکھا۔ دیواروں پہ سرخ رنگ کی سجاوٹ... چینی زبان میں لکھے بینرز۔ اس نے گہری سانس کھینچی اور خفگی سے ایڈم کو دیکھا۔

”تو یہ چائے خانہ سن باؤ کا ہے۔“ ساتھ ہی خفگی سے رخ ذرا موڑ لیا۔ ٹوپی سر پہ تھی مگر اس کے ہالے میں دمکتا چہرہ اور متمتاتے گلابی ہوتے گال صاف دکھائی دے رہے تھے۔

”میں چاہتا تھا ہم تینوں مل کے بیٹھ کے باتیں کر لیں اور مستقبل کا...“ ایڈم نے قدرے نرمی سے بات سنبھالنی چاہی مگر....

”اسے میں نے کہا تھا تمہیں یہاں بلانے کو۔“ وہ سنجیدگی سے ہاتھ میز پہ رکھتے سامنے کو جھکا۔ تالیہ نے خفا خفا سا چہرہ اس کی طرف

موڑا۔

”اور آپ کیوں ایک بددیانت جھوٹی لڑکی سے ملنا چاہتے تھے؟ اس سچے اور عظیم نئے دوست کے پاس کیوں نہیں بیٹھتے جس کے لئے

آپ نے ہمیں چھوڑا تھا۔“

”میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ تم نے ایک غلطی کی اور تم اس کو جسٹی فائی نہیں کر سکتیں۔ جہاں تک وانگ لی کا تعلق ہے تو میں اس سے جن کاموں کی توقع کر رہا تھا وہ اس کے بس کی بات نہیں ہیں۔ اب اگر تم ہماری ذاتی رنجشوں کو پس پشت ڈال دو تو ہم کام کی بات کر لیں۔“ وہ غصے میں نہیں تھا۔ وہ بس دو ٹوک بے تاثر سا کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے رک کے اسے دیکھا۔

اس کے بال چھوٹے تھے۔ قلموں سے کچھ سفید بھی تھے۔ شیو تازہ بنا رکھی تھی اور چہرہ پہلے سے تروتازہ لگتا تھا۔ بالآخر اسے ملا کہ کاپانی اس آگیا تھا اور وہ روبہ صحت تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں کی سنجیدگی اور فکر مندی پہلے سے مختلف تھی۔ نہ جانے کیوں وہ نرم پڑنے لگی۔

”کہیے تو انکو۔ میں سن رہی ہوں۔“ خفگی ختم نہیں کی، مگر کم کر دی۔ ایڈم نے سکون کا سانس لیا۔ تالیہ اور فاتح آگے سامنے بیٹھے تھے اور ایڈم ان کے ایک طرف۔ تکیوں صورت وہ میز پر جھکے تھے۔ ارد گرد میزوں پر چند لوگ کھانے اور خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ کوئی یہاں خاص متوجہ نہ تھا۔

”ہمیں جلد از جلد وہ چابی ڈھونڈ کے اس جگہ سے نکلنا ہے تاکہ آپ لوگ اپنے اپنے کام کریں اور میری شادی ہو سکے۔“ وہ عرصے بعد اتنا مغموم اور بے چین نظر آ رہا تھا۔ جیا کے سارے کنوارے مردوں کو دیکھ کے اس کے پرانے زخم جاگ گئے تھے۔

”ایڈم کا کہنا ہے کہ رجبہ مراد اپنی دولت کو کہیں منتقل کر رہا ہے۔“ فاتح نے سنجیدگی سے تالیہ کو مخاطب کیا۔

”لگتا تو یہی ہے۔ مگر کہاں، ہم نہیں جانتے۔“ اس کا انداز ہنوز لیا دیا سا تھا۔

”اور یہ دولت کہاں سے رہی ہے؟ رجبہ کا کوئی کاروبار، کوئی جائیداد نہیں ہے۔ جب اس کو محل سے نکالا گیا تھا پچھلے سلطان کے عہد میں تو وہ کنگال تھا۔ تبھی تو اوروں سو ننگائی کے ایک خستہ حال مکان میں جا بسا تھا۔ مجھے یہ سب وانگ لی نے بتایا ہے۔“

”یہ دولت ان کو ابوالخیر کی طرف سے ملتی ہے۔ مگر وہ اسے کہیں اور منتقل کیوں کر رہے ہیں؟ یہ مجھے سمجھ نہیں آئی۔“

فاتح نے کہنیاں میز پر رکھے اس کو غور سے دیکھا۔

”تم ہی تو کہتی ہو کہ فضا میں شامل Cesium کے علاوہ کوئی شے مختلف نہیں ہے ہماری اور ان کی دنیا میں۔“

”تو؟“ (ایڈم احتجاج کرنے لگا مگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ ”یہ میری لائن تھی۔“)

”تو ہماری دنیا میں بھی تو یہ کام ہوتے ہیں۔ اس کو منی لانڈرنگ بولتے ہیں۔“

”منی لانڈرنگ! اوہ۔“ اس نے کراہ کے آنکھیں بند کیں۔

”جے تالیہ تو ماشاء اللہ لوٹنے اور چوری چکاری کی فیلڈ سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے ان کا علم لامحدود ہوگا، مگر میں سچی بات ہے کہ ابھی تک ٹھیک سے نہیں جانتا کہ منی لانڈرنگ کیا ہوتی ہے۔“

”کیوں؟ تم نے کبھی اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں پڑھی کیا؟“ وہ چمک کے بولی۔ جواب میں ایڈم نے منہ بنایا تھا۔

”سادہ سی بات ہے۔ جب کوئی آدمی بینک میں پیسہ رکھوانے جاتا ہے تو بینک اس سے پوچھتا ہے کہ یہ پیسہ کہاں سے آیا ہے؟ کیسے کمایا

ہے؟ اس کی رسیدیں دکھاؤ۔“ وہ رخ موڑ کے ایڈم کو سمجھانے لگا۔ ایڈم تالیہ کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کیے سننے لگا۔

”تو حلال کمائی والے رسیدیں دکھا دیتے ہیں۔ مگر ناجائز طریقے سے پیسہ بنانے والے رسیدیں نہیں دکھا سکتے، سو وہ اس پیسے کو اپنے ملک میں نہیں، بلکہ فیشن اہل خوبصورت لڑکیوں کے بیگز میں بھر کے دوسرے ملکوں میں بھیج دیتے ہیں۔ کیونکہ خوبصورت لڑکیوں کے بیگز کی انیورپورٹ پہ تلاشی کم کم لی جاتی ہے۔ اس کو پیسے کو آف شیور اکاؤنٹ میں رکھنا کہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ آف شیور کمپنی بناتے ہیں جو ایک کھوکھلی کمپنی ہوتی ہے۔ بس یہ جان لو کہ ہر ملک پوچھتا ہے کہ پیسہ کہاں سے آیا۔ سوائے چند ایک ملکوں کے۔“

وہ عرصے بعد ایڈم کو اپنا مخلص اور سادہ لیڈر لگا تھا جو اسے آسان زبان میں کچھ سمجھا رہا تھا۔

”کون سے ملک؟“

”ہانگ کانگ اور پانامہ۔“

”یہ ملک کیوں نہیں پوچھتے کہ پیسہ حلال کا ہے یا حرام کا؟“ وہ حیران ہوا۔

”یہ غریب جزیرے تھے۔ ان کے پاس کچھ ایسا نہ تھا جو لوگ یہاں سرمایہ کاری کرتے۔ جس ملک میں بھی لوگ آ کر پیسہ بینکوں میں جمع کراتے ہیں، وہ ملک امیر ہو جاتا ہے سو ان ملکوں نے دنیا کو یہ کہہ دیا کہ ہمارے بینکوں میں پیسہ محفوظ کرو، ہمارے ہاں آف شیور کمپنیاں رجسٹرڈ کرواؤ، ہم پیسے کا ذریعہ نہیں پوچھیں گے۔“

”اوہ، یعنی اس طرح سارے کرپٹ لوگ اپنا کالا دھن پانامہ اور ہانگ کانگ اور سویٹس بینکوں میں بھرنے لگے۔ کیونکہ وہاں کوئی ان سے سوال نہیں کرتا تھا۔“ ایڈم کو سمجھ آ گیا تھا۔

”اور پیسے کو ملک سے چوری چھپے نکال کے آف شیور میں محفوظ کرنا منی لانڈرنگ ہوتا ہے۔ یہ پہلے صندوقوں میں بھر کے ہوتا تھا۔ اب بیگز میں ڈال کے۔“

”دیش اٹ۔ آف شیور!“ تالیہ نے ایک دم میز پر ہاتھ مارا تو وہ دونوں اسے دیکھنے لگے۔

”آف شور کا کیا مطلب ہے بھلا؟“ وہ دبی آواز میں چمکتی آنکھوں سے گویا ہوئی۔ ”ساحل سے دور... سمندر کی طرف کسی شے کو رکھنا۔“

سمندر کے اندر جزیروں میں چھپانا۔ یہ پانامہ، ہانگ کانگ، برٹس ورجن آئی لینڈز، یہ سب جزیرے ہیں۔ ہے نا۔“

”ہاں تو؟“

”تو ہو سکتا ہے اس قدیم زمانے میں بھی ایسے ہی کیا جاتا ہو۔ خزانوں کو صندوقوں میں بھر کے کسی ایسے جزیرے پہ لے جایا جاتا ہو جہاں کوئی اس دولت کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹے خالی صندوق میں ریت کے ذرے پھنسے تھے۔ اسے ساحل پہ گھسیٹا گیا تھا۔ وہ غم تھا۔ اسے کشتی میں لا کے لے جایا گیا تھا۔ راجہ مراد اس دن کشتی تیار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ دیش اٹ۔“ وہ ناراضی بھلائے جوش سے کہہ رہی تھی۔ ”راجہ وہ سب ایک جزیرے پہ بھیجتا ہے۔“

”مگر ملایا میں سینکڑوں جزیرے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کون سا جزیرہ ہے، چے تالیہ۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ چبکی۔ ”ملکہ یان سوفو نے ایک Haunted جزیرے کا ذکر کیا ہے جس سے کوئی پلٹ کے نہیں آتا۔ تین چاند

والا جزیرہ۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہیں کچھ چھپا ہے۔“

”جہاں ملتے ہیں تین چاند۔“ ایڈم بڑبڑایا۔ ”میں نے کتب خانے کی کتابوں میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ آسیب زدہ ہے اور

وہاں سارے جہاز ڈوب جاتے ہیں اس لیے وہاں کوئی نہیں جاتا۔“

”شاید یہ صرف باتیں ہوں۔ عام لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لئے۔“ وہ پر جوش سی باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھتی کہہ رہی تھی

۔ ”مجھے معلوم ہے اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

”کیا؟“ فاتح نے ٹیک لگائی اور غور سے اسے دیکھا۔ تالیہ نے جواب میں بے نیازی سے نظریں اس کی طرف موڑیں۔

”میں یہ بتانے کی پابند نہیں ہوں تو انکو۔“

”اور وہ کیوں؟“ اس کے ماتھے پہ ہل پڑے۔

وہ اٹھی میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے جھکی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کیونکہ میرا الوژن ٹوٹ چکا ہے۔ کیونکہ میں اب.... کسی کے پیچھے

بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جب انسان اپنے آپ کو عزت دینے لگ جائے تو اسے کسی اپروول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں آزاد ہو

چکی ہوں۔ میں نے خود سے وعدہ لیا ہے کہ اب اچھے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولوں گی، دھوکہ نہیں دوں گی اور میں اس وعدے کے لئے صرف

اپنے آپ کو جواب دہ ہوں، کسی دوسرے انسان کو نہیں۔ تالیہ دی فین گرل کے ایل میں رہ گئی ہے تو انکو.... اور جو یہاں ہے، وہ آپ کی

عزت کرتی ہے، مگر وہ ذہنی غلام نہیں ہے۔ کسی کے فین ہونے کا مطلب اپنی رائے کو اس کی رائے کا غلام بنادینا نہیں ہے۔ بعض اوقات

ہم پرستار اپنی محبوب شخصیات سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔“

اس نے چغہ جھنکا، سیدھی ہوئی اور ایک جتنا نظر اس پہ ڈالتی مڑ گئی۔ آخری بات پہ فاتح نے چونک کے ایڈم کو دیکھا جس نے خجالت

سے سر کھجایا تھا۔

”مجھے ہر بات شہزادی کو بتانی پڑتی ہے، ورنہ وہ میرا دایاں ہاتھ کٹا سکتی ہے۔ دایاں!“

تالیہ اب دھپ دھپ زینے اتر رہی تھی۔ فاتح نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے پیچھے ہو کے بیٹھا۔

”چلو اچھا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔“ اس نے تالیہ کی بات کا اثر زائل کرنا چاہا۔

”انہوں نے کہا ہے کہ اچھے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولیں گی۔ اب یہ تو چے تالیہ ہی بتا سکتی ہیں کہ اچھے لوگوں میں ہم شامل ہیں یا نہیں۔

ان کا ویسے بھی کچھ نہیں پتہ۔ کل کو کہہ دیں ساری دنیا میں کوئی اچھا نہیں ہے۔“

فاتح نے گردن موڑ کے کام کرتے بیروں کو دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم اپنا کام کرو اور چوکے رہو۔ کل ملتے ہیں۔ باورچی اوپر آنے

والا ہوگا۔“ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

”سر!“ وہ کھڑا ہوا اور قد رے سنجیدگی سے پکارا۔ وہ جاتے جاتے رکا اور پلٹ کے اسے دیکھا۔

”کوئی بات ہے؟“

”چپے تالیہ نے مجھے بتایا ہے کہ سلطان مرسل.... ان کو.... (تھوک نگلی) اپنے حرم میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جلد ہی وہ راجہ سے بات کرنے والے ہیں۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ”میں چاہتا تھا کہ آپ کو علم ہو کہ آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کو بتانے سے منع کیا تھا۔“

فاتح بن رامل کے کان سرخ پڑے۔ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ سنا تم نے؟ اپنی شہزادی سے کہو، سلطان سے دور رہے۔“ وہ ایک دم اتنے غصے سے بولا کہ خود بھی ٹھٹک گیا۔ ایڈم نے نظر اٹھا کے خاموشی سے اسے دیکھا اور سر کو خم دیا۔

”وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ وہ ملا کہ کی شہزادی ہیں۔ میں یا آپ یہ بات ان کو کس حیثیت سے کہہ سکتے ہیں سر؟“ یہ سوال نہیں تھا۔ تبصرہ تھا۔ کہہ کے وہ رکنا نہیں۔ چنے کی ٹوپی درست کی اور مڑ گیا۔

فاتح مٹھیاں بھیجنے کے رہ گیا۔ اسے کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ سخت ناگوار۔ بے بسی کا عجیب احساس۔

☆☆=====☆☆

راجہ مراد کی خواب گاہ کے اندر قدیلیں جل رہی تھیں۔ سارے میں زرد روشنی پھیلی تھی۔ راجہ میز پر جھکا بیٹھا ایک ننھے ہتھوڑے سے لکڑی کے ٹکڑوں میں میخیں ٹھونک رہا تھا۔ ماتھے پر سرخ پٹی بندھی تھی اور بال پونی میں جکڑے تھے۔ نیچے سیاہ کرتا پا جامہ تھا۔ یہ اس کے آرام کا وقت تھا۔

آہٹ ہوئی تو اس نے سر اٹھایا۔ پھر مسکرایا۔ سامنے تالیہ کھڑی تھی۔ شہزادیوں والے لباس میں تاج اور زیور پہنے وہ سنگھار کیے مسکرا رہی تھی۔

”آؤ تالیہ۔ بہت دیر لگائی آنے میں۔ سنا ہے آج کل تم شہر کی سیر کو نکلی رہتی ہو۔“

”مجھے بھیس بدل کے لوگوں کے حالات معلوم کرنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ مسکرا کے کہتی قریب آئی اور میز کے کنارے رکی۔ راجہ کے ہاتھوں پر نظر ڈالی تو غصگی۔ اس نے ننھی لکڑی کی کشتی پکڑ رکھی تھی۔ جس کو وہ مہارت سے جوڑ رہا تھا۔ چند اوزار اور لکڑی کے ٹکڑے سامنے پھیلے تھے۔

”یہ شوق بھی رکھتے ہیں آپ؟“

”شکار بازوں کے شوق وسیع ہوتے ہیں۔ بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

تالیہ ذرا سی چوکی مگر پھر سنبھل کے بیٹھ گئی۔ ذہن فوراً مرسل کی باتوں کی طرف گیا تھا۔ (کیا اس نے باپا سے بات کر لی؟ اوہ نو۔ اب وہ

کیا کرے گی۔)

”کہیے۔ کیا بات تھی؟“ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ کھوتی نظریں راجہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ وہ جھکا اور دراز سے کچھ نکال کے میز پر رکھا۔ تالیہ دھک سے رو گئی۔

وہ خالی بوتلی تھی۔

راجہ نے کشتی میز پر رکھی اور پیچھے ہو کے بیٹھا۔ ”اس بوتل میں جو مشروب تھا، وہ تم نے پیا تھا... تب جب تم نے چابی نکالی تھی، یاد ہے۔“

”جی، راجہ!“ اس نے پھیکا سا مسکراتے سر کو خم دیا۔ ”مجھے کیسے بھول سکتا ہے۔“

”یہی تو ساری بات ہے، تالیہ۔ تمہیں بھولنا بھی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ بھی مسکرایا۔ اس کی عتابی آنکھوں کی چمک اور اندر تک اترتی نظریں... تالیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

”مطلب؟“

”وقت میں سفر کے لئے ایک قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس مشروب کو پینا پڑتا ہے۔ یہ چابی کو جوڑنے کے لمحے سے پہلے کی ساری یادداشت بھلا دیتا ہے۔ دروازہ کھولنے کے بعد جیسے ہی چابی ٹوٹے گی، تمہیں سب بھول جانا چاہیے تھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم بھول گئی ہو گی۔“

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ کمرے کی خواب ناک فضا میں کچھ غلط تھا، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

”مگر جس لمحے..... برسوں بعد تم نے چابی جوڑی.... تمہیں سب کچھ یاد آ جانا چاہیے تھا۔ دروازہ کھول کے ”واپس“ آتے ہی تمہیں سب یاد آ جانا چاہیے تھا۔ مگر تمہیں نہیں یاد آیا۔ سوائے چند بے ربط مناظر کے تمہیں کچھ یاد نہیں۔ تمہاری ماں تمہاری پیدائش کے وقت مر گئی تھی مگر تمہیں یہ بھی یاد نہیں۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

تالیہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ حلق سوکھ رہا تھا۔

”میں اتنے دن سوچتا رہا کہ میرے جادو میں کوئی کمی رہ گئی تھی کیا؟ تالیہ کو ماضی کیوں نہیں یاد آیا۔ اور پھر مجھے ایک خیال آیا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ بھی میکا کی انداز میں کھڑی ہو گئی۔ کسی معمول کی طرح۔

”مجھے خیال آیا کہ ایسا تب ہوتا جب....“ وہ آگے آیا.... وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ رہی تھی۔ مراد نے اس کو دونوں کہنیوں سے سختی سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ تالیہ کی آنکھیں بس اس پہ جمی تھیں۔

”ایسا صرف تب ہو سکتا تھا.... جب یہ چابی ’تم‘ جوڑتیں۔ تم نے.... یہ چابی.... نہیں جوڑی۔ چابی کا چکر خراب ہو گیا ہے۔ کیونکہ اسے.... کسی اور نے جوڑا ہے۔ تم اکیلی نہیں آئیں.... ہے نا۔“

وہ پتھر کی صورت بن گئی جس کو راجہ نے کہنیوں سے دبوچ رکھا تھا۔ اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب لا کے وہ دھیرے سے سرد آواز میں

بولا۔

”مجھے بتاؤ تالیہ بنت مراد... تم اپنے ساتھ اپنی دنیا سے کس کو لے کر آئی ہو؟...“ اس کی آواز بے رحم غراہٹ میں بدل گئی۔ ”میں پوچھ رہا ہوں... کہ تم میری دنیا میں... کس اجنبی کو لے آئی ہو؟۔“

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆=====☆☆

حالم (نمرہ احمد)

باب دہم:

”صنم تراش“

اس نے خواب میں دیکھا....

ایک ہال میں قطاروں کی صورت آفس کیبن بنے ہیں..

کی بورڈز کے کھڑکنے کی آوازیں... فون کی گھنٹیوں کا شور...

برطرف لوگ فائلوں اور لیپ ٹاپس میں سر دیے بیٹھے ہیں۔

تالیہ ہال کے سرے پہ کھڑی ہے... اس نے سفید منی کوٹ پہن رکھا ہے اور سنہری بالوں کے ہالے میں دکتے چہرے پہ غصہ نمایاں ہے۔

وہ سیدھ میں دیکھ رہی ہے... ہال کے آخری سرے کی طرف جہاں کیبن ختم ہوتے ہیں۔

آخری کیبن میں ایک لڑکی سر جھکائے کام کرتی نظر آرہی ہے۔

اس لڑکی کو نگاہوں میں رکھے تالیہ قدم قدم چلتی گئی ہے۔

فائلیں اٹھائے آگے پیچھے جاتے لوگ ہٹ ہٹ کے اس کو راستہ دے رہے ہیں۔

وہ ماتھے پہ ہل ڈالے تیز تیز چلتی اس لڑکی کے سر پہ آرکتی ہے۔

کیبن کی دیوار چھوٹی ہے۔ اندر بیٹھی لڑکی چونک کے اسے دیکھتی ہے۔

وہ جیب سے ایک لفافہ نکالتی ہے اور اسے بے نیازی سے لڑکی کی طرف ڈال دیتی ہے۔ لفافہ میز سے پھسلتا ہوا نیچے جا گرتا ہے۔

”میں تمہیں نوکری سے فارغ کرتی ہوں۔ ایک باکس میں اپنا سامان ڈالو اور رخصت ہو جاؤ۔ اور یہ... یہ تمہارا ٹرینیشن لیٹر ہے!“

وہ جس انگلی سے لفافے کی طرف اشارہ کرتی ہے اس میں آنسو شکل کی سرخ یا قوت جڑی انگوٹھی دکتی دکھائی دے رہی ہے....

☆☆=====☆☆

”مجھے بتاؤ تالیہ... تم کس کولائی ہوا پنی دنیا سے؟“ مراد راجہ اس کو دونوں کہنیوں سے تھامے اس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

تالیہ کے چہرے پہ سایہ سا آیا مگر پھر گزر گیا۔ لمبے بھر کو بھی نہیں ٹھہرا۔

”تو یہ رائے ہے آپ کی میری بارے میں؟“ وہ جبراً مسکرائی۔ ”اتنی کمزور ہے تالیہ کہ وقت کا دروازہ اکیلے پار کرنے سے ڈرتی ہے

”؟“ استہزائیہ سا انداز تھا اس کا۔

مراد نے جھٹکے سے اس کی کہنیاں چھوڑیں اور برہمی سے اسے دیکھا۔

”میرے ساتھ کھیل نہ کھیلو لڑکی۔ جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔“

”کوئی نہیں آیا میرے ساتھ‘ بابا۔ میں اکیلی ہوں... مگر مجھے اکیلا دیکھ کے ادھورامت سمجھے گا۔ میرے زمانے کی لڑکیوں کو اپنی تکمیل کے لئے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں آپ کے سارے محل کو اکیلی ہی کافی ہوں۔ اور آخری بات...“ شانوں سے لباس جھٹک کے درست کیا، گویا مراد کے خست لمس کو تحقیر سے جھٹکا ہو۔

”آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں سب کچھ بھول چکی ہوں؟ ہو سکتا ہے میں آپ کی سوچ سے زیادہ ماضی سے واقف ہوں۔ اور شاید مستقبل سے بھی!“ ایک نگاہ غلط بابا پہ ڈال کے اس نے ادب سے سر جھکایا۔ ”بابا!“ کہہ کے اٹھ قدموں پیچھے ہٹتی گئی۔

رابعہ مراد کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کمرہ اب خالی رہ گیا تھا۔ چند تائیے بیٹے اور دستک ہوئی۔ پھر ایک ادھیڑ عمر مرد اندر داخل ہوا۔ یہ رابعہ کا خاص خادم تھا جس کو اس روز وہ نئی کشتی بنانے کا حکم دے رہا تھا۔

”عارف۔“ مراد نے اسے سو جتنی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں درست تھا۔ وہ کسی کو ساتھ لے کر آئی ہے۔“

”مگر رابعہ...“ عارف کو اچنبھا ہوا۔ ”کیا انہوں نے خود اقرار کیا ہے؟“

”اس نے مجھے بابا کہہ کے پکارا۔ وہ عرصہ ہوا مجھے رابعہ کہتی ہے۔ بابا کہنے کا مطلب ہے وہ دیانت داری سے کام نہیں لے رہی۔“ پھر وہ میز کی طرف آیا اور دراز سے ایک کاغذ نکال کے عارف کی طرف بڑھایا۔

عارف نے کاغذ تھا ما اور تہہ کھولی۔ سیاہ روشنائی سے بنا خاکہ دیکھ کے وہ چونکا۔

”یہ تو وقت کی مہر ہے۔“

”تم میرے واحد پمپورو (شکار باز) ساتھی ہو جس کو میں بچا کے محل تک لایا ہوں۔ تم وقت کی مہر سے واقف ہو۔ مگر تمہارے سپاہی نہیں جانتے ہوں گے۔ تم یہ خاکہ ان کو دو اور کہو کہ وہ سارے ملاکہ میں بکھر جائیں اور جس مرد کی گردن کی پشت پہ یہ نشان دیکھیں اس کو گرفتار کر کے میرے پاس لے آئیں۔“

”اس کے ساتھ آنے والی کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اوڑھنی سے سر ڈھکے رہے تو ہم اس کو کیسے ڈھونڈیں گے رابعہ؟“

مراد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اپنی بیٹی سے ابھی تفتیش کیوں کی عارف؟ اس لئے تاکہ وہ کوئی غلطی کر دے اور اس نے کر دی۔ اس نے کہا کہ اسے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی واپس آنے کے لئے۔ اس نے ”انسان“ نہیں کہا۔ اس لئے جاؤ اور ایسا مرد ڈھونڈو جس کی گردن پہ یہ مہر ہو۔“

عارف کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سمجھ گیا۔

”جو حکم راجہ!“ پھر اسے خیال آیا۔ ”اور.... وہ کشتی.... وہ اگلے ہفتے تک تیار ہو جائے گی۔ پھر میں اس مہینے کا بقایا سونا جزیرے پہ پہنچا دوں گا۔“

”ہاں یہ کام جلدی کرنا۔ مال زیادہ ہے اور یہاں محفوظ نہیں ہے۔ مگر احتیاط سے۔ تمہاری کمی کسی کو محسوس نہیں ہونی چاہیے۔“

”جو حکم راجہ۔“ وہ چلا گیا تو راجہ واپس کرسی کھینچ کے بیٹھا اور لکڑی کی ننھی کشتی اٹھالی۔ اب اسے اس کشتی کا بادبان بنانا تھا۔ اس نے سفید کپڑا اٹھایا اور قینچی سے اسے کترنے لگا۔ جھکے چہرے پہ چھائی تختی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کے سامنے بنی بالکونی میں تالیہ بے چینی سے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی اور سامنے مسہری پہ بیٹھے ایڈم کی نظریں اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔ اسے گمان گزرا کہ وہ مرسل شاہ کے رشتے کی وجہ سے پریشان ہے۔

”نہیں، نہیں۔ اور جائیں آپ سلطان مرسل کے پاس اتنی بن سنور کے۔ اور کریں آپ ان کو متاثر کرنے کی کوشش۔ یہ تو ہونا تھا۔“

وہ رکی اور اسے گھور کے دیکھا۔ ”میں اس وقت مراد راجہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ ان کو شک پڑ گیا ہے کہ میں اپنی دنیا سے کسی کو ساتھ لائی ہوں۔“

”اوہ!“ ایڈم کے لب سکڑے۔ ”مگر ان کو کیسے علم ہوا؟“

”کیونکہ پہلی دفعہ چابی سے دروازہ کھولنے پہ جب چابی ٹوٹتی ہے تو یادداشت چلی جاتی ہے۔ اسی چابی سے دوبارہ دروازہ کھولنے پہ چابی تحلیل ہوتی ہے اور چکر مکمل ہو جاتا ہے تو یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ لیکن راجہ نے بھانپ لیا ہے کہ میری یادداشت واپس نہیں آئی۔ کیونکہ ہم نے چابی کے چکر کو خراب کر دیا ہے.... پہلے دفعہ دروازہ میں نے کھولا تھا میری یادداشت چلی گئی۔ دوسری دفعہ وان فاتح نے کھولا اس لیے میری یادداشت واپس نہیں آ سکی۔“

”تو وان فاتح کی یادداشت کیوں نہیں گئی؟“

”کیونکہ یادداشت پہلے چکر پہ جاتی ہے جب چابی ٹوٹتی ہے۔“

”بڑا ہی کوئی سائنسدان باپ ہے آپ کا۔“

تالیہ نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ”اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم چابی وان فاتح کے پاس نہ لے کر جاتے اور وہ اس کو نہ جوڑتے تو میں خود دروازہ کھولتی اور راجہ کو ہرگز شک نہ ہوتا۔“

”ہاں بس گھوم پھر کے میرے اوپر آ جایا کریں۔“ وہ خفا ہوا۔ پھر دیکھا کہ وہ دوبارہ بے چینی سے ٹہلنے لگی ہے تو گہری سانس لی اور تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ ”اچھا اتنی پریشان نہ ہوں۔ راجہ کو کیا معلوم کہ کون آیا ہے وہاں سے۔ میں تو ایک مورخ ہوں جس کو آپ نے گرفتار کر کے ماشاء اللہ اتنے ظلم ڈھائے ہیں کہ میرے اوپر شک....“

”تمہاری فکر کون کر رہا ہے ایڈم؟ مجھے وان فاتح کی فکر ہے۔“

ایڈم نے خفگی سے ابرو کٹھے کیے۔ ”یعنی میرے اندر واقعی سیل ڈالتے ہیں؟“

”نہیں، ڈفر، کیونکہ تمہاری گردن پہ وقت کی مہر نہیں ہے۔ وان فاتح کی گردن پہ ہے۔ تمہاری طرف سے کوئی مشکوک نہیں ہوگا۔“

”ہیں؟“ ایڈم نے بے اختیار اپنی گردن کو چھوا۔ ”میری گردن پہ کیوں نہیں ہے مہر؟ میں نے بھی تو وقت کا دروازہ پار کیا تھا۔“

”کیونکہ مہر صرف چابی سے دروازہ کھولنے والے کی گردن پہ ہوتی ہے۔ یہ چابی ایک شخص کے لئے بنائی گئی تھی۔ شکار بازوں کو کیا معلوم

تھا کہ ہم تین لوگ اس سے چوکھٹ پار کر لیں گے۔“

(یعنی میں بس سپلی میں ساتھ آ گیا ہوں۔ ہونہ۔) منہ میں بڑبڑایا۔ مگر تالیہ نے نہیں سنا۔ وہ تھک کے جیسے سامنے والی مسہری پہ آ کے بیٹھی

اور چہرہ ہاتھوں میں گرا لیا۔ سنہری بال چہرے کے دائیں بائیں گرتے چلے گئے۔

”پہلے مسئلے کم تھے کیا جواب یہ نیا مسئلہ آ گیا ہے۔“ وہ خست کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے، آپ کی سلطان کو متاثر کرنے کی کوشش سے جنم لینے والا مسئلہ۔“ اس کی زبان پہ کھجلی ہوئی۔ تالیہ نے جھٹکے سے سر

اٹھایا اور برہمی سے اسے گھورا۔

”بنا سنو رٹا شہزادیوں کی مجبوری ہوتی ہے۔ اور میں سلطان کے پاس ’کام‘ کے لئے جاتی تھی۔ وہ باس ہیں اور میں ان کی ایڈوائزر۔

ایسے میں ان کی طرف سے ذاتی ایڈوائسز ”براس منٹ“ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر میں ملائیشیا میں ہوتی تو ان کو sue کر دیتی۔“

ایڈم جواب میں ہنس پڑا۔ ”آپ اس وقت وہ این جی اوز والی Feminist آئی لگ رہی ہیں، چے تالیہ۔“

مگر وہ جواب میں نہیں ہنسی۔ سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی تو ایڈم کو چہرے پہ سنجیدگی لانی پڑی۔

”یعنی تم بھی عام مردوں کی طرح ہو؟ Victim-Shaming کرنے والے؟ (مظلوم کو الزام دینے والے)؟ سنو ایڈم... اپنا رویہ

تبدیل کرو۔ اگر آفس میں عورت براس ہوتی ہے تو یہ مت کہا کرو کہ وہ باس کے ساتھ بات کیوں کر رہی تھی۔ سڑک پہ براس ہوتی ہے تو یہ

مت کہا کرو کہ وہ باہر کیوں نکلی۔ قتل ہونے والے Victim کے بارے میں تو کوئی نہیں کہتا کہ وہ قاتل کے پاس گیا ہی کیوں کہ قتل ہو گیا؟

مگر براس منٹ کا شکار ہونے والی عورت کے بارے میں ہمیشہ تم لوگ پہلے وکٹم کو الزام دیتے ہو۔“

”سلطان مرسل کا غصہ مجھ پہ کیوں نکال رہی ہیں آپ؟“

”مجھے سلطان پہ غصہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے ”باس“ پہ غصہ ہے۔ ایک باس ہو کے انہیں اپنی ایمپلائوں کو یوں براس نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ پھر

اس کی شکل دیکھ کے وہ ذرا حیران ہوئی۔ ”مگر نہیں... تم جانتے ہی نہیں ہو کہ براس منٹ کیا ہوتی ہے۔“

”آ... آ...“ ایڈم نے ادھر ادھر دیکھا، پھر سر کھجایا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ کسی کو تنگ کرنا، دست درازی وغیرہ وغیرہ۔ مگر خیر اب اتنا کوئی ظلم بھی

نہیں ہوا آپ کے ساتھ، چے تالیہ۔ ایک رشتہ ہی تو بھیجا ہے آقائے۔“

”آقائے یرشتہ ”دربار“ میں بھیجا ہے۔ دربار ایک ”آفس“ ہے اور میں آقا کی ایڈوائزر ہوں۔ وہ ہماری ورک پلیس تھی ایڈم۔ ورک پلیس پہ کام سے ہٹ کے ذاتی تعلق کا صرف اشارہ دینا بھی براس منٹ شمار ہوتا ہے اور اس نے تو اتنی بڑی بات کہہ دی۔“

”اگر آپ کا باس سلطان مرسل جیسا نکما آدی نہ ہوتا تو آپ تب بھی برامانتیں؟“

”ماننا چاہیے کیونکہ کام کی جگہ پہ تعلقات قائم کرنے والے لوگ ہر مہذب معاشرے میں برے سمجھے جاتے ہیں۔ اب تم ٹھہرے بھگوڑے فوجی، تم کہاں گھومے پھرے ہو گے مغربی ممالک میں... اس لیے تمہارے علم میں اضافہ کرتی چلوں (ایڈم نے دانت کچکچائے) یہ مغربی ممالک جن کو تم لوگ برائی کا گڑھ سمجھتے ہو، وہاں بھی کام کی جگہ پہ تعلقات قائم کرنا بہت برا سمجھا جاتا ہے اور براس منٹ کے قوانین وہاں بہت سخت ہوتے ہیں۔“

”میرے جاب لیس ہونے پہ چوٹ کرنے کا شکریہ۔ ذرا میرے علم میں مزید اضافہ کریں۔ گوروں کو اس سب سے کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے کون سا اللہ کو منہ دکھانا ہوتا ہے؟“

”کیونکہ ایسے تعلقات کبھی بھی برابری کی بنیاد پہ نہیں ہوتے۔ ان سے کام متاثر ہوتا ہے۔ باس سیکرٹری سے، ٹیچر اسٹوڈنٹ سے، ڈاکٹر مریض سے، فلم ڈائریکٹر کسی اداکارہ سے انصاف چلانا تو درکنار اسے اگر غلط ٹیکسٹ بھی بھیجتا ہے تو یہ جرم ہے۔ پوچھو کیوں؟“

”وہ اس لئے عقل مند، کیونکہ ایسے تعلقات میں ایک فریق کمزور ہوتا ہے اور دوسرے پہ انحصار کرتا ہے اپنی جاب یا گریڈز کے لئے... جیسے سیکرٹری یا اسٹوڈنٹ... اس کا پلڑہ نیچے ہوتا ہے۔“ (ہاتھ سے نیچے کا اشارہ کیا) ”اور دوسرا فریق پوزیشن آف پاور پہ ہوتا ہے۔ جیسے استاد یا باس۔ (اوپر ہاتھ کر کے اشارہ کیا) اس لئے یہ تعلق Predatory تعلق بن جاتا ہے۔ طاقتور کمزور کو ناجائز باتوں کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ اسی لئے مغربی ممالک میں بھی ایسے تعلقات برے سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے اتنے روپ دھار کے اتنی نوکریاں کی ہیں ایڈم کہ تمہاری سوچ ہے، مگر ہر جگہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ لڑکیاں نوکری کرنے تو آ جاتی ہیں مگر ان کو کوئی یہ نہیں سمجھاتا کہ انہیں باس کی بات کا جواب مسکرا کے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن خیر... یہ نوکری کرنے والی بات تم کہاں سمجھ سکتے ہو۔“

”بالکل۔ میں کہاں سمجھ سکتا ہوں۔ میں ٹھہرا بھگوڑا فوجی۔ خیر آپ سلطان مرسل کو sue کرنے کے منصوبے بنائیں۔ میں چلتا ہوں۔ اور یہ بنگار الما یو کا اگلا باب لایا تھا اسے پڑھ کے کل دربار میں بھجوا دیجئے گا، مجھے یہ پڑھ کے سنانا ہوگا۔“ وہ گلابی غلاف میں لپٹے کاغذوں کو میز پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اور ہاں...“ ماتھے کو چھوا۔ ”وان فاتح نے کہا تھا کہ آپ... سلطان مرسل سے... دور رہیں!“

وہ بالکل ہتھم سی گئی۔ ”انہوں نے... یہ کہا؟“

”جی چے تالیہ۔ انہوں نے یہ کہا اور میں یہ کہتا ہوں کہ ایک دوسری دنیا میں... وہ آپ کے ساتھ برابری کی سطح پہ موجود نہیں ہیں۔“

آخری فقرہ نظریں جھکا کے ادا کیا اور باہر نکال گیا۔

وہ گم صم ہی بیٹھی رہی۔ اس کی بات سنی ہی نہیں۔ (فاتح نے ایسا کیوں کہا؟ کیا ان کو میری پرواہ ہے؟)
ایڈم باہر نکلا تو باہر دربان کے ہمراہ شریفہ کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگا جب وہ لپک کے اس کے پیچھے آئی۔
”سنو.... آدم!“ کمر پر ہاتھ باندھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

”سنو“ شریفہ بنت آدم!“

وہ ٹھٹکی۔ ”میرے بابا کا نام تو جابر ہے۔“

”یقیناً کوئی جابر ہی ہو گا جو تمہارا باپ ہو گا۔ میں تو آدم علیہ السلام کی بات کر رہا تھا جو ہم سب کے بابا ہیں۔“ پھر وہ ٹھہرا۔ ”تمہارا نام شریفہ بنت جابر ہے؟ تمہارا نام سنا سنا کیوں لگتا ہے مجھے؟“ غور کیا مگر یاد نہ آیا۔ شاید اس نام کی کوئی کلاس فیلو تھی اس کی کوئی۔ خیر۔ آگے بڑھ گیا۔ شریفہ نے ٹھک کے تیز رفتار کر کے اس سے ملنے کی کوشش کی۔

”اوہو۔ بات تو سنو۔“

”میں کانوں سے سنتا ہوں اور الحمد للہ میرے دونوں کان کھلے روشن اور ہوا دار ہیں۔“

”تمہاری کتاب کا پہلا باب سنا تھا میں نے اس دن دربار میں۔ شہزادی کی بہت تعریفیں لکھی تھیں تم نے۔“

”تم نہیں سمجھو گی بی بی!“ اس نے چلتے چلتے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔

”میں سمجھتی ہوں سب اچھی طرح اسی لئے تمہیں نصیحت کرنے رک گئی۔“

ایڈم کے قدم رکے۔ اس نے ٹھٹک کے گردن موڑی۔ ایروا کٹھے ہوئے۔ ”کیا مطلب؟“

شریفہ نے آنکھیں گھمائیں۔ ”ایسی تعریف مورخ بن کے لکھی تھی اسی لئے سلطان نے تمہیں انعام و اکرام سے نوازا، مگر ایسی تعریف آدم بن کے مت لکھنا۔ محل سے باہر پھینک دیے جاؤ گے۔“

وہ بالکل سن ہو گیا۔ دم سادھے۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔

وہ قریب آئی اور دھیرے سے بولی۔ ”محبت بھرے نام لکھنے کا تجربہ مجھے بھی ہے، آدم۔ مگر تم شہزادی کے برابر کے نہیں ہو۔ تم ایک مورخ ہو، ایک غلام، ایک قیدی۔ اور وہ شہزادی ہے۔ شہزادیاں محبت کے معاملے میں اپنے سے اوپر دیکھتی ہیں، نیچے نہیں۔ تمہارے لکھے الفاظ.... وہ صرف خوشامد کے نہیں تھے۔ وہ دل سے لکھے گئے تھے۔ اتنا دل سے نہ لکھا کرو۔ ورنہ مار دیے جاؤ گے۔“ وہ ہمدردی اور افسوس سے کہہ رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوئی تو وہ ہلکا سا ہنسا۔

”جن لوگوں کے پاس کرنے کے لئے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہیں الجھتے۔ جاؤ شریفہ خاتون، جا کر محل کے جالے صاف کرو اور اپنے دماغ کے بھی۔“ پھر ہنستے ہوئے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ پیر شیخ کے ہونہر کر کے رہ گئی۔

☆☆=====☆☆

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔

گویا کرنٹ کھا کے وہ سیدھی اٹھ بیٹھی۔

کمرہ اندھیر تھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے تھے اور مدھم چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ تالیہ نے کسی قسم کی روشنی نہیں جلائی۔ بس دم سادھے بیٹھی رہی۔

اس کا خواب خوفناک برگز نہ تھا۔ اس نے ایک آفس دیکھا تھا جس میں وہ آگے چلتی جاتی ہے اور ایک لڑکی کاٹرمنیشن لیئر اس کے منہ پہ مار کے آتی ہے۔ عام سا خواب تھا وہ... مگر... وہ نئے زمانے کا خواب تھا۔ آفس، کمپیوٹرز، اکیسویں صدی کا ملاءِ یشاء... وہ دنگ بیٹھی تھی۔

پہلے اسے لگا کہ ایڈم سے آج آفس جاب کے بارے میں بات کرنے کا اثر تھا کہ ذہن نے اسے ماضی میں کی گئی کوئی آفس جاب خواب کی صورت دکھادی ہے۔ مگر نہیں۔

خواب میں اس کے سنہری بال... اور... ہاتھ کی سرخ انگوٹھی... وہ سب بتا رہا تھا کہ یہ منظر مستقبل کا تھا۔ یہ ابھی واقع ہونا تھا۔

اس کا مطلب تھا... وہ واپس جائے گی۔ وہ ایک دفعہ اپنی اصل دنیا میں واپس ضرور جائے گی۔

وہ دل پہ ہاتھ رکھے بے یقین سی بیٹھی تھی۔ دنگ، متحیر۔ پھر اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ دل خوشی سے بھرنے لگا۔

وہ واپس جائے گی۔ اسے وقت کی قید سے نجات مل جائے گی۔ بالآخر!

وہ انھی اور بال جوڑے میں لپیٹے۔ پھر دیا سلائی رگڑی تو شعلہ چمکا۔ اس نے چراغ روشن کیا اور پھر... ریشمی رومال میں اپنا دستہ اٹھالیا۔

اندر خوبصورت لکھائی میں تحریر کردہ کاغذ سلیقے سے رکھے تھے۔ تالیہ نے آنکھیں رگڑیں اور زرد روشنی میں انہیں پڑھنا شروع کیا۔

(دیکھوں تو سہی میرے بارے میں کیا کیا لکھا ہے اس نقلی فوجی نے۔ خدا کی قسم ایک بھی غلط لفظ ہوا تو...) مگر سوچیں منتشر ہو گئیں۔ پھر

جیسے جیسے پڑھتی گئی لب مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے۔

”قصے ہم تم کو کیا سنائیں

بند اہار کی بیٹی کی رحم دلی کے

اک دن جو سوار ہوا مورخ شاہی بگھی میں

اور شہزادی کے قافلے کے ساتھ جا ترا ملا کہ کے بازار میں...

تو دیکھتا ہے کہ وہ سادہ لباس میں چغہ پہنے چہرہ ڈھکے

پھر رہی ہے عام لوگوں کی طرح...

اک ایک کا حال پوچھتی....

غریبوں کے دروازوں پہ نشان لگاتی....

تا کہ شاہی سپاہی رات کو رکھ جائیں وہاں اثر فیوں کی تھیلیاں....

اور ایسے میں بندہ ہارا کی بیٹی کا چہرہ دیکھو تو وہ...

معصوم خوشی سے دک رہا ہوتا تھا... اور....

وہ پڑھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اس کی سخاوت کے ایک ڈیڑھ واقعے کو ایڈم نے بڑھا چڑھا دیا تھا۔ خیر سچ ہی تھا وہ۔

مسکرا کے اس نے ورق پلٹا۔

اگلے صفحے پہ لکھے الفاظ پڑھ کے اس کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوئی۔

☆☆=====☆☆

سن باؤ کی سرخ حویلی پہ فجر قضا ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ زمانہ جدید میں اس گھر کے باہر بازار تھا اور اس پاس مکانات۔ مگر اس قدیم دور میں اس کے سامنے سبزہ زار تھا اور طویل قطار میں درخت لگے تھے جن کے ساتھ چند گھوڑے بندھے تھے۔

فاتح صبح صبح گھوڑوں کے ساتھ مصروف کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ سرمئی کرتے پا جامے میں ملبوس بال استرے سے تازہ چھوٹے کر رکھے تھے اور چہرے پہ سنجیدگی طاری کیے وہ جھک کے ایک گھوڑے کی لگام کھول رہا تھا۔

”مارنگ واک پہ جارہے ہیں کیا؟“ آواز پہ لگام کھولتے اس کے ہاتھ تھمے۔ جھکے جھکے چہرہ موڑا تو دیکھا... سامنے ہشاش بشاش سائیڈم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”تم؟“ فاتح کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ لگام کھول کے سیدھا ہوا اور بازو سے سبزہ زار کی طرف اشارہ کیا، گویا اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔

”محل سے وقت بے وقت نکلنا آسان ہوتا ہے تمہارے لئے؟“

وہ دونوں اب درختوں کی قطار کے ساتھ چل رہے تھے۔ گھوڑے کی لگام فاتح نے تھام رکھی تھی۔ وہ وانگ لی کا محبوب گھوڑا تھا اور روز صبح اس کو چرانے لے کر جانا غلام کے فرائض میں شامل تھا۔

”شہزادی نے مجھے مورخ مقرر کیا ہے جناب!“ مورخ نے فرضی کالر جھاڑے۔ چھوٹے کرتے کے اوپر بنا آستین کے جیکٹ سی پہنے نیچے پا جامہ اور سر پہ ٹوپی جمائے ’وہ واقعی کوئی شاہی عہدیدار لگتا تھا۔“ اور مورخ کے اوپر کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا۔“

”وہ کیوں؟“

”کیونکہ مورخ رائٹر ہوتا ہے اور رائٹرز سے سب کو ڈرنا چاہیے۔ ان کو آپ اچھے لگیں گے تو آپ کا ذکر اپنی تحریر میں ایک بار کریں گے۔ برے لگیں گے تو بار بار کریں گے۔“

فاتح ہنس دیا۔ ”تم لکھنا انجوائے کر رہے ہو؟“

”بہت زیادہ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اندر اللہ نے لکھنے کے لئے اتنی تڑپ رکھی ہے۔ مجھے لکھ کے سکون ملتا ہے۔ جیسے میں خود اپنا کتھارسس کر رہا ہوں۔“ وہ گھاس پہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

”کس وقت لکھتے ہو؟“

”جس وقت سارے بڑے رائٹرز لکھتے ہیں۔“

”اور وہ وقت کب ہوتا ہے؟“

”جب موڈ اچھا ہو۔“ اس نے ہنس کے شانے اچکا دیے۔

وہ دونوں اب درختوں کے پار سبزہ زار پہ نکل آئے تھے۔ فاتح نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دی تو وہ سر جھکائے گھاس میں منہ مارتا آگے بڑھتا گیا۔

”اپنی شہزادی کو میرا پیغام دیا تھا؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا تو ایڈم نے گہری سانس لی۔

”بے فکر ہیں۔ وہ آقا سے دور ہی رہیں گی۔ وہ خود بھی اس بات سے خوش نہیں ہیں۔“

”اس لئے اس کو چاہیے کہ جلد از جلد وہ چابی تلاش کرے تاکہ ہم واپس جاسکیں۔“ وہ اس بات سے بہت ناخوش لگتا تھا۔

”راجہ مراد کو شک پڑ گیا ہے کہ کوئی چے تالیہ کے ساتھ آیا تھا۔ وہ آپ کی گردن کے نشان کی مدد سے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔“

چے تالیہ نے یہ غازہ بھیجا ہے (اس نے ایک پوٹلی سی لباس سے نکال کے فاتح کی طرف بڑھائی۔) آپ روز یہ تھوڑا سا غازہ (پاؤڈر)

پانی میں گھول کے اس نشان پہ لپ لیا کریں۔ وہ چھپ جائے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے پوٹلی الٹ پلٹ کر کے دیکھی اور جیب میں رکھ لی۔ پھر گردن موڑ کے گھوڑے کو دیکھنے لگا جو گھاس میں سر دیے کچھ

تلاش کر رہا تھا۔ گھوڑے پہ نظریں جمائے فاتح نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔ ”آج واٹنگ لی کے ساتھ مجھے سلطنت محل جانا ہے۔“

”معلوم ہے۔ واٹنگ لی نے آپ کا نام مہمانوں کی فہرست میں ڈالا ہے۔ دربار کی کارروائی کے بعد آج بنگارا یا ملا یوکانیا باب بھی پڑھ

کے سنایا جائے گا۔ اس میں آپ کا ذکر بھی ہے۔“

”مگر جو بنگارا یا ملا یوکانیا نے پڑھی تھی اس میں میرا ذکر نہیں تھا۔“

”کیونکہ آنے والی صدی میں پرتگالی جب ملا کہ پہ حملہ کریں گے تو محلات اور کتب خانے جلا ڈالیں گے۔ یقیناً انہوں نے ہی اس کتاب

کو جلا ڈالا ہوگا اور بعد میں یہ لوگوں کی یادداشتوں سے دوبارہ لکھی گئی ہوگی اس لیے غلطی سے آپ کی جگہ واٹنگ لی کا نام لکھا گیا ہوگا۔“

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ بس اس کے ساتھ گھاس پہ چلنے لگا۔

”اور تم ٹھیک ہو ایڈم؟ گزرا کیسا ہورہا ہے تمہارا محل میں؟“

ایڈم کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سر... اگر میں کسی انسان سے اس حد تک متاثر ہونے لگوں کہ مجھے اس کی بر بات اچھی لگے اور اس کا رعب ہر وقت میرے اوپر چھانے لگے... اور مجھے مسلسل اس کی توجہ حاصل کرنے کی خواہش ہونے لگے... تو آپ کے خیال میں میں کس جذبے کا شکار ہوں گا؟“

”low self esteem کا!“

وہ جو ”محبت“ کی طرح کے کسی جواب کی توقع کر رہا تھا، ایک دم بھونچا رہ گیا۔

”جی؟“

”میری کلاس میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب میں اسکول میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد محبت کرنے والا سمجھتی تھی۔ کوئی نیا ٹیچر ہوا یا نیا کلاس فیلو، لڑکی ہوا یا لڑکا، وہ اس سے فوراً دوستی کی خواہش کرنے لگ جاتی اور پھر اس نئے شخص کی توجہ پانے اور اسے خوش کرنے کے لیے ہر حد تک چلی جاتی تھی۔ آخر میں لوگ اس سے بے زار آ کے اسے چھوڑ جاتے تھے اور وہ کراہتی رہتی تھی کہ لوگوں نے اس کے محبت کرنے والے دل کے ساتھ کیا برا سلوک کیا۔ مگر وہ لڑکی محبت سے مغلوب نہیں تھی۔ وہ صرف ’سلیف اسٹیم‘ کا شکار تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارا اور تالیہ کا ایک ہی مسئلہ ہے۔“ وہ افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے آگے چلتا گیا اور گھوڑے کے قریب جا رکھا۔ ”تم دونوں Low self esteem کا شکار ہو۔“ گھوڑے کی لگام کھینچ کے اس کا منہ گھاس سے نکالا اور اسے زبردستی آگے لے جانے لگا۔

”اور یہ self esteem ہوتی کیا ہے؟ ہر کوئی اس کا ذکر بہت کرتا ہے... آج تک میں اس کا اصل معنی نہیں جان سکا۔“ ایڈم خفا خفا سا لگتا تھا۔

”سلیف اسٹیم... اپنی نظر میں اپنی عزت کو کہتے ہیں۔ خود کو کچھ سمجھنا۔ اپنی عزت کرنا۔ اپنی قدر کرنا۔ اپنے آپ کو پہچاننا۔ ذاتی وقار۔ جن لوگوں میں یہ زیادہ ہوتی ہے ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادھورے نہیں ہیں۔ ان کو ”اچھا“ لگنے کے لیے کسی دوسرے انسان یا چیز کو خود سے جوڑ لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ میں کافی ہیں۔“

گھوڑے کو وہ کھینچ کے زبردستی درختوں کی طرف لے جانے لگا۔ گھوڑا مزاحمت کرتے ہوئے گردن ادھرا دھرا مار رہا تھا۔

”اور مجھ میں اس کی کمی ہے؟“

”بالکل ہے۔ اور تالیہ میں بھی ہے۔ اور جو لوگ اپنی نظروں میں معزز نہیں ہوتے، وہ دراصل خود سے مطمئن نہیں ہوتے۔ انہیں لگتا ہے کہ لوگ ان کے ’اصل‘ کو قبول نہیں کریں گے۔ ایسے میں یا وہ تالیہ کی طرح بن جاتے ہیں... وہ مختلف روپ دھار کے لوگوں سے ’وہ بن کے‘ ملتے ہیں جو وہ ہوتے نہیں ہیں۔ بات بات پہ جھوٹ بولنا۔ کہانیاں گھڑنا۔ جانتے ہو وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ کیونکہ اس کو اپنے اصل ’سلیف‘ پر اعتماد نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ایسا بنا لیتی ہے جیسا روپ لوگوں کے نزدیک معزز ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں۔ ورنہ لوگوں کے

نزدیک کوئی پیانا نہ تھی نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنے اصل انداز میں رہنا چاہیے۔ دنیا خود بخود آپ کے مطابق ڈھل جائے گی۔ اور دوسری قسم کے لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں۔“ گھوڑے کو درخت کے قریب لے جا کر اس نے اس کا رخ جبراً پتوں کی طرف موڑا۔ پہلے تو گھوڑے نے مزاحمت کی پھر پتوں کو سونگھا تو ڈھیلا پڑا اور ذرا سا پتہ دانتوں میں توڑا۔

”تمہارے اندر چونکہ اپنی عزت نہیں تو ایک خلاء بن گیا ہے۔ تم اس خلاء کو بُر کرنے کے لئے تالیہ کی طرح اپنے اوپر ملمع نہیں چڑھاتے۔ تم بس خود کو ادھورا تسلیم کر لیتے ہو۔ نامکمل، مسخ شدہ۔ اور اس ادھورے پن کو دوسرے انسانوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہو۔ میری کلاس فیلو کی طرح تم بہت جلد لوگوں سے متاثر ہو جاتے ہو۔ تم نے صوفیہ رُحمن کو ووٹ دیا تھا۔ مجھے نہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے پاس ایک چیز تھی۔ سچائی اور ایمانداری۔ تمہیں اس خوبی نے کبھی اٹریکٹ نہیں کیا، کیونکہ وہ تمہارے پاس بھی ہے۔ تم سچے انسان ہو۔ مگر صوفیہ کے پاس سحرانگیز شخصیت اور مجمع کو اپنی تقریر سے مسحور کر دینے کا فن تھا۔ وہ تمہارے پاس نہیں تھا۔ وہ ایک اور کانفیڈینٹ خاتون ہے اور تم میں اعتماد کی شدید کمی ہے۔ اس لئے تم اس سے متاثر ہو گئے۔“

”یعنی میں ان لوگوں سے متاثر ہوتا ہوں جن کے پاس وہ ہوتا ہے جو مجھے پسند ہے مگر وہ میرے اپنے پاس نہیں ہے؟“ اسے یہ سب کہتے ہوئے برا نگ رہا تھا۔ اپنی ذات کا کسی دوسرے سے بے رحمی سے تجزیہ کروانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔

”بالکل۔ تم اب بھی اگر مسلسل کسی سے متاثر ہو رہے ہو تو تم اپنی کمی کو کسی دوسرے میں تلاش کر رہے ہو۔ تمہارے جیسے لوگوں کو لگتا ہے کہ دوسرے ان کو ان کے اصل حال میں قبول نہیں کریں گے اس لئے وہ خود کو کسی متاثر کن انسان یا چیزوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اپنے اصل سیلف سے زیادہ بڑا دکھنے کا ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے کہ وہ کسی طرح خود کو کسی بڑے انسان کے ساتھ نتھی کر لیں۔ تم صرف ایک بت تراش رہے ہو اور پروانے کی طرح اس کے گرد چکر کاٹ کے اپنی وقعت دنیا کی نظر میں بڑھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”تو اس بت کو کیسے توڑا جاتا ہے؟ کیسے میں انسانوں سے متاثر ہونے سے بچ سکتا ہوں؟“ وہ سخت اداس نظر آنے لگا تھا۔

”اپنے آپ کو پہنچانو۔ اپنے اندر کی خوبیوں کو نکھارو۔ کسی سے کوئی لالچ نہ رکھو۔ دوسرے لوگوں کی رائے سے بے نیاز ہو کے اپنا کام کرو۔ تمہاری عزت بڑھے گی۔ اور تم لوگوں سے خواہ مخواہ متاثر نہیں ہو گے، کیونکہ تم یہ جان جاؤ گے کہ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔“

گھوڑا اب سکون سے درخت کی ٹہنیوں سے چر رہا تھا اور فاتح اس کے سر پہ کھڑا تھا سا اس کو دیکھ رہا تھا۔ ایڈم اداس سا پیچھے کھڑا تھا۔

”تو میں صرف بت تراشتا ہوں اور ان کی پرستش کرتا ہوں پھر جب وہ لوگ مجھے چھوڑ جاتے ہیں تو میرا شیشے کا بت ٹوٹ جاتا ہے۔ اسکول میں مجھے ہر دوسرے نیچر سے محبت تھی۔ سیاستدانوں میں مجھے صوفیہ رُحمن اچھی لگتی تھی۔ رشتے داروں میں مجھے وہی خاندان کے بڑے پسند تھے جو سب سے زیادہ پراعتقاد اور بے نیاز تھے۔ اگر یہ سب میری خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے تھا تو محبت... محبت کیا ہوتی ہے سر؟“

قدیم ملا کہ کے اس سبزہ زار میں اس روشن صبح ایڈم نے ایک عام سا سوال پوچھا تھا۔

وان فاتح نے گردن موڑ کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ”محبت صرف فیری ٹیلو میں ہوتی ہے ایڈم۔ اس کو اصل زندگی میں نہیں ڈھونڈتے۔“ پھر اس نے گھوڑے کی گردن کو تھپکا تو وہ گھاس سے منہ ہٹا کے گردن ادھر ادھر گھمانے لگا۔ فاتح نے اس کی لگام تھام لی اور سامنے کوچل دیا۔ کہنیوں تک آستینیں موڑے ایک ہاتھ سے لگام تھامے دوسرے سے ماتھے پہ چھباناٹے وہ ابھرتے سورج کو دیکھتا اب آگے بڑھ رہا تھا۔ سبززار کے اس پار ندی تھی جہاں سے اس نے گھوڑے کو پانی پلاتا تھا۔

ایڈم خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بیجان ہی بیجان تھا۔

☆☆=====☆☆

سلطنت محل میں اپنی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں سلطان مخمیس صوفے پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انگوروں سے بھرا طشت سامنے رکھا تھا اور وہ کھڑکی سے باہر نظریں جمائے وقفے وقفے سے انگور منہ میں ڈالتا تھا۔ سنہری اور سبز زرتار پوشاک پہنے سر پہ ریشمی پگڑی نما ٹوپی جمائے جس کے اوپر قیمتی ہیرے اور زمرہ جڑے تھے وہ گہری سوچ میں گم لگتا تھا جب دروازے دستک کے بعد کھلا۔ مرسل نے چونک کے چوکھٹ کو دیکھا۔ مراد راجہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

”صبح بخیر آقا۔“ مراد آگے آیا اور ہاتھ باندھے جھک کے سلام کیا۔

مرسل نے دو انگلیوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ قدم قدم چلتا اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

”آقا کی طبیعت ٹھیک ہے؟ دربار میں آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا خود حاضر ہو کے خیریت معلوم کر لوں۔“ انداز میں تشویش تھی مگر آنکھیں چھوٹی کر کے وہ غور سے مرسل شاہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”ہاں ہاں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔“ اس نے دو انگلیوں سے کینٹی مسلی پھر مراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مراحتا نظروں سے اسے دیکھتا سامنے بیٹھا۔

”کہیے آقا۔ غلام کس طرح آپ کی پریشانی دور کر سکتا ہے؟“

”تم ہمارے بندہ ہارا (وزیر اعظم) ہو، مراد۔ اور ملا کہ سلطنت کا بندہ ہارا سلاطین کی شادیوں اور ان کے بچوں کی پیدائش کے انتظامات کا نگہبان ہوتا ہے۔“

”میں اپنے فرض سے بخوبی واقف ہوں آقا۔ آپ کی اور ملکہ یان سوفو کی شادی میری نگرانی میں ہوئی تھی اور میں نے کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”میں تم سے بہت خوش ہوں اور اب...“ مرسل نے تھوڑی کھجالتے ہوئے شانے جھٹکے۔ ”اب میں شہزادی تاشہ کو اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہوں لیکن ملکہ اس بات پہ بہت جزع و فزع کریں گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم بذات خود اس تقریب کا انتظام کرو اور ملکہ کے کسی بھی ممکنہ رد عمل سے نمٹنے کی حکمت عملی تیار کرو۔ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔“ وہ عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اگر فکر تھی تو صرف ملکہ کے

رؤ عمل کی۔

مراد بالکل پاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

”آقا، آپ شہزادی کو صرف خاتون کا درجہ دینا چاہتے ہیں یا ان سے نکاح بھی کرنا چاہتے ہیں۔“

”میں پہلے صرف شہزادی کو خاتون بنانا چاہتا تھا لیکن اب میرا ارادہ بدل چکا ہے۔ میں ان کو ملکہ کا مقام دینا چاہتا ہوں۔ تم تیاری کر لو۔“

سادہ سے انداز میں حکم جاری کیا اور پوشاک جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا۔ پاٹ چہرہ لئے مراد بھی فوراً سے کھڑا ہوا۔

”جو حکم، آقا۔“

مرسل نے محض سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گیا۔ مراد بے تاثر چہرے کے ساتھ پیچھے کو لپکا۔

باہر دروازے سے کان لگائے کھڑی کینز فوراً اوٹ میں ہو گئی۔ دربان خاموشی سے اس کو دیکھتے رہے مگر کوئی روک ٹوک نہ کی۔ مرسل شاہ

اور راجہ مراد آگے بڑھ گئے، تو کینز اوٹ سے نکلی اور دوسری راہداری میں بھاگی۔ اس کا رخ ملکہ یاں سو فو کے حرم کی طرف تھا۔

دربار میں تقریباً تمام افراد اب بیٹھ چکے تھے اور مسلسل سلطان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ دربار کے بند دروازوں کے باہر برآمدہ بنا تھا جس

سے چوڑی طویل میڑھیاں نیچے محل کے صحن میں اترتی تھیں۔ میڑھیوں کے دہانے پہ کینزوں اور خادموں کی معیت میں تالیہ کھڑی تھی۔

سر پہ تاج سجائے پیروں تک آتا سرخ کمدار لباس پہنے، وہ مسکرا کے نیچے دیکھ رہی تھی جہاں سے وانگ لی اوپر چڑھتا آتا دکھائی دے رہا

تھا۔ پیچھے دو غلام بھی تھے۔ ایک تو خوشگوار انداز میں نظریں اطراف میں گھما رہا تھا اور دوسرا... دوسرا غلام پر سکون چہرے اور پراعتماد چال

کے ساتھ وانگ لی کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہاتھ بندھے تھے مگر گردن اور نگاہیں دونوں اٹھی ہوئی تھیں۔

تالیہ اس کو نظر انداز کیے وانگ لی پہ نظریں جمائے کھڑی مسکراتی رہی۔ وہ اوپر آیا اور ہاتھ جوڑ کے سلام کیا۔ ”صبح بخیر، شہزادی!“

”اچھا لگا آپ سے ملاقات کر کے، سن باؤ۔ میرا بہت جی چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کا۔“

وانگ لی کا چھو لے گالوں والا چینی چہرہ کھل اٹھا۔ ادب سے دوبارہ جھک کے سیدھا ہوا۔ ”آپ کا جب جی چاہے، آپ بلوالیا کریں، مجھے

شہزادی۔ غلام کو شہزادی کی خدمت کر کے خوشی ہوگی...“

”بلواتی کیوں، سن باؤ؟ مجھے تو آپ سے ملنے سے زیادہ آپ کا گھر دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ بہت قصے سن رکھے ہیں اس سرخ لکڑی

والے گھر کے۔“

وہ وانگ لی کو دیکھ کے سادگی سے کہہ رہی تھی اور پیچھے کھڑے وان فاتح کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔ وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

”میرے غریب خانے کے قصے کہاں سن لئے آپ نے؟“ وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

”آپ سے پہلے جو اس گھر کا مالک تھا، وہ اس کی تعریف میں رطب السان رہتا تھا۔“ ایک نظر فاتح پہ ڈالی۔

”ہاں، وہ میرا ایک جرنیل تھا، چند سال پہلے اسی نے یہ گھر بنوا کے دیا تھا مجھے، مگر وہ اس میں زیادہ عرصہ رہا نہیں۔“

”مگر یہ گھر اس کو بہت عزیز تھا، سن باؤ۔ اس کو اس میں ایک بھی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ یا شاید وہ مغرور تھا کافی۔ جو پسند آ گیا اس کی خامیاں نہیں دکھتی تھیں اور جو پسند نہیں آیا اس کی خوبیاں بھول جاتا تھا۔“ وہ اب بھی وانگ لی کو ہی دیکھ رہی تھی۔ فاتح نے بے اختیار ابرو اٹھائے۔ (سیر نیسلے) مگر وہ اس طرف متوجہ نہ تھی۔

”وہ احمق تھا۔“ وانگ لی بے اختیار ہنس دیا۔ پھر جھک کے سلام کیا اور اجازت لے کر دربار کی طرف چلا گیا۔ تالیہ مڑی تو دیکھا، عقب سے ملکہ یاں سوفو چلی آ رہی ہے۔ اس کے پیچھے کنیزوں اور خادموں کا غول بھی تھا۔ ملکہ اس کے قریب رکی تو تالیہ نے جھک کے سلام کیا۔ ”ملکہ!“

”میں نے اس مسئلے کا ایک حل ڈھونڈ لیا ہے۔“ اس کا چہرہ خوشی سے تہمتار ہا تھا۔ ”کون سا مسئلہ، ملکہ؟“ پھر اسے یاد آیا۔ ”قومی خزانہ مسلسل کم ہونے والا مسئلہ؟“ اسے آخری ملاقات میں زیر بحث آیا مسئلہ یاد آیا۔ ”اس مسئلے کا حل تو واقعی ضروری ہے، ملکہ۔ اخراجات بڑھتے ہی جارہے ہیں اور (آواز دھیمی کی) ابوالخیر اور مراد لہجہ کی مسلسل محصول (ٹیکس) کے پیسوں سے چوری کے باعث خزانہ کم ہوتا جا رہا ہے۔“

”مگر اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے میں نے۔“ مسکرا کے کہتی ملکہ آگے بڑھ گئی۔ تالیہ نے بس مسکرا کے سر کو خم دیا البتہ سوچتی نظروں سے گردن موڑے ملکہ کو دیکھنے لگی۔ (کیسا حل؟)

دفعۃً ایک کنیز دور سے بھاگتی آتی دکھائی دی۔ دربار کے دروازے پہ ابھی ملکہ پہنچی ہی تھی کہ کنیز نے اسے روکا اور کان میں کچھ کہا۔ تالیہ یہاں سے ملکہ کا نیم رخ دیکھ سکتی تھی۔

کنیز کی سرگوشی سن کے یاں سوفو کے گال گلابی پڑے اور اس نے منھیاں بھینچ لیں۔ آنکھیں زور سے میچیں۔ چند لمحے ضبط کی اس کیفیت میں کھڑی رہی پھر آنکھیں کھولیں اور برداشت سے مسکرائی، ایک گہری نظر پلٹ کے تالیہ پہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

کچھ عجیب تھا اس کے انداز میں۔ ”آخر ہمارا قومی خزانہ جا کہاں رہا ہے ابوالخیر؟“

دربار سجا تھا اور تمام درباری اور وزراء اپنی کرسیوں پہ خاموش بیٹھے تھے۔ تخت پہ سلطان مرسل براجمان تھا، سامنے پھلوں کی نوکری رکھی تھی جس سے وہ ربوتان پھل اٹھا کے اسے دانتوں سے کاٹتا، منہ میں چباتا وہ تنک کے پوچھ رہا تھا۔

اس کے ساتھ جی سنوری، خاموش سی ملکہ بیٹھی تھی۔ نظریں نیچے درباریوں کی قطار میں ایک کرسی پہ بیٹھی تالیہ پہ جمی تھیں۔ تالیہ اس طرف متوجہ نہ تھی۔ کبھی وہ سلطان کو دیکھتی جو ناخوش لگ رہا تھا اور کبھی نظریں پھیر کے ستونوں کے پیچھے قطار میں کھڑے غلاموں میں سے اس ایک غلام کو دیکھتی جو خاموشی سے دربار کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ چونکہ وہ وانگ لی کا خاص غلام تھا اس لیے اسے اپنے

مالک کے پیچھے کھڑے رہنے کی اجازت تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں تو تالیہ نے نظریں پھیر لیں۔

”آقا...“ ابوالخیر اپنی جگہ سے اٹھا اور ادب سے کہنے لگا۔ ”پچھلے سلطان کے وزیر خاصے بدعنوان تھے۔ خزانے میں سے محصول کے پیسے چرا لیتے تھے۔ مگر ہم نے ہر طرح کی چوری چکاری کی روک تھام کر لی ہے۔ فی الحال قومی خزانے سے پورے ملک میں ترقیاتی کام ہو رہے ہیں۔ پل بنائے جا رہے ہیں، مسافروں کے ٹھہرنے کو سرائے تعمیر کی جا رہی ہیں اور فوج کو جدید اسلحے سے لیس کیا جا رہا ہے۔ اخراجات بڑھ گئے ہیں۔“

”حل... مجھے حل بتاؤ۔ اس کا کیا حل ہے؟“ مرسل بے زار ہوا۔

”آقا پچھلے سلطان کے وزراء جو دولت لوٹ کے چلے گئے تھے وہ تو واپس نہیں لائی جاسکتی، مگر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ تاجروں اور دکانداروں پہ جو محصول لگایا جاتا ہے اس کو دو گنا کر دیا جائے۔ چند دن میں دو گنا محصول ملنے سے خزانہ دو گنا ہو جائے گا۔“ تالیہ نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا اور کھٹکھاری۔ سلطان سمیت بہت سی گردنیں اس کی طرف کھوئیں۔

”کیسے شہزادی تاشہ آپ کے پاس کوئی بہتر نکتہ ہے؟“ سلطان نے دلچسپی سے سوال کیا۔ وہ کھڑی ہوئی اور ادب سے کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں آقا کہ ہماری سلطنت میں مہنگائی بڑھ گئی ہے اور آپ کے شاہی خزانے میں موجود دولت کم ہو رہی ہے...“

(عرصہ پہلے وہ کے ایل میں حالم کے جنگلے کے لاؤنج میں صوفے پہ بیٹھی تھی۔ ہاتھوں میں دیے کا پیلا تھا اور چیچ بھر بھر کے منہ میں رکھتی وہ ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی جہاں دو خوبصورت صوفے آمنے سامنے رکھے تھے اور ایک پہ اینکر بیٹھا سوال پوچھ رہا تھا۔ ”آپ کے خیال میں ملائیشیا میں بڑھتی مہنگائی اور قومی خزانے میں خسارے کا کیا حل ہے، فاتح صاحب؟“

سامنے صوفے پہ بیٹھا سوٹ میں ملبوس سیاستدان ہلکا سا مسکرایا اور نرمی سے کہنے لگا۔

”پہلے یہ سوچو کہ قومی خزانے میں خسارہ ہے ہی کیوں، موبد؟“

دربار میں کھڑی تالیہ کہہ رہی تھی۔ ”مگر ہمیں شاہی خزانے میں دولت کی کمی کی وجہ ڈھونڈنی ہوگی، آقا۔“

(”موبد... ملائیشیا کے خزانے کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ سیاستدانوں نے کرپشن کر کے ملک کا پیسہ مٹی لائڈ رنگ کے ذریعے باہر بھیج دیا ہے اور

وہاں برکے بینکوں میں پڑا ہے۔“)

”آقا اس دولت کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ ملاکہ سلطنت کو چلانے والوں میں سے کچھ لوگوں نے خزانے میں سے مال لوٹ لوٹ کے کہیں دور چھپا رکھا ہے اس لیے ملاکہ میں مہنگائی بڑھ گئی ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی اور سب اسے سن رہے تھے۔ مراد کے چہرے پہ ناپسندیدگی پھیلی تھی۔

(موبد... ملائیشیا کے اربوں ڈالرز باہر کے بینکوں میں پڑے ہیں جو ہمیں واپس لانے ہوں گے...) ”سوٹ میں ملبوس سیاستدان اینکر کو بتا

رہا تھا....)

”آقا، پہلے تو ہمیں یہ سارا لوٹا گیا خزانہ واپس لانا ہوگا۔ راجہ مراد کو تحقیق کرنی چاہیے کہ پچھلی حکومتوں کے وزراء نے لوٹ کے مال کہاں چھپایا ہوگا۔ مگر یہ تو بعد کی بات ہے... فوری اور موثر حل اس کا یہ ہے کہ...“

(”اور جب تک باہر کے بینکوں سے ہمارا پیسا واپس نہیں آتا...“ سیاستدان نے رک کے کافی کاگ اٹھایا اور کھونت بھرا۔ ”ہمیں ایک سادہ کام کرنا ہوگا۔ ہمیں امیر لوگوں سے فیکس لینا ہوگا اور ہمیں براس امیر کو پکڑنا ہوگا جو فیکس نہیں دیتا۔“)

”فوری حل یہ ہے آقا کہ ہمیں ملا کہ سلطنت کے امراء اور رؤساء سے محصول وصول کرنا ہوگا۔ ایک غریب دو سکے محصول دیتا ہے... مگر امیر کی چونکہ دولت زیادہ ہے تو محصول بھی سینکڑوں سکوں کے برابر ہوگا۔ جب سلطنت کے سارے امیر محصول دیں گے تو خزانہ خود بخود بھر جائے گا۔ غریب سے دو کی جگہ چار سکے محصول وصول کرنے کے، کیوں نہ ہم امیر سے دس سکے محصول وصول کریں؟“

(”مگر موہد، ملایشاء میں ہوتا یہ ہے کہ حکمران رشوت لے کر امیروں کو فیکس پہ چھوٹ دے دیتے ہیں۔ چند ہزار کی رشوت دے کر امیر لاکھوں کا فیکس معاف کر دیتے ہیں۔ یوں خزانے میں کمی ہو جاتی ہے۔ خزانہ صرف ایک چیز سے بھرتا ہے اور وہ ہے فیکس!“)

”مگر آقا مسئلہ یہ ہے کہ ابوالخیر کو اس امر کو لازمی بنانا ہوگا کہ ان کے امراء اور رؤساء دوست جو محصول ادا نہیں کرتے، وہ محصول ادا کرنا شروع کر دیں۔ اگر آقا اپنی فوج کے چند دستے امیروں کے گھروں کی طرف روانہ کر دیں اور وہ تلواریں میان سے کھینچ نکالیں تو یقین کیجئے شام تک قومی خزانہ دس گنا بڑھ جائے گا۔۔۔ یہ میری ایک تجویز ہے آقا۔ اگر ابوالخیر مناسب سمجھیں تو اسے لاگو کریں۔“ اور پھر وہ بیٹھ گئی۔ ایک نظر دور کھڑے فاتح پہ ڈالی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ تالیہ نہیں مسکرائی، بس نظریں موڑ لیں کیونکہ سب اسی کو دیکھ رہے تھے۔

مراد سپاٹ سا بیٹھا ہوا البتہ ابوالخیر کے چہرے پہ شدید کڑھن در آئی تھی۔

سلطان مرسل نے تھوڑی کھجالتے ہوئے سوچا۔ ”ویسے یہ تجویز کافی مناسب ہے۔“

”مگر یہ ممکن نہیں ہے آقا۔“ ابوالخیر تند ہی سے بولتے ہوئے جگہ سے اٹھا۔ ”امراء اور رؤساء کی ہمیں ضرورت ہے اس حکومت کو چلانے کے لئے۔ ان سے زیر دستی محصول وصول کریں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ اگر سابق سلطان کے مفروضہ بیٹوں نے بغاوت کر دی تو یہ رؤساء ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔ خزانہ بڑھانے کا ایک ہی حل ہے کہ عوام پہ محصول بڑھا دیا جائے۔ آخر یہ محصول انہی عوام کے اوپر خرچ کیا جاتا ہے۔“

تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑ گئے، مگر خاموش رہی۔

(وہ ابھی تک لاؤنچ میں بیٹھی ولیہ کھارہی تھی اور اسکرین پہ نظر آتا سیاستدان، منکر کو بتا رہا تھا۔

”مگر ہوتا یہ ہے موہد کہ حکومت امیروں سے فیکس نہیں لیتی۔ امیر لوگ ان وزیروں کے دوست ہوتے ہیں اس لئے بچ جاتے ہیں۔ حکومت قومی خزانے کو بڑھانے کے لئے عوام پہ دگنے فیکس لگا دیتی ہے۔ موبائل فون کے کارڈ پہ کتنا فیکس لگ جاتا ہے آپ سب

جانتے ہیں۔ مگر قیمتی گاڑیوں پہ ٹیکس کیوں نہیں بڑھایا جاتا؟ آپ سمجھ سکتے ہیں!“

”آقا... میرے پاس ایک بہتر حل ہے۔“ ملکہ نے مسکرا کے بات کا آغاز کیا تو سب نے چونک کے اسے دیکھا۔

”کہیے یان سو فو۔“ مرسل شاہ فوراً متوجہ ہوا۔ ساتھ بیٹھی ملکہ اب گردن موڑے اس کو دیکھتے نرمی سے کہنے لگی۔

”آقا ہمیں فی الحال ہزاروں من سونا چاہیے تاکہ اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ اس سارے مسئلے کا فوری حل صرف عوام کے محصول

سے نہیں نکلے گا۔ اس کا اصل حل وانگ لی لائے ہیں۔“ ملکہ نے کرسیوں کی قطار میں بیٹھے وانگ لی کو اشارہ کیا۔ وہ کھڑا ہوا اور سامنے آیا۔

پھر ہاتھ باندھ کے جھکا اور روایتی کلمات کہے۔

تالیہ اچنبھے سے اسے دیکھتی آگے ہوئی۔ پیشانی کے بل گہرے ہو گئے تھے۔

”آقا آپ کا ملک اس وقت غربت کا شکار ہو رہا ہے اور اس کا ایک ہی حل ہے۔ وہ یہ کہ شاہ چین سے مدد لی جائے۔“

تالیہ مراد کا سانس تھم گیا۔

(مگر... موبد...“ سیاستدان گہری سانس لے کر فسوس سے کہنے لگا۔ ”ہماری کرپٹ حکومتیں ایسے حالات میں جانتے ہو کیا کرتی ہیں؟

وہ امیر ملکوں سے مدد لے لیتی ہیں۔“)

”آقا... شاہ چین ملا کہ کے حالات سے واقف ہیں اور انہوں نے آپ کے لئے ایک پیغام بھیجا ہے۔“ قدیم ملا کہ کے دربار میں

کھڑا وانگ لی کہہ رہا تھا۔ مرسل ذرا آگے کو ہوا۔ پھل واپس رکھ دیا۔ وہ سنجیدہ اور متوجہ تھا۔

سب وانگ لی کو دیکھ رہے تھے۔

(”امیر ملک اور ورلڈ بینک غریب ملکوں میں ایک Economic hitman بھیجتے ہیں۔ جانتے ہو وہ کیا ہوتا ہے؟“ سیاستدان

نے رک کے سوال کیا تو اسکر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”جی سر“ میں نے Confessions of an Economic hitman پڑھ رکھی ہے مگر آپ ہمارے ناظرین کے لئے

وضاحت کر دیں۔“ ہمنکر متانت سے بولا تو ولیہ کھاتی تالیہ آگے کو ہوئی اور غور سے سننے لگی۔

”یہ ایک پیغام ہر سال ہوتا ہے جو غریب ملک میں کی حکومت کو کہتا ہے کہ وہ ان کے امیر ملک سے قرضہ لے لیں۔“

فرہی مائل چینی کہہ رہا تھا۔ ”اگلے ایک ماہ میں شاہ چین اتنا سونا بھجوا دیں گے جو آپ کے ملک کا نظام سال بھر تک چلانے کے لئے کافی

ہوگا۔ اور یہ رقم آپ کو قسطوں کی صورت اگلے دس سال تک ادا کرنی ہوگی۔ ادائیگی کا کوئی بوجھ نہیں ہوگا آپ پر۔ آپ عوام پر ذرا سا محصول

بڑھا دیں، اور محصول کا وہ بڑھا ہوا حصہ ہر سال اکٹھا کر کے قرض اتارنے کے لئے استعمال کریں۔ چونکہ شاہ چین مسلمان نہیں ہیں تو یہ قرض

سود پر دیا جائے گا۔“

”دس سال... واہ یہ تو کافی لمبی مدت ہے۔“ سلطان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”اس میں تو با آسانی قرض اتارا جاسکتا ہے۔“

(یہ اکنامک ہٹ مین اس غریب ملک کو بھاری سود پر قرضہ دلوادیتا ہے۔ کرپٹ حکمرانوں نے کون سا اپنی جیب سے قرضہ واپس کرنا ہوتا ہے وہ اس کا ٹریکٹ کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔)

”تم کیا کہتے ہو ابو الخیر؟“ مرسل نے پر جوش انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”آقا میرے نزدیک یہ....“ ابو الخیر نے توقف کیا۔ ملکہ کی بے چین نظریں اس پہ جمی تھیں۔ ”... یہ ایک بہترین حل ہے۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا تو بیان سو فونے مسکرا کے گہری سانس خارج کی۔ ”ہمارے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے اور ہم ترقی کر سکیں گے۔“

”مگر آقا....“ تالیہ مضطرب سی کھڑی ہوئی۔ ”ہم اتنا بھاری قرضہ کیسے اتاریں گے؟ ہماری نسلیں مقروض ہو جائیں گی۔“

”شہزادی تاشہ!“ مراد اپنی جگہ سے اٹھا اور سنگین سرد آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”قرضہ اتارنا مردوں کا کام ہے اور ملاکہ کے مرد یہ کام سر

انجام دے دیں گے۔“

”راجہ ٹھیک کہہ رہا ہے شہزادی۔“ مرسل خوشگوار انداز میں کہتا ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ ”ویسے بھی دس سال ایک طوی ی ی ل (طویل کولمبا کر کے) عرصہ ہے۔ تب کی تب دیکھی جائے گی۔ فی الحال ہمیں اس قرض کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔“ پھر چہرہ سامنے کھڑے سن باؤ کی طرف موڑا۔ ”شاہ چین کو ہمارا شکریہ ادا کیجئے۔ ہمیں یہ معاہدہ منظور ہے۔“

(”مگر یہ کاٹریکٹ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔“ سیاستدان اترویدو دیتے رکا اور جھک کے کافی کا لگ اٹھایا۔ ایک کھونت بھر کے اسے نیچے کیا اور انکر کی طرف دیکھ کے بولا۔ ”ورلڈ بینک یا امیر ملک یہ قرضہ ایک خاص شرط پہ دیتے ہیں۔“)

”آقا۔“ وانگ لی کھنکھارا۔ ”شاہ چین کی ایک شرط بھی ہے۔“

دوبار میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

”اور وہ کیا؟“ مرسل کا پھل اٹھاتا ہاتھ تھا۔ تالیہ نے سامنے کرسیوں کے پیچھے کھڑے فاتح کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں افسوس تھا۔

(”امیر ممالک مثلاً امریکہ.....“ سیاستدان نے دوبارہ کافی کا کھونت بھر اور توقف سے بولا۔ ”اس شرط پہ قرضہ دیتے ہیں کہ یہ قرضہ وہ غریب ملک کی حکومت کو نہیں دیں گے بلکہ یہ رقم وہ اس ملک میں موجود اپنے ہی اداروں کو دیں گے۔ اور اس ادارے کا سربراہ وہی اکنامک ہٹ مین ہوتا ہے جو اس قرض کی پیشکش کو لے کر آیا تھا۔“)

”یعنی سر... ناظرین کی آسانی کے لیے... یہ قرضہ امیر ملک اپنے ہٹ مین کو ہی دیتا ہے جو اسے ملک کی ترقی کے لیے استعمال کرتا ہے۔“

”آقا.... شاہ چین کو آپ پہ اعتماد ہے مگر ماضی میں ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ ان کو آپ کے عہدیداروں پہ اعتماد نہیں ہے۔ آپ کا خزانہ پہلے ہی چوری ہوتا جا رہا ہے۔ بدعنوانی عروج پہ ہے۔ اس لئے....“ وانگ لی ادب سے کہہ رہا تھا۔ ”شاہ چین یہ رقم بلا واسطہ آپ کے

خزانے میں بھجوانے کی بجائے.... مجھے اور میرے چینی عہدیداروں کو بھجوائیں گے۔ اور ہم اس رقم سے آپ کے ملک میں ترقیاتی کام کریں گے تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ پیسہ درست جگہ پہ خرچ کیا جا رہا ہے یا نہیں۔“

”نمیر ملک بہانہ تو یہ بناتا ہے کہ وہ یہ رقم اپنے اداروں کو اس لئے دے گا تاکہ کرپشن وغیرہ کی نگرانی کی جاسکے مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ عوام کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایسے بھاری قرضے اگر دس بلین ڈالر کے ہیں تو امریکہ واقعی دس بلین اپنے ہٹ مین کو عطا کر دیتا ہے۔ مگر ہٹ مین ان میں سے ایک بلین اس غریب ملک پہ خرچ کرتا ہے۔ تعلیم، صحت، انصاف کو نظر انداز کر کے سڑکیں اور پل بناتا ہے۔ پارک بناتا ہے۔ یعنی وہ ترقی کروانا ہے جو نظر آئے۔“

”اور باقی نو بلین سر؟“ ہنکر نے متانت سے پوچھا۔

”باقی نو بلین وہ ہٹ مین خاموشی سے اپنے ملک کو واپس بھیج دیتا ہے۔ کانڈوں میں اس ملک پہ دس بلین قرضہ چڑھا رہا ہے اور وہ ملک برسوں قرضہ ادا کرتا رہتا ہے۔ سود کبھی ختم نہیں ہوتا اور تسلیں مقرض ہو جاتی ہیں۔ لیکن اصل میں وہ قرضہ کبھی اس ملک کو ملا ہی نہیں تھا۔“

سلطان مرسل نے قدرے اچنبھے سے بند اہار کو دیکھا۔ ”اس شرط کو میں کیا سمجھوں، مراد؟ کوئی مجھے بتائے کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ کیا یہ ہمارے حق میں اچھی ہے؟“

تمام درباریوں کی نظریں مراد کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ خاموشی سے اٹھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ مرسل سے فیصلہ کروانے والے تھے۔ تالیہ نے منت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”ملا کہ کی تسلیوں کو مقرض مت کر دے!“

مراد راجہ نے ایک گہری نظر تمام افراد پہ ڈالی۔

”سوال یہ ہے سر!“ اسکرین پہ نظر آتے ہنکر نے نکتہ اٹھایا۔ ”غریب ملک کی حکومتوں میں کتنے ہی ذہین اور شاطر وزراء ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض ملک کا سربراہ مان لیا کہ بے وقوف ہے اور ایسی شرطیں قبول کر لیتا ہے تو اس کی حکومت کے سمجھدار لوگ اس کو منع کیوں نہیں کرتے؟“

”وہ اس کو منع کر ہی نہیں سکتے، موہد۔ کیونکہ وہ بھانپ لیتے ہیں کہ یہ غیر ملکی جو شرائط لے کر آیا ہے، یہ دراصل ایک اکتانک ہٹ مین ہے اور جب ہٹ مین کی بات نہ مانی جائے اور حکومت اس کے خلاف اڑ جائے تو وہ ملک میں انتشار پھیلاتا ہے بد امنی کراتا ہے اور حکومت گرا کے نیا سربراہ لاتا ہے۔ پھر نئے سربراہ سے وہ معاملہ سائن کروالیتا ہے۔ کرپٹ وزیر کیسے سربراہ کو منع کریں؟ منع کرنے کی صورت میں ان کو امیر ملک سے اپنی حکومت ختم کروا دینے کا خوف ہوتا ہے۔ لیکن قرض حاصل کر لینے میں ان کا کیا جارہا ہے؟“

”آقا...“ مراد نے بات کا آغاز کیا۔ سب دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے۔

”وانگ لی سے میرے ذاتی اختلافات ایک طرف... شاہ چین کی شرط انصاف پہنی ہے۔ یہ شاہ چین کا پیسہ ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔ وانگ لی ایماندار آدمی ہیں۔ پیسہ ان کے پاس آئے یا ہمارے پاس ایک ہی بات ہے۔ ہمیں اس شرط کو قبول

کر لینا چاہیے۔“

وانگ لی مسکرا دیا۔ یان سو فو کی گردن مزید اکڑ گئی۔ اور سلطان مرسل کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔
 ”معاہدہ میرے پاس لاؤ۔ میں اس پہ شاہی مہر لگانے کے لئے تیار ہوں۔“ وہ خوش نظر آتا تھا۔ دربار میں مبارک سلامت کے نعرے گونجے۔ بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھے جانے لگے۔ سب خوش نظر آرہے تھے۔ سب کی کرسیاں محفوظ ہو گئی تھیں۔
 اداس تھے تو صرف وہ دو لوگ جو اس دنیا کے باسی ہی نہیں تھے۔

جن کو معلوم تھا کہ ایسے قرضوں نے صدیوں بعد بھی قوموں کی قومیں غلام بنارکھی تھیں۔

☆☆=====☆☆

سلطنت محل میں دربار سے مخالف عمارت میں ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں فرشی نشست بچھی تھی۔ گاؤتکے لگے تھے اور سامنے دو فٹ اونچا چبوترہ بنا تھا جیسے قوالی کے لئے بنایا جاتا ہے۔
 اس فرشی نشست پہ حاضرین کی طرف رخ کر کے ایڈم دوزانو بیٹھا تھا۔ سامنے چھوٹی میز پہ قرینے سے سب صفحات رکھے تھے جن پہ وقفے وقفے سے وہ نظر ڈالتا اور پھر چہرہ اٹھا کے حاضرین کو دیکھ کے ادب سے پڑھتا جاتا۔
 سامنے پہلی صف میں سلطان مرسل، ہندابار اور چند وزراء بیٹھے تھے۔ وانگ لی مرسل کے بائیں جانب تھا۔ پچھلی صفوں میں درباری مرد بیٹھے تھے۔

”اور یہ اسی ماہ کی بات ہے جب وانگ لی کے چائے خانے ”جیا“ میں....

ہوئی ایک شام گرم بحثوں کی نذر....

ایڈم مرسل شاہ کی تعریفوں اور شہزادی تاشہ کے قصیدوں کے بعد اب ”جیا“ کے اس قصبے پہ آیا تو آواز جوش سے بلند ہونے لگی۔

ہندابار امراتدرے چونک کے سننے لگا۔

”ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا رئیسوں اور قاضی کے خلاف...“

اور کرنے لگا غلاموں کی حمایت...

جن کو قید کرتے تھے بااثر لوگ اغوا کر کے....“

آخری صف میں دوزانو ہوئے چند خاص سپاہی اور اعلیٰ عہدیدار غلام بیٹھے تھے۔ وان فاتح ان میں سے ایک تھا۔ پلکیں سکوڑ کے وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔

”اور بولا وہ بھری محفل میں آواز بلند کر کے...“

نہیں ڈرتا میں رئیسوں کی دوستی کے چھن جانے سے...“

مرسل شاہ نے قبوے کی پیالی نیچے رکھی اور دلچسپی سے سننے لگا۔ مراد البتہ چونکا ہوا لگتا تھا۔ تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔

”کیونکہ اللہ نے مطمئن کر رکھا ہے میرا نفس شاہوں کی دوستی سے...“

کھوماہوں میں اعلیٰ سوار یوں میں رہا ہوں میں اونچے محلوں میں...“

ایڈم کی آواز جیسے جیسے نغمہ ساز کی طرح فضا میں بکھرتی گئی، حاضرین کا جوش و تجسس بڑھتا گیا۔ قصہ دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ بس سب کو یہ سب کہنے والے جری مرد کا نام جاننے میں دلچسپی تھی۔

”پھر اہوں میں ملک ملک اپنے ہاتھوں سے کھودی ہیں میں نے قبریں...“

تو نہ ڈراؤ مجھے ان چیزوں سے جو مجھے خنزیر نہیں کرتیں...“

لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے لئے آخر دم تک۔

کیونکہ میں...“ ایڈم نے مسکراتے ہوئے حاضرین کو دیکھتے نظریں کاغذ پہ جھکائیں اور پڑھا۔

”وا...“ وہ اٹکا... نظریں اٹھائیں تو یہ نظریں بدلی ہوئی تھیں۔ تھوک نگلا اور فقرہ مکمل کیا۔

”کیونکہ میں دانگ لی ہوں۔ سن باؤ تائی شان۔“

شاہ چین کا سب سے وفادار غلام!“

اور اس کی پلکیں جھک گئیں۔ منوں بوجھ ان پہ آن پڑا تھا۔ بدقت اس نے آنکھیں اٹھائیں، تو دیکھا... سامنے جہاں مرسل شاہ نے

خوشگوار حیرت سے گردن موڑ کے دانگ لی کو دیکھا۔

”کیا واقعی یہ تم نے کہا دانگ لی؟ ایسے خوبصورت بے باک الفاظ؟“

وہاں مراد رجبہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ”ظاہر ہے یہ دانگ لی کی اعلیٰ پائے کی تربیت ہی ہے آقا، جو وہ کسی خوف و خطر کے بغیر

اپنے اصل، کوریکس زادوں کے سامنے بھی یاد کرنے سے نہیں رکتا۔“

پیچھے بیٹھے درباریوں کی بھی توصیفی واہ واہ گونجی۔

دانگ لی جہاں خود قدرے حیران تھا رجبہ کی بات پہ پھیکا سا مسکرایا۔ ”آقا... میں...“ وضاحت دینے کے لئے لب کھولے۔

”ہمارے دل میں تمہاری قدر و منزلت مزید بڑھ گئی ہے، دانگ لی۔ خوش رہو۔“ مرسل شاہ نے زور سے اس کا شانہ تھپکا۔ پھر خوشگوار

انداز میں واپس مورخ کی طرف گردن موڑی۔ ”تم اچھا لکھتے ہو، آدم! آگے پڑھو۔ تمہارا کلام سننے میں لطف آرہا ہے۔“ اور سامنے چھوٹی

میز پر رکھے... پھلوں میں سے ایک گچھا اٹھا کے لبوں میں رکھا۔

دانگ لی نے بدقت مسکراتے ہوئے سر کو خم دیا۔ ”شکریہ آقا۔“ اور خاموش ہو گیا۔ قدرے غیر آرام دہ سا تھا۔ بار بار ایڈم کو دیکھتا تھا جیسے

اچنبھے میں ہو مگر ایڈم اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے بس ایک نظر دور پیچھے بیٹھے فاتح پہ ڈالی۔

فاتح اس کو خود کو دیکھتے پا کے تلخی سے مسکرایا اور استہزائیہ سر جھٹکا۔ اس کی نظروں کا ملال اور تلخی... ایڈم کی آنکھیں جھک گئیں۔ محفل پر خاست ہوئی اور سلطان، جو چینی امداد کی خوشی کے نشے میں سرمست تھا، اٹھنے سے پہلے ایڈم کو شاہی خلعت سے نواز گیا اور شریفوں سے بھری تھیلی بطور انعام بھی دی۔ ایڈم نے خاموشی سے وہ رکھ لی، جھک کے سلطان کا شکریہ ادا کیا اور سر جھٹکائے کھڑا رہا۔ ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے تو وہ تیزی سے باہر آیا۔ وانگ لی اپنے غلاموں کے ہمراہ دوسری سمت میں جا رہا تھا۔ ایڈم تیزی سے ان کے قریب آیا۔ فاتح نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ بس رفتار آہستہ کر دی۔ وانگ لی اور دوسرا غلام آگے نکل گئے۔ وہ دونوں پیچھے رہ گئے۔

”سر...“ وہ بے چینی سے بولا۔ ”میں... میں شرمندہ ہوں۔ جو میں نے کہا وہ سچ نہیں تھا، میں نے سچ چھپایا، مگر...“

”یہ خلعت سنبھالو، ایڈم۔ یہ کافی بھاری ہے۔ تم پہ بوجھ بڑھ گیا ہے۔“

”مگر سر...“

”مجھے کچھ برا نہیں لگا۔ بلکہ اچھا ہوا کہ میرے خدشات دور ہو گئے۔ میں نے جان لیا کہ اب بس وہی ہوگا جو بنگارایا ملا یو میں لکھا ہے۔“

مجھے اسی طرح پلان بنانا ہوگا۔ شکریہ ایڈم۔“

وہ پاٹ سا کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

ایڈم منھیاں بھنچے، بے بسی سے دور جاتے وانگ لی اور اس کے غلام کو دیکھتا رہا۔ وہ بندہ ہار کے محل کے باغ میں تھی جب ایڈم اس کو ڈھونڈتا وہاں آیا۔

باغ میں ایک جگہ بڑے بڑے پتھروں سے سنگی نشستیں بنی تھیں، جیسے مشروم کے سر کاٹ دیے ہوں اور وہ ایک سرکے مشروم پہ بیٹھی اپنا لباس دائیں بائیں پھیلائے، دو رافق پہ دو پہر کے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بادلوں کے پیچھے چھپا آدھی نارنجی ٹکلیا جیسا دکھائی دیتا تھا۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا، چے تالیہ؟“ وہ لال بھسوکا چہرہ لیے اس کے سر پہ آکھڑا ہوا۔

تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔

”کیا میں نے آپ کو مسودہ اس لئے دیا تھا کہ آپ اس میں وان فاتح کے نام کی جگہ وانگ لی کا نام لکھ دیں؟ اس سے پہلے آپ نے میرا لکھا ایک حرف بھی نہیں بدلا۔ تو یہ کیوں؟“ وہ سخت شکست خوردہ، دل ہارا نظر آتا تھا۔ مسودہ سنانے سے قبل ایک دفعہ بھی پڑھ لیتا تو ذہنی طور پہ تیار تو ہوتا مگر اسے گمان تک نہ گزرا تھا کہ وہ یہ کر دے گی۔

”کیا وہ خفا تھے؟“ تالیہ کی نظریں سورج پہ تھیں۔

”ظاہر ہے ان کو برا لگا ہے۔ کیونکہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ سچ کو چھپایا ہے۔“

”یا شاید اس لئے کہ ہم نے ان سے مزید ’فین‘ بنانے کا موقع چھین لیا ہے اور...“

”بات فینز کی نہیں ہے، چے تالیہ۔“ وہ بے زار ہوا تو وہ ایک دم سے اٹھی اور اس کی طرف گھومی تو چہرے پر سختی تھی۔

”ایڈم بن محمد... میری بات کاٹے بغیر سنو...“ وہ غرائی تو وہ بالکل چپ ہو گیا۔ ”تمارے فاتح صاحب اکیسویں صدی میں ایک اسٹار سیلر ٹی تھے۔ ان کے لاکھوں فینز تھے۔ وقت کی قید نے ان سے وہ مقام چھین لیا کہ جہاں ان کو صنم بنا کے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ فینز کو پرستار اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ستارے کی پرستش کرنے لگ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو پرستاروں کی عادت ہو جائے ان کے لئے پرستش کروائے بغیر رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حب جاہ اور حب چاہ... وہ ان دونوں کے بغیر ادھورے ہیں۔ ظاہر ہے ان کو برا لگے گا کہ ہم نے ان سے مزید پرستار بنانے کا موقع چھین لیا۔ ارد گرد دیکھو... ان کا کوئی فین نہیں ہے یہاں۔“

”چے تالیہ... آپ نے... ایسا کیوں کیا؟“ وہ دکھی تھا۔

”کیونکہ... میں نہیں چاہتی ان کو توجہ ملے۔ وہ کسی کی نظروں میں آئیں۔ وانگ لی ایسے الفاظ بولے تو کوئی نہیں چونکے گا۔ لیکن اگر کوئی غلام بولے تو بندہ ہمارا ضرور چونکے گا۔ میرا باپ اس وقت ملا کہ میں برآمدی کی گردن کو دیکھ رہا ہے تاکہ وہ نشان ڈھونڈ سکے۔ اگر اس کو تمہاری کتاب میں دیوتا بنے شخص کی گردن پہ وہ نشان مل جائے تو وہ کیا حال کرے گا وان فاتح کا احساس ہے تمہیں؟“

ایڈم بالکل چپ ہو گیا۔

”میں جو کر رہی ہوں، ہم تینوں کی بھلائی کے لئے کر رہی ہوں۔ تم غلاموں کی کہانی لکھنا چاہتے ہو، لکھو، مگر اس کو وانگ لی کے نام سے لکھو یا کسی اور نام سے۔ مگر فاتح کا نام تم اپنی کتاب میں نہیں لکھو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔“ وہ تحکم سے چبا چبا کے بولی۔

ایڈم نے اپنے سامنے کھڑی شہزادی کو نظر اٹھا کے دیکھا۔ اس کے عقب میں بندہ ہارا کا محل نظر آ رہا تھا، اور وہ اس محل کی طرح اونچی، بارعب اور پُر تمکنت لگ رہی تھی۔

”میں اس حکم کو نہیں ماننا چاہتا۔ میں نے وان فاتح سے وعدہ کیا تھا کہ...“

”ایڈم بن محمد...“ وہ ایک دم غرائی تو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ”تم یہاں... میرے حکم پہ... کھڑے ہو۔ تمہیں یہاں تک میں (سینے پہ انگلی رکھے) لائی ہوں۔ میں ملا کہ کے بندہ ہارا کی بیٹی شہزادی تاشہ بنت مراد ہوں۔ اس محل میں وہ ہوتا ہے جو میرا حکم ہوتا ہے۔ میرے سامنے اپنی توجیحات مت رکھو۔ تم وہی لکھو گے جو میں چاہوں گی ورنہ تم اس دنیا میں تاحر بھٹکتے رہو گے۔ سنا تم نے!“

محل دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔ طاقت کا پلڑہ بے قابو ہو گیا تھا۔ پیا نے اوپر نیچے ہونے لگے اور اپنی اپنی جگہ پہچاننے لگے۔

ایڈم کے کندھے ڈھیلے ہو کے گرے گئے۔ اس نے سر جھکا دیا۔ ”جو حکم، شہزادی۔“

وہ ایک برہم نگاہ اس پہ ڈالتی، لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے، تیز تیز آگے بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اس اداس سے باغیچے میں کھڑا رہا۔ سامنے موجود محل نے کان میں سرگوشی کی۔ ”طاقت میں بہت طاقت ہے، بے وقوف مورخ!“

☆☆=====☆☆

ملکہ کی خواب گاہ سرخ اور زرد رنگ کے پردوں اور قالینوں سے سجی تھی جن پہ مختلف طرح کے شیر اور ڈرگین کی شکلوں کے نقش و نگار بنے تھے۔ دیوار کے کھلے خانوں میں چینی کے برتن اور صراحیاں بھی تھیں۔ پلنگ کے اوپر سرخ جالی دار پردے گرتے نظر آتے تھے غرض وہ ہر طرح سے ”شاہ چین کی دختر“ کا کمرہ لگتا تھا۔

ملکہ یان سو فو اندر داخل ہوئی تو دربار کے برعکس اس کے چہرے کی خوشگوار بیت عنقا تھی۔ رنگت گلابی دہک رہی تھی ماتھے پہ بل تھے اور وہ غصے میں تھی۔

اس کی خاص کنیز بھی پیچھے آئی اور دہلیز پار کر کے کونے میں کھڑی ہو گئی۔

یان سو فو آگے بڑھی... سنگھار میز تک آئی اور کلائی سے چوڑیاں اتارنے لگی۔

”ملکہ.... ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ آقا شہزادی تاشہ کو اپنے حرم میں داخل نہیں کریں گے۔“

”پانچ سال کی تھی جب گھوڑے پہ چڑھنا سیکھا تھا میں نے۔“ وہ رگڑنے والے انداز میں چوڑیاں اتار اتار پھینک رہی تھی۔ آنکھیں شدت جذبات سے سرخ پڑ رہی تھیں۔ ”نوسال کی ہوئی تو قیدیوں پہ مشقوں کے دوران ایک قیدی کی پیشانی میں پہلا تیر کھونا تھا میں نے۔ شاہ چین کی بارہ بیٹیوں میں سے سب سے لا ذلی اور محبوب تھی میں۔“

”ملکہ....“ کنیز نے دلگرفتہ نظروں سے اسے دیکھ کے کچھ کہنا چاہا مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

”بائیس برس کی ہوئی تو اپنی برفن سے آراستہ بیٹی کو باپا نے سینکڑوں چینی اہلکاروں کے ساتھ اس ملک کی طرف روانہ کر دیا۔ اپنے آباؤ اجداد کا دین چھڑوا کے مجھے مسلمان بنایا گیا۔ پھر ایک ایسے سلطان سے میری شادی کر دی جس کو میں جانتی تک نہ تھی مگر حکم تھا کہ یہی کرنا ہے۔ یہ دونوں ملکوں کے لئے خوش بختی لائے گا۔ کیسی خوش بختی ہے جو چین کی شہزادی کے دل کو روند کے ملتی ہے؟“ اب وہ اپنی گردن سے زیور نوچ کے اتار رہی تھی۔ نظر اٹھا کے آئینے میں دیکھا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

”جس سلطان کو کھانا کھانے کی تمیز نہیں جس کو اپنی عقل سے سوچنا تک نہیں آتا۔ جس کو دوسرے چلاتے ہیں۔ اور جس کو میں نے ہر قربانی دینے کے بعد سدھارنے کی کوشش کرنا چاہی۔ اپنے ملک کے لئے.... چین کے لئے۔ اپنے شاہ کے لئے۔ وہ سلطان آج کہتا ہے کہ وہ میرے مقابلے پہ ایک دوسری ملکہ لے آئے گا۔“ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے اس نے تاج اتار اور دیوار پہ دے مارا۔

کنیز سہم کے پیچھے ہوئی۔

یان سو فو نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے تھے۔

”وہ شاہ چین کی بیٹی کے مقابلے پہ دوسری عورت لائے گا؟ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟“

”ملکہ ضرور شہزادی تاشہ نے آقا کو اپنے جال میں پھنسا یا ہو گا ورنہ آپ کی خوبصورتی کے سامنے تو....“

یان سو فو نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔ ”شہزادی تاشہ!“ پھر چہرہ اٹھایا اور آئینے میں عکس دیکھا تو کاجل آنسوؤں کے باعث مٹا مٹا سا

تھا اور جوڑے سے لٹیں نکل کے ادھر ادھر بکھری تھیں۔

”شہزادی تاشہ کے چہرے پہ تیزاب پھینک سکتی ہوں میں... اسے زنداں میں ڈال سکتی ہوں۔ اس کی جان لے سکتی ہوں۔ مگر...“ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آنکھوں پہ رکھیں اور ان کو رگڑنے لگی پھر انگلیاں بتائیں، چہرہ اٹھایا اور گہری سانس لی۔

”مگر میں پانچ برس کی تھی تو گھوڑے پہ چڑھنا سیکھا تھا۔ اتھرے جانور کو قابو کرنا مجھے تب سے آتا ہے۔“ آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑے۔

نوسال کی تھی تو قیدی کے سر پہ رکھے سب کی جگہ پیشانی میں تیر گھوپٹا تھا۔ کیونکہ کان میں باپا نے کہا تھا کہ ”مُشَق تو ناک ہے“ اصل مقصد اس قیدی کو مارنا ہے۔ تب سے محل کے رازوں اور سازشوں کا استعمال کرنا آتا ہے۔“ اس نے غارے سے انا رو مال اٹھایا اور اس سے چہرے کو تھپتھپایا۔ رنگت میں سفیدی اور گلابی گھل گئی۔

”شاہ چین کی بارہ بیٹیوں میں سے سب سے لاڈلی اس لئے تھی کیونکہ باپا کو معلوم تھا، میں انسانوں کو پڑھ بھی سکتی ہوں اور ان سے نہپٹ بھی سکتی ہوں۔“ لالی اٹھائی اور لبوں پہ لگائی۔

”بائیس برس کی تھی تو اس لئے مجھے تنہا شاہی دستے کے ساتھ غیر ملک میں روانہ کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے، یان سوفو تنہا مقابلے کرنا بھی جانتی ہے۔ دونوں ملکوں کو خوش بختی ملے گی، مگر یان سوفو کا دل اب مزید نہیں روند جائے گا۔“ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور جیسے ابھی لبوں کو شانت کر کے درست کیا۔ پھر سنگھار میز پہ رکھا دوسرا تاج اٹھا کے سر پہ رکھا۔

”میں اب صرف شاہ چین کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں ملاکہ سلطنت کی ملکہ بھی ہوں۔ اور مجھے مراد راجہ اور شہزادی تاشہ سے زیادہ چالیں چلنا آتی ہیں۔“ پھر اس نے گردن موڑی اور کنیر کو دیکھا تو اب قدرے پرسکون اور سپاٹ نظر آتی تھی۔

”شہزادی تاشہ کو کل محل بلوالو۔ ہم ظہرانہ ایک ساتھ کھائیں گے۔“

کنیر نے الجھ کے اسے دیکھا مگر سر تسلیم خم کر لیا۔ ”جو حکم ملکہ!“ اور اٹنے قدموں پیچھے ہٹی گئی۔

☆☆=====☆☆

”جیا“ پہ مغرب کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اندر قندیلیں روشن کر دی گئی تھیں اور بڑا ہال کھچا کھچ بھر نظر آ رہا تھا۔ پس ماندہ، زبوں حال سے نوجوان اور ادھیڑ عمر مرد میزوں پہ بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ بعض عجلت میں کھا رہے تھے جیسے ان کو واپس پہنچنے کی جلدی ہو۔

ہال کا ایک دروازہ رسوائی میں کھلتا تھا جہاں چولہے رکھے تھے اور چھت کھلی تھی۔ دھواں فضا میں اڑتا جا رہا تھا اور دیگیوں میں پکوان پکتے نظر آ رہے تھے۔ ایک چولہے کے قریب فاتح بن رامزل پنچوں کے بل بیٹھا لکڑیوں کو چولہے کے اندر دھکیل رہا تھا۔

دھواں اٹھا تو اس نے جھک کے پھونک ماری۔ ایک دم شعلہ سا جل اٹھا اور دھواں چھٹا گیا۔ اس نے آنکھیں ملبیں اور پھر ادھر ادھر

دیکھا۔

وہ رسوئی میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دوسرے غلام کاموں کے سلسلے میں آ جا رہے تھے۔ وہ ان غلاموں کا نگران بنا دیا گیا تھا اور اس پہ اب روک ٹوک نہیں کی جاتی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہیں ڈیڈ؟“ وہ آواز پہ چونکا۔ لکڑیوں کے ساتھ آریانہ آ بیٹھی تھی اور چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے، یاسیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”نیا لے کرتے پا جا مے میں پنچوں کے بل بیٹھا فاتح ذرا سا مسکرایا۔“ یہ سوچ رہا ہوں کہ آگے کیا کرنا ہے۔“

”آپ کے پاس تو ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“

”اب بھی ہے۔ مگر یہ لوگ....“ گردن موڑ کے اس دروازے کو دیکھا جو اندرونی ہال میں کھلتا تھا۔ ”یہ شہر کے غلام محکوم لوگ.... یہ کیسے اپنے لئے کچھ کریں گے؟“ اس کے انداز میں افسوس تھا۔

”کسی کو تو ان کے لئے لڑنا ہوگا ڈیڈ۔“ وانگ لی تو وہ ہیر نہیں نکلا جو آپ اس کو سمجھتے تھے۔ صبح دربار میں اپنی تعریف سن کے وہ خوش تو ہو گیا مگر اس نے تب سے لے کر اب تک آپ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ کوئی عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دے گا۔“

”غلط۔ اس کے بارے میں تاریخ میں لکھے تمام واقعات درست تھے سوائے اس ایک کے۔ وہ جنگی فتوحات، وہ بحری سفر، وہ سفارتکاری، وہ سب کارنامے وہ انجام دے چکا ہے...“

”اس نے جو بھی کیا ڈیڈ، وہ چین کے لئے کیا۔ اب بھی ملا کہ قرض کی غلامی میں ڈال کے وہ اپنے ملک سے حب الوطنی کو ثبوت ہی دے رہا ہے۔ وہ ہیر وہے مگر چینی قوم کا۔ آپ کو اپنی قوم کا مسیحا خود بننا ہوگا۔“

”صحیح کہہ رہی ہو۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے اور سوچتی نظروں سے ہال کے دروازے کو دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”تقدیر صرف ان قوموں کی بدلتی ہے جو اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کرتی ہیں۔“

وہ ہال کے اندر آیا اور ایک غلام سے طشت لے لیا۔ پھر ایک میز تک آیا جو وسط میں تھی۔ اس پہ دو آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فاتح نے ان کے سامنے چاول اور ترکاری کے کٹورے رکھے تو وہ جلدی جلدی کھانے پہ ٹوٹ پڑے۔ وہ طشت اٹھائے کھڑا غور سے ان کو دیکھ گیا۔

”آرام سے کھا لو، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“

”تم میرے آقا کو نہیں جانتے۔ جلد واپس نہ گیا تو وہ میرا برا حال کر دے گا۔“ وہ انگلیوں سے چاول منہ میں رکھتے ہوئے بولا تو فاتح نے افسوس سے سر جھٹکا۔

”تمہاری مجبوری صرف جسمانی غلامی تھی۔ جنی غلام کیوں بن گئے ہو؟“ وہ ذرا اونچا بولا تو قریب میں چند گردنیں مڑیں۔

”وہی غلامی؟ وہ کیا ہوتی ہے؟“ غلام کے چاول میں ہاتھ رہ گئے۔ ہونقوں کی طرح چہرہ اٹھا کے اس کو دیکھنے لگا۔ فاتح نے کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھا، پھر بولا تو آواز بلند تھی۔

”کسی انسان سے اتنا ڈرنا یا اس سے اتنی محبت کرنا کہ اپنے ہر کام، ہر فیصلے کو کرنے سے پہلے اس کا متوقع ردِ عمل سوچنا... یہ غلامی ہے میرے دوست اور یہ تم سب...“ انگلی سے اطراف میں اشارہ کیا۔ ”... کی عادت ہے۔ تم سب وہی غلام ہو۔“

”تو کیا کریں؟“ غلام نے خفگی سے چاول پلیٹ میں پھینکے۔ ”آقا کے غلام ہیں۔ حکم نہ مانیں تو ڈر لگتا ہے کہ سزا ملے گی۔“

”مسلمان ہو کیا تم؟“ وہ برہمی سے بولا تو سارے میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ گردنیں موڑ موڑ کے اسے دیکھنے لگے تھے۔ ”پھر کیوں بھول جاتے ہو کہ مسلمان کسی سے نہیں ڈرتا کیونکہ وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔“

”اللہ سے ہم بھی ڈرتے ہیں، مگر ہمارا مالک...“

”میرے بھائی، صرف اللہ سے ڈرنے کی عادت ڈالو۔ تمہارا مالک کیا دنیا کا کوئی انسان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اگر تم اللہ سے مدد مانگو تو۔“ اس نے لہجہ قدرے نرم کیا اور انداز میں جیسے منت سی بھر لی۔ ”جسمانی غلامی تمہاری مجبوری ہے، مگر خدا را ذہن کو تو آزاد رکھو۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں آزاد انسان بننا سکھایا تھا۔ ہم کیوں وہ سب بھول گئے ہیں۔“

کسی نے جواب نہیں دیا۔ لوگ کھانا روک کے ٹکڑ ٹکڑ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”میں جانتا ہوں تم لوگ پریشان ہو، کیلے ہو، تمہیں اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے اور غلام بنایا گیا ہے مگر تمہیں اس حالت میں ڈالنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی انسان کو اکیلا کرتا ہے۔ سارے رشتے، دوست، مددگار، ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ سب چھوڑ جاتے ہیں اور وہ سب سے انسان کو کاٹ کے کسی تنہا جزیرے پہ لے جاتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟“

کوئی جواب نہ آیا۔ بس خالی چہرے ٹکڑ ٹکڑ اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیونکہ محبت کرنے والے جب تک ہمارے ارد گرد ہوتے ہیں، ان کی محبتوں کا شور ہمیں اپنے اندر نہیں جھانکنے دیتا۔ کبھی کبھی اس شور کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ زیرِ دستی، جبرائیل، یہ تمہارا اور میرا اللہ ہے جو انسان کو اکیلا کر کے اس کو اس کے اندر جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ تم اپنے مالک سے کیوں ڈرتے ہو؟ وہ تمہارا خدا نہیں ہے۔ کوئی انسان کسی کی زندگی کا خدا نہیں ہوتا۔ خدا صرف ایک ہے۔“ انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

نظریں ایک سے دوسرے تک جا رہی تھیں۔

”اس خدا سے ڈرنا سیکھو۔ اس خدا کو پہچانا سیکھو۔ وہی ہماری زندگیوں کے سارے فیصلے ہم سے کرواتا ہے۔ وہی ہمیں خوشی دیتا ہے، وہی غم دیتا ہے۔ وہی بناتا ہے، وہی رلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہمارے دل کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔“

غلام نے پلیٹ اپنی طرف کھینچی اور پھر سے کھانا کھانا شروع کیا۔ مگر فاتح نے ہمت نہیں ہاری۔

”ہمارے رسول اللہ ﷺ کسی انسان سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہر انسان کو برابری کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ اللہ نے ان کے سارے

خوف دور کر دیے تھے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ تم لوگ بھی اپنے خوف دور کر سکتے ہو۔ تم سب اچھے گھروں کے لوگ ہو جو انخوا کر کے جبراً ابو الخیر یا اس جیسے لوگوں کے غلام بنائے گئے ہو۔ اپنے مالکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا سیکھو ملا کہ کے لوگو! اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ نہیں پسند جو مظلوم بن کے ظلم کے سامنے پستے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو بھلے امیر ہوں یا غریب، خوبصورت ہوں یا بد صورت، مگر وہ صرف اللہ سے ڈریں اور درست چیز کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ اللہ کو کوشش کرنے والے پسند ہیں۔ کیا تم لوگ اپنے لئے کوشش کرنے والے نہیں بننا چاہتے؟“

غلام اب تیز تیز لقمے لے رہا تھا۔ گردنیں واپس مڑتی گئیں۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ سب کی توجہ کھانے کی طرف مبذول ہوتی گئی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک میز سے دوسری میز تک امید بھری نظریں دوڑائیں مگر اس کی نگاہ خالی پلٹ آئی۔ کسی نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے تو کسی نے خشمگین نگاہوں سے اس کو گھور کے منہ موڑ لیا تھا۔ سب واپس مصروف ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ تو مارے خوف کے باہر نکل گئے تھے۔ فاتح نے گہری سانس لی اور اداسی سے ان لوگوں کو دیکھا جو جلدی جلدی کھانا ختم کر رہے تھے۔ مالک کا خوف بر شے پہ حاوی تھا۔

☆☆=====☆☆

’سلطنت محل‘ لکڑی کا بنا خوبصورت محل تھا جس کے مغربی کونے میں بڑا سا کتب خانہ سا بنا تھا۔ اس شاہی کتب خانے کے اندر وسیع و عریض ہال سا بنا تھا جس میں قطار در قطار ریک رکھے تھے اور ان کے اندر کتابیں بچی تھیں۔

ایڈم ایک ریک کے سامنے سے کھڑا کتاب اٹھا کے اسے کھولتا نظر آ رہا تھا۔ دو کتابیں بغل میں دبی تھیں۔

سلطنت محل کا کتب خانہ بند ہمارا مراد کے محل سے کہیں زیادہ وسیع اور علمی خزانے سے مالا مال تھا۔ (سلطنت محل وہ محل تھا جس میں سلطان مرسل اور ملکہ یان سو فور ہائش پذیر تھے۔ مراد اور تالیہ کا محل اس سے دور سمندر کنارے اونچی پہاڑ پہ واقع تھا۔)

ایڈم نے کتاب بند کر کے ریک میں رکھی تو چونکا۔ اوپری خانے کے کونے میں قطار میں چار کتابیں رکھی نظر آرہی تھیں۔ وہ ایک ہی سیریز کی کتابوں کی چار جلدیں تھیں۔ جلد اول، جلد دوم، جلد سوم، جلد پنجم۔ اس نے چاروں کے سرورق پڑھے۔ جلد چہارم نہیں تھی۔ درمیان کی جگہ بھی خالی تھی۔ جلد چہارم کس نے اٹھائی اور کہاں گئی؟

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پہریدار اس طرف نہیں تھے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ جلد اول نکالی اور اسے کھولا۔ اندرونی سرورق دیکھ کے وہ ٹھنکا۔

وہ ملا کہ کے مختلف نامور جزیروں کے نقشوں، جغرافیہ اور وہاں کے سفرنامے کی کتاب تھی۔ بنیادی طور پہ وہ دس برس پہلے لکھے جانے والا ایک سفرنامہ تھا۔ جلد اول کے پہلے صفحے پہ فہرست تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر جلد میں کون کون سے مضامین شامل ہیں۔ وہ انگلی صنفی پہ پھیرتا نیچے آیا۔

جلد چہارم۔ ”تین چاند والے جزیرے کا دلچسپ احوال۔“

جو جلد غائب تھی اس میں تین چاند والے جزیرے کا احوال لکھا تھا؟ یا خدا!

ایڈم نے جلدی سے کتاب بند کی اور واپس رکھی۔ اس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے تھے۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور متلاشی نظروں سے ایک کے بعد ایک ریک دیکھنے لگا۔ وہ جامنی رنگ کے سرورق والی کتابیں تھیں یہ رنگ خاصا نمایاں نظر آتا تھا۔ اور پھر اسے وہ رنگ نظر آ گیا۔

کوئے میں رکھی شیشے کے پٹ والی قدیم الماری میں ”جلد چہارم“ رکھی تھی... ایڈم کے اندر جوش سا بھر گیا۔ فوراً سے الماری کا دروازہ کھینچا مگر وہ بند رہا۔ اس نے چونک کے دیکھا۔ کندھے پہ یہ بڑا سا تالہ چڑھا تھا۔
”تم کیا کر رہے ہو یہاں؟“ پیچھے سے پیریدار غراتا ہوا آیا تو وہ چونک کے مڑا۔
”میں.... یہ کتابیں نکالنا چاہ رہا تھا اور....“

”ہر کتاب پڑھنے کے لائق نہیں ہوتی۔“ وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اس کے سر پہ پہنچ گیا۔ میان میں چمکتی تلوار اور جسم پہ پہنا ہنی لباس... وہ کچھ ضخیم سا پیریدار خاصا خوفناک تھا۔
”مگر میں مورخ ہوں اور مجھے....“

”یہ بندہ اہار کا محل نہیں ہے، یہ سلطنت محل ہے۔ یہاں تمہاری شہزادی کا حکم نہیں چلتا۔ یہاں سلطنت کے قوانین نافذ ہیں۔ یہ ممنوعہ کتب ہیں۔ شکل گم کرو اپنی ورنہ۔“ تلوار پہ ہاتھ رکھا تو ایڈم نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ بغل میں دبائی کتابیں نیچے جا گریں۔
”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ممنوعہ کتابیں ہیں۔ وہ کیا ہے کہ نظر کمزور ہے میری۔“ کہتے ہوئے جھکا اور جلدی جلدی کتابیں سینے لگا۔ ”اور تھوڑا سا دماغ بھی کمزور ہے۔ بات دیر سے سمجھ آتی ہے۔ خیر تم میری شکایت نہ کرنا۔“ کتابیں سنبھالتا اٹھا اور زبردستی مسکرا کے اسے دیکھا جو ہنوز شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

”جار ہا ہوں۔ جار ہا ہوں۔“ معصومیت سے مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔ مگر کتکیوں سے اس نے الماری کے اندر رکھی دوسری کتابوں کے سرورق پہ نظر ضرور ڈالی تھی۔

پمپو رو.... شکار باز.... تین چار کتابوں کی جلدوں پہ یہ لفظ اسے واضح لکھا دکھائی دیا تھا۔

ان کتابوں کو یقیناً مرا اور اجہ کے حکم پہ عام عوام کی پہنچ سے دور رکھا گیا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟

☆☆=====☆☆

شہزادی تاشہ کے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹے تھے اور سورج کی خالص تازہ کرنیں اندر سارے کوروشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی آئینے میں خود کو دیکھتی کالوں پہ گلابی سا غازہ ہلکا ہلکا مل رہی تھی جو کھلی ڈبی میں سامنے رکھا تھا۔ پھر اسی کو ہونٹوں پہ

لگا کے ہونٹ آپس میں مس کیے۔

لباس زمر درنگ کا تھا۔ لمبی قمیص اور نیچے لہنگا سا۔ (اسے باجو کرنگ کہتے تھے۔) تاج میز پر رکھا تھا اور بال گھنگریالے کر رکھے تھے۔ سنگھار سے مطمئن ہو کے اس نے چوڑیاں اٹھائی ہی تھیں کہ دروازے کھلے۔ دربان نے صدا لگائی۔

”مراد راجہ شریف لا رہے ہیں۔“

وہ چوڑیاں اٹھائے تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اسی اثناء میں مراد اندر داخل ہوا۔ کمر پر ہاتھ باندھے ماتھے پر سرخ پٹی اور اپنی لمبی شاہی قبا پہنے ہوئے تھا۔ سینے پر لوہے کی زرہ بھی پہن رکھی تھی۔ غالباً شکار پر جا رہا تھا یا واپس آ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اسے ابرو کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”راجہ... آپ نے مجھے بلوایا ہوتا۔“ وہ احتیاط سے بولی۔ وہ ایسے کھڑی تھی کہ آئینے کی طرف اس کی کمر تھی۔ اور راجہ کھڑکی میں سورج کی روشنی کے سامنے کھڑا تھا۔ روشنی کا راستہ رک گیا تھا

”ملاکہ سلطنت کا بندہ ہمارا شاہی شادی کا نگران ہوتا ہے، تم جانتی ہو۔“ آنکھیں چندھیا کے باہر دیکھتے ہوئے پاٹ انداز میں بولا۔ ”سلطان مرسل کی شادی میں نے ہی کروائی تھی۔“

”جی راجہ۔ تب آپ اور ملکہ ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ پمپوروشکار بازوں کا سارا گاؤں تباہ کیا تھا آپ لوگوں نے اور مجھے اس ان دیکھی چینی شہزادی سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ اب آپ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور میں ملکہ یا ان سو فو کے ساتھ ہوں۔ شاید اسی کو سیاست کہتے ہیں۔“ وہ چوڑیاں کلائی میں ڈالنے لگی۔ ایک۔ دو۔

”سلطان مرسل تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

تالیہ نے زور سے چوڑی کلائی پہ آگے کودھکیلی تو وہ جلد کے ساتھ رگڑتی گئی۔ اس کا سانس تھم گیا۔

”بندہ ہمارا کی بیٹی اور ملاکہ سلطنت کے سلطان کا ملاپ ہمارے ملک کا پرانا رواج ہے۔ اکثر سلاطین کی شادیاں بندہ ہمارا کی بیٹیوں سے ہوئی ہیں۔ حیرت ہے مجھے یہ خیال خود کیوں نہیں آیا۔ وقت کا شکر یہ جس نے تمہیں بہت جلد ایک مکمل شہزادی کے روپ میں مجھے واپس کر دیا۔“ وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ چھوٹی عقابی نظریں تالیہ کے چہرے پر جمی تھیں جو سفید پڑنے لگا تھا۔

”تم واپس جانے کا برخیاں ذہن سے نکال دو۔ قسمت تم پر مہربان ہو رہی ہے تا شہ۔ اگر تم سمجھداری سے کام لو تو ہم اس چینی عورت کو ملاکہ سے نکال دیں گے۔ تم ملکہ ہوگی اور میں بندہ ہمارا۔ مرسل شاہ صرف ایک کٹھ پتلی ہوگا۔ میں اس نئے بندھن پر بہت خوش ہوں۔ اور تمہیں نصیحت کرنے آیا ہوں کہ تم بھی خوش رہنا۔ کیونکہ...“ انگلی اٹھا کے تنبیہ کی تو لہجے اور آنکھوں دونوں میں سختی در آئی۔

”میں..... کوئی گڑبڑ..... برداشت نہیں کروں گا۔ اب یہ میری اور میری قوم کی عزت کا سوال ہے۔“

وہ یک ٹک کھڑی اسے دیکھے گئی۔ ہاتھ بے جان سے ہو کے پہلو میں جا گرے تو چوڑیاں کھٹک اٹھیں۔ مراد راجہ جو کھڑکی سے آتی روشنی

کے ہالے میں کھڑا تھا ایک بے تاثر نظر اس پہ ڈالتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔
اس نے گم صم نگاہیں موڑ کے سنگھار میز پر رکھے سنہری تاج کو دیکھا جس میں جڑے ہیرے دکتے دکھائی دے رہے تھے۔
کون کہتا تھا کہ شہزادی ہونا آسان ہے؟

☆☆=====☆☆

سلطنت محل کا باغیچہ میلوں دور تک پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ درمیان میں سفید روشنی تھی جس پہ شہزادی تاشہ چلتی آتی دکھائی دے رہی تھی۔
عقب میں کنیزوں کا غول تھا۔ خود وہ پھیکئی پھیکئی سی لگتی تھی۔ گم صم سی۔ جیسے ہوا میں قدم رکھ رہی ہو۔ سامنے سے ایڈم آرہا تھا۔ کتابیں بغل میں دبا رکھی تھیں۔ اسے دیکھ کے رفتار آہستہ کی اور سر جھکا لیا۔ اس روز کی تلخی ابھی تک یاد تھی۔
تالیہ نے کنیزوں کو اشارہ کیا تو وہ وہیں رک گئی۔ وہ خود بے جان سے قدم اٹھاتی اس کے قریب آرکی۔
”تم یہاں کیسے؟“

”آقا نے کہا تھا کہ مجھے شاہی کتب خانے سے فیض اٹھانا چاہیے۔ اس لیے یہاں آیا تھا۔“ ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ ”میرے لائق کوئی خدمت، شہزادی؟“

”میں صرف تمہاری شہزادی نہیں ہوں ایڈم۔ یہ مت سمجھو کہ مجھے تاج اور تخت کا غرور آگیا ہے۔“

”واقعی یہ نہ سمجھوں؟“ اس نے شکایتی نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔

”ہاں، طاقت اپنا اثر دکھاتی ہے لیکن میں اور تم ایک برابر ہیں ایڈم۔ ہم دونوں ہی یہاں قیدی ہیں۔ مجھ پہ بھروسہ کرو اور حکم مان لیا کرو۔“
کہہ کے وہ آگے بڑھ گئی۔ ایڈم کی ساری کلفت اور ناراضی جیسے دور سی ہو گئی۔ فوراً اس کے پیچھے لپکا۔
”اچھا سنیے۔ اس محل کے کتب خانے میں کچھ کتابیں تالے میں رکھی گئی ہیں۔ مجھے وہ چاہیے ہیں۔ ان میں تین چاند والے جزیرے کا راز چھپا ہے۔“

”میں ملکہ سے ملنے آئی ہوں، مجھے تنگ مت کرو ابھی۔“ وہ کسی قسم کی تلخی کے بغیر تکان سے بولی۔ اور سامنے دیکھتے ہوئے قدم بڑھاتی گئی۔
ایڈم نے قدرے اچھنبے سے اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

”اس سے اچھے تو ہم کے ایل میں تھے، چے تالیہ۔ وہاں ہم برابر تھے۔ یہاں نہیں۔ بلکہ خیر... برابر کے تو وہاں بھی نہیں تھے۔ میں ٹھہرا ایک شریف، قانون کی پاسداری کرنے والا آدمی۔ اور آپ ٹھہری ایک لالچی خاتون جن کی زندگی کے سارے فیصلے خزانے کی کھوج کے گرد گھومتے تھے۔“

وہ ایک دم رکی اور اس کی طرف گھومی۔ ایڈم کی زبان کو بریک لگا۔ ذرا سا گڑبڑایا۔ رعب حسن اور شاہزادیوں والی جاہ۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں دوبارہ اس روز کی طرح.....

”بالکل.... واقعی!“ وہ چونک کے بولی۔ ”یہی تو ہوں میں۔ ایک لالچی عورت جس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خزانے کی کھوج تھا۔ ویری گڈ!“ اور دوبارہ سے چلنے لگی۔ ایڈم کے ابرو حیرت سے سکڑے۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

”طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟ میرے دائیں ہاتھ کو آج بری نظر سے نہیں دیکھا آپ نے۔“

”مرا اور اجہ میری سلطان سے شادی کی تیاری کر رہا ہے۔ اس وقت میرا موڈ اچھا نہیں ہے ایڈم۔“

”اوہ۔“ وہ چپ ہو گیا۔ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایڈم نے اسے امید دلانے کی کوشش کی۔

اگر آپ مجھے وہ کتابیں نکلوا کے دے دیں تو میں یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتا ہوں۔ میں کسی صورت آپ کو ان رسم و رواج کے اوپر قربان نہیں ہونے دوں گا۔“ ذرا جذباتی ہو گیا تو تالیہ نے گردن موڑ کے ایک نظر ایڈم کو دیکھا۔ کرتے پا جامے اور واسکٹ میں ملبوس سر پہ ٹوپی پہنے وہ اچھا لگ رہا تھا۔ تالیہ اداسی سے مسکرائی۔

”تمہاری تو خواہش تھی تا مجھے پولیس سے گرفتار کروا کے قید میں ڈالوانے کی۔ تو اس قید پہ خفا کیوں ہوتے ہو؟“

”وہ نیک کام تو میں اپنے ہاتھوں سے سرانجام دوں گا، مگر یہاں کسی صورت بھی میں آپ کو اس سب کا حصہ نہیں بننے دوں گا۔“ وہ واقعی دے دے غصے میں آیا نظر آتا تھا۔

”تھینک یو ایڈم۔“

”ظاہر ہے چے تالیہ۔ مانا کہ آپ انتہائی فراڈ اور بے وفا انسان ہیں، سوائے دولت کے آپ کسی کے ساتھ وفاداری نہیں نبھاتیں، مگر ہم اس سب میں ساتھ ہی آئے تھے اور ساتھ ہی جائیں گے۔“

”ایڈم!“ وہ برا مانے بنا چونک کے بولی۔ ”میں بتانا ہی بھول گئی... میں نے اس روز خواب دیکھا کہ.... میں کے ایل میں ہوں۔ ایک آفس میں۔ نئے دور میں۔“

”اس میں کیا بڑی بات ہے؟ میں روز خواب دیکھتا ہوں کہ میں کے ایل میں ہوں اور میری شادی ہو رہی ہے۔“

”نہیں ایڈم۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے سرخ یا قوت والی انگوٹھی دکھائی۔ ”یہ انگوٹھی میں نے اس خواب میں پہن رکھی تھی۔ یہ انگوٹھی! اور اس کا مطلب ہے.... وہ خواب آنے والے وقت کا ہے۔ یعنی کہ ہم واپس جائیں گے ایڈم!“ وہ پہلی دفعہ دل سے مسکرائی۔ ایڈم کے لب بھی خوشگوار مسکراہٹ میں ڈھلے۔

”ہم؟ کیا اس خواب میں ہمیں بھی تھا؟ اور وان فاتح بھی؟“

تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”کتابیں... تمہیں مقفل الماری کی کتابیں چاہیے ہیں تا میں کچھ کرتی ہوں اچھا۔“ اور مڑ کے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اسے اس طرف لپکیں۔ تالیہ اس سے نظر ملانے بغیر آگے بڑھ گئی۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو جاتے دیکھنے لگا۔

”کیا ہم اس خواب میں نہیں تھے، چے تالیہ؟ کیا ہم واپس نہیں جائیں گے؟“ اس نے زیر لب کہا مگر وہ اُن سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔ وہ بالکل گم صم سا ہو گیا۔

ملکہ یان سوفو سبزہ زار پہ بنی اس اونچی بارہ دری میں بیٹھی تھی کس کے اوپر چھتری نما کنیو پی بنی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، وہ گال تلے انگلی رکھے بیٹھی، گردن موڑ کے سبزے کو دیکھ رہی تھی۔ نیچے سبز ٹیلوں پہ گھاس اور پھول آگے دکھائی دے رہے تھے۔ درمیان میں ایک مصنوعی صاف پانی کا نالہ بھی بہہ رہا تھا۔

دفعتاً اس نالے کے ساتھ گھاس پہ شہزادی تاشہ چلتی دکھائی دی۔ اس کی رنگت قدرے بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ کنیروں کو اس نے وہیں چھوڑ دیا اور خود کنیو پی کی طرف آئی۔ لکڑی کے زینے چڑھے اور اوپر ملکہ کے سامنے آ کے سر جھکا دیا۔

”ملکہ عالیہ۔ آپ نے یا فرمایا تھا۔“ پھر سیدھی ہوئی۔

”شہزادی تاشہ!“ یان سوفو نے سر کو خم دیا اور مسکرا کے ابرو سے سامنے اشارہ کیا۔ ”بیٹھیے۔“

تالیہ سامنے لکڑی کے بیچ پہ بیٹھ گئی۔ زمر دلہاس ارد گرد پھول کی طرح پھیلتا گیا۔ گود میں رکھی انگلیاں باہم پھنسا رکھی تھیں۔

”تجویز کیسی لگی؟“

”کون سی تجویز؟“ وہ چونکی۔

”قرضے کی۔ اتنی جلدی بھول گئیں آپ؟“ ملکہ نے مسکرا کے غور سے اسے دیکھا تو اس کے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”سچ کہوں تو پریشان ہوں کہ ملا کہ یہ قرضہ کیسے اتار پائے گا۔“ وہ فکر مندی سے کہنے لگی۔ ”قرضہ ہر سال بڑھتا جائے گا۔ جب تک امیر

لوگ خراج اور محصول نہیں ادا کریں گے، ہم اس قرض کو اتار نہیں سکیں گے۔ اور....“

”سلطان کی بیوی بننے کے بارے میں آپ نے مجھے کب بتانا تھا، شہزادی صاحبہ؟“ وہ مسکراتے ہوئے ایک دم سے بولی تو تالیہ کے

الفاظ ٹوٹ گئے۔ لمحے بھر کو وہ چپ ہوئی۔

”مجھے خود مراد راجہ نے ابھی یہاں آتے وقت اطلاع دی ہے، ملکہ۔ میں بھی اتنی ہی پریشان ہوں جتنی کہ آپ۔“

”کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔“ مسکراتے ہوئے یان سوفو نے سر جھٹکا۔ ”آقا نے جلد یا بدیر کسی خاتون کو اپنے نکاح میں لینا ہی تھا

۔ یہ تو ازل سے طے تھا۔“

تالیہ نے سر جھٹک لیا اور گھنگریالی لٹ کان کے پیچھے اڑی۔ ”میں جلد از جلد یہاں سے جانے کی کوشش کرتی ہوں، تاکہ....“

”اور اگر نہ جاسکیں تو؟ سلطان کو کیسے روک پاؤ گی؟“ ملکہ کہنی کرسی کے ہتھ پہ جمائے، انگلی گال تلے رکھے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تالیہ نے شکوہ کناں نظر اٹھائی۔

”کوئی حل نکال ہی لوں گی۔ تال (رک کے نصیحت کی) تاشہ کے پاس منصوبہ ہمیشہ ہوتا ہے۔“

”وہ آدمی کہاں ہے؟ وہ جواب نے شہر میں تمہارا محبوب تھا؟“

جھرنے کے اندر جیسے کسی نے زور سے پتھر پھینکا تھا۔ سوال بے حد غیر متوقع تھا۔ اس کی دھڑکن بے ترتیب سی ہوئی۔ ”وہ.....!“

”اسی شہر میں ہے کیا؟ اکٹھے آئے تھے تم دونوں یا تمہارے پیچھے آیا ہے؟ وانگ لی کا کہنا ہے کہ اس کے ایک غلام سے ملنے تم اور تمہارا مورخ اس کے قبوہ خانے میں گئے تھے۔ ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ کیا وہی ہے وہ شخص؟“

”آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں‘ ملکہ۔“ آواز دھیمی رہی۔

”بہت خوب۔“ ملکہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور باوقار انداز میں اپنی تبا کو جھٹکا۔ ”مجھے ملو اسکتی ہو اس سے آج ہی؟“

تالیہ مراد کے لب بے یقینی سے کھل گئے۔ ”جی؟“ وہ ہکا بکارہ گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

سن باؤ تائی شان کی سرخ حویلی پہ اندھیرا چھرا ہا تھا۔ مغرب ڈھل چکی تھی اور کھلے صحن سے آسمان پہ دکتے تارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ برآمدے میں قدیلے جلی تھیں اور آرام کرسی پہ بیٹھافر بہہ سا وانگ لی، نانگوں پہ کمر لے کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔

سامنے صحن چاند کی روشنی میں نہایا ہوا تھا اور کنویں پہ جھکا فاتح دکھائی دے رہا تھا۔ کرتے پا جامے میں ملبوس، ماتھے پہ سبز پٹی باندھے وہ جھک کے ڈول اوپر کھینچ رہا تھا جب دروازہ بجا۔

وانگ لی نے کتاب بند کر کے اچنبھے سے دروازے کو دیکھا۔ ”اس وقت کون آگیا؟“

”میں دیکھتا ہوں، مالک۔“ فاتح نے ڈول اوپر نکالا اور زمین پہ رکھا تو پانی چھلک کے اس کے پیروں پہ گرا۔ ہاتھ بھی گیلے ہو گئے۔ وہ کرتے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے برآمدے میں آیا اور راہداری میں چلتا گیا۔ سن باؤ کی حویلی کا دروازہ کمروں کے اس طرف سے کھلتا تھا نہ کہ صحن سے۔

فاتح نے سرخ لکڑی کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ سامنے کچی زمین پہ ایک بگھی کھڑی تھی جس کے ساتھ صرف تین سپاہی تھے مگر وہ شاہی سپاہی تھے۔ وہ چونکا۔

دفعتا بگھی کا دروازہ کھلا اور نسوانی پیر نیچے زمین پہ اترا۔ پھر وہ پوری باہر نکلی۔ بھورے چننے میں ملبوس، زیور اور سنگھار سے پاک چہرہ لئے وہ سیدھی سامنے کھڑی ہوئی تو فاتح کا سر ذرا جھک گیا۔

”ملکہ عالیہ!“

مگر ملکہ اکیلی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد سن باؤ کے برآمدے میں جلتی قدیلوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ دیوار کے ساتھ جہاں قالین بچھا تھا اور تکیے لگے تھے وہاں فرش میز کے گرد ایک طرف یاں سوفا اور تالیہ بیٹھی تھی، دوسری طرف وانگ لی مودب سا بیٹھا تھا۔ کونے میں کھڑا فاتح دیوار پہ لگی مشعل جلا رہا تھا۔

”میرے غریب خانے کو آپ نے رونق بخشی، ملکہ۔“

”سنا ہے اپنے قبوہ خانے میں ملاکہ کے رؤسا سے بڑی جرات مندانہ باتیں کہنے لگ گئے ہو، وانگ لی!“ چنے کی ٹوپی کے ہالے میں ملکہ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ تالیہ جو کنکھیوں سے مشعل جلاتے غلام کو دیکھ رہی تھی، فوراً چونکی۔

”وہ وانگ لی کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ ان کے غلام کے الفاظ تھے۔ غلام کو مراد راجہ کے عتاب سے بچانے کے لئے میں نے کتاب میں تبدیلی کروائی تھی۔“

وانگ لی جو شکر یہ کہنے ہی والا تھا، قدرے کھسیانہ ہو گیا۔

ملکہ نے نظروں کا رخ موڑا۔ وہ مشعل جلا کے اب سنجیدگی سے رسوائی کی طرف جارہا تھا۔

”میں تمہارے اس غلام سے ملنے آئی ہوں، وانگ لی۔“

وان فاتح کے قدم زنجیر ہوئے۔ چونک کے مڑا۔

”تم میرے سامنے بیٹھو اور وانگ لی... تم میرے لئے چینی قبوہ تیار کرو گے۔ ملاکہ کے کڑے قبوے پی پی کے اللہ کی قسم میرا گلا اندر تک چھل گیا ہے۔“

نخوت سے بولی تو وانگ لی نے جھٹ سر جھکایا۔ ”جو حکم، ملکہ!“ وہ شاہ جبین کا وفا دار غلام تھا۔ فوراً سے اٹھ گیا۔

فاتح سامنے آ کے خاموشی سے بیٹھا تو ملکہ یاں سو فو ذرا سا مسکرائی۔ (تالیہ مضطرب سی باری باری دونوں کو دیکھتی تھی۔)

”مجھے یہاں دیکھ کے حیران ہو رہے ہو، وانگ لی کے غلام!“

میز کے دوسری طرف زمین پہ وہ دوزانو بیٹھا تھا۔ ہاتھ گود میں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ نگاہ نہیں جھکائی۔ ملکہ کو دیکھتے ہوئے سادگی سے

بولاً۔ ”میرا نام وانگ لی کا غلام نہیں ہے۔ وہ میرا مقام ہے۔ نام فاتح بن رامزل ہے۔ برانسان کا حق ہوتا ہے کہ اسے اس کے نام سے

پکارا جائے۔“

”مگر میری نظر میں تو تم صرف ایک غلام ہو!“

”پھر آپ کو اپنی نظر پہ صرف نظر کرنے کی ضرورت ہے ملکہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو عزت بخشی ہے۔ برانسان

مکرم ہوتا ہے اور اس کی عزت کرنے کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ وہ آدم کی اولاد ہے۔“

”تو اے غلام فاتح بن رامزل...“ وہ کہنیاں چھوٹی میز پر رکھے آگے ہوئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس بات سے واقف تو ہو گے

کہ تمہاری، شہزادی تاشہ کی شادی سلطان مرسل سے کی جا رہی ہے۔“

تالیہ نے نظریں جھکا دیں۔ صورت حال عجیب سی ہو گئی تھی۔

”جی ملکہ۔ واقف ہوں۔“ اس نے تالیہ کو دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تو تاشہ کو اس مصیبت سے نکالنے کے لئے کیا کیا ہے تم نے؟ میری اطلاع کے مطابق تم تاشہ کے گاؤں سے ہو اور اس کے ساتھ آئے ہو۔“

فاتح نے اب کے تالیہ کو دیکھا۔ اس نے بھی نظریں اٹھائیں۔ وہ جیسے سمجھنا چاہ رہا تھا کہ ملکہ کیا جانتی ہے اور کیا نہیں۔
 ”میں اس چیز کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ میں شہزادی کو جلد واپس لے جاؤں گا۔ واپس لے جانے کا وعدہ میں نے عرصے سے ان سے لے رکھا ہے۔“

”اور اگر...“ ملکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آگے کوچھکی۔ ”اگر تم کبھی واپس نہ جاسکتے تو اس شادی کو کیسے روک سکو گے۔“
 ”ہم واپس جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔“

”اور اگر نہ جاسکو غلام فاتح؟ بولو۔ جواب دو۔“ وہ ایک دم پھنکاری۔ وہ خاموش ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے نظریں ملکہ پہ جمائے رکھیں۔

”شہزادی تاشہ اپنے باپا کو انکار کر دیں گی اور اس چیز کی نوبت نہیں آئے گی۔“
 ”شہزادیوں کے انکار کوئی نہیں سنتا، غلام فاتح۔“ وہ تلخی سے بولی۔ نظریں فاتح پہ جمی تھیں۔ ”بندہ ہاں اس رشتے سے خوش ہے۔ وہ جبراً یہ شادی کروادے گا۔ اور سلطان مرسل... وہ انکار کی صورت میں بندہ ہاں کے محل پہ چڑھائی کروادے گا۔ عورت کے نام پہ پہلے بھی بہت سی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ایک اور سہی۔“

”ملکہ... اگر آپ خود یہاں آئی ہیں تو یقیناً اس مسئلے کا کوئی حل بھی سوچ کے آئی ہوں گی۔“
 ملکہ نے گہری سانس لی اور پیچھے کوہو کے مسکرائی۔ ”جانتے ہو ملاکہ کے سلطان سے شادی کرنے والی عورتوں میں کون سی قدر مشترک ہونی چاہیے؟ چاہے وہ امیر ہو یا غریب، بد صورت ہو یا حسین، شاہ چین کی بیٹی ہو یا ایک جنگی قیدی کنیز۔ ان سب کا ایک شرط پورا کرنا لازم ہے!“

تالیہ گم صم سی اسے دیکھ گئی۔
 ”اور وہ کیا ہے، ملکہ؟“ وہ سمجھ رہا تھا۔
 ”سلطان کی دہن غیر شادی شدہ ہونی چاہیے۔ نہ وہ پہلے کسی کی کنیز رہی ہو نہ بیوی۔“
 لمحے بھر کو سرخ حویلی میں سناٹا چھا گیا۔ پھر صحن میں آگے بوڑھے درخت کے پتے ہوا سے جھنجھنائے اور قندیلوں کے شعلے پھڑپھڑائے۔ عجیب پر اسرار ساما حول بن گیا تھا۔

فاتح ملکہ کی آنکھوں میں دیکھتا آگے کو جھکا اور ہاتھ باہم پھنسا کے میز پر رکھے۔
 ”تو آپ چاہتی ہیں کہ میں شہزادی تاشہ سے شادی کر لوں؟“

الفاظ تھے یا کیا... تالیہ کا سانس تھم گیا۔ ناخن ہتھیلی میں پیوست کر لیے۔

ملکہ بھی اسی کے انداز میں آگے کوچھکی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”کیا سلطان مرسل سے تاشہ کو بچانے کے لئے تم اس سے شادی کرو گے؟“

”ملکہ عالیہ!“ وہ ذرا سا مسکرایا۔ ”میں اس شہر میں ایک غلام ہوں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ مگر اپنے شہر میں.... میں

حاکموں میں سے ایک تھا۔ اور میرے جیسے لوگ بدلے میں کچھ مانگے بغیر فیصلے نہیں کیا کرتے۔“

تالیہ کی ہتھیلی ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بس ساکت سی اسے دیکھ گئی۔ نہ وہ حیران ہوا تھا نہ چونکا تھا۔ وہ شاید تیار تھا۔ کیا اس کو معلوم تھا کہ آگے کیا

ہونے جا رہا ہے؟

ملکہ کو البتہ اچنبھا سا ہوا۔ اسے اس ردِ عمل کی توقع نہ تھی۔

”میں تم سے پوچھ رہی ہوں تم تاشہ بہت مراد سے شادی کرو گے؟“

”اور میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے بدلے میں کیا ملے گا؟“

”میرے سوال کا جواب دو غلام۔ تم تاشہ سے نکاح کر کے قاضی وقت کو گواہ بنا کر مراد اور سلطان کے سامنے جا کے یہ کہہ سکو گے کہ تم

تاشہ کے شوہر ہو؟“

”ایک بحری جہاز چند سپاہی۔ اور وانگ لی کی غلامی سے آزادی۔ کیا یہ دیں گی آپ مجھے؟“ وہ ابھی تک سر دسا مسکرا رہا تھا۔ ملکہ کی رنگت

گلابی پڑنے لگی۔

”میں غلاموں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتی!“

”بہت سی چیزیں پہلی دفعہ کرنی پڑتی ہیں ملکہ عالیہ۔ آپ کے اوپر سلطان صرف ایک سو کن نہیں لا رہا۔ وہ ملا کہ کی نئی ملکہ لا رہا ہے۔ ایک

بحری جہاز چند سپاہی اور وانگ لی کی غلامی سے آزادی دلا دیں مجھے۔ میں تاشہ سے شادی کر کے آپ کے تخت و تاج کو ہنوارے سے

بچالوں گا۔ میرے علاوہ آپ کو ملا کہ میں کوئی مرد ایسا نہیں ملے گا جو سلطان سے منسوب لڑکی سے شادی کرنے کی جرات کر سکے۔“

ملکہ لب بھنچے اسے دیکھ گئی۔ ”کیا راجہ مراد کے سامنے اس کی بیٹی کو بیوی کہنے کی ہمت رکھتے ہو؟ کیا سلطان کو یہ بتا سکتے ہو کہ اس سے

منسوب شہزادی شادی شدہ ہے؟“

وہ جواباً مزید آگے جھکا۔

”فاتح بن رامزل... ایک آزاد انسان ہے... اور وہ... کسی سے... نہیں ڈرتا!“ چبا چبا کے بولا۔

وہ سب کچھ خاموشی سے سنے جا رہی تھی۔ صحن میں آگے درخت کی ہلتی شاخیں اور برآمدے کی قدیلوں کے پھڑپھڑاتے شعلے... اور وہ

باتیں... اسے ہر چیز وحشت دلا رہی تھی۔ وہ اس سے زیادہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

”ملکہ!“ وہ بولنے لگی... مگر ملکہ نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کروادیا۔

”تم نے مجھ سے وفاداری کی قسم کھائی تھی، تاہم۔ اس لیے خاموش رہو۔ ویسے بھی تمہیں اس آدمی سے شادی کرنی تھی نا، تم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو.. تو وہ شادی میں کروائے دیتی ہوں۔ میں صبح اعلیٰ عدالت کے ایک چینی قاضی کو بلواتی ہوں۔ ان کے سامنے تم اس غلام سے شادی کرو گی۔ اور پھر یہ آزاد انسان بن جائے گا۔ اگر تم مجھ سے وفادار ہو اور واقعی ملکہ نہیں بنا چاہتیں تو تمہارے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔“ ملکہ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کے زیر اثر تھی۔

تالیہ کا حلق خشک ہو گیا۔ صحن کی تاریکی اور اوپر چمکتے تارے... ان سب کا سنا اس کے اندر اترنے لگا۔ وہ بار بار لب کھولتی، مگر الفاظ جیسے ختم ہو گئے تھے۔ پھر اس نے سر جھکا دیا۔ ”مجھے وعدے نبھانے آتے ہیں، ملکہ۔ آپ ہماری واپس جانے میں مدد کریں گی۔ جواب میں میں اور فاتح (اس کی طرف دیکھا بھی نہیں) وہی کریں گے جو آپ کہیں گی۔“

یان سو فو کا چہرہ ایک دم شانت ہو گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”وانگ لی صبح قاضی کو لے آئے گا اور اس کے سامنے یہ نکاح ہو گا۔“

”صبح!“ فاتح نے اچنبھے سے ابرو اٹھائی۔ ”اتنی جلدی کیا ہے، ملکہ؟ ابھی تو شادی میں کئی دن پڑے ہیں۔“

”سنو فاتح بن رامنزل!“ وہ تیز لہجے میں پھنکاری۔ ”میں شاہ چین کی بیٹی ہوں۔ قیافہ شناسی کے علوم سے آراستہ کر کے بھیجا تھا مجھے میرے باپ نے۔ چہرہ دیکھ کے سارا ماضی پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ مستقبل بھی۔“

”میرے چہرے پہ کیا نظر آتا ہے آپ کو، ملکہ؟“

یان سو فو استہزایہ سا مسکرائی اور آگے بڑھی۔

”سچے ہو اور ایماندار بھی۔ نڈر ہو اور بہادر بھی۔ مگر...“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ چبا چبا کے بولی۔ ”خود غرض ہو... منقاد پرست اور سب سے بڑھ کے... بے وفامرد ہو تم۔ صرف خود سے محبت کرتے ہو اور طاقت کی خواہش رکھتے ہو۔ شہزادی کو تم سے سچی محبت ہے، (تالیہ کی نظریں فوراً جھکیں) مگر تمہیں اس سے محبت نہیں ہے۔ اس لئے تمہارا اعتبار نہیں ہے مجھے۔ صبح سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتی میں۔“

وہ چنچہ سنبھاتی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ دونوں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ وہ اس کے الفاظ پہ ہلکا سا ہنس دیا۔

”آپ مجھے نہیں جانتیں، ملکہ۔ آپ نے میری زندگی نہیں گزاری۔“

ملکہ اس کو نظر انداز کیے تالیہ کی طرف گھومی جو بد دل سی نظر آرہی تھی۔

”تمہارا انتخاب اتنا متاثر کن نہیں تھا، تاہم۔ عام حالات میں، میں تمہیں کبھی ایسے آدمی سے شادی کا مشورہ نہ دیتی جو صرف خود سے محبت کرتا ہو اور جسے وعدے نبھانے نہ آتے ہوں۔ یاد رکھنا، یہ آدمی کبھی وعدے پورے نہیں کر سکتا۔ مگر خیر...“ اس نے شانے جھٹکے۔ ”اس سے

کیا فرق پڑتا ہے۔ شہزادیوں کی شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں۔“

وہ کہہ کے آگے بڑھی تو تالیہ تڑپ کے اس کی طرف گھومی۔ ”کیا آقا کو پسند آجانے والی برلڑکی کی شادی کروادیں گی آپ؟ کس کس کو آقا کے نکاح میں آنے سے روک پائیں گی آپ۔“

یان سو فو سکون سے اس کی طرف پلٹی اور گہری سانس لی۔ ”کیا تم بھول گئی ہو کہ میں وہ ملکہ ہوں جس نے تمہارا گاؤں الور سوئنگائی جلا کے راکھ کر دیا تھا۔ سارے شکار بازوں کو قید کروالیا تھا۔ تمہیں اپنا وفادار سمجھتی ہوں اس لئے تمہارا نکاح کروا رہی ہوں۔ دوسری کوئی ہوتی تو اس کی گردن اترا کے چوک میں لٹکا دیتی۔“

اور ایک نگاہ غلط ان دونوں پہ ڈال کے آگے بڑھ گئی۔

”قبوہ کل پیوں گی میں وانگ لی، ابھی میرے ساتھ باہر آؤ۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔“ بلند آواز سے رسوئی میں موجود وانگ لی کو کہا اور باہر نکل گئی۔ وہ بھی سب کام چھوڑ کے اس کے پیچھے پکا۔

وہ دونوں چلے گئے تو سرخ حویلی کے سناٹے بڑھ گئے۔ وہ شکوہ کناس ہی اس کی طرف گھومی۔

”اچھا بھاتاؤ کر لیتے ہیں آپ۔“ اس کے کان سرخ دہک رہے تھے اور گلارند ہنسنے لگا تھا۔

”یہ تمہیں ملکہ کے سامنے اپنے اور میرے بارے میں کہانیاں گھڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ وہ تیزی سے بولا، پھر گہری سانس لی۔ ”مگر خیر.... یہ کہانی سچ بتانے سے بہتر تھی۔ سچ یہ وہ یقین نہ کرتی۔ شہزادی کے لئے بننے والے غلام پہ کر لیتی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

تالیہ کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بدقت اس نے حواس پہ قابو پایا۔ ”ظاہر ہے.... میں کہانیاں گھڑنے میں ہی تو اچھی ہوں۔ یہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ خزانے کی تلاش میں ہم چھ سو سال پیچھے آئے ہیں۔ اس لئے یہی کہہ دیا کہ آپ اور میں...“ سر جھٹکا۔ ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

”تم نے ٹھیک کیا۔ تم یہی کر سکتی تھیں۔“

”ملکہ کے سامنے راضی ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”ہم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ الور سوئنگائی چلے جائیں گے یا کہیں اور لیکن...“

”تالیہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں مراد راجہ سے وہ چابی حاصل کرنی ہے اور اس کے لیے ہمیں مراد کو اپنی بات ماننے پہ مجبور کرنا ہے۔ ہمیں وہی کرنا ہوگا جو ملکہ کہہ رہی ہے۔ اور سنو.... مجھ پہ بھروسہ کرو۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم دونوں کو نکال کے لے جاؤں گا یہاں سے تو مجھے اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے جو بھی کرنا پڑے میں کروں گا۔ ملکہ میرے وعدوں سے واقف نہیں ہے۔“

”آپ شادی شدہ ہیں تو انکو۔ آپ کے دو بچے ہیں۔ بیوی ہے۔ آپ اس دنیا میں غلام نہیں ہیں۔ آپ ملک کے اگلے وزیر اعظم ہیں۔“

میں آپ سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟“

”شادی نہیں کرنی، لڑکی۔ صرف ایک کاغذ پہ دستخط کرنے ہیں جو ہمیں آزادی دلوا سکتا ہے۔ کس طرح.. یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ابھی تم ملکہ کی بات مان لو تو میں واپس جاتے ہی تمہیں آزاد کر دوں گا۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوگا۔“

تالیہ کا دل ایک دم خالی ہو گیا۔ سارے خدشات واپس آئے، خوف سب دم توڑ گئے۔ وہ بس اس کو تعجب اور ملال سے دیکھ گئی۔

”تو یہ کوئی اصلی شادی نہیں ہوگی۔ صرف... صرف ایک پیپر میرج ہوگی۔ جو واپس جاتے ہی ختم ہو جائے گی۔“

”بالکل۔ کیونکہ یہ اسی طرح ہونا ہے۔“ وہ اب دھیمے لہجے میں اس کو سمجھا رہا تھا۔ ”ہمیں ملکہ یا سلطان کا نہیں سوچنا۔ ہمیں صرف اپنا سوچنا ہے۔ ہمیں وہ کرنا ہے جو اس... اس وقت کی قید سے نکلنے میں ہماری مدد کرے۔“

”اور اس شادی سے ملکہ کے راستے سے میں ہٹ جاؤں گی لیکن ”ہمیں“ کون سا فائدہ ہوگا؟ مراد اور اجہ آپ کی جان لے لے گا تو انکو۔“

”میں نے کہا نا میرے پاس پلان ہے۔ بھروسہ رکھو۔ یہ اسی طرح ہونا تھا۔“

”تو آپ نے تاریخ کی کتابوں میں یہ پڑھ رکھا تھا۔“ اسے اب سمجھ آیا تھا۔ ”اور پڑھاتو میں نے بھی تھا۔ شہزادی تاشہ کی شادی ایک غلام

سے ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں، مگر آپ جانتے ہیں... آپ صرف مجھے ایک سیاسی چال کے طور پہ استعمال کر رہے ہیں۔ ہے نا؟“

اس کے اعصاب دھیرے دھیرے ڈھیلے پڑنے لگے۔ قسمت کے آگے بے بسی... ان الفاظ کا مطلب آج سمجھ آیا تھا۔

”مجھے یہی کرنا آتا ہے تالیہ اور جو ہمیں آتا ہے وہ ہماری جان بچائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ملکہ کی بات مان لیتی ہوں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے مگر...“ وہ ایک دم پاٹ سی ہو چلی۔ ”ایک

لہجے کے لئے بھی یہ مت سوچیے گا کہ ملکہ کو بتائی گئی اس کہانی میں کوئی صداقت تھی۔ (تھوک نگلا)۔ میں چاہوں گی کہ جیسے ہی یہ مسئلہ ختم ہو،

آپ مجھے فوراً آزاد کر دیں اور عصرہ اور آپ کے بچوں کو کبھی علم نہ ہو کہ ایسا کچھ ہوا تھا۔“

”میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور...“

”مجھے آپ سے کیا، کسی سے شادی کرنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ ایک تجربہ بہت تھا۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کو اپنی تکمیل

کے لئے کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے زندگی گزارنے کے لئے کسی جنگجو کا ساتھ نہیں چاہیے۔ میرے لئے میری اپنی تلوار ہی کافی ہے

۔“ آخر میں اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ خود بخود ختم ہو گئی۔ عجیب غصہ سا آنے لگا تھا۔

وان فاتح نے کندھے اچکا دیے۔ ”ظاہر ہے۔ میں یہ سب سمجھتا ہوں۔“

”بہت بہتر!“ وہ آگے بڑھی، پھر رکی۔ گردن موڑ کے چاندنی میں نہائے صحن کو دیکھا۔ نگاہ ٹھہری تو ٹھہر ہی گئی۔

وہی صحن۔ وہی کنواں۔ اور دوسرے کونے میں خالی جگہ۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صحن میں قدم رکھا۔ ہوا

سے چغ کی ٹوپی پیچھے گر گئی اور سنہری بال نظر آنے لگے۔

وانگ لی واپس آیا تو کھٹکھار کے اسے مخاطب کیا۔

”ملکہ رخصت ہو گئیں۔ آپ کے لیے دوسری بگھی روک رکھی ہے۔ کیا آپ قبوہ لیں گی؟“

”نہیں شکریہ۔“ اس کی بے خود نگاہیں اس صحن پہ جمی تھیں۔ عجیب سی پراسراریت تھی اس میں۔ جیسے سرخ اینٹوں تلے صدیوں پرانی داستانیں مدفن ہوں۔

”سن باؤ۔“ وہ اسی کیفیت میں بولی۔ ”یہ کونا خالی کیوں ہے؟ کیا آپ نے یہاں کچھ نہیں بنوایا۔“

”میں نے اس کو مجسمے سازی کے لئے چھوڑ رکھا تھا، شہزادی۔“ وہ ہاتھ باندھے اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

”مجسمے کے لئے؟“ وہ چونک کے اس کی طرف مڑی۔ ”آپ اپنا مجسمہ بنانا چاہتے ہیں۔“

”ایک زمانے میں بڑی خواہش تھی میری شہزادی۔ مگر پھر وقت نہیں مل سکا۔ کیا آپ کو بھی مجسمہ سازی سے شغف ہے۔“

”جی... میں... تصاویر اور مجسمے بنالیتی ہوں۔ تھوڑا بہت یہ کام آتا ہے مجھے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”کیا آپ....“ وہ جوش سے کہنے لگا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں، سن باؤ۔ میں مجسمہ بنا سکتی ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کا مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ میں تو یونہی ایک سوال پوچھ رہی تھی۔“

پھر فاتح کو دیکھا جو اس کے صاف انکار پہ ابرو اٹھا کے زیر لب بولا تھا۔ (سیر کیسلی؟)

”اتنے حیران مت ہو، غلام فاتح!“ وہ چبا چبا کے بولی۔ ”مجھے وانگ لی کا مجسمہ تراشنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شاید تمہیں لگا ہو کہ

شہزادی تا شہ وانگ لی کا مجسمہ بنائے گی۔ یقین کرو، تمہیں غلط لگا ہے۔ کیونکہ میں.... کوئی مجسمہ بنانے.... یہاں نہیں آنا چاہتی۔“ پھر وانگ

کو دیکھا اور مسکرائی۔ ”شب بخیر، سن باؤ۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

اور سپاٹ چہرے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

ایڈم بن محمد جس وقت شہزادی تا شہ کے کمرے سے ملحقہ بیٹھک میں داخل ہوا وہ سن باؤ کے گھر سے رخصت ہونے والی پرسکون اور سپاٹ

تالیہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اڑی رنگت اور پریشان چہرے والی لڑکی لگ رہی تھی جو ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔

”ایڈم!“ اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ ایڈم نے لاشعوری طور پہ اپنا دایاں ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”دیکھیں شہزادی، آپ کے جو بھی ارادے ہیں، میں بتائے دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کو اس کے ہاتھ سے محروم کرنا کبیرہ گناہوں میں سے

ہے اور....“

”ملکہ چاہتی ہیں میں وان فاتح سے شادی کر لوں۔“

محل کے باہر ایک دم تیز ہوا چلی۔ کھڑکی میں رکھے چراغ کا شعلہ پھڑپھڑایا۔

ایڈم بالکل ساکت رہ گیا۔ ہاتھ ڈھیلا سا ہو کے پہلو میں آن گرا۔

”کیا مطلب؟“ الفاظ حلق میں پھنس گئے۔

”مطلب میں ہی تو ابھی ہوں۔ اگر وان فاتح سے شادی نہ کی تو سلطان مرسل سے کرنی پڑے گی۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ اس سے پہلے مراد راجہ ہمیں چابی دے دے۔ اس لئے ملکہ نے...“ وہ پھر سے دائیں بائیں ٹہلنے لگی اور سارا قصہ سنا ڈالا۔ آخر تک ایڈم سنبھل چکا تھا اور چہرے کے زاویے بگڑ چکے تھے۔

”بہت خوب۔ اور آپ کے خیال میں جب سلطان کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ شادی شدہ ہیں تو وہ مسکرا کے کہیں گے... بہت معذرت، محترمہ“ میں نے ایسے ہی آپ کو زحمت دی۔ آپ پیادیں سدھاریے میں اپنے گھر کا راستہ پتا ہوں۔ جی نہیں چے تالیہ۔“ وہ غصے سے بولا تھا۔ پتہ نہیں اسے غصہ کس بات پہ زیادہ آ رہا تھا۔ ”اس شادی پہ ایسی قیامت کھڑی ہوگی کہ الا مان۔ راجہ مراد آپ کی اور فاتح صاحب دونوں کی جان لے لے گا۔“

”فاتح کا کہنا ہے کہ ان کے پاس پلان ہے۔ وہ راجہ کو قابو کر سکتے ہیں۔“

ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر مٹھیاں بھیج لیں۔ ”ان کے وعدے سیاسی وعدے نکلے تو؟“

”وہ چاہتے ہیں میں ان پہ بھروسہ کروں۔“

”اور آپ خود کیا چاہتی ہیں؟“

”میں.....“ وہ چوکی پھر سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا اور مسہری پہ بیٹھ گئی۔ ”میں رضامندی دے چکی ہوں اب میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”فرق پڑتا ہے، چے تالیہ۔“ وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کے بیٹھا اور امید سے بولا۔ ”اگر آپ ایسا نہیں چاہتیں تو مجھے بتائیں۔ ہم کوئی اور حل نکال لیں گے۔ یہ ملکہ تو بالکل اولڈ فیشن ہے۔ اس کے زمانے میں سوائے مکند سوکن کو زبردینے، الٹانا ننگے یا اس کو کسی اور کے ساتھ بھگا دینے کے کوئی حل نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہم اسمارٹ زمانے کے اسمارٹ لوگ ہیں۔ بھلے آپ نے ملکہ کو جو بھی کہانی گھڑ کے سنائی ہو، اگر آپ.....“

”وہ کہانی نہیں تھی ایڈم!“ اس نے تڑپ کے سر اٹھایا تو بکھرے بکھرے سنہرے بالوں کے ہالے میں زرد پڑتا چہرہ بے بس سا نظر آتا تھا۔ شاہی مورخ کے سارے الفاظ دم گھٹ کے مر گئے۔

وہ وقت کی طرح تھم گیا۔

”تو وہ سچ تھا؟“ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ”آپ ان کی محبت میں گرفتار ہیں؟ یہ فین گرل ہونے سے زیادہ شدید ہے۔ اوہ چے تالیہ!“ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

تخت و تاج کے لیے جنگیں لڑنے والے... جلوں میں رہنے والے... آخر میں کس مقام پہ آ کے روتے تھے؟ ایک دل تھا جو میر غریب

سب کا ایک ہی طرح سے دھڑکتا تھا۔ اوہ چپے تالیہ!

تالیہ کی سیاہ آنکھوں کے کٹورے بھگیتے گئے۔

”یہ صرف ایک خواہش تھی جو میں کبھی پوری نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ شادی شدہ ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔“

وہ کافی دیر کچھ بول نہ سکا۔

”مگر وہ کہتے ہیں کہ ان کی بیوی کو علم بھی نہیں ہوگا اور وہ آپ کو فوراً چھوڑ دیں گے!“ اب کے وہ بولا تو سنجیدہ اور پاٹ سا تھا۔ بیٹھک میں

مدھم بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی زرد روشنی میں سامنے بیٹھی شہزادی ایک بے بس اور مجبور لڑکی سے زیادہ کچھ نہیں دکھ رہی تھی۔

”اور یہی تو وہ نہیں جانتے کہ ایسا ادھورا ساتھ میرے لئے کتنا تکلیف دہ ہوگا۔ اگر کسی سے صرف پیپر میرج کرنی ہوتی اور بعد میں چھوڑ

دینا ہوتا تو مجھے فرق بھی نہ پڑتا۔ ایک طلاق ہو چکی ہے میری۔ اور جو لڑکی طلاق کو سروائیو کر لیتی ہے وہ ہر چیز سروائیو کر سکتی ہے۔ مگر ایڈم

... اس کاغذی کھیل کو میں کیسے سروائیو کروں گی۔“

”چپے تالیہ!“ وہ ملال سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کیا آپ کے پاس سلطان مرسل سے نجات کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“

”میرے پاس شاید بہت سے راستے نکل آتے مگر وہ ان فاتح کو لگتا ہے کہ ان کے منصوبے کے لئے یہ حل بہترین ہے۔ تاریخ میں ایسا ہی

لکھا ہے۔ تاشہ کی شہزادی ایک غلام سے ہی ہوتی ہے۔“

”اور آپ؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ وہ ان فاتح پہ بھروسہ کر کے آپ کو غلطی کریں گی یا غلطندی؟“

”میں نفع نقصان دیکھے بغیر ان پہ بھروسہ کرنا چاہتی ہوں۔“

ایڈم نے گہری سانس لی اور آنکھیں مسلیں۔ پھر کچھ دیر سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے۔ پھر آپ یہ شادی کر لیں۔ ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور واپس جا کے وہ آپ کو آزاد کر دیں گے یوں ان کا اپنا

گھر بھی محفوظ رہے گا۔ کوئی برٹ نہیں ہوگا، کسی کا گھر نہیں ٹوٹے گا۔ آپ تو ان کے ساتھ رہنے کی خواہش کو کبھی بھی پورا نہیں کرنا چاہتی تھیں

نا، تو پھر کیا ہوا جو وہ آپ کو چھوڑ دیں گے۔ جذباتیت کے بغیر اس کو ایک منصوبے کی طرح لیں۔ جیسے زندگی میں بہت سے کردار کیے ہیں

آپ نے، ایسے ہی اس کردار میں بھی ڈھل جائیں۔ چند دن کا ایک scam جو ایک دن جلدی کی طرح پھٹ جائے گا۔“ وہ دھیمے لہجے میں

سمجھا رہا تھا۔ تالیہ نے ملال بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”یعنی تالیہ کی شادی ہمیشہ ایک scam ہی ہوگی؟ scam کی طرح شروع... scam کی طرح ختم۔ کیا ساری عمر جھوٹ بولنے کی

یہی سزا ہوتی ہے؟ کہ جب زندگی کا سب سے بڑا جج بولنا چاہو تو کوئی یقین ہی نہ کرے۔“

ایڈم نے نظریں جھکا دیں۔ لمحے شرمندہ شرمندہ سے پھسلتے رہے۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے غم آنکھیں رگڑیں اور گردن اٹھا کے ذرا بہت سے بولی۔ ”میں یہ شادی کر لوں گی اور وہ ان فاتح پہ بھروسہ کروں گی

۔ ہم واپس جائیں گے۔ میرا خواب کہتا ہے کہ ہم نئے زمانے میں ہوں گے۔“

”مگر اس خواب میں میں نہیں تھا۔ خیر!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ نے وانگ لی کا مجسمہ بنانے سے انکار کیوں کر دیا؟“ اس نے سارے قصبے میں تالیہ کی سنائی گئی دوسری اہم بات کا تذکرہ کیا۔ تالیہ نے برنجی سے کندھے اچکائے۔

”مجھے کیا ملنا ہے وانگ لی کا مجسمہ بنا کے؟“

”آپ کو عصرہ بیگم نے بتایا تھا کہ وانگ لی کا مجسمہ شہزادی تاشہ نے بنایا تھا۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کی وانگ لی سے دوستی تھی وانگ لی نے خواہش کی کہ وہ اس کا مجسمہ بنائے اسی لیے شہزادی سرخ حویلی میں آیا کرتی تھی۔“

”اور میں نے خواب میں شہزادی کو پشت سے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً میں ہی تھی اور وہ مجسمہ بنا رہی تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجسمہ بنانے نہیں دراصل بالائی منزل کے مکین سے ملنے جاتی تھی۔“

”اور ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ مکین کون ہے۔ سو مجسمہ بنالیں شہزادی صاحبہ۔ اس کو آپ کے ہاتھوں سے ہی بننا ہے۔ وانگ لی کی دوستی میں نہ سہی بالائی منزل کے مکین سے ملنے کے لئے ہی سہی۔“

”کیا ضروری ہے کہ ہم ہر کام وہی کریں جو اس کتاب میں لکھا ہے؟ ہونہ۔ میں تاریخ کو بدلنا چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں کرنا چاہتی۔ بس۔“ وہ ناگواری سے انھی اور لباس کی احتیاط کیے بغیر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ سادہ مگر لمبے گھیرے کے لمبے کاندار امیز کے کیل سے الجھا اور کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ وہ رکی اور غصے سے کپڑا کھینچا۔ تین چار انچ کا چاک پڑ گیا۔ مگر کپڑا کیل سے علیحدہ ہو گیا۔

”احتیاط سے شہزادی!“

تالیہ نے مڑ کے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ ”کون سے ہیرے جو اہرات لگے ہیں اس لباس میں جو میں احتیاط کروں؟“

”یہ آپ کا لباس ہے اس کے قیمتی ہونے کے لئے یہی کافی ہے۔ ویسے بھی شہزادیوں کے میلے اور پھٹے پرانے لباس بھی صدیوں بعد میوزیم میں رکھے جاتے ہیں تو پھر قیمتی ہے۔“ وہ جو سر جھٹک کے آگے بڑھ رہی تھی ایک دم ٹھہری گئی۔ جیسے منجمد ہو گئی ہو۔

سارا محل اور ساتھ بہت ملا کہ کا سمندر... سب برف بن گیا تھا اور وہ اس میں نیلا برف ہوا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ دماغ میں جیسے کسی نے برف کی سل گھونپ دی تھی۔

چونک کے اس نے ایڈم کو دیکھا۔ وہ اب ادب سے رخصت لے رہا تھا۔ تالیہ سن کھڑی رہی۔

مگر اس ایک لمحے میں بر چیز بدل گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

صبح طلوع ہوئی اور شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کی کھلی کھڑکیوں سے روشنی نے اندر جھانکا تو تالیہ مراد کو دروازے کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ شریفہ سامنے ہاتھ باندھے مود کھڑی تھی اور تالیہ ہاتھوں میں پکڑا رقعہ پڑھ رہی تھی جو راز داری سے اس تک پہنچایا گیا تھا۔

”اشراق کے وقت تک آپ کو میری حویلی میں ہونا چاہیے شہزادی تاشہ۔ باقی سب بھی موجود ہوں گے۔ سن باؤ۔“

اس نے رقعہ مٹھی میں مروڑ دیا اور بازو سے بندھا ایک دوسرا رقعہ نکال کے شریفہ کی طرف بڑھایا۔

”سب سامان کی فہرست ہے۔ اسے میری بگھی میں رکھواؤ۔ میں تیار ہونے لگی ہوں۔ پھر مجھے سن باؤ کی طرف جانا ہے۔“ دانستہ اونچی آواز میں بولی کیونکہ کھلے دروازے پہ اس نے مراد کو رکھتے دیکھ لیا تھا۔

”سن باؤ وانگ لی کی طرف؟ خیریت؟“ وہ کمر پہ ہاتھ باندھے شاہی قبا میں ملبوس، سنجیدہ رعب دار سے انداز میں سوال کرتا اندر داخل ہوا تو شریفہ جھٹ سامنے سے ہٹی اور تالیہ نے فوراً سر جھکایا۔ ”رُجبہ! صبح بخیر۔!“ پھر سر اٹھا کے مسکرا کے بولی۔

”وانگ لی نے مجھ سے ایک خواہش کا ظہار کیا تھا کہ میں اس کا مجسمہ بناؤں۔ شادی تک خود کو مصروف رکھنے کا اس سے بہتر بہانہ مجھے کہاں ملے گا۔ اسی لئے مجسمہ سازی کا سامان لے کر آج وانگ لی کی طرف جانا ہے مجھے۔“

”ویسے..“ مراد اس کو بغور دیکھنے لگا جیسے سوچ میں پڑ گیا ہو۔ ”شہزادی کو ایک چینی غلام کا مجسمہ بنانا زیب نہیں دیتا۔“

”وہ چینی غلام نہیں سفارتکار ہے۔ ملا کہ کو قرضہ لا کے دے رہا ہے اور ملکہ یان سو فو کا وفا دار ہے۔ ملکہ کے وفا دار سے تعلقات اتنے رکھوں گی تو مجھے ہی آسانی ہوگی۔“

وہ مراد کے سامنے کھڑی، سادگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔

”تو تم اب اس شادی کے لیے دلی طور پر راضی ہو؟“

”طاقت میں بڑی کشش ہوتی ہے رُجبہ! طاقت کسے بری لگتی ہے؟“ پھر کان کے پیچھے بال اڑتے ہوئے مسکرائی۔ ”امید کرتی ہوں آپ مجھے بھاری زیورات دے کر اس محل سے رخصت کریں گے رُجبہ۔ آخر آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ آپ کے سارے لوٹے گئے سونے پہ مجھ سے زیادہ کس کا حق ہوگا۔“

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”کون سا سونا؟ میں نے کچھ نہیں چرایا۔ ہاں، میری حلال کی کمائی بہت ہے میرے پاس۔ میں سنار کو بھجوا دوں گا۔ زیورات پسند کر لیں۔ اور جو چاہو گی تمہیں ملے گا کیونکہ اس شادی کے بعد وہ ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

”دیکھتے ہیں رُجبہ!“ اس نے سر جھکا کے کہا تھا۔

مراد کے جانے کے بعد وہ مسہری تک آئی جس کے ساتھ لوہے کی کھوئی پہ لٹکا لباس نظر آ رہا تھا۔ ریشم کا بنا سادہ سفید لباس۔ لبا اسکرٹ نما لہنگا اور گھٹنوں تک آتی قمیض۔ اور ایک مفلر جیسا دوپٹہ۔ تینوں چیزوں (باجو کرنگ) کارنگ سفید تھا۔ نہ کام تھا، نہ ذری نہ دبکا۔ ایک ستارہ تک نہ لگا تھا اس پہ۔

سفید ریشم کو ہاتھ سے مسلتے اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ دہن بنی تھی۔ سرخ کلدار لہنگا۔

سونے کے ہلکے سے زیورات بھی پہنے تھے۔

ٹیکا بھی تھا۔ اور گلوبند بھی۔

کنگن اور مہندی بھی۔

اس نے سر جھٹکا اور لباس اٹھالیا۔ اسے تیار ہونا تھا۔

دل پہ جو گزر رہی تھی اس سب کو نظر انداز کر کے... اسے بس تیار ہونا تھا۔

☆☆=====☆☆

اس صبح سرخ حویلی کے صحن میں وہ کنویں کے ساتھ بے مقصد سا کھڑا تھا۔ درخت کی چھایا کے باعث تیز روشنی اس کو نہیں چھو رہی تھی۔ شیوہ بلکی بڑھی تھی اور بازو سینے پہ لپیٹے پانی میں جھانکتا کچھ سوچ رہا تھا۔

”تو تم شہزادی تاشہ کے ساتھ ان کے گاؤں سے آئے تھے؟“ آواز پہ وہ چونک کے پلٹا تو دیکھا، وانگ لی قبوے کی پیالی ہاتھ میں لئے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

فاتح نے ادب سے گردن جھکائی۔ ”مالک! میں شہزادی کے رازوں کا امین ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو ملکہ نے فرمایا وہ درست تھا۔“

”میں جانتا تھا تم عام آدمی نہیں ہو۔ سونے کا ایک ڈھیر دے کر میں نے تمہیں خریدا تھا۔ جیا کے کاروبار کو تم نے اٹھا کے رکھ دیا۔ اور اب ملکہ تمہارے بدلے مجھے سونے کا وہی ڈھیر دینے کو تیار ہیں۔ تم شہزادی سے شادی کے بعد آزاد ہو گے، فاتح!“ وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے پچھتا رہا ہو۔

”آپ میرے لئے ہمیشہ محترم تھے اور رہیں گے۔ کچھ چیزیں نہیں بدل سکتیں، مالک۔“

”واپس جا کے خط لکھتے رہنا۔ مجھے اچھا لگے گا۔“ وہ مڑنے لگا تو فاتح تیزی سے بولا۔

”آپ ملا کہ کو قرض کی دلدل میں نہ دھکیلیں، مالک۔ آپ اس تجویز پہ عمل کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔“

”خط لکھتے رہنا، فاتح۔ مجھے اچھا لگے گا۔“ چینی سفارتکار نے نرمی سے یاد دہانی کروائی اور قبوے کی پیالی سے گھونٹ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ باہر بگیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ مہمان پہنچ چکے تھے۔

جس وقت قاضی کاغذات کا پلندہ لئے برآمدے میں داخل ہوا، سامنے سن باؤ وانگ لی ایڈم اور فاتح کو فرشی نشست پہ بیٹھے پایا۔

ان کے مقابل وہ بیٹھی تھی۔ زمین پہ سادہ طے عورتوں کی طرح۔ سفید لباس میں ملبوس سفید دوپٹہ سر پہ اوڑھے۔ وہ بس نظریں جھکائے اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

قاضی نے کاغذات چھوٹی میز پہ رکھے اور دوڑا نوہو کے بیٹھا۔ ایک مضطرب نظر وانگ لی پہ ڈالی۔

”سن باؤ.... یہ بہت خطرناک کام ہے۔ مجھے راجہ مراد کے سامنے گواہی دینی پڑے گی۔ کیا شہزادی تاشہ ان خطرات سے واقف ہیں؟“

”رابعہ مراد کا اقتدار اب چند دن کا مہمان ہے۔ آپ کو ان سے نہیں ان کو اب آپ سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے کام کا آغاز کیجئے۔ باقی سب میں دیکھ لوں گا۔ آپ چینی سفارتکار ہیں۔ آپ کو ملاکہ کا کوئی عہدیدار نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

وانگ لی کا انداز سپاٹ تھا۔ قاضی نے گہری سانس لی اور کاغذات سامنے رکھے۔

”نکاح نامے کی چار نقول بنائی گئی ہیں۔ ایک میرے پاس رہے گی تصدیق کے لیے.... باقی دونوں آپ کے پاس ہوں گی۔ چوتھی نقل میں وانگ لی کو دے دوں گا۔“

(یعنی ملکہ کو۔) گواہ کے طور پر سامنے بیٹھے ایڈم نے سوچا تھا۔

وہ بس پڑمردہ سا بیٹھا تھا۔ اس کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ صحن میں چڑیوں کے نغمے سنائے دے رہے تھے اور قاضی مقدس کلمات پڑھ رہا تھا مگر ایڈم کو صرف اس کے لب ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر چیز سلوموشن میں ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے قاضی کو کلمات پڑھتے دیکھا۔

پھر مرد سے رضامندی لیتے دیکھا۔

مرد سپاٹ اور بے نیاز سا تھا۔ اس کے چہرے پر ڈھیروں سکون تھا۔ وہ جیسے ذہن میں اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

اس نے بلا تا مل رضامندی دے ڈالی۔

پھر قاضی نے سفید لباس والی شہزادی سے پوچھا تو اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ قاضی کو دیکھا اور بے خوف انداز میں اقرار کے بولے۔

پھر اس نے دعا کے لئے اٹھے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

اپنے ہلتے لبوں کو محسوس کیا۔

اتنی سی بات تھی اور ایڈم بن محمد کا دل خالی ہو گیا۔

دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔

قاضی چلا گیا۔ وانگ لی باہر نکل گیا اور وان فاتح اپنے دیگر کام پنپانے اٹھ گیا۔ ایسے میں صرف صحن میں مجسمہ سازی کا سامان پڑا رہ گیا۔ شہزادی بھی جس خاموشی سے آئی تھی اس طرح اٹھ گئی۔ مرد اور شہزادی نے ایک دفعہ بھی نظر نہیں ملائی نہ کسی نے کسی سے کوئی بات کی۔ ایسے لگتا تھا سب مشینی انداز میں ملکہ کا حکم ماننے کے لیے بیٹھے تھے۔ کام ختم ہوا تو وہ اپنی اپنی زندگیوں کی طرف واپس لوٹ گئے۔

تالیہ نے کبھی واپس بھجوا دی تھی اور خود پیدل چلتی وانگ لی کے گھر سے نکلی تھی۔ سامنے سبزہ زار تھا اور درختوں کی لمبی قطار۔ وہ ان درختوں کی طرف جانے لگی۔ سینے پر بازو لپیٹے وہ خاموشی سے متوازن قدم اٹھا رہی تھی۔

”کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“ ایڈم اس سے آگے۔

”جیسے خواب ہو کوئی اور ٹوٹ گیا ہو۔ numb۔ بے حس۔ سرد۔“ وہ سکون میں لگتی تھی جیسے کچھ ہوا بھی نہ ہو۔ دونوں ساتھ ساتھ گھاس پہ قدم اٹھانے لگے۔

”یہ صحن میں مجسمہ سازی کا سامان کیسا ہے؟ رات تک تو ڈٹی ہوئی تھیں کہ مجسمہ نہیں بنائیں گی۔“ وہ رکی اور اس کی طرف گھومی۔ ایڈم بھی ٹھہر گیا۔ دونوں اب درختوں کے بیچ آئے سانسے کھڑے تھے۔ قریب میں گھوڑے چرتے دکھائی دے رہے تھے۔

”تم نے کہا تھا صرف اپنا سوچوں۔ سو میں صرف اپنا سوچ رہی ہوں اب۔ تم نے کہا تھا کہ میں ایک لالچی عورت ہوں جس کی زندگی کے سارے بڑے فیصلے خزانے کی کھوج کے گرد گھومتے ہیں۔ میں نے اس بات کو کھلے دل سے قبول کر لیا ہے ایڈم۔“

”میرا وہ مطلب نہیں...“

”میں واقعی ایک خزانے کی پیچھے بھاگنے والی لڑکی ہوں ایڈم! اور مجھے خزانہ مل گیا ہے۔“ وہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ایک دم وہ کے ایل والی تالیہ لگنے لگی تھی۔ غلام سے نکاح اور شہزادی کا رتبہ وہ سب جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔

”خزانہ نہیں ہے، چے تالیہ۔“

”بالکل۔ خزانہ نہیں ہے ایڈم! خزانے ہیں۔“ وہ مسکرا کے بولی تو ایڈم کے ابرو حیرت سے بھنچے۔

”خزانے؟“

”سن باؤ کا گھر۔ اور سن باؤ کا مطلب ہوتا ہے تین خزانے۔“

”وہ تو صرف وانگ لی کا لقب ہے اور...“

”چھ سو سال تک وہ گھر تین خزانوں والا گھر کہلاتا رہا ہے گا۔“ وہ زور دے کر بولی۔ ”اس گھر میں تین خزانے ہیں ایڈم!“

”تین خزانے؟“

”ہاں۔ پہلا خزانہ وقت کا خزانہ تھا۔ جس کا قفل ہم نے کھول لیا۔ تیسرا خزانہ میں نہیں جانتی کیا ہو گا مگر دوسرا خزانہ وہ ہے جو میرے خواب میں اور تم ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ خزانہ جو ہمیں واپس جا کے بے تحاشا امیر کر دے گا۔“

”وانگ لی کے گھر میں خزانہ دفن ہے؟“ وہ ہکا بکارہ گیا۔

”مصرہ نے کہا تھا شہزادی تاشہ وانگ لی کی دوستی کے باعث اس گھر میں آتی تھی۔ مجھے اپنے خواب سے لگا تھا کہ وہ بالائی منزل کے سکین سے ملنے آتی تھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔“ اس کی مسکراہٹ میں اب شرارت در آئی تھی۔ ”میں وہ مجسمہ بنانے روز جاؤں گی وانگ لی کے گھر... لیکن اس کی ایک تیسری وجہ ہے!“ وہ مسکرا کے بتا رہی تھی اور وہ دنگ سا کھڑا تھا۔

”میں وہاں دوسرے خزانے کے لئے جاؤں گی۔“

”کیا وہاں خزانہ دفن ہے جس کو کم نے کھودنا ہے؟“

”نہیں ایڈم۔ ہم نے خزانہ دبانا ہے۔ چھ سو سال بعد ہم واپس جا کے اس خزانے کو اسی گھر سے نکالیں گے۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔

”آپ سن باؤ کے گھر میں زیورات وغیرہ دبانا چاہتی ہیں؟“ وہ اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

”زیورات نہیں۔ میں کتنے ہی سونے چاندی اکٹھے کر لوں، وہ بیچ بیچ کے ختم ہو جائیں گے۔ کے ایل میں، میں ایک سوشلائٹ ہوں، اور ایک چور۔ تم ایک باؤی مین ہو۔ بھگوڑے فوجی۔ ہم دونوں حقیقتاً امیر نہیں ہیں۔ اور ہم دونوں کو امیر ہونے کے لئے خزانہ چاہیے۔ اصلی خزانہ۔ ہمیں کچھ اور دبانا ہے۔“

سبزہ زار پہ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایڈم ہونفوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو اگر واپس جانے کا اتنا یقین ہے تو آپ تھیلے میں سب ساتھ لے جائیں۔ دفن کرنا کیوں ضروری ہے۔“

”میرے پاس زیور بہت کم ہے ایڈم۔ اور مجھے کروڑوں ڈالرز کا خزانہ چاہیے۔ اگر زیور ساتھ لے گئے تو وہ وقت کا سفر طے کر کے ہمارے ساتھ نئے زمانے میں چلا جائے گا۔ وہ نیا ہی رہے گا۔ وہ age نہیں کرے گا۔ جیسے میرے خواب میں یہ انگوٹھی (ہاتھ اٹھا کے انگوٹھی دکھائی) میری انگلی میں بالکل نئی لگ رہی تھی۔“

”تو آپ زیور کو یہاں دفن کرنا چاہتی ہیں؟“

”نہیں۔ میرے پاس اتنا زیادہ زیور ہے ہی نہیں اور زیورات کی 2016 میں کوئی اہمیت نہیں ہے ایڈم۔ مگر جانتے ہو کس چیز کی ہے؟“

”کس کی؟“ وہ تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”شہزادیوں کے استعمال شدہ پٹھے پرانے کپڑوں کی! تم نے ہی تو مجھے کل بتایا تھا۔ قدیم زمانے کے عام سے برتن، کتابیں، خطوط اور دوسری چیزیں نئے زمانے میں antique بن جاتے ہیں جو کروڑوں ڈالرز کے بکتے ہیں۔ جو نیلامی میں لگائے جاتے ہیں۔ جو میوزیم میں سجائے جاتے ہیں۔“

”اوہ۔“ اسے بالآخر سمجھ آنے لگی تھی۔ تالیہ جوش سے بتا رہی تھی۔

”ہم شہزادی تاشہ سلطان مرسل، ملکہ یان سو فو اور راجہ مراد کے زیر استعمال عام سی چیزیں اکٹھی کریں گے اور ان کو سن باؤ کے مجسمے تلے زمین میں دبا دیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ چھ سو سال بعد بھی وہ مجسمہ وہیں موجود رہے گا۔ اسے آج تک نہیں آئے گی۔ ہم ان چیزوں کو اپنے ساتھ وقت کے دروازے میں سے نہیں لے کے جاسکتے۔ ورنہ وہ میری انگوٹھی کی طرح نئے رہیں گے۔ وہ بریلیٹ اور چابی کی طرح age نہیں کریں گے۔“

”اور antique بننے کے لئے ان کا age کرنا ضروری ہے۔ ان کی عمر گزرنا ضروری ہے۔“ وہ سمجھ رہا تھا۔

”ہاں۔ اور یہ خزانہ ”چوری شدہ“ نہیں ہوگا۔ یہ ہم نے اپنی محنت سے کمایا ہوگا۔ فاتح بن رامل مجھے وہاں جاتے ہی چھوڑ دیں گے۔ ان کی زندگی میں میری کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ پھر میرا کیا ہوگا؟ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اب کوئی غلط کام نہیں کروں گی۔ مجھے اپنے خواب پانے کے لئے یہ خزانہ چاہیے ہے ایڈم۔ یہ ہماری زندگیاں بدل دے گا۔ اور یہ.... ”جائز“ ہوگا۔“

وہ دم بخود کھڑا تھا۔ ”آپ کا دماغ.... کیسے کام کرتا ہے؟ یہ اتنے شیطانی منصوبے کہاں سے آتے ہیں آپ کو؟“
تالیہ نے ابرو خفگی سے بھنچے۔

”بکومت۔ یہ بتاؤ، کیا میرا ساتھ دو گے؟ کیا چند بے کار چیزوں کو تجھے سو سال کے لیے دفن کرنے میں میری مدد کرو گے؟“
”پانچ سو ستاون سال!“

”زیادہ میرے autocorrect نہ بنا کرو۔ شکرا دا کرو کہ میں تھی۔ میرے پلانز تھے۔“

”آپ شکر کریں کہ آپ کو میرے جیسا مفت کا غلام ملا ہوا ہے۔“ وہ دونوں اب آگے بڑھ رہے تھے اور ان کی آواز دور ہوتی سنائی دے رہی تھی۔

”مفت کا کیوں؟ خزانے میں سے بیس فیصد حصہ دوں گی تمہیں۔“

”ایک منٹ ایک منٹ۔ بیس فیصد کس خوشی میں؟ ہم ففٹی ففٹی کریں گے۔“

”ففٹی فیصد دماغ تو ہے نہیں تمہارا ہونہ۔ سارا پلان میرا، ساری محنت میری۔ تمہیں صرف مورل سپورٹ کے لئے رکھا ہے۔ اور زیادہ سودے بازی نہ کرو میرے ساتھ، ورنہ شہزادی کے جلال سے واقف نہیں ہوتم۔“

ایڈم نے چلتے چلتے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

”تو شہزادی نہ وان فاتح کی محبت میں اس گھر میں آتی تھی اور نہ ہی وانگ لی کی دوستی میں۔ وہ صرف خزانہ دفن کرنے آتی تھی۔ آپ تا ویسے بالکل نہیں بدلیں گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب آپ مجھ سے ”بنکار املا یو“ میں یہی لکھوائیں گی کہ شہزادی وانگ لی کی دوستی میں اس گھر میں آتی تھی۔ اے مکر فرشتے!“ اپنے بائیں کندھے کو دیکھ کے بولا۔ ”میرے اعمال نامے میں سے بنکار املا یو نکال دو خدا کے لئے۔ اس کے سارے جھوٹوں میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”ویسے ایک بات ہے... وہ نظم جو سن باؤ کے گھر کی دیوار پہ لکھی تھی... شہزادی تا شہ والی... وہ یہاں نہیں لکھی۔ وہ بھی یقیناً میں ہی لکھوں گی۔ مگر کیوں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ ایڈم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ دونوں درختوں کے درمیان اب او جھل ہو رہے تھے۔

دور سن باؤ کی حویلی کی بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑے فاتح نے مسکرا کے ان کو دور جاتے دیکھا تھا۔ وہ ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا، مگر اس کو ڈھیروں اطمینان میسر تھا۔

جھک کے اس نے پانی کے پیالے میں رومال ڈبوایا اور گردن کے پیچھے لیپ شدہ غازہ رگڑ کے صاف کیا۔ وقت کی مہر واضح دکھائی دینے لگی۔

اس کو ظاہر کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

برشے پلان کے مطابق ہو رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

اس صبح قدیم ملاکہ میں زور کی بارش ہوئی تھی مگر دوپہر تک مطلع صاف ہو گیا اور سورج نکل آیا تو سارے میں دھوپ چھاؤں جیسا موسم ہو گیا۔ ایسا آنکھ پھولی والا موسم تھا کہ الامان۔

”جیا“ کی رسوائی میں فاتح زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ گود میں بہت سے پتے رکھے تھے جن کو وہ ٹہنیوں سے علیحدہ کر کے ایک ٹوکری میں ڈال رہا تھا۔ ہاتھ تیز تیز چل رہے تھے اور پوروں میں پتوں کی مہک رچ بس گئی تھی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں ڈیڈ!“ اداس سی آریانہ اس کے ساتھ آ بیٹھی تو اس نے نظر اٹھائی۔ سفید ہیر بینڈ لگائے، وہ چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے، چوڑی مارے بیٹھی اسے یاسیت سے دیکھ رہی تھی۔

”کہتے ہیں قدیم چینی بادشاہ Shen Nong ایک دفعہ سفر پہ نکلا تو ایک جگہ پڑاؤ کے دوران اس کے غلام عادتاً اس کے لئے لکڑیاں جلا کے پانی ابالنے لگے۔ ہوا چلی اور درخت سے ایک پتہ ٹوٹ کے پانی میں جا گرا۔ کسی کو علم تک نہ ہوا اور معمول کے مطابق غلاموں نے بادشاہ کو کڑھا ہوا پانی پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اسے پیا تو ذائقہ بے حد مختلف تھا۔ اس کڑھے پانی نے اسے تازہ دم کر دیا۔ اس نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ایک پتہ پانی میں گرا تھا۔ کہتے ہیں بادشاہ shennong وہ پہلا انسان تھا جس نے پتہ ابال کے پہلی چائے بنانے کی روایت ڈالی۔ تب سے لوگ پتوں کو ابال کے قبوہ چائے اور ”جیا“ بنانے لگے۔ میں بھی اس وقت چائے کے پتے علیحدہ کر رہا ہوں۔“

”میں اس کی بات نہیں کر رہی۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ دلبرداشتہ سی بولی۔

”میری ماما کا کیا ہوگا ڈیڈ؟ آپ کیسے کسی اور سے شادی کر سکتے ہیں؟“

”یہ صرف ایک کاغذی معاہدہ ہے اور یہ ہمیں یہاں سے آزاد کر دے گا۔“ وہ سر جھکائے پتے توڑ رہا تھا۔

”مگر کیسے؟“

”قدیم کہاوٹیں کبھی غلط نہیں ہوتیں، آریانہ۔ اور ایسی ہی ایک کہاوٹ کہتی ہے کہ سچ تمہیں آزاد کر دے گا مگر....“

”مگر پہلے وہ تمہیں غصہ دلانے گا۔“ اس نے جھٹ فترہ مکمل کیا۔

”تو صرف سچ ہے جو ہمیں آزاد کرے گا۔“ وہ ٹوکری رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا، کپڑے جھاڑے اور جوتے پہنے۔ آج کل وہ خود سے باتیں کم

کرتا تھا۔ اس کے پاس سارے جواب موجود ہوتے تھے۔ سادہ کرتے پاجامے، کمر کے گرد کپڑا باندھے، وہ پہلے سے زیادہ پر امید لگ رہا

تھا۔

”جو اس دنیا میں ہوگا وہ اس دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ میں کوئی نیا رشتہ ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا۔ مجھے کسی رشتے کو بنانے میں دلچسپی نہیں ہے، آریانہ۔ مجھے صرف آزادی چاہیے۔“ اور پھر وہ مڑ گیا۔ آریانہ اس کی گردن کے پیچھے مثبت مہر دیکھ سکتی تھی۔

ہال کمرہ کچا کچھ بھرا تھا۔ میزیں لگی تھیں اور لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کمرے کے آغاز میں ایک چبوترہ سا بنانا تھا۔ وہ اس پہ کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولا۔

”مجھے پرسوں کسی نے ’غلام فاتح بن رامنزل‘ کہہ کے پکارا تھا۔“ اس کی آواز کی گرج اور بھاری پن سے کئی ہاتھ رکے۔ کئی گردنیں مڑیں۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑا کمرے کے ایک کونے سے دوسرے تک سب کو باری باری دیکھتا کہہ رہا تھا۔

”اور میں نے اس سے کہا کہ میرا نام غلام نہیں ہے اور مجھے میرے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ جانتے ہو کیوں؟“

جیا کے نیم تاریک ہال میں خاموشی چھانے لگی لوگ اس کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ لقمے چبانے لگے۔ برتنوں کی کھنکھن پڑ کم ہو گئی۔

”کیونکہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ اس نے بنی آدمی کو عزت بخشی۔ ان کو اکرام سے نوازا۔ ملاکہ کے لوگو... آدم علیہ السلام کی اولاد کا ہر شخص خواہ وہ نیک ہو یا بدکار، امیر ہو یا غریب، کالا ہو یا گورا، مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر انسان... عزت کے... قابل ہوتا ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کے زور دے کر بول رہا تھا۔ لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ لب بل رہے تھے۔ گھونٹ بھرے جا رہے تھے مگر آواز نہیں آتی تھی۔

”بھلے ہمیں کوئی انسان برا لگتا ہو... بھلے ہمیں کسی سے نفرت ہو... مگر ہم سب پہ لازم ہے کہ ہم ہر انسان کی عزت کریں کیونکہ اللہ نے سب کو عزت سے نوازا ہے۔ جانور صرف کھانے اور سائبان کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ انسان نہیں۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے ’عزت‘ بھی چاہیے ہوتی ہے۔“

وہ بلند آواز میں قدرے خفگی سے کہہ رہا تھا اور لوگ سن رہے تھے۔

”کیوں بے عزت ہونے کے بعد لوگ شہر چھوڑ دیتے ہیں، خودکشی کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ غم سے مر بھی جاتے ہیں؟ کیونکہ انسان نہیں رہ سکتا عزت کے بغیر۔ تم کیسے لوگ ہو؟ تمہیں تمہارے گھروں سے اغوا کر کے یہاں غلام بنالیا گیا ہے اور تم اپنے مالکوں کی جھڑکیاں سنتے ہو مگر اپنے لئے کھڑے نہیں ہوتے؟“

اسے جیسے ان لوگوں پہ بے حد غصہ تھا۔ وہ چپ چاپ سنے لگے۔

”یاد رکھو۔ اگر کسی انسان کی محبت یا خوف تمہیں اتنا بے بس یا بے حس بنا دے کہ وہ تمہاری بے توقیری کیے جا رہا ہے اور تم چپ چاپ برداشت کر رہے ہو تو تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔ انسان کو کسی بھی رشتے میں اپنی عزت قربان نہیں کرنی چاہیے۔ تم اچھے ہو یا برے، تم معزز ہو۔ تمہارے معزز ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ تم آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔“

کچھ لوگ خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ خاموشی سے کھا رہے تھے۔

”میں یہاں تم لوگوں کو مفت میں اگر کھانا دلواتا ہوں تو عزت کے ساتھ۔ تاکہ تم اپنی عزت خود کرنے لگو۔ خدا کے لئے اپنی قدر کرنا سیکھو۔ جانوروں کی طرح دوسروں کی ناجائز باتیں مت برداشت کرو۔ اپنے حق کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ اکٹھے ہو جاؤ اور احتجاج کرو۔ سلطان کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ تمہارے اوپر ظلم ہو رہا ہے۔ اسے بتاؤ کہ تمہیں کسی منڈی میں نہیں خریدا گیا۔ تمہیں ناجائز طور پر غلام بنا کے بیچا گیا ہے۔ میں تمہارے لئے سلطان کے پاس جانے کو تیار ہوں، ملا کہ کے لوگو... لیکن کیا تم لوگ اپنے لئے میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟“

کچھ نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر وہاں ہر چہرے پہ تھکن تھی۔ گردنیں واپس پلٹ گئیں۔ برتنوں کی آواز آنے لگی۔ کھانا دوبارہ سے کھایا جانے لگا۔ فاتح نے گہری سانس بھری سر جھٹکا اور چبوترے سے اتر آیا۔ پھر کونے میں دیکھا تو آریا نہ سینے پہ بازو پیٹنے کھڑی تھی۔ اسے متوجہ پا کے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ (یہ لوگ بہت بزدل ہیں، ڈیڈ۔)

”ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اپنے لئے کھڑے ہوں، آریا نہ۔ کیونکہ یہ تاریخ میں لکھا ہے۔ یہ قسمت میں لکھا ہے۔ بس تم انتظار کرو۔“

وہ دل ہی دل میں اس سے مخاط ہوتا رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پہ کوئی اضطراب، مایوسی کچھ نہ تھا۔

کونے کی ایک میز پہ بیٹھے چغہ پوش آدمی نے غور سے اسے جاتے دیکھا۔ مدھم رشنیوں کے باوجود اسے ’جیا‘ کے اس نمایاں خوش شکل اور تنومند سے غلام کی گردن کی پشت پہ ایک جلنے کا داغ سا نظر آیا تھا۔

آدمی نے جیب سے رقعہ نکالا اور کھول کے دیکھا۔ اس پہ بنا خاکہ ہو ہوا دیکھا۔ وہ بالآخر مسکرایا۔ پھر چپ چاپ اٹھا اور قبوہ خانے سے باہر نکل گیا۔

اسے بندہ ہارا کا مطلوبہ شخص مل گیا تھا۔

اب اس کا رخ مرادراجہ کے محل کی جانب تھا۔

☆☆=====☆☆

رات کا سیاہ آسمان تھا... چاند چمک رہا تھا... اونچے ٹیلوں کا راستہ پیدل چلنے کے لیے دشوار گزار اور پتھر یلا تھا۔ مگر وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے... تالیہ آگے تھی... ایڈم پیچھے تھا۔ ان لباس اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا... بس تاریکی میں گویا دو ہیولے تھے جو اوپر چڑھتے جاتے۔

سامنے سبزہ زار دکھائی دیا اور چاندنی میں نہائے درخت تو وہ سانس لینے لگے۔ جب سے مجسمہ بنانا شروع کیا تھا، ہر رات وہ دونوں یہاں آ کے درختوں میں کچھ چیزیں چھپا جاتے تھے۔ دوپہر میں جب وہ شاہی گنجی میں حویلی آ کے مجسمے کا کام شروع کرتی تو ایڈم ان کو درختوں کی کھو سے نکالتا اور لباس میں چھپائے اندر لے آتا۔ کسی سپاہی کو علم تک نہ ہوتا کہ وہ دونوں مجسمے کی بنیاد میں کیا بھر رہے ہیں۔

آج وہ درخت میں چند برتن چھپانے کے بعد پلٹی نہیں۔ بلکہ سن باؤ کے گھر کی طرف آگئی۔ سن باؤ آج کسی قریب میں گیا تھا اور گھر پہ نہیں تھا۔ حویلی خاموش پڑی تھی۔ اکا دکا غلام جو یہاں ہوتے تھے وہ بھی غالباً جیا پہ تھے۔

حویلی کا دروازہ کھلا تھا۔ اس زمانے میں لوگ اپنے گھروں کے دروازے مقفل نہیں کرتے تھے۔ وہ چنے کی ٹوپی سر پہ جمائے تیزی سے اندر داخل ہو گئی تو ایڈم کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

”چے تالیہ....“ وہ پیچھے سے ہانپتا ہوا آیا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”کیا ایڈم!“ وہ راہداری میں آگے بڑھتی گئی اور صحن میں آ گئی۔

”آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟“ وہ زچ ہو گیا۔

”میں ہم دونوں کو بہت امیر کرنے جا رہی ہوں ایڈم!“ وہ آخری دیوار تک آئی اور اندھیرے میں اسے ٹٹولنے لگی۔

وہ چلتے چلتے بیچ صحن تک آیا اور رک کے اسے دیکھنے لگا۔

”کیسے؟“

وہ پلٹی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”تاشہ کے خزانے سے جسے ہم دونوں کھود کے نکالیں گے۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے مگر ابھی آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”میں اپنے لیے نشانی چھوڑ رہی ہوں۔“ وہ دیوار کے اس کونے تک آئی جہاں اس نے خواب میں ایک نظم لکھی دیکھی تھی۔

”کیا؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”کیا تم اب بھی نہیں سمجھتے ایڈم کہ تاشہ نے اس دیوار پہ وہ نظم کیوں لکھی تھی؟“ وہ مسکرائی۔

”کیوں؟“

”تاکہ ایڈم اور تالیہ اس دیوار تک جائیں اور وہاں مدفن خزانے کے راز کو کھود نکالیں۔ لیکن ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ جسے سے کتنی اینٹوں کے فاصلے پہ ہم نے خزانہ دبایا تھا؟ وہ نظم جس مقام پہ لکھی جائے گی اس کی سیدھ میں خزانہ ہوگا۔ ایک دفعہ ہم خزانہ نکال لیں تو ہم دنیا کے سب سے طاقتور لوگ بن جائیں گے ایڈم۔“ وہ ایک اینٹ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ یہ اس جگہ کی سیدھ میں تھی۔ اس نے وہاں چاقو سے نشانی لگائی۔ صبح وہ ادھر نظم لکھ دے گی۔

”اور وہاں فاتح؟ ان کا کیا؟“ ایڈم نے یاد دلایا۔ وہ دونوں اب خاموشی سے گھر سے باہر آ گئے تھے اور درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

”وہ زراور زمین سے بے نیاز انسان ہیں۔ ان کو خزانے کی خبر تک نہیں ہوگی۔ یہ صرف میرا اور تمہارا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب ہم

نئے زمانے میں جا کر اس جگہ کو کھودیں گے تو خزانہ وہاں موجود ہوگا۔ ہم نے خاص حفاظتی طریقے سے بنیادوں میں اسے بھرا ہے۔“

”ویسے نئے زمانے میں اس سب کی قیمت کیا ہوگی؟“ اس کو بھی دلچسپی ہوئی۔

”بندہاہا کی نوکرانی شریفہ کے خطوط سے لے کر سلطان کے زیر استعمال مہر شدہ جام تک یہ ساری پھینگی ہوئی چیزیں جب ہم نکال کے

ماہرین کے پاس ٹیسٹ کے لئے کے کر جائیں گے تو یہ چیزیں برٹیسٹ پاس کر جائیں گی۔ ہم ان کی عرب اور یورپی ممالک میں نیلامی کروائیں گے اور ایک ایک چیز کروڑوں ڈالر میں بکے گی۔ تم اور میں بہت امیر ہونے جا رہے ہیں ایڈم!“

پھر ایک دم وہ مسکرائی اور اوپر سیاہ آسمان کو دیکھا۔

”یہی منظر تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ مجھے لگا تھا اس میں ہم خزانہ ڈھونڈنے کی بات کر رہے ہیں مگر نہیں۔ ہم اس میں خزانہ دبانے کے بعد کھود کے نکالنے کی بات کر رہے تھے۔ سارے چکر وقت کے تھے ورنہ ہر بات سمجھ میں آسکتی تھی۔“

وہ دونوں اب سبزہ زار سے نیچے اتر رہے تھے جہاں ان کے گھوڑے منتظر کھڑے تھے۔ پہلی دفعہ ایڈم کو اس کی باتوں سے امید ہونے لگی تھی۔ واپس جا کے.... وہ بھی امیر ہو جائے گا۔ واہ!

☆☆=====☆☆

مجسمے کو بناتے بناتے یہ چھنا دن آپہنچا تھا۔ اس دوپہر وہ سن باؤ کے صحن میں موجود تھی اور کام کر رہی تھی۔ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے شفاف چہرہ لئے وہ مٹھلیں چغے میں ملبوس تھی۔ زیور پہنے ہاتھوں پہ گارا ابھی تک لگا تھا۔ بنیادیں بھری جا چکی تھیں اور مجسمے کی ٹانگیں بن چکی تھیں۔ تالیہ پیچھے ہٹی اور توصیفی انداز میں مجسمے کو دیکھا۔

”میرے آرٹ کو مانتے ہو یا نہیں؟“ ساتھ کھڑے ایڈم سے ستائش طلب کی۔ اس نے گہری سانس لی۔

”قیامت کے دن اس میں جان ڈالنی پڑے گی آپ کو“ محترمہ۔ میرے اعمال نامے کو ان سیاہ کاریوں سے دور رکھیے!“

تالیہ نے تنک کے اسے دیکھا۔ ”چوری کرنے سے تو یہ بہتر کام ہے نا! اور پھر ایک دن میں اس کو خود ہی گرا دوں گی۔ جب.... ہم وہ خزانہ نکالیں گے!“ د بے الفاظ میں یاد کر دیا۔

”چلیں۔ مان لیا۔ اچھا اگر آپ کو مجسمے سے فرصت مل جائے تو مجھے ان کتابوں کا بتائیے گا“ شہزادی صاحبہ۔ وہ ہمیں بندہ ہارا کے خزانے تک لے جاسکتی ہیں۔“ اس نے بھی آواز دھیمی کی۔

”تم محل واپس جاؤ ایڈم۔ ملکہ نے وہ کتابیں تمہارے کمرے میں اب تک بھجوا دی ہوں گی۔“

ایڈم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ”اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں؟ جانتی ہیں تین چاند والے جزیرے پہ چھپی دولت ملا کہ کے لوگوں کی امانت ہے اور اس کا ڈھونڈنا بہت ضروری تھا۔“

”مگر میں ٹھہری لالچی خود غرض چور عورت۔ میرے لئے میرا خزانہ (مجسمے کے قدموں کی طرف اشارہ کیا) زیادہ ضروری تھا۔ اب جاؤ تمہارا کام یہاں ختم ہے۔“

شان بے نیازی سے ہاتھ جھٹکا تو وہ فوراً (سلام، آداب بھول کے) بابر کو بھاگا۔

تالیہ واپس اپنا کام کرنے لگی۔ اسی اثناء میں سن باؤ اپنے کمرے سے نکلا اور اس کی طرف آیا۔ ادب سے سلام کیا۔

”معذرت‘ شہزادی۔ میں آپ کو تنہا چھوڑ کے کام کرنے چلا گیا۔ چند اہم خطوط شاہ چین کی طرف ارسال کرنے تھے۔ اور ابھی ابھی قاصد نے اطلاع دی ہے کہ ملکہ نے مجھے بلوایا ہے۔“

”آپ آرام سے اپنے کام کیجیے‘ وانگ لی۔ میں یہ مجسمہ آپ کی طرف دیکھے بغیر بھی ختم کر سکتی ہوں۔ کل تک یہ تیار ہوگا۔“ وہ جھکی اور گارے کو ہاتھوں میں بھرے اٹھی۔ وانگ لی کی طرف پشت تھی۔ وانگ لی ممنونیت سے مسکرایا۔

”آپ کا شکریہ شہزادی۔ میری پرانی خواہش پوری کرنے کے لئے۔“

شہزادی نے جواب نہیں دیا۔ برآمدے کی طرف پشت کیے وہ مجسمے کے اوپر مٹی لپیٹی رہی۔ کتنی دیر گزری اسے علم نہ ہوسکا۔ وانگ لی کام سے چلا گیا اور وہ مجسمہ بناتی رہی۔ آوازیں البتہ سنائی دی تھیں۔ کوئی باہر سے آیا تھا اور برآمدے کی طرف آنے کی بجائے راہداری سے بیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ زینے چڑھنے کی آواز آئی....

پھر تالیہ کو محسوس ہوا کہ کوئی بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی میں آکھڑا ہوا ہے۔

کوئی ہیولہ سا.... جیسے کوئی دراز قد‘ توانا مرد ہو.... اور وہ نیچے دیکھ رہا ہو....

جہاں صحن کے کونے میں وہ کھڑی تھی.... مٹلیس چغہ پہنے.... جو شاہزادیاں سفر میں پہنا کرتی تھیں.... اس کی کھڑکی کی طرف پشت تھی.... بالوں پر ریشمی اوڑھنی لے رکھی تھی اور سر پہ جسے تاج کی پشت دکھائی دے رہی تھی....

چغہ کے آستینوں سے نکلتی سپید بانہوں میں سونے اور ہیرے کے کنگن تھے....

خوبصورت ہاتھوں میں زمرہ دار یا قوت جڑی انگلیٹھیاں تھیں....

اور وہ ہاتھ مہارت سے مٹی اور گارے سے چوبترے پہ مجسمہ بنا رہے تھے....

شاہزادی.... مجسمہ بناتے ہوئے بار بار رکتی تھی۔

گردن ذرا سی موڑتی تھی....

شکل ابھی بھی دکھائی نہیں دیتی.... بس ماتھے کے اوپر تاج کا کونہ کینٹی سے جھلکتا تھا....

بار بار گردن موڑنے کی خواہش کے باوجود وہ واپس چہرہ پھیر جاتی تھی....

جیسے واقف تھی کہ اوپر کھڑکی میں کوئی اسے دیکھ رہا ہے....

پھر دفعتاً وہ سر جھکا کے ہلکا سا ہنسی.... اور گردن موڑی....

بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑا مرد تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ تکان سے لبریز تھا اور بال الجھے بکھرے سے تھے۔

اسے خود کو دیکھتے پائے کہ وہ مسکرایا اور پھر واپس پلٹ گیا۔ زینے اترنے کی آواز آئی۔

تالیہ پلٹ کے اپنا کام کرنے لگ گئی۔

دفعتا اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکا مگر اطمینان سے مسکراتے ہوئے مجسمہ بناتی رہی۔
 ”شہزادی!“ ادب سے کہا گیا تو وہ اس نے بے نیازی سے چہرہ موڑا۔ ”توانکو!“

وہ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے خوشگوار حیرت سے مجسمے کے قریب آیا اور چاروں طرف سے اسے گھوم پھر کے دیکھا۔
 ”میں جیسے دن سے جیا میں تھا۔ وانگ لی نے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ یقیناً تم نے منع کیا ہوگا۔“ وہ ستائش سے مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ ”پہلے تو کہہ رہی تھیں کہ مجسمہ بنانے نہیں آؤ گی۔“

”میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ بالائی منزل کے مکین سے ملنے نہیں آؤں گی۔“

”تو میری بیوی درست تھی۔ شہزادی تاشہ یہاں صرف وانگ لی کی دوستی میں آتی تھی۔“ وہ گردن جھکا کے مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا۔
 تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم سرخ اینٹوں والے صحن میں کوئی عجیب مردنی سی چھانے لگی تھی۔

”آپ کی بیوی درست ہے۔“ ایک چور نظر مجسمے تلے زمین پہ ڈالی جواب برابر کر دی گئی تھی اور جس کے اندر بہت کچھ مدفن تھا۔ ”اور آپ کو مجھے میرا مقام یاد دلانے کے لئے عصرہ بیگم کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وہ فیصلہ صرف آپ کے اوپر بھروسہ کر کے لیا تھا۔“ آواز میں درشتی گھل گئی۔

”ٹھیک کیا تھا۔“ وہ ابھی تک مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ انداز بے نیاز سا تھا۔ اس کے لئے صرف آزادی اہم تھی۔ کوئی رشتہ کسی کے احساسات اس سب کے نتائج سب ثانوی تھا۔

”اگر آپ نے میرے کام کو سراہ لیا ہو تو پلیز ہٹ جائیے۔ مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ وہ سپاٹ سے انداز میں بولی تو فاتح نے بس مسکرا کے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی طرف پشت ہوئی تو اس کی گردن کا نشان اس کی نظروں میں چبھا۔

تالیہ کا سانس تھم گیا۔ ”توانکو۔ آپ نے وہ غارہ اتار دیا؟“

اس نے مزے تالیہ کو دیکھا اور کندھے اچکائے۔ ”تمہیں لگتا ہے وان فاتح کسی سے ڈرتا ہے؟“ مسکرا کے سر جھٹکا اور برآمدے کی جانب چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

ان کے درمیان کچھ بھی نہ بدلا تھا اور جیسے سب بدل گیا تھا۔

”میں اگلے تین دن مجسمہ بنانے کے لئے روز آؤں گی۔ کوشش کیجئے گا کہ آپ وہ وقت جیا میں ہی گزاریں تاکہ میں آرام سے اپنا کام کر سکوں۔“ قدرے خفگی سے اسے پکارا مگر وہ ان سنی کر کے اندر جا چکا تھا۔
 ”ہونہر۔ گستاخ۔“ وہ سر جھٹک کے واپس مجسمے کی طرف متوجہ ہوئی۔

☆☆=====☆☆

یہ تیسرے روز کی بات ہے جب وہ سن باؤ کے گھر سے تھکی ہاری واپس اپنے محل آئی اور اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو ایڈم بن محمد بے چین

ساواہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میز پر چند کاغذ رکھے تھے۔ اسے دیکھ کے فوراً سے اٹھا۔
”مجسمہ مکمل ہو گیا؟“

”اپنے سارے رازوں کے ساتھ وہ مکمل ہو گیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے اندر آئی۔ دروازے بند کر دیے اور ایک قندیل بجھادی۔ روشنی ہلکی ہو گئی۔ اور کمرے کا ماحول پر اسراریت میں ڈوب سا گیا۔

”تھک گئیں کیا؟“ وہ جو کچھ اور کہنے لگا تھا اس کا تکان زدہ چہرہ دیکھ کے بات روک لی۔

وہ سنگھار میز تک آئی اور ننھے صندوق سے خوشبودار گیلار و مال نکالا پھر اس سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ان معمولی چیزوں میں سے کوئی بھی چیز چرائی نہیں تھی ایڈم۔ میں نے وہ خود حاصل کی تھی۔ جائز طریقے سے۔ سوائے شریفہ کے خطوط کے۔ ان کے لئے بھی آج ایک بھاری رقم اسے ادا کر دی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں ان خطوط کو تجھے سو سال بعد بیچنا چاہتی ہوں مگر وہ خوش ہے۔ اور میں بھی خوش ہوں کیونکہ یہ خزانہ جو ہمیں بہت امیر کرے گا میری جائز کمائی کا ہو گا۔“ پھر رومال رکھا اور مسکرا کے سنگھار میز کے کنارے پہنک گئی۔ ایڈم واپس بیٹھا اور کاغذ سامنے پھیلائے۔

”تین چاند والا جزیرہ ملا کہ سے مغرب کی سمت ڈیڑھ دن کی مسافت پہ ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہاں جانا ہو گا۔ کچھ نقشے اس کتاب میں تھے اور کچھ میں نے شہر کے کتب خانوں سے اکٹھے کیے ہیں۔“ پھر وہ جوش سے کاغذ پر مختلف مقامات پہ انگلی رکھ کے اسے راستہ سمجھانے لگا۔
”دفعۃً اسے ایک خیال آیا۔“ مگر آپ کیسے جاسکیں گی؟ کم از کم تین دن تو آنے جانے میں لگ جائیں گے۔“

”اس کی فکر مت کرو۔ شہزادیاں رواج کے مطابق شادی سے قبل چند دن شاہی آداب کی تربیت حاصل کرنے جنوبی محل کی طرف چلی جاتی ہیں۔ راجہ مراد نے مجھے بھی وہاں جانے کو کہا ہے۔ انکار کروں گی تو راجہ کو شک ہو گا۔ یوں کرتی ہوں کل وہیں چلی جاتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آنا۔ وہاں سے ہم سمندری سفر پہ نکل جائیں گے۔“

ایڈم کا چہرہ خوشی سے تہمتا اٹھا۔ ”اگر ہم ملا کہ کے لوگوں کی لوٹی دولت واپس لاسکیں تو ملا کہ کو چین سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم تاریخ رقم کرنے جا رہے ہیں چے تالیہ۔“ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ تالیہ بھی مسکرا دی۔

”تم تیاری کرو۔ ہم علی الصبح روانہ ہوں گے۔“ وہ پر عزم تھی۔ ایک تھکا دینے والے دن کے بعد ایک مشکل صبح کا آغاز ہونے والا تھا۔
اپنے کمرے میں کرسی میز پر براجمان مراد راجہ لکڑی کی ننھی کشتی میں کیل ٹھونکتا دکھائی دے رہا تھا۔ میز پر چند آلات اور لکڑی کے باریک ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور وہ مہارت سے اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ سامنے ہاتھ باندھے مودب سا عارف کھڑا گلے حکم کا منتظر تھا۔

”شہزادی تاشہ جلد جنوبی محل روانہ ہو جائے گی۔“ وہ نظریں کشتی پہ جمائے سرد آواز میں بولا۔ ”اس کے جاتے ہی تم وانگ لی کے اس غلام کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ گے جس کے گردن پہ تمہارے آدمی کو چند دن پہلے وہ نشان نظر آیا تھا۔ ابھی تک میں صرف شہزادی کی وجہ سے خاموش تھا۔ اس کے جاتے ہی یہ کام ہو جانا چاہیے۔“

”جو حکم عالی جاہ!“ عارف نے فوراً سے سر جھکایا۔ مراد راجہ اب مہارت سے کشتی کے اوپر ننھا سا بادبان لگا رہا تھا۔
کھڑکی کے باہر گہری مہیب رات اتر رہی تھی۔ خاموشی سے۔ چپ چاپ۔

☆☆=====☆☆

اس صبح سرخ حویلی کے صحن میں وہ مجسمہ اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔ کنویں سے پانی کا ڈول نکالتے وقت وان فاتح نے گردن موڑ کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ عجیب لڑکی تھی۔ کبھی کہتی تھی مجسمہ نہیں بنائے گی اور اب.... چند دن میں یہ اونچا سا بت تراش کے چلی گئی۔ اسے صنم تراشی، مینٹلز اور ایسی چیزوں میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر یہ مجسمہ.... وہ اس کو ہمیشہ وہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک حصہ اس مجسمے کو دیکھتے گزرا تھا۔

پانی کا ڈول اس نے برآمدے میں رکھا ہی تھا کہ دروازہ بج اٹھا۔ دستک ایسی گرج دار اور خوفناک تھی کہ وہ چونکا۔ پھر تیزی سے راہداری میں آیا اور دروازہ کھولا۔

سامنے اسلحے سے لیس شاہی سپاہی کھڑے تھے۔ ان کی تلواریں میان سے باہر تھیں۔

”فاتح بن رامل... تمہیں بندابار امراد راجہ کے حکم پہ گرفتار کیا جاتا ہے۔“ ایک نے گرج دار آواز میں حکم سنایا، باقی دو اس پہ جھپٹے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کے گھٹنوں کے بل زمین پہ بٹھایا۔ سختی سے اس کے ہاتھ کمر پہ باندھے اور رسی سے باندھے۔
شور سن کے وانگ لی بستر سے نکل کے فوراً باہر آیا تھا۔

”اس کو کیوں لے جا رہے ہو؟ کیا قصور ہے اس کا؟“ وہ چلایا تھا۔

گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھے فاتح نے چہرہ اٹھایا اور ایک نظر وانگ لی کو دیکھا۔ ”آپ آرام فرمائیے مالک۔ مجھے اپنے سارے قصور معلوم ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ جانے دیجئے۔“ وہ ضبط اور سکون سے نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے اس کے کندھوں پہ زور دے کے اسے گھٹنوں کے بل بٹھا رکھا تھا۔ ایک آدمی اس کے ہاتھوں کو رسی میں جکڑے جا رہا تھا۔

”مگر...“ وانگ لی نے پریشانی سے ان سپاہیوں کی فوج کو دیکھا اور پھر سیاہ گھوڑا گاڑیوں کو جو سامنے کھڑی تھیں۔ قیدی کو لے جانے کے لئے تیار!

”مالک!“ اس نے مسکرا کے وانگ لی کو مخاطب کیا۔ سپاہیوں نے اسے جبراً اٹھایا اور گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔

”جب میں نے کہا تھا کہ میں بادشاہوں اور رئیسوں کے ساتھ بھی گھوما ہوں اور محلوں میں بھی رہا ہوں تو میں نے درست کہا تھا۔ وان فاتح نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے، نہ کسی بندابار اسے ملنے سے ڈرتا ہے۔ آپ فکر مت کیجئے۔ مراد راجہ کو ابھی معلوم نہیں ہے کہ یہ ملاقات میری مرضی اور خواہش سے ہو رہی ہے۔“

وہ اسے گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ چلتا، گردن موڑے اپنے مالک کو مسکرا کے تسلی دے رہا تھا۔ فریبہ چینی

سفارتکار بس سر پہ ہاتھ رکھے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔
اس کا غلام آج اسے پہلی دفعہ آزاد لگا تھا۔

☆☆=====☆☆

سنہری دھوپ نیلے سمندر کی سطح پہ چمک رہی تھی۔ تاجہ نگاہ پانی پھیلا تھا جو پرسکون اور شانت تھا اور بڑے وقار سے اپنے سینے پہ ایک وسیع و عریض کشتی کو اٹھائے ہوئے تھا۔

کشتی کا بادبان ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ کوئی عام کشتی نہ تھی۔ خوب اونچی اور چوڑی کشتی جس کے تہہ خانے میں کمرے بنے تھے اور وہاں شریفہ سامان جوڑتی دکھائی دے رہی تھی۔

زینے چڑھ کے اوپر آؤ تو کشتی کا یہ کھلا ساعرشہ تھا جس کے دونوں کونوں میں تیرکمان اور اسلحے سے لیس سپاہی چوکنے کھڑے سمندر کو نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ ابھی پانی میں کوئی ہلچل مچے تو ان کے تیرمدافعت کے لئے تیار تھے۔

عرشے کے وسط میں لکڑی کے پھٹے لگے تھے۔ تالیہ وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے شہزادیوں کے لباس سے برعکس سیاہ پاجامہ قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے اوپر سیاہ چغہ تھا جو ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ سرد ہوا سے چغے کی ٹوپی بار بار پیچھے گر جاتی اور کانوں پہ ہوا لگنے لگتی۔

”یہ تمام سپاہی آپ کے اعتبار کے ہیں نا؟“ ایڈم سامنے والے پھٹے پہ بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ جو دور تک پھیلے سمندر کو دیکھ رہی تھی چونک کے گردن موڑی۔

ایڈم کافی آرام دہ نظر آ رہا تھا۔ کرتے پاجامے کے اوپر سیاہ چغہ پہنے اس نے سردی سے بچنے کو مفلتر بھی کانوں کے گرد لپٹا تھا۔
”ہاں... میں نے ان کی وفاداری فی الحال تو خریدی ہوئی ہے۔ اور ہم ان کے بغیر سفر نہیں کر سکتے تھے۔ مراد راجہ نے اس جزیرے پہ اپنا سونا یوں تو نہیں چھوڑا ہوگا۔ پوری فوج تعینات کر رکھی ہوگی۔ ہمیں ان کے مقابلے کے لئے ان سب کی ضرورت ہے۔“ پھر اس نے کھوجتی نگاہوں سے سمندر کو دیکھا۔

”کتنا فاصلہ گھیا ہے؟“

”بس اب ہم قریب ہیں۔“ ایڈم نے افق کو دیکھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

”یہ کہاں سے سیکھا تم نے؟“

”کیا؟“

”یہ نقشے پڑھنا... سمندر میں راستے تلاش کرنا...“

”آپ بھول رہی ہیں میں فوج میں تھا اور وہاں یہ سب سکھاتے ہیں۔“

وہ جواب میں کچھ تکیہ کہنے لگی مگر پھر ارادہ بدل دیا اور دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”تم واپس جا کے کیا کرو گے؟“

ایڈم دھیماسا مسکرایا۔ ”آپ کو واپس جانے کا جتنا یقین ہے اتنا مجھے نہیں ہے، چے تالیہ۔ لیکن اگر میں واپس گیا تو...“ اس نے سوچنے والے انداز میں سانس اندر کھینچی۔ ”تو میں کسی سیکورٹی کمپنی میں اپلائی کروں گا اور کہیں گارڈ بھرتی ہو جاؤں گا۔ اس سے بہتر جاب مجھے نہیں ملے گی کیونکہ ندمیری تعلیم ہے نہ تجربہ۔“

”تجربہ تو یہاں تم نے بہت حاصل کیا ہے۔“

”مگر یہ تجربہ وہاں میرے کس کام آئے گا؟ وہ دوسری دنیا ہے، چے تالیہ۔“ اس نے یاد دلایا۔ پھر قدرے ٹھہر کے بولا۔ ”اور آپ؟ آپ کیا کریں گی؟“

”میں!“ وہ پر جوش انداز میں مسکرائی۔ ”میں سب سے پہلے اس خزانے کو کھود کے نکالوں گی، پھر تھوڑا سا بیچوں گی اور ایک گھر خریدوں گی۔“

”جزیرے پر محل؟ جو آپ کا خواب تھا؟“

تالیہ کا منہ بن گیا۔ ”ہرگز نہیں۔ بہت دیکھ لئے جزیرے اور بہت دیکھ لئے محل۔ اب مجھے کسی پر رونق، ہجوم والی جگہ پہ گھر لینا ہے۔ جہاں مارکیٹ، ریسٹورانٹس اور ٹریفک کا شور ہنگامہ ہو۔“

”کے ایل کے بالکل وسط میں ایک علاقہ ہے جہاں...“

”کے ایل نہیں ایڈم۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”میں کہیں دور چلی جاؤں گی۔ کسی دوسرے ملک۔ اور نئی زندگی شروع کروں گی۔“

وہ بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ ”یعنی آپ یہ طے کر چکی ہیں کہ وہاں فاتح واپس جاتے ہی آپ کو چھوڑ دیں گے؟“

”انہوں نے مجھے اپنا یا ہی کب ہے؟ اور ظاہر ہے وہ چھوڑ دیں گے۔ ویسے بھی میں اتنی باوقار ہوں کہ کسی کے بس نام کے سہارے پہ زندگی نہیں گزاروں گی۔“ نخرے سے سر جھٹکا۔

”لیکن ہو سکتا ہے وہ آپ کو نہ چھوڑیں۔ ان کو آپ سے محبت ہو جائے۔ ساری تلخیاں، سارے خواب، سب بھول جائیں وہ اور ایک دنیا سے ٹکر لے کر آپ کو اپنالیں۔“

”میں چور تھی، جھوٹی تھی، لوگوں کو لوٹی تھی مگر گھر توڑنے والوں میں سے نہیں تھی ایڈم۔ میں ان کے بیوی بچوں کی زندگی کبھی خراب نہیں کروں گی۔“ اسے جیسے اس بات پہ دکھ ہوا تھا۔ ”اور یہ شادی... یہ میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ یہ ان کی ایماء پہ ہوئی ہے۔ داتن ہوتی تو کتنا ہنستی۔“ بڑے دن بعد آج وہ یاد آئی تھی۔ مگر پھر اس نے یاد کو جھٹک دیا۔

”اچھا۔ ٹھیک۔ فرض کیا انہوں نے آپ کو جاتے ساتھ ہی تنسیخ نکاح کے کاغذات پکڑا دیے ہیں، اس کے بعد کیا کریں گی آپ؟“

لہروں کے شور کو سنتے چند لمحے کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

”تعلیم تو میری بھی خاص نہیں ہے مگر تجربہ بہت ہے۔ میں پینٹ کروں گی اور آرٹ ورکس بناؤں گی۔ اس خزانے سے امیر بھی ہو جاؤں گی، دنیا گھوموں گی، نئے دوست بناؤں گی۔“

”اور پرانے دوستوں سے بہت دور جانا چاہتی ہیں آپ!“ وہ اداسی سے مسکرایا۔

”پرانے دوست بھی تو اپنی زندگیوں میں مگن ہو جائیں گے۔ تم سیکورٹی گارڈ بن جاؤ گے، میں آرٹسٹ اور وان فاتح....“

”وہ تو وزیر اعظم بنیں گے۔“ دونوں ایک ساتھ بولے اور پھر ہنس دیے۔ نیلا سمندر بھی ان کے ساتھ ہنسا تھا۔

”کیا آپ ملاکہ کو مس کریں گی؟“ چپے تالیہ؟“ تھوڑی دیر بعد وہ سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ زاروں طرف گویا نیلی چادری پچھی تھی جس پہ وہ تیر رہے تھے۔

”یہاں ہے ہی کیا جسے میں مس کروں گی؟“

”یہاں ہے ہی کیا؟ محترمہ! یہاں آپ شہزادی ہیں، حکم چلاتی ہیں، بے پناہ طاقت کی مالک ہیں۔ اور وہاں آپ لوگوں کی جیبیں کاٹتی پھرتی تھیں۔ روپ دھار دھار کے نوکریاں کرتی تھیں۔“

تالیہ نے برہمی سے اسے دیکھا۔ ”زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میری خوش اخلاقی ایکسپائر ہو جائے گی۔“

ایڈم کے چہرے کے زاویے فوراً سیدھے ہوئے۔ تالیہ تقاضا سے مسکرائی، مگر بجائے تعظیم پیش کرنے کے وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔

سامنے سبزی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ دور کوئی جزیرہ سا تھا۔

”یہی ہے.... یہی ہے تین چاند والا جزیرہ۔“ وہ جوش سے کھڑا ہوا، ہاتھ دینے لگا۔ ”کشتی کو اس طرف لے جاؤ۔“

وہ بے چینی سے انھی اور آسمان کو دیکھا۔ ”شام ڈھلنے کے قریب ہے۔ ہمیں چاند نکلنے کے وقت تک اس جگہ پہ پہنچ جانا چاہیے۔“ پھر چغہ سنبھالتی آگے بڑھی اور سپاہیوں کے سر پہ جارکی۔

”جزیرے پہ کچھ ضرور ہمارا منتظر ہوگا۔“ وہ بلند آواز میں بولی اور سب رک کے اسے سننے لگے۔

”سپاہی فوج، مقامی لوگ۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر تم لوگ... تم پوری جانفشانی سے لڑو گے... یاد رکھو، ہم نے زندہ واپس جانا ہے وہ سب

لے کر جس کے لئے ہم آئے ہیں۔ واپس پہنچ کے نہ صرف میں تم میں سے ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازوں گی بلکہ تمہیں آزاد بھی کر دوں گی۔“ وہ پورے قد سے کھڑی ان سے مخاطب تھی۔ ہوا سے چغہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور ٹوپی پیچھے کوڑھلک گئی تھی۔

”لیکن اس سے پہلے... تم لوگوں کو لڑنا ہوگا... اس جزیرے اور اس کے آسبوں سے... تمہیں لڑنا ہوگا... اپنی شہزادی کے لئے لڑو گے

نا؟“

”آپ ہمیں ہر امتحان میں پورا پائیں گی شہزادی۔“ ایک سپاہی جوش سے بولا تو وہ مسکرائی اور گردن موڑ کے ایڈم کو دیکھا۔

”سارے خزانے، ساری جابر، تعلیم، ایوارڈز، انسان جو کچھ بھی حاصل کر لے، ہر چیز ایک طرف... اور ”طاقت اور حاکمیت“ ایک طرف ہے، ایڈم۔ ہاں، شاید اس چیز کو میں مس کروں گی!“

ایڈم ہنس مسکرا دیا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ کشتی تیزی سے تیرتی ہوئی جزیرے کے قریب جا رہی تھی۔ تالیہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہاں کیا ان کا منتظر ہوگا؟

کوئی آسیب... کوئی فوج؟

☆☆=====☆☆

سلطنت محل پہ شام اترتی دکھائی دے رہی تھی اور اونچی دیواروں پہ لگی قندیلیں جلنے لگی تھیں۔ غلام اور کنیریں نظم و ضبط سے سارے کام نبھاتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں محل کی ایک اونچی بالکونی میں ملکہ یاں سوفو کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، وہ تاج اور زیورات سے لدی پھدی، مسکرا کے نیچے دیکھ رہی تھی۔ بڑے دن بعد وہ اتنی پرسکون نظر آتی تھی۔

”اتنے پریشان کیوں ہو، وانگ لی؟“ اس کا مخاطب چینی سفارتکار عقب میں کھڑا تھا۔ چہرہ بے چین اور اداس لگتا تھا۔

”ملکہ عالیہ... مراد راجہ نے میرے غلام کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے یہ سوچ کے خوف آرہا ہے کہ اب کیا ہوگا؟“

”خوف کی بات نہیں ہے، وانگ لی۔“ وہ پرسکون سی دور نیچے پھیلے باغات کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”جلد یا بدیر یہ تو ہوتا تھا۔ ہمارا اس کو قید کر کے اس کے ساتھ جو بھی سلوک کرے، وہ دکھ کی بات ہو سکتی ہے، مگر خوف کی نہیں۔“

”مراد راجہ کو اس نکاح کا علم ہو گیا تو...؟“

”علم تو ہونا ہی تھا۔ مگر میرا نام نہیں آئے گا اور تم سفارتکار ہو، تمہارا کوئی بال بھی بچا نہیں کر سکتا۔“

”اور فاتح؟ اور شہزادی تاشہ؟“

”یہ اب ان کا مسئلہ ہے۔ بھلے مراد اپنی بیٹی کو گلے سے لگائے یا گستاخ غلام کی گردن اتار دے، برصورت میں سلطان تک خبر پہنچ جائے گی کہ شہزادی تاشہ کسی کی منکوحہ ہے۔ میرا مسئلہ یہیں تک تھا، وہ ختم ہو جائے گا۔“ وہ ہولے ہولے اپنے کان سے نکتے بندے پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

”واقعی... ہمارا مسئلہ تو بر حال میں ختم ہو جائے گا۔“ وانگ لی نے گہری سانس بھری۔ پھر جیسے اسے ملال ہو۔ ”مگر مجھے فاتح کے لئے دکھ ہو رہا ہے، ملکہ۔ اس کی پیشانی روشن تھی۔ وہ قید خانے کا ایندھن نہیں بن سکتا۔“

”میں نے کہا، خوف کی بات نہیں ہے، دکھ کی ہے۔ جب میں نے سنا تھا کہ چین کے پہاڑوں پہ ایک سرخ دھاریوں والے نایاب پرندے کی نسل ختم ہو رہی ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں تب تجھے برس کی تھی۔ مجھ سے کتنے دن کھانا نہیں کھایا گیا۔ میرا دل دکھ گیا تھا۔“

”گھر....“ چہرہ وانگ لی کی طرف پھیرا۔ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”دل کی یہی تو اچھی بات ہے اس کے دکھ درد تھوڑے عرصے بعد بھول جاتے ہیں۔ بس تاج سلامت رہے، دل میں بہت جگہ ہے، وانگ لی۔“

”بجائے فرمایا، ملکہ!“ اس سے اتفاق کرنا لازم تھا۔ سوتا سیدی انداز میں وانگ لی نے سر کو خم دیا۔ وہ واپس نیچے باغات کو دیکھنے لگی۔ لالی لگے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ریگ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

مراد راجہ کے دربار کے دروازے بند تھے اور وہاں مسلح پہریدار کھڑے تھے۔ سامنے سے دو سپاہی فاتح کو اپنے آگے چلاتے لاتے دکھائی دیے اس حال میں کہ اس کی ہتھکڑیوں سے بندھی زنجیر پیروں کے گرد لپیٹی تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں میں کوئی خوف نہ تھا۔ بس نظریں گھما کے درو دیوار کا جائزہ لیتے قدم اٹھا رہا تھا۔

ایک سپاہی نے بازو سے جبر اُدھکیٹنا چاہا تو فاتح رک گیا اور ایک ٹھنڈی نظر اس پہ ڈالی۔

”میں خود چل سکتا ہوں، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔“ کوئی رعب تھا یا کیا، سپاہی نے اس کی کہنی چھوڑ دی۔

وہ گردن اٹھائے، سیدھ میں دیکھتے آگے بڑھتا گیا۔ زنجیریں تھامے سپاہی اس کے ہمراہ چپ چاپ چلتے آئے۔

پہریداروں نے دربار کا دروازہ کھولا تو فاتح نے سامنے دیکھا۔

طویل سادہ بار تھا.... درمیان میں لمبا سرخ قالین بچھا تھا جو آخر میں چبوترے تک جاتا تھا۔ چبوترے کے اوپر تخت رکھا تھا جس پہ (فاتح کی نظریں اس کے پیروں سے ہوتیں چہرے تک ٹھی گئیں) مراد راجہ براجمان تھا۔

شاہی قبادائیں بائیں پھیلا رکھی تھیں ایک ہاتھ گھٹنے پہ رکھا تھا اور دوسرا شاہانہ انداز میں پہلو میں پڑا تھا۔ ماتھے پہ سرخ پٹی بندھی تھی اور لمبے سیاہ بال کندھوں کو چھو رہے تھے۔ اپنی عقابی چمکدار آنکھیں وہ قیدی پہ جمائے ہوئے تھا جو سفید کرتے پا جامے میں ملبوس، زنجیروں میں بندھا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ قدرے بڑھی ہوئی شیو، چھوٹے بال (جو ملا کہ میں غیر معمولی لگتے تھے کیونکہ مردوں اور عورتوں سب کے بال لمبے ہوتے تھے۔) اور چھوٹی آنکھیں جو مراد پہ جمی تھیں۔

وہ پہلی نظر میں ہی مقامی باشندہ نہیں لگتا تھا۔

”سامنے آؤ۔“ مراد نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ آواز کھر دری اور رعب دار تھی۔

فاتح سرخ قالین پہ ننگے پاؤں آگے چلتا آیا۔ سپاہی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چبوترے کے عین سامنے آ رکا۔

”تو تم فاتح ہو!“

”اور تم مراد ہو۔ مراد راجہ!“ وہ اسی کے انداز میں بولا تو چبوترے کے نیچے دربان کی طرح کھڑے عارف نے گھر کا۔

”تم اس وقت ملا کہ سلطنت کے بندہ ہمارا مراد راجہ کے دربار میں کھڑے ہو۔ ادب سے بات کرو۔“

”ہمارے زمانے میں ادب اتنا ہی ہوتا ہے بس۔ ان لمبے لمبے القابات، خطابات سے نہیں پکارتے لوگوں کو بھلے وہ ملک کے سربراہ ہی کیوں نہ ہوں۔ صرف ان کا نام لینا کافی ہوتا ہے۔“ پھر نظریں گھما کے عارف کو دیکھا۔

”مگر خیر، تم ہمارے زمانے سے واقف نہیں ہو گے۔ وہ تمہارے ملا کہ سے بہت مختلف ہے۔ اور....“

”تم لوگ باہر جاؤ۔“ عارف نے تیزی سے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ وہ فوراً ہر نکل گئے۔

فاتح نے ہلکا سا مسکرا کے مراد کو دیکھا جو تخت پہ بیٹھا ہنوز اسے گھور رہا تھا۔

”تو صرف تمہارا یہ دربان تمہارے ”شکار بازی“ کے رازوں سے واقف ہے۔ اچھی بات ہے۔ کوئی راز دان ہونا چاہیے، ورنہ سب سے زیادہ تنہائی تخت پہ بیٹھنے والے کے مقدر میں ہوتی ہے راجہ!“

”اور تم کیا جانتے ہو تخت پہ بیٹھنے والوں کے بارے میں؟“ مراد اس پر سے ایک لمحے کو بھی نگاہ نہیں ہٹا رہا تھا۔ عجیب بے خوف سا آدمی تھا۔

”میں اپنے ملک میں ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ کیا تالیہ نے نہیں بتایا؟“ وہ ذرا سا مسکرا کے بولا۔ ”میں... اپنے ملک کا.... بندہ ہاں بننے والا تھا، مراد راجہ!“

”تاشہ سے کیا تعلق ہے تمہارا؟“ مراد نے اگلا سوال داغا۔

”تالیہ کی میری بیوی سے شناسائی تھی، اس نے میری بیوی کی تصویر بنانی شروع کی تو ہمارے گھر اس کا آنا جانا ہوا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک خزانے کی کھوج میں ہے۔ اس خزانے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے وقت کا دروازہ پار کیا اور میں صرف اس کو روکتے روکتے ساتھ آ گیا۔“

”اور تم اسے کیوں روکنا چاہتے تھے۔“

”کیا تالیہ نے تمہیں نہیں بتایا مراد، کہ وہ اس دنیا میں کیا تھی؟“

”کیا تھی؟“

فاتح ہلکا سا مسکرایا۔ وہ نیچے کھڑا تھا اور مراد اوپر بیٹھا تھا مگر دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پہ جمی تھیں۔

”وہ ایک چورتھی۔ بہروپ بدل بدل کے لوگوں کو لوٹنے والی۔ اسے قائل کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ لوگوں سے اپنے مطلب نکال لیتی تھی۔ اور اسے مال و زر سے بہت محبت تھی۔ اب بھی ہے۔ لیکن اس سفر نے اسے بدل دیا ہے۔ وہ واپس جانا چاہتی ہے کیونکہ اسے خود کو بدلنا ہے۔“

”ہونہر۔“ مراد تمسخر سے مسکرایا۔ ”انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا، غلام فاتح! اور وہ واپس نہیں جانا چاہتی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، اس کی سلطان مرسل شاہ سے شادی ہو رہی ہے۔“

”تمہاری دنیا میں کی گئی شادی کی ہماری دنیا میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی، مراد راجہ۔ تمہیں مجھے اور تالیہ کو واپس بھیجنا ہوگا۔“

”میں تمہارے قبوہ خانے کے لوگوں جیسا نہیں ہوں جو تمہاری تقریر سے متاثر ہو جاؤں گا۔ ویسے کیوں کرتے ہو تم وہاں تقریریں؟“

”یہ فطرت ہے میری۔ انسانوں کو کسی جابر حکمران کا غلام بنے دیکھ نہیں سکتا۔ اور پھر تمہاری نظروں میں آنا چاہتا تھا۔ کافی دیر لگی تمہیں

میری گردن کی مہر سے مجھے پہچانتے پہچانتے۔ تمہیں کیا لگتا ہے مراد راجہ؟ یہ ملاقات تمہاری خواہش سے ہو رہی ہے؟ اوںہوں۔ تمہاری بیٹی

نے مجھے ایک کام سکھا دیا ہے۔ چال ایسے چلنی چاہیے کہ دوسرے کو لگے یہ اس کا اپنا منصوبہ تھا۔“

”اور میرا منصوبہ یہ ہے کہ تم اب کبھی دوبارہ سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکو گے۔“

”تم اپنے ہاتھوں سے ہمیں چابی دو گے، مراد راجہ۔ تم نہیں جانتے، مگر میں جانتا ہوں۔ تمہارے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ

نہیں ہوگا۔“

”تم کہہ رہے ہو کہ تم مستقبل سے واقف ہو؟“

”میں ماضی سے واقف ہوں، راجہ!“ وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود اس کا انداز ٹھنڈا اور شانت تھا۔

”میں نے تمہاری بات سن لی، فاتح۔ اب میری بات غور سے سنو۔“ مراد کہنی گھٹنے پر رکھے آگے کو جھکا۔ ”تم بندابارار ہو گے اپنے ملک

کے۔ یہاں تم صرف ایک غلام ہو اور جلد ایک بھولی بھری داستان بن جاؤ گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کھیل کھیل رہے ہو، مگر میں تمہیں

اپنی بیٹی یا اس کی زندگی کے قریب بھی برداشت نہیں کروں گا۔ تم اب قید میں رہو گے اور تمہیں دوبارہ تب بلایا جائے گا جب مجھے لگے گا کہ تم

میرے کسی کام آ سکتے ہو۔ اس لئے....“ عارف کو اشارہ کیا۔ ”اسے لے جاؤ۔“

”جانتے ہو میری سب سے بڑی طاقت کیا ہے، مراد راجہ؟“ عارف سپاہیوں کو آواز دینے لگا تھا کہ وہ بولا۔ ”میں سچ بولتا ہوں اور

تمہارے ساتھ بھی میں نے صرف سچ بولا ہے۔ مجھے قید کیوں کر رہے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا ہے؟“

”تم وانگ لی کے غلام ہو اور وہ ملکہ کا آدمی ہے۔ وہ دونوں بھی جلد نیست و نابود ہو جائیں گے اس لئے تم....“

”ملکہ آج سے بتیس سال بعد مرے گی۔ وہ بھی سرخ پھوڑے نکلنے سے۔“

الفاظ تھے کہ کیا راجہ مراد سن ہو گیا۔ عارف اپنی جگہ پہ ٹھہر گیا۔

زنجیروں میں جکڑا قیدی گردن اٹھائے عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”ملک بدر ہونے کے بعد ملکہ گنامی کی زندگی اختیار کر لے گی اور کئی

سال ایسے ہی گزار دے گی۔ پھر آج سے بتیس سال بعد چین کے ایک پرانے محل میں اسے موت آئے گی۔“

”ملک بدر؟“ عارف بڑبڑایا۔ ”وہ ملک بدر کیوں ہوگی؟“

”جب مرسل شاہ کے خلاف گزشتہ سلطان کے بیٹے بغاوت کر دیں گے اور تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا تخت الٹ دیں گے تو وہ ملک بدر

کر دی جائے گی۔ مرسل کا الہ ناک انجام ہوگا۔ منصور شاہ اگلا حکمران بن جائے گا۔ اور پدوکا راجہ (تن پیراک) اس کا بندابارار ہوگا۔ اگلے

پچاس سال سے زیادہ پدوکا راجہ ملا کہ سلطنت کا بندہ ہار رہے گا۔ اس دوران دو یا تین سلاطین بدل جائیں گے مگر بندہ ہار ایک ہی رہے گا۔ یان سو فو کا باپ اگلے دس سال حکومت کرے گا اور پھر اپنے چھوٹے بیٹے کو شاہ چین نامزد کر کے مر جائے گا۔“

”اور اس کا بڑا بیٹا؟“ عارف فوراً بولا۔ مراد پتھر ہوا سن رہا تھا۔

”اس کا بڑا بیٹا تو اب تک مر چکا ہوگا۔ اس مہینے کی چار تاریخ کو اس نے طاعون سے مر جانا تھا۔“

”نہیں۔“ مراد چونکا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو وہ بچھلے ماہ ملا کہ آیا تھا بھلا چنگا تھا۔ اور دس دن پہلے اس کا خط بھی آیا تھا۔ تم میرے دماغ سے کھینچنے کی کوشش کر رہے ہو فاتح! مگر میں...“

”راجہ.... راجہ!“ عارف کھٹکھٹا رہا تو مراد نے چونک کے اسے دیکھا۔

”ابھی ایک گھڑی قبل چین سے خط موصول ہوا تھا۔ گزشتہ ہفتے ملکہ یان سو فو کا بھائی واقعی طاعون سے مر گیا ہے۔ سب سے پہلے میرے آدمی نے خبر دی ہے۔ ملکہ کو خود ابھی خبر نہیں ملی۔ میں آپ کو غلام سے ملنے کے بعد بتانا چاہتا تھا۔“ عارف نے آہستہ سے بتایا۔

مراد کی رنگت سفید پڑنے لگی۔ اس نے بے یقینی سے قیدی کو دیکھا جو اسی طرح کھڑا تھا۔ عام سا انداز۔ بے نیازی سی بے نیازی۔

مراد اپنی جگہ سے اٹھا اور زینے اتر کے نیچے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟“

”تاریخ کی کتابوں میں ہیں نے تمہاری ساری داستانیں پڑھ رکھی ہیں مراد راجہ! کیا تم جانا چاہتے ہو کہ تمہارا انجام کیسا ہوگا؟“

وہ الفاظ روح کھینچ لینے والے تھے۔ سانس روک دینے والے تھے۔ جیتے جی مار دینے والے تھے۔

”مراد راجہ.... کیا تم جانا چاہتے ہو کہ تمہیں کس زمین پہ موت آئے گی؟“

مراد پلک جھپکے بنا اسے دیکھتا رہا تھا۔ فاتح نے چند لمحے کا انتظار کیا پھر لب کھولے۔

”ایک دن آئے گا مراد جب تم ملا کہ کے شہر کے چوک میں...“

”بس!“ وہ دھاڑا۔ ”بس! میں نہیں جانا چاہتا کہ میرا کیا ہوگا۔ میں اپنی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانا چاہتا۔“

سارے سایے جو اس کے چہرے پہ آئے تھے وہ اب گزر چکے تھے۔ مراد سنبھل گیا تھا اور اس کے چہرے کی سختی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”درست فرمایا راجہ۔ کوئی انسان نہیں جانا چاہتا کہ وہ کون سی زمین پہ مرے گا۔ میں خود بھی نہیں۔“ پھر عارف کی طرف دیکھا۔ ”میں واپس قید میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ جلد تم لوگوں کو میری ضرورت پڑے گی۔ تب مجھے باہر لے آنا۔“

وہ اپنے تئیں ملاقات ختم کر چکا تھا۔ مڑنے ہی لگا تھا کہ مراد پکارا اٹھا۔

”اور تاشہ... میری بیٹی... اس کا کیا ہوگا؟“ اس کی آواز میں کچھ تھا جو فاتح مڑتے مڑتے رکا اور اس کی طرف گھوما۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میری ایک بیٹی تھی، مراد جو پہاڑوں میں کھو گئی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں ایسا سوال پوچھنا چاہیے۔“

”مجھے بتاؤ۔ میری بیٹی کا کیا ہوگا؟“ وہ مضطرب ہو گیا تھا۔

وان فاتح نے گہری سانس لی۔ اور جب بولا تو اس کی آواز مغموم تھی۔

”شہزادی تاشد تارخ کا ایک خوبصورت اور مضبوط کردار تھی جس کی داستان بہت مختصر تھی۔ اس نے کچھ اچھے کام کیے تھے جس کے باعث

اس کو اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔ مگر آخر میں.... (وہ ٹھہرا....) آخر میں اس کا انجام بھی افسوس ناک ہوا تھا۔“

”کیا؟ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ کیا لکھا ہے تمہاری کتابوں میں؟“ وہ بے چین سا ہوا۔ ”مجھے بتاؤ تا کہ میں اس کو ہونے سے روک

سکوں۔“

”وہ ایک سمندری سفر پہ گئی تھی جس سے وہ لوٹ کے نہیں آئی تھی۔ اگر تم اس کا بچانا چاہتے ہو تو اسے کسی سمندری سفر پہ نہ بھیجنا۔“

مراد کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حالم (نمراہ احمد)

گیارہواں باب:

”وقت کے اس پار“

اس نے خواب میں دیکھا...
 گھنٹی کی تیز آواز سے اس کی آنکھ کھلتی ہے...
 وہ بڑا کے لحاف پھینکتی ہے... پھر بستر سے پیر نیچے اتارتی ہے...
 اور چپل پہروں میں ڈالے باہر کو لپکتی ہے...
 اب وہ تیز تیز زینے پھلانگ رہی ہے... دل زور زور سے دھڑک رہا ہے...
 وہ دروازہ کھول کے باہر ڈرائیو سے پہنچتی ہے...
 سامنے گیٹ کے پار کوئی کھڑا ہے... اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے...
 اس کے قدم سست پڑ جاتے ہیں... وہ گیٹ تک آتی ہے... جنگلے کے اوپر سے ہاتھ بڑھاتی ہے... آدمی اس کو ٹوکری پکڑاتا ہے...
 وہ وہیں نیچے زمین پہ بیٹھتی جاتی ہے... ٹوکری اس کے ہاتھ میں ہے... اور چہرہ شکست خور وہ سا لگتا ہے...
 اب وہ ٹوکری میں موجود اشیاء پہ ہاتھ پھیر رہی ہے... ان کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی ہے... تیز مانوس خوشبو...
 اور اس کی آنکھیں بھیگی جا رہی ہیں...
 ٹوکری میں رکھی چیزیں دھندلی نظر آرہی ہیں...
 اور... خواب ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے...

☆☆=====☆☆

سرد ہوا کے زوردار جھونکے نے اس کے سر سے چغے کی ٹوپی گرا دی۔

تالیہ مراد چونک کے اٹھی۔

وہ سوئی نہیں تھی۔ بس کشتی کے کونے میں بیٹھے بیٹھے گھٹنوں پہ چہرہ نکا کے آنکھیں موندی ہی تھیں کہ یہ خواب دکھائی دیا۔ اب آنکھ کھلی تو

دیکھا... کشتی پانی پہ تیرتی آگے بڑھ رہی تھی اور جزیرہ قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔

”کوئی برا خواب دیکھا ہے کیا؟“ ایڈم ہاتھوں پہ رسی لپیٹتے ہوئے قریب آیا تو اس نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ چٹھے میں ملبوس وہ رسی اٹھائے مصروف دکھائی دیتا تھا۔

”اچھے برے کا معلوم نہیں۔ مگر ہاں... خواب ہی دیکھا ہے۔“ اس نے جھرجھری لی۔

”کیا دیکھا آپ نے؟“ وہ اس کے قریب آکا۔ ساتھ ساتھ رسی بھی لپیٹ رہا تھا۔

”میں نے خود کو اپنے کے ایل والے گھر میں دیکھا۔ گھنٹی بجتی ہے۔ ایسی گھنٹی جس کا مجھے انتظار تھا جیسے۔ کوئی عادت ہو جیسے۔ میں بھاگ کے دروازہ کھولتی ہوں تو مجھے کوئی شخص ایک ٹوکری دیتا ہے.... جیسے تحفہ ہو.... مگر میں....“ وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے خود میں ہی الجھ گئی ہو۔

”تحفہ ملنے پہ یوں غمگین کون ہوتا ہے ایڈم؟“

”جو خزانے ڈھونڈنے کے لئے جاتا ہے اور وقت کے اس پار کھو جاتا ہے.... شاید وہ!“ ادا سی سے مسکراتے ہوئے ایڈم نے رسی کا گچھا دور ایک سپاہی کی طرف اچھالا جس نے فوراً اسے اسے تھام لیا۔ دوسرے سپاہی اور خادم بھی لنگر انداز ہونے کی تیاریوں میں لگے تھے۔

”مگر اس ٹوکری میں کیا تھا؟“ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ ”میں اس چیز کی خوشبو پہچانتی ہوں۔ ایسے جیسے.... جیسے رسیا! چاکلیٹ ہو....“ پھر اس نے گہری سانس لی اور کھڑی ہوئی۔

”نخیر.... ایک بات تو طے ہے کہ ہم اس زمانے کی قید سے جلد نکل جائیں گے۔“

”ہم یا صرف آپ؟“

تالیہ نے گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے میں تم دونوں کو چھوڑ کے جاسکتی ہوں۔“

”جی بالکل مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ.... آپ کو بیس فیصد خزانہ بھی مجھ سے ہاشا برا لگ رہا ہوگا اندر ہی اندر۔“

”ہاں لگ تو رہا ہے۔ بیس فیصد جتنا کام تو تم نے کیا نہیں ہے۔ ہونہر۔“ بالوں کو بے نیازی سے پیچھے جھٹکا اور عرشے پہ آگے کو بڑھ گئی۔

جزیرہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا.... سورج اسی رفتار سے ڈھلنے کی تیاری میں تھا۔

ایڈم نے کینہ تو نظروں سے اسے دیکھتے گہری سانس بھری۔

چے تالیہ جل بھی جائیں تو ان کے بل نہیں جائیں گے، یہ تو طے تھا۔

☆☆=====☆☆

بندابارا کے دربار میں کھڑا وان فاتح کہہ رہا تھا۔

”وہ ایک سمندری سفر پہ گئی تھی جس سے وہ لوٹ کے نہیں آئی تھی۔ اگر تم اس کو پہچانا چاہتے ہو تو اسے کسی سمندری سفر پہ نہ بھیجنا۔“

مراد راجہ کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔

”بس یہی یا کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو تم راجہ؟“ بے تاثر سے انداز میں اس نے بات جاری رکھی۔

مراد کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی۔ مگر چہرے کے تاثرات اس نے بہت ضبط سے ہموار رکھے۔

”مجھے تمہاری کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔ جاؤ اور میرے قید خانے میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارو۔“ قدے غصے اور حقارت سے ہاتھ جھلا کے بولا تو فاتح ہلکا سا مسکرایا۔

”بہت جلد تم اتنے مجبور ہو جاؤ گے مراد راجہ کہ تم مجھے خود یہاں واپس بلاؤ گے اور اس کرسی (تخت کے ساتھ والی کرسی کی جانب اشارہ کیا) پہ بٹھا کے میرے ساتھ مذاکرات کرو گے۔“

مراد نے جواب نہیں دیا۔ ہاتھ دوبارہ جھلایا اور رخ موڑ لیا۔ سپاہی تیزی سے وارد ہوئے اور اسے بازوؤں سے پکڑا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ بس ایک نظر راجہ پہ ڈالی جو کمر پہ ہاتھ باندھے رخ موڑ گیا تھا اور پلٹ گیا۔

”عارف!“ اس کے جانے کے بعد مراد قدرے بے چینی سے عارف کی طرف گھوما جو فکر مند سا وہیں کھڑا تھا۔ پیشانی شکن آلود تھی اور آنکھوں میں پریشانی تھی۔

”کیا تمہیں اس آدمی کی باتوں پہ یقین ہے؟“ عارف نے ایک نظر بند دروازے پہ ڈالی جہاں سے فاتح ابھی گیا تھا۔

”اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ ایسے چہرے جھوٹوں کے نہیں ہوتے۔“

”پھر تم ابھی اسی وقت جنوبی محل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور شہزادی کو بحفاظت واپس لے آؤ۔ ابھی عارف!“ آخر میں اس کی مضطرب آواز بلند ہوئی تو عارف نے جھٹ سر جھکا دیا۔

”جو حکم راجہ!“ اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد اب مارے اضطراب کے دربار میں دائیں بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ اندر تک بل کے رہ گیا تھا۔

☆☆=====☆☆

شام ڈھل گئی تو بندہ ہارا محل کے در و دیوار نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو تہہ خانے کا احوال سنایا۔ کھڑکیاں احتجاجاً ذرا کھڑکیں اور دروازوں نے اپنے پٹ جھلائے مگر اونچے ستون بے حسی سے قید خانے کا منظر نامہ سنتے رہے۔

وہ جیل نیچے تہہ خانے میں بنی تھی۔ اندھیر کال کوٹھڑیوں کی قطار جن کے دروازے آہنی اور سلاخ دار تھے۔ ایسی ہی ایک کوٹھڑی کے اندر زمین پہ فاتح بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ کھلے تھے مگر دائیں پیر سے بندھی زنجیر کے سرے پہ بڑا سالو ہے کا وزن بندھا تھا جس کے باعث وہ چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ مگر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بس کونے میں اکڑوں بیٹھا دیوار کو دیکھتا رہا۔ دیوار پہ لگے گارے اور اینٹوں کی خراشوں میں وہ ناخن سے لکیریں کھینچ کے حساب کتاب کر رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ آریا نہ دوسرے کونے میں چپکے سے آن بیٹھی تھی۔ فاتح نے نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔

وہ سفید ہنیر بینڈ میں بال جکڑے، آلتی پالتی کیے بیٹھی اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”کتنے گھٹنے بیت چکے یہ حساب کر رہا ہوں۔ تمہارے باپ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ اور میرے حساب کے مطابق وہ ٹھیک جا رہا ہے۔“ وہ دوبارہ ناخن سے لکیر کھینچنے لگا۔

”آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟“

”مجھے ڈرنا نہیں، محض انتظار کرنا ہے۔ وقت کے اس پار جانے کا انتظار!“

”اور اس کے بعد؟ واپس جا کے آپ تالیہ کے ساتھ کیا کریں گے؟“

”وہی جو میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کو آزاد کروں گا۔ وہ اپنی زندگی گزارے، خوش رہے، میں اپنی زندگی گزاروں گا۔“ اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے اور ایک لکیر کھینچی۔ ناخن کی سوکھے گارے سے رگڑے جانے کی ناقابل برداشت آواز سنائی دی۔

”اور اگر کسی موقع پر آپ کو ”واپسی“ یا ”تالیہ مراد“ میں سے کسی ایک کو چنا پڑے تو کیا کریں گے؟“

وہ چونکا۔ ”تمہیں ایسا خیال کیوں آیا؟“ بے حد حیرت سے اس نے کونے میں بیٹھی آریانہ کو دیکھا۔ جواب میں وہ استہزائیہ مسکرائی۔

”مجھے؟ مگر میں تو کوئی نہیں ہوں، ڈیڈ۔ میں آپ کا Subconscious mind ہوں جو آپ سے پوچھ رہا ہے کہ اگر چناؤ کا موقع آیا

تو کیا کریں گے آپ؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس گردن موڑ کے دیوار پر لگی لکیروں کو دیکھنے لگا۔ ماتھے پہ ہل پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں بے چینی در آئی تھی۔

ذہن میں ایک دم آوازوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

(ایک وقت آئے گا جب آپ مجھے کہیں گے کہ آپ کو میری ضرورت ہے وان فاتح۔ کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔) تالیہ ہنسی تھی۔

(یہ ایک بے وفا آدمی ہے جس کو وعدے نبھانے نہیں آتے۔) ملکہ کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

(میں وان فاتح ہوں اور مجھے کبھی کسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔) وہ ایکذمانے میں کبھی یہ بولا تھا۔

(وان فاتح کو صرف وان فاتح سے محبت ہے!) عصر بے رحم ہوئی تھی۔

آوازیں.... یاد دیں.... سب دیوار پر لگی لکیروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ سر جھٹک کے اپنی توجہ منصوبے پہ مرکوز کرنے لگا۔

☆☆=====☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ سورج ڈوب رہا تھا۔

جوان سمندر لہریں بار بار ساحل تک لاتا اور پھر واپس لے جاتا۔ کشتی ساحل پہ لنگر انداز ہو چکی تھی اور سپاہیوں کا گروہ ریت پہ اترا کھڑا تھا۔

وائرے کی صورت وہ تالیہ اور ایڈم کے گرد کھڑے تھے۔ مورخ خاموش تھا۔ جبکہ چغہ پوش شہزادی ان کو ہدایات دے رہی تھی۔

”سب ٹولیوں کی صورت جزیرے میں پھیل جاؤ، مگر ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ۔ اندر کی طرف جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے

رات میں جنگل کے اندر نہیں جانا۔ صرف ساحل کی پٹی کے ساتھ جزیرے کو چاروں اطراف سے لپیٹنا ہے۔ کوئی بھی غیر معمولی چیز نظر آئے تو ایسی صورت میں....“ اس نے ایک ترکش سامنے کیا جو تیروں سے بھرا تھا۔ ”یہ آتش باز تیر ہیں اور تم سب کے پاس یہ موجود ہیں۔ اس کو سلگا کے ہوا میں چھوڑ دو گے تو یہ فضا میں پھٹ جائے گا اور روشنی دیکھ کے باقی سب تمہاری طرف بھاگے آئیں گے۔“

”جو حکم شہزادی!“ سپاہی سر ہلار ہے تھے۔

”آپ میرے ساتھ رہیے گا۔“ وہ سب بکھر گئے تو ایڈم نے محافظانہ انداز میں کہا۔

”اوہ۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور اندھیرے سے ڈرتے ہو؟ چیچ چیچ!“ تالیہ نے سادگی سے پلکیں جھپکائیں۔

ایڈم کی پیشانی پہ بل پڑے۔ ”میں آپ کے لئے کہہ رہا تھا۔“

”میرے لیے؟“ وہ ہنسی۔ ”میں تا شہ پسونا ہوں میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ پھر بالوں کو جھٹکا، چنے کی ٹوپی برابری کی اور ایک طرف کو مڑی تو ایڈم بولا۔ ”ابھی تک نہ میں نے بنگارا یا ملا یو میں آپ کو ”ساحرہ“ کا لقب دیا ہے نہ ہی ملا کہ میں کوئی آپ کو اس نام سے پکارتا ہے۔“

”شاید وہ وقت ابھی آتا ہے جب میں پسونا بنوں گی۔ تم جلنا چھوڑو۔ اور خزانے کو تلاش کرو۔“ گھمنڈی شہزادی اس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک طرف کوچل دی۔ ایڈم ضبط کے گھونٹ بھرتا رہ گیا۔

سورج ڈوب گیا اور جزیرے پہ اندھیرا چھا گیا۔ ایسے میں پورا چاند آسمان پہ چمکنے لگا۔

جزیرہ بالکل خاموش تھا۔ کسی فوج، کسی مخلوق کی چاپ تک نہ سنائی دیتی تھی۔ کیا واقعی خزانہ اسی جزیرے پہ تھا؟ یا ان کے سارے حساب کتاب غلط تھے؟

وہ ٹھنڈی ریت پہ قدم بہ قدم چل رہی تھی۔ چوکنی نظریں چاروں طرف لگی تھیں۔ جزیرہ بالکل خاموش اور ساکن تھا۔ سوائے ساحل کی لہروں کے شور کے کوئی آواز....

اور ایک دم آواز سنائی دی۔ غراتی ہوئی آواز۔

وہ سنائے میں رہ گئی۔

پس ثابت ہوا کہ جزیرہ زندہ تھا۔ ملا کہ کے اس قدیم جنگل کی طرح جس میں وہ چاروں تک پھنسے رہے تھے۔

تالیہ محتاط انداز میں آواز کی سمت چلنے لگی۔ آواز کسی جانور کی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی مخلوق ڈکار رہی ہو....

جوتے میں کوئی سوراخ ہو گیا تھا جو ریت پیروں میں گھس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ٹھنڈی ریت پہ ننگے پیر چل رہی ہے۔

ننگی ننگی چیزیں پیروں میں چبھ رہی تھیں مگر وہ چھین سے بے پرواہ قدم اٹھاتی رہی۔ چنے کی ٹوپی نے اس کے سر کو ڈھانپ رکھا تھا مگر

ہوا کے باعث وہ پشت سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

دفعتاً ایک مقام پہ وہ ٹھہری۔ سامنے آسمان پہ مکھن کی ٹکیا جیسا چاند چمک رہا تھا۔

اس نے نظریں دائیں طرف موڑیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی خوب روشن تھی۔ جیسے شیشے کی بنی ہو... اس چوٹی کے چمکتے شیشے میں ایک دوسرا چاند نظر آرہا تھا.... وہ ایک دم گھومی۔

ہوا سے چغے کی ٹوپی پیچھے کوڑھلک گئی۔ مگر اس کی سیاہ آنکھیں سامنے جم گئیں.... وہاں سیاہ کانچ جیسے سمندر کا پانی بہہ رہا تھا اور ایک چاند پانی کی سطح پہ چمک رہا تھا.... ”جہاں ملتے ہیں تین چاند۔“

وہ چونک کے بڑبڑائی.... پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے...

”یہاں.... ہاں، یہاں ملتے ہیں تین چاند!“

پہاڑی کی چوٹی شیشے یا کانچ کی بنی لگتی تھی۔ چاند آسمان پہ چمک رہا تھا مگر اس کا عکس سمندر کے پانی اور چوٹی دونوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

”تین چاند۔“ اس نے گہری سانس لی۔ تو یہ تھے تین چاند۔ انہی کے اس پاس آواز آئی تھی۔

”چے تالیہ۔“ ایڈم نے قریب میں سرگوشی کی تو وہ چونکی۔ وہ پیچھے سے تیز تیز آرہا تھا تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”سنو... تم باڈی مین ہو گے وان فاتح کے... میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔“ ایڈم نے جواب نہیں دیا۔ ایک دم ترکش سے تیر نکالا

اور تالیہ کی طرف کمان تان کے تیر چلا دیا۔ وہ ہکا بکارہ گئی۔ تیر زن سے اس کے پاس سے ہوا میں تیرنا پیچھے کو گیا۔ تالیہ گھومی۔

پہاڑی کے قدموں میں ایک آدمی کھڑا تھا اور وہ تالیہ کی طرف تلوار تانے بھاگا آرہا تھا۔ تیر اس کے ہاتھ پہ لگا تو تلوار چھوٹ گئی۔ وہ کراہ کے نیچے گرا۔ تالیہ نے جھٹ اپنا تیر کمان اس پہ تان لیا۔

”آپ اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہیں شہزادی؟ ہے نا۔“ طنز سے کہتا ایڈم قریب آیا۔ تالیہ نے بس تھوک نکالا۔ نظریں اس آدمی پہ جمائے رکھیں۔

اس کی تلوار دور جا گری تھی۔ تلوار اٹھانے کی بجائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ ہاتھ سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

”رک جاؤ ورنہ اگلا تیر تمہارے سر کے آر پار ہو گا۔“ وہ تیر سے اس کا نشانہ لیے غرائی تو آدمی ٹھہر گیا۔ تالیہ نے اس کے اس پاس نظر دوڑائی۔

”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ بولو۔ کہاں ہیں مرادراجہ کے دوسرے آدمی۔“

وہ خستہ حال حلیے والا جنگلی سا آدمی لگتا تھا۔ جواب دینے کی بجائے دائیں طرف دیکھنے لگا۔ ہونٹ سلے رہے۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“

مگر وہ مسلسل دائیں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

”کہیں اس کے ساتھی حملہ ہی نہ کر دیں۔ ہمیں سپاہیوں کی ضرورت ہے۔“

ایڈم نے فکر مندی سے کہتے آتش بھرے تیر کو سلگایا اور زور سے اوپر فضا میں چھوڑا۔ تیر اوپر جا کے پھٹ گیا۔ برسوا آتش بازی کی صورت روشنیاں بکھر گئیں اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ مگر ذرا سی روشنی میں تالیہ کو اس آدمی کے دائیں طرف کوئی حرکت دکھائی دی تھی۔ کوئی ریگلتی ہوئی شے۔ جو اس طرف بڑھ رہی تھی۔

تیر کمان تانے تالیہ کی نظریں اس طرف انھیں۔ چاندنی میں اب واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین پہ کوئی چیز ریگ رہی تھی۔ چھپکلی کی شکل کا مگر مچھ۔ لیکن عام مگر مچھ سے دو گنا۔

”کموڈو ڈریگن ہے یہ تو۔“ تالیہ چونکی۔ ”تو رجبہ نے اپنے خزانے کی حفاظت کے لئے کموڈو ڈریگن پال رکھا ہے اور اس کا خیال یہ شکار باز رکھتا ہے۔ یعنی.....“

”یعنی اس آدمی کا کوئی ساتھی ادھر تعینات نہیں ہے۔ یہ ایک ڈریگن کافی ہے۔“

ڈریگن زمین پہ ریگلتا آہستہ آہستہ اس آدمی کے سامنے آ رہا۔ اس کا بھاری پیٹ نیچے رگڑتا ریت پہ نشان لگاتا جا رہا تھا۔ سامنے آ کے اس نے منہ کھولا اور غرایا۔ ایڈم اور تالیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اب کیا کریں؟“ وہ ذرا فکر مند ہوئی۔ ڈریگن ایک ہی نوالے میں سالم بندہ نگلنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور یہ آج کے ملائیشاء کے ڈریگن سے دو گنا تھا یہ تو ایک ہی سانس میں ان دونوں ہضم کر جاتا۔

”ایسا کرو تم اس آدمی پہ تیر چلاؤ اور میں ڈریگن کا نشانہ باندھتی ہوں۔ ان دونوں کو مار کے ہی ہم اس پہاڑی تک جاسکتے ہیں۔ یہ اگر اس پہاڑی کی حفاظت کر رہے ہیں تو خزانہ ادھر ہی ہے۔“

”مگر ہم کموڈو ڈریگن کو نہیں مارتے۔“ ایڈم ایک دم بولا۔

”اف ایڈم.....“ اس نے دانت پیسے۔ ”یہ ہمیں کھا جائے گا۔“

مگر ایڈم نے کمان نیچے کر دی۔ ”ہم سانپ کو بھی نہیں مارتے۔ ان کو ان کے علاقوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے وائلڈ لائف پارک میں ایک بچی کی جان بچائی تھی کموڈو ڈریگن سے.... لیکن میں نے اس کو نہیں مارا تھا۔ نہیں چے تالیہ.... ہم جانوروں کو مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔“ اس کے اندر کا اورنگ اصلی جاگ گیا تھا۔ تالیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”تو تم کموڈو ڈریگن سے پہلے مقابلہ کر چکے ہو؟“ اس نے اپنا تیر کمان نیچے کر لیا۔

”میں ایک بچی کی جان اس سے بچا چکا ہوں لیکن سرکاری اعزاز دیتے وقت مجھے بھلا دیا گیا تھا۔“

”مگر تم تو اس واقع کو نہیں بھولے نا۔ ہو سکتا ہے اس دنیا کے واقعات اس دنیا کی تیاری کے لیے ہوں۔ جاؤ اور ہمیں اس ڈریگن سے

نجات دلا کے دو۔“ شہزادی نے کمان بلند کر کے اس طرف اشارہ کیا جہاں ڈریگن تھا۔

شہزادی کے حکم پہ ایڈم نے بے اختیار تھوک نکالا۔ چند فٹ کے فاصلے پہ ڈریگن کھڑا غرار ہا تھا اور شکار باز اس کی اوٹ میں کھڑا اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ خون دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا مگر اس کی بے تاثر آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ عجیب پتھر یا چہرہ تھا اس کا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ ایڈم بھاری آواز میں استفسار کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

پتھچھے دوڑتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ایک ایک کر کے سپاہی وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ تالیہ نے ان کو خاموشی سے اپنے عقب میں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے کمان تانے وہیں جگہ سنبھال لی۔

”احمد... کمال... علی... ایسا ہی کوئی نام ہو گا تمہارا۔“ ایڈم تبصرہ کرنے والے انداز میں ڈریگن کی سیدھ میں کئی فٹ کے فاصلے پہ ٹھہر گیا۔ سنجیدہ نظریں اس شکار باز پہ جمی تھیں۔

”مفید۔“ وہ ہلکا سا بولا۔ ”مفید نام ہے میرا اور تم نے اگر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میرا دوست تمہیں نکل جائے گا۔“
 ”یعنی تم نے اس کی اچھی تربیت کی ہے مفید۔“ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ”یہ جانور تمہارا پالتو ہے۔ تمہارے اشارے کی تعمیل کرنا جانتا ہے۔“

”یہ سب کچھ کرنا جانتا ہے۔“

”سب کچھ کرنا تو تم بھی جانتے ہو، لیکن کیا یہ معلوم ہے کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

چاندنی میں ڈوبا خاموش جزیرہ... اور اس پہ ایڈم کی آواز... سب خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔ تالیہ البتہ بے چینی سے بار بار ڈریگن کو دیکھتی تھی۔ کمان تانے وہ ڈوری کو پیچھے کھینچے ہوئے تھی۔ ادھر انگلی چھوڑی، ادھر تیر ڈریگن کی آنکھ میں جا لگے۔

”ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو وہ کر رہا ہے، وہ اسے ”کیوں“ کر رہا ہے! تم بتاؤ۔ تم اس بیاباں جزیرے پہ ایک جانور کے ساتھ راجہ کے خزانے کی حفاظت کیوں کر رہے ہو۔“

”تم کچھ نہیں جانتے۔“ زخمی شکار باز غصے سے بولا۔ ”یہ چند مشکل دن ہم نے گزارنے ہیں، پھر ہمارے پاس اتنا خزانہ اکٹھا ہو جائے گا کہ ہم ساری دنیا پہ حکومت کریں گے۔“ اس کے لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ میلا کچلا چہرہ، الجھی داڑھی... لہو پکاتی آنکھیں... وہ وحشی طور پہ تندرست نہیں لگتا تھا۔

”تو یہ وعدہ کیا ہے راجہ نے تم سے؟“

”میرا راجہ ہمارا سردار ہے اور یہ خزانہ... یہ صرف ہمارا ہے۔“

”میرے پیارے دوست!“ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑے ایڈم نے افسوس سے گہری سانس لی۔ ”تم غالباً میرا راجہ کے تخت

سنجھانے کے دن سے یہیں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ملا کہ میں کیا ہو رہا ہے۔ بے وقوف انسان مراد راجہ اس وقت ملا کہ کا بے تاج سلطان بن چکا ہے۔“

”نہیں۔ ابھی سلطان مرسل زندہ ہے۔“ شکار باز فوراً سے غرایا۔ ”جب وہ مرے گا تو ہم حکومت کریں گے۔“

”تم کتنے بے وقوف ہو، مفید۔ تم یہاں مراد راجہ کے خزانے کی حفاظت کر رہے ہو اس اس میں کہ مراد سلطان کو قتل کر کے تخت سنبھال لے گا؟ نادان انسان.... وہ سلطان کو کبھی قتل نہیں کرے گا۔ پوچھو کیوں۔“

”وہ سلطان کو قتل کر دے گا!“ وہ ہٹ دھرمی سے چلایا۔ خون بہاتے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی شہزادی تاشہ کی شادی مرسل شاہ سے کر رہا ہے۔ کیا اپنے داماد کو قتل کرے گا وہ؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ مراد راجہ کی کوئی بیٹی تاشہ نہیں ہے۔“

”میں ہوں۔ مراد راجہ کی بڑی بیٹی! اور اللہ شاہد ہے کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ تیر سے اس کا نشانہ باندھے وہ بلند آواز میں بولی تو مفید بے اختیار اس کو دیکھنے لگا۔ ”شاید تمہیں میرے باپا نے اپنے بارے میں ہر بات نہیں بتائی۔ میں شہزادی تاشہ بنت مراد ہوں اور مجھے میرے باپا نے یہ خزانہ لینے اور تمہیں مارنے بھیجا ہے.... لیکن میرا یہ جرنیل چاہتا ہے کہ تمہاری جان بخش دی جائے۔“

ایڈم نے گردن موڑ کے اسے گھورا۔ (اپنی کہانیاں گھڑنے والی عادتوں سے آپ باز نہ آئے گا۔)

”اب بتاؤ، مرنا چاہتے ہو یا قید ہونا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو؟“

”مجھے بات کرنے دیں۔“ ایڈم ہلکے سے بولا پھر مفید کی طرف چہرہ موڑا ”مفید، تم راجہ مراد کے وفادار ہو، مگر اپنے دل سے پوچھو۔ راجہ تمہیں بھول چکا ہے۔ وہ وہاں عیش سے حکمرانی کر رہا ہے اور تم ادھر تنہا ہو۔ تمہارا دل اب راجہ سے محبت نہیں کرتا۔“

مفید لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

”جانتے ہو تمہارا دل کس سے محبت کرتا ہے؟“ انگلی اٹھا کے اشارہ کیا۔ ”اس جاندار سے جس کے ساتھ تمہیں جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب ایسے کوئی کسی کو کسی کے ساتھ جنگل میں چھوڑ دے تو پیچھے ساری دنیا اجنبی ہو جاتی ہے۔ صرف وہ اندھیروں کا دوست رہ جاتا ہے۔ یہ تمہارا دوست، تمہارا ساتھی ہے۔ تمہیں اسی سے محبت ہے۔ اور جن سے محبت کی جاتی ہے ان کو اپنی خواہشات کی رسی سے قید نہیں کیا جاتا۔ انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنی زندگی کھل کے جینے دی جاتی ہے اور دنیا کے جنگلوں میں اپنی مرضی سے بھٹکنے دیا جاتا ہے۔ اگر وہ لوٹ کے آجائیں تو ہم محبت میں سچے تھے۔ اگر نہ آئیں تو ہم صرف بد قسمت تھے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اس معصوم جانور کو آزاد کر دو۔“

مگر مفید نفی میں سر ہلاتا ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیسے تھک کے خون بہاتا ہاتھ پہلو میں گرا دیا۔ ”تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔“

”مراد راجہ وہاں عیش کر رہا ہے اور تم یہاں پاگل ہو رہے ہو۔ کب تک اس جانور کو اپنے ساتھ قید میں رکھو گے؟ کم از کم اس کو آزاد کر دو۔ اس کو کہو کہ واپس جنگل میں چلا جائے اور تم ہمارے ساتھ ملا کر چلو۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مراد راجہ نے تمہیں کس کس طرح دھوکہ دیا ہے... اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو ہم سب تیر مار مار کے اس ڈریگن کی آنکھیں اور شریان پھوڑ دیں گے۔“

مفید نے ایک نظر اس ڈریگن کو دیکھا جو پنچوں کے بل کھڑا ان لوگوں پہ مسلسل غرار ہاتھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے سیٹی سی بجائی۔ انجان زبان میں چند آوازیں نکالیں۔ ڈریگن نے اس کی طرف گردن موڑی۔ مفید نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سپاہیوں کے تیر کمان ابھی تک ہاتھوں میں تھے۔ خود تالیہ کا دل زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ تیر تیار تھا۔ ادھر ڈریگن حملہ کرتا، ادھر وہ اس کے اندر تیر اتار دیتی۔

مگر ڈریگن نے چند لمحے کے لئے ارشد کی بات سنی، پھر واپس مڑا اور درختوں کی طرف جانے لگا۔ ایڈم نے گہرا سانس لیا۔ تالیہ کی بھی تیر کمان پہ گرفت ڈھیلی ہوئی۔

”تم نے اچھا فیصلہ کیا، مفید۔ اب ہمیں راستہ دکھاؤ۔ خزانہ کہاں ہے اور تم یقین رکھو واپس جا کے میں...“

”راجہ سے کہنا مجھے معاف کر دے، میں خزانے کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ مفید نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے کہتے اپنے ہاتھ میں لگا تیر ایک دم کھینچ نکالا اور پھر... اگلے ہی لمحے... اسے اپنے سینے میں پوسٹ کر دیا۔ زور سے اس کی چیخ نکلی اور وہ زمین پہ گر کے تڑپنے لگا۔

لمحے بھر کو وہ سب ششدر رہ گئے۔ پھر ایڈم بے اختیار اس کی طرف بھاگا۔

اور صرف ایڈم نہیں تھا جو اس کی طرف بھاگا تھا۔ جنگل کی طرف جاتا کموڈو ڈریگن بھی اپنے مالک کی چیخ سن کے تیزی سے واپس لپکا تھا۔

اگلے ہی لمحے سپاہیوں کے تیر فضا میں بلند ہوئے اور ڈریگن کے جسم میں پوسٹ ہو گئے۔ تالیہ کا تیر اس کی آنکھ میں لگا۔ ڈریگن گھائل ہو کے زمین پہ لوٹنے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکلی تھیں۔

”اے مت مارو...“ ایڈم منت بھرے انداز میں چلایا۔ ”خدا را اے مت مارو۔“

تالیہ نے چغے کی ڈوری گردن تلے سے کھینچی۔ چغہ کندھوں سے ڈھلک کے زمین پہ جا گرا۔ پھر اس نے تیر کمان پرے پھینکا اور تلوار میان سے نکالی۔

جانور التازمین پہ گرا تڑپ رہا تھا۔ تیرزبر میں بجھے تھے اور اثر دکھا رہے تھے۔ تالیہ تلوار لیے تیزی سے اس کے سر پہ آئی۔

”چے تالیہ... اس کو مت ماریں... یہ ایک معصوم جانور ہے...“ ایڈم چلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا، مگر تالیہ نے زور سے تلوار اس کی گردن پہ دے ماری۔

ڈریگن کے سر کے حصے میں بڑا سا کٹ پڑ گیا۔ اس کی تڑپ دم توڑ گئی۔ آنکھوں سے زندگی کی روشنی نکل گئی۔

ایڈم ساکت کھڑا رہ گیا۔

تالیہ اسی طرح آگے بڑھی اور زمین پہ گرے مفید کو گردن سے دبوچ کے اٹھایا۔ پھر اس کے سینے سے زور سے تیرا بھر کھینچ نکالا۔ خون بھل بھل کرنے لگا۔

”جنگل میں رہتے ہوئے اتنے سے زخم سے مر نہیں جاؤ گے۔“ اس کا چہرہ اپنے سامنے کیے وہ غرائی۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ ”تا تک بند کرو۔ راجہ کے چوری کے مال کی حفاظت نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ اب سیدھی طرح مجھے خزانے کا راستہ دکھاؤ تا کہ تمہاری جان بخش دوں۔ ورنہ خدا کی قسم تمہارے جسم میں اتنے گھاؤ لگاؤں گی کہ گھنٹوں تکلیف سے تڑپتے رہو گے۔“ اس کی گردن کو جھٹکا دیا تو تکلیف سے بے حال شکار باز فوراً ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

”ادھر... غار میں.... ہے خزانہ۔“ سپاہی فوراً مشتعل ہو اٹھا اس طرف لپکے۔

تالیہ اس کی گردن دبوچے آگے بڑھنے لگی پھر رک کے مڑی اور ایڈم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”سارے بھاؤ تاؤ جنگ سے پہلے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جائے تو دشمن پہ ترس کھانا کمزوری ہوتی ہے“ ایڈم اور یہ اصول سارے زمانوں کے لئے ہے۔“ اور اسے لئے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم بس شل سا کھڑا رہ گیا تھا۔ سپاہی اب غار کی طرف بڑھ رہے تھے اور سر کٹا کموڈو ڈرگین خون کے تالاب میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔

☆☆=====☆☆

سلطنت محل کی مخروطی چھتوں پہ اس رات بارش برس رہی تھی۔ اپنی خواب گاہ سے ملحقہ بالکونی میں سلطان مرسل شاہ کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے شاہی قبائیں ملبوس وہ نیچے دور تک پھیلے اندھیر سبزہ زار کو دیکھ رہا تھا۔ پانی چھت کے کناروں سے پھسلتا بالکونی کے ستونوں پہ لڑھک رہا تھا۔ موشم خاصا خوشگوار تھا۔

”آقا!“

ملکہ کی آمد کی منادی کے چند ثانیے بعد یان سو فواس کے عقب میں آکھڑی ہوئی تو مرسل چونکا۔ پھر اس کی طرف گھوما۔

”ملکہ۔ طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ مجھے خبر ملی تھی کہ آج قدرے بیمار تھیں آپ۔“

”میرے باپا کی جان آپ نے بچالی ان کی نظر بد کا علاج ہو گیا اس سے زیادہ اور کیا چاہیے مجھے آقا؟“ اس نے مسکرا کے تعظیم پیش

کی۔ پھر سیدھی ہوئی اور انہی مسکراتی آنکھوں سے سلطان کو دیکھا۔ ”آپ کو مجھ سے بات کرنی تھی؟“

وہ دونوں بالکونی میں آمنے سامنے کھڑے تھے ارد گرد بارش برس رہی تھی مگر وہ محفوظ تھے۔

”جی ہاں۔“

”حکم سیجئے آقا!“ وہ اس کی آنکھوں پہ مسکراتی نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”اب تک آپ کو اطلاع تو مل گئی ہوگی کہ میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔ تیاری شروع ہو چکی ہے اور انتظامات کیے جا رہے ہیں۔“
 یان سو فو کے چہرے پہ ایک دم ڈھیروں اداسی بکھر گئی۔ اس نے سر جھکا دیا۔ ”جی آقا۔ سنا تو تھا میں نے مگر یقین نہیں آیا تھا۔“
 ”آپ خفا ہوں گی یقیناً۔“ مرسل شاہ احتیاط مگر پرسکون سا پوچھ رہا تھا۔

”یہ تو شہزادیوں کی قسمت ہوتی ہے آقا۔“ ملکہ نے تھکی تھکی سی پلکیں اٹھائیں۔ ”میرے باپا کے حرم میں تین بیویاں اور کئی خواتین تھیں۔ میں نے اپنی والدہ کی تکلیف دیکھی ہے۔ یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو پڑتا ہے۔ دل دکھتا ہے، لیکن....“ وہ زخمی سا مسکرائی۔
 ”اگر آقا کی خوشی اسی میں ہے تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔ میں اس تقریب میں شامل بھی ہوں گی اور کھلے دل سے آپ کی نئی منکوحہ کو خوش آمدید کہوں گی۔“

مرسل شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔ ”مجھے آپ سے یہی امید تھی ملکہ۔ جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ لیکن میں آپ کو اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ ملا کہ سلطنت کی ملکہ ہیں اور ہیں گی۔“

”سارے سلاطین دوسری شادی سے پہلے یہی کہتے ہیں آقا۔“ وہ بجھے دل سے مسکرائی۔ پھر سر جھٹکا۔ ”خیر... کیا کسی خاتون کا انتخاب کیا ہے آپ نے یا یہ کام بھی مجھے کرنا ہوگا؟“ (شاہی دستور کے مطابق بعض دفعہ ملکہ خود سلطان کی نئی منکوحہ یا خاتون چنتی تھی۔)
 ”کیا آپ کو نہیں معلوم۔“ سلطان حیران ہوا۔ ”میں نے شہزادی تاشہ کا انتخاب کیا ہے۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوگا۔ یہ نام میرے اور مراد رجبہ کے درمیان ہی تھا اب تک۔“

”شہزادی تاشہ؟“ ملکہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بالکونی کے باہر زور کی بجلی کڑکی۔ پل بھر کو سارا محل روشن ہو گیا۔ جگہ جگہ زمین پہ پانی کھڑا نظر آتا تھا۔ اگلے ہی پل اندھیرا چھا گیا۔
 ”جی۔ مراد رجبہ کی دختر۔“

”مگر....“ ملکہ بے اختیار الجھن سے بولی۔ ”شاہی دستور کے مطابق... آپ کے نکاح میں آنے والی خاتون کا چند شرائط پہ اترنا ضروری ہے آقا۔“

”تو شہزادی تاشہ کسی لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی رگوں میں ہمارا ہی خون ہے۔ پھر وہ خوبصورت ہیں اور شاہی آداب جانتی ہیں۔“ مرسل شاہ نے سینہ کڑاتے ہوئے فخر سے کہا تھا۔
 ملکہ چند لمحے سادگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تو پھر.... طلاق دلوائیں گے اسے یا اس کے شوہر کی گردن ماری جائے گی؟“

بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ ایسی دہشت ایسی گرج کہ محل کے ہر ذی نفس کی روح تک کانپ گئی۔
 مرسل شاہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ ملکہ؟“ اس کی رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ”دماغ درست ہے آپ کا؟“

”میرا دماغ تو درست ہے آقا لیکن آپ کی معلومات درست نہیں۔ شہزادی تاشہ نے خود مجھے راز میں لیتے ہوئے بتایا تھا کہ چین سے جو آدمی اس کے ساتھ آیا ہے، وہ اس سے شادی کر چکی ہے۔ کیا آپ کو مرادراجہ نے نہیں بتایا؟ حیرت ہے۔ وہ اپنی شادی شدہ بیٹی کو کنواری لڑکی کے طور پر کیسے پیش کر سکتا ہے۔ چیچ چیچ۔ یہ تو سنگین جرم ہے۔ گناہ کبیرہ ہے۔“ وہ خود حیران تھی۔

”آپ کو...“ مرسل کی آواز بلند اور آنکھیں سرخ ہوئیں۔ ”غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شہزادی تاشہ غیر شادی شدہ ہیں۔“ اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

”آپ خود شہزادی سے اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب پہ ہاتھ رکھو کہ پوچھ لیں۔ اگر اس نے اس شادی سے انکار کیا تو میری گردن مار دیجئے مگر آقا... وہ لڑکی شادی شدہ ہے۔ اور اس کے شوہر کو مرادراجہ نے اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ کو جس سے شادی کرنی ہے، کیجئے آقا، لیکن بزرگوں کے رسم و رواج کو ٹھوکر مار کے نہیں۔ یہ آپ کی خاندانی غیرت اور حمیت کا سوال ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔ مرسل کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میں نہیں مانتا۔“ وہ ایک دم ملکہ کے ساتھ سے گزرتا آگے بڑھ گیا۔ ملکہ یاں سو فونے آرام سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی۔ چیچ چیچ۔ پھر افسوس سے سر جھٹکا۔

بالکونی کی مخروطی چھت کے کنارے مچکے جا رہے تھے۔ بارش میں تیزی آگئی تھی۔

☆☆=====☆☆

جس غار کی حفاظت کموڈو ڈریگن کر رہا تھا، اس کا راستہ تنگ اور تاریک تھا، لیکن زخمی مفید کراہتا ہوا، تالیہ کی راہنمائی کرتا انہیں اندر لے آیا۔

غار کے اندر پتھروں کا ڈھیر لگا تھا۔ سپاہیوں نے فوراً اسے پتھر ہٹائے تو وہاں زمین میں ایک ڈھکن بنا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈھکن اٹھایا، دوسرے نے اندر روشنی کی۔ وہاں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ محض پندرہ بیس سیڑھیاں جن کو اتر کے ایک بڑا سا کمرہ آ جاتا تھا۔ اس نے مفید کی گردن چھوڑ دی۔ دو سپاہی اس کی پٹی وغیرہ کرنے اسے باہر لے گئے۔ دیگر سپاہی نیچے اترے اور کمرے کی دیواروں پہ لگی مشعلیں روشن کیں۔ پل بھر میں وہ کمرہ خوب روشن ہو گیا۔

تالیہ مراد کے کندھے پہ تیروں سے بھرا ترکش تھا اور ہاتھ میں پکڑی تلوار سے ڈریگن کا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ مٹی کی سیڑھیاں قدم قدم نیچے اترنے لگی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اداسی سے بھری مسکراہٹ۔

ایک زینہ... دوسرا زینہ... جیسے جیسے وہ اترتی گئی، کمرہ سامنے آنے لگا۔ اس میں قطار در قطار لکڑی کے صندوق رکھے تھے۔ سپاہیوں نے فوراً صندوقوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اندر سونے کے موٹے موٹے سکے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے ایک عرصہ یہ منظر دیکھنے کی خواہش کی تھی۔

کوئی رازوں سے بھرا کمرہ جس کا دروازہ وہ کھولے گی تو اندر سونے کے ڈھیر لگے ہوں گے۔

آج وہ پندرہویں صدی کے قدیم ملاکہ کے اس جزیرے کے زینے اتر رہی تھی اور سامنے موجود کمرہ ڈھیروں خزانے سے بھرا پڑا دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر اسے خزانہ مل گیا تھا۔

ایڈم اس کے عقب میں زینے اتر رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر سنبھل چکا تھا۔

تالیہ پہلے صندوق تک آئی اور اندر ہاتھ ڈالا۔ سکوں کی کھنک... سونے کی چمک... اس کے جذبات مچلنے لگے۔

وہ دوسرے صندوق تک آئی... ہاتھ اس کے سکوں کے اوپر سے گزارا۔ سونے کا لمس... وہ ٹھنڈک... وہ چمک جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

”تم لوگ اوپر جاؤ۔“ ایڈم نے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ سر تسلیم خم کرتے اوپر کی طرف چلے گئے۔

دیواروں پہ لگی مشعلوں کے شعلے جل رہے تھے اور زر دروشتی میں وہ دونوں اس دولت سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑے نظر آ رہے تھے۔

”یا اللہ... اتنا سونا... اتنی دولت۔“ وہ ایک صندوق پہ جھکی اور جس میں طرح طرح کے زیورات کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے ہاتھ سے چند زیورات اٹھائے اور ان کو واپس اندر گرا دیا جیسے اس سے کھیل رہی ہو۔

”یہ آپ کے نہیں ہیں، چے تالیہ۔“ ایڈم کھٹکھارتا ہوا آگے آیا اور صندوق کا ڈھکن بند کیا۔ وہ سنے بغیر اگلے صندوق تک آئی اور اس میں رکھی سونے کی ننھی اینٹ اٹھائی۔

”خالص سونا۔ اس کی چمک دیکھو۔ اس کو محسوس تو کرو ایڈم۔“ اس کے چہرے پہ بچوں جیسی خوشی تھی۔

”یہ ملاکہ کے غریب لوگوں کی امانت ہے، چے تالیہ۔“ ایڈم نے جلدی سے اینٹ اٹھا کے واپس اندر ڈالی اور دھڑام سے اس صندوق کا بھی ڈھکن گرایا۔ وہ بدقت ضبط کر رہا تھا۔

مگر وہ مست مگن سی ایک کے بعد ایک صندوق کی طرف جارہی تھی۔ سونے میں ہاتھ ڈالتی اور کچھ نہ کچھ نکال لیتی۔ ایڈم بار بار اس کے پیچھے لپکتا اور ہر چیز اس سے واپس لے کر اندر ڈالتا۔

”یہ امانت ہے، چے تالیہ۔ ہم اس کو نہیں چھو سکتے۔“

”سوچو... اگر یہ ہمارا ہو جائے تو...“

”چے تالیہ۔“ وہ ناراض ہوا تو اس نے گہری سانس لی اور زور دے پین سے اسے دیکھا۔

”جانتی ہوں جانتی ہوں۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے خوش تو ہو لینے دو۔“

”آپ نے خوشی خوشی میں اس خزانے میں نقب لگانا شروع کر دینا ہے۔“

”بے فکر رہو۔ اب میں اپنی اصلاح کر چکی ہوں۔ اب میں چوری نہیں کرتی۔“ وہ مڑ کے جانے لگی۔

”جی اسی لئے آپ نے ہر صندوق سے چند اشرفیاں اور اس والے سے تھوڑا سا زور کھسکا کے اپنی جیب میں ڈالا ہے۔“ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہتھیلی پھیلائی۔ تالیہ نے خفگی سے پلکیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔

”اتنے سے سارے خزانے میں سے دو تین چیزیں نکال لینے سے کس کا نقصان ہوگا؟“

”ہمارے ایمان کا نقصان ہوگا۔ اور وہ سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اب واپس کریں سب۔“

تالیہ نے (ہونہہ) کر کے سر جھٹکا اور جیبیں الٹ دیں۔ زور اٹگوٹھی، سکے نکال کے اس کی ہتھیلی پر رکھے۔

”اور وہ جو آپ نے کان کے پیچھے بال اڑتے ہوئے سکے اپنے جوڑے میں چھپایا تھا، وہ بھی دیں۔“

تالیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ ڈالا اور سکے اس کی ہتھیلی پر پٹخا۔ ایڈم کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میدان جنگ میں نہ دشمن پر ترس کھاتے ہیں نہ دوست کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہیں۔“ سمجھداری سے اسے بتایا۔

تالیہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

کمرے کے کونے میں ایک ڈیوڑھی سی بنی تھی جس میں مختلف خانے تھے۔ ان میں عجیب و غریب چیزیں رکھی تھیں۔ کڑے اٹگوٹھیاں۔

تالے۔ ایک سونے کی گڑیا۔ اور سب سے اوپر ایک بوتل تھی۔ وہ اس بوتل کو پہچانتی تھی۔

اس نے بوتل اٹھائی اور اسے اوپر کر کے غور سے دیکھا۔

کانچ کی بنی بوتل خالی تھی۔ صرف پینڈے میں چند قطرے جتنا باقی ماندہ مائع موجود تھا۔

”ایسی ہی بوتل میں ایک مشروب کے اندر چابی رکھی ہوتی تھی۔“ وہ بڑبڑائی۔

”مگر اب یہ خالی ہے۔“

”خالی ہے نہیں۔ اس کو خالی کیا گیا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے واپس رکھی۔ ”باپا کے ملازم یقیناً چابی کو کہیں اور لے گئے

ہیں۔ شاید واپس باپا کے پاس!“ وہ اس کی طرف گھومی تو قدرے فکر مند لگتی تھی۔

”اب ہم چابی کیسے ڈھونڈیں گے؟“

تالیہ نے ایک نظر اطراف میں دوڑائی۔ ”ابھی چابی کی فکر نہیں کرنی۔ وان فاتح کا کہنا تھا کہ ہمیں پلان کے مطابق چلنا ہے۔ اس لئے

بہتر ہے کہ ہم پلان کے مطابق چلیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایڈم نے گہری سانس لی اور ایک عزم سے بولا۔ ”میں ان صندوقوں کو باہر نکلاتا ہوں۔ پھر میں واپس چلا جاؤں گا

اور....“

”نہیں ایڈم!“ وہ بولی تو آنکھیں ایڈم کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ ”یہ خزانہ تم نے ڈھونڈا ہے۔ یہ جزیرہ تم نے ڈھونڈا ہے۔ تمہارے الفاظ نے ڈریگن کے مالک کو مجبور کیا کہ وہ پسپائی اختیار کرے۔ اس خزانے کا راز تمہارا ہے۔ اس راز کو افشاء کرنا بھی تمہارا حق ہے۔“

”مگر....“ ایڈم لمحے بھر کو گنگ ہو گیا۔ ”پلان کے مطابق میں نے واپس جانا تھا اور آپ نے بعد میں یہ خزانہ لے کر واپس ملا کہ آنا تھا۔ آپ شہزادی ہیں اور میں تو بس.... (نگاہیں جھک گئیں)۔ ایک ادنیٰ غلام ہوں۔“

”اور ساتھ میں ایک بھگوڑے فوجی بھی ہو۔ مگر خیر....“ شہزادی نے بڑی نخوت سے گال پہ آئی لٹ پیچھے کی۔ ”تم بھی کیا یاد کرو گے! کیا اعزاز بخشے جا رہی ہوں تمہیں!“

”کیا واقعی؟“ اس نے حیران سی نظریں اٹھائیں۔ ”آپ مجھے اس خزانے کا امین بنا رہی ہیں؟“

”میں جانتی ہوں پلان کے مطابق مجھے یہیں رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا مگر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے ملکہ کی طرف سے خطرہ ہے۔ وہ فاتح کو مشکل میں نہ ڈال دیں۔“

”مگر وہ ان فاتح کو تو کبھی کسی کی ضرورت نہیں رہی۔“

”یہ ان کا خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ان کا ہر خیال درست ہو۔“ پھر تالیہ نے گردن گھمائی اور خزانے سے بھرے کمرے کو دیکھا۔

”تمہاری ماں نے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا جب ایڈم بن محمد کو اللہ تعالیٰ زمین میں مدفن خزانوں کے راز سمجھا دے گا اور اس دن ایڈم دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ طاقتور ہو گا۔ اور میں نے کہا تھا۔ آمین۔ شاید یہ وہی دن ہے ایڈم۔ تم اس خزانے کے مالک ہو۔ اب یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم حق کے لئے کھڑے ہوتے ہو یا نہیں۔ رہی میں تو میرا خزانہ سن باؤ کے گھر چھپا ہے اور میرا مراد مقصود صرف وہ چابی ہے۔ اس لئے مجھے جانا ہو گا۔“

تالیہ مراد کی آواز میں تحکم کی بلکی سی رمت موجود تھی۔ ایڈم بن محمد نے سر کو تسلیم خم کر دیا۔

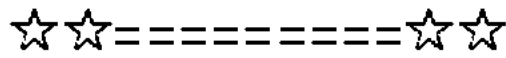
شہزادی حکم سنا کے اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے کندھے کی پشت پہ بندھے ترکش میں اب بھی کافی تیر باقی تھے۔ چے تالیہ کے منصوبوں کی طرح۔

وہ خزانے سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑا سوچ رہا تھا۔

اگر یہ وہ دن ہے.... جب مجھے زمین کے خزانوں کا راز معلوم ہو جانا تھا.... تو مجھے دنیا کے سارے بادشاہوں سے زیادہ طاقتور ہونا تھا۔ پھر اتنا طاقتور کیوں نہیں محسوس کر رہا میں خود کو؟

وہ سوچ رہا تھا۔ حیران۔ پریشان۔

سپاہی اب نیچے اتر رہے تھے۔ کچھ نے تالیہ کے ساتھ واپس جانا تھا۔ کچھ نے ایڈم کے ساتھ یہیں رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا۔



مدھم موم بتیاں مراد راجہ کی خواب گاہ کو نیم روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ چوکڑی مار رکھی تھی۔ اور ارد گرد تیرہ موم بتیاں قطار میں جلا رکھی تھیں۔ سامنے ایک بھری ہوئی بوتل رکھی تھی جس کے پینڈے میں سنہری سکھ اور زنجیر تیر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ بوتل سے چند انچ اوپر پھیلائے زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

مراد نے توجہ نہ دی۔ وہ اسی طرح آنکھیں موندے منتر پڑھنے میں مصروف رہا۔

دفعہ دوبارہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ سرخ پڑ رہی تھیں۔

دستک تواتر سے ہونے لگی۔

مراد نے برہمی سے دروازے کو دیکھا۔ پھر پھونک مار کے ساری موم بتیاں بجھا دیں۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرے میں اٹھا۔ کھڑکی تک گیا۔ پیالے سے پانی لے کر چہرے پہ ڈالا پھر دیا سلائی سلگائی اور قندیل روشن کی۔

اندھیرا چھٹا اور اب کی دفعہ کمرہ عام روشنی سے روشن ہوا۔ وہ موم بتیوں کی نحوست بھری روشنی عنقا ہو چکی تھی۔

اس کے گیلے چہرے کے تاثرات نارمل ہو چکے تھے اور آنکھوں کی سرخی کم تھی۔ سادہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس مراد نے سرخ پٹی ماتھے پہ باندھی اور دروازے کی طرف بڑھا جو مسلسل بج رہا تھا۔

”کون سا عذاب آگیا تھا جو مجھے اس وقت تنگ کیا ہے؟“ پٹ کھولتے ہی وہ دھاڑا تھا۔ ”کیا جانتے نہیں ہو یہ بندہ ہمارا کی عبادت کا وقت ہوتا ہے۔“

”راجہ! سپاہی نے دونوں ہاتھ باندھے عرض کی۔ ”سلطان کا پیغام آیا ہے۔ آپ کو فوری طور پہ بلا بھیجا ہے۔“

”اس وقت؟“ مراد کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”سلطان نے... کہا ہے کہ...“ سپاہی نے تھوک نگا۔ ”اگر مراد اپنے پیروں پہ چل کے نہ آئے تو بیڑیوں میں لے آؤ۔“

ملا کہ سلطنت کے عظیم بندہ ہمارا مراد راجہ کے ماتھے کی ساری شکنیں غائب ہو گئیں۔

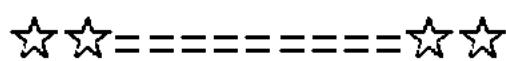
”ہوا کیا ہے؟“ اسے پریشانی ہوئی۔

”معلوم نہیں راجہ۔ مگر آقا سخت برہم لگ رہے ہیں۔“

”چلو۔“ وہ فوراً مڑا اپنی قبا اٹھا کے کندھوں پہ ڈالی پیروں میں جوتی گھسیٹی، تلوار اٹھانے لگا پھر واپس رکھ دی۔ اس کے کسی انداز سے

جرحیت کی بو نہیں آئی چاہی۔

بابر نکلنے سے قبل وہ بوتل کو خاص جگہ پہ چھپانا نہیں بھولا تھا۔



تین چاند والے جزیرے کی وہ چھوٹی پہاڑی چاندنی میں دھک رہی تھی۔ اس کی چوٹی پہ بڑا سا شیشہ تراش کے لگایا گیا تھا یا شاید وہ نمک تھا جو اتنا شفاف تھا کہ چاند کا عکس اس میں جھللاتا تھا۔

دوسرا چاند سمندر پہ تیر رہا تھا اور تیسرا چاند آسمان پہ بادلوں کے اوپر ٹیک لگائے نیم دراز نیچے جزیرے کے ساحل کو دیکھ رہا تھا۔ دور افق پہ مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سیاہ آسمان جامنی ہو رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صبح ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ ایسے میں ساحل پہ کھڑی کشتی کو سپاہی سفر کے لئے تیار کر رہے تھے۔ چند سپاہی پہاڑی کے دامن میں غار کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ تالیہ اور ایڈم کشتی کے ساتھ کھڑے تھے۔ آمنے سامنے۔ تالیہ نے اپنا چغہ پہن رکھا تھا تیز ہوا سے اس کے بال بار بار چہرے پہ آتے جن کو وہ کانوں کے پیچھے اڑتی۔ ایڈم اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”احتیاط سے جائیے گا۔ سمندری سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔“

”ہمیشہ مایوسی کی باتیں کرتے ہو ایڈم۔“ وہ بے فکری سے مسکرائی۔ ”ہم پلان پہ چل رہے ہیں تو ڈر کیسا؟ بس کل تک میں واپس ملا کہ پہنچ جاؤں گی۔ تم تب آنا جب دوسرا مرحلہ پورا ہو جائے۔“ اس نے ذومعنی انداز میں یاد دلایا۔ ایڈم نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے غور سے اسے دیکھا۔

”کیا واقعی آپ یہاں سے کچھ چرا کے نہیں جا رہے؟ آپ چوری سے جاسکتی ہیں۔ ہیرا پھیری سے نہیں۔“

”ارے وہ سب تو میں نے مذاق میں اٹھایا تھا۔“ وہ کھلکھلائی۔ ”ابھی اتنے ٹرکس نہیں سکھائے تمہیں کہ میرے ہاتھ کی صفائی پکڑ سکو۔“

”میری نظر بہت اچھی ہے چے تالیہ۔ یاد کریں۔ مسز عصرہ کی گیلری میں پہچان گیا تھا کہ آپ تنگو کامل کی ملازمہ ہیں۔“

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر تالیہ نے گردن گھمائی۔ وہ دونوں ساحل پہ کھڑے تھے اور سامنے چاندنی سے چمکتے پانیوں والا سمندر بہہ رہا تھا۔ خاموش سا کن سمندر۔ پندرہویں صدی کا جوان سمندر۔

”وقت کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا ایڈم؟“ نیلے پانیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آواز میں اداسی گھل آئی۔

”میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پانی کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر وہاں فاتح کا راز کھل گیا اور راجہ نے ان کو گرفتار کر لیا یا ان کی جان لینے کی کوشش کی تو کیا ہوگا۔“

”نہیں۔ باپا ان کو یوں ایک دم مار نہیں دیں گے۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اگر راجہ نے ان کو مارا نہیں بلکہ چناؤ کا اختیار دے دیا تو وہ کس کو چنیں گے۔“

تالیہ چونکی۔ سمندر کی لہریں پل بھر کو تھم گئیں۔ سارا جزیرہ دم سادھے سننے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”یاد رکھیے گا۔ اگر ان کو چناؤ کا موقع ملا تو وہ آپ کو یا مجھے کبھی نہیں چنیں گے۔“

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ماتھے پہ بل در آئے۔ ”تم میں اور مجھ میں فرق ہے ایڈم۔“
 ”صرف اتنا کہ آپ سے انہوں نے نکاح کیا ہے، مگر یاد رکھیے گا۔ وہ ہمیشہ ہمارے ہیرو رہیں گے اور ہم ان کے فیئر۔ ادنیٰ کارکن۔
 بس!“

”تمہیں کیوں لگتا ہے باپا ان کو چناؤ کا اختیار دیں گے اور کس قسم کے چناؤ کی بات کر رہے ہو تم؟“ وہ ابھی ابھی ہوئی تھی۔ اسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنے مہینے ایک محل میں رہا ہوں میں چے تالیہ۔ اتنا تو بتا سکتا ہوں کہ یہ حکمران بڑے فیصلوں میں ہم ادنیٰ کارکنوں کو شریک نہیں کرتے۔ اس لئے... اگر آپ کو چناؤ کا موقع ملے تو میرے جزیرے سے آنے کا انتظار مت کیجئے گا۔ خود اس دروازے کو پار کر لیجئے گا۔“

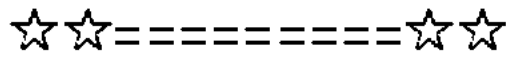
”نہیں ایڈم!“ وہ بولی تو آنکھوں میں قدرے غصہ تھا۔ ”ہم ایک ساتھ آئے تھے اور ایک ساتھ جائیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو اس کی لاش ساتھ جائے گی۔ تم فی الحال اس خزانے کو سنبھالو۔ میں ملاکہ میں تمہاری منتظر رہوں گی۔“
 اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔ ایڈم نے پھر سے سر کو خم دیا۔

”الوداع شہزادی!“

تالیہ نے چغے کی ٹوپی سر پہ برابر کی اور کشتی کی طرف بڑھ گئی۔ اس پہ بیٹھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔
 ساحل کنارے چغہ پوش آدم بن محمد کھڑا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے آس پاس کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ملاح سپاہی نے بادبان کھول دیا اور کشتی کو پانی پہ دھکیل دیا۔ پھر چپو چلانے لگے۔
 وہ عرشے پہ ایک لکڑی کی چوکی پہ بیٹھ گئی اور رخ پانی کی طرف موڑ دیا۔ کنکھیوں سے وہ ساحل کنارے کھڑے ایڈم کو دیکھ سکتی تھی۔
 جب کشتی سمندر پہ دور نکل آئی اور آسمان پہ فجر طلوع ہونے لگی تو تالیہ نے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کے نکالا تو اس میں ایک چمکتی ہوئی شے تھی۔

یہ وہ چیز تھی جو اس نے غار میں رکھی عجیب و غریب چیزوں میں سے اٹھائی تھی۔ یہ سونے کی ہیر پن تھی جس کو ہوڑے میں لگایا جاتا تھا۔
 اس کے دہانے پہ برن کا چہرہ بنا تھا، آنکھوں میں ہیرے لگے تھے۔ اور پیچھے جا کے وہ لمبی نوکیلی ہو جاتی تھی۔ تالیہ نے اسے اٹھا کے روشنی میں دیکھا اور مسکرائی۔

”ایڈم بن محمد.... یہ ملاکہ کے لوگوں کی نہیں میرے باپا کی شے تھی۔ جانے یہ کس لئے استعمال ہوتی ہے مگر نئے دور میں جا کے یہ اچھی خاصی قیمت پہ بک جائے گی۔ اس میں قیمتی ہیرے اور خالص سونا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ وہ خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس کی کشتی سمندر پہ تیرتی جزیرے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔



مراد راجہ جب سلطنت محل پہنچا تو صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ سپاہی اسے فوراً اندر لے گئے۔ مراد نے چہرہ بے تاثر رکھا مگر حقیقتاً وہ پریشان تھا۔

اسے ایک ملاقاتی کمرے میں بٹھا کے سپاہی چلے گئے۔ وہ کافی دیر انتظار کرتا رہا۔ بے چینی سے ٹہکتا رہا۔ ایک دو بار دربانوں کو آواز دی تو انہوں نے بتایا کہ آقا غسل فرما رہے ہیں۔ مراد ضبط کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

اسے اتنا انتظار مرسل نے پہلی دفعہ کروایا تھا۔

صبح کی پہلی کرن باہر آسمان پہ دکھائی دی تو مرسل شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کہیں سے بھی حالت نیند میں نہیں لگتا تھا نہ بال گیلے تھے۔ شاید وہ اتنی دیر کچھ سوچنے میں مصروف رہا تھا۔ پیشانی سلوٹ زدہ تھی۔ مراد نے غور سے اسے اندر آتے اور مسہری پہ براجمان ہوتے دیکھا۔ ایک ہاتھ گھٹنے پہ جمائے وہ سیدھا بیٹھا قدرے خفگی سے مراد کو دیکھ کے بولا۔

”آگئے تم؟“ ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مراد آہستہ سے سامنے بیٹھا۔

”کافی دیر ہو چکی آقا۔ خیریت تھی؟ کہیں بغاوت کا اندیشہ تو نہیں ہوا؟ یا دشمن کا حملہ؟“ وہ بظاہر فکر مندی سے بولا مگر آواز میں معمولی سا گلہ بھی تھا۔

”مراد راجہ!“ مرسل نے بھنویں اکٹھی کیے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”دشمن کے حملے سے زیادہ تکلیف وہ بات میرے لئے یہ ہوگی کہ میرا بند اہارا مجھ سے جھوٹ بولے۔“

مراد کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ تاثرات میں حیرانی گھل گئی۔

”میری جان لے لیجئے آقا، مگر مجھے بتائیے تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔“ پھر اسے خیال گزرا۔ ”کیا چین سے قرضہ لینے کے فیصلے پہ میری رائے....“

”تم نے اپنی بیٹی کو کنواری کیوں کہا جب کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔“ وہ اکھڑے اکھڑے مگر مضطرب لہجے میں بولا تو مراد نے تعجب سے دونوں ابرو اچکائے۔

”میری بیٹی... شادی شدہ؟“ پھر وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ ”ایسا مذاق کس نے کیا آپ سے آقا؟“ وہ حیران تھا مگر جیسے محظوظ بھی ہوا تھا۔

مرسل کے تاثرات قدرے بدلے۔ چہرے کے تناؤ میں کمی آئی۔ وہ ذرا آگے کو ہوا۔

”تو یہ بات غلط ہے کہ ملک چین میں تمہاری بیٹی کی پہلے شادی ہو چکی ہے اور اس بات کو چھپا کے مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔“ وہ بے چین لگتا تھا۔

کھڑکی کے پار جامنی آسمان سفید پڑ رہا تھا۔ روشنی اندر آئی تو کمرہ منور ہونے لگا اور قندیلوں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔
 ”میں سمجھ گیا آقا۔“ مراد نے گہری سانس لے کر سر ہلایا۔ ”آپ کو ایسی بات کسی چین سے تعلق رکھنے والے نے کہی ہوگی۔ ظاہر ہے اس شادی پہ سب سے زیادہ تکلیف چینوں کو ہی ہوگی۔ کیا آپ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ شادی آپ آرام سے کر لیں گے اور گستاخی معاف ملے کوئی رد عمل نہیں دیں گی؟ آپ تو برے سے برے حالات کے لئے بھی تیار تھے آقا، پھر اب ان فضول باتوں پہ کیوں دھیان رہے دے ہیں۔“ کمرہ مزید منور ہوا تو مرسل کے چہرے پہ آئے شک کے بادل بھی چھٹنے لگے۔

”یعنی... شہزادی تاشہ کی کوئی شادی نہیں ہوئی۔ اور وہ.... وہ میرے نکاح میں آ سکتی ہیں۔“
 مرسل کے چہرے پہ خوشی اور اندیشے ایک ساتھ موجود تھے۔ مراد رسان سے مسکرایا اور آگے کو جھکا۔
 ”آقا یہ صرف ایک سازش ہے مجھے آپ سے دور کرنے اور اس شادی کو روکنے کے لئے۔ میری بیٹی غیر شادی شدہ ہے اور وہ آپ کی ہی ملکہ بنے گی۔ آپ اس کو بلو کے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں خود قرآن پہ ہاتھ رکھ کے حلف لینے کو تیار ہوں۔ آپ ان واہموں سے نکل آئیں۔“

”اوہ۔“ مرسل شاہ نے گہری سانس لی۔ کھڑکی سے آتی روشنی نے کمرے کے سارے اندھیرے دور کر دیے تھے۔ فضا جیسے صاف ہو گئی تھی۔ ”تو یہ صرف ایک سازش تھی؟ میں خواہ مخواہ اتنا پریشان رہا۔“ اس نے بے اختیار پیشانی مسلی جیسے بہت سے تناؤ کو خارج کیا۔
 ”یہ تو ابھی شروعات ہیں آقا۔ آگے بہت کچھ ہوگا۔ آپ کو خود کو مضبوط بنانا ہوگا۔ ہمیں مل کے ان سب سازشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔“
 پھر مراد نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ ”مجھے فوج کی مشقوں کی نگرانی کے لئے جانا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو...“

”ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔“ مرسل نے ہاتھ جھلایا۔ وہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ مراد ادب سے سر کو خم دے کے اٹھا اور اٹھنے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرہ اتنا روشن ہو چکا تھا کہ دروازے کے ساتھ جلتی قندیل کا شعلہ بے معنی سا لگتا تھا۔ اس نے لوہے کا ڈھکن اٹھایا تا کہ قندیل کے اوپر رکھ کے شعلہ بجھا دے۔

”اصل میں ملکہ نے بھی عجیب غلط سلط باتیں میرے ذہن میں ڈال دیں۔“ مرسل شاہ پیچھے سے بڑبڑا رہا تھا۔ ”وہ بولیں کہ تاشہ کی شادی اس مرد سے ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ چین سے یہاں آیا ہے اور تو اور مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔“
 مراد نے زوردار آواز سے لوہے کا ڈھکن شعلے کے اوپر رکھا۔

ہوا کا رستہ رک گیا۔

شعلہ بجھ گیا۔

مگر اس کا ہاتھ ڈھکن پہ ساکت ہو گیا۔

مرسل کی طرف اس کی پشت تھی اس لئے مرسل اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا جو ایک دم زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔

سیاہ پڑتا ساکت چہرہ۔

اس نے ڈھکن سے ہاتھ ہٹایا تو وہ بہت وزنی محسوس ہوتا تھا۔ بدقت مراد رجبہ نے قدم آگے بڑھائے اور باہر نکل گیا۔
راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا بندہ اس چہرے کے ساتھ نہیں جا رہا تھا جس کے ساتھ وہ آیا تھا۔

☆☆=====☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ بھی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ سمندر کا پانی لہروں کی صورت بار بار ساحل سے ٹکراتا اور واپس پلٹ جاتا۔
پہاڑی کے دامن میں درختوں تلے صندوق قطار در قطار رکھے تھے اور ان کے اوپر لکڑیوں کے چھپر بنائے گئے تھے۔ تاکہ وہ بارش سے محفوظ رہیں۔ سپاہی اب ایک طرف آگ جلا کے ناشتے کا انتظام کرنے میں مصروف تھے۔ جنگل کے اندر کوئی نہیں گیا تھا کیونکہ یقیناً وہاں بہت سے خونی کموڈور یگن موجود تھے جو ہر سیاح کو کھا جاتے تھے اور لوگ اس جزیرے سے واپس نہیں لوٹتے تھے۔
پھر ایک سپاہی نے جنگل میں جانے کی ہمت کی اور تھوڑی دیر بعد چند پرندے شکار کر کے لے آیا۔ ویسے تو ان کے پاس کھانے کا وافر سامان موجود تھا مگر پرندے مل جانا بھی غنیمت تھا۔ اب دو افراد ان پرندوں کو آگ پہ بھونٹتے دکھائی دے رہے تھے۔
ایڈم ساحل کے پتھروں کے پاس بیٹھا تھا۔ کاغذ گھٹنوں پر رکھے، وہ سپاہی میں قلم ڈبو ڈبو کے الفاظ صفحے پر اتار رہا تھا۔
”مورخ صاحب!“ پیچھے سے ایک سپاہی نے اسے مخاطب کیا تو اس نے گردن موڑی۔
”ہاں کیا ہوا۔“

”میں سوچ رہا ہوں لکڑیاں کاٹ کے کشتی بنانے کا انتظام کروں۔ شہزادی تاشہ کے چلے جانے کی وجہ سے ہمارے پاس کوئی کشتی نہیں ہے۔ بالفرض دوسرا مرحلہ نام کام ہو جاتا ہے تو ہم کیا کریں گے؟“ وہ فکر مند لگتا تھا۔
ایڈم ہلکا سا مسکرایا۔ ”ہاں تم اپنا انتظام پورا رکھو مگر مجھے یقین ہے کہ ہم دوسرے مرحلے تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ سچ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں ان کے لئے راستے اللہ تعالیٰ خود کھولتا ہے۔“

سپاہی نے گردن موڑ کے درختوں کے چھپر تلے رکھے صندوقوں کو دیکھا اور پھر اس مورخ کو جو واپس کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
۔ (سچ کیسا؟ ہم تو شہزادی کی غلامی اور احسانات کی وجہ سے ان سے وفا کر رہے ہیں۔ مگر خیر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔)
پھر ایڈم کے قلم کاغذ کو دیکھا تو بولا۔ ”آپ لکھنے کا سامان ساتھ لائے تھے؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”سراقہ کے کنگن والا واقعہ سنا ہے تم نے؟“ وہ مسکرا کے لکھتے ہوئے بولا تو سپاہی سوچ میں پڑ گیا۔
”وہ صحابی جن کو عمر بن خطابؓ نے فتح ایران کے بعد کسریٰ کے کنگن بھجوائے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھے تھے؟“

”ہاں۔ جانتے ہو جب وہ صحابی نہیں تھے تو کیا تھے؟“ ایڈم لکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ لہروں کا شور اور غم ہوا، کچھ بھی اسے کام سے غافل

نہیں کر پار ہا تھا۔ ”وہ ہجرت مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ کا پیچھا کرتے ان سے جا ملے تھے۔ وہ ان کو گرفتار کروانا چاہتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ان کا گھوڑا ہلنے سے انکاری ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئیں۔ اس وقت انہوں نے آپ ﷺ سے امن کا پروانہ لکھ دینے کی درخواست کی تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کے حکم پر ان کو وہ پروانہ لکھ کے دے دیا گیا تھا۔ جانتے ہو مجھے اس واقعے میں سب سے زیادہ کیا چیز حیران کرتی ہے؟“ شاہی مورخ قلم ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔

”یہی کہ ہجرت کے وقت کی بے سرو سامانی کے عالم میں بھی لکھنے کا سامان ساتھ رکھا گیا تھا۔ جب مدینہ کی طرف جانے والوں کو اپنی جان بچانی تھی اور تعاقب کرنے والے کو سوا دنوں کے لالچ نے بے تاب کر رکھا تھا تب بھی کسی کے پاس لکھنے کا سامان موجود تھا۔ یہ لکھنا بھی عجیب چیز ہے۔ یہ کام انسان کو شروع سے نہیں آتا تھا۔ بہت سے کام انسان نے خود سیکھے۔ غاروں سے عمارتوں تک وہ خود پہنچا مگر لکھنا بالواسطہ اسے اللہ تعالیٰ نے سکھایا۔ کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام کو وحی کے ذریعے لکھنا سکھایا گیا تھا۔ اس سے پہلے انسان لکھا نہیں کرتے تھے۔“

سادوئنگ نے گہری سانس لے کر اس مورخ کو دیکھا جو اپنے کاغذات کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہہ رہا تھا۔

”تم نے پوچھا کہ میں نے لکھنے کا سامان کیوں ساتھ رکھا ہے؟ تو یہ ہے میرا جواب۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہم مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے سیکھی ہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ بڑے بڑے کام کریں۔ میں شاید بڑے بڑے کام نہیں کر سکتا۔ مجھ میں نہ اتنا ہنر ہے نہ اتنی ذہانت۔ نہ میرے پاس اتنے ذرائع ہیں۔ میں اکثر مایوس ہوتا تھا کہ میں اس اعلیٰ مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتا جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ وان فاتح مجھے بڑی بڑی مثالیں دیا کرتے تھے۔ مگر مجھے ملا کہ نے یہ سکھایا ہے کہ انسان کو بڑے کام کرنے کے لیے پہلے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ اور میں نے اس چھوٹے کام سے شروع کیا!“ اس نے اپنا قلم اٹھا کے دکھایا۔ سادوئنگ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اس کی باتیں سننا اس کی مجبوری تھی۔

”قلم سے۔ قلم نے اس واقعے میں کسی کی زندگی بچائی تھی۔ برسوں بعد بھی سراقہ بن مالک نے اس پروانے کو دکھا کے امن حاصل کیا تھا۔ تحریر میں جان بچانے کی طاقت ہوتی ہے سادوئنگ۔ جن لوگوں کو لکھنا آتا ہے ان کا نہ لکھنا گناہ ہوتا ہے۔ اور مجھے لکھنا آتا ہے۔ جو سکون مجھے لکھنے سے ملتا ہے کسی چیز سے نہیں ملتا۔ اب لکھنا میری مجبوری ہے۔ میں اگر نہیں لکھوں گا تو ایک عطائے خداوندی کو ضائع کروں گا۔ اور یہ گناہ ہے۔ تو میں یہ قلم کاغذ اس لئے ساتھ لایا تھا کیونکہ میں نے یہ بات اپنے نبی ﷺ کی زندگی سے سیکھی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ بروقت لکھنے کا سامان ساتھ رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر مجھے آپ ﷺ جیسا سچا اور دیانت دار انسان بننا ہے تو مجھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنانا ہو گا۔ تب ہی میں بڑے بڑے کام کر سکوں گا۔“

جرنیل سادوئنگ نے گہری سانس لی اور دونوں ابرو اٹھائے۔ ”درست فرمایا۔ اب میں ذرا کشتی کا سامان بنانا شروع کر دوں۔“ اور ذرا سی جھمر جھری لے کر وہ مڑ گیا۔ ایڈم نے مسکرا کے سر جھٹکا اور واپس کاغذ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی اسے کافی سارا لکھنا تھا۔ اگر شہزادی تاشہ کی امیدیں سچی تھیں اور انہوں نے واقعی وقت کے اس پار چلے جانا تھا تو اسے یہ کتاب جلد از جلد مکمل کرنی تھی۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ سلطنت کا بندہ ہمارا درجہ اپنے محل میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔ اس کی نظر سے دیکھو تو سارے منظر نامے پہ سرخ دھند چھائی تھی۔ دھند لی سی راہداری تھی جس میں وہ لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ تیز تیز... راہداری بڑھتی جا رہی تھی... وہ چلتا جا رہا تھا... سرخ دھند گھنی ہوتی جا رہی تھی....

درمیان میں کتنے لوگ آئے... پہریدار دربان، سپاہی، غلام۔ اس نے ہر ایک کو ہاتھ جھلا کے ہٹے کا کہا۔ لوگ ہٹتے گئے۔ راستہ دیتے گئے۔ سرخ دھند دھوئیں میں بدلنے لگی۔ ایسا دھواں جس میں سانس لینا تک دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا سینہ بار بار گھٹ رہا تھا۔ مٹھیاں بچنی ہوئی اور ناخن ہتھیلی میں پیوست محسوس ہوتے تھے۔ آنکھیں دہکتے انگاروں جیسی ہو رہی تھیں۔ کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند وہ جارحانہ انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔ (شہزادی نے اس شخص سے شادی کر رکھی ہے جو چین سے اس کے ساتھ آیا ہے۔ اور مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔) الفاظ اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ اندیل رہے تھے۔

گول زینہ سامنے آیا تو وہ بھی سرخ دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ ایسا دھواں جس میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو شامل ہوتی ہے۔ مراد راجہ زینے اترنے لگا۔ ایک ایک زینہ چھوڑ کے پھلانگتا... وہ گول میڑھیاں چکر کی صورت عبور کرتا نیچے آیا۔ وہاں قید خانے بنے تھے۔ قطار در قطار۔ قیدی اسے دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ سرخ دھواں گھنا ہوتا گیا۔ بوشدید محسوس ہو رہی تھی۔

راہداری کے سرے پہ وہ کال کوٹھڑی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی زور سے دروازے پہ ہاتھ مارا۔ ساتھ کھڑے پہریدار نے جلدی سے تالہ کھولا تو مراد پیٹ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔

سرخ دھند میں اتنا نظر آیا کہ قیدی کو نے میں زمین پہ بیٹھا ہے۔ پیر سے زنجیر بندھی ہے اور زنجیر کے سرے پہ وزنی لوہے کی گیند ہے۔ اسے دیکھ کے قیدی نے سر اٹھایا اس کی چھوٹی آنکھوں میں چمک آئی اور وہ مسکرایا۔ سنہری رنگت اور چھوٹے بالوں والا خوش شکل قیدی جو بوسیدہ سفید کرتے پا جامے میں ملبوس اکثر وہ بیٹھا تھا اس وقت کسی دوسری دنیا کا فرد لگ رہا تھا۔

راجہ مراد کو سرخ دھند میں اس کے کپڑے بھی سرخی مائل نظر آ رہے تھے۔

اس نے قیدی کو گریبان سے پکڑ کے کھڑا کیا اور دیوار سے لگا کے غرایا۔

”تمہارا میری بیٹی سے کیا تعلق ہے؟“

فاتح نے اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ سر کی پشت دیوار سے لگائے رکھی۔ اور ابرو اچکا کے مسکرایا۔
 ”تم یہ سوال مجھے کرسی پیش کر کے بھی پوچھ سکتے ہو۔“

”بتاؤ مجھے... کون ہو تم؟ ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ مراد کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

چند لمحے کے لیے قید خانے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف مراد کے تیز، بے ربط تنفس کی آواز سنائی دیتی تھی۔

”ہماری دنیا میں ہمیں گیم تھیوری پڑھائی جاتی تھی۔ گیم تھیوری۔ حکمت چال۔ ایک ایسی حکمت ہے جو کھیل، سیاست، جنگ حتیٰ کہ تمام بڑے فیصلے لیتے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ کیا تم نے کبھی حکمت چال کے بارے میں سنا ہے راجہ؟“ وہ تھل سے بولا تو مراد راجہ نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ اسے جیسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اس آدمی کے ساتھ کیا کرے۔ بس دانت کچکچاتا وہ اسے دیکھ رہا تھا جو اپنی ہی رو میں کہہ رہا تھا۔

”کھلاڑی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ متناہی اور لامتناہی۔ متناہی کھلاڑی محدود ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسے۔ وہ جب کھیلتے ہیں تو اصولوں کے اندر رہتے ہوئے ایک مقرر کردہ ہدف کو حاصل کرنے کے لئے کھیلتے ہیں۔ وہ صرف جیتنے کے لئے کھیلتے ہیں۔ محدود کھلاڑی ہارتے بھی ہیں اور جیتنے بھی ہیں کیونکہ ان کا مقصد صرف طاقت کا حصول ہوتا ہے۔“

”میں آخری بار انسانوں کی زبان میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟“ وہ غرایا تھا۔ اس کا چہرہ غیض و غضب سے سیاہ پڑ رہا تھا۔

”مگر لامتناہی کھلاڑی میرے جیسے ہوتے ہیں۔ لامحدود۔ وہ بغیر اصولوں کے بغیر کسی ہدف کے کھیلتے ہیں۔ ان کا مقصد جیتنا یا کوئی مقصد حاصل کرنا یا طاقت پالینا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ارادے کی مضبوطی سے کھیلتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اصول بدل لیتے ہیں، حدود کو آگے پیچھے کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہ صرف کھیل کو بڑھاتے رہنے کی غرض سے کھیلتے جاتے ہیں۔ وہ جیتنے کے لیے نہیں کھیلتے اس لیے غیر لامتناہی کھلاڑی کبھی نہیں ہارتے۔ ان کو کوئی براہی نہیں سکتا۔“

”تمہارا... میری بیٹی سے... کیا تعلق ہے؟“ راجہ نے چبا چبا کے الفاظ ادا کیے تو غصیلی نظریں اس پہ جمی تھیں... کال کوٹھڑی کے اندر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور باہر ابداری میں سپاہی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔

”ہماری دنیا کی حکمت چال کے مطابق... تم ایک لامتناہی کھلاڑی کو نہیں برا سکتے۔ بقا کی جنگ لڑنے والے زماں و مکاں کی قید سے نکل کے کھیلتے ہیں۔“ پھر اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”ہمیں تم سے تب تک کھیل کھیلنا ہے جب تک کھیل جاری رہ سکے اور تم تھک کے ہمیں یہاں سے جانے دو۔ میں جب چاہتا ہوں اپنی مرضی سے اصول بدل لیتا ہوں کیونکہ تاہیہ اور میرے کوئی اصول، کوئی حدود نہیں ہیں۔ ہمیں طاقت اور اہداف نہیں چاہئیں۔ ہمیں صرف اپنی دنیا میں واپس جانا ہے اور جب تم مجھے اپنے سامنے کرسی پہ بٹھانے کے لئے تیار ہو جاؤ گے تو میں تمہیں بتا دوں گا... کہ میرا اور تاہیہ کا کیا تعلق ہے۔“

مراد نچلا لب دانتوں سے دبائے، نفی میں سر ہلاتا اٹھنے والے قدموں پیچھے ہٹا گیا۔

”خدا کی قسم اگر ملکہ کی بات درست ہے تو میں تمہارا کھیل تم پہ الٹ دوں گا۔“ وہ اٹنے قدموں پیچھے جا رہا تھا۔ سرخ دھواں آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ نیم اندھیر کمرہ صاف دکھائی دینے لگا۔

”میں تم سے نہیں ڈرتا رجبہ۔ تم مجھے کبھی نہیں مارو گے میں جانتا ہوں۔ اور اب تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ہاتھ سینے پہ لپیٹ لئے تھے۔ آنکھوں میں رجبہ کے لیے صرف رحم تھا۔

”میں تمہیں... ابھی... ابھی اسی وقت مار سکتا ہوں۔“ وہ بلند آواز میں گرجا۔ غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے کھڑے فاتح نے ابرو اچکائے۔ ”اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہاری بیٹی اور تمہارے رشتے کا کیا بنے گا؟ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہی سوچ رہے ہونا تم اس وقت۔ میں تمہارا ذہن پڑھ سکتا ہوں، بندہ ہارا!“ سرد سا مسکرایا۔ ”اس لئے بہتر ہے کہ مجھے مارنے کی بجائے تم اپنی فکر کرو کیونکہ تمہیں بہت جلد اس سے بڑے جھٹکے ملنے والے ہیں۔ کیونکہ میں کھیل جاری رکھنے کے لیے کھیل رہا ہوں۔“

”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ وہ اس پہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ ساتھ ہی بلند آواز میں حکم صادر کیا۔ ”اس کا کھانا پانی بند کر دو اور... اور...“ بے بسی سے جیسے وہ بس یہی حکم جاری کر پایا تھا۔ ”اور اس کو اتنا مارو کہ یہ خود کو بھی نہ پہچان سکے۔“

سپاہی فوراً سے فاتح کی کوٹھڑی کی طرف لپکے۔ دوسری کوٹھڑیوں کے قیدی بھی کھڑے ہونے لگے۔

مراد رجبہ ماتھے پہ بل ڈالے بازو پیچھے باندھے لمبے ڈگ بھرتا زینے کی طرف بڑھ گیا۔

سرخ دھند کی جگہ اب سیاہ دھوئیں نے لے لی تھی۔

اس کے اندر کا سارا گوشت جیسے جل گیا تھا اور اب صرف راکھ رہ گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

بندہ ہارا کے محل کے داخلی دروازے کے سامنے جو روشن بنی تھی اس پہ پھولوں کی پیتاں گری پڑی تھیں۔ آج صبح شہزادی تاشہ واپس آئی تھی تو بگھی سے اترتے ہی اس کا استقبال کنیروں اور خادموں نے بہت محبت سے کیا تھا۔

اس کا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کے گئی تھی، البتہ مختلف جگہوں پہ کھونٹیاں لگا کے زرتار کا مدار بلوسات لٹکائے گئے تھے۔ یہ اس کی شادی کے لئے بنوائے گئے تھے۔ وہ چغدا تار کے مسہری پہ پھینکتی کینہ تو ز نظروں سے ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بندھے بال خشک ہو رہے تھے۔ دودن پرانا سیاہ کرتا پا جامہ پہنے وہ قدرے بے رونق سی لگ رہی تھی۔ چہرے پہ سفر کی تکان تھی اور آنکھوں میں بے زاری۔

ایک زمانے میں اس کی کتنی خواہش تھی کہ...

کہ وہ کوئی شہزادی ہوتی...

جس کی شادی کسی بادشاہ سے ہوتی...

اور سونے چاندی کے ڈھیر کے ساتھ زرتار عروسی ملبوسات میں اس کو رخصت کیا جاتا۔

اور آج اس نے جانا تھا کہ کچھ خواب پورے ہونے کے لئے نہیں صرف دل کو خوش کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ فینٹسی۔ ذہن میں بنی کہانیاں۔ ان کو پورا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ ٹریجڈی بن جاتی ہیں۔

شریفہ ایک دم آندھی طوفان کی طرح اندر بھاگتی ہوئی داخل ہوئی تو تالیہ نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ ”ابھی تو ہم سفر سے آئے ہیں... دو گھڑی سانس تو لے لو شریفہ!“

”شہزادی... شہزادی...“ پھولے تنفس سے اس نے جوابات بتائی، وہ تالیہ مراد کو پتھر کا بت بنا گئی تھی۔

قید خانے میں وہ صلیب کی صورت میں بندھا تھا اور سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے مار رہا تھا۔ فاتح نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کے کندھوں اور کمر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ دماغ کی چولیس بل جاتیں۔ اور خون کے ہر قطرے کے ساتھ وہ مناظر یاد آنے لگتے۔

آریانہ سفید لباس میں پہاڑی پہ گری پڑی تھی۔

اس کا لباس خون آلود تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ اس کا سر گود میں رکھے رو رہا تھا۔

وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا۔

سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے برسار رہا تھا اور وہ... وہ آریانہ کی پتھروں سے ڈھکی قبر کے سامنے گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ آنسوؤں کے نشانات تھے۔

اس کی کمر پہ خون کی دھاریں تھیں۔

جب تالیہ اس گول زینے کو اتر رہی تھی تو اس کے سامنے کوئی سرخ دھند نہ تھی۔ صرف خوف تھا۔ اور امید تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ غم و غصے سے سرخ دہک رہا تھا۔

وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی۔ سیاہ کرتے پا جامے میں ملبوس، وہ ننگے پیر دیوانہ وار اس آخری کوٹھڑی کی طرف لپکی۔

چوکھٹ پہ پہنچ کے وہ دھک سے رہ گئی۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ چند سپاہی اندر کھڑے تھے۔ ایک دیوار سے لگا کھڑا فاتح صلیب کی صورت بندھا تھا۔ اس کی گردن بائیں کندھے پہ ڈھکی ہوئی تھی اور لباس پھٹا ہوا خون آلود تھا۔ پیشانی اور سر کے مختلف حصوں سے خون بہہ بہہ کے جسم پہ گر رہا تھا۔ کندھے، کمر،

بازو.... ہر جگہ زخموں کے نشان نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے بے ہوش ہو یا کرب سے میچ رکھی ہوں۔
 ”ہٹو۔ چھوڑ واس کو۔ میں کہہ رہی ہوں، چھوڑ واس کو۔“ شہزادی تاشہ غراتی ہوئی آگے آئی اور جو سپاہی فاتح کے سر پہ کھڑا ہنر فضا میں بلند کیے اسے مارنے ہی لگا تھا، اسے پرے دھکیلا۔ سپاہی چونکا، پھر گرتے گرتے سنبھلا اور اس کی طرف دیکھا۔
 سامنے وہ بھوکے شیرنی کی طرح کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس کو ہاتھ بھی لگاؤ؟“ وہ جب اس کو سرخ آنکھوں سے دیکھتی غراتی تھی تو اس کی آواز میں نسوانی پن نہ تھا۔ وہ کسی وحشی درندے کی غراہٹ لگتی تھی۔ وان فاتح نے اس عجیب آواز پہ آنکھیں ذرا سی کھولیں۔ جھری سے نظر آیا۔ وہ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑی سپاہی پہ چلا رہی تھی۔

”شہزادی.... یہ راجہ کا حکم ہے، اس لئے خدا را آپ یہاں سے جائیے اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ ہنر والا ہاتھ اس نے پیچھے کر کے بصد احترام بتایا تو شعلہ بار نظریں اس پہ جمائے چند قدم آگے آئی۔ سپاہی نے گردن جھکا دی۔

”میں ملاکہ سلطنت کے بند اہارامرا دراجہ کی بیٹی تاشہ ہوں۔ میں.... سلطان مرسل شاہ کی ہونے والی بیوی ہوں۔ میں ملاکہ سلطنت کی ہونے والی ملکہ ہوں۔ جب سلطان مرے گاتو میں اس ملک کی حکمران ہوں گی اور میرے بیٹے تخت سنبھالیں گے۔ مراد راجہ ماضی ہو گیا ہے۔ ملکہ بنتے ہی سب سے پہلے میں اس کی گردن قلم کرواؤں گی۔ اب تم بتاؤ، جرنیل، تمہیں کس کا حکم ماننا ہے؟ ہونے والی ملکہ کا؟ یا ہونے والے مقتول کا؟“ وہ آنکھوں میں خون لئے اسی غراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فاتح کی طرف اس کا نیم رخ تھا۔ اس نے بدقت دھندلی بصارت سے منظر دیکھنا چاہا۔

سپاہی نے مزید سر جھکا دیا اور ہنر زمین پہ پھینک دیا۔ دوسرے سپاہی بھی پیچھے ہٹ گئے۔
 ”میں تمہارے راجہ سے مل کے آتی ہوں۔ تب تک اس قیدی کو کھانا کھلاؤ، پانی پلاؤ اور نیا لباس دو۔ پھر اس کی مرہم پٹی کرو۔“
 اب غراہٹ نہیں تھی مگر آواز ہنوز بھاری تھی۔ اس میں شہزادیوں والا ناز و انداز نہیں، ملکہ والا قہر تھا۔ پھر وہ فاتح کی طرف کھوی جو بے حال سا بندھا کھڑا تھا۔ اور ایک اچھتی نظر اس پہ ڈالی۔

”جب میں واپس آؤں تو مجھے یہ تندرست نظر آنا چاہیے۔ اپنی ملکہ کی بات ماننا سیکھو، جرنیل!“
 وان فاتح نے اسے دیکھتے ہوئے زخمی چہرے کے ساتھ ابرو اچکائے۔ (سیر نیسلی؟) لب بے آواز ہلائے۔
 تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے بھی ایک خشنگیں نظر سے نوازا اور تیز تیز باہر نکل گئی۔
 مراد راجہ باغیچے میں تنہا ٹہل رہا تھا۔ سر پہ قیمتی جواہر سے مزین ٹوپی تھی اور کندھوں پہ سنہری قبا۔ بازو کمر پہ باندھے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔
 ”راجہ... مراد راجہ!“ آواز پہ وہ تیزی سے گھوما۔

سامنے سے دوڑتی ہوئی تالیہ آرہی تھی۔ وہ ملگجے لباس میں تھی اور چہرے پہ سخت طیش چھایا تھا۔

مراد اس کو دیکھ کے یک لخت سن ہو گیا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آئی اس نے اسے کندھوں سے تھاما۔ ”تالیہ... تم آگئیں۔“ اس نے سختی سے مراد کے ہاتھ جھٹکے۔

”آپ کو لگتا تھا میں نہیں آؤں گی؟“

”وان فاتح نے کہا تھا کہ تمہارا انجام یہ ہو گا کہ.... (اس کی آواز ٹوٹی) تم سمندری سفر سے نہیں لوٹو گی۔“

”تو کیا آپ وان فاتح سے ہر ایک کا انجام پوچھ رہے تھے؟“ اس کی آواز میں ترشی در آئی۔ ”میرے جاتے ہی آپ نے اسے کھوج نکالا اور پھر قید کر کے یوں تشدد کیا جیسے میں نے کبھی واپس ہی نہیں آنا تھا؟ یہی چاہتے تھے آپ؟“

مراد کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ ”میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تمہارے پیچھے سپاہی بھیجتا تھا کہ وہ تمہیں واپس لائیں۔ وہ کل رات کو لوٹ آئے۔ ان کے مطابق تم جنوبی محل نہیں گئی تھیں۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں گئیں کیونکہ تم اب واپس آگئی ہو یہی بہت ہے۔“ پھر اس کی آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ ”تم میری بیٹی ہو تالیہ۔ تم نے اتنے سال میرے ساتھ سارے کام مل کے کیے ہیں۔ تم جنگل میں میرے ساتھ جاتی تھیں، جب میں عبادت میں مشغول ہوتا تھا تو تم میرے لئے کھانا بناتی تھیں۔“ وہ تاسف سے اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔ ”ہاں تم ایک دم سے.... بڑی ہو گئی ہو... اور میں تمہارے اس.... (اس کی طرف اشارہ کیا) نئے روپ سے سمجھوتہ نہیں کر سکا کیونکہ میرے لئے میری بیٹی وہی چھوٹی سی تھی۔ لیکن وقت تمہیں جتنا بھی بدل دے، وہ میرے دل سے تالیہ کی جگہ کو نہیں بدل سکتا۔“

مگر سامنے کھڑی تالیہ کی پیشانی شکن آلود ہوتی گئی۔ ”اب ان باتوں کا وقت گزر گیا ہے راجہ۔ یہ باتیں اب مجھ پہ اثر نہیں کرتیں۔ مجھے صرف اتنا بتائیے کہ وان فاتح پہ اتنا ظلم کیوں کیا آپ نے؟“

”کیونکہ اسے کرسی پہ بٹھانے کا وقت نہیں آیا۔“ مراد کے تاثرات تن گئے۔ چہرے پہ برہمی عود آئی۔ ”تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔“ ”وہ کرسی کا حقدار ہے راجہ۔ وہ کرسی پہ ہی بیٹھے گا۔ وہ محلوں میں رہنے والا ہے اور محل ہی اس کا مقدر ہیں۔ اس کے سر کے اوپر سے حکمرانی کا ہما گزرا ہے۔ آپ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

”تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟“ وہ زیر لب آہستہ سے بولا۔ تیز شکاری نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔ ”جب اس کو کرسی پیش کریں گے تو وہ بتا دے گا۔ لیکن ابھی کے لئے“ آپ اس کو جانے دیں۔ ورنہ میں سپاہیوں سے کہوں گی اور وہ اسے جانے دیں گے۔“

”میری پیاری شہزادی!“ وہ طنز سے مسکرایا۔ ”سپاہی میرے ہیں اور میرا حکم مانتے ہیں۔ کل میں نے ان سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اسے تب تک مارو جب تک تاشہ نہ آجائے اور اگر وہ کہے کہ مت مارو تو ہاتھ روک دینا، لیکن اگر وہ کہے کہ اسے چھوڑ دو تو اپنی تلواریں شہزادی تاشہ کے اوپر تان لینا۔ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔“

کاٹ دار لہجے میں بولتا وہ بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔

تالیہ کے اکڑے کندھے ڈھیلے پڑنے لگے۔

”باپا....“ اس کے لب پھڑپھڑائے۔

”باپا کہنے کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ مجھ پر اب یہ الفاظ اثر نہیں کرتے۔ چند ثانیے پہلے تک میں شک میں تھا کہ ملکہ کی بات غلط ہوگی لیکن تمہارا انداز سب عیاں کر چکا ہے۔“ وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو باپ نہیں۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم اکیلی آئی ہو۔ تم نے اپنی شادی کو چھپایا۔ تم نے سلطان کے سامنے مجھے مجرم بنا دیا۔ وان فاتح درست کہتا تھا۔ تم اپنی دنیا میں ایماندار نہیں تھیں۔ مجھے تم سے ایماندار کی توقع نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

وہ بس چپ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”میں تمہیں ملا کہ کی سلطنت دینے جا رہا تھا اور تم نے اپنی اس دنیا کو ترجیح دی جہاں تم اپنی محنت سے دو آنے تک نہیں کما سکتی تھیں۔ کیا ہو تم اس دنیا میں؟ یہ جو یہاں تمہاری آواز میں غراہٹ در آتی ہے نا، یہ اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہاں تمہارے پاس طاقت ہے اور طاقت جیسا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم اپنی دنیا میں واپس چلی گئیں تو دیوانی ہو جاؤ گی، پاگل ہو جاؤ گی کیونکہ وہاں تم شہزادی نہیں ہوگی۔ اس لئے قدر کرو اس سلطنت کی جو تمہاری ہونے والی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے تالیہ ملکہ کے الزامات کو رد کر دو اور کہہ دو کہ تم نے اس (دانت پیسے) اس غلام سے نکاح نہیں کر رکھا۔ خدا کی قسم میں تمہیں بچالوں گا۔“

تالیہ بس سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ گئی۔

”سوچ لو تالیہ! میں آخری بار کہہ رہا ہوں!“

”اس کو کرسی پیش کریں راجہ۔ اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے تو وہ بتا دے گا۔ اور یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ اسے قید میں زیادہ دیر رکھ سکتے ہیں۔ اگر میں اسے نہیں آزاد کروا سکتی تو کوئی ہے جس کے پاس مجھ سے زیادہ طاقت ہے۔ اور جس دن اس کو اپنی طاقت کا علم ہوا، وہ اسے آزاد کروالے گا۔“

مراد راجہ کے ابرو بھنج گئے۔ ”کون؟“

”آپ جلد جان جائیں گے۔“ وہ تنفر سے کہتی ایک آخری نظر اس پہ ڈالتی پلٹ گئی۔ یقیناً اسے قیدی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ مراد نے ایک خشکیوں نگاہ اس پہ ڈالی اور پلٹ گیا۔ اس کا رخ اپنی تیار سواری کی طرف تھا۔ اسے بھی کسی سے ملنے کی جلدی تھی۔ دھند کا جالابنتی سرخ مکڑی اس نے ذہن سے نکال کے دور پھینک دی تھی۔

☆☆=====☆☆

قید خانے کا ماحول اب قدرے مختلف تھا۔ فضا سے تناؤ، خوف اور وحشت چھٹ چکی تھی۔ اب وہاں صرف خاموشی تھی۔ وان فاتح کی کوٹھڑی کا دروازہ بدستور کھلا تھا۔ اس کے پیر سے لگی زنجیر ویسی ہی تھی، مگر لباس بدل چکا تھا۔ خاکی رنگ کا صاف پاجامہ اور

اوپر بنا آستین کی جیکٹ نمائش پہن رکھی تھی۔ کمر پہ پٹیاں بندھی تھیں اور سامنے کھلے سینے پہ بھی کئی جگہ مرہم لگے تھے۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ چہرہ اب صاف تھا، مگر خون آلود کٹ دکھائی دیتے تھے۔

ایک خادم اس کے برہنہ بازو کے زخم کو دیکھ رہا تھا، دوسرا دوا کا تھال لئے سر پہ کھڑا تھا۔
 ”تم لوگ جاؤ، میں دیکھ لوں گی۔“ آواز کے ساتھ نسوانی جوتی کی قریب آتی آہٹ سنائی دی تو فاتح نے آنکھیں کھولیں۔ کوٹھڑی کے کھلے دروازے میں وہ نظر آئی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ دھندلا منظر ذرا واضح ہوا۔

وہ بھورے باجو کرنگ میں ملبوس، سر پہ دوپٹہ لپیٹے، سادہ مگر خوبصورت کنیرنگ رہی تھی۔ پاٹ چہرے کے ساتھ قریب آئی اور روئی خادم کے ہاتھ سے لی۔ پھر فاتح کے ساتھ دوزانو ہو کے بیٹھی۔

”یہ تھال یہیں رکھ دو اور جاؤ۔ مجھے دوسری دفعہ نہ کہنا پڑے۔“ انداز جتمی تھا۔

خادم تعظیم بجالائے اور باہر نکل گئے۔ دروازہ کھلا رہ گیا۔

تالیہ نے روئی تھال میں پڑے پیالے میں ڈبوئی، اس پہ پانی جیسا مائع لگ گیا اور پھر اس کے بازو کے اوپری حصے تک لائی۔ وہ جواہر کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا، کندھا پیچھے کیا۔ تالیہ نے محض سیاہ آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

”مجھے زخم کو دیکھنے دیں۔“ انگریزی میں زیر لب بولی۔ گویا منت کی۔

”تمہیں زخموں کا کیا پتہ؟“

”سنگاپور کی ایک امیر بیوہ کو لوٹا تھا میں نے۔ اس کی نرس بن گئی تھی۔ وہ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوئی تھی۔“ اس نے فاتح کے بازو کو دیکھتے اب بھگی روئی زخم پہ رکھی تو اس نے (سس) کر کے آنکھیں موندیں۔

”کیا چرایا تھا اس سے؟“

”زیور۔ اور کچھ نقدی۔ مگر جتنی خدمت اس کی میں نے کی، وہ میرا حق بنتا تھا۔ اس لئے تھوڑا بہت یہ کام آتا ہے مجھے۔“

”وقت کے اس پار زخموں کی دیکھ بھال کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، حالم!“

وہ جو روئی سے آہستہ آہستہ زخم صاف کر رہی تھی، بے اختیار ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔

”اتنے دن بعد میرا یہ نام کیسے یاد آیا آپ کو؟ تو انکو؟“

”جیسے تمہیں اتنے دن بعد اپنا پرانا کام یاد آیا۔“ وہ ماتھے پہ شکنیں لئے، آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ بازو پہ سرخ لکیروں کی صورت لمبے لمبے

کٹ پڑے تھے۔ تالیہ آہستہ آہستہ بھگی روئی سے ان کو صاف کرنے لگی۔

”آپ تو کہتے تھے آپ کسی سے نہیں ڈرتے۔ راجہ کے سامنے کھڑے ہونے کے لئے تیار ہیں۔ اب ان زخموں سے تکلیف کیوں ہو

رہی ہے؟“

فاتح نے آنکھیں کھول کے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا۔

”تکلیف تو سب کو ہوتی ہے۔“

”ڈر بھی سب کو لگتا ہے اور کسی کا ساتھ بھی سب کو ہی چاہیے ہوتا ہے۔ آپ بھی جتنے بہادر اور مضبوط بن جائیں، فاتح صاحب فطری جذبات سے نہیں بھاگ سکتے آپ!“ وہ پلکیں زخم پہ جھکائے کہہ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”تم جلدی آگئیں۔ حالانکہ تمہیں ادھر رہنا تھا اور ایڈم کو واپس آنا تھا۔“

”آپ کو میری ضرورت تھی۔ اسی لئے آگئی۔“ فاتح نے ہلکا سا سر جھٹکا مگر پھر بات بدل دی۔

”جزیرہ مل گیا تھا؟“

”اور سونا بھی۔ ایڈم وہ سب ساتھ لے کر ہی آئے گا۔“ وہ اب دھیمی آواز میں تفصیلات بتا رہی تھی۔

”گڈ۔ ہر چیز پلان کے مطابق جا رہی ہے۔“

”سوائے آپ کی گرفتاری اور اس قید کے۔“ اس نے روئی رکھی اور مرہم سے بھرا پیالہ اٹھایا۔ پھر انگلی اس میں ڈبوئی اور کندھے پہ دوا لگانا شروع کی۔ ٹھنڈے مرہم کے زخم پہ لگتے ہی وہ (سس) کراہا مگر ضبط کر گیا۔

”تو تم آگئی ہونا۔ مجھے چھڑوا لوگی۔“

”نہیں۔ راجہ کو ملکہ نے ہمارے نکاح کا بتا دیا ہے، وہ اب آپ سے کسی قسم کی رعایت نہیں برتے گا۔ سپاہی میرا حکم نہیں مانیں گے۔“

”پھر؟“ اس نے تشویش سے ابرو اٹھائے۔ ”آخری مرحلے کے لئے میرا آزاد ہونا ضروری تھا۔“

”تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ پلان اے ناکام ہو جائے تو پلان سی ہے نا۔“

”اور پلان بی کا کیا؟“

”تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی!“ وہ توجہ سے دھیرے دھیرے دوا لیپ رہی تھی۔

کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔ بابر کون سا پہر ہوا تھا، اندر ہمیشہ اندھیرا ہوتا تھا۔ ایسے میں دیوار پہ نصب مشعلوں کے شعلے مدھم روشنی بکھیرے ہوئے تھے۔

اس کے ہاتھ پہ بھی ضرب لگی تھی اور ہتھیلی کے اندر کی طرف بڑا سا کٹ لگا تھا۔ تالیہ نے اس کی ہتھیلی اپنے ایک ہاتھ پہ پھیلانی، اور پھر بھیگی روئی سے ہتھیلی پہ لگی خون کی لکیر صاف کی۔

”تم واپس جا کے کیا کرو گی؟“ وہ اس کی جھکی پلکیں دیکھ کے پوچھنے لگا تو انداز نرم تھا۔

تالیہ نے چہرہ نہیں اٹھایا۔ بس گمن انداز میں اس کی ہتھیلی سے خون کے دھبے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنی وہ دولت جس کو میں

نے محنت سے نہیں کمایا....“

”یعنی ساری دولت....“

”... اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ فارغ وقت میں پینٹنگز بناؤں گی۔ جائز کمائی کروں گی، اور خوش رہوں گی۔ شاید کسی دوسرے ملک چلی جاؤں۔ آپ تو ظاہر ہے جاتے ساتھ ہی مجھے چھوڑ دیں گے۔“

”ہاں ظاہر ہے۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔ تالیہ کے ہاتھ لمحے بھر کو بھی نہیں تھمے۔ وہ زخم صاف کرتی رہی۔

بس اس وقت اس کو کمزور نہیں پڑتا تھا۔ اس تعلق پہ رونے کے لیے عمر پڑی تھی۔

”آپ کیا کریں گے؟“

”میں واپس جا کے ایک دنیا کو وضاحت دیتا رہوں گا کہ یہ چار ماہ میں نے کہاں گزارے۔“ اس نے جھرجھری لی۔

”چار ماہ!“ تالیہ نے گہری سانس لی۔ ”چار ماہ بیت گئے! لیکن....“ وہ چونکی۔ ”اگر وقت رک گیا ہو تو؟“

”اور اگر نہ رکا ہو تو؟ ہمیں برشے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ سس۔“ وہ ہاتھ پہ دوا لگا رہی تھی اس لئے اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔

آنکھیں بھی تکلیف سے میچیں۔ تالیہ نے رک کے اسے دیکھا۔ ”ایک بات پوچھوں۔“ اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔ ”آپ کا والٹ کہاں گیا؟“

”موبائل، والٹ، جوتے، ہر چیز جنگل میں کھو گئی تھی جب ہمیں گرفتار کیا گیا تھا۔“

”آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ گر گیا تھا تو میں نے اٹھالیا۔ دینا بھول گئی۔“

وہ چونکا، پھر اسے دیکھ کے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔

”اور تمہیں تو بھول کے چیزیں اٹھانے کی بہت عادت ہے۔“

اس نے مسکراہٹ دبا کے شانے اچکائے۔ پھر دوا کا پیالہ رکھ دیا اور پٹی اٹھالی۔

”اس کے اندر ایک زپ لاک بیگ میں مکئی کے چند دانے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے پرانے پاپ کارن۔ آپ نے انہیں کیوں رکھا ہوا ہے

سنجھال کے؟“ وہ اب پٹی اس کے ہاتھ پہ باندھ رہی تھی۔ جواب نہیں آیا تو سر جھکائے کام کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے نہ بتائیں۔ ویسے بھی میں ہوں تو آپ کی بس ایک ادنیٰ سی کارکن۔ تالیہ دی فین گرل۔ اس لئے....“

”وہ آریانہ کے تھے۔“ تالیہ نے چونک کے سر اٹھایا۔ پٹی کا بل دیتے ہاتھ وہیں تھم گئے۔

وہ اسی کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آواز بھی دھیمی ہو گئی تھی۔

”جس دن آریانہ کھوئی تھی وہ انہیں کھا رہی تھی۔ جب میں اس کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف دوڑا تو مجھے وہ نظر آئے تھے۔ وہ اغوا

کاروں کی نشاندہی کے لئے پاپ کارن گراتی گئی تھی تاکہ ہم ان کی مدد سے اسے تلاش کر لیں۔“

”اے فیری میلز پسند تھیں!“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ پھر چونکی۔ ”لیکن آپ نے تو پولیس میں کہا تھا کہ آریانہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سب

کو ہی معلوم ہے کہ اسے صوفیہ رحمن نے اغوا کر وا کے غائب کر دیا تھا۔ مسز عصرہ تو ٹی وی پر ملا کہتی ہیں کہ ان کی بیٹی کسی اچھے گھرانے کو ہی ملی ہوگی کیونکہ ان کو واپس نہیں ملی مگر...“ اس کی آنکھیں وان فاتح کی زخمی آنکھوں پہ ٹھہر گئیں۔ ”مگر... کیا آپ کو پاپ کارن ملے تھے؟“

وہ خاموش رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ پلک تک نہ جھپک پار ہی تھی۔

”تو انکو... آپ کو... وہ مل گئی تھی؟ ہے نا؟“ اس کو اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فاتح نے ہلکا سا سر کو خم دیا۔

”وہ جہاں مجھے ملی تھی اس کے پاس سے مجھے یہ پاپ کارن ملے تھے۔ کچھ کو میں نے سنبھال لیا۔ کچھ مجھ سے کھو گئے۔“

”اور آریانہ؟“ اس کا سانس اٹکا ہوا تھا۔ ”آپ کی بیٹی؟“

”وہ مر چکی تھی تالیہ۔ میں نے اسے وہیں دفن دیا اور میں واپس چلا آیا۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا اور وہ اگلا سانس نہیں لے سکی۔

”مسز عصرہ کو معلوم ہے؟“ بہت دیر بعد وہ بول پائی۔

”میں نہیں بتا سکا اے۔“

”مگر کیوں؟“ وہ دنگ رہ گئی۔

”مجھے جو درست لگا“ میں نے وہ کیا۔ اس وقت میں اپنی بیٹی کی موت کو سیاسی ایشو نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم خاندان کو سیاست سے الگ رکھنے

والے لوگ ہیں۔ بہت سے لوگ خود ہی سمجھ گئے کہ وہ زندہ نہیں ہوگی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

”نہیں۔ مسز عصرہ کو نہیں معلوم تو کسی کو نہیں معلوم۔ آپ ان کو تو بتا سکتے تھے۔“

”کیسے بتاتا؟ اور اگر بتاتا تو وہ لاش دیکھنے کی ضد کرتی۔ میں اپنی آریانہ کی وہ حالت کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا۔“ اس کی آواز تیز ہوئی۔

”اور عصرہ بالکل ٹوٹ جاتی۔ اس لئے میں نے اس کو ایک امید تھما دی۔ کم از کم وہ Stable تو رہے گی۔ اسے سکون تو رہے گا۔“

”ماں کو سکون کیسے آ سکتا ہے بھلا؟ آپ کو انہیں بتانا چاہیے تھا۔ مر جانے والے کا سکون کھو جانے والے سے جلدی آ جاتا ہے۔“ وہ شکوہ

کرنے لگی۔ پٹی لپیٹتے ہاتھ وہیں اس کے ہاتھ کے اوپر ٹھہرے ہوئے تھے۔

”عصرہ کو نہ آتا۔ وہ ایک مثبت عورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ منفی رہتی ہے۔ میں اس کو مزید منفی پن سے بچانا چاہتا تھا۔“

”یا شاید آپ کو یہ ڈر تھا کہ وہ آپ کو الزام دیں گی۔ کیونکہ آپ کی سیاست نے یہ دن دکھایا تھا۔ اسی لئے اس روز پارٹی پہ وہ مجھے کہہ رہی

تھیں کہ (اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ چار ماہ پہلے کی شام بدقت یاد آئی۔) کہ آریانہ کے بعد انہوں نے سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیا

لیکن اگر آپ نے پہلے نہیں بتایا تو اب بتادیں۔“

”کبھی بھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے وہ چیز چلی گئی اور پہلے جیسی سنجیدگی واپس چھا گئی۔ ”ہماری شادی پہلے ہی بہت

پیچیدہ ہو چکی ہے، میں اس میں مزید پیچیدہ گیاں نہیں بھر سکتا۔“

”آپ کی شادی پیچیدہ ہے؟“ وہ چونکی۔ ”کیا آپ دونوں کے درمیان مسئلے چل رہے ہیں؟“

”اس بات کو جانے دو۔ اور ہاں...“ اس نے بات بدلی۔ ”میں نے تمہارے باپا کو بتایا تھا کہ تم اس دنیا میں چور تھیں۔ اور مجھے وہ سب کہتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔“

”مگر وہ پلان کا حصہ تھا۔ میں نے خود ہی آپ سے کہا تھا کہ ان کو بتا دیجئے گا تا کہ وہ آپ پہ بھروسہ کریں۔“

”لیکن تم... اپنے باپ سے اپنا معاملہ درست کر لیتو اچھا ہوگا۔“

”اس کا وقت گزر چکا۔“ وہ بات کاٹ کے بولی۔ ”ویسے بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا اگر میں کسی سمندری سفر پہ جا کے کبھی واپس نہ آؤں۔“ پھر وہ ہلکا سا ہنسی۔ ”یہ جھوٹ کیوں بولا آپ نے میرے انجام کے بارے میں؟“ وہ پٹی لپیٹ کے گرہ دیتے ہوئے بولی۔ ”ایسی بے کار بات کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“

وہ خاموشی سے اس کی جھکی نظریں دیکھ گیا، پھر نگاہیں پھیر لیں۔ گردن میں گلتی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

”تم مجھے یہاں سے نکالنے کی فکر کرو۔ باقی باتیں چھوڑو۔“ موضوع بدل دیا تو اس نے مسکرا کے پٹی کی گرہ لگائی اور تھال سے رومال اٹھا کے ہاتھ پونچھے۔

”جیسا کہ میں نے کہا... تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“

اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ مدہم روشنی میں بھی اس کی چمکتی آنکھیں واضح دکھائی دیتی تھیں۔

فاتح نے بس مسکرا کے اسے دیکھا۔ زخمی قیدی کے جسم پہ جا بجا پٹیاں بندھی تھیں اور رنگت زرد ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے احاطے میں غلام معمول کے مطابق کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سامان کندھوں پہ اٹھائے سوکھے سڑے نقاہت زدہ اجسام کے مالک غلام ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پھر سے کوئی تعمیراتی کام شروع تھا اور وہ جانوروں کی مانند مشقت میں لگے تھے۔

حویلی کے اندر دیوان خانے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پردے ہٹے تھے اور خوب ساری روشنی اندر آرہی تھی۔ سامنے خوبصورت مسہریاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پہ ابوالخیر بیٹھا غور سے سامنے براجمان مراد راجہ کو دیکھ رہا تھا۔

مراد بظاہر پرسکون نظر آتا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے روشن کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے مسلسل ناخن سے تھوڑی کور گڑتا ہوا... مگر جب سے وہ آیا تھا فضا میں ایسا تناؤ گھل گیا تھا کہ ابوالخیر کو بھی اب تجسس ہونے لگا تھا۔

”راجہ... سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”بند ہارا تمہارے مہمان خانے پہ آیا ہے تو ظاہر ہے سب ٹھیک نہیں ہے۔“ مراد نے ایر ڈیجھنچ لئے اور ناخوشی کے عالم میں کہنے لگا۔

”عجیب مشکلات آن پڑی ہیں۔“

ابوالخیر آگے کو ہوا۔ چہرے پہ تشویش ابھری۔

”راجہ... آپ ہر مشکل میں مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ بتائیے۔ کیا بات ہے۔“

”میں نے تمہیں جب وزیر خزانہ بنوایا تھا اور ملا کہ میں امان دی تھی حالانکہ تم بچھنے سلطان کے حامی تھے تو میں نے ایک عہد لیا تھا تم سے۔“

”مجھے یاد ہے راجہ۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں سلطان سے زیادہ آپ کا وفادار ہو جاؤں تو وقت آنے پہ آپ سلطان سے زیادہ مجھ سے وفابھائی گئے۔“

”اور وہ وقت آگیا ہے ابوالخیر۔“ مراد بھی آگے کو جھکا اور آواز دھیمی کی۔ ”ہمیں مرسل شاہ کا تخت الٹنا ہے۔“

کمرے میں ایک دم گھٹنا سنا چھا گیا۔ ابوالخیر نے بے یقینی سے ابرو اٹھایا۔ ”لیکن مرسل شاہ تو ہماری مرضی کے مطابق کام کر رہا ہے۔“

”کبھی تاریخ کی کتابیں پڑھو تو جانو گے کہ دنیا کے عظیم حکمران... جو شاطر سے شاطر دشمن کے سامنے بھی سب سے پلائی دیوار بن جاتے تھے... جن کے پیار جیسے ارادوں سے مکار دشمن مات کھا جاتا تھا... اپنی ساری عقل و سمجھ کے باوجود... ایک وقت آتا تھا جب وہ کسی عورت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ عورتوں کے فریب سے کسی کو پناہ نہیں ابوالخیر۔ ملکہ یان سو فو اور شہزادی تاشہ... یہ دونوں مرسل شاہ کو اپنے اپنے فریب میں الجھا کے اسے ہمارے لئے ناکارہ بنا رہی ہیں۔“

”لیکن شہزادی کی تو شادی ہونے والی ہے سلطان سے۔“ وہ متعجب ہوا۔

”اور اگر نہ ہو سکی تو مرسل میرے خون کا پیا سا ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تم میری مدد کرو گے۔“

”میں آپ کے ساتھ ہوں راجہ! لیکن...“ وہ رکا اور سوچنے والے انداز میں داڑھی کھجائی۔

”لیکن مجھے کیا ملے گا راجہ؟ میری آپ سے وفاداری کا انعام؟“

مراد راجہ اٹھا اور قبا کو ہلکا سا جھٹکا دے کے درست کیا۔ ”جس دن میں سلطان بنا، تم میرے بندہ ہارا ہو گے! اور وہ دن بہت سا خون بہانے کا دن ہو گا۔“

ابوالخیر زیر لب مسکرایا اور ساتھ ہی کھڑا ہوا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہوں راجہ۔ بہت سے صوبوں کے گورنر بھی میرے ساتھ ہوں گے۔“

آپ جب حکم دیں گے ساری فوجیں آپ کے ساتھ آکھڑی ہوں گی۔“

اب وہ دونوں کھڑکی سے آتی روشنی کے ہالے میں کھڑے تھے۔

تیز چمکتی دھوپ کا ہالہ جو جہنم کی آگ جیسا دہک رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

وانگ لی کا قبوہ خانہ ”جیا“ اس دوپہر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وسیع ہال کمرے میں کرسیاں میزیں اور فرشی نشستیں لگی تھیں اور غلام بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ وہ باتیں کرنے کی بجائے تیز تیز نوالے منہ میں ڈال رہے تھے۔

تبھی قبوہ خانے کا دروازہ کھلا تو چوکھٹ سے بہت سی روشنی اندر آئی۔ چند ایک لوگوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہاں چغہ پہنے سر پہ ٹوپی جمائے ہیولہ سا نظر آیا۔ چونکہ وہ دھوپ میں کھڑا تھا اس لئے اس کا چہرہ واضح نہ تھا۔

پھر وہ شخص آگے بڑھنے لگا۔ میزوں کی قطار کے درمیانی راستے پہ قدم قدم چلنے لگا۔ چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔ بہت سی گردنیں مڑیں مگر وہ سیدھ میں چلتی آگے آئی۔ اور اس اونچے چبوترے پہ جا کھڑی ہوئی جہاں کبھی وان فاتح کھڑا ہو کے اپنی قوم کے لوگوں کو پکارا کرتا تھا۔

”کیا تم لوگوں نے اس شخص کو بھلا دیا ہے جو تمہیں اپنے لئے کھڑا ہونے کی تلقین کرتا تھا؟“ چغہ کی ٹوپی پیچھے گرائی تو سنہری بالوں کے بالے میں دمکتا چہرہ سامنے آیا۔ ماتھے پہ بل تھے اور سیاہ آنکھیں ایک سے دوسرے کی طرف سفر کر رہی تھیں۔

لوگوں کی چہ گویاں دم توڑ گئیں۔ سکوت سا چھا گیا۔ نوالوں والے ہاتھ فضا میں رک گئے۔ نظریں چبوترے پہ کھڑی چغہ پوش سنہرے بالوں والی لڑکی پہ جم گئیں۔

”کیا تمہیں وہ بہادر غلام یاد ہے جو کسی انسان سے نفع نقصان کی امید نہیں رکھتا تھا؟ نہ وہ کسی سے ڈرتا تھا۔“

وہ ماتھے پہ بل ڈالے کہہ رہی تھی اور لوگ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

(تمن چاند والے جزیرے کے ساحل پہ ایڈم اور سارے سپاہی اب گروہ کی صورت بیٹھے تھے۔ سب کی نگاہیں بار بار سمندر سے خالی لوٹ آتیں تو بے اختیار ایڈم کی طرف اٹھتیں جو بہت امید سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔)

”وہ دلیر غلام تمہارے حق کے لئے آواز اٹھانے بندہ ہمارا کے پاس گیا تھا۔ اس نے بندہ ہمارا سے کہا کہ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جاسکتا اس لیے وہ تمام ناجائز غلاموں کو آزاد کر دے۔“

(مراد راجہ اور ابوالخیر ایک نیم روشن کمرے میں میز کے گرد کھڑے تھے۔ میز کی سطح پہ زرد کاغذ والا نقشہ پھیلا رکھا تھا۔ مراد انگلی جگہ جگہ رکھے نئی حکمت عملی سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔)

”اور جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کو مراد راجہ نے قید کر دیا۔ اور اس کو اتنا مارا کہ اس کی ہر گ سے خون بہنے لگا۔“

(وان فاتح خاموش اندھیر کونٹھری میں دیوار سے لگا بیٹھا، دیوار پہ لگی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس نے پہریدار کو آواز دے کر وقت پوچھا۔ جواب ملنے پہ اس نے ناخن سے ایک لکیر مزید کھینچی۔ وقت قریب آ پہنچا تھا۔)

”اب تم لوگ مفت کی وہ روٹی توڑ رہے ہو جو اس کی وجہ سے تمہیں ملی تھی۔ کیا تم نے اس کو ایک دفعہ بھی یاد نہیں کیا جو تمہارے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال بیٹھا ہے؟“

(غلام اور کتیریں سلطنت محل کے ایک حصے کو از سر نو سجانے میں مشغول تھے۔ اپنے خاص مشیروں کے ہمراہ سلطان مرسل رہداری میں کھومتا، کمر پہ بازو باندھے خوش باش ساتھیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ حرم شہزادی ماشہ کے لئے آراستہ کیا جا رہا تھا۔)

”اگر وہ مر گیا تو کون تمہارے لئے دوبارہ کھڑا ہوگا؟ کون تمہارے لئے لڑے گا؟ ملا کہ کے لوگو... تم کب تک اپنے مالکوں سے ڈرتے رہو گے؟“ چغہ پوش لڑخی تکلیف سے کہہ رہی تھی اور سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

(ساحل کی ریت پہ تھکے تھکے بیٹھے جرنیل نے شکایتی انداز میں ایڈم کو کچھ کہا مگر ایڈم جواب دینے کی بجائے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پانی کو دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے بھی چونک کے اس طرف دیکھا۔ دور سمندر پہ ایک بحری جہاز کے خدو خال دکھائی دیے تھے۔)

”کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اپنے خوف دور کرو اور اس انسان کے لئے کھڑے ہو جاؤ جس کو تمہاری ضرورت ہے؟“

(ساحل پہ موجود سپاہیوں نے جھٹ سے لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ شعلے جل اٹھے۔ ڈھلتی شام میں اس جہاز کو اشارہ دیا جانے لگا۔ خود ایڈم سرخ رومال ہاتھ میں لیے ہر آنے لگا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ملکہ نے وعدہ پورا کیا تھا۔ چینی بحری جہاز پہنچ چکا تھا۔)

”کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ ہوتا ہے؟ کیا اپنا خیال رکھنے والے ساتھی کے لئے تم کوشش نہیں کر سکتے؟“

(جیا سے غلام نکل کے اپنے مالکوں کی حویلیوں کی طرف نہیں گئے تھے۔ وہ جوق در جوق بازاروں میں جا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ سر ایک دوسرے کے قریب جوڑے وہر گوشیاں کر رہے تھے۔)

”کیا تم اس کے لئے کچھ نہیں کرو گے؟ کیا تم اس کے لئے ویسے جان نہیں مارو گے جیسے اس نے تمہارے لئے ماری؟ کیسے دوست ہو تم لوگ؟“

(غلاموں کی سرگوشیوں نے قدیم ملا کہ کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مفلوک الحال، چیتھڑوں میں ملبوس جھلسی ہوئی جلد اور سخت چہروں والے غلام دھیرے دھیرے دور دور سے اکٹھے ہو رہے تھے۔)

”دوستوں کے لئے تو جان تک دے دی جاتی ہے۔ اگر مشکل میں ایک دوسرے کے لئے وقت ہی نہیں نکالنا تو پھر کیسے دوست ہوئے تم؟“

(بندہ ہارا کا محل کی پہاڑی پہ واقع تھا اور سامنے سڑک تھی جو اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سڑک کے نشیب میں دھیرے دھیرے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ مگر وہ لوگ نہیں تھے۔ وہ غلام تھے۔ مضبوط جسموں والے سخت جان غلام۔)

”اپنے کن مالکوں سے ڈرتے ہو تم؟ ان سے جنہوں نے تمہیں بھوک اور ظلم تلے پیس کے رکھا ہوا ہے؟ مسلمان ہونے کے باوجود غلام بن کر کھا ہے؟ جانتے ہونا، مسلمان کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ صرف غیر مسلم جنگی قیدی غلام بنتے ہیں۔“

(بندہ ہارا کے محل کے سامنے جمع لوگوں کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ان کے لب خاموش تھے۔ ان کی آنکھیں شکایتی تھیں۔ وہ بس چاروں سمت سے آتے اس مقام پہ بیٹھ رہے تھے جہاں سے سڑک اونچی ہو کے محل تک جاتی تھی۔ سپاہی مستعد ہو گئے مگر قدرے الجھ بھی

گئے۔ سامنے سڑک پہ بیٹھے بے ضرر لوگوں پہ وہ حملہ کرتے بھی تو کیسے؟

”اگر آج تم اپنے ساتھی کے لئے نہیں کھڑے ہوئے تو کل کو تم میں سے ایک ایک کو مراد راجہ اٹھا کے اپنے قید خانے میں ڈال دے گا۔
ڈر واس وقت ہے۔“

(غلام کسی کو کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ بس زمین پہ اکڑوں بیٹھے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے خاموش نظروں سے اوپر محل کو دیکھ رہے تھے۔)

”اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرو اور وان فاتح کے لئے آواز بلند کرو۔ میں مراد راجہ کی بیٹی تاشہ بنت مراد ہوں اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی سپاہی نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

(مراد راجہ نے کھڑکی سے ان غلاموں کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ بریل ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ جیامیں جس غلام نے ایک دفعہ بھی مفت کھانا کھایا تھا وہ ان فاتح کے لئے ادھر آ کے بیٹھ گیا تھا۔)

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے مالک بھی تمہیں نقصان نہیں دے سکیں گے۔ کیونکہ تم حق کے ساتھ ہو۔ حق کے لئے کھڑے ہونے والوں کا ساتھ ہمارا رب تعالیٰ دیتا ہے۔“

(سپاہی بے بسی سے کبھی دور بیٹھا اس خاموش جھوم کو دیکھتے، کبھی گردنیں اوپر کر کے کھڑکی میں کھڑے راجہ کو جس کا چہرہ سرخ و ہک رہا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ میان پہ تھے مگر دونوں اطراف سے کوئی بھی حملے کا عندیہ نہیں دے رہا تھا۔ عجیب بیجان سا بیجان تھا۔)

”کیونکہ اگر آج تم نے مراد راجہ سے اس ظلم کا حساب نہ لیا تو اس کا ہاتھ نہیں رکے گا۔ خود کو کمزور سمجھنا چھوڑ دو۔“

(وہ مظلوم کمزور لوگ چپ چاپ بیٹھے اوپر محل کی کھڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نہ نفرت تھی نہ غصہ نہ انتقام کی آگ۔ صرف شکوہ تھا۔ وہ بلی جیسی معصوم شاکی آنکھیں تھیں جو مراد راجہ کی کھڑکیوں پہ لگی تھیں۔ اس نے زور سے کھڑکی کے پردے بند کیے اور مڑا تو پیچھے تالیہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ سب تھا جو غلاموں کی آنکھوں میں نہ تھا۔)

”تم کمزور نہیں ہو۔ تم اس شہر کے سب سے طاقتور لوگ ہو۔ تمہیں اٹھنا ہے اپنے ساتھی کے حق کے لئے۔ تمہیں اٹھنا ہے ظلم کے خلاف۔“

(سرخ نشان والا بحری جہاز ساحل پہ لنگر انداز تھا۔ سپاہی صندوق اٹھا اٹھا کے اندر رکھ رہے تھے۔ ایڈم بن محمد عرشے پہ کھڑا مسکراتا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا سے اس کے چنے کی ٹوپی گر گئی تھی اور بال ماتھے پہ بکھر آئے تھے۔ مگر اسے وہ تازگی بھری ہوا اچھی لگ رہی تھی۔)

”اور تم یہی سوچ رہے ہونا کہ تم لوگ آخر کیا کر سکتے ہو؟ تو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح تم مراد راجہ کے سارے محل کو ہلا کے رکھ سکتے ہو۔ نہ کسی تیر سے نہ تلوار سے۔ صرف اپنی ایک چپ سے۔“

☆☆=====☆☆

مراد نے کھڑکی کا پردہ زور سے جھٹکا اور تیوریاں چڑھائے پلٹا تو سامنے تالیہ کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ سر و نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا خوبصورت منظر ہے، بابا۔“

”تم نے.... تم نے کیا ہے یہ سب؟ تین دن شہر کے قبوہ خانوں میں جا کے میرے خلاف بولتی رہی ہو تم۔“ مراد دانت پیس کے غصے سے بولا تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔“

”ہناؤ ان لوگوں کو یہاں سے۔ ابھی اسی وقت۔“ وہ سرخ بھبھوکا چہرے کے ساتھ بولا۔

”میں تو ان کو نہیں ہٹا سکتی۔ یہ اپنی مرضی سے آئے ہیں اپنی مرضی سے جائیں گے۔“

”ہناؤ ان کو درندہ محل کی چھت پہ بیٹھے تیر اندازان کو چھلنی کر دیں گے۔“

”کن کو چھلنی کر دیں گے؟ ان غلاموں کو جو شہر کے رؤساء اور امراء کے سارے کام کرتے ہیں؟ ایسی غلطی مت کیجئے گا بابا۔ کیونکہ آج

دوپہر سے ملا کہ کی اکثر اونچی حویلیاں خالی ہو چکی ہیں۔ مالک پریشان ہیں اور غلام غائب ہیں۔“ وہ چبا چبا کے کہہ رہی تھی۔ ”غلام ہر

معاشرے کا سب سے اہم رکن ہوتا ہے، بابا۔ ارے آپ حکمران لوگ تو ہل کے پانی نہیں پی سکتے۔ ایسے میں یہ لوگ اگر بنا بتائے اپنی

حویلیاں چھوڑ دیں تو سارے امراء گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔“

”میں ان بے وقوف نیچ لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ کتنی دیر بیٹھ سکتے ہیں یہ یہاں؟ ہاں؟“

”آپ بھول گئے ہیں۔ یہ غلام ہیں۔ عام عوام نہیں۔ ان کو کئی کئی دن کھانا نہیں ملتا۔ ان سے سخت سے سخت موسم میں بھی کام کروایا جاتا

ہے۔ بھوک اور موسم کی سختی ان پر اثر نہیں کرتی۔ یہ تب تک یہاں بیٹھیں گے جب تک آپ وان فاتح کو کرسی پیش نہیں کرتے۔“

”میں... ان سے... نہیں ڈرتا۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے مٹھیاں بھیجنے کے بولا۔ تالیہ نے پھر شانے اچکائے۔

”مگر آپ رؤساء اور امراء سے ڈرتے ہیں جو ابھی اپنے غلاموں کی خبر لینے یہاں پہنچ جائیں گے۔ سب پوچھیں گے کہ آخر وان فاتح

کون ہے؟ سلطان تک بھی خبر جائے گی۔ وہ بھی شک میں پڑ جائے گا کہ اس غلام کو قید کیوں کیا گیا تھا آخر؟ کیا جواب دیں گے سب کو؟

یہی کہ اس نے شہزادی تاشہ سے نکاح کر لیا تھا اس لئے؟“

”تم!“ مارے ضبط کے مراد نے مٹھیاں بھیجنے لیں۔

”وقت کم ہے، بابا۔ اور وقت ہی سارے مسئلوں کا حل ہے۔ وان فاتح کو کرسی پیش کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔“ پھر

بازو سینے سے ہٹائے اور سر جھکا کے تعظیم پیش کی۔ ”راجہ!“ اور مسکرا کے مڑ گئی۔

مراد راجہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

کھڑکی تلے دور نیچے بیٹھے غلاموں کے ہجوم کی خاموشی اس کے کانوں میں صور کی صورت گونج رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ کی بندرگاہ پہ سرخ جھنڈے والا بحری جہاز لنگر انداز ہو چکا تھا۔ سمندر دوپہر کے اس وقت پرسکون لگتا تھا۔ پانی دھوپ میں چمک رہا تھا اور بندرگاہ پر روانہ ہوتے قافلوں کا شور معمول کے مطابق تھا۔

ایسے میں چینی بحری جہاز کے عرشے کے اوپر ایڈم بن محمد کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ جمائے وہ گردن اٹھائے دور تک پھیلا ملا کہ شہر دیکھ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔

اس کے سپاہی عقب میں مستعد سے کھڑے تھے۔ جب وہ ان کو اشارہ کرے گا تو وہ اپنے صندوق نیچے اتاریں گے، مگر ایڈم کو پہلے خود ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ اس کی کھوجتی نگاہیں ایک سے دوسرے سے ہوتیں ہجوم میں الجھی تھیں اور تبھی وہ اسے نظر آگئی۔

سادہ بھورے رنگ کی باجو کرنگ میں ملبوس وہ سر پہ مفکر کی طرح دوپٹہ لپیٹے مسکراتی ہوئی بحری جہاز کے زینے چڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ایڈم بھی مسکرایا۔ اپنی راہدہ انی میں ہونے کے باوجود وہ آج سادہ نظر آ رہی تھی۔

ایڈم نے پل بھر کو پلکیں موندیں اور سات دن پہلے کی وہ دوپہر یاد کی جب وہ تینوں جیا کی بالائی منزل کے ہال نما کمرے میں ملے تھے۔ کونے کی میز کے گرد بیٹھے انہوں نے سارا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

”تم دونوں تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈو گے اور اس کی طرف جاؤ گے۔ تالیہ... تم اپنے بہترین اور وفادار سپاہی ساتھ لے کر جاؤ گی جن کے خاندان تمہارے پاس محل میں ہوں گے تاکہ وہ خزانہ دیکھ کے تمہیں مارنے کی بجائے بحفاظت واپس لانے پہ مجبور رہیں۔“ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس وان فاتح سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ درمیان میں نقشہ پھیلا رکھا تھا۔

”جزیرے پہ کچھ تو ہمارا منتظر ہوگا۔“ ایڈم کو تشویش ہوئی۔

”جو بھی ہو، تم اس سے لڑنا اور خزانے کو نکال لانا۔ ایڈم کشتی پہ واپس آجائے گا اور تالیہ وہیں رہے گی۔ جہاز چین سے روانہ ہو چکا ہے وہاں پہنچنے میں چند دن لگیں گے۔ تمہیں صبر سے اس کا انتظار کرنا ہے۔“

”پلان سی!“ تالیہ نے کسی شاگرد کی طرح ہاتھ اٹھا کے اجازت مانگی تو دونوں اسے دیکھنے لگے۔

”اگر وہاں جا کے مجھے کوئی برا احساس ہو تو میں ایڈم کو چھوڑ کے واپس آ جاؤں گی۔“

”مجھے پہلے ہی آپ سے یہی امید تھی کہ آپ مجھے چھوڑ کے آنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔“ ایڈم خفا ہوا تو تالیہ نے اسے گھورا۔

”میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ جلد یا بدیر راجہ کو وان فاتح کا علم ہو جائے گا۔ ملکہ بھی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں میرا یہاں

ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایک دفعہ خزانہ مل جائے تو تمہیں میری ضرورت نہیں ہوگی۔“

”میں اکیلا کیسے.....؟“

”ایڈم! وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”کب تک تم لیڈ ہوتے رہو گے؟ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے فیصلے خود کرو اور بڑی بڑی مہموں پہ نکلنا خود سیکھو۔“

ایڈم نے بس ایک خفا نظر تالیہ پہ ڈالی اور پھر فاتح کو دیکھا۔

”اور اگر ملکہ نے جہاز نہ بھیجا تو؟“

”ایڈم ٹھیک کہہ رہا ہے تو انکو۔ کیا ہمیں اس بات پہ یقین کر لینا چاہیے کہ ملکہ ہماری مدد کرے گی؟“

”بالکل نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”ملکہ کا ہم سے کیا رشتہ ہے جو وہ ہماری مدد کرے گی۔“ وہ دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے تو وہ توقف سے بولا۔

”مگر ہمیں اتنا یقین ہے کہ ملکہ مراد راجہ کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں گنوائے گی۔ ملکہ ہماری بھی دشمن ہے مگر ہمیں اس کے اوپر اپنے اعتبار کو نہیں مانتا۔ ہم نے اس کی مراد راجہ سے نفرت کو ناپ کے فیصلے کرنے ہیں۔“

”دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ میں سمجھ گئی!“ تالیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ملکہ ضرور جہاز بھیجے گی اور ہم سارا سونا لے بھی آئیں گے۔ اس کے بعد؟“

”امید ہے تب تک مراد سے میرا تعارف ہو چکا ہوگا۔ اس وقت تک اس کی ساری طاقت ختم ہو چکی ہوگی۔ میں اس کو مجبور کروں گا کہ وہ ہمیں واپس جانے دے۔“

”اور وہ سونا۔“ ایڈم فوراً بولا تو تالیہ نے اسے دیکھا۔

”سونا ملا کہ کے لوگوں کی ملکیت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں وہ شہر کے سارے غریب لوگوں میں بلا تفریق بانٹ دینا چاہیے تاکہ وہ اس سے اپنی زندگیاں سنوار سکیں۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں نا تو انکو۔“

”سونا ملا کہ کے لوگوں کا ہے اور اس کا فائدہ لوگوں کو ہی ملنا چاہیے۔“ اس نے رسان سے کہا تو تالیہ مسکرا دی۔ ایڈم کو بھی سن کے بھلا معلوم ہوا۔

”لیکن سر....“ پھر اسے خیال گزرا۔ ”آپ راجہ کو کیسے مجبور کریں گے کہ وہ ہمیں واپس جانے دیں۔“

”جس دن تم جہاز لے کر واپس آؤ گے تم خود جان لو گے۔“ اس نے بھی مسکرا کے تسلی دی۔ اور جیا کی وہ پراسرار میت بھری فضا میں ڈوبی دوپہر دھندلی ہوتی گئی۔

”امانت داری سے واپس لے آئے سب کچھ؟“ تالیہ کی بات پہ چونکا۔ وہ اب عرشے تک آ چکی تھی۔ ایڈم سنبھل کے مسکرایا۔ وہ بحری جہاز کے عرشے پہ کھڑا تھا اور تالیہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آرہی تھی۔

”آپ تو شاید میرا تابوت دیکھنے کی دعا کر رہی تھیں۔“

”اگر تمہارے لئے میری دعائیں پوری ہوتیں تو آج تمہارے جنازے کو چار ماہ بیت چکے ہوتے۔“ وہ اس کے ساتھ اکھڑی ہوئی۔
عرشے کے کناروں پہ لوہے کی ریلنگ لگی تھی۔ تالیہ نے اسے تھام لیا اور سمندر کے پانی کو دیکھنے لگی۔

”حالات کیسے ہیں؟“ وہ پوچھے بناندرہ سکا۔

”جیسے ہم نے سوچے تھے۔ اب بہت جلد مراد راجہ گھٹنے ٹیک دے گا۔“

”شکر۔ اور یہ سارا سونا ہم ملا کہ کے غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ مجھے یہ سب کر کے بالکل رابن ہڈ والی فیلنگ آرہی ہے۔ وہ بھی اسی طرح خوش ہوتا ہوگا۔“

تالیہ ہنس دی۔ ”رابن ہڈ ایک چور تھا۔“

”مگر وہ غریبوں میں اپنی چوری بانٹ دیتا تھا۔ چور چور میں فرق ہوتا ہے۔“

وہ دونوں عرشے کی ریلنگ کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے تھے اور نیچے ایک طرف سمندر پھیلا تھا دوسری طرف ساحل پہ کشتیوں، ملاحوں اور مسافروں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ وہ جواب میں پھر سے ہنسی تو ایڈم بولا۔

”آپ رابن ہڈ کو چھوڑیں اپنے وان فاتح کی سنائیں۔ آپ کی ضرورت پڑی ان کو یا نہیں؟“

تالیہ نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ”شہزادی جیسی تاشہ نے ایک غلام سے شادی کی تھی اور اسے آزاد کر دیا تھا۔ سو میں نے بھی انہیں آزاد کروا ہی دیا۔ تقریباً۔“ پھر چونکی۔ ”تاشہ کی نظم!“ کچھ یاد آیا۔ ”وہ تو میں نے لکھی ہی نہیں۔“

”وہ جو آپ نے خواب میں سن باؤ کے گھر لکھی دیکھی تھی۔“

”ہاں وہی۔ وہ تو میں نے ابھی لکھنی تھی۔“

”تو جا کے لکھ لیں۔“

تالیہ نے پھر گوگوں نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مگر ضروری تو نہیں کہ وہ نظم میں نے ہی لکھی ہو۔ اور کیا ضرورت ہے مجھے اسے لکھنے کی۔“

”درست کہا۔ جو تاریخ میں ہو چکا ہے وہ کسی وجہ سے ہوا ہے۔ آپ زبردستی حالات کا رخ نہیں موڑ سکتیں۔“ پھر وہ ساحل کی طرف

دیکھنے لگا جہاں چینی فوجیوں کا قافلہ آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ہمراہ گھوڑا گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ ایڈم نے گہری سانس لی۔

”آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔“ تالیہ نے چونک کے اس طرف دیکھا۔

ایڈم اب سپاہیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے بہت سی ہدایات جاری کرنی تھیں۔

☆☆=====☆☆

عصر کا وقت ہوا تو بندہ ہارا کے محل پہ ٹھنڈی چھایا اتر آئی۔ دیوان خانے کی اونچی کھڑکیوں کے پردے ہٹے تھے اور اندر ایک میز کے گرد دو کرسیاں رکھی دکھائی دیتی تھیں۔ دونوں خالی تھیں۔

مراد راجہ دیوار سے ٹیک لگائے ہاتھ میں ننھا سا حقہ تھامے کھڑا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ حقے کی نال لبوں میں دباتا اور گڑگڑاہٹ سے تمباکو اندر کھینچتا۔ پھر نال بنا کے منہ سے دھواں بابر نکالتا۔ دھوئیں کے مرغولے بنتے ہوئے فضا میں تیرنے لگتے۔ وہ بظاہر پرسکون لگتا تھا مگر کبھی کبھی چہرے پر اضطراب دکھائی دینے لگتا جسے وہ مسلسل چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

دفعۃً دروازہ کھلا اور دو سپاہی وان فاتح کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔ اس نے اب پا جامے پہ خاکی کرتا پہن رکھا تھا۔ آستین پورے تھے اور ہاتھ کی پٹیاں نظر آتی تھیں۔ کینٹی کے زخم اور سر کے زخم پہ لیپ شدہ دوا سوکھ چکی تھی۔ کوئی زنجیر نہیں، کوئی ہتھکڑی نہیں۔

اس کے چہرے کے تاثرات ہموار تھے۔ پرسکون۔ ٹھنڈے۔ سپاہی چلے گئے تو اس نے بس نگاہیں گھما کے اس خالی خالی سے کمرے کو دیکھا، پھر نظر کرسی میز پہ ٹھہری۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔

”ہماری دنیا میں جب کوئی مذاکرات کرنے پہ راضی ہو جائے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں میز پہ آمنے سامنے بیٹھنے کو تیار ہے۔“

وہ محظوظ سا بولا۔ مراد راجہ نے کھڑکی سے ٹیک لگائے، شکاری نظریں اس پہ جمائے، حقے کا کش لیا اور حقہ کھڑکی کی منڈیر پہ رکھا۔ پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔

”کرسی حاضر ہے۔ تم بیٹھو۔“

فاتح نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پیشکش قبول کی اور کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ پھر ٹانگ پہ ٹانگ جمالی۔ ”تم بھی بیٹھو راجہ۔“

”تمہارے بیٹھنے کی بات ہوئی تھی میرے نہیں۔“ وہ وہیں ٹیک لگائے کھڑا رہا۔

”اوہ۔ تم مجھے اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ خیر۔“ اس نے سادگی سے شانے اچکائے۔ اس کی چھوٹی خوبصورت آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

”اس ہجوم کے بارے میں تو سن لیا ہو گا تم نے۔“ مراد راجہ نے کھڑکی سے نیچے نظر آتے لوگوں کی طرف اشارہ کیا تو کرسی پہ بیٹھے فاتح نے سر کو خم دیا۔

”میں ایک عرصہ ان لوگوں کو ان کے اپنے لئے کھڑا ہونے کی ترغیب دیتا رہا، مگر کمزور لوگ شاید اپنے لئے کھڑے نہ بھی ہوں تو اس کے لئے ضرور ہوتے ہیں جس سے وہ محبت کرتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کم از کم یہ لوگ کھڑے تو ہوئے۔“

مراد نے حقہ اٹھایا اور غور سے دور بیٹھے فاتح کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ان لوگوں کو یہاں سے بھیجنے کا کیا لوگے؟“

”یقیناً ان کے مالک تمہیں تنگ کر رہے ہوں گے۔ جلد سلطان کو خبر ملنے والی ہوگی۔ لیکن یہ لوگ تمہارا مسئلہ نہیں ہیں۔ تمہارا مسئلہ آج

دو پہر ملا کہ کی بندرگاہ پہ لنگر انداز ہوا ہے۔“

مراد چونکا۔ ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”کیا مطلب؟“

”ہم نے تین چاند والا جزیرہ ڈھونڈ لیا ہے اور تمہارا پالتو وحشی درندہ مار کے تمہارا خزانہ بحفاظت ملا کہ لے آئے ہیں۔“

مراد لمحے بھر کو ششدر رہ گیا۔ پلک تک نہ جھپک سکا۔

”وہ خزانہ چینی بحری جہاز پہ آیا ہے۔ اور اسے چینی سفارتخانے بھیجا گیا ہے۔ بظاہر وہ چین سے آئے قرضے کے سکوں سے بھرے

صندوق ہیں لیکن ان میں سے اکیس صندوق تمہارے ہیں۔“

مراد ایک دم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا، مگر پھر رک گیا۔

”یہی سوچ کے رکے ہونا کہ چینی سفارتخانے پہ حملہ نہیں کروا سکتے تم! میں نے بھی یہی سوچ کے چینی جہاز میں سامان لانے کو کہا تھا

۔ بالفرض تم چینی سفارتخانے پہ حملہ کروا بھی دو تو اپنی فوج اور سلطان کو کیا وجہ بتاؤ گے؟ تم خزانے کی حقیقت کھولنے کے متحمل نہیں ہو۔“

مراد کے قدم زنجیر ہو گئے۔ وہ کمرے کے وسط میں بجسے کی طرح کھڑا فاتح کو دیکھنے لگا اس حالت میں کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

”یان سو فو... وہ تمہارے ساتھ شریک تھی۔ ہے نا!“ اسے سارا کھیل سمجھ میں آ رہا تھا۔

”آگے کا سوچو راجہ۔ اگر تم ہر خطرہ مول لے کر چینی سفارتخانے پہ حملہ کر بھی دو تو جانتے ہو سفارتکاروں کو مارنا کتنا سنگین جرم ہے؟ وہ بھی

اس دور میں جب کہ تمہاری ملکہ چینی ہے؟ نہیں مراد راجہ۔ تم چین سے جنگ چھیڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگیں مگر آواز میں نہ کوئی غراہٹ تھی نہ گرج۔ اس کے قدموں تلے سے زمین

سرک چکی تھی۔

”تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شہزادی تاشہ جنوبی محل نہیں گئی تھی۔ وہ جزیرے پہ گئی تھی اور ملا کہ کے لوگوں کی امانت واپس لے

آئی ہے۔“

چند لمحے کمرے میں ہولناک خاموشی چھائی رہی۔ مراد راجہ بت بنا کھڑا بے یقینی اور غریض و غضب سے اسے دیکھ گیا جو مطمئن سا کرسی

پہ بیٹھا تھا۔

”تم... کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہیں چند راستے دکھانا چاہتا ہوں! اگر تم نے سفارتخانے پہ حملہ کروایا تو سلطان کو ناراض کر دو گے اور چین سے جنگ چھڑ جائے

گی۔ اگر تم نے ان لوگوں کو محل کے سامنے سے نہ بتایا تو سلطان کو علم ہو جائے گا کہ تم نے کسی غلام کو قید کر رکھا ہے۔ بات کھلے گی اور میرے

اور تالیہ کے نکاح کے بارے میں سب کو علم ہو جائے گا۔ اس نکاح کے گواہ بھی ہیں اور ثبوت بھی۔ اس کے بعد سلطان تمہیں جان سے

مارنے کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ اور اگر اس سب سے پہلے تم نے مجھے مار دیا تو نہ صرف تمہاری بیٹی تم سے نفرت کرے گی بلکہ تمہارے پاس

خزانے کے بارے میں مذاکرات کرنے کے لئے کوئی نہیں بچے گا۔“

”تم... کیا چاہتے ہو؟“

”میں جانتا ہوں اب تک تم نے سلطان سے بغاوت کرنے کا سوچ لیا ہوگا۔ اپنی خفیہ فوجیں بھی تیار کر رکھی ہوں گی کیونکہ تم جانتے ہو اب تالیہ اور سلطان کی شادی ممکن نہیں ہے۔ تمہیں اس وقت خطرے کو سامنے سے ہٹانا ہے۔ اور میں سب سے بڑا خطرہ ہوں۔ اصولاً تمہیں میری جان لے لینی چاہیے مگر یہ ناممکن ہے اس لئے تم ایک کام کرو۔“

”تمہیں چاہی دے دوں تاکہ تم واپس چلے جاؤ؟“ وہ طنز سے بولا۔

”صرف میں نہیں۔ تالیہ میرے ساتھ جائے گی۔ جب ہم دونوں غائب ہو جائیں گے تو تم سلطان کو کوئی بھی وجہ بتا کے مار سکتے ہو۔ ملکہ نکاح والی بات دہرا بھی دے تو تم کہہ سکتے ہو کہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ دونوں منکوح تو ملا کہ سے جا چکے ہوں گے۔ تالیہ چلی جائے تو ملکہ بھی مزید اس معاملے کو نہیں کریدے گی۔ تم بندہ ہارا رہو گے اور حکومت کرو گے۔ ہاں اگر ہمارے جاتے ہی سلطان تمہارے خلاف ہو گیا تو تم بغاوت کر کے تخت پہ قبضہ کر سکتے ہو۔ اس سارے مسئلے کا حل ہم دونوں کے یہاں سے چلے جانے میں ہے۔“ وہ روانی سے بتا رہا تھا۔

مراد کے وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ قدم قدم چلتا فاتح کے سامنے آیا اور مقابل رکھی خالی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھے جھکا۔

”تالیہ... میری.... بیٹی ہے۔ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“

”وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اسے جلد یا بدیر یہ دنیا چھوڑ کے جانا ہی ہے۔ اور ہمارے یہ مذاکرات تب ہی کامیاب ہوں گے جب تم تالیہ کو میرے ساتھ بھیجو گے۔“

مراد خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتا ضبط سے گہرے سانس لیتا رہا۔

”اور خزانہ؟ اس کو غریبوں میں بانٹ دو گے کیا؟“ انداز میں تحقیر اور استہزاء تھا۔

”تالیہ یہی چاہتی ہے کہ اسے غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔“ وہ ٹھہرا۔

مراد مزید اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”مگر تم تالیہ نہیں ہو۔ تم لامتناہی کھیل کھیلنے والے آدمی ہو اور تمہارے کھیل میں حدود و قیود اپنی مرضی سے بدلی جاسکتی ہیں۔ تم بتاؤ خزانے کا کیا کرنا چاہتے ہو۔“

کرسی پہ بیٹھا وان فاتح بن رامل مسکرایا۔

”ہاں میں تالیہ نہیں ہوں۔ اس لئے میں اور تم خزانے کے بارے میں ایک معاہدہ کر سکتے ہیں۔“

مراد کے لبوں پہ استہزاء سیہ مسکراہٹ بکھری۔

”تم بالکل میرے جیسے ہو۔ وہی طاقت کی ہوس، وہی اپنی ذات کی پرستش!“

”مراد راجہ!“ اس نے مراد کی بات نظر انداز کی۔ ”میں تمہیں سارا خزانہ واپس کر سکتا ہوں اگر تم ملا کہ کے تمام ناجائز غلاموں کو آزادی

”دلوادو۔“

مراد کے ابرو تن گئے۔ ”وہ کیسے؟“

”تم ملک میں قانون بنا دو کہ صرف غیر مسلم جنگی قیدی کو غلام بنایا جاسکے گا۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کا یہی اصول ہے۔ مسلمان کو غلام نہیں بنایا جاتا۔ اس وقت ملا کہ کے چند بڑے رئیسوں کے پاس بہت سے ایسے غلام ہیں جو مسلمان ہیں اور اغوا کر کے جبراً ان کو غلام بنایا گیا ہے۔ اب تم ان کے مالکوں کو ان کی قیمت ادا کرو یا ان کو ڈراؤ دھمکاؤ، جس وقت وہ غلام آزاد ہو جائیں گے میں تمہارا خزانہ واپس کر دوں گا۔ ملا کہ کے لوگوں کی دولت لوگوں کے ہی کام آئی چاہیے۔“

”اور پھر میں تمہیں چابی دے دوں اور تمہیں یہاں سے جانے دوں؟“ وہ طنز سے بولا۔

”ہاں۔ ورنہ سلطان کو اس نکاح کی خبر ہو جائے گی اور تمہاری مشکلات بڑھ جائیں گی۔ لیکن اگر تم میری بات مان لو تو تم بدستور حکمرانی کرتے رہو گے اور مزید جزیروں پہ اپنا مال چھپاتے رہو گے۔ میں تمہیں بدعنوانی کرنے اور لوگوں کا مال لوٹنے سے نہیں روک سکتا، لیکن میں اپنے اور تالیہ کے لئے بقا کا راستہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔“

چند لمحے وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا جیسے ذہن میں جمع تفریق کر رہا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں چابی دے دوں گا۔ لیکن تالیہ کو مت لے کر جاؤ۔ وہ گئی تو واپس نہیں آئے گی۔“

”تم نے اسے خود اپنے اعمال سے کھویا ہے۔ وہ تمہارے کردار سے نفرت کرتی ہے۔ تمہاری طاقت کی ہوس، تمہاری چال بازی...“

پھر سر جھٹکا۔ ”خیر اس کے بغیر ہمارا کوئی معاہدہ مکمل نہیں ہوگا۔“

مراد نے گہرا ہنکارا بھرا۔ ”مجھے سوچنے دو۔“

”وقت کم ہے، مراد۔ اور یہ سارے کھیل وقت کے ہی ہیں۔“

”کچھ دیر... مجھے کچھ دیر سوچنے دو۔“ اس نے بے بسی بھری ناگواری سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا۔ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے وہ زمین پہ بدھا کے انداز میں آلتی پالتی کر کے بیٹھا اور سرخ پٹی اتار پھینکی۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ساری آوازوں اور سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ دماغ کو ایک نکتے پہ مرکوز کیا۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور لب بڑبڑا رہے تھے۔

”میں مراد راجہ ہوں۔ ملا کہ سلطنت کا بندہ ہوں۔ مجھے کوئی یوں نہیں برا سکتا۔ کوئی مجھ سے میرا تخت اور میری بیٹی نہیں چھین سکتا۔“

مغرب ڈھل گئی اور باہر بیٹھے لوگ اسی طرح بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ ان کو بلانے کے لئے آنے والے ان کے مالکوں کے وفادار غلام بھی گھوڑوں پہ آئے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے بہت پکارا غصہ کیا، آوازیں دیں، مگر وہ غلام ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ بس محل کی اونچی کھڑکیوں کو دیکھتے رہے اور لبوں پہ چپ کی مہر لگی رہی۔

وان فاتح کرسی پہ بیٹھا کھڑکی کے باہر آسمان پہ چھاتی سیاہی دیکھ رہا تھا۔ کافی وقت بیت چکا تھا اور مراد واپس نہیں آیا تھا۔ اسے ذرا فکر ہوئی مگر اس نے اعصاب کو ٹھنڈا رکھا۔

مغرب اتر آئی تو دروازہ کھلا اور مراد اندر داخل ہوا۔ آتے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کیا اور کھڑکیوں کے آگے پردے جھٹک کے برابر کیے۔ پھر فاتح کے سامنے آیا۔ سرخ پٹی ماتھے سے غائب تھی اور ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس نے بوتل میز پہ رکھی تو فاتح نے دیکھا۔ اس کے پیندے میں سکھ اور ڈلی پڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چابی۔

مراد کا چہرہ وہ نہیں تھا جو پہلے تھا۔ وہ پرسکون نظر آتا تھا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ پھر اس نے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔ دونوں ہاتھ میز پہ جما کے اس کی طرف جھکا۔

”میں تمہاری دنیا کے باسیوں کی طرح میز پہ آنے کو تیار ہوں۔“

وان فاتح نہیں مسکرایا۔ کچھ عجیب سا تھا، مراد راجہ کی مسکان میں جو اسے غیر آرام دہ کر رہا تھا۔

”کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ وہ بظاہر ٹھنڈا رہا۔

”میں نے ابوالخیر اور تمام رؤساء کو پیغام بھیج دیا ہے۔ چند ساعتیں پہلے انہوں نے تمام ناجائز غلام آزاد کر دیے ہیں۔ حکم نامے تحریری طور پہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“

”تم نے ان کو رقم ادا کی؟“

”میں ان کا بندہ ہاں ہوں۔ میرے احسان ہیں ان پہ۔ اور تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ ناجائز غلام آزاد ہیں۔ وہ کل صبح سے اپنی نئی زندگی شروع کریں گے۔“

”مجھے تمہاری بات پہ یقین ہے۔“

”اس کے علاوہ یہ رہی چابی۔ تم مجھے سونا واپس کر دو اور اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔ تالیہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے۔“

”کیا واقعی!“ اس نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے بندہ ہارا کا چہرہ دیکھا۔

”ہاں۔ سونا میرے پاس آجائے گا۔ میں نے جان لیا ہے کہ میں تالیہ کو زبردستی یہاں نہیں رکھ سکتا۔ وہ بھی آزاد ہے۔ تم دونوں جاسکتے ہو۔“

”اور ابھی تم ”مگر“ کہنے والے ہو؟ نا راجہ!“ وہ غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

مراد راجہ مسکرایا۔ ”مگر...“ زور دے کے بولا۔ ”مگر میری ایک شرط ہے۔“

فاتح نے گہری سانس لی۔ ”شرط ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ میں کروں گا۔“

”نہ ماننے کی صورت میں، میں بغاوت کروں گا، جب چینی ملکہ ملک بدر ہو جائے گی تو چینی سفارتخانے کا ڈر کس کو ہوگا۔ تم میرے قیدی رہو گے۔ تالیہ مجبوراً یہاں رہے گی اور سونا اور تخت میرا ہوگا۔“

”راجہ تم اتنا خون خرابہ نہیں کرانا چاہتے میں جانتا ہوں۔“

”میں یہ کر سکتا ہوں مگر واقعی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم میری شرط مان لو اور یہ چاہی اٹھا کے یہاں سے چلے جاؤ۔“ مراد کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی اور شکاری آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

”کیا شرط ہے تمہاری؟“ اس کے اعصاب تن رہے تھے۔ کچھ بہت غیر آرام دہ سا تھا اس ماحول میں۔

راجہ نے حق اٹھا کے کش بھرا۔ پھر نال ہنائی اور دھوئیں کا مرغولہ لبوں سے چھوڑا۔ مرغولے فضا میں اوپر کو اٹھتے گئے۔ تمباکو کی خوشبو اور سلگتے انگاروں کی مہک آپس میں گھل مل گئی۔

پھر مراد راجہ نے کہنا شروع کیا۔

☆☆=====☆☆

چینی سفارتخانے کے نام پہ بنی حویلیاں سن باؤ کی حویلی کے دائیں بائیں واقع تھیں۔ آج وہاں بھاری چینی فوج تعینات تھی۔ اکثریت ان چینی افسران کی تھی جو ملکہ یان سو فو کی شادی کے وقت ساتھ آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔

سونے سے بھرے صندوق اندر رکھوائے جا چکے تھے اور سن باؤ کے سرخ دروازے کے باہر ایڈم اور تالیہ متفکر سے کھڑے تھے۔ ابھی ابھی ایک چینی سفارتکار نے آ کے اطلاع دی تھی کہ بندہ اہار کی حویلی کے سامنے اکٹھے ہوئے غلام وہاں سے اٹھ گئے ہیں۔

”کیا وہ تھک گئے تھے؟“ ایڈم نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نہیں۔ راجہ نے اس قیدی فاتح کو باہر بھیجا اور اس نے ان کو اٹھنے کے لئے کہہ دیا۔ مگر وہ غلام اپنے مالکوں کے پاس نہیں گئے۔ راجہ نے نیا قانون نافذ کر دیا ہے جس کے تحت ناجائز مسلمان غلام آزاد ہیں۔ اب وہ غلام ملا کہ کی گلیوں میں خوشیاں مناتے پھر رہے ہیں۔ اور ان کی زبان پہ ایک ہی نعرہ ہے کہ شہزادی تاشہ کی سفارش پہ ان کو آزاد کروایا گیا ہے۔“

سفارتکار یہ کہہ کے وہاں سے ہٹ گیا تو تالیہ نے گہری سانس لی۔

”یعنی وان فاتح نے غلاموں کو آزاد کروادیا۔ مگر تم اپنی کتاب میں لکھنا کہ یہ سب شہزادی تاشہ نے کروایا ہے۔“

”جی میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ جہاں اتنے جھوٹ بولے وہاں ایک اور سہی۔“

”اور یہ بھی لکھنا کہ....“

”شہزادی صاحبہ اب دیر ہو چکی ہے۔ میں اپنی کتاب مکمل کر کے شاہی کتب خانے کے منتظم کو دے آیا ہوں۔ اب اس میں ایک ہی صورت میں اضافہ ہو سکتا ہے اگر آپ دونوں مجھے ملا کہ میں چھوڑ جائیں۔“ وہ جل کے بولا تھا۔

چند ساعتیں گزریں تو تالیہ نے فکر مندی سے سڑک کو دیکھا جو اندھیر پڑی تھی۔

”وان فاتح کہاں رہ گئے؟ ان کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں راجہ سے مذاکرات کامیاب ہوئے یا نہیں۔“

اس کی بات منہ میں رہ گئی۔ دور افتق سے دھول اڑتی دکھائی دی تھی۔ وہ چونکی۔

اس پاس تعینات چینی سپاہی بھی چوکنے ہوئے۔

سڑک پہ تیز گھوڑے دوڑتے آرہے تھے۔ گھوڑا گاڑیوں کے پہیوں کی آواز... چینی سپاہیوں نے تلواریں نکال لیں۔

قافلہ قریب آیا اور چاند کی روشنی میں نظر آیا... مراد راجہ سب سے آگے والے گھوڑے پہ تھا۔ اور دوسرے گھوڑے پہ فاتح بیٹھا تھا۔

تالیہ اور ایڈم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔

”یہ یہاں کیوں آیا ہے؟“ سن باؤ ساتھ آکھڑا ہوا اور پریشانی سے بولا۔ ہاتھ نیام کی تلوار پہ تھا۔

”وانگ لی۔“ گھوڑے پہ بیٹھے فاتح نے ہاتھ اٹھا کے ان کو تھم جانے کا اشارہ کیا، اور اپنا گھوڑا قریب لایا، پھر نیچے اترا۔ تالیہ نے گردن

اٹھا کے شاکی نظروں سے مراد راجہ کو دیکھا۔ اس نے ماتھے پہ سرخ پٹی باندھ رکھی تھی اور لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ وہ بھی تالیہ کو ہی

دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے نظریں پھیر لیں۔

”وانگ لی۔“ فاتح نے ان دونوں کو نظر انداز کر کے سن باؤ کو مخاطب کیا۔ ”مراد راجہ کے اکیس صندوق اس کے حوالے کر دو۔“

ایڈم کا منہ کھل گیا۔

تالیہ شل رہ گئی۔

سن باؤ بھی چونکا۔ ”مگر...“

”یہ میرا فیصلہ ہے۔ اور تم سب کو یہ ماننا ہوگا۔“ وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا۔

”مگر وہ تو غرباء کے لئے...“ تالیہ نے بولنا چاہا تو فاتح نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کرایا۔

”اس کے بدلے میں تمام غلام آزاد ہو گئے ہیں۔ سونے کے چند سکے ہر شخص کے حصے میں آئیں، اس سے بہتر یہ نہیں کہ انہیں آزادی

مل جائے؟ میں نے جو کیا ہے وہ ملا کہ کے لوگوں کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ میں نے غلاموں سے آزادی اور تم دونوں سے واپسی کا وعدہ کیا

تھا۔ کسی کی غربت مٹانے کا نہیں۔ اس لئے مجھے میرے وعدے نبھانے دو۔“

کچھ تھا جو اس کے انداز میں بدل گیا تھا۔ سختی، سنجیدگی۔ کوئی سایہ سا تھا جو چہرے پہ آن پڑا تھا۔

ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، البتہ تالیہ نے سر ہلا دیا۔ ”جو آپ کو مناسب لگے، تو انکو!“

”مگر... ملکہ نے تو...“ سن باؤ نے سرگوشی میں احتجاجاً فاتح سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔

”میں ملکہ کا غلام نہیں ہوں۔ سلطان کو دوسری ملکہ نہیں لانے دوں گا۔ یہ وعدہ کیا تھا میں نے۔ مراد راجہ کو تباہ کرنے کا نہیں۔ اس

لئے... راجہ کے صندوق واپس کر دو۔“

غلام حکم دے رہا تھا۔ پٹی بندھا ہاتھ اٹھا کے اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ سن باؤ نے گہری سانس لی اور سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ کوئی بعید نہیں یہ غلام سلطان کو جا کے کہہ دے کہ اس سازش میں ملکہ بھی شریک تھی۔ ایسی صورت میں سارا کھیل پلٹ جاتا۔ مراد کے ساتھ آئے سپاہی ان حویلیوں کی طرف چلے گئے۔ سن باؤ بھی ساتھ ہولیا۔ البتہ بار بار ناخوشی سے پلٹ کے ان کو دیکھتا ضرور تھا۔

ایڈم گم صم کھڑا تھا۔ تالیہ خاموش تھی۔ فاتح حویلیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اور گھوڑے پہ بیٹھا راجہ ان تینوں کو۔ ”تو یہ شاہی مورخ بھی تمہارے ساتھ آیا تھا؟“ اس نے براہ راست تالیہ کو مخاطب کیا تو اس نے خفا سی نظریں اٹھائیں۔ ”ہمارا آنا آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم کیسے جائیں گے، کیوں نا اس بارے میں بات کر لی جائے۔“ وہ برہمی سے بولی تو فاتح نے اس کو دیکھا۔

”راجہ نے مجھے چابی دے دی ہے۔“ ساتھ ہی کرتے کے گریبان کے اندر سے سنہری زنجیر نکال کے دکھائی جس میں ڈلی اور سکہ دونوں کو جوڑ کے بنی چابی پڑی تھی۔

تالیہ نے چونک کے باپ کو دیکھا جو دم سمسکر رہا تھا۔

”تم جاؤ تالیہ۔ یہ چابی تمہیں خود راستہ دکھا دے گی۔ تمہیں اسی جنگل میں جانا ہے جہاں سے تم آئے تھے۔“

”ہم تینوں... جاسکتے ہیں؟“ وہ حیران تھی۔ بار بار فاتح کو دیکھتی۔ جیسے ابھی وہ کوئی ”مگر“ کہے گا لیکن وہ سنجیدہ رہا۔

”مراد راجہ درست کہہ رہا ہے۔ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سونا لینا اور سلطان سے بات کرنا یہ سب مراد راجہ کا کام ہے۔ کیا تمہیں محل سے کچھ اٹھانا ہے؟“ عام سے انداز میں رک کے تالیہ کی طرف دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں بندہ ہارا کے اونچے محل پہ۔“ تنفر سے بولی تو فاتح نے سر ہلادیا۔

”پھر آؤ۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈم کو بھی اشارہ کیا تو وہ بھی گم صم سا ساتھ ہولیا۔

ذرا فاصلے پہ فاتح کے گھوڑے کے ساتھ دو مزید تازہ دم گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ان پہ کھانے پینے کا مناسب سامان بھی لدا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پہ سوار ہو رہا تھا جب ایڈم پیچھے سے شا کی انداز میں بولا۔

”تو آپ نے وہی کیا جو سیاستدان کرتے ہیں۔ آپ نے ذیل کر لی۔“ وہ ابھی تک سن تھا۔

وان فاتح رکاب پہ پیر رکھ کے اوپر چڑھا اور گھوڑے کی لگام تھامے سرسری سا ایڈم کو دیکھا۔ ”میں نے اس سے زیادہ کا وعدہ نہیں کیا تھا۔“ اور پھر دل میں سوچا۔

(تم کیا جانو میں نے کیا قربان کیا ہے۔)

”مگر ہمیں ملا کہ کے لوگوں کے سامنے راجہ کی بدعنوانی کا پول کھولنا تھا۔ ہمیں....“

”ہمیں صرف واپس جانا تھا، ایڈم۔ ہمیں اپنی اصل زندگیاں واپس چاہیے تھیں۔ اس دنیا میں ہمارا کوئی ہدف نہیں تھا۔ ہم لامتناہی کھلاڑی تھے۔ بس۔ اس لئے خوش ہونا سیکھو۔ تم واپس جا رہے ہو۔“ وہ رعب سے بولا تو ایڈم نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ فاتح اس سے نظر نہیں ملتا رہا تھا۔

ادھر مراد گھوڑے سے اترا اور تالیہ کے سامنے آیا۔ وہ ہنوز سلوٹ زدہ پیشانی لئے کھڑی تھی۔ چہرے پہ خفگی اور الجھن تھی۔

”تم نے اس غلام سے نکاح کر کے میرے پاس کوئی راستہ نہیں چھوڑا، تالیہ۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا ملال سے کہہ رہا تھا۔

”آپ اپنے ہی لوگوں سے دھوکہ کرنے والے ایک بدعنوان آدمی ہیں، بابا۔ آپ نے مجھے محل میں قید کر رکھا تھا۔ آپ کی چابی نے مجھ سے میری دنیا چھین لی۔ مجھے ابھی بھی آپ پہ شک ہے۔“

”کیا شک ہے؟“ وہ پرسکون سا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”یہی کہ آپ مجھے کسی طرح اس دنیا میں روکنے کی کوشش کریں گے۔“

”نہیں۔ میں تمہیں اپنی مرضی سے جانے دے رہا ہوں کیونکہ....“ وہ آگے بڑھا، اس کے کندھوں کو نرمی سے تھاما اور اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیونکہ مجھے یقین ہے، تم واپس ضرور آؤ گی۔“

تالیہ نے زور سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ اسے مراد راجہ پہ بری طرح سے غصہ آیا تھا۔

”تالیہ واپس کبھی نہیں آئے گی۔ مجھے آپ کا محل، آپ کی دولت اور آپ کی طاقت نہیں چاہیے۔ مجھے اپنی عام سی دنیا واپس چاہیے۔ میں اسی میں خوش تھی، بابا۔“

اور ساتھ سے گزر کے آگے نکل گئی۔ اس کا گھوڑا تیار تھا۔ ایڈم اور فاتح گھوڑوں پہ بیٹھے اس کے منتظر تھے۔ تالیہ اپنے گھوڑے پہ چڑھی اور تیزی سے اس کا رخ موڑ دیا۔

”میں تمہارا انتظار کروں گا، تالیہ۔“ عقب میں کھڑا مراد کمر پہ ہاتھ باندھے پرسکون سا گردن اٹھائے ان تینوں کو اندھیر سڑک پہ آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے مڑ کے دیکھا تک نہیں۔

مڑ کے دیکھنے والے نمک کے جسمے بن جاتے ہیں۔

البتہ ان فاتح نے گردن موڑ کے ایک خاموش نظر مراد پہ ڈالی اور سر کو ہلکا سا خم دیا۔ یہ تشکر تھا، یا کسی سمجھوتے کا اشارہ۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چپ لگتا تھا اور اس کی ازلی امید بھری چمک آنکھوں سے غائب تھی۔

”ہمیں اس طرف جانا ہے۔“ فاتح اپنا گھوڑا سب سے آگے لے گیا۔ وہ اب راستہ بتا رہا تھا اور وہ دونوں اس کی پیروی کر رہے تھے۔

ایڈم اداس لگتا تھا۔ وہ ایک بد عنوان حکمران کا پردہ فاش نہیں کر سکا تھا۔

اوپر چمکتا چاند... تارے... اور اندھیر سڑک پہ دوڑتے تین گھوڑے۔ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر فضا میں کچھ تھا جو بھاری اور مہلک سا محسوس ہوتا تھا۔

Cesium سے زیادہ مہلک۔

☆☆=====☆☆

جس جنگل سے نکلنے میں ان کو چار دن لگے تھے راستہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ اس جنگل کے اندر تین دن میں پہنچ گئے۔ فاتح اس دوران زیادہ تر خاموش رہا تھا۔ ایڈم کا موڈ بدستور بہتر ہوتا آیا اور تالیہ بھی جلد نارمل ہو گئی۔ بلکہ جیسے جیسے سفر گزرتا جا رہا تھا وہ پر جوش ہوتی جا رہی تھی۔

”واؤ... ہم بالآخر واپس جا رہے ہیں۔“

”ہم واقعی واپس جا رہے ہیں نا سر؟“ وہ رات کو جنگل کے اندر اپنے اپنے بستر بنا رہے تھے جب ایڈم نے پھر سے پوچھا۔
گھنے رین فاریسٹ کے اونچے درخت خاموشی سے اس قطعے کو دیکھ رہے تھے جہاں خشک پتے گرے تھے اور فاتح ایک درخت کے ساتھ کھڑا سیڑیوں کا جھولا سا باندھ رہا تھا۔ آستین پیچھے کو چڑھائے وہ سنجیدگی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ ایڈم کے سوال پہ محض اتنا بولا۔
”تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟“

”آپ پہ ہے۔ مگر اپنے باپ پہ نہیں ہے۔“ وہ جو مقابل درخت کے ساتھ اپنے بستر کو باندھ رہی تھی مداخلت کرتے ہوئے بولی۔
”وہ تمہارا باپ ہے تالیہ۔ اس کو تم سے محبت ہے۔“ وہ کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے کی طرف پشت تھی اور وہ کام میں لگے تھے۔ ایڈم درمیان میں پتھر پہ بیٹھا باری باری دونوں کو دیکھتا تھا۔

”مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ آخر میں ہم میں سے کسی کو روک نہ لیں۔ یا پتہ نہیں کیا... مگر باپا ایسا ضرور کچھ نہ کر دیں جس سے ہمیں نقصان ہو۔“ پھر چونک کے اس کی طرف پلٹی۔

”انہوں نے اس ساری ڈیل میں کوئی ”کچھ“ تو نہیں رکھنا؟ کوئی شرط؟ کوئی... کوئی ضرر دینے والی بات۔“ اس کی الجھن ختم نہیں ہو رہی تھی۔

فاتح کے رسیاں کتے ہاتھ تھمے۔ صرف ایک پل کو۔ پھر اس نے کام جاری رکھا اور عام سے انداز میں بولا۔ ”میں نے کہا نا، ہم صحیح سلامت واپس پہنچ جائیں گے تو تم اتنی وہمی کیوں ہو رہی ہو؟“

”تو آپ اتنے چپ چپ کیوں ہیں۔“

”کیونکہ میں آگے کا سوچ رہا ہوں۔ مجھے ایک دنیا کو اپنی گمشدگی کے متعلق جواب دینے ہوں گے۔ چارہ ماہ چھوٹا عرصہ نہیں ہوتا۔“ اس

نے جھولا مکمل کر لیا تھا۔ پھر ایک کپڑا سامان سے نکالا اسے جھاڑا اور رسیوں کے پنگھوڑے پہ ڈالا۔ اس بار جنگل میں پچھلی دفعہ کی طرح کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی کیونکہ سامان ان کے پاس تھا۔

”آپ فکر مت کریں تو انکو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

فاتح نے پلٹ کے ایک اچھٹی نگاہ اس پہ ڈالی۔ ”وان فاتح کو کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں پڑی کبھی تالیہ۔“

شاید وہ ویسا ہی بے نیاز تھا جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ شاید یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس نے بس شانے اچکا دیے اور واپس اپنا بستر بنانے لگی۔

”مرا درجہ اب کیا کرے گا؟ سلطان کو بیٹی کی گمشدگی کی خبر کیسے دے گا؟ کیا بہانہ کرے گا؟“

”ایڈم یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنی نجات کے بارے میں سوچنا ہے۔ اور یہ تم ہی تھے جو چار ماہ سے واپس جانے کے لئے

شکایتیں کر رہے تھے۔ اب جب تمہیں راستہ مل رہا ہے تو بہتر ہے کہ ملا کہ کے ہیرو نہ بن سکنے کے غم کو بھول کے تم اپنے ماں باپ اور اپنی منگیتر کا سوچو۔“

وہ ایک دم یوں جھڑک کے بولا تو ایڈم کے چہرے کے سارے زاویے درست ہو گئے۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ ”جی سر۔“

فاتح اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ دو درختوں کے درمیان فضا میں جھولتا رسیوں کا جھولا۔ اور اس نے ان کی طرف سے کروٹ موڑ لی۔ وہ

درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں چاند کی روشنی مدھم سی پہنچ پارہی تھی۔ جانوروں کے بولنے اور کیڑوں کے ریگنے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ دور کسی جھرنے کے بہتے پانی کی آواز بھی آرہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ تالیہ چپ چاپ کام کرتی رہی اور ایڈم پتھر پہ بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالیہ کو مخاطب کیا۔ ”آپ جاتے

ہوئے اپنے باپا سے کیا کہہ رہی تھیں؟“

”یہی کہ میں ان کے محل اور دولت پہ لعنت بھیجتی ہوں۔“

”جی اور اسی لئے آپ نے اپنے کپڑوں میں جو پونلی چھپا رکھی ہے اس میں اچھے خاصے سونے ہیرے اور جواہرات جڑے زیورات

موجود ہیں۔“ وہ تین دن سے جس راز کو دبائے پھر رہا تھا آج اگلے بنارہ نہ سکا۔ تالیہ نے پلٹ کے کینہ تو نظروں سے اسے دیکھا۔

”جائز اور حلال زیورات ہیں وہ۔ شہزادیوں کا حق ہوتا ہے۔ چوری کر کے نہیں لے جا رہی۔“ کپڑا جھٹک کے بستر پہ بچھاتے ہوئے وہ

بولی تو ہاتھ کی سرخ انگوٹھی چمکی۔

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ ناجائز ہیں؟ صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اتنی جلدی محل اور دولت پہ لعنت بھیجنے والی نہیں ہیں آپ۔“

تک کے بولا اور اپنا بستر بنانے اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ خفگی سے کچھ بڑبڑاتی درخت کی طرف مڑ گئی۔

بالآخر ان کے درمیان تناؤ والی فضا ختم ہو رہی تھی۔ بالآخر تالیہ کو یقین آنے لگا تھا کہ سب ٹھیک ہے اور فاتح اس سے کچھ نہیں چھپا رہا۔

ان کی طرف سے کروٹ موڑے فاتح کو اپنے سر ہانے کھڑی اداس سی آریا نہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتی وہ فکر

مندی سے اس کی طرف جھکی۔

”یہ آپ نے کیا کر دیا ڈیڈ؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر دیا۔ ان دونوں کو بتایا ہی نہیں۔ جب ان کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟“

”آریا نہ۔“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے اداسی سے بڑبڑایا۔ ”میں ان کے برابر کا نہیں ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے سے اوپر رکھا ہے۔ اور Its very lonely at the Top“

پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ جنگل کی ساری سیاہی ان آنکھوں میں سمو گئی اور دل بھی اندر تک اندھیر ہو گیا۔

☆☆=====☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب دو درختوں کے درمیان بندھے جھولے نما بستر پہ سوئی تالیہ کی آنکھ کھلی۔ نرم سالخاف اس نے چہرے سے اتارا اور پلکیں چند بار جھپکائیں۔ وہ چپت لیٹی تھی سو اونچے درختوں کے آسمان کو چھوتے سرے نظر آ رہے تھے۔ مدھم چاندنی کہیں کہیں سے جھانک رہی تھی۔ پھر اس نے گردن چوکنے انداز میں موڑی۔

فاتح ایک پتھر زمین پہ کھینچتا اس کے جھولے کے قریب لار ہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ اٹھا کے روکا۔ ”دشش شش... ریلیکس!“ اور پتھر قریب لا کے سیدھا ہوا۔ پھر اس پہ بیٹھا یوں کہ تالیہ کی طرف رخ تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ گرم لخاف اپنے گرد لپیٹے رکھا۔ جھولا ذرا سا جھولنے لگا پھر ساکن ہو گیا۔

”کیا ہوا فاتح صاحب؟“ تالیہ نے بال کان کے پیچھے اڑتے ہوئے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا۔ ساتھ ہی مانوس سی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ چاکلیٹ۔

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو جنگل میں آگے نکل گیا۔ وہاں کوکو کا درخت تھا۔ سوچا تمہارے لئے لے آؤں۔ یاد ہے تمہاری سالگرہ پہ تمہیں یہ بہت لذیذ لگا تھا۔“ وہ پتھر پہ بیٹھا مسکرا کے کہتا چاقو سے پھل کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

”آپ کو یاد تھا۔“ ہاتھ بڑھایا تو فاتح نے پھل اسے تھماتے ہوئے چہرہ اٹھایا۔ وہ قدرے تھکا تھکا لگ رہا تھا مگر یوں پہ مسکراہٹ تھی۔ تین دن کی خاموشی کے بعد آج وہ وہ فاتح لگا تھا جو اسی جنگل میں چار ماہ پہلے اس کو تسلی دیتا تھا اور ہمت دلاتا تھا۔ ”ظاہر ہے مجھے یاد تھا۔“ وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ آواز دھیمی تھی۔

”یہ اب بھی لذیذ ہے۔“ اس نے انگلی کئے پھل کے پیالے میں ڈالی اور گودا منہ میں رکھا تو لذیذ رس اندر تک گھل گیا۔ وہ بس مسکرا کے اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

”تالیہ!“ پھر نرمی سے پکارا۔ ”ان چار ماہ میں تمہارے خیال میں تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟“

”چار پانچ کلو وزن بڑھا ہے میرا۔ اور ہاں چند جنگی امور کی تربیت لی ہے میں نے۔ شاہی آداب دیکھے ہیں۔ ہر روز ڈھیروں زیورات خود پہلا دینے کی مشق کی ہے اور....“

”تالیہ!“ اس نے نرمی سے ٹوکا۔ ”بابر نہیں تمہارے اندر کیا تبدیلی آئی ہے؟ تم نے کیا سیکھا ہے؟“

اس نے گودے بھری انگلی لبوں پر رکھ کے نکالی اور سوچا۔ ”پتہ نہیں تو انکو۔ شاید کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اب بھی دولت کی وہی حرص ہے مجھے۔ اتنے زیورات ساتھ لائی ہوں۔ خزانہ اب بھی چاہیے مجھے۔ ہاں کوشش کروں گی کہ پرانی روش چھوڑ کے نئی زندگی شروع کروں۔“

”جب میں تمہیں چھوڑ دوں گا (تالیہ کی پلکیں جھکیں مگر پھر اس نے ان کو اٹھالیا اور مسکراتی رہی) تو تم کیا کرو گی؟“

”میں شاید امریکہ چلی جاؤں۔ اپنے سارے جائز مال و دولت کے ساتھ اور بطور آرٹسٹ ایک نئی زندگی شروع کر لوں۔“ پھر ٹھہری۔ پھل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

اندھیر رات میں وہ خوف میں لپٹی جھولے پہ بیٹھی تھی اور وہ سامنے پتھر پہ بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں ہم نے یہ نکاح صرف مراد راجہ کو بلیک میل کرنے کے لئے کیا تھا، ورنہ وہ زبردستی میری شادی سلطان سے کر دیتا۔ اور اب ہم اس کو ختم کر دیں گے۔ لیکن... میں چاہوں گی کہ ہم اچھے دوست رہیں۔ میں چھٹیوں میں ملایشیا آنا چاہوں گی اور بھلے آپ وزیر اعظم بھی بن جائیں، آپ ایڈم اور میرے لئے ہمیشہ وقت نکالا کریں گے۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہم تینوں مل بیٹھ کے ان دنوں کو یاد کیا کریں گے۔ ٹھیک ہے نا تو انکو۔“

”میں بھی چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ مگر میں ایک اور بات اس سے زیادہ چاہتا ہوں۔“ وہ نرمی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے ابرو جھنجھ کے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”وہ کیا؟“

”تمہاری حقیقت جاننے سے قبل میں تمہیں تاشہ کہا کرتا تھا۔ اسی جنگل میں میں نے تمہیں پہلی دفعہ تالیہ کہنا شروع کیا تھا۔ جس لڑکی کو میں تاشہ کہہ کے بلاتا تھا وہ میرے لئے ایک ناقابل بھروسہ بے ایمان اور اداکارہ قسم کی عام سوشلائٹ تھی۔ مگر جب میں نے تمہیں جانا.... کہ تمہارا پیشہ کیا ہے اور تم ہی حال ہو تو میں نے تمہیں تمہارے اصل نام سے پکارنا شروع کیا۔ پھر کبھی تاشہ نہیں کہا۔ کبھی تمہیں شہزادی نہیں سمجھا۔ کیونکہ اتنا زیور لا دے تاج اور زرتار لباس پہن کے بھی تم میرے لئے وہی تالیہ تھیں جو میری دنیا کی باسی تھی۔ لیکن اس روز....“

وہ ٹھہرا۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ رہی تھی۔ ”اس روز قید خانے میں جب تم سپاہیوں پہ غرائیں تو میں نے تمہاری وہ آواز سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔“

وہ ذرا سی شرمندہ ہوئی۔ فوراً وضاحت دینا چاہی۔ ”وہ تو میں غصے میں...“

”نہیں تالیہ۔ مجھے برا نہیں لگا تھا۔ بلکہ مجھے اچھا لگا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟“

وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ بنا کسی تاج اور شاہی لباس کے... اس دن تم مجھے شہزادی لگی تھیں۔ وہ تمہارا اصل روپ تھا۔ تمہارا ریکل سیلف۔ تم مجھے تو انکو کہتی ہو۔ ہماری دنیا میں اس لفظ کا مطلب My Boss ہوتا ہے۔... لیکن اس وقت میں نے جانا تھا کہ تمہارا اصل مقام ایک باس کا مقام ہے۔ تم نے ان چار ماہ میں اپنے اصل روپ کو دریافت کر لیا ہے، تالیہ۔ تم ایک شہزادی ہو۔ ایک دانا شہزادی۔ تم روپ بدل بدل کے تنگو کامل کی ملازمہ یا کوئی ویٹرس یا کوئی سطحی سوشلائٹ بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ تم یہ بہروپ اس لئے بناتی ہو، سچ اس لئے نہیں بول سکتیں کیونکہ تم نے اپنے اصل کو کبھی دریافت ہی نہیں کیا تھا۔“

وہ ٹٹکی باندھ کے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم نے ان چار ماہ میں جو سیکھا ہے اس کو ضائع مت کرو۔ واپس جا کے تم اس کو اپنی زندگی پہ لاگو کرنا۔ پھر تمہیں کسی چیز کا خوف سچ سے دور نہیں کرے گا۔ تم اپنے ساتھ سچی ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے اوپر طمع چڑھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کیونکہ تمہیں اپنے اصل روپ پہ اعتماد آ جائے گا۔ میں اس تالیہ کو کے ایل میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں جو قید خانے کے سپاہیوں پہ غرار ہی تھی۔ ان کو ظلم کرنے سے روک رہی تھی۔ یہی چیز تمہاری سب سے بڑی طاقت ہو گی۔ تالیہ تمہیں کسی خزانے، کسی زیور کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے صرف وہی بنا ہے جو تم اس قدیم ملاکہ میں تھیں۔“

”مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آرہیں۔ میں چوری کرنا چھوڑ کے نئی زندگی شروع...“ اس نے کہنا چاہا مگر....

”ایک وقت آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس وقت اس رات کو یاد کرنا۔ تم یاد کرنا کہ میں تمہیں ایسی ہی تالیہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ شہزادی تاشہ جیسی تالیہ۔ صرف تاشہ جیسی نہیں۔ بلکہ کسی باس کی طرح۔ نڈر اور جرات مند۔ اور اس وقت اگر کوئی تمہارے اس روپ کو پسند نہ کرے تو تم اس کی پروا نہیں کرو گی۔ چاہے تمہیں ناپسند کرنے والوں میں میں ہی کیوں نہ شامل ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے نیم رضامندی سے سر ہلایا۔ ”میں اپنے اصل سے نہیں بھاگوں گی۔“

”اور ایڈم...“ اس نے گردن موڑ کے دور سوتے ایڈم کو دیکھا۔ ”اس نے اس دنیا سے یہ سیکھا ہے کہ انسان کو اپنی خوشی اپنے اندر خود ڈھونڈنی ہوتی ہے۔ بجائے دوسروں کے پیچھے بھاگتے رہنے اور دوسروں کی رائے پہ انحصار کرنے کے انسان کو اپنی ذات پہ اعتماد کرنا سیکھنا ہوتا ہے۔ ہم اپنے سب سے اچھے دوست اور سب سے اچھے جج خود ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ تم ایڈم سے رابطے میں رہو اور اس کو بیساکھیوں کے بغیر اپنے قدموں پہ چلنا سکھاتی رہو۔ تمہیں اور اسے اس دنیا سے سیکھے اسباق بھولنے نہیں چاہئیں۔“

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تو تالیہ نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”ہم اچھے دوست تو رہیں گے نا فاتح صاحب؟“ یونہی اس کو نام سے پکار دیا۔

”میں ایسا ہی چاہتا ہوں کہ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں۔“ وہ مسکرا کے پلٹا تو وہ پکار اٹھی۔

”اور آپ نے کیا سیکھا؟“

اس اندھیر رات میں درختوں کے ساتھ کھڑا فاتح ٹھہر گیا۔

پھر آہستہ سے مڑا اور سادگی سے مسکرا کے تالیہ کو دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں جیسا تھا ویسا رہوں گا۔“

”ظاہر ہے۔“ تالیہ نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ ”آپ سیلمرٹی ہیں، پرفیکٹ ہیں۔ آپ میں خامیاں کیسے ہو سکتی ہیں جن کو اصلاح کی ضرورت ہو؟“ تروٹھے پن سے بولی تو اس نے جواب نہیں دیا۔

”آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ اس میں وہ پاپ کارن بھی ہیں۔“

”وہ تم رکھ لو۔ اس وقت تک جب تک میں اسے واپس نہیں مانگتا۔“ وہ مبہم انداز میں کہتا اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تالیہ بھی واپس لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

کروٹ موڑ کے لینے ایڈم کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس نے حرف حرف سنا تھا۔

”وان فاتح یہ سب مجھے ڈائریکٹ بھی کہہ سکتے تھے پھر چے تالیہ کو کیوں کہا کہ وہ مجھے کہیں۔ تین دن سے سر مجھے اگنور کر رہے ہیں۔ ہونہ۔“ اس نے خفگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ اسے سو جانا چاہیے تھا۔

صبح انہوں نے ”دروازے“ کی طرف سفر کرنا تھا۔

☆☆=====☆☆

جنگل پہ صبح اتری تو گھنے درختوں نے دیکھا، تین مسافر قطار میں چلتے جا رہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے مرد کی گردن میں سنہری چابی لٹک رہی تھی جو اس کو راستہ دکھا رہی تھی۔ گھوڑے وہ جنگل سے باہر چھوڑ آئے تھے اور اب پیدل تھے۔ چہروں پہ مٹی لگی تھی اور لباس میلہ ہو رہا تھا مگر وہ چل رہے تھے۔

برائے قدم کے ساتھ تالیہ کو ان چار ماہ کا گزرا ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔

(چار ماہ قبل وہ کے ایل میں سن باؤ کے گھر کے صحن میں کھڑے تھے۔ زمین میں ڈھکن سا کھل گیا تھا اور نیچے سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ فاتح مشکوک سا تالیہ کو رہی سے دیکھ رہا تھا اور وہ خزانے کی طمع میں زینے اتر رہی تھی۔)

جنگل میں وہ تینوں اس مقام تک پہنچے تو فاتح نے گردن سے زنجیر اتاری اور سنہری چابی زمین پہ رکھی۔ ایک دم ہوا چلی اور سوکھے پتے اڑتے گئے۔ جگہ خالی ہوتی گئی۔ وہاں ایک لکڑی کا ڈھکن نظر آنے لگا۔

(وہ رین فاریسٹ کی غار میں کھڑی تھی۔ ساکن ساکت۔ اس کے سر کے اوپر سانپ تھا جس کو فاتح چاقو سے مار رہا تھا۔ سانپ کی گردن کٹ کے گر گئی۔ وہ خوف سے اُسے دیکھ رہی تھی۔)

پتے ہٹ گئے اور ڈھکن صاف نظر آنے لگا۔ وان فاتح نے تیزی سے ڈھکن کھولا۔ نیچے زینہ سا بنا تھا۔ ان تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ تالیہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ خوشی اندر باہر بھرنے لگی۔

(وہ تینوں جنگل میں بیٹھے تھے۔ درختوں کی چھایا تلے اور وہ برن کی گرون پہ چاقو پھیر رہی تھی۔ خون کے چھینٹے وان فاتح کے اوپر آگرے تھے۔)

وہ قدم بہ قدم زینے اترنے لگے۔ ایڈم بار بار دیواروں کو ہاتھ لگا کے ٹٹولتا۔ کیا وہ واقعی واپس جا رہے تھے؟ وہ بے یقین تھا۔
(وہ پنجرے میں بند تھے اور پنجرہ اٹھائے کھوڑا گاڑی سڑک پہ سر پٹ دوڑ رہی تھی۔ تالیہ کے سر پہ چوٹ لگی تھی اور وہ مورہا تھا۔)
زینے اترتے وقت وان فاتح سب سے آگے تھا۔ دروازے پہ وہ پہلے پہنچا۔ تالیہ نے چابی مانگی مگر وہ خود آگے آیا اور تالے میں چابی ڈالی۔ پھر زنجیر ہٹا کے اسے کھولا۔ لکڑی کا قدیم دروازہ کھلتا چلا گیا۔
(وہ بند اہار کے محل میں کھڑی اپنے باپا سے پہلی دفعہ مل رہی تھی۔ اس نے جامنی لباس پہن رکھا تھا اور کان کے اوپر بڑا سا پھول لگا تھا۔)

دروازے کے پار وہی سب تھا جو پہلے نظر آیا تھا۔ طویل راہداری جو گیلی تھی۔ وہ تینوں تیزی سے اس پہ چلنے لگے۔ تالیہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ایڈم اب بھی دیواروں کو بے یقینی سے ٹٹول رہا تھا۔
(وان فاتح ابوالخیر کی حویلی کی رسوئی میں کھڑا صراحی سے پیالیوں میں قہوہ اندیل رہا تھا۔ دھار کی صورت میں گرنا قہوہ پیالی کو بھر رہا تھا۔
چوں کے کڑھنے کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔)

ان کے پیر پانی میں ڈوب رہے تھے اور اوپر سے قطرے بھی برس رہے تھے مگر وہ چلتے گئے... چلتے گئے... چلتے گئے۔
(ایڈم کتب خانے میں کتابیں اور قلم کاغذ پھیلانے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو وہ شعلہ دکھا چکا تھا اور کاغذ دھیرے دھیرے جل رہا تھا۔)

راہداری ایک دوسری پانی بھری راہداری کے ساتھ آہلی۔ دو دریاؤں کا سنگم۔
تالیہ کی آنکھیں فرط مسرت سے بھینکنے لگیں۔ صرف فاتح تھا جو سنجیدہ تھا۔ بے تاثر۔ سرد۔
(وہ دونوں ابوالخیر کی حویلی کی چھت پہ اکڑوں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دور تک پھیلانے دھیرے میں ڈوبے ملا کہ کو دیکھ رہے تھے۔)
دو دریاؤں کے سنگم پہ تالیہ نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہاں کوئی ہمانہ تھا۔ مگر وہ نئی زندگی کی شروعات تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی
'یہاں تک کہ سب سے آگے نکل گئی۔

(وہ ملکہ یان سو فو کے محل میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور طبیب کو ڈانت رہی تھی۔ اس کا تاج سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا اور ملکہ ونگ کھڑی اس کو اپنی حمایت کرتے دیکھ رہی تھی۔)

فاتح اب سست روی سے چل رہا تھا۔ اسے اب واپس پہنچنے کی جلدی نہ تھی۔ ایڈم کا چہرہ اب جیسے پرسکون ہونے لگا تھا۔ اسے یقین آنے لگا تھا۔

(ایڈم د بار میں رکھی سنہری میز پہ موجود اپنے نام کی تختی پہ مسحور سا ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ساتھ ہی دستے رکھے تھے جن کے اوپر لکھا بنگار لیا ملا یو جلمگار ہاتھا۔)

دوسرے دریا کے پار وہی زینہ تھا۔ تالیہ بھاگ کے اس پہ چڑھی۔ سامان کی پونگی سنبھالے وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ فاتح بن رامنزل کے قدم اتنے ہی بھاری ہو رہے تھے۔

(مراد اور لجنہ تختی سے اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میز پہ رکھی اس کی ننھی سی لکڑی کی کشتی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔)

لکڑی کا ڈھکن اس نے ہٹایا تو سیاہ رات دکھائی دی۔ وہ بابرنگی تو خود کو سن باؤ کے صحن میں پایا۔ تاروں بھرا آسمان اور... اس نے گردن موڑی... نئے ملاکہ میں جدید تراش خراش سے آراستہ سن باؤ کا گھر۔

(وہ جیا کے چبوترے پہ کھڑا بلند آواز میں لوگوں سے مخاطب تھا، مگر وہ گردنیں افسوس سے ہلاتے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔) ایڈم بابرنگا تو بالکل دنگ رہ گیا۔ پھر بالآخر کھل کے مسکرایا۔ پیروں پہ گول گول گھوم گیا۔ وہ جدید ملاکہ ہی تھا۔ وہ جدید گھر ہی تھا۔ (وہ تینوں سن باؤ کے برآمدے میں زمین پہ بیٹھے تھے اور چینی قاضی ان سے ان کی رضامندی لے رہا تھا۔ گواہ بنا ایڈم خالی دل اور خالی نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔)

فاتح نے اوپر قدم رکھے اور سیدھا کھڑا ہوا تو ڈھکن خود بخود بند ہو گیا۔ زمین برابر ہو گئی۔ کنویں کا پانی بھر آیا۔ ایسے جیسے وہاں کوئی ڈھکن تھا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

(وہ دونوں بجسے کی جگہ کے نیچے زمین میں سامان بھر رہے تھے۔ سن باؤ کے قدیم صحن میں تالیہ اور ایڈم تہا تھے اور ان کے ہاتھ تیز تیز کام کر رہے تھے۔)

وان فاتح نے صرف برآمدے کی طرف دیکھا۔ دیوار پہ لگی گھڑی ساڑھے گیارہ بج رہی تھی۔ گھڑی پہ تاریخ کی اسکرین سولہ جولائی دکھا رہی تھی۔ وقت رک گیا تھا۔

(وہ مراد کے قید خانے میں مقید صلیب صورت بندھا کھڑا تھا۔ سپاہی اس کو پیٹ رہے تھے اور وہ کرب سے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔)

تالیہ نے دونوں بازو فضا میں پھیلا دیے اور آسمان کی طرف دیکھ کے آنکھیں موند لیں۔ جدید ملاکہ کی ٹھنڈی ہوا اس کے سنہری بالوں میں سرسہراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ آزاد تھی۔

ایڈم بھاگ کے برآمدے میں گیا اور وہاں رکھائی وی آن کیا۔ اسکرین پہ نیوز کا سٹر خبریں پڑ رہا تھا۔ تاریخ، وقت... خبر کی پٹیاں... سب سولہ جولائی تاریخ کا تھا۔ وقت واقعی ختم گیا تھا۔

اور کون کہتا ہے کہ وقت کسی کے لئے نہیں رکتا؟
کبھی کبھی....

کسی کسی کے لئے....
کسی کسی زمانے میں....
وقت تھم بھی جاتا ہے۔
اور تھم کے... وہ انتظار کرتا ہے۔
اپنی بھول بھلیوں میں
کھو جانے والے
مسافروں کی واپسی کا!

☆☆=====☆☆

تاریخ تھی سولہ جولائی۔ دن تھا اتوار کا۔ سن تھا 2016 اور وقت تھارات کے ساڑھے گیارہ بجے جب وہ تینوں یکے بعد دیگرے
زینے چڑھ کے اوپر آئے تھے۔

سن باؤ کا گھر پہلی نظر میں پہچانا نہیں گیا۔ یہ قدیم صحن اور گھر جیسا نہ تھا۔ برشے مرمت اور تزئین و آرائش کے بعد نئی بنا دی گئی تھی۔
مصنوعی سی۔ سوائے جسم کے۔ وہ چند ایک جگہوں سے ذرا ٹوٹا ہوا تھا، مگر یوں لگتا تھا کہ ماہرین بار بار اس کی Repairing کرتے تھے
۔ کنواں بھی اب مصنوعی سا لگتا تھا کیونکہ وقت خود مصنوعی سا ہو گیا تھا۔

اور ہاں.... تالیہ نے آنکھیں موندے، ہانہیں پھیلائے، فضا کو سونگھا.... کوئی بو نہ تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس فضا میں Cesium بھی تھا۔
”چھ سو سال گزر گئے!“ اس نے آنکھیں کھولیں اور پیروں پہ گول گول گھومی۔ چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
”پانچ سو ستاون سال“ چے تالیہ۔ ”ایڈم ٹی وی بند کر کے واپس صحن کی طرف آیا تو اس کے چہرے پہ بھی الوہی خوشی تھی۔ فاتح ان دونوں
کو دیکھ کے بس ذرا سا مسکرایا۔ وہ نہ کسی چیز کو دیکھ رہا تھا نہ فضا کو سونگھ رہا تھا۔ وہ بس ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
دھیرے دھیرے تالیہ کو باہر شور سنائی دینے لگا۔ بہت سی آوازیں، بے ہنگم موسیقی۔ گاڑیوں کے ہارن، ہر طرح کی بولیاں۔ اس کے
تاثرات بدلے۔ قدرے فکر مندی سے بند دروازے کو دیکھا۔

”یہ شور کیوں ہے اتنا۔“

”یہ 2016 ہے چے تالیہ۔ یہاں ہمیشہ ہی اتنا شور تھا۔ آپ قدیم زمانے کی خاموشی کی عادی ہو گئی تھیں۔“ پھر اس نے فاتح کی طرف
دیکھا۔ ”سر آپ نے تو آج کے ایل واپس جانا تھا۔“ اسے سب یاد تھا۔ ”بلکہ آپ جا رہے تھے تو میں نے آپ کو روکا تھا۔“

”نہیں میں آج رات ادھر ہی رہوں گا۔ میں تھکا ہوا ہوں۔“ فاتح نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تو ایڈم لمحے بھر کو خاموش ہو گیا۔ تالیہ نے شور کے باعث جھرجھری سی لی۔

”کیا کے ایل میں ہمیشہ اتنا شور تھا؟ انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا سے کیا بنتا جا رہا ہے۔“ اسی اثناء میں باہر پولیس کے سائرن سنائی دیے۔ تالیہ چونکی۔ ”کیا میرے کان بچ رہے ہیں۔“ ”نہیں ایڈم نے جانے سے پہلے پولیس کو بلایا تھا۔ تمہیں گرفتار کروانے۔“ فاتح نے گہری سانس لی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ”میرا نہیں خیال اب ایڈم تمہیں گرفتار کروانا چاہے گا اس لئے میں ذرا ان کو فارغ کرتا ہوں۔ تم لوگ اندر ہی رہو۔“ ایڈم ساتھ آنے لگا تو اس نے سختی سے منع کیا۔ ایڈم رک گیا۔ اسے ذرا خفت ہوئی۔

”ایڈم مجھے گرفتار کروانے کا سوچے تو سہی۔“ تالیہ نے کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے گھور کے اسے دیکھا۔ ایڈم جواب میں کچھ تیکھا سا کہنے لگا، پھر مجسمے کے قدموں تلے زمین کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ایڈم کی آنکھوں میں سوال اتر ا۔ (کب؟)

”دھیرج... ابھی کافی وقت ہے ہمارے پاس۔“ وہ مسکرا کے سرگوشی میں بولی۔ فاتح پولیس والوں سے معذرت کر کے واپس آیا تو اتنا ہی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ سیدھا برآمدے کی طرف چلا گیا۔ وہاں میز پر لکھنے کا سامان رکھا تھا۔ اس نے نوٹ پیڈ اٹھایا اور قلم کھولا میز پر جھکے کھڑے سرسری سا پوچھا۔

”ایڈم تمہارا ای میل ایڈریس کیا ہے؟“ ایک دم مخاطب کیے جانے پر ایڈم گڑبڑایا۔ ”جی؟“ ”ہمارے موبائلز تو جنگل میں چار ماہ پہلے ناکارہ ہو گئے تھے۔ تم سے ابھی رابطہ تو ای میل پر کرنا ہو گا۔“ ”جی جی سر... لکھیں۔“ وہ جلدی سے بتانے لگا۔

”اور میرا ای میل ہے...“ وہ بھی کہنے لگی تو فاتح قلم بند کر کے سیدھا ہوا۔ ”اس کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ اب جاؤ۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ اور اس کے اعصاب بالکل پرسکون تھے۔ آنکھیں بے تاثر تھیں۔ برآمدے میں روشنی تھی اور وہ روشنی میں کھڑا تھا۔ دونوں پہلوؤں پر ہاتھ جمائے وہ اب ان کو یوں منتظر سا دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو اب جاؤ، میں تھکا ہوا ہوں۔

”جی بالکل۔ آپ آرام کریں۔ ہم اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔“ وہ سمجھنے والے انداز میں بولی۔ ”شکریہ! فاتح نے سر کو خم دیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں بے تاثر تھیں۔

ایڈم نے سلام کیا (فاتح نے اسے نہیں دیکھا) اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی مڑنے لگی تو وہ بولا۔ ”تالیہ!“ وہ ٹھہری اور مڑ کے سیاہ آنکھوں میں سادگی لئے اسے دیکھا۔ ”جی؟“

فاتح چند قدم چل کے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ اس کی گردن میں پہنی سنہری چابی صاف دیکھ سکتی تھی۔ وہ چمک رہی تھی۔
 ”میں صبح ہونے سے پہلے پیپرز ایڈم کو بھیج دوں گا۔ کوئی ثبوت ہونا چاہیے مارشیل توڑنے کا۔ تم آزاد ہوگی۔ اپنی زندگی اپنے اصل کے
 ساتھ گزارنا۔ اور اتنا ہیچ بولنا کہ تمہاری ہر بات پہ لوگ آنکھیں بند کر کے یقین کرنے لگ جائیں۔ ٹھیک ہے نا تالیہ؟“ وہ اس رات کی طرح
 نرمی سے نہیں سمجھا رہا تھا۔ بس بے تاثر انداز تھا اس کا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

”کیا کچھ ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں اس کو سنو یا درکھو۔ جو تم نے سیکھا ہے اس کو تم نہیں بھلاؤ گی۔ تم اپنی زندگی نئے طریقے سے شروع کرو گی۔ تم وہ
 عورت بنو گی جس کو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے انسان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تالیہ بہت مراد....“ اس نے دھیرے سے اس
 کے دونوں ہاتھ تھامے اور ان کو اکٹھا کر کے سامنے کیا۔ وہ شل رہ گئی۔

”میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو.... مجھے تمہاری اور تمہیں میری ضرورت ہے لیکن مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ یہ خود غرضی ہوگی
 ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے آزادی کے بعد امریکہ چلی جاؤ اور ایک اچھی زندگی گزارو۔“

اس کے ہاتھ فاتح کے ہاتھوں میں تھے اور وہ دم سادھے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا آپ مجھے یاد کریں گے؟“ اس کی آنکھیں یوں نہی بھینگنے لگی۔

”مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ تم کبھی بھی واپس قدم ملا کہ میں جانے کی کوشش نہیں کروں گی۔“

”میں پاگل ہوں جو واپس جاؤں گی؟“

”چاہے کچھ بھی ہو جائے... تم... واپس نہیں جاؤ گی۔ تم یہاں سے دور چلی جانا۔ تم ہماری اس دنیا میں شہزادیوں کی طرح رہنا لیکن کبھی
 قدیم ملاکہ کی شہزادی بننے کا مت سوچنا۔ کسی کے لئے نہیں۔ وان فاتح کے لئے بھی نہیں۔“

اس کی بھگی آنکھیں فاتح کے بے تاثر مگر تکان زدہ چہرے پہ جمی تھیں۔ ”آپ کو کیوں لگتا ہے میں واپس جانے کا سوچوں گی؟“

”تم کبھی اس چابی کو دوبارہ نہیں ڈھونڈو گی۔ بھلے جتنی شدت سے تمہارے اندر واپسی کی تڑپ اٹھے... تم تالیہ... تم واپس نہیں جاؤ گی
 ۔“ وہ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

”آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں جیسے آپ مجھے چھوڑ کے کہیں دور جا رہے ہوں۔“

فاتح نے دھیرے سے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ”میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں کے ایل میں ہی رہوں گا۔ میں ایک خود غرض آدمی ہوں
 تالیہ۔ وان فاتح کو صرف وان فاتح سے محبت ہے۔ انکیشن کا سال شروع ہونے والا ہے۔ میرے خواب اور میرے عزائم کی تکمیل کا سال
 ہے یہ۔ مجھے بہت کام کرنا ہے اس سال۔ میں اپنے سفر میں کھو جاؤں گا اور میں تمہیں یاد نہیں کر پاؤں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میری ان
 باتوں کو کبھی نہ بھلاؤ۔“

”میں بھلا بھی نہیں سکتی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنسو پھسل کے گال پہ لڑھکا۔ پھر دروازے کو دیکھا۔ اس کے پار ایڈم رکاکھڑا تھا۔

وہ واپس جانے کو مڑی تو فاتح نے پکارا۔ ”ایڈم کا خیال رکھنا۔ قدیم ملا کہ میں اس کا دل ٹوٹا تھا۔ کوشش کرنا کہ کے ایل میں آ کے وہ اپنے دل اور ذات دونوں کو جوڑنا سیکھ لے۔“

تالیہ نے بس سر ہلادیا۔ وہ نہیں مڑی۔ اسے پتھر نہیں بننا تھا۔

بابر کھڑے ایڈم کو ان الفاظ نے سن کر دیا تھا۔ اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ (تو فاتح جانتا تھا؟)

”سنو۔ تمہارا دل کیوں ٹوٹا ملا کہ میں؟“ وہ بابر نکلتے ہی اس پہ گرجی۔ ساتھ ہی گیلی آنکھیں رگڑ کے صاف کیں۔

”میرے دل کو چھوڑیں۔ اپنے کی فکر کریں۔ جب وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے آپ کو چھوڑیں گے تو آپ کا دل بھی ٹوٹے گا۔“ وہ جل کے بولا اور قدم بڑھا دیے۔

”میرا دل تو مجھے تلے دفن ہے، شاہی مورخ۔ میرا خزانہ میرا مستقبل۔“ وہ پھر سے خوشگوار موڈ میں آگئی تھی، جیسے بارش کے بعد سارا منظر صاف ہو جاتا ہے۔

بابر سڑک کے دونوں اطراف کی دکانیں اور ریسٹوران ابھی تک کھلے تھے۔ شور و آوازیں۔ سڑک پہ چلتی گاڑیاں۔ وہ باہر آئی تو ایک دم گھبرا گئی۔ دل پہ ہاتھ رکھا۔

”یہ کیسی عجیب جگہ ہے۔“ سڑک بمشکل پار کی اور جھرجھری لے کے ایڈم سے بولی۔

پھر اس ریسٹوران کے سامنے رکی۔ باہر میز کرسی اسی طرح لگی تھی اور اس پہاٹ چاکلیٹ رکھا تھا۔ بل اس نے ادا نہیں کیا تھا، اسلئے ویٹر نے ہاٹ چاکلیٹ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ابھی تک تازہ تھا۔

یہ اس نے آرڈر کیا تھا۔ آدھ گھنٹہ پہلے۔ یا پھر... چار ماہ پہلے۔ وقت کے سارے حساب وہ کتاب الٹے ہو گئے تھے۔ وہ ادا سی سے مسکرا دی اور آگے بڑھ گئی۔ اس کی کار وہیں کھڑی تھی۔

”سنو... تم میرے ساتھ آنا... بس سے مت جانا۔ میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں گی۔“ فراخ دلی سے پیش کش کی۔

”میں اس حنیہ اور اس گندے میلے چہرے کے ساتھ بس میں جا بھی نہیں رہا۔“

وہ کار کے قریب آئی تو یاد آیا۔ چابی... چابی کہاں گئی؟ پرس کہاں گیا؟ شاید ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تو جنگل میں کھو گئی تھی جب ان کو قیدی بنا کے ان کا سامان ضبط کیا گیا تھا۔ اس نے بے اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔ اب اتنے لوگوں کے سامنے وہ کار کو ”کسی اور طریقے“ سے نہیں کھول سکتی تھی۔

”چلو کسی ریسٹوران سے منہ ہاتھ دھو لیتے ہیں اور پھر ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ بس کا ٹکٹ کیسے خریدیں گے

”نیکسی کو گھر کے پاس اتار کے میں پیسے اندر سے لا دوں گی۔“

”دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ نیکسی والا بہت پیسے لے گا۔“

”بے فکر رہو، ہم بہت جلد بہت امیر ہونے والے ہیں۔“ وہ واقعی بے فکر سی آگے بڑھ گئی۔

”آپ کو ان فاتح کا انداز کچھ عجیب سا نہیں لگا۔“ وہ ساتھ چلتا الجھا ہوا سا کہہ رہا تھا۔ کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔

”انہوں نے اپنی بیوی کو سمجھو دھوکہ دے کر ایک شہزادی سے نکاح کیا ہے۔ وہ اس نکاح کو ختم کرنے تک ڈسٹرب رہیں گے، ایڈم۔ سمجھا کرو۔“ وہ خود کو مطمئن کر چکی تھی۔

جدید ملاکہ کے بازار میں شہزادی اور مورخ ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔

☆☆=====☆☆

نیکسی نے ایڈم بن محمد کو اس کے گھر کے باہر اتار تو اس کے نکلنے سے قبل تالیہ نے تاکید کی تھی۔

”صبح اپنی سم نکلوا لینا اور نیا فون لے لینا۔ میں کال کروں گی۔ تمہارا نمبر میرے آئی کلاؤڈ میں محفوظ ہو گا۔“

نیکسی ڈرائیو نے بیک ویو مرر میں اس لڑکی کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پہ بیٹھی باہر نکلتے نو جوان کو ہدایت دے رہی تھی۔ بندھے بال رف ہو رہے تھے۔ سوتی سادہ باجو کرنگ پہنے وہ کسی لمبے سفر سے لوٹی لگتی تھی۔ اور وہ نو جوان... ڈرائیو نے ایک تنقیدی نظر اس پہ ڈالی جو ”اچھا“ کہتا اوروازہ بند کر رہا تھا۔ اس کا لباس زیادہ عجیب تھا۔ پاجامہ اور قمیض بے ڈھنگی سی ملی تھی اور اوپر بنا آستین کے نیلی جیکٹ۔ بال بھی کانوں سے نیچے تک آ رہے تھے جیسے کافی دن سے کٹوانے کی زحمت نہ کی ہو۔ ان دونوں کے لباس اور جوتوں پہ جگہ جگہ کانٹے اور مٹی لگی تھی۔ چہرے شاید دھولیے تھے۔

”آپ کہاں سے آئی ہیں؟“ سڑک پہ کار ڈالتے ہوئے وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

پچھلے بیٹھی تالیہ نے کھڑکی سے نظر ہٹا کے اس کے سر کی پشت کو دیکھا۔ ”ملا کہ سے۔“

”کوئی حادثہ وغیرہ ہو گیا تھا کیا؟ یعنی.... کار وغیرہ چھن گئی؟“

”ہاں، حادثہ ہو گیا تھا، مگر شکر ہے جان بچ گئی۔“ وہ واپس شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

کار اب مرکزی شاہراہ پہ آ چکی تھی۔

جگمگاتی آسمان کو چھوتی عمارتیں... سڑک کنارے لگی جم جم کرتی بتیاں.... بھاگتی ٹریفک.... وہ بس مسخوری ہو کے کوالا لپور کی مسروف زندگی کو دیکھ رہی تھی۔

یہ کیسی دنیا تھی جہاں ہر کوئی بھاگ رہا تھا... سب کو جلدی تھی...

کام ختم کرنے کی جلدی.... نیا کام شروع کرنے کی جلدی.... کامیاب ہو جانے کی جلدی... اچھا بن جانے کی جلدی... ہر کام میں

جلدی...

کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ ہر چیز ایک کٹھن عمل سے گزر کے مکمل ہوتی ہے؟

بر کام میں وقت لگتا ہے۔ اور لگنا بھی چاہیے۔

مگر ان لوگوں کا وقت پہ زور نہیں چلتا، یہ اس کدوک نہیں سکتے سوا اپنی رفتار تیز کر دینا چاہتے ہیں۔

لیکن شاید وقت کو روکنا ضروری نہیں ہوتا۔

ضروری صرف ایک ایک لمحے کو جی لینا ہے۔ اسے ضائع کیے بغیر۔

اس نے شیشہ گرا دیا اور کے ایل کی ٹھنڈی ہوا کو اپنے چہرے سے کھینچنے کی اجازت دے دی۔ پھر آنکھیں موند لیں۔

وقت۔ سارے کھیل وقت کے ہی تو تھے۔

کسی کا اس پہ زور نہیں چلتا تھا۔

☆☆=====☆☆

کے ایل پہ سترہ جولائی کی صبح طلوع ہوئی تو شہر کے سارے پھول مہک مہک اٹھے۔ آج آسمان صاف تھا۔ بارش کا کوئی امکان نہ تھا۔

تالیہ نے اپنے کمرے کے پردے ہٹائے تو کھڑکی بے نقاب ہوئی اور ڈھیر ساری روشنی اندر آئی۔ اس نے آنکھیں چندھیا لیں۔

ایک نئی صبح... ایک نئی زندگی... ایک مختلف دنیا۔

وہ سادہ ٹراؤزر اور قمیض میں ملبوس کھڑی تھی۔ گیلے بال تو لیے میں لپٹے تھے۔

اس نے جیسے پانی سے اپنے وجود پہ ان چار ماہ کے تمام نشان دھو ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ چار ماہ میں سر کی جڑوں سے دوانچ جتنے سیاہ

بال نکل آئے تھے اور سنہری ڈائی نیچے چلا گیا تھا۔ اس لئے صبح صبح اٹھ کے اس نے اپنے بال واپس سنہری رنگے۔ پھر خود ہی ان کو ذرا کاٹ

کے لمبائی برابر کی تھی۔ اسی میل کھول کے یاد کیا کہ جانے سے پہلے کیا مصروفیات رہی تھیں۔ اپنے پرانے شیڈیول کو پھر سے ذہن نشین کیا

۔ عصرہ کی نیلامی سر پہ آئی کھڑی تھی۔ وہاں بھی جانا تھا۔ غرض وہ صبح تک خود کو 2016 کے کے ایل میں فٹ کر چکی تھی۔

مگر کیا واقعی؟

وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی تو سارا گھر نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ گوکہ ہر شے وہیں تھی، مگر احساس نیا تھا۔ ریلنگ کی ٹھنڈی لکڑی پہ ہاتھ

گزارتی.... پینٹ شدہ دیواروں اور جا بجا لگے شیشوں پہ نظر دوڑاتی، اس نے آخری زینے پہ قدم رکھا تو سامنے صوفے پہ داتن بیٹھی تھی۔

میز پہ پلیٹ میں کوئی مرغن ڈش اور فرنیچ فراتر سجائے وہ چھری کانٹے سے جھک کے کھانے میں مشغول تھی۔ اسے دیکھ کے ابھی سر

اٹھایا ہی تھا کہ تالیہ تیزی سے اس کی طرف بھاگی اور اس کو گلے لگایا۔

”اوہ لیا نہ صابری۔ میری موٹی مرغی... تم کیسی ہو۔“ خوشگوار حیرت کے ساتھ کہتی وہ علیحدہ ہوئی تو داتن نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا

دماغ چل گیا ہو۔ پھر سمجھ کے گہری سانس لی۔

”کیا چاہیے تمہیں؟“ مشکوک نظر اس پہ ڈالی مگر تالیہ کا موڈ اتنا اچھا تھا کہ اس نے بس مسکرا کے شانے اچکا دیے اور اس کی پلیٹ سے آلو کا چپس اٹھا کے منہ میں رکھا۔

”بس تمہیں اچانک سے اپنے گھر میں دیکھا تو محبت کا اظہار کر ڈالا۔ چاہیے کچھ نہیں۔“

”اچانک مطلب؟ میں تو روز ہی ادھر ہوتی ہوں۔“

تالیہ نے جواب دیے بنا چسپس اور اٹھائے۔ پھر محسوس کیا، وا تن اس کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ذرا سنبھلی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”تم کچھ... مختلف لگ رہی ہو۔“ واٹن ذرا الجھی تھی۔

”اچھا؟ وہ کیسے؟“ اس نے سرسری سے انداز میں بے پرواہی سے کہا تو واٹن سے سر جھٹکا۔

”تمہارا وزن شاید بڑھنے لگا ہے، تالیہ۔ گال ذرا پھولے لگ رہے ہیں۔“ وہ جواگے چپس کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی، رک گئی۔ ”ہاں، میں کھانے بہت لگی ہوں۔ دو دن احتیاط نہ کروں تو تمہارے جیسی ہو جاؤں گی۔ اف۔“ جھمر جھمری لے کر اٹھی اور واٹن سے نگاہ ملائے بغیر اوپن کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”رات میں نے تمہیں اتنی کالز کیں۔ تم نے فون نہیں اٹھایا۔“

”ہاں وہ میرا فون کھو گیا تھا۔ ملا کہ میں۔“ وہ چولہے تک آئی اور غائب و ماغی سے برتنوں کو دیکھا۔ کون سی چیز کہاں رکھی تھی؟ کون سے بٹن سے کون سا برنر چلتا تھا؟ قہوہ کیسے بنائے؟ مگر قہوہ کہاں سے آگیا؟ اف وہ پہلے کس چیز سے ناشتہ کیا کرتی تھی؟

”تم ملا کہ کیوں گئیں؟“ داتن نے افسوس سے اس کی پشت کو دیکھا۔ ”تم اس خزانے کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔ اس ملعون چابی کو مکمل کرنے کی کوشش...“

”میں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔“ وہ اس کی طرف گھومی اور کاؤنٹر سے ٹیک لگائے ساوگی سے بولی۔ ”مجھے یقین آ گیا ہے۔ وہ چابی“
وہ خزانہ وہ سب ملعون ہے۔ میں اب اس کا پیچھا نہیں کروں گی۔ خوش؟“

داتن نے ابرو بھنج کے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”ارے واہ اتنی جلدی مان گئیں تم؟“

”ہوں!“ اس نے شانے اچکائے اور واپس گھوم گئی۔ دھیرے دھیرے کچن کی ترتیب یاد آتی جا رہی تھی۔

”کوئی بات ہے، تالیہ؟“ داتن ذرا اچنبھے سے اس کو کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ ”کل تک تم دیوانی ہو رہی تھیں، اس خزانے کے لئے اور آج....“

”اف داتن!“ وہ مڑے بغیر برتن پٹخ پٹخ کرتی مصنوعی ناگواری سے بولی۔ ”ایک تو تمہاری بات مان رہی ہوں، اوپر سے...“

”یہ انگٹھی کہاں سے لی؟ دکھاؤ!“ لیانہ صابری کو اس کے برتن پیٹتے ہاتھوں میں وہ انگٹھی اب نظر آئی۔ ذرا سی جھلک نے اس کی جوہری جیسی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ وہ انگٹھی اور تیزی سے لپک کے تالیہ کے سامنے آئی۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کے بے یقینی سے اس انگٹھی کو دیکھا۔ سرخ آنسو شکل یا قوت کے گرد ننھے ہیرے لگے تھے۔ انگٹھی سونے کی تھی اور سونا بھی چوڑا اور بھاری تھا۔ داتن نے اس کی انگلی سے سرعت سے انگٹھی نکالی اور اوپر کر کے روشنی میں اسے دیکھا۔

”میرے خدا.... یہ تو بہت قیمتی ہے۔ یہ نئی خریدی ہے کیا تم نے۔“ وہ انکشت بدنداں رہ گئی تھی۔

”تالیہ نے پہلے کبھی زیور ”خریدا“ ہے جواب خریدے گی؟ لاؤ واپس کرو۔“ تروٹھے پن سے کہتے اس نے انگٹھی واپس لی اور انگلی میں ڈالی۔

”میں سمجھ گئی!“ داتن نے پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے اس کو مشکوک نظروں سے گھورا تو تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”کیا؟“ دل زور سے دھڑکا۔

”تم نے خزانے کا خیال اس لئے ذہن سے نکال دیا ہے کیونکہ تمہیں کسی اور واردات کا موقع مل گیا ہے۔ یہ تم نے کسی کی چرائی ہے نا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ جلدی بتاؤ کیا معاملہ ہے۔“

”تم جانتی ہو کہ جب تک میں خود نہ بتانا چاہوں تم مجھ سے نہیں اگلا سکتیں اس لئے کیوں نا ہم ابھی بیٹھ کے ناشتہ کریں۔ اچھے دوستوں کی طرح۔“ اس نے نرمی سے داتن کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا تو اس نے شک بھری نظروں سے تالیہ کو دیکھا۔

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو تالیہ۔“

”ظاہر ہے میں تم سے کچھ چھپا رہی ہوں۔ لیکن ابھی میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی مجھے زیادہ بڑے مسئلے درپیش ہیں۔“

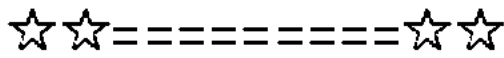
”اوہ ہاں۔ سمجھ جیسے۔“ داتن سنجیدہ ہوئی۔

”سمجھ؟“ تالیہ نے یاد کرنا چاہا۔ (سمجھ کا کیا مسئلہ تھا؟)

اور پھر جھماکے سے یاد آیا۔ سمجھ... اس کا سابقہ شوہر... اس کو دھمکا رہا تھا۔ پیسے مانگ رہا تھا اور نہ وہ وان فاتح اور اشعر کو بتادے گا کہ وہ کوئی امیرزادی نہیں ہے بلکہ طلاق یافتہ اور.... وہ ایک دم ہنس پڑی۔

اب یہ ساری باتیں ثانوی ہو گئی تھیں۔ فاتح کو چار ماہ پہلے جنگل میں اس نے سب بتا دیا تھا اور وہ دونوں اتنا آگے نکل آئے تھے کہ ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

”سمجھ...“ وہ مسکرا کے سر جھٹکتی قبوہ پیالی میں انڈیلنے لگی۔ کاؤٹر سے ٹیک لگائے کھڑی داتن ہنوز خفگی اور شک بھری نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھیں۔



ایڈم بن محمد کے چھوٹے سے گھر پہ صبح روشن ہو چکی تھی۔ مرغیاں اپنے ڈربے میں کٹ کٹا رہی تھیں اور بلی دھوپ سے چمکتی دیوار پہ سو رہی تھی۔

اندر کچن میں ناشتے کی اشتہاء انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ گول میز کے گرد محمد بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے اور ایبو (ماں) چولہے کے سامنے کھڑی تھی۔ سر پہ اسکارف لپیٹے ڈھیلے ڈھالے باجو کرنگ میں ملبوس وہ آستین اوپر چڑھائے کام میں مصروف تھی۔

”ایڈم کہاں ہے؟“ محمد صاحب نے چونک کے ایک دم پوچھا تو ایبو پلٹی اور سادگی سے ان کو دیکھ کے بولی۔

”کل اچانک سے ملا کہ چلا گیا تھا۔ رات دیر سے واپس آیا۔ میں کھانا گرم کرنے اٹھی مگر کمرے میں چلا گیا اور اندر سے آواز لگا دی کہ تھکا ہوا ہے سونا چاہتا ہے۔ میں نے بھی تنگ نہیں کیا۔“

”اور اب؟“

”اب صبح سویرے جب میں باتھ روم میں تھی تو باہر جانے کی آواز آئی تھی۔ لو آ گیا۔“

اسی اثناء میں راہداری کا دروازہ کھلا تو ایبو نے گہری سانس لی۔ ”ایڈم... ناشتہ لگ گیا ہے۔ ادھر آ جاؤ۔“ ساتھ ہی آواز دی۔

محمد صاحب اخبار پڑھتے ہوئے چائے پیتے رہے۔ دفعتاً ایڈم اندر داخل ہوا اور سلام کہہ کے نظر ملائے بغیر کرسی کھینچی۔

ایبو نے اس کے لیے فرائیڈ رائس پلیٹ میں نکالے اور میز تک آئی تو لمحے بھر کو دھک سے رہ گئی۔ ”یا اللہ ایڈم... یہ بالوں کو کیا کیا؟“

محمد صاحب نے بھی چونک کے اسے دیکھا۔

وہ سادہ ٹی شرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا۔ چہرہ سنجیدہ تھا اور بال... بال بالکل چھوٹے کٹوائے تھے۔ ”کل“ سے پہلے جتنے بال تھے اس سے بھی کافی چھوٹے۔

”یونہی ماں۔ گرمی بڑھ گئی ہے۔ تو سوچا... بال کٹوا لوں۔“ وہ مسکرا کے تازہ دم سا بولا۔

”چلو... اچھا کیا۔ بال کٹوانے سے تمہاری رنگت کتنی صاف نکل آئی ہے۔“

محمد صاحب نے بھی ایک تائیدی نظر اس پہ ڈالی اور اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایڈم نے بس سعادت مندی سے سر ہلایا۔ ”بس

ماں... صرف بالوں کی وجہ سے لگ رہا ہے۔ ورنہ رنگت تو ایسی ہی تھی پہلے بھی۔“ نظریں چرا کے پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔ ناسی لیمہ کی

خوشبو بھوک بڑھا رہی تھی۔ چاولوں کے ساتھ مونگ پھلی کا سالن۔ اس نے ایک چمچ منہ میں ڈالا تو ماں کے ہاتھ کا ذائقہ یاد آیا۔ ساتھ ہی

قدیم ملاکہ کے سارے کھانے۔ گراس ہو پرز سے محل کے لوازمات تک۔ ایک فلم سی چل گئی۔

”قاتح صاحب سے جو بات کرنے گئے تھے وہ کر لی؟“

”وہ....“ ایڈم نے نوالہ نگلتے ہوئے یاد کیا۔ ”ہاں جی وہ کر لی۔“

”کون سی بات؟“ محمد صاحب نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا تو ایبو سامنے والی کرسی کھینچتے ہوئے بولی۔

”کل جلدی میں جب نکلا تھا تو کہہ رہا تھا کہ وہ جو امیر زادی فاتح صاحب کے خاندان کو ٹکرائی ہے اس کی اصلیت کھولنے جا رہا ہے۔ وہ شاید کوئی مجرمانہ عزائم رکھتی تھی۔“

”اوہ! ایسے لوگوں کو ضرور بے نقاب کرنا چاہیے۔ تم نے اچھا کیا!“

ایڈم نے زور سے گلاس میز پر رکھا۔

”وہ... وہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ جلدی سے تردید کی۔ گال گلابی ہو گئے۔

”مگر تم خود تو کہہ رہے تھے کہ اس کو تم نے نوکرائی بنے دیکھا تھا اور اب وہ امیر بننے کی اداکاری کر رہی ہے۔“

”وہ... نوکرائی... نہیں ہے ایبو۔ وہ واقعی... واقعی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ سمجھ لیں ملک کے سب سے اعلیٰ خاندان سے۔“

اس کو وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے وہ سچ کے دائرے میں رہ کے اپنا راز محفوظ رکھتے ہوئے جواب دے سکے۔

”یا اللہ ایڈم... اگر ایسی بات تھی تو اتنے دن سے خود کو پریشان کیوں کر رہے تھے اس کے پیچھے؟“

”میں چلتا ہوں ایبو۔“ وہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مزید بیٹھارہا تو شاید گھبرا جائے۔ وہ تو اس ڈر سے ماں باپ سے

گلے بھی نہ ملا تھا کہ وہ شک میں نہ پڑ جائیں۔

”نوکری ڈھونڈنے جا رہے ہو؟“

سوال پہ وہ ٹھٹکا۔ نوکری؟ اس کے پاس نوکری نہ تھی؟

وہ بے روزگار تھا؟ وہ شاہانہ وظیفے پہ مامور شاہی مورخ نہ تھا؟

اوہ... اسے تو اس دنیا میں نوکری بھی ڈھونڈنی تھی اور اس کی شادی بھی ہونا تھی۔ ایک دم کندھوں پہ بہت سا بوجھ آن گرا۔

”آ... جی... میں...“ وہ ہکلا یا۔ پھر باپ کو دیکھا۔ ”باپا... مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے، موبائل گم گیا ہے تو نیا لینا ہے۔“

”کیسے گم گیا؟“ انہوں نے اخبار رکھی، ٹوہ نکالتے ہوئے پوچھا۔

”ملا کہ میں چھن گیا۔“ اس نے تھوک نکالا۔ پیسے لے کر اس کو جلد از جلد گھر سے نکلتا تھا تا کہ وہ سنبھل سکے۔ وہ تو ان سے نظریں تک نہیں

ملا پارہا تھا۔

2016 کا ایل پہلے کبھی اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج لگ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

کے ایل پہ دوپہر اتری تو پارک کی جھیل دھوپ میں چمکنے لگی۔ اطراف میں دور دور تک گھاس پھیلا تھا۔ ایک طرف درخت تھے اور

سامنے لمبا ٹریک۔ ٹریک کے ساتھ بنچ رکھا تھا جس پہ وہ بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں نیا فون پکڑ رکھا تھا۔ سیاہ لمبی اسکرٹ بلاؤز پہ سرخ منی کوٹ پہنے

’سنہری بالوں کو کھولے، سر پہ تر چھا کر کے سفید ہیٹ پہنے، وہ منتظری دائیں طرف ٹریک کو دیکھ رہی تھی جب بائیں طرف سے ایڈم چلتا ہوا آیا اور اس کے ساتھ بیٹھا۔

تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

ڈریس شرٹ پہنے، کف کے بٹن بند کیے، چھوٹے چھوٹے بالوں میں وہ سنجیدہ سا نظر آتا تھا۔

”تم مجھے تعظیم پیش کیے بغیر ہی بیٹھ گئے۔“ شہزادی کی طبع پہ یہ بات ناگوار گزری تھی۔ ایڈم نے جل کے اسے دیکھا۔

”آپ غالباً ابھی تک قدیم ملاکہ سے واپس نہیں آئیں۔“ طنز کر کے بولا تو اس نے گہری سانس لی اور جھیل کود دیکھنے لگی۔

”شاید واقعی... میں واپس نہیں آئی۔ ذہن ابھی تک اسی جگہ مقید ہے۔ خوشی سے نہیں، عادت سے۔ کے ایل کو دوبارہ سمجھنے میں ذرا وقت

لگے گا۔“

اس کی بات ایڈم کو بھی اداس کر گئی۔

”میں نے تو بال اس لئے کٹوا لیا کہ سب کی نظریں بالوں پہ جائیں اور رنگ پہ نہیں۔ مگر ماں نے فوراً سے بھانپ لیا کہ میری رنگت

اچھی ہو گئی ہے۔“

”ہاں.... چھ سو سال پہلے کی خالص خوراک نے ہمیں کافی صحت مند بنا دیا ہے۔“

”پانچ سو ستاون سال، چھ تالیہ۔“ وہ بگڑ کے بولا۔ تالیہ نے پہلے اسے گھورا۔ پھر اس کے دائیں ہاتھ کو۔ لیکن پھر ضبط کے گھونٹ بھر کے

رہ گئی۔

”کبھی کبھی سچ بولنا کتنا مشکل ہوتا ہے، چھ تالیہ۔ میں چاہ کے بھی ماں اور باپا کو نہیں بتا سکتا کہ میں کل ایک رات میں کن زمانوں سے

پھر آیا ہوں۔“

”میں بھی داتن کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ کوئی ہمارا یقین نہیں کرے گا ایڈم۔“

”آپ تو شاید اتنے رازوں کے ساتھ رہ سکتی ہیں مگر میرے لئے یہ چھپانا مشکل ہے۔ اس لئے کچھ وقت گھر سے باہر رہوں گا تاکہ

جب تک مارٹل نہیں ہو جاتا، ماں سے کم سے کم سامنا ہو۔“ پھر اس نے یاسیت سے تالیہ کو دیکھا۔ ”ہم مارٹل ہو جائیں گے نا، چھ تالیہ؟“

وہ جواباً اسے دیکھ کے مسکرائی۔

”وقت سب سے بڑا امر ہم ہے ایڈم۔ وقت بہت کچھ خود ہی ٹھیک کر دیتا ہے۔“

”وقت!“ ایڈم نے گہری سانس لی۔

”تمہاری وان فاتح سے بات ہوئی؟“ اسے خیال آیا تو پوچھنے لگی۔ ایڈم نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھ سے ان کا نمبر کھو گیا ہے۔ آپ کی طرح کوئی آئی کلاؤڈ کاؤنٹ تو ہے نہیں مجھ غریب کا جو سارے کانیکشن محفوظ ہوں۔ اکی میل

”بھی نہیں کی انہوں نے۔ میرے پاس تو آپ کا نمبر بھی نہیں تھا۔“

”شکر مجھ امیر کے سارے کانیکشن محفوظ تھے۔ اسی لئے تمہیں کال کر لی۔“ جل کے بولی۔ پھر گہری سانس بھری۔ ”ان کو کال کی تھی

میں نے لیکن ان کا نمبر آف جا رہا ہے۔ امید ہے بخیریت ہوں گے۔“

”چے تالیہ۔“ ایڈم بچہ بیٹھا بیٹھا اس کی طرف گھوما۔ چہرے پہ الجھن تھی۔ ”آپ کو نہیں لگتا وہ ان فاتح ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”مجھے لگتا ہے وہ ڈسٹرب ہیں۔ انہوں نے اپنی بیوی کو....“

”اگر وہ بیوی کی وجہ سے ڈسٹرب ہیں تو اس دن ہوتے جب آپ سے نکاح کیا تھا۔ مگر وہ اس وقت سے ڈسٹرب ہیں جب سے وہ مراد

رابعہ کے ساتھ سن باؤ کے گھر آئے تھے۔ یہ آپ کے ولن نما والد نے ضرور کچھ کیا ہے میں بتا رہا ہوں۔“

”مجھے بھی یہی شک ہے لیکن ایک بات میں نے ان چار ماہ میں سیکھی ہے ایڈم کہ وقت کے ساتھ سچ خود ہی سامنے آ جاتا ہے۔ وقت اور

سچ کا لین دین چلتا رہتا ہے۔“ وہ مطمئن تھی۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے۔ مجھ سے تو وہ بات ہی نہیں کر رہے تھے۔“ وہ پھر سے خفا ہوا۔

”اپنے احساس کمتری سے نکل کے جینا سیکھو ایڈم۔ اور ہم نے بھی تو ان سے خزانے والی بات چھپائی ہے نا۔ پھر اگر انہوں نے کچھ چھپا

بھی لیا تو....؟“

ایڈم نے چونک کے بچ کے دوسرے سرے پہ بیٹھی ترچھے ہیٹ والی لڑکی کو دیکھا۔

’ہاں وہ خزانہ.... وہ کب نکالیں گے ہم؟ وہ تو فاتح صاحب کے گھر میں ہے۔“

”تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ پلان اے بی، سی، سب تیار ہیں۔ نہ صرف ہم خزانہ نکالیں گے بلکہ اس کو بلیک مارکیٹ میں بیچ

کے امیر بھی ہو جائیں گے۔“

”پھر مجھے کسی نوکری کی ضرورت نہیں ہوگی۔“ ایڈم نے سکون کا سانس لیا۔

”ہاں اور پھر تم خوب شاندار طریقے سے اپنی شادی کرنا۔“

”شادی؟“ وہ چونکا۔ ”ہاں... دو ماہ بعد میری شادی ہے۔“

”مجھے کتنا الزام دیتے تھے کہ تمہاری شادی میری وجہ سے نہیں ہو پائی۔ شکر ہے اب یہ الزام تو نہیں دے سکو گے۔“

”اگر میری شادی نہ ہوئی تو الزام آپ کے ہی سر ہوگا“ چے تالیہ۔ ”وہ زیر لب بولا مگر تالیہ سن نہ سکی۔ وہ پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو رہی

تھی۔

”فاتح صاحب سے ملنے چلتے ہیں کسی دن۔ ان کے ارد گرد لوگ بہت ہوتے ہیں اس لئے یوں ایک منہ اٹھا کے نہیں جاسکتے۔ بلکہ....“

سے یاد آیا۔ ”نیلامی پہ چلتے ہیں دونوں۔ وہاں ملاقات ہو جائے گی ان سے۔ اور پھر ہم ان سے پرائیوٹ ملاقات کے لیے وقت مانگ

لیس گے۔“ پھر وہ ذرا سانس لی۔ ”وہ وان فاتح جن سے ملنے کے لئے ایک دنیا کئی کئی ہفتے پہلے سے اپائنٹمنٹ لیتی ہے، ان کو اب فوراً ہمیں اپائنٹمنٹ دینی پڑے گی۔ کیونکہ دنیا والے نہیں جانتے کہ ہم نے ایک زمانے کا سفر ایک ساتھ کیا ہے۔“ اس کے انداز پہ ایڈم بھی مسکرا کے اٹھا۔

”اچھا تو میں نیلامی میں آپ کا ہلس ون بن کے جاؤں گا۔“

تالیہ نے گھور کے اسے دیکھا۔ ”مت بھولو کہ میں شہزادی ہوں اور تم وہ قیدی جس کا...“

”جس کے دائیں ہاتھ پہ آپ بری نظر رکھنا چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا“ چے تالیہ بنت مراد۔ ”وہ اعتماد سے کہتا اس کے مقابل کھڑا ہوا۔“ یہ دو ہزار سولہ کا کے ایل ہے۔ اور ہم ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں۔ یہاں سارے شہری برابر ہوتے ہیں۔ میں اور آپ... ہم یہاں برابر ہیں۔ آپ یہاں شہزادی نہیں ہیں۔“

وہ بچ کے ساتھ کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ وسیع جھیل تھی جس کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ تالیہ نے دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہیٹ سیدھا کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکرائی۔

”شہزادی نہ سہی، میں ملک کے اگلے وزیر اعظم کی بیوی ضرور ہوں، ایڈم۔ تمہاری فرسٹ لیڈی۔ چاہے تھوڑے دن کے لئے ہی سہی۔“ ایڈم پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ دل ڈوب کے ابھرا۔

”میں چاہوں گا کہ آپ ہمیشہ فرسٹ لیڈی رہیں اور یہ مقام وہ آپ سے کبھی واپس نہ لیں۔“

”ارے چھوڑو ایڈم۔ میں ایسے خواب نہیں دیکھتی۔ بس ہم ساری عمر دوست رہیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بھلے وہ کل ہی مجھے چھوڑ دیں۔“ پھر رخ موڑ لیا۔ آنکھوں میں تکلیف سی ابھری تھی۔ ”وہ اگر تمہیں میرے لئے کوئی پیپرای میل کریں تو مجھے بتا دینا۔“ ہیٹ درست کرتی، بیگ کندھے پہ لٹکاتی، وہ ٹریک کی طرف بڑھ گئی۔

ایڈم ادا سی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ نئے زمانے کی نئی پیچیدگیاں۔

☆☆=====☆☆

نیلامی کی تقریب عصرہ اور فاتح کی رہائش گاہ پہ منعقد ہوئی تھی۔ سنہری اور سفید رنگ سے سارے میں آرائش کی گئی تھی۔ لان میں کرسیاں دو قطاروں کی صورت سجائی گئی تھیں اور درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ دوسری طرف بے ٹیبلز لگی تھیں۔ جگہ جگہ سجے سفید اور سنہری پھولوں کے گلدستے تقریب کو ایک باوقار رنگ دے رہے تھے۔

تقریب کا ابھی آغاز ہوا تھا۔ بہت سے مہمان آچکے تھے مگر بہت سوں نے آنا تھا۔ ڈرنکس سروس کی جارہی تھیں اور لوگ ٹولیوں کی صورت لان میں پھیلے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

عصرہ لان کے دہانے پہ بچھے سرخ کارپٹ پہ استقبالی انداز میں کھڑی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ساتھ موجود ملازمائیں ہر آنے

والے کو راستہ دکھاتیں۔ عصرہ کے ساتھ اس کا بیٹا سکندر کھڑا تھا۔ گیارہ سال کا لڑکا سوٹ اور ٹائی پہنے بڑا بڑا لنگ رہا تھا۔ ماں کی طرح وہ بھی مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔

تالیہ اور ایڈم جب کار سے اتر کے کھلے گیٹ سے اندر آئے تو سرخ کار پٹ کے سرے پہ کھڑی عصرہ نے دور سے ان کو دیکھ لیا تھا۔ مسکرا کے وہ چند قدم آگے آئی۔ بالوں کو نفاست سے جوڑے میں باندھے، موتیوں کی لڑی گردن میں پہنے وہ سفید اور سنہری باجو کرنگ میں ملبوس تھی اور سنہری اسٹول کندھے پہ پن سے جمار کھا تھا۔ میک اپ سے جی سنوری وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی، تالیہ کے اندر اسی پھیلنے لگی۔

عصرہ نہیں جانتیں کہ فاتح اور میں نے.... پھر اس نے سر جھٹکا اور مسکرا کے آگے بڑھی۔ عصرہ اس سے گال سے گال ٹکرا کے گلے ملی۔ پھر علیحدہ ہو کے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم بہت اچھی لگ رہی ہو تالیہ۔ تمہارے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“

تالیہ جو ابادقت سے مسکرائی۔ اس نے سنہری رنگ کی انڈین ساڑھی باندھ رکھی تھی جس کے آستین کلائی سے ذرا پیچھے تک ختم ہوتے تھے۔ سنہری بالوں کو گھنگریالہ کر کے چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ قدیم ملاکہ سے لائے گئے ننھے ناپس اور ہیرے کالا کٹ پہنے ہوئے تھی۔ عصرہ کی نظر اس کے سچے سنورے چہرے سے ہوتی زیور پہ جاٹھری.... لیکن مزید تعریف کرنا اس کی شان کے خلاف تھا۔ بس مسکرا کے ساتھ کھڑے نوجوان کو دیکھا تو چونکی۔

وہ سیاہ کوٹ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس، کٹے ہوئے بالوں والا قدرے غیر آرام دہ نظر آتا تھا، ایڈم تھا۔

”ایڈم!“ اس کے ابرو تعجب سے اٹھیں۔

”ایڈم سے آپ کی طرف ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس کی جاب ختم ہو گئی ہے۔ اب میں اس کو اپنے ساتھ رکھتی ہوں تاکہ اس کی جاب کا بندوبست کر سکوں۔ ہم اچھے دوست بن گئے ہیں اس لئے میں نے....“

”اچھا کیا تم اس کو لے آئی۔ اچھا لگا تمہیں دیکھ کے ایڈم!“ عصرہ جبراً مسکرائی۔ اگر اسے اچھا نہیں بھی لگا تھا تو اس نے ظاہر نہیں کیا۔

عصرہ دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی اور وہ دونوں آگے لان تک آئے تو ایڈم نے جھک کے سرگوشی کی۔ ”مسز عصرہ نے مجھے وقت سے پہلے نوکری سے نکال دیا تھا تاکہ میں فاتح صاحب کے سامنے ان کا بھانڈا نہ پھوڑ دوں کہ اس روز آپ کی کار میں واپس کرنے گیا تھا۔ انہوں نے فاتح صاحب کو بتایا تھا کہ کار آپ خود لینے آئی تھیں اور آپ نے فائل چرائی۔“

”مگر عصرہ کی سازشیں ناکام ہوئیں کیونکہ ہم وان فاتح کو جنگل میں ساری حقیقت بتا چکے ہیں۔ امید ہے اب تک فاتح صاحب نے گھائل غزال کو بھی نیلامی سے ہٹا دیا ہو گا کیونکہ وہ نقلی ہے اور اشعر اس کو بکوا کے عصرہ اور فاتح کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔“ تالیہ بظاہر مسکرا کے اطراف میں دیکھتی زیر لب کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں لان کے سرے پہ کھڑے تھے اور اس کی نظریں مسلسل کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

”وہ رہی آپ کی بنائی گئی پینٹنگ۔“ ایڈم نے نیلامی کی کرسیوں کے سامنے اسٹیج پہ رکھے عصرہ کے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ چونکی۔ وہ خوبصورت پورٹریٹ اپنے سارے وقار کے ساتھ آویزاں برائیک کی توجہ کھینچ رہا تھا۔ اسے بے اختیار کچھ یاد آیا۔...

(قدیم ملا کہ محل.... سبزہ زار پہ بنی لکڑی کی کیونوپی.... اس پہ براجمان ملکہ یان سو فو.... اور سامنے بیٹھی شہزادی اس کو ایک پورٹریٹ دکھا رہی تھی.... ملکہ کی تصویر....)

تالیہ نے سر جھٹکا۔ یہ قدیم ملا کہ بار بار کیوں یاد آ جاتا تھا؟

”اور وہ رہے وان فاتح۔“

”کدھرا!“ اس نے بے قراری سے ایڈم کے اشارے کے تعاقب میں دیکھا۔

قدرے فاصلے پہ ایک پھولوں سے سجاستون تھا اور اس کے ساتھ فاتح کھڑا تھا۔ اشعر اور اس کا باڈی مین عبداللہ بھی ساتھ کھڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں گلاسز تھے اور وہ کسی بارے میں بات کر رہے تھے۔

تالیہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

وہ سیاہ کوٹ کے اندر سفید شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ شیو بنائے بال دائیں طرف کو جمائے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ ازلی پرسکون انداز، ازلی شاہانہ مسکراہٹ۔ گلاس پکڑے ہاتھ پہ بینڈ تاج لگا تھا۔ چہرے کے زخم مندمل تھے البتہ کینٹی پہ مدہم سا کٹ یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔

وہ ایڈم کو یکسر بھلائے کسی خواب کی سی کیفیت میں اس کی طرف بڑھی۔ کلچ تھا، سنہری ساڑھی سنبھاتی وہ گھاس پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔

وہ جدید کے ایل میں یوں پہلی دفعہ ملیں گے۔ اتنے لوگوں کے درمیان۔

وہ اسے دیکھ کے مسکرائے گا؟

یا بعد میں ملنے کا کوئی اشارہ کرے گا؟

یا کوئی معنی خیز بات مسکرا کے کہے گا جس کا مطلب صرف وہ دونوں جانتے ہوں گے...؟

وہ قدم اٹھا رہی تھی...

اس پارٹی میں موجود یہ تمام بااثر طاقتور لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہ دونوں کس دنیا کے ساتھی تھے....

وہ قریب آرہی تھی جب کوئی صاحب آئے اور فاتح سے ہاتھ ملایا۔ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ تھامتا تو ان کی نظر اس کے پٹی زدہ ہاتھ پہ گئی۔ پھر کینٹی کے زخم پہ۔

”اوہ آپ ٹھیک ہیں سر؟ یہ کیا ہوا؟“

”ارے یہ کچھ نہیں ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔ ”رات کو ہاتھ روم کے لئے اٹھا تو اندھیرے کے باعث ٹھوکر لگ گئی۔“

”الیکشن قریب ہیں، سر۔ ٹھوکروں سے اجتناب کریں۔“

جواباً وہ تمام افراد ہنس دیے۔ اشعر نے تالیہ کو نہیں دیکھا تھا، وہ ان صاحب کو گرمجوشی سے ملتا نہیں لئے آگے بڑھ گیا تو پل بھر کے لئے فاتح اور باڈی مین عبداللہ تنہا رہ گئے۔ وہ قریب آچکی تھی۔ مسکرا کے ذرا سا کھنکھاری۔

”شام بخیر... تو انکو!“

وان فاتح گلاس سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ آواز پہ چہرہ موڑا، اسے دیکھا اور گلاس نیچے کیا۔ پھر سنجیدگی سے سر کو پس خم دیا۔

”آپ کو پیننگلز کی یہ نیلامی دیکھ کے کبھی خیال آتا ہے فاتح صاحب... کہ قدیم زمانوں میں انسانوں کی بھی اسی طرح نیلامی ہوا کرتی ہوگی؟“ وہ مسکراہٹ دبائے معنی خیزی سے بولی۔

فاتح نے نظریں گھما کے گہرے انداز میں دیکھا، پھر مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ کافی سرد تھی۔

”میرا جواب انکار میں ہے، تاشہ!“

”جی؟“ اس کی مسکراہٹ مٹتی۔

”نہیں، میں تمہیں اپنا گھر نہیں بیچ رہا۔ نہ میں کبھی دوبارہ تمہیں اس گھر میں خوش آمدید کہوں گا۔ اس روز تم عصرہ کے ساتھ ملا کہ آگئیں، میں خاموش رہا۔ میری چھٹی Spoil ہوئی، میں نے برداشت کیا، لیکن میں یہ نہیں بھولا کہ تم نے اشعر کے لئے اس گھر کی فائل کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اس لئے میرا جواب انکار میں ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں دونوک کہہ رہا تھا۔

وہ بالکل ٹھہر کے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں اچنبھا لئے ابرو حیرت سے اکٹھے کیے۔ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھی۔

”سوری، فاتح صاحب، مگر وہ گھر...“

تبھی عبداللہ کے ہاتھ میں پکڑا فون بجا تو اس نے جھٹ فاتح کو تھما دیا۔

وہ تالیہ کو نظر انداز کر کے فون کان سے لگائے بات کرنے لگا۔

”جی جی.... میں نے نمبر چینیج کیا ہے۔ میرا فون کہیں کھو گیا ہے، مل نہیں رہا تھا۔ جی مجھے آپ کا پیغام ملا تھا۔“ وہ مسکرا کے کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔ چلتے چلتے وہ ستون کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ اس کا سارا وجود کان بنا ہوا تھا۔

پھولوں سے ڈھکے ستون کے اس طرف کھڑے فاتح نے فون بند کر کے عبداللہ کو تھمایا تو اس نے راز داری سے پوچھا۔

”سر... مسز عصرہ نے کہا تھا یہ آج کی اسپیشل گیسٹ ہیں۔ کیا ان کے کچھ اور عزائم ہیں؟“ اس نے نہیں دیکھا تھا کہ تالیہ پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔

”کون؟ یہ تاشہ؟ ہاں یہ عصرہ کی نئی دوست ہے۔ اشعر کے ساتھ انوالوڈ ہے شاید۔ اور میزبانی عصرہ نبھاسکتی ہے، میں نہیں۔ مجھے اس لڑکی سے شدید Dishonest قسم کی دامنز آتی ہیں۔“ اکتاہٹ سے کندھے جھٹک کے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ گردن موڑ کے شل سی اس کو جاتے دیکھنے لگی۔ اس کا دل بہت آہستہ آہستہ سے دھڑک رہا تھا۔

آگے بڑھتا فاتح گھاس پہ تنہا کھڑے ایڈم کو دیکھ کے رکا۔ پھر ہلکا سا مسکرایا۔

”ایڈم! سر سے پیر تک اس کا حلیہ دیکھا۔

ایڈم بھی خوش دلی سے مسکرا کے اپنائیت سے آگے بڑھا۔ ”کیسے ہیں آپ سر؟“ اس کا چہرہ دکنے لگا تھا۔

”ایم فائن۔ تم ٹھیک ہو؟“ بس رسما مسکرا کے کہتا وہ آگے بڑھنے لگا پھر رک کے ایڈم کو دیکھا۔ ”اس روز میں تمہاری بات نہیں سن سکا تھا شاید۔ تم کیا کہنے آئے تھے؟“

”میں سر؟ کس روز؟“ ایڈم کو فوری یاد نہیں آیا۔

”جب میں ملا کہ سے جا رہا تھا تو تم نے مجھے روکا تھا۔ تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔“ وہ جیسے آگے جانا چاہتا تھا مگر مشکل سے چند لمحوں کے لئے بات کرنے رکا تھا۔

”ایڈم آپ سے بات کرنے چھٹی والے دن ملا کہ تک چلا گیا؟“ عبداللہ نے ایک جلن بھری نظر ایڈم پہ ڈالی۔

”سر میں....“ ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ٹکڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”آپ نے میری بات سن لی تھی سر۔“

”اچھا، مجھے لگا شاید وہ بات درمیان میں رہ گئی۔ عجیب تکان بھرا ایک اینڈ تھا یہ۔“

وان فاتح بن رامزل یہ کہہ کے گلاس تھامے سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔

چند ہی لمحوں میں دوسرے کئی مہمان اس کی طرف جانے لگے۔ وہ جہاں جاتا تھا وہاں محفل لگ جاتی تھی۔

صرف دو لوگ تھے جو بالکل شل تھے۔ اپنی اپنی جگہ حیران۔

”ایڈم!“ دفعتاً تالیہ اس کے قریب چلتی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کارڈ تھا۔

”یہ وان فاتح کو کیا ہوا ہے؟ شاید وہ لوگوں کے سامنے ہمیں پہچان کے کسی کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتے۔“

”ایڈم! یہ دیکھو!“ اس نے کارڈ اس کے سامنے کیا تو اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

”گھائل غزال نیلامی پہ موجود ہے۔“

”ایں؟ وان فاتح نے اس کو ہٹوایا نہیں؟“ وہ دنگ رہ گیا۔

”ایڈم!“ اس کی آنکھیں بھینگنے لگیں۔ ”اپنا ای میل دیکھو۔ انہوں نے تمہیں ای میل کی ہوگی۔“

”اوہ ہاں۔ میں نے تو اس روز سے میل نہیں دیکھی۔ نیا فون ہے نا۔ میں بھول گیا۔“ اس نے جلدی سے فون نکالا اور اچھے اچھے انداز

میں اسکرین پہ بٹن دبائے۔ وہ اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ ارد گرد غبگتے مہمانوں سے بے نیازان دونوں کی نظریں اسکرین پہ جمی تھیں۔

وان فاتح کے نام سے میل سامنے پڑی تھی۔ یہ آج صبح کی تاریخ میں وصول ہوئی تھی۔ ایڈم نے دھڑکتے دل سے اس کو دبایا۔ ایک طویل پیغام کھل گیا۔

بے قرار آنکھوں نے پڑھنا شروع کیا۔

”ڈیئر ایڈم....“

جس وقت میں یہ ای میل لکھ رہا ہوں رات کے پونے بارہ بجے ہیں اور تاریخ سولہ جولائی ہے۔ تم دونوں ابھی ابھی میرے گھر سے نکلے ہو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وانگ لی کے گھر سے۔ وہ گھر جہاں ہم نے خود کو کھوکھو کے دوبارہ پایا ہے۔

میں اس ای میل کو اپنے ای میل اکاؤنٹ کی بجائے ایک ویب سائٹ سے بھیج رہا ہوں اور اس کو شیڈ یول کر رہا ہوں تاکہ یہ تمہیں تین دن بعد ملے۔ شکر کہ سکندر نے مجھے یہ کام کرنا سکھا رکھا تھا کیونکہ اگر ابھی یہ میل تمہیں ملی اور تم نے دیکھ لی تو تم دونوں واپس آ جاؤ گے اور جو ہونے جا رہا ہے اس کو روکنے کی کوشش کرو گے جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور اپنے ای میل سے اس لئے نہیں بھیج رہا تاکہ تم اس کا جواب نہ دے سکو اور مجھے کبھی یہ میل دوبارہ اپنے اکاؤنٹ میں واپس نہ ملے۔

میں اتنے دن سے تمہیں نظر انداز اسلئے نہیں کرتا کہ تم سے بات نہیں کرنی تھی بلکہ اس لئے کہ تم ہی سے تو بات کرنی تھی۔ تمہارا اور میرا تعلق اس سے مختلف ہے جو تالیہ اور میرا تھا۔ میں نے الوداعی لحات میں تمہیں کوئی نصیحت اس لئے نہیں کی کیونکہ تم تجربے سے سیکھنے کے عادی ہو۔ امید ہے تالیہ تمہارا خیال رکھے گی اور تم اس کا۔

مجھے یہ ای میل لکھنے کی نوبت اس لئے پیش آئی کیونکہ ہمارے سارے مطالبے ماننے کے لئے مراد راجہ نے میرے سامنے ایک شرط رکھی تھی اور میں نے وہ شرط مان لی تھی۔ اس لئے کیونکہ میں نے تم لوگوں سے صرف واپس لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے بعد کے ساتھ کا نہیں.....

☆☆=====☆☆

مراد راجہ اور وان فاتح میز پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ درمیان میں موم بتی جل رہی تھی اور مراد کرسی سنبھالے آگے ہو کے اس کی آنکھوں میں دیکھتا مسکرا رہا تھا۔ فاتح نے ابرو بھینچے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا شرط ہے تمہاری؟“

جواباً مراد نے حقے کاش بھرا اور منہ سے دھواں چھوڑا۔... مرغولے سے بن کے اوپر فضا میں اٹھنے لگے۔ پھر وہ کھلے دل سے مسکرایا۔

”وہ دروازہ تم نے کھولا تھا نا؟ چابی تم نے جوڑی تھی نا؟“

”ہاں۔“

”نہیں جوڑنی چاہیے تھی۔ تم نے یہ کر کے چابی کا چکر خراب کر دیا ہے۔“

”کام کی بات پہ آؤ راجہ۔ لمبی کہانیاں مت سناؤ۔“

راجہ نے حقہ پرے دھکیلا اور گویا ہوا۔

”میری شرط صرف یہ ہے کہ دروازہ اب بھی تم ہی کھولو گے اور اس چکر کو مکمل کر دو گے۔ مگر پہلے تمہیں یہ چابی اس بوتل سے نکال کے

جوڑنی ہوگی۔ اور اس سے بھی پہلے تمہیں یہ مشروب پینا ہوگا۔“

فاتح نے ایک گہری نظر بوتل پہ ڈالی جو بے رنگ مائع سے بھری تھی۔ سکھ اور ڈلی پیندے میں پڑے تھے۔ ”اور اس سے کیا ہوگا؟“

مشلوک انداز میں مراد کو دیکھا۔

”جب دروازہ کھولنے کے بعد چابی ٹوٹے گی تو وہ لمحہ امر ہو جائے گا۔ اور کفارہ پورا ہو جائے گا۔“

”کس چیز کا کفارہ؟“

”چابی کا چکر خراب کرنے کا کفارہ۔ کیا تم اب بھی نہیں سمجھے؟ چلو دیکھو۔۔۔“

وہ نرمی سے سمجھانے لگا اور فاتح تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

”تمہیں وہ لمحہ یاد ہے جب تم نے چابی جوڑی تھی؟“

”ہاں۔ میں اپنی سواری میں بیٹھا تھا اور میرا دوست میرے پاس وہ چابی لے کر آیا تھا اور میں نے دونوں ٹکڑوں کو جوڑ دیا تھا۔ پھر؟“

”وہ بھی ایک امر لمحہ تھا۔ اس لمحے سے لے کر اس چابی کے دوبارہ ٹوٹنے تک کا وقت تمہارا کفارہ ہوگا اور وہ وقت... تمہارے ذہن سے

محو ہو جائے گا۔“

فاتح پیچھے کو ہوا۔ اور بے اختیار ابرو اٹھایا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ یہ سارا وقت جو میں نے قدیم ملاکہ میں گزارا ہے... میں اسے بھول

جاؤں گا؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ چابی خود جوڑنے کے بعد کا جتنا وقت تم نے گزارا ہے وہ ہمارے اصول کے مطابق ایک ناجائز وقت تھا۔ اس کا

کفارہ صرف یہی ہے کہ جو بھی دوبارہ اس چابی کو جوڑ کے دروازہ کھولے گا چابی کے ٹوٹنے کے بعد وہ اس ناجائز وقت کو بھلا دے گا۔ یہ

چابی ایک شخص کے لئے تھی۔ یہ تالیہ کے لئے تھی۔ تم نے اس کو جوڑ کے غلط کیا۔ اور یہی تمہارا کفارہ ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے ناگواری سے بھنویں بھنچیں۔ ”کوئی اور راستہ بھی ہوگا وقت میں واپس جانے کے لئے۔“

”فاتح بن رامل!“ وہ ہتھیلیاں میز پہ جمائے مزید آگے ہوا اور سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”تم میری بیٹی سے شادی کرو گے“

میرے محل کے باہر لوگوں کو بٹھا دو گے مجھے سلطان کے سامنے رسوا کرو گے تو تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں دوسرے راستے دکھاؤں گا؟

نہیں۔ اگر تمہیں واپس جانا ہے تو اس کا ایک یہی راستہ ہے۔ ورنہ میں بغاوت کروں گا۔ سلطان کو مار دوں گا اور پھر مجھے کسی چھپے ہوئے نکاح کا ڈر نہیں ہوگا۔“

کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ فاتح کا ذہن ان الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اور میرے سب بھول جانے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

اب کے مراد معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”تالیہ واپس آجائے گی!“

فاتح کے ماتھے پہ ہل گہرے ہوئے۔

”تالیہ... کبھی واپس نہیں جائے گی۔“

”تم میری بیٹی کو نہیں جانتے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے چار ماہ ایک محل میں حکومت کی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ واپس جا کے عام سی زندگی گزار لے گی؟ نہیں فاتح... طاقت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ حکمرانی ایک نشہ ہے جس کی تڑپ روح نکلنے کے ساتھ ہی جاتی ہے اس سے پہلے نہیں۔ اس نے طاقت کے پیالے کو چکھ لیا ہے وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔“

”اچھا۔ اور میں سب بھول جاؤں گا تو وہ مجھ سے مایوس ہو کے تمہارے پاس آجائے گی؟“

”ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ تم نے خود کہا تھا میری بیٹی کی موت ہمارے اسی زمانے میں لکھی ہے۔ سمندری سفر پہ۔ وہ سمندری سفر ابھی آنا ہے فاتح... ہے نا۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس ضبط سے اس کو گھورتا رہا۔

”اور اگر میں یہ نہ مانوں تو؟ اگر میری جگہ تالیہ دروازہ کھولے تو؟“

”تو وہ اس امر لمحے سے لے کر چابی کے دوبارہ ٹوٹنے تک کا سارا وقت بھول جائے گی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“

”یعنی جو بھی دروازہ کھولے گا وہ سب بھول جائے گا۔ اور اپنی زندگی میں یوں واپس چلا جائے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!“ اس کی آواز میں اضطراب چھلکا۔

”ہاں۔ اب یہ تم پہ منحصر ہے کہ تم یہ قربانی خود دیتے ہو یا تالیہ کو آگے کرتے ہو۔“

”اور تم ہمارے جاتے ہی تالیہ کے منتظر ہو گے۔ مگر تمہارا انتظار انتظار ہی رہے گا مراد۔ جتنے برس انتظار کرو وہ نہیں آئے گی۔“

”تم بھول رہے ہو کہ وقت یہاں بھی ٹھہر جائے گا۔ وہ تمہاری دنیا میں جتنے برس گزارے میری دنیا میں جب وہ آئے گی تو وہ اسی دن اسی پل واپس آئے گی۔ میں مرسل شاہ سے اس کی شادی منسوخ نہیں کر رہا۔ تم اپنی دنیا میں میری شہزادی بیٹی کو جتنے برس روکنا چاہو روک

لو۔ اور آخر میں وہ ہمارے ملا کہ واپس آجائے گی اور ملکہ بنے گی۔ میں نے کہا نا، تم مراد راجہ کو نہیں ہرا سکتے۔“

”اور اگر اس سب کے باوجود وہ واپس نہ آئی تو؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے، وان فاتح... تم نے تو صرف یہی فیصلہ کرنا ہے کہ کیا تم اس چابی کو (بوتل کی طرف اشارہ کیا) پانے کے لئے یہ قربانی دے سکتے ہو؟“ مراد مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

فاتح نے ہلکی سی نظریں موڑیں۔ کمرے کے کونے میں آریا نہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا، گویا اسے روکا ہو۔

”ڈیڈ... آپ اس کی بات نہ مانیں۔ ایڈم کو یہ مشروب پینے دیں۔ اگر وہ سب بھول بھی جائے تو کیا ہوگا؟ مگر آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ نہ ہی تالیہ کو بھولنا چاہیے۔“ وہ منت کر رہی تھی۔ فاتح نے اس کو نظر انداز کیا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔“ اس نے بوتل اپنے قریب کی۔

”یعنی تم سب بھلا دینے پر راضی ہو۔“ مراد مسکرایا۔ ”پوچھ سکتا ہوں کیوں؟“

”تم مجھے نہیں جانتے راجہ۔ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس نے بوتل کا ڈھکن زور سے باہر کو کھینچا، پھر اسے لبوں سے لگالیا۔ گھونٹ بہ گھونٹ پانی اندر اترتا گیا۔

اس کا کوئی ذائقہ نہ تھا۔ بے لذت۔ بے سواد۔

مشروب ختم ہوا تو سونے کے دونوں ٹکڑے باہر آگرے۔ اس نے آرام سے ان کو اٹھایا اور جوڑ دیا۔ چابی جڑتے ساتھ ہی چمکنے لگی۔

فاتح نے اس کی زنجیر کو گردن میں پہن لیا اور پھر مراد کو دیکھا۔

”دروازہ کھولنے کے کتنی دیر بعد چابی ٹوٹے گی؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”دروازہ کھلتے ہی یہ برگرز رتے پل بھاری ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ تم اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکو گے۔ اور آخر کار تم اس کو گردن سے نوچ پھینکو گے۔“

”قریباً کتنی دیر بعد؟“ اس نے دہرایا۔ ”کتنا وقت ہوگا میرے پاس؟“

”قریباً ایک پوری رات۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کیوں؟ تم اس ایک رات میں کیا کرنا چاہتے ہو؟“ مراد نے غور سے اسے دیکھا۔

”ایک رات تو بہت طویل عرصہ ہے راجہ۔ یہاں تو ایک لمحے میں دنیا بدل جاتی ہے۔ زمانہ پلٹ جاتا ہے۔ میں نے کہنا، تم مجھے نہیں جانتے۔“ اور کرسی دھکیل کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات پتھر جیسے ہو رہے تھے۔

”اور مجھے معلوم ہے کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔“

☆☆=====☆☆

”ڈیئر ایڈم.....“

میں نے راجہ کی شرط مان لی تھی۔ واپس آنے کے بعد جب چابی ٹوٹے گی تو میرے ذہن سے یہ گزرے چار ماہ محو ہو جائیں گے۔ میں

نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی کیونکہ یہی ہم تینوں کے لئے بہتر ہے۔

اگر ایڈم تم یہ مشروب پیتے تو تم سب بھول جاتے۔ قدیم ملاکہ کے سارے اسباق بھول کے تم وہی عام سی زندگی گزارنے لگتے جو پہلے گزار رہے تھے مگر اب تم وہ زندگی نہیں گزارو گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنے اصل کو بھول جاؤ۔

اور اگر تالیہ یہ پیتی تو وہ بھی اسی زندگی کی طرف لوٹ جاتی جس کو اس نے بہت مشکل سے چھوڑ کے اپنے اصل کو دریافت کیا تھا۔ میں اس سے اس کا اصل نہیں چھین سکتا تھا۔

رہا میں تو.... مجھے یہ فیصلہ مشکل نہیں لگا۔ میری زندگی پہلے ہی بہت پیچیدہ ہے۔ یہ الیکشن ایر ہے۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جن کو میری مکمل توجہ چاہیے۔ اور قدیم ملاکہ کو بھول جانے سے میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ مجھے بھول جانا چاہیے کہ میں نے اپنی بیوی سے بے وفائی کی ہے۔ کاغذوں پہ ہی سہی۔

یہ ای میل لکھنے سے قبل میں نے سوچا تھا کہ اس میں تالیہ کے لئے آزادی کا پروانہ لکھ بھیجوں گا، لیکن جیسے جیسے یہ چابی بھاری ہو رہی ہے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ رشتے چاہے صرف کاغذی ہی ہوں اتنی آسانی سے نہیں توڑے جاسکتے۔ تالیہ سے کہنا، میں اب اسے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ایک دن وہ مجھے ہر وہ چیز یاد کروادے جو میں بھول بیٹھا ہوں۔ خود غرضی کہہ لویا کچھ بھی، میں تالیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اسے خود سے مایوس بھی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تب وہ واپس چلی جائے گی۔ میں چاہتا ہوں، وہ میرے ساتھ رہے۔ کیونکہ اسے میری اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔

چار ماہ قبل... اس چابی کو جوڑنے سے پہلے میں اسے ایک بددیانت اور سطحی سوشلائٹ ”تاشہ“ کے طور پہ جانتا تھا جس نے میری فائل چرائی تھی۔ اگر چیزیں واپس اسی مقام پہ پہنچ جائیں تب بھی میں چاہوں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بھلے میں اسے ناپسند کروں، اسے دھتکاروں میں چاہتا ہوں کہ وہ تب بھی میرے ساتھ رہے۔ امید ہے اسے وعدے نبھانے آتے ہوں گے۔

اور میں چاہوں گا ایڈم، کہ تم اپنی زندگی کو دوبارہ سے تعمیر کرنا شروع کرو، لیکن اس دفعہ وہ کوئی عام زندگی نہیں ہونی چاہیے۔ میں تمہاری توقعات کے مطابق رجبہ کی بدعنوانی کو بے نقاب نہیں کر سکا کیونکہ میں ایڈر تھا، اور ایڈرز کو مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں، لیکن تم ایڈر نہیں ہو۔ تم آزاد ہو۔ کسی سمجھوتے، کسی مشکل فیصلے کی بجائے تم بہادر فیصلے لے سکتے ہو۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کرنا چاہتا کیونکہ بہت جلد تم خود سمجھ جاؤ گے کہ اب تمہیں آگے کیا کرنا ہے۔

بارہ بج رہے ہیں اور میری چابی بھاری ہو رہی ہے۔ میں صبح تک ہی اس کا بوجھ سہار پاؤں گا اور تب تک مجھے چند اہم کام کرنے ہیں۔ اپنا اور تالیہ کا خیال رکھنا۔

اور ہاں... میں جانتا ہوں تم دونوں نے سن باؤ کے صحن میں کیا دبا یا ہے۔ تالیہ سے کہنا وہ یہ گھر مجھ سے خرید لے اور اپنا خزانہ نکال لے۔ یہ خزانہ تم دونوں کی محنت کی کمائی اور تمہاری صدیوں کی مسافت کی اجرت ہے۔

اور میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس سفر کو کبھی نہ بھلاؤ۔

فقط۔

وہ غلام جس کو شہزادی تاشہ نے آزاد کیا تھا۔

☆☆=====☆☆

موسیقی بنوز بجز رہی تھی۔ اور مہمانوں کی خوش گپیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی لگی تھی۔ ایسے میں وہ دونوں لان کے سرے پہ کھڑے ایڈم کے موبائل سے وہ ای میل پڑھ رہے تھے۔

میل ختم ہوئی تو ایڈم نے اسکرین بجھادی اور مردہ ہاتھوں سے فون جیب میں ڈالا۔ پھر تالیہ کو دیکھا۔

اس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی اور وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔

”ایڈم!“ اس نے بے یقین سی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”یہ سب کیا تھا؟“

ایڈم کی آنکھوں کے کنارے بھینگنے لگے۔ گارندہ سا گیا۔ ”چے تالیہ... انہوں نے ہمیں چننے کی بجائے اپنی پرانی زندگی کو چن لیا۔ میں

نے آپ سے کہا تھا، یہ حکمران لوگ سمجھوتے کرتے وقت ہم ادنیٰ کارکنوں کو بھلا دیتے ہیں۔“

”ایڈم!“ اس کی خالی خالی آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ ”وہ مجھے بھول چکے ہیں۔ وہ اداکاری نہیں کر رہے، وہ واقعی مجھے بھلا چکے ہیں۔

میری ساری ریاضتیں، ساری کوششیں... میری ساری اچھائی وہ سب فراموش کر چکے ہیں۔ ان کو اتنا بھی یاد نہیں کہ ہماری شادی ہوئی تھی!“

وہ سکتے میں تھی۔ زمین اس کے پیروں تلے سے سرک رہی تھی اور سارا وجود جیسے کھائی میں گرتا جا رہا تھا۔

”وہ تو میری طرف دیکھنے کے رو دار نہیں ہیں انہیں کیسے وہ سب یاد کرواؤں گی جو قدیم ملا کہ میں ہوا تھا؟“

وہ بنا پلک جھپکے اس مشہور سیاستدان کو دیکھ رہی تھی جو کافی فاصلے پہ کھڑا تھا۔ اس کے گرد لوگوں کا جھمگھٹا لگا تھا۔ وہ مسکرا کے بات کر رہا تھا

اور لوگ موبائلز اور کیمروں سے مسلسل اس کی تصاویر بنا رہے تھے۔ باڈی مین، گارڈز، سیکرٹری... دائرے کی صورت اس کو اطراف سے

گھیرے ہوئے تھے اور جیسے جیسے ریش بڑھ رہا تھا، وہ غیر متعلقہ لوگوں کو اس کی طرف جانے سے روک رہے تھے۔

وہ ناقابل رسائی تھا۔

وہ ان سے بہت اوپر تھا۔

وہ ان کو ان پہچانتا تک نہیں تھا۔

اسے بس ان کے نام یاد تھے۔

ایک اس کا باڈی مین تھا۔ عام ساڑ کا جس نے دس گیارہ دن اس کے پاس کام کیا تھا۔

اور دوسری اس کی بیوی کی نئی دوست، بددیانت سطحی سی لڑکی تھی جو اس کے سالے میں انوالوڈ تھی۔

اور جس نے اس کی فائل چرائی تھی۔
وہ اپنی زندگی میں واپس چلا گیا تھا۔
اور وہ دونوں... وہ اب اس کے کچھ بھی نہ تھے۔
اور اگر وہ اس کو کچھ بتاتے تو وہ کبھی یقین نہ کرتا۔
کوئی بھی یقین نہ کرتا۔
کیا ساری عمر جھوٹ بولنے کا یہ نقصان ہوتا ہے؟
کہ جب آپ اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولنا چاہو تو کوئی اس پہ یقین ہی نہ کرے؟
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆=====☆☆

حالم (نمرہ احمد)

بارہواں باب:

”سلطان ساز“

اس نے خواب میں دیکھا کہ...
 وہ راہداری میں کھڑی ہے...
 سامنے چند آفسز بنے ہیں...
 جن کی دیواریں شیشے کی ہیں...
 ایک آفس کے اندر کا منظر وہ صاف دیکھ سکتی ہے...
 اس میں ایک سیاہ کوٹ والا آدمی کھڑا ہے...
 میز سے ٹیک لگائے سینے پہ بازو لپیٹے
 وہ تالیہ کی طرف دیکھ رہا ہے...
 اور تالیہ...
 وہ راہداری میں کھڑی ہے...
 ہاتھ میں ایک بڑا سا زرد پلے کارڈ ہے
 جسے وہ شیشے کے دروازے پہ چسپاں کر رہی ہے!
 آفس کا ریڈور میں نیم اندھیرا ہے...
 جیسے اکثر لوگ جا چکے ہوں...
 کارڈ چسپاں کر کے وہ مڑتی ہے..
 اور ایک چبھتی ہوئی نظر اس آدمی پہ ڈالتی ہے...

☆☆=====☆☆

تاریخ تھی سولہ جولائی۔ شہر تھا جدید ملاکہ۔ سن تھا دو ہزار سولہ اور وقت تھا رات کے ساڑھے گیارہ بجے جب وہ تینوں سن باؤ کی حویلی

میں کھڑے تھے۔

زمین اپنے خفیہ راستوں کو چھپائے برابر ہو چکی تھی۔ ایڈم ٹی وی چلا کے تاریخ معلوم کر رہا تھا اور تالیہ بے یقینی سے گول گول گھوم کے اطراف کو دیکھ رہی تھی۔

صرف وان فاتح دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے بے تاثر سا کھڑا تھا۔ صرف اسے معلوم تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ گردن میں پڑی زنجیر برگرزرتے لمحے بھاری ہوتی جا رہی تھی۔

(”تم اس کو اپنی جیب میں نہیں ڈالو گے۔ اس کو ہاتھ یا گردن میں پہنے رکھنا۔“ راجہ مراد کی آواز ذہن میں گونج رہی تھی۔ ”اس کو اپنی جلد کے ساتھ لگائے رکھنا ورنہ یہ را کھ بن جائے گی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی یہ ٹوٹ جائے گی۔ اور تمہارے ذہن سے سب کچھ محو ہو جائے گا جو دوام لحوں کے درمیان میں ہوا تھا۔“

”اور میری یادداشت واپس کیسے آئے گی؟“ خالی بوتل دونوں کے درمیان میز پہ رکھی تھی۔ اس کو دیکھ کے فاتح نے پوچھا تھا۔
”نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں آئے گی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے، غلام فاتح!“ وہ ایک دم غصے سے بولا تھا۔

پولیس کے سائرن سنائی دینے لگے تو ایڈم دروازے پہ جانے لگا۔ فاتح نے اسے روک دیا۔ ان دونوں کو صحن میں چھوڑ کے اس نے رابدراری عبور کی اور باہر کا سرخ دروازہ کھولا۔

باہر چھوٹی صاف ستھری سڑک تھی جس کے دونوں اطراف میں ایسے ہی تاریخی گھر اور ریسٹوران بنے تھے۔ دکانوں کے باہر چھپر تلے لوگ کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔

سن باؤ کے گھر کے سامنے پولیس کار کھڑی تھی اور دو آفیسرز گھر کے دروازے پہ منتظر کھڑے تھے۔ فاتح نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل آیا۔

”السلام علیکم فاتح صاحب!“ ایک افسر نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ کے گارڈ کی کال آئی تھی کہ چور گھس آئے ہیں۔ خیریت ہے؟ ہم اندر آجائیں۔“ ساتھ ہی ایک نظر اس کے کرتے پاجامے پہ ڈالی۔

”نہیں، گھر میں نہیں۔ باہر سڑک پہ لوٹا ہے انہوں نے۔“ وہ گہری سانس لے کر بتانے لگا۔ ”میں ابھی تھانے آ کے پورا واقعہ بتاتا ہوں“ فی الحال گھر میں کچھ میڈیا والے موجود ہیں۔ ان کے جاتے ہی میں آتا ہوں۔“

”مگر سر.....!“

”کیا تم مجھے نہیں جانتے؟ آفیسر؟ تمہارا ڈپٹی کمشنر میرا کلاس فیلو ہے۔ اس سے کہو کہ میرا انتظار کرے۔ میں خود آ کے رپورٹ لکھواؤں گا۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔ ”مجھے لباس بدل کے منہ ہاتھ دھونے دو۔“ ایک افسر بے چین ہوا تو دوسرے نے فوراً اشارہ کیا۔

”جی سر“ ڈی سی پی صاحب نے ذکر کیا تھا۔ ٹھیک ہے ہم آپ کا انتظار کریں گے۔“

فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کیا (اب جاؤ) اور واپس مڑ گیا۔

تالیہ اور ایڈم کو وہاں سے بھیجنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ جیسے ہی وہ گھر سے نکلے وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا۔ چار ماہ پہلے ایڈم کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہی عادتاً اس نے کار کی چابی دروازے کے ساتھ بنی کھوٹی پہنکائی تھی۔ وہ وہیں تھی۔ اس کا لوہا اب بھی ٹھنڈا تھا۔

وہ باہر سڑک پہ آیا تو تالیہ اور ایڈم جا چکے تھے۔ اس نے کار سے اپنا بیگ نکالا اور واپس برآمدے میں آ کے اسے کھولا۔ گردن میں جھوٹی چابی ہرگز رتے پل بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

”پلان کیا ہے ڈیڈ؟“ کو نے میں کھڑی آریانہ کی آواز نے اسے چونکایا۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ بازو سینے پہ لپیٹے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے پاس صبح تک کا وقت ہے اور مجھے چند اہم کام کرنے ہیں۔“ لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے وہ برآمدے میں پچھی مسہری تک آیا اور اور وہاں بیٹھا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ نیلی روشنی میں اس کا چہرہ دمکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

”کیا کر رہے ہیں ڈیڈ؟“ وہ ابھی تک فاصلے پہ کھڑی تھی۔ فاتح تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

”ایڈم کو ای میل لکھ رہا ہوں۔ جو نہیں بتایا وہ بتا رہا ہوں۔“

”اور تالیہ؟ اس کو چھوڑ دیں گے آپ؟“

ٹائپ کرتی اس کی انگلیاں تھمیں۔ گلد آمیز نگاہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”چھوڑنا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟“

”تو پھر اسے کہا کیوں تھا کہ چھوڑ دیں گے؟“

”چھوڑ تو دوں گا۔ یہی بتانے کے لئے میل لکھ رہا ہوں۔“ وہ اب سرعت سے ٹائپ کر رہا تھا۔ ”یہ الگ بات ہے کہ ایسا لگ رہا ہے

جیسے....“

”جیسے؟“

”جیسے مراد رجبہ نے چند گھنٹے دیے ہوں کہ وہ ان فاتح.... یہ اتنا وقت ہے تمہارے پاس اس کے بعد تم مر جاؤ گے۔ سو جو کرنا ہے اس

دوران کر لو۔ اب تم بتاؤ آریانہ.... کیا مرنے سے پہلے کوئی کسی کو چھوڑنے کی خواہش کر سکتا ہے؟“

سن باؤ کے قدیم برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ کنویں کے اندر جیسے خاموشی۔ آریانہ دکھ سے اسے دیکھے گئی۔

”ڈیڈ.... اس کو چھوڑ دیں۔ جب سب بھولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کو خود سے کیوں باندھ کے رکھتے ہیں؟“

وہ ٹائپ کرتے ہوئے رکا تو وہ جلدی سے بولی۔

”واپس آ کے میل مکمل کرتا ہوں۔ ابھی ہمت نہیں ہو رہی۔“ اس نے آدھی میل چھوڑ کے اسکرین فولڈ کر دی۔ پھر وہ اٹھا اور اوپر کی طرف

چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ میڑھیاں اترتا دکھائی دیا تو زینوں کے اختتام پہ بیٹھی آریانہ نے گردن اس کی جانب موڑی۔
 ”ان چارہ ماہ کی ساری نشائیاں مٹا آئے ہیں آپ؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

اس نے سیاہ شرٹ اور پیٹ پہن رکھی تھی۔ شیوہن چمکی تھی۔ بالوں کو قدرے تراش کے پرانی حالت پہ لے آیا تھا۔ قلموں سے بال سفید تھے، باقی دائیں طرف مانگ نکال کے گیلے کر کے جمار کھے تھے۔ گردن میں زنجیر اب بھی نظر آرہی تھی۔ ہاتھ میں شاپر تھا جس میں ملاکہ والے کپڑے اور جوتے تھے۔ اپنے تمام زخموں پہ اس نے نئے زمانے کے بینڈ ایڈ لگا دیے تھے۔

”نشائیاں مٹانے کے سوا چارہ ہے کیا؟ کل جو ان فاتح نیند سے جاگے گا، اس کو کسی بھی چیز پہ شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ شدید ذہنی پریشانیوں میں گھر جائے گا۔ اس کے لیے ہر چیز مارل ہوئی چاہیے۔“ وہ تیز تیز زینے پھلانگ رہا تھا۔ آخری زینہ عبور کر کے آگے بڑھ گیا تو آریانہ نے پکارا۔ ”اور جسم پہ لگے ان گنت زخموں کا کیا؟“

”انہی کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔“

کار کی چابی اٹھائے وہ تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے لگے کوڑے دان میں سیاہ شاپر میں مقید چیزیں پھینکیں اور ڈھکن بند کیا۔ گویا زندگی کا ایک باب بند کیا۔
 چند لمحوں کے لیے اندر تک سب خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن کے ایک کشادہ کمرے میں موجود تھا۔ آفس چیئر پہ ڈپٹی کمشنر براجمان تھا اور اس کے سامنے بیٹھا فاتح کندھے اچکا کے کہہ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹینڈ پہ کیمرہ نصب تھا جو اس کا بیان ریکارڈ کر رہا تھا۔

”میں ملاکہ تین دن کے لیے آیا تھا مگر تین گھنٹے بھی نہ رک سکا۔ میں ملاکہ سے واپس جا رہا تھا کہ میرا باڈی گارڈ میرے پاس آیا۔ یہ ریکارڈ ہو رہا ہے نا؟“ اس نے اپنے دوست کو اشارہ کیا تو اس نے سر کو خم دیا۔

”گڈ۔ مجھے یہ ویڈیو ای میل کر دینا۔ میرا دماغ اس وقت سب چیزوں کو کس اپ کر رہا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صبح جب میں یہ ویڈیو دیکھوں تو مجھے یاد رہے کہ ان تین گھنٹوں میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔“ اس نے تین انگلیوں سے کنپٹی مسلی۔
 ”آپ کہہ رہے تھے...؟“

”ہاں... میرا باڈی گارڈ آیا تھا میرے پاس۔ وہ میرے ساتھ گاڑی میں ہی تھا جب تین آدمی آئے اور انہوں نے ہم پہ پستول تان لئے۔ پھر ہمیں باہر نکالا۔ وہ مجھ سے والٹ، پیسے اور فون مانگ رہے تھے۔ وہ تین چیزیں جو یہ سارے چور مانگتے ہیں۔ مگر...“ کندھے اچکا کے کیمرے میں دیکھتے ہوئے گہری سانس لی۔ ”اتنی آسانی سے وان فاتح ہار کب مانتا ہے؟ میں بحث اور سوال و جواب کرنے لگا۔ ان کو میرے سوال پر لگے تو انہوں نے جارحیت کا مظاہرہ کیا۔“

”کیسے؟“ آفیسر نے تشویش اسے دیکھا۔

”ہاتھ پائی ہوئی۔ اور وہ مو بال بٹوہ سب چھین کے لے گئے۔ مجھے بے ہوش کرنے کے لئے کوئی سرنج بھی لگائی۔“ اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا جو شرٹ کے آستین سے ڈھکا تھا۔ ”اس کے بعد سے میرا دماغ غنودگی کی سی کیفیت میں ہے۔ میرا باڈی مین.. (تھج کی) باڈی گارڈ مجھے گھرا لیا۔ ہم وہاں تماشہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو خبر ہو کہ مجھے یوں لوٹا گیا ہے۔ اب بھی میں رپورٹ نہیں کروانا چاہتا۔ اس سب کو صیغہ راز میں رہنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے سر۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں اس بات کو کور کر دوں گا۔“ پھر آفیسر نے غور سے اسے دیکھا۔ ”میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے آپ پر تشدد بھی کیا لیکن... انہوں نے آپ سے گاڑی نہیں چھینی؟“

وان فاتح کی گردن میں گلتی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی مگر چہرہ پر سکون رہا....

”میں نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے، یہ ضروری نہیں ہوتا، قمر الزمان!“

”خیر... ہم اپنے طور سے تفتیش کریں گے، جو بھی سامنے آیا آپ کو مطلع کیا جائے گا۔“

وان فاتح اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر کیمرے کو دیکھا۔ ”مجھے یہ ویڈیو بھیج دینا۔ لازمی۔ تین منٹ سے زیادہ مت لینا۔ مجھے بار بار تم سے سوال کرنا اچھا نہیں لگے گا۔“ زور دیا۔

”جی سر۔ اور آپ کامیڈیکل چیک اپ....“

”اس کی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ بس یوں لگتا ہے کہ سارا واقعہ ذہن سے پھسل رہا ہو۔“ اس نے مصنوعی نقاہت سے کہتے ہوئے کنبی کو چھوا۔ افسر نے کیمرا آف کیا تو فاتح نے ہاتھ نیچے کر لئے۔ وہ ایک دم بہتر نظر آنے لگا۔ بس عجلت میں مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور خدا حافظ کہہ کے باہر نکل گیا۔ کشنر اس کو ابھی سوچتی نگاہوں سے جاتے دیکھنے لگا۔

وان فاتح کو اتنی جلدی کیوں تھی؟ جیسے وقت کم ہو اور اسے بہت کچھ کرنا ہو۔ جیسے اسے کسی جگہ پہنچنا ہو۔ اتنی رات میں؟

صبح ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا جب سن باؤ کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے وہ مڑا تو چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے۔

رات کے اس پہر راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا آگے آیا۔ برآمدے کی مدھم جی جل رہی تھی اور لکھائی کی میز پر لیپ ٹاپ فولڈ شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ چار جنگ لگی تھی۔ وہ یڑمروہ سا کرسی تک آیا اور اسکرین اوپر اٹھائی۔ آدھی لکھی ای میل سامنے جگمگا رہی تھی۔

کیا اب وہ ”چھوڑ دینے“ کی باتیں لکھ سکے گا؟ بالخصوص ان گزشتہ چند گھنٹوں کی ’ووڑ دھوپ‘ کے بعد علم میں آنے والی باتوں کے بعد

... کیا اب بھی وہ اس کو چھوڑ سکے گا؟

وہ کرسی پہ گر سا گیا اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ اس نے بھول جانے کا فیصلہ تب کیا تھا جب رجبہ مراد نے اس کے سامنے کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب نہیں لگا تھا کتا لیہ کو چھوڑنا اتنا کنھن ہوگا۔ اور اب بھی وہ چھوڑ دیتا اگر یہ چند گھنٹے درمیان میں نہ آئے ہوتے۔ مگر اب نہیں۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور لیپ ٹاپ قریب کھسکایا۔ آنکھیں سپاٹ ہو گئیں اور انگلیاں کی بورڈ پہ حرکت کرنے لگیں۔
 ”اس کو چھوڑ دیں، ڈیڈ۔ اس کو آزاد کر دیں۔ اپنا نہ سوچیں۔ اس کا سوچیں۔“

آریانہ اس کے کندھے کے پیچھے آکھڑی ہوئی اور التجا کرنے لگی۔ وہ کی بورڈ سے نظریں ہٹائے بغیر ٹاپ کرتے ہوئے بولا۔
 ”پہلے اسے بھول جانے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کیونکہ تب مجھے اپنی یہ جدید دنیا واپس چاہیے تھی۔ اور ان دونوں کو بھی۔ لیکن اب اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ مجھے اپنی ”امید“ بھی واپس چاہیے۔ ملکہ درست کہتی تھی، میں واقعی خود غرض ہوں۔“ آواز میں آنچ سی تھی۔

ای میل مکمل کر کے اس نے اسے شیڈ یول کیا۔ رات پونے بارہ شروع کی گئی میل صبح چار بجے کے قریب مکمل ہوئی تھی۔ اختتام آغاز سے مختلف تھا۔ میل بھیج کے وہ رکا اور ایک دوسری میل کی۔

”یہ ایڈم کو بیس جولائی کی صبح ملے گی۔ اور تب ہی ملتی چاہیے۔“ ایسے دہرایا جیسے بالآخر اس نے اپنے مقصد کو جان لیا ہو۔ آریانہ خاموشی سے اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ذاتی ای میل کھولی تو سامنے پولیش ڈیپارٹمنٹ کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ اس نے اس کو ان چھوڑ ہٹے دیا اور اسکرین فولڈ کر دی۔

پھر گلے کی زنجیر اٹھا کے آریانہ کو دکھائی۔ ”اب اس سے نجات حاصل کرنی ہے۔ اس کے ٹوٹے ہی مجھے نیند آجائے گی اور صبح میرے ذہن کی سلیٹ خالی ہو چکی ہوگی۔ اور میں خود بھی بھول چکا ہوں گا کہ وہ چابی... کہاں گئی!“

یہ کہہ کے وہ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ گردن میں پڑی زنجیر کو ابھی تک ہاتھ میں مروڑ رکھا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔

ایک نئی زندگی کی طرف۔

☆☆=====☆☆

سترہ جولائی کی صبح ملا کہ کے باسیوں کو جگانے کے لئے روشنی نے برکھڑکی پہ دستک دی تو سن باؤ کے گھر کا وہ کمرہ بھی منور ہونے لگا۔ بیڈ پہ آڑے ترچھے لیٹے وان فاتح کی آنکھ تیز روشنی سے کھلی تو وہ جیسے چونکا۔ پھر اٹھنا چاہا تو جسم میں شدید ٹیسس اٹھنے لگیں۔ وہ واپس لیٹ گیا اور آنکھیں بار بار جھپکیں۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ وہ کہاں تھا، کیوں تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پھر دھیرے سے وہ اٹھا اور اطراف میں دیکھا۔

وہ اپنے ملاکہ والے گھر کے کمرے میں تھا۔ نیند اتنی گہری آئی تھی کہ یوں لگتا تھا عرصے بعد جاگا ہو۔ سوچوں کو مجتمع ہونے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ اٹھ کے بیٹھا اور تعجب سے کمرے کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ یادداشت واپس آنے لگی۔

وہ تو رات کے ایل واپس جا رہا تھا۔ پھر رک کیوں گیا؟ یاد کیوں نہیں آ رہا تھا؟

سکندر جولیانہ اور عصرہ شام سے پہلے چلے گئے تھے۔ پھر وہ سمندر پہ گیا تھا۔ پھر وہ بیگ سیٹ کے جا رہا تھا۔ پھر؟ وہ کیوں رک گیا؟ سیل فون کی تلاش میں ہاتھ مارا تو سائیڈ ٹیبل خالی تھا۔ وہ اچنبھے سے اٹھا۔ جسم بے حد درد کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں مسلے کو ہاتھ اوپر لایا تو چونکا۔ ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔ فاتح کی آنکھوں میں بے یقینی اُٹھ آئی۔ ہاتھ الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ پھر بازو اٹھا کے اوپر نیچے گھمایا۔ وہاں بھی چند بندج لگے تھے۔

وہ قدم قدم چلتا دیوار پہ آویزاں آئینے تک آیا اور پھر بالکل منجمد ہو گیا۔

شیشے میں دکھائی دیتی اس کی شکل تو وہی تھی مگر.... کچھ مختلف تھا۔ اس نے آنکھیں چندھیا کے بے یقینی سے خود کو دیکھا۔ پھر مزید قریب آیا۔ آنکھ اور کینٹی کے قریب زخم تھا۔ گردن پہ خراشیں۔ اس نے شرٹ گریبان سے نیچے کی، ٹخن کھولے اور شرٹ اتاری۔ پھر گھوم کے دیکھا۔ کمر اور کندھوں پہ زخموں کے نشان تھے۔ سینے پہ بھی ضربیں لگی تھیں۔

اس نے پیشانی چھوئی اور آنکھیں موندیں۔ آخری چیز کیا ہوئی تھی؟

ہاں وہ ایڈم کے ساتھ کار میں بیٹھا تھا۔

ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔

اور ایڈم کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے کچھ دے رہا تھا۔ سنہری چیز۔ پھر کیا ہوا تھا۔

مگر ذہن بالکل صاف تھا۔ تختہ سیاہ کی طرح صاف۔ بلیک ہول کی طرح خالی۔

پھر وہ تیزی سے باہر نکلا۔ زینے پھلانگے اور نیچے آیا۔ برآمدے میں آ کے وہ ٹھنکا۔ لیپ ٹاپ سامنے رکھا تھا۔ اس نے تو کل سامان

سمیٹ کے کار میں ڈالا تھا اور وہ کے ایل واپس جا رہا تھا پھر اب...؟؟

وہ قریب آیا اور اسکرین روشن کی۔ سامنے آفیسر کی ای میل جگمگا رہی تھی۔ وہیں میز کنارے جھکے جھکے فاتح نے بچہ بچہ ہنسوؤں کے ساتھ ای میل کھولی۔

”آپ کی درخواست کے مطابق آپ کے بیان کی ویڈیو بھیج رہا ہوں۔“

ویڈیو چلائی تو جو منظر سامنے آیا اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ تعجب اور بے یقینی سے وہ خود کو اسکرین پہ بولتے دیکھ رہا تھا۔ تھکا

ماندہ زخمی سافٹخ اسی لباس میں بیٹھا لوٹے جانے کا واقعہ بتا رہا تھا.... پھر اس نے کہا کہ لیٹروں نے اسے کوئی سرنج لگائی تھی جس سے اس کا

ذہن ماؤف ہو رہا تھا... ایسے جیسے وہ بار بار بھول رہا ہو۔

”تو یہ ہوا تھارات کو؟“ وہ بے یقین تھا۔ ”مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیا میں بوڑھا ہو رہا ہوں؟ یا شاید... کوئی غنودگی کی دوا انہوں نے مجھے

دی تھی؟ یا اللہ!“

اس نے کراہ کے سر جھٹکا۔ یہ پستول دکھا کے لوٹ لینے والا واقعہ اسے کیوں نہیں یاد تھا؟ عجیب بات تھی... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا کہ موبائل نکال کے آفیسر کو کال کرے مگر... موبائل کہاں گیا....

اچھا ہاں، ویڈیو کے مطابق وہ چور لے گئے تھے۔ عجیب بات تھی۔ بہت عجیب بات تھی۔

پھر اس نے برآمدے کی دیوار پہ آویزاں گھڑی دیکھی۔ آج پارلیمان کا اجلاس تھا۔ اور وہ ناعز کر چکا تھا۔ آف۔ ساری باتیں ذہن سے

نکلنے لگیں۔ شدید غصہ اور فرسٹریشن چھانے لگی۔ اسے جلد از جلد واپس پہنچنا تھا۔

دوبہر تک وہ واپس گھر پہنچا تو عصرہ اور بچے لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو سکندر اسے دیکھتے ہی بھاگتا آیا اور اس کی

ناگوں سے لپٹ گیا۔ کسی زخم پہ سکندر کا ہاتھ لگ گیا اور اسے شدید درد ہوا مگر وہ ضبط کر گیا اور جھک کے اسے پیار کیا۔

”ڈیڈ.... مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ آپ واپس نہیں آئیں گے۔ کھو جائیں گے۔“ وہ اس سے لپٹے لپٹے کہہ رہا تھا۔ فاتح نے مسکرا کے اس

کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا۔ ”بڑے بھی کبھی کھوتے ہیں کیا؟“

”آریا نہ بھی تو کھو گئی تھی۔ وہ تو ہم سے بڑی تھی۔“

فاتح کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بنوہ غائب تھا۔ وہ پاپ کارن۔ وہ کھو چکے تھے۔

اس کے اندر ابال سا اٹھا مگر وہ ضبط کر کے رہ گیا۔ وہ چور یقیناً بنوہ بھی لے گئے تھے۔ آف۔ آف۔

سکندر اٹھ کھڑا تو فاتح نے چہرہ اٹھایا۔ عصرہ تعجب سے اسے دیکھتی قریب آ رہی تھی۔ ”آنکھ پہ کیا ہوا؟ اور ہاتھ پہ؟“

”رات باتھ روم کے لئے اٹھا تو ٹھوکر لگ گئی۔ بے فکر ہو کچھ نہیں ہوا۔ چند چوٹوں کے ساتھ بھی میں ایکشن لڑ سکتا ہوں۔“

مسکرا کے بات کو کور کرتا وہ اندر کی طرف بڑھا۔ جھوٹ بولنا اس کی فطرت نہیں تھی لیکن لوٹے جانے کا بتانا باعث تو ہیں تھا۔ عصرہ نے

الجھ کے اسے جاتے دیکھا، پھر کندھے اچکا دیے۔ وہ ایک ہی دن میں اتنا کمزور لگ رہا تھا۔ رنگت کملائی ہوئی تھی۔ شاید زیادہ دیر ساحل پہ

بیٹھ گیا ہو اس لئے رنگ ٹھن ہو گیا ہو۔

”یہ تمہاری گردن پہ کیسا نشان ہے۔“ کمرے کے دروازے پہ اس کے قدم رک گئے۔ گردن کی پشت کو ہاتھ سے چھوا۔ کچھ ابھرا کھدا

ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

”کہنا، گر گیا تھا۔“

”یہ گرنے کا نشان تو نہیں لگتا۔“ عصرہ قریب آنے لگی تو وہ بے زاری سے ”مجھے آرام کرنے دو“ کہہ کے اندر کی طرف بڑھ گیا

۔ دروازہ عصرہ کے منہ پہ بند کر دیا تو اس کے ابرو تن گئے۔ ہونہ میں سر جھٹکا اور مڑ گئی۔

اندر آتے ہی اس نے بتی جلائی۔ پھر سنگھار میز تک آیا۔ دراز سے پاکٹ مرر نکالا اور آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ننھا آئینہ گردن کی پشت پہ لے گیا اور بڑے آئینے میں عکس دیکھا۔

وہاں گول سا جلنے کا نشان تھا۔ اور بھورا پڑ چکا تھا۔ یہ چوٹ اسے کب لگی؟ اتنا صاف گول نشان؟

اس نے آئینہ پرے پھینکا اور نڈھال سا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

شام کو وہ کے ایل میں واقع ایک پرائیوٹ کلینک کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ماتھے پہ بل تھے اور چہرے سے ناخوش لگتا تھا۔ سخت بے زار

سامنے بیٹھا ادھیڑ عمر ڈاکٹر دونوں ہاتھ اٹھائے اس کو سمجھا رہا تھا۔

”میں نے آپ کے سارے زخم دیکھے ہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے واضح بتائیں کہ یہ آپ کو کب آئے؟“

”میں بتا رہا ہوں اتنی دیر سے کہ کل رات تین لوگوں نے چوری کی کوشش کی تو میں نے مزاحمت کی۔ اس پہ انہوں نے مجھے مارا۔“ اس

نے پولیس کو دیا بیان دہرایا۔

”اسٹریج۔“ ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔ ”ڈریسنگ ہو گئی ہے، دوا بھی دے دی ہے میں نے آپ کو۔ مرہم کا بھی سمجھا دیا ہے، مگر....“ اس

نے توقف کیا۔ ”یہ زخم کل کے نہیں ہیں۔“

”تو پھر کب کے ہیں؟“

”کم از کم بھی چار سے پانچ دن پرانے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کسی نے آپ کو لوہے کی زنجیروں سے مارا ہو۔ آپ کے ہاتھ باندھے گئے

ہوں۔ کمر پہ چڑے کے کوڑے یا ہنر سے مارے جانے کے نشان ہیں لیکن....“ ڈاکٹر نے پھر توقف کیا۔ ”مجھے آپ کی کمر پہ پرانے نشان

بھی ملے ہیں۔ کم از کم تین سے چھ ماہ پرانے نشان۔ وہ بھی مار پیٹ کے ہیں۔ اور یہ گردن کا زخم اس کو بھی کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ یہ تو

صاف گرم چیز سے داغے جانے کا نشان ہے۔“

وہ جواب میں ذرا جھنجھلایا۔ ”میں نہیں جانتا کہ آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے۔ مگر یہ کل کے ہی ہیں۔“

”مگر اتنی جلدی کھرند کیسے بن سکتے ہیں فاتح صاحب؟“ پھر فاتح کا ناخوش چہرہ دیکھ کے بات بدل دی۔ ”خیر آپ فکر نہ کریں، دوا لیتے

رہیں، مرہم لگاتے رہیں، یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اسے لگا شاید فاتح چھپا رہا ہے سوزید زور نہیں دیا۔ وان فاتح ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد پہلے سے زیادہ الجھ گیا تھا۔

کلینک سے نکل کے وہ پارکنگ تک آیا تو رک گیا۔ ایک نظر سامنے سڑک پہ دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا۔ پھر رک کے کچھ محسوس کرنا چاہا۔

کیا تھا جو طبیعت پہ ناگوار گزرتا تھا؟ یہ زن سے بھاگتی دوڑتی گاڑیاں؟ یہ شور؟ یہ اس لباس میں ملبوس آگے پیچھے جاتے مصروف سے

لوگ؟ سب ویسا ہی تھا جیسے ہمیشہ لگا کرتا تھا۔ پھر سب اتنا اجنبی اجنبی کیوں لگ رہا تھا؟ سوال بہت سے تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

عصرہ کی نیلامی کے پہلے روز تک وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ بڑھتی عمر، دماغ پہ چوٹ، یا ڈرگ انجکٹ کرنے کے باعث۔ یقیناً وہ اس رات کے واقعات بھول چکا تھا۔ ایسا ہوتا ہے۔ ٹراما کے باعث انجری سے ذرا دیر پہلے کے واقعات بھول جایا کرتے ہیں۔ اس نے سوچوں کو اس واقعے سے ہٹانے کے کام کی طرف مبذول کر دیا۔ البتہ رات میں آریانا نہ اکثر آ جاتی اور بیڈ کے کنارے کھڑے ہوئے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا کرتی۔

”ڈیڈ... ذہن اتنا خالی خالی سا کیوں ہے؟ جیسے کچھ ہوا ہو۔ جیسے بہت کچھ ہوا ہو مگر یاد نہ آ رہا ہو۔“

”ایک رات میں کتنا کچھ ہو سکتا ہے آخر؟“ وہ سر جھٹک کے کہتا اور کروٹ لے لیتا۔ نرم بستر نامانوس کیوں لگتا تھا؟ اسے سخت بچھونے کی عادت بھی نہیں تھی نزد مین پہ سونے کی۔ پھر اب...؟ لیکن وہ بار بار سر جھٹک دیتا۔

نیلامی کے پہلے روز پارٹی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ اسے وہ نظر آ گئی۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس سنہرے بالوں والی سوشلائٹ جس کو اس روز عصرہ نے ملا کہ والے گھر بلوا کے اس کی چھٹی بدمزہ کر دی تھی۔ فاتح جانتا تھا کہ وہ اس کے گھر کے پیچھے ہے اس لئے اسے دو ٹوک انداز میں منع کر کے وہ دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ البتہ اسے یوں لگا جیسے وہ شل ہو گئی ہو۔ طبیعت کے برخلاف کوئی تیکھا جواب بھی نہیں دیا۔ خیر... وہ آگے بڑھا تو ایڈم نظر آیا۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ ایڈم اس رات کچھ کہنے آیا تھا۔

فاتح نے رک کے اس سے سوال کیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح کم اعتماد نظر آنے لگا۔ جیسے الجھ گیا ہو۔ شاید اسے اس رات کے واقعات کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک باڈی مین کے سامنے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے کہ وہ ذہنی طور پہ اتنا کمزور بھی ہو سکتا ہے کہ لوٹے جانے کے اس واقعے کو بھول جائے۔ انہوں نے اسے اپنے استفسار پہ پچھتاوا ہوا سو بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔

پارٹی کی رونق اپنے عروج پہ تھی۔ دو روزہ نیلامی میں آج آدھے آٹھ پر رکھے گئے تھے۔ باقی آدھے اور زیادہ قیمتی چیزیں عصرہ نے کل کے لئے بچا رکھی تھیں۔ وہ کال سننے مہمانوں سے ذرا الگ ہوا تو سیکرٹری عثمان قریب آیا اور سرگوشی کی۔

”سروہ پیسے میں اب ادا کروں ایڈم کو؟“

وان فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”کون سے پیسے؟“

”سر۔۔۔ جو آپ نے میرے اکاؤنٹ میں آن لائن بھجوائے تھے۔ اس رات جب آپ ملا کہ میں تھے اور آپ نے مجھے کال کر کے کہا

تھا کہ سیل فون کھو گیا ہے تو میں آپ کے لئے نیا فون اور نئی سم لے لوں۔“ وہ وضاحت دیتے دیتے خود بھی حیران نظر آنے لگا۔

”ہاں ہاں... رائٹ۔“ وہ سنبھل کے مسکرایا۔ ”تو تم وہ پیسے ایڈم کو کیا کہہ کے دو گے؟ کیوں دے رہے ہو اسے یہ؟“

”سروہی جو آپ نے کہا تھا کہ اس کو معلوم ہے یہ کس چیز کے ہیں۔ آپ نے اصل میں صبح سے پہلے ٹرانسفر کا کہا تھا مگر مجھے اس کا

اکاؤنٹ نمبر نہیں معلوم تھا اس لئے دیر ہو گئی۔“

”ہاں ابھی دے دو پھر۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کے گلاس سے کھونٹ بھرتا مڑ گیا البتہ ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پھر سے ابھرنے لگے تھے۔

سوموار کو اس کی واپسی پہ عثمان نیا فون اور سم کارڈ لے کر جب آیا تو اس نے یہ بتایا تھا کہ یہ حکم آدھی رات کو اسے فون کر کے فاتح نے ہی دیا تھا، مگر عصرہ سامنے تھی تو عثمان نے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے فاتح نے فون نکالا اور اپنا بینک اکاؤنٹ پورٹل کھولا۔ پھر آخری ٹرانزیکشن چیک کی۔ بیس ہزار رنگٹ۔ اس کی آنکھیں تعجب سے کھل گئیں۔ اس نے بیس ہزار کیوں بھیجے ایڈم کو؟ ٹرانزیکشن کرتے وقت یادداشت کے لئے جو نوٹ لکھا جاتا ہے، فاتح نے وہ نوٹ کھولا۔ وہاں ایک سطر لکھی تھی۔

For Chocolates

کیا یہ ٹرانزیکشن میں نے ہی کی ہے؟ مگر کسی اور کو میرا پاسورڈ نہیں معلوم۔ اور عثمان کو جب میں نے خود فون کر کے کہا ہے تو... اوہ خدایا۔ اس نے نائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہا تھا۔

گلاس ایک قریبی میز پر رکھا اور لوگوں کے درمیان سے گھاس پر راستہ بناتا آگے بڑھنے لگا۔ شدید گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

اندر لاؤنج میں بھی چند لوگ آ جا رہے تھے جو کسی ضرورت سے اندر آئے تھے یا ملازم تھے۔ وہ سب کو نظر انداز کرتا لاؤنج کے پرلے کونے پہ بنے پاؤڈر روم کی طرف بڑھا۔ (یہ ایسا کمرہ تھا جس میں بڑا سا آئینہ دیوار پہ لگا کے سامنے سنک بنے تھے۔ یہ صرف مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لئے تھا۔ ہاتھ روم کے طور پر استعمال کرنے کے لیے نہیں۔)

دروازے کا تاب گھمایا اور اسے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تیز زرد بتیاں جلی تھیں۔ دیوار گیر آئینے کے سامنے ماربل کا بڑا سا سلیب تھا جس میں فاصلے پہ دو سنک بنے تھے۔

ایک سلیب پہ ہتھیلیاں جمائے وہ جھکی کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ سرخ ساڑھی اور سنہری بالوں والی تالیہ۔ ”سوری۔ میں باہر جا رہا ہوں۔“ وہ واپس ہونے لگا تو تالیہ نے چونک کے چہرہ اٹھایا۔ آئینے میں اپنے عکس کے عقب میں چوکھٹ پہ ڈورنا ب پکڑے فاتح کو دیکھا۔ اور فاتح نے بھی آئینے میں اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھنکا۔

اس کے گال آنسوؤں سے بھیگے تھے اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ جیسے جسم میں خون کا قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔ شاید کافی دیر سے رو رہی تھی۔ کاجل بہہ گیا تھا۔ اسے عکس میں دیکھ کے بالکل ٹھہر گئی۔ فاتح نے ابرو تعجب سے اکٹھے کیے۔

”تم ٹھیک ہو؟“ رسی سا پوچھا۔

تالیہ نے نشورول سے لمبا سا نشو کھینچا اور اس کے قریب آئی۔ فاتح نے ڈور تاب چھوڑ کے راستہ دیا۔ تالیہ بے دردی سے آنکھیں رگڑیں اور ایک دکھ بھری نظر اس پہ ڈالی۔

”میرا نام.... تالیہ ہے۔ تالیہ بنتِ مراد۔“ تکلیف سے چبا چبا کے بولی۔

”ہاں واٹ ایور‘ تا شہ۔ تم آرام سے منہ دھولو۔ میں اپنے ہاتھ روم کی طرف جا رہا ہوں۔“ وہ پیچھے ہٹنے لگا تو وہ گلوگیر آواز میں چیخ کے بولی۔

”آپ یہیں رہیں۔ آپ اپنی صحیح جگہ پہ کھڑے ہیں۔ میں ہی غلط جگہ پہ کھڑی تھی۔ مجھے جانا چاہیے۔ آپ کو آپ کا گھر اور یہ زندگی مبارک ہو۔“

دکھا اور تنفر بھری نظروں سے اسے دیکھتی وہ پیر پختی آگے بڑھ گئی تو فاتح نے اچنبھے سے اسے جاتے دیکھا۔

”ہاؤ روڈ!“ پھر سر جھٹک کے آگے چل دیا۔

ایڈم لان کے دہانے پہ کھڑا عثمان سے بات کر رہا تھا جب وہ اندر سے آتی دکھائی دی۔ عثمان نے اسے ایک پھولا ہوا لفافہ تمھایا اور بے زاری سے چند جملے کہہ کے پلٹ گیا۔ تالیہ قریب آئی تو نڈھال لگتی تھی۔

”عجیب بات ہے۔ وان فاتح نے یہ پیسے مجھے کیوں بھجوائے ہیں؟“ وہ حیران سا اس سے پوچھنے لگا۔ ”میں نے پوچھا یہ کب بھیجے ہیں انہوں نے تو وہ بولا کہ اتوار کی رات کو کہا تھا یعنی جب ہم واپس آئے تھے۔ یعنی ان کی یادداشت جانے سے پہلے انہوں نے....“

”ایڈم.... پلیز.... مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ وہ اس کو نہیں سن رہی تھی۔ ایڈم نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا میک اپ منہ دھونے کے باعث ہلکا ہو گیا تھا۔ کا جل کچھ بہہ گیا تھا۔ اور آنکھوں کے کٹورے بار بار پانی سے بھر رہے تھے۔

”چہ تالیہ.... خود کو سنبھالیں۔“ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”مجھے اس وقت کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ بس تم کا راسٹارٹ کرو۔“ اس نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ”میں عصرہ کو الوداع کہہ دوں۔“

ایڈم کو وہیں چھوڑ کے وہ عصرہ کی طرف جانے لگی۔ وہ لان کے دوسرے دہانے پہ کھڑی مہمانوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ چند گز کا فاصلہ بھی اس کے لئے دو بھر ہو گیا۔ قدم بھاری بھاری سے ہونے لگے۔ وہ بدقت چلتی قریب آئی۔ جسم اتنا نڈھال تھا کہ لگتا تھا ابھی گر پڑے گی۔

”عصرہ....“ اس کے پکارنے پہ مسکراتی ہوئی عصرہ مڑی تو اس کی شکل دیکھ کے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”تالیہ تم ٹھیک ہو؟“ اسے تشویش ہوئی۔

”نہیں۔ میری طبیعت اچانک سے خراب ہو گئی ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ بہت معذرت۔“ وہ بدقت اپنے وجود کو مجتمع رکھے بول رہی تھی۔

”اوہ.... ابھی تو تمہارے بنائے میرے پورٹریٹ کی نیلامی بھی ہونا تھی۔“

”میں نہیں رک سکتی۔ پلیز۔“

”اٹس اوکے۔ کل آجانا۔ ویسے بھی گھائل غزال تو کل ہی لگے گی۔“

مگر اس کی بلا سے اب گھائل غزال اور عصرہ کے ساتھ جو بھی ہو۔ اسے اب کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ بس ایک دل تھا جو رک رک کے دھڑک رہا تھا۔ سارے مسئلے اس دل کے ہی تو تھے۔

راستے میں ایڈم خاموشی سے ڈرائیور کرتار بااوردہ چپ چاپ بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ آنسو بنا آواز کے بہہ رہے تھے۔ ایڈم بار بار ہارونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کے اسے دیکھتا، مگر کچھ کہہ نہ پاتا۔ پھر اس نے کوشش کی۔

”مجھے نہیں معلوم ان کا زیادہ بڑا جرم کیا ہے۔“ اسٹیرنگ وکیل گھماتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ”وہ پانی پی لینا، ہمیں بے خبر رکھنا یا آپ کو آزاد نہ کرنا۔ پتہ نہیں وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں لیکن اگر وہ ہمیں اس طرح اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں تو نکالنے دیجئے۔ دکھ مجھے بھی ہے، اور دماغ شل ہے لیکن میں نے کبھی ان سے لمبی امیدیں نہیں باندھی تھیں۔ اس لئے اب ہمیں بھی اپنی عام زندگیوں میں واپس چلے جانا چاہیے۔“

”ایڈم گاڑی روکو۔“ وہ ایک دم بلند آواز سے رونے لگی تو ایڈم نے جلدی سے کار آہستہ کی پھر اسے سڑک کے کنارے کھڑا کیا۔ وہ مصروف شاہراہ تھی اور کنارے پہ فٹ پاتھ بنے تھے جن کے ساتھ کھجور کے درخت قطار میں لگے تھے۔ وہ درخت کے سائے تلے رک گئے تھے اور شاخوں کے جھروکوں سے ڈوبتا سورج دکھائی دے رہا تھا۔

”وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“ وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ ”وہ مجھے یوں اکیلا کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ مجھے پہچان کیوں نہیں رہے؟ وہ مجھ سے پہلے کی طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔“

”چے تا ایہ.... ان کو کچھ یاد نہیں ہے۔“

”مگر میں نے ان کو خود بتایا تھا۔ جنگل میں ساری کہانی سنائی تھی ان کو۔ اور تم نے ان کو خزانے کا بتایا تھا، جب تم ان کو میرے پاس سن باؤ کے گھرا لئے تھے۔ مجھے پکڑنے کے لئے۔ پھر ان کو کیوں نہیں یاد؟“ وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”وہ سب چابی جوڑنے کے بعد ہوا تھا۔ جب میں کار میں ان کے ساتھ بیٹھا تو بات شروع کرنے سے قبل میں نے ان کو چابی دے دی تھی جس کو انہوں نے فوراً جوڑ دیا تھا۔ آپ کا خزانے کی تلاش میں آنا، اور ہمارا دروازہ پار کرنا، یہ سب بعد میں ہوا تھا۔“

”میں نے ان کو سب بتایا تھا جنگل میں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی آنسوؤں اور چٹکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ”اپنے بارے میں، عالم کے بارے میں، اشعر کی گھائل غزال سے متعلق سازش، عصرہ کا فائل چرانا، سب بتایا تھا۔“

”مگر ان کو یہ سب نہیں یاد۔ ان کی یادداشت میں آپ صرف ایک بگڑی امیرزادی ہیں جس نے ان کی فائل چرائی تھی۔“

”اور ان کے احساسات کا کیا؟ کیا یادداشت جانے سے وہ بھی ختم ہو گئے؟“ وہ بے یقینی بھری گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتہ“ چے تالیہ۔ مگر احساسات تو یادوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی تو مرادراجہ سے کبھی وہ انیسیت محسوس نہیں ہوتی جو وقت کا سفر کرنے سے قبل چھوٹی تالیہ کو ہوتی تھی۔“

”نہیں۔“ اس نے سر سیٹ کی پشت سے نکا دیا اور نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ سب ان کا کوئی پلان ہے۔ وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ ان کو سب یاد ہے۔“

”وہ جھوٹ نہیں بولتے۔“

”نہیں۔ میں نہیں مانتی۔ زندگی مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتی۔ قسمت میرے ساتھ اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”آپ denial میں ہیں۔“ اس نے افسوس سے تالیہ کو دیکھا۔ وہ روتے ہوئے نفی میں سر ہلارہی تھی۔

”میں نہیں مانتی۔ میں اتنی بری تو نہیں تھی کہ میرے ساتھ یہ سب ہوتا۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ سنا تم نے۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ مجھے یوں پہچاننے سے انکاری نہیں ہو سکتے۔“

”چے تالیہ....“

”وہ صرف اداکاری کر رہے ہیں۔ وہ عصرہ سے ڈرتے ہیں۔ میں ان کو دیکھ لوں گی۔ میں سب کو دیکھ لوں گی۔ میں ان سے بات کروں گی۔“ پھر اس نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑیں۔ ”ابھی لوگ تھے سامنے۔ کل میں ان سے اکیلے میں بات کروں گی۔ دیکھنا وہ تب وضاحت کریں گے کہ ان کا رویہ ایسا کیوں تھا۔“

”شاک ملنے کے بعد پہلا فیئر denial (نہ ماننے) کا ہوتا ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر کار اشارٹ کرنے لگا۔

”پھر جب یقین آتا تو وہ صدمے میں بدلتا ہے۔ پھر یا تو وہ ملال بن کے ختم ہو جاتا ہے یا غصے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ اس نے کار سڑک پہ ڈال دی۔ تالیہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اداس سائیڈم کہہ رہا تھا۔

”غصے کے بعد وہ انتقام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آپ کو خود کو اس فیئر سے نکالنا ہو گا تا کہ یہ ملال بن کے ختم ہو جائے۔ میری طرح۔ جیسے میں ابھی صدمے میں ہوں اور اس صدمے کو غصہ نہیں بننا چاہیے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ؟“ وہ دھکی لہجے میں بولی تو ایڈم ادا سی سے مسکرایا۔

”آپ کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟“ اور ایکسیلیئر پہ پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

تالیہ کے آنسو ایک دفعہ پھر تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے گردن موڑ لی اور بھاگتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔ اس دنیا کے لیے وہ واپس آئی تھی؟ اس زندگی کے لیے؟

وہ گھر آئی تو صد شکر آج داتن نہیں تھی۔ اس نے بس دروازہ بند کیا اور کشن لے کر وہیں لاؤنج میں صوفے پہ لیٹ گئی۔ کروٹ کے بل سمٹی

سمٹی سی لیٹی وہ روئے گئی۔ زار و قطار۔ بنا آواز کے۔ دل کے سب سے گہرے خانے سے اہل اہل کے آتے آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے گئے۔

کب رات گزری۔ کب صبح ہوئی۔ اسے علم نہیں ہوا۔ بس وہ گھنٹوں اسی پوزیشن میں لیٹی رہی۔ پھر کھڑکیوں سے روشنی اندر آنے لگی تو وہ آنکھیں پونچھتی اٹھی۔ سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ مگر اسے صرف ایک بات یاد تھی۔ اسے وان فاتح سے ملنا تھا۔

چند منٹ بعد وہ تیار ہو کے سیڑھیاں اترتی دکھائی دی تو خلاف معمول سادہ سی سفید اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی اور سیاہ منی کوٹ پہن رکھا تھا سہرے بال پونی میں باندھے، دھلا دھلا چہرہ اور خالی آنکھیں.... وہ جیسے اندر تک بدل گئی تھی۔

پورچ ابھی عبور کیا ہی تھا کہ گیٹ پہ گھنٹی بجی۔ وہ قریب آئی تو دیکھا، سامنے کورئیر سروس کارائیڈر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نوکری تھی جسے اس نے ادب سے بڑھایا اور ایک کانڈ سامنے کیا۔

”یہ آپ کے لئے آیا ہے۔“

تالیہ نے چپ چاپ دستخط کیے اور نوکری تھامی۔ وہ ہیلمٹ پہنتا واپس بانیٹ پہ بیٹھ گیا۔

”آج صبح مجھے وان فاتح کی دوسری ای میل موصول ہوئی ہے اور مجھے ان پیسوں کا مقصد انہوں نے سمجھا دیا ہے۔“ نوکری کے اندر کھے کارڈ پہ لکھا تھا۔ ”وہ چاہتے ہیں کہ میں ہر ہفتے آپ کو یہ بھیجا کروں۔ میں نہیں جانتا وہ ایسے کیوں کر رہے ہیں، مگر وجہ جو بھی ہو.... پپی برتھ ڈے۔“

اس نے نوکری میں جھانکا۔ اندر تازہ رسیلے کوکوپھل رکھے تھے۔ اور ان کے درمیان کہیں کہیں چاکلیٹ بارز پڑے تھے۔

(وہ اداکاری کر رہے ہیں۔ وہ عصرہ سے ڈرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔) وہ کار کی طرف بڑھتے ہوئے بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

کے ایل پہ کب سے بادل برس رہے تھے۔ وہ درمیانے طبقے کا علاقہ بارش سے بھیگ بھیگ چکا تھا۔ سڑک نشیب میں گرتی دکھائی دیتی تھی اور اطراف میں گھروں کی قطاریں تھیں۔ اس گیلی سڑک پہ ایڈم بن محمد آتا دکھائی دے رہا تھا۔ چیک والی میرون شرٹ سیاہ مینٹ پہ پہنے، وہ موبائل پہ چہرہ جھکائے ٹائپ کرتا چل رہا تھا۔

کیلکولیٹر پہ وہ حساب کر رہا تھا کہ جتنے پیسے وان فاتح نے دیے تھے ان سے اگر وہ ہر ہفتے کوکوپھل لے کر چے تالیہ کو دے تو وہ کتنے عرصے میں ختم ہوں گے؟

قریباً چار ماہ میں۔ اور اس کے بعد؟ اس نے گہری سانس لی اور موبائل اسکرین پہ وہ ای میل کھولی جو آج علی الصبح اسے موصول ہوئی تھی۔ وان فاتح نے وہ چار روز قبل بھیجی تھی مگر شیڈیول کر دینے کے باعث وہ آج اس تک پہنچی تھی۔

”ایڈم.... میرا سیکرٹری عثمان اب تک ایک خطیر رقم تمہارے حوالے کر چکا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس رقم سے ہر ہفتے تالیہ کو چاکلیٹس اور کوکو پھل بھجوا کر دو۔ وہ جہاں بھی ہو اس کو یہ ہر ہفتے ملنا چاہیے۔ بیس تاریخ کو اس کی سالگرہ ہے۔ میں چاہوں گا کہ تم بیس تاریخ سے اس کام کو شروع کرو اور جب تک یہ پیسے تمہارے پاس ہوں تم یہ کام کرتے رہو۔

فقط،

تمہارا وقت کا ساتھی۔“

وہ ای میل صبح سے کئی دفعہ پڑھ چکا تھا۔ تالیہ کو پھل بھجوانے کے بعد بھی وہ اسے بار بار کھولتا تھا۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ وہ اسے معلق کیوں کر گئے ہیں؟ یہ کیوں نہیں بتایا کہ اسے کوکو پھل بھجج کے وہ بار بار اسے اپنا آپ کیوں یاد دلانا چاہتے ہیں؟ ایسے تو وہ کبھی آگے نہیں بڑھ پائے گی۔ نئی زندگی نہیں شروع کر پائے گی۔ اوہ وان فاتح۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

اس نے موبائل جیب میں ڈالا اور گیلی سڑک پر تیز قدم بڑھانے لگا۔ گھروں کی قطار کے آگے ننھے ننھے باغیچے بنے تھے۔ بارش نے ان سب کو بھی دھو کے نکھار ڈالا تھا۔ ایڈم سرسری نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا، جیسوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا جب وہ رکا۔ اس کے گھر سے دو گھر چھوڑ کے ایک گھر کے باہر پتھر پٹی چوکی پر ایک نو عمر بچی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں قلم بھی تھا جس سے وہ بار بار کچھ انڈر لائن کرتی۔ بارہ تیرہ سالہ بچی نے ابھی تک اسکول یونیفارم پہن رکھا تھا اور سر کتاب پر جھکا تھا۔ کتاب کا سرورق دکھائی دے رہا تھا اس لئے اس کے قدم رکے۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا وہ اس کے قریب آیا۔

”لیزا!“ نرمی سے ہمسایوں کی بچی کو پکارا تو اس نے سر اٹھایا۔

”ایڈم آبنگ....“ پھر بھنوس بھنچیں۔ ”آپ مختلف لنگ رہے ہیں۔ یہ بالوں کو کیا کیا؟“

”تم اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ، کیا پڑھ رہی ہو؟“ دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”یہ!“ لڑکی نے کتاب اٹھا کے دکھائی۔ بھوری جلد پر سنہری رنگ سے واضح لکھا تھا۔ بنگاراملا یو (ملایا کانگریسی پھول) از آدم بن محمد۔

”یہ ایک تاریخی داستان ہے جو ہمارے کورس میں شامل ہے۔“

”اچھا۔“ وہ اداسی سے مسکرایا۔ ”کیسی کتاب ہے یہ؟“

”ہونہ۔“ خواہ مخواہ میں ہی لکھی مورخ نے۔ ”وہ منہ بنا کے بولی تو ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔“

”پتہ نہیں یہ کیوں اتنی موٹی تاریخی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ کون سا سلطان کس سن میں مرا؟ کون سی جنگ کس تاریخ کو ہوئی۔ ایک دم

بے کار۔ بھلا پوچھو جب بھی ہوئی ہو جنگ اس کے بارے میں علم ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اوپر سے اتنا مشکل ٹیسٹ آتا ہے اس سے

دل کرتا ہے اس مورخ کو بھرے چوک میں الٹا لٹکا کے....“

”بس تم ساری زندگی نکلی، کام چور اور جاہل رہنا۔“ وہ سرخ پڑتے کانوں کے ساتھ چمک کے بولا۔ ”ہمسائیوں کے گھروں سے مرغیوں کے انڈے اور محلے کی دکان سے چاکلیٹس چرا کر کے کھاتی رہنا۔ تمہیں کتابوں کی اہمیت پتہ ہوتی تو یوں مرمر کے پاس نہ ہوتیں۔ ہونہ۔ یہ لٹکانیں گی مورخ کو!“

بچی نے جواباً زور سے ”ہونہ“ کر کے سر جھٹکا اور چہرے کے آگے کتاب کر لی۔ ایڈم نے پیرنچا، زیادہ بلند آواز میں ”ہونہ“ کیا اور برے برے منہ بناتا آگے بڑھ گیا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو بادل چھٹنے لگے تھے اور دھوپ نکل رہی تھی۔ سفید بلی گھاس پہ انگڑائیاں لیتی سستانے میں مصروف تھی۔ ڈربے کے اندر بیٹھی مرغی چوکنی سی باہر جھانکتی بلی کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے بچے اس نے پروں کے قریب دبار کھے تھے۔

ایڈم نے پنجرے پر رکھے مرتبان کا ڈھکن کھولا، خوراک کی مٹھی بھری اور جھک کے جالی سے اندر پھینکی۔ چوزے چوں چوں کرتے فوراً سے دانوں کی طرف لپکے۔

”کیا صبح ہی صبح جاب ڈھونڈنے نکلے تھے؟“ ماں اس کے عقب میں کب آکھڑی ہوئی اسے علم ہی نہ ہوا۔ بس مسکراتے ہوئے چوزوں کو دیکھتا رہا۔

”ایڈم... نوکری ڈھونڈ رہے ہونا؟“ ابو کے چہرے پہ تشویش تھی۔ وہ جھاڑو ہاتھ میں لئے، استینیں اوپر چڑھائے، کام کے غالباً درمیان سے اٹھ کے آئی تھی۔

”نوکری کرنے سے کیا ہوگا، ابو؟“ اس کی نظریں چوزوں پہ جمی تھیں جو پھدک پھدک کے دانے چک رہے تھے۔

”پھر وہی مایوسی کی باتیں۔“

”غلط۔ مایوسی کی بات نہیں کر رہا۔ سوال پوچھ رہا ہوں۔ نوکری کرنے سے گھر میں ’دانہ آئے گا؟‘ وہ اس کی طرف گھوما تو چہرے پہ سنجیدگی تھی۔

”ہاں بیٹا، تم پیسے کمانے لگو گے تو شادی کر سکو گے، پھر اپنے بچے پال سکو گے، خوشحال رہو گے۔“

”یعنی نوکری صرف کمانے اور بچے پالنے کے لئے کی جاتی ہے۔ مگر ماں... وہ تو جانور ہوتے ہیں جو صرف کھانے اور بچے پیدا کرنے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔“

”وہ الگ بات ہے، ایڈم۔“ ابو نے سمجھانا چاہا مگر پنجرے کے سامنے کھڑا ایڈم اس کی نہیں سن رہا تھا۔

”میں سیکورٹی گارڈ کی نوکری ڈھونڈ رہا ہوں ماں۔ میں نوکری ضرور کروں گا، پیسے بھی کماؤں گا اور کیا پتہ کوئی بڑا خزانہ بھی میرے ہاتھ لگ جائے، لیکن ماں... کیا انسان کی زندگی میں کوئی بڑا مقصد نہیں ہونا چاہیے جو اس کو جانوروں اور پرندوں پہ فوقیت عطا کرے؟ کوئی تو فرق ہم میں ہونا چاہیے۔“

”ہاں ضرور۔ تم بامقصد نیک کام بھی کرو زندگی میں۔ لیکن نوکری الگ چیز ہے۔“

”نیک‘ بامقصد کام اور نوکری ایک ہی چیز کیوں نہیں بن سکتے ماں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس خود بھی نہیں ہے، مگر آج کل میں اکثر یہی بات سوچتا ہوں۔“ پھر اس نے گہری سانس بھری اور ایک نظر پنجرے پہ ڈالی۔ چوزے دانہ چک چکے تھے اور اب مٹی میں آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ ان کو مزید دانوں کی تلاش تھی۔ ننھے ننھے پیٹ تھے مگر بھوک مٹی ہی نہ تھی۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ صرف بھوک مٹانے کے لئے تھی۔

کیا ایڈم بن محمد ان ننھے پرندوں سے بھی گیا گزرا تھا؟ وہ ادا سی سے سوچے گیا۔

☆☆=====☆☆

آسمان خوب بارش برسا کے اب ہلکا ہو چکا تھا اور بادل چھٹ چکے تھے۔ دھوپ نکل آئی تھی اور ایسے میں پارلیمان کی عمارت فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

پارلیمان ایک اونچے ناور اور ساتھ زمین پہ پھیلی عمارتوں پہ مشتمل تھی۔ زمین پہ لیٹی عمارت میں (پارلیمان اور سینٹ) کے ایوان تھے اور اونچے ناور میں پارلیمانی ممبرز کے آفسز تھے۔

ناور کے اندر قطار میں لفٹس لگی تھیں۔ ایک لفٹ کے دروازے کھلے تو اندر سے وان فاتح باہر نکلا۔ سامنے طویل کاریڈور تھا جس میں بتیاں جلی تھیں اور چند افراد آ جا رہے تھے۔ فاتح موبائل کوٹ کی جیب میں ڈالتا عثمان سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے اس نئے legislation کا ڈرافٹ اپنی میز پہ چاہیے۔“

”سروہ تو میں نے آپ کو ہفتے والے روز ہی دے دیا تھا۔“

”ہاں آف کورس!“ فاتح نے گہری سانس لی اور پیشانی چھوئی پھر تیز قدم اٹھاتے عثمان کی طرف جھک کے کہا۔ ”مگر درمیان میں اتوار کا دن آگیا جو میں نے ملا کہ میں گزارا۔ کبھی ایسا ہوا تمہارے ساتھ عثمان کہ تم صرف ایک رات کے لئے سوؤ اور جب جاگو تو لگے ایک زمانہ بیت چکا ہے۔“ ساتھ ہی جھر جھری لے کر سر جھٹکا۔

”کبھی میں بہت تھکا ہوا ہوں تو ایسا لگتا ہے‘ سر۔“ عثمان نے انک انک کے جواب دیا اور پھر فاتح کو دیکھا۔ وہ گرے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا، گیلے بال دائیں طرف کو جھار کھے تھے اور آنکھ کے قریب زخم کنسیلر لگا کے چھپا رکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کھڑے ایک ’کارکن‘ سے یوں دل کی بات پہلے نہیں کیا کرتا تھا۔ یہ عادت کب سے پڑی اس کو؟

راہداری میں وہ مڑے تو لیڈر آف اپوزیشن کا آفس سامنے نظر آیا۔ وان فاتح کے قدم سست ہوئے۔ بند دروازے کے سامنے تالیہ کھڑی تھی۔

”تم... ادھر؟“ اسے حیرت ہوئی۔ پھر ایک برہم نظر عثمان پہ ڈالی۔

”اگر پرس میں پیسے ہوں تو لیڈر آف اپوزیشن کے آفس تک پہنچنے کی اجازت مل جاتی ہے، فاتح صاحب!“ وہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی پاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سادہ سفید اسکرٹ بلاؤز پہ سیاہ کوٹ.. پونی میں بندھے بال، دھلا دھلا یا چہرہ... روئی روئی آنکھوں تلے سرخی... وان فاتح پتلیاں سکڑ کے اسے دیکھتا قریب آیا۔

”نصیریت؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ اسے یہ ناگوار گزرا تھا۔

”ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو میں اندر آ سکتی ہوں؟ نہ بھی لگے تو میں اندر آنا چاہوں گی۔“ وہ ہٹ دھرم لگ رہی تھی۔ آج آریا پار ہونا تھا۔

فاتح نے ضبط سے پہلے عثمان کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر تالیہ کو پیچھے آنے کا کہا۔ اندر آتے ہی وہ سیدھا اپنی کرسی کی طرف گیا۔

”بیٹھو، تاشہ۔ اور بتاؤ کیا بات ہے۔“ ہاتھ جھلا کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں وہ دونوں تنہا تھے۔ کوئی ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی قریب آئی۔ کرسی کھینچی۔ اس پہ بیٹھی۔ مگر پلک تک نہ جھپکی۔ بس اسے دیکھے گئی۔

”تاشہ جو بھی کہنا ہے تمہیں، بس پانچ منٹ میں کہو اور مجھے کام کرنے دو۔ اس سے زیادہ مروت کا مظاہرہ میں نہیں کر سکتا۔“ وہ ہموار لہجے میں بولا۔ پاٹ آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ کوئی شناسائی.. کوئی بیتے زمانوں کا عکس... ان آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔

”آپ جانتے ہیں میں کیا کہنے آئی ہوں۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ گلارند ہنسنے لگا۔

”میں وہ گھر تمہیں نہیں بیچنا چاہتا۔ وہ بات ختم ہو چکی ہے۔ مزید کوئی بات کرنی ہے تو بتاؤ۔“ وہ ناراض نہیں لگ رہا تھا، بس بے زار تھا۔

یہ بے گانگی، یہ بے نیازی....

تالیہ کا دل برہنہ کن کے ساتھ ڈوبنے لگا۔

وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

وہ واقعی سب فراموش کر چکا تھا۔

وہ اس کے لئے صرف ایک سطحی، بگڑی ہوئی امیرزادی تھی جو بار بار اس کے پیچھے آرہی تھی۔ یا اللہ... اگر اسے واقعی کچھ یاد نہیں تو وہ اس کے بارے میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا؟

حقیقت کی روشنی ذہن کی کھڑکیوں سے اندر گئی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے تھوک نگا اور سارے آنسو پی گئی۔ پھر ذرا سنبھل کے بیٹھی۔

”میں صرف ایک وضاحت دینے آئی تھی۔ آپ نے...“ وہ سوچ سوچ کے بول رہی تھی۔ نیم اندھیر آفس ایک دم ٹھنڈا لگنے لگا تھا۔

”آپ نے مجھ پہ الزام لگایا تھا کہ وہ فائل میں نے چرائی تھی۔ اشعر صاحب کے کہنے پہ۔ آپ اپوزیشن لیڈر ہیں۔ حکومتی اراکین پہ الزام

لگاتے ہیں تو ثبوت بھی دیتے ہیں۔ مجھ پہ الزام لگانے کا ثبوت نہیں دیا مجھے آپ نے۔“
 ”تمہیں شکرا داکرنا چاہیے کہ میں نے ثبوت پولیس کو نہیں دیے۔ خیر۔ فائل میں واپس لے چکا ہوں۔ اس لئے اس ٹاپک کو بند کر دو تو اچھا ہوگا۔“

”پوچھ سکتی ہوں فائل واپس کیسے لی آپ نے؟ سچے اور ایماندار لیڈر ہیں آپ، اپنی ووٹر کے سوال کا جواب دیا ننداری سے دینا چاہیے آپ کو۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے سوال کرتی میز پہ دونوں مٹھیاں رکھے ہوئے تھی۔ سر دھیشے سے ٹھنڈک سی نکلتی اس کے سارے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔

”اچھا تو تم نے مجھے ووٹ دیا تھا۔“ وہ ٹائی کو ذرا ڈھیلا کرتا کرسی پہ پیچھے ہو کے بیٹھا۔
 ”میرا سوال وہیں موجود ہے فاتح صاحب۔ اگر آپ نے سچ بولا تھا کہ فائل واقعی چوری ہوئی ہے تو اتنی جلدی واپس کیسے آگئی؟“ اس نے ٹھنڈے شیشے سے ہاتھ بنا کے گود میں رکھ لئے۔ نظریں وان فاتح کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

”میں نے ایک انویسٹی گیشن ہار کیا تھا۔ خوش؟“ ساتھ پہ ابر واچکائے۔ وہی ازلی بے نیازی۔ وہ واقعی بھول چکا تھا۔
 تالیہ نے بدقت خود کو سنبھالا۔ دل زخم زخم ہو رہا تھا۔

”میں نے آپ کی فائل نہیں چرائی تھی۔ کل بھی کہا تھا اور آج بھی کہوں گی۔ لیکن ٹھیک ہے۔ اس ٹاپک کو بند کر دیتے ہیں۔ آپ مجھے گھر نہ پہنچنا چاہیں آپ کی مرضی۔ بس میرے ایک آخری سوال کا جواب دیا ننداری سے دے دیں۔“

پرس اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تو وہ ”عادتاً“ اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہیں اٹھنا چاہیے تھا پھر کیوں؟
 وہ ہلکا سا مسکرائی۔ وہ اس عادت کو پہچانتی تھی۔ یعنی اس کی صرف narrative memory کھوئی تھی۔ عادات اور سیکھی ہوئی چیزیں اس کے وجود سے الگ نہیں ہوئی تھیں۔

”آپ مجھے وہ گھر کیوں نہیں پہنچنا چاہتے؟“

”کیونکہ وہ ایک تاریخی ورثہ ہے اور تم تاریخی چیزوں کو صرف پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھتی ہو۔“

”اور کس لیے ہوتی ہے تاریخ؟“

”تاریخ“ ”سیکھنے“ کے لئے ہوتی ہے۔ عبرت کے لئے۔ وہ گھر میں اس کو بچوں کا جو اس کی قدر کرنا جانتا ہوگا۔ اور تم صرف پینٹ کرنا جانتی ہو۔“ دونوں کے درمیان میز تھی اور وہ اس کے کناروں پہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فرش سے اٹھتی ٹھنڈک اس کے پیروں میں سرایت کرتی اسے برف کر رہی تھی۔

”آپ پینٹرز کو کتر سمجھتے ہیں؟“ اس کی ریڑھ کی ہڈی مارے سردی کے دکھنے لگی تھی۔

”نماشا!“ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کے جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انیسویں صدی میں ایک امیر گھرانے کی لڑکی الڑتھ تھامسن پینٹ کیا کرتی تھی۔ تب عورتیں اگر پینٹرز بنتی تھیں تو وہ تمہاری طرح عام چیزیں بناتی تھیں۔ پھول، انسانی شکل، گلستان۔ سینری۔ مگر الڑتھ کی سوچ گہری تھی۔ وہ جنگی پینٹنگز بناتی تھی۔ اور ہاں، تب یہ جنگوں پہ مبنی فلمیں نہیں بنتی تھیں نہ اس نے جنگیں دیکھی تھیں جو اس کو معلوم ہوتا کہ جنگیں کیسی ہوتی ہیں۔ جانتی ہو اس نے اپنی ایک شہرہ آفاق پینٹنگ بنانے کے لئے ایک کھیت میں بچوں کو دوڑایا، پھر بہت سے گھوڑے خریدے اور ملازموں کو فوجی وردیاں پہنانے کے اس میں دوڑایا۔ پھر نقلی لڑائی کروائی۔ اس سے کھیت تباہ ہوا، دھول اٹھی، میدان کا رنگ بدلا۔ اور وہ ناز و نعم میں پلی لڑکی پینٹ کرتی گئی۔ مجھے صرف اس پینٹر عورت نے متاثر کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے روشناس کروانے کے لیے پینٹ کرتی تھی۔ میں پینٹرز کو کمتر نہیں سمجھتا۔ مگر میں صرف ان پینٹرز سے متاثر ہوتا ہوں جو کسی بڑے مقصد کے لئے پینٹ کرتے ہیں۔ جیسے الڑتھ کرتی تھی۔“

یکدم ساری ٹھنڈک تالیہ کے جسم سے نکلتی گئی۔ اس کا چہرہ دہسنے لگا۔ تنفس تیز ہو گیا۔ وہ آگے بڑھی، ہتھیلیاں میز پر رکھ کے اس کے انداز میں جھکی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ یہ بتانا بھول گئے فاتح صاحب کہ.... الڑتھ نے لارڈ نیلی سے شادی کر لی تھی۔ اس کا تنگ ذہن جاگیردار نواب شوہر سمجھتا تھا کہ عورت کی اپنی سوچ نہیں ہو سکتی، وہ اپنی رائے نہیں رکھ سکتی اور اسے پینٹ کرنی کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کبھی الڑتھ کے ٹیلنٹ اور شوق کی انتہا کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنے نظریات الڑتھ پر چھوٹے شروع کر دیے اور اس کا کیرئیر آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ شاید اس کا دل مر گیا تھا۔ آپ نہیں جانتے فاتح صاحب، ظالم اور بے حس آدمی سے شادی اونچے ارادوں والی لڑکی کو کیسے ماردیتی ہے۔“

پرس کا اسٹریپ پھسل کے نیچے آ گیا تھا۔ اس نے اسے کندھے پر دوبارہ جمایا اور ایک شکوہ کنناں نظر اس پر ذاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فاتح نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا اور کرسی سنبھالی۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ شکر کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر چلی گئی۔

☆☆=====☆☆

کے ایل کے قریب پتراجایا کا شہر تھا۔ کے ایل کی اکثر سرکاری عمارتیں اب پتراجایا منتقل ہو چکی تھیں اور وہ طاقت اور اثر و رسوخ کا منبع بن چکا تھا۔ بارش کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد دھوپ چلی گئی اور سارے شہر پہ ٹھنڈی سی چھایا چھا گئی۔ پتراجایا میں ایک بڑا سا پل تھا جس کے چاروں طرف اونچے ناورز بنے تھے۔ پل کے درمیان میں سڑک گزر رہی تھی اور دونوں اطراف میں سرکار پٹ سے مزین فٹ پاتھ بنے تھے جن کے اوپر لوگ پیدل بھی نل عبور کر رہے تھے۔

دونوں طرف کے سرخ فٹ پاتھ کو اونچے ریلنگ نے مقید کر رکھا تھا۔ نیچے دریا کی صورت بنی جھیل بہہ رہی تھی۔ وہاں سیاح جگہ جگہ کھڑے تھوڑے کھنچواتے دکھائی دے رہے تھے۔

مگر وہ سیاحوں کی طرح کھڑی نہیں تھی۔ وہ رینگ سے ٹیک لگائے، سرخ کارپٹ پہ اکڑوں بیٹھی نیچے بہتی جھیل کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ کوٹ ساتھ زمین پہ پڑا تھا۔ اور ہوا سے پونی جھول رہی تھی۔ خالی خالی سیاہ آنکھیں دور پانیوں پہ جمی تھیں۔ پل کی پتھر ملی سڑک کی طرف اس کی پشت تھی اور سڑک پہ دوڑتی ٹریفک کا شور اس کو محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے جیسے سارے احساسات برف ہو گئے تھے۔ اور جب برف پگھلی تو برشے بہہ گئی۔ وہ خالی ہاتھ، خالی دامن بیٹھی تھی۔

سیاہ بوٹ میں مقید و قدم اس کے قریب آ کے رکے۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ بس پانی کو دیکھتی، خود فراموشی کے عالم میں بولی۔

”میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کھو گیا۔ میرا اس کے ساتھ گزارا اچھا وقت چوری ہو گیا۔ میرے سارے سچ جھوٹ بن گئے۔ وہ مجھے اب پہچانتا بھی نہیں ہے۔ کوئی ایسے کیسے اجنبی بن جاتا ہے، ذوالکفلی صاحب؟“ شکوہ کناں پلکیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

وہ سیاہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ چڑھائے ہوئے تھا۔ بال جگہ جگہ سے سفید تھے اور چہرے پہ مسکراتے ہوئے جھریاں پڑ رہی تھیں۔

”کیا ہوا ہے، تالیہ؟ تم فون پہ اتنی ٹوٹی ہوئی کیوں لگ رہی تھیں؟“ وہ نرمی سے سوال کرتا اس کے سامنے سرخ قالین پہ بیٹھا، ایسے کہ ذوالکفلی کی پشت جھیل کی طرف اور چہرہ تالیہ کی جانب تھا۔

”میں زندگی میں پہلی دفعہ اتنی بری طرح ہاری ہوں۔ مجھے غلط آدمی سے محبت ہو گئی۔ وہ شادی شدہ تھا، اس کے دو بچے تھے اسی لئے میں اس کا خواب نہیں دیکھتی تھی۔ مگر وہ ان دیکھا خواب سچا ہو گیا۔ وہ مجھے مل گیا، لیکن وہ چھوڑ دیتا تو اچھا تھا۔ کم از کم وہ میرا دوست تو رہتا....“

اس کی آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھرنے لگے۔ ”مگر اس نے تو مجھے اپنی زندگی سے کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ ایسا بے نیاز اور بے حس ہو گیا کہ اسے میری ساری اچھائیاں بھول گئیں۔ اسے میری ذہانت، میری کوشش سب بھول گیا۔ میں اس کے لئے صفر ہو گئی ہوں بلکہ شاید منفی کا کوئی ہندسہ!“ آنسو پٹ پٹ گالوں پہ گرنے لگے۔

”میں کیا کروں، ذوالکفلی صاحب، میں اتنی دکھی ہوں کہ میرا دل زندہ رہنے کو بھی نہیں چاہتا۔ میں نے ہر چیز ہار دی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا۔“

ذوالکفلی نے سیاہ چشمہ اتارا اور اپنی جھریاں زدہ آنکھوں کی پتلیاں سکوڑ کے اس کا بھیگ چہرہ دیکھا۔

”کیا اسے تم سے محبت تھی؟“

”اپنا سیت تھی، دوستی تھی، محبت کا علم نہیں۔ پھر اس کا ایک حادثہ ہو گیا۔ اس کی یادداشت کھو گئی۔ اب وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ اس کا ذہن اس وقت تک رک گیا ہے۔ جب تک وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس کو یاد ہی نہیں کہ ہم نے ایک ساتھ کن بلندیوں کا سفر کیا تھا۔“

اس نے روتے ہوئے سر گھٹنوں پہ ٹکا کے آنکھیں بند کر دیں۔ گرم پانی گالوں پہ بہتا محسوس ہوا۔ سارا منظر سیاہ ہو گیا۔ پھر اس میں ذوالکفلی کی آواز گونجی۔

”کیا تم نے اس کے ساتھ زندگی کی کوئی بلندی دیکھی تھی؟“

”ہاں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔ ”ساری دنیا ختم ہو گئی تھی اور بس ہم رہ گئے تھے۔ جنگل کے ساتھی۔ محل کے ساتھی۔ قید خانے کے ساتھی۔ اور اب وہ اپنے محل میں واپس جا چکا ہے۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ۔ وہ اپنی بلندی پہ واپس جا چکا ہے اور میں پاتال میں پڑی ایک بھکارن کے سوا کچھ نہیں رہ گئی۔“

”تمہیں یہ تصویر یاد ہے۔“ آواز پہ اس نے گیلی پلکیں کھولیں اور سر اٹھایا تو اندھیرا چھٹا اور سامنے سرخ قالین پہ اُلتی پالتی کیے بیٹھا ذوالکفلی نظر آیا۔ وہ موہا بل اسکرین پہ اسے ایک تصویر دکھا رہا تھا۔ منظر دھندلا تھا۔ تالیہ نے پلکیں جھپکیں تو وہ واضح ہوا۔ ”یہ تم نے بچپن میں بنائی تھی۔ تم اکثر اسی طرح کی تصاویر بناتی تھیں۔ پہاڑی پہ بنے اونچے محل، اور نیچے بہتا سمندر۔“ تالیہ نے اس پینٹنگ کو دیکھا تو آنسو پھر سے بہنے لگے۔ سرسبز پہاڑی۔ تعمیر شدہ بھوری لکڑی کا محل.... اور عقب میں بہتا نیلا سمندر۔ اسے بند اہارا کا محل یاد آیا۔

”تمہارے سارے محل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ پہاڑی کبھی سرسبز ہوتی، کبھی بھوری بخر۔ سمندر کبھی رات کے باعث سیاہ ہوتا، کبھی سورج میں نیلا سبز چمک رہا ہوتا۔ مگر جانتی ہوں سب میں مشترک کیا ہوتا تھا؟“

”کیا؟“ اس نے چونک کے ذوالکفلی کو دیکھا۔ وہ مسکرایا تو اس کی آنکھوں کے گرد جھریاں گہری ہونے لگیں۔

”تم نے کبھی سڑک نہیں بنائی۔“

تالیہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔ ”سڑک؟“

”محل تک پہنچنے کے لئے پہاڑی پہ سڑک ہونا ضروری تھی، تالیہ۔ مگر تم کبھی سڑک نہیں بناتی تھیں۔“

اس نے بے یقینی سے تصویر کو دیکھا۔ اس پہ واقعی کوئی سڑک، کوئی راستہ نہیں بنا تھا جو پیدل چلنے والے کو اوپر لے جائے۔

”اور یہی زندگی ہے۔ بلندی پہ بنے محل تک پہنچنے کے لئے کوئی صاف سڑک موجود نہیں ہوتی، پتری تالیہ (شہزادی تالیہ)۔ دشوار گزار پہاڑی راستوں پہ سچ سچ کے چلنا ہوتا ہے۔ ذرا سا قدم پھسلا تو نیچے سمندر میں جا گروگی۔“

تالیہ نے آہستہ سے ہتھیلی کی پشت سے گال صاف کیے۔ وہ بالکل سن ہی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

”زندگی نے آسان سڑکوں کا وعدہ کر بھی نہیں رکھا، پتری! اگر تمہیں اس سے محبت ہے تو کسی دوسرے کا راستہ کاٹنے کی بجائے اپنا راستہ خود بنانا ہوگا۔ اس تک پہنچنے کا راستہ آسان نہیں ہوگا۔ بار بار گروگی، زخمی ہوگی، اور شاید اس تک پہنچ بھی نہ سکو، لیکن کم از کم ایک دفعہ کوشش تو کرو۔“

اس کے آنسو رک چکے تھے اور وہ گم صم سی نظریں اسکرین پہ جمائے ہوئے تھی۔

”وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال چکا ہے۔“

”اگر اس کو کسی حادثے نے تم سے الگ کیا ہے، اس کے دل کے گدے پن نے نہیں تو تم اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہو؟“
 ”تو کیا کروں؟ کسی Low life، بے وقار، بے خود عورت کی طرح اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس کے گرد منڈلاتی رہوں؟“ قدرے غصے سے بولی۔ ”یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

”اگر وہ محل پر رہنے والوں میں سے ہے اور تم اس کے ساتھ تعلق کی بلندی تک جا چکی ہو تو یہ اسی صورت ہو، ہوگا کہ تم بے وقار، بے خود عورت نہیں بنی ہوگی۔ اور بلندیوں پر رہنے والوں کو بلندی کے لوگ ہی بھاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ رہنے کے لئے خود کو بے وقار کرنا ضروری تو نہیں۔ اور تم اتنی ذہن ہو کہ مجھے یقین ہے، تم بہتر راستے نکال ہی لوگی۔ اگر نہیں نکال سکتیں تو میں نہیں مان سکتا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ کوئی بلندی دیکھی تھی!“ تالیہ نے چہرہ موڑ کے دور نظر آتی اونچی عمارتوں کو دیکھا۔

”دیکھی تھی۔ ہم ایک زمانہ ساتھ رہے تھے۔ پھر میرے باپ نے مجھ سے وہ بلندی چھین لی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ سب مجھے واپس مل سکتا ہے؟“

”انسان دل سے کوشش کرے اور اس کی تکنیک درست ہو تو اسے سب مل سکتا ہے۔“ ذوالکفلی نے اسکرین بجھائی اور موبائل واپس جیب میں ڈالا۔

”میرا دل ٹوٹ گیا ہے، میرے جھوٹوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے آن لیا ہے۔ مجھ میں اس دشوار گزار گھاٹی پہ چڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں تو بالکل ہار چکی ہوں۔“

”پتری تالیہ... میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت بالکل مایوس ہو۔ تمہیں اپنا آپ ایک فیلیئر لگ رہا ہے لیکن اب بھی اگر تمہارے پاس دو چیزیں ہیں تو تم دوبارہ سے کھڑی ہو سکتی ہو۔“

اس نے چونک کے ذوالکفلی کو دیکھا۔ ”دو چیزیں؟“
 ”پہلی چیز... تمہاری sanity قائم ہے۔ تم کتنی بھی ٹوٹی ہوئی کیوں نہ ہو، کم از کم تم جھیل میں کود نہیں رہیں، یا لباس چاک کر کے سر میں مٹی نہیں ڈال رہیں۔ ساری مایوسی ایک طرف، تم اب بھی اپنے حواسوں میں ہو۔ اس کا مطلب ہے تم پھر سے کھڑی ہو سکتی ہو...“
 تالیہ نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ آنسو پھر سے گرنے لگے۔ ”ظاہر ہے میں جانتی ہوں کہ اگر اس سے مایوس ہو بھی جاؤں تو کہیں دور چلی جاؤں گی، خاموش اور اداس زندگی گزاروں گی۔ مگر حواس سلامت ہیں میرے۔ اپنا تماشا نہیں بناؤں گی نہ خودکشی کروں گی۔“ پھر توقف سے بولی۔ ”اور دوسری چیز؟“ ساتھ ہی ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

”تمہیں اپنی غلطی معلوم ہے اور اس کو اب بھی درست کر سکتی ہو۔ تمہاری غلطی کیا تھی، تالیہ؟“ اس نے دہرایا۔
 ”میری کریڈیٹ پہلٹی نہیں ہے۔ میری بات بے وزن اور بے معنی ہے کیونکہ میں سچ نہیں بولتی تھی۔ اگر میں نے خود کو سچا بنایا ہوتا تو میرا قول معتبر ہوتا اور میری ہر بات پہ وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا۔“

”دیکھا.... یہ دونوں چیزیں تمہارے پاس ہیں۔ تمہارے حواس برقرار ہیں اور تمہیں اپنی غلطی معلوم ہے۔“ وہ مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ اس کے عقب میں بہتی جھیل کے اوپر پرندوں کا ایک غول اڑ رہا تھا۔ تالیہ کی نظریں ان کے پروں پہ جم گئیں۔

”کیا شدید بچھتاؤں اور مایوسی سے نکلنے کے لئے بس یہی دو چیزیں چاہیے ہوتی ہیں؟ حواس برقرار ہونا اور اپنی غلطی پہچان کے اسے درست کرنے کی کوشش کرنا؟“

”میرے نزدیک تالیہ.... یہ دونوں کافی ہوتی ہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دہرا رہا تھا۔ تالیہ نے دوبارہ سے آنکھیں رگڑیں۔

”تو اب میں کیا کروں؟ کہاں سے شروع کروں؟“

”یہ میں تمہیں کیونکر بتا سکتا ہوں؟“ وہ حیرت سے مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گردن اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔ مسکراتے ہوئے ذوالکفلی کی آنکھیں مزید چھوٹی ہو گئی تھیں۔

”تم تالیہ مراد ہو، اور تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان بی ہوتا ہے۔“

”میرے پاس کبھی پلان بی نہیں ہوتا۔ پلان سی ڈی سب بناتی ہوں مگر بی کا خانہ خالی چھوڑتی ہوں۔ سب مجھ پہ اعتبار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ہر چیز نام کام ہو جائے تو بھی تالیہ کا پلان بی انہیں مصیبت سے نکال دے گا مگر ذوالکفلی صاحب... تالیہ کے پاس کوئی پلان بی نہیں ہوتا۔“

”اب ہوگا!“ وہ یقین تھا۔

چند لمحے بعد ذوالکفلی سرخ فٹ پاتھ پہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ اسی طرح وہاں اکڑوں بیٹھی جھیل کے اوپر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

بنا کسی بوجھ کے وہ ہلکے اور آزاد پرندے اپنے پر پھیلانے فضا کو چیر کے اوپر اڑتے جا رہے تھے۔

اوپر.... بلندیوں کی طرف.....

☆☆=====☆☆

سرخ مخروطی ٹکون سے مزین شیشوں سے ڈھکی عمارت پوری شان سے کے ایل کے کاروباری علاقے میں کھڑی تھی۔ اندر آؤ تو نیچے ایک شاندار سا شاپنگ مال بنا تھا جہاں بے فکر لوگ راہداریوں میں ٹہلتے، شاپنگ بیگز اٹھائے، خریداری میں مصروف نظر آتے تھے۔ مال کی چھت جہاں ختم ہوتی، اس سے اوپر والے فلورز مختلف کمپنیوں کے آفسز پہ مشتمل تھے۔ ایک فلور بارین نیشنل (سیاسی جماعت) کا ہیڈ آفس تھا۔ اس فلور کا ماحول یکسر مختلف نظر آتا تھا۔ یہاں ہر طرف چھتوں پہ سفید بتیاں جل رہی تھیں اور شیشے کی دیواروں سے بنے کیبن میں لوگ کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک آفس میں اشعر محمود کنٹرول چیئر پہ بیٹھا ایپ ٹاپ پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ ٹک سک سے تیار، گہرے نیلے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس، بال جیل سے کھڑے کیے، وہ اس چھوٹے سے آفس سے مطابقت رکھتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ آفس پارٹی عہدے کی وجہ سے اس کو اس عمارت میں ملا ہوا تھا جبکہ اس کا اصل آفس یہاں سے کچھ دور کاروباری مراکز پہ مبنی ایک اونچی عمارت میں تھا۔ وہ آفس شاہانہ اور پر تعیش تھا، اور اسی کے لا کر سے 'حالم' نے سن باؤ کے گھر کی فائل چرائی تھی۔ جبکہ یہ والا عام سا تھا۔

”سر!“ سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ریلی کھنکھارا۔ اشعر نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے اپنے ادھیڑ عمر سیکرٹری کو دیکھا۔

”میں نے بہت تلاش کیا ہے مگر میں یہ معمہ حل نہیں کر سکا کہ وہ فائل وان فاتح کے پاس واپس کیسے پہنچی۔“

اشعر نے ایک گہری نظر ریلی پہ ڈالی۔ ”یہ معمہ تو میں بھی حل نہیں کر سکا، بہر حال تم اس کی فکر نہ کرو۔“ ریلی کے اندر تک اترتی نظروں سے اسے گھورا۔ ”جو بھی چور ہے، چاہے وہ اپنا ہے، چاہے وہ دشمن ہے، میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ فی الحال تم آج کی نیلامی کی فکر کرو۔“

”سر، ساری تیاری مکمل ہے۔“ ریلی جوش سے بتانے لگا۔ ”آج گھائل غزال نیلامی کے لئے رکھی جائے گی۔ ہمارا آدمی جو کہ ایک قابل برنس مین ہے، وہاں بولی لگائے گا۔ وہ بولی کو بڑھاتا جائے گا اور مہنگی ترین قیمت پہ گھائل غزال خرید لے گا۔ چونکہ رقم فوراً نہیں بلکہ دو دن میں ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے وہ سودا طے ہوتے ہی دو ماہ برا میکسپرس کو بلائے گا اور سب کے سامنے وہ گھائل غزال پہ ٹیسٹ کرنا چاہیں گے۔ عصرہ بیگم منع کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گی اور ماہرین یہ راز فاش کریں گے کہ پینٹنگ جعلی ہے۔ یوں ہمارا بندہ پیسے دینے سے بچ جائے گا اور....“

”اور عصرہ اور فاتح کی ساکھ خاک میں مل جائے گی۔“ اشعر پیچھے ہو کے بیٹھا اور سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی۔ ”پچھلے دس سال میں عصرہ کے بیچے گئے ایک ایک آرٹ پیس کا آؤٹ اور تحقیق شروع ہو جائے گی۔ مقدموں کے انبار لگ جائیں گے اور ان دونوں کے پاس ایکشن کے بارے میں سوچنے کے لئے وقت نہیں ہوگا۔ لیکن....“ وہ لائٹ سے سگریٹ جلاتے ہوئے چونکا۔ جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

”وہ لڑکی.... تالیہ مراد.... وہ بھی یہی پینٹنگ خریدنا چاہتی تھی۔ تم اس امر کو یقینی بناؤ گے کہ پینٹنگ ہمارا بندہ ہی خریدے۔ کیونکہ وہ عصرہ کی دوستی اور مروت میں ٹیسٹ نہیں کروانے دے گی۔ اور سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔“

”سر، بے فکر رہیں۔ ہم بولی کو اتنا اوپر لے جائیں گے کہ وہ اس لڑکی کی پہنچ سے دور ہو جائے گی۔“ ریلی پر اعتماد تھا۔ اشعر محمود کے لبوں پہ مسکراہٹ درآئی۔ اس نے جلتے سگریٹ کا کش بھرا، اور پھر جھک کے سگریٹ کو الیش ٹرے تک لے گیا۔

”عصرہ اور فاتح اتنے بڑے اسکیٹڈل میں پھنس جائیں گے کہ ان کی صداقت اور امانت مشکوک ہو جائے گی۔ اور پھر....“ اس نے سگریٹ کو جھٹکا۔

راکھ شیشے کے پیالے میں جاگری۔

“Ashes Ashes, We all fall down!”

پیالے کے وسط میں راکھ کے ٹکڑے پڑے تھے۔ دہکتے انگاروں سے نکلنے والے ٹھنڈے بے جان ٹکڑے...! اشعر کی نظریں ان پہ جم گئی۔ سرمئی پن میں یادوں کی ملاوٹ گھٹنے لگی....

وہ اس وسیع و عریض، پر تعیش آفس میں میز کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چند برس پہلے کا اشعر۔ اس کے بال نسبتاً چھوٹے اور چہرہ کم عمر لگتا تھا۔ سفید براق شرٹ پہ میرون ویسٹ پہنے، وہ تک سب سے تیار لگتا تھا، مگر آنکھیں قدرے اداس تھیں۔

کنٹرول چیئر پہ محمود صاحب براجمان تھے۔ ادھیڑ عمر، پختہ چہرے اور برہم آنکھوں والے صاحب جن کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔ ایک زمانے میں یہ ان کا آفس ہوتا تھا۔ اور بے بس سا اشعر سامنے کھڑا ہوتا تھا۔

”آخرین ہے اشعر۔ تم اپنا مت سوچنا۔ بس اپنے بہنوئی کی غلامی کرتے رہنا۔“ وہ سخت خفا نظر آتے تھے۔

اشعر نے تذبذب سے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔ ”بابا...“ آگے کو جھکے ہاتھ باہم پھنسائے اس نے سمجھانے والے انداز میں بات شروع کی۔ ”فاتح آبنگ کے ساتھ کام کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوگا۔ میں تعلقات بنا رہا ہوں، اپنا نام کما رہا ہوں، ہم ان کی انکیشن مہم شروع کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے بہت محنت کی ہے ان کے لئے۔ اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔ کل کو وہ ممبر پارلیمنٹ بنیں گے اور پرسوں انہیں مزید اونچا عہدہ ملے گا تو میں بھی نفع میں رہوں گا۔ میں ان کے سیاسی تعلقات استعمال کر کے اپنے کاروبار کو فائدہ دوں گا۔ ان کو بھی معلوم ہے کہ میرا بھی اس میں فائدہ ہے اور وہ اس بات سے مطمئن ہیں۔“

”تو کیا تم ساری عمر اس کے غلام بن کے رہو گے؟“ محمود صاحب تیوری چڑھائے پوچھ رہے تھے۔

”میں ان کا پولیٹیکل سیکرٹری ہوں بابا۔ اور میں یہی بننا چاہتا تھا۔“

”ایک سیکرٹری؟“

”نہیں، سیکرٹری نہیں۔“ وہ پیچھے کو ہوا اور گہری سانس لی۔ پھر اٹھی ہوئی گردن کے ساتھ بولا۔ ”میں کنگ میکر ہوں۔ ان کا سلطان

ساز!“

”آہ... کنگ میکر۔“ محمود صاحب نے برہمی سے ناک سے کبھی اڑائی۔ ”اب کیا تم پہ اتنا برا وقت آگیا ہے کہ تم ایک سیاستدان کے

کنگ میکر بنو گے؟ جانتے ہو کنگ میکر کیا ہوتا ہے؟“

”جی، میں جانتا ہوں اور مجھے یہ کام پسند ہے۔“ وہ پرسکون تھا۔ مطمئن تھا۔

(کنگ میکر سیاست میں اس آدمی یا گروہ کو کہتے ہیں جس کا کسی سیاستدان پہ گہرا Influence ہوتا ہے۔ وہ اپنے عسکری، مذہبی، سماجی

اور سیاسی تعلقات کے ذریعے سیاستدان کو ترستا ہے، اس کو اٹھاتا ہے، اس کو کامیاب کرواتا ہے اور اس کو طاقت کے مقام پہ پہنچاتا ہے۔

اقدار حاصل کرنے کے بعد بھی اسی کے مشورے سے وزراء، اعظم اور حکمران کام کرتے ہیں۔ کرسی پہ کوئی اور بیٹھا ہوتا ہے اور اس کی

ذوریوں پیچھے سے اس کا سلطان ساز کھینچ رہا ہوتا ہے۔ مگر اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود کنگ میکر خود کبھی سیاسی امیدوار کے طور پہ کھڑا

نہیں ہوتا، نہ اس کو عوام جانتے یا پسند کرتے ہیں۔)

”میرے بیٹے، تم اگر کسی اور شخص کے دائیں ہاتھ بننے تو میں معترض نہ ہوتا۔“ وہ بے بسی سے جھنجھلاتے ہوئے آگے جھکے اور سمجھانے لگے۔ ”مگر تم وان فاتح کو اقتدار دلوانا چاہتے ہو۔ وہ بے نیاز اور خود غرض شخص ہے۔ وہ تمہیں بھلا دے گا۔ تم اپنا ٹیلنٹ اپنی صلاحیتیں اپنے لئے استعمال کرو۔“

”ہم یہ بات پہلے کرچکے ہیں، بابا۔“ وہ ادا اس ہوا۔

”مگر دوبارہ اس لئے کہہ رہا ہوں تاکہ تم اس بارے میں سوچو۔“

اشعر چپ ہو گیا۔

”میرا سارا پیسہ پھنسا ہوا ہے، بابا اور آپ کے پاس بھی ابھی اتنا پیسہ نہیں کہ میں فوراً انکیشن کی تیاری کر سکوں۔ آپ کا رو باری آدمی ہیں اور آپ پہ بھی قرض چڑھے ہیں، بالفرض میں ایم پی کے انکیشن کے لئے کھڑا بھی ہو جاؤں تو پیسہ کہاں سے لاؤں گا؟“ وہ جیسے زچ ہوا۔ محمود صاحب نے چونک کے اسے دیکھا۔ ”یعنی یہ خیال تمہارے ذہن سے گزرتا ہے۔“ ان کے تھے تاثرات ڈھیلے ہوتے گئے۔ ”انسان ہوں، بابا۔ طاقت کی خواہش میرے اندر بھی ہے مگر پیسہ کہاں سے لاؤں؟“ وہ بے بس تھا۔ محمود صاحب خاموش ہو گئے۔ پھر چند لمحے کے لئے چھت کو تکتے نگ گئے۔

آفس میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ اشعر نے سر جھکا دیا۔ دل برا ہونے لگا۔ اسے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔

”تم میری شاپ بیچ دو۔“

اشعر کا منہ کھل گیا۔ ”وہ تو آپ کی ہے، بابا۔“

”ہاں مگر میرا سب کچھ تمہارا اور عصرہ کا ہی ہے۔ وہ شاپ میں تمہیں دے دیتا ہوں، تم اس کو بیچ دو۔ وہ تاریخی مقام پہ ہے اور اس کی بہت قیمت ہوگی۔ تم خود انکیشن لڑو اور اس پیسے کو استعمال کرو۔“

اشعر چپ ہو گیا۔ ”میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا، بابا۔“

”تو پھر جلدی فیصلہ کرو۔ تمہارے پاس زیادہ دن نہیں ہیں۔ اگر تم نے ایک ہفتے میں کاغذات نامزدگی داخل نہ کروائے تو تمہیں پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ اس کو سمجھا رہے تھے مگر اشعر متامل تھا۔... آفس کی سادہ دیواریں راکھ کے رنگ کی تھیں... ایش ٹرے میں ٹھنڈی راکھ پھر سے اسے واضح نظر آنے لگی تھی۔

اشعر محمود نے سر جھٹکا اور اوپر دیکھا تو نجی جاچکا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے سیاسی آفس میں تنہا بیٹھا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ اس نے سگریٹ کی تازہ بنی راکھ کو پھر سے ایش ٹرے پہ جھٹکا اور دہرایا۔

Ashes Ashes We all fall down!

☆☆=====☆☆

حالم کے بنگلے پہ دوپہر پگھل رہی تھی۔ بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان صاف تھا۔ ذرا نیوے پہ بھاری بھر کم داتن سامان کے شاہرز اٹھائے ہانپتی کانپتی چلتی جا رہی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ شاہر اٹھائے اندر آئی تو لاؤنج کی ساری بتیاں جلی تھیں۔ دوپہر کے وقت اتنی روشنیاں؟ وہ حیران ہوتی لاؤنج عبور کر کے کچن تک آئی اور شاہر سلیب پہ رکھے۔ پھر ٹھنک کے رکی۔ اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔

بیل والی جوتیاں ادھر ادھر قالین پہ لڑھکی تھیں۔ جیواری ٹاپس میز پہ اتار پھینکے گئے تھے۔ صوفے کی حالت سے لگ رہا تھا وہ رات وہیں سوئی ہے۔ ساڑھی کی چم چم صوفے پہ بھی لگی تھی۔ غرض ہر چیز ابتر تھی۔

”تالیہ... تالیہ...“ داتن نے چہرہ اوپر کر کے آواز دی۔ جواب نہ دار۔ پھر اس نے پریشانی سے فون نکالا اور اسے کال ملائی۔ کال فوراً کاٹ دی گئی تھی۔ تالیہ اس کی کال بھلا کب کاٹتی تھی؟ وہ ٹھیک تو تھی نا؟

لیانہ دوبارہ کال ملانے لگی مگر درمیان میں اس کے بیٹے عدنان کی کال آنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ ”ہاں بولو...“

”ماں... کیا حال ہے؟“ وہ توقف سے بولا۔

”ذرا مصروف ہوں۔ تم بتاؤ۔“ پھر اسے یاد آیا۔ ”میسے پورے مل گئے تھے اس دن؟“

”ہاں ماں، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر سا شام میڈم نے اتنے میسے آرام سے دے دیے ہیں تو...“ وہ رک رک کے احتیاط سے کہہ رہا تھا۔

”تو اگر تم ان کی تھوڑی سی منت کر لو تو کیا معلوم اتنی رقم مزید بھی دے دیں۔ دیکھو ماں، یہ کم پڑ جائیں گے میرے لئے اور...“

”عدنان، میں اس وقت شدید پریشان کھڑی ہوں۔ پلیز تم کچھ دیر کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ لیانہ چیخ کے بولی۔ ساتھ ہی لاؤنج کی حالت کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”سا شام میری کال نہیں اٹھا رہی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔“

”کہاں ہونا ہے، ماں؟ امیر لوگوں کے اپنے مشغلے ہوتے ہیں۔“

”عدنان، تم بار بار بھول جاتے ہو کہ وہ مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے، مگر تم نہیں سمجھو گے۔“ اس نے کوفت سے فون بند کیا۔ پھر بے چینی اور تشویش سے تالیہ کا نمبر ملانے لگی۔ اب کی بار فون آف ہو گیا تھا۔

☆☆=====☆☆

کوالا لمپور کے اس علاقے میں سڑک کنارے ریستوران اور کافی شاہس کی بہتات تھی۔ دونوں اطراف میں بنی دکانوں کے سامنے کرسیاں میزیں بچھائے گاہکوں کو کھانا پیش کیا جا رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور لنچ بریک کے باعث طرح طرح کے لوگ اس فوڈ اسٹریٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

ایسے میں ایک سوپ پارلر کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ سفید اسکرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے، منہ پر بالوں کو پونی میں جکڑے، اداس مسکراہٹ سے اس پارلر کو دیکھ رہی تھی۔ تنگو کامل کے گھر 'نوکرانی' والا کردار ادا کرنے سے قبل اس نے یہاں نوکری حاصل کی تھی کیونکہ تنگو کامل ادھر اکثر آیا کرتے تھے۔ تالیہ مراد کی ہر چیز پلان کا حصہ ہوتی تھی۔

”تالیہ!“ آواز نے اسے چونکایا۔ سڑک کی طرف سے بوڑھا شیف سبزیوں کی نوکری اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کے وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔

”تم کب آئیں؟ آؤ آؤ اندر آؤ۔ یہاں کہاں کھڑی ہو؟“ وہ جوفنی میں سر ہلانا چاہتی تھی، شیف کے اصرار پہ منع نہیں کر سکی۔ وہ اسے مہلت دینے پہ راضی نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ریستوران کے کچن میں کرسی پہ بیٹھی تھی اور مختصر سا عملہ اس کے گرد جمع تھا۔ ویٹرس، ایک (ویٹر)، شیف، سب اس کو حیرت، خوشی اور خفگی سے دیکھتے سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

”تم بناتائے چلی گئیں؟ پورے دو ہفتے بعد آ رہی ہو۔ بدلی بدلی لگ رہی ہو۔“

”تنگو کامل کی ملازمہ نور نے بتایا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے اور تم پاکستان چلی گئی ہو۔“

”واللہ تالیہ ہم تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم کیسی ہو؟“ بوڑھا شیف بہت اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے اداس مسکراہٹ سے اس خالی کاؤنٹر سلیب کو دیکھا۔ کبھی وہ اس پہ چوکرٹی مارے بیٹھی ہوتی تھی۔ ان کو ایمانداری کی تلقین کرتی تھی۔ گانے گاتی تھی۔ سوپ اور باتیں بناتی تھی۔

اور آج وہ کرسی میز پہ سنبھلے ہوئے انداز میں بیٹھی تھی۔

”قسمت مجھ پہ مہربان ہوئی۔“ اس نے ان کے سوالوں کے جواب میں متانت سے کہنا شروع کیا۔ ”میں اپنے ملک واپس چلی گئی، اپنے باپا کے پاس۔ وہاں میری شادی ہو گئی اور یوں میں مالی طور پہ بہت مستحکم ہو گئی۔“ وہ جج بول رہی تھی۔ ”میں نے ان کچھ دنوں میں دولت کی بہت سی ریل پیل دیکھ لی لیکن پھر....“ اس کی آواز میں اداسیاں گھل گئیں۔

”پھر میں لیگل طریقے سے واپس آ تو گئی لیکن واپسی کی قیمت مجھے یہ چکانی پڑی کہ میرا شوہر.... وہ مجھ سے کھو گیا۔“

”اے؟ وہ کہاں گیا؟ اتنی جلدی؟“

اس کی آنکھوں کے کنارے بھینگنے لگے۔ ”بس یوں سمجھیں کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پتہ نہیں اس کو میری کیا بات بری لگی۔ خیر....“ اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ صاف کی۔ ”اب میرے پاس کافی پیسہ ہے، سو میں ویٹرس جیسی نوکری نہیں کروں گی بلکہ کوئی بہتر کام ڈھونڈوں گی۔ البتہ آپ لوگوں کو میں ہمیشہ مہم کروں گی۔ آپ نے... اس جگہ نے.... (نگاہیں اطراف میں دوڑائیں) مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ یہاں میں نے ہر ایک کو 'تالیہ ایک سچی اور امانت دار لڑکی ہے۔' کہتے سنا تھا۔ ان الفاظ کو دوبارہ سننے کی خواہش نے مجھ سے بہت بروقت

فیصلے کروائے ہیں۔“

وہ ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہی تھی۔ اداس نظریں ان سب کے چہروں سے ہوتیں درو دیوار پہ لپٹ جاتی تھیں۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ کیسے وہ ایک کردار بناتی تھی.... کیسے وہ اس میں ڈھل جاتی تھی۔

”تالیہ.... میری بچی....“ شیف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”تم جب چاہو واپس آ سکتی ہو۔ ہمارے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“

”نہ بھی ہوں تو میں کھڑکی سے کود آؤں گی، تو سہی!“ وہ غم آنکھوں سے ہنس کے بولی تو وہ سارے بھی ہنس دیے۔ اس جگہ نے ایک اور فیصلہ اس کے لئے آسان بنا دیا تھا۔

☆☆=====☆☆

داتن لاؤنج میں ٹہل رہی تھی جب پورچ میں کلارکنے کی آواز آئی۔ آواز تالیہ کی کار کی تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنے بھاری جتنے کو سنبھالتی دروازے تک آئی۔

تبھی دروازہ کھلا اور تالیہ اندر داخل ہوئی۔ وہ سادہ حلیے میں دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ پاٹ سی لگ رہی تھی۔ داتن کو دیکھ کے بس سر کوخم دیا اور آگے بڑھ گئی۔ داتن اس کی طرف گھومی یوں کہ اب دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔

”تم کہاں تھیں تالیہ؟“

”جب میں کوئی اس کام شروع کرتی ہوں تو سب سے پہلا کام معلوم ہے کیا کرتی ہوں؟“ تالیہ پرس صوفے پہ ڈالتی کہہ رہی تھی۔ داتن نے الجھ کے اسے دیکھا۔ ”تالیہ نے جو کردار ادا کرنا ہوتا ہے، میں اس کی پروفاکل لکھتی ہوں اور پھر خود کو اس میں ڈھال لیتی ہوں۔ آج میں پرانے سوپ پارلر گئی تو مجھے یاد آیا کہ میرا برپلان میری پروفاکل پہ انحصار کرتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں تالیہ۔ تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟“

تالیہ پرس رکھ کے مڑی اور سادگی سے اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں نہیں بتا رہی داتن۔“

داتن چونکی۔ پھر دروازے کی طرف گھومی۔ کھلی چوکھٹ سے دھوپ اندر آرہی تھی اور وہاں.... ایڈم کھڑا تھا۔

”اندر آ جاؤ ایڈم۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔“ وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے لاؤنج کے کونے میں بنے دروازے تک چلی گئی۔

ایڈم نے داتن کو دیکھ کے سلام کہا اور پھر طائرانہ نظریں اطراف میں دوڑائیں۔

داتن شل ہو گئی جی۔

وان فاتح کا باڈی مین اب اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے بال بے حد چھوٹے ہو گئے تھے۔ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا اور جیبوں

میں ہاتھ ڈالے دلچسپی سے تالیہ کے گھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

”نیچے میرا رکروم ہے۔“ تالیہ نے کونے والے دروازے کے ساتھ بنے چوکھے پہ انگوٹھا رکھا اور پھر کوڑ دبا یا۔ برقی دروازہ کھل گیا۔ نیچے زینے تھے۔ وہ زینے اترنے لگی تو بتیاں خود بخود جلنے لگیں۔

”تو آپ جو بھی چراتی ہیں، وہ نیچے محفوظ کرتی ہیں۔“ جب وہ نوجوان بھی سیڑھیوں پہ نیچے اترنے لگا تو داتن کو ہوش آیا۔ وہ ہڑبڑا کے ان کے پیچھے پئی۔

ورکروم کی ساری بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ وہاں بہت سے ڈبے رکھے تھے جن میں سامان محفوظ تھا۔ ایک دیوار پہ بڑے بڑے سے لاکر بھی بنے تھے جن کے ہر خانے کے مختلف کوڈز تھے۔ درمیان میں بڑی سی ورک ٹیبل تھی۔ تالیہ نے کوٹ اتار کے ایک کرسی کی پشت پہ ڈالا اور کونے سے ایک وائٹ بورڈ کھینچی سامنے لائی۔ اسٹینڈ پہ لگا وائٹ بورڈ اس نے دیوار کے سامنے رکھا اور پھر سیاہ مارکرا اٹھایا۔

”تالیہ... میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟“ داتن ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی۔ ساتھ ہی بار بار ایڈم کو گھور رہی تھی جو اس کمرے کے لاکرز دیکھ رہا تھا۔

”ایڈم سب جانتا ہے اور یہ میرے نئے اسکام میں میرا ساتھ دے گا۔“ تالیہ بورڈ پہ کچھ لکھتے ہوئے بولی تو داتن نے بے بسی سے اس کی کہنی چھوئی۔

”تالیہ... تم اس پہ کیسے اعتبار کر سکتی ہو؟“ وہ دبی سرگوشی میں بولی۔

”مجھے آواز سنائی دے رہی ہے ویسے۔“ وہ کندھے اچکا کے بولا تو داتن نے پلٹ کے اسے بس کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”داتن پدوکا۔“ تالیہ اس کی طرف گھومی اور رساں سے کہنے لگی۔ ”ایڈم میرا دوست ہے۔ بلکہ اب ایڈم فیملی ہے۔ مجھے اس پہ مکمل اعتماد ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔“

”مگر تالیہ... تم اس کو کیسے کسی اسکام میں شامل کر سکتی ہو؟ اور اسکام ہے کیا؟“

”داتن!“ تالیہ نے اس کے دونوں کندھوں کو تھاما اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں نے تم سے بہت دفعہ کہا تھا کہ میں اس جھوٹ اور خیانت کاری کے کام کو ترک کرنا چاہتی ہوں۔ تم نہیں مانتے۔ جو اسکام اب ہم کھیلنے جا رہے ہیں وہ سچائی اور ایمانداری سے کھیلنا جائے گا۔ اگر تم خود کو وہ راستہ چھوڑنے کے لئے تیار کر سکتی ہو تو یہاں بیٹھو۔ ہم تمہیں سب بتا دیں گے۔ لیکن اگر تم تیار نہیں ہو تو کچن میں جاؤ اور میرے لئے کچھ کھانے کو لاؤ، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کم از کم میری توانائی برقرار رکھنے کی حد تک تو تم میری مدد کر سکتی ہو۔“

داتن بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا، پھر گھنگریا لے سیاہ بال کان کے پیچھے اڑتی مڑ گئی۔ جاتے جاتے بھی وہ ایک جارحانہ قسم کی گھوری ایڈم پہ ڈالنا نہیں بھولی تھی۔ (ایڈم نے جلدی سے نظریں موڑ لیں اور تالیہ کی طرف متوجہ ہوا۔)

”آپ نے اتنی جلدی میں بلایا، میں بتا نہیں سکا۔ صبح وہ کو کو پھل...“ داتن چلی گئی تو وہ کہنے لگا مگر...

”میں کام کے وقت کام کے علاوہ بات نہیں کرتی، ایڈم۔ یہ دیکھو۔“ سپاٹ سے انداز میں کہتے اس نے ایک فائل ایڈم کی طرف

اچھائی۔ ایڈم نے فائل تھامتے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں میز کے کنارے پہ آئے منے سامنے کھڑے تھے۔ تالیہ کی آنکھیں سپاٹ تھیں اور ایڈم کی متاسف۔

”آپ ٹھیک ہیں نا؟“ شاہی مورخ کوشنراوی کی فکر ہوئی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ اور تم جانتے ہو اب میں جھوٹ نہیں بولتی۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

”اس بارے میں میری رائے ابھی محفوظ ہے۔“ پھر فائل کھولی اور صفحے پلٹانے لگا۔

”یہ تالیہ مراد تنگو کامل کی ملازمہ کی پروفائل ہے۔ تنگو کامل کا خاندان اور سوپ پارلر والے اس تالیہ کو جانتے تھے۔ مولیا کو بھی میں نے حال بن کے یہی فائل بھیجی تھی۔“

”اوکے... اس کا کیا کرنا ہے۔“

تالیہ نے مارکر اس کی طرف بڑھایا اور فائل اس سے لے لی۔ ”میں اس پروفائل جیسی نہیں ہوں اس لئے مجھے نئی پروفائل بنانی ہے۔ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ۔ تم لکھتے جاؤ۔“

ایک دم سے وہ جیسے قدیم ملاکہ میں چلا گیا۔ فضا میں مانوس سی خوشبو آنے لگی۔ محل کا باغچہ۔ روش پہ شہلی شہزادی... جس کا تاج اور زیورات دھوپ میں چمکتے تھے اور قلم سے الفاظ کاغذ پہ گھسٹتا شاہی مورخ جو اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھا....

”لکھو!“ ایڈم اس کی آواز پہ چونکا۔ سفید اسکرٹ بلاؤز اور پونی میں بندھے بالوں والی لڑکی میز کے گرد شہلی فائل کھولے لکھوار ہی تھی۔ ایڈم نے غیر ارادی طور پہ سر کو تعظیم میں خم دیا، پھر مارکر لے کر وائٹ بورڈ تک آیا۔

”تالیہ مراد۔“ تالیہ فائل سے پڑھتی شروع ہوئی۔ وہ پہلے فائل کے الفاظ پڑھتی پھر اس سے مختلف الفاظ لکھواتی۔

(تالیہ مراد۔ اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔)

”تالیہ بنت مراد بچہ... اس کا تعلق ملاکہ سے ہے۔“

ایڈم تعمیل کرتے ہوئے مارکر سے سفید بورڈ پہ الفاظ اتار رہا تھا۔

(تین ماہ سے تنگو کامل کی ملازمہ ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، مگر انگریزی اور ملے زبان ٹھیک سے بول لیتی ہے۔)

”وہ پچھلے کئی سال سے کے ایل میں مقیم ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ اس کو آداب معاشرت سے مکمل آگاہی ہے۔“ تالیہ میز کے

گردنہل کے لکھوار ہی تھی۔ ”وہ چار زبانیں بول اور لکھ لیتی ہے اور اس کو آرٹ کی گہری سمجھ ہے۔“

(بہت باتونی لڑکی ہے۔ قدرے بے وقوف اور جلد باز۔)

”وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اسے لمبے صبر آزمائیں کھیلنے کی عادت ہے اور وہ انسانوں کے لالچ کو اندر تک پڑھ لیتی ہے۔“

(آدھا دن تنگو کامل کی ملازمت کرتی ہے اور شام میں ایک ریسٹوران میں بطور ویٹرس کام کرتی ہے۔ کشمیر میں اس کا لمبا چوڑا خاندان

ہے جس کی کفالت یہی کرتی ہے۔)

”لکھو۔ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث اسے بے پناہ دولت ورثے میں ملی ہے۔ وہ کوئی جاب نہیں کرتی بلکہ سوشلائٹ ہے اور مختلف چیریٹی ورکس میں حصہ لیتی ہے۔ اس کا کوئی خاندان نہیں ہے جو اس کی کمزوری بنے۔“

کمرے میں یا تالیہ کی آواز تھی یا شاہی مورخ کے سفید بورڈ پر مار کر گھسیٹنے کی۔

(جو کھاتی ہے اپنے خاندان کو بچھڑ دیتی ہے۔ خود عام کپڑوں اور جوتوں میں خوش باش گھوم رہی ہوتی ہے۔)

”لکھو کہ تالیہ صرف اپنے لئے کماتی ہے، اپنے لئے جیتی ہے۔ شہزادیوں کی طرح رہتی ہے اور قیمتی چیزیں اور ہتھیار پہنتی ہے۔“

(تالیہ کو سوپ بنانے احمقوں کی طرح بہت بولنے اور ہر چھپکلی کا کروچ کودیکھ کے چچیں مار مار کے رونے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔)

”لکھو کہ... تالیہ کو تیر اندازی اور تلواری کے علاوہ پینٹنگ اور مجسمہ سازی میں بھی مہارت حاصل ہے۔ وہ اتنی بہادر ہے کہ ایک تیر سے کمبوڈوڈریگن کو ہلاک کر سکتی ہے۔“

برفترے کے ساتھ تالیہ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اندر جیسے بہت سا غصہ تھا جو ابل ابل کے آ رہا تھا۔ ایڈم بار بار ایک خاموش نظر اس پر ڈالتا تھا۔ اسے اس کی فکر ہو رہی تھی۔

(وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے جن کے پاس اچھی شکل اور دراز قد کے علاوہ کوئی خصوصیت اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ نہ ذہانت نہ تعلیم۔)

”وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے جو ہمت نہیں ہارتیں، بہادری سے ہر مشکل کا سامنا کرنے کی ترکیب ڈھونڈتی ہیں اور ان کو اپنی تکمیل کے لئے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

(اس کے باوجود تنگو کامل ہو یا سوپ پارلر والے، سب تالیہ سے محبت کرتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کے بہت حیران ہوا کہ ایک کم ذہن، کم علم، اور سادہ سی لڑکی پہ سب اتنا اعتبار کیوں کرتے ہیں؟ مگر اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ ایماندار، سچ بولنے اور خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہے۔ انہی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی میں کبھی ترقی نہیں کر سکی اور نہ کر سکے گی۔)

اگلی سطور پڑھ کے وہ چند لمحے تک خاموشی سے فائل پر سر جھکائے کھڑی رہی۔ ایڈم کھلا مار کر لئے منتظر سا اسے دیکھے گیا۔ پھر تالیہ نے فائل بند کی اور چہرہ اٹھا کے جیسے حقیقت کا سامنا کیا۔

”لکھو کہ تالیہ بنت مراد کی انہی خوبیوں کی وجہ سے اس سے دل سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ ایک بے حد شاطر، ہنرمند اور پراعتماد لڑکی جو کسی سے نہ ڈرتی ہو، اسے لوگ مشکل سے ہی پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ مرد عورتوں کو مضبوط بننے کے لئے تو کہتے ہیں، لیکن وہ خود کو ان مضبوط عورتوں کے لئے تیار نہیں کرتے۔ لکھو کہ وہ اب جھوٹ نہیں بولتی اور ایمانداری سے معاملات ڈیل کرنا چاہتی ہے اور اسے خود بھی نہیں معلوم کہ ان خوبیوں کے ساتھ وہ کبھی ترقی کر بھی سکے گی یا نہیں۔“

پروفائل ختم ہو چکی تھی۔ اس نے فائل میز پر ڈال دی اور وائٹ بورڈ کو دیکھا جہاں ایڈم کا ہاتھ سرعت سے چلتا الفاظ رقم کر رہا تھا۔ پھر وہ

پچھے ہٹ گیا اور تالیہ قریب آئی۔ اس کی آنکھیں ان الفاظ پہ جمی تھیں۔

”کیا یہ پروفائل من گھڑت ہے، چے تالیہ یا اب آپ ایسی ہی بن چکی ہیں؟“

”کیا تم اب تک یہ نہیں جان پائے ہو؟“ وہ الفاظ کو پڑھتے ہوئے بولی۔

داتن ٹرے لئے نیچے آئی اور اسے میز پر رکھا۔ پھر کرسی کھینچی اور کہنیاں میز پر رکھے ناراض سی بیٹھ گئی۔ ایڈم نے ایک نظر ٹرے کو دیکھا اور پھر تالیہ کی پشت کو۔

”آپ کچھ کھالیں، چے تالیہ۔“ ساتھ ہی چاکلیٹ براؤنیز کی پلیٹ اس کی طرف دھکیلی۔

داتن اسے گھورتے ہوئے قریب ہوئی۔ ”یہ براؤنیز میں اپنے لئے لائی تھی۔ تالیہ اتنی ساری چاکلیٹ اور میٹھا نہیں کھاتی۔ وہ گرل چکن کھائے گی۔“

ایڈم نے بہت ضبط سے جواب سرگوشی کی۔ ”ان کو چاکلیٹ سب سے زیادہ پسند ہے۔ شاید آپ نہیں جانتیں۔“

”تالیہ۔ کھانا کھا لو۔“ داتن نے بلند آواز میں پکارا تو وہ جو وائٹ بورڈ پڑھنے میں مصروف تھی، چونکی اور پلٹی۔ پھر میز پر رکھی اشیاء کو متلاشی نظروں سے دیکھا۔ ٹرے تک جھکی اور گرل چکن کی پلیٹ اٹھا کے واپس وائٹ بورڈ کی طرف مڑ گئی۔

داتن نے فاتحانہ نگاہوں سے ایڈم کو دیکھا۔ ”اس کو چاکلیٹس پسند ہیں لیکن وہ اپنی بر پسند کو عادت نہیں بنا لیتی!“ اس کے تو جیسے اندر تک طمانیت بکھر گئی۔ اور ایڈم اندر تک جل گیا۔

”اور کچھ؟“

”بس اتنا کہ.....“ داتن اس کی طرف جھکی اور اسے گھورا۔ ”یہ وائٹ بورڈ چے تالیہ نے کمبوڈور لیگن کو ایک تیر سے ہلاک کرنے کا لکھا ہے“

وہ جج ہو یا نہ ہو، اگر تم نے میری تالیہ کو کبھی نقصان پہنچایا تو واللہ میں تمہیں کسی بھوکے کمبوڈور لیگن کے سامنے ڈال دوں گی۔“

”پھر ایک بات میری بھی سن لیں۔“ وہ بھی اس کے قریب جھکا۔ ”ایڈم بن محمد کو کمبوڈور لیگن سے ڈر نہیں لگتا۔ اس لئے آپ اپنی دھمکی اپ گریڈ کرنے کے بارے میں سوچیں۔“

داتن نے ”ہونہہ“ میں سر جھٹکا اور تالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اپنی پروفائل کو ذہن نشین کر کے ان کی طرف گھوم چکی تھی اور سنجیدگی سے لائحہ عمل بتا رہی تھی۔

”داتن.... میں جانتی ہوں اس کام میں تم ہمارا ساتھ نہیں دو گی۔ نہ میں تمہیں ساتھ چلنے کے لئے کہوں گی۔ مگر تمہیں یہیں سے ایک کام کرنا ہوگا۔ میں تمہیں ٹیکسٹ کر رہی ہوں۔“

ساتھ ہی موبائل پہ بٹن دبائے تو داتن کے فون کی ٹون بجی۔ اس نے عینک لگائی اور اسکرین دیکھی۔ پھر عینک اتاری اور تالیہ سے بولی۔ ”کام ہو جائے گا۔“ پھر ایک جتنی نظر ایڈم پہ ڈالی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ قدرے حیران تھا۔

”عصرہ کے گھر نیلامی میں۔ آج گھائل غزال کی نیلامی ہے اور مجھے اس کی سب سے بھاری بولی لگانی ہے، تاکہ اشعر کے بندے اسے نہ خرید سکیں کیونکہ وہ پینٹنگ کوئٹسٹ کروا کے عصرہ کو بے عزت کرنا چاہیں گے۔ میں تیار ہونے جا رہی ہوں۔ وقت کم ہے۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کے زینوں کی طرف بڑھی تو ایڈم نے الجھن سے پکارا۔

”مگر ہمیں مسز عصرہ کو اس نقلی پینٹنگ کو نیلامی پر رکھنے سے روکنا چاہیے۔ اگر آپ اسے نہ خرید سکیں اور ان لوگوں نے وہ خرید لی تو کیا ہو گا؟“

”ایڈم، جب میں مشورہ مانگوں، تب دینا۔ ابھی کھانا کھا لو۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کے زینے چڑھنے لگی۔ ایڈم نے خفگی سے اسے دیکھا پھر داتن کو جو فاتحانہ مسکراہٹ سے اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

”تالیہ کے پلانز میں تالیہ کی مرضی چلتی ہے، لڑکے!“

”بہت شکریہ۔“ وہ جل کے بولا۔

داتن کے اندر تک ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ کے لان میں تقریب کے انتظامات ہو چکے تھے اور مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ بڑے بڑے شوکیزز میں قیمتی نوار دات اور پینٹنگز بھی تھیں جن کے گرد لوگ گھوم پھر کے ان کو دیکھ رہے تھے۔ چوکس سیکورٹی الہکار جگہ جگہ تعینات تھے۔

وان فاتح اپنے کمرے میں موجود تھا۔ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے وہ کالر کھڑے کیے مائی پہن رہا تھا۔ پھر آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے ٹھہرا۔ انگلیوں سے گردن کی پشت کو ٹٹولا۔ ابھرا ہوا گول نشان واضح محسوس ہوتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں بے بس سی الجھن ابھری۔ یہ زخم... یہ نشان؟ پھر اس نے سر جھٹکا (جن لڑکوں سے ہاتھ پائی ہوئی تھی، یقیناً انہوں نے ہی یہ چوٹ دی ہوگی۔ یا شاید یہ پرانی ہو اور اس نے پہلے نوٹس نہ کی ہو)۔

پھر ایک دم وہ چونکا۔ مائی وہیں گردن میں چھوڑے اس نے موبائل اٹھایا۔

اس کی سوشل میڈیا ٹیم نے ملاکہ کے ساحل پہ چار روز قبل فاتح سے ملاقات کرنے والے نوجوان کی تصاویر شیئر کی تھیں۔ یقیناً اس نوجوان نے تصاویر سوشل میڈیا پہ لگائی تھیں جہاں سے معمول کے مطابق اس کی ٹیم نے انہیں آفیشل ہینڈل پہ پوسٹ کر دیا تھا۔ فاتح نے تیزی سے ان تصاویر کو کھولا۔ پھر دو انگلیوں سے بڑا کیا۔

ایک تصویر ساحل پہ چلتے وان فاتح کی پشت سے کھینچی گئی تھی جس میں اس کی سفید شرٹ ہوا سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اور گردن صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل صاف اور بے داغ تھی۔

فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ یہ شرٹ.... یہ شرٹ کہاں گئی؟ پولیس اسٹیشن کی ویڈیو میں اس کی سیاہ شرٹ تھی۔ وہ ملاکہ میں صبح اٹھا تب بھی اس کی سیاہ شرٹ تھی۔ مگر اس روز تو اس نے سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ شرٹ کہاں گئی؟

اس نے کوفت سے موبائل رکھا اور سر جھٹکا۔ ان لڑکوں نے اسے زخمی کیا ہو گا یقیناً.... کپڑے خون آلود ہو گئے ہوں گے.... اس نے بھینک دیے ہوں گے.... یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ وہ اس بارے میں اتنا سوچے۔

وہ اب سنجیدگی سے آئینے میں خود کو دیکھتا تائی باندھنے لگا۔ پھر کالر برابر کیے۔ پرفیوم اٹھا کے خود پہ چھڑکا۔ سفید شرٹ پہ گہری نیلی تائی رات کی تقریب کی مناسبت سے بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ گیلے بال دائیں طرف کو پیچھے کر کے جمار کھے تھے۔ آنکھ کا زخم ویسا ہی تھا۔

تبھی عقب میں دروازہ کھلا اور عصرہ داخل ہوئی۔ جوڑا باندھے کانوں میں آنسو شکل موتی پہنے وہ پیر تک آتے سلور لباس میں ملبوس تھی۔ دولٹیں گھنگریالی کر کے گالوں پہ چھوڑ رکھی تھیں۔ مسکراتی ہوئی وہ اس کے قریب آئی اور میز سے کنسیلر کی ڈبی اٹھائی۔

”اتنے برس پہلے جو گیلری میں نے بنائی تھی.... اتنے برس جو سامان اکٹھا کیا تھا.... آج وہ سب بک جائے گا۔“ وہ اداس مسکراہٹ سے کہتی کنسیلر کی ڈبی کھول رہی تھی۔ فاتح نے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اس کی طرف رخ موڑا۔

”حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو اب بھی چاہوں گا کہ تم اپنا کام جاری رکھو۔“

”ہمیں امریکہ میں سینٹل ہونے کے لئے....“

”ہم امریکہ نہیں جا رہے۔ تم جانا چاہو تو الگ بات ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔ ہم یہ بات کر چکے ہیں عصرہ!“ وہ ٹھنڈے انداز میں بولا تو عصرہ نے ڈبی سے ذرا سا غازہ انگلی کے پورے پہ لگایا اور پھر اسے فاتح کی آنکھ کے قریب احتیاط سے ملنے لگی۔

”تم ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے فاتح۔ تمہارے پاس ویسے بھی الیکشن کے لئے اتنی رقم نہیں ہے۔“ اب وہ غازہ اس کی کنیٹی پہل رہی تھی۔ زخم دھیرے دھیرے چھپنے لگا۔

”بیمیوں کی فکر نہ کرو۔ میں سن باؤ والا گھر بیچ رہا ہوں۔ بات ختم۔“ وہ.... ذرا بے رخی سے بولا تو عصرہ نے جتنا ہی مسکراہٹ سے اسے

دیکھا۔

”تمہیں جلد یاد دیرا احساس ہو جائے گا فاتح کہ میں درست ہوں اور تم غلط۔ خیر....“

زخم چھپ گیا تھا۔ اس نے ڈبی رکھی اور مسکرا کے فاتح کو دیکھا جو کچھ ناخوش نظر آتا تھا۔

”آج کے دن تم میرا مکمل ساتھ دو گے۔ جیسے میں نے تمہیں سپورٹ کیا ہے اتنے سال تم آج اس سب کا لحاظ کرو گے۔“

”ظاہر ہے۔“ اس نے تائی کو دوبارہ کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

پھر وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ سیاہ ٹوپیس میں ملبوس وجیہہ صورت مسکراتا ہوا فاتح اور اس کی کہنی تھامے سلور چمکتے لباس میں خوش باش سی عصرہ۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلتے بے حد بھلے معلوم ہوتے تھے۔

پرفیکٹ کپل۔

”سر درد کی دوا ملے گی، مسز عصرہ؟“

آواز پہ عصرہ چونک کے پلٹی۔

☆☆=====☆☆

نیلامی کی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ لان میں اونچا اسٹیج بنا تھا اور سامنے کرسیوں کی دو قطاریں لگی تھیں۔ درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ اولین کرسیوں میں سے دو نشستوں پہ تالیہ اور ایڈم بیٹھے تھے۔ ایڈم اس زبردستی کے سوٹ میں غیر آرام دہ سا بیٹھا بار بار گردن موڑے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

”میں اور آپ ایک دفعہ پہلے بھی ایک نیلامی انینڈ کر چکے ہیں، چے تالیہ۔“ وہ ہچکچا کے بولا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں ”ماضی“ خود کو دہرانے نہ لگ جائے۔“

”دہرا بھی دے تو کیا ہوا۔“ تالیہ لمبی گردن سیدھی رکھے، چہرے پہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے سکون سے بیٹھی تھی۔ اس نے اونچا جوڑا باندھ رکھا تھا اور سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ میک اپ کے نام پہ صرف سرخ لپ اسٹک تھی۔ البتہ انگلی کی سرخ آنسو شکل انگوٹھی، کانوں کے یا قوتی ٹاپس اور گردن میں پڑا ہیرے کا نیکلےس... قدیم ملاکہ کا وہ زیور اسے مزید دلکش بنا رہا تھا۔

تالیہ کنکھیوں سے اپنے دائیں جانب، دو نشستیں چھوڑ کے بیٹھی عصرہ کو دیکھ رہی تھی جو جم جم کرتے لباس میں مسکرا کے اپنے شوہر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا کے جواب دے رہا تھا۔ فاتح کے ساتھ بیٹھا اشعران کی بات پہ محظوظ سا بنسا تھا۔ لوگ تصاویر اتار رہے تھے۔ ان کو سراہ رہے تھے۔ وان فاتح اس کی بیوی اور سالہ.... پرفیکٹ فیملی کی تھیں۔

”کیا ان کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ کے برا لگتا ہے آپ کو؟“ ایڈم نے سرگوشی کی تو وہ چونکی۔ وہ قدیم لمبے میں مخاطب ہوا تھا۔ جب لوگ اس پاس ہوتے تو وہ دونوں قدیم لمبے زبان بولنے لگتے تھے۔

تالیہ کے لبوں پہ مبہم مسکراہٹ بکھر گئی۔

”نہیں، شاہی مورخ، کیونکہ میں ان تینوں کے رشتے کی حقیقت جانتی ہوں۔ یہ ایک دوسرے سے بے زار لوگ ہیں۔“ پھر گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

”تمہارے کیا ارادے ہیں اب؟“

”پتہ نہیں، چے تالیہ۔“ وہ گہری سانس لے کر اسٹیج کو دیکھنے لگا۔ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس، چھوٹے بالوں اور گندمی رنگت والا ایڈم غیر آرام دہ نظر آتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے میں دو دنیاؤں کے درمیان پھنس گیا ہوں۔“

”سنو ایڈم!“ وہ اس کی طرف ذرا جھکی اور سرگوشی کی۔ ”ماضی صرف سیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ نہ اس کے خیالوں میں گم رہا جاتا ہے نہ اس سے بالکل فرار حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“

”کل تک اتنی اپ سیٹ تھیں آپ۔ ایک دن میں خود کو سنبھال کیسے لیا ہے؟“ ایڈم بس اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ضبط سے مصنوعی مسکراہٹ سجا کے بیٹھی تھی۔ اس سوال پہ محض شانے اچکائے۔

”ایک بات تو طے ہے کہ جو بھی ہو جائے، تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔“

ایڈم کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسٹیج پہ کھڑے آدمی نے ڈانس کے مائیک پہ چہرہ جھکا کے اعلان کیا۔

”گھائل غزال۔“ ساتھ ہی بازو سے اشارہ کیا۔ دو باوردی ملازم آئے اور وہ نادر چھوٹی سی پینٹنگ اسٹینڈ پہ رکھ کے چلے گئے۔ سنہرے فریم میں مقید وہ پینٹنگ محض دو باشت جتنی تھی۔

پچھلے اسٹیج پہ لگی بڑی پروجیکٹر اسکرین پہ اس پینٹنگ کی تعارفی ویڈیو چلنے لگی۔ کس نے بنائی، کب بنائی، وغیرہ وغیرہ۔

”مبولی شروع ہوتی ہے پچاس ہزار رنگت سے۔ کیا کوئی اس سے زیادہ پیش کرے گا؟“ ویڈیو کے ختم ہوتے ہی میزبان نے جوش سے حاضرین کی طرف اشارہ کیا۔ تالیہ نے اپنی اسٹک اٹھائی جس پہ اس کا نمبر لکھا تھا اور با آواز بلند بولی۔

”ایک لاکھ رنگت!“

دو کرسیاں چھوڑ کے بیٹھی عصرہ نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ فاتح البتہ اسٹیج کو دیکھتا رہا۔ اور اشعر.... وہ ننکھیوں سے عصرہ کو دیکھ رہا تھا....

دوسری قطار میں بیٹھے ایک صاحب نے اپنا کارڈ بلند کیا۔ ”ایک لاکھ پچیس ہزار۔“ مگر اشعر کو اس کی آواز نہ سنائی دی۔ لمحے بھر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے حال لپیٹ دیا گیا اور ماضی کا منظر چلنے لگا....

وان فاتح کی رہا لشگاہ کے سامنے وہ کار میں بیٹھا تھا اور اسٹیئرنگ وہیل پہ چند کاغذ رکھے ان کو پڑھ رہا تھا۔ کاغذات نامزدگی۔ اشعر محمود۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ کاغذ جمع کروانے کی کل آخری تاریخ تھی۔

اس نے کاغذات کو تہہ کر کے پینٹ کی جیب میں ڈالا اور باہر نکلا۔ پورچ سنسان پڑا تھا۔ فاتح کی کار وہاں نہیں تھی۔ البتہ عصرہ کی کار موجود تھی۔ لان بھی خالی تھا۔ وہ جوش اور مسرت سے اندر داخل ہوا تو لاؤنج میں سامنے پہ آریانا بیٹھی دکھائی دی۔ وہ چہرہ جھکائے کسی کلرنگ بک میں رنگ بھر رہی تھی۔ لمبے بال چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔ آہٹ پہ سر اٹھایا تو اشعر کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی اور سر کو خم دے کر سلام کیا۔

”آریانا... مبی کہاں ہیں؟“ وہ مسکراتا ہوا سامنے آیا۔ تبھی اپنے کمرے سے عصرہ نکلتی دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کان کا ناپس بند کرتی، بغل میں پرس دبائے، عجلت میں لگتی تھی۔

”ایش.... یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“ وہ خفا خفا سی ناپس بند کرتے قریب آئی۔ اشعر کی مسکراہٹ سمٹی۔

”کا کا میں....“

”باپا نے بتایا کہ تم کاغذات نامزدگی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ تھینا یہ بے کار خیال بھی انہوں نے تمہارے دل میں ڈالا ہوگا۔ خیر میں نے ان کو اچھی خاصی سنا دی ہیں۔ ابھی حد ہوتی ہے۔ یہ کوئی تمہارے کرنے کا کام ہے۔ تم جو کر رہے ہو، اسی میں ٹھیک ہو۔“ وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔

اشعر کی مسکراہٹ بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ چپ چاپ سننے لگا۔

”باپا کی ہر بات پہ فضول چیزیں نہ سوچنے لگ جایا کرو، ایش۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسے تھے، اور وہ شاب تو میں نے کب سے باپا کو کہہ رکھا ہے کہ مجھے چاہیے۔ میں نے اس پہ آرٹ گیلری بنانی ہے۔“

اشعر کے کندھے ڈھیلے ہو کے نیچے جا گرے۔

”آپ نے.... پہلے تو کبھی نہیں کہا۔“

”تو اب کہہ رہی ہوں نا۔ دیکھو ایش....“ وہ مصاحف انداز میں قریب آئی۔ ایک ہاتھ سے کلچ پکڑ لیا، دوسرا اس کے کندھے پر رکھے نرمی سے سمجھانے لگی۔ ”مجھے آرٹ گیلری کھولنی ہے۔ میں ایک سیاسی بیوی ہوں، مجھے فاتح کے ساتھ پبلک کی نظر میں رہنا ہے۔ میرا بھی کوئی کیریئر، کوئی پہچان ہونی چاہیے۔ وکیل ہونے کے باوجود فاتح کے تین بچے پالتے پالتے میں کبھی پریکٹس نہیں کر سکی (آریانہ نے سرائی کے ماں کو دیکھا) اور مجھے شوق بھی نہیں ہے، لیکن یہ آرٹ گیلری فاتح کو بھی فائدہ دے گی اور تم.... تم بالکل بھی سیاست میئر نیل نہیں ہو۔ میں کبھی بھی باپا کو یا تمہیں وہ دکان بیچنے نہیں دوں گی۔“

اشعر کے لب بھینچ گئے تھے۔ آنکھوں میں تکلیف ابھری مگر وہ کہے جا رہی تھی۔

”ایش دیکھو.... اگر تم وہ دکان بیچ بھی دو تو تم جیت نہیں سکتے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ ابھی تم صرف فاتح کو سپورٹ کرو۔ دکان کو ضائع مت کرو۔ اس سے بہتر ہے وہ دکان باپا مجھے دے دیں۔ تم جو ہو وہی ٹھیک ہو۔ سمجھ رہے ہونا۔“

اشعر نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار میں بیٹھا تھا۔ کاغذات ہاتھ میں اٹھائے وہ ان کو آخری نظر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے لب بھینچ لئے اور ان کو چاک کر دیا۔ چار پھر آٹھ ٹکڑے کیے.... اور ان کو ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال کے ڈھکن زور سے بند کیا۔

اس کا چہرہ اب غصے بھری بے بسی سے سرخ پڑ رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اس دکان کے علاوہ بیچنے کو کچھ نہیں تھا... پانچ سال... اسے پانچ سال مزید انتظار کرنا تھا....

”دولا کھ۔“ نیلا می اپنے عروج پہ تھی۔ وہ میزبان کی آواز پہ چونکا، اور پھر جلدی سے سر جھٹکا۔ سٹکیوں سے ساتھ بیٹھی عصرہ کو دیکھا جو جوش سے مسکراتی اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔

”دولا کھچپاس ہزار!“ پہلی قطار میں بیٹھی تالیہ نے سکون سے کارڈ بلند کیا۔

”وہ لا کھستر ہزار۔“ دوسرے کونے میں بیٹھا آدمی فوراً سے کارڈ اٹھا کے بولا۔

”تین لا کھ۔“ وہ سکون سے اسٹیج کو دیکھتی قیمت بڑھا رہی تھی۔

”سوا تین لا کھ۔“ اس آدمی نے اس سے زیادہ سکون سے کہا تو تالیہ چونکی۔ پوری گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ چہرے پہ ہلکی سی پریشانی نظر آئی۔

”چے تالیہ.... آپ کو یہ بر حال میں خریدنی ہے۔“ ایڈم نے اضطراب سے سرگوشی کی۔

”سوا تین لا کھ ایک.... سوا تین لا کھ دو۔“ چے تالیہ.... کیا آپ رقم بڑھانا چاہیں گی۔“ میزبان جوش سے پوچھ رہا تھا۔

تالیہ نے تھوک نگلا۔ پھر کارڈ اٹھایا۔ ”تین لا کھ چپاس ہزار۔“

”چار لا کھ!“ وہ آدمی سرعت سے بولا۔

پہلی قطار میں سب کی گردنیں تالیہ کی طرف گھومیں۔ وہ اسٹیج کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک کھلی اسٹ کان کے پیچھے اڑی اور بولی۔

”چار لا کھ پچیس ہزار۔“

”ساڑھے چار لا کھ۔“ وہ آدمی اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔

تالیہ نے گہری سانس لی اور گردن پھیر کے عصرہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ عصرہ کے اس طرف بیٹھا فاتح بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے پھر سے کارڈ اٹھایا۔ ”پونے پانچ لا کھ۔“

”چھ لا کھ!“ اس آدمی نے ایک دم چھ لا کھ پہ چھلانگ لگائی تو تالیہ نے گہری سانس لے کر کارڈ گود میں ڈال دیا۔

”چھ لا کھ ایک.... چھ لا کھ دو....“ پر جوش میزبان تالیہ کو دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔ اکسار ہاتھ مگر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”چے تالیہ.... پلیز....“ ایڈم کراہا مگر وہ دبی دبی سرگوشی میں بولی۔ ”میرے پاس اس سے زیادہ پیسے نہیں ہیں ایڈم۔“

”چھ لا کھ فائنل۔ مبارک ہو مسز عصرہ۔ گھائل غزال چھ لا کھ میں جناب جعفر غنی کو فروخت کی جاتی ہے۔“ میزبان نے نعرہ لگایا تو لان میں بیٹھے تمام لوگ تالیاں بجانے لگے۔ سوائے ایڈم کے۔

جعفر صاحب کھڑے ہوئے اور مسکرا کے مبارکبادیں وصول کیں۔ پھر کھٹکھارے۔

”مجھے یہ اعتراف کرنے دیں کہ میں اپنی جمع پونجی کا ایک حصہ اس پینٹنگ پہ لٹا رہا ہوں۔“ حاضرین نے اس بات پہ بے اختیار قہقہہ لگایا تھا۔

”لیکن....“ وہ دوبارہ کھٹکھارے۔ ”میں اس کو خریدنے سے پہلے ایک دفعہ اس کو ٹیسٹ کروانا چاہوں گا۔“

ایک دم سے تقریب میں سناٹا چھا گیا۔ بہت سی گردنیں اس کی طرف گھومیں۔ خود عصرہ پوری کی پوری گھوم گئی۔ ابرو بھنج گئے۔
 ”جعفر صاحب، یہ تمام پینٹنگز اصلی ہیں، میرے پاس ان کے کاغذات ہیں۔“ وہ جبراً مسکرا کے بولی۔ ”اور ہم تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔“ (اشعر زیر لب مسکرایا۔)

”جی مگر اپنی تسلی کے لئے اگر اس تقریب میں موجود دو آرٹ ایکسپرٹس اس پینٹنگ کو جانچ پرکھ لیں تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔“ اس نے پچھلی قطار کی طرف اشارہ کیا تو دو افراد کھڑے ہوئے۔ ایک نوجوان تھا، دوسرا ادھیڑ عمر۔

”سنگو منیر صاحب۔“ عصرہ خوشگوار حیرت سے ان کو دیکھ کے جگہ سے اٹھی۔ پھر حاضرین کو دیکھا۔ ”یہ تنگو منیر اور اسماعیل صاحب ہیں۔ یونیورسٹی پروفیسرز ہونے کے علاوہ یہ ہمارے اقرباء میں سے ہیں۔ اگر یہ پینٹنگ کو جانچ پرکھ کے دیکھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پلیز آپ لوگ اوپر تشریف لے آئیں۔“ وہ جوش سے کہہ رہی تھی۔

”مگر اس ٹیسٹ کی کیا ضرورت ہے؟“ تالیہ اونچا سا بولی تو سب مڑ مڑ کے اسے ہی دیکھنے لگے۔ ”کیا مسز عصرہ کی نیک نامی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ پینٹنگ اصلی ہے؟ اگر آپ مسز عصرہ سے کچھ خریدنے آئے ہیں تو ان پر اعتبار بھی کریں۔“ وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔ عصرہ نے ہاتھ اٹھا کے نرمی سے اسے روکا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تالیہ۔ پلیز آپ لوگ پینٹنگ کو دیکھ لیں۔“

وہ دونوں افراد اپنی جگہ سے اٹھے اور کرسیوں کے درمیان سے گزرتے ایلیج تک آئے۔ پھر پینٹنگ کو اسٹینڈ سے اتار کے میز پر رکھا۔ اپنے آلات کا بیگ کھولا۔ عینکیں چڑھائیں۔

عصرہ واپس جگہ پہ بیٹھ گئی اور فاتحانہ نظروں سے ایلیج کو دیکھنے لگی۔ تبھی اشعر نے سرگوشی کی۔ ”کا کا.... مجھے ڈر لگ رہا ہے.... آپ کو ٹیسٹ کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔“

”مجھے عرب شہزادے کی بات پہ اعتبار ہے۔ وہ مجھے نقلی پینٹنگ کیوں عطیے میں دے گا۔ ڈونٹ وری۔“ عصرہ نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کے خدشے کو رد کیا۔ ”ویسے بھی یہ دونوں ایکسپرٹ میرے پرانے جاننے والے ہیں۔ یہ کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔“

”چھ تالیہ۔ کچھ کریں۔“ ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ تلخی سے بڑبڑائی۔ ”وان فاتح کو جنگل میں بتایا تھا میں نے کہ گھائل غزال نقلی ہے۔ ان کو وہ مشروب نہیں پینا چاہیے تھا۔ اب نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔“

دونوں افراد باری باری پینٹنگ کو جانچ رہے تھے۔ پرکھ رہے تھے۔ مختلف زاویوں سے جائزہ لے رہے تھے۔ پھر معمر صاحب نے سر اٹھایا اور حاضرین کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”میری پیشہ وارانہ اور ماہر اندرائے کے مطابق....“ وہ سانس لینے کو رکے تو سب نے دم سادھ لیا۔
 ”یہ پینٹنگ اصلی ہے۔“

پھر سوالیہ نگاہوں سے دوسرے ایکسپرٹ کو دیکھا۔ اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔
 ”جی..... پینٹنگ واقعی اصلی ہے۔ سو فیصد۔“

جہاں پورا لان تالیوں سے گونج اٹھا، وہاں اشعر محمود کی ساری مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ اس نے بے یقینی سے ایکسپرٹس کو دیکھا۔ پھر گردن موڑ کے جعفر صاحب کو جو اپنی جگہ پہ کھڑے ہکا بکارہ گئے تھے۔ رنگت ایسی پیلی پڑی گویا کانٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
 ”جعفر صاحب امید ہے آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔“ میزبان نے جوش سے اسے مخاطب کیا تو جعفر صاحب جبری مسکرائے اور جگہ پہ بیٹھے۔
 ”آپ کے پاس رقم ادا کرنے کے لئے تین دن ہیں۔ اب ہم اگلے آئیٹم کی طرف بڑھتے ہیں....“ نیلامی پھر سے شروع ہو گئی۔
 ایسے میں اشعر محمود بالکل گم صم ہو گیا تھا اور عصرہ... اس نے گردن ذرا نکال کے دو کرسیاں چھوڑ کے بیٹھی تالیہ کو مسکرا کے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

تالیہ نے بھی جواباً مسکرا کے سر کو خم دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ ایڈم ابرو بچھنے ان دونوں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔
 ”چے تالیہ... کیا کیا ہے آپ نے؟“
 تالیہ نے مسکرا کے اس کی طرف چہرہ موڑا۔

”اے شاہی مورخ... تمہاری گہری نظریں اس وقت کہاں تھیں جب بندہ ہارا کی حسین بیٹی نیلامی سے پہلے اندر گئی تھی؟“
 ”بندہ ہارا کی نقلی والی حسین بیٹی نے کہا تھا کہ وہ مسز عصرہ سے سر درد کی دوا لینے جا رہی ہے۔ لیکن سیانے ٹھیک کہتے تھے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری اور کہانیاں گھڑنے سے نہ جائے۔“ وہ جل بھن گیا تھا۔

☆☆=====☆☆

”ایک گھنٹہ پہلے“

فاتح اور عصرہ ایک ساتھ چلتے لاؤنج میں آگے بڑھ رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”سر درد کی دوا ملے گی، مسز عصرہ؟“

عصرہ چونک کے پلٹی۔ فاتح بھی ساتھ ہی مڑا۔

وہاں تالیہ کھڑی تھی۔ سرنخ لپ اسٹک کے ساتھ مسکراتی ہوئی، منہرے بالوں کا فرانیسی جوڑا بنائے، وہ جل پری کی طرح کا سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔

”اوہ تالیہ.... تم....“ عصرہ مسکراتی۔ ساتھ ہی ایک محتاط نظر فاتح پہ ڈالی جس کے ماتھے پہ اسے دیکھ کے بل پڑے تھے۔ پھر جلدی سے

تشویش سے بولی۔

”ہاں میرے پاس دوا ہوگی۔ تمہارے سر میں درد ہے کیا؟“

”میرے نہیں، آپ دونوں کے سروں میں جلد ہی شدید درد ہونے والا ہے اس لئے اسپرین کی گولیاں اپنے ساتھ رکھیں۔“
عصرہ اور فاتح کے تاثرات ایک ساتھ بدلے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر الجھن بھری حیرت سے تالیہ کو۔ ”کیا مطلب؟“

”مجھے کچھ ایسا معلوم ہے جو آپ دونوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کیونکہ....“ سنہرے جوڑے والی خوبصورت لڑکی قریب آئی اور فاتح کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”جو ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ ہماری جان بچاتا ہے۔ اور جو ہمیں معلوم نہیں ہوتا، وہ ہماری جان لے بھی سکتا ہے۔“
مگر وہ ان فاتح کے صاف سلیٹ جیسے ذہن کے لئے وہ فقرہ بے معنی تھا۔ وہ بھنویں اکٹھے کیے بنجیدگی سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہ رہی ہو۔“
”کیوں نا ہم اندر بیٹھ کے بات کریں؟“ پھر سرسری سا اطراف میں دیکھا۔ ”ویسے مجھے معلوم نہیں کہ کون سے کمرے میں بیٹھنا چاہیے۔ آپ کی فائل۔ یقیناً میں نے آنکھیں بند کر کے چرائی تھی اسی لیے معلوم نہیں کہ کون سا کمرہ کس کا ہے۔ لیکن اس کمرے میں چلتے ہیں۔“ اس نے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو عصرہ کے کمرے کا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
”تالیہ، مہمان آرہے ہیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لئے امید ہے تم نے کسی ضروری بات کے لئے بلایا ہے۔“ کمرے میں آ کے عصرہ بنجیدگی سے بولی۔

تالیہ نے دروازہ بندہ کیا اور ان دونوں کی جانب گھومی۔ پھر سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور بتیاں جلا لیں۔ شاہانہ بیڈروم سفید روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ بیڈ کے کنارے وہ دونوں کھڑے تھے اور ان کے مقابل تالیہ۔
”بات بہت ضروری ہے۔“

”ٹوی دی پوائنٹ بات کرو، تاشہ!“ بے زار سے فاتح نے کوٹ کی آستین کے پیچھے کر کے گھڑی دیکھی۔ تالیہ نے سینے پہ بازو لپیٹے اور قریب آئی۔ باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھا۔
”جو گھائل غزال آپ نیچے جا رہی ہیں، وہ نقلی ہے۔“
روشن کمرے میں یکدم سناٹا چھا گیا۔ پھر عصرہ کے ماتھے پہ ہل ابھرے۔

”کیا مطلب؟ میری پینٹنگ کو ماہرین نے authenticate کیا ہے۔“ اس کے گال سرخ ہوئے۔

صرف ان ماہرین نے جن سے آپ پہلی دفعہ ملی تھیں کیونکہ آپ کے جاننے والے دونوں ماہرین اچانک سے غائب ہو گئے تھے۔
فاتح جو آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے سامنے کھڑی لڑکی کو خود اعتمادی سے بولتے دیکھ رہا تھا اس بات پہ چونک کے عصرہ کو دیکھا۔
”تم نے پینٹنگ اپنے قابل بھروسہ ماہرین کو نہیں دکھائی تھی؟“

”وہ.... وہ اس وقت ملائیشاء میں نہیں تھے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ عصرہ کا بے بسی اور غصے سے چہرہ دکھنے لگا۔ ”میرے پاس سارا پیپر ورک موجود ہے۔ اور....“

”جو آدمی آپ سے شہزادہ (شیخ جاسم) بن کے ملا تھا وہ دراصل اس شہزادے کا مینیجر ہے۔ ایک ملازم۔ گھائل غزال واقعی اس کی تھی‘ مسز عصرہ‘ لیکن وہ ڈیڑھ سال پہلے چوری ہو گئی تھی اس نے آپ کو وہ نقلی پینٹنگ دی ہے جو چوروں ہاں لگا کے چلے گئے تھے۔“

”اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟“ وہ مشکوک چھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تاہم نے نظروں کا رخ اس کی طرف پھیرا اور مسکرائی۔ کئی زمانے پہلے ایک اور نیلامی پہ بھی وہ قریب سے پہلے اس سے ملاقات کرنے اندھیر بنجروں تک گئی تھی۔

وقت کیسے بدل گیا تھا۔ اور وقت کیسے ایک ساتھ۔

”کیونکہ جب پینٹنگز چوری ہوتی ہیں تو وہ بلیک مارکیٹ پہ بیچی جاتی ہیں جہاں سے خریدنے والے کو ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ اور آپ کی گھائل غزال اس لئے نقلی ہے کیونکہ اصلی گھائل غزال میرے پاس ہے۔“

اس نے کہنی پہ ننگے پرس کو کھولا اور اندر ہاتھ ڈال کے کتاب جتنی پینٹنگ نکال کے سامنے کی۔ عصرہ کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

”مگر تم نے میری ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کے کہا تھا کہ میری پینٹنگ اصلی ہے۔“ وہ دھک سے رہ گئی۔

”کیونکہ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ میرا اعتبار کریں گی۔“

”تم بعد میں بھی بتا سکتی تھیں۔“ فاتح درشتی سے بولا۔ اس کی مشکوک نظریں ہنوز تاہم پہ جمی تھیں۔

”میں بتانے والی تھی مگر پھر آپ دونوں نے میرے اوپر فائل چوری کا الزام ڈال دیا۔ اگر میں اتنی بدنیت ہوتی فاتح صاحب تو آپ کو خاموشی سے یہ بیچنے دیتی۔ یہ نقلی پینٹنگ کسی نے غلطی سے آپ کو نہیں دی۔ اس کے پیچھے پوری پلاننگ ہے۔ اور جس نے یہ کیا ہے اس نے اپنا خریدار باہر بٹھا رکھا ہو گا جو اونچی بولی لگا کے سب کے سامنے پینٹنگ کو ٹیسٹ کروائے گا اور نقلی نکلنے کی صورت میں آپ کی بدنامی الگ ہوگی۔ مسز عصرہ پہ پولیس رپورٹ درج ہوگی یہ جیل جائیں گی اور آپ کی بریجی گئی پینٹنگ کا آڈٹ شروع ہو جائے گا۔“

”نہیں۔“ عصرہ نے مضطرب چہرے کے ساتھ گردن کڑائی۔ ”میری پینٹنگ اصلی ہے۔ تمہاری نقلی ہوگی۔“

”ہاں تاہم ہم کیسے مان لیں کہ تمہاری پینٹنگ نقلی نہیں ہے۔“

”میں نے آپ کے ایک پرانے ماہر طہ زہری صاحب کو بھی قریب پہ بلایا ہے۔ وہ اس وقت کے ایل میں نہیں تھے جب آپ نے اس پینٹنگ کو ٹیسٹ کروایا تھا۔ مگر فی الحال وہ یہیں موجود ہیں۔ آپ ان کو کال کریں۔ دونوں پینٹنگز دیکھ کے خود بتا دیں گے کہ کون سی اصلی ہے۔“ وہ پراعتما دتھی۔ داتن نے اس کا دیا کام بروقت کر دیا تھا۔

عصرہ نے اسے گھورتے ہوئے کچھ کھولا، موبائل نکالا اور سنگین لہجے میں بولی۔ ”تم یہیں رہو، میں ابھی آرہی ہوں۔“ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ ادھ کھلا رہ گیا۔

فاتح آنکھیں چھوٹی کر کے اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ”سو تم بلیک مارکیٹ سے چیزیں خریدتی ہو۔ یہ جرم ہے۔ Tax evasion‘ یونو۔“
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ پینٹنگ میں نے وہاں سے خریدی ہے۔“ وہ سچ بولی رہی تھی۔

”ایک ہی بات ہے۔ خیر... اگر یہ شہزادے جاسم کے ہاں سے چوری ہو ہی گئی تھی تو اس نے پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی۔“

”رپورٹ کر کے وہ کیا کہتے؟ یہ وہ پینٹنگ ہے جو اس نے خود بلیک مارکیٹ سے خریدی تھی اور اس پہ کبھی ٹیکس ادا نہیں کیا۔“

”اچھا مان لیا کہ تمہاری پینٹنگ اصلی ہے، اور تم میری بیوی کو ایک اسکیئنڈل سے بچانے آئی ہو مگر تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟“

”شاید آپ کو ہماری ملاقات کے آخر تک معلوم ہو جائے کہ میں پینٹر سے زیادہ بھی کچھ ہوں۔“ اس نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔

فاتح نے بے رخی سے سر جھٹکا اور ساتھ رکھی سنگھار میز کے کنارے پہ جا بیٹھا۔ وہ بے زار کے ساتھ ساتھ مشکوک بھی لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد عصرہ اور ایک معمر صاحب اس کمرے میں موجود تھے اور عصرہ کی گھائل غزال کا معائنہ کیا جا رہا تھا۔ عصرہ کی رنگت زرد تھی اور وہ اضطراب سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ دفعتاً طہ صاحب نے سر اٹھایا اور سادگی سے عصرہ کو دیکھا۔
 ”یہ نقلی ہے۔“

عصرہ نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ اب وہ صاحب بتا رہے تھے کہ کس طرح اس نقلی پینٹنگ کو غالباً کسی اوون میں بیک کر کے age کیا گیا تھا، پینٹ سال ڈیڑھ پرانا تھا.....

”اور یہ پینٹنگ؟“ تالیہ نے بیگ سے نکال کے چھوٹی سی پینٹنگ سامنے کی تو اس نے اسے احتیاط سے تھاما پھر اونچا کر کے دیکھا۔ پھر میز پر رکھا اور اپنی ٹول کٹ کھول لی۔ عصرہ اب بالکل خاموشی سے سینے پہ بازو لپیٹے لب بھنچے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”یہ اصلی ہے۔ سو فیصد اصلی۔ یہ دیکھیں...“ ماہر نے پینٹنگ پہ جھکے جوش سے بتانا شروع کیا تو میز کے کونے پہ بیٹھا فاتح تیزی سے

بولاً،

”شکریہ طہ صاحب۔“

ماہر کی بولتی بند ہو گئی۔ اس نے گہری سانس لی اور چیزیں سمیٹنے لگا۔

اس کے جاتے ہی عصرہ نے اپنی پینٹنگ اٹھائی اور زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب یہ پینٹنگ نیلامی پہ نہیں جائے گی۔“ اس نے پینٹنگ کو زور سے ردی کی ٹوکری میں پھینکا۔ چھناکے کی آواز آئی اور شیشہ چکنا چور

ہو گیا۔

”اس طرح تو آپ کو کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ سب آپ کے ساتھ کس نے کیا ہے!“

عصرہ نے بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”میں نقلی پینٹنگ کو کیسے نیلامی پہ لگا سکتی ہوں؟“

تالیہ نے میز پہ رکھی اصلی پینٹنگ دو انگلیوں سے اس کی طرف دھکیلی۔

”آپ اس پینٹنگ کو نیلامی پہ لگا دیں۔ میں اس کی بولی لگاؤں گی۔“

”تم اپنی پینٹنگ خریدو گی؟“

”نہیں۔ آپ پہلے اس لڑکی کو بولی لگانے سے منع کریں گی جو غالباً کوئی عام سی در کر رہے اور آپ نے اسے اچھا لباس اور زیور پہنا کے باہر معزز مہمانوں میں بٹھا رکھا ہے تاکہ وہ میرے مقابلے میں بولی لگائے اور قیمت بڑھائے۔“

فاتح کے کندھے سیدھے ہوئے۔ اس نے چونک کے عصرہ کو دیکھا۔ عصرہ کی پلکوں میں لرزش ہوئی۔ اس نے تھوک نگلی۔

”اتنے حیران مت ہوں فاتح صاحب۔ نیلامیوں پہ اتنا تو چلتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی امیر زادی ہر قیمت پہ نیلامی جیتنا چاہتی ہے تو اپنا بندہ بٹھایا جاتا ہے تاکہ وہ قیمت بڑھاتا جائے۔ شاید آپ نے بھی کبھی کوئی نیلامی اسٹینڈ کی ہو مگر آپ کو یاد دہو۔“ سرسری سا کہہ کے عصرہ کی طرف دیکھا۔

”جس نے بھی یہ کیا ہے اس کا خریدار بھی وہاں بیٹھا ہوگا۔ میں صرف قیمت بڑھاؤں گی اور وہ مجھ پہ سبقت لے جائے گا کیونکہ اس کو معلوم ہوگا کہ پینٹنگ نفلی ہے اور اسے قیمت نہیں ادا کرنی۔ لیکن اگر پینٹنگ اصلی نکل آئے تو قانوناً اس کو لازماً قیمت ادا کرنی ہوگی۔ نہ صرف آپ کو مالی فائدہ ہوگا بلکہ اس خریدار کے ذریعے آپ اصل سازشی شخص کو ٹریس بھی کر سکتی ہیں۔“

عصرہ بے بس سی بیڈ کے کونے پہ جا بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”اور تم مفت میں ہمیں اتنی قیمتی پینٹنگ دے دو گی؟“ فاتح غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا کھڑا ہوا اور سامنے آیا۔ اب وہ دونوں مد مقابل کھڑے تھے۔ تالیہ جتانے والے انداز میں مسکرائی۔

”مفت میں تو صرف پندرہویں صدی کے چائے خانوں میں غلاموں کے لئے کھانا ملا کرتا تھا“ فاتح صاحب۔ دو ہزار سولہ میں مفت میں کچھ نہیں ملتا۔“

سر پکڑے بیٹھی عصرہ نے بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا۔ ”یعنی تمہیں کچھ چاہیے؟ کیا؟ نیلامی والی رقم؟“

”نہیں۔ چے تاشہ کو میرا گھر چاہیے۔“ وہ اس کے چہرے کو بغور پڑھ رہا تھا۔

تالیہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”آپ کا گھر اس پینٹنگ سے کافی مہنگا ہے اس لئے آپ اسے مجھے نہ بیچیں۔ صرف کرایے پہ دے دیں۔“

”کرایے پہ؟“ فاتح نے تعجب سے ابرو اچکائے۔ ”تم اس کا کیا کرو گی؟“

”مجھے اس گھر میں بیٹھ کے ایک پینٹنگ بنانی ہے۔ آپ ایک ماہ کے لئے اسے مجھے کرایے پہ دے دیں اور اگر درمیان میں آپ اسے

بیچنا بھی چاہیں تو میں وہ گھر خالی کر دوں گی۔ بھلے آپ اسے اگلے ہفتے ہی بیچ دیں۔“

”اور جب تک میں وہ گھر نہ بیچوں تم اسے استعمال کرتی رہو گی؟“

”جی۔ آج بیس جولائی ہے (اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کو وہ تاریخ یاد نہ تھی۔) بیس اگست کو میں اسے خالی کر دوں گی۔ اگر میں

آپ کی جگہ ہوتی تو ہاں کرنے میں دیر نہ لگاتی 'فاتح صاحب'۔

”تم میری جگہ پہ نہیں ہو۔“ وہ درشتی سے بولا تو تالیہ نے شانے اچکا دیے۔

”گھائل غزال آپ کی میز پہ ہے۔ میں اب باہر جا رہی ہوں۔ اگر آپ نے اسے نیلا می پہ لگا دیا تو پارٹی کے اختتام پہ آپ گھر کی چابی

میرے حوالے کر دیں گے۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں۔ تو؟“ فاتح ماتھے پہ بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔

”تو نہ کریں۔ ویسے بھی یہ پینٹنگ میں نے آپ کو نہیں دی، مسز عصرہ کو دی ہے۔ اسے میری طرف سے اس نیلا می کے لئے عطیہ سمجھ کے

قبول کر لیں، جیسے عرب شہزادے سے قبول کی تھی۔“ اسی کے لہجے میں الفاظ لونا کے وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی عصرہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ بے حد پریشانی تھی۔

”فاتح۔“ اس نے جلدی سے فاتح کے دونوں ہاتھ تھامے اور اس کے سامنے آئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”اگر میں نے اب نیلا می

سے پینٹنگ ہٹائی تو بہت بدنامی ہوگی۔ پلیز فاتح، گھر اس کو دے دو۔ وہ کریزی سی سوشلائٹ ہے۔ وہ اسی پہ خوش ہو جائے گی۔“

”تم اس لڑکی کے ساتھ کیسے کوئی سودا کر سکتی ہو جس نے میری فائل چرائی تھی۔“

”کیا پتہ اس نے نہ چرائی ہو؟ اور وہ انگ بات ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ فاتح نے جھنجھلاہٹ سے سر جھٹکا۔

”مجھے اس گھر کو بیچنا ہے عصرہ!“

”وہ ایک ماہ میں گھر خالی کر دے گی فاتح۔ اس کی بات کا اعتبار کرو، اس نے ہمیں اسکیئنڈل سے بچایا ہے۔ یا اللہ۔ ہم تباہ ہو سکتے تھے۔“

اس نے نم پیشانی کو چھوا۔ وہ اندر تک بل گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اسے گھر دے دیتا ہوں، لیکن آج کے بعد تم کبھی بھی امریکہ جانے کی بات نہیں کرو گی۔ سنا تم نے؟“

عصرہ کچھ کہنے لگی، پھر سر ہلا دیا۔ ”جو تم کہو۔ بس ابھی مجھے اس سچویشن سے نکالو۔“

”جمعے کو میں کاغذات نامزدگی جمع کروا رہا ہوں عصرہ۔ اور تم مجھے نہیں روکو گی۔ از دیٹ کلیئر!“

”تم بھی تالیہ کی طرح موقعے کا فائدہ اٹھا رہے ہو۔ واقعی۔ مفت میں کچھ نہیں ملتا لیکن خیر...“ عصرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مجھے بر

شرط منظور ہے۔“

”عصرہ تم راضی نہ ہو تب بھی میں نے یہی کرنا ہے۔ اگر پینٹنگ نہ رکھی تو خواہ مخواہ باتیں بنیں گی۔ اور ہم یہ نہیں جان سکیں گے کہ یہ کس

کی حرکت ہے... دیکھو عصرہ...“ وہ چہرے پہ نرمی لائے اس کے ہاتھ تھامے سمجھانے لگا۔ ”تم کسی کو بھی پینٹنگ کے بدلے جانے کا نہیں

بتاؤ گی۔ یہ جس نے بھی کیا ہے وہ پینٹنگ کے اصلی نکلنے پہ حیران ہوگا۔ اور کسی طریقے سے تم سے اگلوانے کی کوشش کرے گا۔ وہ تھینا کوئی

قریبی دوست وغیرہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”او کے پھر؟“ وہ اس کی بات سمجھ رہی تھی۔

”تم غور کرنا کہ نیلامی کے بعد تم سے کون آ کے غیر ضروری سوالات پوچھتا ہے۔ کوئی پوچھے گا عصرہ۔ کوئی ضرور پوچھے گا۔“ وہ اسے غور سے دیکھتا دھیرے دھیرے سمجھا رہا تھا اور عصرہ سمجھتے ہوئے سر ہلارہی تھی۔

☆☆=====☆☆

”سو آپ نے سر درد کی دوا لینے کے بہانے جا کر ان کو سب بتا دیا۔ میں سمجھا آپ کے سر میں واقعی درد ہے اور آپ اندر تھوڑی دیر آرام کرنے گئی ہیں۔“

تقریب میں واپس آؤ تو اسٹیج پہ نیلامی جاری تھی اور پہلی قطار میں بیٹھا ایڈم دانت پیستے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ”آپ مجھے اپنا پلان بتا بھی سکتی تھیں لیکن نہیں۔ آپ ابھی تک خود کو شہزادی سمجھتی ہیں اور مجھے ایک غلام۔“

”اور بھگوار فوجی بھی۔“ اسٹیج کو دیکھتی تالیہ نے ہنسی کی۔

”مگر آپ نے ان کو اشعر کے بارے میں کیوں نہیں بتایا کہ یہ سب اسی کی سازش تھی؟“ ایڈم نے تالیوں کی گونج کے دوران سرگوشی کی۔

تالیہ نے آنکھیں گھما کے اسے گھورا۔

”اگر وہ اپنے دوست اور دشمن میں خود تفریق نہیں کر سکتے تو وہ اس قابل نہیں کہ ان کی مدد کی جائے۔“

ایڈم نے جواباً پتلیاں سکڑ کے اسے گھورا۔ ”تاریخ گواہ ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ اندھیرے میں ہی رکھتی ہیں اس لئے اس کے پیچھے بھی کوئی اور وجہ ہوگی۔“ اور منہ بنا کے چہرہ سیدھا کر لیا۔

تقریب ختم ہوئی تو اندھیرا چھا رہا تھا۔ لان میں نصب تمام برقی قمقمے جلادے گئے تو سارے میں روشنی پھیل گئی۔ بٹھے ٹیبلز پہ کھانا چن دیا گیا تھا اور مہمان اب ٹیبلتے ہوئے کھانا لینے میں مصروف تھے۔

فاتح ایک ٹیبل کے سامنے کھڑا پلیٹ اٹھائے ساتھ کھڑے ایک دوست سے بات کر رہا تھا۔ کھانا ڈال کے وہ مڑا تو دیکھا، سامنے ایڈم کھڑا ہے۔ فاتح مسکرایا اور بات ختم کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیسے ہو ایڈم؟“

”کنفیوژڈ ہوں سر۔ سوچا آپ سے ایک مشورہ مانگ لوں۔“ وہ متانت سے کہنے لگا۔

”پوچھو۔“ فاتح سلاڈ کے پتے کو کانٹے میں پھنسا رہا تھا۔ ایڈم کی نظریں سبز پتے پہ جھکیں تو اسے گھوڑے کو چارہ کھلاتے ہوئے اس کو سیلف اسٹیم پہ لپکھ رہا غلام فاتح یاد آیا۔ ماضی بر قدم پہ ایسے کیوں یاد آتا ہے؟ بھول کیوں نہیں جاتا جیسے فاتح کو بھول گیا تھا؟

”ایک کام ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اسی سے متعلق جاب ملے گی۔ مگر ایک کام ہے جو میں کرنا چاہتا ہوں مگر اس کام میں نوکری تلاش کرنا ناممکن سا لگتا ہے۔“

”کرنا کیا جانتے ہو اور کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ اب پلیٹ پہ چہرہ جھکائے چاؤلوں کو سلاڈ میں مکس کر رہا تھا۔

”گارڈ بن سکتا ہوں بس۔ مگر مجھے لکھنے کا شوق ہے۔“ وہ جھینپ کے بولا۔ شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ فاتح نے چاولوں کا چمچ لبوں میں رکھا اور چند لمحے خاموشی سے ان کو چبایا۔

”گارڈ کا کام کیا ہوتا ہے ایڈم؟“

”اپنے مالک کی حفاظت کرنا۔“

”مگر کس طرح؟ ہاتھ سے پستول تو وہ خطرے کی صورت میں نکالتا ہے اس سے پہلے وہ سارا وقت کیا کرتا ہے؟“

ایڈم نے لمحے بھر کے لئے سوچا۔ ”وہ ماحول پہ گہری نظر رکھتا ہے اور اپنے مشاہدے سے بر غیر معمولی بات کونٹس کرتا ہے۔“

”اور لکھنے والے کیا کرتے ہیں؟“

”وہ... ایڈم انکا۔“ وہ اپنے ماحول پہ گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدے سے بر غیر معمولی بات کونٹس کرتے ہیں۔“ الفاظ ادا کر کے جیسے وہ خود گم صم ہو گیا تھا۔

”مل گیا جواب؟“ فاتح مسکرا کے پلٹنے لگا، پھر واپس مڑا اور اسے غور سے دیکھا۔

”مجھے یاد پڑتا ہے تمہارے پاس پستول بھی ہوتا تھا۔ مگر تم نے اس دن ان لڑکوں پہ پستول نہیں اٹھایا۔ کیا تم واقعی اچھے گارڈ ہو؟“

ایڈم چونکا۔ پھر ہونٹوں کی طرح اس کی شکل دیکھی۔ ”کون سے لڑکے؟“

”اس رات ملا کہ میں جن چور لڑکوں نے ہمیں روکا تھا اور مجھے زخمی کیا تھا۔ کیوں؟ تمہیں یاد نہیں؟ تم اس وقت میرے ساتھ تھے ایڈم!“

وہ غور سے ایڈم کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا، مگر ایڈم کو یاد ہونا چاہیے تھا۔ کیا واقعی وہی سب ہوا تھا جو اس نے پولیس کو

ویڈیو میں بتایا تھا؟ یا کچھ اور ہوا تھا؟..... فاتح کے اندر جو چار دن سے کھٹک رہا تھا، وہ اب زور زور سے کھٹکنے لگا۔

”مجھے.... مجھے یاد ہے، سر!“ ایڈم انک انک کے بولا۔ ”اور میں نے پستول نکالا تھا مگر آپ نے مجھے منع کیا تھا کہ میں.... گولی نہ

چلاؤں۔“ وہ جج کہہ رہا تھا۔ ذہن میں جنگل کا منظر گھوم رہا تھا جب قدیم ملاکہ میں وہ غیر مانوس زبان بولنے والے لوگ ان کے گرد گھیرا

ڈالے کھڑے تھے۔ اس نے پستول نکالا تھا مگر فاتح نے اس ہتھیار ڈالنے کا کہہ دیا تھا۔

”کیا آپ کو نہیں یاد؟“ اب کے ایڈم نے غور سے اسے دیکھا۔

فاتح نے سر جھٹکا۔ ”مجھے کیوں یاد نہیں ہوگا۔“ پھر بات پلٹ دی۔ ”تم اچھے گارڈ ہو مگر کام وہ کرو جو تمہارے دل کو پسند ہو۔“ سرسری سا

کہتا وہ مڑ گیا۔ اندر کھٹکتی شے خاموش ہو گئی۔ سب ویسا ہی ہوا تھا یقیناً، بس اسے یاد نہ تھا۔

”تعجب کی بات ہے، کسی کو گھاسل غزال پہ کیسے شک ہو سکتا ہے۔“ عصرہ اور تالیہ ایک بے ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھیں جب اشعری آواز

نے دونوں کو چونکایا۔ تالیہ نے گردن موڑی تو وہ جو اپنی بہن کو مخاطب کرتا قریب آ رہا تھا، ایک مسکراتی نظر تالیہ پہ ڈال کے سلام میں سر کو جنبش

دی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“ تالیہ؟“

”ہمیشہ کی طرح چوکنی اور ہوشیار!“ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولی۔ وہ ہلکا سا ہنسا۔ سر مکی سوٹ اور تانی میں ملبوس اس نے اپنے وجیہہ چہرے پہ ایسی مصنوعی مسکراہٹ سجا رکھی تھی جس کی ایک لکیر بھی مدہم نہ پڑتی تھی۔

”کا کا.... یہ کیا حرکت تھی تمہارے خریدار کی؟ وہ تم پہ شک کیوں کر رہا تھا؟“ وہ پھر سے موضوع کی طرف آیا۔

عصرہ جو پلیٹ پکڑے کھڑی تھی، ذرا متذبذب ہوئی۔ سیاہ رات میں اس کے چمچھاتے لباس کے باوجود ایک دم مرجھا جانے والا چہرہ چھپ نہ سکا۔

”وہ.... شاید....“ (اسے فاتح کی تنبیہ یاد آئی۔)

”میں بتاتی ہوں۔“ تالیہ نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ”جو گھائل غزال مسز عصرہ کو کسی نے تجھے میں دی تھی، وہ نقلی تھی۔ کیونکہ اصلی گھائل غزال کافی عرصہ قبل بلیک مارکیٹ پہ بک چکی ہے۔ عرب شہزادہ بھی نقلی تھا اور ماہرین بھی۔ سو میں نے مسز عصرہ کو اصلی پینٹنگ لاد دی اور نقلی کو ہم نے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔“

اشعر لمحے بھر کون ہو گیا۔ پھر آنکھوں میں تشویش ابھری۔ فوراً عصرہ کو دیکھا جو متذبذب نظر آرہی تھی۔ ”کا کا، کیا یہ سچ ہے؟“

”اشعر آپ کے بھائی ہیں، مسز عصرہ۔“ تالیہ نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا۔ ”وہ آپ کی فیملی ہیں۔ ان کو نہیں بتائیں گی تو کس کو بتائیں گی کہ کتنے بڑے کرائمز سے آپ لوگ بال بال بچے ہیں۔“

عصرہ کے سارے بوجھ جیسے ہلکے ہو گئے۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی اور فوراً اسے اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب وہ تیزی سے اس کو ساری بات بتا رہی تھی اور وہ تشویش سے سن رہا تھا۔

تالیہ ان کو چھوڑ کے گھر کے بیرونی حصے کے سامنے آئی جہاں وان فاتح چلا آرہا تھا۔ اس نے تالیہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا تو وہ مسکراہٹ دبائے چلی آئی۔

”جی تو!....“ (تو انکو کہتے کہتے رکی۔) ”جی فاتح صاحب۔“ مسکراہٹ سٹی۔ یہ وہ شخص نہیں تھا جو بالائی منزل کی کھڑکی سے اسے دیکھتا تھا جب وہ اس قدیم صحن میں مجسمہ بنارہی ہوتی تھی۔ یہ کوئی اور شخص تھا۔

فاتح نے مٹھی میں بند ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ جسے تالیہ نے تھام لیا۔

”تم نے آج جو بھی کیا، اپنی مرضی سے کیا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اس کا احسان رکھوں گا یا مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میری رائے تمہارے متعلق اب بھی وہی ہے، تاشہ۔ تم کبھی سیدھی بات نہیں کرتیں۔ پتہ نہیں اب تمہیں میرا گھر کیوں چاہیے۔ لیکن....“ اس کے مقابل کھڑے اس کی آنکھوں میں دیکھ کے تنبیہ کی۔ ”اگر میرے گھر کے ایک انچ کو بھی نقصان پہنچا تو میں تمہیں وہاں سے فارغ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

اس کو کھری کھری سنا کے فاتح کی نظر اس کے عقب میں پڑی جہاں لفٹ نیبل کے ساتھ عصرہ اور اشعر کھڑے سرگوشیوں میں بات کر

رہے تھے۔ فاتح کی پیشانی پہ بل پڑے۔

”بے فکر ہیں۔ اشعر صاحب آپ کی فیملی ہیں۔ اس لئے میں نے بینکنگ والا معاملہ ان کو بتا دیا۔ آخر ایسے موقع پہ فیملی کام نہیں آئے گی تو کون آئے گا ہوں؟“ کلنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کے آگے بڑھ گئی۔ فاتح نے بہت ضبط سے اسے دور جاتے دیکھا۔ اور پھر عصرہ اور اشعر کو۔

اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆=====☆☆

حالم کے بنگلے پہ اندھیرا چھایا تھا۔ کالونی کے دوسرے گھروں کی بتیاں روشن تھیں مگر آج رات نہیں تھی، اس لئے تالیہ کے پورچ کی بتی بجھی تھی۔ اس نے کار اندر کھڑی کی اور پھر پرس کہنی پہ لٹکائے سست روی سے باہر نکلی۔ موبائل پہ ساتھ ہی کچھ ٹائپ کرتے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا تو سارا پورچ روشن ہو گیا۔

وہ موبائل پہ چہرہ جھکائے گیٹ بند کرنے پیچھے آئی تو کسی احساس کے تحت گردن اٹھائی۔

گیٹ کے اندر کی طرف سمج کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے، کچھڑی بالوں کو پی کیپ سے ڈھانکے، سانولی رنگت والا سمج اس کو گھور رہا تھا۔ تالیہ بالکل ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم اس موٹی عورت کو بھیج کے مجھے ڈرا دھمکا کے خاموش کرا دو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔“ وہ اپنی چمکتی سیاہ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

پھر ایک قدم آگے آیا اور سینے پہ لپٹے ہاتھ کھول کے دونوں پہلوؤں پہ رکھے۔

”میں تمہارے ماضی سے واقف ہوں۔ جو تم یہاں مرحوم امیر باپ کی بیٹی بنی پھر رہی ہونا، جس کو تر کے میں اتنی دولت مل گئی تھی، میں جانتا ہوں کہ تم یہ نہیں ہو۔ تمہارے اشعر محمود کے خاندان میں جتنے چکر لگ رہے ہیں، امید ہے جلد وہ تمہیں اپنا حصہ بنا لیں گے... لیکن...“

راتن پیس کے ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ تالیہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ گئی۔

”اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم ایک fake ہو۔ ایک یتیم خانے سے نوکرائی کے طور پہ ایڈاپٹ کی جانے والی لڑکی جس کو بوجھ کی طرح اس کے فوٹر پیرنٹس نے اتار پھینکا تھا اور جس کی پہلے ہی شادی ہو چکی ہے مگر طلاق کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور جانے کن کن طریقوں سے تم نے یہ دولت بنائی ہے۔“ تحقیق سے اس کے سر سے پیر تک ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”تو وہ تمہیں فوراً سے دور کر دیں گے۔ تمہاری ساری عزت ختم ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم مجھے میرا شیئر دو۔“

کالونی کی مدہم روشنیوں اور خالی سڑک سے ہٹ کے وہ دونوں تالیہ کے گیٹ کے اندر آئے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کچھ بھی بولے بنا اسے سنتے ہوئے وقفے وقفے سے پلکیں جھپکتی تھی۔

”تمہیں ملائیشیا میں لایا تھا۔ تمہاری اس ترقی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ مجھے... اپنا حصہ... چاہیے۔“ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔
چند ثانیہ کے لئے پورچ میں سناٹا چھا گیا۔ سمیع نے دیکھا وہ بس اسے دیکھے جارہی ہے... دیکھے جارہی ہے... اور پھر... ایک دم... وہ ہنس پڑی۔

”یا اللہ سمیع...“ وہ گردن پیچھے پھینک کے ہنستی جارہی تھی۔ سمیع کے تاثرات بدلے۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔
”تم میرا حصہ...“

”تم کتنے فنی ہو، سمیع۔“ بمشکل ہنسی روک کے اس نے سمیع کو دیکھا تو آنکھوں میں بے تحاشہ ہنسنے کے باعث پانی آ گیا تھا۔
”میں تو تمہیں بھول ہی گئی تھی۔ اتنا اعرصہ ہو گیا تمہاری شکل دیکھے، مگر یا اللہ سمیع... تم تو ابھی تک وہیں ہو۔“ وہ پھر سے ہنس دی۔
”تم مجھے جانتی نہیں ہو، تالیہ۔“ وہ غرایا۔

”اؤ ہوں۔“ اس نے انگلیوں سے نم آنکھیں رگڑیں۔ ”بلکہ تم مجھے نہیں جانتے۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے طمانیت سے مسکرائی۔ اور دو قدم آگے آئی، پھر چہرہ اس کے قریب جھکایا اور سرگوشی کی۔

”تالیہ نے ٹوٹے جوتوں کے ساتھ جنگلوں میں سفر کیا ہے۔ اس نے کچے جانور ان دانتوں سے کھائے ہیں۔ وہ رسیاں تڑوا کے انسانی پنجروں سے اندھیری رات کو نکل کے بھاگی تھی۔ اس نے اپنے گدھ جیسے باپ کو ان انگلیوں پہ نچایا ہوا ہے۔ اسے وقت کے امراء اور رؤساء کے خلاف کھڑا ہونا بھی آتا ہے اور اسے تباہ سمندروں کا سینہ چیر کے وحشی جزیروں کو سر کرنا بھی آتا ہے۔ وہ ایک دنیا پہ حکومت کر کے آئی ہے سمیع اور تم ابھی وہیں کھڑے ہو۔“

وہ پھنوس بھنچا سے دیکھ رہا تھا۔ یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

”جوتالیہ تم سے ڈرتی تھی وہ کہیں پیچھے رہ گئی۔ جو تمہارے سامنے کھڑی ہے اسے کچھ کھونے کا خوف نہیں ہے۔ جاؤ، جس کو جو بتانا ہے بتا دو۔“ پھر ہاتھ اٹھا کے انگلیاں ہلائیں۔ ”Bubye“

”ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں دارنگ نہیں دوں گا۔ اب میں جو کروں گا وہ تم دیکھ لو گی۔“ وہ تنفر سے اسے دیکھتا مڑا اور باہر نکل گیا۔
تالیہ نے مسکرا کے گیٹ بند کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لاؤنچ تباہ ویران پڑا تھا۔ اس نے بتیاں جلائیں اور بڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ پیر میز پہ رکھ دیے اور موبائل کھول لیا۔
”آج آپ سے ٹھیک سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ کیا ہم دوبارہ مل سکتے ہیں۔“ اشعر کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

”شیور، اشعر صاحب۔ صبح ناشتے پہ ملتے ہیں۔“

اشعر کو شاید اتنی جلدی مثبت جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے فوراً اسے جواب بھیجا۔

”کہاں؟“

”صبح بتاؤں گی۔“ اس نے فون پرے ڈال دیا۔ ایک دم کال کی گھنٹی بجی تو اس نے مسکرا کے فون اٹھایا مگر پھر چونکی۔ بجنے والا فون یہ نہیں تھا۔

تالیہ ایک دم سیدھی ہوئی اور پرس میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرا فون نکالا جو ”حالم“ کا تھا۔ آج ہی اس نے یہ دوبارہ ایکٹو کروایا تھا۔ اس پہ غیر شناسا نمبر جگمگا رہا تھا۔ شاید حالَم کا کوئی کلائنٹ تھا۔ تالیہ نے فون کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“

”سلام علیکم! وان فاتح بات کر رہا ہوں۔ یہ میرا نمبر ہے۔ کیا ہم تھوڑی بات کر سکتے ہیں، حالَم؟“

تالیہ لمحے بھر کو بالکل سن رہ گئی۔

اس سارے گورکھ دھندے میں اسے ایک بات بالکل بھول گئی تھی۔

اگر وان فاتح تالیہ کی ساری اچھائیاں بھول چکا ہے تو اسے حالَم کی شناخت بھی یاد نہیں رہی تھی۔ وہ تالیہ پہ اعتبار نہیں کرتا تھا، مگر حالَم پہ کرتا تھا۔

”شیور، فاتح صاحب۔“ اس نے ٹیک لگائی اور پیر لمبے کر کے قینچی صورت میز پر رکھے، پھر سنہری لٹ کو انگلی پہ مروڑتی، چھت پہ چمکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”حالَم آپ کے لئے کیا کر سکتا ہے؟“

کھیل تو ابھی شروع ہوا تھا۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کے گھر کے لان کا منظر بدلا ہوا تھا۔ کیمرنگ والے ہر چیز کا صفایا کر کے جا چکے تھے اور لان اصلی حالت پہ واپس آ چکا تھا۔ اندر لاونج میں سناٹا تھا۔ گھر ذرا نکھرا ہوا لنگ رہا تھا۔ ایسے میں فاتح اپنے کمرے سے نکلا۔ رات کی مناسبت سے اس نے ٹراؤزر پہ سادہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور پیروں میں سلپرز تھے۔ وہ عصرہ کے ادھ کھلے دروازے پہ رکا اور کھنکھنایا۔

سامنے عصرہ میز پہ کاغذ اور لیپ ٹاپ پھیلائے حساب کتاب میں سر دیے بیٹھی تھی۔ آہٹ پہ سر اٹھایا اور مسکرائی۔ ”تقریباً سب کچھ بک گیا۔ نیلامی نفع بخش رہی۔ تھینکس ٹو تالیہ۔“

”وہی تالیہ جس نے تمہارے بقول ہماری فائل چرائی تھی۔“

عصرہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی، پھر کندھے اچکا دیے۔ ”اپنی آنکھوں سے تو میں نے نہیں دیکھا تھا اسے فائل چراتے ہوئے۔ میں نے تو صرف کہا تھا کہ وہ اپنی کار لینے ہمارے گھر ہماری غیر موجودگی میں آئی تھی۔ تم نے ہی فرض کر لیا تھا کہ فائل اس نے چرائی ہوگی۔“

”خیر... فائل میرے پاس واپس آ گئی ہے اس لئے میں اس قصے کو فی الوقت نہیں چھیڑ رہا۔“ پھر وہیں چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے رکھے ٹھہرا۔

”امید ہے تم اپنا وعدہ یاد رکھو گی۔“

”میں نے امریکہ جانے کی بات نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا، فاتح۔ تمہارے کسی بھی انکیشن میں تمہیں سپورٹ کرنے کا نہیں۔ اس کی توقع

مجھ سے ندرکھنا۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”شب بخیر عصرہ!“ اس نے ڈورناب سے دروازہ اپنی طرف کھینچا اور اسے بند کر دیا۔ چہرے پہ گہری سوچ چھا گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اوپر اپنی اسٹڈی کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ ٹھنڈے شیشے پہ ایک ہاتھ رکھے دوسرے سے موبائل کان سے لگائے وہ نیچے نظر آتی اندھیر کالونی کو دیکھتے حال کو سن رہا تھا۔

”حالم آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے“ فاتح صاحب؟“

”تم نے مجھے کہا تھا کہ میری فائل تالیہ نے چرائی تھی۔ کیا تمہیں یقین ہے؟“

بنا تو قف کے حال کی مردانہ آواز گونجی۔ ”تمام ثبوت تو اس کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ آپ کے کسی ملازم کی حرکت نہیں ہے۔ صرف تالیہ مراد وہ اجنبی تھی جو آپ کے گھر آئی تھی اور جو اشعر محمود کے گھر اور آفس بھی آتی جاتی رہی تھی۔“

”ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن کیوں، حال؟ سن باؤ کے گھر میں ایسا کیا ہے جو اس کو چاہیے؟“

”میں پتہ کر کے بتا سکتا ہوں۔“

”نہیں تم اس کو چھوڑو۔ ایک آدمی کی تفصیلات تمہیں بھیج رہا ہوں۔ اس نے میری بیوی سے گھائل غزال خریدی ہے، مگر وہ پینٹنگ دراصل....“ اس نے مختصر اسرار واقعہ کہہ سنایا۔

”ٹھیک ہے سر۔ میں اس آدمی کو چیک کرتا ہوں۔ آپ کو کس پہ شک ہے۔“

”بچھلی دفعہ میں نے تالیہ مراد پہ شک کا اظہار کیا تو تم نے بھی اسی کا نام لے دیا۔ اس لئے میں اپنا شک محفوظ رکھوں گا۔ مجھے ثبوت چاہیے۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا اور اس نرمی کے اندر خشکی بھی تھی۔

”آپ مجھے ہمیشہ مخلص اور نیک نیت پائیں گے فاتح صاحب۔“ پھر حال نے توقف کیا۔

”کچھ اور؟“

”اتوار کی رات ملا کہ میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے۔“

”کیسا حادثہ؟“

”تم انو۔ سٹی گیٹر ہو، حال۔ تم تحقیقات کر کے مجھے بمع ثبوت آگاہ کرو کہ میرے ساتھ اتوار کی رات کیا ہوا تھا اور کس نے کیا تھا؟“

”کیوں؟ کیا آپ کو نہیں یاد کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”اگر میں کہوں کہ ایک پوری رات میری یادداشت سے محو ہو چکی ہے تو تم کیا کہو گے؟“

”یہی کہ آپ ایک سچے انسان ہیں۔“

اور کال کٹ گئی۔

فاتح نے کھڑکی سے ہاتھ ہٹایا تو اس پہ پانچ انگلیوں کا نشان ثبت ہو چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی تو دھواں سا شیشے پہ بکھر گیا اور وہ نشان دھندلا ہو گیا۔ دھندلے شیشے کے پار نیچے سیاہ رات میں ڈوبی کالونی خاموشی سے وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔

☆☆=====☆☆

بارین نیشٹل کا آفس دیکھ کے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس کے فرش تلے ایک بڑا سا مال بنا ہے کہاں فتری ماحول کے برعکس رنگوں اور روشنیوں کی بہار ہے۔

مال کی گیلریز میں شاپنگ کرتے لوگ ٹہل رہے تھے۔ دکانیں کھل چکی تھیں اور فوڈ کورٹ میں کھانے کی خوشبو پھیلی تھی۔ ایسے میں اشعر محمود مسکراتا ہوا فوڈ کورٹ کی طرف چلتا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی رفتار سے بمشکل ملتا رہلی ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”سر... جعفر صاحب... وہ خریدار... بہت سیخ پا ہیں۔ قانوناً ان کو پینٹنگ کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ پینٹنگ نقلی ہوگی اور...“

اشعر ایک دم رکا اور اس کی طرف گھوما۔ رہلی بھی ہڑبڑا کے رکا۔ اشعر نے اس کے سینے پہ انگلی رکھی۔ ”میں نہیں... تم...! تم نے وعدہ کیا تھا اس سے۔“ دانت پیس کے مسکراتے ہوئے اسے گھورا۔ ”واللہ اگر اس آدمی کا مجھ سے کوئی بھی تعلق ثابت ہوا تو تمہیں اس مال کی چھت سے کود جانے پہ مجبور کر دوں گا۔“

”نہیں ہو گا سر۔ کبھی نہیں ہو گا۔“ وہ جلدی سے کہنے لگا۔ دونوں آمنے سامنے فوڈ کورٹ کے دہانے پہ کھڑے تھے اور اطراف میں لوگ آ جا رہے تھے۔

”میں نے ہر چیز بہترین انداز میں پلان کی تھی اور...“

”ہاں تبھی عین وقت پہ پینٹنگ کا راز کھل گیا۔ ایڈیٹ!“ اشعر مصنوعی مسکراہٹ برقرار رکھے پھر سے چلنے لگا تو رہلی پیچھے لپکا۔

”سر وہ چپے تالیہ نے پتہ نہیں کیسے...“

”چپے تالیہ دکھاوے کی شوقین بگڑی امیرزادیوں میں سے ہے۔ اس کے پاس اصلی پینٹنگ تھی تو اس نے دکھاوا کرنا ہی تھا۔ اپنی ناکامی اس کے سرمے میں ڈالو۔“

پھر ہاتھ جھٹکا اسے دفعتاً ہونے کا اشارہ کیا تو رہلی گہری سانس بھر کے وہیں رک گیا اور اشعر آگے بڑھتا گیا۔ مسکراہٹ کو مزید گہرا کر لیا اور تائی کی ٹاٹ درست کی۔ سرمئی سوٹ اور سفید شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح وجیہ لگ رہا تھا۔

فوڈ کورٹ میں ایک میز پہ تالیہ بیٹھی نظر آرہی تھی۔ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے وہ گرے اسکرٹ پہ سفید مٹی کوٹ پہنے گردن میں گرے رومال کی گرہ باندھے بیٹھی کافی کے گھونٹ پی رہی تھی۔ ایک گھنگریالی لٹ گال پہ جھول رہی تھی۔ اشعر کو آتے دیکھ کے مسکرا کے لٹ پیچھے کی اور کپ رکھا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کی صبح کا مطلب واقعی صبح ہوگا۔“ وہ ہشاش بشاش سا کہتا سامنے بیٹھا۔
 ”مجھے وعدے اور دوستی دونوں کو نبھانا آتا ہے۔ اشعر صاحب۔“ وہ مسکراتی ہوئی تازہ دم سی لگ رہی تھی۔
 ”سب سے پہلے تالیہ...“ اشعر نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ”آپ کا بہت شکریہ... کل آپ نے ہمارے خاندان کو جس کرائسز سے بچایا... آبنگ (بھائی) نے تو ٹھیک سے شکریہ کہا نہیں ہوگا اس لئے میں...“
 ”شکریہ کہنا تو درکنار وہ تو آخر میں بھی مجھ سے خفا ہی تھے۔“ اس نے اداسی سے سر جھٹکا اور کپ اٹھالیا۔ پھر رکی۔ ”آپ کافی لیس گے؟“

”نہیں، شکریہ۔ جب آپ کا ٹیکسٹ ملا میں کافی ہی رہا تھا۔ خیر آبنگ خفا کیوں تھے؟“
 ”کیونکہ انہوں نے عصرہ کو کسی سے یہ بات کرنے سے منع کیا تھا اور میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ تو فیملی ہیں نا۔ مطلب وہ آپ کو کیونکر اپنے دائرے سے نکال سکتے ہیں؟“ اس نے خفگی سے سر جھٹکا اور گھونٹ بھرا۔
 اشعر مسکراتا رہا البتہ اس کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھری۔
 ”انہوں نے جلد یا بدیر مجھے بتانا ہی تھا۔ ہم ایک فیملی ہیں۔“

”ظاہر ہے ان کو بتانا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ عرب شہزادہ حقیقتاً شہزادہ نہیں تھا تو اس میں آپ کا کیا قصور؟ لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کے بہنوئی اور آپ کے درمیان کوئی بدگمانی پیدا ہو۔ آپ اپنے فیس بک سے وہ تصویر اتار دیں۔“
 ”کون سی تصویر؟“ وہ چونکا۔ تالیہ نے جواب میں حیرت سے اسے دیکھتے کپ نیچے رکھا۔

”ارے۔ ایک سال پہلے کی ایک سفارتخانے کی تقریب کی تصویر جس میں آپ شہزادہ جاسم کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے ہیں اور ساتھ میں اس کا وہ مینیجر بھی ہے جو عصرہ سے شہزادہ جاسم بن کے ملا اور بعد میں اس کے مالک نے کہہ دیا کہ یہ میرا کزن ہے۔ اگر فاتح صاحب نے وہ تصویر دیکھی تو وہ بدگمان ہو جائیں گے حالانکہ دیکھا جائے تو آپ دن میں سینکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں۔ آپ کو ہر ایک کی شکل تھوڑی یاد رہتی ہوگی۔“

اشعر نے بدقت مسکراہٹ قائم رکھی۔ ”میں نہیں جانتا آپ کس تصویر کی بات کر رہی ہیں۔ لیکن میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں کوئی تصویر کیوں اتاروں؟“ وہ پراعتما د تھا۔ ”اور آبنگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، وہ کبھی میرے لئے اتنا برا نہیں سوچ سکتے۔“
 ”اوہ... پھر میں مطمئن ہوں۔“ پھر جیسے یاد آیا۔ ”شاید وہ تصویر آپ کے نہیں، کسی نوارزم کے بیچ پہ دیکھی تھی میں نے۔ خیر جانے دیں۔“

ارد گرد غلبتے لوگ، مال کی رونقیں، اشعر کو اپنے اور اس کے درمیان پھیلے تناؤ میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ وہ جبراً ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔
 ”خیر آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“ وہ معصومیت سے بولی تو اشعر نے اطراف میں دیکھا۔

”تھوڑی دیر قبل میں شاید کہتا کہ ناشتے کے لئے۔ یہاں کارنر والا ریستوران میرا پسندیدہ ہے.... مگر آپ شاید ناشتے کی بجائے بات چیت کرنا چاہیں گی۔ تو کیوں نا آپ بتائیں.... چے تالیہ.... کہ کل رات والے آپ کے ”احسان“ کے بدلے میں میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لئے؟“

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ کل رات والے احسان کی نہیں اس تصویر کو فاتح کو نہ دکھانے کی بات کر رہا تھا۔

”میرے پاس دولت، مقام، جائیداد سب ہے، اشعر صاحب۔ لیکن ہاں ایک چیز ہے جو آپ مجھے دلو سکتے ہیں۔“ وہ کہنیاں میز پر جمائے آگے ہوئی۔

”حکم سیجیے۔“

”مجھے باریسن نیشنل....“ امرو سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ مال کی چھت سے اوپر ایک فلور باریسن نیشنل کا ہیڈ آفس تھا۔ ”.. میں جاب چاہیے۔“

”جاب؟ واقعی؟“ اس نے تعجب سے امرو اچکائے۔ ”آخری دفعہ جب ہم میرے آفس میں ملے تھے تو آپ نے کہا تھا آپ کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

”اس بات کو ایک زمانہ بیت گیا ہے۔“

”چھ دن بھی نہیں گزرے، تالیہ۔ خیر۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ سوشل ورک کی شوقین ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ سیاسی پارٹی میں یہ کام کر سکتی ہیں۔ اچھی سوچ ہے مگر یہ یاد رکھیے گا کہ سیاسی پارٹی میں کام کرنے پر آپ کو ملے گا کچھ نہیں۔“

”تو آپ کیوں کرتے ہیں؟“

”کیونکہ صرف دو عہدے ایسے ہیں جو pay back کرتے ہیں۔ ایک سیاستدان ہونا یا دوسرا کسی سیاستدان کا کنگ میکر ہونا۔ ایک میں ہوں اور ایک میں رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ تمام جائز بے کار ہیں۔“

”تو کوئی بے کار جاب ہی دلوادیں آپ مجھے۔ کوئی اعلیٰ عہدہ۔“ اس نے کافی پیتے ہوئے شانے اچکائے۔

اشعر نے تھوڑی کو ناخن سے رگڑتے سوچا۔ ”فنانس ڈیپارٹمنٹ میں، یا میڈیا اسٹریٹجی کمیٹی میں آپ کو بہت اچھی جاب مل سکتی ہے۔ آپ کو میڈیا اسٹریٹجی میں ہونا چاہیے۔ سیلری بھی اچھی ہوگی اور جاب بھی اسٹیٹس والی ہے۔ آپ سی وی لائی ہیں؟“

”جی۔ بالکل۔“ اس نے پرس کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے تو پھر میرے ساتھ اوپر آئیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی کوٹ کا بٹن بند کیا۔

”مگر امید ہے ایک بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگی کہ میں باریسن نیشنل میں کسی کو جاب نہیں دے سکتا۔ میں صرف سفارش کر سکتا

ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بھی مسکرا کے پرس اٹھاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ ”اگر کوئی آؤٹ آف دی وے جا کر مجھے ایک اچھی پوسٹ پہ ہار کر سکتا ہے تو وہ وان فاتح ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ آپ میری سفارش کریں تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں۔“ اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔

”شیور۔ آنگ آفس میں ہوں گے۔ چلیں۔ ان سے ابھی بات کر لیتے ہیں۔“ وہ فوراً تیار ہو گیا تھا۔ اسے فاتح کے آفس میں صرف اشعر کی سفارش سے جاب مل سکتی تھی اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ فاتح یہ جان پائے کہ اشعر نے گھائل غزال والی حرکت کی تھی۔ اشعر محمود اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا اور پہلی دفعہ اس کی رائے تالیہ کے بارے میں بدل رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

مرغی آج صبح سے ہی مسلسل کٹ کٹا رہی تھی۔ چوزے چوں چوں کرتے باغیچے میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ بلی نے صبح حملے کی کوشش کی تو ایڈم کی ماں نوکیل تار لے آئی اور چھوٹی دیواروں کی منڈیر پہ لگانے لگی۔ اسکارف لپیٹے آستین چڑھائے، ایبو ٹھنڈی میٹھی دھوپ میں کھڑی تار لگا رہی تھی۔ دفعتاً کسی احساس کے تحت پیچھے دیکھا تو ایڈم کو برآمدے کے اسٹپ پہ بیٹھے پایا۔ وہ نوٹ پیڈ گھنٹوں پہ رکھے، قلم کا کنارہ لبوں پہ دبائے، دو رافق کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک شبِ خوابی کی رف ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“

”اپنے ارد گرد کے ماحول کا گہرے مشاہدہ کر کے کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں، کیا لکھوں۔“

”اصلی لکھاری لوگوں کو قلم اور کاغذ اٹھانے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا لکھنا ہے، اگر وہ خالی کاغذ کو گھوریں تو یا ان کا موڈ نہیں یا وہ لکھاری نہیں۔“

”اور تمہیں لکھاریوں کے بارے میں اتنا کیسے معلوم؟“

”تمہارے تایا کسی زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی چائے قبوے بناتے بناتے اتنی سمجھ تو آ ہی گئی تھی۔“ وہ اس کی طرف پشت کیے تار لپیٹ رہی تھی۔

ایڈم نے سست روی سے ہاتھ کی پشت سے جمائی روکی۔ پھر اسی سے دور آسمان کو دیکھنے لگا۔ ”کہانی لکھنا چاہ رہا ہوں، ایبو۔“

”یہ تمہیں لکھنے کا شوق کب سے ہو گیا۔“

”جب سے ملا کہ گیا ہوں، تب سے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں ایڈم۔ جب سے واپس آئے ہو بدلے بدلے لگ رہے ہو۔ کوئی بات ہے کیا؟“ وہ میخ کے ساتھ تار کو لپیٹ کے گرہ باندھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ میں تو ویسا ہی ہوں۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کندھے اچکائے۔ مرغی کٹ کٹاتی ہوئی اس کے قدموں کے قریب آ

کھڑی ہوئی۔ چوزوں کا غول بھی پیچھے لپکا۔

”پھر اس لکھنے کے شوق کو چھوڑو اور نوکری تلاش کرو۔ بغیر نوکری کے فاطمہ کے گھر والے شادی نہیں کریں گے ایڈم۔ اور شادی میں صرف دو ماہ رہتے ہیں۔“

”پیسے آجائیں گے ماں۔ بہت جلد۔“ اس نے بے پرواہی سے کہا اور پیڈ پہ جھک گیا۔ قلم کھولا اور الفاظ اتارنے لگا۔ ایبو نے تار کا آخری سرہ باندھا اور پھر ستائش سے اسے دیکھا۔ دیوار کی منڈیر پہ سرحدی علاقے جیسی گول گول تارنگ چکی تھی۔ اب بلی کوئی جسارت کر کے تو دکھائے۔

”ایبو۔“ ایڈم کا دماغ بھٹکنے لگا تو اسے پکارا۔ وہ مڑ کے اسے دیکھنے لگی۔ نکھری دھوپ میں برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھا ایڈم بن محمد غز وہ لگ رہا تھا۔ کسی اور کے لئے غمزہ۔

”اگر کوئی انسان کسی دوسرے کو بھول جائے... ایسے بھول جائے جیسے یادداشت کھو جاتی ہے۔ جیسے سمندر میں جہاز ڈوب جاتا ہے۔ اور دوسرا انسان مسلسل تکلیف میں ہو تو اس دوسرے کو کیا نصیحت کرنی چاہیے؟“

”دوسرا تکلیف میں کیوں ہے؟“ ایبو اس کے سامنے آرکی اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”دوسرے کو پہلے سے محبت تھی اور اب اس کی بے اعتنائی اس کے لئے تکلیف بن رہی ہے۔“

”اور تیسرا کیا چاہتا ہے؟“

ایڈم نے چونک کے اس کو دیکھا۔ وہ تیز دھوپ میں کھڑی تھی اس لئے اس کا چہرہ واضح دکھائی نہ دیتا تھا۔

”تیسرا بس یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔“

”پھر اس کو چاہیے کہ دوسرے کو بتائے کہ زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے۔ کبھی جودل کے بہت قریب تھا وہ یوں بے پرواہ ہو جاتا ہے جیسے ہم اس کے چہرے کی خاک برابر بھی نہ تھے۔ لوگ ہمیں بھول کے اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہم ان کی بے اعتنائی سے مسلسل اذیت میں رہتے ہیں۔“

”تو ایسے وقت میں کیا کیا جائے؟“

”یہ سمجھ لیا جائے کہ کوئی تیسرا یا چوتھا کسی دو لوگوں کے رشتے کو متروک نہیں سکتا۔ رشتوں کو وہ دو لوگ خود بھی نہیں توڑتے۔ یہ ہمارا مالک ہوتا ہے ہمارا اللہ تعالیٰ جو لوگوں کو ہماری زندگی میں لاتا ہے اور ہمارے دلوں میں ان کی محبت ڈالتا ہے۔ وہی بنساتا ہے وہی رلاتا ہے۔ وہی مردہ ہوئے دلوں کو محبت سے زندہ کرتا ہے اور وہی ان لوگوں کو پھر ہماری زندگی سے لے بھی جاتا ہے۔ دل اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہی ان کو الٹا پلٹا تار بتاتا ہے۔“

”اللہ تعالیٰ ایسا کیوں کرتا ہے؟“

”کیوں کا جواب ڈھونڈنے سے اذیت کم تو نہیں ہو جائے گی بیٹا۔ جسم میں تکلیف ہو تو ہم جان جاتے ہیں کہ کوئی شے درد دے رہی ہے۔ پھر ہم اس شے کو جسم سے دور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کبھی دوا لے کر، کبھی چبھا ہوا کانٹا نکال کے، کبھی گرم توے سے ہاتھ دور لے جا کے۔ جب بھی کچھ تکلیف دیتا ہے تو ہمیں اپنے آپ کو اس سے دور کرنا ہوتا ہے۔“

”میں انسانی رشتوں کی بات کر رہا ہوں۔ محبتوں کی۔“

”محبت تو راحت دیتی ہے، تکلیف نہیں۔ اور اگر یہ تکلیف دینے لگے تو یہ بھی ایک نشانی ہوتی ہے کہ خود کو اذیت دینے والے شخص سے دور کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔“

”کیا فرار اس کا واحد حل ہے؟ جس سے محبت ہے اس کو نہ دیکھو اس سے دور چلے جاؤ۔ کیا ایسے دلوں کے روگ ٹھیک ہو جاتے ہیں؟“

”اکثر کے ہو جاتے ہیں۔“

”میں چاہتا ہوں وہ اس سے دور چلی جائے تاکہ اس کے دل کا روگ دور ہو سکے مگر اس نے اسے ایسی مجبوری اور وعدے کے رشتے میں باندھ دیا ہے کہ وہ تکلیف سہتی رہے گی مگر اس کے ساتھ رہے گی۔ اور ساتھ رہنے کے بہانے ڈھونڈے گی۔ وہ ایسے کانٹے کی طرح ہے جو اس کے دل میں چبھا ہے مگر وہ اسے نکال کے تکلیف کو کم بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ اب باغیچے میں بھاگتے چوزوں کے ننھے پیروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو پھر تیسرے کو چاہیے کہ ان دونوں کو ان کے حال پہ چھوڑ کے اپنی تکلیف کی فکر کرے۔“

ایڈم نے سر جھٹکا اور پھر نگاہیں چرا کے چہرہ کاغذ پہ جھکا دیا۔

”شکریہ ماں۔ مجھے لکھنے کے لئے موضوع مل گیا ہے۔“ وہ ماں سے نظر ملائے بغیر تیز تیز قلم کاغذ پہ گھسیٹنے لگا۔ ابو دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے افسوس سے اسے دیکھتی رہی۔

☆☆=====☆☆

جس وقت اشعر محمود نے آفس کا دروازہ کھولا، فاتح اپنی کرسی سے اٹھ کے کافی ٹیبل کی طرف جا رہا تھا۔ کوٹ اسٹینڈ پہ ٹنگا تھا اور وہ سفید شرٹ اور اسٹراپ والی ٹائی میں ملبوس تھا۔ دروازہ کھلنے پہ گردن موڑ کے دیکھا۔ اشعر کو وہاں پا کے ہلکا سا مسکرایا اور کافی اسٹینڈ تک آیا۔

”خیریت؟“

”میرا ایک کام کرنا ہے آپ کو۔“ اشعر بٹاشت سے کہتا سامنے آیا اور کھڑے کھڑے بولا۔ ”کسی کو جواب چاہیے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو ہمارے آفس میں کوئی اونچا عہدہ دیں۔ ڈیپارٹمنٹ ہیڈ بنا دیں یا کوئی بھی اچھی جاب۔ آپ یہ کر سکتے ہیں۔“

فاتح نے پانی کی بوتل اٹھائی اور ڈھکن انگلیوں سے گھما کے کھولا۔ ”میرٹ بنتا ہے اس کا؟“

”وہ ٹیلنڈ بھی ہے اور اہل بھی۔ مجھے یقین ہے وہ بہت اچھا اضافہ ثابت ہوگی۔“ وہ وہیں میز کے کنارے کھڑا کہہ رہا تھا۔

”ایٹش.... یوں ایک دم کسی کو رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے ایچ آر کو مطمئن کرنا ہوگا۔ پھر آتھکس کمیٹی کو بھی مسئلے ہو جاتے ہیں اس طرح کی تقرریوں سے۔“ کہتے ہوئے فاتح نے کافی میکر کا ڈھکن اٹھایا اور بوتل اس کے اندر اندر ملی۔ پانی کی دھار گرنے لگی تو وہ بوتل اوپر لے گیا۔ کافی اوپر۔ پانی اب لمبی دھار کی صورت نیچے گرتا خانے کو بھر رہا تھا۔ اشعر نے گردن اونچی کر کے پہلے اس کے ہاتھوں کی مہارت دیکھی۔ پھر اس کو دیکھا۔

”آبنگ... صاف بات کرتے ہیں۔ میں نے اتنے سالوں میں آپ کے کہنے پہ بہت سے غریب لوگوں کو اپنی فرم میں نوکریاں دی ہیں۔ پارٹی میں کارکنوں کو اپنی طاقت کے مطابق اکو موڈیٹ کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے مجھے آپ ایچ آر کے حوالے مت دیں۔ مجھے زبان دیجئے کہ آپ میری امیدوار کو ایک بہت اچھی جاب دلوا دیں گے۔ اپنے آس پاس۔“ وہ دونوں انداز میں بولا۔

”شیور۔ میں اس کی اہلیت کے مطابق اس کو یہاں جاب دلوا دوں گا۔ اسے بھیجو۔“

پھر فاتح نے کین کھول کے کافی نکالی اور کافی میکر کے اندر لائی۔ ہر خانے کو جگہ پہ فکس کیا، اور مٹن آن کیا۔ اسی دوران دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ بوتل اور فلٹر پیپر ز کو اپنی جگہ پہ سیٹ کر کے اسی بے نیازی سے مڑا تو دیکھا۔

اشعر کے ساتھ وہاں تالیہ کھڑی تھی۔ گردن میں رومال کی گرہ لگائے، سنہرے بالوں کو جوڑے میں سمیٹے، وہ سادگی سے کبھی اس کو دیکھتی کبھی اشعر کو۔ فائل سینے سے لگا رکھی تھی۔

وان فاتح نے دونوں ابرو اٹھا کے اسے دیکھا۔

”سیر نیسلے؟“ پھر جیسے تعجب سے سر جھٹک کے بنسا۔

”تالیہ... آبنگ نے مجھے زبان دی ہے کہ وہ تمہیں اپنے قریب بہت اچھی جاب دلوا دیں گے۔“ ساتھ ہی اشعر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی تو فاتح نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ اور تاشہ... تم بیٹھو۔“

اشعر نے جانے سے قبل اس کی آنکھوں میں دیکھ کے یاد دہانی کروائی، جیسے کہہ رہا ہو۔ (آبنگ... آپ یہ ضرور کریں گے کیونکہ میں بھی آپ کے کام کرتا رہا ہوں۔) فاتح نے خاموشی سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو تالیہ کرسی پہ بیٹھی اور فائل سامنے رکھ دی۔ کندھے اور گردن سیدھی رکھے اب وہ خود اعتمادی سے فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

”تو تمہیں بی این (بارسین نیشنل) میں اچھی جاب چاہیے؟“ ٹینک لگاتے ہوئے سامنے کرسی پہ بیٹھا اور فائل اٹھا کے کھولی۔ انداز پر فیشنل ہو گیا۔ رات والے واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

”جی، سر!“

”ہوں!“ وہ اس کے کاغذات کو پڑھ رہا تھا۔ کونے میں رکھے کافی میکر سے پانی ایلنے کی آواز آنے لگی تھی۔

”ماسٹرز میں تم نے پوٹیکل سائنس یا آئی آر یا سوشیالوجی نہیں پڑھی لیکن کوئی بات نہیں۔“ اس نے صفحہ پلٹایا۔ ”تمہارے مارکس اچھے تھے۔ لاہور سے کیا تھا تم نے ماسٹرز!“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”کے ایل سے تم نے چند آرٹ کورسز کیے ہیں۔ پینٹنگز اور مجسمے بنا سکتی ہو۔ رائفل شوٹنگ کا کورس، جمناسٹک۔ ہوں۔“

پانی ایلنے کی آواز بلند ہوئی تو کافی کی مہک اس کے نھنوں سے ٹکرانے لگی۔ وہ خاموشی سے اس کو اپنی فائل پڑھتے دیکھنے لگی۔

”سی وی اتنی متاثر کن نہیں ہے تمہاری لیکن اشعر سے وعدہ کیا ہے میں نے۔“ اب اس نے واپس پہلا صفحہ پلٹایا اور رک کے اس کا نام پڑھا۔ ”تالیہ مراد بنت مراد راجہ۔“ پھر عینک کے اوپر سے آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”تمہارے دادا کو بھی تمہاری طرح تاریخ سے دلچسپی تھی کیا؟ کیونکہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام ملا کہ سلطنت کے ایک بنداہارا کے نام پہ رکھا ہے۔“

تالیہ کی گردن میں گٹھنی سی ڈوب کے ابھری مگر تاثرات ہموار رہے۔ ”مراد راجہ صرف سلطان مرسل شاہ کے بنداہارا کا نام نہیں تھا، یہ عام سا نام ہے۔“ پھر توقف کیا۔ ”اور ویسے بھی بنداہارا مراد راجہ اتنا مشہور نہیں کہ اس کے نام کے اوپر لوگوں کے نام رکھے جائیں۔“ آواز تلخ ہو گئی۔ اندر جیسے اپنے باپ کے لئے غصہ ایلنے لگا۔

”مشہور ہونے کی بات نہیں ہوتی، تاہم۔ مراد راجہ تاریخ کا ایک عظیم کردار تھا اور اس کو میرا خیال ہے لوگ misunderstand کرتے آئے ہیں۔ وہ ایک اچھا اور honourable آدمی تھا۔ مگر ہماری سوشلائٹ لڑکیوں کو تاریخ کی گہرائی میں جانے کا شوق نہیں ہوتا۔ افسوس۔“ فاتح کی نظریں فائل پہ جھک گئیں تو وہ بہت ضبط سے بولی۔

”تاریخ ویسی نہیں ہوتی جیسی مورخ قلمبند کرتے ہیں۔“

مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

”تمہارے والد حیات ہیں؟“ پھر یاد آیا۔ ”اوہ رائٹ، ان کی وفات ہو چکی ہے جس کے بعد تمہیں یہ سب تر کے میں ملا تھا۔ عصرہ نے بتایا تھا۔ خیر۔ کیا کرتے تھے وہ؟“

”وہ سیاست دان تھے۔ بہت دانا، بہت زیرک انسان تھے۔ اور ان کی وفات نہیں ہوئی۔“ فاتح نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ ”جب آخری دفعہ میں نے انہیں دیکھا تھا تو وہ زندہ تھے اور صحیح سلامت تھے۔ ہاں، اب ان کی قبر بھی ہے اور وقت کی دھول میں وہ قبر ملیا میٹ ہو چکی ہوگی مگر میرے لیے وہ ابھی بھی زندہ ہیں۔“

”ہاؤ نائس!“ اس نے بغیر اثر لیے صفحہ پلٹایا۔ پھر کچھ پڑھ کر چونک کے اسے عینک کے اوپر سے دیکھا۔

”میرنیل اسٹیٹس۔ میرڈ؟ تو تم شادی شدہ ہو؟ پھر ہم ابھی تک تمہارے شوہر سے کیوں نہیں ملے؟“ فائل بند کرتے ہوئے عینک اتار

کے رکھی اور پیچھے کو ٹیک لگائی۔ تالیہ مراد کے اندر تک کانٹے سے چبھ گئے۔ تکلیف بہت زیادہ تھی۔

"میں اور میرے شوہر۔ ہم ساتھ نہیں رہتے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہنے لگی۔ وہاں کوئی جذبہ، کوئی بے چینی کچھ نہ تھا۔ یادوں کے ساتھ احساس بھی مر گئے تھے۔

"کیوں؟" اس نے تعجب سے ابرو اکٹھے کیے۔

"ہم ایک لمبے سفر سے لوٹے تو میں نے جانا کہ وہ واپس نہیں آیا۔ وہ ایک دوسرے سفر پہ نکل گیا۔ شاید خود غرض تھا، شاید مجھے protect کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ بھی نہیں رہا اور چھوڑا بھی نہیں۔ اب اس کے آگے اونچی منزلیں ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ وہ ان کو پا لے۔"

کرسی پہ ٹیک لگائے، گال تلے انگلی رکھے بیٹھے فاتح نے سوچنے والے انداز میں پوچھا۔ "واپس آئے گا کیا؟" وہ مسکرائی اور آگے کو جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں تالیہ بنت مراد رجبہ ہوں۔ اگر وہ خود سے واپس نہ آیا تو اس کو گردن سے دبوچ کے واپس کھینچ لاؤں گی۔ پھر چاہے مجھے کسی کی قبر بنانی پڑے یا پرانی قبر کھودنی پڑے، ایک بات تو طے ہے کہ تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔"

"اوکے کول... خیر... باریسن نیشنل میں کیوں کام کرنا چاہتی ہو؟ حالانکہ تم جانتی ہو میں تمہیں بالکل پسند نہیں کرتا۔"

ابلتی کافی قطرہ قطرہ جگ میں گر رہی تھی اور اس کی کڑوی خوشبو سارے آفس میں پھیل چکی تھی۔

(میں چاہتا ہوں وہ میرے ساتھ رہے کیونکہ اسے میری اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔ چار ماہ قبل میں تالیہ کو ایک بددیانت اور سطحی سوشلائٹ کے طور پہ جانتا تھا جس نے میری فائل چرائی تھی۔ اگر چیزیں واپس اسی مقام پہ پہنچ جائیں، تب بھی یہی چاہوں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بھلے میں اسے ناپسند کروں، اسے دھتکاروں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ تب بھی میرے ساتھ رہے۔ امید ہے اسے وعدے نبھانے آتے ہوں گے۔)

اس نے بہت سی کڑوی مہک اندر اتاری اور مسکرا کے گویا ہوئی۔

"آپ کے ساتھ کام کرنا میری سی وی کو چار چاند لگا دے گا۔ کچھ عرصے کی جاب سے مجھے مستقبل میں بہتر جابز مل جائیں گی۔ اور میں ایک اعلیٰ عہدہ اس لیے بھی چاہتی ہوں کیونکہ مجھے لیڈ کرنے کی عادت ہے، لیڈ ہونے کی نہیں۔ مجھے boss lady بن کے حکم چلانا اچھا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے میں ماتحتی کرنے کی بجائے ایک اچھی پروجیکٹ ہیڈ بن سکتی ہوں۔ مجھے سیاست کی سمجھ بوجھ بھی ہے اور مجھے عالمی سیاست سے دلچسپی بھی ہے۔ آپ مجھے کام دیں، میں ہر کام کر سکتی ہوں۔"

"اعلیٰ عہدے کا مطلب ہے، کام کا بہت زیادہ بوجھ۔ اور جہاں تک میں اپنے معاشرے کو جانتا ہوں، نازک سوشلائٹس دن کے بارہ بجے اٹھتی ہیں اور ان کی ساری زندگی شام کو ہونے والی پارٹی کا گاؤن منتخب کرنے تک محدود رہتی ہے۔ اگر میں تمہیں کوئی بہت بڑا عہدہ

دے بھی دوں تو کیا تم کام کر لو گی؟“ وہ سنجیدہ تھا۔

کافی ابل ابل کے جگ کو بھر چکی تھی اور پھر مشین ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

”میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ مجھے جو کام جب بھی اور جتنا بھی دیں گے، میں بغیر شکایت کے اسے مکمل کر کے دوں گی۔ میں سب کر سکتی ہوں۔ آپ جلد جان جائیں گے۔“

”سو تمہارے کوئی سوشل ورک، لوگوں کی بہبود وغیرہ کے عزائم نہیں ہیں؟“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ گو کہ مجھے بہت اچھی سیاسی سمجھ بوجھ ہے، مگر میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں بی این میں اس لیے آنا چاہتی ہوں کہ ملائیشیا جیسے ایک تیسری دنیا کے ملک کو دنیا کا بہترین ملک بنا دوں، وغیرہ وغیرہ، یا پھر۔۔۔“

”تیسری دنیا کیا ہوتی ہے تاثر؟“

اس نے ایک دم پوچھا تو وہ بولتے بولتے رکی۔ ابرو بھنچنے کے پوچھا۔ ”سوری؟“

”تیسری دنیا کا ملک ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا، کرسی دھکیلی اور کافی ٹیبل تک گیا۔

”ترقی پذیر ملک۔ گو کہ ملائیشیا اب ایسا نہیں ہے مگر میری بات کا مطلب تھا کہ۔۔۔“

”سرد جنگ ایک بہت طویل جنگ تھی جو ہماری دنیا میں ہوئی تھی۔ یہ دراصل جنگ نہیں تھی، بس امریکہ اور روس کے درمیان ایک تناؤ، ایک تلخی تھی کہ کس کا نظام بہتر ہے۔ امریکہ کا کپیٹل ازم یا روس کا کمیونزم۔“ وہ کیبنٹ کھول کے کافی کا مگ نکالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تالیہ کرسی پر ترچھی ہو کے اسے دیکھنے لگی۔

”ایک طرف مغربی بلاک تھا۔ امریکہ اور نیٹو ممالک کا۔ دوسری طرف مشرقی بلاک تھا۔ سوویت یونین (روس) اور اس کے اتحادیوں کا۔ کئی سال یہ دونوں بلاک اپنے نظام کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔“ اس نے کافی میکر کے اندر سے گرم جگ نکالا اور مگ میں اسے اندر دیا۔

”جن ممالک نے اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا، ان کو پہلی دنیا کے ممالک کہا جاتا تھا۔ جنہوں نے روس کا ساتھ دیا، وہ دوسری دنیا کے ممالک کہلائے اور۔۔۔“ اس نے جگ کو مگ سے دو تین فنٹ اوپر اٹھا دیا۔ لمبی سی سیاہ دھاری نیچے گرتی دکھائی دے رہی تھی۔ تالیہ کی نظریں اس دھار پہ جم سی گئیں۔ اندر ہی اندر کچھ ڈوب کے ابھرا تھا۔ ابولا خیر کا بہترین غلام قبوے کو دھار کی صورت پیا لے میں بھرا کرتا تھا۔

”اور جو ممالک نیوٹرل رہے۔۔۔ انہوں نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔۔۔ ان کو تیسری دنیا کے ممالک کہا جاتا تھا۔“ اس نے جگ رکھا اور مگ اٹھائے کرسی تک واپس آیا۔ سیٹ سنبھالی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”آج لوگ غلط العام انداز میں تیسری دنیا کے ممالک سے مراد غریب ترقی پذیر ممالک لیتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی تحقیر آمیز اصطلاح نہیں

تھی۔ مگر اب لوگوں نے اس کا مطلب بدل دیا ہے۔ جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں۔ آرٹ اور تاریخ کو کمرشل فائدے کے لیے استعمال کرنا الگ چیز ہے اور اس میں دلچسپی لے کر اس سے کچھ سیکھنا الگ۔ "پھر گھونٹ بھر کے مگ میز پر رکھا اور اسی جتنا مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ "سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والوں کو سرد جنگ کے بلاکس کے بارے میں عموماً معلوم ہوا کرتا ہے مگر خیر۔۔۔ تم یہاں کام کرو گی تو سیکھ جاؤ گی۔" پھر اس کی فائل اس کی طرف دھکیلی۔ "تم سوموار سے جوائن کر سکتی ہو۔" اس کی ساری کڑواہٹ کو پی کے وہ سپاٹ سا مسکرائی اور فائل لیے اٹھی۔

"سوموار بہترین رہے گا کیونکہ ویسے بھی مجھے ویک اینڈ پہ ملا کہ جانا ہے۔ اپنے نئے گھر کا جائزہ بھی تو لینا ہے۔" جتاتے ہوئے کہا تو اس نے ایپ ٹاپ کھول لیا اور عینک ناک پہ جمائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نہ خدا حافظ، نہ الوداع۔ بس بے رخی کافی تھی۔ اور وہ یہ پہلی دفعہ تھوڑی کر رہا تھا۔

مگر یہ طے تھا کہ تالیہ کی ہمت نہیں ٹوٹے گی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے خود سے دہرایا تھا۔ "کیسا رہا انٹرویو؟" وہ آفس سے نکل کے کارڈ ورک آئی تھی کہ اشعر جو سامنے سے دو افراد کے ساتھ چلتا آ رہا تھا، اسے دیکھ کے رکا اور مسکرا کے پوچھا۔

"توقع کے برخلاف، بہت اچھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ اسے واقعی امید نہ تھی کہ فاتح اتنی آسانی سے جاب دینے پر راضی ہو جائے گا۔

اشعر کو الوداع کہہ کے وہ راہداری کے دہانے تک آئی تو کونے میں اس کی طرف پشت کیے کھڑے آدمی نے ایک دم رخ موڑا۔ تالیہ جو فائل سینے سے لگائے چلتی جا رہی تھی، ٹھنک کے رکی۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کے سُن رہ گئی۔ وہ سمجھتا تھا۔

ڈریس شرٹ پہنے وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لے کھڑا جتانے والے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ تالیہ نے فوراً اس طرف دیکھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ وہاں اشعر ابھی تک کھڑا ان دو افراد سے کوئی بات کر رہا تھا۔ آگے پیچھے دوسرے لوگ بھی آ جا رہے تھے۔

"اشعر صاحب سے میرا تعارف نہیں کرواؤ گی ڈیئر وائف؟" وہ گہری نظریں اس کے چہرے پہ جمائے ہوئے تھا جو ایک دم فق ہوا تھا۔ پھر وہ سنبھلی۔ ماتھے پہ ہل پڑے۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم نے خود کہا تھا کہ میں ان کو سب بتا دوں۔ وہی بتانے آیا ہوں۔" بے نیازی بھری مسکراہٹ سے کہتا وہ اس کے ساتھ سے گزر کے اشعر کی طرف بڑھاتا تالیہ جلدی سے بولی۔

"رکو۔ پلیز رکو، سمج۔" وہ جیسے پریشانی کو چھپاتے ہوئے سوچ سوچ کے کہہ رہی تھی۔

سمجھ رکھا اور مسکرا کے پلٹا۔

"ادھر آؤ... یہاں بات کرتے ہیں۔" وہ تیزی سے ریست رومز کی طرف بڑھی۔ سمجھ پیچھے آیا۔

وہ ایک طویل بال تھا جس میں سنک بنے تھے اور دوسری طرف بائو رومز کے دروازے تھے۔ سمجھ جیسے ہی اندر آیا، تالیہ نے دروازہ بند کیا اور غصے سے اس کی طرف کھڑی۔

"تم میری جان چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"تم اب بھی مجھ سے ڈرتی ہو۔" وہ دونوں وہاں اکیلے تھے۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" جواباً سمجھ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"تم جاب لینے آئی ہو یہاں، ہے نا؟ میں نے اشعر صاحب کی بات سن لی تھی۔ تم جتنی بہادر رہنے کی اداکاری کر لو، تم اپنے نئے آفس میں کوئی تماشہ نہیں بنانا چاہو گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اپنا اتنا سا حصہ! دو انگلیوں کے درمیان ذرا سا خلا بنا کے دکھایا۔

"میرے پاس اتنا کیش ہے، نہ ہوتا ہے۔" وہ زچ ہوئی۔ "اور بینک سے میں تمہیں ایک پیسہ نہیں بھیجوں گی۔"

"ہاں ظاہر ہے سیاسی جماعت میں کام کرنے کے بعد تمہاری بینک ٹرانزیکشنز پر کڑی نظر رہے گی۔ میں تمہیں مشکل میں چھوڑی ڈالوں گا

تالیہ۔"

"سمجھ میں آگیا نا تمہارے؟ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"یہ بات وہ عورت کہہ رہی ہے جو صرف جاب انٹرویو پر بھی لاکھوں کی جیولری پہن کے آئی ہے۔"

تالیہ بدک کے پیچھے ہٹی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے مگر کانوں میں پہنے ایئرنگز کے موٹے موٹے ہیرے جگمگا رہے تھے۔

"تم مجھے یہ ہیرے دے سکتی ہو۔" اس نے اس کے کانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ... یہ نفی ہیں۔ یہ سبز رگون ہیں۔" گردن کڑا کے بولی۔

"یہ سب اصلی ہیں اور یہ تو صرف پہلی قسط ہے۔ ایئرنگز پلیز۔" وہ ہتھیلی پھیلانے کھڑا تھا۔

"اور یہ مت سمجھنا کہ میں ان کو بغیر رسید کے بیچ نہیں سکتا۔ میرے اتنے سارے جاننے والے ہیں کہ میں صرف ہیرے الگ کروا کے بیچ

سکتا ہوں۔ اب میرا وقت ضائع مت کرو اور مجھے یہ ایئرنگز دو۔"

"یہ پہلی اور آخری دفعہ ہے سمجھ۔" وہ بے بسی سے غرائی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے نوچنے والے انداز میں اپنے

کانوں سے موٹے موٹے ہیروں والے ٹاپس اتارے اور اس کی مٹھی پر پٹختے۔

”آئینہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ ورنہ تمہاری جان لے لوں گی۔“

سمیع نے روشنی میں اٹھا کے ان ہیروں کو دیکھا، پھر مسکرا کے سر کو خم دیا۔ ”شکر یہ دوست۔“

اور انہیں جیب میں ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ تالیہ زیر لب کچھ بڑبڑاتی رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے دھک رہا تھا اور وہ سخت جھنجھلائی ہوئی لگتی تھی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائشگاہ پہ وہ رات اتری تو لان کی ساری بریاں جگمگاٹھیں۔ اندر لاؤنج میں عصرہ صوفے پہ بیٹھی، لیپ ٹاپ کھولے کام کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سادہ سی سرمئی میکسی میں ملبوس، کندھے پہ سیاہ اسٹول ڈالے بالوں کو الجھے ہوئے جوڑے میں باندھے پوری توجہ سے اسکرین پہ جھکی تھی جب جولیا نہ روتی ہوئی بھاگتی آئی۔

”ماما... ماما... سکندر نے مجھے مارا ہے۔“ لمبے بالوں والی بچی بھگی آنکھیں ملتی تیزی سے اس کے گھٹنے سے آگلی۔ عصرہ نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور اپنے گال پہ آئے بال پیچھے اڑے۔

”کیوں؟“

”وہ گیم میں ہار رہا تھا تو اس نے میرا جوائے اسٹک چھین لیا اور مجھے مارا۔“ وہ بھاں بھاں کیے روئے جا رہی تھی۔

”سکندر! عصرہ نے اسکرین فولڈ کی اور پرسکون انداز میں زور سے آواز دی۔ سکندر تیوریاں چڑھائے خفا خفا سا باہر نکل آیا۔

”جی ماما؟“

عصرہ نے دو انگلیوں سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سرخ چہرہ لئے سامنے آیا۔

”ماما... سکندر کو بھی ماریں جیسے اس نے مجھے مارا ہے۔“ اسے دیکھ کے وہ مزید زور سے رونا شروع ہوئی۔ سکندر نے کھا جانے والی

نظروں سے اسے گھورا مگر خاموش رہا۔

”سکندر...“ وہ سنجیدہ سی سادگی سے گویا ہوئی۔ ”آپ نے ابھی کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ غلط کیا تھا مگر کیا آپ کو معلوم

ہے؟“

سکندر خاموش رہا۔

”آپ میرے کمرے میں جاؤ اور گیارہ منٹ تک سوچو کہ آپ نے کیا غلط کیا ہے، کیوں کیا ہے۔ پھر واپس آ کے مجھے اپنی

reasons بتاؤ گے۔“ ساتھ ہی ابرو سے جانے کا اشارہ کیا۔ سکندر خفا خفا سا فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جولیا نے آنسو

پونچھتے خفگی سے اسے دیکھا۔

”اے گیارہ منٹ کیوں دیے ماما؟ مجھے ہمیشہ آٹھ منٹ ملتے ہیں۔“

”کیونکہ آپ آٹھ سال کی ہو اور وہ گیارہ سال کا۔ ہم جتنے بڑے ہو جاتے ہیں، ہمیں اپنی غلطیوں پہ غور کرنے کے لئے اتنا زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اب آپ آنسو صاف کرو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ جولیانہ نے زبردستی آنسو صاف کیے اور منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔ عصرہ نے فون اٹھایا اور نمبر ملا کے اسے کان سے لگایا۔

”کتنا سامان بچا ہے گیلری میں؟“ اب وہ اپنی سیکرٹری سے پوچھ رہی تھی۔

”بس چند ہی آٹمز ہیں جو بک نہیں سکے۔“

”ان کو آن لائن سیل پہ لگا دو۔ مجھے اس سارے مال سے جان چھڑانی ہے بس۔“

وہ واقعی جان چھڑانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ساتھ ہی کنپیٹیوں کو دبایا۔ نیلامی کی سروردی بالآخر ختم ہونے والی تھی۔

بات مکمل ہوئی تو سکندر باہر آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اب قدرے جھکا ہوا تھا۔ سرخی غائب تھی۔ وہ چپ چاپ اس کے دوسری طرف آ بیٹھا۔ درمیان میں ماں تھی... جولیانہ نے گردن نکال کے اس کا جائزہ لیا۔

”پھر آپ نے سوچا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

”جی۔“ اس نے جھکے سر کے ساتھ کہا۔ ”جولیانہ جیت رہی تھی تو مجھے غصہ آ گیا۔ یہ گیم میں نے اسے سکھائی تھی۔ میں اس میں جیتنا چاہتا تھا۔“

”تو آپ اسے جیتنے دیتے بعد اور میں نئی گیم شروع کر کے زیادہ اچھا کھیل کے اسے ہرا دیتے۔“

”وہ تو میں اسے ہرا ہی دوں گا۔“ امروا چکا کے بولا پھر ماں کی شکل دیکھ کے چہرہ جھکایا۔ ”سوری ماما۔“

”جیتنے کے لئے دوسرے کو تکلیف دینا ضروری نہیں ہوتی، سکندر۔ میں آئندہ یہ نہ سنوں کہ آپ نے بہن پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ آپ کو

معلوم ہے رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی بچے پہ ہاتھ نہیں اٹھایا تھا؟ آپ مسلمان ہو۔ اور مسلمان ایسے کرتے ہیں کیا؟“

”مگر ماما۔ جولیانہ چیونگ بھی تو کر رہی تھی۔“

عصرہ نے چونک کے گردن گھمائی۔ جولیانہ یکدم پھیل گئی۔

”سکندر چیج کہہ رہا ہے؟“ اس نے اسے گھورا۔ جولیانہ کے آنسو آ گئے۔

”میں صرف...“

”آٹھ منٹ، جولیانہ! صرف آٹھ منٹ!“ اس نے چٹکی بجا کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آنسو روکتی کمرے کی طرف بھاگی۔

سکندر نے گہری سانس بھری اور ذرا چوڑا ہو کے صوفے پہ بیٹھا۔ ”ماما... آپ اس کو سمجھایا کریں۔ یہ جھوٹ بھی بولنے لگی ہے اور چوری

بھی کرتی ہے۔“

”کیا اس نے پہلے بھی ایسے کیا ہے؟“ وہ متفکر ہوئی۔

”جی ماما۔ یہ فرینڈ کی نوٹ بک کپڑوں میں چھپا کے لے آئی۔ میں نے دیکھ لی تو کہا کہ یہ غلط بات ہے۔ مگر ماما وہ آگے سے بدتمیزی سے بولی، ماما نے بھی تو ڈیڈ کے لاکر سے فائل نکال کے کپڑوں میں چھپائی تھی۔ ایسا کرنے سے گناہ نہیں ملتا۔“

عصرہ بنت محمود بالکل شل رہ گئی۔ دل دھڑکنا بھول گیا۔

”کیا بے کار بات کر رہے ہو، سکندر؟ میں نے کب کچھ چھپایا ہے؟“ پھر غصے سے اس کا چہرہ دہکا۔

”ماما مجھے پتہ ہے جولیانا جھوٹ بول رہی ہے۔“ وہ فوراً بولا تو عصرہ نے تھوک نگا۔

”اگر یہ بات آپ کے ڈیڈ کو معلوم ہوئی تو وہ آپ دونوں سے ناراض ہو جائیں گے۔ وعدہ کرو آپ یہ بات ان کو نہیں کہو گے۔ اگر وہ ناراض ہوئے تو گھر نہیں آئیں گے۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔

”آف کورس ماما۔ میں نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے جلدی سے ماں کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ عصرہ کو ایک دم ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اب جولیانا کو الگ سے ڈانٹتی ہوں۔“ سکندر کو تسلی دلا کے وہ تیزی سے کمرے کی طرف آئی۔ جولیانا بیڈ پہ بیٹھی سر ہاتھوں پہ گرائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کے چونک کے گردن اٹھائی۔

”ماما! ابھی تو فائو منٹ ہوئے ہیں اور...“

”جولی۔“ عصرہ جلدی سے اس کے ساتھ بیٹھی اور نرمی سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ ”آپ نے سکندر کو یہ کہا ہے کہ ماما نے ڈیڈ کی الماری سے کچھ چھپایا تھا؟“

جولیانا نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ ”میں نے نہیں کہا۔“

”آپ جھوٹ بھی بولنے لگ گئی ہو، جولی۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے بولی۔ پھر گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔ ”مجھے تو نہیں یاد کہ میں نے کبھی کچھ کپڑوں میں چھپایا ہو۔“

”وہ اس رات.... میں نے دیکھا تھا۔“ اٹک ٹک کے بولی۔ عصرہ کے دل کی دھڑکن سست ہو گئی۔

”کیا؟ مجھے بتاؤ، میں نہیں ڈانٹوں گی۔“

”میں ڈیڈ کے باتھ روم میں تھی تب آپ آئی تھیں اور آپ نے....“ وہ رک رک کے بتا رہی تھی۔ ”کوئی فائل لاکر سے نکال کے کپڑوں میں چھپائی تھی۔ پھر آپ چلی گئی تھیں۔“

”اور آپ ڈیڈ کے باتھ روم میں کیا کر رہی تھیں؟ اکیچو کلی مجھے پتہ ہے۔ آپ ٹوٹھ پیسٹ کھا رہی تھیں، ہے نا؟“ وہ ایک دم غصے سے بولی تو جولیانا نے سہم کے سر جھکا لیا۔

”آپ کے باتھ روم کی ٹوٹھ پیسٹ میں چیک کرتی ہوں تو آپ نے سوچا، آپ ڈیڈ کی کھاؤ گی تو مجھے پتہ نہیں چلے گا۔ بتاؤں میں ڈیڈ کو؟“

بتاؤں؟“

”ماما سوری۔ آئندہ نہیں کروں گی۔“

”اگر آئندہ آپ نے ٹوتھ پیسٹ کو منہ میں ڈالا تو میں ڈیڈ کو بتا دوں گی کہ آپ ان کی ٹوتھ پیسٹ کھاتی ہو۔ اس دن بھی مجھے پتہ تھا کہ آپ اندر ہوا سی لیے میں آئی مگر سوچا آپ کو خود احساس ہو جائے گا اسی لیے میں اپنی چیزیں لے کر چلی گئی۔“ وہ اب بے ربط انداز میں کہتی اسی کو ڈانٹنے جا رہی تھی۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ چکی تھیں۔

جب وہ دونوں باہر نکلیں تو جولیا نثار مل لگ رہی تھی اور عصرہ بھی سنبھلی ہوئی تھی۔ فاتح گھر آچکا تھا اور کچن سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جولیا نہ کا ہاتھ تھامے قدرے تعجب سے راہداری میں آگے بڑھتی گئی، یہاں تک کہ کچن کا کھلا دروازہ سامنے آیا تو اس نے چوکھٹ سے اندر جھانکا۔

کچن کھلا اور سفید ٹائلز سے آراستہ تھا۔ کاؤنٹر پر سکندر بیٹھا تھا اور دوسرے کے ساتھ فاتح ٹیک لگائے بازو سینے پہ لپیٹے کھڑا تھا۔ نانی ڈھیلی کیے شرنک کے کف موڑے وہ تھکا تھکا لگتا تھا مگر مسکرا کے سکندر سے کچھ کہہ رہا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی۔

”تم آج کچن میں کیسے؟“

فاتح نے نگاہیں پھیر کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ”بھوک لگی تھی۔ کھانا لینے آیا تھا۔“

کھانا ملازمہ نے ٹیبل پہ لگا تو دیا تھا، ”عصرہ تعجب سے اندر آئی۔“

”ڈیڈ کو کھانے کا ڈانٹتے نہیں پسند آ رہا، ماما۔“ سکندر نے نوڈلز کے پیالے سے سر اٹھا کے اطلاع دی۔

”کھانا ہمیشہ صبح ہی بناتی ہے۔ آج کیا ہو گیا ہے اچانک؟“

”عجیب سا کھانا بناتی ہے وہ۔ میرے معدے میں جلن ہو رہی ہے۔“ وہ کندھے اچکا کے بولا تو عصرہ آگے آئی۔

”میں تمہیں کچھ اور بنا دیتی ہوں۔“

”ہاں شیور۔“ وہ بس مسکرا دیا۔ تکان کے باوجود موڈ اچھا لگ رہا تھا۔ جولیا نہ شرماتی شرماتی باپ کے قریب آ کے کھڑی ہوئی۔ فریج سے پیکٹ نکالتی عصرہ نے ننکھیں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے لیے چلتا پھرتا نام بم بن چکی تھی۔

”مجھے تم لوگوں سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“

نوڈلز سوپ پیتے سکندر نے گردن موڑی۔ جولیا نہ جو کمیٹیٹ سے ٹیک لگائے کھڑی اپنے لمبے بالوں سے کھیل رہی تھی چہرہ اٹھا کے دیکھنے لگی۔ عصرہ البتہ نیم رخ موڑے سلیب پہ قیصر رکھ کے تیز تیز اس سے پیڑے نکالنے لگی۔ ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

”میں نے پارٹی چیئر مین شپ کے لیے کانڈات جمع کروا دیے ہیں۔ دو ماہ بعد انکیشن ہے۔ سوموار سے ہم کمپین شروع کریں گے۔“

”کیا پھر آپ پارٹی چیئر مین بن جائیں گے۔“

”کیا آپ پردھان منتری بن جائیں گے؟“ دونوں بچوں نے یکے بعد دیگرے سوال پوچھا۔ عصرہ کے ہاتھوں میں مزید تیزی آ گئی۔

”جب کوئی اسکول کی فٹ بال ٹیم میں شامل ہوتا ہے تو اس کا خواب ہوتا ہے کہ وہ بہترین پلیئر بنے۔ پھر وہ کیپٹن بنے، پھر وہ قومی لیول پہ کھیلے۔ اور آخر میں وہ قومی ٹیم کا کیپٹن بنے۔ جب کوئی فوج میں بھرتی ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ایک دن وہ آرمی چیف بنے۔ اپنے ملک کی اعلیٰ ترین سطح پہ نمائندگی کرنے کا خواب دیکھنا بڑی بات نہیں ہے۔ بریاستدان اعلیٰ ترین مقام پہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اور میں.....“ اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ ”اس کے بہت قریب ہوں۔ تم لوگوں سے میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔“

بچے چپ ہو گئے۔ جولیا نے ماں کو دیکھا اور سکندر کا چہرہ جھک گیا۔

”جب بھی کیمپین شروع ہوتی ہے ڈیڈ، ہر طرف سے مسئلے شروع ہو جاتی ہیں۔“ اس کو ”مسئلوں“ کے علاوہ کوئی لفظ نہیں مل رہا تھا۔

”تم یہ یقین رکھو سکندر کہ تمہارا باپ ہر موقع پہ تمہاری حفاظت کرے گا اور.....“

”جیسے آریانہ کی حفاظت کی تھی؟“ عصرہ نے ایک دم میٹ بال ڈش میں بیچی اور اس کی طرف گھومی تو آنکھوں میں بے بسی بھر اخصہ

تھا۔ ”اور اگر میں آریانہ کو بھلا بھی دوں، تب بھی برکیمپین کے شروع ہوتے ہی منفی مہم شروع ہو جاتی ہے۔ میرے بچوں سے رپورٹرز سوال پوچھتے ہیں۔ مجھے برجگہ مسکرا مسکرا کے لوگوں سے وعدے کرنے پڑتے ہیں۔ انٹرویوز، اخبارات.... اور پھر آئے روز اخبارات میں تمہارے اوپر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ بچے اسکول جانے سے ڈر نے لگتے ہیں۔ تم گھر کی شکل دیکھنا بھول جاتے ہو۔ ہم تمہارے لیے ترس جاتے ہیں۔ اور اس ساری بھاگ دوڑ کے آخر میں فاتح بن رامنزل تم ہار جاؤ گے تو کیا ہوگا؟ ہاں؟“

بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

”اور اگر ہم جیت گئے تو؟“ وہ اتنا ہی پرسکون کھڑا تھا۔ عصرہ نے تاسف بھری نظر اس پہ ڈالی، پھر ڈش پرے کھسکائی اور پیر پختی وہاں سے نکل گئی۔

فاتح نے گہری سانس بھری اور خاموشی سے سنک تک گیا۔ ہاتھ دھوئے اور قیمے کی ڈش کو اپنے قریب کیا۔ پیڑھا اٹھایا اور اسے گول شکل دینے لگا۔ اس کے ہاتھ مہارت سے چل رہے تھے۔ ذہن عصرہ کی باتوں میں الجھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خاموشی سے پاستہ کے اوپر میٹ بالز پلیٹ میں سجائے میز پر رکھ رہا تھا تو نوکری میں پڑی سبزیاں دیکھ کے چونکا۔

”پہلے خیال کیوں نہیں آیا۔“ ماتھے کو چھوا پھر چھریوں کے اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ سب سے بڑا چھرا نکالا اور سلاڈ کی سبزیاں الگ کر کے کٹنگ بورڈ پر رکھیں۔ اب وہ تیز تیز ہاتھ چلاتے ان کو کاٹ رہا تھا۔

سکندر آہستہ آہستہ سوپ پیتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ڈیڈ..... آپ کو یہ کرنا آتا ہے۔“

”نہیں..... لیکن تمہاری ماں ناراض ہو چکی ہے اور ملازم گھر جا چکے ہیں۔ خود ہی کرنا پڑے گا۔“ اس نے سلاڈ پلیٹ میں ڈالا اور جھک کے چمچ سے پاستہ کا ڈانقہ چکھا۔ مگر چہرے پہ بد مزوگی پھیلی۔ ”بس گزارے لائق ہے۔“

اسے ڈانقہ پسند نہیں آ رہا تھا۔ پراسیس کیے گئے پیکٹ والے کھانے بے تاثیر بے سواد۔

معلوم نہیں کیوں مگر ذہن میں کوئی ”موازنہ“ سا تھا جس کے سامنے یہ کھانا بے کار لگ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں عصرہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی اور ساتھ بیڈ پہ آڑی ترچھی لیتی جولیا نہ کوئی کلرنگ بک کھولے رنگ بھرتی، کہہ رہی تھی۔

”آج ڈیڈ خود کیوں کھانا بنا رہے ہیں؟ وہ تو پانی پینے بھی کچن میں نہیں آتے تھے اور آج کہہ رہے تھے مجھے پکتے سوپ کی مہک اچھی لگ رہی ہے۔ ماما..... ڈیڈ ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔“ پھر رک کے انگلیوں پہ کچھ گنا۔ ”آپ ان سے ناراض ہیں تو کیا آپ ان کو فورٹی ایٹ منٹس دیں گی؟“

”مجھے تنگ مت کرو، جولی۔“ ناگواری سے کہتے اس نے کروٹ بدل لی۔ ایک آنسو آنکھ سے گرا اور تکیے میں جذب ہو گیا۔

(ساری اداکاری تھی فیملی مین بننے کی تاکہ وہ لوگ یقین کر لیں کہ اس کو ان کی پرواہ ہے۔ ہونہر۔)

عصرہ کے اندازے الامحدود تھے۔

☆☆=====☆☆

یونیورسٹی میں اکثر کلاسز ختم ہو چکی تھیں اس لیے طلباء طالبات کا ہم غنیر گیٹ سے باہر نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ پارکنگ میں حسب معمول بے حد رش تھا اور سب اپنے اپنے بیگز اٹھائے اپنی مطلوبہ سواری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسکارف، اسکرٹ، باجو کرنگ، مغربی لباس غرض ہر طرح کا لباس پہنے لڑکیاں باہر آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں ایک پھولدار اسکارف والی لڑکی بیگ کندھے پہ ڈالے، موبائل کے بٹن دباتی سڑک کر اس کرنے لگی تو عقب سے آواز آئی۔

”فاطمہ!“

وہ چونک کے گھومی۔ پھر اس نے نوجوان کو وہاں کھڑے دیکھ کر تعجب سے ابرو اٹھٹھے ہوئے۔

”ایڈم۔ تم؟ ادھر؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔ دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھبنا کے دیکھا۔ وہ واقعی ایڈم ہی تھا۔ چھوٹے بالوں اور نکھری رنگت والا ایڈم۔ سیاہ پیٹ پہ سفید ٹی شرٹ پہ سبز سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”فاطمہ..... ہم بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟“

”ہاں... ادھر آ جاؤ۔“ فاطمہ سنجیدگی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

دونوں فٹ پاتھ پہ چلتے بس اسٹینڈ تک آئے جہاں چھپرے تلے بیچ رکھا تھا۔ فاطمہ قدرے تکلف سے ادھر بیٹھی، درمیان میں کتابیں اور

بیگ رکھا اور ہاتھ سے اسے کتابوں کے اس طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے متانت سے بیٹھ گیا۔

”تم خیریت سے آئے ہو؟“ پھر جیسے یاد آیا۔ ”تمہارا تحفہ مل گیا تھا مجھے۔ شکریہ اس کے لئے۔“

ایڈم بن محمد نے گہری سانس لی۔ چار ماہ پہلے بھیجا گیا تحفہ اسے یاد بھی نہ تھا۔ بلکہ... ایک ہفتہ قبل بھیجا گیا تحفہ (دل ہی دل میں اپنی تصحیح کی) جس کے لیے اس نے عصرہ اور تالیہ دونوں سے مشورہ مانگا تھا۔ تب اس کے مسئلہ محدود تھے۔ اور اب تو زمانہ ہی بدل چکا تھا۔ وہ وقت اور وہ احساسات دونوں ہی گم گشتہ سے لگتے تھے۔ پرانے اور فراموش کردہ۔

”فاطمہ... میں ہماری شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”سنو ایڈم!“ وہ بات کاٹ کے بولی تو ایڈم نے دیکھا۔ پھولدار اسکارف کے ہالے میں مقید اس کے چہرے پہ نکھلی تھی۔ وہ خوش شکل اور صاف رنگت والی پر اعتماد مگر سنجیدہ سی لڑکی تھی اور اس وقت وہ تکلف سے بیٹھی نظر آتی تھی۔

”میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ تمہارا اور میرا رشتہ اربنخ طریقے سے ہوا تھا تب تم فوج میں تھے۔ میں کتنے عرصے سے تمہارے نام پہ بیٹھی ہوں۔ تم نے فوج چھوڑ دی، پھر تمہیں کوئی نوکری نہیں ملی۔ وان فاتح کی نوکری بھی تم سے مستقل نہ ہو سکی...“

”وہ تو صرف چند دن کی تھی۔“ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

”اب تم بتاؤ میرے والدین کیسے تمہارے ساتھ میری شادی کر دیں؟ ایڈم جب تک ان کو کوئی فنانشل سکیورٹی نہیں ملے گی، وہ شادی نہیں کریں گے۔ اب خالہ بتا رہی تھیں کہ تم ایک دم سے لکھنے لکھانے کی طرف چلے گئے ہو۔ ایڈم یہ کیا ہے؟“

ایڈم کے رخسار گلابی ہوئے۔ (یہ ایو بھی نا!)

”وہ الگ بات ہے فاطمہ۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ انکل اگر مجھے تھوڑا وقت دے دیں، بس چند ماہ تو میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ بس وہ یہ دو ہفتے کے اندر اندر اسٹیبلش ہونے کی شرط چھوڑ دیں۔ تم خود بتاؤ فاطمہ دو ہفتے کے اندر میں کیسے امیر ہو سکتا ہوں۔“ وہ روہانسا ہوا۔

”تو چند ماہ میں کیسے ہو گے؟“

ایڈم چپ ہوا۔ تھوک نگلا۔ ”مجھے امید ہے کسی طرف سے۔ بس یہ سمجھو بہت جلد میرے پاس پیسہ آ جائے گا۔“ (خزانہ نکالنے کے بعد بیچنے میں بھی وقت لگنا تھا۔)

”بغیر محنت کے؟ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے؟“ وہ طنز سے بولی۔ ”اس طرح اچانک سے کیا تمہارے باغیچے سے تیل کا کنواں نکلے گا یا محن میں خزانہ دفن ہوا ملے گا؟“

بس زور سے ہارن بجاتی سائیڈ سے گزری اور ایڈم بھی اندر تک مل گیا۔ نظریں چرا لیں۔

”بالفرض میرے گھر کی زمین سے خزانہ نکل آئے تو کیا تب تم مجھ سے شادی کر لو گی؟“

”نکل بھی آیا تو کون سا تمہارا ہوگا؟“ وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ایڈم تم کوئی اچھی نوکری ڈھونڈو اور اگر ایسا نہ ہوا تو یقین رکھو پایا

یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔ میں پہلے ہی ماما بابا کی پریشانی دیکھ کے ڈسٹرب ہوں۔“
 ”فاطمہ فاطمہ....“ وہ ملتچی انداز میں کھڑا ہوا۔ ”پلیز تم میرا یقین رکھو۔ میں محنت کروں گا اور کوشش بھی اور....“ یکدم وہ ٹھہرا اور ٹکڑے ٹکڑے اے دیکھنے لگا۔ اطراف سے گاڑیاں ہارن بجاتی زن سے گزر رہی تھیں مگر ایڈم بن محمد بالکل گم صم ہو گیا تھا۔
 ”کیا کہا تم نے؟“

”بابا یہ رشتہ ختم کر دیں گے ایڈم۔“
 ”نہیں اس سے پہلے.... تم نے کہا خزانہ نکل بھی آیا تو میرا نہیں ہوگا۔ کیوں؟“ وہ جیسے کسی خواب سے جاگا تھا۔ پانچ سو ستاون سال قدیم خواب سے.... ”کیوں نہیں ہوگا وہ میرا؟“
 ”وہ تو میں روانی میں کہہ گئی۔ یہ کتابیں پڑھ پڑھ کے دماغ خشک ہو جاتا ہے۔“ اس نے سر جھٹکا اور بچ سے اپنی قانون کی موٹی سیاہ کتابیں اٹھائیں۔ ایڈم یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ نے چیزیں سمیٹ کے اس کو دیکھا تو وہ اسی طرح حیران اور گم صم سا کھڑا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

”Treasure trove Act 1995... تمہیں نہیں معلوم ایڈم؟“

اور ایڈم بن محمد کے سارے خواب کسی ایسے ہیرے کی طرح چمکنا چور ہوئے جس کو آسمان سے زمین پہ پھینکا جائے اور اس کی چمکتی کرچیاں دور دور تک پھیل جائیں۔

☆☆=====☆☆

حالم کے بنگلے پہ اندھیرا پھیلا تھا۔ پورچ کی بتی آج پھر بجھی تھی۔ داتن اندر آئی تو پہلے پورچ روشن کیا، پھر لاونچ کی بتیاں جلا لیں۔ تالیہ وہاں نہیں تھی۔ تہہ خانے کی طرف جاتا دروازہ کھلا تھا اور وہاں سے روشنی آرہی تھی۔ داتن نے گروہری کے تھیلے وہیں رکھے اور برہمی سے ماتھے پہ بل ڈالے زینوں کی طرف آئی۔

”تم نے لا پرواہی کی حد کر دی۔ دروازہ کھول کے بیٹھی ہو.... اتنا قیمتی سامان رکھا ہے یہاں اور....“ داتن نے دھپ دھپ اترتی نیچے آئی اور اس پہ چڑھ دوڑی جو فرش پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ اور اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹکی۔
 بے یقینی سے گردن چاروں طرف موڑی۔

وہاں بنے سیف کے مختلف دروازے کھلے تھے اور وہ اندر سے خالی تھے۔ پیٹنگنز کے کارٹن بھی غائب تھے اور خالی ڈبے اور کھڑکی کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ داتن پدوکا نے دہل کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔
 ”وہ خوف تھا۔“

"تالیہ! "داتن نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر اسے فکر ہوئی "تمہیں کیا ہوا ہے؟ اور یہ سب کہاں گیا ہے؟"

"اگر اب میں سوچوں تو وہ خوف تھا۔ بچپن میں ... " وہ اس کو دیکھتی اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔ شاید داتن کے چہرے کی لکیروں میں اپنی زندگی کی فلم چلتی دیکھ رہی تھی۔ "اور وہ لالچ بھی تھا اور جبر بھی۔ کون سا جذبہ پہلے آیا، مجھے نہیں یاد۔ لیکن جب یتیم خانے اور بعد میں میرے فوٹر پیرنٹس کے گھر مجھے جبر سے دبایا جاتا، خواہشات کو پورا کرنے سے روکا جاتا ... تو میں چوری کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ پھر وہ عادت بن گئی۔ جبر الینا اور پوچھے جانے پہ جھوٹ بول دینا۔ لیکن اب اگر سوچوں تو حاوی ترین جذبہ خوف ہوتا تھا۔"

"تالیہ... تم ٹھیک ہو؟" داتن اس سے لمحے بھر کے لیے بھی نظریں ہٹائے بغیر کرسی کھینچتی قریب آئی اور بیٹھی۔

"میں ہمیشہ خوفزدہ رہی ہوں۔ یہ ڈر کہ میری بات سنی نہیں جائے گی یا مجھے ڈانٹ کے خاموش کرا دیا جائے گا، مجھ سے جھوٹ بولا رہا۔ اور جب ڈر ختم ہو گیا تو یہ ان سیکورٹی پیدا ہو گئی کہ اگر میں من گھڑت باتیں نہیں کہوں گی تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ لوگ مجھے میرے جج کے ساتھ قبول نہیں کریں گے۔ میں ہمیشہ خوف کے زیر اثر رہی ہوں داتن۔ میں کبھی بہادری سے اپنے اصل کا سامنا نہیں کر سکی۔" ابھی بکھری سنہری لٹیس اس کے گالوں پہ جھول رہی تھیں اور وہ دیوار کو دیکھتی بے خودی بولے جا رہی تھی۔

"لیکن پھر میں ایسے انسان سے ملی جس نے مجھے سکھایا کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اس کی سچائی اور امانت داری ہوتی ہے۔ جو لوگ سچے ہوتے ہیں وہ اپنی نظروں میں باعزت ہوتے ہیں۔ اپنے قول کے کچے ہوتے ہیں۔ ان کے سارے خوف دور ہو جاتے ہیں۔ وہ سرائی کے جی سکتے ہیں۔ صرف وہی ہوتے ہیں بہادر اور میں نے سوچا کہ میں بھی ایسی بننا چاہتی ہوں۔"

"تالیہ؟" داتن اسے تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

"مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔" تالیہ اداسی سے مسکرائی "پہلے اپنے سارے جھوٹوں کی سزا ملنا تھی۔ پہلے کفارے ادا ہونے تھے۔ میرے ساتھ زندگی نے ہی جھوٹ بول دیا، داتن!" اس کی گم صم آنکھیں پانی سے چمکیں "مجھے کچھ اور دکھا کے کچھ اور عطا کر دیا۔ مجھے اتنا قابل اعتبار بنا دیا کہ اگر میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا جج بولنا چاہوں تو بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"تالیہ ... کیا ہوا ہے؟"

"مگر اب نہیں، داتن!" اس نے آنکھیں پوروں سے رگڑیں۔ "اب میں اس خوف کے ساتھ نہیں جیوں گی۔ اب میں بھی ایڈم کی طرح سچ بولنا چاہتی ہوں اور وان فاتح کی طرح اپنے قول کو سچا بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے بہت سے قانون توڑے ہیں اب مزید نہیں توڑوں گی۔ یہ سب ... " اطراف میں نظر دوڑائی۔ "یہ سب میرا نہیں تھا۔ یہ سب دوسرے لوگوں اور میوزیمز کا تھا۔ میں نے ایک ایک چیز واپس کر دی ہے۔ جیسے چرانا آتا ہے ویسے ہی گناہ طریقے سے لوٹانا بھی آتا ہے۔"

داتن نے دہل کے پھر سے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "تالیہ ... نہ کرو ... وہ سب ..."

"اور جو کچھ میں خرچ کر چکی ہوں ... وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس کا میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں امید کرتی ہوں کہ میری

ایمانداری کے باعث اللہ تعالیٰ اور پھر وہ لوگ جن سے میں نے وہ چیزیں چرائی تھیں، مجھے معاف کر دیں گے۔“
 ”اب کیا ہوگا تالیہ؟ تم کہاں سے کھاؤ گی؟ کیا کماؤ گی؟“ داتن نے وہل کے سینے پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔
 تالیہ نے گہری سانس لی اور بال کان کے پیچھے اڑے۔

”میں نے جاب ڈھونڈ لی ہے۔ اور میرے پاس بہت سا زیور بھی ہے۔ جو واقعی میرا ہے۔ اور مجھے ایک اور جگہ سے بھی امید ہے۔“ اس کے ذہن میں سن باؤ کا صحن گھوما۔ ”ہاں مجھے ابھی بھی بہت سا راپیہ حاصل کرنے کا شوق ہے لیکن اب میں صرف اس پیسے کو قبول کروں گی جو واقعی میرا ہوگا۔“

پھر نرم آنکھوں سے مسکرائی تو داتن نے دیکھا، اس کی ناک سرخ پر رہی تھی۔

”رہی تم تو میں تمہیں یہ کام چھوڑنے پہ مجبور نہیں کروں گی۔ تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔ میں اور تم ہمیشہ دوست رہیں گے۔“

داتن نے ملال سے اس خالی خالی سے کمرے کو دیکھا۔ ”ایسا کیا ہوا ہے چار دن میں جو تم اتنی بدل گئی ہو تالیہ؟“
 ”مجھے وان فاتح سے محبت ہو گئی ہے داتن، زخمی سا وہ مسکرائی اور کپڑے جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن سانس روک کے اسے دیکھ گئی۔
 پھر کہنے کی کوشش کی۔

”اسی فیصد لوگوں کو ہر چھ ماہ بعد نیا کرش ہو جاتا ہے اور وہ چار ماہ میں اتر بھی جاتا ہے مگر.....“

”تم نہیں سمجھو گی، داتن!“ وہ مسکراتے ہوئے بولی پھر ایڑیوں پہ گول گول گھوم گئی۔ خالی کمر بہت کھلا کھلا سا لگ رہا تھا۔
 ”میں نے یہ سب واپس کر دیا ہے، پھر بھی میرا دل ہلکا کیوں نہیں ہوا؟“ اس نے سوچا تھا۔ تبھی موبائل بجاتا تالیہ نے اسے نکال کے دیکھا۔

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ ایڈم کا پیغام وہاں جگمگا رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ایڈم ریستوران کی آخری میز پہ بیٹھا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تالیہ جیسے ہی دروازے سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ہشاش بشاش اور تازہ دم لگتی تھی۔ سادہ باجو کرنگ پہنے، بالوں میں ہیر بینڈ لگائے، سر پہ ترچھی ہیٹ جمائے، مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور کرسی سنبھالی۔ پھر کہنیاں میز پر رکھیں اور پھر چمکتی آنکھوں میں شرارت بھرے اسے دیکھا۔

”میں نے سارا ”ادھار شدہ“ مال اصل مالکوں کو واپس کر دیا ہے۔“ فاتحانہ انداز میں بولی تو ایڈم پھیکا سا مسکرایا۔
 ”دگڈ۔“

”صرف گند؟ ارے اس پہ تو تمہیں اپنی شہزادی کی شان میں ایک قصیدہ لکھنا چاہئے تھا۔“

”جے تالیہ.....“ وہ دھیمسا بولا۔ چہرہ بجھا بجھا سا لگتا تھا اور اس نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”سن باؤ کا خزانہ.....“

”ہاں وہی بتانے لگی تھی۔“ وہ جوش سے آگے کوچھکی۔ ”فاتح صاحب نے گھر میرے حوالے کر دیا ہے۔ کل صبح ہم ملا کہ جائیں گے۔ میں نے کھدائی کا سامان خرید لیا ہے۔ ہمیں احتیاط سے کھدائی کرنی ہے تاکہ خزانہ نکال کے ہم کوئی نشان چھوڑے بغیر صحن کو برابر کر دیں اور.....“

”جے تالیہ وہ خزانہ ہمارا نہیں ہے۔“

ایک دم سے جیسے سارے شہر میں سناٹا چھا گیا۔ تالیہ ٹکڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا؟“ اسے واقعی سمجھ نہیں آیا تھا۔

وہ خزانہ ہم نہیں لے سکتے۔“

تالیہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لوگ اپنی اپنی میزوں پہ کھانے پینے میں مگن تھے، کوئی اس طرف متوجہ نہ تھا۔

”کیوں؟ وہ ہمارا ہے۔ ہم نے دبایا ہے۔“

”مگر چھ صدیوں تک اس کی حفاظت ہم نے نہیں ”زمین“ نے کی ہے۔ اسے امانت کی طرح اپنے اندر ہم نے نہیں ”زمین“ نے چھپایا ہے۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ ”زمین“ سرکار کی ہوتی ہے۔“

وہ بالکل سن رہ گئی۔ ساکت، مجسم۔ ارد گرد پھرتے لوگوں کے جھوم میں بھی اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

”Treasure trove act کے تحت ملائیشیا کی زمین سے کوئی بھی چھپا ہوا خزانہ ڈھونڈنے پہ شہری کا فرض ہے کہ وہ اسے حکومت کے حوالے کر دے کیونکہ زمین میں چھپے خزانے سرکار کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس کی اطلاع حکومت کو نہیں دیں گے تو ہم مجرم ہوں گے اور پولیس ہمیں گرفتار کر سکتی ہے۔ خزانہ چھپانے پہ بھاری جرمانہ اور قید کی سزا ہے۔“

”وہ خزانہ.....“ وہ ایک دم غرائی پھر آواز مدہم کی۔ ”وہ خزانہ ہمارا ہے۔ جائز اور حلال۔ وہ حکومت کا نہیں ہے۔“

”وہ صرف اسی صورت میں ہمارا ہو سکتا تھا اگر اس پہ 50 سال سے کم عرصہ گزرا ہو یا اس کو ہمارے آباؤ اجداد نے دفنایا ہو اور ہم اس پہ کلیم کر سکیں۔ مگر ہم کلیم ثابت نہیں کر سکتے۔ قانوناً وہ ہمارا نہیں ہے۔“

”میری بات کان کھول کے سنو ایڈم!“ وہ میز پہ زور سے ہاتھ مار کے بولی۔ ”میں نے سارا لوٹا مال واپس کر دیا کیونکہ وہ میرا نہیں

تھا۔ میں نے پھر سے زندگی شروع کی۔ جاب ڈھونڈی۔ ایک نیلامی پہ ان سے جھوٹ بولا تھا تو وہ ناراض ہو گئے تھے۔ اس نیلامی پہ ان سے سچ بولا۔ اب میں زمین کو سوچی اپنی امانت واپس لینے آئی ہوں تو تم کہہ رہے ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں؟ غلط۔ میں نہیں مانتی ایسے قانون کو۔ مجھے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ خزانہ ہمارا ہے اور جائز ہے تو ہم کس طرح اس کو چھوڑ دیں؟“

”مجھے بھی اس کی اتنی ضرورت ہے جتنی آپ کو لیکن میں قانون نہیں توڑوں گا۔ البتہ میں آپ کو منع بھی نہیں کروں گا نہ میں کسی کو بتاؤں گا۔ آپ خزانہ نکال لیں.... سچ دیں... جو بھی کریں، آپ یہ سب اپنے لیے کریں گی۔ مگر ایک فیصلہ آپ کو اب بھی سے کرنا ہے۔ کیا آپ واقعی ایماندار بننے جا رہی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو ملک کے قانون کا احترام کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ یہ نہیں کرتیں تو کیا آپ خود اپنے وعدوں پہ یقین کر پائیں گی۔“

”وہ خزانہ میرا ہے۔“ وہ دونوں ہتھیلیاں میز پہ جمائے اٹھی اور اس کی طرف جھک کے غرائی۔ ”تم.... تمہارے اصول.... تمہارے قانون.... تم سب جہنم میں جاؤ۔ مجھ سے میری زندگی لے لی گئی۔ مجھ سے فاتح کو لے لیا گیا۔ میرا آپ وقت کی چابی نے مجھ سے دور کر دیا.... میرا آخری رشتہ تھا وہ اور وہ بھی مجھ سے چھن گیا (غصے سے منہ سے نکلا) میں پہلے ہی اپنی بیشتر دولت دے چکی ہوں۔ اور اب میں اپنا جائز خزانہ بھی دے دوں؟ برگز نہیں۔“ اس کا رنگ شدت جذبات سے سرخ پڑ چکا تھا۔

”میں نے کہا نا... آپ اپنے فیصلوں میں آزاد ہیں۔ فتویٰ بہت سی چیزوں کی اجازت دے دیتا ہے لیکن جس دین کو میں مانتا ہوں اس میں تقویٰ انسان کو بہت سے غیر ضروری بوجھ سے بچا بھی لیتا ہے۔ میں اپنے ضمیر پہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“ وہ سادگی مگر اداسی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیجی بھیجی سی تھیں۔ تالیہ نے ایک غصیلی نظر اس پہ ڈالی پرس دبوچ کے اٹھایا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

ایڈم نے اسے دکھی دل کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ملال اور درد بہت تھا مگر ایک بات طے تھی کہ آدم بن محمد کا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ ہر بوجھ سے آزاد۔

☆☆=====☆☆

اتوار کی صبح اشعر محمود کے قلعہ نما گھر کے لان میں ہرن دھوپ سینکتے دکھائی دے رہے تھے۔ صبح خوب بارش ہوئی تھی۔ سارا لان نہادھو کے نکھر نکھر گیا تھا۔ اب چانک سے دھوپ نکل آئی تو ہرن گھاس پہ ست سے لیٹ گئے تھے۔

لان کے وسط میں لکڑی کی سیڑھیاں بنی تھیں جو اوپر ایک کینو پی تک جاتی تھیں۔ مخروطی چھت والی کینو پی کے اندر لکڑی کے بیچ آمنے سامنے رکھے تھے۔ اشعر ایک بیچ پہ براجمان پیر قینچی صورت میز پہ رکھے ہوئے تھا۔ جینز کے اوپر پی شرٹ پہنے، بالوں کو عام دنوں کے برعکس ماتھے پہ بکھیرے وہ اخبار سامنے پھیلائے ہوئے تھا۔

”ایٹش!“ اس نے زینے چڑھنے کی آواز سن لی پھر بھی اخبار پڑھتا رہا۔ جب عصرہ سامنے آکھڑی ہوئی تو اشعر نے اخبار کا کونا موڑا اور

سپاٹ سے نظروں سے اسے دیکھا۔

”اتنی صبح؟ خیریت؟“ انداز سرد تھا۔

”مجھے بات کرنی تھی۔“ عصرہ شدید پریشان نظر آتی تھی۔ اسکرٹ کے اوپر کندھوں کے گرد سادہ شال لپیٹے، وہ میک اپ سے خالی چہرہ لیے، بال باندھے یوں دکھائی دے رہی تھی گویا ابھی نیند سے اٹھ کے آئی ہو۔

”فاتح نے کاغذات جمع کروادیے۔ میں جانتی ہوں اس بات پر تم مجھ سے ناراض ہو لیکن اس روز گھائل غزال والی مدد کے بدلے میں اس نے کہا تھا کہ۔۔۔“

”آپ نے عظیم طاعون کے بارے میں سن رکھا ہے، کا کا؟“ تلخی سے اخبار لپیٹتے ہوئے اس نے عصرہ کو دیکھا۔

”اب تم فاتح کی طرح باتیں مت کرو۔“ وہ خفگی سے کہتی سامنے بیٹھی مگر اشعر نے بات نہیں سنی۔ اخبار میز پر ڈالتے ہوئے بولا

”اور آپ نے وہ نظم سنی ہے Ring-a-Ring-a-roses؟ بعض کہتے ہیں کہ وہ نظم یورپ کے عظیم طاعون کے بارے میں تھی، جب

لاکھوں لوگ طاعون سے مر گئے تھے۔ ان کو سرخ دانے نکلتے تھے۔ جو سرخ دائروں کی صورت نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ طاعون

کے مریض جیب میں poises (پھول) اٹھا کے پھرتے تھے تاکہ خوشبو بیماری کی بو کو ڈھانک دے اور شفا دے۔ ان کے جسم سیاہ پڑ

جاتے اور طاعون کے مریضوں کے مرنے کے بعد ان کی لاشیں اور ان کے گھر جلا دیے جاتے۔ یعنی آخر میں۔۔۔۔۔“ وہ آگے ہوا اور پھر

چبھتی نظروں سے عصرہ کو دیکھا۔ ”آخر میں وہ سب مر جاتے تھے۔“

پھر اس نے آہستہ سے نظم پڑھی۔

Ring around the rosies

(سرخ پھول جیسے دانے کے گرد دائرہ)

A pocket full of posies

(پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ جیب میں ہے)

Ashes Ashes

(راکھ۔۔۔۔۔ راکھ)

We all fall down

(اور ہم سب ڈھاتے چلے گئے)

اس نے آخری الفاظ اتنے سرد انداز میں ادا کئے عصرہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

”اشعر پلیز میری بات سنو۔“

”وان فاتح کیا سمجھتے ہیں؟ اگر وہ چیئر مین شپ کی لیے کاغذات جمع کرائیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ سیٹ میری ہے تو وہ کامیاب ہو جائیں گے؟ نہیں کا کا۔ ہم سب راکھ کا ذہیر بن کے ایک ساتھ ڈھے جائیں گے۔“

”میں نے بہت کوشش کی ہے، اشعر لیکن وہ نہیں مانتا۔ اس نے آخر میں اپنی مرضی ہی کرنی ہوتی ہے۔“

”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چیئر مین میں بنوں گا۔ آپ نے کہا تھا کہ آنگ سیاست سے کنارہ کش ہو کے مجھے endorse کریں گے لیکن کل میں نے سنا کہ وہ انکیشن لڑ رہے ہیں۔ واہ۔ کا کا۔ واہ۔“ ناگواری بھرے غصے سے کہتا وہ گردن موڑے گھاس کود دیکھنے لگا۔ وہ سخت ناراض لگتا تھا۔

”اگر وہ گھائل غزال والا معاملہ نہ ہوتا تو.....“ عصرہ بے بسی سے بولی، پھر سر جھٹکا۔ ”مگر نہیں۔ وہ تب بھی میری نہ مانتا۔ اسے اپنی ہی کرنی ہوتی ہے۔ اور اب تو وہ عجیب سا ہو گیا ہے۔ بے نیاز سا۔ جب سے وہ ملا کہ سے واپس آیا ہے بدلا بدلا لگتا ہے۔“

اشعر نے چونک کے اسے دیکھا، پھر تعجب سے ابرو اٹھایا۔ ”کیا بدلا ہوا لگتا ہے؟ مجھے تو ویسے ہی لگے ہیں۔ سوائے آنکھ کے زخم کے۔“

”تم اس کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہتے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اسے سمجھنا کتنا مشکل ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔ پھر کینٹی پے ہاتھ رکھا۔ ”اشعر..... میں مزید کوشش نہیں کر سکتی۔ میں تھک گئی ہوں۔ تم لوگوں کے مسئلے ختم نہیں ہوئے تھے کہ نیلامی والا مسئلہ آگیا۔ میرے ساتھ ایسا کون کر سکتا ہے؟ تم نے پتہ کروایا؟“

”کر وادوں گا۔ میرے اپنے کام پھنسنے پڑے ہیں ابھی۔“ اس نے بے زاری سے چہرہ دوبارہ موڑ لیا۔ عصرہ نے چھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”فاتح نے کاغذات نامزدگی کیا جمع کروائے، تم نے تو نظریں ہی پھیر لیں، ایش۔ تم بھول گئے ہو میں نے تمہارے لیے اس کی فائل تک چرائی۔ اب اور کیا کروں میں؟“

”کا کا میرے سر میں درد ہے، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ رکھائی سے کہہ کے اٹھا، میز پر رکھا موبائل اٹھایا اور لکڑی کے زینے اترنے لگا۔ بر قدم کے ساتھ لکڑی کے چننے کی آواز آتی تھی۔ عصرہ بے بسی بھرے غصے سے کھڑی ہوئی۔

”میں کیا کروں مزید ایش؟ میں تھک گئی ہوں۔“

اشعر جواب دیے بنالان پہ اتر اور آگے چلتا کیا۔ اس کے ابرو اتنے ہوتے ہوئے تھے اور چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے نیلامی کے اسکیڈل کی تیاری کب سے کر رکھی تھی۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اگر اسکیڈل نہ بن سکا تو وہ عصرہ سے کیسا رویہ رکھے گا؟ اس بارے میں اس کے ذہن میں کوئی اسکرپٹ تیار نہ تھا۔ فی الوقت وہ عصرہ اور فاتح کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆=====☆☆

حالم کے بنگلے کو بھی بارش نے دھو ڈالا تھا۔ کھڑکیوں پہ قطرے جم گئے تھے مگر دھوپ نکلی تو وہ سوکھتے گئے۔ تالیہ اپنے کمرے کی کھڑکی کی

ساتھ زمین پہ بیٹھی تھی۔ شیشے سے چہرہ نکار کھاتھا اور نظریں باہر جمی تھیں۔ رات والے سلسپنگ سوٹ میں ملبوس وہ ویران ویران سی لگ رہی تھی۔

دفعہ وار وزہ کھلا اور داتن سنجیدہ چہرہ بنائے اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی جو اس نے تالیہ کے قدموں کے پاس رکھی اور پھر اپنا بھاری بھر کمسر اپا سنبھالتی بیڈ کے کنارے جا بیٹھی۔ اب وہ تالیہ سے دو فٹ کے فاصلے پہ تھی۔

”اگر اپنے سارے مال و دولت کو گنونا تمہیں اتنا تکلیف دے رہا ہے تو تم نے ایسا کیا کیوں؟“ اس نے تھکی تھکی سی تالیہ کا پر مڑوہ چہرہ دیکھا جو گال شیشے سے نکائے باہر جھانک رہی تھی۔

”میں دو دنیاؤں کے درمیان پھنس گئی ہوں داتن۔“ اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

”تالیہ ہم اچھے دوست رہے ہیں مگر اب تم راستہ بدلنا چاہتی ہو۔ تمہیں نئے نیک دوست مل گئے ہیں اور اب تمہیں پرانے دوست گناہگار اور بھٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ پرانے دوست برے سہی اور نئے بہت اچھے سہی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم پرانے دوست سے اب دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔“

تالیہ نے نظریں موڑیں تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ”پرانے دوستوں جیسی میں رہنا نہیں چاہتی..... مگر نئے دوست اخلاق اور کردار میں اتنے اعلیٰ ہیں کہ ان تک میں نہیں پہنچ سکتی۔ میں کیا کروں داتن؟“

”تم میرے جیسی کبھی نہیں تھیں۔ میں تنگو کامل کی بیوی کے سارے زیور چرانا چاہتی تھی مگر تم نے کہا کہ اس کا تاج (تیارا) چھوڑ دوں وہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔ تم دھوکہ دی اور جھوٹ کی اس دنیا میں بھی دل دکھانے سے ڈرتی تھیں۔ تم تلخ اور زہر خند نہیں تھیں۔ ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھیں۔“

”مگر میں ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔“ اس کی نگاہ محل پہ تھی جو اونچی پہاڑی پہ بنا تھا اور اس تک جانے کے لیے کوئی سڑک نہ تھی۔

”تم کردار اور اخلاق کے اعلیٰ ترین معیار پہ پہنچ کہ بھی ان جیسی نہیں بن سکتیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ کوئی کسی کی طرح نہیں بن سکتا۔ ہر انسان مختلف ہوتا ہے۔ اور کیونکہ انہوں نے تمہاری طرح دوزندگیوں کے ذائقے نہیں چکھے۔ وہ سچے ہیں اس لیے انہیں جھوٹوں سے لڑنا نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ سیدھے راستے پہ رہے ہیں اس لیے انہیں میڑھ اتنی آسانی سے دکھائی نہیں دیتے۔ تمہیں دکھائی دیں گے۔ ہمیشہ دکھائی دیتے رہیں گے۔ تم سچی بننا چاہتی ہو شوق سے بنو، لیکن تم ان سے ہمیشہ مختلف رہو گی۔“

تالیہ نے دھیرے سے سر اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور یہ میرا اصل ہے جس کے ساتھ مجھے رہنا ہے؟“

”ہاں۔ تم نے اتنے میڑھ پن اختیار کیے ہیں کہ اب تم انسانوں کے وہ سارے میڑھ دیکھ سکتی ہو جو تمہارے نئے دوست نہیں دیکھ سکتے۔ تم سچ جھوٹ کی پہچان ان سے بہتر کر سکتی ہو کیونکہ تم اس سب سے گزر چکی ہو۔“

تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ پھر سے گردن موڑ کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

داتن چلی گئی اور کمرے میں کافی دیر خاموشی پھیلی رہی تو اس نے فرش پر رکھا سیاہ موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ پھر اسپیکر آن کر کے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا اور گال گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”کیسے ہو، عالم؟“ چند گھنٹیوں بعد وان فاتح ی آواز سنائی دی۔ اس کا سانس اٹھل پٹھل لگتا تھا جیسے وہ بھاگتا ہوا آرہا ہو۔ ”تھینا وہ صبح کی جاگنگ کر رہا تھا۔“

”فاتح صاحب..... آپ کے کام ابھی تک نہیں ہو سکے مگر.....“

”میں نے پوچھا.... کیسے ہو تم؟“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ سن باؤ کا غلام مجسمہ بناتی شہزادی سے ایسے ہی نرمی سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ ایک مسئلہ پوچھنا تھا آپ سے۔“

”میرا خیال تھا تم اکثر مسئلے خود حل کر لیتے ہو۔ خیر پوچھو۔“ وہ تیز تنفس کے درمیان بولا۔ رفتار آہستہ کر دی تھی۔

”آپ legislator ہیں۔ قانون بناتے ہیں۔ خود بھی وکیل رہے ہیں۔ مجھے بتائیں یہ treasure trove ایکٹ کیا ہے؟“

”خزانہ ڈھونڈنے والوں کے فرائض، رائلٹی؟ اس میں یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کو ملائیشیا میں کوئی مدفن خزانہ ملے تو آپ کو فوراً اس شہر کے ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دینی ہوتی ہے۔“

”اور اگر کوئی اطلاع دینے کے بجائے وہ خزانہ خود رکھنا چاہے تو؟“

”تو یہ جرم ہے۔“

”لیکن اگر خزانہ اس کے اپنے آباؤ اجداد کا ہو یا اس نے خود دبایا ہو..... تو یہ جرم کیسے ہوا؟“

”پچاس سال گزر جانے کے بعد مدفن چیزیں سرکار کی ملکیت بن جاتی ہیں، ہاں اگر کوئی یہ ثابت کر سکے کہ اس نے خزانہ خود دبایا تھا یا

واقعی اس کے آباؤ اجداد کا ہے تو وہ اسے مل سکتا ہے۔“

”ثابت نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر ہمیں خود معلوم ہو کہ ہم سچے ہیں... کیا تب بھی ہم وہ خزانہ خود نہیں رکھ سکتے؟ اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہو کہ ہم

سچے ہیں تب بھی نہیں؟“

”اللہ تعالیٰ کو تو سب معلوم ہوتا ہے مگر وہی ہمیں کہتا ہے کہ ہمیں law of the land کی پاسداری کرنی ہے اور ملک کا قانون

ثبوت مانگتا ہے۔“

”فاتح صاحب!“ اس نے آنکھیں رگڑیں۔ ”اگر انسان ایک راستے سے تائب ہونے کا عہد کر لے مگر پھر ایک موقع آئے۔ ایک

temptation سامنے ہو تو کیا ایک آخری مرتبہ اس کو چکھا جاسکتا ہے؟ بس یہ آخری ہو اس کے بعد وہ عہد کرے کہ وہ بر غبت سے

اجتناب کرے گا۔“

”اور اگر وہ امتحان آخری امتحان ہوا...؟ اگر اس کے بعد امتحان ہی نہ ہونا ہو اور اسی کے اوپر ہمیشہ کے لیے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ کیا جانا ہو؟ تب؟“

کھڑکیوں پہ ایک دم سے بوندیں برسنے لگیں۔ بارش پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ تالیہ نے بے اختیار چہرہ شیشے سے دور کیا۔

”تو بہ کا وقت تو موت تک ہوتا ہے فاتح صاحب۔“

”دیکھو حالم... کچھ امتحانات میں سہلی آ جاتی ہے اور کچھ کو فیل کرنے کی صورت میں کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ امتحانات انٹری ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ایک نئے طرز زندگی میں داخلے کا امتحان۔ ان کو فیل کیا تو آپ داخل ہی نہیں ہوں گے۔ بعد میں تو بہ کر بھی لیں تو کس نے گارنٹی دی ہے کہ تو بہ قبول بھی ہوگی؟“

”اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش سامنے ہو تو اسے کیسے چھوڑا جائے؟ فاتح صاحب؟ اتنا بڑا دل کوئی کہاں سے لائے؟“

”دیکھو حالم... جب اللہ تعالیٰ ہمیں امتحان میں ڈال کے محبوب چیز اور درست چیز کے چناؤ کا موقع دیتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہمارے اندر اچھائی کی رمت باقی ہے۔ ابھی سیدھا راستہ ہمارے قدموں سے مایوس نہیں ہوا۔ سیدھے راستے کی خود سے لگی یہ امید نہیں توڑنی چاہیے۔ ایک طرف سے رزق نہیں آئے گا تو کسی دوسری طرف سے آجائے گا۔ اتنا تو اچھائی کی طاقت پہ بھروسہ رکھو نا!“ وہ اب تیز تیز چلتے ہوئے اسے سمجھا رہا تھا۔ تالیہ اے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ اس کے آنسو زار و قطار گرنے لگے۔ وہ ابھی بول ہی رہا تھا جب اس نے کال کاٹ دی اور فون پر رے ڈال دیا۔

سارے فیصلے اس برستی بارش نے کروا دیے تھے۔

☆☆=====☆☆

وہ حالم سے فون پہ بات کرتے ہوئے سڑک پہ تیز تیز چل رہا تھا جب بارش شروع ہوئی۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، کانوں میں ہینڈز فری لگائے اس نے چہرہ اٹھا کے آسمان کو دیکھا پھر قدم تیز کر دیے۔ قریب میں بس اسٹینڈ کا چھپر بنا تھا۔ فاتح نے بات جاری رکھتے ہوئے جیب سے پانی کی ننھی سی بوتل نکالی اور شید کی طرف آگیا۔

حالم نے ایک دم سے کال کاٹ دی تو اس نے برامانے بغیر ہینڈز فری کانوں سے نکالے اور بیچ پہ آ بیٹھا۔ پھر بوتل لبوں سے لگائی اور موبائل کھول کر دیکھنے لگا۔

گیلے بالوں اور کپڑوں کے ساتھ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اب ایک بھر پور چھٹی انجوائے کرتا نظر آ رہا تھا۔

”فاتح صاحب... وان فاتح!“

آوازوں سے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پورٹرز نے اسے ڈھونڈ لیا ہے۔ اس نے بس مسکرا کے چہرہ اوپر اٹھایا وہ تو مکھیوں کی طرح

اطراف سے اس پہ جھپٹے۔ پل بھر میں سامنے پانچ چھ افراد جمع ہو گئے تھے۔ ایک دو نے چھتیاں تان کے باقی سب کو بھی بارش سے بچا لیا تھا۔ کچھ چھپر تلے بھی آگئے تھے۔

"آپ نے کانغذات یا مزدگی جمع کروادیے ہیں۔ کیا آپ خود کو بی این کا اگلا جنیر مین بنتے دیکھ رہے ہیں جبکہ کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے استعفیٰ کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔"

کسی نے مائیک اس کے چہرے کی طرف کئے سوال جھاڑا۔ وہ مسکرا کے پیچھے ہوا "ایک بازو بیچ کی پشت پہ پھیلا یا اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی۔"

"وان فاتح استعفیٰ نہیں دے رہا... نہ دے گا۔ میں انکیشن لڑ رہا ہوں اور بالکل لڑ رہا ہوں۔"

"مگر کچھ عرصہ پہلے تک لوگ آپ سے یہ سوال پوچھتے تھے تو آپ جواب گول کر جاتے تھے۔ اب آپ بہت دھڑلے سے انکیشن لڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا تب آپ کو لگتا تھا کہ آپ کو مخالفتوں کے باعث انکیشن سے دستبردار ہونا پڑے گا؟"

"دیکھیں انکیشن لڑنا تو میں اس دن چھوڑوں گا جس دن آپ کو اطلاع ملے گی کہ بعد نما عصر وان فاتح کا جنازہ ہے۔ ورنہ اس زندگی میں سیاست میں ایک دفعہ اتر جانے والا اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔"

بارش میں کھڑے رپورٹرز کا قہقہہ گونجا۔

"مگر فاتح صاحب جب سے آپ کی دکانیں جلی تھیں اور آپ کی انوسٹمنٹ ڈوبی تھی عام تاثر یہ بن گیا تھا کہ آپ کے پاس انکیشن لڑنے کا پیسہ نہیں ہے۔ تو اب آپ کے مالی حالات کیسے ہیں؟"

"اب صوفیہ رحمن کی طرح میرے باپ نے بھی کرپشن کر کے لامحدود دولت اکٹھی کی ہوتی تو میرے مالی حالات کو اس آگ سے فرق نہ پڑتا مگر خیر میں انکیشن لڑنے کی پوزیشن میں ہوں۔"

"فاتح صاحب یہ بتائیے۔" دوسرے رپورٹرز نے سانس لیے بغیر پوچھا۔ "تازہ اطلاع ہے کہ کل اشعر محمود بھی جنیر مین شپ انکیشن کے لئے کانغذات جمع کرانے جا رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

فاتح نے جیب سے ہینڈ زفری نکالے اور ان کی گرہ کھولتا اٹھا۔ "کانغذات جمع کروانا برا ایک کا حق ہے اور پھر انکیشن سے پہلے بہت سے کانغذات جمع کروائے جاتے ہیں۔"

ہینڈ زفری کانوں میں ڈالتا وہ فٹ پاتھ پہ آگے بڑھتا اور رپورٹرز اپنے مائیک اس کی طرف بڑھائے لئے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اشعر صاحب صرف کورنگ امیدوار ہیں؟ اور وہ بعد میں کانغذات واپس لے لیں گے؟" ایک لڑکے نے بلند آواز میں پوچھا۔ (کورنگ امیدوار اصل امیدوار کا حامی ہوتا ہے اور اس لئے کانغذات جمع کرواتا ہے تاکہ اگر اصل کے کانغذات مسترد ہو جائیں تو اس کا گروپ اس کو کھڑا کر سکے۔ مستردگی کے فیصلے کے آنے تک کانغذات نامزدگی جمع کروانے کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔)

"اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنی جاگنگ مکمل کر لوں کیونکہ میرے سامنے ایک لمبا دن ہے۔" اس نے جواب دیے بغیر فون جیب میں ڈالا اور ہینڈ زفیری کانوں میں پکے کرتے ہوئے قدم تیز کر دیے۔ صحافی مزید سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے مگر وہ جلد ہی ان کے درمیان سے راستہ بناتا... ہلکا ہلکا سا بھاگتا آگے نکل گیا۔

اور ایسے میں اس کے ذہن میں ایک خیال گردش کرنے لگا تھا۔

معلوم نہیں حال نامی اس انویسٹی گٹر کا کیا مسئلہ ہوگا؟

بار بار ذہن بھٹک کے اس ہی کی طرف جارہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ایڈم کے چھوٹے سے گھر کا باغیچہ اتوار کی صبح پھولوں سے مہک رہا تھا۔ مرغی گھاس پر چونچ مار رہی تھی اور چوزے چوں چوں کرتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دیوار پہ لوہے کی تار لگی تھی جس کے باعث بلی اب وہاں دکھائی نہ دیتی تھی۔ ایڈم کی ماں برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی دُش میں میدہ لیے پیڑے بنا رہی تھی۔ بارش ختم ہوئے گھنٹہ بھر ہونے کو آیا تھا اور موسم خوشگوار تھا۔

گیٹ کی بیل بجی تو ماں نے چونک کے سر اٹھایا۔ پیڑے بناتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ سامنے لگے چھوٹے سے جنگلے نما گیٹ کے پار کھڑی لڑکی صاف دکھائی دیتی تھی۔ پاؤں کو چھو تا سرخ فراک پہنے کہنی پہ بیگ ڈالے 'سر پہ ترچھا سفید ہیٹ رکھے' وہ سنہرے بالوں والی لڑکی شناسا تھی۔

"سلام!" سر کو خم دے کر سلام کیا تو ابو دُش رکھ کے آٹے سے لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ اٹھی۔

"چے..." وہ رکی۔ اس کا نام کیا تھا؟ بھول سارہا تھا۔ مگر وہ جلدی سے آگے آئی اور مسکرا کے دروازہ کھولا۔

"میں ایڈم سے ملنے آئی ہوں۔" وہ ہچکچا کے بولی۔ ساتھ ہی نظروں سے باغیچے کا جائزہ لیا۔ گھاس کے اختتام پہ ماچس کی ڈبی جیسا ننھا سا گھر تھا جس کی چھت مخروطی تھی۔

"آپ اندر آئیے۔ میں اسے بلاتی ہوں۔" ابو اسکرٹ سے بندھے رومال سے ہاتھ صاف کرتی اندر کو پکی۔

"ایڈم.. ایڈم!" ماں ایڈم کے کمرے کا دروازہ تیزی سے کھول کے اندر داخل ہوئی تو دیکھا وہ اسٹڈی ٹیبل پہ جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ چیک والی سرمئی شرٹ پہنے 'وہ سادہ حلیے میں تھا۔ ماں کو دیکھ کے چہرہ موڑا اور جمائی روکی۔

"میں ناشتے کے لئے آہی رہا تھا۔"

"وہ باہر آئی ہے۔ کہہ رہی ہے ایڈم سے بات کرنی ہے۔"

"کون؟" وہ چونکا۔ "فاطمہ؟" بے یقینی سے قلم رکھا۔

"نہیں۔ وہ لڑکی جس نے تمہارے تایا کا خواب سن کے آمین کہا تھا۔"

ایڈم بن محمد کو چند ثانے سمجھ ہی نہیں آیا۔ وہ ہونقوں کی طرح ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"کون؟"

"وہ جو اشعر صاحب کی پارٹی میں موجود تھی۔ سنہرے بالوں والی"....
ایڈم اتنی تیزی سے بوکھلا کے کھڑا ہوا کہ اس کے کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے کی آواز آئی۔
"چے تالیہ؟"

"ہاں۔ یہ وہی ہے نا جو کسی کی نوکرائی تھی اور اب خاندانی رئیس بننے کی اداکاری کرتی ہے؟" ایبو نے یاد کیا۔
وہ کوئی نوکرائی وغیرہ نہیں ہے۔ وہ ملک کے اعلیٰ ترین شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ شہزادیوں سے بھی اعلیٰ ہے وہ۔ "وہ بگڑ کے
جلدی جلدی بولا تھا۔

تالیہ گیٹ کی طرف پشت کئے کھڑی تھی جب وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کا لمبا سرخ فرائ، سر کا ہیٹ، اور پیچھے گرتے سنہری بال
یہاں سے دکھائی دیتے تھے۔ ایڈم نے شرمندگی سے اپنے چھوٹے سے باغیچے کو دیکھا، پھر ہاتھوں سے شرٹ کی نادیدہ شکنیں درست کیں
اور کنکھارتا ہوا قریب آیا۔

"چے تالیہ!"

وہ اس کی طرف گھومی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ تالیہ نے سفید ہیٹ ترچھا کیا تو اس کا چہرہ پورا نظر آیا۔ اس چہرے پہ صرف سادگی تھی۔
"اندر... اندر آئیے۔"

وہ گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔ یعنی سڑک پہ۔ ارد گرد چھوٹے گھروں کی قطار تھی اور لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک لڑکی پر ام دھکیلتی آرہی
تھی۔ ایک فربہ مائل عورت گروہری کے تھیلے اٹھائے سامنے جا رہی تھی۔ ایک بوڑھا جوڑا خوشگوار موسم کے باعث واک کرنے نکلا ہوا تھا۔
"یہ عورت کبھی اس لڑکی جیسی ہوگی۔" اس نے ابرو سے سامان اٹھائے چلتی عورت کی طرف اشارہ کیا تو ایڈم نے اس کی نگاہوں کے
تعاقب میں پہلے اس موٹی عورت کو دیکھا، پھر اس نوجوان لڑکی کو۔ "کبھی یہ اتنی پتلی ہوگی لیکن اپنی شادی کے تین چار سال بعد یہ ایسی ہوگی
ہوگی۔ تقریباً بیس کلو وزن بڑھا ہوگا جس کو یہ گھٹائیں سکی ہوگی۔"

ایڈم غور سے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اپنے گھر پہ شرمندگی، اپنا حرف حلیہ، ساری فکریں ذہن سے محو ہونے لگیں۔

"جانتے ہو پتلے لوگ موٹے کیوں ہو جاتے ہیں؟" تالیہ گردن موٹے پتلی لڑکی کو پر ام دھکیلتے دیکھ رہی تھی۔

"کیونکہ وہ بہت کھاتے ہیں۔"

"مگر کتنا کھاتے ہیں؟ پتہ ہے ایک تحقیق ہوئی اس بارے میں کہ پتلے لوگوں اور موٹے لوگوں کی روزانہ کی خوراک میں کتنا فرق ہے؟"

وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

"موٹے اور پتلے لوگوں کی سال بھر کی خوراک کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہے 'شاہی مورخ' ہر روز موٹے لوگ پتلے لوگوں سے کتنا زیادہ کھاتے ہیں؟" اس نے چہرہ موڑ کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"صرف ایک نوالہ زیادہ!"

ایڈم نے بے یقینی سے ابرو اٹھائے۔

"ایک نوالہ؟ صرف ایک نوالے سے کون موٹا ہوتا ہے؟"

"بالکل۔ یہ عورت بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ روز کا ایک نوالہ زائد کھانے سے میں موٹی کہاں ہو سکتی ہوں۔ مگر ہر روز کا ایک زائد نوالہ جو اندر جاتا ہے 'وہ جمع ہوتا جاتا ہے اور سال بھر میں چار پانچ کلو وزن بڑھا دیتا ہے۔ شادی کے چوتھے پانچویں سال تک لڑکیاں پندرہ بیس کلو بڑھا کہ موٹی مرغیوں جیسی بن جاتی ہیں کیونکہ ان اب کو لگتا ہے کہ ایک نوالہ ذرا سی چیٹنگ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

پھر وہ پوری اس کی طرف گھومی اور اس مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"لیکن فرق پڑتا ہے۔ روز کے چھوٹے چھوٹے جھوٹ اور چھوٹی چھوٹی خیانتیں جمع ہو کے بہت بڑا ڈھیر لگا دیتی ہیں اور ان سے جان چھڑانا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جیسے بڑھا ہوا وزن کم کرنا۔ ان دونوں کاموں کے لئے بہت سادہ اور پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ پلیٹ میں پیش کی گئی رغبتوں کو دیکھ کے بھی انکار میں سر ہلانا پڑتا ہے۔"

"آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں ... میری کار میں کھدائی کا سامان پڑا ہے۔ میرے ساتھ ملا کہ چلو۔ ہم اپنا خزانہ کھود کے نکالیں گے اور پھر ہم فوراً ڈسٹرکٹ آفیسر کو خبر دیں گے۔ ہم اسے پوری ایمانداری سے سرکار کے حوالے کر دیں گے۔"

ایڈم نے اسے پتلیاں سکڑ کے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ آپ خزانہ دیکھتے ہی کدال میرے سر پہ نہیں دے ماریں گی؟ اور کھودے ہوئے گڑھے میں میری لاش ڈال کے بے دفنا کے سارے ثبوت نہیں مٹا دیں گی؟"

تالیہ نے تھکی ہوئی سانس بھری۔

"اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو تمہیں ساتھ کیوں لے کر جاتی؟ اکیلی ہی سارا خزانہ نکال کے غائب ہو جاتی۔ تم نے پولیس کو نہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"واقعی مجھے ساتھ لے کر جا کیوں رہی ہیں آپ؟"

"تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تالیہ بہت مراد اپنے باپ جیسی نہیں ہے۔ وہ اس خزانے کو نہیں لوٹے گی جو اس کے ملک کے لوگوں کی

امانت ہے۔ اور میرے خواب کے مطابق ہم دونوں اکٹھا خزانہ نکالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک خزانہ ہم نے پہلے بھی ایک ساتھ ڈھونڈا تھا۔ جیسے تم نے اس خزانے کی حفاظت کی تھی، آج مجھے اس کی کرنے دو۔“

ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ماتھے کے بل غائب ہو گئے۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔

"آپ واقعی بدلنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں مجھے اچھائی کی طاقت پراتا بھروسہ تو ہے ہی۔" ہیٹ والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔ ایڈم کا دل خوشی سے بھر گیا۔

"لیکن آپ کے امیر ہونے کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔"

تالیہ مراد نے ہیٹ ترچھی کی اور معنی خیزی سے مسکرائی۔ "کس نے کہا؟"

ایڈم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ "یک منٹ... آپ نے ابھی کہا کہ آپ خزانے کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔"

"ہرگز نہیں... میں نے یہ کہا کہ ہم ڈسٹرکٹ آفیسر کو اطلاع دیں گے اور خزانہ حکومت کے حوالے کر دیا گے۔ مگر یونواٹ ایڈم۔ تم میں

اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم بہت سیدھے ہو۔ میں نہیں ہوں۔ میں نے ٹریڈر ٹروویکٹ پڑھا ہے۔ اس کے مطابق حکومت کو خزانہ

ڈھونڈنے والوں کو انعام بھی دینا ہوتا ہے۔"

"انعام؟" .. ایڈم کا منہ کھل گیا۔

"ہاں اور جب ہم سرکار سے خزانے کی ڈیل کریں گے تو ان سے عہد لیں گے کہ انعام خزانے کا percentage ہوتا چاہئے۔

کروڑوں کے خزانے کا معمولی حصہ بھی بہت ہی ہوگا۔ حکومت بہت آرام سے چند نوادرات ہمیں دے دے گی جس کو میں بھرپور پروموشن

کے بعد کروڑوں میں بیچوں گی۔ ہاں ہم اس رقم سے بہت امیر نہیں ہو جائیں گے مگر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اتنی رقم کافی ہے۔

اور پھر میرے پاس ملا کہ سے لایا گیا قیمتی زیور بھی ہے اور وان فاتح مجھے بی این اعلیٰ پائے کی جاب بھی دلا دیں گے۔ یہ بھی کم نہیں ہے۔"

"اور میں سمجھا چے تالیہ اپنے سارے خواب بھلا کر درویشانہ زندگی گزارنے جا رہی ہیں مگر آپ نہیں بدلیں گی۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا

تو تالیہ نے کندھے اچکائے۔

"خوابوں پر شہزادی تالیہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ گستاخ مورخ" پھر اس کے دائیں ہاتھ کو دیکھا جسے ایڈم نے سرعت سے پیچھے کر لیا۔ "میں

لباس تبدیل کر کے آتا ہوں، آپ یہیں رکھیں"

وہ جیسے ہی اندر آیا ابو پیچھے پیچھے چلتی آئی "تم دونوں کسی خزانے کی بات کر رہے تھے، ایڈم مجھے بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ایڈم بن محمد کوزمین میں چھپے خزانے کا راز ملنے والا ہے، ماں۔ تالیہ کی دعا قبول ہونے والی ہے۔" وہ الماری میں بیٹگرز ادھر ادھر کرتے

ہوئے عجلت میں بتانے لگا۔ چہرہ جوش سے متمرد ہاتھا۔

چوکھٹ میں کھڑی ایبو نے گہری سانس لی۔ "اور اس روز تم دنیا کے بادشاہوں سے زیادہ طاقتور بن جاؤ گے۔ یہ بات بھی اس خواب

میں شامل تھی ۔

ایڈم کے ہاتھ رکے۔ وہ ٹھٹھکا۔ بے اختیار کمبوڈو ڈریگن کی لاش اور وہ غاریا آیا جو سونے سے بھرا تھا۔
(ایک خزانے کا راز اسے پہلے بھی ملا تھا مگر اس نے کسی مقام پہ خود کو بادشاہ سے زیادہ طاقتور تصور نہیں کیا تھا ، اور طاقتور تو وہ اب بھی نہیں بنے گا ، تو پھر..؟)
خیر... اس نے سر جھٹکا اور کپڑے نکالنے لگا۔

☆☆=====☆☆

اس مصروف سڑک کے دونوں اطراف میں ڈیزائنر شاپس بنی تھیں۔ شاپنگ کرتے لوگ سڑک کنارے ٹہل رہے تھے۔ دکان کے اندر بھی اشیاء دور سے چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک جیولری اسٹور کے دروازے سے سمیع اندر داخل ہو رہا تھا۔
سمیع کے بال مناسب کئے تھے اور آنکھوں پہ مہنگے فریم والا نظر کا چشمہ تھا۔ ڈیزائنر کوٹ پہنے ، انگلی میں سونے کی قیمتی انگلیٹھی ، کلائی میں سنہری گھڑی باندھے وہ بظاہر کوئی مالدار آدمی لگتا تھا۔ سانولے چہرے پہ بے نیاز مسکراہٹ تھی اور عقاب جیسی آنکھیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

مینجر اس کو دیکھ کے فوراً اٹھا۔ وہ مسکرا کے قریب آیا اور زیورات سے بچے شوکیس کے ساتھ رکھی کری پہ بیچنا۔
"بتائیے سر کیا دیکھنا چاہیں گے؟" یہ درمیانے درجے کا اسٹور تھا اور اس میں ڈیزائنر جیولری تو نہ تھی ، لیکن پھر بھی اس کا شمار قابل بھروسہ جیولرز میں ہوتا تھا۔

سینئر مینجر نے نگاہوں سے اس آدمی کی مالی حیثیت کا اندازہ کرنا چاہا۔ وہ کوئی وند و شا پر نہیں لگتا تھا۔
ظاہر ہے وہ اس بات سے واقف نہ تھا کہ سمیع نے ادھار کی چیزیں پہن رکھی تھیں۔ اسکے مالی حالات خراب تھے آج کل اور کام ٹھنڈا تھا۔
قرض انگ چڑھے تھے۔ ایسے میں تالیہ کے ناپس اس کا واحد ہتھیار تھے۔ ہاں مگر وہ بیوقوف نہ تھا کہ ناپس بیچنے کی کوشش کرنا۔ اس نے اپنے سارے دوست سے ہیرے نکلوائے تھے اور ان ہیروں کی پرانی تاریخوں میں کسی درمیانے درجے کے اسٹور کی رسیدیں بھی بنوالی تھیں۔
ایسے اسٹور کے جیولر مالکان اپنے جاننے والے چوروں اور نو سر بازوں کی چوری شدہ رسیدیں بنا دیتے تھے تاکہ انہیں بیچنا آسان ہو۔
اسکے سارے دوست نے ہیرے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ ناپس بلیو ڈائمنڈ کے تھے اور ڈیزائنر جیولری معلوم ہوتے تھے۔
یقیناً تالیہ کو اس کے کسی چاہنے والے نے دیئے ہوئے۔

"اپنی والدہ کے ڈائمنڈز کو میں انگلیٹھی میں جڑوانا چاہتا ہوں۔ دراصل میری شادی ہو رہی ہے" وہ مسکرا کے بتا رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک باکس نکالا اور اسے کھولا۔ اس کے اندر وہ دونوں ہیرے ایک سونے کے لاکٹ کے ساتھ پڑے دکھائی دیتے تھے۔ لاکٹ پرانا تھا اور ایسا لگتا تھا اندر سے ہیرے اتارے گئے ہیں۔

"میں نے ایک جیولر سے ان کو اترا دیا مگر اس نے انگوٹھی کے جو ڈیزائن دکھائے وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔"

"شیور سر... آپ کے ذہن میں کوئی ڈیزائن ہے؟"

مینجر نے فوراً باکس قریب کیا اور نوٹیزر سے ایک ہیرا اٹھا کے دیکھا۔ اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

"میں یہ ڈیزائن چاہ رہا تھا۔ میری منگیت کو یہ پسند ہے مگر سر پر اتار دینا ہے تو اس لیے..." وہ موبائل پہ ایک ڈیزائن دکھانے لگا۔

"آپ کے پاس رسید ہے نا اس کی؟ دراصل سسٹم ایسا ہے کے..." مینجر وضاحت دینے لگا۔ بظاہر شک کرنے کی وجہ تو نہ بنتی تھی مگر وہ مجبور تھا۔

"آف کورس ہے۔" اس نے جیب سے فوراً کاغذ نکال کے دکھائے۔ والدہ نے قریباً پانچ برس پہلے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے ایسے ہی پڑا ہے۔" اب وہ رٹی رنائی کہانی سن رہا تھا۔

"بہت قیمتی ہیرا ہے یہ۔" مینجر متاثر کن نظروں سے ہیرے کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے احتیاط سے دونوں ہیروں کو ڈبی میں ڈالا۔

"میں ان کو چیک کر لوں" پھر بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔" خوش اخلاقی سے کہتا مینجر ہیروں کو لئے شوکیس کے سرے تک آیا جہاں نیچے چند مشینیں رکھی تھیں۔ اس نے مائیکرو اسکوپ کی طرح کی مشین میں ایک ہیرا رکھا اور آنکھ مقررہ جگہ پہ لگا کہ اسے پرکھنے لگا۔

اسنور کے قیمتی ہیروں اور سونے کی چمک سمیع کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اسے سی کے ٹھنڈے اور خنک ماحول میں وہ خود کو بہت آرام دہ محسوس کر رہا تھا جب مینجر واپس اس تک آیا۔

"آپ کے ہیرے بالکل اصلی ہیں۔ اچھا اب میں آپ کو چند فریش ڈیزائن دکھا دیتا ہوں جو آپ کی خوش قسمت وائف کو بہت پسند آئیں گے۔" مینجر خوش دلی سے چند کیسز نکال لایا۔ پھر ایک ایک انگوٹھی نکال کے دکھائی۔ اپنی چرب زبانی سے وہ ہر انگوٹھی کے ڈیزائن کی شان میں قلابے ملا رہا تھا۔

سمیع کچھ دیر ان کو دیکھتا رہا۔ یوں ظاہر کیا جیسے اسے ڈیزائن پسند نہ آرہے ہوں۔

"شاید ہیرے بہت بڑے ہیں۔ ان کو بیچ کے میں چھوٹے ہیرے خرید کے اگر انہیں یوں بنوا لوں تو..." وہ ایک ڈیزائن پہ انگلی رکھ کے بولا تو جیولر گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہوا۔

"تو تھینکس جناب۔ مجھے آپ کے چوری کے ہیرے نہیں خریدنے۔" جیولر کا لہجہ ایک دم روکھا ہوا تو سمیع نے چونک کے اسے دیکھا جو سمیع کے پیچھے کسی کو دیکھ رہا تھا۔

سمیع ایک دم گھوما۔ کرسی بھی ساتھ ہی گھومی۔

دکان کے دروازے سے تین پولیس آفیسرز داخل ہو رہے تھے۔

"ایک منٹ - میرے ہیرے چوری کے نہیں ہیں۔" اس نے بوکھلا کر میجر کو پکارا۔ "آپ نے پولیس کیوں بلا لی ہے؟"

"کہانی اچھی گھڑی آپ نے جناب۔" جیولر رکھائی سے کہتا اٹھا اور اپنے کیسز سمیٹنے لگا۔ پولیس والے اس کے گرد گھیرا بنائے کھڑے ہو گئے۔ وہ سمیع کو گھور رہے تھے جو حیران پریشان رہ گیا تھا۔

"اور میں آپ کی کہانی میں آ بھی گیا تھا لیکن میں نے ہیروں کو چیک کر لیا۔ جس سارے آپ نے یہ جعلی رسیدیں بنوائی ہیں، اس کے پاس میرے والی مشین نہیں ہوگی ورنہ بتا دیتا کہ ان ہیروں پہ laser inscription کی گئی ہے جس میں ان کا سرٹیفائیڈ نمبر لکھا ہے۔ یہ آپ کی والدہ کے نہیں ہیں جناب۔ یہ ہیرے Joyalukkas کے ٹاپس سے اتارے گئے ہیں اور یہ ایک سال پہلے ایک سنگاپورین خاتون کے پاس سے چوری کیے گئے تھے اور ان کا سرٹیفکیٹ نمبر پولیس نے تمام ڈائمنڈ ڈیلرز کو بھیج رکھا تھا۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ ڈیزائنر جیولری جب بھی چوری ہوتی ہے، اس کے مالکان اس کا laser انسکراپڈ نمبر پولیس کو دے دیتے ہیں۔" وہ ٹھک ٹھک انگلیوں کے ڈبوں کے ڈھکن بند کر رہا تھا اور سمیع کے قدموں تلے زمین سرک رہی تھی۔

"یہ میں نے نہیں چرائے۔ مجھے میری بیوی نے دیے تھے یہ۔"

"یہ ہیرے صرف چوری شدہ نہیں ہیں، مسٹر۔" افسر نے اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر ہتھکڑی لگاتے کہا۔ "یہ ہیرے ایک قتل کے سین سے چرائے گئے تھے۔ اب تم تھانے چل کے ہمیں یہ بتاؤ گے کہ اس قتل سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"اف!" سمیع نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

وہ اسے جان بوجھ کے ہاتھ رومز تک لائی تھی کیونکہ وہاں کیمرے نہیں لگے تھے۔ اس نے جان بوجھ کے اس وقت صرف موٹے موٹے ٹاپس پہن رکھے تھے تاکہ وہ ان کے لالچ میں آجائے۔ اس کا وہ ڈرنا، وہ غصہ کرنا، وہ سب۔۔۔ سب اداکاری تھا۔ اس نے اسے بہت برا پھنسا دیا تھا۔

اف! اس کا دماغ گول گول گھوم رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ شہر میں سن باؤ کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ ہفتہ بھر پہلے رات کو چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی سرخ حویلی۔ وہی کنواں۔ وہی تروتازہ پودے اور وہی لال اینٹوں والا صحن۔ مجسمہ بھی ویسے ہی فخر سے سر بلند کیے کھڑا تھا۔ اس کی پتھریلی آنکھیں سنجیدگی سے سامنے والی دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

اس وقت ان کو کھدائی کرتے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ مجسمے کے قریب اینٹیں اکھڑی پڑی تھیں اور گہری جگہ کھدی ہوئی تھی۔ شام ہو چکی

تھی اور وہ دونوں مٹی سے اٹے کپڑوں کے ساتھ دستانے چڑھائے، بال پلاسٹک کیپ میں ڈھانکے، کدالیں پکڑے کھودنے میں لگے تھے۔

"اب تک ہمیں یہ جگہ کھود لینی چاہیے تھی۔" ایڈم سانس لینے کو رکھا تو شکایتی انداز میں بولا۔ اس کا چہرہ مٹی سے اٹا تھا اور کپڑے بھی میلے ہو رہے تھے۔

تالیہ نے کدال کا پھل زمین پہ گاڑھا اور اس پہ دونوں ہاتھ جما کے ذرا دیر کو سستانے رکی۔

"احتیاط سے کام کرنا تھا نا۔ ورنہ سارے بازار کو اطلاع مل جاتی کہ یہاں کھدائی ہو رہی ہے۔"

"آوازیں تو اب بھی گنی ہوں گی۔"

"اسی لیے آتے وقت آس پاس بتا دیا تھا کہ نئی کربائے دار ہوں اور گھر کی ری ماڈلنگ کروا رہی ہوں۔ بے فکر رہو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔" اس نے پھر سے کدال اٹھالی اور زمین کھودنے لگی۔

پچھ سو سال نے اس جگہ کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ مجسمہ ویسا نہ تھا جیسا اس نے بنایا تھا۔ جگہ جگہ سے وہ ٹوٹا ہوا لگتا تھا گویا بعد میں مرمت کی گئی ہو۔ صحن بھی کئی دفعہ بنایا گیا تھا مگر زمین پرانی تھی۔

جیسے آسمان پرانا تھا۔ جیسے ملا کہ کا بوڑھا سمندر پرانا تھا۔

بس ہوا میں cesium کی ملاوٹ تھی۔

کدال کی ہر ضرب کے ساتھ مٹی نکلتی جا رہی تھی اور وہ اپنے مطلوبہ صندوق کے قریب پہنچتے جا رہے تھے۔۔۔ مٹی پہ نظریں جمائے، کدال اس میں مارتے، اس کے ذہن کے پردے پر ایک نیلی شام اترنے لگی۔

پرانے وقتوں کے ملا کہ میں سن باؤ کے گھر کی شام۔۔۔

سن باؤ دانگ لی کام سے باہر گیا تھا۔ شاہی سپاہی حویلی کے سامنے پہرے پہ مقرر تھے۔ ایڈم آج جلدی چلا گیا تھا مگر شہزادی تاشوہیں بیٹھی مجسمہ بنا رہی تھی۔ اس نے تاج سر پہ جما رکھا تھا اور جھمکے پہنے ہوئے تھے۔ لباس بھی زرتار تھا۔ تاج سے نکل کے پیچھے گرنا کپڑا سر کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ اس کا مدار لباس کے باوجود وہ مہارت سے مجسمے پہ ہاتھ چلا رہی تھی۔

"اتنے سال میں نے اس مجسمہ کو دیکھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ یہ وقت میں پیچھے جا کے تم نے بنایا تھا۔" آواز پہ وہ چونک کے پلٹی۔

فاتح اوپر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا اور مسکرائی۔

"تو اکتو!"

"شہزادی! فاتح نے سر کو خم دیا۔ ادب یہاں بھی پہلا قرینہ ہی تھا۔

"آپ کے گھر میں جو مجسمہ نصب ہے، اس پہ جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ ہوئی نظر آتی ہے۔ مجھے یاد ہے ہمارے وقت میں سفر والے روز عصرہ

کے مدعو کرنے پہ میں وہاں گئی تھی تو دیکھا تھا۔"

"ہاں کونوں سے وہ ٹوٹا رہتا ہے مگر تاریخی ورثے کی حفاظت کے شوقین لوگ اس کی مرمت کرواتے رہتے ہیں۔ آخری دفعہ عصرہ نے اس کی نوک پلک سنواری تھی۔" وہ زینے اترتے ہوئے نیچے آیا تو ساتھ ہی بولتا جا رہا تھا۔ وہ گارے میں لتھڑے ہاتھ لیے اس کو دیکھے گئی۔

سفید چھوٹے کرتے اور پاجامے میں وہ صاف رنگت والا اونچا لمبا غلام مسکراتے ہوئے قریب آ رہا تھا۔ ملائیشیا میں وہ ایک اسٹار سیلبریتی تھا۔ اور یہاں وہ ایک غلام۔

مگر دونوں جگہوں پہ وہ 'اس' کا تھا۔

"کیا سوچنے لگیں؟" وہ اس کے بالکل سامنے آ رکا۔ مسکراتے ہوئے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

وہ سنبھل کے مسکرائی۔ "عجیب باتیں سوچتی ہوں میں آج کل۔"

"مثلاً؟"

"کیا ہم واپس جاسکیں گے تو انکو؟"

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ ہم جائیں گے تو ضرور جائیں گے۔" پھر آواز دھیمی کی۔ "ایک دفعہ ہمیں مراد راجہ کا خزانہ مل جائے۔۔۔ ہم اس کو ایسے گھیریں گے کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں وہ چابی دینی پڑے گی۔" وہ مطمئن تھا۔ پر امید تھا۔ اس وقت تک اس کو مراد راجہ کی "شرط" کا گمان تک نہ ہوا تھا۔

"سوچ رہی ہوں واپس جا کے کیا ہوگا؟" وہ اپنی سوچتی نظریں اس کے وجیہ چہرے پہ جمائے ہوئے تھی۔ ہاتھوں کی مٹی سوکھنے لگی تھی۔ "آپ تو مجھے آزاد کر دیں گے مگر۔۔۔ سارا ملک، آپ کا خاندان۔۔۔ دوست۔۔۔ فیمنز۔۔۔ کوئی کبھی نہیں جان پائے گا کہ آپ نے جیسے سو سال پہلے کی ایک شہزادی سے شادی کی تھی۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ جانیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ مجھے آزاد کرنے کے بعد بھی آپ ایسے ہی رہیں۔ کے ایل میں آپ مجھے ایک بگڑی ہوئی امیرزادی سمجھتے تھے۔ مگر اب آپ جانتے ہیں کہ میں ایسی نہیں ہوں۔ ہم نے اندھیر جنگلوں کا سفر ایک ساتھ کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ مجھے کبھی نہ بھلائیں۔" "میں تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں؟ یہ وقت تو ایک سرمایہ ہے۔ ہم نے اس سے سیکھنا ہے۔ ماضی ہوتا ہی سیکھنے کے لیے ہے۔" "تالیہ نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔ "میرے خواب میں آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں آپ کو میری ضرورت ہے اور مجھے آپ کی۔"

"سوری مگر وہاں فاتح کو کسی کی ضرورت کبھی نہیں رہی۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ پھر ساتھ سے گزر کے آگے آیا اور قریب سے مجسمہ

دیکھنے لگا۔ تالیہ نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"اور اگر مجھے آپ کے قریب رہنا ہو تو میں کیا کروں؟"

نبیلی شام ابھی تک روشن تھی اور سن باؤ کا گھر خاموش تھا۔ ایسے میں آدھے بنے مجسمے کے ساتھ وہ دونوں یوں کھڑے تھے کہ فاتح مجسمے کو دیکھ رہا تھا اور وہ آدھی مڑ کے اسے۔

"تم کئی دفعہ کہہ چکی ہو کہ تم یہاں سے دور چلی جاؤ گی۔ امریکہ وغیرہ۔"

"چلی تو میں جاؤں گی... اپنی کچھ چیزیں لے کر۔" اس نے نظریں جھکا کے مجسمے کے قدموں کو دیکھا جہاں زمین برابر تھی مگر منوں مٹی تلے

اس کا خزانہ چھپا تھا۔ "لیکن اگر کبھی ارادہ بدل دوں اور آپ کے ساتھ رہنا چاہوں تو کیسے رہوں؟"

وہ آہستہ سے اس کی طرف گھوما۔ ایسے کہ پتلیاں سکیڑے اس کی بات پہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

"میرے آفس میں جاب کر لینا۔"

"مگر آپ کو تو میری ضرورت نہیں ہے۔" اس نے فوراً جتایا۔

"ہاں وہ تو نہیں ہے، لیکن میری زندگی، تالیہ، صرف کام کے گرد گھومتی ہے۔ اگر تمہیں میرے قریب رہنا ہے تو تمہیں میرے آفس میں

جاب کرنی پڑے گی۔" پھر سے کندھے اچکائے۔ سدا کا بے نیاز اور مطمئن آدمی۔

"آپ کے آفس میں مجھے کون سی جاب مل سکتی ہے؟" پھر ٹھہر کے بولی۔ "آپ کے آفس میں کون سی جاب اعلیٰ ترین ہے اور کون سی

ادنیٰ ترین؟"

"اعلیٰ ترین تو ممبرز پارلیمنٹ ہوتے ہیں۔"

"وہ تو میں بن نہیں سکتی۔ ادنیٰ ترین کون ہوتے ہیں؟"

"سب سے ادنیٰ اور معمولی جاب سیکورٹی ورکرز کی ہوتی ہے مگر نہیں، وہ آفس کے باہر ہوتے ہیں۔ پھر رہ گیا لفٹ والا آدمی۔ انہوں۔

وہ بھی ہمارے فلور پہ نہیں ہوتا۔" وہ تھوڑی کھجالتے ہوئے سوچنے لگا۔ "ہاں... سب سے کم تنخواہ والے تو پرسنل ایڈ یا باڈی مین ہی ہوتے

ہیں۔ اور سب سے اچھی جاب ڈیپارٹمنٹ ہیڈز کی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور دانائی کی وجہ سے وہاں تعینات ہوتے ہیں۔ کوئی سوشل

میڈیا ٹیم کا مینجر ہے تو کوئی میڈیا اسٹریٹجی کمیٹی کا ہیڈ، مگر دراصل یہ لوگ کنگ میکرز ہوتے ہیں۔"

"تو سب سے اعلیٰ جاب کنگ میکرز کی ہوتی ہے؟" اس کی آنکھیں چمکیں۔

"بالکل۔" پھر اسے دیکھ کے مسکرایا۔ "میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم جب بھی مجھ سے جاب مانگنے آؤ گی، میں تمہیں اپنا کنگ میکر بناؤں

گا۔ اس عہدے کا جو نام بھی ہو، وہ کنگ میکر کا عہدہ ہی ہوگا۔"

"اور اگر شہرت اور طاقت کی چکاچوند میں آپ اپنا وعدہ بھول گئے تو؟" اسے واہمہ سا ہوا۔

"بھول بھی گیا تو تم اتنی قابل ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت میں بہت جلد میرٹ اور محنت سے کنگ میکر بن جاؤ۔" پھر وہ ٹھہرا۔ "لیکن یاد رکھنا۔ راسپیوٹین کسی کو اچھے نہیں لگتے۔" تنبیہ کی۔ تالیہ کے ابرو اچنبھے سے اکٹھے ہوئے۔

"راسپیوٹین کون؟"

"فرانس کے بادشاہ نکولیس کا سلطان ساز۔ ویسے تو وہ نکولیس کے بیمار بیٹے اور بیوی الیگزینڈرا کا معالج اور پیر تھا، لیکن بادشاہ کا اصل ہمراز اور مشیر بھی تھا۔ بادشاہ ہر فیصلہ اپنے اسی روحانی پیشوا سے پوچھ کے کرتا تھا۔ الیگزینڈرا اور راسپیوٹین، ان دونوں کے غلط مشوروں سے نکولیس کو نقصان پہنچا تھا۔ دونوں سے عوام شدید نفرت کرتے تھے۔ آخر میں راسپیوٹین کو ایک دوسرے شہزادے نے دعوت کے بہانے گھر بلا کے قتل کر دیا تھا۔"

الفاظ کی سنگینی نے سرخ صحن کو اداس کر دیا۔

"عوام سلطان سازوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

"کیونکہ وہ اپنے لیڈر کو اپنے علاوہ کسی کی خواہش پہ چلتا نہیں دیکھ سکتے۔ آزاد لیڈر کسی سلطان ساز، کسی مشیر کی خواہش پہ چلتا بھی نہیں ہے۔ وہ اصولوں پہ چلتا ہے اور صرف درست مشورہ قبول کرتا ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ عوام کبھی اپنے لیڈر کو قصور وار نہیں ٹھہراتے۔ وہ راسپیوٹین جیسے سلطان سازوں اور الیگزینڈرا جیسی نا عاقبت اندیش بیویوں سے نفرت کرتے ہیں۔ لیڈر آخر تک ہیرو رہتا ہے۔"

وہ دونوں مجسمے کے ساتھ صحن میں کھڑے دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔

"اور آخر میں سارے طاقتور سلطان ساز قتل کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"کیونکہ اگر وہ بادشاہ کے ساتھ وفادار نہ رہیں تو بادشاہ کو مار کے تخت پہ قبضہ کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر وفادار رہیں تو بادشاہ کا ان سے اعتبار کوئی نہیں ہتا سکتا۔ کوئی سازش، کوئی چال ان کا مقام نہیں گھٹا سکتی تو حاسد رقیب ان کی جان لے لیتے ہیں۔ سلطان ساز بنا آسان نہیں ہے۔ اور گو کہ میں تمہیں جاب دینے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں دل سے کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم میرے آفس میں میرے ساتھ اس طرح کام کرو۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"کیونکہ۔" وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اور ملال سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "یہ ایسی دلدل ہے جس میں کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ یہ تمہیں اپنے اندر دھنسا لے گی۔ اور اگر دھنسا نہ سکی تو لباس و انداز ضرور کر دے گی۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ صرف میرے ساتھ رہنے کے لیے تم اس دلدل میں قدم رکھو۔"

وہ فکر مند لگتا تھا۔ تالیہ مسکرا دی۔

"جیسے آپ کو میری ضرورت نہیں، ویسے ہی مجھے بھی آپ کی ضرورت نہیں۔ میں تو آپ کا امتحان لے رہی تھی۔" پھر شہزادی نے گھمنڈی

تالیہ کا مٹی سے انا چہرہ ساکت ہو گیا۔ ایڈم بھی شل رہ گیا۔

وہ صحن اتنا پکا اور قدیم تھا کہ یوں لگتا تھا، برسوں سے کسی نے ایک اینٹ بھی نہیں ہلائی تھی۔ مجسمہ بھی اپنی جگہ پہ موجود تھا۔ تو پھر خزانہ کہاں گیا؟

صندوق اتنا مضبوطی سے فٹ کیا گیا تھا کہ خزانہ نکالنے والے نے اس کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور صرف اس کے ڈھکن میں شکاف کر کے ساری چیزیں نکال لی تھیں۔ مگر کس نے اور کب؟

”یہ نہیں ہو سکتا۔ چے تالیہ یہ ناممکن ہے!“

اب حالت یہ تھی کہ صحن کے درمیان میں گڑھا کھدا ہوا تھا اور اس کے دہانے پہ وہ دونوں مٹی مٹی ہوئے پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔

”ہمارا خزانہ کہاں گیا ایڈم؟“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ششدر نظریں ٹوٹے ہوئے صندوق پہ جمی تھیں۔

”کسی نے ہم سے پہلے خزانہ نکال لیا ہے۔ مگر کس نے؟“

”اب ہمیں حکومت کا انعام نہیں ملے گا۔“

”اور میری شادی کے پیسے بھی اکٹھے نہیں ہو پائیں گے۔“

”یعنی ہم وہیں پہ آگئے ہیں جہاں سے شروع ہوئے تھے۔ ہمارا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔ ”اور ہم پھر خالی ہاتھ

ہیں۔“

وہ دونوں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ شل۔ ماؤف دماغ لیے۔ سب کچھ جیسے ختم ہو گیا تھا۔

”ہم نے کیوں سوچ لیا تھا چے تالیہ کہ چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی خزانہ اپنی جگہ پہ موجود ہوگا۔“

وہ ابھی تک بنا پلکیں جھپکے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔

”پانچ سو ستاون سال ایڈم۔“

اور ان دونوں میں سے کوئی نہ ہنسا۔ وہ چپ چاپ گم صم سے بیٹھے رہے۔

سن باؤوا نگ لی کا مجسمہ اپنی پتھر لی آنکھوں میں صدیوں پرانے راز چھپائے خاموشی سے دورانق کو دیکھتا رہا۔

صرف وہی جانتا تھا کہ خزانہ کس نے نکالا تھا۔

مگر بندہ ہمارا کی بیٹی نے اس کا پتھر یلا چہرہ بناتے وقت اندر زبان تک نہیں رکھی تھی جس کو ہلا کے وہ انہیں حقیقت بتا سکتا۔

اس کی صرف آنکھیں تھیں جن میں سارے راز پتھر ہو چکے تھے۔

☆☆=====☆☆

سوموار کی صبح کے ایل کے دفاتروں میں کام شروع ہو چکے تھے۔ منڈے مارنگ کسی کو پسند نہیں تھی، مگر جمائیاں روکتے اتوار کے

ہنگاموں کو بھلانے کی سعی کرتے ورکرز کام میں لگے تھے۔ پتر اور لڈریڈ سنٹر کے اس فلور پر باریسن نیشنل کا دفتر بھی معمول کی مصروفیات کا شکار دکھائی دیتا تھا۔

وان فاتح کے آفس کے سامنے بنے چھوٹے سے سنگ ایریا میں تالیہ مراد بیٹھی نظر آتی تھی۔ بالوں کا جوڑا بنائے، وہ بھوری اسکرٹ بلاؤز پر سفید کوٹ پہنے کوئی ایگزیکٹو لگ رہی تھی۔

وہ ابھی ابھی آ کے بیٹھی تھی اور اسے دیکھتے ہی فاتح کا سیکرٹری عثمان فوراً چلا آیا تھا۔

”میم آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ میں فاتح صاحب سے آپ کے اپائنٹمنٹ لیٹر کا پوچھ کے آتا ہوں۔“ شائستگی سے بولا تو تالیہ نے بے نیازی سے گردن ہلادی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

عثمان چلا گیا تو اس کا فون بجا۔ اس نے موبائل نکال کے اسکرین روشن کی۔

”میں نے ساری جگہ کھود کے دیکھ لی کہ شاید چیزیں آس پاس مٹی میں گر گئی ہوں۔ مگر نہیں۔ سب غائب ہے۔ میں ابھی ملا کہ میں ہوں۔ زمین برابر کر دی ہے اور اینٹیں جوڑ دی ہیں۔ سینٹ سوکھ جائے گی تو صحن پہلے جیسا ہو جائے گا۔ مگر چے تالیہ.... ہمارا خزانہ کہاں گیا؟“

تالیہ کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔

”آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی کی جائز کمائی کو یوں لوٹ لیا جائے تو کیسا دکھ ہوتا ہے ایڈم۔ میں ملا کہ سے اسی لیے رات میں ہی واپس چلی آئی تھی کیونکہ اب خزانے کا ذکر میرے لیے تکلیف دہ بن گیا ہے۔ آج سے تالیہ کسی خزانے کا پیچھا نہیں کرے گی۔ اپنی زندگی کا یہ باب میں نے سن باؤ کے صحن میں دفن کر دیا ہے۔“

جس وقت وہ پیغام ٹائپ کر رہی تھی، عثمان اندر کھڑا فائلوں میں الجھے فاتح سے پوچھ رہا تھا۔

”سر وہ چے تالیہ کو کیا کام دینا ہے۔ وہ آگئی ہیں۔ آپ مجھے بتا دیتے تو میں ان کا اپائنٹمنٹ لیٹر ٹائپ کر دیتا۔“

فاتح نے عینک اتاری اور فائل پرے رکھی، پھر ٹیک لگا کے اسے دیکھا۔

”ایش نے اسے میرے پاس بھیجا ہے یہ کہہ کر کہ میں اس کو کوئی اعلیٰ جاب دوں۔“

”او کے سر! تو کون سی جاب ان کو.....“

”لیکن یہ ایش کی غلط فہمی ہے کہ وہ میرے آفس میں آ کے حکم صادر کرے گا اور میں اس کی بات مان لوں گا۔“ سر دلچھے میں کہا گیا اس کا فقرہ عثمان کو ششدر کر گیا۔

”مگر سر آپ نے جاب دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”ہاں اور وعدہ پورا کرنا پڑے گا اس لیے یوں کرتے ہیں، کسی کو چند دن کی چھٹی دے کر اس کو ہائر کر لیتے ہیں۔ یہ نازک طبع لو کی ہفتے

سے زیادہ نہیں نکلے گی۔“

”او کے سر، لیکن ڈیپارٹمنٹ ہیڈز میں سے کسی کو بھی چھٹی دی تو وہ برامان جائیں گے اور۔۔۔“

”میں ایک سوشلائٹ کو ڈیپارٹمنٹ ہیڈ بناؤں گا عثمان؟ تمہارا دماغ درست ہے؟“ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

”مگر آپ نے ان کو اعلیٰ ترین عہدہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”غلط۔ میں نے وہ جاب دینے کا کہا تھا جو وہ ڈیزر رو کرتی ہے۔ تم یوں کرو عبد اللہ سے کہو جہاں اس نے گیارہ دن چھٹی کی وہاں میں دن مزید مانگ کر لے۔ یہ لڑکی اول تو اس جاب کو اپنی توہین سمجھ کے لینے سے انکار کر دے گی، اور اگر قبول کر لی تب بھی زیادہ دن یہ مجھے برداشت نہیں کر پائے گی۔ روز کے پندرہ سولہ گھنٹے وان فاتح کے ساتھ رہنا آسان نہیں ہوتا۔ ہو گیا مسئلہ حل، عثمان؟ اب مجھے کام کرنے دو۔“

اس نے سرد انداز میں کہتے ہوئے عینک اٹھائی اور اسے آنکھوں پہ جماتے ہوئے فائل کھول لی۔ آستینیں موڑے، کہنیاں میز پہ جمائے، اب وہ فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا تھا۔

”عبد اللہ کی جگہ جاب؟“ عثمان حق دق رہ گیا۔ ”سر... اشعر صاحب بہت خفا ہوں گے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہو گا۔“ ساتھ ہی دو انگلیوں سے اسے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

عثمان کے کان سننا اٹھے۔ نائی کی ناٹ کسی تھوک نگلا اور ہمت جمع کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

اب اسے باہر جا کے چے تالیہ کو یہ بتانا تھا کہ اس کے پاس نے اسے آفس کا سب سے ادنیٰ ترین عہدہ دیا تھا۔

اسے تالیہ مراد کو بتانا تھا کہ....

آج سے...

وہ وان فاتح بن رامزل کی باڈی دوسن ہوگی۔

☆☆=====☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)